جلد اول

پاکستان کا ثقافتی انسائیکلوپیڈیا

شمالی علاقہ جات

سلسلہ قراقرم، ہمالیہ، ہندوکش



PAKISTAN ENCYCLOPEDIA OF FOLKLORE

الفیصل

لوک ورثہ
LOK VIRSA

جلد۔اول

پاکستان کا ثقافتی انسائیکلوپیڈیا

شمالی علاقہ جات

سلسلہ قراقرم، ہمالیہ، ہندوکش

8846

زیر اہتمام مشترکہ اشاعتی پروگرام

الفیصل

CIRSA

DATA ENTRED

لوک ورثہ، اسلام آباد
ISBN

جملہ حقوق محفوظ
یہ کتاب یا اس کا کوئی بھی حصہ لوک ورثہ
کے قومی ادارے کی تحریری اجازت کے بغیر
کہیں بھی شائع نہیں کیا جا سکتا۔

ایگزیکٹو ایڈیٹر / پبلشر
عکسی مفتی

ایڈیٹر
سید محمد علی

سب ایڈیٹر
محمد حسن حسرت

Panel of Contributors

محمد حسن حسرت ..... بلتستان
ڈاکٹر عنایت اللہ فیضی ..... چترال
جمشید خان دکھی ..... گلگت، دیامر، غذر
شیر باز علی خان برچہ ..... بروشال ہنزہ، نگر

A= 8846

A joint venture of
Lok Virsa, Islamabad
and
Al-Faisal Nashran, Lahore,
In five volumes
NWFP, Sindh, Baluchistan, Punjab and Karakorum Region

الفیصل

Sold and distributed in Pakistan by
Al-Faisal Nashran, Ghazni Street, Urdu Bazaar, Lahore, Pakistan
Ph: 92-042-7230777
E.Mail: alfaisal_pk@hotmail.com

فہرست

۱۔ دیباچہ i

۲۔ فوک لور اور ثقافتی اقدار کا شعور

عکسی مفتی vi

غذر، گلگت، دیامر:

جغرافیہ 1

قدرتی چشمے 3

مزارات 4

فصلیں، پھل اور سبزیاں 5

قومیں 5

گلگت میں اسلام کی آمد اور صوفیاء 12

انتظامی اضلاع 13

گلگت کی آزادی 14

شنا کی علاقوں کے قبائل 15

شین قبیلہ 15

تراخن، مخلوٹ، گرکس قبائل 16

متفرق قبائل 18

مقامی خصوصیات 18

مجذوب بابا چلاسی اور اُن سے منسوب روایات 21

مقامی کھانے 22

خوشی کے موقعوں پر پکنے والے کھانے 23

شربت 24

خیرات 24

روٹیوں کی قسمیں 25

دھرم پھٹہ، ڈنگ دھرم، ویلی دھرم، چھپٹہ 26

چھرمکھہ 27

کشی، گل منڈی، رَرخہ بت، گس، 27

شونڑ، پھلئی، پنوشاہ، پے چوہ، شوپن 27

جنگلات اور جنگلی حیات 2

دلچسپ دیومالائی روایات 3

نیشنل پارک 4

تاریخ 5

گلگت کے سابق حکمران اور اُن سے منسوب روایات 6

ادب، ادیب و شعرا 13

مختلف و منفرد انداز حکمرانی 13

آبادی کے اجزائے ترکیبی، زبان و بولی 14

رونو قبیلہ 15

یشکن قبیلہ 16

کمین 17

متفرق اقوام 18

بدھ آثار 20

سید کا چشمہ 22

آداب دسترخوان 23

مُل 23

غمی کے پکوان 24

تبرک (زکمہ) 25

پھپاؤں، قستہ، ٹٹوری، 25

پھلکا، گولہہ 26

کچھ اور مقامی کھانے 27

دُوئی ڈوڈو، پھٹور کس، وی بارس، 27

اِسکرکُ (میتھی) 28

زبونگ، اچار 29
مشروبات، موروہ 29
مٹھائیاں، دِسوٗ، پھر پھٹی دِسوٗ اور کلاوَ 30
بک 30
مُوتو دُو، ہمہ چہ 31
خوبانی 32
لوک داستانیں، کہانیاں اور روایات 33
پچھنی اور دینل کھمیٹو 36
رُنی اور اس کا چالاک بیٹا 38
محبت کی لوک کہانی 42
وزیر اشو کی ''یدینی'' 43
''تئی بن دادو'' کی کہانی 44
ٹھگئی چگا (ٹھگ کی کہانی) 45
منیر اور شیر کی کہانی 47
دادی اماں کی لوک کہانی 49
عوامی پیشے اور دستکاریاں 50
چرواہوں اور چراگاہوں سے منسوب روایات 52
ٹوکری سازی 53
موچی (شٹو)، زرگر، درزی اور کشیدہ کار 54
لکڑہارا (جُک سارو) ڈوم (سازندے) 56
معمار 57
مارتولی وجبلی (پتھر توڑنے والے) 58
عادات واطوار 61
پتھر کا توا 62
چدن، کُھر (پرنالہ)، یونر (پن چکی) 63
چکی کے پتھر کے اوزار (رَ ال اور باٹ) 63
[illegible] 64
کھیان (برآمدہ) [illegible] 67
کلہہ 67
میل 30
دودھ سے تیار کی جانے والی متفرق اشیاء 30
کُرح، بُرحہ 31
پھل، توت 31
انگور، چیری، دیگر پھل 33
سُو ملک اور ملکی فر 34
راجا تراخان اور بولتا کوا، رُنی (چڑیل) 37
پسبا تھے نہ تھے، قصہ یرمس وملنگ جان 40
سنکر (بگروٹ) اور چنار کا درخت 43
شری بائی دیوی کا قصہ 43
عشق حقیقی کی لوک داستان 44
کاں منوں تو چلاس کوس کھای 46
بھبوتن، ناصر آباد (ہنی) کی ایک لوک کہانی 48
گلیشیر کی پیوند کاری 49
کاشتکار، گلہ بانی اچوپانی 51
بڑھئی، نائی (تھکر)، جولاہے (بیوں ے) 53
آسیابان (یونرے والہ) 54
اخوند، تاجر، طلاکش (سونیوال) 55
لوہار (اکھر)، جالوان (کشتی کھینے والے) 57
شرمہ باف 58
لوگوں کا رہن سہن 58
پتھر اور لکڑی سے بنائی جانی والی اشیاء 62
شِل (پتھر کی سل) 62
چکی میں استعمال ہونے والی اشیاء/اوزار 63
چکی کے لکڑی کے اوزار 63
چکی کے لوہے کے اوزار 64
سنوگوٹ (مقامی روایتی گھر) 66
چُلن (بیت الخلا)، غسل خانے 67
گھڑی/شکار 68

ھَمَر، تَوَن، کھٹول، ڈھینچ مچلیچ 68
محلات 69
مویشی خانے/ پناہ گاہیں، شرانو، گُینل، گسپر 70
مروجہ کیلنڈر، تقویم اور وزن کے پیمانے 70
شنا گنتی 71
شنا لوک ادب 73
ثقافتی ادارے 75
دروَی گائے، مذہبی شاعری 76
نوحہ 77
دوسرا دور، تیسرا دور 77
گلزار ملنگ جان، سان، زادِ سفر 78
سوینو موریئے 78
ددی یَی شلوکے 78
عرس میلے تہوار، تہوار، دُھوم دھکا 80
گلابی اَیت (گلاب کی عید) 81
مُردوں کی عید/ اُشار 83
صندل کا تہوار 83
جشن آزادی گلگت، جشن بہار کا میلہ 85
جشن آزادی پاکستان 85
محرم کی ماتمی مجالس 86
پیدائش کی رسمیں 86
کلیک ملیک (جہیز) 90
روانگی بارات/ نکاح 92
آج کل کی شادیاں 94
کسینو 93
موت کی رسمیں 96
مہمان داری، بی پھاؤ 97
نسالو 99
عبادت گاہوں کا طرز تعمیر 68
بیاک 70
باءوہرای، دھکری (منڈوع)، انشپ لیع 70
مہینوں کے نام 71
ناپ اور وزن کے پیمانے 72
علم وادب کے ادارے 75
چَنی گائے، چلاسی گیت 75
شنا حمدیہ اشعار، شنا نعتیہ اشعار 76
شنا شاعری کے ادوار 77
جواہر چلاسی (بابا چلاسی) 78
سمولو رسول ﷺ 78
شنا قاعدہ اور گرائمر، شنا زبان وادب 78
عورتوں اور مردوں کے نام 79
نوروز، جشن غدیر 81
سنو بزونو، عیدین 82
غنونی 83
چلی 84
سلک روٹ فیسٹول 85
شندور میلہ 85
شنا رسم ورواج 86
منگنی، شادی 89
رسم تاؤ اور رسم مہندی 91
دعوت ولیمہ (گری ٹِکہ) 93
رَپ، لوسون/ باری کا کسینو 93
ہنگامی کسینو، پندر 95
نئے گھر میں داخل ہوتے وقت دعوت (منوح) 97
شاپ (خیر وبرکت کی دعائیں) 98
رَازَن، دفینہ سازی 100

ختنہ (بسمون)، شئی پھیال، اُنی لَی 101
رسم ڈاڈا کا طریقہ 102
نذرانے کی رسم 103
رسمِ چلی گون، رسم چراغ روشن 104
بدن 106
میل جول کے طریقے 108
سری کون کی رسم 108
لوک علاج، دم، درود، ٹونے ٹوٹکے، توہمات 108
لوک علاج، رون، چُرکی 109
بھنگ، ھَیو، کھم پوش، صف 109
بھز ربھنگ، چلی، فلیل 110
زوغی پاشا، اسپندر، جرد چوٹل 110
تمورو، لِلیو، سئی بومہ 111
مرکوچل 110
بُرو، گُلت، اِشکین، سوم 111
کشہ پھپھرنگ 111
کھکامس، پونگ، مکھوتی 111
گٹرنگ، کِبر، شلکو، نرستو 112
دنداسہ، ٹکور، انچئی کلہہ 112
پیشاب بند ہونے پر عمل 112
لوک علاج کے ٹوٹکے 113
چشموں کے پانی سے علاج 113
تتہ پانی، بڑولس، شروٹ کا چشمہ 113
دماس کا چشمہ، گرونجر کا چشمہ 114
شولجہ (اشکومن) چشمے کا پانی جس سے پتھر بنتے ہیں 114
جوڑوں کا اپنی جگہ سے ہلنا اور فریکچر زدہ لوگوں کا لوک علاج 114
سنگ جراحت 114
پھیولو بڑیجونک (کندھے کا درد) 114
دانت کا درد کا لوک علاج 115
دم درود، تعویذ ٹونے ٹوٹکے 115
ٹونے ٹوٹکے، گنو 115
گنو کا منتر، وِیو، ویو کا منتر 116
ثورے چھونک (چھوٹے سر اور بڑے جسم والے بچوں کا علاج) 116
دال جھوتھونک (ڈر اور خوف کا علاج) 117
تانک دونک (آگ سے داغنا) 117
ھر دونک (نشتر) 117
مردہ سپ بونک (سوکھے کی بیماری) 117
متفرق ٹوٹکے 118
نظرِ بد، بدنظری سے بچاؤ کے ٹوٹکے 123
توہمات 124
چندشگون اور توہمات: تیبان، ناران اور شیستم دیوتا 124
چشمہ دیوتا 124
یُدینی (موسیقاروں اور شاہی خاندان کی مؤکلہ) 124
تیکھولے (بونا مخلوق) 124
یمالے (تصوراتی عورت ذات مخلوق) 125
ست ماں دجارے (سات ماں بیٹیاں) 125
زلزلہ، چاند گرہن، سورج گرہن، راھمی 125
سیلی، مُرکُم 126
تیکھ دیکھ نی (بھوت) 126
سونَی چی (سونے کی رکھوالی) 126

لیلی چی (خونی عورت)..... 126
اُشوٹی چی..... 126
کسری گوتو (کسر کی زنبیل)..... 127
شاپال، میل گس..... 127
کاہن، جن بھوت، پری اور چڑیل..... 128
کاہنوں کی قسمیں، رٹھس..... 128
رُینی مٹوہ..... 129
کاہن سے لیے جانے والے دیگر کام..... 133
پری کا قصہ..... 135
برای یا پری..... 137
خالص مردانہ کھیل: بُلہ..... 138
پولو ٹیم تشکیل دینے کے روایتی طریقے..... 139
بھٹ پھل (شارٹ پٹ)..... 143
سمولو (کشتی)، مسٹ کاہ..... 144
زنانہ کھیل: بلہ سأ (جھولا جھولنا)..... 144
ٹپہ، ہپ جھکی..... 145
بچگانہ کھیل: لیش پیش، پنڈوک، ٹکر وسا (گلی ڈنڈا)..... 145
پہاڑی دوڑ..... 146
کھکائیں پھل تھونک (اخروٹ پھینکنا)..... 147
انڈے لڑانے کا کھیل..... 148
شکاریات کی قدیم روایت..... 148
حلوئی میارو..... 151
کپکہ، دھڑپ، کوپہ..... 152
لوک لباس، زیورات اور دیگر سامان آرائش..... 152
زیورات (ہرکون)..... 156
پچولیس..... 156
سلسلہ، زمی یا مشٹیے، طوطہ..... 157
ثمر، برونو..... 157
دُھوم ددی چی/ پس بدی چی (دوخیالی عورتیں)..... 126
گورپھہ چنگ (تصوراتی پرندہ)..... 127
سجی (پاک صاف)، مچھ گون..... 127
درنجی، سار پودیوا کو..... 127
کاہن..... 128
ڈنگ رٹھس، پشو..... 129
راجہ گوہرامان کی کہانی..... 131
جن کا قصہ، جادو..... 134
چڑیل (رُنی)..... 136
جسمانی کھیل اور لوک تماشے..... 138
گھوڑے پر پولو (انشپار بلہ)..... 139
گتل بلہ، بسراہ..... 142
تنبک بازی، نیزہ بازی..... 143
بالہ رَاس تھونک (رسہ کشی)..... 144
رابیلہ/ چھلے دونک، بلی بلا..... 144
راجہ بنانے کا کھیل..... 145
پٹھو دونک، رن ٹھسا..... 146
برونو جپ تھونک (انگوٹھی چھپانا)..... 147
چھوپے ویونک..... 147
تم دونک (تیراکی)..... 148
شکار کے عقیدے اور روایات..... 149
شکار کے روایتی طریقے..... 152
مچھلی کا شکار..... 152
لوک لباس..... 152
روایتی زیوارات..... 156
بازی بند..... 156
گسمور، چولیے، اِسکاؤتمر..... 157
حلقہ بند، بموئیں/ کائے، دیگر چاندی کی اشیاء..... 158

بروشال ہنزہ، نگر، یاسین:

حدود اربعہ (بروشال ہنزہ)..... 159
بروشال یاسین..... 159
گلیشیر کی اقسام..... 160
جھیل، چشمے، بزرگان دین..... 160
تاریخ..... 162
آبادی کے اجزائے ترکیبی، زبان اور بولی..... 165
عورتوں اور مردوں کے نام..... 167
شادی بیاہ کے پکوان، شربت، سُپرا..... 169
روٹیوں کی اقسام:
بَروُے گیل، بری کُوژ، پھل ژ پھقو..... 170
شکر کوژے پھقو، بُروش یشیک..... 170
خمولٹ، سی سر، اَرذوق، چھا پھقو..... 171
شلک پھٹی، پُروتہ، خمشد ون، چھموریکی..... 171
ژوُرے ہوئی، ماشے شکر کوژ..... 172
گوشت کے سالن: بلانیشو، چھیے خَم..... 172
متفرق سالن:..... 172
آٹے کی نرم غذائیں: مُل، متُوک..... 173
ژیڈیو دِرمَ، ماکُولات مغزیات..... 173
آش کی اقسام، خَرنہ دوَدو..... 174
موژہ ڈوَڈو، چھپ ژہ ڈوَڈو..... 174
نَسکی ژہ ڈوَڈو، تمُوروژہ ڈوَڈو..... 174
قروت، پھٹا سنگ..... 175
بَستو د، چھموس..... 175
عوامی پیشے اور دستکاریاں..... 176
شبانی (چرواہے)، آسیابانی (آبی چکی)..... 177
ٹوکریوں کی مختلف اقسام:
پُورا، چوُرا گرَن، کھور، کھریٹی، شق، شپیکے شق..... 178
بروشال نگر..... 159
آب وہوا کا کیفیت نامہ..... 160
جڑی بوٹیاں، فصلیں، جانور..... 160
شاہراہ قراقرم..... 161
ریاست بروشال کا خاتمہ..... 164
نامور خاندان، زبانیں، مقامی خصوصیات..... 166
خاص خاص پکوان اور آداب اکل ونوش..... 168
غمی کے پکوان، ہریسہ..... 169
خمہ لی، قستہ، گیل،..... 169
بلکہ شپیک، بسس ژِگیل،..... 170
غُملدَی، دیژرِمُ، ملیدہ..... 170
ہئی اے پھقو، ہری اے قستہ..... 171
سالن کی اقسام: شکر کوژے، شپتینگے ہوئی..... 171
ہوسرے ہوئی، ہوئی لم گرما..... 172
یوٹس یٹی سہ خم، میار تک دوژرس..... 172
شوپَن..... 173
میٹھے پکوان: دِرمَ پھٹی، ڈنگ دِرمَ، دِرمَ شورو..... 173
ہَنی اے ژمیک..... 173
قُرت ژہ ڈوَڈو، بیڑنگ ژ ڈوَڈو..... 174
برس ژہ ڈوَڈو، غشو نیسقُل ڈاوَڈو..... 174
جوعیات: رَقپینے ژمیک..... 174
مشروبات: چائے، بلنگہ چائے، تُمورو چائے، دِلتَر..... 175
متفرقات اکل ونوش وآداب دسترخوان..... 175
نجاری، سازندے..... 176
زیور سازی، ٹوکرا سازی..... 177
جفت ساز (ہوچواوتاشو)..... 178
پٹی بافی (گشش کوئین)..... 179

لوک داستانیں، کہانیاں اور روایات:

کاہن تالی اور اُس کی پری زاد بیوی کی کہانی..... 190
شون ککر اور ہوکے مو، چپورسن کی تباہی..... 191
حضرت شاہ بریاولی کی داستان..... 192
عیاشو ملک اور منکر نکیر..... 192
لوک گیت..... 193
قیلو لسکر اور پراسرار گدھا..... 194
لوک زیورات، دیگر سامان آرائش، زنانہ مردانہ آراشی لباس..... 194
تہواروں کے ملبوسات، زیورات..... 194
جانوروں کی آرائش وزیورات..... 196
جسمانی کھیل، لوک تماشے، خالص مردانہ کھیل..... 198
لوک علاج، ٹونے ٹوٹکے..... 197
زنانہ اور بچگانہ کھیل..... 200

حصہ بروشال:

روایتی طرز تعمیر، آرائش اور رہن سہن، حہ..... 201
لوک ساز، گیت اور ناچ..... 202
گیت..... 203
آباء پرستی کے رسوماتی گیت..... 203
چرواہوں کے گیت..... 203
ایک دعائیہ گیت..... 203
لوک ساز..... 204
اَجولی..... 204
قبائلی، خاندانی، شخصی اور تاریخی دھنیں..... 204
کاہنوں کے لئے مخصوص دھنیں..... 205
تاریخی دھنیں..... 205
قومی دھنیں..... 205
عرس اور میلے..... 205
کت وِت..... 205
چیز..... 206
تگھم..... 206
گنانی..... 206
وِوتھ چک..... 207
ووگوستوئی (پرووندوں کی شادی)..... 207
کُچ کھمک خدوئی..... 207
پیر باڈر..... 208
پیا قمر..... 208
نوروز..... 208
بوپھاو..... 208
تھموشلینگ..... 209
مزارات..... 210

بلتستان:

جغرافیہ..... 211
پہاڑ اور گلیشیر..... 211
میدان اور جھیلیں..... 212
دیوسائی پلین..... 212
گرم پانی کے چشمے..... 212
دریائے سندھ (انڈس)..... 212
پرندے/جانور..... 213
تاریخ..... 213
آبادی کے اجزائے ترکیبی، زبان اور بولی..... 217
نمایاں نسلی گروہ اور قبائل..... 217

منگول، مون 217
سادات، مقپون، چترالی، پٹھان، مقامی خصوصیات 219
عورتوں اور مردوں کے نام 220
پلاپو، کسر، اذوق، پھُر پھُر، کھور با 222
روایتی تعمیر و آرائش اور رہن سہن، طرز تعمیر عمومی 224
قلعہ کھر پوچھے 226
چوپال، مسجد پچھن، جھیل اور تالاب 227
لوہار، موچی 230
کمہار، سنار، درزی، موسیقار 232
پہلا ادبی دور 233
رسم و رواج اور دیگر روایات 235
اموات 239
رسم قرآن خوانی، کھور ہرکق 241
باراتی 243
گرون زان 243
توہمات اور جب بھوت 244
شکار سے متعلق توہمات اور روایات 246
بلتی اور شنا زبان میں دنوں کے نام 251
عرس اور میلے 253
عیدیں 254
ختم قرآن 254
یوم آزادی، جشن نوروز 255
مے پھنگ (آتش بازی) 255
مویشیوں کی بالائی چراگاہوں کی طرف منتقلی 257
نوجوانوں کی تفریحی ضیافت 259
کھہ ستون (برف باری کی رسم) 260
لوک داستانیں، کہانیاں اور روایات 261
کیسر داستان کا خلاصہ 263
شین، بروشو، خوریا ہور، کشمیری 218
علم و ادب 219
مقامی کھانے اور آداب دسترخوان، زان، ہرژب کھور 221
چاپھے، بلے، پھورس، نمکین چائے، خندہ 223
طرز تعمیر خصوصی 225
باغات، عوامی پیشے اور دستکاریاں، کاشتکار، گلہ بانی 228
بڑھئی 229
نائی، اخوند، جولاہا 231
مالکان پن چکی، تاجر، ادبی اور ثقافتی شخصیات 233
دوسرا ادبی دور، تیسرا اور موجودہ دور 234
طرز معاشرت اور عادات خصائل 235
کھہ میتھل، رسم نکاح خوانی، شادی کی تاریخ کا تعین 241
تھودمہ، سیر موسینگ اور مار بجوس، سکون تھق، بل تھود 242
کھہ زوس 243
بوس زان 243
شکاریات 246
بلتی تقویم کیلنڈر 248
ناپ تول کے مقامی پیمانے 252
مجالس محرم و اسد اور دیگر عرس مقدسہ 253
حج بیت اللہ و زیارت مقامات مقدسہ 254
شب برات 254
سون بور (بوائی) 256
خوشیوں کا میلہ 257
اونگ چوس 258
لوسر یا ستون پھیوک 259
پھولوں کا تہوار 260
داستان کیسر (پس منظر) 263
کیسر سے منسوب تمثیلی آثار 269

رگیالو چولو بزانگ اور دوسروں والا کبوتر..... 270
شینگ کھنی خسوسبو..... 280
لوک شاعری..... 283
گلیشیر کی پرورش..... 286
موجودہ دور کا ایک طلسمی واقعہ..... 287
محبّ وطن چڑیل کی کہانی..... 289
لوک رومان، ژھن تھغ ینگ..... 290
لوریاں..... 292
پہیلیاں..... 293
موسیقی قبل از اسلام..... 295
بلتی چھوس..... 295
بروق چھوس ،مون چھوس..... 295
بان چھوس، بودھ چھوس، موسیقی بعد از اسلام..... 295
سینو پا، میندوق بلتمو، پھورگون کار،..... 297
لنگ کار، افغانی، چلاہو، ستغراء..... 299
موسیقی کے آلات اور ان کا استعمال..... 300
لوک لباس، زیورات، سامان آرائش..... 304
پولو کھیل کی تاریخ..... 306
بلتستان میں پولو کھیلنے کے خاص دن..... 309
پولو کی تہمیدی رسومات..... 310
بچوں کے کھیل..... 312
لوک علاج کی جڑی بوٹیاں..... 315
شینگ کھکن چندن..... 276
ایک شکاری کی کہانی..... 282
برق مایور چو، تیستے مراد..... 284
منافو..... 285
دو شکاریوں کا واقعہ..... 285
سد پارہ جھیل سے منسوب ایک لوک روایت..... 288
گونگما غور ہرزے کا واقعہ..... 290
بروشال پا، شیلے سوک..... 291
دعائیہ کلمات..... 294
لوک ساز، لوک ناچ اور گیت..... 294
بلتی موسیقی چھوس کی دھنیں..... 295
کھچے چھوس..... 295
حریب، نوبت..... 296
باسن، رقص کی دھنیں، چھوغو پراسول، گاشوپا..... 297
تھین کار، بورا کار، پھوتو نگ کار، لم کار..... 197
دھن ستغراء کی قسمیں..... 299
کلاسیکی لوک گیت..... 301
جسمانی کھیل اور لوک تماشے..... 306
پولو سے متعلقہ موسیقی..... 308
گھوڑے سے متعلق بلتی ضرب المثال اور محاورے..... 309
دیگر کھیل تماشے، شرطیہ پولو..... 311
کشتی، ٹاپو، چھولو، متفرق کھیل، لوک علاج، دم درود، ٹوٹکے..... 314

چترال:

حدود اربعہ / جغرافیہ..... 317
فصلیں، تاریخ..... 318
زبانیں، چترال کی آبادی میں قبائل اور زبانوں کی تقسیم..... 323
کھانوں کی اقسام..... 326
روایتی دستکاریاں اور گھریلو صنعتیں..... 330
جانور اور جنگلات..... 317
آبادی اور زبانیں، قبائل..... 320
مختلف مواقع پر پکائے جانے والے کھانے..... 326
لوک پیشے..... 328
ادبی اور ثقافتی شخصیات..... 333

زبانیں، چترال کی آبادی میں قبائل اور زبانوں کی تقسیم 323
کھانوں کی اقسام 326
روایتی دستکاریاں اور گھریلو صنعتیں 330
طرز تعمیر اور رہن سہن 335
لباس اور زیورات 340
روایتی چترالی ستار (سیتھار) 345
بیٹی کی رخصتی کا گیت 348
لوک اسلحہ اور ہتھیار 351
بزکشی 354
ہیم بڑا خودک 355
بامپھو غاڑ 356
پائے دریک 357
دوردیتی اشٹوک 357
توہمات 357
کنونانگ 359
یورمس بی بی 360
انسائیکلو پیڈیا کے لکھاریوں کا مختصر تعارف:
محمد حسن حسرت 362
جمشید خان دکھی، شیر باز علی خان برچہ 364
فہرست کتابیات/ماخذات (حصہ شنا) 365
فہرست کتابیات/ماخذات (حصہ بلتستان) 374
کتابیات حصہ چترال 382
مختلف مواقع پر پکائے جانے والے کھانے 326
لوک پیشے 328
ادبی اور ثقافتی شخصیات 333
رسم ورواج اور تہوار 336
لوک ساز 345
چند مشہور گیت 348
بیٹی کا مرثیہ ماں کی طرف سے 349
لوک کھیل اور جسمانی کرتب 353
استور غاڑ 354
اوغ جان 355
شیر مُو 356
کڑ بوکی 357
لوک روایات، کہانیاں 357
لوک داستانیں 358
لوک کہانی (کڈیم کڈاک) 359
ڈاکٹر عنایت اللہ فیضی 363
فہرست کتابیات/ماخذات (حصہ بروشال ہنزہ، نگر، یاسین) 374
کتابیات اور حوالہ جات حصہ بلتستان 379

دیباچہ

پاکستان 14، اگست 1947ء کو ایک آزاد مملکت کی حیثیت سے وجود میں آیا۔ وہ علاقے جو آج مملکت پاکستان کا حصہ ہیں نہ صرف دنیا کی قدیم ترین تہذیب وثقافت کے وارث ہیں بلکہ موہنجوداڑو، ٹیکسلا، ہڑپہ اور گندھارا جیسی ہزاروں سالہ قدیم تہذیب وتمدن کے نقوش اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہیں۔ یہ دنیا کا واحد ملک ہے جو طویل سیاسی جدوجہد اور نظریاتی بنیادوں پر قائم ہوا۔ علامہ ڈاکٹر محمد اقبال نے ایک علیحدہ مملکت کے قیام کا خواب دیکھا اور قائداعظم محمد علی جناح نے اسے تعبیر دی۔ مگر وہ خواب اور تعبیر ہماری منزل نہیں، یہ منزل پر پہنچنے کا راستہ تھا۔ اُس خواب کو حقیقت میں بدلنے اور منزل پر پہنچنے کے لئے اس دھرتی اور اس مٹی سے پھوٹنے والی لوک ریت اور روایات کے اُن راستوں کو اختیار کرنا ہوگا جو ہمارے اسلاف کا خاصہ تھیں۔

پاکستانی تہذیب وتمدن قدیم وجدید کا حسین امتزاج ہے۔ اس علاقے میں اسلام کی آمد نے اس قدیم تمدن، اس کے تہذیبی اور فطرتِ انسانی اور اس کی روحانی قدروں کی نفی نہیں کی بلکہ ان قدروں کے ہم آہنگ اجزاء کو پروان چڑھایا، انہیں زندہ رہنے میں مدد دی اور پاکستانی تہذیب وثقافت کو جدید تقاضوں سے ہم آہنگ کر کے پاکستانیوں کو ایک ایسی وحدت کی لڑی میں پرو دیا کہ آج پاکستان کا ہر علاقہ متنوع، رنگارنگ اور جداگانہ ثقافتی رنگ کے باوجود وحدت کی ایسی لڑی سے منسلک ہے جس کی آبیاری اسلامی روحانی قدروں سے ہوتی ہے۔ اس انسائیکلوپیڈیا میں پاکستانی ثقافت کے ایسے اجزائے ترکیبی کے نقوش کی تفصیل دی گئی ہے جو اس سے قبل کبھی یکجا نہیں کیے گئے۔

لوک ورثہ نے پاکستان کے ثقافتی انسائیکلوپیڈیا کی تیاری میں برسہابرس صرف کیے ہیں۔ اس سلسلے میں نہ صرف یہ کہ پاکستان کے دشوار ترین علاقوں کا سفر کیا گیا بلکہ ہر علاقے کے لکھاریوں، دانا اور معتبر لوگوں کے ساتھ میٹنگ کر کے انہیں اس کام میں باقاعدہ شامل کر کے اسے موجودہ مقام تک پہنچایا گیا ہے۔ یہ کہنا کہ یہ کام مکمل ہو گیا ہے درست نہ ہوگا، ابھی اس میں بہتری اور ترمیم واضافے کی بہت گنجائش ہے اور امید ہے کہ اس ماڈل کو مدنظر رکھتے ہوئے ہر علاقے کے لکھاری، دانشور اور محقق قلمی تعاون اور مشوروں سے نوازیں گے۔

ثقافتی انسائیکلوپیڈیا پر کام کے لیے ابتدائی طور پر چند رہنما اصول ترتیب دیئے گئے تھے جن کا مقصد لکھاری کو یہ سمجھانا تھا کہ یہ دیگر انسائیکلوپیڈیا سے فرق نوعیت کا کام ہے اور اس میں تاریخ اور جغرافیہ سے زیادہ فوک لور پر فوکس رکھنا ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ ہم اپنی اس کوشش میں کسی حد تک کامیاب ہوئے۔ اس سلسلے میں لکھاری کی سہولت کے لئے درج ذیل گائیڈ لائن (رہنما اصول) ترتیب دیئے گئے تھے۔

علاقے کا نقشہ اور حدودِ اربعہ: علاقے کا ایک بہترین نقشہ جو ثقافتی شناخت اور اسکے مخصوص جغرافیائی خدوخال کو سامنے رکھ کر بنایا جائے جیسے ساندل بار، پوٹھوار، تھرپارکر اور چولستان کا نقشہ وغیرہ۔ جو علاقے کی مخصوص لسانی اور ثقافتی شناخت کی حد بندی کو واضح کرتا ہو۔ اور کچھ اعداد وشمار وغیرہ۔ شہروں اور قصبوں کے نام شمالاً جنوباً اور مشرق

مغرب میں علاقے، دریا پہاڑ وغیرہ۔

جغرافیہ: جغرافیائی اعتبار سے صرف تین یا چار پیراگراف کافی ہونگے لیکن اس میں مقامی سطح پر چرند پرند، مشہور مقامات، جھیلیں، دربار، درگاہ، دریا، مزار، موسم، فصلیں، جڑی بوٹیاں، درخت اور مقامی خصوصیات وغیرہ۔ جغرافیے کا فوک لور کے حوالے سے بیان پرزور ہونا چاہیے جیسے سوہنی مہینوال کا دریائے چناب یا وارث شاہ کا ملکہ ہانس، ہیر رانجھے کا تخت ہزارہ اور دوسرے کئی طرح کے جغرافیائی ثقافتی حوالے۔

تاریخ: تاریخ کے بارے میں مختصراً دو یا تین پیراگراف ہوں۔ ان میں فوک لور کے پہلو کو نمایاں جگہ دی جائے مثلاً کسی مشہور قصے کے کرداروں کا ذکر، ادبی فنی ثقافتی، تاریخی شخصیات اور مقامات وغیرہ۔ انتہائی اہم تاریخی اور ضروری حوالے اگر ہوں تو انہیں مختصراً بیان کر دیا جائے۔

آبادی کے اجزائے ترکیبی، زبان اور بولی: آبادی کے بارے میں پیراگراف میں نسلی اور لسانی معلومات درج کی جائیں جیسے بلوچ کافی تعداد میں ہیں۔ فلاں فلاں قبیلے اور فلاں فلاں زبانیں بولتے ہیں ان کے عادات و خصائل وغیرہ اور اعداد و شمار۔

ہر قبیلے پر ایک چھوٹا پیراگراف علیحدہ علیحدہ لکھیں اس کے علاوہ اگر علاقے میں خانہ بدوش قبیلے آتے ہوں تو انہیں بھی شامل کریں۔ قبیلوں اور زبانوں کا مختصر تاریخی پس منظر بیان کریں۔

مقامی خصوصیات: علاقے کی مشہور مخصوص ثقافتی شناخت کیا ہے۔ مشہور چیزیں مقامی خصوصیات کے زمرے میں آتی ہیں جیسے قصور بابا بلھے شاہ کی وجہ سے یا وہاں کے خاص کھانوں کی وجہ سے۔ اسی طرح اور علاقے مشہور ہیں جیسے کہیں جوتے اور کھیس مشہور ہوتے ہیں کہیں کوئی بہادر آدمی نے نام پیدا کیا ہوتا ہے وغیرہ۔ علاقے کی مخصوص شناخت یا نام کس بناء پر ہے، اس پر زور ہونا چاہیے۔

علاقے کی ثقافتی مشہور شخصیات جیسے دلا بھٹی، عالم لوہار، آدم خان، بالی جٹی، اور مشہور ادبی شخصیات جیسے وارث شاہ، خوشحال خان خٹک وغیرہ۔ ہر شخصیت اور اس کے ہنر یا پیشے کے متعلق الگ پیرگراف میں ذکر کریں۔

عورتوں اور مردوں کے نام:

مقامی کھانے: یہ باب مندرجہ ذیل حصوں پر مشتمل ہونا چاہیے۔

۱۔ کھانے کے طریقے، اہم رسم و رواج اور آداب

۲۔ خاص خاص پکوان

۳۔ مہمانداری کے طریقے اور سلیقے

۴۔ مٹھائیاں، پھل اور مشروبات۔

۵۔ میزبانی کے طریقے اور اداب دسترخوان۔

مقامی کھانوں کے بارے میں تفصیل کے ساتھ لکھا جائے۔ ان کے اجزائے ترکیبی اور لوک روایت وغیرہ۔ صرف مقامی سطح کے کھانوں کے بارے میں جانکاری مہیا کی جائے جیسے ساگ، سبجی، مٹھائیاں، مشروبات اور دیگر چیزوں کے استعمال کے مقامی طریقے، خوشی غمی کے خاص پکوان وغیرہ۔

روایتی تعمیر و آرائش اور رہن سہن: یہ باب مندرجہ ذیل حصوں پر مشتمل ہوگا۔

۱۔ لوگوں کا رہن سہن، گھر، تعمیر مکان، سامان آرائش، گھریلو سامان

۲۔ طرز تعمیر عمومی

۳۔ طرز تعمیر خصوصی

۴۔ دیگر تعمیرات کنویں، باولیاں، باغ، تالاب، کاریز، چوپال، حجرے، جھونپڑیاں، تنبو، وغیرہ۔

۵۔ علاقے کی اہم تاریخی اور ثقافتی عمارات وغیرہ۔

علاقے کی روایت، فن تعمیر اور آرائش کے بارے میں مکمل باب اہم چیزوں یا تعمیر کے نقشے اور تصویریں بھی مہیا کی جائیں۔ عمومی گھر کیسے ہیں، علاقے کے بڑے گھر تعمیراتی خصوصیات، حویلیاں وغیرہ۔ فن تعمیر کے مختلف فنون کی تفصیل، مثلاً لکڑی کا کام نقش گری، سجاوٹ کے دوسرے ہنر وغیرہ۔

عوامی پیشے اور دستکاریاں: مقامی اور روایتی پیشوں پر تفصیں سے ایک باب لکھیں جس میں مقامی ہنرمندوں، کمہار، نائی، موچی، اور دیگر پیشوں اور ان پیشوں سے وابستہ لوگوں کے بارے میں معلومات۔

مثلاً کس پیشے کے لوگ کس قوم سے تعلق رکھتے ہیں ان کا تاریخی پس منظر وغیرہ۔ متعلقہ ہنرمندوں میں پیشوں کے رجحان، اسباب وغیرہ۔ اور علاقے کی دستکاریوں پر الگ الگ پیراگراف لکھئے۔ اس کے علاوہ خواتین گھروں تک محدود ہو کر اگر کوئی ہنر جانتی ہوں اور کام کرتی ہوں تو اس پر معلومات درج کریں۔

رسم و رواج: رسومات اور رسم و رواج کے بارے میں تفصیلی باب جس میں

شادی بیاہ، پیدائش اور موت،

ختنہ کی رسم ان کے علاوہ متعلقہ علاقے کی خصوصی رسم مثلاً،

گھر میں داخل ہونے کی رسم،

چھوٹے بڑے کے بارے میں رسومات، آداب وغیرہ۔

حال دینا حال لینا، میل جول

دوستی و دشمنی کی رسومات

دوستی و دشمنی کی رسومات

سفر پر جانے کی رسومات،

تعویذ باندھنے کی رسم اور اس طرح کی دیگر رسومات وغیرہ۔

مردوں عورتوں کی گھریلو ذمہ داریاں اور مشاغل

بوڑھوں، بزرگوں کے مشاغل،

بچوں کے مشاغل۔

لوک ساز، گیت اور ناچ: الگ پیراگراف میں فن رقص و موسیقی اور سازوں کے بارے میں عمومی تعارف لکھیں پھر الگ ایک پیرا میں گیت۔ ناچ اور ساز پر تفصیلی نوٹ لکھیں۔ یہ مقامی رقص اور موسیقی کے بارے میں مکمل باب ہو جس میں ہر ساز کے مقامی نام، مشہور رقص اور گیت اور کن تہواروں اور موقعوں پر یہ پیش کئے جاتے ہیں۔ مشہور گیتوں کے مختصر بول، سازوں اور ناچوں کی تصاویر بھی مہیا کریں۔

لوک داستانیں، کہانیاں، باتیں اور روایات: لوک داستانوں، کہانیوں، قصوں اور روایات کے بارے میں تفصیلی باب جس میں مشہور مقامی قصہ کہانیوں کا مختصر خلاصہ دیا جائے۔ مقامی اکھان اور رومان دیئے جائیں، واریں، جگ نامے، رزمیہ داستانیں بیان کی جائیں۔

لوک لباس اور زیورات اور دیگر سامان آرائش: لباس اور زیورات، عورتوں کے لباس:۔ اس باب میں زنانہ اور مردانہ، بچگانہ مقامی روایتی لباسوں کی قسمیں وہ کن خاص موقع پر پہنے جاتے ہیں، عام لباس کیا ہے، بنائے گئے زیورات اور لباس و آرائش کی تفصیلات وغیرہ۔

مردوں کے آرائشی لباس، اسلحہ جات، کلہاڑی، تلوار، ڈھال وغیرہ اور ان کے باندھنے کے طریقے یا دوسرکسی قسم کا آرائشی لباس و اسلحہ وغیرہ۔ عام لباس، مختلف پیشوں سے تعلق رکھنے والوں کا لباس،

جانوروں کی آرائش اور زیورات جیسے بیل کے گلے میں پٹے، اونٹ اور گھوڑے کا سامان آرائش وغیرہ۔ بچوں کے لباس، عمومی لباس، خاص مواقع کے لباس۔

لوک علاج، دم درود اور ٹونے ٹوٹکے: لوک علاج مختلف بیماریوں کے لئے مقامی سماج کے علاج، جو کہ معمولی قسم کی جڑی بوٹیوں وغیرہ یا دم درود سے کئے جاتے ہوں، ٹونے ٹوٹکے لوک علاج کی روایت اور قصے کہانیاں وغیرہ۔ منتیں، پیری مریدی، ڈاکٹری، حکمت، سنیاسی علاج۔

عرس اور میلے: ایک باب جس میں چھوٹے بڑے میلے اور تہوار متروک قسم کے میلے، موسمی تہوار بھی موجود ہوں جیسے بیساکھی کا تہوار، اقلیتوں کے میلے، پنجہ صاحب کا میلہ، ایسٹر اور کرسمس وغیرہ۔ خانقاہوں، مزاروں کی تفصیل، ان کی انتظامیہ اور تنظیم کے بارے میں معلومات وغیرہ۔

جسمانی کھیل اور لوک تماشے: بچوں اور بڑوں کے مقامی کھیل اور مختلف لوک تماشے، جیسے نٹ، بازی گر وغیرہ۔ قدیم روایتی سانگی، لوک تھیٹر، نقال، بہروپیے۔ نیزہ بازی، کبڈی، کشتی وغیرہ۔
خواتین کے کھیل، اور مشاغل، چغل خوری، بدخوہیاں وغیرہ۔

انسائیکلو پیڈیا میں کوشش کی گئی ہے کہ ثقافت سے متعلق تمام ضروری معلومات مختصراً اور جامع انداز میں بیان کر دی جائیں۔ ساتھ ہی موضوع سے متعلق تصاویر بھی فراہم کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ سلسلہ قراقرم، ہمالیہ اور ہندوکش جلد۔ ا، میں (۱) غذر، گلگت، دیامر (۲) ہنزہ، نگر (۳) چترال اور (۴) بلتستان کے علاقوں سے متعلق مواد شامل ہے۔ قارئین کی سہولت کے لئے فہرست میں ذیلی عنوانات بمعہ صفحہ نمبر دیئے گئے ہیں جبکہ انسائیکلو پیڈیا کے آخر میں اُن تمام ماخذات کو لکھ دیا گیا ہے جن سے استفادہ کر کے مصنفین نے انسائیکلو پیڈیا ترتیب دیا۔

اس کام میں جو لکھاری ہمارے ساتھ شامل ہیں، میں ذاتی طور پر اور ادارے کی جانب سے اُن کا ممنون ہوں۔ خاص طور پر شمالی علاقہ جات پر کام کے حوالے سے، اُن دشوار گزار اور دور دراز علاقوں میں کام کرنا خاص طور پر ایسے علاقے جن سے متعلق آج تک کوئی تحریری مواد دستیاب نہیں، بے حد مشکل کام ہے۔ جناب محمد حسن حسرت، اُن کے معاون قلم کار شیر باز علی خان برچہ اور جمشید خان دکھی، چترال پر کام کے حوالے سے ڈاکٹر عنایت اللہ فیضی، آپ تمام حضرات کا تعاون انسائیکلو پیڈیا سلسلہ قراقرم، ہمالیہ اور ہندو کش، کی اشاعت کا سبب بنا۔ یقیناً اب بھی اس میں بہتری اور اضافے کی بڑی گنجائش ہے۔

مجھے اُمید ہے کہ پاکستان بھر کے لکھاری خاص طور پر ثقافت کے حوالے سے لکھنے والے اس کام پر مثبت ردعمل کا اظہار کریں گے اور ثقافتی انسائیکلو پیڈیا کی دیگر جلدوں کے سلسلے میں ہمیں اُن کا قلمی تعاون حاصل رہے گا تا کہ پاکستان کا ثقافتی انسائیکلو پیڈیا قومی وحدت کی علامت بن جائے اور دنیا جان سکے کہ پاکستانی اپنی منفرد، متنوع اور جداگانہ ثقافتوں کے باوجود محبت اور وحدت کی ایک مضبوط لڑی کا حصہ اور دنیا میں امن، محبت اور بھائی چارے کے فروغ کے پیامبر ہیں۔

عکسی مفتی
اکتوبر ۲۰۰۴ء

فوک لور اور ثقافتی اقدار کا شعور

ایسا کون ہے جسے زندگی اور موت، شادی بیاہ، غمی خوشی اور پیدائش وغیرہ کی عمومی رسومات کا علم نہ ہو یا وہ عشق و محبت کے گیتوں، بزرگوں اور سرکردہ لوگوں کے اقوال، شجاعت و بہادری کی لوک داستانوں، تعویز گنڈوں، عام سماجی زندگی کے طور طریقوں جن میں دوپٹہ رنگنا، ڈالی بھجوانا، تعویذ اور قیمتی پتھر پہننا، گھر کی دیواروں پر لپائی کرنا اور لوک میلوں وغیرہ سے واقف نہ ہو، ان سب باتوں کا ہماری لوک زندگی سے گہرا تعلق ہے اور یہ سب لوک ادب کے شعبے کے علم پر مبنی ہے۔

سب کو علم ہے کہ لوک داستانیں کیا ہیں ہم جبلی طور پر ان کے مفہوم سے آشنا ہیں۔ تاہم جیسے پانی میں مچھلی بغیر کسی کوشش کے رہتی اور تیرتی ہے اسی طرح ہم بھی شعوری طور اپنی لوک زندگی کا ادراک نہیں رکھتے۔ یہی وجہ ہے کہ لوک زندگی اور داستان کی باقاعدہ تعریف ایسی ہی ہے جیسے کسی سے خوراک و لباس کی افادیت معلوم کرنا۔ ایک فلسفی اگرچہ زندگی کی تعریف بتا کر لکھتا ہے تاہم ایک عام آدمی کو صرف زندگی گزارنے سے غرض ہے۔ چنانچہ وہ ان گتھیوں کو سلجھانے کے بجائے صرف اپنی زندگی گزار رہا ہے اور زندگی بہتے پانی کی طرح ایک مخصوص رفتار سے رواں دواں ہے۔

لوک زندگی کیا ہے؟

جب کوئی سماجی طبقہ کسی مخصوص جگہ پر صدیوں ایک مخصوص طرز سے زندگی گزارتا ہے تو اجتماعی زندگی کا ایک خاص انداز جنم لیتا ہے۔ یہ اجتماعی زندگی اپنے تمام سماجی رویوں، جذبات و احساسات کے ساتھ اس طبقے کی لوک یا عمومی زندگی کا مظہر ہوتی ہے۔ اسکی بیحد اہمیت ہے۔ ایک طرف تو لوک طرز زندگی کسی طبقے کی پہچان ہوتی ہے دوسری طرف وہ اسے دیگر طبقات سے ممتاز بناتی ہے اور اس طبقے کو ایک لڑی میں پروئے رکھتی ہے۔ مشترکہ لوک زندگی کے رویے انسانوں کو نہ صرف اکٹھا رکھنے میں معاون ثابت ہوتے ہیں بلکہ وابستگی کا احساس بھی فراہم کرتے ہیں۔ یہ احساس بالکل ویسا ہی ہے جیسا کہ کسی کے دل میں خونی رشتوں کو دیکھ کر جاگتا ہے۔ ایک نظر نہ آنے والا فطری احساس جس کے تحت ایک طبقہ یا کمیونٹی اپنے افراد کو اس رشتے سے وابستہ رکھتی ہے۔ تاہم یہ وابستگی جبری یا شعوری نہیں ہوتی اور نہ ہی یہ کسی سیاسی قومیت کے احساس کی مرہون منت ہوتی ہے۔ یہ ایک جبلی احساس ہے جو صدیوں کے ایک جیسے سماجی رویوں اور مشترکہ سوچ سے جنم لیتا ہے۔ اسکا وہی مقام ہے جو انسانی جسم میں خون کا ہے۔

ماضی کو محفوظ کرنے کے حوالے سے بھی لوک رویوں کا ایک اہم مقام ہے۔ اسی لئے انہیں مقبول ماضی یا گزشتہ ادوار کی اہم نشانیوں کا بھی نام دیا جاتا ہے۔ عموماً یہ سمجھا جاتا ہے کہ یہ چیزیں زیادہ دیر چلنے والی نہیں اور وقت کے ساتھ ساتھ معدوم ہو جائیں گی۔ بعض لوگ انہیں توہمات کے نام سے بھی یاد کرتے ہیں۔ تاہم ان کے باقی رہنے یا بقاء کی صلاحیت کی وجہ سے انہیں زبانی یا سینہ بہ سینہ روایات کہا جاتا ہے جو باپ سے بیٹے کو نسل در نسل منتقل ہوتی رہتی ہیں۔

بعض کا خیال ہے کہ لوک رویے یا طریقہ کار محض ادب یا لٹریچر ہے جو کہ زبانی منتقل ہوتا ہے۔ مگر یہ اپنی فہم کیلئے ان افراد کا مرہون منت ہے جو ادب اور لوک رواج دونوں کا علم رکھتے ہوں۔ دھوتی اور پگڑی باندھنے سے لیکر پختہ اینٹوں سے چنوارے کی تعمیر تک تمام چیزیں لوک ادب اور روایات کا حصہ ہیں۔

لوک رویوں کی زبانی ابلاغ سے تدوین وتبلیغ کی وجہ سے بعض لوگوں نے لوک داستانوں کو زبانی فن کا نام بھی دے دیا ہے۔ تاہم اسکی یہ تعریف تمام تر غیر زبانی چیزوں یعنی رقص، سوت کاتنا اور سماجی رسوم ورواج وغیرہ کا سہارا لیکر ہم پوری انسانی داستان بیان کر سکتے ہیں۔ ہمیں اس مقصد کیلئے اپنے لاشعور کے پوشیدہ اور اعلیٰ وادنیٰ گوشوں کو کام میں لانا پڑے گا۔ انسانی ذہن کے بعض گہرے اور عمیق پہلوؤں کی سب سے بہتر نمائندگی لوک ادب ہی کرتا ہے۔ لوک ادب کی بڑائی یہ ہے کہ یہ معاشرے کی مجموعی عکاسی کرتا ہے۔

لوک طرز زندگی صرف الفاظ کا مجموعہ نہیں بلکہ وہ زندگی کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کرتا ہے۔ اس میں نہ صرف سماجی زندگی کے رسوم و رواج ہیں بلکہ تمام علوم وفنون شامل ہیں۔ ان میں دریائے سندھ کی کشیدہ وکندہ کشتیاں، مال کوہستان کے ''جاج'' بلوچ شیشے کے کام والے لباس، سندھی اجرک، ہاتھ سے بنی لنگی اور اس قسم کی دیگر بہت سی اشیاء شامل ہیں۔

اسکے علاوہ، دھمال، جوگی کی بین، نٹوں کی ''جنکا حرکات''، بہروپیوں کے سوانگ، مداری کے تماشے اور سندھی ملاکھڑا بھی وادی سندھ کی لوک زندگی کا اہم جزء ہے۔

کوئی ماں جب اپنے بچے کو لوری سناتی ہے، جب سکول کے بچوں کو کوئی بجھارت بتائی جاتی ہے، جب کوئی قوال قوالی سناتا ہے، یا محفل سماع سجائی جاتی ہے، جب لوگ خوشی کے موقعوں پر گائے جانے والے سہرے اور گیت گاتے ہیں قصہ خواں، بھیراں اور میراثی لوک گیتوں کو چھیڑتے ہیں اور ماں اپنی بیٹی کو سینا پرونا اور کشیدہ کاری سکھاتی ہے، گاؤں کا لوہار اپنے کسی شاگرد کو اوزاروں کا استعمال سکھاتا ہے، کمہار بھٹے میں اینٹیں اور زرگر زیورات بناتا ہے تو ہمیں اُس لوک ریت کے عظیم الشان ورثے کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے گزرتا وقت جس کی اہمیت کم نہیں کر سکا۔

لوک رسوم ورواج ایک طبقاتی مظہر ہے۔ یہ کسی ایک آدمی یا گروہ کی اختراع نہیں صدیوں پر محیط ایک مسلسل عمل کے بعد کہیں جا کر ساری انسانیت یا تمام تر طبقے کی نمائندہ ہوتی ہیں۔ تاہم ہمیں ایک فرق روا رکھنا ہوگا کہ غالب کی غزل یا چغتائی کی مصوری اپنی تمام تر مقبولیت کے باوجود لوک ریت کا حصہ نہیں۔ یہ ایک فرد کی اعلیٰ صلاحیتوں کی مظہر ضرور ہیں مگر ڈیرہ غازی خان کے چرواہوں کے گیت، داؤد کے چرواہوں کے نڑ بیت، پنجاب کی لڑکیوں کا سوت کاتتے ہوئے ترنجن گانے کا دلربا انداز، خوبصورت رنگوں سے مزین کیلنڈر، ٹرکوں اور تانگوں پر بنی اپنی نوعیت کی انوکھی تصویریں اور پشاور کے قصہ خوانی بازار میں چھیڑی گئی داستانیں سب ہی لوک ریت کے شاہکار ہیں، یہ اجتماعی زندگی کا حصہ اور لوگوں کے ایک گروہ کی تخلیق ہیں جو اس طبقے کے ہر فرد کا ورثہ ہے۔

عبدالرحمٰن چغتائی کے کسی فن پارے کی اصل قدر و قیمت کا اندازہ لگانے کیلئے آرٹ کی باریکیوں کا علم اور غالب کی کسی غزل کو سمجھنے کیلئے موسیقی اور اردو ادب سے آشنائی ضروری ہے، بیگم اختر کی کسی غزل کی گائیگی سے لطف اندوز ہونے کیلئے اردو ادب اور کلاسیکی موسیقی دونوں کا علم چاہیے۔ مگر لوک ریت سے لطف اندوز ہونے کیلئے کسی تربیت یا رسمی تعلیم کی ضرورت نہیں یہ ایک خودرو یا قدرتی حس ہے جو بذات خود زندگی کے دامن سے پھوٹتی ہے۔

لوک ریت کی تخلیقات اگرچہ بے نام ہوتی ہیں تاہم وہ صدیوں سے سینہ بہ سینہ چلی آنے والی روایات کی مظہر ہوتی ہیں۔ مگر ان کے پھیلاؤ کا طریقہ کار اور ان کا ماخذ ہمیشہ زبانی روایات پر مشتمل نہیں ہوتا، یہ بات وادی سندھ کے تہذیبی ورثے کے لئے زیادہ صحیح ہے۔

کوئی لوک گیت چاہے کسی ۱۸ ویں صدی کے صوفی شاعر کے قلم کی تخلیق ہو، وہ بھی موجودہ دور میں مکمل طور سے اپنا زبانی وجود برقرار رکھ سکتا ہے۔ اسی طرح ہیر رانجھا، سسی پنوں اور سوہنی مہینوال جیسی معروف رومانی داستانیں جواب کتابوں میں بھی محفوظ ہیں مگر یہ کتابوں میں نہ بھی محفوظ ہوتیں تو ان کے وجود کو کوئی خطرہ لاحق نہیں تھا۔ کیونکہ وہ زبانی روایات کی صورت لوگوں کے سینوں میں بھی محفوظ ہیں اور میراثی، بھات وغیرہ انہیں اکثر دھراتے رہتے ہیں۔ اسی طرح کسی لوک داستان کو اسلام آباد یا کراچی میں کتابی شکل میں محفوظ کرنے کے باوجود بھی اس کی لوک اہمیت میں کمی واقع نہیں ہوتی۔

چنانچہ لوک ادب زیادہ تر زبانی روایات پر مشتمل ہے جس نے اسے جہاں پایا اور جیسا پایا محفوظ کرلیا۔ یہ صرف زبانی ادب نہیں بلکہ یہ انسان کی مادی نظریاتی زندگی کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کرتا ہے۔ یہ چاہے کتاب کی شکل میں نمودار ہو مگر اُسے کتابی شکل میں منجمد نہیں ہونا چاہیے۔ یہ الفاظ پر مشتمل ہونے کے باوجود بھی انسانی زندگی کے دیگر ''غیر لفظی'' یعنی (non verbal) پہلوؤں پر محیط ہے۔ اسکی عظمت اس میں ہے کہ یہ انسان اور معاشرے کو ایک شناخت عطاء کرتا ہے اور انہیں مکمل کرتا ہے۔

پاکستان ایک ترقی پذیر ملک ہے۔ تاہم نہ تو یہ مکمل طور سے صنعتی ہے اور نہ ہی جدید، اگرچہ اس میں تیزی سے تبدیلی آرہی ہے عجیب بات یہ ہے کہ کم ترقی یافتہ ہونے کے بعض اپنے فوائد ہیں۔ پاکستانی لوک ثقافت اب بھی ایک زندہ روایت ہے جس پر پاکستانیوں کی ایک بڑی تعداد عمل پیرا ہے اور جو عام آدمی کی زندگی کے تمام گوشوں میں بڑی نمایاں نظر آتی ہے مگر لوگوں کو اس لوک روایت کی شان وشوکت کا صحیح ادراک ہی نہیں۔

پاکستان کا لوک ادب صدیوں کی طبقاتی زندگی کا مظہر ہے۔ یہ کسی فرد یا گروہ کی اختراع نہیں بلکہ یہ صدیوں سے جاری بتدریج عمل اور معاشرے کے اجتماعی طور طریقوں کا عکاس ہے۔ یہ اپنے اندر انسانی زندگی کی حکمتوں کو سموئے ہوئے ہے۔ مگر یہ ماضی نہیں۔ بلکہ ماضی حال اور مستقبل میں اپنے ہونے کے شعور کا پرتو ہے۔ انسان نے شعور اور آگہی کی یہ منزلیں صدیوں میں طے کی ہیں۔ لوک رواج نہ صرف انسانوں کو مضبوط رشتوں میں باندھنے بلکہ ابلاغ عامہ کا ایک انتہائی اہم اور موثر ذریعہ بھی ہیں جسکی حقیقت سے پوری دنیا آگاہ ہے۔ ایک ایسے ملک میں جہاں شرح خواندگی پاکستان جتنی کم ہو اور جسکی زیادہ تر آبادی کا انحصار زراعت پر ہو، لوک رواج ایسے معاشرے کے سماجی خدوخال وضع کرنے میں نہایت اہم کردار ادا کرتے ہیں اور انکی اہمیت ابلاغ کے دیگر ذرائع سے بہت زیادہ ہے۔

یہ حقیقت پاکستانی لوک ادب کو ایک عملی چیز بناتی ہے۔ یہ ایک زندہ ورثہ ہے یہ ورثے میں ملنے والی چیزوں نہ کہ وراثت پر مشتمل ہے۔ اس چیز کی نمایاں اہمیت ہے۔ ہمیں اپنے بارے میں شعور کو ہر چیز پر مقدم رکھنا چاہیے۔

نسلی، علاقائی اور جغرافیائی حقائق سے آنکھیں بند نہیں کی جاسکتیں اور پاکستان سندھی، بلوچی، پنجابی اور پٹھان پر مبنی ایک کثیر الجہتی معاشرے پر مشتمل ہے تاہم ان سب کو لوک روایات اور مشترکہ رسوم ورواج نے ایک لڑی میں پرو رکھا ہے۔ اس کے برخلاف کچھ نظریاتی حقائق بھی ہیں جن میں سب سے اہم یہ ہے کہ پاکستان ملت اسلامیہ کا ایک اہم رکن اور مشترکہ مذہبی اقدار پر مبنی ایک ملک ہے۔ یہ نظریہ کہ پاکستان کا علاقائی تہذیبی ورثہ یا د ماضی پر مشتمل ہے جو وقت کے ساتھ فنا ہو جائے گا اور نظریاتی بندھنوں اور دور جدید کی تیز رفتار سائنسی ترقی کا ساتھ نہیں دے پائے گا، غلط ثابت ہو چکا ہے۔

ہمارا تجربہ یہ ہے کہ وقت کے ساتھ یہ معدوم ہونے کے بجائے ابھرتا ہے اور اکثر تو اہم اور طاقتور سیاسی ایشوز کی شکل اختیار کر لیتا ہے

جنہیں عیار سیاستدان اپنی مطلب برآئی کیلئے استعمال کرتے ہیں۔

علاقائی کلچر کو دبانے اور مذہب اور قومیت کے نام پر انکی نفی کرنے سے اکثر بڑے گھمبیر مسائل جنم لیتے ہیں جن میں طبقاتی بے چینی اور سیاستدانوں کے ہاتھوں استحصال شامل ہیں۔ نیز اُنکے علاوہ علیحدگی پسند تحریکوں کو فروغ حاصل ہوتا ہے۔ سرائیکی صوبہ، سندھو دیش اور بلوچ اور پختونوں کی علیحدگی پسند تحریکیں بھی اسی کا شاخسانہ ہیں۔ من حیث القوم علاقائی تہذیبوں کے بارے میں ہمارا رویہ اور اپروچ منفی سوچ کی عکاس ہے جب تک یہ سوچ ایک روشن خیال اور متحرک سوچ میں تبدیل نہیں ہوتی اس وقت تک پاکستان کے سماجی منظر نامہ میں کوئی ڈرامائی تبدیلی ممکن نہیں۔

یہی وجہ ہے کہ آج ہمیں ملک کے بیشتر علاقائی سیاسی معاملات میں یہی تہذیبی بحران نظر آتا ہے۔ بہت سارے مسائل جنکا آج لوگوں کو سامنا ہے وہ سماجی و تہذیبی نوعیت کے ہیں۔

علاقائی تہذیبیں پاکستانیوں کے لئے ایک خوشگوار ہم آہنگی اور بھائی چارے والی چیز ثابت ہوسکتی ہیں۔ ان تہذیبوں کے تنوع میں ہی ہمیں ایک واحدانیت نظر آتی ہے اور یہی اسلامی ثقافت کی روح ہے۔ اسلام علاقائی اختلاف اور ان کے فرق کا خیال رکھتا ہے۔ پاکستان کے تہذیبی منظر نامہ میں اگرچہ کوئی حقیقی تصادم نہیں ہے جن چیزوں کو ہم Mutuchly exclusive سمجھتے آئے ہیں وہ درحقیقت ایک گہری واحدانیت کے پرتو ہیں جو علاقائی اور نظریاتی دونوں بنیادوں کا احاطہ کرتے ہیں۔ یہ جغرافیائی بھی ہیں اور نظریاتی بھی۔

انسان کے بے شمار مسائل اس وقت جنم لیتے ہیں جب فی زمانہ سوچ وفکر کے زاویوں کو الگ الگ خانوں میں رکھا جاتا ہے، مثلاً مادی جسم اور روح، زمینی اور الواحی، مادے اور توانائی وغیرہ کو مختلف مظاہر سمجھا جاتا ہے۔ جبکہ ضرورت اس امر کی ہے کہ انہیں اس وحدانیت کا حصہ سمجھا جائے جو خود انسان کے اندر سے پھوٹتی ہے۔

نفسیاتی اعتبار سے یہ کہنا کہ بلوچ اور سندھی، پنجابی سے مختلف ہیں دراصل انکی کسی مخصوص جگہ سے وابستگی کی وجہ ہے۔ یہ درحقیقت اس کیفیت اور اضطراب کا ردعمل ہے جو معاشی ناہمواری اور سیاسی محرومی سے جنم لیتا ہے۔

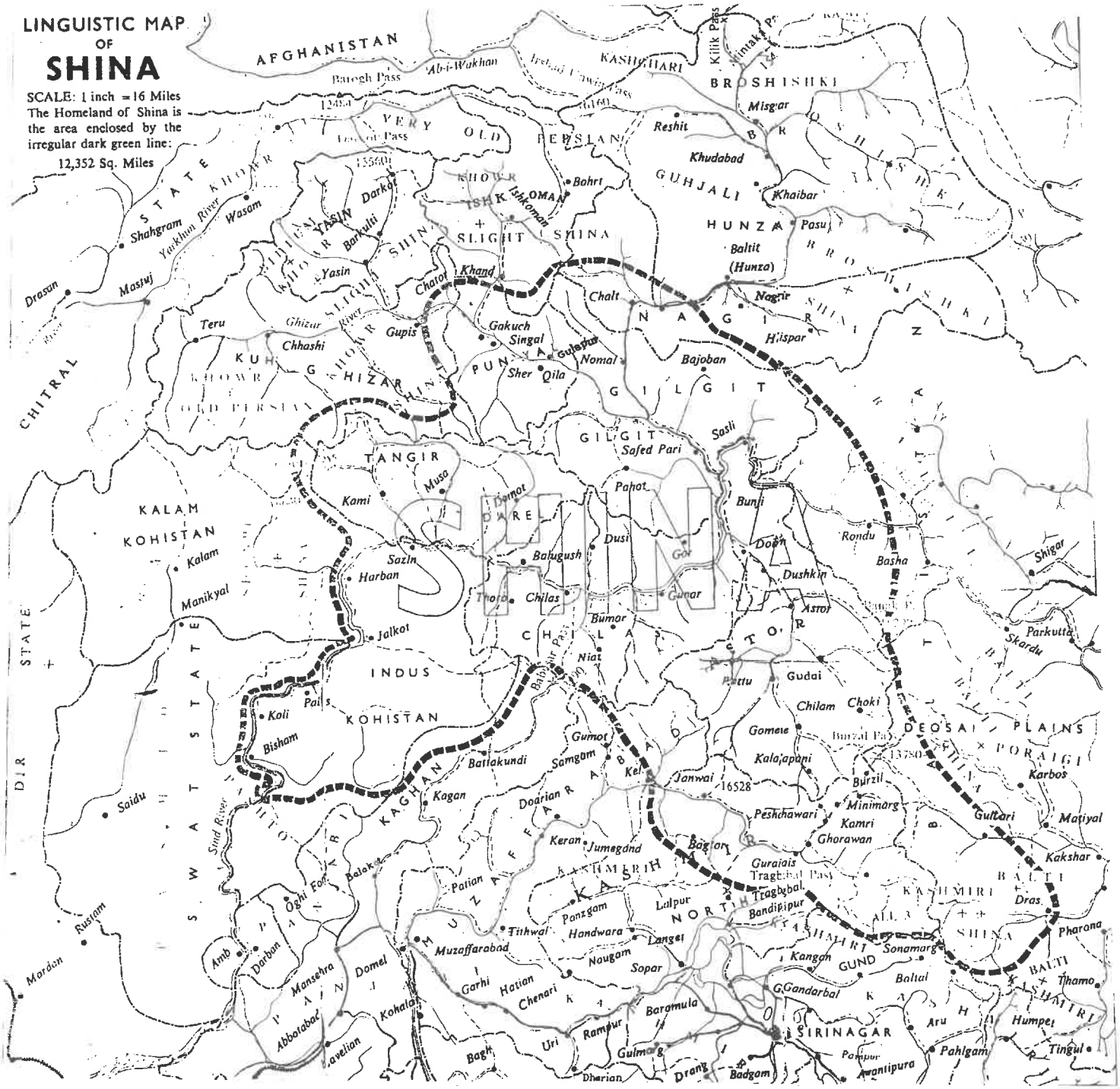
ہمارے بے شمار مسائل کی وجہ انسانی اقدار کا خیال رکھے بغیر حاصل کی گئی غیر متوازن صنعتی ترقی ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم اپنی گرانقدر روایات کی پاسداری کرتے ہوئے اپنے آپ کو روایت کی جڑوں سے علیحدہ کئے بغیر جدید خطوط پر استوار کریں۔

ہمیں نئے نظام اور نئے حالات کے مطابق اپنی گم شدہ روایات کا پتہ چلانا، انہیں قائم رکھنا، آنے والی نسلوں میں ثقافتی اقدار کا شعور اور ان کی اہمیت اجاگر کرنا ہے۔ یہ کوئی آسان کام نہیں۔ ہم یہاں پاکستان کا ثقافتی انسائیکلوپیڈیا ترتیب دے کر فنون لطیفہ، صنعت وحرفت، اقتصادیات، مذہب، ادب یا معاشرتی وسماجی تاریخ نہیں لکھ رہے بلکہ ہماری کوشش ہے کہ اُن تجربات پر ایک نظر ڈالتے چلیں جو ہمارے تمدن، ہماری روایات اور ثقافت کی تشکیل کا سبب بنے۔ ہر چند کہ لوک ثقافت تاریخ سے جدا نہیں مگر یہ تاریخ نہیں، یہ ماضی کے ساتھ حال اور مستقبل بھی ہے، اور یہی اہم ہے کہ ہم اپنے فوک لور کو اپنے حال اور اپنے مستقبل سے ہم آہنگ کر کے آگے بڑھیں۔

عکسی مفتی

(عکسی مفتی کے انگریزی مضمون سے ترجمہ کیا گیا)

This Linguistic Map of SHINA is based on the actual and original research done by
(Dr. M.S.Namus) in Gilgit Rgon.
Book: "Gilgit aur Shina Zuban" (Urdu)



غذر، گلگت، دیامر

جغرافیہ

شمالی علاقہ جات پاکستان کے شمال میں نہایت خوبصورت اور دلکش علاقوں میں شمار ہوتے ہیں۔ یہ علاقے تقریباً 72494 مربع کلومیٹر کے وسیع و عریض رقبے پر پھیلے ہوئے ہیں اور یہ پانچ اضلاع پر مشتمل ہیں جو گلگت، غذر، دیامر، سکردو اور گانچھے کہلاتے ہیں۔ نگر، ہنزہ، یاسین اور گوپس (کی کچھ آبادی) کے علاوہ ضلع گلگت، ضلع دیامر اور ضلع غذر کو ایک ہی ثقافتی زون سمجھا جاتا ہے۔ ارض شمال کے یہ پانچ اضلاع پاکستان کے انتہائی شمال میں واقع ہیں۔ یہ علاقے 34 تا 37 عرض بلد شمالی اور 72 تا 77 طول بلد مشرقی کے درمیان واقع ہیں۔ گلگت شمالی علاقہ جات کا دارالخلافہ اور تجارتی مرکز ہے۔

بعض مؤرخین کا خیال ہے کہ اس کا پرانا نام ''گری گرت'' تھا۔ سنسکرت میں جس کے معنی پہاڑوں سے گھرا ہوا کے ہیں جو بعد میں بگڑ کر گلگت بن گیا۔ بعض کا کہنا ہے کہ گلگت سنسکرت کے لفظ ''گلگوت'' کی بگڑی ہوئی شکل ہے جس کے معنی قبرستان کے ہیں۔ پرانے زمانے میں کئی لڑائیوں کے دوران یہاں بے شمار لوگ قتل ہوئے جس کی وجہ سے سارا علاقہ قبرستان بن گیا۔ ایک اور مقامی شخص کا کہنا ہے کہ گلگت اصل میں ''گلگشت'' ہے۔ گلگت شہر کی سطح تقریباً اڑھائی صدی قبل موجودہ سطح سے تقریباً اسی اور سو فٹ کے درمیان بلند تھی۔ لیکن آبی طوفان اور سیلاب بیچ کی مٹی بہا کر لے گئے اور اس کی زرخیزی جاتی رہی۔ برمس اور نائی کی میں واقع چکنی مٹی کے پہاڑ بھی اس بات کی نشاندہی کرتے ہیں کہ کسی زمانے میں گلگت کا دریا اس قدر بلندی پر بہتا تھا۔ گلگت خاص میں نگرل سے متصل پہاڑ کی پتھریلی چٹان پر ''ہل گہ نال'' کے کندہ نقوش سے معلوم ہوتا ہے کہ ماضی میں گلہ بانی کے ساتھ ساتھ لوگوں کی معیشت کا دارومدار کھیتی باڑی پر بھی تھا۔ یہاں کے نشیبی علاقوں پر موجود کھیتیاں اور آبادی سب سیلاب کے بعد کی ہیں۔ کہتے ہیں کہ سیلاب سے قبل گلگت کی زمین اتنی زرخیز تھی کہ ہر طرف پھول ہی پھول نظر آتے تھے اس لئے اسے گلگشت یعنی سیرِ چمن کا نام دیا گیا جو بعد میں بگڑ کر گلگت بن گیا۔ کاشغر کا ایک ترکمان یہ دعویٰ کرتا ہے کہ گلگت کا اصل نام ''کھل کھت'' ہے۔ ترکی میں کھل کے معنی جانا اور کھت کے معنی آنا کے ہیں۔ چوں کہ یہ علاقہ ماضی میں ترکوں کی چھاؤنی تھی۔ جو فتوحات کے لئے یہاں آتے جاتے رہے اسی لئے اس کا نام کھل کھت پڑا جو بعد میں بگڑ کر گلگت بنا۔

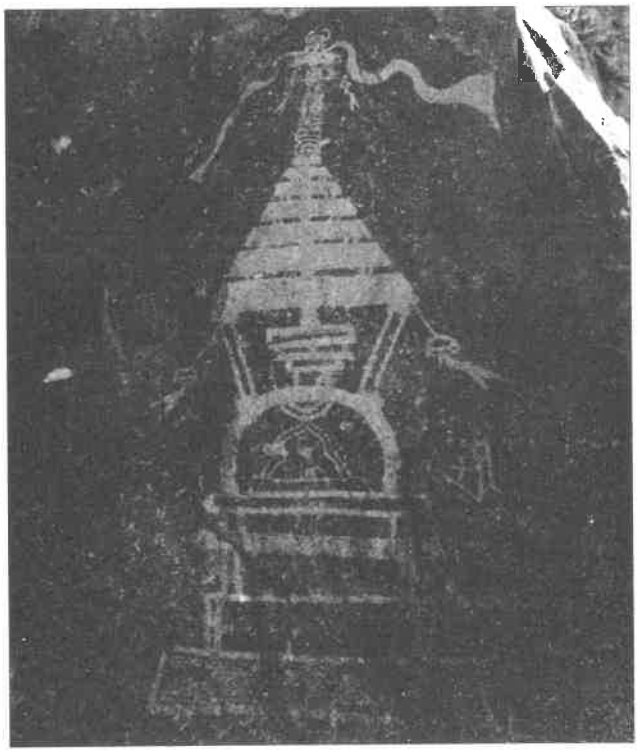
ان علاقہ جات کے شمال میں افغانستان اور چین، جنوب میں مقبوضہ کشمیر، آزاد کشمیر اور صوبہ سرحد، مغرب میں صوبہ سرحد اور مشرق میں مقبوضہ کشمیر اور چین واقع ہیں۔ گزشتہ برسوں سویٹ یونین ہمارا قریبی ہمسایہ تھا لیکن اس کے انہدام کے بعد اسلامی جمہوریہ تاجکستان ہمارا قریب ترین ہمسایہ بن گیا ہے۔ علاقہ پہاڑی ہے اور سطح سمندر سے بلندی تقریباً 4000 سے 25,000 فٹ تک ہے۔ یہ علاقے اپنے بلند و بالا اور دیوقامت پہاڑوں، بلند چوٹیوں، لمبے گلیشیروں اور دشوار گزار دروں کی بدولت بین الاقوامی شہرت کے حامل ہیں اور ایک عرصے سے سیاحوں، سائنس دانوں اور کوہ پیماؤں کو دعوت نظارہ دے رہے ہیں۔

زمانہ قدیم میں جب چترال اور گلگت کی سیاسی وحدت ختم ہوئی تو بقیہ گلگت کو انتظامی حوالے سے سات چھوٹی چھوٹی اکائیوں میں تقسیم کیا گیا۔ یہ اکائیاں ''مقسوہ'' کہلاتی تھیں۔ اس لحاظ سے پرانے لوگ اس علاقے کو ''ست مقسوہ گلیت'' آج بھی کہتے ہیں۔ جرمن سکالر پروفیسر کارل جٹمار کے مطابق ہر ''مقسوہ'' کو ایک صوبے کی حیثیت حاصل تھی۔ انتظامی طور پر کی گئی ''ست مقسوہ گلیت'' کی تقسیم کی تفصیل درج ذیل ہے:

۱۔ سین بر بالا وسین بر پائین یعنی منپن اور ہندی سے نومل تک کا علاقہ۔
۲۔ ''جگوہ مقسوہ''، موضع گلگت، شکیوٹ و مناور بشمول شیوداس۔
۳۔ علاقہ جات بگروٹ و حراموش۔
۴۔ علاقہ سئی و بونجی۔
۵۔ علاقہ غور (گوہر آباد) و چلاس۔
۶۔ علاقہ داریل و ہربن۔
۷۔ تانگیر۔

گلگت آتے ہوئے پڑی کے قریب دنیا کے تین عظیم پہاڑی سلسلے، قراقرم، ہمالیہ اور ہندوکش آپس میں ملتے ہیں۔ تقریباً تمام علاقے سنگلاخ چٹانوں، تنگ وادیوں اور برف پوش پہاڑوں پر مشتمل ہیں۔ ان علاقوں کے انتہائی شمال میں سطح مرتفع پامیر واقع ہے جسے جغرافیہ دان بام دنیا کہتے ہیں۔ پامیر کے بعد دیوسائی کا میدان ایشیاء کا دوسرا بلند ترین سطح مرتفع ہے۔ دنیا کی مشہور پہاڑی چوٹیاں جن میں دوسری بڑی چوٹی K-2 جس کی بلندی 28250 فٹ ہے، نانگا پربت جس کی بلندی 26607 فٹ ہے اور راکاپوشی جس کی بلندی 25550 فٹ ہے، ان علاقوں میں پائی جاتی ہیں۔ یہاں کے بڑے بڑے گلیشئر ون میں سیاچن، بلتورو، چھوغولونگمہ، رینگمو، بیافو بلتستان میں اور ہسپر گلیشیئر ضلع گلگت میں واقع ہیں۔ ان علاقوں میں موجود کوہساروں میں کئی اہم دروں کی نشاندہی بھی کی گئی ہے۔ جن میں بابوسر، برزل، قمری (دیامر)، قراقرم، مستاغ، چھوربٹ، زوجیلہ، سلتورو،

تھلے، عالم پی، غنڈو، ہینگو، برالدو، باشہ (بلتستان میں) ہسپر، ارشاد، کلک منتکہ، خنجراب، شمشال (گلگت میں) اور ضلع غذر کے قرمبر، درکوت، بروغل وشندور کے درے اہم جغرافیائی حیثیت کے حامل ہیں۔ یہ وہ خطہ ارض ہے جو دو عظیم ایشیائی طاقتوں، روس اور بھارت کو ایک دوسرے سے جدا کرتا ہے اور چین اور پاکستان کو آپس میں ملاتا ہے۔



تھلپن چلاس میں چٹان پر کندہ نقوش

شمالی علاقوں میں مون سون کی بارشیں نہیں ہوتی ہیں جس کی وجہ اس خطہ کا جغرافیائی محل وقوع ہے۔ یہاں کا موسم گرمیوں میں گرم اور سردیوں میں سخت سرد ہوتا ہے۔ ان علاقوں میں سب سے زیادہ گرمی جولائی میں اور سب سے زیادہ سردی جنوری میں ہوتی ہے۔ موسم بہار اور موسم سرما میں یہاں بارشیں ہوتی ہیں اور اوسط بارش تقریباً چھ انچ سالانہ ہے۔ شمالی علاقہ جات میں سب سے زیادہ بارشیں داریل، تانگیر اور استور میں ہوتی ہیں۔ کوہ ہمالیہ کے شمال، شمال مغرب اور جنوب کی طرف بارش کم ہوتی ہے۔ سب سے زیادہ بارش کوہ ہمالیہ کے ڈھلوان پر ہوتی ہے جبکہ اس کی دوسری طرف بارش بہت کم ہوتی ہے۔ شمالی علاقے ہمالیہ کے اسی طرف واقع ہیں اور بارشوں کی کمی کا سبب بھی یہی ہے البتہ ضلع غذر، بلتستان کے ضلع سکردو، گانچھے، ضلع دیامر کے استور اور ضلع گلگت کے ہنزہ ونگر کے علاقوں میں پہاڑوں کے ساتھ ساتھ نشیبی وادیوں میں بھی اچھی خاصی برف پڑتی ہے۔ یہی برف پگھل کر گرمیوں کے موسم میں ندی نالوں کے ذریعے دریائے سندھ میں طغیانی کا باعث بنتی ہے۔ ان علاقوں میں سال کے چار واضح موسم ہوتے ہیں:

1- موسم سرما (یونو)　　دسمبر، جنوری، فروری۔
2- موسم بہار (بزونو)　　مارچ، اپریل، مئی۔
3- موسم گرما (اوالو)　　جون، جولائی، اگست۔
4- موسم خزاں (شروء)　　ستمبر، اکتوبر، نومبر۔

ان علاقوں کے بلند وبالا پہاڑوں، دریاؤں، ندی نالوں، جنگلات اور گلیشیئروں کے علاوہ قدرت نے انہیں خوبصورت وادیوں اور جھیلوں سے بھی نوازا ہے۔ یہاں کی درجنوں حسین وجمیل وادیاں نہ صرف اپنی خوبصورتی کی وجہ سے مشہور ہیں بلکہ ان مقامات پر موجود قدرتی جھیلوں نے ان کی خوبصورتی کو چار چاند لگایا ہے۔ ان میں کچورہ، سدپارہ، نلتر، شندور، دیوسائی، پھنڈر، راما، گدئی، سرکون (بونجی)، گٹوال (حراموش)، گاسو (سئی جگلوٹ)، گینا، گل اختوری، بوریت گلمت (ہنزہ) کی مشہور جھیلیں اپنے خوبصورت مناظر کی وجہ سے قابل ذکر ہیں۔ چلاس میں فیری میڈو اور تانگیر میں ستیل کے مقامات بھی اپنی خوبصورتی کی وجہ سے علاقہ بھر میں مشہور ہیں۔ ان علاقوں کے اہم دریاؤں میں دریائے سندھ، شیوک، شگر، استور، ہنزہ اور گلگت شامل ہیں۔ چھوٹے بڑے نالوں کا پانی بھی ان دریاؤں میں جاملتا ہے۔ یہاں تمام چھوٹے بڑے دریا، دریائے سندھ میں مدغم ہوتے ہیں۔ پاکستان کی زرعی معیشت اور توانائی کے نظام کا دارومدار اسی دریا پر ہے۔ ان علاقوں میں گرمیوں کے دوران دریاؤں اور نالوں کے کنارے سیر وتفریح کرنے اور ستانے کے لئے استعمال ہوتے ہیں۔ گلگت میں حال ہی میں پاک آرمی کے جوانوں نے ''CAA سٹی پارک'' کے نام سے ایک خوبصورت پارک کا تحفہ یہاں کے لوگوں کو دیا ہے جو قابل دید ہے۔ اس کے علاوہ چنار باغ اور اس سے ملحقہ لب دریا پر واقع مقامات گرمیوں میں لوگوں کی تفریح کا ذریعہ ہیں۔

جنگلات اور جنگلی حیات:

شمالی علاقوں کو قدرت نے مختلف النوع جنگلی حیات سے بھی مالا مال کر رکھا ہے۔ جنگلی جانوروں میں کیل، بلیو شیپ، مارخور، مارکو پولو شیپ، بھورا ریچھ، تبتی گدھا، برفانی چیتا، جنگلی کتا، بھیڑیا، لومڑی، الپائن ویزنل (شانچہ) سیاہ گوش، خرگوش، مرموٹ (ترشون) وغیرہ شامل ہیں جبکہ پرندوں میں چکور، رام چکور، گولڈن ایگل، باز، مرغابی، کبوتر، فاختہ، کوا، ہدہد، چیل، مایون اور بٹیر کے علاوہ چڑیوں کی بہت سی اقسام پائی جاتی ہیں۔

72494 مربع کلومیٹر پر پھیلے ہوئے ان وسیع وعریض علاقوں میں قدرتی جنگلات کا رقبہ تقریباً 1100 مربع میل ہے جو کہ ان علاقوں کے کل رقبہ کا تقریباً چار

فی صد بنتا ہے۔ یہاں پر جنگلات کی درجہ بندی دو طرح سے کی جاتی ہے۔ ایک "Govt.ProtectedForests" جبکہ دوسرا "Commercial/Private Forests"۔ استور، گلگت، پونیال، نگر اور بلتستان میں 252 مربع میل پر پھیلے ہوئے جنگلات Govt Protected Forests شمار ہوتے ہیں۔ ان جنگلات میں زیادہ تر کائل، فر اور سپروس کے درخت پائے جاتے ہیں جبکہ چلاس اور داریل، تانگیر میں جنگلات کا رقبہ 848 مربع میل ہے جو Commercial/Private Forests کے زمرے میں شامل ہیں۔ ان میں تقریباً 90% خالص دیار کے جنگلات ہیں اور باقی 10% میں کائل، فر اور سپروس کے درخت پائے جاتے ہیں۔

قدرتی چشمے:

شمالی علاقے قدرتی چشموں کے لیے بہت مشہور ہیں۔ بلتستان، گلگت اور دیامر کے بہت سے مقامات پر ٹھنڈے اور گرم پانی کے چشمے ابلتے ہیں، جن کا پانی لوگ مختلف بیماریوں کے لیے بطور علاج استعمال کرتے ہیں اور شفایاب ہوتے ہیں۔ رائیکوٹ چلاس کے ابلتے ہوئے چشمے، بر، بڈلس (نگر) اور برست، دماس پونیال، گرونجر، درکوت، ایمت (غذر) مرتضیٰ آباد ہنزہ کے چشمے علاقہ ہائے گلگت، غذر و دیامر میں بہت مشہور ہیں۔

دلچسپ دیومالائی روایات:

ان علاقوں کے دیومالائی قصے بھی عجیب و غریب نوعیت اور دلچسپی کے حامل ہیں۔ پری زادیوں کے لیے یہاں ''برای'' کی اصطلاح عام استعمال ہوتی رہی ہے۔ لوگوں کے خیال کے مطابق برای مختلف افراد سے وابستہ ہو کر ان کی حفاظت کیا کرتی ہیں۔ شنا میں ''برای بےٹن'' ایک محاورہ ہے جس کا لفظی معنی ''پری بیٹھی ہے'' بنتا ہے جو عام طور پر برکت ہونے کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ یہ محاورہ ان مواقع پر استعمال ہوتا ہے جب گھر میں کسی چیز کی بہتات ہو جائے۔ المختصر برای برکت کی علامت تصور ہوتی ہے۔ پہاڑوں اور اونچے اونچے دشوار گزار مقامات پریوں کے مسکن کے طور پر مشہور ہیں۔ ننگا پربت، بلچھار، راکاپوشی اور دھیران پہاڑوں کے سلسلے ان کے گھر شمار ہوتے ہیں۔ 1953ء میں ننگا پربت کی مہم پر جانے والے جرمن کوہ پیماؤں میں سے چوٹی سر کرنے والے کوہ پیما ہرمن بھول کا ایک ایسی مخلوق سے آمنا سامنا ہوا تھا جس نے اسے آوازیں دی تھیں اور اس کے دستانوں کا پتہ دیا تھا۔ اس دوران ہرمن بھول نے مسلسل یہ محسوس کیا کہ کوئی غیر مرئی مخلوق اس کا پیچھا کر رہی ہے جو اسے دکھائی نہیں دیتی۔ مقامی طور پر ننگا پربت دیامر کے نام سے جانا جاتا ہے جس کے معنی دیوتاؤں کا مسکن ہیں۔ یہ بات عام تھی کہ اس بلند و بالا پہاڑ کی چوٹی پر پریوں اور دیوتاؤں کی آبادیاں ہیں اور پریوں کی ملکہ ایک مخصوص قلعہ میں فروکش ہے۔ ان حالات کے پیش نظر اس چوٹی تک رسائی ممکن متصور نہیں ہوتی تھی۔ جب چوٹی سر ہوئی تو کہا گیا کہ بعض سماوی آفات مثلاً ٹڈی دل کا فصلوں پر حملہ آور ہونا یا وبائی امراض کا پھیلنا ان غیر مرئی مخلوق کی ناراضگی کی وجہ سے ہے۔



کارگاہ نالہ میں چٹان پر کندہ بدھا کا مجسمہ

عصر حاضر میں پرانے زمانے کے قلعوں کے نام و نشان تک باقی نہیں رہے ہیں۔ البتہ قلعہ چلاس اچھی حالت میں ہے جبکہ چھپروٹ، پسن اور اشپش نومل کے قلعوں کے کھنڈرات کے آثار اب بھی ملتے ہیں۔ اس کے علاوہ ایک بڑا اُبھرواں نقوش سے آراستہ پتھر جسے بوبر سے لایا گیا ہے، کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ پتھر مرحوم علی احمد جان AIG پولیس کے خاندان کے قبضے میں ہے۔ قلعہ فردوسیہ کے اندر غازی گوہر امان کا بنایا ہوا بلند و بالا مینار آج بھی پورے آب و تاب کے ساتھ حسن سٹیڈیم میں ایستادہ ہے۔ جہاں پر آج کل الحیات شہید پبلک سکول قائم ہے۔ یہ مینار درد طرز تعمیر کا نمونہ ہے۔ جس کے تحت پہلے دیوار پر لکڑی کے فریم بنا کر اس کے اندر پتھر رکھتے اور پھر حسب ضرورت گارے سے لپائی کرتے۔ ہنزل میں واقع بدھ مت کا مجسمہ اور جوٹیال گلگت کی مغلی شکار بھی تاریخی اہمیت کے حامل ہیں۔ گلگت سے چند کلومیٹر دور کارگہ کے قریب ایک چٹان پر بُت کا مجسمہ کندہ ہے، جسے مقامی لوگ ''یاچھنی'' کہتے ہیں۔ ''یاچھنی'' نیچھ کی مادہ ہے جو ایک جناتی مخلوق تصور ہوتی ہے۔ کارگہ کے اس بت سے وابستہ کئی کہانیاں بھی

ہیں، جہاں تک بت کی اصلیت کا تعلق ہے۔ یہ ''چمبہ بدھو'' کا مجسمہ بتایا جاتا ہے جو مہاراجہ اشوک کی حکمرانی کے آخری دور میں مداین تکا کے جوشیلے بھکشوؤں نے یاکھانی (کشمیر کی ملکہ) کے حکم سے بنایا گیا تھا۔ یاکھانی کی مناسبت سے یہ بت (یاچھنی) کے نام سے معروف ہوا کیونکہ بیچھ اور یاچھنی مقامی طور پر جنات کے ناموں کے لیے مستعمل تھے۔ علاوہ ازیں چلاس، ہڈر، تھور، گیچی، تھلپن اور منارگہ سے شتیال تک دریائے سندھ کے بائیں کنارے چٹانوں پر کندہ تصویریں اور تحریریں آج بھی لوگوں کو دعوت نظارہ دے رہی ہیں۔

ہڈر (چلاس) کے علاقے میں یہ قصہ مشہور ہے کہ بہرام شہزادہ کا مسکن نوپورہ گلگت میں تھا۔ شہزادہ کا مقابلہ دیوزاد مخلوق سے ہوتا تھا۔ ایک دفعہ شہزادہ گلگت سے پہاڑی راستے کے ذریعے ہڈر آیا تو اس کا سامنا ایک دیو سے ہوا۔ بہرام شہزادہ کا ایک برق رفتار گھوڑا تھا، جو ''باد ہوا'' کے نام سے موسوم تھا۔ جب دیوان کے راستے میں مزاہم ہوا تو شہزادہ نے حملے کے لئے گھوڑے کو ایڑ لگائی تو اس کا گھوڑا اڑا۔ لوگوں کے مطابق گھوڑا جس جگہ سے اڑا اور جہاں اترا ان دونوں جگہوں پر گھوڑے کے پاؤں کے نشانات آج بھی دیکھے جاسکتے ہیں۔ ہڈر کے اس جگہے کا نام ''چُماں'' ہے۔ بعد میں شہزادہ ھُڈر سے کارگاہ نالہ کے راستے واپس گلگت آیا۔

قیام پاکستان کے بعد 1970ء کی دہائی میں عجوبۂ عالم شاہراہ قراقرم کی تعمیر سے جہاں ان علاقوں میں معاشی انقلاب آیا ہے وہاں بیرونی ثقافتی یلغار سے یہاں کا منفرد ثقافتی ورثہ بھی بری طرح متاثر ہوا ہے۔ تقسیم سے پہلے گلگت اور پاکستان کے مابین کوئی سڑک نہیں تھی۔ البتہ 1947ء سے قبل گلگت۔ استور۔ بانڈی پور روڈ اس خطے کو کشمیر سے ملاتا تھا۔ یہ سڑک بہت تنگ تھی جس میں گھوڑوں اور گدھوں کے ذریعے سامان کشمیر سے گلگت لاتے تھے۔ آزادی کے بعد 1952ء میں گلگت کو پاکستان سے ملانے کے لئے کئی ہزار فٹ بلندی پر واقع بابوسر ٹاپ کے اوپر سے جیپ کے قابل ایک سڑک تعمیر کی گئی جو بالاکوٹ اور مانسہرہ سے ہوتے ہوئے راولپنڈی جاتی۔ یہ سڑک موسم گرما کے دوران صرف تین ماہ کے لئے کھلی رہتی۔ انڈس ویلی کے نام سے دوسری سڑک جو 1970ء میں مکمل ہوئی، جس کے ذریعے پنڈی، پشاور اور سوات سے ٹرک اور جیپیں گلگت آتی جاتی تھیں۔ 1960ء سے حکومت پاکستان نے اسلام آباد اور گلگت کے مابین ''پی آئی اے'' کے ذریعے فضائی آمدورفت کا اہتمام کیا، مگر ایک گھنٹے کا یہ ہوائی سفر بھی خوشگوار اور صاف موسم کے ساتھ مشروط تھا۔ ہفتے میں صرف چند دن اسلام آباد سے گلگت پرواز کے لئے مخصوص ہوتے تھے۔ لیکن موسم کی خرابی کی صورت میں یہ پروازیں بھی منسوخ ہوتی تھیں۔ ہوائی جہاز کی پروازیں آج کل ہفتہ بھر ہوتی ہیں لیکن موسم صاف ہونے کی شرط آج بھی قائم ہے۔

مزارات:

بلتستان کی طرح ضلع گلگت میں بھی روحانی شخصیات اور بزرگان دین کے متعدد مزارات موجود ہیں جو آج بھی مرجع خلائق ہیں۔ گلگت خاص میں موجود بہت سی زیارت گاہوں کے علاوہ چپرسن، شمشال، غلمت، گوجال (بالائی ہنزہ)، غلمت (نگر) تھول (نگر) التت (ہنزہ) پھکر (نگر)، میاچھر (نگر)، دنیور (گلگت)، بٹوٹ (نومل)، استور پرانا بازار، آئی گہ (استور) گٹومل (بٹوگاہ) چلاس جبکہ ضلع غذر میں گاکوچ بالا اور نوہ (یاسین) کی زیارتیں مشہور ہیں۔ لوگ ان زیارت گاہوں پر جاکر منتیں مانگتے اور دلی مراد پاتے ہیں۔ گویا یہاں کے سادہ لوح عوام کی ان زیارت گاہوں سے بڑی عقیدت وابستہ ہے۔ البتہ آج کل لوگوں میں وہ جوش وخروش نہیں جو پچھلے وقتوں میں تھا۔

نیشنل پارک:

شمالی علاقوں میں اس وقت چار نیشنل پارک موجود ہین جن میں دیوسائی نیشنل پارک، ہندراب/شندور نیشنل پارک، خنجراب نیشنل پارک اور سینٹرل قراقرم نیشنل پارک شامل ہیں۔ تین گیم سینکچریز، نو گیم ریزرو اور نو کنٹرول ہنٹنگ ایریاز ہیں جن کی تفصیل کچھ اس طرح سے ہے۔

1- گیم سینکچریز:

(i)	کارگہ	ضلع گلگت
(ii)	نلتر	ضلع گلگت
(ii)	سدپارہ	ضلع سکردو

2- گیم ریزرو:

(i)	نازبر	ضلع غذر
(ii)	شیرقعلہ	ایضاً
(iii)	چھشہ/بوسٹر	ایضاً
(iv)	پکورہ	ایضاً
(v)	کلک متکہ	ضلع گلگت
(vi)	دنیور	ایضاً
(vii)	تانگیر	ضلع دیامر
(viii)	نر/غوڑو	ضلع سکردو
(ix)	اسکورنالہ	ایضاً

3- کمیونٹی کنٹرول ہنٹنگ ایریاز

(i)	خیبر	ضلع گلگت
(ii)	غلکن	ایضاً
(iii)	شناکی	ایضاً
(iv)	بر نگر	ایضاً
(v)	کے۔وی۔او	ایضاً
(vi)	قرمبر	ضلع غذر
(vii)	استور	ضلع دیامر
(viii)	سکویو، کراپتھنگ، یسنگو (SKB)	ضلع سکردو
(ix)	ہوشے	ضلع گنگ چھے

فصلیں، پھل اور سبزیاں:

یہاں کی زمینوں میں گندم، مکئی، جو، باقلہ، کنگنی، باجرہ، ترنبہ کاشت کی جاتی ہیں۔ مٹر، پالک، بند گوبھی/ پھول گوبھی، ٹماٹر، مولی، گاجر، پیاز، آلو، شلجم، بینگن اور دیگر سبزیاں بھی کاشت کی جاتی ہیں۔ پھلوں میں سیب، چیری، ناشپاتی، خوبانی، آڑو، آلوچہ، انگور، بادام، اخروٹ، توت، انجیر اور انار وغیرہ شامل ہیں۔

جڑی بوٹیوں کی پیداوار کے حوالے سے بھی اس علاقے کی سرزمین بڑی زرخیز ہے اور دور دراز کے لوگ آج بھی ان جڑی بوٹیوں کو مختلف بیماریوں کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ ماضی میں استور سے جڑی بوٹیوں کی بھاری مقدار میں خرید و فروخت ہوتی رہی ہے۔

تاریخ

گلگت اور ملحقہ علاقہ جات کبھی دردستان اور کبھی بلورستان کے نام سے جانے جاتے تھے۔ ان علاقوں کی کوئی قدیم و مستند تاریخ تحریری صورت میں دستیاب نہیں۔ مگر یہاں کی تاریخ قصہ کہانیوں کی شکل میں سینہ بسینہ چلی آ رہی ہے جن میں دیومالائی عنصر اور افسانوی رنگ صاف نظر آتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں کی تاریخ میں الف لیلوی داستانوں کے تذکرے عام ملتے ہیں۔ جنہیں مستند تاریخ کی حیثیت نہیں دی جا سکتی۔ البتہ گلگت و ملحقہ علاقہ جات کے زمانہ وسطیٰ کی سیاسی تاریخ آٹھویں صدی عیسوی میں اس وقت شروع ہوئی جب عربوں نے وسط ایشیاء میں پیش قدمی شروع کی۔ عربوں کی اس پیش قدمی نے اس علاقے کو دو اطراف سے متاثر کیا۔ پامیر کے اس پار سے ترک آبادی بدخشان، واخان اور سنکیانگ سے اس طرف وارد ہوئی اور دوسری طرف کابل کے ساتھ عربوں کے تعلقات نے بھی واخان، بلور اور تبت خورد کو متاثر کیا۔

تاریخ کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ پانچویں صدی عیسوی سے پہلے ان علاقوں میں دردیسا نامی حکومت تھی البتہ اس سلطنت کے متعلق واضح شواہد دستیاب نہیں۔ قدیم تاریخ کشمیر راج ترنگنی میں دردیسا کے چند حکمرانوں کے نام ملتے ہیں۔ پانچویں اور آٹھویں صدی عیسوی کے درمیان اس خطہ میں بلور کے نام سے ایک سلطنت قائم ہوئی جس پر چینیوں اور تبتیوں کا اثر و رسوخ بہت زیادہ تھا۔ جیسا کہ بتایا جاتا ہے کہ 747ء کے دوران چین اور تبت کے درمیان بڑی کشمکش جاری تھی اور پامیر کے آس پاس چین اور تبتی فوجیوں میں ایک بڑی جنگ چھڑ گئی تھی۔ اس زمانے میں بلورستان کے لوگوں کا مذہب بدھ مت تھا۔

قومیں:

لوگوں کا وہ گروہ جو شنا زبان بولتا ہے محققین اس کا شمار دارد قبائل میں کرتے ہیں۔ مستشرقین اور ایشیاء کے محققین نے بھی لوگوں کے اس گروہ کو "دارد" کا نام دیا ہے۔ اس حوالے سے وہ علاقہ جہاں دارد لوگ آباد ہیں "دردستان" کہلاتا ہے اور اس کے باشندوں کو دردقوم کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ زبان کے لحاظ سے کشمیری اور کوہستانی دارد خاندان میں شامل ہیں۔ مگر نسل کے لحاظ سے کشمیری اور کوہستانی لوگ دارد قوم میں شامل نہیں۔ وہ بولتے دارد زبان ہیں مگر خود دارد نہیں۔ دردستان کی آبادی کا بیشتر حصہ دو بڑی اقوام شین اور یشکن میں منقسم ہے۔ البتہ دیگر کئی اقوام بھی یہاں قلیل تعداد میں موجود ہیں۔ شنوں کے بارے میں عموماً یہی خیال ہے کہ یہ آرین ہیں۔ جبکہ دیگر اقوام کے بارے میں مورخین کی آراء میں اختلاف ہے۔ پاکستان، آزاد کشمیر اور مقبوضہ کشمیر کے تقریباً 12352 مربع میل کے علاقے میں شنا زبان بولی جاتی ہے۔ 1931ء میں کیئے گئے ایک سروے کے مطابق شنا زبان بولنے والے لوگوں کی تعداد 63918 تھی، جس میں 4 فی صد سالانہ شرح اضافہ کے حساب سے 2002ء تک یہ تعداد تقریباً ایک ملین سے بھی تجاوز کرتی ہے جبکہ شمالی علاقہ جات میں کل آبادی کا تقریباً 60 فیصد حصہ شنا بولتا ہے۔ دردستان کی حدود تقریباً وہی ہیں جو شنا زبان کی ہیں۔

عہد قدیم میں دارد لوگ لداخ کی مختلف اطراف میں آباد ہوئے۔ غالباً اسلام قبول کرنے سے پہلے یہ لوگ لداخ میں سندھ کی مرکزی وادی میں داخل ہوئے۔ اس وقت ان لوگوں کا کوئی مذہب نہیں تھا۔ اس لیے انہوں نے بدھ مذہب اختیار کیا۔ اب وہ لاماؤں کو اپنا مذہبی پیشوا مانتے ہیں۔ اسلام قبول کرنے کے بعد بھی دارد قبیلہ کے افراد نے بلتستان اور پھر لداخ کی طرف نقل مکانی کی۔ یہ مسلمان دارد بدھ داردوں کے بہت قریب پہنچ گئے اور اب دونوں کی بستیاں پہلو بہ پہلو موجود ہیں۔ دارد لوگ سندھ کے کنارے کنارے اوپر کو چڑھے اور دیگر اقوام کے پہلو بہ پہلو جا کر آباد ہوئے۔ بلتستان کے علاقے روندو اور بشو میں آبادی کا

تقریباً نصف حصہ نسلاً دارد ہیں۔ لیکن شنا زبان اب صرف چند دیہاتوں میں ہی بولی جاتی ہے اور بشو میں تو اب شنا زبان رائج ہی نہیں۔ مقبوضہ کشمیر کے علاقہ دراس میں نصف سے زیادہ آبادی داردوں کی ہے اور وہ شنا بولتے ہیں دراس کے علاوہ پورگ میں بھی دارد قبیلے کے بہت سے لوگ آباد ہیں۔

گلگت کے سابق حکمران اور اُن سے منسوب روایات

گلگت اور آس پاس کے علاقوں میں سابق حکمرانوں کو ''راع'' کہتے تھے۔ بتایا جاتا ہے کہ ماضی بعید میں وہ ہندو مذہب کے پیروکار تھے۔ لیکن گزشتہ کئی صدیوں سے وہ مسلمان ہو چکے ہیں۔ گلگت کے جن دیو مالائی حکمرانوں کا ذکر ملتا ہے ان میں شری بدھت بدھ مذہب کا آخری ''راع'' تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اسے ایک مسلمان مہم جو آذر جمشید نے ہلاک کر دیا تھا۔ آذر جمشید کے نام کے بارے میں بھی تاریخی کتب میں اختلافات موجود ہیں۔ کسی نے اسے شمشیر، کسی نے آذر، کسی نے آذر جمشید اور کسی نے آذر شمشیر کے ناموں سے موسوم کیا ہے۔ اس کتاب میں آذر جمشید کا نام استعمال کیا جا رہا ہے تا کہ قارئین کو سمجھنے میں سہولت ہو۔ آذر جمشید نے شری بدھت کی ایک بیٹی سے شادی کر کے ایک نئے خاندان ''تراخان'' کی بنیاد ڈالی۔ آذر اور تراخان ترکی نام بتائے جاتے ہیں۔ کہتے ہیں اس زمانے میں بدخشان اور گلگت کی مملکتوں کے درمیان قریبی تاریخی تعلقات تھے۔ ''گلگت کی تاریخی داستان'' نامی کتاب میں ڈاکٹر لٹنر نے اس علاقے کے ابتدائی دور کے واقعات کو واضح انداز میں قلمبند کیا ہے۔ اس تاریخی داستان کو کئی طریقوں سے بیان کیا گیا ہے۔ گلگت میں کئی صدیوں تک حکمرانی کا شرف خاندان تراخان کو حاصل رہا ہے۔ حکمران خاندان تراخان کا مورث اعلیٰ آذر جمشید کے نام سے معروف تھا۔ آذر جمشید سے پہلے راجہ شری بدھت ان علاقوں میں حاکم تھا۔ ان کے بعد بگورتھم ان علاقہ جات کا والی مقرر ہوا۔ جس نے ایک لمبے عرصے تک حکومت کی۔ اس کے بعد اس کا بیٹا اگرتھم راجہ بنا۔ اگرتھم گری یعنی ایک سہ پہلو چٹان تھوپ چھار گلگت کے متصل دریائے گلگت کے درمیان واقع ہے۔ اس چٹان کے تینوں کونوں پر ایک ایک مربع فٹ کے متعدد سوراخ ہیں، جن میں لوہے کے سلاخ گاڑھ کر ان کے اوپر ایک خوبصورت مینار تعمیر کیا گیا تھا جو راجہ شیر علی خان والئی گلگت کے زمانے تک موجود تھا۔ لیکن اس کے بعد محفوظ نہ رہ سکا۔ اس راجہ کے دور میں چینی ترکستان، بلتستان، لداخ، تبت، کشمیر اور بدخشان کے ساتھ گلگت کے تجارتی روابط استوار تھے۔

ان علاقوں میں شری بدھت نامی ایک ظالم حکمران کا افسانوی واقعہ لوگوں میں بہت مشہور ہے، جسے یہاں بیان کیا جاتا ہے۔ لیکن اس طرح کے دیو مالائی واقعات کو تاریخ کا حصہ قرار نہیں دیا جا سکتا۔ روایت کے مطابق راجہ شری بدھت اگرتھم کا اکلوتا بیٹا تھا۔ اس لیے بڑے ناز و نعم میں پروان چڑھ کر عیش و عشرت کا دلدادہ ہوا۔ خود پسندی اور مردم آزاری اس کا شعار تھا۔ اخلاق سوز اور بے ہودہ حرکات اور فضولیات میں اس کی زندگی صرف ہوئی۔ رعایا اس کے مظالم سے بہت تنگ آ چکی تھی۔ اس زمانے میں یہ دستور تھا کہ راجہ شری بدھت کی خوراک کے لیے صبح و شام دو بکری کے بچے یکسالہ یا دوسالہ شاہی دربار میں پیش کیے جاتے۔ بدقسمتی سے ایک دفعہ ایک بڑھیا نے بکری کا وہ بچہ شری بدھت کے حضور پیش کیا، جسے اس نے انسانی دودھ سے پالا پوسا تھا۔ راجہ کو یہ طعام بہت ہی پسند آیا۔ تفتیش کرنے پر معلوم ہوا کہ موضع دینور کی ایک بڑھیا نے یہ بکری کا بچہ اس کی ماں کے مرنے کے بعد اپنی دختر یا بہو کے دودھ سے پالا تھا۔ ظالم شری بدھت کا شوق اور بڑھا کہ جب انسانی دودھ کے اثر سے مویشی کا گوشت اس قدر لذیذ ہوتا ہے تو خود انسان کا گوشت کس قدر لذیذ ہوگا۔ پس اس ظالم نے حکم دیا کہ آئندہ اسے انسانی بچوں کو بطور خوراک صبح و شام پیش کیا جائے۔ بادشاہ کے اس حکم کی تعمیل ہوتی رہی۔ صبح و شام نو خیز بچوں کے گوشت سے ظالم شری بدھت کے دسترخوان کو سجانے کا سلسلہ کئی سالوں تک جاری رہا۔ عوام بے چارے اپنے جگر پاروں کی خون ریزی کو دیکھ کر خون کے آنسو روتے رہے۔ قریب تھا کہ چند سالوں میں نسل انسانی کا سلسلہ منقطع ہو جائے، عوام پروردگار عالم کے حضور اس قدر گڑگڑائے کہ رحمت خداوندی جوش میں آئی اور شاہ رئیس خان کے مطابق اسی اثناء میں آذر جمشید نامی ایک شخص کو خدا نے اس طرف مسیحا بنا کر بھیجا، جس نے یہاں کے عوام کو ظالم اور جابر حکمران سے نجات دلانے کی خاطر نہ صرف شری بدھت کے قریبی وزیروں اور مشیروں کے ساتھ ساز باز کیا بلکہ اس کی نیک سیرت بیٹی نور بخت سے شادی کر کے اسے بھی اپنا ہمراز بنا لیا۔ شری بدھت کے وزراء نے آذر جمشید سے ساز باز کے بعد شری بدھت کی حکومت کا خاتمہ کرنے اور لوگوں کو ان کے مظالم سے نجات دلانے کا مصمم ارادہ کیا۔ روایت کے مطابق شری بدھت کا دل سیسے کا تھا اور آگ کے علاوہ کوئی چیز شری بدھت کی موت کا سبب نہیں بن سکتی تھی۔ اسی لیے اسے آگ اور گرمیوں کے موسم سے سخت نفرت تھی اور وہ شروع موسم بہار سے ابتدائی موسم گرما تک کوہ ہپو کر کے محلات میں رہتا تھا اور گرمیوں کے ایام میں دور دراز کے سرد ترین مقامات پر جایا کرتا تھا اور انتہائی سردی میں گلگت واپس آتا تھا۔ جائے لوٹو ملکہ نور بخت کا رضاعی باپ بھی تھا اور شری بدھت کا وزیر اعظم بھی۔ اس کے علاوہ مختلف اقوام کے چار وزرائے مملکت، شری بدھت کے زیر نگیں مختلف علاقوں کے نظم و نسق کے لیے مامور تھے۔ شری بدھت کی غیر حاضری میں مذکورہ چار وزراء مع وزیر اعظم مملکت کے سیاہ و سفید کے مالک ہوتے تھے۔ یہ پانچوں وزراء بھی شری بدھت کی

شبانہ روز خونریزی اور آدم خوری سے تنگ آ چکے تھے اور سخت متنفر ہو چکے تھے۔ اپنے باپ شری بدھت کے بالکل برعکس ان کی بیٹی نور بخت نہ صرف پیکر حسن و جمال تھی بلکہ از حد رحمدل، خدا ترس اور صاحب کردار بھی تھی۔ وہ اپنے باپ سے سخت نفرت کرتی تھی۔ اس لیے اپنے باپ کی حکومت کے خلاف سازش میں وہ بھی شریک ہوگئی۔ صلح مشورہ کے بعد آذر جمشید کی شادی ملکہ نور بخت سے نہایت راز دارانہ طریقے سے کردی گئی اور یہ راز شری بدھت سے پوشیدہ رکھا گیا۔

یہاں پر روایات میں اختلاف ہے، حشمت اللہ خان کے مطابق نئی شاہی سلطنت کے حکمران کا نام شمشیر تھا، جس نے شری بدھت کی بیٹی نور بخت سے شادی کی اور 1120ء تا 1160ء یعنی 40 سال تک اس کی حکومت رہی۔ جبکہ شاہ رئیس خان کے مطابق نئے حکمران کا نام شاہ آذر جمشید تھا جس کا تعلق خاندان کیانی سے تھا اور اسی نے ملکہ نور بخت سے شادی کی تھی۔ اس نے (آذر جمشید) 643ء سے 659ء یعنی سولہ سال تک حکمرانی کی۔ ان کے دور میں رعایا بڑی خوشحال تھی۔ میجر جے بڈلف چودھویں صدی سے تراخان حکمرانی کا آغاز بتاتے ہیں۔ جبکہ جنرل کننگھم کا خیال ہے کہ تراخان دور کا آغاز تیرھویں صدی سے ہوا۔ فریڈرک ڈریو بانی حکمران تراخان کے بعد اس خاندان کے نو حکمرانوں کا ذکر کرتے ہیں۔ اگر فی کس تیس سال عمر شمار کی جائے تو تراخان کی حکومت کا آغاز سولھویں صدی میں چلا جاتا ہے۔ خاندان تراخان کے حکمرانوں کا ذکر حشمت اللہ خان نے نہیں کیا ہے۔ ڈاکٹر احمد حسن دانی کے مطابق حشمت اللہ خان نے گلگت اور بدخشان کے مابین تاریخی روابط کا تذکرہ نہیں کر کے غلطی کی ہے۔ دوستی کی بنیاد پر قائم یہ روابط اس وقت اور بھی مستحکم ہوئے جب حیدر خان کی بدخشانی شہزادی سے شادی ہوئی۔ بہر حال گمان یہی ہے کہ حکمران خاندان شمال سے ہی یہاں آئے۔ اسلام کا پہلا مبلغ بھی بدخشان سے یہاں آیا۔

صرف مذکورہ دونوں مصنفین کی مرتب کردہ تاریخی کتابوں میں واقعات اور حکمرانوں کے ناموں کے بارے میں ہی اختلافات نہیں بلکہ کئی اور کتابوں کے مطالعہ سے بھی ان اختلافات کا پتہ چلتا ہے۔ پروفیسر عثمان علی اپنی کتاب ''قراقرم کے قبائل'' کے صفحہ نمبر 507 پر ان اختلافات کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ شاہ رئیس خان نے اپنی تاریخ میں جو ادوار بتائے ہیں وہ موازناتی تاریخ سے کسی طرح نہیں ملتے۔ پروفیسر دانی بھی ان ادوار کو تسلیم نہیں کرتے۔ بہت سارے نامور مؤرخین کی تاریخیں راجہ شاہ رئیس خان کی تاریخوں سے صدیوں کے فاصلے پر ہیں مثلاً ترخنی دور کے آغاز کے بارے میں تمام مورخین اور ماہرین عمرانیات اپنی الگ الگ رائے رکھتے ہیں اگرچہ وہ ایک دوسرے کے زیادہ قریب ہیں لیکن وہ تمام راجہ شاہ رئیس خان سے بڑا اختلاف رکھتے ہیں۔

مختصر یہ کہ ملکہ نور بخت خاتون حاملہ ہوگئی۔ اتفاق سے انہی دنوں میں ان کے حمل کی مدت پوری ہوئی جن دنوں شری بدھت کا ورود گلگت میں ہونے والا تھا۔ جس دن سر شام راجہ شری بدھت گلگت وارد ہوا اس سے پہلے یوم کی رات ملکہ نور بخت خاتون کا ایک حسین و جمیل بیٹا پیدا ہوا۔ شہزادی اپنے والد کے خوف سے لرزہ براندام ہوئی کہ کہیں شری بدھت گلگت وارد ہو کر حسب معمول میری ملاقات کے لیے سونی کوٹ نہ آ جائے۔ نہایت بدحواسی کے عالم میں ملکہ نے ایک صندوق تیار کرایا اس میں روئی کا تختہ بچھا کر اس پر نرم بستر ڈال دیا اور نومولود فرزند کو دودھ پلا کر اس میں سلا دیا۔ تین سو تولہ سونا پارچے میں باندھ کر ایک خط لکھ کر بچے کے سرہانے رکھ دیا جس میں یہ تحریر تھا کہ جو شخص اس صندوق کو دریا سے نکالے سو تولہ سونا اس کی خدمت کا صلہ ہے اور جو شخص اس کی پرورش کر کے جوان کرے سو تولہ اس کی محنت کا معاوضہ ہے اور جو استاد اسے زیور تعلیم سے آراستہ کرے باقی ماندہ سو تولہ سونا اس کی خدمت کا صلہ ہے۔ اس کے بعد اپنے لخت جگر کو صندوق میں رکھ کر اسے دریائے گلگت میں بہا دیا۔ گلگت پہنچ کر شری بدھت نور بخت کے پاس آیا ملکہ نے دروازے تک باپ کا استقبال کیا اور باپ نے فرط محبت سے ان کو گلے لگایا۔ وزراء نے سر شام ہی تمام بلوائیوں کو شری بدھت کی آمد کی خبر پہنچا کر انہیں خبردار کیا تھا۔ شہزادہ آذر جمشید مسلح ہو کر کمین گاہ میں پوشیدہ رہا۔ اس کے بعد شری بدھت اپنی خواب گاہ میں جا کر آرام پذیر ہوا اور شہزادی اپنی خواب گاہ چلی گئی۔ رات کے پچھلے پہر برجی سونی کوٹ میں شہزادی کے محل کی سب سے اونچی منزل میں روشنی جلائی گئی۔ اسی روشنی کے اشارہ پر میدان کنو داس کے اوپر پہاڑ کے ایک ایسے مقام پر آگ روشن کی گئی جس کی روشنی تمام گلگت میں دکھائی دیتی تھی۔ بس پھر کیا تھا کہ گلگت کی مضافات میں چوب چراغوں میں روشنی ہوئی اور چاروں طرف لوگوں کا ہجوم شری بدھت کے محل کی طرف امڈ آیا چونکہ راجہ شری بدھت کے ملازم بھی اس انقلاب کی سازش میں شریک تھے اس لیے اس کے احکامات کی کسی نے بھی تعمیل نہیں کی۔ شری بدھت شدت غیض و غضب سے بالا خانے سے نیچے اترا۔ غصہ سے ان کی آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا۔ اصطبل کے دروازے پر پہنچ گیا تھا کہ اس کا اگلا قدم اس کنویں کی چھت پر پڑا جسے اسی مقصد کے لیے بنایا گیا تھا۔ ابھی شری بدھت کنویں میں گرا نہیں تھا کہ آذر جمشید کا چھوڑا ہوا تیر سینے کو چھید کر پشت کے پار نکلا اور شری بدھت اپنے بھاری بھرکم وزن کے ساتھ کنویں کی تہہ میں جا پہنچا۔ مشتعل لوگوں کے ہجوم نے اپنے اپنے ہاتھوں میں موجود لکڑی کے تمام چراغ اس کنویں میں ڈال دیئے، جس سے وہ کنواں آتش کدہ جہنم بن گیا اور یوں ظالم شری بدھت کیفر کردار تک پہنچ گیا۔ دوسرے دن آذر جمشید کی تخت نشینی کی رسم ادا کی گئی۔ جب شہزادہ جمشید اور دوسرے اراکین دربار کو یہ علم ہوا کہ ملکہ نور بخت خاتون نے

اپنے باپ کے خوف سے اپنے فرزند کو دریا برد کیا ہے تو ان کو بہت ہی رنج ہوا۔ ریاست گلگت کی آخری سرحد تک دریائے گلگت اور دریائے سندھ کی دونوں جانب بہت کوشش کے باوجود کوئی صندوق برآمد نہیں ہوا۔ ایک روز آذر جمشید نے اپنے وزراء کو جمع کیا اور حکم دیا کہ میری عدم موجودگی میں عنان حکومت ملکہ سنبھالے گی۔ وزیراعظم ملکہ کے نائب کے فرائض سرانجام دے گا۔

یوں آذر جمشید ارباب اقتدار کو کچھ ہدایت دے کر شکار کے بہانے چند مصاحبوں کو ساتھ لے کر چل پڑا اور پھر واپس نہیں لوٹا۔ ملکہ نور بخت خاتون کا دور حکومت 659 سے 668ء تک رہا۔ رعایا میں ملکہ بے حد مقبول تھی۔ زعمائے سلطنت کو اچانک خیال آیا کہ ملکہ کے بعد کوئی وارث تخت و تاج نہیں ہے۔ پس قبل از وقت کسی ملک کے شہزادے سے ملکہ کی شادی کرائی جائے تاکہ وارث تخت و تاج پیدا ہو۔ چنانچہ اس امر کی تصفیہ کیلئے کہ ملکہ کی شادی کس ملک کے شہزادے سے ہونی چاہئے، تمام وزراء اور چیدہ چیدہ جہاندیدہ اور سنجیدہ لوگ صلح و مشورہ کے لیے بیٹھ گئے۔ لوگ موضوع کے مطابق اپنی اپنی آراء سے نواز رہے تھے کہ یکا یک برسر دربار ایک پالتو مرغ نے اذان دی اور آخر میں بروشسکی زبان میں یہ جملہ اس بے زبان مرغ کی زبان پر آیا کہ ''بلداس تھم بئ'' یعنی ''بلداس میں راجہ موجود ہے'' اس آواز کو سب نے سن لیا مگر کسی نے توجہ نہیں دی۔ عین گرمئ گفتگو میں اس مرغ نے دوبارہ اذان دے کر اس جملے کو پھر دہرایا مگر پھر بھی کسی نے پرواہ نہیں کی۔ جب تیسری بار بھی یہی جملہ صاف اور صحیح الفاظ میں اس بے زبان کے منہ سے نکلا تو اس دفعہ اہل دربار چونک پڑے اور تکرار کے ساتھ یہ الفاظ ایک بے زبان کے منہ سے نکلنے کو ہاتف غیبی کی بشارت سمجھ کر چند ہوشیار آدمیوں کو تحقیق حال کے لیے بلداس بھیج دیا۔ بلداس گلگت کے شمال مغرب کی طرف چند کلومیٹر کے فاصلے پر دریائے گلگت کی دوسری جانب واقع ہے اور آج کل اس چھوٹی بستی کو سکارکوئی (پرتاب سنگھ پورہ) کہتے ہیں۔ سرکاری کاغذات میں یہ بستی ''سونیار باغ'' کے نام سے بھی موسوم رہی ہے۔ اس زمانے میں اس پتی میں صرف ایک ہی گھر تھا۔ صاحب خانہ کا نام ''زرگر گڈوس'' تھا جو زرگر پیشہ تھا اور طلاکشی بھی کرتا تھا اور یہ شخص کچھ لکھا پڑا بھی تھا۔ حکومت کے نمائندے ''زرگر گڈوس'' کے گھر پہنچے اور چند لڑکوں کو باہر کھیلتے دیکھا۔ ان میں ایک لڑکا خوبصورت تھا اور اس کا قد و قامت بھی گڈوس کے حقیقی بیٹوں سے جدا تھا۔ نمائندوں نے گڈوس کو اس کے لڑکوں کے ساتھ دربار میں پیش کیا۔ پہلے پہل تو گڈوس نے اس خوبصورت اور حسین و جمیل لڑکے کو بھی اپنا حقیقی بیٹا کہتا رہا۔ لیکن ارباب اقتدار کی طرف سے دباؤ بڑھا تو اس نے تمام کہانی صاف صاف بتائی اور کہا کہ آج سے بیس سال قبل راجہ شری بدھت کے قتل کی صبح بمقام مسینی یعنی دریائے گلگت اور ہنزہ نگر کے سنگھم پر میں طلاکشی میں مصروف تھا کہ ایک صندوق دریائے گلگت میں بہتے ہوئے سامنے دکھائی دیا۔ میں نے صندوق باہر نکالا اور اس میں دی گئی ہدایات کے مطابق اس لڑکے کی تربیت کی۔ لیکن مجھے آج بھی معلوم نہیں کہ یہ بچہ کس کا ہے۔ جب ملکہ نور بخت کو احوال معلوم ہوئے تو اسے کامل یقین ہو گیا کہ یہ جوان ان کا اکلوتا فرزند ہے۔ صندوق کو دریا میں ڈالنے کی تاریخ، یوم و سال، موسم اور مدت کو ملکہ نے اپنی یادداشت کے عین مطابق پایا اور اپنے ہاتھ سے لکھی ہوئی تحریر کو بھی شناخت کر لی۔ بس پھر کیا تھا کہ الفت مادر جوش میں آئی، بے تابانہ اپنے لڑکے کی طرف دوڑی اور اسے سینے سے لگا لیا۔ زرگر مذکور کو ملکہ نے انعام و اکرام سے نواز کر رخصت کیا۔ گڈوس نے شہزادے کا نام ''کرک'' رکھا تھا۔ ملکہ نے شہزادہ کو مزید تعلیم دلوائی اور جب شہزادہ ''کرک'' زیور تعلیم سے آراستہ ہوا تو ملکہ بحق فرزند تاج و تخت سے دستبردار ہوئی اور ایک معینہ تاریخ سعید پر نہایت تزک و احتشام کے ساتھ ملکہ نے اپنے فرزند ارجمند کی رسم تاجپوشی ادا کر دی۔ ملکہ کا نو سالہ دور حکومت امن و امان سے گزرا۔ ان کی حدود سلطنت بھی وہی تھیں جو راجہ شری بدھت اور آذر جمشید کی حکومت کی تھیں۔ شاہ رئیس کے مطابق، شہزادہ کرک کی تاجپوشی 25 سال کی عمر میں ہوئی اور گلگت پر 668ء تا 723ء یعنی 55 سال تک ان کا اقتدار قائم رہا۔ جبکہ بعض روایات سے ان حکمرانوں کے دور اقتدار کی تاریخوں میں کئی صدیوں کا فرق معلوم ہوتا ہے۔ بہر حال ان کا زمانہ حکومت گلگت کی اقبال مندی اور سربلندی کا زمانہ تھا اور رعایا نہایت ہی آسودہ حال و خوشحال تھی۔ یہ راجہ ایک طرف اپنے نانا شری بدھت کی طرح دیوہیکل، شہ زور، جری اور بہادر تھا تو دوسری طرف اپنے نانا کے برعکس بڑا خلیق، رحمدل اور ملنسار بھی تھا۔ روایت کے مطابق گلگت کی تاریخ میں کئی حکمران خواتین کے نام بھی مذکور ہیں۔ جن میں ملکہ نور بخت، ملکہ جوار خاتون، ملکہ صاحب نما وغیرہ وغیرہ شامل ہیں۔ ایک روایت کے مطابق 1120ء میں شری بدھت کے قصر شاہی کو آذر جمشید کے حکم سے مسمار کرتے وقت ''خوطو'' کے کہے ہوئے اشعار سے اس وقت کے ماحول اور سیاسی حالات کی عکاسی ہوتی ہے۔ ''خوطو'' دیہاتی ڈیم سنگھ کا بیٹا تھا۔ متعلقہ اشعار درج ذیل ہیں:۔

کرو تھے توشری گہ بدھت جے کرو
ڈیم سنگہ ای خوطو کرو
نائے چمری کلہ تھے راکے پھلٹم، حکہ!
تتو شاٹشو ملکہ ڈیم سنگہ ای
خوطو کرو نائے چمری کلہ تھے
تھئی راکے گہ پھلٹم، حکہ!

ترجمہ: شری بدھت کہتا ہے کہ میری فطرت سخت ہے لیکن وہ کس طرح سخت

ہے۔ میں، ڈیم سنگھ کا بیٹا خوطو کی فطرت اس سے بھی سخت ہے۔ دیکھ اے ملعون خاندان کے آدمی! اس لوہے کے بیلچے سے میں، ڈیم سنگھ دہقان کا بیٹا خوطو، تیرے قصرِ شاہی کو زمین بوس کردوں گا۔ اور تو دیکھتا ہی رہے گا۔

شری بدھت کی حکومت نہ صرف ظالمانہ تھی بلکہ ریاست کے تمام لوگ اس سے متنفر بھی تھے۔ یہی وجہ تھی کہ اس کے خلاف ساز باز میں اس کے وزیروں اور مشیروں کے علاوہ اس کی بیٹی نور بخت بھی شریک ہوئی۔ شری بدھت کی حکومت کے خاتمے کے بعد بھی کئی صدیوں تک ان کے مظالم کا خوف لوگوں کے دلوں سے نہیں گیا۔

اس ظالم بادشاہ کا خوف یہاں کے عوام کے دلوں میں کس قدر تھا اس کا اندازہ اس تاریخی روایت سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے جو بیسویں صدی کے ربع سوئم تک قائم تھی اور جسے لوگ بڑے اہتمام سے سرانجام دیتے تھے۔ روایت اس طرح سے ہے کہ لوگوں کو ظالم شری بدھت کی موت کا یقین نہیں آرہا تھا اور یہ خبر مشہور ہوئی کہ وہ فرار ہوکر یاسین کی طرف چلا گیا ہے اور وہاں پر موجود ایک گلیشیر کے نیچے زندہ موجود ہے۔ چنانچہ اسی خوف سے کہ کہیں شری بدھت واپس نہ آئے ہر سال ایک معینہ وقت پر گھروں میں ایک خصوصی ڈش جسے مقامی لوگ ''ڈُلی'' کہتے ہیں کا خصوصی اہتمام کیا جاتا اور سرِشام محلے کے لوگ کھلے آسمان تلے ایک جگہ جمع ہوتے اور تناول ماحضر کے بعد محلے کے جوان مشعل ہاتھ میں لیے آبادی سے دور جاتے اور مشعل جسے عرف عام میں ''تلینے'' کہتے ہیں وہاں پھینک دیتے اور لوٹتے ہوئے اس کی طرف مڑکر دیکھنے کی اجازت بھی نہیں تھی۔ شری بدھت یا اس کی روح کو گلگت کی طرف آنے سے روکنے کے لیے لوگ یہ عمل کیا کرتے تھے۔ مختلف علاقوں میں یہ رسم قدرے تفریق کے ساتھ ادا کی جاتی تھی۔ اب یہ رسم نہیں ہے۔

شاہ رئیس خان نے تاریخ گلگت میں 700ء اور 800ء کے درمیان گلگت پر تاتاریوں کے حملے کا ذکر بھی کیا ہے۔ جس کے مطابق ان کی یلغار کو روکنے کے لیے بری خان نو تعمیر شدہ یاسین کے قلعہ بری کھن کو مدافعت کے لیے مضبوط کرتا ہے اور راجہ گلگت سے مدد طلب کرتا ہے۔ بری خان راجہ شاہ ملک کا پروردہ بھائی تھا اور جسے یاسین کا عامل مقرر کیا گیا تھا جبکہ یاسین کا اصل والی شاہ فرمائش تھا، جو شاہ ملک کا رشتہ دار تھا۔ شاہ ملک اپنی فوج لے کر درکوت تک پیچھا کرتا ہے۔ اس دوران اس کا گھوڑا مرجاتا۔ گھوڑے کے فراق میں راجہ شاہ ملک نڈھال ہوکے گرتا ہے۔ تاتار بھاگتے ہوئے اپنے ساتھ شاہ ملک کو بھی تاشقند لے جاتے ہیں، جہاں اسے تقریباً آٹھ سال تک رکھا جاتا ہے۔ پھر ایک دن وہ تاشقند سے فرار ہوکر یاسین اور یاسین سے گلگت آتا ہے۔ بتایا جاتا ہے کہ شہزادہ کی آمد کی خوشی میں کئی روز تک جشن ہوتا رہا۔ تاتاریوں کے اس حملے کے بارے میں تاریخ کی کسی اور کتاب میں حوالہ نہیں ملتا ہے۔ شاید کمزور یادداشت کی بنیاد پر 750ء کی چائنیز کی یلغار یا بعد میں خلیفہ مامون کے زمانے میں عربوں کی فتح کا حوالہ دینے کی بجائے تاریخ گلگت میں تاتاریوں کا حوالہ دیا گیا ہو۔ غالباً اس حوالہ میں عربوں کی فتح کی طرف اشارہ ہے۔ یہ فتح 15-814ء میں وقوع پذیر ہوئی۔ دراصل یہ فتح شاہ کابل کی تھی کیونکہ یہی معلوم ہوتا ہے کہ اس خطہ کے حکمران ان کے اتحادی تھے۔ عربی نقش ونگار بھی واخان، بلور، جبال، خاقان اور جبال تبت کے حکمرانوں پر فتح کی نشاندہی کرتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ خلیفہ مامون کے زمانے میں یہ فتح اس وقت ہوئی جب ترک پہلے ہی گلگت کے حکمران تھے۔ اگرچہ تاریخوں میں اختلاف ہے پھر بھی یہ ممکن ہے کہ راجہ سوملک کے دور میں جس واقعہ کا تذکرہ کیا گیا ہے غالباً وہ تذکرہ عربوں کے حملے کا ہی ہو۔

حشمت اللہ خان کی کتاب ''تاریخ جموں'' کے مطابق 1120ء تا 1160 کے درمیان گلگت پر شمشیر (آذر جمشید) کی حکومت قائم رہی۔ اسی دور میں سید شاہ افضل اور دیگر پانچ بزرگوں کی گلگت میں آمد ہوئی اور یہ بھی روایت ہے کہ شمشیر (آذر جمشید) نے پونیال، یاسین اور چترال کو بھی فتح کیا۔ شمشیر (آذر جمشید) کے بعد اس کا بیٹا ملک 1160ء تا 1205ء تک راجہ ہوا۔ جس نے داریل کو بھی فتح کیا۔ ملک کے بعد اس کا بیٹا خان 1205ء تا 1245ء گلگت کا راجہ ہوا۔ 1245ء تا 1290ء کے درمیان ترتراخان جو خان کا بیٹا تھا، اس کا جانشین ہوا۔ ترترا خان اپنی ہی بیوی کے ہاتھوں قتل ہوا اور اس کی بیوہ گلگت کی حکمران بن گئی۔ اس بیوہ کا ایک بیٹا تراخان تھا۔ جب وہ خود عمر رسیدہ ہوگئی تو حکومت تراخان کو سپرد کرکے خود گوشہ نشین ہوگئی۔ بتایا جاتا ہے کہ اس کے دور میں بدخشان سے تاج مغل نے حملہ کیا اور چترال، یاسین، پونیال کو فتح کرکے گلگت پہنچا۔ تراخان کو شکست ہوئی اور تاج مغل گلگت پر قابض ہوگیا۔ تاج مغل نے اسماعیلی مذہب کی اشاعت کی، تراخان نے چالاکی سے فوراً اسماعیلی مذہب اختیار کرکے گلگت کی حکومت تاج مغل سے دوبارہ واپس لے لی۔ تراخان کے بعد 1335ء سے 1390ء تک اس کا بیٹا سوملک اس کا جانشین ہوا۔ اس کے دور میں تاج مغل نے دوسری دفعہ گلگت پر حملہ کیا اور سوملک کو اسیر کرکے بدخشان لے گئے۔ کچھ عرصے کے بعد سوملک وہاں سے بھی جان بچا کر واپس آنے میں کامیاب ہوا۔ اس کے بعد اس کا بیٹا خسرو خان کی 1390ء سے 1435ء تک حکمرانی رہی۔ اس کی حکومت گلگت کے علاوہ پونیال اور استور تک محدود تھی۔ خسرو خان کے بعد اس کے بیٹے حیدر خان نے گلگت کی باگ ڈور سنبھالی اور تاریخی کتب کی رو سے اس کے دور حکومت 1435ء تا 1480ء ہے۔ حیدر خان کے بعد اس کا بھتیجا چلیس خان اور اس کے بعد اس کا بیٹا نور خان

یکے بعد دیگرے گلگت کے حکمران بن گئے۔ 1565ء سے 1600ء تک کے دوران مرزا خان گلگت کا راجہ بنا جو نور خان کا بیٹا تھا۔ مرزا خان کے دور میں چترال سے سنگین علی نے گلگت پر حملہ کر دیا اور مرزہ خان کو مقابلہ کی تاب نہ ہوئی اور وہ بھاگ کر بلتستان چلا گیا۔ مرزا خان نے سکردو جا کر علی شیر خان انچن کے دربار میں شیعہ مذہب اختیار کر لیا پھر مدد کی درخواست کی۔ علی شیر خان انچن اور اس کی فوج نے مرزا خان کی مدد کی خاطر گلگت پر حملہ کیا اور چترال تک فتح و کامرانی کا جھنڈا لہرایا۔ اس طرح گلگت میں مرزا خان کی حکومت پھر سے قائم ہوگئی اور اس کے ساتھ ہی یہاں مذہب شیعہ کی بنیاد بھی پڑ گئی۔ مرزا خان کے بعد اس کا بیٹا علی شیر راجہ بنا جس کا دورانیہ 1600ء تا 1635ء بتایا جاتا ہے۔ علی شیر کے ایک وزیر ریشو نے اس سے تخت حکومت چھین لی اور 1635 تا 1652 ریشو وزیر نے گلگت پر حکومت کی۔ بعد ازاں وزیر ریشو بھی قتل ہوا۔

تاریخ گلگت کی ایک اہم خاتون جواری کی شادی پہلے سکردو میں علی شیر خان انچن کے بیٹے علی محمد خان سے ہوئی تھی بعد ازاں جب طلاق ہوگئی تو وزیر ریشو نے راجہ نگر کے بیٹے فردوس کو بطور خانہ داماد لا کر جواری کی شادی اس سے کر دی۔ جواری سے ایک لڑکا پیدا ہوا جس کا نام حبیب خان تھا۔ چنانچہ جب وزیر ریشو قتل ہوا تو حبیب خان المعروف جبی خان گلگت کے تخت پر متمکن ہوا۔ اپنی ماں جواری کی ولایت میں 1650ء تا 1670ء بیس سال حبیب خان نے اور 1670ء تا 1700ء یعنی تیس سال گوری تھم نے حکومت کی۔ کچھ عرصے کے بعد حبیب خان کے ایک بیٹے نے باپ سے نافرمانی کر کے شاہ رئیس راجہ یاسین کے ساتھ ساز باز شروع کر دی۔ حبیب خان کو جب اس بات کا علم ہوا تو سکردو کے راجہ شاہ مراد سے مدد طلب کی۔ شاہ مراد نے شگر کے راجہ امام قلی خان کو ایک لشکر جرار کے ساتھ گلگت روانہ کر دیا۔ امام قلی خان نے قلعہ نومل کا محاصرہ کر کے چار ماہ کے بعد حبیب خان کے دشمنوں کو گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دیا۔ دو تین سالوں کے بعد گلگت میں پھر فساد برپا ہوا اور اس فساد کو ختم کرنے کے لیے سکردو کے شاہ مراد خود فوج کے ساتھ گلگت پہنچا۔ شاہ مراد نے گلگت کو ایک بار پھر فتح کرنے کے بعد اپنے ساتھیوں میں سے ایک شخص کو گوپس بطور نائب مقرر کر کے خود سکردو واپس چلا گیا۔ 1700ء سے لے کر 1790ء کے درمیانی عرصے کے حکمرانوں کے بارے میں ''تاریخ جموں'' خاموش ہے اس لئے اس زمانے کو چھوڑا گیا ہے۔ مرزہ کی بیٹی جواری کے دور حکومت میں ایک دفعہ مغلیہ فوج نے جب گلگت کے قلعے کا محاصرہ کیا تو اس وقت جواری بیوہ ہو چکی تھی۔

1790ء تا 1814ء کے دور میں گوری تھم ثانی گلگت کا راجہ ہوا بعد ازاں اس کا بیٹا محمد خان نے 1812ء تا 1821ء تک گلگت پر حکومت کی۔ اس دور میں یاسین، پونیال اور نگر کی طرف سے پے در پے گلگت پر حملے ہوئے اور یوں گلگت کی خود مختاری کا خاتمہ ہوا۔ پہلے یاسین کے سلیمان شاہ، عباس خان اور پھر سلیمان شاہ (دوسری بار) تخت گلگت پر متمکن ہوئے۔ 1828ء تا 1833ء پونیال کے راجہ عزت خان نے گلگت میں اپنی حکومت قائم کی جبکہ طاہر خان راجہ نگر نے 1833ء تا 1837ء کے دوران عزت خان پر حملہ کر کے گلگت پر قبضہ کر لیا۔ چار سال کی حکومت کے بعد جب طاہر خان فوت ہوا تو اس کا بیٹا شاہ سکندر نے 1837ء تا 1840ء گلگت پر حکومت کی۔

خاندان ترا خان کی حکومت کے زوال کے بعد گلگت حملہ آوروں کے لیے جولان گاہ بن گیا۔ گوہر امان راجہ یاسین نے سکندر کو قتل کر کے گلگت پر قبضہ کیا اور 1841ء کے دوران ایک سال تک حکومت کی۔ کریم خان نے سکھوں کی فوج کی مدد سے گوہر امان کو نکال کر سکھوں کی سرپرستی میں 1842ء تا 1851ء اپنی حکومت قائم کر دی۔ اس وقت سے گلگت کا تعلق کشمیر سے پیدا ہوا۔ راجہ گوہر امان نے ڈوگروں کے خلاف راجہ ہنزہ کے ساتھ ساز باز کیا اور اقوام داریل بھی اس ساز باز میں شامل ہوگئیں۔ اس متحدہ فوج نے قلعہ گلگت کو تسخیر کیا۔ غالباً یہ 1852ء کا واقعہ ہے۔ گوہر امان کی فوج نے ڈوگرہ فوج کو گاجر مولی طرح کاٹ دیا۔ مناور اور پڑی کے درمیان واقع بھوپ سنگ پڑی آج بھی افواج ڈوگرہ کی پسپائی کی یاد دلا رہی ہے۔

اس جنگ کے نتیجے میں گوہر امان گلگت پر دوبارہ قابض ہوا۔ 1860ء تک ڈوگرے دریائے سندھ کے پار بونجی تک محدود رہے۔ 1860ء میں جب حالات سازگار ہوئے تو مہاراجہ نے ان سرحدی اضلاع کے حصول کے لیے منظم کوششیں شروع کر دی۔ اس سال کرنل ڈیوی سنگھ کی قیادت میں ڈوگروں کی ایک مضبوط فوج گلگت وارد ہوئی۔ جنرل ہوشیار سنگھ سکردو سے گلگت آ چکا تھا۔ اس سال گوہر امان نے وفات پائی۔ لہذا ان حملہ آوروں کو گلگت حاصل کرنے میں کوئی بڑی دشواری پیش نہیں آئی۔ گلگت کا فوجی کمانڈر جنرل ہوشیار سنگھ تھا۔ سول انتظامیہ کا قیام بھی عمل میں لایا گیا اور میاں جواہر سنگھ پہلا وزیر وزارت مقرر ہوا۔

ڈوگروں کا یہ دور گلگت کے لوگوں کے لیے مصائب و آلام کا دور ثابت ہوا۔ ڈوگرے بھوپ سنگھ، سنتو سنگھ، رام دھین وغیرہ کے قتل کو نہیں بھولے تھے۔ لہذا ان کا بدلہ لینے کے لیے گلگت کے بے شمار لوگوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ مڈوری کوٹ (یاسین) کا واقعہ اس کا منطقی نتیجہ تھا۔ ڈوگرہ فوجوں نے اس قلعہ میں محبوس بارہ تا چودہ سو نفوس کو، جن میں بچے، عورتیں اور بوڑھے شامل تھے، دغا بازی سے تہہ تیغ کیا۔ کپتان ہیورڈ، جس نے مڈوری کوٹ کا دورہ کیا، نے کئی انسانی کھوپڑیوں کو دیکھا۔ اس نے مڈوری کوٹ کے قتل عام کو انسانیت کے چہرے پر

ایک بدنما دھبہ قرار دیا۔

1877ء میں انگریزوں نے مہاراجہ کی اجازت سے گلگت میں اپنی ایجنسی قائم کی۔ لیفٹیننٹ کرنل جے بڈلف آفیسر آن سپیشل ڈیوٹی متعین ہوا۔ 1881ء میں ایجنسی نظام کو ختم کیا گیا لیکن 1889ء میں اسے دوبارہ منظم کیا گیا کیونکہ شمال کی طرف سرحدی حالات غیر مستحکم تھے۔ روسی یلغار پر نظر رکھنے کے لیے ایسے انتظامات ضروری تھے۔ لیفٹیننٹ کرنل اے۔ جی ڈیورینڈ پولیٹیکل ایجنٹ مقرر ہوا۔ جس کا کام سرحد پار سیاسی حالات و واقعات پر نظر رکھنا تھا اور یہ دیکھنا تھا کہ روس، افغانستان اور چین کے سیاسی اتار چڑھاؤ کیا ہیں؟ کونسے اور کس قسم کے لوگ ان سرحدی اضلاع میں آتے ہیں۔ ان کے مقاصد کیا ہیں، ہنزہ نگر اور پولیٹیکل ڈسٹرکس کے راجے شمال سے کیسے تعلقات رکھتے ہیں؟ اس دوران گلگت کی سیاست میں کئی نشیب و فراز آئے۔ تاہم انگریز اور ڈوگرے مشترکہ حکمران رہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ انگریزوں کے عمل دخل میں غیر معمولی اضافہ ہوگیا کیونکہ انہیں ان علاقوں کی اہمیت کا احساس ہوگیا تھا۔ یہ احساس اس وقت بھی تھا جب کشمیر کو گلاب سنگھ کے ہاتھوں بیچا جارہا تھا۔ اب جبکہ انگریزوں کو احساس ہوگیا تھا کہ بقول ایڈلر گلگت کے بغیر ہند پرسکون نہیں رہ سکتا۔ وہ اسے بفرزون خیال کرتے تھے۔ اس لیے انگریز یہ چاہتے تھے کہ یہ علاقہ مہاراجہ کے متزلزل ہاتھوں میں نہ رہے۔ چنانچہ انہوں نے اسی میں اپنی عافیت سمجھی کہ گلگت کا کنٹرول براہ راست ان کے ہاتھوں میں رہے۔ لہذا 26 مارچ 1935ء کا معاہدہ پٹہ اسی اتار چڑھاؤ کا منطقی نتیجہ تھا۔ 3 اپریل 1935ء کو وائسرائے ہند نے اس معاہدہ کی توثیق کی اور اس پر عملدرآمد کا آغاز ہوا۔ معاہدہ پر مل درآمد ہوتا تو یہ 2 اپریل 1995ء تک موثر رہتا۔ مگر 1947ء میں برصغیر میں برطانوی راج کا سورج غروب ہوا۔ برصغیر دو آزاد مملکتوں، پاکستان اور بھارت میں منقسم ہوا جس کے نتیجے میں تمام سابقہ معاہدات منسوخ قرار پائے۔ ہند کی برطانوی حکومت نے پٹہ کی باقی میعاد منسوخ کر کے گلگت ایجنسی کو مہاراجہ کی تحویل میں دے دیا۔ یکم اگست 1947ء کو مہاراجہ کا مقرر کردہ گورنر بریگیڈیئر گھنسارا سنگھ نے صوبہ سرحدی گلگت کا چارج سنبھالا۔ صوبہ گلگت میں بونجی اور استور کے علاقے بھی ضم کر دیئے گئے۔ جو 1935ء کے معاہدے کے بعد مہاراجہ کی براہ راست تحویل میں تھے جہاں ایک ریونیو اسسٹنٹ کی حکمرانی تھی۔ 27 اکتوبر 1947ء کو مہاراجہ ہری سنگھ نے کشمیر کا بھارت کے ساتھ الحاق کر دیا۔ الحاق کا فیصلہ یہاں کے لوگوں کے لیے ناقابل قبول تھا۔ یہی وجہ تھی کہ یہاں کے عوام نے فیصلہ کیا کہ وہ مہاراجہ کی غلامی کے بندھن توڑ ڈالیں گے اور آزادی حاصل کریں گے۔ چنانچہ یہاں کے رہنے والوں نے متحدہ کوششیں شروع کیں۔ ان کی کوششیں بارآور ثابت ہوئیں۔ اور یکم نومبر 1947ء کو گلگت اور اس سے ملحقہ علاقے آزاد ہوئے۔ یکم نومبر 1947ء سے لے کر 15 نومبر 1947ء تک یہ علاقہ مقامی لوگوں کی جمہوری کونسل کی تحویل میں تھا۔ اس جمہوری کونسل کا صدر شاہ رئیس خان تھا۔ 16 نومبر 1947ء کو حکومت پاکستان کے نمائندے سردار محمد عالم خان نے گلگت کا کنٹرول اپنے ہاتھوں میں لیا۔ 1842ء سے 31 اکتوبر 1947ء تک سکھ، ڈوگرے اور انگریز ہم پر حکومت کرتے رہے جبکہ 1842ء سے پہلے مطلق العنان راجاؤں کی حکومت تھی۔ ماضی بعید کے حالات کا عام روایات اور لوک گیتوں سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ گلگت اور اس کی مضافات میں مختلف راجاؤں کی حکومت رہی ہے اور جمہوری حکومت کا رواج یہاں پر نہیں رہا ہے۔ یہ بھی عجیب بات ہے کہ جن راجاؤں نے یہاں حکومت کی ہے وہ عموماً باہر سے آئے ہوئے لوگ تھے۔

مختلف ادوار میں وقتاً فوقتاً بزرگان دین اسلام کی تبلیغ کے لیے یہاں آتے رہے۔ شاہ رئیس خان کے مطابق راجہ سوملک اپنے والد راجہ کرک کے بعد چالیس سال کی عمر میں برسر اقتدار آئے اس راجے کے اوائل عہد حکومت میں ایک خدا رسیدہ بزرگ سید شاہ فاضل یا شاہ افضل علاقہ بدخشان سے ہوکر اس علاقے میں آئے، ان کی تبلیغ سے امراء اور عوام دائرہ اسلام میں داخل ہوئے۔ راجہ سوملک کی کوئی نرینہ اولاد نہیں تھی۔ اسی بزرگ کی دعا سے اس کا بیٹا شاہ ملک پیدا ہوا۔ سید شاہ افضل کی وفات کے بعد راجہ سوملک نے قلعہ گلگت کے اندر غربی کنارے پر عزت و احترام سے ان کی میت کو سپرد خاک کر دیا۔ اس قلعہ کا اب نام و نشان تک باقی نہیں لیکن موصوف کی زیارت گاہ کشمیری بازار کے عقب میں آج بھی موجود ہے۔ لیکن بدقسمتی سے اس مقدس زیارت کی دیکھ بال کا کوئی بندوبست نہیں۔ ارض شمال میں اسلام کی بنیاد سیدوں نے رکھی۔ انہوں نے پورے خطے کو جہالت کے اندھیروں سے نکال کر نور اسلام سے منور کیا۔ البتہ ان علاقوں میں اسلام یکبارگی نہیں آیا بلکہ اسلام کے سانچے میں ڈھلتے ڈھلتے بھی لوگوں کو کئی صدیاں لگی ہیں۔ کیونکہ اسلام قبول کرنے والی پہلی نسل تو محض کلمہ پاک پڑھ کر مشرف بہ اسلام ہوئی، دوسری نسل نے کچھ اصول اور ضابطے اپنائے جبکہ تیسری نسل نے کچھ خرافات چھوڑ کر کردار سازی کی طرف توجہ دی۔ لیکن کئی صدیاں گزرنے کے باوجود یہاں کے لوگوں نے بعض رسموں کو تادیر نہیں چھوڑا۔ مثلاً گلگت میں چراغ تربت جلانا، گل خنوں کا احترام اور پتھروں اور چٹانوں سے محبت کے سلسلے ماضی قریب تک جاری تھے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شجر اسلام کو پروان چڑھتے چڑھتے تن آور درخت بننے تک کئی صدیاں صرف ہوئیں۔

گلگت میں اسلام کی آمد اور صوفیاء:

مؤرخین کا خیال ہے کہ گلگت میں اسلام پندرھویں اور سولھویں صدی میں آیا۔ پروفیسر دانی کے مطابق گلگت میں اسلام کی تبلیغ کی خاطر جو چھ مبلغ آئے وہ میر شمس الدین عراقی کے پیروکار تھے۔ جنہیں شمس الدین عراقی نے سولھویں صدی کے وسط میں اکبر اعظم کے دور سے پہلے بغرض تبلیغ گلگت بھیجا تھا۔ دانی ان چھ مبلغین میں سید سلطان ولی امپھری زیارت والے، سٹی تھانہ گلگت کے عقب والے بزرگ کی زیارت، کشمیری بازار سے متصل شمالی جانب واقع زیارت، ہائی سکول گلگت کی مشرقی جانب سے متصل زیارت میں مدفون دو بزرگان اور دنیور والے بزرگ سید سلطان عارف کی زیارت گاہوں کے نام شامل کرتے ہیں۔ جبکہ پروفیسر عثمان علی پروفیسر دانی کے اس خیال سے کہ ان بزرگان کو شمس الدین عراقی نے تبلیغ کے لئے گلگت روانہ کیا تھا، اختلاف کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ شمس الدین عراقی 1526ء میں وفات پائے تھے۔ وزیر حشمت اللہ کے مطابق گلگت میں اسلام کی بنیاد 1120ء میں آذر شمشیر (آذر جمشید) کے دور میں پڑی۔ گو کہ آذر جمشید نے گلگت تسخیر کرنے کے بعد اشاعت اسلام میں کوئی دلچسپی نہیں لی لیکن اس کے دور میں چھ بزرگ سید شاہ بریا ولی، سید سلطان علی، سید شاہ ولی، سید شاہ افضل، سید شاہ اکبر، سید میر ابراہیم سرزمین گلگت میں قدم رنجہ ہوئے۔ بہرحال ان نفوس قدسیہ کی آمد کا زمانہ جو بھی ہو ان کی عملی جدوجہد کی وجہ سے علاقے کے لوگ بدھ مذہب کو خیرباد کر کے دین اسلام میں داخل ہوئے۔ ایک روایت کے مطابق انیسویں صدی کے تقریباً وسط میں قرآن پاک کا ایک نسخہ پہلی بار یہاں لایا گیا۔ پروفیسر عثمان کے مطابق سید شاہ افضل نے 1555ء سے 1560ء تک گلگت میں تبلیغ اسلام کا فرض نبھایا۔ اسی صدی میں سال 1590ء کے دوران سید بریا ولی نامی ایک اور بزرگ درہ ہسپر عبور کر کے نگر تشریف لائے جہاں اس دور میں بدھ مت، ہندومت اور مجوسیت کا دور دورہ تھا۔ آپ اس طرف آنے والے اولین مبلغ تھے۔ جنہوں نے منظم انداز میں شیعہ مسلک کی تبلیغ کی۔ سید بریا ولی کے بعد اشاعت اسلام کی خاطر نگر ہنزہ میں جو بزرگ تشریف لائے وہ سید شاہ ولی تھے۔ آپ نے یہاں مستقل قیام کیا اور دن رات دین اسلام کی ترقی و ترویج میں صرف کئے۔ پروفیسر دانی کا خیال ہے کہ آپ کا تعلق طوسی برادران (1590 تا 1600ء) سے تھا۔ یہاں کے لوگ ان برگزیدہ ہستیوں سے بے پناہ محبت کرتے تھے۔ ان بزرگان دین کے ساتھ رعایا کی والہانہ محبت حکمرانوں کو ایک آنکھ نہیں بھاتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ حکمرانوں کے ذریعے اسلام ان علاقوں میں کبھی پروان نہیں چڑھا۔ پروفیسر عثمان کے مطابق سید شاہ ولی 1730ء کے بعد اسکردو سے ہسپر کے راستے نگر آئے اور تھول کے مقام پر سکونت اختیار کی۔ گلگت، نگر، حراموش اور بگروٹ کے علاقوں میں شیعہ مسلک بلتستان کے واسطے سے پروان چڑھا۔ ہنزہ، اشکومن، یاسین، گوپس اپنے محل وقوع اور پامیر اور واخان سے متصل ہونے کی وجہ سے اسماعیلیت کے فروغ کے باعث بنے۔ کوہ غذر، پونیال اشکومن اور گوپس یاسین میں چترال کے شاہ کٹور اور ورشی گھوم کے خوش وقت حکمرانوں کے ذریعے کسی حد تک سنی مسلک پروان چڑھا۔ والیٔ یاسین سلیمان شاہ اسلام کے شیدائی تھے۔ آپ کے سید احمد شہید سے قریبی تعلقات تھے اور ان کے درمیان خط و کتابت بھی ہوتی تھی۔ جب گوہر امان برسر اقتدار آئے تو بھی پشاور کے علماء کے ساتھ رابطے استوار تھے۔ اسی طرح اہل استور نے کشمیر سے متصل ہونے اور پیروں کی تبلیغ کی وجہ سے سنی مسلک اختیار کیا۔ اس سلسلے میں پیرزادہ سید اکبر شاہ کی دینی خدمات کے حوالے موجود ہیں۔ جبکہ چلاس اور داریل تانگیر کے علاقے کے لوگوں نے سوات اور ہزارہ سے متصل ہونے کے ناطے اور بزرگان دین کی تبلیغ کی وجہ سے اہل سنت کا مسلک اپنایا۔ گلگت میں اسلام کی تبلیغ کے حوالے سے سید شاہ سلطان الف یا میر سلطان الف کو اہم مقام حاصل ہے۔ آپ تقریباً 1680ء میں گلگت تشریف لائے۔ آپ نے دین اسلام کی تبلیغ کے لئے گلگت کو اپنا مرکز بنایا۔ 1710ء کے متصل زمانے میں آپ نے وفات پائی۔ اور آپ کو دنیور میں سپرد خاک کر دیا گیا۔ آپ کی زیارت آج بھی مرجع خلائق ہے۔ امپھری گلگت کی زیارت کے بارے میں بعض لوگ یہاں مدفون بزرگ کا نام سید ابراہیم، کوئی سید سلطان ولی اور کوئی سید علی بتاتا ہے۔ پروفیسر دانی آپ کو ان چھ مبلغین میں شمار کرتے ہیں جن کو میر شمس الدین عراقی نے یہاں بھیجا تھا۔ اور جس کا نام سید سلطان ولی تھا۔ لیکن پروفیسر عثمان کا کہنا ہے کہ اس طرف آنے والے مبلغین کا عراق سے کوئی تعلق نہ تھا۔ آپ اس بزرگ کا نام سید ابراہیم اور مسلک شیعہ بتاتے ہیں جو 1760ء کے بعد گلگت تشریف لائے۔ ہائی سکول سے متصل شرقی جانب واقع زیارت گاہ میں دو بزرگ ہستیاں مدفون ہیں۔ کہتے ہیں کہ یہ دو بھائیوں کی قبریں ہیں جو کہ کشمیری پیرزادہ سید تھے۔ ایک کا نام پیرزادہ سید شاہ اکبر اور دوسرے کا نام پیرزادہ سید شاہ فضل تھا۔ یہ دونوں بزرگ 1762ء کے متصل زمانے میں تشریف لائے تھے اور آپ دونوں مسلک کے اعتبار سے سنی تھے۔ مولانا ابوالفراح کا کہنا ہے کہ ان زیارات مقدسہ پر شیرآ کر سر جھکایا کرتے تھے۔ سٹی تھانہ کے عقب میں واقع زیارت سید محمود بابا کی ہے۔ آپ ہزارہ سے یہاں تشریف لائے۔ آپ کا تعلق بھی سنی مسلک سے تھا۔ چلاس اور داریل تانگیر میں اسلام ہزارہ اور سوات کی جانب سے 1760ء کے بعد پھیلا۔ ان علاقوں میں دین اسلام کی ترقی کا باعث کاغان کے سادات بنے۔ ساداتِ کاغان، پیر بابا بنیر، حضرت سید علی غواص ترمذی کی اولاد سے

ہیں۔سید نور غازی بابا کے آباؤاجداد نے کاغان، بٹہ کنڈی، تھک اور چلاس میں اسلام کی تبلیغ کی۔جبکہ داریل تانگیر کی جانب اسلام پھیلانے میں کابل گرام کے سیری بابا، پکھلی کے سید، مہذوب پیر اباسین کا بڑا ہاتھ ہے۔

ادب، ادیب وشعراء:

ماضی بعید کی ادبی شخصیات کے بارے میں کوئی تحریری مواد دستیاب نہیں۔البتہ شعراء ہر دور میں گزرے ہیں۔پرانے ادوار میں شعراء محض حکمرانوں کی تعریف وتوصیف لکھ کران کی خوشنودی حاصل کرتے تھے۔

ان کا زیادہ وقت حاکموں کی قصیدہ خوانی میں صرف ہوتا تھا۔روایت کے مطابق شنا زبان کا قدیم ترین شاعر ''دینل کھمیٹو'' شمار ہوتا ہے۔عام روایت یہی ہے کہ وہ ایک دینل (کاہن) تھا جس کی طرف کئی ایک پیشن گوئیاں بھی منسوب ہیں۔قبل از اسلام کے اس شاعر نے موجودہ دور کے بارے میں کئی اشارے کیئے تھے جو تقریباً سچ ثابت ہوئے ہیں۔البتہ 1842ء تا 1947ء کے دور میں شنا شعراء نے مذہبی شاعری یعنی دعا، مناجات، حمد الٰہی، مدح، نعت رسولؐ، قصائد، نوحہ جات اور مرثیوں کی طرف توجہ دی۔اس دور کے مشہور شعراء محمد رضا، اخوند مہربان، وزیر احمد خان احمد، صمد خان، وزیر احمد اور خلیفہ رحمت ملنگ گزرے ہیں۔پاکستان بننے کے بعد میدان ادب میں بھی انقلاب آیا۔شنا شاعری نے فراخ اور وسیع میدانوں میں قدم رکھا۔''دینل کھمیٹو'' پچھلے زمانے کا ایک اہم نام تھا جو غیر مسلم دور کا نمائندہ پیشین گو تھا۔

انتظامی اضلاع:

اس وقت شمالی علاقے پانچ اضلاع پر مشتمل ہیں۔ہر ضلع کا انتظامی سربراہ ڈپٹی کمشنر ہے جبکہ چیف سیکریٹری پانچوں اضلاع کے انتظامی امور کا نگران اعلیٰ ہوتا ہے۔گلگت ان علاقہ جات کا دارالخلافہ ہے۔یہ علاقے براہ راست وفاق پاکستان کے ماتحت ہیں اور وزیر امور کشمیر وشمالی علاقہ جات ان کا انتظامی سربراہ ہے۔قانون ساز کونسل شمالی علاقہ جات کا سب سے بڑا سیاسی اور جمہوری ایوان ہے۔وفاقی وزیر امور کشمیر وشمالی علاقہ جات کو قانون ساز کونسل کے چیف ایگزیکٹو کی حیثیت حاصل ہے جبکہ ڈپٹی چیف ایگزیکٹو قانون ساز کونسل شمالی علاقہ جات کے ارکان میں سے منتخب کیا جاتا ہے۔قانون ساز کونسل، شمالی علاقہ جات کی کل نشستیں 24 ہیں۔ہر ضلع سے ایک، ایک کے تناسب سے منتخب ہونے والی خواتین کی پانچ نشستیں ملا کر ان کی تعداد 29 بن جاتی ہے۔وفاقی حکومت کی منظوری سے حال ہی میں قانون ساز کونسل شمالی علاقہ جات کے لئے سپیکر کے علاوہ ڈپٹی سپیکر کی نئی اسامی پیدا کی گئی ہے۔

مختلف ومنفرد اندازِ حکمرانی:

گلگت اور اس کی مضافات میں جب ایجنسی نظام رائج تھا تو ان علاقوں میں تین طرح کے حکمران تھے۔انگریز اگرچہ سرحدوں کی حفاظت کے دعویدار تھے لیکن درحقیقت اصل حکمران ہی وہی تھے۔1889ء سے انگریز پولیٹیکل ایجنٹوں نے ایک طرف اس علاقے کی باگ ڈور سنبھالی جبکہ دوسری طرف وزیر وزارت، گلگت وزارت کے افسر اعلیٰ کی حیثیت سے اپنے فرائض انجام دیتا تھا۔مہاراجہ کی اشیر باد سے مقامی راجے الگ سے حکمرانی کررہے تھے۔گویا تینوں حکمران ٹولے حکمرانی کے مزے لوٹ رہے تھے۔ماہرین 1935ء سے پہلے گلگت ایجنسی کے انتظامی ڈھانچے کا نقشہ کچھ اس طرح کھینچتے ہیں:۔

۱) وزارت گلگت بشمول گلگت، تحصیل استور، نیابت بونجی۔

۲) جاگیر پونیال۔ ۳) ریاست ہائے ہنزہ نگر۔

۴) گورنرشپ یاسین، کوہ وغذر۔ ۵) گورنرشپ اشکومن۔

۶) چلاس ڈسٹرکٹ کے جمہوری قبائل۔ ۷) جنوبی پامیر کا تغدم بش کا علاقہ۔

وزیر وزارت کی تقرری مہاراجہ کشمیر کرتا تھا اور گلگت کی وزارت، وزیر وزارت کے احکامات کی تعمیل کرتی تھی۔انگریز پولیٹیکل ایجنٹ چلاس، پونیال اور دیگر گورنرشپ کے علاقوں کو براہ راست کنٹرول کرتے تھے۔جبکہ ہنزہ نگر کی ریاستیں داخلی طور پر آزاد تھیں لیکن خارجہ امور مہاراجہ اور انگریز نپٹاتے تھے۔چلاس کا انتظام انگریز APA چلاتا تھا۔1935ء کی لیز ایگریمنٹ کے بعد تحصیل استور اور نیابت بونجی کو وزارت گلگت سے الگ کرکے ایک انتظامی اکائی کی شکل میں کشمیر میں شامل کرکے اسے ایک ریونیو اسسٹنٹ کے ماتحت کردیا گیا۔داریل تانگیر کے جنگجو قبائل اکثر آزاد رہے ہیں۔البتہ غذر اور پونیال کے راجاؤں نے وقتاً فوقتاً ان علاقوں پر حکمرانی کی ہے۔لیکن ان سب میں راجہ پختون ولی کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ اس نے داریل تانگیر کے ترش خو قبائل پر بارہ سال تک حکمرانی کی۔کہتے ہیں کہ داریل تانگیر کے بارہ غیر مقامی حکمران راجاؤں کی قبریں اب بھی تانگیر میں ہیں جو قتل کردئے گئے ہیں۔داریل تانگیر کے لوگوں نے قیام پاکستان کے پانچ سال بعد یعنی 1952ء میں ایک معاہدہ کے تحت پاکستان کے ساتھ الحاق کیا۔یکم نومبر 1972ء کو پولیٹیکل ڈسٹرکٹ پونیال، اشکومن، گوپس یاسین سے ایف سی آر کے خاتمے کے ساتھ ہی پونیال اشکومن اور گوپس یاسین کے نام سے دو نئی سب ڈویژنوں کا قیام ایک نوٹیفیکیشن کے ذریعے عمل میں لایا گیا۔جبکہ چلاس اور داریل تانگیر سے فرنٹیئر کرائمز ریگولیشن ایف سی آر کا قانون ختم کرنے کے بعد بارہ مارچ 1973ء کو حکومت پاکستان نے ایک نوٹیفیکیشن کے تحت دو سب ڈویژنوں یعنی

چلاس اور داریل تانگیر سب ڈویژن کے نام سے نہ صرف ان علاقوں کی تنظیم نو کی بلکہ کئی ضابطے اور قوانین کا نفاذ بھی کیا۔ 73-1972ء کے دوران پاکستان کی منتخب عوامی حکومت نے شمالی علاقہ جات بھر سے راجگی نظام کا ہمیشہ ہمیشہ کے لئے خاتمہ کر کے جمہوری اصلاحات کا دروازہ کھول دیا۔

گلگت کی آزادی:

قیام پاکستان کے بعد یہاں کے بہادر لوگوں نے اپنے علاقے کو دشمن کے پنجے سے ہر حال میں آزاد کرانے کا عزم کیا۔ ان کی عملی جدوجہد رنگ لائی اور بالآخر یکم نومبر 1947ء کو جنگ آزادی کے ہیرو مرزہ حسن خان، راجہ بابر خان اور انکے رفقاء کار جن میں احسان علی، شاہ خان، جان عالم، صوبیدار شیر علی، غلام مرتضیٰ ہنزائی، صفی اللہ بیگ، شاہ سلطان نگر، صوبیدار فدا علی، اکبر حسین گوپس، صوبیدار شاہ زمان، بختاور شاہ وغیرہ شامل ہیں، کی عملی جدوجہد سے یہاں کے غیور عوام نے بغیر کسی بیرونی امداد کے نہ صرف مہاراجہ کشمیر کی طویل غلامی کا طوق اپنے گلے سے اتار پھینکا بلکہ گلگت اور اس سے ملحقہ علاقہ جات کو آزادی سے ہمکنار کیا۔ آزادی کے اس معرکے میں جن علماء کرام نے حصہ لیا ان میں قاضی عبدالرزاق، سید محمد عباس، مولوی منان، مولانا راجی الرحمت نظر اور مولانا ابوالفراح کے نام قابل ذکر ہیں۔ یکم نومبر 1947ء سے 15 نومبر 1947ء تک یہ علاقہ جات مقامی سطح پر قائم کی گئی ایک عبوری حکومت کی عمل داری میں رہے۔ اس عبوری حکومت کے اولین صدر راجہ شاہ رئیس خان تھے۔ بدقسمتی سے وہ اس نوزائدہ حکومت کا نظم ونسق تادیر قائم نہ رکھ سکے لہٰذا حکومت پاکستان نے مذکورہ عبوری حکومت کے حکمرانوں کی دعوت پر 16 نومبر 1947ء کو سردار محمد عالم خان پولیٹیکل ایجنٹ کے ذریعے علاقے کی باگ ڈور سنبھالی۔ یہاں پر یہ بھی واضح کرتا ہوں کہ بلتستان کا علاقہ آزادیٔ گلگت کے تقریباً ساڑھے نو ماہ بعد یعنی 14 اگست 1948ء کو آزادی سے ہمکنار ہوا۔

آبادی کے اجزائے ترکیبی، زبان اور بولی

1998ء کی مردم شماری کے غیر سرکاری نتائج کے مطابق شمالی علاقوں کی آبادی 870347 نفوس پر مشتمل ہے۔ شمالی علاقہ جات کے پانچوں اضلاع میں مجموعی طور پر شنا زبان بولنے اور سمجھنے والوں کی کثرت ہے۔ ماہر لسانیات ڈاکٹر ناموس کے مطابق شنا زبان پاکستان، آزاد کشمیر اور مقبوضہ کشمیر کے تقریباً 12352 مربع میل وسیع علاقے میں بولی جاتی ہے۔ شنا کے لینگویسٹک میپ میں وہ علاقہ جہاں شنا بولی جاتی ہے ایک غیر منظم تکون کی شکل کا ہے۔ شنا وطن کا دل شنا کی کا خطہ ہے جو دریائے سندھ کے دونوں کناروں پر ہربن سے لے کر گور تک واقع ہے۔ اس خطے میں دریائے سندھ مشرق سے مغرب کی طرف بہتا ہے اس سے اوپر اور نیچے سندھ کا رخ شمالاً جنوباً ہے۔ شنا زبان، جرمن ماہر لسانیات ڈاکٹر جارج بدرس کے قول کے مطابق تین ہزار سال سے پانچ ہزار سال قبل مسیح کی زبان ہے جو قراقرم، ہمالیہ اور ہندوکش کے عظیم پہاڑی سلسلوں کے دامن میں پھیلے ہوئے علاقے میں لب ولہجے کی خفیف سی تبدیلی کے ساتھ بولی جاتی ہے۔ اس زبان کو کبھی سرکاری یا درباری زبان ہونے کا شرف حاصل نہیں ہوا۔ اس زبان کا شمار کشمیری کی طرح آریائی زبانوں کے داردی خاندان میں ہوتا ہے۔ ماہرین اسے کشمیری زبان کی ماں کا درجہ دیتے ہیں۔ آریہ حملہ آور ایک ہزار اور دو ہزار قبل مسیح کے درمیان یکے بعد دیگرے ہندوستان میں وارد ہوئے۔ 1500 قبل مسیح کا دوران کے حملوں کے عروج کا دور تھا۔ ان حملہ آوروں میں شین لوگ بھی تھے۔ جنہوں نے سندھ کے کناروں سے ملحقہ شنا کی کے علاقے کو فتح کر کے یہاں آباد ہوئے۔ شنا بولی اس وقت کی سنسکرت کی ایک شکل ہے۔ جو ان پہاڑوں میں ایک ہزار سال قبل مسیح داخل ہوئی۔ اس لئے شنا کے ابجد میں وہ تمام آوازیں شامل ہیں جو سنسکرت زبان میں موجود ہیں۔ شنا زبان کے چار زبانچے ہیں۔ (۱) گلگتی زبانچہ، جو معیاری شنا کہلاتا ہے۔ پونیال کی زبان اس سے ملتی جلتی ہے۔ (۲) استوری زبانچہ، جو استور، گریز اور دراس میں بولا جاتا ہے۔ (۳) چلاسی زبانچہ جو چلاس اور داریل تانگیر میں مروج ہے۔ (۴) چوتھا زبانچہ بروکپا کہلاتا ہے جو سکردو، پرکوتہ، طولتی سے گزر کر پوریگ (لداخ مقبوضہ کشمیر) تک پہنچا۔ پوریگ میں بولی جانے والی زبان اب اس درجہ مختلف ہوگئی ہے کہ شنا بولنے والے اس کو نہیں سمجھ سکتے۔ یہ زبان اس قدر قدیم ہونے کے باوجود صدیوں تک بول چال کی حد تک رہی البتہ انیسویں صدی عیسوی کے اواخر سے اس کی نثری تحریریں ریکارڈ بندوبست کی صورت میں ملتی ہیں۔

گلگت شہر کی سیاسی اہمیت کے علاوہ یہاں پر بولی جانے والی شنا زبان کو بھی معیاری زبان کا درجہ حاصل ہے۔ ضلع گلگت میں ہنزہ بالا کے لوگ وخی بولتے ہیں جبکہ ہنزہ خاص اور نگر کے لوگوں کی زبان بروشسکی ہے۔ ان علاقوں کی آبادیوں کے قلیل حصے کی زبان شنا ہے ان کے علاوہ گلگت ضلع بھر میں شنا بولی جاتی ہے۔ ضلع غذر میں پونیال بھر کے علاوہ سب ڈویژن گوپس میں آبادی کے کچھ حصے کی زبان شنا ہے۔ بلتستان میں شنا زبان بولنے والے خاصی تعداد میں موجود ہیں۔ گلتری بھر کے علاوہ سکردو میں وادیٔ روندو کی آبادی کا 1/3 حصہ اور موضع سدپارہ اور کھرمنگ میں بعض دیہاتوں میں شنا بولی جاتی ہے۔ ضلع گنگ چھے میں کہیں بھی شنا نہیں بولی جاتی جبکہ ضلع دیامر بھر کے لوگوں کی زبان شنا ہے۔ صوبہ سرحد میں انڈس کوہستان کا کچھ علاقہ مدخیل، کولی، پالس، جلکوٹ، سازین، ہربن، کشمیر میں کیل، پھلوئی کے بعض مقامات جبکہ مقبوضہ کشمیر کے دراس، گریز، تلیل اور



پھندر گو پس ویلی گلگت

لداخ اور اس کے ملحقہ علاقے کو بھی شنا کے لسانی جغرافیہ کے حدود میں شامل کرلیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ چترال میں عشریت اور افغانستان کی کنڑ وادی میں ''ساؤ'' کے مقام پر بھی شنا بولتے ہیں۔ یہ زبان کم وبیش نولہجوں میں بولی جاتی ہے جس طرح بارہ کوس کے بعد دنیا کی ہر زبان کا لہجہ قدرے تبدیل ہوجاتا ہے یہی حال شنا زبان کا بھی ہے۔ یہاں کے لکھاری شنا لکھتے وقت اردو رسم الخط میں لکھتے ہیں اور ہر لکھاری اپنا لکھا ہوا خود ہی پڑھ سکتا ہے۔ اگرچہ ہمارے قلم کاروں نے شنا طرز تحریر کے حوالے سے شنا قاعدے تو مرتب کیئے ہیں لیکن ابھی تک ان میں سے کسی کو شرف مقبولیت حاصل نہیں ہوا ہے۔ شنا کے علاوہ شنا لسانی جغرافیہ میں اردو بولی اور سمجھی جاتی ہے اور بعض لوگ فارسی، عربی، کشمیری، گوجری، کھلوچا، پشتو، بلتی، بروشسکی، وخی اور انگریزی بھی بولتے ہیں۔

شنا کی علاقوں کے قبائل

رونو:

قدیم نسلی درجہ بندی کے تحت حکمران خاندان کے بعد ان کا درجہ آتا ہے۔ حکمران عام طور پر اپنے وزیر ''رونو'' خاندان ہی سے منتخب کیا کرتے تھے۔ ''گلگت اور شنا زبان'' کتاب کے مصنف ڈاکٹر ناموس ''رونو'' قوم کے بارے میں لکھتے ہیں کہ یہ لوگ گلگت، نگر اور پونیال میں قلیل تعداد میں موجود ہیں۔ مغرب کی جانب یاسین اور چترال میں بھی اس قبیلے کے لوگ آباد ہیں۔ بتایا جاتا ہے کہ ان کے کچھ خاندان واخان اور سری کول میں بھی رہتے ہیں۔ یہ لوگ عہد قدیم میں تخت وتاراج کے مالک تھے۔ ہر وادی کے راجہ لوگ بہت سی شادیاں کرتے تھے۔ وہ رانیاں جو کسی دوسرے شاہی خاندان سے تعلق رکھتی تھیں ان کی اولاد گشپور کہلاتی تھی، وہ بیویاں جو کسی راجہ کی بیٹیاں نہیں ہوتی تھیں بلکہ زمیندار گھرانوں سے تعلق رکھتی تھیں ان کی اولاد رونو کہلاتی۔ پروفیسر عثمان اس سے اختلاف کرتے ہوئے اپنی کتاب ''قراقرم کے قبائل'' کے صفحہ نمبر 368 پر لکھتے ہیں کہ سُو ملک ایک ترکمان سردار تھا اگرچہ وہ مسلمان نہیں تھا لیکن ایک نامور حکمران تھا۔ اس کے تین لڑکے ژون، رون اور ہرایو تھے۔ سُو ملک کی وفات پر اس کی حکومت ان کے تینوں بیٹوں کے درمیان تقسیم ہوئی۔ رون کو گلگت کی حکومت ملی اور اسی کے نام پر یہ قوم رون سے ''رونو'' کہلائی۔ رونو کے لیے رانا یا جرال کی اصطلاحوں پر غور کرنے کی بجائے ترکمان سردار سو ملک کی اولاد ہونے کے ناطے رونو کو راجپوت قرار دیا جاسکتا ہے کیونکہ یہی نظریہ زیادہ وزنی نظر آتا ہے۔ یہ لوگ یہاں کے رہنے والے باشندوں سے زیادہ دراز قد ہیں۔ ان کے چہرے بیضوی ہیں اور ان کی داڑھی زیادہ گھنی نہیں ہے۔ ان کے خدوخال زیادہ ترقی یافتہ ہیں ان میں سے بعض کے خدوخال اعلیٰ ذات کے راجپوتوں سے ملتے ہیں۔ اس قوم کے کئی نامور افراد ایسے ہیں جنہوں نے کارہائے نمایاں سرانجام دیئے۔ ریشو وزیر جو اس قوم کا ایک نامور سپوت تھا، نے گلگت پر کئی سال تک حکومت کی۔ وزیر شاکرین، وزیر شاہ مرزہ آزادی گلگت کے نامور ہیرو کرنل مرزہ حسن خان، ریٹائرڈ صوبیدار محمد ایوب اس قوم کے نامی گرامی لوگ ہیں۔ کرنل شمبرگ کے مطابق یہ اپنے ہمسائیوں سے قد کاٹھ، جبڑوں کی ہڈیوں اور عقابی خدوخال کے لحاظ سے جداگانہ ہیں۔

شین:

شین اور یشکن دردستان یا شنا کی علاقے کی دو بڑی ذاتیں ہیں۔ غور، چلاس اور تانگیر کے علاوہ شین لوگوں کی اکثریت کہیں اور دیکھنے میں نہیں آتی۔ شین علاقے کا معزز قبیلہ ہے۔ یہ لوگ گلگت کی بالائی وادی یعنی پونیال کے اوپر بھی آباد ہیں مگر زیادہ اونچائی پر اور کم زرخیز حصوں میں دکھائی نہیں دیتے۔ شین قبیلے وادیٔ سندھ سے اوپر حراموش سے پرے بھی رہتے ہیں۔ بعض یورپی مصنفین کا خیال ہے کہ شین باشندے چینی الاصل ہیں جبکہ بعض انہیں آریا تصور کرتے ہیں۔ چونکہ شنا اور چینی زبان ایک دوسرے کی ضد ہیں، ان کے کلچر اور جسمانی خدوخال میں زمین و آسمان کا فرق ہے لہذا شنوں کا چینی الاصل ہونے کا نظریہ قابل توجہ نہیں۔ اسی لیے مئوخر الذکر خیال وزنی نظر آتا ہے کیونکہ شمالی علاقوں میں آنے والے شین ایران / افغانستان سے سوات اور ہزارہ کے راستے ان علاقوں میں داخل ہوئے۔ یہی آریوں کا اولین جتھا تھا جس نے ہندو پاکستان کی سرزمین پر قدم رکھا۔ یہی جتھا کشن گنگا، شردی، گریز اور جنوب مشرق میں چلاس کی طرف آباد ہوا۔ یہ لوگ بڑے جنگجو، خون خوار اور وحشی تھے۔ آریوں کا یہ پہلا جتھا اپنے ساتھ ہند آریائی زبان کا ڈھانچہ بھی ساتھ لے کر آیا۔ اگرچہ یہ تعداد میں کم تھے لیکن زبان کی وجہ سے اپنی پہچان قائم رکھی۔ ان کی زبان ہند یورپی خاندان کی ایک شاخ ہے۔ ماضی میں یہ لوگ گائے سے کراہت محسوس کرتے تھے اور بحالت مجبوری بیلوں کو ہل چلانے کے لیے استعمال کرتے تھے اور حتی المقدور بچھڑوں کو ہاتھ نہیں لگاتے تھے۔ یہ بندشی نظام اب ختم ہوگیا ہے اور ہندوازم کی باقیات نہیں رہی ہیں۔ شین قبائل کی زیادہ آبادی کا علاقہ ''شنا کی'' میں جلکوٹ سے لے کر غور تک ہے۔ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ سندھ کا جو ٹکڑا اپنی سمت میں مشرق مغرب بہتا ہے جس کے کنارے ''شنا کی'' علاقہ ہے وہاں شین لوگوں کی تعداد زیادہ ہے۔ یہ سندھ دریا کی دردستان میں بزرگ وادی ہے جتنا ہم اس وادی سے دور چلے جاتے ہیں اتنی ہی یشکن لوگوں کی تعداد بڑھتی چلی جاتی ہے اور شین تعداد میں کم ہوجاتے ہیں مثلاً نگر، ہنزہ، اشکومن،

یاسین، چترال میں بیشتر یشکن آباد ہیں۔ دوسرے قبیلوں میں شادیاں کرنے کی وجہ سے شین قبائل کی نسل خالص نہیں رہی۔ اسی لیے اس قوم کی ماضی میں موجود خوبیاں گنوانا اب بہت مشکل ہوگیا ہے۔ وادیٔ سندھ کے زیریں حصے سازن سے نیچے رہنے والے شین باشندوں کی رانوں اور ٹانگوں پر زیادہ بال نہیں ہوتے۔ ان کی آنکھوں اور چہرے کا رنگ بھی قدرے کالا ہے۔ ان کے چہرے کے خدوخال بڑے تیکھے ہیں۔ مضبوط اور متناسب جسموں کے لوگ ہیں، وہ چست اور مخمل مزاج ہیں اچھے کوہ پیما ہیں، بولنے کا لہجہ کرخت ہے۔ سازن سے اوپر گلگت کے آس پاس ان لوگوں کا رنگ قدرے گندمی ہے۔ مگر خدوخال میں کوئی خاص فرق نظر نہیں آتا۔ ان کی ناک نمایاں اور تھوڑی چھوٹی ہوتی ہے۔ اگرچہ شین باشندوں کی ایک جداگانہ نسل سے تعلق رکھنے کی روایت ایک عرصے سے ختم ہوچکی ہے لیکن وہ ابھی تک خود کو اشرافیہ مانتے ہیں اور دوسروں کی نسبت خود کو ایک اعلیٰ اور باعزت نسل سمجھتے ہیں۔ شنوں کا جسم سیدھا اور دراز ہوتا ہے۔ داڑھیاں گنجان اور ناک ستواں ہوتا ہے۔ شین قوم کا ایک شاندار ماضی ہے۔ اس قوم نے شمالی علاقوں میں حکمرانی بھی کی۔ شین داردوں کی حکومت سوات پر بھی کافی عرصے تک رہی۔ ٹاروال شنوں کا مرکز تھا۔ پروفیسر عثمان علی کے مطابق شنوں کی حکومت کا دور 1000ء سے 1400ء تک رہا ہے۔ بعض مؤرخین شنا زبان کی پیدائش کا دور بھی یہی بتاتے ہیں۔ شنا زبان کا شمار ہند یورپی خاندان میں کیا جاتا ہے اور ماہرین لسانیات اسے پشاچہ کی اہم شاخ تصور کرتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شنوں کی حکومت اس پورے علاقے پر تقریباً 400 سال سے زائد مدت تک رہی لیکن شنوں کی دردیسا میں حکومت کا زمانہ اس سے زیادہ لمبا ہے۔ مرور زمانہ کے ساتھ شین قبیلے کے لوگوں کے Sub-tribes بنے اور یہ اپنے آباؤاجداد کے نام سے مشہور ہوئے۔ شنوں کی رعیت میں ہی کمین قبائل اپنی زندگی بسر کررہے تھے۔ قدیم شین ہندومت کے پرستار تھے جبکہ یشکن بدھ ازم کے معتقد تھے۔ ہمارے خطے میں شنوں کے بڑے قبیلوں میں دھڑمے، بوٹے اور مچو کے قابل ذکر ہیں۔

یشکن:

دردستان میں اس ذات کی تعداد سب سے زیادہ ہے۔ ہنزہ، نگر، پونیال، اشکومن، چترال اور یاسین کی بیشتر آبادی یشکن باشندوں پر مشتمل ہے۔ اس کے علاوہ گلگت، سئ جگلوٹ، داریل اور استور میں بھی ان کی بڑی تعداد پائی جاتی ہے۔ ان کا پیشہ زراعت ہے۔ ہنزہ اور یاسین کی زیادہ سرد آب و ہوا میں رہنے والے یشکن باشندوں کے خدوخال بڑے کھردرے ہیں۔ ان کے سرخ بال بھی عام دیکھنے میں آتے ہیں۔ ہنزہ اور نگر میں یہ خود کو یشکن نہیں بلکہ بروشو کہتے ہیں۔ یاسین میں ورشک اور بروشو کے نام سے معروف ہیں۔ نگر کے بروشو قبیلے کے خدوخال کچھ مختلف ہیں۔ وہ اکثر کوتاہ قد چہرے کی ہڈیاں ابھری ہوئیں اور چھدری داڑھیوں والے لوگ ہیں۔ ان کا جسم پھیلا ہوا ہوتا ہے اور ناک بیٹھی ہوئی ہوتی ہے۔ قدیم یشکن باز پالتے تھے اور گھوڑوں سے انہیں بڑی محبت تھی۔ پروفیسر عثمان کہتے ہیں کہ لفظ یشکن دو الفاظ سے مرکب ہے یعنی یش اور کن۔ کن اصل میں لاحقہ ہے جس کے معنی والا کے ہیں۔ اگر لفظ جوڑ کر معنی لیئے جائیں تو اس کے معنی یش والا کے ہوں گے۔ یش لفظ اصل میں ایش تھا جس کے معنی بروشسکی میں آسمان یا اونچائی کے تھے۔ ایش کن مسلسل استعمال سے یشکن بن گیا۔ پس مرکب لفظ کے معنی ہوئے آسمان والا، اوپر والا، پہاڑوں کی بلندی پر رہنے والا وغیرہ۔ چونکہ اس قوم کے لوگ شمال اور مغربی پہاڑی سلسلوں میں آباد تھے۔ اس لیے انہیں یشکن کہا گیا۔ آریانسل کے شین لوگوں کے گلگت وارد ہونے سے پہلے یہاں یہ لوگ آباد تھے۔ جو گلگت کے شمال کی طرف سے آئے تھے۔ نسل کے لحاظ سے وہ تورانی تھے۔ یشکنوں کا دور حکومت 100 قبل مسیح سے شروع ہوکر 1000ء پر محیط ہے۔ جس طرح کسی مملکت کے لیے زبان، علاقہ اور افراد کی ضرورت ہوتی ہے اسی طرح شنا زبان کی مملکت کے لیے یشکنوں نے جگہ، ماحول اور افراد فراہم کیئے جبکہ شنوں نے اپنی زبان دی۔

تراخن، مغلوٹ، گرکس:

تراخان، مغلوٹ اور گرکس، گلگت، نگر و ہنزہ کے حکمرانوں کے اہم خاندانی سلسلوں کے نام ہیں۔ ان سلسلوں کے حکمرانوں نے ان علاقوں پر کئی سو سالوں تک حکومت کی۔ ان میں نامی گرامی حکمران بھی ہوئے، مدبر سیاستدان اور جنگ آزما سپاہی بھی جن کی وجہ سے تاریخ نے کئی رخ بدلے۔ یہاں کی تاریخ کے دو اہم موڑ یہ بات ثابت کرنے کے لیے کافی ہیں کہ تاریخ بنانے اور بگاڑنے میں کس نے کیا کردار ادا کیا۔ مثلاً شاہ سکندر کا بھائی کریم خان مغلوٹ پہلا شخص ہے جس نے گوہر امان کے خلاف مہاراجہ کشمیر اور سکھوں کی مدد طلب کی۔ کریم خان مغلوٹ کے بلاوے کے نتیجے میں ہم تقریباً ایک صدی تک ڈوگروں اور انگریزوں کے غلام ہوئے۔ ہم پر ظلم کے پہاڑ توڑے گئے۔ ہمیں تمام شہری حقوق سے محروم رکھا گیا۔ کریم خان کا خیال تھا کہ سکھ اور ڈوگرے حکومت حاصل کرکے انہیں راجگی بخشیں گے لیکن یہ محض خواب و خیال ثابت ہوا۔ سکھ اور ڈوگروں نے اپنی حکومتیں بنائیں جس کی وجہ سے اقتدار سے محروم ہونا پڑا۔ پھر تاریخ کا ایک ایسا موڑ بھی آیا جب اسی مغلوٹ خاندان کے ایک نامور فرد صوبیدار میجر محمد بابر خان نے 1947ء میں گلگت سکاؤٹس کی مدد سے ڈوگروں کو یہاں سے نکال باہر کرنے میں کامیابی

صل کی اور ہم پھر سے آزاد ہوئے۔ آذر، تراخان یا ترتراخان ناموں سے یہ
ت ظاہر ہوتی ہے کہ یہ لوگ ترک تھے۔ پروفیسر عثمان علی اپنی کتاب ''قراقرم کے
ائل'' کے صفحہ نمبر 534 پر لکھتے ہیں کہ آذر مغل (ترخان) قبیلے سے تعلق رکھتا
ا۔ چونکہ آذر کے اسلاف میں یہ خاندانی نام موجود تھا اس لیے آذر نے اس کا نام
ترا خان'' رکھا تھا تا کہ اس کا سلسلہ منقطع نہ ہو اور یہ خاندانی نام چلتا رہے۔ یہی
بہ ہے کہ یہ خاندان ''تراخانی'' مشہور ہوا۔ تراخانی مغلوں نے گلگت پر تقریباً تین
و سال تک حکومت کی۔ آذر سے لے کر مرزہ خان تک تمام راجوں کے نام
مغل'' نام تھے۔ خان مغلوں کی نشانی ہے اور مغلوں ہی نے ''خان''، ''آذر''
ستعمال کیئے۔ ہنزہ، نگر کے حکمران گرگس و مغلوٹ کہلاتے ہیں۔ وزیر حشمت اللہ
جگان نگر کا ایک الگ شجرہ پیش کرتے ہیں۔ بڈلف اپنی کتاب ''ہندوکش کے
ائل'' میں مافوق الفطرت عناصر کی طرف اشارہ کرتے ہیں اور کوئی واضح تصویر
ش کرنے سے قاصر نظر آتے ہیں۔ ترخانوں کا سلسلہ نسب جواری پر ختم ہوا اور ان
ں کوئی نرینہ اولاد نسل آگے بڑھانے کے لیے موجود نہ رہی۔ مغلوں کے القابات
ں سب سے اہم لقب ''ترخان'' تھا جس کے معنی بڑے خان کے ہیں۔ یہ ایک
ا اعزازی نام تھا اور ابتدائی منگول کلچر کا حصہ بن چکا تھا۔ شروع شروع میں جب
نگول قبائل جھیل بیکال کے اردگرد دیکھا ہو رہے تھے تو وہ اپنی جنگجویانہ حملوں سے
یگر اقوام کا صفایا کر رہے تھے۔ اس وقت ان جنگجو قبائل کے سردار نویان اور ترخان
کے نام سے مشہور ہوئے۔ چنگیز خان نے اپنے ایک جانثار ساتھی کو ''ترخان'' کے
طاب سے نوازا تھا جسے بعد میں چغتائی امیروں کے زمرے میں شامل کیا گیا۔ یہ
عزازی خطاب اس کی اولاد میں منتقل ہوتا گیا۔ امیر تیمور اہم کمان سنبھالنے کے
لیے جن خاندانوں کو اولیت دیتا تھا ان میں ترخان برلاس، ارغون، جلائر، توپکی،
ولائی، مغل، سلاجز، طولائی، قچپاق، ارلات اور تاتار شامل تھے۔ ان خاندانوں
ں بھی ترخان اور برلاس سرفہرست تھے کیونکہ یہ لوگ آزمودہ کار، جنگجو اور جانثاری
ں یکتا ہوتے تھے۔ ترک بابری میں بھی جگہ جگہ ترخانوں کی جنگجویانہ سرگرمیوں کا
ام ذکر ملتا ہے۔ تاج مغل کا گلگت پر حملے کا مقصد لوٹ مار کرنا یا زمین پر حکومت کا
صول نہ تھا۔ وہ مبلغانہ کوششوں کے تسلسل میں یہاں تک آیا اور اپنے مقصد میں
امیاب بھی ہوا۔ اس کے ساتھ صوفیا، علماء اور مبلغین کی ایک مضبوط جماعت بھی
ئی۔ تاج مغل نے اس جماعت کے توسط سے تبلیغ کا فریضہ سرانجام دیا۔ جیسا کہ
یسا ہوتا ہے کہ باہر سے آنے والے حملہ آوروں کے ساتھ آنے والے کچھ لوگ
تلف اغراض کے لیے پیچھے رہ جاتے ہیں۔ غزنویوں، خلجیوں، تیموریوں، مغلوں،
ر سکندر اعظم کے فوجیوں کی طرح برصغیر میں بھی کچھ لوگ اردگرد رہ گئے اور بس
ئے۔ اسی طرح تاج مغل کے ساتھ آنے والے کچھ لوگ بھی یہاں کے ہو کر
رہے۔ ان میں ترخانیوں کے کچھ خاندان شامل ہیں جو آج بھی یہاں پھل پھول
رہے ہیں۔ روایات ہیں کہ تاج مغل کے ساتھ آنے والوں میں ترخانیوں کے کچھ
خاندان جو سمرقند سے بدخشان آ کر آباد ہو گئے تھے اور جنہوں نے مذہب اسماعیلیہ
قبول کیا ہوا تھا، تاج مغل کے ساتھ گلگت آئے اور پھر یہیں آباد ہو گئے۔ 1762ء
میں کشمیر میں جیسے ہی افغانوں کی حکومت قائم ہوئی تو شک و شبہہ پر مقامی لوگوں کی
پکڑ دھکڑ، قتل و غارت گری اور قید و بند کے لامتناہی سلسلے شروع ہوئے تو مغلوں
کے بڑے بڑے جتھے پناہ اور عافیت کی تلاش میں سرگرداں ہو کر ادھر ادھر بھٹکنے لگے
اور بھٹکتے بھٹکتے بعض اقوام مغل کے لوگ گلگت وارد ہو کر کشروٹ کے مقام پر آباد
ہوئے۔ ترخانی مغلوٹ کا دور حکومت 1400ء سے 1822ء تک بتاتے ہیں۔

کمین:

شین، یشکن اور کمین تین الگ الگ قومیں ہیں۔ ان کے خدوخال جدا
جدا ہیں۔ ان کے رنگ مختلف ہیں، ان کی قدیم معاشرتی زندگی مختلف تھی۔ ان
قوموں کے درمیان خطوط متارکہ قائم تھے ان کے درمیان معاشرتی قدغنیں اور
ایسی سخت بندشیں رائج تھیں کہ جن کی وجہ سے معاشرتی نظام اونچ نیچ کا شکار تھا۔
مختلف خانوں میں تقسیم ہونے کی وجہ سے باہم عداوتیں پیدا ہو گئی تھیں۔ کوئی کسی کی
بڑائی قبول کرنے پر آمادہ نہ تھا۔ کمین قوم کے لوگ داریل میں زیادہ پائے جاتے
ہیں۔ یہ برتن بناتے ہیں اور آٹا پیسنے والی چکیاں چلاتے ہیں۔ یہ لوگ کام کرتے
ہیں۔ اسی لیے کمین یعنی کام کرنے والے کہلائے۔ اتفاق سے اردو میں ایک اور لفظ
مروج ہے جو فارسی لفظ کمینہ کے معنی میں مروج ہے اس کا مخفف کمین بنایا گیا۔ بعض
لوگوں نے غلطی سے یہ سمجھ لیا کہ اس ذات کمین سے مقصود کمینہ یعنی گھٹیا ذات کا
آدمی ہے حالانکہ مقصود کام کرنے والا کمین ہے۔ مشر شاہ نے اپنی کتاب ''تبت میں
آریہ'' میں لکھا ہے کہ کرامن لفظ کرم سے بنا ہے جس کے معنی ہیں ''کام''۔ کمین
لوگ تعداد میں بہت ہیں مگر گلگت میں ان کی تعداد قلیل ہے۔ پروفیسر دانی کے
مطابق کمین قبیلے کے لوگوں میں بدیسی عنصر موجود ہے۔ ان کے خدوخال سیاہ ہیں
اور یہ دبلے پتلے جسم رکھتے ہیں۔ کمین دردستان سے باہر بھی ملتے ہیں۔ پنجاب میں
کمین کی اصطلاح ادنیٰ قوم کو کہتے ہیں جو فن کار اور معمولی کسان ہیں۔ پروفیسر
عثمان کے مطابق کمین فارسی زبان کے لفظ کمینے کا مخفف ہے اور یہ کسی ذات یا نسل
کو ظاہر نہیں کرتا ہے۔ یہ محض ایک لفظ کے لغوی معنی ہیں۔ یہ چھوٹی یا بڑی کسی بھی
ذات کے شخص کو اس کے سفلہ پن پر کہا جا سکتا ہے کہ وہ کمین عادات کا مالک ہے
اس لفظ کو بطور ذات استعمال نہیں کیا جا سکتا اور نہ کرنا چاہئے۔ کمین لوگوں کی تھور،
داریل، تانگیر کے علاوہ کوہستان میں بھی کئی شاخیں ہیں اور ان علاقوں میں اس قوم

کا ایک منفرد مقام ہے۔ یہ بڑے غیور اور مضبوط لوگ ہیں۔ یہ اپنے اپنے دائروں اور معاشرتی حلقوں میں وہی مقام رکھتے ہیں جو دوسری قوموں کو حاصل ہے۔ اس بات پر تمام مورخین اور ماہرین عمرانیات متفق ہیں کہ کمین قبائل آریاؤں کی یہاں آمد کے ساتھ وجود میں آئے۔ یہ قبل مسیح کا زمانہ تھا۔ 1857ء کے بعد ہند میں جو سیاسی تبدیلیاں آئیں اور اس کے نتیجے میں مغلوں پر جو اثرات ہوئے ان کا کسی قدیم دور سے کوئی تعلق نہ تھا۔

متفرق قبائل:

کشمیر میں پیشے کے اعتبار سے بھی ذاتیں بنیں اور ایسی بنیں کہ اصل ذاتیں پس منظر میں چلی گئیں اور لوگ نئے القابات سے ملقب ہوئے۔ حالانکہ پیشے کا ذات سے کوئی تعلق نہیں۔ ان علاقوں میں کئی گاؤں اور چھوٹے چھوٹے محلوں کے نام اسلاف کے بعض نامور افراد کے ناموں سے بھی منسوب ہیں جیسے احمدے رجوے، قادریے، عیدے، پلتنے وغیرہ لیکن ایسا نہیں کہ متعلقہ گاؤں یا محلے کے تمام لوگوں کی نسبت مذکورہ نامور فرد سے ہے یا تمام اہل محلّہ کا نسلی گروہ ایک ہے۔ برصغیر میں کشمیری ایک ہی نسل کے تصور ہوتے تھے۔ جو کہ حقیقت پر مبنی نہیں۔ کیونکہ ماہرین کے مطابق انسانی نسلیں مختلف بادلوں کی طرح آپس میں نہ صرف ملتی ہیں بلکہ ملنے کے بعد جدا جدا بھی ہو جاتی ہیں۔ ایسے میں یہ اندازہ کرنا مشکل ہوتا ہے کہ کونسا ٹکڑا کون تھا۔ کیونکہ بادل ایک دوسرے کے ساتھ گھل مل گیا ہوتا ہے۔ یہی حال زبانوں اور انسانی نسلوں کا ہوتا ہے۔

متفرق اقوام:

شنا علاقوں میں مذکورہ پانچ بڑی اقوام کے ساتھ ساتھ دیگر متفرق اقوام جو صدیوں سے یہاں رہ رہی ہیں، ان میں سادات، آخوند، ڈوم، پٹھان، گوجر، پنجابی، بلتی، چترالی، کشمیری وغیرہ شامل ہیں۔ ان کے علاوہ خانہ بدوش قوم سونیوال جنہیں مقامی لوگ ''مروح'' کہتے ہیں، قلیل تعداد میں یہاں موجود ہیں۔ ماضی میں پامیر سے بھی مختلف لوگ بھیڑ بکریاں لے کر یہاں آیا کرتے تھے لیکن پاکستان بننے کے بعد یہ سلسلہ منقطع ہوا۔ پاکستان بننے کے بعد شمالی علاقہ جات سے ملحقہ صوبہ سرحد کے علاقوں سے تعلق رکھنے والے مختلف اقوام کے لوگوں کی ایک بڑی تعداد نے بغرض تجارت اور کاروبار اس طرف کا رخ کیا۔

مقامی خصوصیات

شنا زبان بولنے والوں کی دنیا اپنی نوعیت اور حیثیت کے لحاظ سے منفرد ہے۔ اس کے چاروں طرف بلند و بالا پہاڑ ہیں۔ یہ ایک پیالے کی طرح ہے جس میں دریائے سندھ بہتا ہے۔ سندھ کے ان تمام معاونوں کی وادیاں جو بلتستان کے مغرب کی طرف واقع ہیں، گلگت کے خطے میں شامل ہیں۔ ان سب دریاؤں اور نالوں کا پانی سندھ میں گرتا ہے۔ گویا جغرافیائی طور پر یہ ایک اہم خطہ ہے۔ شنا کے علاقے میں گلگت کو مرکزی حیثیت حاصل ہے جو شمالی علاقوں کا صدر مقام بھی ہے۔ اس خطہ کے نیچے جنوب مشرق کی سمت ہمالیہ، مشرق اور شمال مغرب میں قراقرم شمال مغرب اور مغرب میں ہندوکش کے پہاڑی سلسلے ہیں۔ گلگت سے چند کلومیٹر کے فاصلے پر مشرق کی طرف وہ تاریخی مقام ہے جہاں پر مذکورہ تین عظیم پہاڑی سلسلے یعنی ہمالیہ، قراقرم اور ہندوکش آمنے سامنے کھڑے ہوتے ہیں۔ پاکستان کی دوسری بلند ترین چوٹی نانگا پربت شنا علاقے کی حدود میں واقع ہے۔ 26,660 فٹ بلند یہ پہاڑ ہمالیہ سلسلہ کوہ کے مغرب میں پندرہ سو (1500) میل اور دنیا کی بلند ترین چوٹی ایورسٹ سے تقریباً ایک ہزار میل دور واقع ہے۔ نانگا پربت قراقرم کے سلسلہ ہائے کوہ سے زیادہ قریب ہونے کے باوجود اس کا حصہ نہیں۔ درجنوں کوہِ پیما اس کو سر کرنے کے جنون میں ہمیشہ کے لئے اس کی گہرائیوں میں دفن ہو چکے ہیں۔ کوہِ ہمالیہ اور قراقرم کے بلند دیگر چوٹیوں کی نسبت نانگا پربت پر زیادہ جانیں ضائع ہوئی ہیں۔ اور اس طرح یہ پہاڑ دنیا میں ''خونی پہاڑ'' یا قاتل چوٹی کے نام سے مشہور ہے۔ K-2 ماضی میں امریکی پہاڑ کہلاتا تھا جبکہ نانگا پربت جرمن پہاڑ کے نام سے مشہور ہوا۔ نانگا پربت نے تقریباً 50 کوہ پیماؤں کی جانیں لی ہیں۔ لاتعداد کوہ پیماؤں کی ناکامی کے بعد آخر کار جرمن اس کو سر کرنے میں کامیاب ہوئے۔ جرمنی کے ہربن بول کو پہلی بار 1953ء میں نانگا پربت سر کرنے کا اعزاز حاصل ہوا۔

ان علاقوں میں ذرائع آب پاشی کی کمی ہے۔ اور مون سون ہوائیں یہاں نہیں پہنچتی ہیں۔ سردی کے موسم میں برفباری سے پہاڑوں کی چوٹیاں سفید ہو جاتی ہیں۔ اور بہار میں درختوں پر نیا سبزہ رشکِ ارم بن جاتا ہے۔ خشک پتھر سنگلاخ ٹیلے، سیاہ پہاڑ سب جگہ ایک جیسا ہی منظر نظر آتا ہے۔ سیاحت کے تناظر میں ان علاقوں کی بڑی اہمیت ہے۔ ہر سال ہزاروں ملکی اور غیر ملکی سیاح یہاں آتے ہیں۔ جس سے کثیر زرِ مبادلہ حاصل ہوتا ہے۔ ان علاقوں کے خشک پہاڑ سرسبز و شاداب ممالک میں رہنے والے سیاحوں کو اپنی طرف کھینچ کر لاتے ہیں۔ ان علاقوں میں سردیوں کے پانچ مہینوں میں نہ کھیتی، نہ سبزی، نہ درختوں پر پتے، نہ جانوروں کے لئے چارہ ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں کے باسیوں کو سات مہینے میں بارہ مہینے کی خوراک پیدا کرنی پڑتی ہے۔ شاہراہِ قراقرم کی تعمیر سے لوگوں کا یہ بوجھ بھی ہلکا ہوا ہے۔ اب یہاں کی معیشت کا مکمل انحصار شاہراہِ قراقرم پر ہے، جو سارا سال کھلی رہتی ہے۔ ضروریاتِ زندگی کا سارا سامان اسی شاہراہ کے

ریعے یہاں پہنچتا ہے۔ شاہراہ قراقرم کا بیشتر حصہ بھی شنا کی حدود میں شامل ہے۔

ضلع دیامر کے نجی جنگلات سے دیار اور کائل کی لکڑی ایک عرصے سے
طنِ عزیز پاکستان کو برآمد کی جارہی ہے۔ یہ علاقے سدابہار جنگلات، زندگی بخش
ڑی بوٹیوں، طرح طرح کے جنگلی پھولوں، فلک بوس کوہساروں، آبشاروں، بہتے
بھرنوں، خوبصورت جھیلوں، برفانی گلیشئروں اور مناظر فطرت سے بھرے پڑے
یں۔ شاہراہِ قراقرم کی تعمیر سے ہمسایہ ملک چین کے ساتھ بھی کاروباری روابط
ستحکم ہوئے ہیں جس کی وجہ سے یہاں کے لوگوں کی معاشی حالت اور معیار زندگی
دونوں پر خوشگوار اثرات مرتب ہوئے ہیں۔

ان علاقوں کی برف پوش چوٹیاں سفید اور چمکدار ہیں۔ جس کی وجہ سے
ناظر قدرت اور بھی پرکشش ہوجاتے ہیں۔ یہاں سردیوں میں سخت سردی اور
گرمیوں میں سخت گرمی ہوتی ہے۔ گلگت، چلاس اور اس کے نیچے دریا کے ساتھ
ساتھ واقع علاقوں میں موسم گرما میں اتنی ہی گرمی پڑتی ہے جتنی کہ پنجاب اور پشاور
کی وادیوں میں۔ یہ کیفیت 15-20 دنوں تک رہتی ہے۔ 15 جولائی اور 15 اگست
کے درمیان ہلکی بارش سے ہوا خنک ہوجاتی ہے۔ یہاں کے پانی میں نمکیات کی کمی
ہے۔ لوہا تو پانی میں بالکل ناپید ہے۔ کیلشیم اور آئیوڈین کا نام ونشان تک نہیں ہے۔
س لئے یہاں کے باشندے جسمانی لحاظ سے دبلے پتلے ہوتے ہیں۔ وجاہت اور
وی بدن بہت کم دیکھنے میں آتے ہیں۔ ہوا سرد ہونے کے سبب رنگ سفید ہیں اور
آریائی نسل کی آمیزش نے خدوخال معقول پیدا کردیے ہیں۔ یہاں پر اکثر لوگوں
کے معدے خراب رہتے ہیں۔ باہر سے آنے والے لوگوں کے معدے بھی چھ مہینے
کے بعد خراب ہونے شروع ہوتے ہیں۔ معدے کی خرابی سے لوگوں کو دست بھی
آتے ہیں۔ بچے اور بڑوں کے پیٹ میں کیڑوں کی بیماریاں عام پائی جاتی ہیں۔
حیاتیاتی اور روغنیاتی خوراک کی کمی کی وجہ سے خون کی کمی کی بیماریاں بھی عام ہیں۔
یہ علاقے گولڈن ٹراؤٹ مچھلی، قسم قسم کے پرندوں اور مارخور کی نایاب اقسام کی وجہ
سے دنیا بھر میں مشہور ہیں۔ سونا یہاں کی ریت سے نکلتا ہے۔ دریا کی ریت دھوکر
سونے کے ذرے الگ کرتے ہیں۔ مگر سونے کی مقدار اتنی کم ہے کہ ایک آدمی سارا
ن محنت کرکے محنت کے برابر معاوضہ حاصل نہیں کرسکتا۔ اسلئے اب لوگوں نے یہ
کام تقریباً چھوڑ دیا ہے۔ البتہ ملک کے زیریں علاقوں سے لوگ آکر سونا نکالتے
یں۔ جنہیں ''سونیوال'' کہتے ہیں۔ یہاں کے پہاڑ قیمتی پتھروں کی دولت سے بھی
الامال ہیں۔ بلور، زبرجد، ابرق، روبی، یاقوت، سلاجیت اور سنگ مرمر کے
پتھر وغیرہ ان میں پائے جاتے ہیں۔ ماضی میں یہاں کے لوگ بھیڑوں کے اون
سے سویٹر، دستانے، گلوبند اور جراب وغیرہ بناتے تھے۔ لیکن اب یہ کام تقریباً
ترک ہوچکا ہے۔ کسی زمانے میں جب یارقند اور کاشغر کے راستے شمال کی طرف
سے کھلے تھے تو یہاں پر شاہراہِ ریشم (موجودہ شاہراہِ قراقرم) کے ذریعے ان
ممالک سے مال آتا تھا اور پھر پاکستان کے تاجر یہاں سے مال خریدتے
تھے۔ شاہراہِ قراقرم کی تعمیر سے چین کے ساتھ تجارت کا سلسلہ دوبارہ بحال ہوگیا
ہے۔ درہ بابوسر اور درہ برزل مملکت شنا کے حدود میں شامل ہیں۔ سوکھی خوبانی
چلغوزہ، زیرہ، خوبانی کی گری، خشک توت، بادام، اخروٹ، چیری، آلو وغیرہ یہاں
سے باہر جاتی ہیں۔ مگر یہ بھی مقدار میں اتنی قلیل ہیں کہ ان سے کوئی بڑی آمدنی اس
دیس کو نہیں ہوتی۔ ان علاقوں کے منفرد رسم ورواج آہستہ آہستہ ختم ہوتے جارہے
ہیں۔ قبل ازیں یہاں کے لوگ فصل بوتے اور کاٹتے وقت خوشیاں مناتے تھے۔
بچوں اور غریبوں کو کھانا کھلاتے تھے۔ شادی بیاہ کے موقع پر ناچ گانے ہوتے
تھے۔ نوروز، ڈاڈا اور گنونی کے تہوار بڑے اہتمام کے ساتھ منائے جاتے تھے۔
لیکن آہستہ آہستہ یہ سب قصہ پارینہ بنتے جارہے ہیں۔ اسماعیلی مکتبِ فکر کے لوگ
اپنے رسم ورواج پر آج بھی قائم ہیں۔ اہلِ تشیع کے پاس رسم ورواج کی کچھ قدریں
اب بھی باقی ہیں جبکہ اہلِ سنت رسم ورواج کو خیرباد کرچکے ہیں۔



گلکہہ (کنوئیں) سے پانی پینے کا انداز

ان علاقوں میں طرح طرح کی جڑی بوٹیاں بھی پائی جاتی ہیں۔ جو
مختلف بیماریوں میں بطورِ علاج استعمال ہوتی ہیں۔ ماضی میں استور سے جڑی
بوٹیاں تجارتی بنیادوں پر برآمد ہوتی تھیں۔ لیکن گزشتہ کئی سالوں سے یہ کاروبار تعطل
کا شکار ہے۔ استور کا علاقہ جڑی بوٹیوں اور پٹو، چلاس اور داریل تانگیر گھنے قدرتی
جنگلات، حراموش بگروٹ قیمتی پتھروں، نومل چیری (گلاس) اور نگر کا علاقہ خوبانی

اور دیگر پھلوں کی وجہ سے بھی مشہور ہے۔ جڑی بوٹیوں کے ساتھ ساتھ یہاں کے بلند و بالا مقامات پر قسم قسم کے خود رو قدرتی پھول مناظرِ قدرت کے حسن کو دوبالا کرتے ہیں۔ موسم سرما کے آغاز میں یہاں کے لوگ مال مویشی حسبِ استطاعت ذبح کر کے مخصوص مقام پر رکھ کر گوشت خشک کر کے سردیوں کے ایام میں استعمال کرتے ہیں۔

داردلوگ درمیانے درجے کے جفاکش اور سخت کوش ہیں۔ وہ ایسے ماحول میں رہتے ہیں جہاں بدن اور روح کو زیادہ سہولتیں مہیا نہیں۔ اہلِ دردستان اپنے کردار و گفتار میں بہت حد تک آزاد مزاج ہیں۔ بولنے اور کرنے میں جرات کا امتزاج رکھتے ہیں۔ سختی اور دباؤ کو ایک محدود وقت تک تو ان کی طبیعت برداشت کرتی ہے لیکن جلد ہی سینے کے سمندر میں مواد جوش کھاتا ہے۔ دارد نہ بزدل ہے نہ نرم دل اور نہ دوست پرور۔

تحصیل، تحصیل کے لحاظ سے سارے دردستان کے باشندوں میں خدو خال، قدو قامت، چہرے مہرے، رنگ ڈھنگ، گرمی و نرمی، افتاد اور نہاد کے لحاظ سے فرق ہے۔ گریز میں کشمیری اثرات پائے جاتے ہیں۔ دراس میں بلتستان کا اثر ہے۔ استور میں کشمیر بلتستان اور چلاس کے مشترکہ اثرات ہیں۔ گلگت ایجنسی میں ہنزہ اور نگر اور بعض غیر دردا قوام کے اثرات ملتے ہیں۔ پنیال میں اشکومن اور یاسین کا اثر ہے۔ داریل اور تانگیر میں کالام کوہستان کا اثر ہے اور سندھ کوہستان میں سوات کا اثر ہے۔ چلاس میں داریل کا اثر ہے۔

اگر خدو خال اور زبان کے لحاظ سے دیکھا جائے تو کوئی شک باقی نہیں رہتا کہ داردلوگ نسل کے لحاظ سے آریائی ہیں۔ یہاں کی آب و ہوا نے البتہ ان پر اثر ڈالا ہے۔ چوڑے شانے، درمیانے درجے کے مضبوط اعضائے بدن کا تناسب اچھا، ہاتھ پاؤں کے چالاک اور درمیانے درجے کے سخت گیر پہاڑی لوگ ہیں۔ سنگلاخ کوہستان میں پرورش پائی ہے اور مشکل پہاڑوں پر چڑھنا ان کی عادت ہو چکی ہے۔ ان کے بالوں کا رنگ اکثر سیاہ ہوتا ہے۔ چند کے بال سرخ بھی ہیں اور خال خال سنہرے بال بھی نظر آتے ہیں۔ رنگ گندمی سے اوپر سفیدی کی طرف میلان رکھتا ہے۔ مگر مردوں کا رنگ دھوپ کی تیزی میں سیاہی مائل ہو جاتا ہے۔ عورتوں کا رنگ اکثر صاف اور سفید ہے۔ جس میں سرخی جھلکتی ہے۔ آنکھیں خرمئی رنگ یا سرخی مائل خرمئی رنگ کی ہوتی ہیں۔ بعض اوقات نیلی شفاف آنکھیں بھی نظر آجاتی ہیں۔ مردوں کا طریق گفتگو ایک حد تک گراں اور سخت معلوم ہوتا ہے۔ دردستان کے پڑھے لکھے افراد اچھی اردو بولتے ہیں مگر لہجہ سخت ہے۔ اس کے علاوہ کہیں نہ کہیں اور اس سے زیادہ تحریر میں مذکر مؤنث اور فعل کی تعریف میں لغزشیں ٹپک پڑتی ہیں۔

بدھ آثار:

فاہیان کے مطابق ضلع دیامر کی تحصیل داریل میں پھگچ کے مقام مہاتما بدھ کا ایک طویل چوبی مجسمہ تھا جس کی لمبائی 94 فُٹ تھی اور اس پر سونے پتریاں چڑھائی گئی تھیں۔ اس مجسمے کی زیارت کے لئے چین اور تبت سے زائرین جوق در جوق آتے تھے۔ ایک اور روایت کے مطابق پھگچ (داریل) کے مقام ایک دارالعلوم (یونیورسٹی) بھی تھا جہاں بدھ مت وغیرہ کی تعلیم دی جاتی تھی۔ اس مقام پر سینکڑوں بدھ بھکشو بھی رہتے تھے۔ اس دارالعلوم کے کھنڈرات کے آثار آج بھی ملتے ہیں۔ ان علاقوں میں جانوروں میں مارخور اور پہاڑی بکرے کی تصویریں چٹانوں اور دیوہیکل پتھروں پر جگہ جگہ ملتی ہیں۔ ان تصویروں میں انسانوں کو زیادہ تر شکاریوں، گڈریوں اور تیراندازوں کی شکل میں دکھایا گئے ہیں۔ اس قسم کے چٹانی مجسمے، ماضی میں ان علاقوں میں موجود طبعی ماحول کے متعلق ضروری معلومات فراہم کرتے ہیں۔ ایک بڑا اُبھرواں نقوش سے آراستہ پتھر جسے غالباً گزشتہ سے پیوستہ دہائی میں بوبر سے گلگت لایا گیا ہے۔ اور جو مرحو



گورنر فارم چلاس میں چٹان پر کندہ بدھا کا مجسمہ

علی احمد جان AIG پولیس کے خاندان کے قبضے میں بتایا جاتا ہے۔ اس تاریخی ورثہ کے تحفظ کے لیے انقلابی اقدامات کی ضرورت ہے۔ گوہر آباد (گور) چلاس تھلپر ہپر نگ نامی ایک جگہ ہے جس کے بارے میں یہ روایت ہے کہ اہل غور علاقے کے بوڑھے اور عمر رسیدہ لوگوں کو ہپر نگ کی پہاڑی سے نیچے دھکیل کر ابدی نیند سلاتے

تھے جبکہ ضلع غذر کے گاکوچ بالا میں ''جرولی ٹھوکوہ'' کے بارے میں مشہور ہے کہ اہل گاکوچ اپنے مردوں کو وہاں پھینک دیا کرتے تھے۔

مجموعی طور پر شمالی علاقوں کی شہرت بلند بالا پہاڑوں، دریاؤں، بل کھاتی ندیوں، بہتے جھرنوں، شکارگاہوں، خوبصورت مناظر، خوشنما گلیشئرز، آثار قدیمہ اور پتھروں پر کندہ تحریروں کے باعث ہے۔ ضلع دیامر کی شہرت میں چلاس کی معروف شخصیت پیر غلام النصیر المعروف بابا چلاسی، مولانا عبدالباقی مرحوم، ڈاکٹر محمد سلیم خان اور بریگیڈیئر ریٹائرڈ محمد اسلم خان کا بڑا ہاتھ ہے۔ جبکہ استور کا علاقہ معروف ادبی شخصیت اشرف علیگ اور نامور سیاستدان امان اللہ خان اور میجر وہاب شہید کا آبائی علاقہ ہونے کی نسبت سے بھی شہرت کا حامل ہے۔ اس کے علاوہ امیر حمزہ اور محمد علی جیسے درویش صفت لوگوں کا مسکن بھی استور کا علاقہ ہے۔ اہل استور کا ایک خصوصی اعزاز یہ بھی ہے کہ جب یہاں کے لوگوں کو 1934ء میں پہلی بار کشمیر اسمبلی میں نمائندگی دی گئی تو متحدہ کشمیر اسمبلی کے لئے منتخب نمائندوں کا تعلق بھی استور سے تھا۔ ان میں وزیر محمد خان (1934-37)، راجہ حسین خان (1937-41ء)، 1941ء کے بعد راجہ غلام رضا خان اور متحدہ قانون ساز اسمبلی کے آخری نمائندے استور ہی کے راجہ سلطان محمد شاہ کے نام شامل ہیں۔ شنا بولنے والے علاقوں میں بونجی (دیامر) کی بھی بڑی اہمیت ہے۔ کیونکہ یہ عسکری اعتبار سے تقسیم پاک و ہند سے پہلے ڈوگرہ افواج کی سب سے اہم چھاؤنی رہی ہے۔ ضلع غذر کا علاقہ شہداء کی سرزمین ہونے کے علاوہ راجہ گوہر امان، راجہ انور علی خان (حلو راع)، رحمت جان ملنگ، صوبیدار شیر علی، ریئر ایڈمرل ممتاز ولی اور بریگیڈیئر راجہ عنایت ولی، پیر کرم علی شاہ، راجہ حسین ولی، سکواڈرن لیڈر فرمان ولی جیسی نامور شخصیات کا مسکن ہے۔ جبکہ 1999ء کے معرکہ کارگل میں نشانِ حیدر کا اعزاز حاصل کر کے قوم کا سر فخر سے بلند کرنے والے حوالدار لعلک جان شہید کا تعلق بھی اسی ضلع سے ہے۔ گلگت اور نگر کے علاقے اپنے حساس اور منفرد محل وقوع کے علاوہ تحریک آزادئ گلگت کے قائدین و ہیروز، نامور ادبی شخصیات اور حریت پسندوں کے مساکن ہونے کی وجہ سے بھی شہرت کے حامل ہیں۔

مجذوب بابا چلاسی اور اُن سے وابستہ روایات:

چلاس کی سرسبز و شاداب وادئ تھک، نیاٹ سے تعلق رکھنے والی اس روحانی شخصیت کا اصل نام عبدالغنی المعروف مجذوب بابا چلاسی تھا اور دنیا اُنہیں آج بھی ''مجذوب بابا'' کے نام سے جانتی ہے۔ مجذوب کا لفظ کثرت استعمال کی وجہ سے مہذوب بن گیا ہے۔ عالم شباب ہی میں ان پر انوارِ الٰہی کے رموز کھلنے لگے اور وہ دنیا سے کنارہ کش ہوتے گئے۔ ابتداء میں ہربن داس چلاس کو اپنا مسکن بنایا اور تپتی دھوپ میں اس پتھریلے میدان میں دنیا و مافیہا سے بے خبر اسرارِ حق میں گم رہنے لگے، شب گزاری کے لئے چلاس قلعے کے نزدیک ایک چھوٹی سی کٹیا میں قیام کرتے۔ شروع میں وہ ایک عجیب رسم الخط میں لکھتے رہتے تھے اور مسلسل لکھتے چلے جاتے تھے اور قلم کا تحفہ خوشی سے قبول کرتے تھے۔ ایک مسلمان کی حیثیت سے ہمارا عقیدہ ہے کہ غیب کا علم صرف اللہ تعالیٰ کو ہے اور وہ جسے چاہے اُسے اسمیں سے کچھ حصہ عطا کرے۔ مہذوب بابا کو بھی اللہ تعالیٰ نے اس علم کا حصہ عطا کیا تھا اور وہ اکثر لوگوں کے ماضی اور پوشیدہ حالات کے بارے میں سو فیصد سچی باتیں بتاتے تھے۔ جس دن تہاڑ جیل دہلی میں شہید کشمیر مقبول بٹ کو پھانسی دی گئی اُس روز صبح سویرے انہوں نے ہمارے ساتھی خوشی محمد طارق کو چلاس میں بتایا کہ آج ہندوستان میں تمہارے کشمیری کو مارا گیا ہے، حالانکہ بابا کے پاس نہ تو ریڈیو تھا نہ اخبار اور نہ یہ خبر اُس وقت کہیں سے نشر ہوئی تھی۔ اسی طرح ایس پی دلپذیر صاحب کا ایک ہوٹل داسو میں ہے انہوں نے وہ ہوٹل ایک غیر ملکی کمپنی کو کرایہ پر دیا تھا۔ ایک دفعہ پذیر صاحب بابا سے ملنے گئے تو بابا نے اُنہیں کہا کہ تمہارا ہوٹل ہے یا بوتل؟ پذیر صاحب کہتے ہیں اُس وقت تو بات میری سمجھ میں نہیں آئی چند دنوں کے بعد وہ کمپنی ہوٹل چھوڑ کر چلی گئی تو دیکھنے میں آیا کہ ہوٹل کے تمام کمرے شراب کی خالی بوتلوں سے بھرے ہوئے تھے۔ خوشی محمد طارق، مہذوب بابا ایک اور واقعہ بتاتے ہیں کہ 82-1981ء میں انہوں نے ضلع کونسل دیامر کی رکنیت کے لئے کاغذات جمع کرائے تھے اور کوئی انتخابی مہم نہیں چلائی تھی۔ اس اثناء میں وہ چلاس گئے اور بابا سے ملاقات کی۔ بابا نے اشاروں کنایوں میں باتیں کیں جو اس وقت وہ نہیں سمجھ سکے۔ طارق کا کہنا ہے کہ رات کو وہ چلاس ریسٹ ہاؤس میں آ کر سو گئے۔ ابھی آنکھ نہیں لگی تھی اور نیم غنودگی کا عالم تھا کہ مہذوب بابا کمرے میں آئے اور سات عدد سبز رنگ کے بیلٹ پیپر ہاتھوں میں پکڑائے اور واپس چلے گئے۔ وہ کہتے ہیں کہ انہوں نے جب جاگ کر دیکھا تو کمرے کا دروازہ اندر سے بند تھا اور وہاں کسی قسم کے کاغذ وغیرہ نہیں تھے۔ بعد میں انتخابات ہوئے اور اللہ کا کرنا کہ طارق کو سات ووٹوں سے الیکشن میں کامیابی حاصل ہوئی تو انہیں بابا کے دیئے ہوئے سات سبز کاغذوں کا فلسفہ سمجھ میں آ گیا کیونکہ ان کا رنگ بھی وہی تھا جو اصل بیلٹ پیپر زکا تھا۔ اُنکی تحریروں کا ایک انمول ذخیرہ آج بھی اُنکے بھتیجے اور شمالی علاقوں کی معروف سماجی شخصیت عنایت اللہ شمالی کے پاس موجود ہے۔ بابا کو فی البدیہہ شعر کہنے اور ظریفانہ جملے کسنے کا ملکہ بھی حاصل تھا۔ ایک دفعہ مرحوم مولانا عبدالباقی نے اُنکے سامنے فارسی کا یہ مصرع کہا: ''اے زاغ دریں باغ تماشہ چہ میکنی؟'' تو بابا نے فٹ سے شنا کا یہ مصرع جوڑا ''دائیکوی فٹالی پھت تھے شنی شاچہ میکنی؟'' جس کا فارسی اور شنا مفہوم یہ ہے کہ اے کوے! تو اس باغ میں کیا گل کھلا رہا ہے؟ (فارسی)۔

ران چھوڑ کر معمولی ساگ سے گزر بسر کر رہا ہے (شنا)۔ ایک دفعہ مجذوب بابا کے پاس کسی نے فارسی کا یہ مصرع پڑھا: ''اگر باپدر جنگ جوید کسے'' تو بابا نے جواب میں فوراً شنا کا یہ مصرع کسا ''زمین بان نے تھئی گیٹو پوچی ماں گسے'' جس کا مفہوم کچھ اس طرح بنتا ہے: اگر باپ کے ساتھ کوئی لڑنا چاہے تو ممکن ہے۔ لیکن جو بیٹا زمین آباد نہ کرے ایسے بے غیرت بیٹے کی بھی ماں.....؟



عبدالغنی المعروف مجذوب بابا چلاسی

سید کا چشمہ:

سید شاہ بُریا کے بارے میں روایت ہے کہ موضع ہندی/ہنی (ناصر آباد) کے ایک شخص نے آپؒ کی خدمت عالیہ میں حاضر ہوکر کہا کہ موضع ھنی رہندی جس چشمے کے پانی پر آباد ہے اس میں دن بدن پانی کم ہو رہا ہے۔ جس کی وجہ سے مخلوق خدا پریشان ہے۔ آپ کوئی تدبیر فرمائیں تاکہ پانی کی کمی کا مسئلہ حل ہو۔ اس پر سید شاہ بُریا نے ایک تعویذ بنا کر سائل کے حوالہ کرتے ہوئے ہدایت کی کہ اسے معتقلہ چشمے میں ڈال دو اور کھول کر نہ دیکھو۔ تعویذ اس نے برکو (تھیلہ) میں ڈالا اور واپس ھنی رہندی کی طرف سفر شروع کیا۔ جب سائل گُوچ بالا پہنچا تو اس نے سید شاہ بُریا کی ہدایت کو پس پشت ڈالتے ہوئے تعویذ کو کھول کر دیکھنے کا ارادہ کیا۔ اس مقصد کیلئے جونہی اس نے برکو (تھیلہ) کھولا تو اس میں سے دو رام چکور نکل کر اڑے۔ ایک رام چکور اُڑ کر گُورو (جگلوٹ) کے مقام پر اترا جبکہ دوسرا رام چکور چھلت کی سفید پڑی کے پاس اترا۔ جن دو مقامات پر رام چکور اترے ان میں دیکھتے ہی دیکھتے چشمے پھوٹ پڑے۔ جو آج بھی موجود ہیں اور جن سے خدا کی زمین بھی سیراب ہوتی ہے اور مخلوق خدا اپنی پیاس بھی بجھاتی ہے۔ یہ چشمے آج بھی ''سیتی اُرخ'' یعنی سید کا چشمہ کے نام سے موسوم ہیں۔ ہنی/ہندی کا باشندہ اپنی غلطی پر افسوس کرتا رہا، البتہ اسے اپنے تھیلے میں سے رام چکوروں کے پروں کے چند ٹکڑے ملے جسے اس نے ہنی رہندی (ناصر آباد) کے چشمے میں ڈالا تو وہاں پر بھی پانی کی مقدار میں تھوڑا اضافہ ضرور ہوا۔ شمالی کے مطابق مجذوب بابا 1999ء کے دوران عیدالاضحیٰ کے دن چلاس میں مالک حقیقی سے جا ملے۔

مقامی کھانے

دنیا میں ہر معاشرے کے اپنے معمولات اور کھانے پینے کا اپنا ایک روایتی انداز ہوتا ہے۔ لیکن چونکہ شنا بولنے والے لوگ شمالی علاقوں کے تقریباً چار ضلعوں میں پھیلے ہوئے ہیں۔ اس لئے ان کی اس وسعت نے ان کے طور طریقوں اور کلچر کو بھی متاثر کیا ہے۔ اس پر مستزاد یہ کہ مذہب نے انہیں مزید گروہ بندیوں میں تقسیم کر کے اس کے کلچر کے بھی حصے بخرے کئے ہیں۔ شنا بولنے والے لوگ گلگت میں موجود تینوں بڑے مسالک یعنی اسماعیلیہ، سنی اور شیعہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ ضلع غذر میں شنا بولنے والے لوگوں میں کھوار زبان اور کلچر کے اثرات صاف نظر آتے ہیں۔ جبکہ ہنزہ نگر میں شنا بولنے والوں کی زبان اور کلچر میں بروشسکی زبان اور کلچر کا نمایاں اثر نظر آتا ہے۔ بلتستان میں شنا بولنے والے لوگوں پر بلتی زبان اور کلچر کے اثرات غالب ہیں تو چلاس، داریل اور تانگیر پر صوبہ سرحد کی زبان اور کلچر کے اثرات پائے جاتے ہیں۔ گلگت خاص میں ہر طبقے کے لوگ آپ کو ملیں گے۔ یہاں پر زیادہ تر صوبہ سرحد کا کلچر پروان چڑھ رہا ہے۔ یہاں کی نوجوان نسل کو یہ پتہ نہیں کہ ان کا کلچر کیا ہے؟ اسلاف کے نام و نشان تک مٹتے جا رہے ہیں لیکن کسی کو کوئی پرواہ نہیں۔ مذکورہ مذہبی اور جغرافیائی اختلاف کی وجہ سے یہاں کے روایتی کھانے اور ان سے متعلقہ طرز بود و باش میں ایک ہی لسانی گروپ کے درمیان بھی کافی فرق پایا جاتا ہے۔

ان علاقوں میں لوگ عموماً ایک دن میں تین دفعہ چائے اور دو دفعہ کھانے کا اہتمام کرتے ہیں۔ صبح سویرے ناشتہ پر چائے اور روٹی کا انتظام کیا جاتا ہے۔ اس کے بعد لوگ کام پر جاتے ہیں۔ جب موسم کام کاج کا ہو تو دن کے گیارہ بجے کے قریب پھر چائے روٹی کے ساتھ پیتے ہیں۔ اس چائے کو ضلع غذر میں ''چستی کلئی چائے'' کہتے ہیں۔ دوپہر کو عموماً روٹی، عام ساگ کے ساتھ کھاتے ہیں یا آلو کی ترکاری بنا کر استعمال کرتے ہیں۔ اگر ساگ وغیرہ نہ ہو تو پیاز اور ٹماٹر کی چٹنی بنا کر بھی گزارہ کر لیتے ہیں۔ سہ پہر کے وقت پھر چائے کے ساتھ روٹی پیش کی جاتی ہے۔ چائے تینوں اوقات میں نمکین ہوتی ہے کیونکہ چینی کی چائے بہت کم استعمال کرتے ہیں۔ سہ پہر کی چائے کو اہلِ گلگت ''بکی کلئی چہہ'' کہتے ہیں۔ شام کا کھانا مغرب کی نماز کے فوراً بعد کھاتے ہیں۔ شہروں میں متمول

گھرانے کے لوگ اس وقت کے کھانے کے لئے چاول اور سبزی گوشت کو ترجیح دیتے ہیں جبکہ غربا حسبِ توفیق روٹی اور سبزی یا کبھی کبار گوشت اور چاول کا اہتمام کرتے ہیں۔ بعض مقامات پر جمعرات اور اتوار کو اہتمام سے چاول اور گوشت کا بندوبست نہ کرنا معیوب سمجھا جاتا تھا۔

آدابِ دسترخوان:

علاقہ جات شنا کے لوگوں کے مقامی کھانے اور آدابِ دسترخوان بھی منفرد ہیں۔ ہر علاقے کے مقامی کھانے قدرے جدا جدا ہیں۔ مگر آدابِ دسترخوان تقریباً ایک جیسے ہیں۔ کھانے سے پہلے اور بعد میں ہاتھ دھوئے جاتے ہیں۔ بسم اللہ پڑھ کے کھانا شروع کیا جاتا ہے۔ مہمان یا دسترخوان پر موجود بزرگ آدمی لقمہ اٹھا کر جب تک کھانے کا ابتدا نہ کرے کوئی بھی شخص اپنا ہاتھ دسترخوان کی طرف نہیں بڑھاتا۔ تین تین، چار چار آدمی مل کر ایک ہی پلیٹ میں کھانا کھاتے ہیں۔ اگر دسترخوان پر مہمان موجود ہے تو میزبان کو اس وقت تک کھانا پڑتا ہے جب تک مہمان کھانے سے ہاتھ نہیں کھینچتا۔ حتیٰ کہ مہمان کھانا چھوڑ دے تو بھی میزبان اسے مزید کھانے پر زور دینا اپنا فرض سمجھتا ہے۔ ہر کوئی پانی پینے سے پہلے اردگرد کے ساتھیوں کو پانی کا گلاس پیش کرتا ہے۔ لیکن وہ شکریہ کے ساتھ لوٹاتے ہیں۔ تب جا کر پیاسا پانی پیتا ہے۔ کھانا کھا کر پھر ہاتھ دھوتے ہیں اور پھر اس کے بعد دعا پڑھتے ہیں۔ کھانے کے بعد عشاء کی نماز پڑھتے ہیں اور اس کے بعد عموماً سو جاتے ہیں۔ البتہ سردیوں کی طویل راتوں میں لوگ ایک دوسرے کے گھر جا کر دیر تک گپ شپ کرتے رہتے ہیں یا بزرگ قصہ گو قصہ کہانیاں سناتے ہیں۔ لوگوں کے اس عمل کو ''حلیج بجونک'' کہتے ہیں۔

شنا کی سرزمین میں رہنے والے تقریباً تمام لوگ مہمان نواز ہیں۔ جب کوئی قریبی تعلق دار یا رشتہ دار بہت دور سے آ کر مہمان بنتا ہے تو امیر کیا غریب بھی اپنی حیثیت سے بڑھ کر اس کی خاطر تواضع کرتے ہیں۔ عموماً مہمان کے اعزاز میں ایک جانور بکرا، بھیڑ وغیرہ ذبح کیا جاتا ہے اور اس کا گوشت پکا کر پہلے مہمان کو پیش کیا جاتا ہے پھر تمام اہلِ خانہ اسے استعمال کرتے ہیں۔ بعض دیہی علاقوں میں یہ رواج اب بھی قائم ہے۔ جبکہ شہری علاقوں میں مہمان نوازی چائے اور بسکٹ تک محدود ہو کر رہ گئی ہے۔ بعض دیہاتوں میں اگر کسی کے گھر مہمان آتا تو محلے کے تمام بزرگ لوگ اس رات حسبِ توفیق تازہ پھل یا خشک فروٹ کا تحفہ لے کر میزبان کے گھر پہنچتے اور اپنا تحفہ مہمان کے سامنے رکھ دیتے اور پھر مہمان کے ساتھ دیر تک باتیں کرتے رہتے۔ اس دوران مل کر فروٹ کھایا کرتے۔

جب کبھی کوئی رشتہ دار یا قریبی محلے کا آدمی کسی کے گھر کے قریب سے گزرے تو متعلقہ گھر کے آدمی کی اگر راہگیر پر نظر پڑے تو اسے اپنے گھر کھانے پینے کی دعوت دیتا ہے۔ راہگیر عموماً شکریہ کے ساتھ معذرت کا اظہار کرتا ہے لیکن بعض دفعہ داعی راہگیر کی ایک نہیں سنتا اور اس کی خاطر تواضع کر کے ہی اسے جانے دیتا ہے۔ علاقہ غذر کے بعض علاقوں میں اگر کوئی اجنبی مہمان بھی سرِ راہ ملے تو مرد کیا خواتین بھی احترام سے اسے سلام کرتی ہیں جبکہ دیگر علاقوں میں ایسا نہیں ہے۔ البتہ مرد حضرات آپس میں سلام کرتے ہیں اور عورتیں آپس میں۔ سلام کہتے ہوئے عموماً سر کو بھی جنبش دی جاتی ہے۔

خوشی کے موقعوں پر پکنے والے کھانے

شہری علاقوں میں عموماً شادی بیاہ کے موقع پر حسبِ استطاعت جانور ذبح کرتے ہیں یا بازار سے گوشت خرید کر لاتے ہیں اور سبزی بالخصوص پالک، آلو، شلغم یا بغیر سبزی کے ترکاری بناتے ہیں اور اسے پلاؤ کے ساتھ مہمانوں کو پیش کیا جاتا ہے۔ اب کوفتے، قیمہ، روسٹ اور سلاد بھی خوشی کے مواقع پر پکنے والے کھانوں کا حصہ بن گئے ہیں۔ متمول گھرانے کے لوگ عموماً دو قسم کی ترکاریاں بناتے ہیں جو سبزی گوشت اور سادہ گوشت پر مشتمل ہوتی ہیں۔ سویٹ ڈش کا رواج بھی اب عام ہوا ہے۔ کھڑے ہو کر کھانے کا سلسلہ بھی شروع ہو چکا ہے جو انگریزوں کا دین ہے یوں اسلامی اقدار غیر محسوس طریقے سے دم توڑ رہے ہیں۔ البتہ بعض علاقوں بالخصوص ضلع دیامر کے دیہی علاقوں میں ایسے مواقع پر پکنے والے کھانوں کا طریقہ قدرے مختلف ہے۔ جہاں حسبِ استطاعت جانور ذبح کئے جاتے ہیں اور گوشت کو بڑے بڑے دیگچوں میں سادہ نمکین پانی میں بھونتے ہیں جس سے سادہ شوربہ تیار ہوتا ہے۔ گوشت کو شوربے سے الگ کیا جاتا ہے اور شوربہ کو تھالیوں میں ڈال کر مہمانوں کو پیش کیا جاتا ہے۔ ایک آدمی لوٹے میں پگھلا ہوا دیسی گھی حسبِ ضرورت سادہ شوربے سے لبریز ہر تھالی میں انڈیل دیتا ہے۔ جسے گندم کے آٹے سے بنائی جانے والی نہایت پتلی غیر خمیری روٹی جس کا حجم بڑے توے کے تقریباً برابر ہوتا ہے، کے ساتھ ملا کر مزے سے کھاتے ہیں۔ جبکہ چند آدمی مہمانوں کو فرداً فرداً پکا ہوا گوشت تقسیم کرتے ہیں۔ شہری علاقوں میں خوشی کے موقعوں پر محلّہ داروں اور دوستوں کو بذریعہ کارڈ مدعو کیا جاتا ہے جبکہ رشتہ داروں کو گھر کا ذمہ دار فرد بذاتِ خود جا کر دعوت دیتا ہے۔ قریبی رشتہ داروں کو کارڈ بھجوانا معیوب سمجھتا جاتا ہے۔

مُل:

یہ طعام عموماً بچہ پیدا ہونے کے موقع پر بنایا جاتا ہے۔ ایک طرف زچہ کو

زچگی کے چند دن بعد تک ''شربت'' دیا جاتا ہے تو دوسری طرف مبارکبادی کے لئے جو خواتین آتی ہیں ان کے لئے خصوصی طور پر ''مُل'' بنا کر پیش کیا جاتا ہے۔ اگر کسی خاتون کی ایسے مواقع پر اس طعام سے خاطر تواضع نہیں کی گئی تو وہ اس سلوک کو عمر بھر نہیں بھولتی اور ہمیشہ ٹوکتی رہتی ہے۔ اس کے بنانے کا طریقہ یہ ہے کہ گندم کا آٹا پانی میں ڈال کر دیگچے کو چولہے پر چڑھاتے اور خوب جوش دیتے ہیں اس دوران ایک بیلن ''اِسکاؤ'' کے ذریعے مسلسل پانی اور آٹے کو ہلاتے رہتے ہیں۔ ایک وقت ایسا آتا ہے کہ آٹا پانی میں گھل مل کر نہ صرف گاڑھا ہو جاتا ہے بلکہ اس کا رنگ بھی قدرے تبدیل ہوتا ہے تو دیگچے کو آگ سے اتار دیتے ہیں۔ آٹے اور پانی کے اس محلول کو تین چار عورتوں کے لئے ایک تھالی بھر کر پیش کرتے ہیں اور اس محلول کے اندر چمچ سے گڑھا بنا کر اسے دیسی گھی سے بھر دیتے ہیں اور حسبِ ضرورت چینی ڈال کر گرم گرم استعمال کرتے ہیں۔ مُل میں ''دسو'' بھی ڈال دیں تو اور لذیذ ہوتا ہے۔ جب کوئی شخص بار بار اصرار پر بھی گفتگو میں شریک نہ ہو اور بات نہ کرے تو ایسے موقعوں پر اکثر کہتے ہیں کہ ''موریئے کن تھینو، تھی آنیئر مُل ٹھوکے گینا'' یعنی باتیں کیوں نہیں کرتے ہو کیا تمہارے منہ میں ''مُل'' ٹھونک دیا گیا ہے۔ آجکل مبارکبادی کے لئے آنے والی عورتیں اپنے ساتھ نقدی کی صورت میں کچھ رقم بھی زچہ کو پیش کرتی ہیں جسے مقامی لوگ ''پندر'' کہتے ہیں۔ عورتیں ''پندر'' کے لین دین کا سلسلہ ادھار سمجھ کر چکاتی ہیں۔

شربت:

گلگت اور اس کے ملحقہ علاقہ جات میں شربت سے مراد مشروبات نہیں بلکہ کھانے کی ایک خاص قسم ہے جو خوشی کے موقع پر بنایا جاتا ہے۔ یہ کھانا بالخصوص شادی یا ختنہ کی تقریبات کے موقع پر بناتے ہیں۔ نگر کا ''شنا کی'' کا علاقہ اس کا مرکز ہے۔ اس کے بنانے کا طریقہ یہ ہے کہ دیسی گھی کو کسی برتن میں ڈال کر برتن کو آگ پر رکھ کر خوب جوش دیتے ہیں پھر دیسی گھی کا فاضل مواد جو جوش دینے پر علیٰحدہ ہوتا ہے، اسے کسی چھانی کے ذریعے الگ کر کے پھینک دیتے ہیں۔ اس کے بعد آگ اور تیز کی جاتی ہے اور دیگچے میں گھی کے اندر گرم پانی ڈال دیا جاتا ہے اور تھوڑا تھوڑا کر کے گندم کا وہ آٹا جو اسی مقصد کے لئے قدرے موٹا کر کے پیسا جاتا ہے، ایک ہاتھ سے دیگچے میں ڈال دیا جاتا ہے جبکہ دوسرے ہاتھ ''ڈوئی'' جسے مقامی لوگ ''تش بیل'' کہتے ہیں، کے ذریعے آٹا اور گھی کو آخر دم تک متحرک رکھتے ہیں۔ آٹا ڈالنے کے بعد بھی کچھ گرم پانی ڈال دیتے ہیں۔ اسی طرح شربت تیار ہو جاتا ہے۔ اس میں نمک اور چینی کچھ نہیں ڈالتے۔ شربت کے کھانے کے بعد عموماً پانی پینے نہیں دیا جاتا کیونکہ لوگوں کے مطابق اس سے گلے کے خرابی کی شکایت پیدا ہو جاتی ہے۔ شربت چار یا پانچ آدمی ایک ہی تھالی میں مل کر کھاتے ہیں۔ اسے ہاتھ کے ذریعے ہی کھاتے ہیں۔ متمول گھرانے کے لوگ شادی میں شربت کے بعد سادہ ترکاری اور گوشت بھی پیش کرتے ہیں۔ جسے مقامی لوگ ''گالہہ'' کہتے ہیں۔ دیگر علاقوں بالخصوص گلگت میں زچہ کے لئے عموماً شربت پیش کیا جاتا ہے۔ لیکن یہاں پر اس کے بنانے کا طریقہ بالکل مختلف ہے۔ سب سے پہلے کسی برتن میں دیسی گھی ڈالتے ہیں اور اسے آگ پر رکھتے ہیں۔ جب گھی گرم ہو تو گھی کے برابر ٹھنڈا پانی ڈالتے ہیں۔ اس کے اندر حسبِ ذائقہ چینی یا بعض دفعہ نمک ڈالتے ہیں۔ جب پانی اور گھی گرم ہو کر آپس میں ملتے ہیں تو اس میں تھوڑا سا آٹا ڈالتے ہیں اور اسے ڈوئی سے ہلاتے ہیں۔ جب خوب جوش دیا جاتا ہے تو گھی سطح پر ظاہر ہوتا ہے۔ گھی کا سطح پر ظاہر ہونا اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ شربت تیار ہے۔ اس کے ٹھنڈا ہونے پر صبح ناشتے کے وقت زچہ کی خدمت میں پیش کرتے ہیں۔

غمی کے پکوان

خیرات:

شہری علاقوں میں عموماً موت کے تین دن بعد کسی بھی مناسب تاریخ کو حسبِ استطاعت جانور ذبح کرتے ہیں یا بازار سے خرید کر گوشت لاتے ہیں اور اسے سبزی یا بغیر سبزی کے ایک ہی ترکاری بناتے ہیں اور پلاؤ کے ساتھ مہمانوں کو پیش کیا جاتا ہے۔ کھانے کے بعد مہمان متوفی کے ایصالِ ثواب کے لئے فاتحہ پڑھتے ہیں۔ خیرات کھانے کیلئے لوگوں کو گھروں میں جا کر دعوت دی جاتی ہے یا مذہبی عبادت خانوں میں جا کر دعوتِ عام دی جاتی ہے۔ البتہ ضلع دیامر کے بیشتر علاقوں میں طریقہ کچھ اور ہے۔ جہاں غم کے موقعوں پر حسبِ استطاعت جانور ذبح کئے جاتے ہیں اور اس کا گوشت حسبِ تعداد نفر ہر گھر کو بلاتفریق رشتہ دار، دوست، دشمن تقسیم کرتے ہیں اور اسی حساب سے آٹا اور گھی بھی دیتے ہیں۔ گھی کو عموماً خوشی اور غم کے ایسے مواقع پر استعمال کرنے کے لئے ہی محفوظ کیا جاتا ہے۔ جبکہ ضلع غذر میں شنا بولنے والے لوگ موت کے تیسرے دن دوسرے کھانوں کے علاوہ روایتی کھانا ''پھلئی'' بناتے ہیں اور رات کو ''رسم چراغِ روشن'' ادا کرنے کے بعد مہمانوں کو پیش کرتے ہیں۔ یہ رواج اب دم توڑ رہا ہے۔

اوگرہ:

''اوگرہ'' عموماً عاشورہ کے دن بالخصوص اہلِ سنت کے گھرانے کے لوگ بنا کر بچوں میں تقسیم کرتے ہیں۔ اس کے بنانے کا پرانا طریقہ کچھ اس طرح سے ہے کہ سب سے پہلے دیسی چاول جو گلگت میں ہی کاشت ہوتا تھا، اسے اوکھلی اور موسر کے ذریعے کوٹتے تھے

اور اس کا چھلکا علیحدہ کرتے تھے۔ چاول کو صاف کرنے کے بعد اس کی دو طرح سے درجہ بندی کیجاتی تھی۔ پہلے درجے میں ثابت صاف چاول اور دوسرے درجے میں چاول کے باریک ٹکڑوں کو شامل کیا جاتا تھا۔ ''اوگرہ'' مؤخرالذکر چاول سے بناتے تھے۔ سب سے پہلے چاول کو پانی کے ذریعے صاف کرتے اور اس میں موجود چھوٹے چھوٹے پتھر الگ کیے جاتے۔ صاف چاول کو گرم ابلتے ہوئے پانی میں ڈال دیتے ہیں۔ جب پانی دیگچے میں سے بھاپ بن کر ختم ہو جاتا تو اس میں دودھ اور چینی ڈال کر ڈوئی سے ہلاتے ہیں۔ دودھ اور چاول کو خوب جوش دیتے ہیں۔ اسی طرح ''اوگرہ'' تیار ہوتا ہے۔ آج کل کے چاول کی کھیر اس کی ترقی یافتہ صورت ہے۔

تبرک (زکمہ)

اہلِ تشیع حضرات دس محرم کو ظہر عاشور تک عموماً فاقہ کشی کرتے ہیں۔ اس کے بعد گھر میں موجود چیز استعمال کرتے ہیں۔ محرم کے دس دنوں میں ماتمی مجلس کے بعد لوگ نذر و نیاز کی شکل میں حلوہ یا بسکٹ و چائے وغیرہ سے شرکاء کی تواضع کرتے ہیں اور یہ عمل باری باری ہر گھرانے کے لوگ انجام دیتے ہیں۔ اس دوران جو چیزیں پیش کی جاتی ہیں انہیں تبرک (زکمہ) کہتے ہیں۔ عاشورے کے تیسرے یا چوتھے دن یا کسی بھی مناسب تاریخ کو اہلِ محلّہ ہر مرکزی امام بارگاہ میں ''نذرِ امام حسینؑ'' کے نام سے فی گھرانہ کے حساب سے پیسے جمع کر کے کرتے ہیں۔ پیسوں کے مطابق بڑا یا چھوٹا جانور خرید کر اسے ذبح کرتے ہیں اور پکا کر امام بارگاہ میں ہی سب مرد حضرات جمع ہو کر تناول کرتے ہیں۔ اس کے بعد اہلِ بیتؑ کے لئے خصوصی فاتحہ خوانی ہوتی ہے۔ پچھلے وقتوں میں روٹی کے ساتھ سبزی گوشت پکا کر کھایا کرتے تھے لیکن آج کل تر کاری کے ساتھ چاول پکایا جاتا ہے۔

جب کسی گھر میں موت واقع ہوتی ہے تو رشتہ دار اور ہمسائے تین دن تک بلا ناغہ متاثرہ گھر تینوں وقتوں کا کھانا بھیجتے ہیں اور جس گھر میں موت ہوئی ہے وہاں کھانا پکانے نہیں دیا جاتا۔ جب موت سے متاثرہ گھر میں لوگ فاتحہ خوانی کے لئے جاتے ہیں تو سردیوں میں چائے/قہوہ بسکٹ کے ساتھ پیش کرتے ہیں اور گرمیوں میں ٹھنڈے مشروبات سے تواضع کی جاتی ہے۔ یاد رہے کہ موت سے متاثرہ گھر میں ابتدائی تین دنوں میں جو بھی چیز مہمانوں کو پیش کی جاتی ہے وہ تمام دوست، احباب، ہمسائے اور رشتہ داروں کی طرف سے ہوتی ہے۔ بعض لوگ ان تین دنوں میں مہمانوں کو کھانے کے لئے کچھ بھی پیش نہیں کرتے۔ البتہ تین دن کے بعد متاثرہ گھر میں کھانے کا انتظام کیا جاتا ہے۔

روٹیوں کی قسمیں

پھپاؤں:

پتلی غیر خمیری روٹی جو گندم کے آٹے سے بناتے ہیں۔ آٹے کے پیڑے کو اس قدر پھیلاتے ہیں کہ بڑے توے کے برابر روٹی بنتی ہے۔ تازہ مکھن کے ساتھ بڑے مزے سے کھاتے ہیں جبکہ سادہ شوربہ میں ملا کر بھی استعمال کرتے ہیں۔ یہ روٹی گلگت بلتستان کے پورے خطہ میں یکساں مقبول ہے۔ ''گھی گہ پھپاؤں'' کی شنا ضرب المثل ایسے موقعوں پر استعمال کی جاتی ہے۔ جب دو افراد گھی اور پھپاؤں کی طرح آپس میں بہت ہی گھل مل جائیں۔

قِستہ:

گندم کی خمیری روٹی ''قستہ'' کہلاتی ہے۔ قستہ کے لئے پہلے خمیر تیار ہوتی ہے۔ گرمیوں کے ایام میں ٹھنڈے پانی سے جبکہ سردیوں کے دنوں میں نیم گرم پانی سے آٹا گوندھتے ہیں۔ یہ روٹی بڑی زود ہضم ہوتی ہے۔ یہ روٹی ہر سالن، چائے اور گھی کے ساتھ استعمال کی جاسکتی ہے۔ ماضی میں قستہ سازی میں مہارت نئی نویلی دلہن کی اہلیت کا معیار تصور ہوتا تھا لیکن آج کی دلہن قستہ سازی کے زیور سے آراستہ نہیں رہی۔ معاشرے کی بہت کم عمر رسیدہ خواتین باقی ہیں جو قستہ بنا سکتی ہیں۔ قستہ کو بعض علاقوں کے لوگ ''سپک'' کہتے ہیں۔

ٹٹوری:

مکئی کے آٹے سے بنائی گئی خمیری روٹی کو شنا میں ''ٹٹوری'' کہتے ہیں یہ عموماً گول اور تقریباً آدھا انچ سے بھی زیادہ موٹی ہوتی ہے۔ بڑے توے پر کئی روٹیاں ایک ساتھ رکھ کر پکائی جاتی ہیں۔ چونکہ موٹی ہوتی ہے اور توے پر مکمل طور پر نہیں پکائی جاسکتی اسلئے اسے توے سے اتار کر آگ کے اردگرد کھڑا کر کے رکھ دی جاتی ہے۔ جب روٹی پک کر تیار ہوتی ہے تو عام ساگ ''سوانچل، اسگریا شفتل'' سے تیار شدہ سادہ ترکاری میں مکئی کی روٹی (ٹٹوری) کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کر کے ہری مرچ یا پسی ہوئی دیسی مرچ ڈال کر اس طرح ملا دی جاتی ہے کہ ساگ اور روٹی گھل مل جاتی ہیں۔ یہاں کے لوگ اسے بڑے شوق سے کھاتے ہیں۔ بالخصوص عورتوں کی تو یہ مرغوب غذا ہے۔ ہمسایہ عورتیں ایک دوسرے کو بلا کر مل کر کھانا پسند کرتی ہیں۔ جب لسی بھی ساتھ ہو تو اس کا مزہ دوبالا ہو جاتا ہے۔ مکئی کی روٹی ''پنوءشا'' اور چائے کے ساتھ بھی استعمال کی جاتی ہے اور ''چھر مکہہ'' کیلئے بھی استعمال ہوتی ہے۔ اگر ساگ کی ترکاری نہ ہو تو مکئی کی روٹی کے چھوٹے چھوٹے باریک ٹکڑے بنا کر ایک تھالی میں لسی کے ساتھ ملا دیا

جاتا ہے اور لکڑی کے مخصوص چمچہ (جسے مقامی لوگ ''کھپئیں'' کہتے ہیں) کے ذریعے اسے کھاتے ہیں۔ مکئی کی روٹی کا استعمال آج کل نہ ہونے کے برابر ہے۔ مکئی کے آٹے سے روایتی ''چھپٹہ'' بھی بنائی جاتی ہے۔ جسے صرف چائے کے ساتھ استعمال کرتے ہیں۔ مکئی کا آٹا حلوہ بنانے کے لئے سوجھی کی جگہ پر بھی استعمال میں لایا جاتا ہے۔ آٹے کو بھون کر ''سانتو'' بناتے ہیں اور اسے چائے میں ڈال کر استعمال کیا جاتا ہے۔ مکئی کی ٹٹوری سے بڑی ایک اور قسم کی غیر خمیری روٹی بھی بنتی ہے جسے عرفِ عام میں ''منیلی'' کہتے ہیں۔

دھرم پھٹہ:

گندم کے دانے ہفتہ بھر پانی میں بھگوئے جاتے ہیں۔ جب گندم کے دانے پھول جاتے ہیں تو اس کے اوپر اور نیچے برچ نامی درخت کا چھلکا جسے مقامی زبان میں ''جُور'' کہتے ہیں اوپر نیچے رکھ دیتے ہیں یا موٹے کپڑے میں لپیٹ کر ایک بھاری پتھر اس پر رکھ دیا جاتا ہے۔ کچھ دنوں کے بعد گندم کے دانوں میں شگوفے پھوٹتے ہیں۔ اس دوران گندم کے دانے آپس میں مل کر یکجان ہوتے ہیں۔ گندم کے چھوٹے چھوٹے پیڑے بنا کر اسے دھوپ میں سکھایا جاتا ہے۔ کونپل زدہ گندم کے پیڑوں کو چکی میں پیس کر جو آٹا حاصل ہوتا ہے۔ اس آٹے کو گوندھ کر روٹی تیار کی جاتی ہے۔ جسے مقامی طور پر لوگ ''دھرم پھٹہ'' کہتے ہیں۔ اس روٹی عموماً کو میٹھی/کڑوی گری کے تیل، چربی یا دیسی گھی کے ساتھ استعمال کرتے ہیں۔ اگر اس میں ''دِسو'' بھی ملا دیا جائے تو اور لذیذ ہوتی ہے۔ دھرم کی مندرجہ ذیل دو قسمیں بتائی جاتی ہیں:۔

۱) ڈنگ دھرم:

ڈنگ دھرم اخروٹ اور خوبانی کی گری خوب کوٹ پیس کر اس میں گندم کا تازہ آٹا اور دھرم کا آٹا ملا کر ایک خاص دیگ جسے شنا میں ''چدن'' کہتے ہیں، آگ کی ہلکی آنچ پر بڑی محنت سے پکاتے ہیں۔ یہ حلوے سے زیادہ گاڑھی اور سخت ہوتی ہے لیکن اس کا ذائقہ میٹھا ہوتا ہے۔ ڈنگ دھرم زیادہ مقدار میں کھائی نہیں جاسکتی۔ یہ بڑی ثقیل اور طاقتور ہوتی ہے۔ اسے آپ قدیم دور کی سویٹ ڈش کہہ سکتے ہیں۔

۲) ویلی دھرم:

ویلی دھرم پتلی دھرم کے معنوں میں استعمال ہوتی ہے۔ اسے ڈنگ دھرم کی طرح پکاتے ہیں البتہ اس کی نسبت یہ قدرے پتلی ہوتی ہے۔

چھپٹہ: یہ یہاں کی روایتی روٹی ہے۔ جسے مقامی لوگ ''چھپٹہ'' کہتے ہیں۔ ''چھپٹہ'' زیادہ تر گندم کے آٹے سے بناتے ہیں۔ آٹے میں حسبِ ضرورت سوڈا اور نمک ڈال کر گوندھتے ہیں۔ جب خمیر تیار ہوتا ہے تو اسے اوپر اور نیچے مخصوص برتن سے ڈھانپ کر سلیقے سے ایسے آگ کے اندر دبایا جاتا ہے جو بے شعلہ ہو۔ کچھ دیر کے بعد اسے پلٹا کر پھر آگ میں دباتے ہیں۔ متمول گھرانے کے لوگ اس میں گھی اور انڈے وغیرہ بھی ڈالتے ہیں۔ آگ کی تپش زیادہ ہو تو گھنٹے سے پہلے ہی یہ روٹی پک کر تیار ہوتی ہے۔ اسے عموماً صبح کی چائے کے ساتھ استعمال کرتے ہیں۔ عموماً چائے کی پیالی کے اندر ''چھپٹہ'' ڈالکر چمچہ یا ہاتھ کے ذریعے نکال کر کھاتے ہیں۔ کبھی کبھار مکئی کے آٹے کی ''چھپٹہ'' بناتے ہیں۔ مکئی کی چھپٹہ کے لئے خمیر کی ضرورت نہیں پڑتی۔ مکئی اور گندم کا آٹا ملا کر بھی خمیری ''چھپٹہ'' بنائی جاسکتی ہے۔



ایک خاتون روایتی روٹی ''چھپٹہ'' لئے ہوئے

پھُلکا:

پتلی خمیری یا غیر خمیری روٹی جو گندم کے آٹے سے بناتے ہیں۔ غیر خمیری روٹی کو ''شِلک'' کہتے ہیں۔ آجکل اسی کا رواج عام ہے۔ پچھلے وقتوں میں یہ روٹی اس قدر عام نہیں تھی۔ زیادہ تر ترکاری کے ساتھ استعمال کرتے ہیں۔ چپاتی، پراٹھہ اور ''پھلکے'' کا رواج آجکل زیادہ ہے۔

گولہہ:

''گولہہ'' بھی زیادہ تر مہمانوں کے لئے بناتے ہیں۔ آٹے کو جلیبی کے مواد کی مانند گوندھا جاتا ہے۔ پھر اس مواد کو آگ پر رکھے ہوئے ایک توے پر اس طرح پھیلایا جاتا ہے کہ وہ نیچے نہ گرے۔ چند لمحوں میں پتلی اور نہایت ملائم روٹی

تیار ہوتی ہے۔اس روٹی کو دیسی گھی کے ساتھ مہمانوں کو پیش کیا جاتا ہے۔شنا زبان میں اسے ''گولہہ'' کہتے ہیں۔

چھپر مُکھہ:

گندم یا مکئی کی روٹی کو ہاتھ سے خوب مسل دیتے ہیں اور اس میں گھی ڈال کر خوب حل کر دیا جاتا ہے اور حسبِ ذائقہ نمک ڈال کر چائے، لسی یا ان دونوں کے بغیر بھی استعمال کرتے ہیں۔اسے سفری کھانا کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔

کچھ اور مقامی کھانے

کشی:

یہ کھانا عموماً استور فارورڈ ایریا میں بارڈر کے آر پار شنا بولنے والے لوگ بناتے ہیں۔ پہلے جو یا گندم کا دھلیا بناتے ہیں اور اسے لسی میں پکاتے ہیں۔ یہ کھانا کھیر کی طرح کا ہوتا ہے۔اس میں گھی بھی ڈال کر کھایا جاتا ہے۔اس میں حسبِ ذائقہ چینی یا نمک بھی ڈالتے ہیں۔

گل منڈی:

سب سے پہلے بُرح میں نمک ڈال کر اسے گوندھتے ہیں اور جلیبی کے خمیر کی طرح پتلا کرتے ہیں۔ پھر روایتی روٹی پھپاؤں نامی گندم کی پتلی غیر خمیری روٹی پر گوندھا ہوا بُرح اور اس کے اوپر تازہ مکھن پگھلا کر لیپ دیتے ہیں۔سبز دھنیا کوٹ کر نکالا ہوا پانی اس پر چھڑکتے ہیں۔ جب ایک پھپاؤں تیار ہوتا ہے تو اس کے اوپر دوسرا پھپاؤں رکھ دیتے ہیں اور یہی عمل دہراتے ہیں اور حسبِ ضرورت مقدار پوری کرتے ہیں۔گل منڈی پرانے وقتوں میں لوگوں کا مرغوب طعام تھا۔آجکل اس کا سلسلہ نہ ہونے کے برابر ہے۔

رَحِ بَت:

رَحِ بت کو انگور کے چاول بھی کہہ سکتے ہیں۔کشمش یا دانہ دار انگور سے دانہ نکال کر چھلکے کو خشک کرتے ہیں اور سوکھے چھلکے کو پتھر کی سل پر خوب پیس کر آٹے کی طرح سفوف بناتے ہیں اس کے بعد اس میں تھوڑا سا پانی ملا کر شیرہ بناتے ہیں۔اس شیرہ کو پتلے اور باریک پھُلکے (پھپاؤں) پر ڈال کر ''دسو'' کی طرح استعمال کرتے ہیں یہ شیرہ میٹھا ہوتا ہے۔

کَسّ:

آجکل کا لکھمن، ''کَسّ'' کی ترقی یافتہ شکل ہے۔پہلے گندم کے گوندھے ہوئے پتیری (شِلک) آٹے کے پیڑے کو نہایت نرم اور باریک انداز میں پھیلا کر اسے بڑے توے کے برابر بناتے ہیں۔ پھر اس کے اوپر کچھ سوکھا آٹا لگاتے ہیں تاکہ آپس میں پیوست نہ ہو۔ بعد ازاں اس کو چار تہوں میں لپیٹتے ہیں۔اس کے بعد چھری کی مدد سے اسطرح کاٹتے ہیں کہ اس کے لمبے لمبے میکرونی کی طرح ٹکڑے بنتے ہیں۔ایک طرف دیگچے میں پانی گرم کرتے ہیں۔ جب پانی ابلنے لگے تو اس میں آٹے سے بنائے گئے لمبے لمبے ٹکڑے اس کے اندر ڈال دیتے ہیں۔دوسری طرف فرائی پان (چمنڈوری) میں الگ سے کچھ چربی ڈال کر اس میں ایک آدھ پیاز ڈال کر گرم کرتے ہیں۔ پھر دیگچے میں موجود دیسی میکرونی پک جاتی ہے تو فرائی پان میں موجود تڑکا بھی اس میں ڈال کر دیگچے کو آگ سے نیچے اتارتے ہیں۔بعض دفعہ اس میں ''کرح'' بھی ڈالتے ہیں۔اسے روٹی کے بغیر لکڑی کے مخصوص چمچہ سے گرم گرم کھاتے ہیں۔جس کسی کو زکام کی شکایت ہوتی ہے تو اسے گرم گرم کھلا کر سلا دیا جاتا ہے۔ جس سے بیمار کے خوب پسینے نکلتے ہیں اور جب صبح اٹھتا ہے تو بستر پسینے سے تر ہوتا ہے اور زکام ٹھیک ہو جاتا ہے۔

دُدئی ڈوڈو:

دودھ میں کچھ گندم کا آٹا ڈال کر ہلاتے ہیں۔اس میں حسبِ ذائقہ نمک یا چینی ڈال کر خوب گرم کرتے ہیں۔تھوڑی دیر کے بعد دودھ کا ڈاؤڈو ''دُدئی ڈوڈو'' تیار ہوتا ہے۔یہ ڈوڈو زودِ ہضم ہوتا ہے۔اسی لئے اکثر مریضوں کو یہی کھلاتے ہیں۔

پھٹور کسّ:

خشک خوبانی کو شنا میں ''پھٹور'' کہتے ہیں۔اس سے جو ڈوڈو بناتے ہیں اسے ''پھٹور کسّ'' کہتے ہیں۔ڈوڈو بنانے کا طریقہ یہ ہے کہ پہلے خشک ''پھٹور'' پانی میں ڈال کر گرم کرتے ہیں اور خوب جوش دیتے ہیں تو ''پھٹور'' پانی میں گھل جاتا ہے۔پھر تھوڑے سے گندم کے آٹے میں پانی چھڑک کر ہاتھ سے چورہ سا بنا کر ''پھٹور'' میں ملاتے ہیں اور اسے ایک بار پھر جوش دے کر دیگچے کو آگ سے اتار دیتے ہیں۔ لیجیے ''پھٹور کسّ'' تیار ہے۔اسے چمچہ کے ذریعے گرم گرم کھاتے ہیں۔ بالخصوص جب کسی کو زکام ہوتا ہے تو گرم گرم ''پھٹور کسّ'' کھا کر فوراً سو جاتے ہیں۔ صبح اٹھتے ہیں تو زکام ٹھیک ہو جاتا ہے۔

وی بارُسّ:

پانی کو آگ پر رکھ کر گرم کرتے ہیں۔ جب خوب جوش آئے تو تھوڑا

نمک ڈالتے اس کے بعد اس میں حسبِ ضرورت دیسی گھی ڈالتے ہیں۔ پھر برتن کو آگ سے علیحدہ کر کے اس میں گندم کی روٹی کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے گرم پانی میں ڈال کر کچھ دیر چھوڑ دیتے ہیں۔ جب روٹی خوب گل جائے تو کھاتے ہیں۔ یہ زیادہ تر عورتوں کی خوراک ہے۔ البتہ مرد بھی کبھی کبھار استعمال کرتے ہیں۔

شونٹر:

یہ عموماً توت کے تنوں کے بالائی حصے پر ہوتا ہے۔ زیادہ تر پیوند شدہ توت سے حاصل کردہ ''شونٹر'' پسماندہ وقتوں میں گوشت کے نعم البدل کے طور پر استعمال کرتے تھے۔ اگر شونٹر پرانا ہو گیا تو بہت سخت ہوتا ہے۔ جسے استعمال میں کیا کرتے۔

پھُلئی:

گندم کے دانے حسبِ حاجت پانی میں کچھ دیر بھگوتے ہیں اور اس کے بعد اسے کسی چادر پر پھیلا کے تھوڑی دیر کے لئے چھوڑتے ہیں۔ ان دانوں کو اوکھلی میں ڈال کر کوٹتے ہیں۔ چربی ڈال کر دیگچے کو آگ پر رکھ دیا جاتا ہے۔ حسبِ ضرورت ہلدی، نمک اور پیاز بھی ڈال دیتے ہیں۔ اس کے بعد گندمی مواد کی مقدار کو مدنظر رکھتے ہوئے دیگچے میں پانی ڈال دیتے ہیں۔ جب پانی کھولنے لگے تو اس میں گندم کا مواد ڈال دیا جاتا ہے۔ اسے خوب جوش دیکر پکایا جاتا ہے۔ جب تیار ہو جائے تو اسے کھاتے ہیں۔ بغیر گوشت کے بھی اسے بنایا جاتا ہے۔ آجکل یہ رواج باقی نہیں رہا ہے۔ یہ ڈش عموماً علاقے میں کسی وبائی بیماری کے پھیلنے کی صورت میں اتفاقِ رائے سے اجتماعی طور پر محلے کے تمام لوگ ایک مخصوص دن تیار کرتے اور بیرونِ خانہ شام کے وقت ایک جگہ جمع ہو کر تناول کرتے۔ لوگوں کا خیال تھا کہ اس طرح کے خیرات سے بیماری دور ہوتی ہے۔ پرانے وقتوں میں ''تلینی'' کی رسم کی ادائیگی کے موقع پر بعض جگہوں میں یہ ڈش بناتے تھے۔

پنوشاہ:

یہ ایک عام ساگ ہے جسے عرفِ عام میں ''اسگر'' کہتے ہیں۔ اس ساگ کے بڑے بڑے پتے ہوتے ہیں۔ جو عام طور پر ہر جگہ کاشت کرتے ہیں۔ ایک طرف ساگ کو صاف کر کے چھری سے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کرتے ہیں۔ دوسری طرف بادام، خوبانی یا آڑو کے مغز کو کوٹ کوٹ کر اس سے جو مواد حاصل ہوتا ہے اسے پانی میں ڈالتے ہیں۔ اس ترکاری میں تیل یا چربی بالکل نہیں ڈالتے۔ اب دیگچے کو آگ پر رکھ دیتے ہیں اور کاٹا ہوا ساگ اور پسی ہوئی گری کا مغز اس طرح دیگچے میں ڈالتے ہیں کہ ساگ نیچے اور گری کا مغز اوپر ہو۔ ٹماٹر مرچ اور نمک حسبِ ذائقہ ڈال دیتے ہیں۔ اسے مکئی کی روٹی (ٹٹوری) کے ساتھ استعمال کرتے ہیں۔ یہ عورتوں کی مرغوب غذا ہے۔ ''اسگر'' کی ساگ کے پتوں کو گرم پانی میں ابال کے خشک بھی کرتے ہیں اور سکھانے کے بعد اسے کوٹتے ہیں۔ پھر اسے گوشت کے ساتھ ترکاری بنا کر استعمال کرتے ہیں۔ اسے مقامی زبان میں ''شکوشاہ'' کہتے ہیں۔ لوگ اس ساگ کو بہت پسند کرتے ہیں۔

پے چوہ:

تیل میں پیاز براؤن کر کے اس میں ہرے ٹماٹر اور بینگن کاٹ کر ڈالتے ہیں اور اس میں حسبِ ذائقہ ہری مرچ اور نمک ڈال کر ہلکی آنچ پر رکھیں تو چند منٹوں میں تیار ہوتا ہے۔ عموماً گرمیوں میں یہ ترکاری بناتے ہیں جو روٹی کے ساتھ کھاتے ہیں۔ یہ نہایت سادہ اور عام سی ترکاری ہوتی ہے۔

اِسکرُکُ (میتھی):

یہ ساگ عموماً کیاریوں میں لوگ کاشت کرتے ہیں۔ زیادہ تر گوشت کے ساتھ استعمال کرتے ہیں۔ لوگوں کی من پسند خوراک ہے۔ میتھی کی ساگ کے پتوں کو سکھا کر اسے بطور مصالحہ دوسری ترکاریوں مثلاً آلو، اِسگر اور سادہ ترکاری میں بھی ڈالتے ہیں۔

شَوپن:

یہ ایک روایتی طعام ہے، جو عموماً نسالو کے دنوں میں ذبح شدہ جانوروں کی اوجھڑی کو صاف کر کے اس سے ایک چھوٹی رومال کے سائز کے برابر کے ٹکڑے بناتے ہیں۔ ذبح شدہ جانور کی گردن اور ریڑھ کی ہڈی کے گوشت کے باریک ٹکڑے کر کے اس میں مرچ مصالحہ، پیاز اور نمک وغیرہ ملاتے ہیں۔ اوجھڑی کے رومال نما ٹکڑے میں باندھ کر اسے لپیٹتے ہیں۔ اور رومال کے سروں کو ایک جگہ جمع کر کے باریک لکڑی کے کیل لگاتے ہیں۔ کیل کے اردگرد اسی جانور کی صاف کی گئی انتڑی سے باندھنے کے بعد گرہ لگا کر ائیر لاک کرتے ہیں۔ دوسری طرف ایک بڑے برتن جو ''چدن یا بلوس'' کہلاتا ہے، میں پانی بھر کے تمام تیار شدہ مال اس میں ڈال کر خوب جوش دیتے ہیں۔ یہ معلوم کرنے کے لئے کہ متعلقہ چیزیں پک گئی ہیں یا نہیں، ایک تیز دھار آلہ اس میں دباتے ہیں۔ اگر تیز دھار آلہ آسانی سے چبھے تو سمجھا جاتا ہے کہ یہ پک گئے ہیں۔ پکنے کی صورت میں کسی ٹوکرے میں ڈال کر رکھ دیتے ہیں۔ اسے تقریباً تین مہینے تک استعمال کیا جا سکتا ہے۔ اگر مہمانوں کو پیش کرنا مقصود ہو تو اسے چھری سے کاٹ کر حسبِ ضرورت تھوڑے سے گرم پانی میں دوبارہ جوش دے کر پیش کرتے ہیں۔ یہ شوپن کہلاتا

ہے۔ جو عموماً بھیڑ بکریوں کے گوشت سے بناتے ہیں۔ شوپن روٹی کے ساتھ کھاتے ہیں۔ ایک شوپن دو یا تین آدمیوں کے لئے کافی ہوتا ہے۔ گوشت کے سموسوں کو اس کی ترقی یافتہ شکل قرار دیں تو بے جا نہ ہوگا۔ اسی طرح بھیڑ بکریوں کی اوجھڑی صاف کرکے اس کے ٹکڑے بناتے ہیں اور ان ٹکڑوں کے اردگرد انتڑیاں لپیٹ کر گرہ لگاتے ہیں۔ اور اس کا سالن بناتے ہیں۔ جو بڑے شوق سے کھاتے ہیں۔ مقامی لوگ اسے ''پھلینے'' کہتے ہیں۔ چھوٹے جانور کی ریڑھ کی ہڈی اور گردن کے گوشت کو تیشہ کے ذریعے کوٹ کر ہڈی اور گوشت ایک کر دیتے ہیں۔ اور اس میں مسالحہ جات ملا کر پانی میں ڈال کر پکاتے ہیں۔ اس میں تیل کا تڑکا نہیں دیا جاتا۔ اس سالن کو روٹی کے ساتھ استعمال کرتے ہیں۔ اسے مقامی زبان میں ''سنگ سیر'' کہتے ہیں۔

رَبونگ:

راجمہ جسے مقامی لوگ ''ربونگ'' کہتے ہیں۔ عموماً مکئی کی فصل کے ساتھ کاشت کرتے ہیں لیکن کیاریوں میں بھی یہ کاشت کی جاتی ہے۔ کیاریوں میں اس کی نشوونما اور سہارے کے لئے لکڑی کے ڈنڈے بھی ساتھ ساتھ کھڑے کئے جاتے ہیں لیکن مکئی کی فصل میں ڈنڈوں کی ضرورت نہیں پڑتی۔ کیونکہ مکئی کے تنے ڈنڈوں کا کام دیتے ہیں۔ تقریباً دو مہینے کے عرصے میں یہ فصل استعمال کے قابل ہوتی ہے۔ اسے سالن کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ گرمیوں کے دوران تازہ اور سردیوں میں سوکھی ''ربونگ'' استعمال کی جاتی ہے۔ بالخصوص ''نسالو'' کے سوکھے گوشت کے ساتھ اسے مقامی لوگ بہت استعمال کرتے ہیں۔

اچار:

ان علاقوں میں اچار کا استعمال بھی عام ہے۔ لوگ روایتی طریقوں سے خود اچار بناتے ہیں۔ زیادہ تر شلغم، مولی، کرم، راجمہ، کیپر اور دیگر سبزیوں سے اچار بناتے ہیں۔ اچار سردیوں کے موسم میں زیادہ استعمال کرتے ہیں۔ سبزیوں کو پانی میں ابال کر ایک دو دن تک سکھاتے ہیں۔ اس میں سرکہ اور خوبانی کا ''شُت'' ڈالتے اور سرسوں کے بیج، بادیان، دھنیا کے بیج، زیرہ اور مرچ ونمک حسبِ ذائقہ ملاتے۔ سرکہ اور شُت کی جگہ بعض مقامات پر کھٹی لسی بھی استعمال کرتے۔ ماضی میں اسے کدو کے برتن میں ائیرلاک کرکے کچھ دن رکھنے کے بعد استعمال کرتے تھے۔ رام چکور اور چکور کے گوشت سے بھی اُمراء اچار بناتے تھے۔ آجکل اچار میں سرسوں کا تیل بھی ڈالتے ہیں۔

مشروبات

موروہ:

''موروہ'' انگور کے رس کو کہتے ہیں۔ پونیال میں موروہ آج بھی بنایا جاتا ہے۔ سب سے پہلے پکے ہوئے انگور کو جمع کیا جاتا ہے۔ پھر اسے انگور کا رس نکالنے کے برتن میں ڈال دیا جاتا ہے۔ اس برتن کی تہہ کے قریب رس باہر نکالنے کے لئے جگہ چھوڑ دی جاتی ہے۔ چار پانچ دن تک انگور اس برتن میں رہنے دیا جاتا ہے۔ پھر ایک آدمی اپنے پاؤں خوب صاف کرکے انگور کو پاؤں سے خوب دباتا ہے۔ جبکہ دوسرا آدمی اس دوران انگور برتن میں ڈالتا رہتا ہے۔ انگور کا رس مخصوص جگہ سے دوسرے برتن میں جمع ہوتا جاتا ہے۔ دوسرے برتن میں انگور کا رس ڈھکنا ٹائٹ کئے بغیر محفوظ کیا جاتا ہے۔ اگر ڈھکنا ٹائٹ ہو تو گیس کی وجہ سے پھٹنے کا خطرہ ہوتا ہے۔ اب ''موروہ'' تیار ہے۔ اسے استعمال کیا جاسکتا ہے۔ زیادہ سے زیادہ ایک ہفتے کے اندر اندر اسے استعمال میں لایا جائے تو بہتر ہے ورنہ شراب میں تبدیل ہوجاتا ہے۔

انگور سے شراب بھی بنائی جاتی تھی۔ ماضی میں اگر شراب بنانا مقصود ہوتا تو انگور کے رس کو ایک ٹینکی نما گڑھا جو زمین دوز بناتے تھے جسے مقامی لوگ ''سان'' کہتے ہیں، میں ڈال دیتے۔ اس گڑھے کے فرش پر پتھر کی بڑی بڑی سلیں رکھ دی جاتیں جبکہ اس کے چاروں طرف بھی بڑی بڑی سلوں سے دیوار بناتے۔ پتھر کی سلوں کے درمیانی شگاف، birch کے چھلکوں سے بھر دیے جاتے اور اس کے اوپر بھیڑ کی چربی گرم کرکے پلستر کرتے۔ گڑھے کی چھت ڈھانپ کر درمیان میں حسبِ ضرورت شراب نکالنے کے لئے روشن دان کی طرح کا ایک شگاف چھوڑ دیتے۔ دو تین مہینے کے بعد ''سان'' کا ڈھکنا کھول دیا جاتا تو اس وقت شراب تیار ہوتی جسے عموماً کھانے کے بعد خصوصاً مختلف تہواروں کے مواقع پر استعمال کرتے۔ ''سان'' کے اندر شراب کئی سالوں تک رکھی جاسکتی تھی۔ شراب جتنی پرانی ہوتی اتنی سخت اور نشہ آور ہوتی۔ انگور، توت اور خوبانی سے عرق بھی بناتے تھے۔ البتہ شراب سے اس کا طریقہ مختلف ہے۔ ایک ایسے برتن میں جو ائرلاک ہوتا ہے۔ ایک پائپ باہر نکالتے اور پائپ کو دوسرے برتن میں ڈال دیتے۔ ائرلاک برتن کو گلے ہوئے انگور، توت یا خوبانی سے بھر دیا جاتا اور اس کے نیچے آگ جلاتے۔ جوں جوں آگ تیز ہوتی، رس بھاپ میں تبدیل ہوکر پائپ کے ذریعے دوسرے برتن میں آتا اور وہاں ٹھنڈا ہوکر پانی بنتا۔ بھاپ سے حاصل ہونے والے اس مائع کو مقامی لوگ عرق کہتے ہیں۔ بالخصوص پونیال میں یہ عام استعمال ہوتا تھا۔ ایک عام شرابی تقریباً ایک لٹر شراب کھانے کیساتھ استعمال کرتا ہے۔ مذہبی پابندیوں کی وجہ سے آجکل اس

کا استعمال تقریباً ختم ہوگیا ہے۔

میل:

شنا میں لسی کو ''میل'' کہتے ہیں۔ مکھن نکالنے کے بعد جو دودھ بچتا ہے۔ اس میں کچھ پانی ڈال کر نوش کرتے ہیں۔ اکثر کسی گہری تھالی میں روٹی بالخصوص مکئی کی روٹی کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں پر لسی ڈال کر چمچ کی مدد سے استعمال کرتے ہیں۔ حسبِ ذائقہ نمک بھی ڈالتے ہیں۔ لسی کو اکثر لنچ پر ہی استعمال کرتے ہیں۔ جس گھر میں دودھ کی فراوانی ہو اسے آباد گھر تصور کیا جاتا ہے۔ پچھلے وقتوں میں لسی بھیڑ یا بکری کے چمڑے سے بنا ہوا مشکیزہ جسے مقامی لوگ ''تھرنگ اِیں'' کہتے ہیں، میں بناتے تھے۔ بعد میں لکڑی کا بنا ہوا برتن ''زگہہ'' استعمال ہوا جبکہ آجکل شہری علاقوں میں لسی برقی مشینوں کے ذریعے نکالی جاتی ہے۔ لسی بنانے کے کام کی ذمہ داری عورتوں کی ہے۔ دیسی طریقے سے لسی بنانے کے لئے دو سے تین گھنٹے لگتے ہیں۔



لسی بنانے کا روایتی انداز

مٹھائیاں

دِسوَ:

فاضل انگور جمع کر کے اسے ایک مخصوص برتن میں رکھ دیتے ہیں۔ پھر اس کا رس نکالا جاتا ہے۔ اس کو ایک ڈرم میں ڈال دیتے ہیں اور ڈرم کو آگ پر رکھا جاتا ہے۔ آگ کے لئے زیادہ تر توت اور خوبانی کی لکڑی استعمال کی جاتی ہے۔ کیونکہ اس سے آگ تیز ہوتی ہے اور راکھ کی ضرورت بھی پوری ہوتی ہے۔ جب خوب جوش آئے تو توت اور خوبانی کی لکڑی سے بنی ہوئی راکھ جو بڑی صفائی سے جمع کی جاتی ہے، اسے ''دِسوَ'' میں ڈال دیتے ہیں۔ سرکنڈے کی شاخوں سے بنی ہوئی ڈوئی کی مدد سے دسو کو متحرک رکھتے ہیں اور اسے مزید جوش دیتے ہیں۔ جب محلول گاڑھا ہوتا ہے تو ڈرم آگ سے اتارا جاتا ہے اور ایک چھانی کے ذریعے اسے کسی دوسرے برتن میں انڈیل دیا جاتا ہے۔ اس کے بعد اگلے دن پھر دیگچے کو جس میں کچی ''دِسوَ'' تیار ہوتی ہے، مزید گرم کیا جاتا ہے۔ پھر حسب ضرورت اسے گاڑھا کر کے استعمال میں لایا جاتا ہے۔ اسے روٹی، ''مُل''، گھی وغیرہ کے ساتھ استعمال کیا جاتا ہے۔ یہ شہد اور جام کی طرح گاڑھی اور لذیذ ہوتی ہے۔ اہل دیامر اسے ''دسٹوں'' کہتے ہیں۔

پھُر پھُٹی دِسوَ اور کلاوَ:

''دِسوَ'' کی تلچھٹ کو چھڑیوں سے بنے ہوئے کسی بڑے ٹوکرے جسے مقامی لوگ ''کرنیَ'' کہتے ہیں، میں رکھ کر اس کے اوپر کوئی وزن دار چیز رکھ دیتے ہیں۔ پھر ''کرنیَ'' کو کسی اونچی جگہ پر لٹکایا جاتا ہے اور اس کے نیچے ایک برتن رکھ دیتے ہیں تاکہ تلچھٹ میں موجود باقی رَس بھی رِس رِس کر برتن میں جمع ہو۔ برتن میں جمع شدہ مواد سے مذکورہ طریقے سے ''دسو'' بنایا جاتا ہے۔ جسے مقامی لوگ ''پھر پھٹی دسو'' کہتے ہیں۔ اسی طرح خوبانی کی گری اور اخروٹ کے مغز کو دھاگے میں پرو کر مالا بناتے ہیں، جسے شنا میں ''جِھر'' کہتے ہیں۔ اخروٹ اور خوبانی کے ان مالاؤں کو ''پھر پھٹی دسو'' میں ڈال کر باہر نکالنے کے بعد دھوپ پر رکھ دیتے ہیں۔ جو تیار ہو کر ''کلاوَ'' بنتی ہے۔ جسے خشک پھل کے طور پر فروخت بھی کرتے ہیں۔ ''کلاوَ'' بڑی لذیذ ہوتی ہے۔

دودھ سے تیار کی جانے والی متفرق اشیاء

بک:

لسی کو ملیشا کے کپڑے (چکہہ) کے تھیلے میں ڈال کر اس کا سرا خوب ٹائٹ کر کے اسے کسی اونچی جگہ پر لٹکایا جاتا ہے۔ لسی میں موجود پانی کپڑے سے دھیرے دھیرے ٹپکتا ہے اور آخر کار گاڑھی لسی باقی رہتی ہے۔ اسے چوبیس گھنٹے تک اسی طرح رہنے دیا جاتا ہے۔ اب جو گاڑھی لسی باقی بچی ہے اسے ''بک'' کہا جاتا ہے۔ اسے روٹی کے ساتھ کھایا جاتا ہے۔ اور چٹنی بھی بنائی جاتی ہے۔ یہ عمل کسی برتن میں بھی کیا جا سکتا ہے۔ وہ پانی جو لسی سے الگ ہو کر حاصل ہوتا ہے اسے ''پرون'' کہتے ہیں۔ وہ کسی استعمال کا نہیں ہوتا۔ البتہ گدھے اسے بڑے شوق

سے پیتے ہیں۔

کُرح:

اگر ''بک'' کے چھوٹے چھوٹے پیڑے بنا کر سکھایا جائے تو اس سے ''کُرح'' بنتا ہے۔ جسے بچیاں اور بالخصوص حاملہ عورتیں بڑے شوق سے کھاتی ہیں۔اسے چٹنی میں بھی استعمال کرتے ہیں۔

بُرح:

لسی کو کسی دیگچے میں ڈال کر اسے آگ پر رکھ کر خوب جوش دیتے ہیں۔ کافی دیر بعد اسے آگ سے اتار کر ٹھنڈا ہونے پر پانی کو گرایا جاتا ہے اور جو باقی بچتا ہے وہ ''برح'' کہلاتا ہے۔ جسے روٹی کے ساتھ یا اس کے بغیر بھی کھاتے ہیں۔ اسے چٹنی میں بھی استعمال کیا جاتا ہے۔

مُوتو دُد:

دہی کو شنا میں ''موتو دُد'' کہتے ہیں۔ مکھن نکالنے کے علاوہ اس سے لسی، بک، کرح، برح وغیرہ بناتے ہیں۔ دہی میں چینی ڈال کر روٹی کے ساتھ بھی کھاتے ہیں۔ کبھی کبھار چاول پر ڈال کر چمچ کے ذریعے بھی استعمال کرتے ہیں۔ دیہاتوں میں ندیوں کے ساتھ زمین دوز کنواں نما جگہیں بنائی جاتی ہیں۔ جہاں دہی، لسی اور دودھ وغیرہ رکھ دیے جاتے ہیں۔ایسی جگہوں کو ''مچلیع'' کہتے ہیں۔

ہَمہ چہ:

گائے کا بچہ دینے کے بعد جو زردی مائل گاڑھا دودھ حاصل ہوتا ہے اسے شنا میں ''گمامو'' دودھ کہتے ہیں۔ تقریباً دو تین دن تک ''گمامو'' دودھ جمع کر کے رکھتے ہیں۔ گرمیوں میں ایک دن سے زیادہ رکھیں تو خراب ہوتا ہے۔ اسی دودھ سے ''ہَمہ چہ'' بناتے ہیں۔ یہ پنیر کی طرح ہوتی ہے۔ بنانے کا طریقہ یہ ہے کہ ''گمامو'' دودھ کو ایک بڑے دیگچے میں ڈال کر اس میں چینی ڈال دیتے ہیں اور اچھی طرح حل کرتے ہیں۔ پھر دیگچے کو ہلکی آنچ پر گرم کرتے ہیں۔ دودھ جوں جوں گرم ہوتا ہے تو گاڑھا ہو کر جم جاتا ہے۔ جب خوب جم جائے تو دیگچے کو آگ سے نیچے اتارتے ہیں۔ تھوڑی دیر تک اسے ٹھنڈا ہونے دیا جاتا ہے۔ جب خوب ٹھنڈا ہو جائے تو کھاتے ہیں۔ جب بھی ''ہَمہ چہ'' بناتے ہیں تو اس میں سے ہمسایوں اور رشتہ داروں کا حصہ ضرور بھیجتے ہیں۔ گلگت، غذر اور چلاس، داریل تانگیر میں لہجے میں تھوڑے سے فرق کے ساتھ اسے ''ہَمہ چہ'' کہتے ہیں جبکہ استور میں ''کونہہ'' اور منیمرگ میں اسے ''اِیخ'' کہتے ہیں۔

پھل

شمالی علاقہ جات اونچے اونچے پہاڑ اور گہری گہری وادیوں کی بدولت بہت مشہور ہیں۔ یہ علاقے دنیا کی بلند ترین چوٹیوں، گلیشیئروں، سبزہ زاروں، ندی نالوں، میٹھے پانی کے چشموں اور آبشاروں کی وجہ سے سیاحوں کے لئے بے پناہ کشش رکھتے ہیں۔ سخت موسموں کے باوجود یہاں مختلف قسم کے پھل پائے جاتے ہیں۔ شدید سردی کے کم ہوتے ہی زمین کے اندر سے سڑابری کے خودرو پودے سر اٹھاتے ہیں۔ یہ پودا زمین سے اوپر زیادہ سر نہیں نکالتا بلکہ پھیلاؤ کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ نہایت نرم اور لذیذ میوہ ہے۔ آج کل گھریلو کیاریوں میں بھی اس کی پنیری لگائی جاتی ہے۔ پاکستان کے دوسرے پہاڑی علاقوں کی طرح یہ علاقہ جن مخصوص قسم کے میوہ جات کے لئے بھی مشہور ہے ان کا ذکر ذیل میں کیا جاتا ہے۔

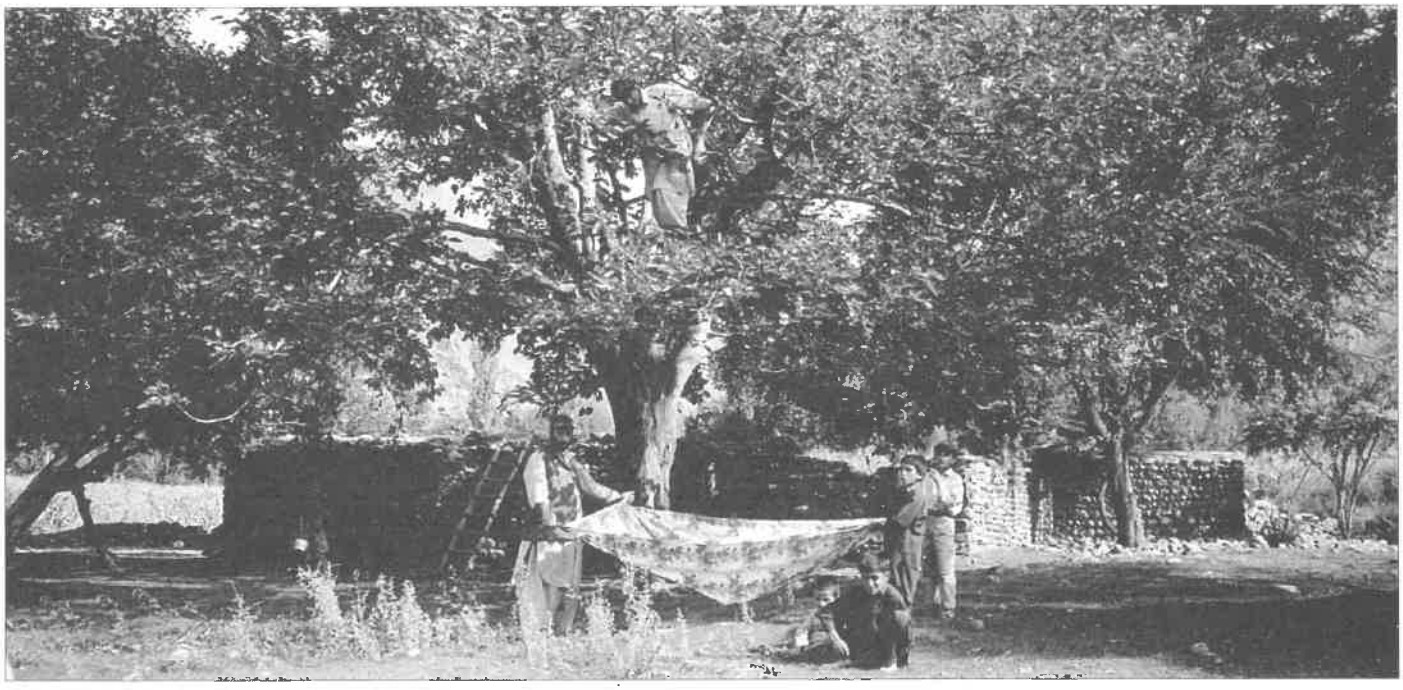
توت:

توت کے درخت ان علاقوں میں بڑی تعداد میں پائے جاتے ہیں۔ ماہرین کے مطابق یہ درخت ریشم کے کیڑوں کے تخم کے ساتھ شاہراہ ریشم موجود شاہراہِ قراقرم کے ذریعے چین سے یہاں آیا اور کشمیر تک پھیل گیا۔ توت کو مقامی لوگ ''مروح'' کہتے ہیں۔

یہاں کے سفید توت جسے ''بدنہ'' کہتے ہیں بہت ہی لذیذ اور عام پھل ہے۔ اس کی کئی اقسام ہیں جن کی تفصیل درج ذیل ہے:۔

۱۔ کنی شتو　　(کالی توت)
۲۔ شِی شتو　　(سفید توت)
۳۔ چھرچٹ　　(بے پھل)
۴۔ کنی مروح　　(پیوندی کالی توت)
۵۔ چِہ مروح　　(پیوندی ارغوانی توت)
۶۔ لکشر　　(پیوندی گدلا سفیدی مائل پیوندی توت)
۷۔ کشری مروح　　(کشمیری گہرا سرخ رنگ کی پیوندی توت)
۸۔ بدنہ　　(بے دانہ سفید اور سرخی مائل پیوندی توت)

توت کے درخت لوگوں کی معاشی زندگی میں اہم کردار ادا کرتے ہیں کیونکہ یہاں پر پائی جانے والی توت کی اقسام میں سے کئی قسمیں ماضی میں انسانی خوراک کا ذریعہ رہی ہیں۔ موسم بہار کے آغاز میں جب خوراک کا ذخیرہ ختم ہوتا تو لوگ جزوی طور پر اس پھل اور خشک خوبانی (پھٹور) پر گزر اوقات کیا کرتے



توت جمع کرنے کا روایتی طریقہ

تھے۔ بالخصوص ''بدنہ'' توت یہاں کے لوگوں کا مرغوب ترین پھل ہے۔ کہتے ہیں کہ بدخشان، بدنہ توت کا مرکز ہے اور یہ وہی سے ان علاقوں میں متعارف ہوئی۔ مئی کے اوائل سے لے ماہ جون کے آخر یا جولائی کے وسط تک یہ پھل موجود ہوتا ہے۔ البتہ مختلف مقامات پر اس پھل کے پکنے کا موسم بھی مختلف ہے۔ توت کا پھل اگر انفرادی طور پر کھانا مقصود ہو تو توت کے درخت پر چڑھ کر کھایا جاتا ہے وگرنہ تمام اہلِ خانہ یا مہمانوں کے لئے پیش کرنا ہو تو ایک نوجوان مرد یا خاتون درخت پر چڑھ کر اس کی ہر شاخ کو پاؤں کے ذریعے زور سے مارتا/مارتی ہے۔ جبکہ زمین پر متعلقہ شاخ کے عین نیچے دو افراد بستر ے کی چادر کے برابر ایک چادر جس کے سروں کو ہاتھوں سے تھامے بیٹھ جاتے ہیں اور توت جمع کرتے ہیں۔ اس عمل کو مقامی لوگ ''مروح جل تھونک'' کہتے ہیں۔ اگر شاخیں بڑی اور پھیلی ہوئی ہوں تو کئی چادریں استعمال میں لائی جاتی ہیں۔

ماضی میں نوجوان لڑکے درختوں پر چڑھ کر ٹوکریوں میں توت چن کر بازار میں فروخت کر کے اپنا جیب خرچ پورا کرتے تھے۔ بدنہ توت کا رس نچوڑ کر جام اور بعض مقامات پر شراب بھی بنائی جاتی ہے۔ توت کے میوے کو خشک بھی کیا جاتا ہے۔ خشک توت اخروٹ، گری اور خشک خوبانی کے ساتھ بہت لطف دیتا ہے۔ توت کی لکڑی ایندھن کے لئے بھی بہت مشہور ہے۔ کیونکہ اس کی لکڑی سے جلائی گئی آگ کے انگارے دیر تک حرارت پہنچاتے ہیں۔ دوران خزاں توت کے درختوں کی شاخ تراشی کر کے لکڑی ذخیرہ کی جاتی ہے تا کہ سردیوں میں بطور ایندھن استعمال میں لائی جا سکے۔ توت کی لکڑی سے جو راکھ حاصل ہوتی ہے اسے نسوار کی تیاری میں بھی استعمال کرتے ہیں۔

خوبانی:

یہ پھل اپنے اندر بے شمار خوبیاں لیے ہوئے ہے۔ بیسوں قسم کی خوبانی علاقہ بھر میں پائی جاتی ہے۔ تازہ خوبانی سے زیادہ خشک کی ہوئی خوبانی آج کل نہ صرف ملک کے تمام علاقوں میں بھیجی جاتی ہے بلکہ بیرونِ ملک بھی اس کی کافی مانگ ہے۔ خوبانی کا شمار یہاں کے مشہور پھلوں میں ہوتا ہے۔ گزشتہ ڈیڑھ دہائی سے خوبانی کے پھل کو سلفر کے ذریعے محفوظ کر کے برآمد بھی کیا جاتا ہے۔ ماضی میں خشک خوبانی (پھٹور) کو غریب لوگ بطور خوراک استعمال کرتے تھے جبکہ خوبانی کی گری کے مغز سے تیل نکالنے کا عمل ماضی قریب تک بہت عام تھا۔ لیکن آج کل محدود پیمانے پر یہ عمل جاری ہے۔ گری کے مغز کو پہلے بھون کر کچلتے ہیں پھر سل پر خوب رگڑتے ہیں۔ اسی طرح گری کی پسائی کا خمیر بنتا ہے۔ سل کو گرم کیا جاتا ہے اور خمیر کو اس پر اوپر نیچے ہلاتے ہیں۔ سل تو گرم ہوتی ہے اس پر گرم پانی جو کہ نمکین ہوتا ہے کا چھینٹا دے کر خمیر کو ملاتے ہیں تو تیل الگ ہو جاتا ہے اور سل کی ڈھلوان پر نیچے کی طرف بہنا شروع کرتا ہے۔ بادام کی گری سے روغن بادام بھی اسی طرح نکالا جاتا ہے۔ سل کو ایک طرف اونچا رکھا جاتا ہے۔ خوبانی کی گری کے روغن کی تعریف تو بہت سنی ہے۔ برف کے موسم میں استعمال کرو تو آدمی گرم رہتا

ہے۔ ساری سردی میں پاؤ بھر استعمال کرو تو جوانی واپس آتی ہے، لوگوں کے مطابق سر پر لگانے سے بال لمبے اور سیاہ ہو جاتے ہیں۔ شنا کا یہ محاورہ کہ ''اک ہنی پی تیل نے نکھای'' بمعنی ایک گری کا تیل نہیں نکلتا ہے، زبان زد عام ہے۔ یہ محاورہ ہمیں اتحاد کا درس دیتا ہے۔ اس کا مفہوم یہ ہے کہ ایک آدمی تن تنہا کچھ نہیں کر سکتا اس لئے ہمیں آپس میں مل جل کر امداد باہمی کے اصول کے تحت کام کرنا چاہئے۔

انگور:

شمالی علاقہ جات میں پایا جانے والا انگور لذت اور مٹھاس کے حوالے سے اپنا ثانی نہیں رکھتا۔ یہاں کے انگور کی بھی کئی قسمیں ہیں۔ گورسب ڈویژن چلاس میں ڈھڈنگ کے مقام پر انگور دیگر تمام علاقوں کی نسبت کافی پہلے پک کر تیار ہوتے ہیں۔ پونیال کا انگور علاقہ بھر میں مشہور ہے۔

چیری (گلاس):

چیری کا پھل شمالی علاقہ جات میں بڑی مقدار میں ہوتا ہے۔ یہ میوہ جس ہاتھ میں بھی ہو خوبصورت لگتا ہے اور جس منہ سے لگے ان کی چاہتوں کو مول لیتا ہے۔ اس کا موسم بھی بڑا خوبصورت ہوتا ہے۔ مارچ کے آخری اور اپریل کے ابتدائی ایام میں جب چیری کے پودوں پر پھول آتے ہیں تو برفانی موسم کا سماں یاد آتا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ ابھی ابھی برف گری ہو اور جب چیری کے دانے پکتے ہیں تو ایسا لگتا ہے کہ مرجان کے درخت ہیں۔ بہت سے شائقین اس کی فصل کا صرف نظارہ کر کے ہی لطف اندوز ہوتے ہیں۔ چیری کے پھل کا کاروبار بالخصوص مئی کے مہینے میں اپنے جوبن پر ہوتا ہے۔ لوگ اسے تحفتاً اپنے یار دوستوں کو بھیجتے ہیں۔ پاکستان بھر میں یہاں پائے جانے والے چیری کی بہت مانگ ہے۔ اس پھل کا موسم بہت مختصر ہوتا ہے۔ چیری کو مقامی لوگ ''گلاس'' کہتے ہیں۔

دیگر پھل:

ناشپاتی، انار، بادام، آلو بخارا، آلوچہ، آملوک، انجیر اور اخروٹ کی یہاں پر بہت سی اقسام پائی جاتی ہیں۔ اب تو پنجاب، سندھ، سرحد اور بلوچستان کے علاوہ دوسرے ممالک بالخصوص عوامی جمہوریہ چین سے بھی پھلدار پودے درآمد کر کے یہاں لگائے گئے ہیں۔ انگور، خوبانی، توت اور انجیر کے پھل خشک کر کے بھی استعمال کرتے ہیں۔

لوک داستانیں، کہانیاں اور روایات

داستان کہنا اور سننا قدیم زمانے سے انسانی تہذیب کا حصہ رہا ہے۔ طویل سفر پہ جانے والے مسافر قافلوں کی شکل میں جہاں کہیں پڑاؤ ڈالتے تو راتوں کو مشعلوں کی ٹمٹماتی روشنیوں میں کھلے آسمان تلے قصوں اور داستانوں کے ذریعے تہذیب و ثقافت کے چہرے سے نقاب اٹھاتے۔ داستان گو کی چرب زبانی اور قادر الکلامی دن بھر کے تھکے ہارے مسافروں میں زندگی کی ایک نئی لہر دوڑا دیتی۔ روایت میں یہ بات بھی موجود ہے کہ راستے میں سرائے خانوں میں پیشہ ور داستان گو ہوا کرتے تھے اور مسافروں کی دل بستگی کے لئے اپنے فن کا مظاہرہ کرتے۔

گلگت میں بھی داستان کہنا اور سننا قدیم زمانے سے انسانی تہذیب و ثقافت کا حصہ رہا ہے۔ نانی اور دادی اماں کی صورت میں تقریباً ہر گھر میں قصہ گو موجود ہوتے۔ بچے روتے یا والدین کو پریشان کرتے، نانی یا دادی جن، بھوتوں اور پریوں کی داستانوں سے ان کا دل بہلا لیتی۔ سردیوں کی طویل راتوں میں لحافوں میں چھپ کر نانی یا دادی جب کوئی قصہ چھیڑ دیتی، تب گھر کے تمام بچے ہمہ تن گوش ہو کر لطف اٹھاتے۔ انہی سردیوں میں دن کے وقت اجلی دھوپ کی نرم گرم بانہیں جب انسانی وجود کو ڈھانپ لیتیں تب کسی کھلی جگہ محفل جم جاتی۔ ایک شخص داستان شروع کرتا اور فراغت کے طویل اوقات ان داستانوں کی نذر ہو جاتے۔ اس زمانے میں چونکہ زندگی کی ہنگامہ خیزی حال کی طرح نہیں ہوا کرتی تھی۔ انسان مصروفیت اور ضرورت کی چکی میں پسا ہوا نہیں تھا اس لئے جیسے ہی سردی کی دھوپ پہاڑوں اور چھتوں کی منڈیروں سے اتر کر زمین پہ پھیل جاتی۔ گاؤں کے لوگ مختلف جگہوں میں جنہیں ''بیاک'' (چوپال) کہا جاتا، اکھٹے ہوتے، باتیں ہوتیں، قصے سنے جاتے، دھوپ ڈھلنے تک یہی سلسلہ چلتا رہتا تھا۔

یہاں کے بزرگوں کے مطابق قصے کہانیاں سننے کا اصل مزہ راتوں کو آتا ہے۔ جب لوگ آتش دان کے گرد بیٹھ جاتے اور ایک شخص داستانوں کی پٹاری کھول دیتا۔ طویل راتیں دھیرے دھیرے گزرتی جاتیں اور یوں لوگ ان قصوں کہانیوں کے ذریعے ٹھٹھرتی راتوں کی شدت بھول جاتے۔ گاؤں کے کسی گھر میں باری باری لوگ جمع ہوتے۔ بچے، بوڑھے، عورتیں سبھی اپنے اپنے گھروں میں کھانا کھا کر چلے آتے۔ عورتیں اپنے ساتھ سلائی بُنائی اور اون کاتنے کا کام لے کر آتیں۔ مرد بکری کے بالوں سے رسی بنانے کا کام کرتے۔ ان کے ہاتھ چلتے رہتے مگر کان قصہ گو کے منہ سے نکلنے والے الفاظ پر لگے رہتے۔ قصہ گو حضرات بھی بڑے باکمال ہوتے تھے۔ اپنی چرب زبانی اور قادر الکلامی سے وہ سماں باندھ دیتے کہ محفل میں موجود ہر فرد ہمہ تن گوش ہو کر سنتا۔ اس اثنا میں گھر کی عورتیں وقتاً فوقتاً خشک میوہ جات اور ستو کے ذریعے اہلِ محفل کی تواضع کرتی رہتیں۔ آتش دان کو گرم رکھنا بھی عورتوں ہی کی ذمہ داری ہوتی تھی۔ بعض داستان گو ایسے ستم ظریف ہوتے کہ جب کوئی چیز کھانے کی طلب ہوتی تب قصہ سناتے سناتے کسی دلچسپ موڑ پر ایک دم خاموش ہو جاتے اور مطلوبہ چیز کا تقاضا کرتے اور جب تک وہ چیز بہم

نہ پہنچائی جاتی قصے کا دوبارہ آغاز نہ کرتے۔

یہ داستانیں مختلف قسم کی ہوتی تھیں۔ مافوق الفطرت قصے، علاقے کی مشہور شخصیات کے قصے، مختلف جگہوں اور چیزوں سے متعلق قصے وغیرہ ہوتے تھے۔ مقامی لوک داستانوں میں شری بدت، یچھنی، سُو ملک، قبیلہ، کچھے کی تباہی، بلداس تھم بنی، دینل اور دنسی (چڑیل) جیسی داستانیں بڑی مشہور و مقبول تھیں۔ ان کے علاوہ فارسی کتابوں سے اخذ کی ہوئی داستانیں بھی بڑے شوق اور دلچسپی سے سنی جاتیں۔ ان میں الف لیلیٰ، رستم و سہراب، داستانِ امیر حمزہ، یوسف زلیخا اور گلستانِ سعدی قابلِ ذکر ہیں۔

مقامی لوک داستانیں عرصہ دراز سے سینہ بہ سینہ چلی آ رہی ہیں۔ ان میں بعض باتیں تو مشترک ہیں اور بعض باتوں میں اختلاف ہے۔ ان داستانوں میں زندگی کے مختلف پہلوؤں کی عکاسی ہوتی ہے۔ کسی میں محبت کا بیان ملتا ہے تو کسی میں نفرت کا۔ کسی میں انصاف کا کسی میں انتقام کا۔ کسی کہانی میں مردانہ وجاہت و بہادری کا قصہ رقم ہوتا ہے تو کسی میں نسوانی حسن و جمال کی فتنہ پردازیوں کا حال کھلتا ہے۔ الغرض زندگی ہر رنگ میں ان لوک داستانوں کے آئینے میں جھلکتی ہے۔ ان سب میں ایک بات تقریباً مشترک ہے کہ ناقابلِ یقین کہانیوں میں جن، بھوت، پری، چڑیل یا کوئی اور مافوق الفطرت کردار کی موجودگی ضروری ہوتی ہے۔ اگر کسی قصے میں ایسا کوئی کردار نہ بھی ہو تب بھی ان میں محیر العقول واقعات کی رنگ آمیزی ضرور ہوتی ہے۔

سُو ملک اور تُلی فر:

گئے وقتوں کی بات ہے کہ گلگت پر ایک راجا حکومت کرتا تھا جس کا نام سو ملک تھا۔ سو ملک بڑا ہی بہادر اور عقلمند تھا۔ اس کی ایک بہن تھی جو بڑی خوبصورت اور ذہین تھی۔ دور دور تک اس کے حسن کا چرچا پھیلا ہوا تھا۔ کئی ریاستوں کے راجے اور شہزادے اس سے شادی کے خواہشمند تھے۔ جب ریاست یاسین کے راجا فرمائش خان کی طرف سے رشتہ آیا تو سو ملک انکار نہیں کر سکا۔ کیونکہ فرمائش خان بھی بہت ہی بہادر اور طاقتور راجا تھا۔

کہتے ہیں کہ اس زمانے میں بدخشاں سے منگول سپاہ ان علاقوں پر لشکر کشی کرتی رہتی تھی۔ کئی ریاستوں کے راجا ان کے مطیع تھے اور منگولوں کے لئے سالانہ خراج بھجوا دیتے تھے۔ جس سال خراج بھجوانے میں کوتاہی برتتے، منگول آندھی طوفان کی طرح اس ریاست پہ چڑھائی کر دیتے اور زبردست تباہی پھیلانے کے بعد واپس چلے جاتے۔ یاسین کا راجہ فرمائش خان بھی بدخشاں کے منگولوں کا باج گزار تھا۔ روایت کے مطابق ایک سال کسی وجہ سے اس نے خراج نہیں بھجوائی۔ منگولوں نے جب یہ سنا تو سخت آگ بگولا ہوئے اور یاسین پر حملہ کرنے کے لئے اشکومن اور درکوت کی طرف سے داخل ہوئے۔ جب راجہ فرمائش خان کو منگولوں کے حملے کا علم ہوا تو اس نے گلگت کے راجا سو ملک کو پیغام بھیجا کہ منگولوں کے خلاف اس کی مدد کرے۔ سو ملک اپنے بہنوئی کی مدد کے لئے فوراً ایک بڑا لشکر لے کر یاسین کی طرف روانہ ہوا اور کہیں ٹھہرے بغیر یاسین پہنچ گیا۔ اتفاق سے منگول نے بھی اسی دن یاسین پہنچ کر دریا کی دوسری طرف پڑاؤ کیا تھا۔ جب دونوں لشکر آمنے سامنے ہوئے تب منگولوں کی طرف سے قاصد نے پیغام لایا کہ لڑائی کا آغاز سو ملک کی طرف سے ہو۔ سو ملک اور اس کی سپاہ چونکہ کسی جگہ ٹھہرے بغیر یاسین پہنچے تھے اس لئے وہ سخت تھکے ہوئے تھے۔ جبکہ منگول جگہ جگہ پڑاؤ کرتے ہوئے یاسین پہنچے تھے۔ اس لئے وہ تازہ دم تھے۔ سو ملک نے صورتحال کا جائزہ لیا اور منگول کے سپہ سالار کو پیغام بھیجا کہ لڑائی اگلے روز تک ملتوی کی جائے۔ تاہم اگر انفرادی طور پر کوئی جنگجو اپنی بہادری اور مہارت دکھانا چاہے اسے اجازت دی جائے۔ منگولوں کے سپہ سالار نے سو ملک کا یہ پیغام قبول کیا اور اپنی سپاہ میں سے ایک بہادر شخص کو اپنی شجاعت و مہارت ثابت کرنے کا حکم دیا۔ اس منگول نے حکم کے بموجب ایک بکرا ہاتھ میں اٹھایا اور پوری قوت سے گھماتے ہوئے دریا کی دوسری طرف پھینک دیا۔ بکرا اڑتا ہوا آیا اور سو ملک کے قریب زمین پہ گر پڑا۔ تب سو ملک نے خود ہی اس کا جواب دینے کا فیصلہ کیا۔ اس نے بڑا سا درخت جڑ سے اکھاڑا اور دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر گھماتے ہوئے اس زور سے منگولوں کی طرف پھینک دیا کہ درخت اڑتا ہوا جا کے ان کے درمیان گرا۔ درخت اتنا بڑا تھا کہ اس کے نیچے آ کے بہت سے منگول سپاہی مر گئے۔ سو ملک کی بہادری کا یہ مظاہرہ دیکھ کر منگولوں کا حوصلہ جواب دے گیا۔ انہوں نے لڑنے کا ارادہ ترک کیا اور راتوں رات پسپائی اختیار کرتے ہوئے واپس چلے گئے۔ دن کے وقت جب سو ملک کی سپاہ نے منگولوں کو نہ دیکھا تو سخت حیران ہوئے۔ سو ملک فراست سے سمجھ گیا کہ انہوں نے پسپائی اختیار کی ہے۔ اس نے فوراً اپنے لشکر کو منگولوں کا تعاقب کرنے کا حکم دیا۔ اس کی سپاہ تیزی سے منگولوں کا پیچھا کرتی ہوئی درکت پہنچ گئی۔ وہاں دونوں فوجوں کا آپس میں ٹکراؤ ہوا۔ بدقسمتی سے لڑائی کے دوران سو ملک گھوڑے سے نیچے گر گیا۔ جب اس کی فوج نے اپنے راجا کو گھوڑے پر نہ دیکھا تو ہمت ہار گئی اور پسپا ہو کر گلگت کی طرف بھاگ گئی اور راجا سو ملک کو منگولوں نے گرفتار کر کے اپنے ساتھ بدخشاں لے گئے۔ منگول چونکہ تہذیب و شائستگی بالکل نہیں جانتے تھے اسلئے ایک بادشاہ کے شایانِ شان سلوک کرنے کے بجائے اسے شاہی محل کے مطبخ کے لئے لکڑیاں لانے کی ذمہ داری سونپی گئی۔ سو ملک لاچار تھا کہیں بھاگنے کا بھی راستہ نہیں تھا اس لئے مجبوراً یہ کام کرتا رہا۔



ہنزہ کی خواتین خوبانیاں خشک کرنے کے لئے انہیں صاف کر رہی ہیں

ایک روز وہ باقی ملازموں کے ساتھ جنگل میں لکڑیاں کاٹ رہا تھا۔ اچانک اس کی نظر ایک مرے ہوئے جانور کے سر پر پڑی۔ اس نے فوراً رونا شروع کیا۔ اس کے ساتھی اسے روتا دیکھ کر حیران ہوئے اور رونے کا سبب پوچھا۔ مگر سو ملک نے کسی کو بھی اپنے رونے کی وجہ نہیں بتائی۔ لکڑیاں لا کے مطبخ میں رکھ دیں اور ایک جگہ بیٹھ کر رونے لگا اور ساتھ ہی بڑبڑاتے ہوئے کہنے لگا۔ ''کسی کو بھی احساس نہیں کہ میں عام شخص نہیں ہوں۔ گلگت کا راجا ہوں۔ اسی طرح کسی کو علم نہیں کہ جنگل میں مرے ہوئے جانور کا سر ''تلی فر'' کا ہے۔ کتنے افسوس کی بات ہے ایک راجا لکڑہارا بنا ہوا ہے اور ایک تلی فر جنگل میں پڑا ہوا گل سڑ رہا ہے۔ (تلی فر کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ خچر اور گھوڑی کی نسل سے ہوتا تھا۔ بہت ہی تیز اور طاقتور جانور ہوتا تھا۔ ہر شخص اس کی شناخت نہیں کر سکتا تھا۔)

راجا سو ملک کی یہ بڑبڑاہٹ ایک شخص نے سنی اور یہ بات منگولوں کے بادشاہ تاج مغل تک پہنچ گئی۔ اس نے سو ملک کو طلب کیا اور پوچھا۔ ''اے سو ملک کیا تم تلی فر کو پہچان سکتے ہو؟''

سو ملک نے جواب دیا۔ ''جی ہاں اے مغل سردار۔ میں تلی فر جانور کو دیکھ کر پہچان سکتا ہوں۔''

تب تاج محل نے حکم دیا۔ ''شاہی اصطبل کے تمام گھوڑوں کو ایک کھلے میدان میں جمع کیا جائے تا کہ سو ملک دیکھ کر بتا سکے کہ ان میں ''تلی فر'' موجود ہے کہ نہیں؟''

فوراً حکم کی تعمیل کی گئی۔ ایک کھلے میدان میں سینکڑوں گھوڑے لائے گئے۔ سو ملک نے غور سے تمام گھوڑوں کو دیکھا اور پھر ایک کمزور اور گندے سے گھوڑے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ یہ ''تلی فر'' ہے۔ اس گھوڑے پر اتنی بار برداری کی گئی تھی کہ اس کی پشت پہ بڑے بڑے زخم آئے ہوئے تھے۔ مغل سردار کے حکم پر اس نے ''تلی فر'' کی دیکھ بھال شروع کی اور کچھ ہی عرصے میں ''تلی فر'' صحت مند اور طاقت ور ہو گیا۔ جب ''تلی فر'' اصل حالت میں لوٹ آیا تب ایک روز سو ملک نے اس کی پشت پہ زین باندھ کر تاج مغل کے سامنے حاضر کیا۔ تاج مغل ''تلی فر'' کو دیکھ کر بہت خوش ہوا اور حکم دیا کہ ''تلی فر'' کو بادشاہوں کی سواری کی شایان شان بنانے کے لئے خصوصی تربیت دی جائے۔ سو ملک نے تاج مغل کے حکم کے بموجب ''تلی فر'' کی تربیت شروع کی۔ چند ہی دن میں ''تلی فر'' کو اس قابل بنایا کہ ایک ہی دن میں بدخشاں سے ہندوستان جا کر واپس آ سکتا تھا۔ سو ملک ''تلی فر'' کی تربیت کے ساتھ ساتھ منگولوں کی قید سے نجات حاصل کرنے کی تدابیر بھی سوچتا جا رہا تھا۔ ایک روز جب ''تلی فر'' کی تربیت مکمل ہوئی اور منگول سردار نے ''تلی فر'' کی کارکردگی دیکھنے کی خواہش ظاہر کی تو سو ملک ''تلی فر'' پہ سوار ہو کر تاج مغل کے سامنے حاضر ہوا اور کہا۔ ''اے منگول سردار! تم نے مجھے اپنا ملازم بنا کے رکھا۔ میں گلگت کا راجا ہو کر بھی تیرے مطبخ کے لئے لکڑیاں کاٹتا رہا۔ صرف اس لئے کہ میں تیرا اعتماد حاصل کر کے کبھی یہاں سے فرار ہونے میں کامیاب ہو سکوں۔ قسمت سے مجھے یہ موقع ملا اور ''تلی فر'' میرے قبضے میں آیا۔ اب ''تلی فر'' اس قابل بن گیا ہے کہ تیری آنکھوں کے سامنے میں بھاگ رہا ہوں۔ تم میں اور تمہاری فوج میں ہمت ہے تو مجھے پکڑ لے۔''

سو ملک نے یہ کہا اور ''تلی فر'' کی لگام کھینچی۔ اس کے اشارے سے ''تلی فر'' سرپٹ دوڑنے لگا۔ ذرا ہی دیر میں سب کی نظروں سے غائب ہو گیا۔ تاج مغل نے فوراً اپنی سپاہ کو سو ملک کا پیچھا کرنے کا حکم دیا۔ فوراً بڑی تعداد میں تیز رفتار گھڑ سوار فوج سو ملک کے تعاقب میں نکلی۔ منگولوں کے گھوڑے ہوا سے باتیں کرتے ہوئے ''تلی فر'' کا پیچھا کر رہے تھے لیکن سب کی تیز رفتاری ''تلی فر'' کے سامنے بے بس تھی۔ منگول گھڑ سوار اور ''تلی فر'' کا فاصلہ بڑھتا جا رہا تھا۔ بڑی دیر بعد سب گھوڑے بہت پیچھے رہ گئے۔ صرف ایک گھوڑی ایسی تھی جو ''تلی فر'' کے مقابلے میں دوڑ رہی تھی اور آہستہ آہستہ ''تلی فر'' کے قریب آتی جا رہی تھی۔

راجہ سو ملک نے ''تلی فر'' کی رفتار کچھ کم کی اور تعاقب میں موجود گھوڑی اس کے برابر آئی سو ملک نے پلٹ کر چیخ کر کہا ''اے بے وقوف انسان! کیوں اپنی اور گھوڑی کی جان کے دشمن بنے ہو۔ تم کبھی بھی ''تلی فر'' کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ تمہاری گھوڑی کے پیٹ میں بھی ''تلی فر'' موجود ہے۔ اس لئے اس نے میرا پیچھا کرنے میں ہمت دکھائی۔ میرا مشورہ مان لو۔ واپس چلے جاؤ اور گھوڑی کو مرنے سے بچاؤ تا کہ تجھے بھی ''تلی فر'' مل جائے۔''

منگول گھڑ سوار نے یہ سنا تو بہت خوش ہوا اور سو ملک کا تعاقب ترک کر کے واپس چلا گیا۔ سو ملک ''تلی فر'' پہ سوار یاسین اپنی بہن کے پاس پہنچ گیا۔ یاسین کا راجہ فرمائش خان اس خیال میں تھا کہ سو ملک درکوت کی لڑائی میں منگولوں کے ہاتھوں مارا گیا ہے۔ اس نے جب سو ملک کو اپنے سامنے دیکھا تو سخت متعجب ہوا۔ یاسین میں سو ملک کو یہ جان کر سخت طیش آیا کہ اس کی عدم موجودگی میں راجہ فرمائش خان اس کی بہن پر شدید ظلم کرتا تھا۔ سو ملک کو اتنا غصہ آیا کہ بے قابو ہو کر اس نے راجہ فرمائش خان کو مارا پیٹا اور اس کا ایک بازو بھی توڑ دیا۔ رات کے وقت وہ بہن سے ملنے اس کے کمرے کے دروازے پہ گیا۔ اندر سے بہن کی اور راجہ فرمائش خان کی باتیں سنائی دینے لگیں۔ راجہ فرمائش خان ٹوٹے ہوئے بازو کی وجہ سے شدید درد میں مبتلا تھا اور تکلیف کی شدت سے کراہ رہا تھا۔ سو ملک کو بہن کی آواز سنائی دی، وہ غصے سے کہہ رہی تھی۔ ''میرے بھائی کو یہ حق نہیں پہنچتا تھا کہ آپ پر ہاتھ اٹھائے۔ انہوں نے آپ کا بازو توڑا ہے خدا کرے ان کا بازو بھی

ٹوٹ جائے۔''

سوملک بہن کے منہ سے یہ باتیں سن کر سخت ملول اور شرمندہ ہوا۔ بہن سے ملے بغیر واپس ہوا اور خود سے کہنے لگا۔ ''یہ سچ ہے کہ عورت کے لئے سب رشتوں سے بڑھ کر اس کا مرد عزیز ہے۔ چاہے وہ کتنا ہی برا ہو باپ اور بھائی سے زیادہ عورت کے لئے عزیز ہوتا ہے۔ آئندہ راجہ فرمائش خان جتنا بھی میری بہن پہ ستم ڈھائے اس کی طرف داری کی تو میری بیوی طلاق ہو جائے۔''

یہ کہہ کر غصے سے بھرا ہوا اسی وقت گلگت روانہ ہوا۔

یچھنی اور دینل کھمیٹو:

گلگت کے جنوب مغرب میں نپورہ کے پہاڑی سلسلے میں ایک مسطح پہاڑ پہ ایک عورت کا مجسمہ بنا ہوا ہے۔ مقامی زبان میں اسے ''یچھنی'' کہتے ہیں۔ یہ مجسمہ زمین سے 30 فٹ بلند ہے۔ بلاشبہ یہ مجسمہ قدیم زمانے میں بنایا گیا ہے۔ اس سے یہ بات بھی ظاہر ہوتی ہے کہ کبھی اس علاقے میں بدھ مت کے ماننے والے رہتے تھے۔ لیکن گزرتے وقت کے ساتھ اس مجسمے سے محیر العقول واقعات منسوب کئے گئے۔ اسے آدم خور کہا جانے لگا۔ ذیل کی داستان بھی اسی طرح سینہ بہ سینہ سفر کرتی رہی ہے۔

کہتے ہیں کہ قدیم زمانے میں یچھنی زندہ تھی۔ اس کا تعلق دیو کی نسل سے تھا۔ یچھنی بہت ہی ظالم اور آدم خور تھی۔ وہ نپورہ کی پہاڑی پہ رہتی تھی۔ گلگت کے لوگ نپورہ کے جنگل سے لکڑیاں لانے جاتے تھے۔ لوگوں کے مطابق اگر دو افراد جنگل کی طرف جاتے تو ایک کو یچھنی کھا لیتی اور دوسرے کو چھوڑ دیتی تھی۔ اس طرح چار میں سے دو کو اپنا شکار بنا لیتی۔ گلگت کے لوگ اس آدم خور مخلوق سے بہت پریشان تھے۔ ان کا سکون ختم ہوا تھا۔ ہر طرف خوف و ہراس پھیلا ہوا تھا۔ یچھنی کو ختم کرنے یا اس کی تباہ کاریوں سے محفوظ رہنے کی کوئی تدبیر کارگر نہیں ہو رہی تھی۔

ایک دفعہ گلگت کا ایک شخص بگروٹ چلا گیا۔ واپس آ کے اس نے بتایا کہ بگروٹ میں ایک زبردست ''دینل'' (کاہن) رہتا ہے۔ اس کا نام کھمیٹو ہے۔ وہ بہت بڑا عامل ہے۔ جن بھوت وغیرہ کو تابع کرنے میں زبردست مہارت رکھتا ہے۔ یہ سن کر گلگت سے معززین کا ایک وفد بگروٹ گیا اور دینل کھمیٹو کو یچھنی کے ظلم و بربریت کا سارا واقعہ سنایا۔ دینل کھمیٹو ان کی مدد کرنے پہ آمادہ ہوا اور ان کے ساتھ گلگت آیا۔ یہاں اس نے اپنا عمل شروع کیا اور لوگوں سے کہا۔ ''یچھنی کو ختم کرنا یا تابع بنانا میرے لئے مشکل نہیں لیکن میری ایک نصیحت یاد رکھو یچھنی کے خاتمے کے بعد میں جہاں کہیں بھی جاؤں اور میرا انتقال ہو جائے تو میری لاش یچھنی کے پیروں کے نیچے دفن کی جائے ورنہ کچھ ہی عرصے بعد یچھنی پھر سے زندہ ہو جائے گی۔''

لوگوں نے یقین دلایا کہ اس کی نصیحت پر عمل کیا جائے گا۔ دینل کھمیٹو نے لوہے کی میخیں تیار کیں اور منتر پڑھتا ہوا پہاڑی کی طرف روانہ ہوا۔ یچھنی جس چٹان پر رہتی تھی وہ ایسی دشوار جگہ تھی کہ کسی انسان کا پہنچنا ناممکن تھا۔ لیکن دینل کھمیٹو منتر پڑھتا ہوا مسطح چٹان پہ لوہے کی میخیں ٹھونک کر ان کو پکڑتا ہوا اس غار کے دھانے تک پہنچ گیا جس کے اندر یچھنی رہتی تھی۔ یچھنی نے جب غار کے اندر انسانی بو محسوس کیا تو باہر نکلی اور ایک انسان کو دیکھ کر لمبی لمبی سانسیں لینے لگی۔

دینل کھمیٹو دل ہی دل میں منتر پڑھتا جا رہا تھا۔ اس نے کہا۔ ''بہن یچھنی! تم کیسی ہو؟ میں تمہارے لئے ایک بری خبر لے آیا ہوں۔ افسوس تمہارا بھائی کشمیر میں مر گیا ہے۔''

جب یچھنی نے یہ سنا تو شدید صدمے سے اپنا دایاں ہاتھ سینے پہ رکھا۔ دینل کھمیٹو نے فوراً منتر پڑھ کر میخ پہ پھونکا اور یچھنی کے سینے پہ رکھے ہاتھ کی پشت پہ میخ ٹھونک دی۔ یچھنی کے منہ سے ایک بھیانک چیخ نکلی اور اس کا سینہ اور ہاتھ پتھر کے بن گئے۔ دینل کھمیٹو نے دوبارہ افسوس کرتے ہوئے کہا۔ ''بہن یچھنی! قسمت میں تمہارے لئے مزید دکھ لکھے ہوئے ہیں۔ تمہارا باپ بھی بلتستان میں مر گیا ہے۔''

یہ سن کر یچھنی نے ایک بار پھر دکھ کا اظہار کرتے ہوئے دوسرا ہاتھ اپنی ران پہ مارا۔ دینل کھمیٹو نے فوراً منتر پڑھتے ہوئے وہاں بھی کیل ٹھونک دی۔ کیل لگتے ہی ران اور دوسرا ہاتھ بھی پتھر کا بن گیا۔ اب یچھنی حرکت کرنے کے قابل نہیں رہی تھی۔ وہ چلانے لگی اور کھمیٹو کی دغابازی پر واویلا کرتے ہوئے بولی۔ ''ہائے دینل کھمیٹو! یہ تو نے میرے ساتھ کیا کیا۔ اب میں خوراک کیسے کھاؤں گی؟'' دینل کھمیٹو نے کہا۔ ''آج سے پہلے تو انسانوں کو کھا لیتی تھی اور آج سے پتھر اور کنکر تیری خوراک بنیں گے۔'' کہتے ہیں اب بھی جب اوپر سے چھوٹے چھوٹے پتھر اور روڑے لڑھکتے ہوئے نیچے گرتے ہیں تو لوگ کہتے ہیں کہ یچھنی کے لئے خوراک آ رہی ہے۔

جب یچھنی بالکل بے بس ہوئی تب دینل کھمیٹو نے مزید منتروں کے ذریعے اسے مکمل پتھر کا بنا دیا۔ اس کے بعد نیچے وادی میں آیا۔ گلگت کے لوگوں نے اس کا شاندار استقبال کیا۔ کئی دنوں تک گلگت میں جشن منایا گیا۔ ایک دن دینل کھمیٹو واپس بگروٹ روانہ ہوا۔ لوگوں نے بہت اچھی طرح اسے رخصت کیا۔ لیکن گلگت کے کچھ چالاک لوگوں کو دینل کھمیٹو کی واپسی سے خوشی نہ ہوئی۔ ان کے کانوں میں کھمیٹو کی باتیں گونجنے لگیں کہ یچھنی کے خاتمے کے بعد اس کے پیروں کے نیچے دینل کی لاش دفن کی جائے ورنہ یچھنی دوبارہ زندہ ہو جائے گی۔ ان

چالاک لوگوں نے آپس میں مشورہ کیا کہ کھمیٹو اگر چلا گیا اور کسی نامعلوم جگہ مرجائے تب یچھنی کا عفریت دوبارہ زندہ ہوجائے گا۔ اس لئے یہی وقت ہے اس دینل کو مار کر یچھنی کے پاس دفن کردیا جائے تا کہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اس مصیبت سے نجات مل جائے۔ یہ طے کر کے وہ کھمیٹو کے پیچھے گئے اور راستے میں اس کو پکڑ کر مار ڈالا اور اس کی لاش یچھنی کے نیچے دفن کردی۔

اس طرح بدنصیب کھمیٹو گلگت کے لوگوں پہ احسان کرنے کے باوجود انہی کے ہاتھوں مارا گیا۔ کھمیٹو کے بارے میں کی گئی ایک تحقیق سے یہ بات معلوم ہوئی ہے کہ وہ چھپروٹ ریاستِ نگر کا باشندہ تھا۔ جہاں اس کے خاندان کے افراد آج بھی آباد ہیں۔

راجا ترا خان اور بولتا کوا:

کہتے ہیں بہت پہلے گلگت پر راجا ترا خان کی حکومت تھی۔ حکمران خاندان ترا خان کا مورث اعلیٰ آذر جمشید کے نام سے معروف تھا جس نے شری بدت کا خاتمہ کر کے اس کی بیٹی نور بخت سے شادی کی تھی۔

راجا ترا خان بڑا عقلمند اور بہادر بادشاہ تھا۔ دور دور تک لوگ اس کی بہادری اور ذہانت کی مثالیں دیتے تھے۔ دوسری ریاستوں کے بادشاہ بھی اس سے مرعوب رہتے تھے۔ ایک دفعہ راجہ ترا خان دریائے گلگت کے کنارے اپنے مصاحبوں اور دوستوں کے ساتھ بیٹھا تھا۔ گفتگو کے دوران اس نے بڑے ہی فخر سے کہا کہ روئے زمین پر اس وقت اس جیسا بہادر اور عقل مند شخص موجود نہیں۔ ابھی وہ یہی کہہ رہا تھا کہ ایک کوا کہیں سے اڑتا ہوا آیا اور عین اس کے سر کے اوپر آ کر گندگی خارج کی۔ کوے کی بیٹ ترا خان کے اوپر پڑی تو شدید غصے سے لال پیلا ہوگیا۔ گرج گرج کر اپنے کارندوں کو حکم دیا کہ کسی طرح سے بھی کوے کو پکڑ کر اس کے سامنے لایا جائے۔ فوراً بڑی تعداد میں ترا خان کے سپاہی کوے کو پکڑنے کے لئے روانہ ہوئے۔ کہتے ہیں وہ کوا انسانی بولی سمجھتا اور بولتا تھا۔ اس نے جب یہ سنا تو اڑتا ہوا مناور کی طرف گیا جو گلگت سے چند میل کے فاصلے پر مشرقی سمت ایک گاؤں ہے۔ جب راجا کے سپاہی تعاقب کرتے ہوئے مناور پہنچ گئے تو وہاں سے بھی اڑتا ہوا دریائے گلگت کے اس پار وادی دنیور کی طرف چلا گیا۔ لیکن جب دیکھا کہ راجہ کے آدمی اس کے تعاقب سے باز نہیں رہے ہیں تو وہ پہاڑ کے اندر دنیور نالے میں جا کر چھپ گیا۔ مسلسل اڑتے رہنے سے کوا سخت تھک گیا تھا۔ پکڑے جانے کے خوف سے کچھ کھایا پیا بھی نہیں تھا۔ اب جو پہاڑی نالے میں آ کر چھپ گیا تو شدید بھوک محسوس ہوئی۔ اِدھر اُدھر دیکھا کھانے کو کچھ بھی نہ ملا۔ کھلی فضا میں نکلنے سے دیکھے جانے کا اندیشہ تھا اس لئے پہاڑی کھوہ میں چھپ کر بیٹھ گیا۔

دوسری طرف راجہ کے سپاہی اسے تلاش کرتے ہوئے دنیور نالے میں آ گئے۔ ایک جگہ دیکھا کہ ایک بوڑھی عورت مارخور کا گوشت دھو رہی تھی۔ ان لوگوں نے بڑھیا سے گوشت کے چند ٹکڑے لئے اور ایک بڑی سی چٹان پہ گوشت رکھ دیا۔ خود قریب ہی چھپ کر بیٹھ گئے۔

کوا بڑی دیر تک پہاڑی کھوہ میں چھپا رہا۔ بھوک کی شدت اسے بے تاب کئے دے رہی تھی۔ جب اسے اندازہ ہوا کہ اب تک اس کا تعاقب کرنے والے مایوس ہو کر واپس گئے ہوں گے۔ وہ خوراک کی تلاش میں باہر نکلا اور کھلی فضا میں اڑتا ہوا نیچے وادی دنیور کی طرف آنے لگا۔ فوراً ہی اُسے ایک بڑی چٹان کے اوپر گوشت کے ٹکڑے نظر آئے۔ شدید بھوک سے وہ نہ جان سکا کہ یہ سب اسے پکڑنے کی چال ہے۔ وہ چٹان پہ آ کر جوں ہی چونچ سے گوشت کا ایک ٹکڑا پکڑا ایک جال اس کے اوپر آیا اور وہ جال میں پھنس گیا۔ راجا کے سپاہی اسے پکڑ کر گلگت لے آئے اور ترا خان کے سامنے پیش کیا۔ راجا نے سخت غصے سے کہا۔ ''اے گستاخ کوے! کیا تو جانتا نہیں تھا کہ میں کون ہوں؟ تیری ہمت کیسے ہوئی کہ گلگت کے سب سے بہادر راجہ کے اوپر تو نے گندگی پھینک دی؟''

کوے نے کہا۔ ''حضور! میں آپ کو اچھی طرح جانتا ہوں اور میں یہ بھی جانتا ہوں کہ دریا کے کنارے جس جگہ آپ بیٹھ کر اپنے بارے میں شیخی بگھار رہے تھے اسی جگہ ایک آدمی دفن ہے جو آپ سے کئی گنا زیادہ طاقت ور تھا۔ مجھے آپ کا غرور پسند نہ آیا۔ کیونکہ انسان جتنا بھی طاقت ور ہو ایک دن اس نے مٹی میں مل جانا ہے۔ جو انسان دریا کے کنارے دفن ہے وہ بھی بہت غرور کرتا تھا۔ مگر انجام کیا ہوا۔ بے حیثیت مٹی میں مل کر بے حیثیت بن گیا۔ اس طاقتور آدمی کے ساتھ اس کی انگوٹھی بھی دفن کی گئی تھی۔ آپ اس جگہ کی کھدائی کروالیں انگوٹھی دیکھ کر معلوم ہوگا کہ وہ آپ کے مقابلے میں کتنا طاقتور اور بڑا تھا۔''

ترا خان نے فوراً حکم دیا کہ اس جگہ کی کھدائی کی جائے۔ جب زمین کھودی گئی تب اندر سے ایک انگوٹھی برآمد ہوئی۔ کہتے ہیں انگوٹھی اتنی بڑی تھی کہ ترا خان کا پورا جسم انگوٹھی سے گزر سکتا تھا۔ راجہ ترا خان یہ دیکھ کر بہت حیران ہوا۔ ساتھ ہی اس کے دل پر زبردست اثر ہوا اس نے فوراً توبہ کی کہ آئندہ کبھی غرور کی بات نہیں کرے گا۔ اس کے بعد بولتے کوے کو آزاد کردیا گیا۔

رُنی (چڑیل):

قدیم زمانے میں جب آبادی کم تھی۔ علم و آگہی کی روشنی ابھی پھیلی نہیں تھی۔ توہمات کے اثرات پورے علاقے میں بری طرح پھیلے ہوئے تھے۔ ذرا سی

عجیب بات واقع ہوتی تو لوگ ضعیف الاعتقادی اور توہم پرستی سے محیر العقول واقعات کی پٹاری کھول دیتے۔ ''چڑیل'' کا تعلق بھی ایسے ہی واقعات کی کڑی سے تھا۔ کہا جاتا ہے کچڑیل کے پاس غیر معمولی طاقتیں ہوتیں جن کی وجہ سے وہ اپنی شکل وصورت بدل دیتی اور ضرورت کے مطابق انسانی آنکھوں سے بھی اوجھل ہوجاتی تھی۔ انسانی گوشت ان کی مرغوب غذا ہوتی تھی۔ یہ جس شخص کو اپنا شکار منتخب کرلیتی کہا جاتا ہے کہ وہ شخص سونے کی حالت میں ہوتا تب چڑیلیں اپنی غیر معمولی طاقتوں کے ذریعے اس کی روح جسم سے نکال لیتی۔ اور ڈراؤنی آوازیں نکالتے ہوئے روح کو لے کر ویرانوں کی طرف نکل جاتی ہیں۔ وہاں اس انسان کی روح جسمانی صورت میں آتی اور تمام چڑیلیں مل کر اس انسان کے ٹکڑے کردیتیں اور آپس میں بانٹ کر کھالیتیں اور واپس اپنے اپنے گھروں کو لوٹ کر عام انسانوں کی طرح اپنے بستروں میں سوجاتیں۔ دوسری طرف جس انسان کی روح کو جسم سے نکالا گیا تھا وہ شدید بیمار پڑجاتا اور چند ہی دنوں میں اس کی موت واقع ہوتی۔ اس کے برعکس جس انسان کی روح طاقت ور ہوتی اور چڑیل کے قبضے میں نہ آتی اور کسی چڑیل کو زخمی کرلیتی تب دن کے وقت زخمی چڑیل بیمار پڑجاتی۔ ایسے میں اگر وہ انسان چڑیل کے سامنے آتا تب چڑیل بچ جاتی اور وہ انسان مرجاتا۔

گلگت اور آس پاس کے علاقوں میں چڑیل سے متعلق یہ ساری باتیں اس زمانے میں یقین کی حد تک کہی اور سنی جاتی تھیں۔ رفتہ رفتہ ان باتوں کی صداقت تو ختم ہوتی رہی تاہم ان سے متعلق واقعات کی بازگشت اب بھی یہاں سنی جاتی ہے۔

رُنّی اور اس کا چالاک بیٹا:

کہا جاتا ہے کہ کافی عرصہ پہلے گلگت کے ایک محلے میں چڑیل رہتی تھی۔ اس کا نام پھٹولی تھا۔ عام وقت میں تو چڑیل ایک عام عورت کی طرح زندگی گزارتی تھی۔ تاہم مخصوص راتوں میں اس کی جون بدل جاتی اور چڑیل بن کر انسانی گوشت کا شکار کرلیتی۔ پھٹولی کا ایک بیٹا تھا۔ بہت ہی صحت مند اور کڑیل جوان تھا۔ علاقے کی ایک جوان لڑکی اس سے محبت کرتی تھی۔ اتفاق سے وہ لڑکی بھی چڑیل تھی۔ تمام چڑیلوں آپس میں سمجھوتہ ہوتا تھا کہ ہر طرح کا شکار مل جل کر کرتی تھیں اور زندگی میں ایک بار انہیں اپنے عزیز ترین رشتہ دار کو بھی شکار کرکے باقی چڑیلوں کی دعوت کرنی ہوتی تھی۔ ایک دفعہ اس نوجوان کی ماں چڑیل کی باری آتی ہے کہ اپنے بیٹے کی دعوت کرے۔ پھٹولی راضی ہوتی ہے۔ جب ان کی چڑیل محبوبہ کو اس کا علم ہوتا ہے۔ تو وہ سوچتی ہے کس طرح اپنے محبوب کو چڑیلکی خوراک بننے سے محفوظ رکھا جائے۔ کافی دیر سوچنے کے بعد ایک طریقہ اس کے دماغ میں آتا ہے۔ اگلے روز جوان جب اپنے بیل چرانے دریا کی طرف گیا تو اس کی محبوبہ چڑیل اس کے پاس گئی۔ نوجوان اسے دیکھ کر خوش ہوا اور اس سے پیاری پیاری باتیں شروع کیں۔ محبوبہ چڑیل بے تابی سے بولی۔ ''باتوں کے لئے زندگی پڑی ہے۔ تم اپنی فکر کرو اور اپنی ماں سے بچ کے رہو۔''

نوجوان حیرانی سے بولا۔ ''کیوں؟ میری ماں میرے ساتھ کیا کرے گی؟''

وہ بولی۔ ''تیری ماں چڑیل ہے اور اس نے باقی چڑیلوں سے وعدہ کیا ہے کہ اس دفعہ تیرے گوشت کی دعوت کرے گی۔ اگر وعدے کے مطابق تمہاری ماں نے دعوت نہ کی تو ان کا بادشاہ اسے جلا کر راکھ کردے گا۔''

نوجوان بے یقینی سے بولا۔ ''میری ماں ایسی نہیں ہوسکتی۔ وہ مجھ سے بہت محبت کرتی ہے۔''

محبوبہ بولی۔ ''میں تجھے ایک جگہ کے بارے میں بتاتی ہوں۔ تم اس جگہ چھپ جاؤ۔ پھر خود اپنے کانوں سے سب کچھ سن لوگے۔''

''تم یہ سب کیسے جانتی ہو؟ مجھے کیسے بچاسکتی ہو؟''

''میں تم سے محبت کرتی ہوں۔ لیکن یہ حقیقت ظاہر کرتی ہوں کہ میں بھی چڑیل ہوں۔ لیکن تمہاری ماں سے زیادہ طاقت ور ہوں۔ جن سے محبت کرتی ہوں انہیں بچانے کی طاقت رکھتی ہوں۔''

نوجوان دکھ سے بولا۔ ''تمہاری بات سن کر مجھے افسوس تو ہوا ہے مگر یہ اطمینان بھی ہوا کہ تم مجھے بچانا چاہتی ہو۔ میں تیری باتوں پہ عمل کرنے کی کوشش کروں گا۔''

محبوبہ بولی۔ ''تھوپ چھار میں چنار کا ایک بڑا درخت ہے۔ درخت کا تنا کھوکھلا ہے۔ رات کے وقت تمام چڑیلیں اس کھوکھلے تنے میں جمع ہوتی ہیں اور آئندہ شکار کے بارے میں فیصلہ کرتی ہیں۔ تم چنار کے اوپر شاخوں میں چھپ کر بیٹھ جاؤ۔ چڑیلیں جہاں بیٹھتی ہیں وہاں سے اوپر کی طرف دیکھنے کی اجازت نہیں۔ اس لئے تم بغیر کسی خطرے کے وہاں چھپ کر بیٹھ سکتے ہو۔''

نوجوان نے محبوبہ کا شکریہ ادا کیا اور گھر واپس آیا اور اپنی ماں سے کہا۔ ''ماں! میں دوسرے ملک جانا چاہتا ہوں تاکہ کچھ کما کر لے آؤں۔ میرے لئے چھپٹہ (مقامی روٹی) تیار کرلیں۔''

ماں نے جواب دیا۔ ''بیٹا! آج بڑا منحوس دن ہے۔ آج کے دن گھر سے باہر نکلنا مناسب نہیں۔ تم تین چار دن بعد چلے جاؤ۔''

''نہیں ماں۔ میں نے آج ہی جانے کا فیصلہ کیا ہے۔ مجھے اجازت دے دو۔''

ماں ملتجی لہجے میں بولی۔ ''بیٹا! یہ آج کیسا فیصلہ کیا ہے؟ جب تجھے نہیں دیکھوں گی تو میرا دل پھٹ جائے گا اور میں مر جاؤں گی۔''

بیٹا ماں کے مکر کو سمجھ رہا تھا پھر بھی اسے ترس آیا اور کہا۔ ''ٹھیک ہے ماں میں تجھے تکلیف دے کر کہیں نہیں جاؤں گا۔ لیکن اس وقت ذرا باہر گھومنے کی اجازت دو۔ میں سورج ڈوبنے سے پہلے لوٹ آؤں گا۔''

ماں تاکید سے بولی۔ ''بیٹا شام سے پہلے ضرور واپس آجاؤ میں تمہارا انتظار کروں گی۔''

بیٹا گھر سے باہر نکلا اور تھوپ چھار میں چنار کے درخت کی شاخوں میں چھپ کر بیٹھ گیا۔ دن آہستہ آہستہ ختم ہوا اور شام کی سیاہی پھیلنے لگی۔ دوسری طرف پھٹولی بے چینی سے بیٹے کی واپسی کی منتظر تھی۔ لیکن وقت گزرنے کے باوجود وہ واپس نہیں آیا تھا۔ پورے محلے میں اسے ڈھونڈا۔ اس کے دوستوں سے پوچھا مگر اس کا کہیں اتا پتا نہیں تھا۔ شکار کرنے کا مخصوص وقت ہوا۔ وہ بال کھولے بین کرتی ہوئی بیٹے کی واپسی کی راہ دیکھتی رہی۔ بڑی دیر بعد ایک ساتھی چڑیل عورت کے پاس آئی اور بولی کہ ''تمام چڑیلیں جمع ہوگئی ہیں اپنے بیٹے کو لے کر جلدی چلی آؤ۔''

وہ روتی ہوئی بولی۔ ''میرا بیٹا باہر گیا ہے۔ آتے ہی اسے لے آؤں گی۔''

چڑیل چلی گئی۔ کچھ دیر بعد ایک دوسری چڑیل آئی اور غصے سے بولی۔ ''اے بدبخت! شہنشاہِ معظم سخت غصے میں ہیں۔ بیٹے کو لے کر فوراً چلی آؤ ورنہ تیرا انجام بڑا بھیانک ہوگا۔''

نوجوان کی ماں خوف سے تھر تھر کانپنے لگی اور چکرا کر گر پڑی۔ دوسرا چڑیل نے اسے پکڑ کر کندھے پہ رکھا اور اپنے بادشاہ کے پاس لے گئی۔ بادشاہ اس وقت باقی چڑیلیں کے ساتھ تھوپ چھار کے اسی چنار کے درخت کے کھوکھلے تنے میں بیٹھا تھا۔ نوجوان بھی اسی درخت کی شاخوں میں چھپا بیٹھا تھا۔

پھٹولی کو جب ہوش آیا تو بادشاہ نے گرج کر کہا۔ ''بدبخت عورت! تمہارا بیٹا کہاں ہے؟ ہمارے ساتھ وعدہ خلافی کی سزا نہیں جانتی ہو؟''

پھٹولی تھر تھر کانپتے ہوئے بولی۔ ''رحم کر شہنشاہِ معظم! میری غلطی کوئی نہیں۔ میرا بیٹا باہر نکلا تھا ابھی تک گھر نہیں آیا ہے اور مجھے علم نہیں کہ وہ کدھر گیا ہے؟''

تب بادشاہ نے کہا۔ ''شکار کا مخصوص وقت گزرتا جا رہا ہے۔ اس وقت تم وعدے کے مطابق بیٹے کو پیش نہیں کر سکی ہو۔ اس کی سزا تو بڑی سخت ہے لیکن تم بوڑھی ہو اس لئے تم پہ رحم کرتے ہوئے ہم یہ سزا تجویز کرتے ہیں کہ اپنے دونوں بیلوں کو اسی وقت یہاں لے آؤ اور بیٹے کی جگہ ہماری دعوت کا انتظام کرو۔''

پھٹولی اسی وقت اپنے گھر آئی۔ مویشی خانے سے دونوں بیلوں کو نکال کر ان کی دم کو آپس میں باندھ دیا۔ پھر انہیں اٹھا کر اپنے گلے میں یوں لٹکایا جیسے دو چوہے ہوں۔ تیزی سے بادشاہ کے حضور آکر انہیں ذبح کیا اور سب کی دعوت کی۔

نوجوان درخت کی شاخوں سے یہ سارا ماجرا دیکھ رہا تھا۔ اسے شدید دکھ کے علاوہ غصہ بھی آرہا تھا۔ یہ بات اس کے لئے انتہائی تکلیف دہ تھی کہ اس کی ماں اس کی دشمن بنی ہوئی تھی۔

تمام چڑیلیں اپنے بادشاہ کے ہمراہ بیلوں کے گوشت سے لطف اٹھا رہی تھیں۔ ایسے میں نوجوان کی محبوبہ چڑیل نے ایک بیل کے گوشت کی ایک پسلی چھپالی اور دوسروں سے آنکھ بچا کر درخت کے اوپر شاخوں میں نوجوان کی طرف بڑھائی۔ نوجوان نے پسلی اپنے پاس رکھ لی۔ جب تمام چڑیلیں کھانے سے فارغ ہوئیں تو بادشاہ نے بیلوں کی ہڈیوں کو اکٹھا کیا۔ جب ہڈیوں کو شمار کیا تو ایک پسلی کم ہوئی۔ انہوں نے گم شدہ پسلی کو بہت ڈھونڈا مگر کہیں نہ ملی۔ پھر انہوں نے چیڑ کے درخت کی لکڑی سے پسلی بنالی۔ اس کے بعد بادشاہ نے تمام ہڈیوں کو بیلوں کی کھالوں میں رکھ دیا اور کہنے لگا۔ ''اے بیلو! تم مردہ نہیں ہو۔ لیکن جب تمہارا مالک کھیتوں میں لے جا کر تمہارے ذریعے زمین کاشت کرنے لگے تب تم گر کر مر جاؤ گے۔''

تمام چڑیلیں چلی گئیں تو نوجوان بھی درخت سے نیچے اترا اور اپنے گھر آیا۔ ماں اسے دیکھ کر غصے سے بولی۔ ''تم کہاں گئے تھے۔ میں سارا وقت تیرے لئے پریشان رہی۔''

نوجوان نادم ہو کر بولا۔ ''مجھے معاف کر دو ماں۔ میں ایک دوست کے گھر چلا گیا۔ اس نے مجھے مجبور کر کے رات اپنے پاس ہی ٹھہرالیا۔''

نوجوان یہ کہہ کر اپنے کمرے میں آیا۔ وہ ماں سے نجات حاصل کرنے کے بارے میں سوچنے لگا۔ گھر کے ساتھ ان کا کھیت تھا۔ زمین ہموار نہیں تھی بلکہ ڈھلوانی تھی۔ اس کھیت میں ایک بڑا پتھر اوپر پہاڑ سے لڑھکتا ہوا آکے رک گیا تھا اور اب کافی حصہ زمین میں دھنسا ہوا تھا۔ ایک روز نوجوان نے کدال اور بیلچہ ساتھ لیا اور پتھر کے آس پاس کی زمین کھودنے لگا۔ پھٹولی نے یہ دیکھا تو کہا۔ ''بیٹا! پتھر بہت بڑا ہے۔ تم اکیلے کھیت سے باہر نہیں نکال سکتے ہو۔ پھر اس کی ضرورت بھی تو نہیں ہے۔''

نوجوان بولا۔ ''میں جانتا ہوں کام بہت سخت ہے۔ لیکن تم بھی تو میری مدد کرو گی۔ پتھر ہٹ گیا تو ہماری زمین بہتر فصل دے گی۔''

نوجوان نے کچھ زمین کھود کر درخت کی موٹی شاخ بطورِ لیور بڑے پتھر کے نیچے رکھ کر زور لگایا تو پتھر کا ایک حصہ اوپر اٹھنے لگا اور اس کے نیچے ایک خلا سا بن گیا۔ نوجوان نے ماں کو آواز دی۔ ''ماں! ادھر آؤ۔ تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔ یہ

چھوٹا پتھر اس خلا کے ذریعے بڑے پتھر کے نیچے رکھ دو۔ میں لیور پر مزید وزن ڈال کر اور بھی اوپر اٹھانے کی کوشش کرتا ہوں۔''

اس کی ماں قریب آئی اور ڈرتے ڈرتے ایک پتھر اٹھاتی ہوئی بولی۔ ''بیٹا احتیاط سے لیور پکڑنا۔ اگر ہاتھ سے چھوٹ گیا تو میں اس کے نیچے کچل جاؤں گی۔''

نوجوان بولا۔ ''ڈرو مت ماں! میں نے لیور بڑی مضبوطی سے پکڑ رکھا ہے۔''

پھٹولی بڑے پتھر کے خلا کے نیچے پتھر رکھنے کے لئے جھک گئی۔ اسی وقت نوجوان نے لیور چھوڑ دیا اور پتھر تیزی سے لڑھک کر ماں کے اوپر آ گیا۔ پھٹولی بھیانک آواز میں چلائی۔ ''اوہ بیٹا! تم نے یہ کیا کیا؟ مجھے کچل دیا۔ خدا کے لئے جلدی سے پتھر ہٹاؤ ورنہ میں مر جاؤں گی۔''

نوجوان بولا۔ ''تیرا مر جانا ہی بہتر ہے ماں۔ ورنہ اگلے چاند کی آخری تاریخ کو تم میرے گوشت سے اپنی ساتھی چڑیلوں کی دعوت کرو گی۔''

پھٹولی درد سے چلا چلا کر بولی۔ ''ہائے میں مر گئی۔ مجھے پتھر کے نیچے سے نکال دو۔''

بیٹا بولا۔ ''میری بد بخت ماں تم تو بڑی طاقت ور ہو۔ دو بیلوں کو ہار کی طرح گلے میں لٹکا کر تھوپ چھار لے آئی تھی۔ اب یہ پتھر کیوں نہیں ہٹا سکتی ہو؟''

وہ چیختے ہوئے بولی۔ ''وہ رات کا وقت تھا اور ہم چڑیلوں کی مخصوص جون میں تھی۔ اسلئے ہماری طاقت کئی گنا بڑھ گئی تھی۔ اب میں عام عورت کی طرح ہوں مجھے بچاؤ۔''

نوجوان نے ماں کے چیخنے چلانے پر بالکل کان نہیں دھرا۔ اس کی ماں اس طرح چیختی چلاتی ہوئی ذرا دیر بعد مر گئی۔ نوجوان خوشی سے ناچتا ہوا اپنے گھر آیا۔ اسی وقت اس کی محبوبہ چڑیل بھی آ گئی۔ دونوں خوشی و مسرت سے دن گزارنے لگے۔

ایک دن نوجوان بیلوں کو جوت کر کھیت میں لے گیا اور جوں ہی ہل زمین پہ لگا دونوں بیلوں نے زور سے آواز نکالی اور ان کا پیٹ پھٹ کر دل باہر نکل آیا اور دونوں بیل اسی جگہ گر کر مر گئے۔

نوجوان کو یاد آیا کہ چڑیلوں کے بادشاہ نے یہی کہا تھا کہ مالک جوں ہی ہل جوتے گا، بیل مر جائیں گے۔ اس خیال کے دماغ میں آتے ہی نوجوان افسوس کرتا ہوا گھر واپس آیا اور اس کے بعد اپنی محبوبہ سے شادی کر کے ہنسی خوشی رہنے لگا۔

سپیا تھے نہ تھے:

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ بلچھار وادیٔ بگروٹ میں دولت خان نامی ایک آدمی رہتا تھا۔ وہ اردو، پنجابی اور پشتو زبانیں جانتا تھا۔ سوائے دولت خان کے اور کوئی آدمی یہ زبانیں نہیں جانتا تھا۔ جب کوئی خط یا کوئی مہمان آتا تو لوگ ترجمانی کیلئے دولت خان کو بلاتے۔ یوں دولت خان کی زبان دانی کا چرچا زبان زدِ عام تھا۔ ان دنوں بگروٹ کے موضع جات بلچھار اور تی سوٹ والوں میں ایک چراگاہ پر تنازعہ ہوا اور اسی تنازعہ کی وجہ سے دونوں موضع جات کے لوگوں میں دشمنی روز بروز بڑھتی گئی اور مقدمہ بازی کا سلسلہ جاری ہوا۔ ان دنوں پولیس اور محکمہ مال کا عملہ جب بھی بگروٹ آتا۔ حسبِ معمول دولت خان سے تبادلہ خیالات کرتا۔ دولت خان چونکہ بلچھار کا تھا۔ اسلئے موضع تئی سوٹ والے یہ شک کرتے کہ دولت خان متنازعہ چراگاہ کے بارے میں ان کے خلاف سرکاری اہل کاروں کو اکسا رہا ہے۔ اسی طرح تئی سوٹ کی رائے عامہ روز بروز ان کی مخالف ہوتی گئی۔ تئی سوٹ والے انہیں اپنا سب سے بڑا دشمن سمجھنے لگے۔ ان کا خیال تھا کہ دولت خان کی جانب دار ترجمانی کی وجہ سے ہی ان کا مقدمہ خراب ہو رہا ہے۔ تقریباً 20-25 سال کے بعد مقدمہ بازی ختم ہو گئی اور آہستہ آہستہ فریقین کے جذبات ٹھنڈے پڑ گئے۔

ایک دن تئی سوٹ کے کچھ لوگ کسی کام سے کہیں جا رہے تھے۔ انہوں نے راستے میں دولت خان کو اکیلے کھیتوں میں کام کرتے دیکھا۔ انہیں دیکھتے ہی وہ مشتعل ہو گئے اور اپنے جذبات پر قابو نہ پا سکے۔ یکا یک دولت خان پر چڑھائی کر دی۔ لوگ ہاتھوں سے انہیں مار رہے تھے اور زبان سے کہہ رہے تھے۔ ''سُپیا تھے نہ تھے'' یعنی سپاہیوں کی زبان بولو گے یا نہیں۔ لوگوں نے دولت خان کو اس وقت چھوڑا جب وہ مر چکا تھا۔ یہ تھی دولت خان کی زبان دانی کی سزا۔ اس دن سے یہ مثل ''سُپیا تھے نہ تھے'' ایک ضرب المثل کی طرح مشہور ہے۔

قصّہ یرمس و ملنگ جان:

ملنگ اور یرمس ایک دوسرے کو بہت چاہتے تھے۔ خلیفہ ملنگ جان 1879ء میں شیر قلعہ پونیال میں پیدا ہوئے۔ آپ کا نام نامی رحمت عرف ملنگ جان تھا۔ سیر و تفریح کا شروع ہی سے شوق رکھتے تھے۔ دریا کے کنارے کنارے ٹہلنا اور مچھلیوں کا شکار کرنا ان کے محبوب مشغلے تھے۔ آپ ہمیشہ اپنے سر پر ترکی ٹوپی پہنتے اور ایک خوبصورت پھول بھی ٹوپی پر لگاتے۔ شاعری کے علاوہ آپ موسیقی کے بھی دلدادہ تھے۔ بچپن ہی سے شعر و شاعری سے لگاؤ تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ آپ کا تعلق چشتیہ مذہب سے ہے لیکن اصل میں وہ چشتی نہیں۔ آپ مذہب اسلام کو مختلف پھولوں کا ایک گلدستہ تصور کرتے تھے۔ ان کی شیریں کلامی کے چرچے عام تھے۔ ملنگ کی محبوبہ یرمس ایک حسین و جمیل اور صاحبِ کردار عورت تھی۔ ان کا

حسن و جمال دیکھ کر ملنگ فریفتہ ہو گئے۔ آپ نے یرمس کے حسن و جمال کی تعریف میں شنا زبان میں ایسے اشعار کہے جس کی مثال ملنی مشکل ہے۔ جب یرمس کی شادی اسکی مرضی کے خلاف کسی دوسرے شخص سے کر دی گئی تو کہتے ہیں کہ وہ ملنگ کے فراق کے غم میں تادیر زندہ نہ رہ سکی۔ ملنگ جان بھی تادم مرگِ یرمس کی یاد کو اپنے سینے میں لئے مارا مارا پھرتا رہا۔ لیکن ان کی یاد کو خانہ دل سے نہیں نکال سکا۔ ملنگ جان اپنے ماحول سے یکسر بیگانہ اور ستم ہائے روزگار سے بے نیاز تھا۔ وہ اپنی شاعری کے ذریعے یرمس کے حسن کی داد دیتا تھا۔ اس کی شاعری درحقیقت اس کی اپنی ''داستانِ محبت'' کی ترجمان ہے۔ اسلئے اس کے اشعار جذبات و احساسات میں ڈوبے ہوئے ہوتے ہیں۔ زبان کی سلاست و روانی اور موسیقیت سے بھرپور بحروں میں لکھے گئے اشعار نے اس کے کلام کے حسن کو چار چاند لگایا ہے۔

گلگت اور آس پاس کے علاقوں میں رحمت ملنگ اور یرمس کا عشق کئی رنگ آمیزیوں کے ساتھ مشہور ہے۔ ان دونوں کے معاملات قلبی میں جذب و کیف اور صدق و صفا کا عنصر اس حد تک تھا کہ ان سے منسوب کئی ناقابلِ یقین واقعات زبان زدِ خاص و عام ہیں۔ خاص طور پر ملنگ کا عشق کیفیتِ جنوں تک پہنچ گیا تھا۔ اس کی ہر سوچ اور ہر حرکت یرمس کے عشق کی خوشبو میں معطر ہوئی تھی۔ وہ محض ایک عاشق ہی نہ تھا ایک شیریں کلام اور بلند خیال شاعر بھی تھا۔ اپنے احساسات اور جذبات کے اظہار کے لئے جب شعر کی زبان استعمال کرتا تب تو راستے کے پتھر بھی عشقِ یرمس میں وجد کی کیفیت میں آتے۔ دریا کی طوفانی لہریں یرمس ملنگ کے بے مثال عشق کے گیت گاتیں۔ پہاڑوں سے ٹکراتی ہوائیں ان دونوں کے عشق کے قصے دور دور تک پہنچانے کے درپے ہوتیں۔ اب جبکہ وادیٔ عشق کے ان حکمرانوں کو مرے ہوئے ایک طویل عرصہ ہوا ہے لیکن ان کا عشق اور عشق کے واردات سے منسوب رومانوی قصے اب بھی اہلِ دل کے لئے سوز و گداز اور بے تابی کے سامان بہم پہنچاتے ہیں۔ کچھ ایسے ہی واقعات ذیل میں رقم کئے جاتے ہیں۔

☆ رحمت ملنگ کو مچھلی کے شکار کا بہت شوق تھا۔ ایک روز وہ دریا میں کانٹا ڈالے بیٹھا یرمس کے خیالوں میں ڈوبا ہوا تھا۔ سورج عین سر کے اوپر آیا لیکن اسے دھوپ کی شدت کا بالکل احساس نہیں ہو رہا تھا۔ محبوب کی یاد اس کے لئے کسی سایہ دار درخت سے کم نہیں تھی۔ صبح سے دوپہر ہوئی تھی ابھی تک کوئی مچھلی کانٹے میں نہیں پھنسی تھی۔ اسی وقت ایک شخص ادھر آنکلا۔ اس کے تھیلے کو خالی دیکھ کر مذاق اڑاتے ہوئے کہا ''واہ ملنگ! بڑے اچھے شکاری ہو، صبح سے ایک مچھلی نہیں پکڑی ہے۔ لوگ تو کہتے ہیں تمہارے عشق میں اتنی طاقت ہے کہ یرمس کا نام لے کر تم جو بھی کام کرتے ہو وہ پورا ہو جاتا ہے۔ آج میں بھی دیکھوں تیرا عشق واقعی کتنا سچا ہے؟''

رحمت ملنگ نے ایک نظر اس شخص پہ ڈالی پھر دریا کی مچلتی، تڑپتی لہروں کی طرف دیکھتے ہوئے چند شعر کہے جن کا مطلب یہ تھا کہ یہ لوگ اتنے بے وقوف کیوں بنتے ہیں؟ ہم عاشقوں کا امتحان لینا چاہتے ہیں۔ یہ اتنے بدگمان ہیں کہ ہماری کیفیت جنوں پہ شک کرتے ہیں۔ یہ عشق کے اس مقام سے واقف نہیں جہاں سے گزر کر ذرہ ذرہ حسنِ یار کی جھلک دکھاتا ہے۔ انہیں کون سمجھائے کہ حق شناسوں کا خدا عشق ہے، انہیں کون بتائے کہ عشق بن کوئی بھی مقصد کو نہیں پہنچ سکتا۔ انہیں سمجھ لینا چاہئے کہ آسمان سے زمین تک ہر چیز قوتِ عشق ہی کی بدولت قائم ہے۔

رحمت نے یہ اشعار کہے اور کانٹا دریا سے باہر نکالا۔ کہتے ہیں کانٹے میں اتنی بڑی مچھلی پھنسی ہوئی تھی کہ وہ آدمی چکرا کر گر پڑا۔ بڑی دیر بعد ہوش میں آیا۔ رحمت ملنگ سے معافی مانگی اور مرتے دم تک لوگوں کو اس واقعے کا تذکرہ کرتا رہا۔

☆ ایک دفعہ رحمت ملنگ یرمس کے گاؤں کی طرف نکلا۔ چلتے چلتے ایک جگہ وہ زمین پہ بیٹھ گیا اور گہری گہری سانسیں لینے لگا۔ لوگوں نے اس کی یہ حرکت دیکھی تو طنزیہ انداز میں پوچھا ''کیا بات ہے رحمت ملنگ! زمین کیوں سونگھ رہے ہو؟ کیا یرمس کی خوشبو آرہی ہے؟''

رحمت نے ایک گہری سانس لی اور کہا ''اے لوگو! جب عشق کی آگ میں جل کر دل کندن بن جائے تب انسان کی تمام حسیات طاقتور بن جاتی ہیں۔ تم عشق کر کے دیکھ لو ذرے سے آفتاب بن جاؤ گے۔ ابھی کچھ دیر قبل یرمس یہاں سے گزر کر گئی ہے میں اس کے بدن کی خوشبو محسوس کر رہا ہوں۔'' کہتے ہیں کہ لوگوں نے بعد میں معلوم کیا تو پتہ لگا کہ واقعی کچھ دیر پہلے یرمس اس جگہ سے گزری تھی۔

☆ ایک دفعہ رحمت شیر قلعہ کے پل سے گزر رہا تھا۔ اس زمانے میں پل اتنا تنگ تھا کہ صرف ایک ہی شخص گزر سکتا تھا۔ جب وہ پل کے درمیان میں آیا تو دوسری طرف سے یرمس آتی ہوئی دکھائی دی۔ یرمس اپنے شوہر کے ساتھ آرہی تھی۔ دونوں آگے پیچھے چل رہے تھے۔ یکا یک رحمت کے بڑھتے ہوئے قدم رک گئے۔ محبوب کو سامنے پا کر اس پہ جذب و کیف کی کیفیت طاری ہوئی۔ اس کے قدم پیچھے مڑنے کے لئے بھی تیار نہیں تھے کیونکہ اس کے دل کو یہ بات گوارا نہیں کہ محبوب کی طرف اس کی پیٹھ ہو۔ اس کے سامنے ایک ہی صورت تھی، اس نے یرمس کی طرف دیکھا جو اپنے شوہر کے پیچھے پیچھے آرہی تھی۔ اچانک ملنگ نے ایسا فیصلہ کیا جس کے سبب مرتبۂ عشق بہت بلند ہوا۔ اس نے محبوب کو پشت دکھانے کے بجائے دریا میں چھلانگ لگانے کو ترجیح دی اور پل سے نیچے کود پڑا اور تیرتا ہوا دوسری طرف چلا گیا۔

☆ ایک دفعہ رحمت ملنگ کو راجہ پونیال نے طلب کیا اور اس کے عشق کا

مذاق اڑاتے ہوئے کہا ''اے ملنگ جان! تیرے عشق کے قصے بہت پھیلے ہوئے ہیں۔ پونیال کا ہر فرد تمہارے اور یرمس کے عشق کی بات کرتا ہے۔ میں بھی دیکھنا چاہتا ہوں کہ تم اپنے عشق میں کتنے سچے ہو۔''

رحمت ملنگ نے راجا کی بات کے جواب میں چند اشعار کہے جن کا ترجمہ اس طرح ہے کہ ''جو شخص شرابِ عشق پی لے تو دنیا کی ہر چیز اس کے لئے مسخر ہوتی ہے۔ میں کیا ہوں؟ خاک کا پتلا؛ یرمس کے عشق نے مجھے معرفت نفس کی دولت بخشی۔ اب میں جو لفظ بھی منہ سے نکالتا ہوں صرف قول نہیں بلکہ انمول موتی ہوتے ہیں۔ مجھ سے جو بھی عمل سرزد ہوتا ہے میرا عشق اس کا رہنما ہوتا ہے اور جس کسی کا رہنما جب تک عشق نہیں ہوتا وہ منزل سے آشنا نہیں ہوتا۔''

راجہ نے یہ اشعار سنے تو تعریف کی لیکن کہا کہ تیرے عشق کا اعتبار تبھی آئے گا جب عملی مظاہرہ کرو گے۔

راجہ نے رحمت ملنگ کو بتائے بغیر حکم دیا کہ گاؤں کی عورتیں ایک ایک روٹی پکا کے راجہ کے محل میں لے آئیں۔ شام کے وقت تمام عورتوں نے روٹیاں پکا کے راجہ کے حضور پیش کیں۔ راجہ نے ملنگ جان کو پھر بلایا اور کہا ''اے ملنگ جان! تمہارے عشق کی صداقت کا امتحان ہے۔ ان بہت سی روٹیوں میں ایک روٹی یرمس کے ہاتھ کی بنائی ہوئی ہے۔ اگر تم عشق میں سچے ہو تو یرمس کی بنائی ہوئی روٹی کی نشاندہی کرو۔''

رحمت ملنگ نے یہ سن کر آنکھیں بند کرلیں اور روٹیاں سونگھنے لگا اور ذرا ہی دیر میں ایک روٹی نکال کے راجہ کو دیتے ہوئے کہا کہ یہ یرمس کی بنای ہوئی روٹی ہے۔ جب یرمس نے روٹی بنا کے راجہ کو دی تھی اس وقت باقی روٹیوں سے ملانے سے قبل راجہ نے یرمس کی روٹی پہ نشان لگایا تھا اور جب ملنگ نے وہی روٹی نکال کے راجہ کے حوالے کی تو راجہ دنگ رہ گیا اور ملنگ جان کے عشق کی سچائی پہ ایمان لے آیا۔

محبت کی لوک کہانی:

ھنوحل (حراموش) میں عشق ومحبت کی ایک لازوال داستان مشہور ہے جو لوگوں میں سینہ بسینہ چلی آرہی ہے۔ روایت کے مطابق ''پون پونکہ بگم'' نامی ایک عورت اور ''مُحن'' نامی شخص میں محبت ہوگئی اور وہ ایک دوسرے کو ٹوٹ کر چاہنے لگے۔ مُحن نے محبوبہ سے منگنی کیلئے پیغام بھیجا تو ''پون پونکہ بگم کے بھائیوں نے ان کی محبت کو نظر انداز کرتے ہوئے رشتے سے انکار کردیا۔ عیدالفطر کے دن مُحن بھیڑ بکریوں کے ساتھ چراگاہ کی جانب نکلا۔ چند چھوٹے چھوٹے چرواہے لڑکے بھی اس کے ساتھ آئے۔ شتر نالے کا نام ''پونی بجل'' یعنی پون پونکہ بگم کا نالہ بھی اسی نسبت سے رکھا گیا ہے۔ اس نالے میں پہنچ کر مُحن نے لڑکوں سے کہا کہ عید کا دن ہے تم قریبی دیہات جا کر خود بھی کچھ کھاؤ اور میرے لئے بھی کچھ ذریعے مُحن کے نالے میں آمد کی خبر سن کر کھانے پینے کا کچھ سامان لیکر اس کی محبوبہ دوڑ پڑی۔ جب نالے میں پہنچی تو دیکھا کہ اس کا محبوب مُحن برلب نالہ ایک بڑے پتھر پر سویا ہوا ہے۔ محبوبہ کے دل میں شرارت سوجھی۔ محبوبہ نے مُحن کو نیند سے جگانے کے لئے روایتی طریقے سے ہٹ کر پانی کے کچھ چھینٹے اس کے چہرے پر گرادئے۔ جسکی وجہ سے وہ چونک گیا اور اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا۔ مُحن سیدھا نالے میں گر گیا۔ ادھر نالے کا پانی مُحن کو بہالے جارہا ہے، اُدھر اسکی محبوبہ نالے کے کنارے دوڑتی ہوئی آہ وزاری کررہی ہے۔ اتنے میں دیہات سے کھانے پینے کی چیزیں اور کچھ پھل لے کر لڑکے بھی پہنچ گئے۔ اور وہ بھی ''پون پونکہ بگم'' کے ساتھ ہوگئے۔ مُحن کی لاش نالہ اوربلتستان سے آنے والے دریا یعنی دریائے سندھ کے سنگھم تک پہنچ گئی۔ اس موقع پر مُحن کی محبوبہ نے یہ دردناک گیت گائے:-

شل گہ جھرو جو الی ووتے نے پلوی گہ سن
می انو مُحن نے ، ووتس چھوت تھے گہ ھر
اَجی پھچیلو گیئی کُھر یر وا پچا مَی رَا گہ مریجوت
مھہ گہ کِنی شُوں مُنس نا، ووجے شُواں نتک دیگس
اَلہ مَی رُنگ اَی گہ پیانلے ھُنے مَی آجہ گہ بایے کج را
سسیّ دھی بگمی گہ سِنی انووی دے گہ گی تھا

ترجمہ:

سینکڑوں نالوں پر مشتمل اے بلتستان سے آنے والا دریا یعنی دریائے سندھ! میرے محبوب مُحن کو آہستہ بہالے جا یعنی اسے کوئی تکلیف نہ پہنچا۔

عمودی اور سلیپری نالے میں گر کر میرا چچازاد بھائی ہلاک ہو۔ میں کالی کتیا مرگئی ہوں۔ میں نے کتے کی طرح جلد بازی سے کام کیا۔ مطلب یہ ہے کہ میرا چچازاد بھائی اگر مجھے نہ بتاتا کہ میرا محبوب نالے میں ہے تو میں نہ آتی اور یہ المناک واقعہ بھی پیش نہیں آتا۔ اسلئے اس نے اپنے چچازاد بھائی کو برا بھلا کہا اور بددعا دی۔ اور اپنے عمل کو کتے کے عمل کی طرح قرار دیا۔

اے میرے جنگل کے چرواہو! جب میرے والدین کے پاس جاؤ تو انہیں کہنا کہ تمہاری بیٹی بگم اپنے محبوب کی جدائی برداشت نہ کرتے ہوئے دریا میں کودگئی۔

جب پون پونکہ بگم نے پہلا شعر کہا تو مُحن کی لاش دریا کی سطح پر بلا حرکت اسطرح نمودار ہوئی کہ جیسے کسی نے لاش کو اِدھر اُدھر جانے سے روکا ہے۔ یہ

منظر دیکھ کر محن کی محبوبہ نے مذکورہ دوسرا شعر پڑھا۔ اسکے بعد لڑکوں کو مخاطب کرتے ہوئے تیسرا شعر پڑھ کر دریا میں کود گئی۔ محبوبہ ایک شناور کی طرح تیرتی ہوئی جب مُحن کی لاش کے قریب پہنچ گئی تو روایت کے مطابق مُحن کے ہاتھ خود بخود کُھل گئے اور دونوں بغل گیر ہوتے ہوئے دیکھے گئے۔ اسی طرح دونوں کی لاشیں ایک جان دو قالب کے مصداق دریا برد ہوئیں۔ بعد میں سکارکُئی گلگت کے عبدالصبور کی روایت کے مطابق ایک دفعہ وہ ھڈور (چلاس) کسی کام سے گیا تو وہاں پر کچھ مقامی بزرگ لوگوں سے ملاقات ہوئی جو ایک درخت کی چھاؤں میں بیٹھے ہوئے تھے جس پر انگور کی بیل بھی سانپ کی طرح لپٹی ہوئی تھی۔ باتوں باتوں میں ان لوگوں نے اس درخت اور انگور کا پس منظر بیان کرتے ہوئے کہا کہ کسی زمانے میں ایک مرد اور عورت کی لاشیں ھڈور کے دریا سے اس طرح ملیں جیسے دونوں ایک دوسرے میں پیوست ہوئی ہوں۔ ہر ممکن کوشش کے بعد لاشوں کو ایک دوسرے سے جدا کرنے میں ناکامی ہوئی۔ پھر آپس میں مشورے سے یہ طے پایا کہ دونوں لاشوں کو کھولتے ہوئے پانی میں ڈال کر پہلے گھلنے دیا جائے اور اسکے بعد آسانی سے جدا کیا جائے۔ جب یہ تجربہ بھی کامیابی سے ہمکنار نہیں ہوا تو رہنمائی کے لئے علماء سے رجوع کیا گیا۔ تمام صورت حال کا جائزہ لیکر علماء نے دونوں لاشوں کو ایک ساتھ دفن کرنے کا حکم دیا۔ علماء کے فیصلے پر عمل کرتے ہوئے دونوں کی لاشیں ایک ہی قبر میں دفن کردی گئیں۔ اسی قبر سے انجیر کا یہ درخت جس پر انگور کی بیل بھی لپٹی ہوئی تھی اُگ آیا۔ جسے عبدالصبور سکنہ سکارکُئی گلگت نے از خود مشاہدہ کیا ہے۔ سکارکُئی گلگت کے اس شخص نے یہ کہانی عبداللہ ملنگ کو سنائی جبکہ عبداللہ ملنگ سے کتاب ھذا کے مؤلف نے انٹرویو کے ذریعے نقل کی۔

سنکر (بگروٹ) اور چنار کا درخت:

سنکر، بگروٹ وادی کی ایک چھوٹی سی دیہات کا نام ہے۔ کہتے ہیں کہ کسی وقت اس ویران جگہ سے بزرگ شاہ بریا کا گزر ہوا تو کچھ دیر آپ وہاں ٹھہرے۔ اس دوران آپ کو سخت پیاس لگی تو آپ نے اللہ تعالیٰ سے پانی کے لئے دعا کی۔ آپ کی دعا بارگاہِ ایزدی میں مقبول ہوئی اور ساتھ والی پہاڑی سے پانی کا چشمہ پھوٹ پڑا۔ چند دنوں کے بعد شاہ بریا کو شدید گرمی محسوس ہوئی تو آپ نے اپنی عصا کو جو کہ چنار کی بنی ہوئی تھی زمین میں گاڑ دیا اور خدا سے پھر دعا کی کہ وہ اس چھڑی کو سایہ دار درخت بنادے۔ یہ دعا بھی بارگاہِ رب العزت میں مقبول ہوئی اور ایک تناور درخت عالمِ وجود میں آیا۔ جس کے سائے تلے آپ جلوہ افروز ہونے لگے۔ کہتے ہیں کہ چنار کے اس درخت کی شاخیں اتنی لمبی پھیلی ہوئی تھیں کہ بگروٹ نالہ کے پار والی پہاڑی جو 600 گز دور تھی، تک چھورہی تھیں۔ اس درخت کو بعد میں منگول حملہ آوروں نے جلا ڈالا لیکن کچھ ہی عرصہ بعد اس کے جلے ہوئے تنے سے پانچ شاخیں پھوٹ پڑیں۔ یہ شاخیں تیس گز کے احاطے پر پھیلی ہوئی تھیں۔ یہ درخت اب بھی دیکھے جاسکتے ہیں۔

وزیر رشو کی ''یدینی'':

وادی بگروٹ کے ایک گاؤں کا نام بُلچی ہے۔ یہاں موجود ڈوم قبیلے کے لوگوں کے پاس ایک ڈھول ہے جسے عرفِ عام میں مقامی لوگ ''رشوی یدینی'' یعنی وزیر رشو کا ڈھول کہتے ہیں۔ رونو قبیلے کا وزیر رشو اس ڈھول کو کسی زمانے میں نہایت خوبصورت کور میں لپیٹ کر رکھتا تھا۔ کہتے ہیں کہ جب کبھی وزیر رشو کسی کے خلاف فوج کشی کرنا چاہتا تو ''یدینی'' (ڈھول) کو اپنے سامنے لاکر رکھتا۔ اگر ڈھول بغیر کسی کے ہاتھ لگائے بجنے لگے تو رشو سمجھتا کہ اس فوج کشی میں کامیابی یقینی ہے اگر ڈھول خاموش رہے تو رشو فوج کشی کی مہم جوئی سے باز آتا۔ کیونکہ اس سے اسے یقین ہوجاتا تھا کہ ناکامی مقدر بن چکی ہے۔

شری بای دیوی کا قصہ:

شری بائی ایک دیوی کا نام ہے جس کے بارے میں لوگ کہتے ہیں کہ یہ استور میں نوگام نامی دیہات میں موجود ایک چٹان پر رہتی ہے۔ لوگ اس چٹان کو بھی شری بائی ہی کہتے ہیں۔ پرانے وقتوں میں اس چٹان کو ہمیشہ جونیپر کی شاخوں سے ڈھانپ کر رکھتے تھے جبکہ بوبن نامی ایک محافظ اس کی دیکھ بال پر معمور تھا۔ بانجھ عورتیں یہاں آکر بھیڑ بکری وغیرہ کا نذرانہ دیوی کو پیش کرتیں اور مقدس چٹان سے دعا کرتیں کہ وہ ان کی گود ہری کردے۔ موسم گرما میں جب لوگ اپنی فصل کی کٹائی وغیرہ مکمل کرتے تو دیہات کی عورتیں بہترین لباس زیبِ تن کرکے دیوی کے حضور جاتیں۔ عورتوں کا قافلہ راستہ میں گانا گاتے ہوئے خراماں خراماں منزل مقصود پر پہنچ کر بوبن کو بکری کا نذرانہ پیش کرتا تو بوبن جونیپر کی چھوٹی چھوٹی شاخیں ہوا میں اچھالتا اور عورتیں ان شاخوں کو زمین پر گرنے سے پہلے پکڑ لیتیں۔ جو عورت جتنی شاخیں پکڑ لیتی تو یہ سمجھا جاتا کہ اسکی اتنی تعداد میں اولاد ہوگی۔ بوبن نام سے ایک گاؤں نوگام کے قریب آج بھی واقع ہے۔ اصل بوبن کی اولاد تو یہاں اب بھی موجود ہے البتہ شری بائی کی رسم قصہ پارینہ بن چکی ہے۔ روایت کے مطابق اس طرح کا ایک پتھر گلگت میں برمس کے قریب بھی پایا جاتا تھا اور یہاں پر بھی وہی رسم اسی طریقے سے ادا کی جاتی تھی۔ البتہ یہاں پر یہ رسم ''Mulkum'' کے نام سے موسوم تھی۔

''تئی بن دادو'' کی کہانی:

گوہر آباد (گور) چلاس میں ''تئی بن دادو'' (تئی بن دادا) کے نام سے ایک لوک کہانی مشہور ہے۔ روایت یوں ہے کہ گور میں کچھ زمین ''تئی بن دادئی زمین'' کے نام سے کچھ عرصہ قبل تک موجود تھی۔ اس زمین پر ''بنی'' کے کچھ درخت بھی تھے۔ لوگ نہ اس زمین کو آباد کرتے تھے نہ ''بنی'' کے درخت کاٹتے تھے۔ کیونکہ ان کا عقیدہ تھا کہ زمین آباد کرنے اور درخت کاٹنے سے ''تئی بن دادو'' ناراض ہوتا ہے اور ایسا کرنے والوں کو نقصان پہنچاتا ہے۔ لہٰذا خلاف ورزی کی کسی کو جرات نہیں تھی۔ گور کے لوگ سالانہ بہار کی آمد کے ابتدائی دنوں میں ''تئی بن دادو'' کے نام پر ایک بکرا جس کا رنگ سر سے پاؤں تک سفید ہوتا تھا، مذکورہ زمین پر ذبح کرتے تھے اور تمام لوگ مل کر اسی جگہ پر بکرے کا گوشت پکا کر کھاتے تھے اور اس کی ہڈیاں اور بچا کھچا گوشت پوست وغیرہ ایک جگہ پر جمع کرتے تھے اور اس پر لکڑیاں ''نرکوہ'' اور ''چلی'' نامی درختوں کی شاخیں ڈال کر آگ لگاتے تھے۔ آگ کے شعلے اور مذکورہ شاخوں کا دھواں بلند ہوتے ہی ایک سفید ریش بزرگ نما شخص انسانی شکل میں نمودار ہو کر آگ کے اردگرد چکر لگاتے ہوئے ''چلی'' اور ''نرکوہ'' کی شاخوں کو ادھر ادھر پھینکتا۔ شاخوں کو پھینکنے کا عمل مکمل ہوتے ہی باریش شخص آنکھوں سے اوجھل ہوتا۔ لوگوں کے عقیدے کے مطابق اس طرح کی قربانی اور عمل سے فصلیں اچھی ہوتی تھیں اور علاقہ خوشحال رہتا تھا۔ اگر اس طرح کا نذر و نیاز نہیں کرتے تو علاقہ قحط سالی سے دوچار ہو جاتا۔ مذکورہ باریش بوڑھے کو آگ کے گرد چکر کاٹتے ہوئے مولانا لقمان حکیم کے والد مسمی محمد میر مرحوم نے زمانہ طفلی میں از خود مشاہدہ کیا ہے۔ ''تئی بن دادو'' کے نام سے ایک دیوہیکل پتھر گلگت خاص سے چند کلومیٹر دور گلمی کای (کارگہ) نالے میں آج بھی موجود ہے لیکن اہلِ گور کے ''تئی بن دادو'' سے اس پتھر کے تعلق کے بارے میں کوئی کتابی حوالہ مجھے نہیں ملا۔ مولانا لقمان حکیم نے مجھے بتایا کہ مذکورہ پتھر پلتنی محلّہ گلگت کے حاجی محمد اسلم مرحوم نے 1970ء کی دہائی میں انہیں کارگہ کے دورہ کے دوران دکھایا تھا۔ ''تئی بن دادو'' کی زمین پر اب کاشت بھی ہوتی ہے اور بنی کے درخت بھی کاٹے جاتے ہیں۔

عشق حقیقی کی لوک داستان:

ضلع غذر کے گاؤں گلاپور کے ایک نوجوان اور دوشیزہ کی عشق حقیقی کی کہانی بہت مشہور ہے۔ نوجوان کا نام ایک روایت کے مطابق ''راحم'' تھا جبکہ خوبرو دوشیزہ کا نام رجلہ بتایا جاتا ہے۔ وہ اپنے گاؤں کی حسین ترین لڑکی تھی۔ شنا میں رجلہ ایک بیلدار پھول کو کہتے ہیں جو بہت خوشبو دار ہوتی ہے۔ نوجوان اور رجلہ ایک دوسرے کو ٹوٹ کر چاہتے تھے۔ نوجوان گرمیوں میں مال مویشی کے ساتھ گلاپور نالے میں رہتا تھا۔ جب کبھی محبوب کی یاد ستاتی وہ اس سے ملنے گاؤں آتا تھا۔ ملاقاتوں کا یہ سلسلہ ایک عرصے تک جاری رہا۔ ایک دفعہ ایسا ہوا کہ نوجوان کسی وجہ سے معشوق سے ملنے گاؤں نہ آسکا۔ جسکی وجہ سے رجلہ بڑی پریشان ہوئی۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کا اضطراب بھی بڑھنے لگا اور اس کے دل میں طرح طرح کے وسوسے جنم لینے لگے۔ جب اس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہوا تو وہ اپنے محبوب کی تلاش میں نالے کی طرف چل پڑی۔ تلاش بسیار کے بعد اس نے اپنے محبوب کو برلب نالہ ایک دیوہیکل پتھر، جس پر قریب واقع جنگلی درخت کا سایہ پڑتا تھا، سویا ہوا پایا۔ نالہ اس پتھر سے تقریباً تین سو فٹ نیچے تھا۔ محبوب کی ایک جھلک دیکھ کر رجلہ کی تمام تھکن دور ہوگئی اور وہ تازہ دم ہوگئی۔ اس نے محبوب کو روایتی طریقے سے جگانا مناسب نہیں سمجھا۔ وہ سوچتی ہوئی نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔ جونہی اس کے دل میں محبوب کو جگانے کی ترتیب سوجھی تو وہ دھیرے سے ہنس پڑی۔ رجلہ نے قریب کے چشمہ سے مٹھی بھر پانی لیا اور اس کے چند قطرے محبوب کے چہرے پر چھڑک دیے۔ پانی کی چھینٹیں چہرے پر پڑتے ہی نوجوان چونک پڑا اور اس نے کروٹ بدلتے ہوئے اٹھنا چاہا لیکن اٹھتے ہوئے اپنا جسمانی توازن برقرار نہ رکھ سکا۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ دیوہیکل پتھر سے لڑھک کر تین سو فٹ گہرائی میں واقع نالے میں گر گیا۔ رجلہ کی آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا۔ اس کی امیدوں اور ارمانوں کے محل گر پڑے۔ تقریباً ایک گھنٹے تک اس پر سکتہ طاری رہا۔ جونہی اس کے ہوش ٹھکانے آئے تو اس کے چہرے پر آنسوؤں کی برسات جاری تھی۔ محبوب کے بغیر اسے اپنی زندگی بے معنی سی معلوم ہونے لگی۔ اس کے سہانے خواب ٹوٹ پھوٹ کر بکھر گئے تھے۔ اس قدر بلندی سے نالے میں اپنے محبوب کے گرنے کا منظر اس کی نظروں کے سامنے تھا جو اسے بار بار یہ احساس دلا رہا تھا کہ یہ جرم کسی اور نے نہیں بلکہ اس نے خود کیا ہے۔ اس نے محبوب کے بغیر زندہ رہنے سے مرنے کو ترجیح دی اور اپنی زندگی کی پرواہ کئے بغیر اس پتھر سے چھلانگ لگا کر موت کو گلے لگالیا، جس پتھر سے اس کا عاشق نالے میں گرا تھا۔ دوسرے دن اہلِ محلّہ نے گلاپور نالہ اور دریائے غذر کے سنگھم کے قریب عاشق اور معشوق کی لاشوں کو اس حالت میں پایا کہ دونوں آپس میں لپٹے ہوئے تھے حالانکہ محبوب کے نالے میں گرنے اور رجلہ کے چھلانگ لگانے کے درمیان ایک گھنٹے سے بھی زیادہ وقت کا فرق تھا۔ عاشق و معشوق کی لاشوں کا بعد از مرگ اس طرح لپٹنا مقامی لوگوں کے مطابق عشق حقیقی کی عکاسی کرتا ہے۔ مذکورہ دیوہیکل پتھر گلاپور گاؤں سے چند کلومیٹر دور نالے میں ''رجلہ نارگئی گرہ'' (یعنی وہ بڑا پتھر جس سے رجلہ نالے میں گری) کے نام سے آج بھی موجود ہے۔ پتھر کے ساتھ واقع متذکرہ جنگلی درخت (کھکاؤں)، تھکے ہارے راہگیروں کو تھوڑی دیر ستانے کے لئے

آج بھی سایہ فراہم کررہا ہے۔

ٹھگئی چگا (ٹھگ کی کہانی):

شنا میں ٹھگ دھوکہ باز کو کہتے ہیں۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ کسی گھر میں بچہ پیدا ہوا۔ کہا جاتا ہے کہ یہ بچہ مینڈک کی شکل کا تھا جو پیدا ہوتے ہی باتیں کرنے لگا تھا۔ کچھ عرصہ بعد اس کی شکل انسان کی سی ہوگئی۔ اس نے شرارتیں اپنے گھر سے شروع کیں۔ ایک دفعہ اس کا باپ کھیتوں میں ہل چلا رہا تھا کہ ''ٹھگ'' بھاگتا ہوا گیا اور باپ سے کہا کہ ماں مر رہی ہے، نیاز خیرات کرو۔ باپ نے بیل ذبح کر کے اس کا گوشت اسی وقت تقسیم کیا۔ ٹھگ اسی وقت جلدی واپس ماں کے پاس آیا اور کہا باپ مر رہا ہے کوئی خیرات تقسیم کرو۔ ماں نے گھر میں جو کچھ تھا پکا کر تقسیم کر دیا۔

اسی طرح ایک دن ٹھگ پیدل چل رہا تھا کہ راستے میں ایک گھڑسوار ملا۔ اس نے گھڑسوار سے عرض کی کہ میں تھک گیا ہوں، سوار کو رحم آیا اور اس نے اپنا گھوڑا تھوڑی دیر سواری کے لئے ٹھگ کو دیا۔ ٹھگ گھوڑے پر سوار ہوا تو مالک نے نام پوچھا، ٹھگ نے اپنا نام ''ھرھر'' بتایا اور گھوڑے کو دوڑایا۔ گھوڑے کا مالک اسے دیکھ کر حیران ہوگیا اور زور زور سے آوازیں دیں ''الہ ژا! ھرھر'' لوگوں نے کوئی توجہ نہ دی کیونکہ شنا زبان میں ''ھرھر'' کے معنی لے جاؤ کے ہیں۔ ''الہ ژا! ھرھر'' کا یہ مطلب ہوا کہ اے بھائی لے جاؤ۔ اس طرح ٹھگ گھوڑے کے ساتھ ایک ندی پر پہنچا وہاں پر ایک بڑھیا اپنی لڑکی کے ساتھ بیٹھی تھی جو کہ پیدل ندی پار نہیں کر سکتی تھیں۔ بڑھیا نے ٹھگ سے عرض کی کہ ہمیں ندی پار کراؤ۔ ٹھگ نے کہا کہ پہلے لڑکی کو پار کراؤں گا اس کے بعد آپ کو۔ بڑھیا خوش ہوئی اور ٹھگ کا نام پوچھا تو اس نے اپنا نام ''جمو'' بتایا۔ شنا زبان میں ''جمو'' داماد کو کہتے ہیں۔ اس طرح ٹھگ لڑکی لے کر بھاگ گیا۔ بڑھیا حیران ہوئی۔ عدالت میں حاضر ہوئی ادھر گھوڑے کا مالک بھی اسی عدالت میں حاضر ہوا۔ منصف نے گھوڑے کے مالک سے بیان لیا۔ ''تمہارا گھوڑا کون لے گیا ہے؟'' اس نے کہا ''ھرھر'' لے گیا ہے۔ منصف نے کہا تم نے خود کہا کہ لے جاؤ لے جاؤ اس کی کیا غلطی ہے۔ اس کے بعد بڑھیا سے پوچھا کہ ''تمہاری لڑکی کو کون لے گیا؟'' اس نے کہا کہ ''جمو'' لے گیا۔ منصف نے کہا کہ ''جمو'' کا حق ہے وہ جہاں چاہے اپنی بیوی کو لے جا سکتا ہے۔ اس طرح ٹھگ کے مقابلے میں دونوں مقدمہ ہار گئے۔

بعد ازاں ٹھگ نے لڑکی سے شادی کر لی اور گھوڑے سے کام لینا شروع کر دیا۔ یہی شرارتیں اس نے گاؤں میں بھی شروع کر دیں۔ ایک دن گاؤں والوں نے اس کے گھوڑے کو مار ڈالا۔ ٹھگ یہ منظر دیکھ کر حیران ہوا۔ اس کے بعد اس نے گھوڑے کا چمڑا خشک کر کے اپنے ساتھ لیا۔ ایک جگہ پر تین اندھے سوداگر ایک درخت کے سائے تلے بیٹھے تھے اور آپس میں بات چیت کر رہے تھے کہ ہم سے کوئی بدنیتی کرے تو اس پر اللہ کا قہر نازل ہوگا۔ یہی باتیں کر رہے تھے تو ٹھگ نے موقع غنیمت پا کر گھوڑے کا چمڑا ان کے درمیان پھینک دیا۔ اندھے سوداگر ڈر گئے انہیں یقین ہوگیا کہ اللہ تعالیٰ کا قہر نازل ہوا ہے۔ ٹھگ سارا سودا اٹھا کر گاؤں لے آیا۔ لوگ یہ دیکھ کر حیران ہوگئے۔ اس سے پوچھا یہ سارا مال کہاں سے لے آئے ہو۔ ٹھگ نے جواب دیا کہ آج دریا بہت سامال بہا کر لے آیا ہے جو بھی جائے گا وہاں سے سامان لے کر آئے گا۔ لوگوں نے ٹھگ کی بڑی منت سماجت کی کہ ہمیں بھی دکھاؤ۔ ٹھگ بہت سے جوان اور کافی مال مویشی بھی اپنے ساتھ لے گیا۔ جوانوں اور مویشیوں کے ساتھ دریا کے پل سے گزرتے ہوئے اس نے لوگوں سے کہا کہ ذرا نیچے تو دیکھو کیسی کیسی بھینسیں اور گھوڑے دریا میں بہہ رہے ہیں۔ جلدی جاؤ ورنہ کوئی اور لے جائے گا۔ ٹھگ پر اعتبار کرتے ہوئے بہت ساروں نے دریا میں چھلانگ لگا دی۔ کچھ اوپر انتظار کر رہے تھے۔ نیچے والے اپنے آپ کو بچانے کے لئے ہاتھ پاؤں ہلا رہے تھے تو ٹھگ نے کہا کہ وہ آپ کو بلا رہے ہیں۔ اس پر سب نے دریا میں چھلانگ لگا دی۔ اس طرح سارے دریا میں ڈوب گئے۔

شام کو واپس گھر آیا تو معلوم ہوا کہ اس نے دھوکہ دے کر سب کو دریا برد کیا ہے۔ گاؤں والے مشتعل ہوئے اور ٹھگ کا گھر جلایا گیا۔ اس موقع پر ٹھگ کی بیوی نے کہا کہ لوگوں کے ساتھ شرارتیں مت کرو۔ آج گھر جلایا گیا ہے کل ہمیں بھی مار ڈالیں گے۔ ٹھگ نے کہا خیر کوئی بات نہیں۔ اس نے ایک بوری لی اس کی تہہ میں چند اشرفیاں رکھیں اوپر سے مکان کا جلا ہوا کوئلہ ڈالا اور گدھے پر لاد کر شہر کی طرف چل پڑا۔ راستے میں اسے ایک بوڑھا امیر آدمی مل گیا۔ وہ اپنے لڑکے کے ساتھ پیدل سیر کو نکلا تھا۔ چلتے ہوئے وہ ایک دوسرے کے ساتھ بات چیت کر رہے تھے۔ لڑکے نے کہا میں تھک گیا ہوں۔ امیر آدمی نے ٹھگ سے عرض کی کہ تھوڑی دیر کے لئے لڑکے کو سواری کرنے دو۔ ٹھگ نے کہا ٹھیک ہے لیکن گدھے پر اشرفیاں لدی ہوئی ہیں۔ اگر کوئی آدمی اس پر سوار ہو جائے اور اس سے ہوا خارج ہو جائے تو اس خارج شدہ گندی ہوا سے اشرفیاں کوئلہ بن جاتی ہیں۔ امیر آدمی نے کہا کہ ایسی کوئی بات نہیں اگر خدانخواستہ ایسا ہوگیا تو اس نقصان کے بدلے آپ کو اشرفیاں دوں گا۔ اس پر ٹھگ راضی ہوگیا اور دل ہی دل میں خوش ہوگیا کہ آج کوئلے کے بدلے اشرفیاں ملیں گی۔ جب منزل پر پہنچے تو ٹھگ نے لڑکے کو اتارا اور جلدی بوری کھول کر کہا کہ وہی ہوگیا جو میں نے کہا تھا اور جس کا مجھے ڈر تھا۔ بوڑھا آدمی حیران ہوگیا۔ اس پر اعتبار کر لیا اور اسے گھر لے جا کر کافی مال اور

اشرفیاں دے کر رخصت کیا۔ ٹھگ شام کو اشرفیوں کی بھری بوری گھر لے آیا تو سارے لوگ حیران ہوگئے اور پوچھا یہ مال کہاں سے لے آئے ہو۔ اس نے جواب دیا کہ آج بازار میں مکان کے کوئلے کی بڑی مانگ ہے۔ اس پر لوگوں نے اعتبار کر کے سب نے اپنے اپنے گھروں کو آگ لگا کر خاکستر کر دیا اور کوئلہ لے کر بازار گئے، ان کو کیا ملنا تھا۔ بازار سے واپس آ کر لوگوں نے ٹھگ کی بیوی کو مار ڈالا۔ ٹھگ حیران ہوگیا اور مردہ کو نہلا دھلا کر دلہن کی طرح سجایا اور ایک گھوڑے پر سوار ہو کر لاش کو آگے رکھا اور چل پڑا۔ راستے میں ایک بادشاہ کی چار پانچ شہزادیاں مل گئیں۔ انہوں نے ٹھگ سے پوچھا کیا چیز لے جا رہے ہو۔ اس نے کہا یہ میری دلہن ہے۔ شہزادیوں نے کہا اس کی شکل دکھاؤ۔ اس نے جواب دیا کہ اگر اس وقت اس کی شکل دکھائی تو یہ مر جاتی ہے۔ شہزادیوں نے حیران ہو کر پھر اصرار کیا۔ انہیں یقین نہیں ہوا اور کہہ دیا کہ اگر یہ مر جائے تو ہم سے کسی ایک کے ساتھ شادی کر لینا۔ ٹھگ دل ہی دل میں خوش ہوا اور چادر کھول کر نیچے رکھدی تو وہ مری ہوئی تھی۔ شہزادیاں اسے دیکھ کر حیران ہوئیں۔ ٹھگ نے بھی سخت چیخنا شروع کر دیا۔ آخر ایک شہزادی کے ساتھ شادی کر کے گھر آیا تو لوگ پھر حیران ہوگئے۔ شہزادی کے ساتھ کافی مال بھی ملا تھا لوگوں نے اس سے پوچھا تو اس نے جواب دیا کہ جس کی بیوی قتل ہو جائے بادشاہ اس کو اپنی لڑکی دیتا ہے۔ تیسری دفعہ بھی لوگوں نے اعتبار کر کے اپنی اپنی بیویوں کو مار ڈالا اور بادشاہ کے پاس حاضر ہو کر کہنے لگے ہماری بیویاں مر گئی ہیں۔ ہمیں لڑکی دے دو بادشاہ حیران ہوگیا اور درباریوں کو حکم دیا کہ ان سب کو قید کر دو اس کے بعد ٹھگ ہنسی خوشی وقت گزارنے لگا۔

کاں مئوں تو چلاس کوس کھای:

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ چلاس میں ایک کوا (کاں) اور ایک کبوتر (کُنولی) رہ رہے تھے۔ جن کا ذریعہ معاش کھیتی باڑی تھا۔ ایک دن کبوتر نے کوے سے مخاطب ہو کر کہا کہ تمام زمینداروں نے اپنی اپنی زمینیں حل چلا کر کاشت کے لئے تیار کر دی ہیں۔ چلو ہم بھی زمین پر حل چلائیں۔ کبوتر کی باتیں سن کر کوے نے کہا کہ تم جا کر روٹی تیار کرو۔ کھانا کھانے کے بعد کام پر جائیں گے۔ کبوتر روٹی تیار کر کے لے آتا ہے۔ روٹی کھا کر کوے نے کہا ''کوم تھئی نے تو تھ کنولی نے تھئی نیت نے تھ کنولی، کاں مئوں تو چلاس کوس کھای'' یعنی اے کبوتر! کام کرنا ہے تو کرو نہیں کرنا ہے تو نہیں کرو، کوا مر گیا تو چلاس کی یہ جاگیریں کس کام کی۔ کوے کی باتیں سن کر کبوتر اکیلے جا کر کھیتوں میں حل چلاتا ہے۔ چند دن بعد کبوتر کوے سے کہتا ہے کہ لوگوں نے اپنے اپنے کھیتوں کو ابتدائی پانی بھی دے دیا ہے، آؤ ہم بھی کھیتوں کو پانی دیں۔ کوا پھر کبوتر سے کہتا ہے کہ روٹی پکاؤ تو کھا کر کام پر جائیں گے۔ کبوتر روٹی تیار کر کے لے آتا ہے۔ جسے کھانے کے بعد کوا کہتا ہے ''کوم تھئی نے تو تھ کنولی نے تھئی نیت نے تھ کنولی، کاں مئوں تو چلاس کوس کھای۔'' کوے کی یہ باتیں سن کر کبوتر اکیلے کھیتوں کو پانی دے کر واپس آتا ہے۔ جب فصل پک کر تیار ہوئی اور لوگ اسے کاٹنے لگے تو کبوتر نے کوے سے کہا کہ لوگوں نے اپنی فصلوں کی کٹائی شروع کر دی ہے اور ہم یونہی بیٹھے ہوئے ہیں۔ چلو جا کر فصلوں کی کٹائی کریں۔ کوا کبوتر سے کہتا ہے کہ تم جا کر روٹی تیار کر کے لے آؤ۔ کھانا کھا کر کام پر جائیں گے۔ کبوتر روٹی تیار کر کے لے آتا ہے۔ جسے کھانے کے بعد کوا کہتا ہے کہ ''کوم تھئی نے تو تھ کنولی نے تھئی نیت نے تھ کنولی، کاں مئوں تو چلاس کوس کھای۔'' کبوتر اکیلے فصل کی کٹائی کرتا ہے۔ چند دن بعد کبوتر نے کوے سے کہا کہ تمام لوگوں نے اپنی فصلوں کو یکجا کر کے روایتی ''ٹاپ'' کی شکل میں ایک جگہ جمع کر دیا ہے۔ آؤ ہم بھی ایسا کریں۔ کوے نے کبوتر کی باتیں سن کر کہا کہ تم روٹی تیار کر کے لے آؤ کھانا کھانے کے بعد کام پر چلے جائیں گے۔ کبوتر بے چارا روٹی تیار کر کے لاتا ہے۔ جسے کھانے کے بعد کوا پھر یہی کہتا ہے کہ ''کوم تھئی نے تو تھ کنولی نے تھئی نیت نے تھ کنولی، کاں مئوں تو چلاس کوس کھای۔'' کبوتر کوے کی باتیں سن کر اکیلے کام پر جاتا ہے اور فصل کو یکجا کر کے روایتی ''ٹاپ'' بنا کر گھر لوٹتا ہے۔

چند دن بعد غلہ گھانے کے دن آئے تو کبوتر نے کوے سے کہا کہ گلہ گھانے کا کام گاؤں بھر میں شروع کیا گیا ہے۔ آؤ ہم بھی جا کر غلہ گھائیں۔ کوے نے کبوتر سے کہا کہ تم روٹی پکا کر لے آؤ کھانا کھا کر کام پر جائیں گے۔ کبوتر کھانا پکا کر لے آتا ہے۔ جسے کھانے کے بعد کوا کہتا ہے کہ ''کوم تھئی نے تو تھ کنولی نے تھئی نیت نے تھ کنولی، کاں مئوں تو چلاس کوس کھای۔'' کوے کی یہ باتیں سن کر کبوتر غلہ گھانے کا کام اکیلے سرانجام دیتا ہے۔ اگلے دن کبوتر کوے سے کہتا ہے کہ تمام لوگوں نے اناج کی صفائی کا کام مکمل کیا ہے۔ چلو ہم بھی اپنے اناج کو صاف کریں۔ کوے نے کہا کہ روٹی تیار کرو کھانا کھا کر کام کریں گے۔ کبوتر روٹی تیار کر کے لاتا ہے جسے کھا کر کوا کہتا ہے کہ ''کوم تھئی نے تو تھ کنولی نے تھئی نیت نے تھ کنولی، کاں مئوں تو چلاس کوس کھای۔'' کبوتر اکیلے کام پر جاتا ہے۔ ایک طرف صاف گندم کا ڈھیر (لاء) اور دوسری طرف اس کا بچا کھچا حصہ (کھیشے) الگ کر کے رکھدیتا ہے۔ اگلے دن کبوتر کوے سے کہتا ہے۔ تمام لوگ اپنا اپنا اناج اپنے اپنے گھروں میں ذخیرہ کر چکے ہیں۔ چلو ہم بھی اپنا اناج محفوظ کر لیں۔ کوا کہتا ہے کہ تم کھانا تیار کر کے لے آؤ کھا کر کام پر جائیں گے۔ کبوتر کھانا تیار کر کے لے آتا ہے۔ اس دفعہ کھانے کے بعد کوا کبوتر کے ساتھ چلا جاتا ہے۔ چلتے چلتے جب کوے نے دیکھا کہ صاف گندم کا الگ ڈھیر ہے اور گندم

کے بچے کھچے حصے کا الگ ڈھیر۔ صاف گندم کا ڈھیر دیکھ کر اس کا جی للچایا اور اس نے کبوتر سے کہا کہ ہم دونوں میں سے جو پہلے جا کر جس ڈھیر پر بیٹھے گا وہ ڈھیر اس کا ہوگا۔ کبوتر یہ شرط منظور کرتا ہے اور جلدی سے اڑ کر صاف گندم کے ڈھیر (لاء) پر بیٹھتا ہے۔ کوا، کبوتر کے بعد اسی ڈھیر پر جاتا ہے جہاں کبوتر بیٹھا ہوا ہے۔ وہ کبوتر کو دوسرے ڈھیر (کھیشے) کی طرف دھکیل دیتا ہے۔ کبوتر کوے کی اس حرکت پر سیخ پا ہوتا ہے لیکن اس کے پاس صبر کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ ایک طرف کوا اناج گھر لے جاتا ہے اور مزے اڑاتا ہے جبکہ دوسری طرف کبوتر گندم کے بچے کھچے خوشے (کھیشے) صاف کرنے کے لئے پانی کی نالی پر لے جاتا ہے۔ وہاں صاف نہ ہوئے تو بڑی نہر پر لے جاتا ہے لیکن وہاں بھی ناکام ہو کر انہیں دریا پر لے جاتا ہے۔ کبوتر گندم کے بچے کھچے خوشے صاف کر ہی رہا تھا کہ اس کی نظر دریا میں تیرتی ہوئی ایک صندوق پر پڑی۔ کبوتر نے صفائی کا کام چھوڑ دیا اور تھوڑی سی کوشش کے بعد صندوق کو باہر نکالا۔ جب صندوق کھول کر دیکھا تو وہ لعل و جواہرات سے بھری پڑی تھی۔ کبوتر سارا کام یونہی چھوڑ کر صندوق اٹھائے خوشی خوشی گھر لوٹا۔ جب کبوتر گھر پہنچا تو لعل و جواہرات سے بھری صندوق دیکھ کر کوے کے منہ میں پانی بھر آیا۔ کبوتر نے سارا ماجرا سنایا۔ اس موقع پر کوا ''مل'' کھا رہا تھا۔ کاہل کوے کی عقل لالچ کی آگ میں جل چکی تھی۔ اس نے سوچا کہ شاید کبوتر کے نقشِ قدم پر چل کر بغیر کسی محنت کے لعل و جواہرات سے پر اسے بھی ایک صندوق ملے گی جو کہ ناممکن تھا۔ لیکن اس کے باوجود کوے نے جان بوجھ کر ''مل'' کا ایک نوالہ زمین پر گرا دیا۔ پھر اس نوالے کو صاف کرنے کی خاطر نالی پر گیا۔ وہاں سے بڑی نہر پر لے گیا اور وہاں سے ناکام ہو کر برلبِ دریا پہنچا۔ اس موقع پر دریا میں کوے کو بھی ایک صندوق تیرتی ہوئی نظر آئی۔ جسے دیکھ کر کوا پھولا نہیں سمایا۔ اس نے ''مل'' کا نوالہ ایک طرف پھینک دیا اور جلدی جلدی جا کر صندوق دریا سے باہر نکالا۔ اس نے خوشی خوشی جب صندوق کھولا تو کیا دیکھتا ہے کہ ایک بڑا سانپ شکار کی تلاش میں ہے۔ اس نے کوے کو ڈس مارا اور وہ وہیں پر ڈھیر ہو گیا۔ اس وقت سے ''کاں مئوں تو چلاس کوس کھای۔'' ایک مقولہ بن گیا ہے۔ جس کے لفظی معنی یہ ہیں کہ ''کوا مر گیا تو چلاس کی جاگیریں کس کام کی؟''

کوا ہر وقت محنت سے جی چراتا تھا۔ لہٰذا اس مقولے کو اس وقت استعمال میں لایا جاتا ہے جب کوئی محنت سے جی چرائے۔ جس کا مفہوم یہ ہے کہ ''میں مر گیا تو یہ محنت مزدوری کس کام کی'' کبوتر کو اپنی محنت کا صلہ مل چکا تھا جبکہ کوا اپنی کاہلی کی بھینٹ چڑھ گیا۔

منیر اور شیر کی کہانی:

گوہر آباد (غور) اور گونر فارم کے آس پاس ننگا پربت کی طرف دو تراشیدہ آدم نما پہاڑ ہیں جو شیر اور مُنیر کے نام سے جانے جاتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ کسی زمانے میں دو بھائی بہن تھے۔ بھائی کا نام شیر اور بہن کا نام منیر تھا۔ دونوں بہن بھائی روزانہ پہاڑ پر بھیڑ بکریاں چرانے لے جاتے تھے۔ ایک دن ایسا ہوا کہ منیر گرمی اور حبس کی وجہ سے کچھ دیر ستانے کے لئے ایک سایہ دار جگہ پر بیٹھ گئی۔ وہ اس دن بڑی خوبصورت دکھائی دے رہی تھی۔ اس کی خوبصورتی اور رنگ و روپ دیکھ کر بھائی کے دل سے رشتے کا تقدس جاتا رہا اور وہ سلگتی ہوئی نظروں سے منیر کی طرف دیکھنے لگا۔ منیر کے حسن و جمال کے آگے اس نے ہتھیار ڈال دیے اور اس سے بے ہودہ حرکات کرنے پر اتر آیا۔ منیر نے شیر کی یہ حالت دیکھ کر منت سماجت کی لیکن وہ اپنے حرکات سے باز نہ آیا۔ منیر کو یقین تھا کہ شیر آسانی سے جان نہیں چھوڑے گا۔ بڑی سوچ بچار کے بعد اسے ایک ترکیب سوجھی۔ اس نے ایک ڈول شیر کے ہاتھ میں دیا جو غربال کی طرح نیچے سے چھلنی تھا اور کہا کہ اس میں بھر کر دریا سے پانی لاؤ تو میں تمہاری ہر بات تسلیم کروں گی۔ مرتا کیا نہ کرتا کے مصداق شیر ڈول ہاتھ میں لے کر دریا کی جانب چل پڑا۔ منیر چونکہ بڑی نیک سیرت عورت تھی۔ اسلئے وہ اس صورت حال سے بڑی پریشان ہوئی۔ بھائی کے بے ہودہ حرکات کا منظر ایک بار پھر اس کی نظروں میں آیا اور اس پر جنونی کیفیت طاری ہو گئی۔ کافی دیر تک زمین پر بکھری کرچیوں کی طرف دیکھتی رہی۔ اسے یہ غم کھائے جا رہا تھا کہ شیر ڈول میں پانی بھر کر لے آیا تو کیا بنے گا۔ میری عزت برباد ہو جائے گی۔ بھائی بہن کے رشتے کا تقدس ختم ہو جائے گا اور یہ بدنامی تا قیامِ قیامت ہمارے ناموں سے منسوب رہے گی۔ ادھر شیر نے دو دفعہ غربال نما ڈول میں پانی لانے کی بھرپور کوشش کی لیکن ناکام ہوا۔ تیسری بار اس نے ڈول کی تہہ میں گاڑھا کیچڑ ڈال دیا جس کی وجہ سے ڈول پانی سے بھر گیا۔ ادھر منیر طرح طرح کی سوچوں میں گم تھی کہ اچانک اس کی نظر شیر پر پڑی جو ڈول میں پانی لے کر اس کی طرف آ رہا تھا۔ شیر کو اپنی طرف آتے دیکھ کر اس کے اوسان خطا ہو گئے اور اس کا اضطراب بڑھنے لگا۔ شیر سے بچنے کے ظاہری اسباب اگرچہ مفقود تھے لیکن اللہ کی مدد سے منیر مایوس نہیں تھی۔ اس نے دونوں ہاتھ آسمان کی طرف بلند کئے اور خدا سے دعا کی کہ اے اللہ مجھے اپنے بھائی (شیر) کے شر سے محفوظ فرما۔ جب شیر اس کے اور قریب آیا تو ایک بار پھر منیر نے صدق دل سے یہ دعا کی کہ اے اللہ اس سے پہلے کہ بھائی بہن سے منہ کالا کرے دونوں کو پتھر بنا دے۔ وقت قبولیت کا تھا اسلئے منیر کی دعا

بارگاہِ ایزدی میں مقبول ہوئی اور دونوں پتھر کے بنا دیے گئے۔ ایک طرف مذکورہ آدم نما پہاڑ منیر کی صورت وسیرت اور پاک دامنی کی گواہی آج بھی دے رہا ہے تو دوسری طرف شیر سر پر ڈول لئے اپنی سیہ کاریوں کی بدولت لوگوں کے لئے نشانِ عبرت بنا ہوا ہے۔ منیر اور شیر کی لوک کہانی گوہر آباد اور چلاس بھر میں بہت مشہور ہے۔ البتہ بعض جگہوں پر منیر اور شیر کے نام کے بجائے یہ کردار ''منور'' اور ''شین'' کے نام سے جانے جاتے ہیں۔ گلگت سے چلاس جاتے ہوئے ڈھرنگ داس کے مقام پر شاہراہ قراقرم کے بائیں جانب جبکہ چلاس سے گلگت آتے ہوئے دائیں جانب یہ آدم نما چوٹیاں دیکھی جاسکتی ہیں۔

بھبوتن، ناصر آباد (ہنی) کی ایک لوک کہانی:

گرمیوں کے دن تھے۔ دریائے ہنزہ میں طغیانی آئی ہوئی تھی۔ رات کی تاریکی میں یا چاند کی چاندنی میں پانی کے تیز بہنے کی آوازیں بستی میں آجائیں تو مائیں بچوں کو سینے سے چمٹا چمٹا کر بھوت پریت کی کہانیاں سنا سنا کر سلا دیتیں۔

ہنی میں واقع مٹی کے ٹیلے مدہم اور ٹھنڈی چاندنی میں پراسرار مخلوق بن کر آسیب پھیلاتے۔ ان ہی دنوں میں ہنی سے بارہ مہم جو افراد پر مشتمل ایک پارٹی گنش کے اس پار واقع جزیرہ میں سونا نکالنے میں مصروف کار تھی۔ سونوالوں کا یہ ٹولا سونا نکال نکال کر انبار لگا رہا تھا۔ دریائے ہنزہ ایک بار پھر کچھ زیادہ مہربان دکھائی دے رہا تھا۔ دریا کی تیزی گلیشئرز کو کاٹ کاٹ کر وافر مقدار میں سونا بہالا رہی تھی۔ سونوالوں کی محنت رنگ لا رہی تھی۔ لہٰذا انہوں نے یہ طے کیا کہ وہ معمول سے کچھ زیادہ دن جزیرہ میں فروکش رہیں گے۔ تاکہ کچھ زیادہ سونا حاصل کرسکیں لیکن خدا کو کچھ اور منظور تھا۔ چونکہ دریا میں پہلے سے سیلاب آیا ہوا تھا۔ اب طغیانی میں اور اضافہ ہوا تو جزیرہ میں بھی خاصا پانی چڑھ آیا اور سونوالوں کا راستہ پانی کے بہاؤ کی نذر ہوگیا۔ اب ہر طرف پانی کی حکمرانی تھی۔ آبادی اور بستی کے کنارے جو دور دور سے دکھائی دیتے تھے، اب وہ بھی نظروں سے اوجھل تھے۔ راکاپوشی کی چوٹی ہمیشہ کی طرح بادلوں میں گم کبھی کبھی ایک جھلک دیتی لیکن جب بھی بادل اس کو گھیر لیتے، پارٹی مایوسی کا شکار ہوجاتی۔ سونوال امید و یاس کے بیچوں بیچ ہنی کے انگوروں کے باغوں کا تصور کرتے اور اونچے اونچے ٹیلوں سے میاچھر کے عقب سے سورج طلوع ہوتے دیکھنے کی تمنا کرتے۔ کبھی کبھی وہ ایک دوسرے سے کہتے کہ کیا تو نے بھیڑ بکریوں کی مے مے نہیں سنی؟ بہرحال ان کی دعائیں قبول نہیں ہوئیں۔ پانی کا چڑھاؤ قائم و دائم رہا۔ سونوالوں کی خوراک کے ذخائر انجام کو پہنچ چکے تھے۔ بھوک اور فاقہ کشی ستانے لگی تھی۔ ایسے میں سوچنے لگے کہ اب فاقہ کشی سے نجات کیسے حاصل کی جائے۔ سونوالوں کی پارٹی میں بھبوتن نامی ایک طاقتور ذہین شخص تھا۔ اس کی یہ رائے صائب قرار پائی کہ دو اشخاص میں کشتی لڑوائی جائے جو جسے پچھاڑے اسے بطورِ غذا پارٹی کے بقیہ افراد استعمال کریں۔ چنانچہ جزیرہ میں یہ خونی کشتیاں شروع ہوئیں اور انسان انسان کا گوشت کھا کھا کر لطف اٹھانے لگے۔ اس طرح دس سونوال جان چھوڑ گئے۔ جزیرہ پر بھبوتن اور اس کا ایک ساتھی رہ گیا تھا۔ چونکہ بھبوتن طاقتور اور مضبوط تھا اس لئے اسے دوسرے ساتھی کو زیر کرنے میں کوئی دقت پیش نہ آئی۔ وہ اپنے ساتھی کا گوشت مزہ لے لے کر کھا گیا۔ ایسے وقت میں دریائے ہنزہ کا سیلاب اتر گیا تھا اور جزیرہ سے باہر نکلنے کا راستہ بھی نکل آیا تھا۔ بھبوتن انسانی گوشت کھا کھا کر عادی ہو چکا تھا۔ اسے بھیڑ بکریوں کے گوشت سے اب کوئی دلچسپی نہ رہی تھی۔ وہ انسانوں کا متلاشی تھا تاکہ وہ ان کا گوشت کھائے اور خوب لطف اٹھائے۔ جزیرہ سے باہر نکل کر حسن آباد کے اس پار پہاڑ پر اسے روشنی دکھائی دی۔ اس کی خوشی بے پایاں تھی کیونکہ وہ مقام سورتو گڈریا کا مسکن تھا۔ اور اسے انسانی گوشت ملنے کی امید ہوگئی تھی۔

بھبوتن جب پہاڑی پر پہنچا تو اس کی خوشی مایوسی میں بدل گئی۔ باڑے کا دروازہ بہت تنگ تھا اور وہ اس سے گزر کر اندر داخل نہیں ہوسکتا تھا۔ لہٰذا وہ باہر انتظار کرتا رہا تاکہ جیسے سورتو باہر نکلے۔ وہ اس کا گوشت کھائے ''سورتو'' دروازہ کی چھیدوں سے جھانک کر بھبوتن کی ہیبت دیکھ چکا تھا۔ وہ انسانی شکل میں ایک جن دکھائی دے رہا تھا۔ وہ سخت خوفزدہ تھا۔ تاہم ذہین شخص تھا۔ اس نے ایک ترکیب نکالی تاکہ بھبوتن کو دھوکا لگے اور وہ دیوار گرا کر باڑا میں داخل نہ ہو۔ چمڑے کی مشک میں لسی بھری ہوئی تھی۔ ''سورتو'' نے مشک کو چھت سے لٹکا کر رکھ دیا اور اس کے نیچے لکڑی کے تھال میں ایک چمچہ رکھا۔ جس پر مشک کے باریک سوراخ سے لسی کے قطرے رس رس کر گرنے لگے اور تیز آواز پیدا کرنے لگے۔ لسی کا قطرہ چمچ میں گرتا تو ''سورتو'' کہتا ''کھہ کھپئیں کھہ'' یعنی کھاؤ چمچ کھاؤ۔ بھبوتن کو اس سے یہ مغالطہ ہوا کہ کوئی دوسرا شخص بھی اندر موجود ہے۔ لہٰذا انتظار کیا جائے۔ ''سورتو'' نے اس دوران عقبی دیوار سے پتھر اکھیڑ اکھیڑ کر ایک سوراخ بنایا اور باہر نکل کر بھاگ کھڑا ہوا۔ رات اخیر ہو چکی تھی۔ صبح کی سیاہی پھیل رہی تھی۔ ''سورتو'' بھبوتن کے دسترد سے محفوظ تھا اور کافی دور نکل چکا تھا۔ وہ خوشی سے چلا رہا تھا۔ بھبوتن نے ''سورتو'' کی آوازیں سنیں اور اپنی حماقت پر بہت پچھتایا۔ تاہم بڑی تیز رفتاری سے اس کا پیچھا کرنا شروع کردیا اور دونوں ایک ساتھ ہنی کے گاؤں میں داخل ہوئے۔ لوگوں نے بھبوتن کو دیکھا اور بھبوتن نے لوگوں کو۔ اب اس کے علاوہ کوئی چارہ نہ تھا کہ بھاگ کھڑا ہو۔ لوگوں نے اس کا پیچھا کیا۔ بھبوتن ایک بڑے درخت کے

کھوکھلے تنے میں جا چھپا۔ لوگوں نے درخت کو آگ لگادی اور بھوتن کا کام یوں تمام ہوا۔ تاہم اس کے بعد ہنی میں بادوباراں کے طوفان اٹھے، سیلاب آئے، زمین میں بڑے بڑے شگاف پیدا ہوئے اور مٹی کے بڑے بڑے ٹیلے نمودار ہوئے جو آج بھی بھوتن کی یاد دلاتے ہیں۔

دادی اماں کی لوک کہانی:

ایسی لوک کہانیاں جو اکثر دادی اماں سنایا کرتی ہیں اگرچہ بہت ہیں، لیکن یہاں پر ایک کہانی بطور نمونہ پیش کی جاتی ہے۔ یہ کہانی ''شرح آی'' یعنی پہاڑی بکری کے نام سے مشہور ہے۔ روایت کے مطابق کسی جنگل میں ایک پہاڑی بکری رہتی تھی۔ اس بکری کے تین بچے تھے جن کے نام شُرجُتی پالو، مُوجُتی پالو اور پھُچُتی پالو، رکھے گئے تھے۔ پھُچُتی پالو شرارتی تھا جبکہ باقی دو بہت شریف تھے۔ بکری گھاس چرنے کیلئے چراگاہ جانے سے پہلے روزانہ بچوں کو بکر کوٹھے میں بند کرتی اور بچے اندر سے کنڈی لگاتے۔ شام کو خوب چرنے کے بعد بکری بکر کوٹھے کے دروازے پر آ کر ایک ایک کا نام لیکر پکارتی تو وہ دروازہ کھولکر اس سے لپٹ جاتے اور باری باری بکری کا دودھ پی کر سیر ہو جاتے۔ ایک دن حسبِ معمول بکری چراگاہ سے واپس آ کر اپنے بچوں کا نام لیکر پکارا تو بچوں نے دروازہ کھولا اور دودھ پینے لگے۔ یہ منظر دور سے ایک ریچھ دیکھ رہا تھا۔ ریچھ نے دل ہی دل میں بچوں کا کام تمام کرنے کا فیصلہ کیا۔ اگلے دن جب بکری گھاس چرنے نکلی تو ریچھ بکر کوٹھے کے دروازے تک پہنچ گیا اور ایک ایک بچے کا نام لیکر آواز دی اور دروازہ کھولنے کیلئے کہا۔ دونوں شریف بچوں نے دروازہ کھولنے سے انکار کیا لیکن ''پھُچُتی پالو'' نامی شرارتی بچے نے کسی کی نہ سنی اور دروازہ کھول دیا۔ ریچھ دروازہ کھلتے ہی اندر کود پڑا اور شرارتی بچے کو نگل لیا۔ دونوں شریف بچے موقع پا کر بھاگ گئے اور جنگل پہنچ کر چلغوزے کے ایک درخت کے پیچھے چھپ گئے۔ شام کو جب بکری لوٹی تو اس نے دیکھا کہ بکر کوٹھے کا دروازہ کھلا ہے اور بچے موجود نہیں ہیں۔ وہ بچوں کی جدائی میں بے قرار ہو کر انکی تلاش میں جنگل کی طرف نکل پڑی۔ جنگل میں وہ بچوں کی تلاش میں ماری ماری پھر رہی تھی کہ اچانک بچوں کی اس پر نظر پڑی بچوں نے بکری کو پکارا اور دوڑ کر اس سے لپٹ گئے۔ بکری نے ''پھُچُتی پالو'' کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے سارا قصہ سنایا۔ بکری دونوں بچوں کو لیکر بکر کوٹھے کی طرف دوڑی۔ انہیں دودھ پلایا اور بکر کوٹھے میں بند کر کے خود لوہار کے پاس چلی گئی۔ اس نے لوہار سے دو تیز خنجر بنوائے اور انہیں اپنے سینگوں پر نصب کرائے۔ وہاں سے بکری ریچھ کی تلاش میں نکلی۔ راستے میں ریچھ سے اس کا آمنا سامنا ہوا۔ بکری کسی تمہید کے بغیر ہی اس پر حملہ آور ہوئی اور سینگوں پر نصب خنجر اس کے پیٹ میں گھونپ دئے۔ جونہی ریچھ کا پیٹ پھٹا، شریر بچہ ''پھُچُتی پالو'' پیٹ سے باہر نکلا اور ریچھ بے ہوش ہو کر گر پڑا اور مر گیا۔ شریر بچہ ریچھ کے پیٹ میں سکڑ کر بہت پتلا ہوا تھا۔ بکری اسے گھر لائی اور چمڑے کے تھیلے میں ڈال دیا۔ تقریباً ایک ماہ بعد وہ چلنے پھرنے کے قابل ہوا۔ اسکے بعد سے بکری اور بچے سارے مل کر گھاس چرنے چراگاہ جانے لگے۔

گلیشیئر کی پیوند کاری

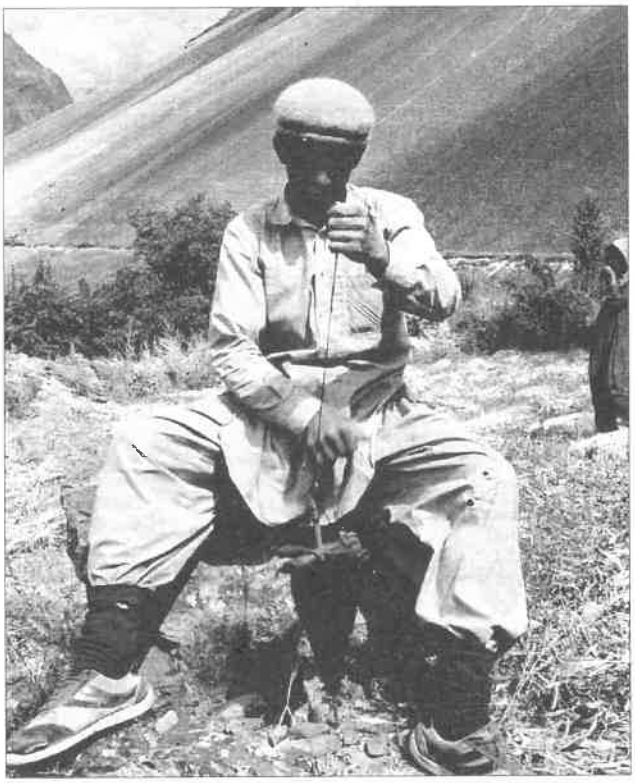
شمالی علاقہ جات کے دوسرے خطوں کی طرح گلگت میں بھی گلیشیئرز کی پیوند کاری کا سلسلہ ازمنہ قدیم سے چلا آرہا ہے۔ گلیشیئرز کی پیوند کاری کا طریقہ صرف وعجیب وغریب ہی نہیں بلکہ بڑا دلچسپ اور منفرد بھی ہے۔ لوگوں کی روایات کے مطابق کئی مقامات پر مصنوعی پیوند کاری کے ذریعے پانی کی مقدار میں اضافہ کیا گیا ہے۔ گلیشیئرز کی روایتی پیوند کاری اگرچہ جدید دنیا اور نئی نسل کے لئے ایک انوکھی سرگرمی ہے لیکن ہمارے بزرگ اس طریقہ کار سے بخوبی واقف ہیں۔ چند برس قبل شمالی علاقوں کا پسماندہ ضلع دیامر میں پانی کی کمی کو پورا کرنے کے لئے گلیشیئرز کی پیوند کاری کا ایک کامیاب تجربہ کیا۔ جس کا اہتمام اس علاقے کی ایک نامور غیر سرکاری تنظیم ''پربت ویلفیئر ایسوسی ایشن'' نے کیا تھا۔ اس تنظیم کے اہل کاروں نے لوک دانش کو استعمال میں لاتے ہوئے علاقائی روایات کے عین مطابق گلیشیئرز کی پیوند کاری کا بیڑہ اٹھایا۔ تنظیم کے رضا کاروں نے نا مساعد حالات میں جانفشانی کا مظاہرہ کرتے ہوئے سطح سمندر سے 16 ہزار فٹ بلند پہاڑی چوٹیوں سے گلیشیئرز کے 6 نر اور 6 مادہ بلاک مطلوبہ جگہ پر پہنچائے۔ یاد رہے کہ گلیشیئر کو پہاڑ کی چوٹی سے بغیر نیچے رکھے یا ریسٹ کئے منزل مقصود تک پہنچانا ہوتا ہے۔ نر اور مادہ برف کی پہچان بھی ہر کوئی نہیں کر سکتا بلکہ گلیشیئر کے مضافات میں رہنے والا کوئی مقامی شخص ہی اس کی اہلیت رکھتا ہے۔ منور خان صدر پربت سوشل ویلفیئر ایسوسی ایشن کے مطابق نر اور مادہ گلیشیئر بگروٹ سے لائی گئی اور پیوند کاری کا عمل سرانجام دینے والے ماہرین کا تعلق بھی بگروٹ سے تھا۔ سال 2001ء کے دوران سب ڈویژن چلاس ضلع دیامر کے موضع جات بابوسر اور ہڈور میں ایک ایک مقام پر جبکہ بٹوگاہ میں دو مقامات پر گلیشیئر کی پیوند کاری کی گئی۔ سال 2002ء میں بابوسر میں ایک اور جگہ پیوند کاری کا کام کیا گیا۔ پیوند کاری کا عمل شروع کرنے سے قبل مال مویشی کی قربانی بھی کی گئی تا کہ اللہ کی خوشنودی حاصل ہو اور منصوبہ کامیابی سے ہمکنار ہو جائے۔ پیوند کاری کی مطلوبہ جگہ پر ایک گول اور 9 فٹ گہرا کنواں تیار کیا گیا تھا۔ اس کنویں کے بالکل درمیان میں نر اور مادہ کو رکھنے کے لئے قبر نما جگہ تیار کی گئی۔ نر اور مادہ برف کے بلاک کو کنویں میں رکھنے کے بعد

ان کے اوپر پسا ہوا نمک، پسا ہوا کوئلہ ڈال کر بند کیا گیا۔ مختصراً اس جگہ میں ڈیپ فریز رجیسا ماحول پیدا کیا گیا۔ گلیشیئرز کی پیوند کاری کے اس طریقے سے پہلے اس مقام کا مکمل معائنہ کیا جاتا ہے اور اس جگہ سورج کے طلوع اور غروب تک کا جائزہ لیا جاتا ہے اور اس بات کا خاص خیال رکھا جاتا ہے کہ سورج کی شعاعیں براہِ راست اس مقام کو متاثر نہ کریں۔ اب ایک سال گزرنے کے بعد گلیشیئرز کی پیوند کاری کا یہ منصوبہ کامیابی سے ہمکنار ہو چکا ہے۔ اب پیوند کاری کئے گئے اس ڈیڑھ فٹ چوڑے اور پانچ فٹ لمبے برف کے بلاک کے اردگرد کم وبیش دو سے ڈھائی سو میٹر تک مضبوط گلیشیئر نے جنم لیا ہے۔ پیوند کاری سے تیار کئے گئے اس گلیشیئر کی آئندہ تین برسوں تک دیکھ بھال کی جائے گی۔ جبکہ آئندہ آٹھ برسوں تک اس گلیشیئر سے مقامی سطح پر زرعی مقاصد کے لئے پانی حاصل کیا جائے گا۔ جبکہ 14 سے 15 برسوں کے دوران یہ گلیشیئر مزید بڑھ جائے گا اور اس سے حاصل ہونے والے پانی کی مقدار دگنی سے زائد ہو جائے گی۔ اضافی پانی کی دریائے سندھ کے پانی میں شمولیت ملکی سطح پر پانی کے بحران کی کمی میں بھی معاون ثابت ہوگی۔ اس منصوبے کی کامیابی سے مقامی لوگ پانی کی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے ایک بار پھر گلیشئرز کی پیوند کاری کے اس روایتی طریقے کی جانب متوجہ ہو چکے ہیں۔

عوامی پیشے اور دستکاریاں

شمالی علاقوں کے لوگ ماضی میں زیادہ تر گلہ بانی کا کام کرتے تھے۔ البتہ نشیبی میدانی علاقوں میں کاشت کاری بھی بعض لوگوں کی معیشت کا ذریعہ تھی۔ کچھ لوگ تجارت اور کچھ ملازمت بھی کیا کرتے تھے۔

تقریباً تمام ضروریات زندگی مقامی سطح پر حاصل کی جاتیں، کیونکہ اس وقت ان کی درآمد کا کوئی خاص ذریعہ نہیں تھا۔ دیہی زندگی میں اکثر کام لوگ خود مل کر سرانجام دیتے تھے۔ اب ہنرمند لوگوں نے معاشرتی قدغنوں کی وجہ سے آبائی پیشے چھوڑ کر دوسرے کام شروع کر دئے اور کسی نے اپنے بزرگوں کے ورثے کو ترقی نہیں دی۔ آج کل کوئی بھی بال کٹوانے، جوتا سلوانے، اوزار مرمت کروانے کے لئے کسی کے گھر نہیں جاتا بلکہ اس مقصد کے لئے بازار کی طرف جاتا ہے۔ جوں جوں دنیا ترقی کرتی گئی تو جہاں نوعِ انسان کو طرح طرح کی سہولتیں حاصل ہوئیں وہاں انسانی محنت ومشقت کے کام بھی بری طرح متاثر ہوئے۔ پہلے یہاں کے لوگ بھیڑ کی اون سے دھاگہ بناتے اور اس دھاگے سے مقامی طور پر گرم کپڑے پٹو، کمبل، سویٹر، دستانے، گلوبند اور جرابیں وغیرہ بناتے تھے۔ خواتین اپنے ہاتھوں سے تقریباً 1/2 فٹ چوڑی رنگارنگ اونی پٹی بھی بناتیں جسے عموماً پولو پلیر، شکاری



رسی بٹنے کا روایتی انداز

اور چرواہے اپنی ٹانگوں کے اردگرد لپیٹ لیتے تاکہ ٹانگیں چوٹ سے محفوظ رہیں اور سردی سے بچا جا سکے۔ یہاں پر بوڑھی مائیں اون کات کر دھاگہ تیار کرتیں تو بہن بیٹیاں اس سے افراد خانہ کے لئے بنیان، دستانے، جراب اور مفلر وغیرہ بن لیتیں جو موسم سرما میں استعمال کئے جاتے۔ گھریلو سطح پر تیار ہونے والے ان اشیاء پر خوبصورت اور دلکش پھول کاڑھ لیتے جو دستکاری کے اعلیٰ نمونے تصور ہوتے۔ جب کسی عورت کو پتہ لگتا کہ فلاں محلے میں بنائی کا کوئی نیا نمونہ موجود ہے تو وہ ہر حال میں نہ صرف اسے حاصل کرتی بلکہ بنیان کی تیاری میں متعلقہ ہنرمند خاتون سے رہنمائی بھی لے لیتی۔ کیل یا بکری کا چمڑا خود پکا کر اس سے دور دراز کے گاؤں کے لوگ اپنے لئے جوتے بناتے۔ خاص گلگت میں درزی، نائی، دھوبی، لوہار اور چاندی کے زیورات بنانے والے موجود تھے۔ جبکہ گلگت سے باہر کے علاقوں میں لوگ خود ہی یہ سارے کام کر لیتے تھے۔ پچھلے وقتوں میں گلگت میں نہ کوئی مٹی کے برتن بناتا تھا نہ اب کوئی جانتا ہے۔ نہ کوئی رنگ ریز موجود تھا نہ حکیم نہ ولایتی دوا فروش کی کوئی دکان تھی۔ دیسی دوائیاں بھی بڑی مشکل سے ملتی تھیں۔ البتہ ایک روایت کے مطابق مٹی کے برتن داریل وغیرہ سے بھی لائے جاتے تھے لیکن بڑے پیمانے پر صنعت وحرفت کا ماضی میں یہاں نام ونشان تک نہیں تھا اور لوگ اپنی طبیعت کے تساہل کے سبب اس طرف مائل بھی نہیں تھے۔ البتہ باہر سے آئے ہوئے لوگوں کی وجہ سے یہاں کام کاج کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔ ان علاقوں

میں سردیوں میں نہ صرف سخت سردی پڑتی ہے بلکہ زمین میں سخت سردی کی وجہ سے ککر جم جاتا ہے۔ جس کی وجہ سے موسم خزاں کے بعد کوئی فصل یا سبزی اگانا مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن ہوتا ہے۔ زمین میں ککر جم جانے کی وجہ سے پودوں کی بڑھوتری تک رک جاتی ہے۔ زمین اپنی اس طبعی حالت کی وجہ سے تین ماہ تک بالکل ہی ویران نظر آتی ہے۔ یہاں اناج کی مقامی پیداوار بہت قلیل ہے۔ جس کی وجہ سے اناج کی مقامی ضروریات پوری نہیں ہوسکتیں۔ لہٰذا کافی اناج پاکستان کے دوسرے علاقوں سے درآمد کرنا پڑتا ہے۔ یہ علاقے مون سون کی بارشوں کی حدود سے باہر ہیں۔ عموماً مارچ، اپریل، مئی اور ستمبر اکتوبر میں ہلکی بارش ہوتی ہے۔ یہاں پر کئی علاقے سطح سمندر سے بہت بلندی پر واقع ہیں۔ جہاں شدید موسمی حالات کی وجہ سے سالانہ صرف ایک فصل کاشت ہوتی ہے۔ البتہ میدانی اور کم بلندی پر واقع مقامات پر سالانہ دو فصلیں کاشت کی جاتی ہیں۔ ان علاقوں میں زمیندار بہت ہی کم زمینوں کے مالک ہوتے ہیں اور زیرِ کاشت رقبہ کی سخت کمی ہے۔ چونکہ بارشیں بہت کم ہوتی ہیں۔ اسلئے بارانی فصلیں پیدا نہیں ہوتیں۔ تمام زمینیں نہری ہیں اور نہروں، نالوں یا چشموں کے پانی سے سیراب کی جاتی ہیں۔ زیادہ تر لوگ مال مویشی، بھیڑ اور بکریوں کے ریوڑ پالتے ہیں۔ جنگل سے لکڑی کاٹ کر فروخت کرنے کا کاروبار بھی کرتے ہیں۔ آج کل لوگ مختلف سرکاری محکموں اور نجی اداروں میں ملازمتیں کرنے کے علاوہ فوج اور پولیس میں بھی بھرتی ہوتے ہیں۔

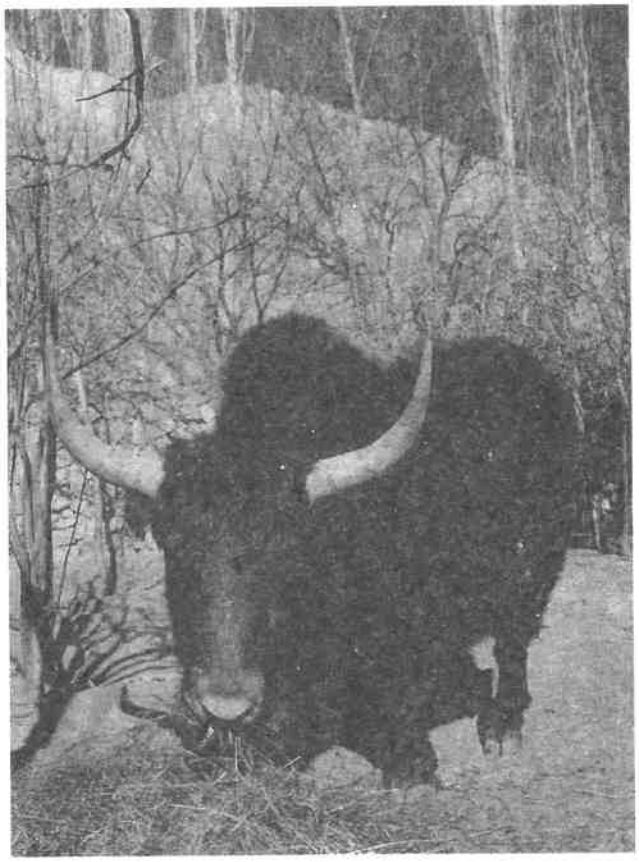
کاشتکار:

کاشتکار فصلیں اگا کر ہمارے لئے اناج وغیرہ پیدا کرتے ہیں۔ ان کی محنت اور مشقت کی وجہ سے ہی ہمیں روٹی ملتی ہے۔ پرانے وقتوں میں یہ لوگ کاشتکاری اور کھیتی باڑی کے اوزار از خود بناتے تھے۔ زیادہ تر زرعی آلات بھوج پتر، بید، ایش اور پدم کی لکڑی سے بنائے جاتے تھے۔ راجوں مہاراجوں کی زمین ان کے مزارع کاشت کرتے تھے جبکہ وہ لوگ جن کی کوئی زمین نہیں ہوتی وہ بڑے زمینداروں کی زمین ساجھے پر لیتے۔ اس خطہ کا زیادہ تر علاقہ پہاڑی ہے اور زیرِ کاشت رقبہ آبادی کے لحاظ سے بہت کم ہے۔ جو تھوڑا بہت میدانی علاقہ ہے وہاں پر کاشت کاری کی جاتی ہے۔ چارہ کے علاوہ پھلدار و غیر پھلدار درخت بھی لگائے جاتے ہیں۔ بعض جگہوں پر خودرو درخت بھی پائے جاتے ہیں۔ محققین شین قوم کا تعلق آریہ سے بتاتے ہیں اور اس سلسلے میں نامور محقق میکس مولر کہتے ہیں کہ لفظ آریا ''آرار'' سے مشتق ہے۔ جس کے معنی زمین کاشت کرنے والے کے ہیں۔ کھیتی باڑی کا کام زیادہ تر مردوں کی ذمہ داری ہے لیکن عورتیں کاشتکاری کے کام میں مردوں کی مدد بھی کرتی ہیں۔ زیرِ کاشت رقبہ بہت محدود ہے۔ ماضی میں زمینداروں سے ہر فصل کا مالیہ لیا جاتا تھا۔ یہ مالیہ جنس کی شکل میں ہوتا تھا جو زمین کی زرخیزی کے مطابق گھٹتا اور بڑھتا تھا۔ انگور کی فصل پر بھی ٹیکس عائد تھا۔ یہاں کی زمین آلو کی کاشت کے لئے بہت موزوں ہے۔ یہاں کا آلو ملک بھر میں بے حد پسند کیا جاتا ہے اور تمام ملک کو برآمد کیا جاتا ہے۔

گلہ بانی / چوپانی:

شنا خطہ کی حدود میں گلہ بانی کا پیشہ بھی عام ہے۔ مقامی زبان میں چوپان کو ''پیالو'' کہتے ہیں۔ یہ لوگ اپنی تمام زندگی بلند و بالا چراگاہوں میں گذارتے ہیں۔ چرواہے نہ صرف بھیڑ بکری کثرت سے پالتے ہیں بلکہ ہر طرح کی مال مویشی کو موسم کے لحاظ سے ایک جگہ سے دوسری جگہ چرانے کے لئے لے جاتے ہیں۔ مالدار لوگ کافی تعداد میں مال مویشی پالتے ہیں۔ اس میں قوم یا نسل کی کوئی تخصیص نہیں۔ صاحب مال خاندان کے لوگ جو پڑھے لکھے نہیں ہوتے، عموماً چرواہے کا کام کرتے یا مال مویشیوں کی پرورش کا کام اکثر گجر برادری کے لوگوں کے سپرد کر کے ان کی محنت کا معاوضہ دیا جاتا۔ گجر برادری کے لوگ اکثر ایسے بلند پہاڑی علاقوں میں رہتے ہیں جہاں کافی جنگل اور معقول چراگاہیں موجود ہوتی ہیں۔ وہ عارضی طور پر اپنے لئے جھونپڑے وغیرہ بناتے ہیں۔ کیونکہ یہ خانہ بدوش زندگی گزارتے ہیں اور ایک جگہ ٹک کر نہیں بیٹھتے، یہی وجہ ہے کہ موسم کے ساتھ ساتھ جگہ بدلتے رہتے ہیں۔ موسم کے علاوہ انہیں نقل مکانی کے لئے کسی چھوٹے سے بہانے کی ضرورت ہوتی ہے۔ چرواہوں کو بعض سرمایہ دار لوگ نہ صرف بہت کم اور نامعقول معاوضہ دیتے ہیں بلکہ انہیں اپنے جال میں جائز و ناجائز طریقے سے اس طرح پھنساتے ہیں کہ وہ زندگی بھر ان کے غلام بن کر رہ جاتے ہیں۔ چرواہے مالکوں کو مال مویشی سے حاصل شدہ گھی، اون اور بال مہیا کرتے ہیں جن سے مالکان گرم کپڑے، سویٹر، کمبل، گرم چادریں، رسیاں اور بچھونے وغیرہ بنواتے ہیں۔ جسے عموماً فروخت بھی کیا جاتا ہے۔ بعض جانوروں کے چمڑوں سے جوتے اور دیگر سامان بنتے جبکہ گدھا، گھوڑا، خچر اور خوش گاؤ وغیرہ بوجھ اٹھانے کے کام میں بھی لائے جاتے ہیں۔ نشیبی علاقوں کے لوگ جو تھوڑی بہت زمین کے مالک ہوتے ہیں۔ وہ گائے یا بکری ضرور رکھ لیتے ہیں تاکہ دودھ کی ضرورت پوری ہو۔ بھیڑوں کا اون بھی فروخت کرتے ہیں۔ جن گھرانوں میں دودھ کی فراوانی ہوتی ہے وہ اکثر اپنی ضرورت سے زیادہ حاصل ہونے والا دودھ ضرورت مندوں کو فروخت کرتے ہیں۔ دودھ کے علاوہ مال مویشی سے لوگ گھی اور گوشت بھی حاصل کرتے ہیں اور ان کے چمڑوں کو بازار میں بیچتے بھی ہیں۔

بعض جانور عیدالاضحیٰ کی قربانی کے لئے بڑے اہتمام کے ساتھ پالے جاتے ہیں۔



یاک (خوش گاؤ)

ضلع غذر کے بعض بالائی علاقوں میں خوش گاؤ (یاک) اب بھی پالے جاتے ہیں۔ یاک "Yak" کو بلتی میں "ہیاق" اردو میں خوش گاؤ اور شنا میں بیپو "Bepo" کہتے ہیں۔ لفظ یاک بلتی زبان کے "ہیاق" کی بگڑی شکل ہے۔ خیال ہے کہ "یاک" کا اصل وطن تبت ہے اور اس کی نسل عہد عتیق میں شمالی علاقہ جات کی طرف منتقل ہوئی تھی۔ بلتستان، گلگت، ہنزہ، شمشال، نگر اور غذر وغیرہ میں یاک کو پالتو جانور کی حیثیت حاصل ہے۔ سدھائے ہوئے یاک سے حسبِ ضرورت بار برداری اور سواری کا کام بھی لیا جاتا ہے۔ یہ سرد علاقوں اور اونچے پہاڑوں پر رہنے والا جانور ہے، خنجراب کے بلند و بالا پہاڑ اس کی گرمائی چراہ گاہ ہیں یہی وجہ ہے کہ یہ میدانی علاقوں میں نہیں پایا جاتا۔ یہ نایاب جانور زیادہ تر پامیر سے مال مویشی کا کاروبار کرنے والے لوگ ضلع غذر اور وہاں سے گلگت لاتے ہیں جبکہ بالائی استور میں خوش گاؤ کی نسل کشی سے ایک نئی قسم دریافت کی گئی ہے۔ مقامی لوگ جس کے نر کو "زوئی" اور مادہ کو "زموہ" کہتے ہیں۔ "زموہ" کا دودھ زردی مائل اور بہت گاڑھا ہوتا ہے۔ استور کے گھوڑے چھوٹے قد کے ہوتے ہیں جنہیں مقامی لوگ "ٹٹو" کہتے ہیں جو سواری اور بار برداری دونوں کے لئے استعمال کئے جاتے ہیں۔

اس کے علاوہ بھیڑ، بکری، بکرا، گائے، بیل وغیرہ نسل کے جانور یہاں عام ملتے ہیں۔ نومبر/دسمبر کے مہینے میں بالخصوص "نسالو" کے لئے اور عیدالضحیٰ سے قبل کے عشرے میں قربانی کے لئے مال مویشی کی خصوصی منڈی لگتی ہے۔ جہاں سے لوگ خریداری کرتے ہیں۔ چرواہے منڈی کے قابل مال مویشی لے کر ان دنوں میں شہروں کا رخ کرتے ہیں۔ صاحبِ نصاب کیا غریب لوگ بھی قرض کر کے قربانی ضرور کرتے ہیں۔ نسالو کیلئے مقامی تاجر منہ مانگی قیمت کے بدلے لوگوں کو ادھار مال مویشی دیتے ہیں۔

چرواہوں اور چراگاہوں سے منسوب روایات:

ماضی میں چراگاہوں میں چرنے والی بھیڑ بکریوں پر بھی ٹیکس عائد تھا۔ اس ٹیکس کے علاوہ ایک عجیب وغریب ٹیکس برمس، خومر اور نوپورہ نامی تین دیہاتوں پر عائد تھا۔ وہ یہ تھا کہ مئی سے اکتوبر تک ان دیہاتوں کے ہر گھر میں جو گائے یا بھینس دودھ دیتی تھی ان میں سے ایک گائے کے دودھ کا مکھن حکمران کے گھر جاتا تھا۔ اس کے علاوہ حکمران کو جسے "راع" کہتے تھے ایک بچھڑا فی گھر دیتے تھے۔ اس ٹیکس کو "چیلو" کہتے تھے۔ کہتے ہیں کہ یہ ٹیکس "جواری" نامی خاتون حکمران نے عائد کیا تھا۔ یہاں چراگاہوں پر مخصوص لوگوں کے حقوق ہوتے ہیں۔ غیر مستحق لوگ اگر کسی چراگاہ کو استعمال کریں تو ان سے اُس کا معقول معاوضہ لیا جاتا ہے۔

چرواہا (پیالو) سے متعلق "کروئی برائے" کے نام سے بھی ایک رسم نگر کی طرف رائج تھی۔ جس کے مطابق "رسم موال" سے قبل اکیس عدد چھوٹی گول روٹیاں جسے مقامی زبان میں "چھپٹہ" کہتے ہیں، پکاتے۔ کیونکہ کاہنوں کی اصطلاح کے مطابق "برائے" کی تعداد اکیس ہوتی ہے۔ ان روٹیوں پر گھی لگا کر تر کرتے، روٹیوں کے ساتھ ساتھ گوندھے ہوئے آٹے سے ایک انسانی پتلا بھی بناتے، جسے چرواہے سے تشبیہ دی جاتی۔ اس پتلے کو بھی پکا کر روٹیوں کے ساتھ رکھتے۔ پتلے کے سر پر مکھن کا ایک لقمہ رکھ کر اس کے اوپر پدم کی ایک چھوٹی ٹہنی علم کی طرح گاڑھ دیتے۔ ایک برتن میں خشک میوہ یعنی توت، خوبانی، انگور وغیرہ ڈال دیتے اور خشک میوے کے ڈھیر پر اکیس عدد اخروٹ اور تین عدد انار رکھ دیتے۔ چرواہا ان سب کو اپنے ساتھ لے کر بچوں کے ساتھ بکر کوٹھے (ہرائے) کی طرف چل پڑتا۔ راستے میں جو کوئی بھی ملتا تو اسے ان اشیاء میں سے کچھ نہ کچھ ضرور دیتا اور اس طرح بالآخر بکر کوٹھے کے دروازے پر پہنچ جاتا۔ بھیڑوں اور بکریوں کے سانڈوں کے سینگوں پر مکھن ملتا اور ایک یا دو اخروٹ ان کے سینگوں سے ٹکرا کر توڑ دیتا۔ اس کے بعد اسے حاضرین میں تقسیم کیا جاتا۔ آٹے کے بنے ہوئے پتلے کو چرواہا خود کھاتا۔ اس رسم کی ادائیگی سے پہلے بکر کوٹھے میں پدم کے پتوں کی دھونی دی

جاتی۔ یہ رسم ''کروئی برائے'' کے نام سے موسوم تھی۔

بڑھئی:

ماضی میں تعمیر مکان اور دیگر زرعی آلات وغیرہ بنانے کے لئے لوگ اپنی ضروریات خود پوری کرتے تھے۔ اسطرح رفتہ رفتہ ایک مخصوص طبقہ وجود میں آیا جو آلات کشاورزی، لکڑی کے برتن اور چوکھاٹ، دروازے وغیرہ بناتا۔ شنا میں ایک کہاوت ہے کہ ''استاد سے کشولیر کھای'' یعنی لکڑی کے برتن بنانے والا کاریگر خود ٹوٹے اور ناقابل استعمال برتن میں روٹی کھائے، اردو کا مقولہ ''چراغ تلے اندھیرا'' کے مفہوم کا حامل ہے۔ ان کو نقد یا جنس کی صورت میں مقررہ معاوضہ دیا جاتا تھا۔ بڑھئی کا کام صرف ایک نسل کے لوگوں نے نہیں کیا بلکہ ہر نسل کے لوگوں میں اس کے کاریگر موجود تھے۔ جب سے ان علاقوں کے کشمیر کے ساتھ رابطے استوار ہوئے اس کے بعد کشمیر سے نامور ہنرمند یہاں آئے اور فنِ تعمیر کے ساتھ ساتھ دیگر فنون کو بھی بڑی ترقی ملی۔ ان علاقوں میں موجود پرانی اور تاریخی عمارتوں، راجوں کے محلات، مساجد، امام بارگاہوں اور جماعت خانوں پر کندہ لکڑی کے فن پارے ان نامور ہنرمندوں کے فنِ تعمیر کے عظیم شاہکار ہیں۔ ان علاقوں میں زیادہ تر فنون کشمیر سے آئے۔ البتہ لکڑی کے کام کا پیشہ یہاں پہلے سے موجود تھا۔ جنوب سے آنے والے جو پنجاب کے دوآبے میں رہتے تھے ان علاقوں میں کچھ نہ کچھ فن لے کر آئے۔

ماضی میں مکانوں کے چھتوں اور دروازوں کے علاوہ ضروریاتِ زندگی کے بیشتر ظروف مقامی طور پر لکڑی کے بنائے جاتے تھے۔ جن میں لکڑی کے بڑے بڑے تھال، پیالے، ڈونگے، غلہ رکھنے کے بڑے بڑے ٹرنک، لسی کے برتن (زگہ) چمچے، لکڑی کے سلیپر نما پاپوش، صندوق اور زرعی اوزار وغیرہ شامل ہیں۔

نائی (ٹھکر):

پرانے وقتوں میں یہاں پر مردوں میں بال رکھنے کا رواج کم تھا۔ مرد جوانی میں اپنا سر منڈائے رکھتے لیکن سر کے نیچے چاروں طرف بالوں کو رہنے دیتے جو بڑے ہو کر جھالر کی شکل اختیار کرتے۔ بلتیوں نے بھی یہ فیشن دردوں سے لے رکھا ہے۔ کھاتے پیتے گھروں کے نوجوان سروں کو صرف درمیان سے تقریباً دو انچ تک شیو کرتے۔ جو لڑکے یا مرد اپنے سر کے بالوں کو بڑھا کر گھنگریالے نہیں بنا سکتے وہ ان کی مینڈیاں کر لیتے تھے جو گردن اور کانوں پر چاروں طرف پھیلی ہوتیں۔ ادھیڑ عمر میں سارے سر کی شیو کر لیتے۔ مرد ایک دوسرے کے بال از خود ٹنڈ کرتے تھے۔ جبکہ تقریباً تمام لوگ داڑھی رکھتے تھے لیکن ہزارہ جات کی جانب سے نائی برادری کے لوگوں کی ان علاقوں میں آمد سے یہاں کے رسم و رواج بھی متاثر ہوئے۔ لوگ نت نئے فیشن کے بال رکھنے لگے اور داڑھی کاٹنے کا رجحان بھی رفتہ رفتہ بڑھ گیا۔ البتہ ختنہ اور بچوں کے بال بنانے کے لئے ماضی میں ہر علاقے میں کچھ مقامی ماہرین بھی ہوتے تھے جو آج کل ناپید ہیں۔ جبکہ غیر مقامی حجام جگہ جگہ ملتے ہیں۔ پچھلے وقتوں میں ان علاقوں میں نومولود بچہ یا بچی کے ابتدائی بال کاٹنے کے موقع پر رنگارنگ تقریب کا اہتمام کیا جاتا تھا۔ رشتہ داروں کو مدعو کیا جاتا، طرح طرح کی چیزوں سے ان کی خاطر تواضع کی جاتی اور ان مواقع پر ناچ گانے کی محفلیں بھی ہوتیں۔ لیکن آج کل یہ رسم باقی نہیں رہی۔

جولاہے (بیوں حے):

پرانے وقتوں میں جولاہے حسبِ ضرورت مال مویشیوں سے حاصل ہونے والے اون (پشں) اور بالوں سے طرح طرح کی چیزیں بناتے تھے۔ بھیڑ سے حاصل ہونے والے اون کو کات کر جولاہے پٹو بناتے۔ اون کھڈیوں پر تیار کیا جاتا اور اس سے درزی مقامی روایتی پوشاک مثلاً شکہ، ٹوپی، کوٹ وغیرہ بناتے جبکہ بوڑھی دادیاں اون کو ایک صاف جگہ پر پھیلا دیتیں اور اس پر چھڑیوں کی اس وقت تک بوچھاڑ کرتیں جب تک اون استعمال کے قابل نہ ہو۔ جب اون تیار ہوتی تو ہنرمند عورتیں اس سے دھاگہ تیار کر کے بنیان، جراب، دستانے، ناڑے، روایتی ٹوپیاں، گلوبند وغیرہ بناتیں۔ اون کی بنائی اور کاتنے کا ہنر شین، یشکن دونوں قبیلے کے لوگ جانتے تھے۔ داریل چلاس میں اون سے تیار ہونے والی چُنری (حنری) بہت مشہور ہے۔ ڈوم پیشہ لوگ بھی جولاہے کا کام کیا کرتے تھے۔ مقامی طور پر تیار ہونے والے پٹو کی مانگ اب بھی بہت ہے۔ بالخصوص استور کا پٹو جسے ''چشمِ بلبل'' کہتے ہیں، بہت ہی مشہور ہے۔ ایک اور نفیس پٹی ''زیبا کی'' بھی مشہور ہے۔ پٹو کے کوٹ کو مقامی لوگ ''پسلو کوٹ'' کہتے ہیں۔ اب یہ صنعت دم توڑ چکی ہے۔ ماضی میں جنگلی جانوروں کے چمڑے کو بھی لباس کے طور پر استعمال میں لایا جاتا تھا۔

ٹوکری سازی:

ماضی میں بیشتر مرد حضرات بید کی لچکدار چھڑیوں سے طرح طرح کے چھوٹے بڑے ٹوکرے اور ٹوکریاں بنا کر فروخت کرتے تھے۔ بڑے دو ٹوکرے، گدھے کی ایک طرف ایک اور دوسری طرف ایک متوازن رکھ کر اس پر زیادہ تر جانوروں کی کھاد وغیرہ ڈھولائی کر کے کھیتوں تک لے جاتے جبکہ چھوٹے چھوٹے ٹوکرے سبزی اور فروٹ لے جانے کے کام آتے تھے۔ ان بڑے ٹوکروں کو ''کرئیے'' اور ''ڈوکوٹو'' چھوٹوں کو ''تھلیو'' اور ''تُنہ'' کہتے ہیں۔ جبکہ چاول کا خوشہ الگ کرنے کے بعد باقی ماندہ تیلیوں سے چٹائی نما بچھونا جسے مقامی لوگ ''چھستن''

کہتے ہیں، بنائے جاتے تھے۔ جسکی موٹائی ایک انچ سے بھی زیادہ ہوتی تھی۔ زیادہ تر کشمیری لوگ چھستن سازی کا ہنر جانتے تھے۔

ٹوکری بنانے کے لئے گندم کے خوشے الگ کر کے لمبی لمبی تیلیوں کو کافی دیر تک پانی میں رہنے دیا جاتا۔ پھر ان سے عورتیں طرح طرح کے ٹوکرے بناتیں جو عموماً روٹی اور سبزیاں رکھنے کے کام آتے۔

آسیابان (یونرَے والِہ):

دیگر خطوں کی طرح شمالی علاقہ جات کے ان مقامات پر جہاں شنا بولی جاتی ہے، ماضی میں آٹے کی پسائی کے لئے پن چکیاں موجود تھیں۔ پن چکیاں وجود میں آنے سے قبل لوگوں کو غلہ کوٹ کر آٹا بنانے میں کافی مشقت اٹھانی پڑتی تھی۔ شنا میں پن چکی کو ''یونز'' کہتے ہیں۔ آسیہ بان کو غلہ پسائی کا معاوضہ کم وبیش دو سیر آٹا فی من کے حساب سے دیا جاتا تھا۔ شنا میں پسائی کے اس معاوضے کو ''بوی'' کہتے ہیں۔ بعض مقامات پر مختلف برادریوں اور نسلی گروہوں کی اپنی اپنی پن چکیاں ہیں اور تقریباً ہر نسل کے لوگوں میں آسیہ بان موجود ہیں۔ البتہ ماضی میں گلگت خاص اور داریل میں آسیا بان بیشتر کمین برادری سے تعلق رکھتے تھے۔ اب پن چکیاں شہری علاقوں سے ناپید ہوگئی ہیں۔ جبکہ دور دراز کے دیہی علاقوں میں کہیں کہیں یہ سلسلہ اب بھی جاری ہے۔ شنا میں ایک کہاوت ہے کہ ''سیچ یونز پھر یجونک'' یعنی سر پر چکی کا گھومنا، بہت تکلیف میں ہونے کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ لوگ پسائی کے لئے اناج گدھے کے ذریعے چکی تک لاتے اور لے جاتے۔ گدھوں کی بیوقوفی یا اپنے فرائض سے کس قدر لگاؤ ہے اس کا اندازہ آپ شنا کی اس کہاوت سے بخوبی لگا سکتے ہیں کہ ''**رکنی ڈاکج کھا نجی آلت یوں ری دارج بجی**'' جس کے معنی ہیں کہ گدھے کی پیٹھ پر خارش آئے تو وہ چکی کے دروازے پر جائے یعنی اسے بوجھ کی طلب وہاں تک لے جاتی ہے۔ اسی طرح کی ایک اور کہاوت بھی مشہور ہے کہ ''**رکن سے آنگ تھے اکوٹ بار اٹی**'' یعنی گدھا چلّا کر اپنے لئے بوجھ کا سامان پیدا کرے۔ شاید اسی سبب سے گدھے اپنے سر پر بے وقوفی کا تاج اب تک سجائے بیٹھے ہیں۔

موچی (شٹوء):

شنا بولنے والے ہر قبیلے میں (شٹوء) کے نام سے موچی کا کام ہمیشہ موجود رہا ہے۔ کیونکہ ماضی میں یہ پیشہ کسی خاص قبیلے سے موسوم نہیں تھا۔ یہ چمڑے کا کام کرتا تھا۔ کوریئے، تھوٹئے، گھوڑے کے زین، چابک، لگام، چمڑے کے حربی اور زرعی اجناس، لسی بنانے کے لئے چمڑے کے ''تھرنگ ایں'' وغیرہ ''شٹوء'' بناتا تھا۔ یہاں کے روایتی موچی چمڑے اور لکڑی سے پاپوش بھی بناتے تھے۔ لمبے اور پہاڑی سفر کے دوران پاؤں ڈھانپنے کے لئے بطور پاپوش بکری یا کیل (آئی بیکس) کی کھال مخصوص روایتی طریقے سے نرم کرتے تھے اور اس سے پاؤں تقریباً ٹخنوں سے کچھ اوپر تک ڈھانپ لیتے تھے۔ اس پازیب کو اس وقت کے لوگ ''تھوٹیے'' کہتے تھے۔ جسے عام لوگ استعمال کرتے تھے۔ جبکہ خاص افراد ''کوریئے'' پہنتے تھے۔ کوریئے آرائش اور زیبائش کے ساتھ بنائے جاتے اور ان سے پاؤں گھٹنوں تک ڈھانپ لئے جاتے۔ زیادہ تر شین برادری کے لوگوں میں ''تھوٹیے'' اور یشکن برادری کے لوگوں میں 'کوریئے'' بنانے اور استعمال کرنے کا رواج تھا۔ اب یہ کام روبہ زوال ہے کیونکہ اب لوگ بوٹ، چپل اور قسم قسم کے بوٹ پہنتے ہیں۔

زرگر:

ماضی میں یہاں زیادہ تر چاندی کے زیورات بنتے تھے۔ چاندی کے زیورات بنانے والے زرگر کہلاتے۔ شین، یشکن میں زرگر نہیں تھے۔ زرگری کا پیشہ کشمیر سے آنے والے اپنے ساتھ لائے۔ پرانے زمانے میں بدخشاں اور سوات سے زیورات آتے تھے۔ آج کل چاندی کے زیورات بنانے والے زرگر، سونے کا کام بھی کرتے ہیں۔ جنہیں مقامی لوگ زرگر ہی کے نام سے جانتے ہیں۔ پچھلے وقتوں میں شادی بیاہ کے مواقع پر امیر اور صاحبِ حیثیت لوگ ہی چاندی کے زیورات بناتے تھے۔ آجکل چاندی کے زیورات کا رواج صرف غریبوں تک محدود ہے۔ جبکہ امیر لوگ سونے کے زیورات بنواتے ہیں۔ یوں کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ عصرِ حاضر میں چاندی کا کاروبار زوال پذیر ہے اور سونے کے کاروبار کا بازار گرم ہے۔

درزی اور کشیدہ کار:

کپڑے کی سلائی کے لئے ماضی میں کوئی خاص پیشہ ور درزی نہیں ہوتا تھا۔ ہر گھر میں لوگ اپنا روایتی سادہ لباس جو کہ چغہ یا اون پر مشتمل ہوتا، خود بناتے تھے۔ البتہ راجوں اور مہاراجوں کے خاندان کی پوشاک کی سلائی کے لئے خصوصی درزی مقرر ہوتے تھے۔ عہدِ حاضر میں پیشہ ور درزیوں کی بہتات ہے اور جدید ترین سلائی مشینوں کی آمد سے اس صنعت نے بڑی ترقی کی ہے۔

پرانے زمانے میں کشیدہ کاری کے ہنر کو بڑی اہمیت حاصل تھی۔ یہاں کے دستکار نہایت ماہر، چابک دست اور جمالیاتی ذوق سے معمور ہوتے تھے۔ دستکاریوں کا کچھ کام عورتیں کرتی تھیں اور کچھ کام مرد۔ یہاں کا چغہ اور چُنری (حنری) پر جس نفاست سے عورتیں ریشمی دھاگے سے کشیدہ کاری کرتیں اسکی مثال ملنی مشکل ہے۔ قمیضوں، دوپٹوں، اوڑھنیوں، گدوں، میز پوش

وغیرہ پر کشیدہ کاری کے کام میں یہاں کی عورتوں کو کمال حاصل تھا۔ مردوں کے لئے بنیان، ''پھتن'' (ہینڈ بیگ) گلوبند، دستانے، جراب وغیرہ اونی دھاگے سے بناتے وقت عورتیں ان پر بھی کشیدہ کاری کے ہنر کے جوہر دکھاتیں۔ جوں جوں ان علاقوں کے کشمیر سے مراسم بڑھے، دستکاری کے شعبہ نے اور ترقی کی۔ لحاف اور رضائی بھی ہر نسل کی عورتیں خود بناتی تھیں۔

اخوند:

گلگت میں بعض قبائل ایسے ہیں جنہیں ''اخوند'' کہتے ہیں۔ اخوند اصل میں کوئی گوت نہیں بلکہ ایک معزز خطاب ہے جو دینی تعلیم یافتہ مسلمانوں کے لئے وقف ہے۔ لیکن کشمیر میں اس نام کے ہندو خاندان بھی پائے جاتے ہیں۔ اخوند ملاگری کے فرائض انجام دیتے ہیں۔ 1916ء کی بندوبست دوم میں اخوندوں کے دو خاندانوں کا ذکر آیا ہے۔ یہ دونوں خاندان کشمیر سے گلگت آئے تھے۔ یہاں اخوند، مولوی یا ملا ہر قومیت میں ملتے ہیں۔ اخوند طبقہ لوگوں کو درس و تدریس کا فریضہ بھی سرانجام دیتا۔ دَم، دُعا اور تعویذ وغیرہ کے لئے بھی ان کی خدمات حاصل کی جاتیں۔ ان کی خدمات کے صلے میں لوگ انہیں نقدی یا اجناس کی شکل میں معقول معاوضہ دے دیتے۔ معاشرے میں ان کا اب بھی بے حد احترام ہے۔ گوہر آباد چلاس میں مولوی راجی الرحمت نظر مرحوم اور ملا حبیب کا گھرانہ ''اخوندے'' کہلاتے ہیں۔ محلّہ کشروٹ میں مولوی عزیز کا گھرانہ، اخوند مہربان کھٹی محلّہ، اخوند محمود ڈاکپورہ، یوسف زوار اور اخوند محمد علی گلگت، پل روڈ گلگت کے قریب کوٹ محلّہ کے لوگ اور خزانہ روڈ گلگت کے قریب حسین اکبر مرحوم وغیرہ کے گھرانے بھی اخوند کہلاتے ہیں۔ چلاس اور گوہر آباد میں مولوی حضرات کو اب بھی ''اخوند'' کہتے ہیں۔ معاشرے میں ان کا بڑا احترام کیا جاتا ہے۔

تاجر:

ماضی میں ان علاقوں سے کوئی چیز برآمد نہیں ہوتی تھی۔ کیونکہ یہاں کی پیداوار مقامی لوگوں کی ضروریات کے لئے ہی ناکافی ہوتی تھی۔ کسی زمانے میں جب یارقند اور کاشغر کے راستے شمال کی طرف سے کھلے تھے اور مشرقی جانب کشمیر سے تعلقات مستحکم تھے تو یہاں پر ان ممالک سے مال آتا تھا اور پاکستان کے کاروباری لوگ یہاں سے مال خریدتے تھے۔ بعض روایات کے مطابق ان علاقوں میں اونی، فر، سوتی پارچہ جات اور چائے کی تجارت خاصی مقدار میں ہوتی تھی۔ ان تجارتی قافلوں میں زیادہ تر یارقند کے لوگ شامل ہوتے تھے۔ سترھویں صدی عیسوی میں کشمیر میں شال کی صنعت کی ترویج اس تجارت میں اضافے کا باعث بنی جس کی اونی ضروریات، تبتی بالائی علاقوں اور وسط ایشیاء کی بکریوں کی کھال کی مانگ کی وجہ سے تھی۔ حتی کہ مؤرخین کا کہنا ہے کہ 1940ء تک لیہ ایک اہم تجارتی مرکز تھا۔ جہاں مختلف علاقوں کے تاجروں کا اجتماع ہوتا تھا۔ زیادہ تر تجارتی قافلے یارقند یا ختن اور کشمیر کی جانب سے آتے تھے۔ قالین، ریشمی کپڑے، نمدے، سوتی کپڑا، چینی کے برتن وغیرہ کا کاروبار بھی ہوتا تھا۔ برصغیر پاک و ہند کی تقسیم سے پہلے یہاں پر ڈوگرہ، سکھ اور کشمیری لوگ تجارت پیشہ تھے لیکن پاکستان بننے کے بعد ڈوگرہ اور سکھ تو نہیں رہے البتہ ان کی جگہ جنوب کی طرف سے آنے والے ہزارہ جات کے تاجروں نے لے لی، جن کے دیکھا دیکھی مقامی لوگ بھی تجارت کا کام کرنے لگے۔ شاہراہ قراقرم کی تعمیر کی وجہ سے یہاں کے لوگوں کی نہ صرف معاشی حالت تبدیل ہوئی ہے بلکہ طویل تعطل کے بعد ہمسایہ ملک چین سے تجارت کا قدیم کاروبار پھر سے شروع ہو چکا ہے اور مقامی لوگ اس کاروبار میں بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہے ہیں۔ اس کاروبار کی بدولت یہاں کے مقامی لوگوں کا معیار زندگی بہت بلند ہوا ہے۔ آج کل ان علاقوں سے آلو، چیری، سیب، خشک میوہ جات، سلاجیت، خام چمڑا، پٹو، جڑی بوٹیاں اور عمارتی لکڑی محدود پیمانے پر پاکستان کے مختلف علاقوں کو برآمد ہوتی ہیں۔

طلاکش (ریت سے سونا چھاننے والے سونیوال):

ماضی میں طلاکشی کا کام بڑے پیمانے پر ہوتا تھا۔ دریائے ہنزہ، نگر میں موضع دنیور تک اور نالہ بگروٹ میں گلیشئر سے لے کر دریائے گلگت کے مقام اتصال تک اور دریائے گلگت میں موضع دنیور سے لے کر اس کے اتصال دریائے سندھ تک اور دریائے سندھ میں کل حدود علاقہ گلگت کے اندر اور چلاس تک موسم سرما کے دوران طلاکشی کا کام جاری رہتا۔ ان علاقوں میں صرف دریا کے کنارے کی خاک دھونے کا دستور ہے۔ یہاں سے اچھی کوالٹی کا سونا حاصل ہوتا ہے۔ دریائے ہنزہ اور بگروٹ کے نالے سے حاصل کیا جانے والا سونا عمدہ کوالٹی کا ہوتا ہے۔ اس علاقے میں دھاتوں کی کانوں کے آثار بھی پائے جاتے ہیں۔ طلاکشی کا کام کرنے والے سونیوال (مروح) کہلاتے۔ یہ لوگ طلاکشی کا کام بطور پیشہ کرتے۔ کیونکہ ان دنوں سونے کا کاروبار عام تھا اور اسے اہم زرِ مبادلہ کی حیثیت حاصل تھی۔ مقامی لوگوں میں یہ طبقہ ''مروح'' کے نام سے جانا جاتا تھا۔ گرمی، سردی کی شدت کے باوجود سونیوال دریا کی خاک چھانتے پھرتے لیکن آمدنی ان کی محنت کے مقابلے میں بہت کم ہوتی۔ پھر بھی وہ اس پیشے سے وابستہ رہتے۔ کیونکہ ان کی آمدنی کا اور کوئی ذریعہ نہیں تھا۔ پرانے وقتوں میں سونیوالوں سے جو طلاکشی کا کام کرتے دس روپے فی کشتی ٹیکس وصول کیا جاتا تھا۔ آج کل طلاکشی کا کام نہ ہونے

کے برابر ہے۔ طلاکشی کے ساتھ ساتھ سونیوال لوگ جالوانی کا کام بھی کیا کرتے تھے۔ اس پیشے کو لوگ بابرکت پیشہ خیال نہیں کرتے تھے۔ اس حوالے سے ایک شنا مقولہ مشہور ہے۔ ''لیحہ مروع ،لیحہ دروع ''یعنی طلاکش اور شکاری کے پیشے غربت کا باعث بنتے ہیں۔

لکڑہارا (جُک سارو):

پرانے زمانے میں جب بھی لوگوں کو جلانے کی لکڑی کی ضرورت پڑتی تو چند جوان مل کر قریبی جنگل جاتے اور شام تک ایک بوجھ جلانے کی لکڑی اپنی پیٹھ پر لاد کر لے آتے۔ خصوصاً شادی بیاہ اور دیگر خوشی غمی کے مواقع پر محلے کے چند جوان گدھے لے کر جنگل جاتے اور ایک رات جنگل میں گزارنے کے بعد لکڑی لے آتے۔ گدھوں پر لاد کر جنگل سے ہیزم سوختنی لانے کا سلسلہ ایک عرصے تک جاری رہا۔ آج کل شہری علاقوں میں ٹریکٹر کے ذریعے ہیزم سوختنی لاتے ہیں جبکہ دیہی علاقوں میں گدھوں پر لانے کا سلسلہ بھی جاری ہے۔ کسی زمانے میں بیشتر محلّہ جات میں مخصوص لکڑہارے ہوتے تھے جو جنگل سے لکڑی لاکر ضرورت مندوں میں فروخت کیا کرتے تھے اور لکڑی کی خرید و فروخت ان کے گھروں میں ہی ہوتی تھی۔ لیکن بازاروں میں سنڈیکیٹ کے قیام کے بعد گھروں میں لکڑی کی خرید و فروخت کا سلسلہ ختم ہو چکا ہے اور لکڑہارے لکڑی سنڈیکیٹ میں ہی فروخت کیا کرتے ہیں۔

ڈوم:

سازندوں کو شنا زبان میں ڈوم کہا جاتا ہے۔ دیگر آریائی زبانوں میں بھی اس طائفہ کے لئے یہی لفظ رائج ہے۔ ہر قریہ و بستی میں یہ گروہ قدیم زمانے سے موجود ہے۔ پرانے وقتوں میں ہر محلے کا اپنا بینڈ ہوتا تھا۔ موسیقی کے آلات شہنائی (سرنئی)، ڈھول (ڈڈھنگ) اور دو چھوٹے ڈھولک (ڈھاملہ) پر مشتمل ہیں۔ ڈوم قدیم زمانے سے یکجا رہائش رکھتے ہیں۔ جہاں کہیں ان کی بستی ہے اسے ڈومیال کہا جاتا ہے۔ ماضی میں سماجی حوالے سے ان کا بہت پست مقام تھا۔ اب زمانے کی تبدیلی کے ساتھ ان کی نئی نسل پڑھائی لکھائی کی طرف بھی متوجہ ہوگئی ہے اور چند ایک سرکاری ملازمتوں سے بھی وابستہ ہوگئے ہیں۔ قدیم زمانے میں جنگ کے دوران لشکریوں کے ساتھ سازندے بھی ہوتے تھے۔ قلعہ یا کوئی بستی فتح کرنے کی صورت میں فاتحانہ دُھن بجاتے تھے۔ اس کے علاوہ شادی بیاہ اور پولو کے مقابلوں کے موقعہ پر ان کی موجودگی لازمی ہوتی ہے۔ انہیں معقول معاوضہ ملتا ہے۔ مقامی ملیشیا میں بھی انہیں بھرتی کیا جاتا ہے۔ علاقہ شنا کی میں لوہار طبقہ کو بھی ڈوم کہا جاتا ہے۔ لیکن ان کے لئے کہیں کہیں اکھر بھی کہا جاتا ہے۔ معاشرے کے لوگ ان لوگوں کو حقیر سمجھتے تھے اسلئے لوگوں کی توجہ اس پیشے کی طرف کم ہوتی گئی اور آج کل اس پیشے سے وابستہ افراد کی مقدار بہت قلیل ہے۔ اس انسانی طبقے سے لوگوں کی حقارت کا جو عالم ہے وہ اس شنا مقولے سے صاف ظاہر ہوتا ہے۔ ''ڈوم کمین سومو نہ گِن، کُوٹھ کلت بأن نہ تھہ ''یعنی جس طرح کلت (Buck Wheat) کے خراب بیج کاشت کرنے سے فصل کی امید نہیں کی جاسکتی اس طرح اس برادری کی دوستی کا بھی کوئی اعتبار نہیں کیا جاسکتا۔ حالانکہ ایسی کوئی بات نہیں۔ اس برادری میں بھی دوسری برادریوں کی طرح صاحب کردار لوگ موجود ہیں۔ قدیم رسم و رواج کے مطابق فاتح افواج کو بھی یہ اجازت نہیں تھی کہ وہ سازندوں (ڈوم) کو قتل یا گرفتار کریں یا ان کا مال لوٹیں۔



ڈوم روایتی ڈھول، نقارہ اور شہنائی بجاتے ہوئے

لوہار (اکھر):

لوہار پیشہ لوگوں کو ''شنا کی'' علاقہ میں جیسا کہ قبلاً ذکر آچکا ہے، اکھر کہا جاتا ہے۔ آہن گری یہاں کا قدیم پیشہ ہے۔ لیکن یہ فن یہاں ترقی یافتہ نہیں ہے۔ آلات کشاورزی اور گھریلو استعمال کی چند ایک اشیاء از قسم تیشہ، کلہاڑی، آتش گیر و آتش بل بناتے یا ان کی مرمت کرتے ہیں۔ پھپھسے کوئلے سے بھٹی دہکاتے ہیں اور لوہے کی اشیاء کوٹ بجا کر نئی شکل دیتے ہیں۔ ہتھیار سازی ان کے بس کی بات نہیں۔ البتہ قدیم زمانے میں تیر، تبر اور تلوار کی دھار تیز کرتے تھے۔ ان کے گزارے کے لئے فی گھر کچھ غلہ ان کے لئے مقرر تھا۔ جس کے عوض یہ لوگوں کے لئے چیزیں بناتے تھے۔ آج مذکورہ بالا جملہ اشیاء بازار میں دستیاب ہیں۔ علاوہ ازیں اس پیشے سے متعلقہ جدید اوزار کی عدم دستیابی اور اس پیشے سے منسلکہ لوگوں کی غربت کی بنا پر بھی یہ لوگ جدید تقاضوں کا ساتھ دینے سے قاصر رہے لہٰذا لوہار کا پیشہ بھی روبزوال ہے۔ پھر بھی دیہاتوں میں چند ایک لوگ اس پیشہ سے آج بھی وابستہ ہیں اور عہدِ رفتہ کی یاد دلاتے ہیں۔



لوہار کام کرتے ہوئے

جالوان (کشتی ھینے، نے):

ماضی میں جب روایتی کشتی ابھی متعارف نہیں ہوئی تھی تو اس وقت لوگ لکڑی کی بڑی بڑی گیلیوں پر بیٹھ کر دریا پار کیا کرتے تھے۔ اس کے بعد دریاؤں اور نالوں کو عبور کرنے کے لئے لٹھوں کے ٹھاٹھ بھی استعمال ہوتے رہے ہیں۔ بیلوں کے چمڑے سے تیار کردہ چار پانچ مشکیزوں کے اوپر لٹھوں کے ذریعے ایک قابلِ نشست جال سا بناتے تھے جو سائز میں تقریباً 8 x 6 فٹ یا اس سے بھی زیادہ ہوتا تھا۔ مسافر اسی جال پر بیٹھ کر دریا عبور کرتے تھے۔ اس ٹھاٹھ کو چلانے والوں کو مقامی زبان میں ''جالوان'' کہتے ہیں۔ بیلوں کے چمڑے کما کر بنائے جانے والے ان بڑے بڑے مشکیزوں کو مقامی زبان میں ''کھیکے'' کہتے ہیں۔ بعدازاں ''دٹ'' اور ''گل'' کے ذریعے دریا عبور کیے جانے لگے۔ ترقیاتی کاموں کی وجہ سے آج کل دریاؤں اور نالوں پر کہیں آر سی سی، کہیں لوہے اور کہیں لکڑی کے بے شمار پل بنے ہوئے ہیں۔ جس کی وجہ سے جالوان کے پیشے کی ضرورت باقی نہیں رہی اور اس پیشے سے وابستہ لوگ پس منظر میں چلے گئے۔ جالوانی کا کام زیادہ تر صونیوال (مروح) لوگ کیا کرتے تھے۔

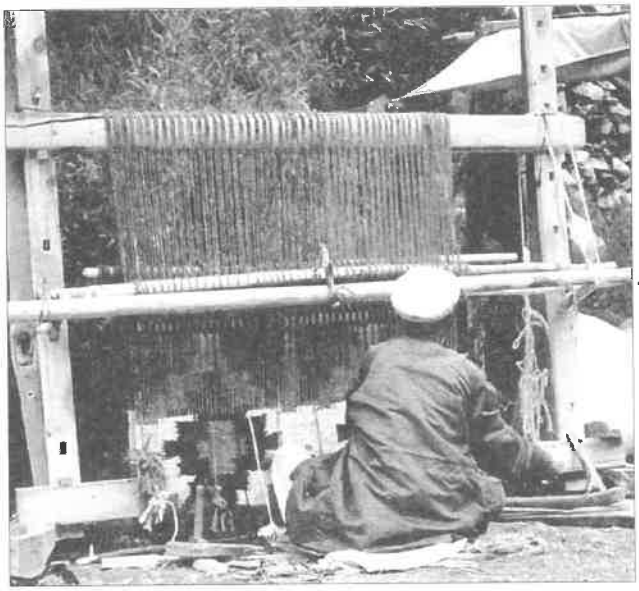
معمار:

ان علاقوں میں معمار کو مستری کہتے ہیں۔ پرانے زمانے میں یہاں تربیت یافتہ معمار نہیں تھے البتہ گاؤں کے کچھ لوگ حسبِ ضرورت تعمیراتی کام کیا کرتے تھے۔ عموماً ناتراشیدہ پتھروں کی اکہری دیوار بنانے کا رواج تھا۔ غیر تربیت یافتہ معمار انتہائی مہارت سے دو دو منزلہ عمارتیں کھڑی کرتے تھے اور ستونی مسقّف گھر بناتے تھے۔ لہٰذا دیواروں پر کم سے کم بوجھ پڑتا تھا۔ تاہم یہ اکہری دیواریں ہر کوئی نہیں بنا سکتا تھا۔ مخصوص لوگ یہ کام کرتے تھے۔ 1841ء کے دوران سکھ حملہ آوروں کے ساتھ ان علاقوں میں پیشہ ور لوگ بھی آئے۔ جس کے بعد اس صنعت نے ترقی کی۔ البتہ سولہویں صدی کے آخر اور سترھویں صدی کے شروع میں بدھ مت کے دور میں پتھروں پر انسانوں کی تصویریں بڑی مہارت سے بنائی جاتی تھیں لیکن وہ تادیر یہاں نہیں رہے۔ اسلئے اس پیشے سے وابستہ ماہرین کی ضرورت ان علاقوں میں ہمیشہ سے رہی ہے۔ جب سکھ حملہ آور یہاں آئے تو اپنی رہائش کے لئے بیرکیں بنائیں۔ جس کی بدولت ان علاقوں میں رندہ، تیشہ، آری وغیرہ یعنی سامان ''تس گہ چک'' متعارف ہوئے۔ غریب لوگ معماروں کے ساتھ قلی کا کام کیا کرتے تھے۔ عام طور پر ایک معمار کے دو قلی معاون ہوتے۔ قلی کی نسبت معمار کی یومیہ آمدنی تقریباً تین گنا زیادہ ہوتی ہے۔ بعض روایات کے مطابق قبل مسیح

اشوک کنشک کے بدھ مت دور میں ہی ماہرین یہاں آئے تھے جنہوں نے چٹانوں پر نہ صرف شبیہیں تراشیں بلکہ پتھروں پر لکھائی کا عمل بھی جاری کیا اور بڑے بڑے پتھروں کے ستون تراش کر اپنے ہنر کے جوہر دکھائے۔

شرمہ باف (شرمہ بیوں حوں):

پرانے زمانے میں ان علاقوں کے لوگ قالین دری اور کارپٹ کی جگہ ''شرمہ'' استعمال کرتے تھے۔ شرمہ دراصل ایک بچھونا ہوتا جو موسم سرما میں ان علاقوں کی سخت ترین سردی کا مقابلہ کرتا۔ اون سے لحاف اور نمدے بھی بنائے جاتے۔ معرش آرائشی چیزوں میں شرمے بنے جاتے تھے جو بکرا، بکری اور یاک کے بالوں سے تیار کئے جاتے تھے۔ انہی بالوں سے رسیاں بھی بنائی جاتی تھیں۔ یہ طبقہ ''شرمہ بیوں حے'' کہلاتے تھے۔ شرمہ کی بنائی کے لئے مخصوص اوزار ہوتے تھے اور یہ بڑا محنت طلب کام تھا اور لوگوں کی محنت کے مقابلے میں معاوضہ بہت کم ملتا تھا۔ شاہراہِ ریشم یا قراقرم ہائی وے کی تعمیر کے بعد اس علاقے کے مقامی پیشے بھی بری طرح متاثر ہوئے۔ لوگوں کو سستے داموں پاکستان سے قالین اور دریاں دستیاب ہوئیں۔ جس کی وجہ سے یہ محنت طلب پیشہ پس منظر میں چلا گیا۔



روایتی کھڈی پر شرمابافی

مارتولی وجبلی (پتھر توڑنے والے):

مارتول سے پتھر توڑنے والے کو ''مارتولی'' اور اس کے ساتھ لوہے کی تقریباً چار فٹ لمبی سلاخ لئے جو معاون ہوتا ہے اسے ''جبلی'' کہتے ہیں۔ مارتولی بڑا ہنرمند کاریگر ہوتا ہے جبکہ جبلی اس کے ساتھ بطور قلی کام کرتا ہے۔ لیکن عام قلیوں کی نسبت وہ بھی کافی ہنرمند ہوتا ہے۔ مارتولی اور جبلی کا ایک دوسرے کے ساتھ چولی دامن کا ساتھ ہے۔ جب کبھی مکان کی بنیاد وغیرہ کیلئے پتھر کی ضرورت پڑتی تو لوگ ان کی خدمات حاصل کرتے۔ ماضی میں تقریباً ہر بڑے گاؤں میں یہ کاریگر دستیاب ہوتے تھے۔ مارتولی کی یومیہ شرح آمدنی معمار کی نسبت زیادہ ہوتی جبکہ جبلی عام قلی سے زیادہ ریٹ حاصل کرتا۔

مارتولی اور جبلی کا کام بہت محنت طلب اور خطرناک کام ہوتا ہے جو عموماً پہاڑوں کی ڈھلوانوں اور اسی قسم کی دیگر جگہوں پر کرتے ہیں جہاں پتھر آسانی سے دستیاب ہو۔



مارتولی وجبلی کام کرتے ہوئے

روایتی تعمیر و آرائش و رہن سہن

لوگوں کا رہن سہن:

عہد عتیق میں کرۂ ارض پر انسانی آبادی بہت کم تھی۔ عام طور پر لوگ جنگلوں اور پہاڑوں کے غاروں میں رہتے تھے۔ ان کی زندگی بہت سادہ اور ضرورتیں بہت تھوڑی تھیں۔ اناج حاصل کرنے کے طور طریقوں سے واقف نہ تھے اس لئے وہ قدرتی پیداوار اور پھلوں پر گزارہ کرتے تھے۔ ان کا عام مشغلہ شکار کرنا تھا۔ جنگلی جانوروں کا شکار کر کے ان کا گوشت کھاتے تھے اور ان کی ہڈیوں سے ہتھیار کا کام لیتے تھے جبکہ ان کے کھال سے تن ڈھانپتے تھے۔ لوگوں کی معاشرت بہت سادہ تھی بلکہ یوں کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا کہ لوگ وحشیانہ طرز زندگی بسر کرتے تھے۔ ان پر ہر وقت جنگلی جانوروں کا خوف سوار رہتا تھا۔ گرمی، سردی، برسات، آندھی، طوفان اور

بیماریاں بھی ان کی دشمن تھیں۔ ان سب کا حل یہ تھا کہ انسان مل جل کر رہیں اور ایک دوسرے کے کام میں ہاتھ بٹائیں۔ انہی وجوہات کے پیش نظر قدیم انسانوں نے بستیاں آباد کرنی شروع کیں، مکان بنائے اور غلّہ حاصل کرنے کے لئے کھیتی باڑی کی اور اسی طرح انسان کی تمدنی زندگی کا آغاز ہوا۔ بھیڑوں کی اون اور جانوروں کے چمڑوں سے لباس تیار کرتے۔ گلگت اور شمالی علاقوں کے ان اضلاع میں جہاں شنا بولنے والے قبائل آباد ہیں وہاں ایک مکان میں مشترکہ رہن سہن کا نظام رائج ہے۔ گھر کا سب سے بزرگ آدمی گھر کا حاکم ہوتا۔ اگر دادا زندہ نہ ہو تو باپ اور باپ زندہ نہ ہو تو بڑا بھائی کنبے کی سرپرستی کرتا ہے۔ اسی طرح دادی گھر کی مالکن ہوتی ہے۔ اگر دادی زندہ نہ ہو تو ماں اور ماں نہ ہو تو بڑے بھائی کی بیگم مالکن کی خدمات سرانجام دیتی ہے۔ گھر میں موجود مرد حضرات حسبِ استطاعت جو کمائی کرتے ہیں وہ مہینے کے آخر میں سرپرست کے ہاتھ میں دیتے ہیں۔ ماہانہ اخراجات سے جو رقم بچتی ہے اسے گھر کا سرپرست غم وخوشی کے دنوں کے لئے محفوظ کرتا ہے۔ شادی بیاہ اور غمی کے اخراجات کا ذمہ دار بھی گھر کا سرپرست ہوتا ہے۔ سرپرست کے احکامات سے روگردانی معیوب سمجھا جاتا ہے۔ والدین اور بزرگوں کا احترام یہاں کے لوگوں کے دلوں میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔ ایک شنا کہاوت ہے کہ ''مپھیر تک تو نیر گہ دے چھورا'' یعنی بوڑھے بابا کو ٹوکری میں بھی رکھنا پڑے تو رکھو تا کہ اس کے انمول مشورے تمہارے کام آسکیں۔ ماضی کے ظالمانہ کاربیگار کے نظام نے بھی یہاں کے لوگوں کو مشترکہ رہن سہن کا نظام اپنانے کے لئے راہ ہموار کیا۔ کیونکہ کاربیگار فی چولہا (فی کنبہ) کے حساب سے مقرر تھا۔ کنبہ کے افراد جتنے چولہوں میں بٹتے، فی چولہے کے حساب سے بیگار کا بوجھ اٹھانا پڑتا۔ اس لئے عافیت اسی میں سمجھی جاتی کہ کنبہ مشترکہ ہی رہے۔ آزادی کے بعد ماضی کے ظالمانہ نظام سے چھٹکارا تو ملا لیکن مشترکہ رہن سہن کا نظام بری طرح متاثر ہوا۔ ضلع دیامر بالخصوص چلاس اور داریل/تانگیر میں روایتی دشمنیوں کی وجہ سے مشترکہ رہن سہن کا نظام لوگوں کی ضرورت بن گیا۔ اسلئے ان علاقوں میں یہ نظام آج بھی ماضی کی طرح قائم ہے۔ والدین کی زندگی میں بیٹوں کا علیٰحدہ سکونت اختیار کرنا اگرچہ آج بھی ان علاقوں میں معیوب سمجھا جاتا ہے لیکن آہستہ آہستہ یہ نظام دم توڑتا نظر آرہا ہے۔ مرد حضرات گھر کی ضروریات مہیا کرنے کے ذمہ دار ہوتے ہیں جبکہ عورتیں غلہ صاف کرنا، دودھ دوہنا، کھانا پکانا، کپڑے دھونا اور گھر کی صفائی وغیرہ کے کام سرانجام دیتی ہیں۔ ضرورت سے زیادہ دودھ ہو تو گھر کی مالکن اسے ہمسایہ یا کسی دوسرے گھرانے کو مفت یا معاوضہ لے کر دے سکتی ہے۔ گھر کی مالکن دادی ماں یا اماں جان ہوتی ہے۔ جو اندرون خانہ سیاہ وسفید کی مالکن ہوتی ہے۔ اناج خانہ اور دیگر ضروری ساز وسامان اور زیورات کی کنجیاں اسی کے ہاتھ میں ہوتی ہیں۔ بہو، بیٹیاں ادھر ادھر جانے کے لئے اسی کے حکم کی تابع ہوتی ہیں۔ مالکن گھر کی چابیاں سینے کے بائیں جانب کُرتے پر میڈیم سائز پرس چاندی کے خوبصورت کانٹے پر ٹانک دیتی، جسے مقامی زبان میں ''پھتن'' کہتے۔ سینے پر چابیوں کا گچھہ دیکھ کر نو وارد کو اندازہ لگانا مشکل نہیں ہوتا کہ گھر کی مالکن یہی ہے۔ یہاں کے لوگ کھیتی باڑی کے کام میں ایک دوسرے کا ہاتھ بٹاتے اور آپس میں ان کا حسن سلوک مثالی ہوتا۔ جھوٹ، فریب اور چوری کا نام ونشان بھی نہیں تھا۔ جوں جوں آبادی بڑھتی گئی جھگڑے پیدا ہوتے گئے۔ ان لڑائی جھگڑوں کو نپٹانے کے لئے کسی بڑے سردار کی تقرری کی ضرورت محسوس کی گئی۔ مورث اعلیٰ کی نسل میں سے براہ راست ایک بزرگ آدمی یا قوم میں سے ایک برگزیدہ شخص کو ''ترنگفہ'' کا عہدہ پیش کیا جاتا۔ رفتہ رفتہ جب زمانے نے ترقی کی تو گاؤں گاؤں کے جھگڑے ہونے شروع ہوئے جس کی وجہ سے ریاست کی بنیاد پڑی۔ ایسی صورت میں تمام ریاستوں کے ترنگفے جمع ہو کر اتفاق رائے سے اپنا ایک رہنما منتخب کرتے۔ اس سب سے بڑے ترنگفہ کو ''چو'' کا لقب دیا جاتا جو راجہ کے معنوں میں استعمال ہوتا۔ بلتی زبان میں آج بھی ''کاچو'' کے معنی راجہ بھائی کے لئے جاتے ہیں۔ چلاس اور داریل تانگیر میں لوگوں کے جھگڑوں کے تصفیہ کے لئے روایتی جرگہ ''سگاس'' مقرر ہوتی۔ اس سگاس کے دروازے سب کے لئے کھلے ہوتے اور ضرورت پڑنے پر ہر کوئی بحث میں حصہ لے سکتا۔ ہر گاؤں کی سگاس ایک ''جسٹیر و'' کو مرکزی سگاس کے لئے نامزد کرتی۔ دوران بحث جب سب بولنے لگتے تو ایک زوردار سیٹی بجتی جس کے بعد نامزد ''جسٹیر و'' ہی بات کر سکتا۔

پرانے وقتوں میں تین پتھر تکونی انداز میں رکھ کر آتش دان بنایا جاتا۔ پتھر کی پتلی پتلی سلوں کو آتش دان پر رکھ کر اس کے نیچے آگ جلا کر حسبِ ضرورت روٹی بنائی جاتی۔ دیا سلائی کا کام چقماق سے لیا جاتا۔ دیا سلائی کی آمد سے قبل ان علاقوں میں ایک دوسرے کے گھر سے آگ مانگ کر چولہا جلایا جاتا۔ اگر ہمسایوں کے تعلقات ٹھیک نہ ہوں تو جلانے کے لئے آگ دینے سے بھی گریز کرتے۔ اسی طرح کاروانِ حیات بڑی مشکلوں سے رواں دواں رہتا۔ روشنی کے لئے torch wood جسے مقامی زبان میں ''لئی'' کہتے ہیں، کے چھوٹے چھوٹے نوکدار ٹکڑے بنا کر ایک پتھر پر رکھ کر جلائے جاتے۔ ناک کے اندر اس کے دھوئیں کی کئی تہیں جمتیں۔ جس کا اندازہ صبح ناک صاف کرتے وقت ہوتا۔ بعد میں ایک بوتل نما برتن میں چربی ڈال کر اس میں کاٹن کی بتی کا سرا باہر نکالتے اور بیرونی سرے پر آگ روشن کرتے۔ جب مٹی کا تیل آیا تو روشنی کے لئے اسے چربی کی جگہ استعمال کیا جانے لگا۔ روشنی کے لئے مٹی کا دیا بھی جلایا جاتا تھا۔ جسے مقامی زبان میں ''اسکمبوہ'' کہتے تھے۔ اس میں خوبانی کی گری اور اخروٹ کی گری کا تیل، حیوانی

چربی اور بعض اوقات گھی بھی استعمال ہوتا رہا ہے۔ کبھی کبھار رات کو روشنی کے اسباب مہیا نہیں ہوتے تو اندھیرا چھانے سے قبل ہی سرِ شام کھانا کھا کر سو جاتے جبکہ گرمیوں میں مکان کی چھت پر چاند کی روشنی میں کھانا کھایا جاتا۔ بید کی لکڑی سے ضرورت کے کئی برتن بنائے جاتے مثلاً تھالیاں اور چمچے جنہیں مقامی طور پر گڈُر، پتی، کھپّیں اور ٹرُو کے نام دئے جاتے۔ اب یہ برتن نایاب ہوتے جا رہے ہیں اور ہمارے بچے ان اشیاء سے بالکل نابلد ہیں۔ شہتوت کی لکڑی سے اہرن، ہل اور دیگر زرعی اوزار بھی بنائے جاتے۔

ان علاقوں میں اشیاء کے بدلے اشیاء حاصل کرنے کا رواج قائم تھا۔ بچے جب کبھی والدین سے پیسے طلب کرتے تو صاحبِ ثروت لوگ آنے دو آنے کا سکہ دے دیتے جبکہ رقم کی عدم موجودگی کی صورت میں تھوڑا گندم یا مکئی کسی تھیلے میں ڈال کر دے دیتے۔ بچے اناج دکاندار کو دے کر اس کے بدلے مٹھائیاں یا ضرورت کی دوسری اشیاء حاصل کرتے۔ اگر والدین پیسے یا اناج نہیں دیتے تو بچے گھر سے اناج چوری کر کے اپنی جیب خرچ پوری کرتے۔ گھروں میں مرغیاں پالنے کا رواج بھی عام تھا۔ بالخصوص خواتین مرغی کے انڈے دے کر بازار سے اپنی ضرورت کی اشیاء حاصل کرتیں۔ غریب ضرورت مند لوگ زمینداروں سے اس شرط پر ایک من اناج حاصل کرتے کہ نئی فصل پر ایک من 20 کلو یا دو من لوٹا دینگے۔ اسی طرح بعض دفعہ گھی دینے کا وعدہ کر کے اناج حاصل کرتے۔ گویا سود کا کاروبار عام تھا۔ ادھار دینے والے لوگ بھی اصل زر کے ساتھ سود لیا کرتے تھے۔ عیدین کے مواقع پر کپڑے کی قیمت کے برابر دکاندار اناج بھی قبول کرتے تھے۔ ان علاقوں میں سود ''سلم'' کے نام سے موسوم ہے۔ اگر ادھار لینے والا وقتِ مقررہ پر رقم نہیں دیتا تو مالک مزید میعاد کے ساتھ سود کی رقم بھی بڑھاتا۔ گویا سود در سود کا لا متناہی سلسلہ جاری رہتا اور قرض لینے والا مقروض در مقروض ہوتا چلا جاتا۔

ظہورِ اسلام سے قبل ان علاقوں میں بدھ مت کا دور دورہ تھا اور ان کے رہن سہن اور طرزِ معاشرت پر اس کے گہرے اثرات تھے۔ پرانے دور میں عورتوں کے مخصوص ایام کے دوران انہیں غلیظ اور ناپاک شے قرار دے کر گاؤں کے ایک کنارے اس مقصد کے لئے بنائے گئے مکان میں ڈال دیتے۔ اس دوران کسی مرد کو وہاں جانے کی اجازت نہیں ہوتی۔ اہلِ استور متاثرہ عورت کو ''ڈھوکر ہی شہٹی'' یعنی تنہا گزیدہ عورت کہتے تھے۔ ان ایام میں ان کے کھانے کے برتن تک کوئی شخص ہاتھ نہیں لگاتا تھا۔ کیلاش (چترال) کے علاقے میں یہ رسم آج بھی موجود ہے۔

بعض مقامات پر مختلف رنگ کی ٹوپیاں عورتوں کے سروں پر دیکھ کر ان کی ازدواجی حیثیت کا اندازہ آسانی سے لگایا جا سکتا تھا۔ غیر شادی شدہ دوشیزہ اونی پٹو کی سفید ٹوپی (شیئی کھوئی) پہنتی۔ اس ٹوپی پر سلائی کڑھائی کی جاتی اور جو کی خشک تیلیوں کو پانی میں نرم کر کے خاص قسم کے نقش و نگار بنائے جاتے۔ شادی شدہ عورت کالی ٹوپی (کئی کھوئی) پہنتی۔ گویا کالی ٹوپی شادی شدہ عورت کی نشانی تھی۔ اس پر بھی طرح طرح کے نقش و نگار ہوتے۔ بیوہ کی ٹوپی (کگونئی کھوئی) بھی کالی ہی ہوتی لیکن اس پر کوئی زیور اور نقش و نگار نہیں ہوتے تھے۔

بہار اور گرمیوں کے موسم میں گاؤں کے نوجوان مل کر پک نک کا اہتمام کرتے اور کسی قریبی تفریحی مقام پر جا کر دن بھر کھیل کود میں گزارتے۔ اس مقصد کے لئے وہ ایک مقررہ رقم جمع کرتے اور اس سے ضرورت کی چیزیں خریدتے۔ بعض دفعہ تفریحی مقامات پر رات بھی گزارتے جبکہ خواتین اندرونِ محلّہ کسی کھلے باغ میں جا کر پک نک منایا کرتیں اور دن بھر جھولا جھولنے میں گزار دیتیں۔

سخت گرمیوں کے ایام میں دن کو مرد حضرات برلبِ دریا یا نالہ جاتے اور دن بھر ستانے کے بعد سورج ڈھلنے کے ساتھ ہی گھر لوٹتے جبکہ خواتین محلے میں موجود کسی چنار کے درخت کے نیچے دن کی گرمی گزار دیتی تھیں۔ اس موقع پر نوجوان تیراک ٹولیوں کی شکل میں دریا میں تیراکی کے کرتب بھی دکھاتے جبکہ تیراکی کے فن سے نابلد حضرات غسل پر اکتفا کرتے۔ رات مکان کی چھتوں پر کھلی فضا میں گزار دیتے۔ اگر گرمی اور مچھروں کا حملہ زیادہ ہو تو بستر کی چادر پانی میں بھگو کر اوڑھ لیتے جس سے گرمی کی شدت کسی حد تک کم ہو جاتی۔ چونکہ محلے میں مکانوں کی چھتیں تقریباً ایک دوسرے سے ملی ہوئی ہوتیں اسلئے نصف شب تک چھت پر بیٹھے بیٹھے ہمسائے ایک دوسرے سے گپ شپ کرتے رہتے۔

پانی کی نالی محلے کے تقریباً ہر گھر سے ہو کر جاتی۔ کپڑے دھونے کے لئے محلے میں ہر گھر کے باہر نالی کے آر پار یا سیدھ میں ایک لمبے پتھر کی سل رکھی جاتی، جس پر رکھ کر خواتین اہلِ خانہ کے کپڑے دھوتی تھیں۔ کپڑے پانی میں بھگو کر کچھ دیر رہنے دیے جاتے۔ اس کے بعد تقریباً دو فٹ لمبے لکڑی کے ایک بیٹ نما ڈنڈے سے کپڑوں کی وہ پٹائی کی جاتی جسکی مثال نہیں ملتی۔ الغرض بڑی مشقت کے بعد کپڑے صاف کیے جاتے۔ مقامی زبان میں لکڑی کے اس ڈنڈے کو ''تھناس'' کہتے ہیں۔ کپڑے دھونے کے بعد انہیں سکھانے کے لئے کسی ایسی جگہ پر جہاں دھوپ ہو پھیلا دیے جاتے۔ پرانے وقتوں میں کپڑے بغیر استری کے پہنے جاتے تھے البتہ ایک روایت کے مطابق اہلِ استور ایک کیتلی نما برتن میں کھولتا ہوا پانی ڈال کر اس سے استری کا کام لیا کرتے تھے۔ سردیوں کے موسم میں ایک یا دو بار کپڑے دھونے کی زحمت کی جاتی۔ سال میں ایک بار فروری یا مارچ کے مہینے میں کوہلوں اور نالیوں کی صفائی کے لئے ہفتہ دو ہفتہ تک پانی بند کیا جاتا تو خواتین اہلِ خانہ کے کپڑے اپنے سروں پر لاد کر قدرتی چشموں، دریاؤں اور نالوں کا رخ کرتیں اور دن بھر کی مشقت کے بعد شام کو گھر لوٹتی تھیں۔ ماضی میں

گری کا تیل نکالنے کے بعد جو مواد بچتا اسے کپڑے دھونے کے لئے استعمال کرتے۔ پسی ہوئی کالی دال، مکئی کا آٹا، شہتوت کی لکڑی کی راکھ اور ''صابن رِگ'' (ایک جڑی بوٹی جو ریگستانوں میں ہوتی ہے) بھی کپڑے دھونے کے لئے بطورِ صابن استعمال میں لاتے۔

کاشتکار کام کے موسم میں دھوپ بارش کی کوئی پرواہ نہیں کرتے بلکہ موسلا دھار بارش اور جھلستی دھوپ میں بھی کھیتی باڑی کا کام جاری رہتا البتہ ان کا زیادہ تر معمول یہ تھا کہ صبح دم کھیتوں کا رخ کرتے اور دھوپ نکلنے تک کاشتکاری کا کام کرتے۔ دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد زمیندار تھوڑی دیر ستاتے اور پھر سہ پہر سے شام تک کام کا سلسلہ جاری رہتا۔ کھیتوں میں گودی کا سارا کام عورتیں کیا کرتیں۔ گودی کے ایام میں کھیتوں میں رنگ برنگ کپڑوں میں ملبوس خواتین کی موجودگی سے فصلوں کی ہریالی دوچند ہو جاتی اور دور دور تک کا منظر سہانا لگتا۔ زرعی زمینوں میں کاشتکاری کے ایام میں بڑا دلکش سماں ہوتا۔ ہر زمیندار باری باری فصل کی بوائی اور کٹائی میں ایک دوسرے کی مدد کرتے اور مرد اور عورتیں ٹولیوں کی شکل میں اپنا اپنا کام سرانجام دیتے۔ کھیتوں میں باہم مل جل کر مشقت طلب کام کر کے بھی لوگ اس طرح لطف اندوز ہو جاتے جیسے پک نک منا رہے ہوں۔ گویا ہر کام میں اجتماعیت کا عنصر غالب تھا اور اسی کے سبب ان کی محنت اور مشقت میں بھی بڑا لطف تھا۔ وہ بڑے اطمینان اور سکون سے زندگی گزارتے تھے۔ چراگاہوں سے دور بسنے والے لوگ، گھر میں دودھ کی خاطر پالے گئے مال مویشیوں کو گھر کے ذمہ دار افراد گرمیوں میں صبح شام چرانے کے لئے مویشی خانوں سے باہر لے جاتے اور گھنٹہ دو گھنٹہ چرانے کے بعد واپس گھر لاتے۔ برلبِ ندی نالہ گھاس کی بہتات ہوتی جو مال مویشی کی خوراک بنتی تھی۔

فصل خریف کی کاشت کے بعد تقریباً جون کے مہینے میں ٹولیوں کی شکل میں مال مویشی رکھنے والے لوگ اپنے مال مویشی قریبی چراگاہ لے جاتے ہیں۔ مال مویشی کے ساتھ چراگاہ جانے والے نوجوان چند دن جنگل میں بطورِ پک نک گزار کر واپس آتے۔ اکتوبر کے مہینے میں جب سردی کا آغاز ہوتا تو اس وقت جنگل یا چراگاہ سے مال مویشی واپس گھر لانے کے لئے نوجوان ایک بار پھر ہنسی خوشی جنگل/ چراگاہ کا رخ کرتے۔ گھر واپسی کا مقررہ دن بستی کے نوجوان مل کر جنگل یا چراگاہ سے مال مویشی لے کر آنے والوں کا راستے میں جا کر استقبال کرتے۔ مال مویشی یا بوریہ بستر لے کر بستی سے چراگاہ جانے اور آنے کے اس عمل کو مقامی لوگ ''اچای دونک'' کہتے ہیں۔ بعض دفعہ نوجوان مل کر مال مویشی کے لئے نمک (پجوء) لے کر جنگل جاتے اور اپنے اپنے مال مویشیوں کا نمک سے خاطر تواضع کرتے اور مال مویشی کی خبر گیری کے بعد گھر واپس لوٹتے۔ مال مویشی کو نمک پیش کرنے کے اس عمل کو ''پجوء دونک'' کہتے ہیں۔ سردی کے آغاز کے ساتھ ہی نوجوان ٹولیوں کی شکل میں چراگاہ جاتے اور اپنے اپنے مال مویشی قافلے کی شکل میں ساتھ لے کر گھر واپس لوٹتے۔ ان ایام میں عموماً مال مویشی خود بھی اپنے مالک کے گھر واپس لوٹتے۔

جب آپ شہری مضافات سے باہر نکلیں تو ایک طرف میڈیم سائز کے بنے ہوئے لوگوں کے نیچے مکانوں کی چھتوں پر گھاس پھوس اور رشکہ وغیرہ کا ذخیرہ نظر آتا ہے، جو وہ سردیوں کے لئے سنبھال رکھتے ہیں تاکہ مال مویشی کی خوراک بنے تو دوسری طرف درختوں اور شاخوں کے درمیانی جگہے پر گھاس پھوس، رشکہ اور مکئی کے خشک ٹانڈے موسم سرما کے لئے چیر کر تیار کی گئی ہیزم سوختنی کا سٹاک دیکھیں گے جو نہایت ہی سلیقے سے رکھتے ہیں۔ درختوں کے تنوں اور شاخوں کی اتصال کی جگہ کو مقامی زبان میں ''چرکوٹ'' کہتے ہیں۔ سردیوں کے لئے اشیائے ضرورت ذخیرہ کرنے کا لوگوں کا یہ روایتی انداز بڑا دلکش اور جاذبِ نظر ہوتا ہے۔

عادات واطوار:

ماضی میں ان علاقوں کے لوگ بڑی سادہ زندگی گزارتے تھے۔ لداخ کے لوگوں کی طرح شاندار عمارتوں کی تعمیر اور سامان تعیش اور عمدہ سامان خانہ داری رکھنے کا دستور نہیں تھا۔ اسی سادگی کی وجہ سے یہاں کے لوگ عموماً خوشحال رہتے تھے۔ ان علاقوں کے لوگ نہ صرف خوش مزاج ہیں بلکہ ان میں مردانہ اوصاف کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہیں۔ ان علاقوں کے لوگ اپنوں سے زیادہ غیروں کو اپناتے ہیں اور ان کی ہر ممکن خدمت کرتے ہیں۔ غیر مقامی حکام کی خوشنودی حاصل کر کے خوشی محسوس کرتے ہیں۔ لوگ اپنا ذہن بہت کم استعمال کرتے ہیں۔ لوگوں میں پس وپیش کرنے کی عادت ہے۔ حتی کہ گھر آئے مہمان کو کھانے کا پوچھیں تو وہ کہے گا کہ میں کھانا کھا کے آیا ہوں حالانکہ اس نے کھانا نہیں کھایا۔ اس لئے میزبان عموماً مہمان کی ان رسمی باتوں کو نظر انداز کر کے اس کی خاطر تواضع کرنے سے کبھی گریز نہیں کرتے۔

ماضی میں بچے بچیاں اور لڑکے لڑکیوں پر کام کا بوجھ نہیں ڈالا جاتا تھا۔ پھر بھی لڑکیاں عورتوں کی اور لڑکے گھر کے کام کاج میں مردوں کے ہاتھ بٹاتے۔ اس زمانے میں تعلیم کے مواقع کم تھے۔ مسجد مکتب میں سورۃ فاتحہ کے علاوہ آخری پارہ کے چند سورتوں کو زبانی یاد کرنا ہی کافی سمجھا جاتا۔ لڑکے اور لڑکیوں کا زیادہ تر وقت کھیل کود میں ہی گزر جاتا تھا۔ البتہ غریب والدین کے لڑکے لڑکیاں دن بھر گاؤں میں چولہا جلانے کے لئے لکڑی کی تلاش میں سرگرداں رہتے اور شام تک کچھ نہ کچھ لکڑیاں چن کر گھر لوٹتے۔ آجکل جگہ جگہ سکول بنے ہوئے ہیں اور تعلیم عام ہونے اور لوگوں میں تعلیمی شعور پیدا ہونے کی وجہ سے امیر کیا غریب کے بچے بھی زیورِ تعلیم

سے آراستہ ہو رہے ہیں۔

یہاں کے دیہاتوں میں لوگ اپنی ضرورت کی کئی چیزیں اور آلات کو پتھر یا لکڑی سے بناتے۔ گائے، بیل، بھینس، بکری اور بھیڑ کی اون اور چمڑے سے بھی طرح طرح کی اشیاء تیار کی جاتی ہیں۔ آج مختلف دھاتوں اور پلاسٹک وغیرہ سے جو کام لیا جاتا ہے، پہلے پہل یہ کام پتھر، لکڑی اور چمڑے سے لیا جاتا تھا۔ پتھر اور لکڑی سے جو چیزیں بنائی جاتیں ان میں سے چند کا تذکرہ درج ذیل ہے۔

پتھر اور لکڑی سے بنائی جانے والی اشیاء

اُڈھور (اوکھلی):

کسی بڑے پتھر کی کھدائی کر کے اسے پیالہ نما بنا کر مکان کے احاطے میں زمین کے اندر گاڑھ دیتے اور اسے بطور اوکھلی استعمال میں لاتے۔ پسائی او رکٹائی کے لئے کسی نوکدار پتھر کو جو زمین کے اندر گاڑھے ہوئے پیالہ نما پتھر میں بغیر رکاوٹ کے آجا سکے، بطورِ موسر استعمال کرتے۔ شنا زبان میں زمین پر گاڑھے ہوئے اس پتھر کو اوکھلی ''اُڈھور'' اور کوٹنے والا آلہ موسر کو ''مزل'' کہتے ہیں۔ اس میں عموماً دھان کوٹ کر چاول نکالتے۔ یہ کام عورتیں کرتیں۔ تین چار عورتیں باری باری دھان کوٹ کر چاول نکالتیں۔ شنا میں ایک مثل ہے کہ ''اڈھور سہہ تیل کھای مُزل تھکیٹ'' یعنی ''اوکھلی کی خوراک تیل جبکہ موسر کی قسمت میں تھوک'' بہت مشہور ہے۔ گرم مصالحہ جات، نمک اور خشک ٹماٹر بھی اوکھلی میں پیس کر استعمال میں لائے جاتے۔ ہر عورت باری باری اوکھلی کے گرد پاؤں پھیلا کر موسر کو دونوں ہاتھوں سے سر سے بھی اوپر اٹھاتی اور زور سے اوکھلی میں موجود دھان پر مارتی۔ موسر پر حسبِ ضرورت تھوک لگا کر اسے پھسلنے کا موقع نہیں دیا جاتا۔ گھنٹوں محنت و مشقت کے بعد جو چاول حاصل ہوتا وہ ایک وقت کے لئے ہی کافی ہوتا۔ خواتین موسر کو اوکھلی پر مارتے وقت ایک خاص قسم کی آواز بھی نکالتیں۔ بعد میں متوسط طبقے کے لوگوں نے اس مشقت سے بچنے کے لئے اندرون خانہ ایسا انتظام کیا کہ موسر کو ہاتھوں سے استعمال کر کے توانائی ضائع کرنے کی بجائے اسے پاؤں کے ذریعے حرکت دینے کی حکمت عملی اپنائی۔ گویا یہ اوکھلی اور موسر کی ترقی یافتہ صورت تھی۔ حکمت عملی کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ ان کے نام بھی تبدیل ہوئے اور اب مقامی لوگ انہیں ''ہنڈرمونلو'' کہنے لگے۔ آج کل طرح طرح کے صاف اور شفاف چاول بازار میں دستیاب ہونے کی وجہ سے کوئی بھی چاول کاشت کرنے کا مشقت طلب کام کرنے کی تکلیف گوارا نہیں کرتا۔ یوں اوکھلی، موسر اور ''ہنڈرمونلو'' کا زمانہ قصہ پارینہ بن چکا ہے۔ ''ہنڈرمونلو'' کی حکمت عملی کشمیری اپنے ساتھ لے آئے تھے۔

شِل (پتھر کی سل):

پتھر کی سل کو مقامی لوگ ''شل'' کہتے ہیں۔ ان علاقوں میں کھرل کا کام ''شل'' سے لیا جاتا تھا۔ ایک سیدھا اور لمبا پتھر ''شل'' کا کام دیتا تھا جبکہ اس کے اوپر مختلف اشیاء پیسنے کے لئے ایک گول پتھر جو کھردار نہ ہو، استعمال ہوتا تھا۔ مقامی لوگ اس پتھر کو ''گگوئی'' کہتے تھے۔

پتھر کا توا:

توا کو شنا میں ''تاؤ'' کہتے ہیں۔ جو لذت پتھر کے توے پر پکی ہوئی روٹی کی ہوتی اس طرح کی لذت آج کل کے جدید آلات کے ذریعے بنائی ہوئی روٹیوں میں کہاں۔ آہنی توؤں کے استعمال سے قبل لوگ پتھر کی سل کو بطورِ توا استعمال کرتے تھے۔ ہلکی آنچ پر دھیرے دھیرے جو روٹی پکتی اس کا مزہ ہی کچھ اور ہوتا۔

بلوسَ:

سالن پکانے والے پتھر کے برتن کو ''بلوس'' کہتے ہیں۔ جس پتھر ''بھٹ'' سے یہ برتن بنائے جاتے اسے ''بلوسَ بھٹ'' (soap stone) کہتے۔ ان برتنوں کا ڈھکنا بھی پتھر کا ہی بنا ہوتا تھا۔ ''بلوسَ'' میں پکنے والا سالن بڑا لذیذ ہوتا کیونکہ وہ آج کل کے پریشر ککرز میں پکنے والے سالنوں کی طرح دم گھٹ کر تیار نہیں ہوتا تھا بلکہ اپنی مرضی سے پکتا تھا۔ ''بلوسَ بھٹ'' بڑا نرم ہوتا۔ ہنزہ، نگر، سکردو اور پرشنگ (استور) میں یہ پتھر عام ملتا تھا۔ ایک ہتھوڑا اور لوہے کی چھینی جسے اہلِ استور ''گٹ'' اور اہل گلگت ''گک'' کہتے، کی مدد سے سنگ تراشی کی جاتی۔ اس پتھر سے برتن بنانے والے کاریگر عام طور پر بلتستان سے آتے تھے۔ نگر



لکڑی کے روزمرہ استعمال کے روایتی برتن

سے بھی بلوس لاتے تھے۔

چدن:

یہ سالن پکانے کا ایک برتن ہوتا تھا جو ڈیگ لوہے کو پگھلا کر بنایا جاتا تھا۔اس برتن کے بنانے والے کاریگر عام طور پر پامیر کے علاقے سے آتے تھے۔اس قسم کے برتنوں کا رواج زیادہ تر پونیال، اشکومن، یاسین اور غذر کے علاقے میں تھا۔

کُھر (پرنالہ):

جب ایک جانب سے دوسری جانب پانی گزارنے کے زمینی رابطے مسدود ہوتے تو درختوں کے تنوں کو اندر سے کھوکھلا کر کے اس کے ذریعے پانی گزارتے۔ مقامی لوگ اس کھوکھلے تنے کو ''کھر'' کہتے ہیں۔گلگت سے خنجراب جاتے ہوئے شاہراہِ قراقرم کے اوپر سے بذریعہ ''کُھر'' پانی گزارنے کے کئی نمونے آج بھی دیکھے جاسکتے ہیں۔ایک بلند مقام سے دوسرے بلند مقام تک پانی لے جانے کے لئے یہی استعمال ہوتے ہیں۔عام طور پر چٹانوں کو کاٹ کر اس پر لکڑی کا کھر بنا کر پانی لاتے۔''یچھنی'' کے قریب نوپورہ نالے کے منہ میں اس طرح کے ''کھر'' کے صدیوں پرانے آثار اب بھی ملتے ہیں۔بعض مورخین کا خیال ہے کہ نوپورہ میں زمانہ قدیم کا بدھ مت کا سٹوپا تھا، جس کے اردگرد زمین کی آبپاشی اور پینے کے لئے پانی حاصل کرنے کی خاطر پرنالہ بنایا گیا۔ یہ سٹوپا اور تعمیرات وغیرہ چھٹی صدی عیسوی کے آخر اور ساتویں صدی عیسوی کے شروع کے زمانے سے تعلق رکھتے ہیں۔

یونر (پن چکی):

پن چکی سے قبل بالخصوص عورتیں غلے کو ''سل'' پر پیس کر آٹا بناتی تھیں۔بعد میں ہاتھ سے چلنے والی چکی اس مقصد کے لئے استعمال میں لائی گئی۔لیکن پن چکی کی ایجاد کے بعد غلے کی پسائی کا کام کافی آسان ہوا۔پن چکیاں (جندر، گھراٹ) ان علاقوں میں بعض مقامات پر اب بھی موجود ہیں۔مقامی لوگ انہیں ''یونر'' کہتے ہیں۔آجکل مشینی چکیوں اور فلور ملز کی بدولت پن چکیاں پس منظر میں چلی گئی ہیں۔ماضی میں لوگ گدھوں پر اناج لاد کر پن چکی تک لے آتے تھے۔فی من اناج سے تقریباً دو سیر پسائی کا معاوضہ وصول کرتے تھے۔مقامی زبان میں اس معاوضے کو ''بوئی'' اور چکی میں پسائی کا کام کرنے والے کو ''یونر والی'' کہتے ہیں۔پن چکی میں پتھر کے دو بڑے وزنی گول پاٹ اوپر نیچے ترتیب سے رکھ دیے جاتے، جنہیں مقامی زبان میں ''یونر بھٹ'' کہتے ہیں۔ان پتھروں کو پانی کے بہاؤ کی قوت اور دباؤ سے چلایا جاتا۔پن چکیاں عموماً ندی نالوں کے ساتھ بنائی جاتیں۔جس پتھر سے یہ پاٹ بنائے جاتے اس کو ''مرکوہ'' کہتے ہیں۔یہ پتھر نگر میں میا نچھر کے مقام پر ملتا ہے۔پن چکی میں ایک من مکئی پیسنے کے لئے تقریباً اڑھائی گھنٹے اور ایک من گندم کے لئے تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ لگتا ہے۔



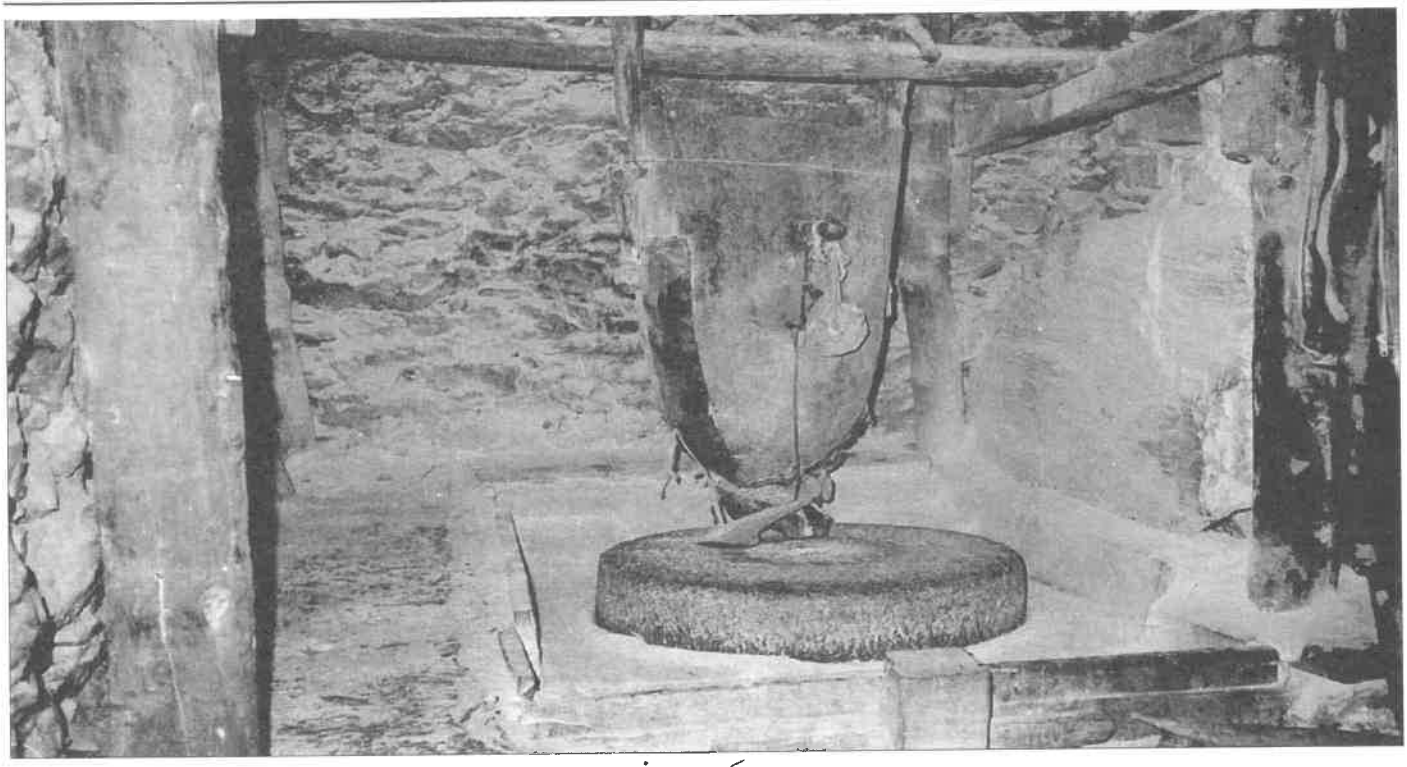
پن چکی کا بیرونی منظر

چکی میں استعمال ہونے والی اشیاء/اوزار

پتھر کے اوزار (رَال اور باٹ):

پانی کی سطح کو مدنظر رکھتے ہوئے پتھر سے بلند دیوار بناتے ہیں اور دیوار کی بلند سطح پر پانی گزارنے کے لئے نالی بنائی جاتی ہے جہاں سے کول (کھر) کے ذریعے پانی کو نشیبی سطح پر گرا کر چکی چلائی جاتی ہے۔بلندی پر بنائی گئی اس نالی کو ''رال'' کہتے ہیں۔چکی کے اوپر کے باٹ کو شنا میں ''اجینو بھٹ'' جبکہ نچلے باٹ کو ''کھرینو بھٹ'' کہتے ہیں۔ان پتھروں کو ''مرکوہ'' کہتے ہیں۔چکی میں ایک ''پتہ بھٹ'' اور ایک ''سوا تن بھٹ'' بھی ہوتے ہیں جو چقماق کے پتھر سے بنائے جاتے ہیں۔

لکڑی کے اوزار (چیں، نرو، موٹس، پھچالے، ڈھور، گڑھکی، پُھیولو، اُدھاچو، مذھر، کُھر):



روایتی پن چکی کا اندرونی منظر

''چیں'' لکڑی سے بنتی ہے۔اسے پانی کی نالی کی تہہ میں جہاں پر پانی کا دباؤ پڑتا ہے رکھ دیتے ہیں۔

''نرو'' پر لکڑی کے پر لگے ہوتے ہیں۔جو پانی کے دباؤ سے حرکت میں آتا ہے۔اور چکی کے چلنے کا باعث بنتا ہے۔

''موٹس'' چکی کے نچلے باٹ پر لگاتے ہیں۔پن چکی کے پر جو پانی کے دباؤ سے حرکت کرتے ہیں۔

''پھحالے'' کہلاتے ہیں۔''ڈھور'' بھی لکڑی کا بنا ہوتا ہے، جس میں غلہ ڈالتے ہیں۔

''گڑھکی'' ڈھور کی نشیبی جگہ پر نصب ہوتی ہے اور اس کا سرا چکی کے بالائی باٹ کو چھوتا ہے۔جب باٹ چلنے لگتے ہیں تو لکڑی اور پتھر کے ملاپ سے ایک مخصوص آواز نکلتی ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ چکی چل رہی ہے۔ڈھور سے ڈھوری میں غلہ آتا ہے اور وہاں سے ہو کر چکی میں جاتا ہے۔

''پھیولو'' لکڑی کا بنا ہوا بیلچہ نما ہوتا ہے، جس سے آٹا تھیلے میں ڈالنے کا کام لیتے ہیں۔

''اُدھاچو'' کے ذریعے بڑے باٹ کو بوقت ضرورت اوپر نیچے کرتے ہیں۔

''مڈھر'' وہ جگہ کہلاتی ہے جہاں آٹا جمع ہوتا ہے۔درخت کے تنے کو کھوکھلا کر کے اس کے ذریعے بلندی سے پانی گراتے ہیں جس کے زور سے پن چکی گھومنے لگتی ہے۔اسے اردو میں ''کول'' اور شنا میں ''کُھر'' کہتے ہیں۔

لوہے کے اوزار (سِٹ، سُنواری، ڈھکی):

''سِٹ'' نرو کے اندر لگاتے ہیں۔ایک سرا ''نرو'' میں جب کہ دوسرا سرا ''سنواری'' میں ہوتا ہے۔''سُنواری'' کا ایک حصہ اوپر والے باٹ میں پھنسا دیتے ہیں جس کے زور سے باٹ گھومتا ہے۔''ڈھکی'' سے باٹ کو کھردرا کرتے ہیں تاکہ پسائی صحیح ہو۔

چمڑے کے اوزار (پچالو):

پچالو بھیڑ کے اونی چمڑے کے ٹکڑے پر مشتمل ہوتا ہے۔اس سے ''مڈھر'' اور اس کے اردگرد بکھرا ہوا آٹا جمع کرنے کا کام لیا جاتا ہے۔

روایتی طرزِ تعمیر

یہاں کے لوگ کچے مکانوں میں زندگی بسر کرتے تھے۔پتھر چونکہ یہاں پر عام ملتا تھا۔اسلئے مکان زیادہ تر پتھر کے بنائے جاتے۔البتہ بعد میں لوگوں نے ایسی مٹی سے جس میں ریت شامل نہ ہو، اینٹ اور بکھوہ بنانے لگے اور ان کے ذریعے بھی سر چھپانے کیلئے پناہ گاہیں تعمیر کیں۔مکان عموماً برلب ندی اور ایک دوسرے کے قریب بناتے۔ماضی میں یہاں پر مکانات دردطرزِ تعمیر کے مطابق بنائے جاتے۔دردطرز تعمیر کے تحت پہلے لکڑی کا فریم بنا کر اسے دیوار پر رکھ

دیتے ہیں اور اس میں پتھر کی بھرائی کرتے ہیں۔ کہیں کہیں پتھر کی دیوار پر مٹی کا پلاستر بھی چڑھاتے۔ وقت کے ساتھ ساتھ اس میں بھی تبدیلی آتی گئی۔ جب کشمیری کاریگر فوجی قافلوں کے ساتھ یہاں آئے تو اپنے ساتھ ہنر بھی لائے۔ انہوں نے پتھروں یا مٹی کی اینٹوں سے لمبی لمبی اور بڑی بڑی بیرکیں فوجی استعمال کیلئے تعمیر کیں۔ ان بیرکوں کے اندر دونوں سروں پر دوہری دیوار تعمیر کر کے اس کے مخصوص حصوں کو عام دیوار سے زیادہ باہر نکالتے اور نچلے سرے پر گولائی میں ڈاٹ نکال کر آگ جلانے کیلئے آتش دان بناتے اور آگ کا دھواں اندرون دیوار مخصوص شگاف کے ذریعے چھت تک نکالتے اور چھت پر اس مقصد کیلئے چمنیاں بنائی جاتیں۔ مقامی زبان میں اس آتش دان کو ''بخاری'' کہتے ہیں۔ چھت پر چمنی کی چاروں طرف سوراخ ہوتے جن کے ذریعے دھواں باہر نکلتا۔ چھت پر چمنی دیکھ کر دور سے ہی اندازہ لگایا جاتا کہ اس گھر میں بخاری لگی ہوئی ہے۔ اس کے دیکھا دیکھی امیروں اور متوسط طبقے کے لوگوں نے اپنے مہمان خانوں اور مکان سے ملحق برآمدوں میں بھی اس طرح کی بخاریاں تعمیر کیں۔ آج کل شہری علاقوں میں فان گیس اور آہنی بخاریاں دونوں استعمال ہو رہی ہیں۔ جبکہ دیہی علاقوں میں آہنی بخاریاں اور بغیر بخاری کے روایتی آتش دان استعمال ہوتے ہیں۔ طرزِ تعمیر کی اسی حکمت عملی کے تحت لکڑی کے بڑے بڑے پلوں کیلئے پتھر کے پلرز یا پشت بان جنہیں مقامی زبان میں ''دلناٹ'' کہتے ہیں، بنائے جاتے۔ گلگت کی تاریخی پل کے ''دلناٹ'' اسی حکمت عملی کی علامت ہیں۔ کہتے ہیں کہ اس پل کیلئے بنائے گئے دونوں طرف کے دلناٹ کی تعمیر میں ریت کے ساتھ سیمنٹ کی جگہ انڈہ استعمال کیا گیا ہے۔ یہاں کے لوگوں نے ناتراشیدہ پتھروں کی اکہری دیوار بنا کر سر چھپانے کے لئے گھر بھی تعمیر کئے۔ غیر تربیت یافتہ کاریگر بڑی مہارت سے دو دو منزلہ عمارتیں کھڑی کرتے۔ اس طرزِ تعمیر میں چھت کا سارا بوجھ ستونوں پر پڑتا اور دیواروں کا کام محض پردے کے علاوہ اور کچھ نہیں ہوتا۔ ان اکہری دیواروں کو مٹی کے گارے سے لیپ دیا جاتا۔ جس کی وجہ سے ان کی پائیداری میں اضافہ ہوتا۔ جن مقامات کی مٹی پائیدار ہوتی، وہاں پر مکانات کی تعمیر کے لئے مٹی کے اینٹ بنائے جاتے تھے۔ پہلے سائز کے مطابق سانچہ تیار کیا جاتا، جسے مقامی لوگ ''اِرَن'' کہتے ہیں۔ ان مٹی کی اینٹوں کی لمبائی تقریباً اٹھارہ انچ، چوڑائی "11"، "10 یا "9 اور موٹائی "4 ہوتی۔ اینٹ کو شنا زبان میں ''ڈِسٹک'' کہتے ہیں۔ اینٹ بنانے سے پہلے چکنی مٹی کا گارا بنا کر رکھ دیتے اور اگلی صبح گارا تیار ہوتا۔ اینٹ چند دنوں تک دھوپ میں سوکھنے دیے جاتے۔ چھت یا دیواروں پر پلستر کے لئے گارے کی ضرورت ہوتی تو اس میں گندم کا باریک بھوسہ بھی شامل کیا جاتا۔ جس سے لوگوں کے مطابق پلستر زیادہ پائیدار ہوتا اور اس میں شگاف نہیں پڑتے۔ اسی طرح کے گارے سے بعض مقامات پر جہاں کی مٹی اچھی ہو باغوں کی دیوار بندی بھی کی جاتی جبکہ ان مقامات پر جہاں کی مٹی میں ریت شامل ہو، اس طرح کی دیوار بندی ممکن نہیں ہوتی۔ اسلئے ایسی جگہوں پر بغیر گارے کے ناتراشیدہ اور سل نما اور چوڑے پتھروں کی لمبی لمبی اکہری یا دوہری دیوار بنائی جاتی۔ ہر طرح کی دیوار کرسی تک پتھر کی بناتے۔ مٹی کی دیوار کے لئے لکڑی کے دو بڑے بڑے تختے تیار کر کے انہیں لکڑی کے سہاروں کی مدد سے مجوزہ دیوار کی کرسی پر رکھتے۔ اس طرح کم وبیش لمبائی چھ فٹ، اونچائی دو فٹ اور چوڑائی دس انچ پر مشتمل سانچہ تیار کرتے۔ ''بکبوہ'' کے سائز میں حسبِ منشا کمی بیشی کی جاتی تھی۔ (بکبوہ بلتی زبان کا لفظ ہے۔ مٹی کے کچے اینٹ کو بھی بکبوہ کہتے ہیں۔) اس سانچے کی نچلی سوراخوں میں کاغذ یا گندے کپڑے کے ٹکڑے رکھ کر گارا نیچے گرنے نہیں دیا جاتا۔ اس کے بعد اس بڑے سانچے کو گارے سے بھر دیا جاتا۔ جس کے لئے کسی خاص مہارت کی ضرورت نہیں پڑتی۔ مقامی لوگ اس بڑے سانچے کو ''بکبوہ'' اور اس طرح کی دیوار کو ''بکبوئی کٹ'' کہتے ہیں۔ گارا ڈالنے کے بعد سانچے کو تقریباً دو دن تک اسی طرح رہنے دیا جاتا اور اس کے بعد اس سے آگے دوسرا ''بکبوہ'' پھر تیسرا اور چوتھا وغیرہ کا اہتمام کیا جاتا۔ جب پتھر یا مٹی کی دیوار بندی کا کام مکمل ہوتا تو آخر میں باغ کی دیواروں کے اوپر نوکدار جھاڑی جسے مقامی لوگ ''بروی کونہہ'' کہتے ہیں، اس ترتیب سے لگاتے کہ کوئی آدمی باغ کے اندر داخل نہیں ہو سکے۔ بعض جگہوں پر دیوار کے بغیر بھی مذکورہ نوکدار جھاڑی سے کھیتوں یا باغات کی دیوار بندی کی جاتی۔ کھلی جگہوں پر لگائے گئے نئے پودوں کے تنوں پر بھی یہ جھاڑی لگاتے۔ تاکہ مال مویشی نقصان نہ پہنچا سکیں۔ پرانے زمانے میں بنائی گئی عمارتوں کی دیواروں میں نصب بڑے بڑے پتھروں سے اس دور کے لوگوں کی طاقت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ بعض مقامات پر پتھر کی دیواروں پر بڑی مہارت سے لکڑی کے بڑے بڑے بیم استعمال کئے جاتے جس سے مکانات بڑے محفوظ اور پائیدار ہوتے۔ چلاس اور داریل، تانگیر میں اس طرح کے فنِ تعمیر کے ذریعے بنائے گئے دو منزلہ اور سہ منزلہ مکانات جنہیں مقامی لوگ ''گھڑی'' اور بعض ''شکار'' کہتے ہیں، آج بھی دیکھے جا سکتے ہیں۔ پرانے وقتوں کے قلعوں کے آثار یہاں پر بہت سے مقامات پر پائے جاتے تھے۔ کہتے ہیں کہ صرف چھموگڑھ کے گاؤں میں سات قلعے تھے جن کا اب نام ونشان تک باقی نہیں۔

تعمیرات کا سسٹم سکھوں کی آمد کے بعد متعارف ہوا۔ کیونکہ سکھ ان علاقوں میں پیشہ ور لوگ اپنے ساتھ لائے تھے۔ سکھوں سے قبل یہاں تعمیر کا کوئی باقاعدہ نظام نہیں تھا۔ لوگ چھپر نما مکان بنا کر پناہ حاصل کرتے۔ البتہ راجہ (راع)، قلعہ جسے مقامی لوگ ''کوٹ'' کہتے ہیں، بناتے تھے۔ پرانے وقتوں

میں گھر کے تمام خواتین وحضرات ایک ہی مکان میں شب باشی کرتے تھے۔ اگر کوئی مہمان آئے تو اسے بھی گھر کے کسی کونے میں سلاتے یا بعض دفعہ اسے محلے کی مسجد سے ملحق مسافر خانہ (گٹ گی) میں قیام کا اہتمام کیا جاتا۔ اگر مکان میں جگہ کی کمی ہو تو بھوسہ خانہ کو بھی بطور خواب گاہ استعمال میں لایا جاتا۔ روایت کے مطابق ہجری دور میں ہنزہ میں ''بورتھ جھیل'' کے اوپر ڈھلوان پر ایک کوہل تعمیر کی گئی تھی اس کے بارے میں مشہور ہے کہ یہ کوہل ''روزبی'' نامی ایک شخص نے کیل کے سینگوں سے کھودی ہے جو تقریباً نو سال کے عرصے میں مکمل ہوئی۔ اس کوہل کی لمبائی نصف میل بتائی جاتی ہے۔

سنوگوٹ (مقامی روایتی گھر):

ان علاقوں میں روایتی مکانوں کی تعمیر میں بھی دیومالائی تصورات کا بڑا عمل دخل رہا ہے۔ یہاں کے روایتی مکان کی چھت کے بیچ میں جو روشندان (سومنہ یا سگومنہ) ہوتا اس کی وجہ کاہنوں کے خیال کے مطابق یہ ہے کہ مؤکلات (راجھیئے) ہمیشہ چھت پر اترتی ہیں۔ اس لئے چھت پر روشندان کا ہونا بہت ضروری ہے تاکہ مؤکلات اور اہل خانہ کے درمیان بذریعہ روشندان رابطہ بحال رہے۔ لوگوں کا خیال ہے کہ مرنے کے بعد کی دنیا یعنی عالم برزخ کا بھی روشندان ہوتا ہے جسے ''دولو کی سومنہ'' کہتے ہیں۔ روایتی مکان چار ستونوں پر قائم ہوتا ہے اور لوگوں کے مطابق مکان کے اندر ستونوں کا ہونا بھی ضروری ہے تاکہ ان پر ڈھول یا بندوق لٹکایا جاسکے اور درنجی اور یدینی روشندان سے ڈھول اور بندوق کو دیکھ سکیں۔ اس کے علاوہ تھوبن کا عمل سرانجام دینے کے لئے بھی چھت کے روشندان کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہاں کے روایتی گھر مستطیل یا مربع شکل کے ہوتے۔ مروجہ سائز اڑتالیس ہاتھ یعنی چاروں طرف بارہ بارہ ہاتھ پر مشتمل ہوتا ہے۔ ایک ہاتھ تقریباً ڈیڑھ فٹ کے برابر تصور ہوتا ہے۔ کبھی کبھار سائز لمبائی میں تیرہ ہاتھ اور چوڑائی میں گیارہ ہاتھ پر مشتمل ہوتا ہے۔ اس طرح سائز میں حسبِ منشا کمی بیشی ہوتی رہتی ہے۔ مکان کی دیوار اٹھارہ انچ موٹی ہوتی۔ مکان کی چھت کا سارا بوجھ دو بیم اور چار ستونوں پر پڑتا ہے۔ مکان کے مرکز میں کھانا پکانے اور پتیلے وغیرہ رکھنے کے لئے خصوصی طور پر دائیں اور بائیں جانب دو آتشدان کے سوراخ بناتے ہیں جبکہ ان کے درمیان تیسری آتش دان ہوتی ہے۔ اسکے سامنے ''جِنَونل'' کے دائیں جانب گھر کے مالک اور بائیں جانب مالکن کے بیٹھنے کے لئے مخصوص جگہ بنائی جاتی ہے۔ ان مخصوص جگہوں پر بعض دفعہ نو بیاہے جوڑے اور مہمان بطور عزت افزائی بٹھائے جاتے۔ دیسی مکان میں تَون (ڈمبور) شوم کے ایک کونے میں رکھتے ہیں۔ یہ لکڑی کی بنی ہوئی ایک بڑی صندوق ہوتی، جس میں غلہ وغیرہ رکھتے ہیں۔ یہ رات کو سونے کیلئے چارپائی کا کام بھی دیتی ہے۔ عموماً مکان ناتراشیدہ پتھروں اور مٹی کے گارے سے بناتے۔ مکان ایک یا دو کمروں پر مشتمل ہوتا۔ مکانوں کے چھت کی سطح ہموار رکھتے۔ لکڑی کے رافٹرز پر جونیپر (چلی) کی جو لکڑی بغیر کسی صفائی کے رکھتے اسے ''پیچے'' کہتے ہیں۔ لوگوں کا کہنا ہے کہ چلی کی لکڑی آسانی سے سڑتی نہیں ہے۔ سرما کے موسم میں لوگ اپنے مال مویشی بھی گھر کے قریب رکھتے۔ دیواروں پر روشن دان کی مانند چھوٹی چھوٹی کھڑکیاں ہوتیں لیکن بعض مکانوں میں کھڑکیاں سرے سے ہوتی ہی نہیں۔ چھت کے عین وسط میں بادریہ (سومنہ یا سگومنہ) بناتے۔ جہاں سے نہ صرف دھواں نکلتا بلکہ روشنی بھی حاصل ہوتی۔ شنا کی یہ کہاوت کہ ''گوٹی دھوم گوٹی سومیٹ لیل بَی'' یعنی گھر کے دھویں کا حال بادریہ جانے، بہت مشہور ہے۔ یہاں کے کلچر میں سنو گوٹ (یعنی شین قوم کے لوگوں کا روایتی گھر) کو خصوصی اہمیت حاصل ہے۔ ''سنوگوٹ'' کو ماہرین چار حصوں میں تقسیم کرتے ہیں۔ (۱) شوم، (۲) مُن (۳) پَن (۴) شیں تی۔ روایتی گھر میں داخل ہوتے ہی جس جگہ پر بوٹ وغیرہ رکھتے ہیں اسے ''شوم'' کہتے ہیں۔ جہاں پر ایک جانب کبھی کبار کھانے کی چیزیں اور پانی وغیرہ بھی رکھتے۔ پَن کی جگہ مکان کی مرکزی جگہ شمار ہوتی ہے۔ اس کے پاس یک آہنی سہ پایہ آتش دان ہوتا ہے، جس پر ہانڈیاں وغیرہ رکھتے ہیں۔ مقامی زبان میں اسے ''جِنَونل'' کہتے ہیں۔ اسکے بالکل سیدھ میں وسطِ چھت پر بادریہ ہوتا ہے۔ سنوگوٹ کے روایتی ستون کشیدہ کاری کا اعلیٰ نمونہ ہوتے ہیں۔ لکڑی کے بنے ہوئے چھت کے دو بڑے مرکزی بیم اور چاروں ستون ایک دوسرے سے مل کر ایک عجیب وغریب اور دلکش منظر پیش کرتے ہیں۔ جبکہ باقی چھت بھی بناوٹ کے لحاظ سے جاذبِ نظر ہوتی ہے۔ البتہ دھویں کی وجہ سے روایتی گھر کی دیواریں اور چھت کالی ہوتی ہیں۔ چھت پر لگنے والی کالک کو مقامی لوگ ''چھئیں'' کہتے ہیں۔ پَن سے آگے کی جانب جو جگہ ہوتی ہے اسے مُن یا مُنی شیں تی کہتے ہیں۔

یہاں پر روایتی گھر دو طرح سے بناتے ہیں۔ ایک گسیر کم جبکہ دوسرا فسکم (ہموار)۔ گسیر کم طرز شنو اور کھجونو گوٹ دونوں میں استعمال ہوتے ہیں۔ گسیر کم میں نہ صرف وقت زیادہ لگتا ہے بلکہ پیسہ بھی زیادہ خرچ ہوتا ہے۔ اس تعمیر میں زیادہ تر جونیپر (چلی) کی لکڑی استعمال ہوتی ہے۔ فسکم میں چھت کی اندرونی اور بیرونی سطحیں ہموار ہوتی ہیں۔ اس میں وقت بھی کم لگتا ہے اور پیسہ بھی۔ دونوں کی چھتوں پر برچ کے چھلکے (جُوژ) یا سرکنڈے (پھرو) بچھا کر اس پر پانچ یا چھ انچ گارے سے پلستر کرتے۔ تاکہ بارش کے پانی سے گھر محفوظ رہے۔ روایتی گھر کا دروازہ عموماً مشرق کی جانب ہوتا ہے۔ مرکزی شیں تی کے سامنے کی دیوار پر قرآن وغیرہ رکھنے کیلئے ایک شلف نما جگہ بناتے ہیں جسے ''تکشہ'' کہتے ہیں۔ جبکہ زنانہ شیں تی کی دیوار پر سامان رکھنے کیلئے الماری ہوتی ہے۔ مردانہ



چرخے پر اونی دھاگے کی بنائی

شیں تی کی جانب چھوٹی سی کھڑکی بھی ہوتی ہے جو برآمدے کی جانب کھلتی ہے۔گھر کا دروازہ بھی برآمدے کی جانب ہوتا ہے۔گھر کے شوم میں کبھی کبھی نومولود گائے اور بھیڑ بکریوں کے بچے بھی رکھے جاتے تاکہ سردی سے بچ سکیں۔گھر میں داخل ہوتے ہی سامنے کی جانب چھوٹی سی جو دیوار نظر آتی ہے وہ دراصل ''شنترہ'' ہے۔جو عموماً سامان یا کپڑے وغیرہ لٹکانے کے کام آتا ہے۔گھر کے اندر جانب دروازہ پاپوش وغیرہ رکھنے کے لئے جو جگہ مختص کی جاتی اسے ''شوم'' کہتے۔لکڑی کا جو جنگلہ شوم اور بیٹھنے کی جگہ کی حد بندی کرتا ہے اسے ''بت کور/چکردیس'' کہتے ہیں۔شوم میں کبھی کبار ڈھینج بھی بناتے تھے۔بعض روایتی گھروں میں غلّہ وغیرہ رکھنے کیلئے ''ہمر'' اور ''توُن'' بھی ہوتے۔آتش دان کے اردگرد بیٹھنے کی جو جگہ ہوتی ہے اس کا فرش اکثر لکڑی کا ہوتا ہے۔روایتی آتش دان کو یہاں کے لوگ ''پیری گُل کھن'' کہتے ہیں۔اس کے اوپر سے پھلانگنا یا اس میں تھوکنے کی ہرگز اجازت نہیں۔کیونکہ لوگ اسے متبرک سمجھتے ہیں۔آتش دان کو شینا میں ''پھُپھس'' کہتے ہیں۔پھُپھس کے اردگرد بیٹھنے کی جگہ ''اِسمن لچنگ/بتھ بُریں'' کہلاتی ہے۔گھر کے سامنے کی جانب جگہ کو ''شیں تی''، مالک کے پیٹھ کی جانب والی جگہ کو مردانہ حصہ (مشہ یوشیں تی) جبکہ مالکن کے پیٹھ کی جانب والی جگہ کو زنانہ حصہ (چیوشیں تی) کہتے ہیں۔مکان کے چھت کے سنٹر میں تقریباً ڈیڑھ بائی ڈیڑھ فٹ کا ایک سوراخ یعنی بادریہ جسے مقامی زبان میں ''سومنہ یا سگومنہ'' کہتے ہیں، بناتے، تاکہ آگ کا دھواں خارج ہو اور روشنی بھی آئے۔مردانہ ''شیں تی'' کی جانب ابھری ہوئی ایک اور جگہ بھی بنائی جاتی تھی، جسے مقامی لوگ ''چپائی'' کہتے، گھر کا مالک عموماً اس ''چپائی'' پر سوتا اور اس کے نیچے گھریلو استعمال کے سامان مثلاً گینتی، بیلچہ، تیشہ، کلہاڑی، درانتی اور ہیزم سوختنی وغیرہ رکھتے۔وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ لوگوں نے جب سٹور کی ضرورت بھی محسوس کی تو روایتی گھر سے متصل ایک اور کمرہ بھی بنایا جس کا دروازہ روایتی گھر کے اندر ہی ہوتا۔یہ سٹور روم ''گنجی'' کہلاتا۔معاشرے کے مختلف طبقوں کے مکانات بھی مختلف ہوتے تھے۔مکانات کی تعمیر کے سلسلے میں ماہرین تین طبقوں یعنی شاہی طبقہ، متوسط طبقہ اور ادنیٰ طبقہ کا ذکر کرتے ہیں۔متوسط طبقہ کے مکانات تین کمروں یا اس سے بھی زیادہ پر مشتمل ہوتے۔جس میں ایک مہمان خانہ (بیٹھک) اور ساتھ برآمدہ ہوتا۔جبکہ افراد خانہ کیلئے برآمدہ کے ساتھ الگ کمرہ ہوتا۔اس طبقہ کے لوگوں کے بیٹھنے کیلئے ایک کمرہ، کھانا پکانے کیلئے کچن اور ایک کمرہ شب بسری کیلئے مقرر ہوتا جبکہ سارے کنبہ کے استعمال کیلئے مکان کے احاطے کے کسی کونے میں ایک دیسی ٹائلٹ ہوتا۔ادنیٰ طبقہ کے لوگوں کا مکان محض روایتی گھر پر مشتمل ہوتا، جسے بیٹھنے، سونے، کھانا پکانے اور مل بیٹھ کر کھانا کھانے کیلئے استعمال کرتے تھے۔

کھیان (برآمدہ): مکان کے دروازے سے ملحق گرمیوں میں استعمال کے لئے بھی جگہ بنائی جاتی، جسے مقامی لوگ ''کھیان'' کہتے تھے۔

بلتیع یا بلدیح: مکان کی چھت پر ایک برساتی بنائی جاتی جسے مقامی لوگ ''بلدیح یا بلتیع'' کہتے۔''بلدیح'' کے تین اطراف پر دیوار بندی کی جاتی جبکہ سامنے کی جگہ کھلی رکھتے۔دھوپ اور بارش کے حملوں سے بچنے کے لئے ''بلدیح'' بنائی جاتی۔جو عموماً گرمیوں کے دوران استعمال میں لائی جاتی۔

چُکن (بیت الخلا): ماضی میں یہاں مرد حضرات کھلے میدانوں/کھیتوں میں رفاحاجت کے لئے جاتے جبکہ خواتین اس مقصد کیلئے مویشی خانے استعمال کرتی تھیں۔البتہ ہنزہ، نگر اور بلتستان میں روایتی بیت الخلا (چکن) سسٹم موجود تھا۔بعض روایات کے مطابق ہنزہ میں اگر کوئی نووارد مہمان روایتی بیت الخلا ایک بار بھی استعمال نہیں کرتا تو میزبان ناراض ہوتا۔

غسل خانے: ماضی میں یہاں غسل خانوں کا بھی کوئی خاص انتظام نہیں تھا۔مرد حضرات غسل کے لئے چشموں، ندی، نالوں اور دریاؤں کا رخ کرتے جبکہ بعض جگہوں میں خواتین مویشی خانوں میں لکڑی کے تختوں پر بیٹھ کر غسل کرتیں یا گھر کے باہر ''کھیان'' میں اس مقصد کے لئے عارضی سی جگہ بناتے۔البتہ راجوں، مہاراجوں کے ہاں خصوصی غسل خانے جنہیں عرفِ عام میں ''حمام'' کہتے ہیں، بنائے جاتے۔بعض جگہوں پر برلب ندی، خواتین کے لئے خصوصی حمام بھی موجود ہوتے تھے۔

گلگلہہ: پینے کے لئے لوگ صبح سویرے زمین دوز بنائے گئے چار یا پانچ فٹ گہرے کنویں میں ندی کا پانی ذخیرہ کرتے کیونکہ اس وقت ندی کا پانی صاف ہوتا اور گندگی کا احتمال بالکل نہیں ہوتا تھا۔مقامی لوگ ان کنوؤں کو ''گلگلہہ'' کہتے

ہیں۔اس طرح کے کنویں جگہ جگہ بنائے جاتے اور اس کے پہلو میں پانی نکالنے کیلئے لکڑی، لوہے یا چمڑے کا ایک بڑا ڈول رکھ دیتے۔ پیاسے راہگیر ان کنوؤں سے پانی پی کر اپنی پیاس بجھاتے۔تقریباً ہر محلے میں ایک ''گلکہہ'' ضرور ہوتا تھا، جہاں سے اہلِ محلّہ پینے کے لئے پانی حاصل کرتے تھے۔

گھڑی/ شکار: ضلع دیامر کے موضع جات بالخصوص داریل اور تانگیر میں تین تین منزلہ مکان بناتے، جسے اہلِ داریل/تانگیر ''گھڑی'' جبکہ اہلِ گور چلاس ''شکار'' کہتے۔یہ گھڑیاں رہائش کے ساتھ ساتھ واچ ٹاور کے طور پر بھی استعمال میں لائے جاتے۔یہ عموماً بیرونی حملوں سے بچنے کے لئے گاؤں کے چاروں اطراف دفاعی حکمت عملی کے تحت بناتے۔ان گھڑیوں کی دیواریں بھی پتھر اور لکڑی پر مشتمل ہوتیں جبکہ چھت تمام کی تمام لکڑی پر مشتمل ہوتی۔لکڑی کی سیڑھی گھڑی کے اندر سے ہوتے ہوئے آخری منزل تک رہنمائی کرتی۔ حملے کی صورت میں دشمن پر جوابی فائرنگ کے لئے گھڑی کی بالائی منزل میں خصوصی سوراخ چھوڑ دیے جاتے۔گھڑیاں لوگوں کی مشترکہ بھی ہیں اور انفرادی بھی۔آجکل یہ گھڑیاں زیادہ تر سٹور کا کام دیتی ہیں۔

ماضی میں ایک عام زمیندار کی چار دیواری روایتی گھر کے علاوہ درج ذیل پر مشتمل ہوتی تھی:۔

ھَمَر: روایتی گھر کی چھت کے نیچے کسی کونے میں یا مکان سے ملحق برآمدے (مکھیان) کے احاطے میں چار یا پانچ فٹ اونچی دیوار تعمیر کر کے بناتے۔ اس کا کوئی دروازہ نہیں ہوتا تھا۔اسے غلہ ذخیرہ کرنے کے لئے بناتے۔ جب غلہ نکالنے کی ضرورت پڑتی تو اوپر کی طرف سے پھلانگ کر اس میں داخل ہونا پڑتا۔

تَون: یہ عموماً لکڑی کا بناتے جو صندوق کی طرح ہوتا۔البتہ اس کا حجم کافی بڑا ہوتا۔ اسکے جوڑ عارضی طور پر لکڑی کے میخوں سے جوڑے جاتے اور بوقتِ ضرورت اسے فولڈ بھی کیا جا سکتا تھا۔ یہ دیسی گھر میں اس طرف رکھا جاتا جس طرف پاپوش وغیرہ رکھے جاتے ہیں اور جس جگہ کو عرفِ عام میں ''شوم'' کہتے ہیں۔اس میں بھی عام طور پر غلہ رکھتے ہیں۔

کھٹول: یہ ٹوکرہ نما ہوتا ہے۔ نیچے سے کھلا اور اوپر سے قدرے تنگ ہوتا ہے۔اسے توت کی نازک شاخیں گرم کر کے انہیں حسبِ منشا توڑ مروڑ کر بناتے ہیں۔چھت کے اوپر کسی نمایاں جگہ پر رکھتے ہیں۔ جو ہر وقت اہلِ خانہ کی نظروں کے سامنے ہو۔اس کے اندر اور باہر گارے سے پلستر کر کے غلہ یا خشک پھل وغیرہ سٹور کرنے کے لئے استعمال کرتے ہیں۔

ڈھینح: یہ عام طور پر سطحِ زمین کے نیچے بنائے جاتے۔یہ مٹکا نما ہوتا تھا۔ بعض جگہوں پر بڑے بڑے مٹکے بھی بطور ''ڈھینح'' استعمال میں لائے جاتے تھے۔ پہلے زمانے میں قیمتی سامان اور زیورات کے علاوہ اس میں حسبِ ضرورت غلہ بھی سٹور کرتے۔بعض دفعہ سردیوں میں اسے دیسی شلغم اور آلو وغیرہ سٹور کرنے کے لئے بھی استعمال میں لاتے تھے۔''**ڈھینح**'' عموماً کسی خفیہ مقام پر بناتے۔ اس کی جگہ کا علم صرف گھر کے ذمہ دار لوگوں کو ہوتا۔اسے بنانے کا ایک مقصد یہ بھی ہوتا تھا تاکہ گھر کا اثاثہ حملہ آوروں کے ہاتھ نہ لگے۔اسے چکنی مٹی والی زمین پر بناتے اور پلستر کے ذریعے اس کے سوراخ وغیرہ بند کئے جاتے۔ اسکے مختلف اطراف پر بھوج پتر کے بڑے بڑے شیٹ لگا کر نمی اور مٹی وغیرہ سے بچاتے۔ زمین کے اندر سیال مادے کو سٹور کرنے کے لئے ''سان'' بنائے جاتے۔

ڈھنگ اوں: یہ ایک کمرہ ہوتا ہے جو عموماً چھت کے اوپر ''بلتیع'' کے آس پاس بنایا جاتا۔اسے ''نسالو'' کا گوشت، خشک سبزیاں اور پھل وغیرہ سٹور کرنے کے لئے استعمال کرتے۔آج بھی کہیں کہیں مکان کی چھتوں پر ''ڈھنگ اوں'' نظر آتا ہے۔

مُچلیع: یہ عموماً برلبِ ندی بناتے ہیں۔یہ ڈھائی یا تین فٹ اونچا کمرہ نما ہوتا ہے۔ندی کا تھوڑا سا پانی اس میں سے گزار دیتے ہیں جو ہر وقت جاری رہتا ہے۔اس میں عموماً دودھ، دہی، لسی اور تازہ مکھن وغیرہ رکھ دیتے۔ زیادہ تر مال مویشی کے مالک جن کے ہاں وافر مقدار میں دودھ ہوتا ہے، ''مچلیع'' تعمیر کرتے ہیں۔اسے مکان کے باہر لیکن چار دیواری کے اندر بناتے ہیں۔ پرانے وقتوں میں اسے بطورِ ریفریجریٹر استعمال میں لاتے تھے۔''مچلیع'' کہیں کہیں آج بھی موجود ہے۔

عبادت گاہوں کا طرزِ تعمیر

اسلام ان علاقوں میں پھیلا تو اجتماعی عبادت کے لئے لوگوں نے مسجد کی ضرورت محسوس کی۔سب سے پہلے نماز کے لئے ایک صف میں قبلہ رو ہو کر کھڑا ہونا پڑتا ہے اور امام کے لئے جو نماز پڑھاتا ہے، جگہ کی تخصیص کی جاتی ہے۔لہٰذا یہیں سے مسجد کا ہال مستطیل شکل کا اور مغربی دیوار کے مرکز میں امام کے لئے محراب کی تعمیر کا آغاز ہوا۔تمام مساجد کے رخ کے لئے اس طرح کا عالمی اصول عمارت سازی کے فن میں بہت مختلف اور منفرد ہے۔

مسجد کے ساتھ ساتھ ایک اور کمرہ بھی تعمیر کیا جاتا جسے مقامی لوگ ''کٹ گئی'' کہتے ہیں۔اس کمرے کو عموماً مسافر خانہ کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ پرانے زمانے میں بنائی گئی مساجد میں کوئی مینار اور گنبد نہیں ہوتا تھا۔ جبکہ عصرِ حاضر میں جو مساجد بنائی جاتی ہیں ان میں ان دونوں کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ مساجد کے علاوہ امام بارگاہ، خانقاہ اور جماعت خانے بھی یہاں پر موجود ہیں جو

مسلمانوں کی عبادت گاہوں کے طور پر جانے جاتے ہیں۔ان عبادت گاہوں میں بھی نقش نگاری کے اعلیٰ نمونے ملتے ہیں۔زمانہ قدیم میں مسجدوں اور دیگر عبادت گاہوں میں نووارد، سیاح اور مسافر شب باشی کرتے تھے جبکہ اہلِ محلّہ ان کو خوراک کا اہتمام بھی کرتے تھے۔مسجد کے علاوہ ان علاقوں میں دیگر عبادات اور مذہبی مقاصد کیلئے بنائی جانے والی عمارتیں تین طرح کی ہیں۔جن میں امام بارگاہیں، جماعت خانے اور مقبرے شامل ہیں۔مساجد میں نمازیں انفرادی اور اجتماعی طور پر بھی پڑھی جاتی ہیں۔مساجد میں محلّہ مسجد، جامع مسجد اور عیدگاہ شامل ہیں۔مسجدوں میں موسمی اثرات سے بچنے کیلئے چھت بھی تعمیر کرتے ہیں۔جبکہ عیدگاہ بغیر چھت کے ایک کھلا میدان ہوتا ہے۔جس میں عید کی نماز پڑھی جاتی ہے۔جامع مسجد میں محراب کے ساتھ ساتھ امام کو خطبہ دینے کیلئے منبر بھی بناتے ہیں۔ہر مسجد کی بائیں جانب ایک اونچی جگہ ہوتی جہاں پر چڑھ کر اذان دی جاتی جبکہ وضو اور استنجا کیلئے خصوصی جگہ ہوتیں۔مسجد سے ملحق امام کیلئے کمرہ اور ایک مسافر خانہ (گُٹ گی) ہوتی۔قبل ازیں راجاؤں کے محلوں میں بھی مساجد موجود ہوتی تھیں، جہاں پر شاہی خاندان کی خواتین نماز پڑھتیں۔ایسی مساجد ''نگینہ یا نینا'' کہلاتی تھیں۔امام بارگاہوں میں شہدائے کربلا کی یاد تازہ کرنے کیلئے مجالس منعقد ہوتی ہیں۔مساجد عبادات اور امام بارگاہ ماتمی جلوس کے علاوہ لڑکوں اور لڑکیوں کو دینی تعلیم دینے کیلئے بھی استعمال میں لائے جاتے ہیں۔البتہ مرکزی امام بارگاہ محرم کی مجالس کے دوران استعمال کرتے ہیں۔امام بارگاہ بھی ایک بڑے ہال پر مشتمل ہوتا ہے۔جس میں عورتوں کے بیٹھنے کیلئے جگہ مختص ہوتی ہے۔یہاں پر بھی ذاکرین کے بیٹھنے کیلئے منبر موجود ہوتا ہے۔امام بارگاہ کے ساتھ ایک کمرہ بھی بناتے ہیں جو سٹور کے علاوہ بعض دفعہ کچن کا کام بھی دیتا ہے، جہاں عزاداروں کے لئے تبرک وغیرہ تیار کرتے ہیں۔

اسماعیلی برادری کے لوگ عبادات کیلئے جو عمارت تعمیر کرتے ہیں اسے جماعت خانہ کہتے ہیں۔جماعت خانہ بھی ایک بڑے ہال پر مشتمل ہوتا ہے۔جس سے ملحق برآمدہ بھی ہوتا ہے۔اس میں عبادات کے علاوہ مذہبی اور دنیوی تعلیم بھی دی جاتی ہے۔شیعہ، سنی کی عبادت گاہوں میں ہر کوئی مسلمان عبادت کیلئے جا سکتا ہے لیکن جماعت خانوں میں سوائے اسماعیلی برادری کے کسی اور کا داخلہ ممنوع ہے۔ماضی میں مزارات کے اردگرد لکڑی سے جنگلہ بناتے جبکہ بزرگ ہستیوں کے مزار کے اردگرد ایک کمرہ تعمیر کیا جاتا۔کمرے کے اندر مزار کے اردگرد طواف کیلئے جگہ بھی چھوڑتے۔ برگزیدہ ہستیوں کے مزار آستانہ (استان) کہلاتے۔ان مزاروں کی تعمیر میں لکڑی پتھر اور گارا استعمال ہوتا تھا۔عام مزاروں کی چاروں طرف دیوار بندی کی جاتی۔مزاروں کے احاطے کی کھلی جگہ کو عام مسلمانوں کے مزارات کیلئے استعمال کرتے۔دنیور کی زیارتِ گاہ کی گنبد دار چھت پر لکڑی کا مینار تبتی طرزِ تعمیر کا آئینہ دار ہے۔اس مینار کی لکڑی پر نہ صرف خوبصورت کشیدہ کاری کی گئی ہے بلکہ اس کا نچلا چیمبر شکل و شباہت میں ہشت پہلو بھی ہے۔اور اسی پر مینار قائم ہے۔اس زیارت گاہ کے دروازے پر بھی کشیدہ کاری کی گئی ہے۔دروازے پر لٹکی ہوئی ایک زنجیر ہے جسے زائرین ہاتھ سے پکڑ کر دعا مانگتے ہیں۔جب کبھی دنیور میں خشک سالی یا قحط سالی ہوتی تو لوگ حسبِ توفیق پیسہ یا غلّہ جمع کر کے زیارت کے احاطے میں نذر و نیاز کر کے لوگوں میں تقسیم کرتے تو مشکلات حل ہوتیں۔طوفانی بارشوں کی صورت میں دیگر زیارتوں میں بھی اس طرح کی نذر و نیاز کا اہتمام کر کے اجتماعی دعا کی جاتی۔

محلات:

ان علاقوں میں راجوں مہاراجوں کے محلات (راکوہ) کا طرزِ تعمیر بھی خصوصی ہوتا تھا۔یہ محلات کئی منزلہ ہوتے تھے۔جن کے دروازے، کھڑکیاں، چھت، ستون اور الماریاں اعلیٰ نقش نگاری اور کشیدہ کاری کے مظہر ہوتے تھے۔راجوں کے محلات میں مہمان خانے، دیوانِ خاص اور زنان خانوں کے علاوہ دربارِ خاص کے لئے خصوصی جگہ بھی مختص ہوتیں۔محافظوں کے لئے قلعے کے تقریباً ہر کونے میں برجیاں ہوتی تھیں۔راجوں کے محلات میں ایک روایتی گھر بھی ہوتا تھا جسے ''گسر کم راکوہ'' کہتے تھے۔جس کی چھت روایتی فنِ تعمیر کا اعلیٰ نمونہ ہوتی تھی۔یہ گھر آج کل بھی صاحبِ ثروت لوگ قدرے تبدیلی کے ساتھ شوقیہ طور پر بناتے ہیں۔یہاں کے محلات کی تعمیر میں کشمیری اور بلتی کاریگروں کی ہنرمندی صاف نظر آتی ہے۔شاہی طبقہ کے محلات تقریباً ہر ضلع میں ہوتے تھے، جسے حکمران طبقہ استعمال کرتا تھا۔

قلعۂ فردوسیہ گلگت شہر کے وسط میں حکمرانوں کے جاہ و جلال کا مظہر تھا۔یہ قلعہ کئی بار تباہ اور کئی بار تعمیر ہوا۔اس کا مرکزی حصہ جس میں ایک اونچا مینار بھی تھا، رانی گوہرامان نے اپنے دوسرے دورِ حکومت میں تعمیر کرایا تھا۔اب قلعے کے آثار تو کہیں نظر نہیں آ رہے ہیں البتہ متذکرہ مینار آج بھی اپنی جگہ پر قائم ہے۔قلعہ فردوسیہ در دطرزِ تعمیر کا نمونہ تھا۔اس کی دیواروں پر لکڑی کے فریم بنا کر ان کے اندر پتھروں سے بھرائی کی گئی اور بعد میں مٹی کا پلستر کر کے اسے مزید پائیدار بنایا گیا۔1871ء کے موسم بہار کے دوران شدید زلزلہ آیا جس کی وجہ سے قلعے کا کافی حصہ زمین بوس ہو گیا۔

بعض روایات کے مطابق شاہ رئیس اعظم کی حکومت کے بعد جب گلگت کا علاقہ اس مشترک حکومت کے عمل دخل سے آزاد ہوا تو گلگت کو سات حصوں میں تقسیم کیا گیا۔جس کو مقامی زبان میں ''مقسوہ یا مسکوہ'' کہتے۔اسی ''مقسوہ'' کے حوالے سے گلگت کے قلعہ فردوسیہ میں بھی سات برجیاں بنائی گئیں۔جہاں سات

''مقسوہ'' کے لوگ باری باری ڈیوٹی دیا کرتے تھے۔ اب اس قلعے کے منہدم کرنے کے بعد صرف ایک برجی موجود ہے، جسے راجا گوہر امان نے مرمت کر کے استحکام بخشا ہے۔

نگر کی سابق ریاستی حکومت کا شاہی قلعہ نگر خاص میں آج بھی سیاحوں کو دعوتِ نظارہ دے رہا ہے جبکہ ضلع دیامر میں چلاس کا قلعہ خستہ حالت میں ہے جو آج کل محکمہ پولیس کے تصرف میں ہے۔

بیاک:

چھوٹے چھوٹے محلّہ جات میں ایک مرکزی اور نمایاں جگہ فارغ وقت گزارنے اور باہمی گفت وشنید اور اجتماعی مسائل بحث کرنے کے لئے مخصوص ہوتی تھی، جسے مقامی لوگ ''بیاک'' کہتے تھے۔ بعض دفعہ ''بیاک'' میں قصہ گو حضرات نوجوانوں کی فرمائش پر بادشاہوں، جنوں اور پریوں کے علاوہ اپنے آباؤ اجداد کے کارنامے مزے لے لے کر سناتے تھے۔ ''بیاک'' کی جگہ صرف مردوں کے لئے مخصوص ہوتی تھی۔ شادی بیاہ کے مواقع پر اسی جگہ گانے بجانے کا اہتمام کیا جاتا اور لوگ باری باری ناچتے۔ آج کل بیاک کا سلسلہ پس منظر میں چلا گیا ہے۔ البتہ مساجد اور دوسری عبادت گاہوں کے بیرونی احاطے بطورِ بیاک استعمال میں لائے جاتے ہیں۔ جہاں پر تعلیمی اور مذہبی باتوں، اجتماعی خیرات، مقامی، ملکی اور عالمی خبروں پر تبصروں کے علاوہ اور کچھ نہیں ہوتا۔

مویشی خانے/ پناہ گاہیں:

پرانے وقتوں میں انسانی پناہ گاہوں سے زیادہ جانوروں کے لئے پناہ گاہیں زیادہ ہوتی تھیں۔ کیونکہ مال مویشی کی فطرت اور عادات کو مدنظر رکھتے ہوئے ان کے لئے عارضی الگ الگ پناہ گاہیں بنائی جاتیں تھیں۔

شرانو:

اس میں گائے بیل وغیرہ گرمیوں کے موسم میں رکھتے ہیں۔ دو کمروں کے برابر ہوتا ہے۔ چھپر وغیرہ سے عارضی سی چھت بناتے ہیں، جسے ''پیالی'' کہتے ہیں۔ چار دیواری بھی زیادہ نہیں ہوتی۔ عارضی چھت اور چار دیواری کے درمیان کی جگہ کھلی چھوڑ دی جاتی ہے۔ گدھے رات کو شرانو میں ہی رکھتے۔ سردیوں کی راتوں میں گدھوں کی پوشاک جسے مقامی لوگ ''توکوم'' کہتے ہیں، پیٹھ پر رکھ دیتے تاکہ سردی نہ لگے۔ گدھوں کے لئے گھاس پھوس اور ''بسپور'' وغیرہ رکھنے کی خاطر جو جگہ بنائی جاتی اسے مقامی زبان میں ''مدھر'' (کھرلی) کہتے ہیں۔ ''شرانو'' اور ''گینل، باء'' وغیرہ سے سالانہ ایک بار کھاد نکال کر کھیتوں کو دی جاتی۔ تاکہ زمین کی زرخیزی میں اضافہ ہو۔

گینل:

شرانو کے ساتھ ملحق ایک بڑا کمرہ ہوتا ہے۔ شرانو سے ہو کر اس کے اندر جانا پڑتا ہے۔ اس میں سردیوں کے موسم میں مال مویشی رکھتے ہیں۔

گسپر:

یہ بھی ایک کمرہ ہوتا ہے جس میں بھوسہ اور دیگر گھاس پھوس وغیرہ ذخیرہ کرتے ہیں۔ بوقتِ ضرورت سونے کے لئے بھی اسے استعمال میں لاتے ہیں۔

باء و ہرای:

باء میں بھیڑ، بکری اور گائے کے بچھڑے وغیرہ رکھتے ہیں جبکہ ہرای میں بھیڑ بکریاں رکھی جاتی ہیں۔

ڈھکری (منڈوع):

دڑبا کو کہتے ہیں۔ اس میں مرغ اور مرغیاں وغیرہ رکھی جاتی ہیں۔ برآمدے کے کسی کونے میں بناتے ہیں۔ ڈھائی یا تین فٹ اونچی دیوار بنا کر اس پر گھاس پھوس ڈالتے ہیں اور اس کے اوپر مٹی ڈال کر عارضی سی چھت بناتے ہیں۔

انشپ لیع:

گھوڑے کو مقامی زبان میں ''انشپو'' جبکہ اصطبل کو ''انشپو لیع'' کہتے ہیں۔ مالدار لوگ جو گھوڑے پالنے کے شوقین ہوتے، ان کے ہاں اصطبل بھی بنائے جاتے۔ گھوڑوں اور گدھوں کو کھانے کے لئے غلہ (مکئی) وغیرہ دے دیتے۔ کھانے کے لئے غلہ وغیرہ پیش کرنے کے اس عمل کو ''بسپور دونک'' کہتے ہیں۔ ''انشپو لیع'' زیادہ تر راجوں مہاراجوں کے ہاں تعمیر کئے جاتے تھے یا گھوڑے پالنے کے شوقین لوگ اپنے ہاں بناتے تھے۔

مروجہ کیلنڈر، تقویم اور وزن کے پیمانے

ماضی میں انسانوں نے ماہ وسال کی تقویم جاننے کے لئے ہمیشہ سورج، چاند اور ستاروں کی مدد لی ہے۔ مرغے کے بانگ سے بھی وقت معلوم کرنے میں مدد ملتی تھی۔ رات کو مرغے کی پہلی بانگ جو عموماً ایک بجے کے قریب ہوتی، کو سن کر سحری کے لئے جاگتے اور وقفے وقفے سے دی جانے والی تین بانگوں کے بعد جب طلوع سحر کا اظہار ہوتا تو کھانا بند کرتے اور روزہ شروع ہوتا۔ نماز کے اوقات، مریضوں کو دوا پلانے اور کام کاج شروع کرنے کیلئے وقت کا اندازہ بھی سورج اور مرغے کی بانگ سے لگاتے۔ شام کو بسیرا ڈھونڈنے والے پرندوں اور جانوروں کو دیکھ کر بھی وقت کا اندازہ لگایا جاتا تھا۔ صبح، دوپہر اور شام کے وقت کا،

سایہ اور سورج کا مقام دیکھ کر اندازہ لگاتے۔ سورج کو شنا میں ''سُوری'' کہتے ہیں۔ کسی زمانے میں سورج وقت کا پیمانہ ہوتا تھا۔ ''کھل'' وقت شماری کی بنیادی اکائی ہے۔ شنا میں وقت کیلئے ''کھین'' اور دن کے لئے ''دیز'' کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ پرانے وقتوں میں مستعمل وقت ماپنے کے پیمانے کے مطابق تین گھنٹوں کا ایک گھنٹہ شمار ہوتا تھا۔ ''اووی سُوری'' یا ایک کھل سُوری سے تین گھنٹے، دوہای یا دو کھل سوری سے چھ گھنٹے، چے ہای یا چے کھل سوری سے نو گھنٹے، چار ہای یا چار کھل سوری سے بارہ گھنٹے، پوش ہای یا پوش کھل سوری سے پندرہ گھنٹے، سہ ہای یا سہ کھل سوری سے اٹھارہ گھنٹے، ست ہای یا ست کھل سوری سے اکیس گھنٹے، کوٹی یا انس کھل سوری سے چوبیس گھنٹے مراد لئے جاتے تھے۔ دن کی تبدیلی کا شمار سرِ شام سے کرتے تھے۔ اسی نظام الاوقات کے مطابق زمانہ قدیم سے پانی کی وارہ بندی مقرر تھی۔ دُبِ اکبر، قطبی ستارہ، کہکشاں، ثریا اور لچھار تارو کی بدلتی کیفیات سے رات کے مختلف پہروں کا اندازہ لگاتے تھے۔ سال کو کالو اور بیل، مہینہ ماز، صبح صادق کو لوح، صبح کو چلبُو جی رلوسَ ٹیں، دوپہر کو دزوع، سہ پہر کو بلیکال، شام کو شام رباس اور شب کو راتی کہتے ہیں۔ گزشتہ کل کو بلہ، گزشتہ سے پیوستہ کو اچِ، آنے والے کل کو لُسٹا نک اور پرسوں کو حیڑنگ کہتے ہیں۔ ہر مہینہ تیس دنوں کا شمار ہوتا ہے۔ اس طرح سال تین سو ساٹھ دنوں کا ہوتا تھا۔ لوگوں کے خیال کے مطابق اکیس جون اور اکیس دسمبر کو سورج اپنے گھونسلے میں بالترتیب اڑھائی اڑھائی دن قیام کرتا ہے جس سے سال کے تین سو پینسٹھ دن پورے ہوتے ہیں۔ ہر مہینہ انگریزی کی اکیس تاریخ سے شروع ہوتا ہے۔

مہینوں کے نام:

(۱)۔ نوروزی ماز (۲)۔ مناکو ماز (۳)۔ گمکی ماز
(۴)۔ پری اسای ماز (۵)۔ تھپ سنی ماز (۶)۔ استی ماز
(۷)۔ قبلای ماز (۸)۔ شری چرپو ماز (۹)۔ گرگنی بائی
ماز (۱۰)۔ گرو ماز (۱۱)۔ یُونی ماز (۱۲)۔ بی پھوی ماز۔

دیامر چلاس کی طرف جو مہینے مستعمل تھے ان میں جنوری مل ماز، فروری تے بینو، مارچ شینو، اپریل نینو، مئی مینو، جون سن نو، جولائی لینچو، اگست کھلو، ستمبر بینو، اکتوبر شرشلو، نومبر نوشو، دسمبر بونیو کے نام سے موسوم تھے۔ جہاں تک دنوں کے ناموں کا تعلق ہے تو اتوار کو اَوِت، سوموار کو حنڈرو، منگل کو انگارو، بدھ کو بودو، جمعرات کو برسپت، جمعہ کو شکر اور سنیچر کو شمشر کہتے ہیں۔ استور میں مہینوں کے نام کے بجائے پندرہ واڑے کا سلسلہ موجود تھا۔ پندرہ واڑہ کو اہل استور ''پچھ'' کہتے۔ لوگوں کے مطابق ایک ماہ کیلئے دو پچھ اور ایک سال کیلئے چوبیس پچھ شمار کئے جاتے تھے۔ شروع چاند سے چاند مکمل ہونے تک ایک پچھ تصور ہوتا اور یہ حصہ ''پون'' یعنی روشنی کہلاتا جبکہ چاند کے باقی پندرہ دنوں کا حصہ دوسرا پچھ تصور ہوتا جو ''چھین'' یعنی اندھیرا کہلاتا۔ استور کے لوگ ماضی میں ہر پچھ کے ساتھ کوئی نہ کوئی سرگرمی بھی منسوب کیا کرتے تھے۔ ان سرگرمیوں کا خلاصہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے:

۱) کٹہ سرای پون:
اکتوبر کے مہینے میں موسم زمستان کے دوران گھریلو استعمال کیلئے لوگ ایندھن جمع کرتے تھے۔ لوگوں کا یہ عمل ''کٹہ سرای'' کہلاتا تھا۔

۲) پڑیلو چھین:
اکتوبر کے مہینے میں ہی زمستان میں گھریلو استعمال کیلئے اناج وغیرہ پیس کر ذخیرہ کرنے کا عمل ''پڑیلو چھین'' کہلاتا تھا۔

۳) ڈائیکوی پون:
موسم سرما میں نومبر دسمبر کے مہینے میں مال ذبح کر کے سردیوں میں استعمال کرنے کیلئے گوشت ذخیرہ کرنا ''ڈائیکوی پون'' کہلاتا۔

۴) سنگھیوں چھین:
اس سے ڈائیکو کے جانور سے حاصل ہونے والی اوجھڑی اور چربی وغیرہ سے خاص کھانے تیار کرنا مراد ہے۔

۵) پھلیو پون:
دسمبر کے مہینے کے اس پندرہ واڑہ میں کوئی خاص سرگرمی نہیں ہوتی۔

۶) نشو چھین:
ماہ دسمبر کے اس پندرہ واڑہ میں درم بلائی پکاتے ہیں۔

۷) چیو پون:
چیو میں ''اشار'' کی رسم ادا کی جاتی ہے اور مہینہ جنوری کا ہوتا ہے۔

۸) پوشے وین چھین:
جنوری کے پندرہ واڑہ کے آغاز میں برتنوں میں جَو اور گندم کے دانے بھگو کر کسی گرم جگہ پر رکھتے ہیں تو چند دنوں میں ان سے کونپلیں پھوٹتی ہیں۔ ان کونپلوں کو مرد و زن اپنی اپنی ٹوپیوں پر سجا کر خوشیاں مناتے ہیں۔

۹) نیو پون:
فروری کے مہینے میں دن طویل ہوتا جاتا ہے اور سورج کی گرمی بھی دن بدن بڑھتی ہے تاہم رات کو شدید سردی ہوتی ہے۔

۱۰) ہنگاؤ چھین:
فروری کے پندرہ واڑہ میں بونجی تا ڈوئیاں گرمی ہوتی ہے اور کاشت کا کام تقریباً شروع ہوتا ہے۔

۱۱) شیٹیو پون:

روایت کے مطابق مارچ کے مہینے میں ''شیٹیو پھ'' کے دوران خوشگوار موسم ہوتو گرمیوں کے موسم کی یاد تازہ ہوتی ہے اور اگر برف باری ہو جائے تو بہت زیادہ برف باری ہوتی ہے۔ استوری شنا کی ایک کہاوت ہے کہ ''شیٹیو رولوتو یونو بھگای، شیٹیو ہزیلوتو والو بھگای'' یعنی اگر شیٹیو رویا تو موسم سرما کا وسط اور ہنسا تو گرما کا وسط ہوتا ہے۔

۱۲) لچھ گاؤ:

مارچ کے اس پندرہ واڑے میں نشیبی علاقوں سے برف پگل کر زمین خشک ہوتی ہے اور لوگ مال مویشی کو چرنے کے لئے کھلا چھوڑتے ہیں۔

۱۳) دودھای چھیلو پون:

اپریل کے مہینے میں مال مویشی فربہ ہونے لگتے ہیں اور اس دوران بھیڑ بکریوں کے بچے پیدا ہوتے ہیں، جس کی وجہ سے دودھ کی فراوانی ہوتی ہے۔ اس لئے یہ حصہ دودھ والا پندرہ واڑہ کہلاتا ہے۔

۱۴) منیو چھین:

مئی کے مہینے میں جب دودھ کی فراوانی ہوتی ہے تو اسے متھ کر خوب گھی نکالتے ہیں۔

۱۵) بنیو:

بنیو سے مراد ہل چلانے کا پندرہ واڑہ ہے۔ اس کا آغاز ایک خاص رسم سے کیا جاتا ہے۔ روایت کے مطابق گاؤں کے معمر ترین شخص کی پیٹھ پر بیج کا تھیلا رکھتے ہیں تو وہ اسے متعلقہ کھیت تک لے جاتا ہے۔ بوڑھا شخص وہاں پہنچ کر ایک ساتھی کی مدد سے ''ھوپ پلہ ھس'' کا نعرہ لگا کر کچھ بیج زمین پر بکھیرتا ہے اور ہل چلانے کا آغاز کرتا ہے۔ اس موقع پر تبرک کے طور پر کچھ کھانا کھیت میں موجود لوگوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ اس رسم کے بعد گاؤں والوں کو اپنے اپنے کھیتوں میں ہل چلانے کی عام اجازت ہوتی ہے۔ ''ھوپ پلہ ھس'' دیوتا کا نعرہ تصور ہوتا ہے۔ گلگت میں کسی باری بوجھ کو اٹھاتے وقت یہ الفاظ ادا کئے جاتے ہیں۔

1860 کے بعد گلگت میں سرکاری طور پر بکرمی سال اور مہینے رائج ہوئے۔ لیکن فصلی اور موسمی امور کے سلسلے میں برجی مہینے یعنی حمل، ثور، جوزا، سرطان، اسد، سنبلہ، میزان، عقرب، قوس، جدی، دلو اور حوت کا استعمال بھی ہوتا تھا۔ آہستہ آہستہ اسلامی مہینے بھی مستعمل ہونے لگے۔ 1935 کے بعد انگریزوں کے دور حکومت میں یہاں عیسوی سال اور مہینے رائج ہوئے اور یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے۔

پرانے وقتوں میں لوگ اپنی عمروں کا حساب مختلف اہم واقعات کے حوالے سے رکھتے تھے۔ عرب والے سن ہجری سے پہلے اصحاب فیل کے واقعے سے حساب لگاتے۔ یونانی، اولمپک اور روم کی بنیاد پڑنے کے سال سے گنتی کرتے۔ اسی طرح اہل گلگت بھی اہم تاریخی واقعات کے حوالے سے اپنی اور دوسروں کی عمروں کا اندازہ لگاتے ہیں۔ تاج مغل کا حملہ، گوہر امان کے گلگت پر حملے، نگر کی لڑائی، بھوپ سنگھ پڑی کی جنگ، ڈوگروں کا گلگت پر قبضہ، 1893 کی بندوبست اول، 1915 کی بندوبست ثانی، 1905 کا سیلاب، 1935 کے پٹہ کا معاہدہ، نومبر 1947 آزادئ گلگت کا واقعہ اور گلگت ائیر پورٹ کی تعمیر جیسے اہم واقعات سے عمروں کا اندازہ لگاتے تھے۔ چیزوں کی لمبائی معلوم کرنے کے لئے ہاتھوں، بازوؤں اور قدموں کا سہارا بھی لیا جاتا تھا۔ وزن معلوم کرنے کے لئے کسی چیز کو ہاتھوں سے اٹھا کر اندازہ لگاتے تھے۔ اگر چہ یہ طریقے مستند تو نہ تھے لیکن لوگوں کو انہیں اختیار کرنے کے علاوہ کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔ دُبِّ اکبر کو یہاں کے لوگ ''کھٹ'' یعنی چارپائی کے نام سے موسوم کرتے۔ گردش زمین کے ساتھ جیسے جیسے یہ ستارے متحرک ہوتے تو وقت کے بارے میں اندازے لگائے جاتے۔

شنا گنتی:

شنا گنتی، شمار میں عربی گنتی سے ملتی جلتی ہے۔ جس طرح عربی میں دس کے بعد گیارہ کے لئے ''احد عشر'' یعنی ایک اور دس استعمال ہوتا ہے اسی طرح شنا میں بیس کے بعد اکیس کیلئے ''بی گہ اک'' یعنی بیس اور ایک استعمال ہوتا ہے۔

اردو	شنا	اردو	شنا	اردو	شنا	اردو	شنا
ایک	اک	دو	دو	تین	حے	چار	چار
پانچ	پوش/پوئیں	چھ	سہ	سات	ست	آٹھ	انس
نو	نو	دس	دَی	گیارہ	اکای	بارہ	بای
تیرہ	حوئیں	چودہ	چوندَی	پندرہ	پنژی	سولہ	سوئیں
بیس	بی	تیس	بی گہ دَی	چالیس	دوبی	سو	شَل

ناپ اور وزن کے پیمانے:

پرانے وقتوں میں روغنیات کے اپنے پیمانے ہوتے تھے۔ ایک اوو یا ہای ڈیڑھ چھٹانگ کا ایک پیمانہ ہوتا تھا۔ دو ہای تین چھٹانگ، حے ہای ساڑھے چار چھٹانگ، چار ہای چھ چھٹانگ، پانچ ہای ساڑھے سات چھٹانگ، سہ ہای نو چھٹانگ، ست ہای ساڑھے دس چھٹانگ وغیرہ شمار ہوتے تھے۔ جس برتن میں

ہمسائے سے کوئی چیز ادھار لیتے اسی برتن میں واپس کرتے تھے۔ لمبائی ماپنے کے لئے ایک انگلی کے برابر چوڑائی کو ''جھپ'' ایک بالشت ''اک وِٹ'' اور ایک ہاتھ کے برابر لمبائی یا چوڑائی ''اک ہت'' کہلاتی۔ کپڑا اور پٹو وغیرہ کے پیمائش کا پیمانہ بھی یہی تھا۔ زمین کا ناپ تول قدم لگا کر کیا کرتے تھے۔

قدیم گلگت میں سونے کے علاوہ جنس کا تبادلہ، کاروبار کا ایک اہم ذریعہ تھا۔ گندم کے بدلے کپڑا، خشک میووں کے بدلے نمک، بھیڑ بکریوں کے بدلے اناج دینے کا رواج عام تھا۔ مقامی طور پر بنائے گئے چمڑے کے بڑے تھیلے جنہیں مقامی لوگ ''کوتو یا ژتای'' کہتے ہیں، میں اناج یا آٹا رکھتے اور انہیں بطور پیمانہ بھی استعمال کیا کرتے۔ بید کی لکڑی سے بنائی گئی ایک تھالی نما برتن جسے ''گڈر'' کہتے ہیں، کو بھی اناج کا وزن کرنے کیلئے استعمال میں لاتے تھے۔ ایک گڈر اناج وزن میں کہیں پانچ سیر اور کہیں اس سے کم یا زیادہ ہوتا۔ مرور زمانہ کے ساتھ اناج وزن کرنے کیلئے ''ہای'' کا پیمانہ وجود میں آیا۔ یہ پیمانہ عموماً اڑھائی پونڈ یا 1.134 کلوگرام کے برابر ہوتا تھا۔ بعض مقامات پر یہ بڑا چھوٹا بھی ہوتا تھا۔ چھ ہای وزن ایک ''کوٹی'' کہلاتا۔ ہای بید کی لکڑی کا لمبوترا اور گول برتن ہوتا تھا۔ اس پر چمڑا چڑھا کر دیر تک استعمال میں لاتے تھے۔ گلگت میں 1842 کے بعد جو پیمانے رائج تھے ان کے مطابق چھ ٹوپہ ایک کوٹ، بیس ٹوپہ ایک سینا، سئی اور بونجی کے علاقوں میں ساٹھ ٹوپہ ایک کھروار اور باقی تحصیل گلگت میں باسٹھ ٹوپہ ایک کھروار کے برابر ہوتے تھے۔ استور میں ''ترک'' آٹھ سیر جبکہ گلگت میں چھ سیر کا شمار ہوتا تھا۔ ''طولو'' سونے کے وزن کا پیمانہ تھا۔ ایک طولو آٹھ ماشہ سونے کے وزن کے برابر ہوتا تھا۔ اس طرح دوسر کھو ایک رَٹ، دو رَٹس ایک باغلو اور دو باغلو ایک طولو وزن کے برابر تصور ہوتے تھے۔ شادی بیاہ کے مواقع پر دلہن کے باپ کو اہل سئی چھ طولو، اہل گلگت، نومل و بگروٹ تین طولو اور اہل شروٹ بارگود و طولو دیتے تھے۔

شنا لوک ادب

شنا زبان کا شمار کشمیری کی طرح ہند یورپی اور آریائی زبانوں کے داردی خاندان میں ہوتا ہے اور ماہرین اسے کشمیری زبان کی ماں کا درجہ دیتے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود کشمیری زبان شنا کے مقابلے میں بہت آگے ہے۔ کیونکہ اس کے اپنے حروف تہجی، درس و تدریس کا نظام اور ادب کا بہت بڑا ذخیرہ موجود ہے۔ جرمنی کے ماہر لسانیات ڈاکٹر گیارک بدروس شنا کو ''ٹونل لنگویج'' قرار دیتے ہیں۔ موجودہ شنا نہ صرف ارتقائی منازل طے کر رہی ہے بلکہ ایک زبان کی شکل میں دن بدن پروان چڑھ رہی ہے۔ اس زبان کے لہجوں میں شنا خاص گلگت، شنا بگروٹی وخراموشی، نگر اور ہنزہ کے مخصوص علاقوں میں بولی جانے والی شنا، شنا پونیالی واشکومنی، شنا استوری، شنا پلولی اور شنا چلاس، داریل، تانگیر و کوہستانی لہجے شامل ہیں۔ شمالی علاقہ جات بھر میں اردو زبان بطور لنگوا فرانکا استعمال ہوتی ہے۔ یہاں کے شہری علاقوں میں بیرونی علاقوں کے لوگوں کی یلغار سے بھی مقامی زبان پر منفی اثرات پڑے۔ اسی لئے پہاڑی علاقوں کے لوگوں کی دیہاتی شنا اور شہری علاقوں کی شنا میں بہت تفریق پائی جاتی ہے۔ کیونکہ متذکرہ علاقوں میں شنا الفاظ کی ادائیگی اور لہجے میں واضح فرق موجود ہے۔ ایک علاقے کا باشندہ دوسرے علاقے میں چلا جائے تو دوسرے علاقے کے لوگ اس کے لہجے کی وجہ سے فوراً پہچان لیتے ہیں کہ یہ شخص کہاں سے آیا ہے۔ الغرض علاقائی اثرات اور لب ولہجہ کے تفریق کے باوجود زبان ایک ہوتی ہے اور متکلم اسے سمجھنے میں دشواری محسوس نہیں کرتا۔ سیانے کہتے ہیں کہ ہر چھتیس میل کے بعد کسی زبان کے انداز تکلم اور گفتگو میں تھوڑا سا فرق آجاتا ہے۔ یہی مسئلہ شنا زبان کے ساتھ بھی درپیش ہے۔ یہاں ہر علاقے کا اپنا منفرد طرز تکلم کے ساتھ چند مخصوص محاورات اور ضرب الامثال بھی موجود ہیں، جو مجموعی طور پر شنا زبان کا سرمایہ ہونے کے باوجود اپنے مخصوص علاقے سے زیادہ نسبت رکھتے ہیں۔ اور شنا بولنے والا بخوبی سمجھ لیتا ہے کہ اس شنا محاورہ یا ضرب المثل کا تعلق فلاں علاقے سے ہے۔ جیسے ''**اوژے توتست موژے وان**'' کا محاورہ ''اول طعام بعد کلام'' کے مفہوم کا حامل ہے اور جو چلاس کے لب ولہجے کی نمائندگی کرتا ہے۔ گلگت میں بولی جانے والی شنا کے لہجے کو دیگر علاقوں کی نسبت مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ اور گلگت کی شنا کو معیاری مانا جاتا ہے۔

شنا زبان کا اب تک اہم مسئلہ متفقہ حروف تہجی کی عدم دستیابی ہے اس لئے یہ زبان تحریری ادب سے محروم ہے۔ بہت پہلے سے شنا لکھنے کی انفرادی کوششیں ہوتی رہی ہیں۔ محققین کے مطابق پہلی کوشش 1894ء میں امیر سنگھ نائب مہتمم بندوبست نے رپورٹ بندوبست مرتب کرتے وقت کی تھی۔ اس نے مختلف اشیاء کے نام اور کچھ لوک گیت ضبط تحریر کئے لیکن وہ اپنی کوششوں میں کامیاب نہیں ہوسکا کیونکہ شنا حروف تہجی کا اس وقت تعین نہیں ہوا تھا۔ بعد میں ڈاکٹر لٹنر، جان بڈلف، گریئرسن، گراہم بیلی، کرنل لوریمر اور ایف ریڈالف نے بھی یہاں بولی جانے والی زبانوں میں سائنسی بنیادوں پر تحقیق شروع کی۔ شنا کو رومن رسم الخط کا جامہ پہنا کر لکھنے کی ابتداء کی گئی۔ اس کے بعد اس زبان کی گرائمر، اصوات، لہجوں اور تراکیب پر مباحث کئے گئے۔ انگریز سرکار نے 1904ء کے بعد تمام سول اور فوجی اہلکاروں کو ہدایت نامہ جاری کیا کہ وہ متعلقہ علاقوں کی زبانیں سیکھیں تاکہ لوگوں سے قربت حاصل ہو اور امور سلطنت کی انجام دہی میں آسانی ہو۔ اس سلسلے میں قواعد وضوابط مرتب کئے گئے، امتحانات کا نظام ترتیب دیا گیا اور کامیاب ہونے والے سول اور فوجی آفیسروں کو سو روپے ماہوار کے حساب سے الاؤنس مقرر

کیا گیا۔ یہ طریق کار حکومت اور لوگوں کو قریب لانے میں کارآمد ثابت ہوا۔ 1920ء سے 1947ء تک غیر مقامی آفیسروں کو شنا پڑھانے اور سکھانے کا کام جن لوگوں نے انجام دیا ان میں مولوی حمید اللہ، ماسٹر دولت شاہ، ماسٹر غلام رضا، ماسٹر تیغون، ماسٹر میر عیان، ماسٹر عجب خان، ماسٹر محمد ولی مناور، ماسٹر فقیر محمد نومل اور ماسٹر عبداللہ خان مناور کے نام شامل ہیں۔ شنا اب اردو رسم الخط میں لکھتے ہیں۔ شنا کو اردو رسم الخط میں لکھنے کی ابتداء بھی ہندوستانی نائب مہتمم امیر سنگھ نے 21 مارچ 1894ء کو گلگت کی اولین بندوبست کی رپورٹ لکھ کر کی۔ ڈاکٹر احمد حسن دانی ''گلگت مخطوطات'' کے بارے میں اظہار خیال کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ یہ مخطوطات گپتہ سٹائل میں قلم بند کئے گئے وہ شتیال، چلاس، گلگت اور ہنزہ کے علاقوں میں گپتہ سٹائل کی تحریریں ملنے کی وجہ بھی یہی بتاتے ہیں۔ دانی کا کہنا ہے کہ یہاں کھردشتی تحریریں بھی عام تھیں۔ ان علاقوں میں چٹانوں پر چینی نام اور تحریریں بھی ملی ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ چینیوں، تبتیوں اور دیگر حملہ آور قوموں نے ان علاقوں میں اپنے آثار چھوڑے ہیں۔ چٹانوں کے علاوہ ستونوں پر جو کندہ تحریریں ملی ہیں، ماہرین کے مطابق وہ مختلف قوموں کے رسم الخط کے نمونے ہیں۔ اس طرح آہستہ آہستہ یہ زبان نشوونما کے مراحل طے کرنے لگی۔ 1961ء میں شنا زبان کے حوالے سے اہم پیشرفت ہوئی۔ معروف ماہر تعلیم ڈاکٹر ایم ایس ناموس نے شنا پر ایک کتاب ''گلگت اور شنا زبان'' لکھی۔ مقامی محققین پیر غلام النصیر المعروف بابا چلاسی، محمد امین ضیاء، عبدالخالق تاج، صوفی شکیل اور ضلع کوہستان سے تعلق رکھنے والے قلم کار راز ول کوہستانی نے بھی انفرادی طور پر شنا کے حروف تہجی اور اس کے رسم الخط کے حوالے سے کافی کام کیا۔ شنا زبان پر تحقیق کے حوالے سے جمشید خان دکھی نے بھی ایک کتاب تیار کی ہے۔

دوسری زبانوں کی طرح ہر چھتیس میل کے بعد شنا زبان کے لب و لہجے میں بھی واضح فرق پایا جاتا ہے۔ گلگت کی بولی، ناصر آباد (ھنی) سے مختلف ہے۔ چلاس کی استور سے مختلف ہے۔ پونیال کی شنا بولی میں مذکورہ تمام علاقوں سے زیادہ شیرینی اور مٹھاس پائی جاتی ہے۔ ان علاقوں میں بولی جانے والی شنا زبان کے بعض الفاظ اور معانی میں بھی فرق پایا جاتا ہے۔ مثلاً اہل گلگت نمک کو ''پچو'' اور کالی دال کو ''بلی'' کہتے ہیں جبکہ اہل دیامر نمک کو ''لونی'' اور کالی دال کو ''کوٹی'' کہتے ہیں۔ شنا زبان کے الفاظ نہ صرف طرح طرح کی آوازوں سے ادا کئے جاتے ہیں بلکہ ایک لفظ کے کئی معنی بھی نکلتے ہیں۔ مثلاً ''دے'' بمعنی دیدو ''دے...؟'' بمعنی دوگے؟ اور ''تھے'' بمعنی کرو ''تھے...؟'' بمعنی کروگے؟ وغیرہ۔ ان علاقوں میں لوگوں کی مذہبی زبان عربی تو تھی لیکن فارسی کا مقام بھی بہت بلند تھا۔ پرانے زمانے میں فارسی سرکاری زبان کی حیثیت سے یہاں پر رائج تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ان علاقوں میں موجود مدرسوں میں دیگر کتابوں کے ساتھ ساتھ فارسی کتابیں کریما، گلستان، بوستان، زلیخا، سکندر نامہ اور عربی کتاب ''خلاصہ'' بھی پڑھائی جاتی تھیں۔ جبکہ قصہ گو حضرات داستان یوسف و زلیخا، شیرین فرہاد، لیلیٰ مجنوں اور قصہ سہراب و رستم مجلسوں میں اصل تحریر پڑھ کر شنا ترجمہ کر کے لوگوں تک پہنچاتے تھے۔ اس خطے میں اسلام کی تبلیغ بھی عربی اور فارسی کے ذریعے ہوئی۔ ان علاقوں میں فارسی زبان کے اثرات کی وجہ سے نہ صرف شنا میں فارسی کے عروض و اوزان اور بحور عام ہو گئے بلکہ اسے الفاظ کا ایک لامتناہی ذخیرہ بھی مل گیا۔ فارسی کے الفاظ روزمرہ کی بول چال میں شنا پڑھے لکھے لوگوں کے ساتھ ساتھ ان پڑھ بھی استعمال کرتے تھے۔ شنا زبان کو زندہ رکھنے میں دینی مدارس کا بھی بڑا ہاتھ ہے۔ ضلع دیامر بالخصوص داریل، تانگیر اور چلاس میں اب بھی تعلیمی زبان شنا ہی ہے، جہاں علماء کرام عربی و فارسی کتب کا درس شنا زبان میں ہی دیتے ہیں۔

شنا شاعری بھی اتنی ہی قدیم ہے جتنی شنا زبان۔ لیکن بدقسمتی سے اس زبان کا کوئی قدیم نثری یا شعری فن پارہ محفوظ نہیں۔ شنا ادب بھی دیگر زبانوں کی طرح لوک گیتوں پر مشتمل ہے۔ یہ لوک گیت ازمنۂ قدیم سے لوگوں میں سینہ بہ سینہ محفوظ چلے آ رہے ہیں۔ شادی بیاہ کے موقعوں پر رسم حنا بندی اور دولہا دلہن کے لئے استقبالیہ اور الوداعی گیت مخصوص ہوتے تھے۔ شعراء اہم تاریخی واقعات کو منظوم انداز میں بیان کرتے تھے۔ شعر و شاعری کی محفلوں سے شادی کی تقریبات کی زینت دوبالا ہوتی تھی۔ مختصراً یہ کہ پرانے زمانے کا ادب برائے تفریح تھا جبکہ عصر حاضر کا ادب برائے زندگی کے اصول کا علمبردار نظر آتا ہے۔ بعض روایات کے مطابق قدیم زمانے میں پیغامات اشعار پر مبنی ہوتے تھے۔ اشعار کے ذریعے اشاروں اور کنایوں میں ایک دوسرے سے خط و کتابت کرتے تھے۔ شاعری آزاد تھی اس میں قافیہ اور ردیف کی پابندی نہیں ہوتی تھی۔ دیامر میں صنف نازک کی شاعری بھی منفرد ہوتی ہے۔ یہ شاعری جذبات کو بھڑکانے اور دشمنوں کے خلاف اپنے اپنے قبیلے کے مردوں کا حوصلہ بڑھانے اور مردانہ وار مقابلہ کرنے پر آمادہ کرنے میں بھی مددگار ثابت ہوتی ہے۔ البتہ اشعار کسی سُر (ھین) کے تحت ہوتے تھے۔

جب گلگت کے علاقے پر خوش وقت خاندان کا غلبہ ہوا تو چترالی شاعری کے اثرات شنا شاعری پر گہرے ہوتے چلے گئے۔ چترالی شاعری میں دھن کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ شاعر پہلے دھن بناتا ہے پھر دھن کی بنیاد پر اشعار تخلیق کئے جاتے ہیں۔ وزیر حشمت اللہ اور شاہ رئیس خان کا خیال ہے کہ 1120ء میں گلگت میں اسلام آیا اور شنا میں باضابطہ شاعری کا آغاز مسلمانوں کے اسی دور حکومت (1120ء تا 1842ء) میں ہوا۔ شنوں اور یشکنوں نے فارسی طرز پر اسی دور میں شعر کہے۔ البتہ حمد، نعت رزمیہ، غزل اور قطعہ کے نمونے 1842ء کے بعد ہی ملتے

ہیں۔ یہاں کے عام لوگ شاعری سے زیادہ لگاؤ نہیں رکھتے اور گلوکار کو شاعر اور شاعر کو گلوکار کہنا عام عادت ہے۔ شنا شاعری کو دھن اور ترنم کے بغیر سنانے کا نہ شاعروں میں کوئی تصور تھا اور نہ ہی لوگ ان کے بغیر لطف اندوز ہوتے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ جو لوگ شاعر تو تھے لیکن ان کی آواز اچھی نہیں تھی ان کو ماضی میں کوئی پذیرائی نہیں ملی۔

1980ء کی دہائی اس لحاظ سے بڑی اہمیت کی حامل ہے کہ اس میں مقامی شعراء اور دانشوروں نے اپنے شعری ذوق کی تشفی کے لئے ایک ایسے پلیٹ فارم کی ضرورت محسوس کی جس کے ذریعے سے وہ اپنے فن کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنی مخفی صلاحیتوں کو اجاگر کر سکیں۔

علم وادب کے ادارے:

۱) شنا ادبی مرکہ　۲) قراقرم رائٹرز فورم　۳) حلقہ ارباب ذوق

حلقہ اُرباب ذوق گلگت 88-1987 میں قائم ہوا۔ اس تنظیم کے زیر اہتمام باقاعدگی سے محفل مشاعرے اور سیمینار منعقد ہوتے رہتے ہیں، جس میں شعراء کو اردو اور شنا کلام سنانے کے مواقع حاصل ہوتے ہیں۔ حلقہ اُرباب ذوق نے نہ صرف یہاں کے شاعروں کے مقام کو بلند کیا بلکہ شاعری کو بھی چار چاند لگایا۔ اس حلقے کے بعض شعراء اردو اور شنا دونوں کے قادر الکلام شاعر ہونے کی وجہ سے اردو شاعری کے فنی اسرار و رموز کو شنا شاعری میں آزمایا۔ جس کی بدولت شنا شاعری کو عروج ملا۔ ایک وہ زمانہ تھا جب شعراء کو تحقیر کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ جبکہ آج یہ عالم ہے کہ سیاسی اور سماجی تقریبات کے علاوہ مساجد اور امام بارگاہوں کی تقریبات بھی شعراء کی شرکت کے بغیر ادھوری تصور کی جاتی ہیں۔ یہ وہ تنظیم ہے جس میں شنا ادب کی قد آور شخصیات موجود ہیں۔ ان میں محمد امین ضیاء، عبدالخالق تاج، فضل الرحمان عالمگیر اور عبداللہ ملنگ جیسے نامور شعراء شامل ہیں۔

ثقافتی ادارے:

ساز و آہنگ کی محفلیں ان اداروں میں قراقرم آرٹس کونسل، درد آرٹس کونسل، گلگت آرٹس کونسل، پاکیزہ آرٹس کونسل اور غذر آرٹس کونسل کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ حال ہی میں نگر میں انجمن فکر و سخن کے نام سے ایک ادبی تنظیم معرض وجود میں آئی ہے۔

مذکورہ تنظیموں کے علاوہ دیامر رائٹرز فورم، فکری تحریک اور حلقہ اُرباب ذوق غذر کے نام سے بھی کچھ ادبی انجمنیں موجود میں آئی ہیں جن میں سے بعض علاقے میں اردو ادب کے فروغ کے لئے کام کر رہی ہیں، جبکہ بعض ادبی اور دیگر کتب کی اشاعت کے سلسلے میں مقامی قلم کاروں کو سہولیات بہم پہنچاتی ہیں۔ یہ ادبی اور ثقافتی تنظیمیں، علاقے میں قیامِ امن اور اتحاد بین المسلمین کے سلسلے میں گراں قدر خدمات سرانجام دے رہی ہیں۔ روایت کے مطابق شنا زبان کا قدیم ترین شاعر کھمیٹو تھا۔ البتہ 1120ء میں شری بدھت کے قصرِ شاہی کو آذر جمشید کے حکم سے مسمار کرتے وقت ''خوتو'' کے کہے ہوئے اشعار اولین قرار دئے جاسکتے ہیں جو تاریخ کے باب میں درج ہیں۔ کھمیٹو کے متعلق مشہور رہے کہ وہ کاہن (دینل) تھا۔ یہ کاہن چھپروٹ نگر کا باشندہ تھا۔ اس کے خاندان کے لوگ چھپروٹ میں آج بھی موجود ہیں۔

عشق ومحبت کے گیت:

چَتی گائے:

عشق ومحبت کے گیتوں کو چتی گائے کہتے ہیں۔

لشٹیکی صبای کھین نماز تھے دعا تھم
قبول تھے رحیما غریبی دعا
دون ماھی یئ ڈم پھروئ چھمویے
جھکئ ھنے
می ارمان تٹ ھنی بلبل شکر

ترجمہ: صبح سویرے اپنے مذہبی عبادات ادا کرنے کے بعد میں نے خدا کے حضور غریب کی دعا قبول کرنے کی استدعا کی۔ پھر اپنے محبوب کی طرف متوجہ ہو کر کہا کہ ہاتھی کے دانتوں کی طرح سفید دانت، سرکنڈے (سروٹ) کے پودے کی طرح لچکدار جسم اور مشک کی طرح اسکی خوشبودار زلفیں ہیں۔ اے میرے پیارے بلبل تم ہی میری تمنا ہو۔ آخری مصرع یعنی ''**می ارمان تٹ ھنی بلبل شکر**'' زوردار تالیوں کی گونج میں بار بار دہراتے ہیں۔ یہ گیت راجہ بہادر علی خان جوان دنوں استور میں تھا، نے راجہ ہنزہ کی بیٹی کے دامِ عشق میں گرفتار ہو کر لکھے تھے۔ ان دونوں کی منگنی بھی ہوئی تھی لیکن بعد میں ہنزہ اور کشمیر کے درمیان جنگ چھڑنے کی وجہ سے ایک دوسرے کے حریف بن گئے اور شادی کے ارمان پورے نہ ہو سکے۔

چلاسی گیت:

توھن گیچھر بُجے سومو! ڈم بمم
می شاھینوی پشاتو دے وس سلام سست رز
اجہ گورڑ بوم تو می ددی آجہ نش
ھرگنئ زئ دے موبُج مس
صمدخانی سونی موس بشم تتك
موڑ دے تو موس ڈب درو دیم

ترجمہ: شاعر کی محبوبہ گچھ میں رہتی ہے اور اس کا دوست گچھ جارہا ہے۔ شاعر اپنے دوست سے مخاطب ہوکر کہتا ہے:

اے میرے پیارے دوست! تو گچھ جارہا ہے ۔ میری شاہینوی (شاہین کی مادہ یعنی محبوبہ) سے ملاقات ہوئی تو اسے میرا سلام پہنچانا۔ اور کہنا کہ میں گھر کیسے جاؤں میری حقیقی ماں نہیں بلکہ ایک بڑا سانپ ہرگن (بشکل سوتیلی ماں) مجھے ڈسنے کے لئے تیار بیٹھا ہے۔ اے صمد خان کی باعزت بیٹی! میں بانسری بجاؤنگا۔ مجھے بانسری دے دے میں اسے اپنے پاس رکھونگا۔

دروحَی گائے (استوری لہجہ):

شنا میں ''دروح'' شکاری کو کہتے ہیں۔ جبکہ ''دروحَی گائے'' شکاری گیت کے معنوں میں استعمال ہوتے ہیں۔ قدیم شنا شاعری میں بہت سے شکاری گیت بھی ملتے ہیں۔ ''کل اَی گہ چھال'' یعنی کیل بکری اور میمنا کے گیت، ان دونوں کی المناک گفتگو پر مشتمل ہیں۔

پیرِہ جِکا گسری میارو
پیرِہ جِکا یوك مراکادَی
پیری جِکا بپھری بای بارو
پیری جِکا یوك مراکادَی
پیرہ جِکا شنگئے گہ مُکھیلو
پیری جِکا یوك مراکادَی
پیری جِکا کُھورِ گہ تِنگ ایلو
پیری جِکا یوك مراکادی

ترجمہ: وہ دیکھو مست مارخور کس شان سے جھوم رہا ہے۔ وہ دیکھو پشم اور سمور سے لدھا ہوا کس شان سے جھوم رہا ہے۔ وہ دیکھو خوبصورت سینگ اور چہرے والا کس شان سے جھوم رہا ہے۔ وہ دیکھو عمودی چٹانوں پر سم جمانے والا کس شان سے جھوم رہا ہے۔

مذہبی شاعری:

حمد، نعت، مدح، منقبت، نوحے اور مرثیوں پر مشتمل شاعری کو مذہبی شاعری کہنا مناسب ہوگا۔ کیونکہ شنا تہذیب وثقافت میں شاعری کی یہ صنف، ادب سے زیادہ مذہبی رنگ کی حامل ہے۔ مرثیوں میں زیادہ تر حضرت امام حسینؓ اور ان کے اہل بیت پر میدان کربلا میں ڈھائے جانے والے ظلم وستم کے تذکرے کئے جاتے ہیں۔ مذہبی شاعری کے نمونے 1842ء کے بعد کے ادوار میں ملتے ہیں۔ روایت کے مطابق ان علاقوں میں پہلا قرآن مجید 1887ء کے بعد لایا گیا ہے۔ 1988ء میں ''گلزار اہلِ بیت'' کے نام سے فرفوح (بگروٹ) کے فضل علی نے شنا میں ائمہ کرام کی مدح اور محمدؐ وآل محمد کے فضائل اور مصائب کے متعلق منظوم کلام پر مشتمل کتاب شائع کی۔ سال 2004ء کے اوائل میں بارگو کے محبت علی قیصر نے مرثیوں اور نوحوں پر مشتمل بعض لوگوں کا منظوم شنا کلام جمع کر کے شائع کیا۔ شنا زبان کے عارفانہ کلام کے مشہور شعراء میں اخوند مہربان، وزیر احمد خان، صمد خان، خلیفہ رحمت ملنگ جان، راجی رحمت نظر، پیر غلام النصیر المعروف بابا چلاسی، اخوند محمد رضا، گوہر علی گوہر اور اخوندزادہ حسین اکبر کے نام شامل ہیں۔ 2003ء میں شاعر رسول حضرت حسانؓ کے مشہور نعتیہ اشعار ''واحسن منک لم طرقتْ عینی.....'' کی دھن پر جمشید دکھی نے شنا نعتیہ اشعار لکھے۔

شنا حمدیہ اشعار:

وزیر احمد خان استور

حمد وثنا سو خدا جا
درود جِھانا مصطفےٰ جا
سو اسی خیر الوریٰ جا
تھے نظر مہ شرمندا جا

ترجمہ: پہلے خدا کی حمد وثنا بیان کرو۔ اس کے بعد محمد ﷺ پر درود بھیجو جو ہمارا خیر الوریٰ ہے۔ اے خدا! اپنے اس شرمندہ بندے پر رحم فرما۔

محمد رضا نگر

جِپ گی خدا وار شکر تھم
سس گی تو واری سجدہ دم
ھت گی تجو روزی بچھم
اللّٰہ، تو رحمان الرحیم

ترجمہ: زبان سے شکر خداوندی ادا کرونگا۔ اور خدا کے حضور میرا سر سجدہ ریز ہوگا۔ میں روزی کے لئے اپنے خدا کے حضور دست طلب دراز کرونگا۔ اے اللہ! تو نہایت مہربان اور رحم کرنے والا ہے۔

شنا نعتیہ اشعار:

راجی الرحمت نظر

محمدؐ اسی ذی شان
کُھی عادت سسی قرآن

سِسی پائیور لامکان
مکای ماہِ تابان
مدینای آسمائی سُوری
سنگ تھریگو بُٹی جہان

ترجمہ: نعتیہ اشعار میں شاعر کہتا ہے کہ ہمارا محمدؐ بڑی شان والا ہے۔ قرآن اس کی سیرت اور صورت کا مظہر ہے۔ لامکان آپؐ کے قدموں تلے ہے۔ آپ مکے کے ماہِ تاباں ہیں اور مدینے کے آسمان پر سورج بن کر جگمگا رہے ہیں۔ آپؐ کے نور سے پوری دنیا روشن ہے۔

نوحہ:

اخوند مہربان

ھو تھین حسینؓ سے قاسم و اکبر نئے گنُوس
سہ زینب وکلثوم، علی اصغر نئے گنُوس
زینب خیال چھرے می سکینای مجو پھتو
سہ الوداع شبیہ پیمبر نئے گنُوس

ترجمہ: میدان کربلا میں امام عالی مقام حضرت حسینؓ پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ میں نے قاسم، اکبر، زینبؓ، کلثومؓ اور علی اصغر سارے کے سارے کھودئے ہیں۔ اے زینبؓ! میرے بعد میری سکینہ کا خیال رکھ، کیونکہ میں تم سے رخصت ہو رہا ہوں۔ میں نے پیغمبر خدا کا ہم شکل کھودیا ہے۔

شناشاعری کے ادوار:

پہلا دور (1842ء تا 1947)

اس دور کی شنا شاعری کا زیادہ تر انحصار مذہبی شاعری پر رہا ہے۔ شعراء اپنے اپنے عقائد کے مطابق ایک دوسرے کے جذبات کا احترام کرتے ہوئے بڑے معتدل انداز میں منظوم کلام تخلیق کرتے تھے۔ مذہبی شعائر سے دلی وابستگی کی وجہ سے ہر مکتبہ فکر کے شعراء نے نہ صرف حمد و نعت لکھے ہیں بلکہ مرثیہ نگاری کی سعادت بھی حاصل کی ہے۔ اس دور کے نمائندہ شعراء میں محمد رضا نگر، اخوند مہربان، وزیر احمد خان احمد، صمد خان اور خلیفہ رحمت ملنگ جان کے نام قابل ذکر ہیں۔ خلیفہ رحمت ملنگ جان، جو شیر قلعہ پونیال کا باشندہ تھا اور غالباً 1970ء کی دہائی میں وفات پا چکے ہیں، کو شنا زبان کا بڑا شاعر مانا جاتا تھا۔ اس زمانے سے پہلے بھی نامور شعراء گزرے ہونگے لیکن سوائے دینل کھمیٹو کے کسی اور کا تحریری ثبوت موجود نہیں۔

دوسرا دور (1947ء تا 1966):

یہ دور شنا زبان و ادب کے شعبہ جات میں ترقی کا دور تھا۔ شعراء نے اپنے شنا کلام کو ضبطِ تحریر میں لانے کا آغاز اسی دور میں کیا۔ پیر غلام النصیر المعروف بابا چلاسی نے اپنے شنا صوفیانہ کلام پر مشتمل کتاب ''جواہر چلاسی'' 62-1961 میں شائع کی۔ جبکہ خلیفہ رحمت ملنگ جان نے اپنا شنا کلام ''گلزارِ ملنگ'' کے نام سے سال 1965ء میں چھپوایا۔ سرکاری سطح پر شنا کا ایک مشاعرہ اسی دور میں منعقد ہوا۔ اس دور کو ماہرین شنا شاعری میں نئے نئے رجحانات ابھرنے کا دور تصور کرتے ہیں۔ اسی دور میں اصناف سخن میں ترانے کی صنف بھی متعارف ہوئی۔ شاعروں نے وطن اور وطن کے محافظوں کی شان میں گیت گائے۔ ستمبر 1965ء کی پاک بھارت جنگ کے دوران دوسری زبانوں کے شاعروں کی طرح شنا زبان کے شعراء نے بھی ولولہ انگیز ملی نغمے اور نظمیں لکھ کر نہ صرف افواج پاکستان کے جانبازوں کا حوصلہ بڑھایا بلکہ قوم کے لہو کو بھی گرما دیا۔ فضل الرحمان عالمگیر کو شنا زبان میں پہلا ترانہ ''سونی وطن گلیت'' لکھنے کا اعزاز حاصل ہے۔ اس ترانے کا ایک بند:-

اقبالی تو شاھین ھن
تھی زدیر آسمان زمین ھن
تھی ھتیر فتحِ مبین ھنّ
دین اسلامی تو امین ھن

ترجمہ: اے مردِ مجاہد! تیری مثال اقبال کے شاہین کی سی ہے۔ آسمان اور زمین تیری زد میں ہیں۔ تو ہی دین اسلام کا امین ہے۔ کیونکہ خدا نے فتحِ مبین کا پرچم تمہارے ہاتھ میں تھما دیا ہے۔

تیسرا دور (1966ء سے آج تک)

اس دور کو اگر شنا شاعری کے عروج کا دور کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا۔ اس دور میں شنا شاعری محض تک بندی یا قافیہ بندی کی شاعری نہیں رہی بلکہ تعلیم یافتہ شعراء نے شعر کے فنی محاسن کو اجاگر کیا۔ لوگ خوب سے خوب تر کی تلاش میں سرگرداں رہے۔ شنا شاعری گل و بلبل اور عشق کے قصوں تک محدود نہ رہی۔ شنا شاعروں نے اپنے اشعار کے ذریعے معاشرتی ناہمواریوں کو اجاگر کیا۔ ادبی اور ثقافتی تنظیمیں وجود میں آنے لگیں۔ اس دور کے 1991ء تک کے نمائندہ شنا شعراء میں پیر غلام النصیر المعروف بابا چلاسی، فضل الرحمان عالمگیر، راجی الرحمت نظر مرحوم، محمد امین ضیاء، غلام نبی وفا، شجاعت علی خان، عبداللہ ملنگ، عبدالخالق تاج

، گوہر علی گوہر، جان علی، صلاح الدین حسرت، نعمت ولی تبسم، میر فاضل شاہ اثیر جلال آبادی، اکبر حسین اکبر، سید نجم الحسن نجم، شاہ خان، عنایت اللہ شمالی، بہرام خان شاد اور جمشید خان دکھی کے نام شامل ہیں۔

جواہر چلاسی (بابا چلاسی):

پیر غلام النصیر المعروف بابا چلاسی کا شنا کلام ''جواہر چلاسی'' کے نام سے 1961-62ء میں منظرِ عام پر آیا۔ اس کتاب میں بابا چلاسی نے اپنے وضع کئے ہوئے شنا حروف تہجی کے تحت اردو رسم الخط میں اپنا صوفیانہ کلام لکھا ہے۔ یہ کتاب شنا کی پہلی منظوم کتاب قرار دی جاسکتی ہے۔ پیر صاحب سے فیض حاصل کرنے کے لئے دور دور سے بڑے چھوٹے ہر طرح کے لوگ آتے ہیں۔ آپ نے شنا کے علاوہ عربی، فارسی، پشتو اور اردو پانچ زبانوں میں نہ صرف شاعری کی ہے بلکہ کتابیں بھی منظر عام پر آچکی ہیں۔

گلزارِ ملنگ جان:

فلسفی شاعر خلیفہ رحمت ملنگ جان 1879ء میں چھیر پونیال (موجودہ شیر قلعہ) میں پیدا ہوئے۔ آپ کے فارسی اور شنا کلام پر مشتمل کتاب ''گلزارِ ملنگ جان'' کے نام سے 1965ء میں حاجت امان کے اہتمام سے شائع ہوئی۔ گلزار ملنگ جان کے نام سے شائع ہونے والی یہ کتاب تین حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلا اور دوسرا حصہ گلزار ملنگ جان (صفحہ 1 تا 92)، اور ''ندائے ملنگ جان'' (صفحہ 93 تا 170) کے نام سے فارسی کلام پر مشتمل ہے۔ جبکہ تیسرا حصہ ''یورمس ملنگ جان'' (صفحہ 171 تا 181) کے نام سے چند شنا اشعار پر مشتمل ہے۔ شنا کے بیشتر اشعار دو مختلف بحروں میں لکھے گئے ہیں۔ اس کتاب میں اردو رسم الخط استعمال کیا گیا ہے۔ اور شنا کی مخصوص اصوات کی ادائیگی کے لئے اردو کے قریب ترین اصوات سے استفادہ کیا گیا ہے۔ شنا کے معروف شاعر فضل الرحمان عالمگیر کو ان کے شاگرد ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔ فضل الرحمان عالمگیر کے مطابق خلیفہ رحمت ملنگ جان کا انٹرویو مرحوم عبدالحمید خاور نے کیا تھا۔ ملنگ جان کے شنا عشقیہ اشعار کا محور اس کی محبوبہ یورمس ہے۔ سسی پنوں، ہیر رانجھا کی طرح شنا ادب کا دامن بھی یورمس او رملنگ جان کی عشق و محبت کی لازوال داستان سے معمور ہے۔

سان:

1974ء میں گلگت کے معروف شاعر اور محقق محمد امین ضیاء نے ''سان'' کے نام سے اپنا شنا کلام اپنے وضع کردہ اضافی شنا حروف کے تحت اردو رسم الخط میں شائع کیا۔

زادِ سفر:

بابا چلاسی کی شنا شاعری کی دوسری کتاب 78-1977ء کے دوران شائع ہوئی۔ اس میں بابا نے شنا کے مخصوص آواز وں پر مبنی حروف از خود وضع کر کے انہیں استعمال کیا ہے۔

سوینو موریئے:

1978ء میں محمد امین ضیاء نے ''سوینو موریئے'' یعنی دانشوروں کے اقوال کے نام سے شنا کہاوتوں پر مشتمل اپنی دوسری کتاب لوک ورثہ کے تعاون سے شائع کی۔

سمولو رسولؐ:

معروف شاعر اور قلمکار اکبر حسین اکبر نے 1985ء میں ''سمولو رسولؐ'' کے نام سے سیرت کی پہلی شنا نثری کتاب لکھی۔ جس پر انہیں صدارتی ایوارڈ سے نوازا گیا۔

شنا قاعدہ اور گرائمر:

1986ء میں محمد امین ضیاء نے ''شنا قاعدہ اور گرائمر'' کے نام سے تیسری کتاب لکھی۔ جس میں شنا حروف تہجی اور شنا گرائمر کے اصول تجویز کئے گئے۔

رچھالی مسالو:

شنا کے مشہور شاعر گوہر علی گوہر مرحوم نے اپنا شنا کلام ''رچھالی مسالو'' یعنی صدائے نگہبان کے نام سے 1988ء میں شائع کیا۔

شنا زبان و ادب:

''شنا زبان و ادب'' کے نام سے ایک کتاب 1999ء میں اکادمی ادبیات پاکستان کے زیر اہتمام شائع کی گئی۔ اس کی تالیف کا کام معروف شاعر عبدالخالق تاج نے کیا۔ علاقے کے معروف شنا اور اردو زبان کے قلمکاروں کے مضامین اس کتاب میں شامل ہیں جو شنا میں لکھی گئی ہے۔

ددی یی شلوکے:

''ددی یی شلوکے'' یعنی دادی اماں کی لوک کہانیاں کے نام سے شنا لوک کہانیوں پر مشتمل کتاب صوفی شکیل احمد شکیل نے 2001ء میں شائع کی۔ یہ کتاب بھی شنا میں لکھی گئی ہے اور ساتھ ساتھ اردو ترجمہ بھی کیا گیا ہے۔ 2004ء کے اوائل میں ''گلگتی شنا میں پڑھنا لکھنا'' کے نام سے ایک کتابچہ بھی صوفی شکیل نے شائع کیا۔

ان کے علاوہ معروف قلمکار شیر باز علی خان برچہ نے 1989ء میں ''تذکرۂ اہل قلم و شعرائے گلگت'' کے نام سے ایک اردو کتاب شائع کی۔ جس میں

دوسرے شعراء کے علاوہ ثنا شعراء کا تعارف اور نمونہ کلام بھی شامل کیا گیا۔ اسی طرح کئی نامور مقامی قلمکاروں کی اردو میں لکھی گئی کتابوں اور رسالوں میں مضامین کی شکل میں شنا زبان، شاعری اور ضرب الامثال کے نمونے بھی ملتے ہیں۔ ان کتابوں اور مجلّوں میں قراقرم ہندوکش، تذکرہ اہل قلم وشعرائے گلگت، بلورستان، شنالوجی، جلوۂ شمال اور کئی تعلیمی اداروں سے شائع ہونے والے دیگر مجلّے شامل ہیں۔ عبدالخالق تاج اور رازدل کوہستانی نے شنا قاعدے بھی مرتب کئے ہیں۔

عورتوں اور مردوں کے نام

ان علاقوں میں اسلام کی آمد سے قبل لوگ کاہنوں اور توہمات پر یقین رکھتے تھے۔ کاہن ہر شعبۂ زندگی کے ساتھ لوگوں کے ناموں پر بھی اثر انداز ہوتے تھے۔ حتی کہ بچوں کے نام تجویز کرنے کے لئے بھی لوگ ان سے رجوع کرتے تھے۔ جو کھکر واور شوالو جیسے نام رکھتے۔ اسلامی ناموں کے ساتھ ساتھ کاہنوں کے رکھے ہوئے ناموں سے آج بھی لوگ موسوم ہیں۔ عہد حاضر میں مسلکی ناموں کا رواج بھی چل نکلا ہے۔ اہل سنت والجماعت کے لوگ حضرت محمد ﷺ اور صحابہ کرامؓ کے نام، اہل تشیع اور اسماعیلی حضرات محمد ﷺ اور آل محمد ﷺ کے نام زیادہ رکھتے ہیں۔ ماضی قریب تک شین لوگ اپنے ناموں کے آخر میں سنگھ لگاتے تھے۔ قبولِ اسلام کے باوجود انہوں نے اپنے ناموں کے ساتھ سنگھ لگانا نہیں چھوڑا تھا۔ مثلاً حبہ سنگھ، مل سنگھ، دم سنگھ، چمار سنگھ، بنیال سنگھ، رام سنگھ، جوہر سنگ، موہ سنگھ، ڈیم سنگھ وغیرہ۔ بعض قبائل کے لوگ اپنے نام جانوروں یا کسی اور آشنا چیز کے نام پر رکھتے۔ جیسے برای (پری)، شین (بیج)، بسیرو (بچھڑا)، بدلو (بوسیدہ کپڑے پہنا ہوا)، بھٹ (پتھر)، ٹونکر (ٹڈی دل) وغیرہ۔ یہاں کے لوگ اپنے ناموں کے ساتھ ''خان'' کا لاحقہ بھی استعمال کرتے ہیں۔ جیسے رستم خان، برادر خان، شیرین خان، خسرو خان، عبداللہ خان، رش خان، لچھر خان وغیرہ۔ ماضی میں لفظ ''خان'' دراصل سردار یا رئیس کے لقب کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ ''خان بہادر'' کا خطاب باعث افتخار تصور ہوتا تھا جو برطانوی سرکار کی طرف سے دیا جاتا تھا۔ اکبر بادشاہ کے اتالیق بیرم خان اور اس کے بیٹے عبدالرحیم کو بھی ''خان خاناں'' کے خطاب سے نوازا گیا۔ مغلیہ خاندان کے عہد میں سپہ سالار کے لئے یہ نام بطور لقب بھی [illegible] ہوا ہے۔ پروفیسر عثمان کے مطابق ''خان'' کا لفظ 1206ء میں چنگیز خان اعظم'' مقرر ہونے کے بعد ان علاقوں میں مستعمل ہوا۔ خان دراصل جو مغلوں کی نشانی ہے اور شمال کی جانب سے ان علاقوں میں آیا ہے۔ میں یشکنوں نے ہی استعمال کیا۔

کبھی کسی خاندان میں نومولود بچے زندہ نہیں بچتے تو متاثرہ خاندان اسے اپنی بدبختی تصور کرتا اور بعض دفعہ اپنی بدبختی کو دور کرنے کے لئے بچوں کے عجیب وغریب نام رکھتے۔ جیسے ژکن (گدھا)، سوی (بچھڑی)، کتوری (کتیا)، شوں (کتا)، جون (سانپ) وغیرہ۔ چرند پرند کے حوالے سے بھی لوگوں کے نام ملتے ہیں۔ جیسے میون، طوطا، ہری، شاہین، شیر، بلبل وغیرہ۔ مختلف ملکوں اور علاقوں کے حوالے سے بھی کئی لوگوں نے اپنے نام رکھے ہیں۔ جیسے ایران علی، نجف شاہ، یمن، دادو، مصر خان، یاسین، یونان، پاکستان، کشمیر، ولایت، علی مردان، سید بغداد۔ اس کے علاوہ پیغمبروں اور اسلام کی برگزیدہ شخصیات کے نام بھی رکھے جاتے ہیں۔ جیسے محمد، احمد، یونس، ادریس، الیاس، یعقوب، ہارون، یوسف، داؤد، موسیٰ، عیسیٰ، ابراہیم، ابوبکر، حضرت علی، صدیق، حضرت نبی، فاروق، عثمان، حیدر، حسین علی، حسنین، حسن، جعفر، حنیفہ، طلحہ، عمر، خالد، ولید، جویریہ، فاطمہ، زہرا وغیرہ۔ لوگوں کے ایسے نام بھی ملتے ہیں جو قیمتی پتھروں کی نسبت سے رکھے گئے ہیں۔ جیسے زمرد، مرجان، نیلم، لرم، نگینہ، فیروز، ہیرا وغیرہ۔ لوگ پھولوں کی نسبت سے بھی نام رکھتے ہیں۔ جیسے گلاب، چنبیلی، کنول، رجیلی، پھونو، شٹوکو، بے باری، گلسری، گلسمبر، سوسن، لیلو، گلستان، سنبل چمن، گلشن کسملی، بہاری، گل داؤد، گل بہار وغیرہ۔ اسلامی مہینوں کی نسبت سے بھی نام رکھے جاتے ہیں۔ مثلاً رجب علی یا رجب خان، شعبان علی، محرم علی، صفر علی یا صفر خان وغیرہ۔ جب نرینہ بچے پیدا ہوتے ہی یا کچھ عرصے بعد مرجاتے تو ایسی صورت میں نومولود کو گدھی کا دودھ پلاتے اور اس کا نام ''گوکو'' رکھ دیتے یا کتیا کا دودھ پلا کر اس کا نام ''کتورو یا خکرو'' رکھ دیتے جبکہ بعض دفعہ گائے کا دودھ پلا کر ''بکھیرو'' نام رکھ دیتے۔ لوگوں کا خیال یہ تھا کہ اس طرح کرنے سے متعلقہ جانوروں یعنی گدھی، کتیا اور گائے کی بچے پیدا کرنے کی صلاحیت کمزور ہوتی جبکہ متاثرہ خواتین کی انسانی بچے پیدا کرنے کی صلاحیت مستحکم ہوجاتی یا یوں کہیے کہ اس طرح انسانی بچے پیدا ہوکر پروان چڑھتے اور متعلقہ جانوروں کے بچے پیدا ہوتے ہی یا کچھ عرصے بعد مرجاتے۔ یاد رہے کہ گدھی کا دودھ پینے والا ''گوکو'' کتیا کا دودھ پینے والا ''کتورو یا خکرو'' اور گائے کا دودھ پینے والا ''بکھیرو'' کہلاتا۔ اولاد میں سب سے اول پیدا ہونے والا بیٹا ''نمیلو پچ'' اور بیٹی نمیلی دھی'' کہلاتی جبکہ چلاس کے لوگ آخری بیٹے کو ''تل کیڑہ پچ'' اور آخری بیٹی کو ''تل کیڑہ دھی'' کہتے۔ سب سے آخر میں پیدا ہونے والے بچے کی بابت کہتے کہ ''انو پچ مئی کنہ پچارو ھن'' یعنی یہ وہ آخری بیٹا ہے جس نے بچہ دانی کی صفائی کی۔ اسلئے اس کے بعد اولاد کا پیدا ہونا ممکن نہیں۔

ماضی میں عورتوں کے نام عموماً اس طرح کے ہوتے تھے۔ شیلی بای، شو شو بای، شلی بای، کپوری، شلی مار، سکومل، بی بی، روزی بای، شرمل وغیرہ۔ بعض

لوگوں کے ہاں جب اولاد کی بہتات ہوتی تو ایسے مواقع پر بھی عجیب وغریب نام رکھتے تھے۔ مثلاً ''بسکہ یہ'' یعنی اس سے زیادہ حاجت نہیں، مُتہ یہ یعنی اور اولاد نہیں چاہئے وغیرہ۔ یہاں کے لوگ اپنے پسندیدہ جانوروں کو بھی کسی نام سے پکارتے اور جب کبھی انہیں ان کے مخصوص نام دے کر پکارا جاتا تو یہ حکم کی تعمیل میں کھچا کھچ مالک کے پاس آتے۔ بیل کے لئے ''تارو، مکھورو، ڈولا، بلوکو، سمان، گائے کے لئے تاری، لیلی، لالی، جاری، فلیلی، نیلی، لولی، مکھوری، جرونی، لزمی، گھوڑے کے لئے شب دیز، شب رنگ، راجہ، کاہہ، گھوڑی کے لئے لیلی، نیلی وغیرہ، بھیڑ بکریوں وغیرہ کے لئے دپے، کپّے، کھراشے، لیسّ، دنئ، مچھاری وغیرہ جیسے نام سے پکارتے۔ لوگوں کے اصل نام کو بگاڑ کر کوئی اور مہمل نام دے کر پکارنے کا رواج بھی کئی مقامات پر موجود ہے۔ مثلاً بختاور کو بخان، حنان کو نانو، شاہین کو شہینو، شرین خان کو شرینو صلاح الدین کو صلاحو، مراد خان کو خنو، میر باز خان کو میر بسو، حنیف کو تھنیفو، نیت اللہ کو نثلا، شمسیہ بیگم کو شمی کے نام سے پکارتے۔ اگر کسی بچی کی آنکھیں نیلی ہوں تو اسے ''بوشی'' یعنی بلی کہتے ہیں اور یہ نام مرتے دم تک ساتھ رہتے۔ بعض دفعہ قریبی رشتہ دار تک اصلی نام سے ناآشنا ہوتے ہیں۔ شنا میں والدہ کو آجی، والد کو بابوہ، بُبا، بَبا، با، مالو، کہتے ہیں جبکہ غذر کی راجہ فیملی والے والدہ کو ''زِزی'' اور بہن کو ''گیو'' اور پھوپھی کو ''بچہ'' کہتے ہیں۔

عرس، میلے اور تہوار

شمالی علاقوں کے شنا بولنے والے خطے میں رہنے والے سب لوگ مسلمان ہیں۔ آبادی کے لحاظ سے پہلے نمبر پر اہل سنت، دوسرے نمبر پر اہلِ تشیع اور تیسرے نمبر پر اسماعیلیہ کمیونٹی ہے۔ ظہورِ اسلام سے قبل ان علاقوں میں رسوم ورواج، توہمات اور ضعیف الاعتقادی کا دور دورہ تھا۔ اسلام کی آمد کے بعد ان میں بڑی حد تک کمی آگئی۔ اس خطے میں عرس کا کوئی رواج نہیں۔ اس کی بنیادی وجہ بعض اہلِ نظر کے مطابق یہاں کسی ولی یا پیر وغیرہ کی عدم موجودگی بتائی جاتی ہے۔ جن بزرگوں کے طفیل یہاں اسلام پھیلا ان کا قیام یہاں محض تبلیغ کی حد تک تھا، جو بعد میں مختلف علاقوں کی طرف چلے گئے۔ البتہ جن بزرگانِ دین کے مزاراتِ مقدسہ یہاں پر موجود ہیں وہ مرجع خلائق تو ضرور ہیں لیکن سالانہ عرس کے طور پر کوئی تقریب نہیں ہوتی۔ مقاماتِ مقدسہ کی زیارت کرنے کے لئے لوگ منتیں مانتے ہیں اور زیارت کے دوران کوئی نہ کوئی جنس یا نقد رقم زیارت کے محافظوں کو دے دیتے ہیں۔ جمعرات اور جمعہ کے دن، مقامات مقدسہ کی زیارت کے لئے لوگوں کا تانتا بندھا رہتا ہے۔ طالبعلم امتحانات کے بعد اس نیت سے زیارت گاہ پر حاضری دیتے ہیں کہ اس کی بدولت انہیں امتحان میں کامیابی نصیب ہو۔ ان کے علاوہ دیگر خواتین و حضرات دلوں میں اپنے اپنے مسائل کے حل کے لئے امداد کی امنگیں لے کر مقاماتِ مقدسہ کا رخ کرتے ہیں۔ پچھلے وقتوں میں زیارت گاہیں مختلف محلے کے لوگوں میں تقسیم تھیں۔ جب کبھی علاقے میں بہت زیادہ بارشیں ہوتیں تو ہر محلے کے لوگ پیسے جمع کرتے اور ایک بکرا، بیل یا گائے خرید کر متعلقہ زیارت گاہ لے جاتے اور وہی پر ذبح کر کے آپس میں تقسیم کرتے اور بارش تھمنے کی خاطر دعا کرتے۔

پرانے وقتوں میں ان علاقوں میں بڑے بڑے تہوار ''شنو بڑے دیزے'' کے نام سے منائے جاتے تھے لیکن اشاعت اسلام کے بعد یہ تمام تہوار تقریباً ختم ہوگئے۔ البتہ ان میں سے درج ذیل تہوار کچھ نہ کچھ فرق کے ساتھ آج بھی منائے جاتے ہیں۔

تہوار

۱) دھوم نکھا ۲) نوروز ۳) جشنِ غدیر ۴) گلابی اَیت ۵) سنو بزونو ۶) عیدین ۷) مردوں کی عید/اشار ۸) غنونی ۹) صندل کا تہوار ۱۰) چلی

دُھوم نکھا:

یہ تہوار پونیال کے اہم تہواروں میں سے ایک ہے جو قدیم زمانے سے چلا آرہا ہے۔ دھوم نکھا کا تہوار ہر سال موسم خزاں میں منایا جاتا ہے۔ اس تہوار کا مطلب زمین سے حاصل شدہ اناج سے شیاطین کو بھگانا ہے۔ یہ رسم زیادہ تر پونیال اشکومن میں رائج ہے۔ اس روز لوگ نئے کپڑے پہنتے اور قریبی رشتہ داروں کو مدعو کرتے ہیں۔ سارے گاؤں والے مشترکہ طور پر ایک دن مقرر کرتے اور اسی دن شام کو طرح طرح کے لذیذ کھانے تیار کئے جاتے ہیں۔ پرانے وقتوں میں اس موقع پر روایتی طعام ''مُل'' پکایا جاتا تھا۔ اس کے علاوہ خشک اور تازہ پھل بھی دسترخوان کی زینت بنتے تھے۔ گاؤں والے ایک دوسرے کو گھروں میں جا کر مبارکباد دیتے۔ ہر گھر میں خوشی کا سماں ہوتا۔ لوگ اس دن کے لئے خصوصی طور پر نئے کپڑے بناتے۔ لوگوں کا خیال ہے کہ یہ دن سال بھر کی محنت، مشقت سے فراغت اور اگلے پانچ مہینوں میں اپنی جمع پونجی کو سکون سے استعمال میں لانے اور ایک نظر نہ آنے والی بونے قد کی مخلوق جسے مقامی لوگ ''یچھونے'' کہتے سے نکالنے کے لئے منایا جاتا ہے۔ کیونکہ متعلقہ علاقوں کے لوگ مخلو صرف بے برکتی کی علامت تصور کرتے ہیں بلکہ اسے گھر سے نہ نکا دعوت دینے کے مترادف خیال کرتے ہیں۔ لہٰذا اس شام کھانے بعد گھر کا ایک بزرگ فرد ہاتھ میں چھڑی لے کر گھر کے چاروا

مارتے ہوئے یہ کہتا جاتا کہ ''کھایا پیا اب ناراض نہ ہونا اور اس گھر سے نکل جانا اور گرمیاں شروع ہوئیں تو پھر آجانا۔'' اس طرح وہ بزرگ گھر کے دروازے پر آخری چھڑی مارتا اور سارے گھر والے گھر سے باہر نکل آتے۔ بچے زور زور سے آوازیں نکالتے اور اپنی خوشی کا اظہار کرتے۔ آخر میں سارے گھر والے اور مدعو رشتہ دار مل کر ''یخھولے'' کے گھر سے نکل جانے کی خوشی میں شکرانے کی دعا کرتے۔ لوگوں کا خیال ہے کہ ''یخھولے'' گھر کے ہر فرد کے ساتھ ہوتے ہیں جو موسم گرما میں گھر میں داخل ہوتے ہیں اور تہوار مذکور یعنی ''دھوم نکھا'' کے روز گھر سے نکل جاتے ہیں۔ اس موقع پر بعض علاقوں میں یہ دعائیہ کلمات بھی پڑھتے ہیں:

بسم اللہ یا خدایا برکت دے
اوسُم، دوسُمی برکت دے
کھرکی جوانی برکت دے
کٹوال بٹوالی برکت دے
گلیت ملکی برکت دے
شرواَی رائی لو بوسنگ برکت دے
اُوالی سوری برکت دے
ژکنی سنگ نکھوسنگ برکت دے
گگویی دانی نکھوسنگ برکت دے

ترجمہ:

خدا کے نام سے شروع کرتا ہوں، اے خدا ہمیں برکت عطا فرما۔ قدیم نامور لوگ اوسُم اور دوسُم کے زمانے کی طرح برکت دے۔ طویل قامت کھر کی جوان کی طرح بلند قامتی عطا کر (کہتے ہیں کہ اس کا قد ساڑھے چار گز اونچا تھا)۔ نامور بہادر لوگ کٹوال اور بٹوال کو عطا کردہ برکت ہمیں بھی دے۔ گلگت کے ملک راجہ کے دور والا برکت عطا کر۔ خزاں کی لمبی رات کو اور طویل کرتا کہ ہم صبح تک اناج سمیٹ سکیں۔ گرمیوں کے دنوں کو اور طویل کرتا کہ ہم دن بھر اناج سمیٹ سکیں۔ گدھوں کے سر پر سینگ لگنے تک برکت دے۔ گول پتھر کی داڑھی نکلنے تک برکت دے یعنی ناممکن اور نہ ختم ہونے والی برکتیں عطا فرما۔

نوروز:

نوروز اور اس کی اہمیت سے اکثر و بیشتر لوگ واقف ہیں۔ نوروز شمسی ں کا پہلا دن ہوتا ہے۔ سورج اس صبح برج حمل سے طلوع ہوتا ہے۔ نوروز اس سے بھی اہمیت کا حامل ہے کہ اکثر اقوام سال کا پہلا دن خواہ وہ انگریزی مہینوں کا ہو یا کوئی اور، عید کے طور پر مناتے ہیں۔ اس طرح شمسی مہینوں کا سال بھی گردشِ آفتاب سے بننے والے سال کے پہلے دن کے طور پر منایا جاتا ہے۔ اس دن کی اہمیت اپنی جگہ مسلّم ہے۔ نوروز ہر سال 21 مارچ کو بطور عید، شاندار طریقے سے منایا جاتا ہے۔ ضلع گلگت میں یہ دن بڑے دھوم دھام سے مناتے ہیں۔ پرانے وقتوں میں مرد اور عورتیں الگ الگ ناچ اور گانوں سے لطف اندوز ہوتے اور شام کو پولو کھیلا جاتا۔ بچے انڈوں پر طرح طرح کے رنگ کر کے انہیں آپس میں لڑاتے۔ جس کسی کا انڈا دوسرے کے انڈے سے ٹوٹ جاتا تو ٹوٹا ہوا انڈا جیتنے والے کو دیا جاتا۔ اس جشن کے موقع پر عورتیں درختوں کی شاخوں پر رسیاں ڈال کر جھولا جھولنے میں مصروف ہوتیں۔ یہ جشن اسماعیلی برادری اور امامیہ فرقے سے تعلق رکھنے والے لوگ آج کل بڑی سادگی سے مناتے ہیں۔ وقت کے ساتھ ساتھ لوگوں میں وہ جوش و خروش نہیں رہا جو پرانے زمانے میں ہوتا تھا۔ اس تہوار کے موقع پر بچوں کے ''ڈاڈا'' کا خصوصی طور پر اہتمام کیا جاتا۔ اس موقع پر گلگت میں مختلف کھیلوں مثلاً پولو، تیراندازی، شمشیر زنی، کشتی، رسہ کشی، پہاڑی دوڑ اور تیرا کی کے مقابلے مختلف قوموں اور علاقوں کے مابین منعقد کئے جاتے تھے۔

جشنِ غدیر:

یہ جشن زیادہ تر امامیہ فرقے کے لوگ مناتے ہیں۔ اس فرقے کے لوگ حضرت علیؓ کو پہلا امام مانتے ہیں اور ان کی امامت آنحضرت ﷺ کے وصال سے شروع ہوتی ہے۔ اسلئے یہ حضرات ''عیدِ غدیر'' کو حضرت علیؓ کے یومِ امامت کے طور پر جوش و خروش سے مناتے ہیں۔ اس روز لوگ نئے کپڑے پہنتے اور ایک دوسرے کو عید مبارک کہہ کر گلے ملتے ہیں۔ دعوتیں دی جاتی ہیں اور سارا دن خوشیوں میں گزرتا ہے۔ آپس میں مبارک سلامت کے دعائیہ کلمات کا خوب تبادلہ ہوتا ہے۔ کھیل تماشے ہوتے اور بچے انڈے لڑاتے ہیں۔ آج کل امامیہ مساجد میں اس دن کے حوالے سے تقاریر کا اہتمام بھی کیا جاتا ہے۔ یہ دن ذی الحجہ کی 18 تاریخ کو منایا جاتا ہے۔

گلابیؔ اَیت (گلاب کی عید):

گلابیؔ ایت سے گلاب کی عید مراد لی جاتی ہے۔ پچھلے وقتوں میں شنا بولنے والے بعض مقامات غذر، نگر، حراموش، بگروٹ اور گلگت میں ''گلابی ایت'' کے نام سے بھی ایک تہوار منایا جاتا تھا۔ عموماً بہار کے موسم میں جب چاروں طرف پھول ہی پھول کھلتے تو یہ تہوار منایا جاتا۔ اس میں گاؤں کے تمام مرد و زن حصہ لیتے ہیں۔ اس تہوار کا کوئی خاص دن پہلے سے مقرر نہیں ہوتا بلکہ ہر جگہ اپنے مخصوص موسمی حالات کے تحت مختلف اوقات میں مناتے۔ اس عید پر سینو گلاب لازمی طور پر شامل

کیا جاتا۔اس موقع پر گاؤں کے لوگ طرح طرح کے کھانے پکاتے، ایک دوسرے کو مدعو کرتے اور دن بھر خوشیاں منائی جاتیں۔ بعد ازاں لوگ اپنے آباؤ اجداد اور رشتہ داروں کے مقبروں پر جا کر نہ صرف دعائیں کرتے بلکہ ان پر پھول بھی نچھاور کئے جاتے۔اس عید کی خاص بات یہ ہوتی ہے کہ اس موقع پر گوشت نہیں پکایا جاتا بلکہ دودھ اور دیگر اشیاء سے بنائی گئی چیزیں تیار کر کے پیش کی جاتیں۔ یہ عید ضلع دیامر کے علاوہ باقی مقامات پر بغیر کسی ذات پات اور رنگ و نسل کی تمیز کے منائی جاتی تھی۔ یہ سلسلہ اب بالکل متروک ہو چکا ہے۔

سنو بزونو:

شنا میں ''بزونو'' موسم بہار کو کہتے ہیں جبکہ ''سنو'' بمعنی ''سین قوم سے وابستہ'' مراد ہے۔ بزونو کے معنی کمزوری کے بھی ہوتے ہیں۔ سنو بزونو فروری کی درمیانی تاریخ سے شروع ہو کر مارچ کے ابتدائی ایام تک جاری رہتا ہے۔ بعض روایات کے مطابق یہ تہوار عموماً 6 فروری کو مناتے ہیں۔ یہ دن ''سنوناؤ'' یعنی شین قوم کے لوگوں کا نیا دن کے نام سے مشہور تھا جو اہلِ گلگت ''سنو بزونو'' کے نام سے جانتے تھے۔ تقریباً 12 دنوں تک یہ تہوار جاری رہتا تھا۔ یہ تہوار موسم بہار کی آمد پر منایا جاتا تھا۔ اس تہوار سے مراد جہاں ایک طرف استقبالِ آمدِ بہار ہوتا تو وہاں دوسری طرف ایک خوشی یہ ہوتی کہ طویل سرما کا موسم اپنی تمام تر مشکلات اور حشر سامانیوں کے ساتھ اختتام پذیر ہوا۔ اس تہوار کو منانے کے لئے لوگ مقررہ تاریخ سے چند دن پہلے روایتی ''درم'' تیار کرتے جو چینی کے بغیر ہی مٹھائی کی طرح لذیذ ہوتی۔ ''نسالو'' کی ران اور دم کے حصے کا خشک گوشت اس تہوار میں استعمال کرنے کے لئے خصوصی طور پر رکھا جاتا۔ یہ تہوار ناچ گانے کے ساتھ ختم ہو جاتا۔

اس موقع پر گلگت کے لوگ ''شوارن'' (پولوگراؤنڈ) میں جمع ہوتے جبکہ عورتیں سڑک کی دونوں جانب مکان کی چھتوں پر بیٹھ کر لوگوں کا ہجوم جو پولوگراؤنڈ کی طرف جاتا تھا، کا نظارہ کرتیں۔ ایک کمزور ترین بھیڑ لائی جاتی۔ ''ترنگفہ'' (نمبردار) قربانی کرنے کے لئے اسے ذبح کرتا اور اس کا خون ''بلہہ'' (Polo Stick) پر لگایا جاتا۔ پھر ''ترنگفہ'' گھوڑے پر سوار ہو کر بھیڑ کے سر کو اپنے ''بلہہ'' سے کچھ فاصلے تک گیند کی طرح کھیلتے ہوئے لے جاتا۔ اس کے بعد ڈوم یا سازندے بھیڑ کے سر کو رسی سے باندھ کر پورے ''شوارن'' میں گھسیٹتے۔ اس کے بعد ناچ شروع ہو جاتا اور ساتھ ہی پولو کھیل کا آغاز بھی کیا جاتا۔

عیدین:

مقامی لوگ عید الاضحیٰ کو بڑی ایت اور ''قربانئ ایت'' اور عید الفطر کو چھوٹی عید اور ''رُزای ایت'' کہتے ہیں۔ دنیا بھر کے مسلمانوں کی طرح شنا بولنے والے علاقوں کے مسلمان عید الاضحیٰ اور عید الفطر کے تہوار مذہبی جذبے اور جوش و خروش سے مناتے ہیں۔ عیدین کے مواقع پر لوگ طرح طرح کے نئے کپڑے پہنتے ہیں اور گھروں میں قسم قسم کے کھانوں کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ عرفے کی رات عورتیں کیا بعض دفعہ مرد حضرات بھی ہاتھوں پر مہندی لگایا کرتے۔ رات مقامی طور پر دستیاب مہندی کے پودے کے پتوں کو کوٹ کر ہاتھوں پر لگاتے تھے اور ہاتھوں پر سوتی کپڑا ڈھانپ کر باندھتے اور سو جاتے۔ صبح جاگنے کے بعد جب ہاتھ دھوتے تو وہ بڑے خوبصورت لگتے۔ ہاتھوں پر تھوڑا سا سرسوں یا گری کا تیل لگایا جاتا تو وہ اور چمکنے لگتے۔ لوگ بڑی خوشی سے ایک دوسرے کو اپنے ہاتھ دکھاتے تھے۔ عید پر مسلمانوں کو خوشی کا پیغام لے کر آتی ہیں۔ ان کے انعقاد سے معاشرتی میل جول اخوت اور محبت اور سماجی بھائی چارہ کو فروغ ملتا ہے۔ بالخصوص عید الفطر سے قبل ماہ رمضان میں لوگ پورے ذوق و شوق سے خدا کی عبادت کرتے ہیں اور دوزخ کی آگ سے پناہ مانگتے ہیں۔ عید مبارک اور سلامت کے دعائیہ کلمات سے دن کا آغاز ہوتا ہے اور یہ سلسلہ کئی دنوں تک جاری رہتا ہے۔ شہر کی مضافات میں وسیع عریض میدانوں میں نماز عید ادا کی جاتی ہے۔ جہاں پر لوگوں کا ہجوم قابلِ دید ہوتا ہے۔ نماز کے بعد لوگ اپنے پیاروں کی قبروں پر جا کر فاتحہ خوانی بھی کرتے ہیں۔ مصافحہ اور معانقہ کا بازار گرم رہتا ہے۔ عورتیں اور بچے عرفے کی رات مقامی طور پر دستیاب پودے کے پتوں سے مہندی بنا کر ہاتھوں کے ساتھ ساتھ پاؤں کی انگلیوں کو بھی لیپ لیتے اور صبح سویرے اٹھ کر دھوتے اور سرسوں یا گری کا تیل لگاتے تو ہاتھ خوب چمکتے اور بڑے خوبصورت لگتے۔ عید کے دن بچے کیا بڑے بھی عیدی کا تقاضا کرتے ہیں۔ جب عید الفطر کا چاند نظر آنے کا اعلان ہوتا ہے تو اس خوشی میں رات کو خوب ہوائی فائرنگ ہوتی ہے۔

عید الاضحیٰ سے پہلے جب حاجی حضرات کا حج کا قرعہ نکلتا ہے تو اس کے فوراً بعد رشتہ دار دوست احباب حج پر جانے والوں کو اپنے گھر مدعو کرتے ہیں اور یہ سلسلہ حج کے سفر پر روانگی تک جاری رہتا ہے۔ عید الاضحیٰ کے موقع پر قربانی یہاں کے تمام لوگ بڑے جوش و خروش سے کرتے ہیں۔ امیر کیا غریب بھی قربانی کی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے ہیں۔ عید سے چند دن پہلے یہاں کے لوگ گندم کی خمیری آٹے جس میں انڈے، تیل، گھی خشک خوبانی اور سوڈا بھی ملاتے ہیں، سے چھوٹی چھوٹی گول روٹی بنا کر تیل میں پکاتے ہیں یہ روٹی کافی مقدار میں پکا کر ذخیرہ کرتے ہیں تا کہ عید کے چند دن بعد تک استعمال میں لائی جا سکے۔ عموماً چائے کے ساتھ صبح ناشتے کے دوران یہ روٹی استعمال میں لائی جاتی ہے۔ مقامی لوگ اس روٹی کو ''شرکہ'' کہتے ہیں۔ عید کے تہواروں کے موقع پر مائیں اپنی بہنوں، بیٹیوں اور دوسرے عزیز و اقارب کے گھر چند ''شرکہ'' بطورِ تحفہ بھی بھیجا کرتی ہیں۔

مُردوں کی عید/ اُشار:

شنا بولنے والے علاقوں بالخصوص استور میں ''اشار'' یا مردوں کی عید کے نام سے ماضی میں ایک خاص تہوار جنوری کے پہلے ہفتے میں منایا جاتا تھا۔ جسے مقامی زبان میں ''چیوپون'' کہتے تھے۔ تہوار کی تقریبات کا آغاز گاؤں کے چوکیدار کے اس اعلان کے ساتھ شروع ہوتا کہ فلاں دن یوم اشار ہوگا۔ یہ اعلان کم ازکم دو دن پہلے کیا جاتا۔ اعلان کے ساتھ ہی گاؤں میں تیاریاں شروع ہوتیں۔ اچھے اچھے اور لذیذ کھانے تیار کئے جاتے۔ مقررہ دن اور مقام پر ہر گھر سے پکا پکایا کھانا اجتماع گاہ پہنچایا جاتا۔ جہاں جوان، بچے، بوڑھے سب مل جل کر کھاتے۔ اس سے طبقاتی تفاوت ختم ہوجاتی۔ اس کا ثواب لوگ اپنے عزیزوں اور پیاروں کی ارواح کو بخش دیتے۔ ''اشار'' میں بہت ساری گول، مول اور چھوٹی چھوٹی روٹیاں بھی بھیجی جاتی تھیں۔ یہ روٹیاں ان ننھے منے بچوں کی روحوں کے لئے ہوتیں جو کم سنی میں اللہ کو پیارے ہوگئے ہوں۔ لوگوں کا عقیدہ تھا کہ آج کے دن تمام مردوں کی روحیں آزاد کی جاتی ہیں اور انہیں حکم دیا جاتا کہ جاؤ اپنے اپنے رشتہ داروں کے بھیجے ہوئے تحفے وصول کرو۔ لوگوں کے خیال کے مطابق اس مردے کو غریب تصور کیا جاتا۔ جس کے رشتہ داروں نے کم مقدار میں صدقہ دیا ہو۔ شنا کا یہ مقولہ ''**مردہ تتوہ توزندہ تُشئی**''، یعنی ''مردوں کی روحوں کا پیٹ بھرے تو زندوں کو بھی پیٹ بھر کر کھانا ملے گا۔'' اس تہوار کی اصلیت ظاہر کرتا ہے۔ چونکہ یہ تہوار ایک عرصے سے ترک کردیا گیا ہے۔ اسلئے بعض لوگ کہتے ہیں کہ کافی سالوں سے مردوں کی روحیں بھوکی ہیں۔ استور کے علاقہ ''تریشنگ'' میں یہ تہوار اب بھی منایا جاتا ہے۔

غنونی:

یہ ایک مقامی تہوار ہے۔ جسے ہر سال جون کے مہینے میں فصل کی کٹائی پر منایا جاتا ہے۔ ''غنونی'' کا لفظ ''غنو'' سے ماخوذ ہے اور ''غنو'' شنا اور بروشسکی دونوں زبانوں میں ''بیج'' کو کہتے ہیں۔ لوگوں کے خیال کے مطابق یہ رسم آذر جمشید ایران سے لے کر آئے تھے۔ کیونکہ یہ رسم ان علاقوں میں نہیں ہے، جہاں شین قبیلے کے لوگ رہتے ہیں۔ پرانے وقتوں میں یہ رسم بڑی دھوم دھام سے ادا کی جاتی تھی۔ اس تہوار کی آمد سے قبل ہی لوگ مال مویشی سے حاصل کردہ گھی محفوظ کرتے اور ''غنونی'' کی تقریبات میں استعمال کرتے۔ علاقے کے سب سے پرانے خاندان کا کوئی آدمی سال نو کا تازہ مکھن اور مقامی روایتی روٹی ''چھپٹہ'' چونٹل کے پتے میں رکھ کر راجہ صاحب کی خدمت میں رسم بسم اللہ کے لئے پیش کرتا۔ یاد رہے چونٹل ایک قسم کا جنگلی پودا ہوتا ہے جس کے پتے چوڑے، تھالی کی طرح ہوتے ہیں۔ جب راجہ صاحب ایک نوالہ تناول کرتا تو مجلس میں موجود دیگر معززین بھی ایک ایک نوالہ تناول کرتے تھے۔ روٹی اور مکھن کا ایک ایک نوالہ کھانے کے بعد حاضرین ایک دوسرے کو مبارکباد دیتے تھے۔ اس کے بعد راجہ صاحب اپنے محل میں جاتا، جہاں پر راجہ کو بانیانِ ریاست میں سے کوئی شخص باقاعدہ ''شئی پھیال'' لے کر کھیت کی طرف جاتا اور نئی فصل سے کچھ خوشے چن لیتا۔ ان خوشوں سے کچھ دانے بھون کر دودھ میں ڈالا جاتا اور دودھ کا پیالہ راجہ صاحب کی خدمت عالیہ میں پیش کیا جاتا۔ راجہ صاحب دودھ کو ایک دو چمچہ بھنے ہوئے جو کے دانوں کے ساتھ پیتا تھا۔ جس کے بعد فصل کی کٹائی شروع ہوجاتی۔ ماضی میں اس تہوار کے موقع پر بڑی خوشیاں منائی جاتی تھیں۔ پولو، نیزہ بازی، تیر اندازی وغیرہ کھیل کھیلے جاتے تھے۔ اس موقع پر دینل (کاہن) کو بھی نچایا جاتا تھا۔ جنگلی پودا ''چونٹل'' کے پتوں سے بانسری بجائی جاتی اور بچے، بوڑھے اور جوان خوب لطف اندوز ہوتے تھے۔ یہ رواج پونیال اور نومل میں کہیں کہیں آج بھی موجود ہے۔

صندل کا تہوار:

پرانے زمانے میں گلگت میں صندل کی پوجا کا تہوار منایا جاتا تھا۔ ہوتا یوں تھا کہ تین دن تک تین غیر شادی شدہ نوجوان روز نہا دھو کر خود کو صاف ستھرا رکھتے۔ چوتھے دن وہ اپنے ہمراہ گھی، روٹیاں، ہر قسم کا پھل اور شراب وغیرہ لے کر پہاڑوں کی طرف نکل جاتے۔ صندل کا ایک مناسب درخت چن کر وہ اس کی شاخ پر گھی اور شراب کو چھڑک دیتے اور فروٹ اور روٹیاں کھالیتے۔ پھر اس شاخ کو کاٹ کر گاؤں واپس لے آتے۔ گاؤں میں داخل ہونے پر تمام لوگ ان کا استقبال کرتے۔ پھر انہیں ایک مقررہ جگہ پر لے جایا جاتا، جہاں محفلِ رقص و سرود منعقد ہوتی۔ درخت سے کاٹی ہوئی شاخ کو بہتے ہوئے پانی کے قریب ایک بڑے پتھر پر رکھ دی جاتی۔ پھر ایک بکری کو ذبح کرکے اس کا خون صندل کی شاخ پر چھڑکا یا جاتا۔ اس کے بعد رقص کی محفل شروع ہوتی جس میں ہتھیاروں کی نمائش بھی کی جاتی تھی۔ ذبح کی ہوئی بکری کا سر ایک بانس پر ٹانک کر اسے تیروں اور گولیوں کا نشانہ بنایا جاتا۔ جس شخص کا نشانہ ٹھیک بیٹھتا اسے بکری کا گوشت اور ایک بڑا پیالہ شراب کا بطورِ انعام دیا جاتا۔ گوشت ختم ہوجانے کے بعد بکری کی ہڈیاں بہتے پانی میں بہادی جاتیں اور اس کے بعد تمام لوگ بہتے پانی میں نہاتے۔ پھر ہر شخص صندل کی شاخ کا تھوڑا تھوڑا حصہ لے کر گھر کی طرف چل پڑتا۔ گھر کے دروازے پر کچھ سوال و جواب کے بعد وہ صندل کی شاخ کے ساتھ اندر داخل ہوجاتا اور اس کی بیوی شاخ پر سے کچھ پتے اتار کر ان پر شراب اور پانی چھڑکتی اور انہیں آگ پر رکھ دیتی اور باقی شاخ پر آٹا چھڑک کر اسے گھر کی چھت کے ساتھ لٹکا دیتی۔ پھر وہ

اپنے شوہر کے سر اور کندھوں پر آٹا چھڑک کر اس سے یوں مخاطب ہوتی ''اے طاقت ور بادشاہ! پریوں کے بیٹے تم بڑی دور سے آئے ہو۔'' دوسرے دن بیوی چند مزیدار روٹیاں پکاتی اور اپنی بکریوں کو لے کر اسی پتھر کے پاس پہنچ جاتی۔ پہلے دن صندل کی پوری شاخ رکھی ہوتی۔ اس کی طرح گاؤں کی دوسری عورتیں بھی وہاں پہنچ جاتیں اور وہ اس پتھر پر چھوٹی چھوٹی کنکریاں مار دیتیں۔ اس دوران بکریاں جس سمت بھاگ کر جائیں اس سے آنے والے سال میں بچوں کی تعداد اور ان کی جنس کا اندازہ کیا جاتا تھا۔ اخروٹ اور انار کو اس پتھر پر رکھا جاتا جو اور روٹیاں کھائی جاتیں۔ بکریوں کو ان کی مرضی کے مطابق چراگاہوں میں جانے دیا جاتا۔ پانچ دن بعد ایک گیت تمام گھروں میں گاتے تھے۔ اس گیت کا اردو ترجمہ درج ذیل ہے:۔

اے پریوں کے طاقت ور بادشاہ میں نے ترے حضور قربانی دی
تم کتنے اچھے ہو تم نے میرا گھر برکتوں سے بھر دیا
تم میرے لئے ایک بیوی لائے جبکہ میں اکیلا تھا
بیٹیوں کے بجائے تم نے مجھے بیٹے دیے
مجھے سچائی کا رستہ دکھایا
تم نے مجھے بہت سے بچے دیئے
تم نے مجھے پہاڑ جیسا طاقت ور بنایا
میں سرگن گلیت گیا
لوگوں سے ملنے کے لئے
تم نے بہت سی جنگلی بکریاں ہلاک کر دیں
تم کتنا عمدہ لباس پہنے ہوتے ہو
تم گھوڑے پر سوار ہوتے ہو
تمہارے ہاتھ میں تلوار ہوتی ہے
اے طاقت ور بادشاہ! میں تمہارے لئے ایک دنبہ ذبح کروں گا
تم پہاڑوں سے ہمارے لئے آتے ہو
میں مکھن سے تمہارے پاؤں کی مالش کروں گا
تم وادیوں سے ہمارے پاس آتے ہو
میں تیل سے تمہارے بدن کی مالش کروں گا
میں وسیع میدانوں میں گیا تھا
لوگوں نے تمہارے لئے بکرے ذبح کر رکھے تھے
میں نے تمہارے لئے ایک دنبہ ذبح کیا ہے
میری عزت افزائی کرو
کل تم چلے جاؤ گے
اے پریوں کے طاقت ور بادشاہ! میں تمہیں سلام کرتا ہوں
تم نے مجھے خوشحالی دی ہے
میں تمہیں کیسے جانے دوں گا

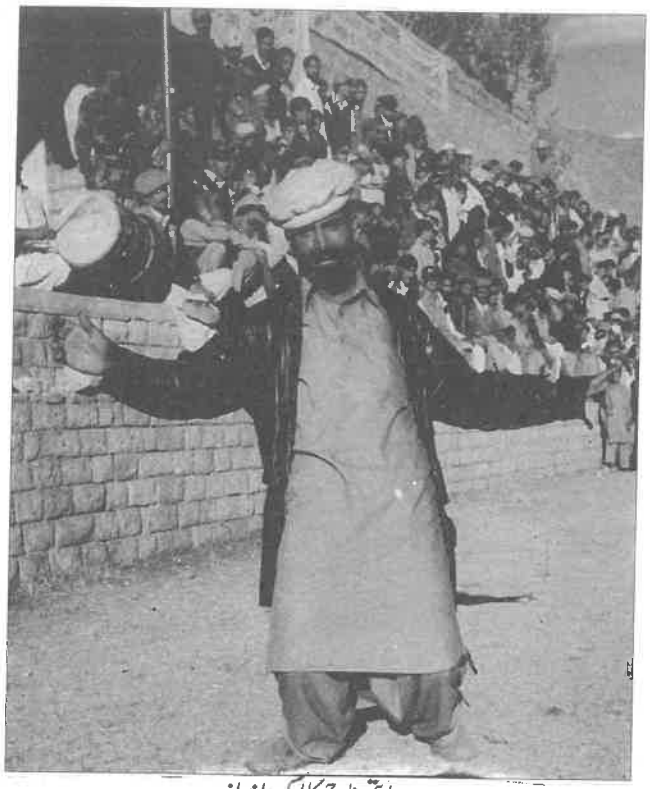
ہرشین گاؤں کے باہر ایک بڑا پتھر ماضی قریب تک دکھائی دیتا تھا جسے مقامی لوگ ''چلی بٹ'' کہتے تھے۔ اس تہوار میں ہندوؤں کے تہوار ''دسہرہ'' کی جھلک ملتی ہے۔

چلی: ''چلی'' تہوار سال کا آخری تہوار کہلاتا تھا جو گندم کی بوائی کے ساتھ ہی شروع ہوتا تھا۔ اس تہوار کا جشن دو دن تک جاری رہتا۔ تہوار کا پہلا دن راجہ (رع) کے نام کے ساتھ منسوب ہوتا اور دوسرا عوام کے لئے پہلے دن کے آغاز سے ایک شام پہلے لوگوں کا ایک جلوس راجہ کے محل کی طرف جاتا۔ جہاں سے ہر شخص کو پندرہ سیر گندم ملتا۔ پھر صندل کی لکڑی کا ایک الاؤ روشن کیا جاتا اور سارا گندم اس کے دھویں میں نہلایا جاتا۔ وہی گندم اگلے دن کھیتوں میں بونے کے لئے رکھ لیا جاتا۔ جو گندم بچ جاتا اسے پیس کر ایک بڑی روٹی تیار کی جاتی۔ یہ روٹی جس میں کئی لذیذ چیزیں ڈالی جاتیں، ایک آدمی کی حفاظت میں دے دی جاتی۔ وہ ساری رات اس پر پہرہ دیتا۔ اگلی صبح تمام لوگ ایک جلوس کی شکل میں وہ روٹی راجہ کے محل میں لے جاتے۔ جس شخص نے وہ روٹی اٹھائی ہوتی اس کے اپنے منہ پر آٹا ملا ہوتا اور اسے ''ڈونو'' کہا جاتا۔ رات کو بوائی کے لئے رکھی ہوئی گندم ان کے ساتھ ہوتی۔ راجہ اس گندم میں اپنی طرف سے سونے کے کچھ زیورات ملا دیتا جسے فصل کی فراوانی کا شگون سمجھا جاتا۔ پھر راجہ لوگوں کے ساتھ کھیتوں تک جاتا اور اپنے ہاتھ سے کسی کھیت میں حل چلا کر بیج بو دیتا۔ اس کے ساتھ ہی دوسرے تمام لوگ بھی اپنے کھیتوں میں حل چلانے لگتے۔ شام کو گندم کی بوائی سے فارغ ہو کر تمام لوگ راجہ کے محل میں جمع ہو جاتے۔ جہاں محفل موسیقی منعقد ہوتی۔ راجہ کیک نما روٹی کو کاٹ کر لوگوں میں تقسیم کرتا۔ یہ جشن رات گئے تک جاری رہتا۔ دوسرا دن جو کہ عوام کے ساتھ منسوب ہوتا، صبح سے شام تک جشن منایا جاتا۔ لوگ ایک دوسرے کے گھر جاتے اور خوب دعوتیں اڑاتے۔

ہنزہ اور نگر میں اس تہوار کو ''بھم کی بوائی'' کے نام سے پکارا جاتا اور بالکل مندرجہ بالا طریقہ سے منایا جاتا لیکن آب و ہوا میں فرق کے سبب وہاں یہ بہار کے دنوں میں منعقد ہوتا ہے۔ کیونکہ وہاں گندم کی بوائی اسی موسم میں ہوتی ہے۔ اس قسم کا میلہ یاسین اور چترال میں بھی منایا جاتا ہے۔ وہاں اس کا نام ''بنشک'' ہے یعنی بیج بونا لیکن وہاں اس میلے میں مہتر (راجہ) حصہ نہیں لیتا۔

جشنِ آزادیٔ گلگت:

یکم نومبر 1947ء کو گلگت اور دیامر کے غیور لوگوں نے ڈوگروں اور



روایتی ناچ کا ایک انداز

انگریزوں کی غلامی سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے نجات دلا کر شمعِ آزادی روشن کردی۔ چنانچہ سالانہ ماہ نومبر میں جشن آزادی کے پرمسرت موقع پر ہفتہ آزادی بڑے جوش وخروش کے ساتھ منایا جاتا ہے۔ اس دوران ہر چہرے پر مسرت اور شادمانی کی چمک ہوتی ہے۔ لوگ پورا ہفتہ کھیل تماشوں اور رقص وسرود میں گزارتے ہیں۔ اس دوران مختلف کھیلوں کے علاوہ رنگارنگ ثقافتی اور ادبی پروگرام ہوتے ہیں۔ ماضی میں اس موقع پر گٹل بالہہ، تیراکی، بسراہ، تنبک بازی، پہاڑی دوڑ اور رسہ کشی کے مقابلے بھی ہوتے تھے لیکن آج کل یہ کھیلیں باقی نہیں رہی ہیں۔ البتہ ان کی جگہ فٹ بال، ہاکی، کرکٹ، والی بال وغیرہ کھیلے جاتے ہیں۔ سب سے جاندار کھیل پولو جو ''بادشاہوں کا کھیل اور کھیلوں کا بادشاہ'' کے نام سے جانا جاتا ہے، شاہی پولو گراؤنڈ گلگت میں کھیلا جاتا ہے۔ جس میں شمالی علاقوں کے تمام اضلاع سے پولو کی ٹیمیں شرکت کرتی ہیں۔ جشن آزادی کے موقع پر علاقے کے دیگر نامور تنظیمیں رنگا رنگ ادبی اور ثقافتی محفلوں کا اہتمام بھی کرتی ہیں۔ ہفتہ آزادی کا اختتامی پروگرام بازاروں کی سجاوٹ اور چراغاں پر مشتمل ہوتا ہے۔ جس میں منتخب دوکانداروں کو تعریفی اسناد اور انعامات سے نوازا جاتا ہے۔ جشن آزادی کے موقع پر دیگر اضلاع سے کھیلوں کے شائقین گلگت کا رخ کرتے ہیں۔ جسکی وجہ سے ہفتہ بھر شہر میں میلے کا سا سماں ہوتا ہے۔ ان ایام میں ہوٹلوں کا کاروبار بڑا منافع بخش ہوتا ہے جہاں تل دھرنے کو جگہ نہیں ملتی۔

جشنِ بہار کا میلہ:

گلگت میں جشن بہاراں کا میلہ زمانہ قدیم سے رائج ہے۔ ماضی میں اس میلے کو ''بزونو'' کہا جاتا تھا جسکے معنی بہار کے ہیں لیکن آج کل یہ میلہ ماضی کی طرح نہیں منایا جاتا۔ عہدِ حاضر میں اس موقع پر کھیلوں کے علاوہ ادبی اور ثقافتی پروگراموں کا اہتمام ہوتا ہے۔ یہ جشن اپریل یا مئی کے مہینے میں ہفتہ بھر مناتے ہیں۔

سلک روٹ فیسٹیول:

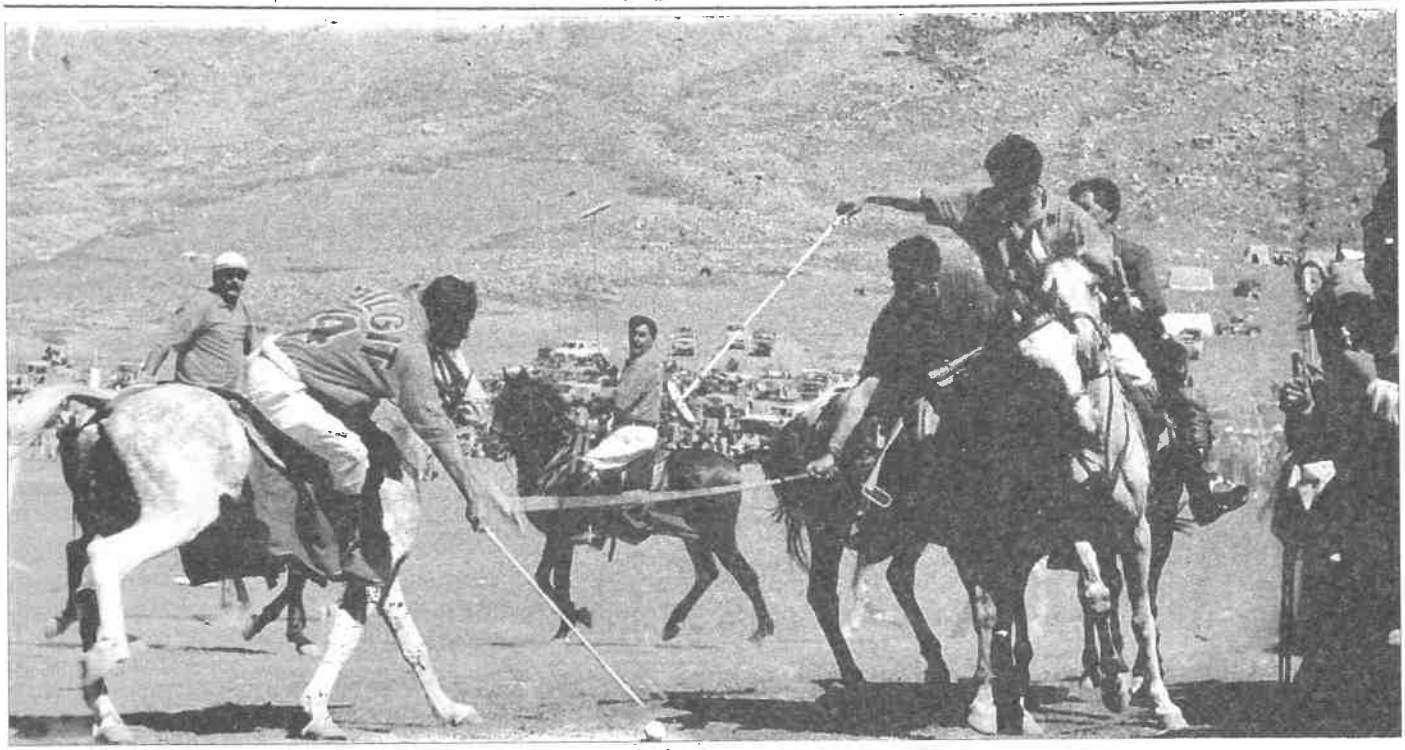
شمالی علاقہ جات میں مذکورہ فیسٹول کے انعقاد کا آغاز لوک ورثہ کے قومی ادارے نے ''انٹرنیشنل سلک روٹ فیسٹول'' منعقد کر کے کیا تھا۔ بعد ازاں اب یہ فیسٹول باقاعدگی سے ''سلک روٹ فیسٹیول'' کے نام سے منایا جاتا ہے، جس میں پاکستان کے علاوہ دیگر ہمسایہ اور وسط ایشیائی ریاستوں سے ثقافتی اور تجارتی مندوبین بھی شرکت کرتے ہیں۔ اس میلے کا اہتمام عموماً موسم گرما میں کیا جاتا ہے، کیونکہ اس دوران یہاں کا موسم بڑا خوشگوار اور دلکش ہوتا ہے۔ اس موقع پر تمام سرکاری، غیر سرکاری اور دیگر سماجی تنظیموں کے علاوہ ملکی اور غیر ملکی ادارے اپنی مصنوعات کا سٹال لگاتے ہیں۔ اس موقع پر شہر بھر میں جشن کا سا سماں ہوتا ہے۔ اس دوران مقامی ثقافتی اور ادبی تنظیموں کے علاوہ قومی اور مختلف ملکوں سے آئے ہوئے ثقافتی طائفے بھی اپنے فن کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ یہ میلہ تقریباً دو ہفتے تک جاری رہتا ہے۔ اس میلے کے ختم ہونے کے بعد بھی کئی دنوں تک اس کی رونقیں اور جوش وخروش دلوں کو مخمور رکھتے ہیں۔ چیمبر آف کامرس اور بازار کمیٹی کے تعاون سے مقامی مصنوعات اور قیمتی پتھروں کی نمائش بھی ہوتی ہے۔ گلگت کے علاوہ ہنزہ اور سکردو میں بھی اس تہوار کے موقع پر جزوی پروگرام ترتیب دیے جاتے ہیں۔ البتہ اس کے خصوصی پروگرام مرکزی شہر گلگت میں ہی ہوتے ہیں۔

جشن آزادیٔ پاکستان:

ان علاقوں میں سالانہ ۱۴، اگست کو یومِ آزادیٔ پاکستان بڑے جوش وخروش سے مناتے ہیں۔ ہفتہ بھر کھیل تماشے اور روایتی کھیل پولو کے علاوہ ادبی اور ثقافتی پروگرام بھی ہوتے ہیں۔ رات کو بازار میں چراغاں ہوتا ہے۔ مقامی وقومی اخبارات اس دن کی نسبت سے خصوصی ضمیمے شائع کرتے ہیں جبکہ مقامی ریڈیو سٹیشن اس حوالے سے خصوصی پروگرام نشر کرتا ہے۔

شندور میلہ:

ہر سال جولائی کے مہینے میں چترال اور شمالی علاقہ جات کی انتظامیہ کے باہم اشتراک سے ضلع غذر اور چترال کی سرحد پر واقع تقریباً 12500 فٹ بلند



شیندور میں پولو کا ایک منظر

مقام شندور میں سہ روزہ ''شندور میلہ'' کا انعقاد ہوتا ہے۔ جس میں شمالی علاقہ جات اور چترال کی پولو ٹیموں کے مابین سنسنی خیز مقابلے ہوتے ہیں۔ اس موقع پر شندور کی حسین وادی میں خیمہ بستی قائم کی جاتی ہے اور جگہ جگہ سٹال لگاتے ہیں، جس کی وجہ سے ساری وادی شہر کا منظر پیش کرتی ہے۔ اس میلے میں ملکی اور غیر ملکی سیاح جوق در جوق شرکت کرتے ہیں۔ ''شندور میلہ'' کے دوران راتوں کو ثقافتی پروگرام اور رقص و سرود کی محفلیں بھی منعقد ہوتی ہیں۔

محرم کی ماتمی مجالس:

شعیہ امامہ فرقے کے لوگ واقعہ کربلا کی یاد میں ہر امام بارگاہ میں مجالس منعقد کرتے ہیں۔ محرم کی دسویں تاریخ کی صبح مرکزی امامیہ مسجد گلگت سے ایک ماتمی جلوس نکلتا ہے۔ ماتمی جلوسوں میں مقامی زبان شنا اور اردو میں مرثیے اور نوحے پڑھے جاتے ہیں۔

شنا رسم و رواج

وہ علاقے جہاں شنا زبان بولی جاتی ہے، اپنے مخصوص اور منفرد رسم و رواج اور طرزِ معاشرت کی بدولت بہت مشہور ہیں۔ اگرچہ بیرونی اثرات اور اشاعت اسلام کے بعد ان لوگوں کے طور طریقے بہت بدل گئے ہیں لیکن کہیں کہیں یہ رسم و رواج کسی نہ کسی شکل میں آج بھی موجود ہیں۔ یہاں کے تہوار کم و بیش زراعت سے منسلک ہیں۔ آج کل تہوار پہلے جیسے جوش و خروش سے نہیں مناتے۔ تہوار زیادہ تر فصل کی بوائی، کٹائی اور کھیت میں ہل چلانے کے مختلف مواقع سے منسوب ہیں۔ جس طرح مختلف علاقوں میں بولی جانے والی زبان شنا کے لب و لہجہ میں کافی فرق ہے اسی طرح ایک ہی لسانی گروپ سے تعلق رکھنے والے مختلف علاقوں کے رسم و رواج میں بھی قدرے فرق پایا جاتا ہے۔

پیدائش کی رسمیں:

ماضی میں جب کسی کے ہاں کوئی لڑکا پیدا ہوتا تو مبارکبادی کے لئے ایک طرف عورتیں پہنچ جاتیں تو دوسری طرف رشتہ دار مرد حضرات اور دوست احباب اپنے اپنے رائفل تان کر وہاں پہنچ جاتے اور ہوائی فائرنگ کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہوتا البتہ لڑکی کی پیدائش پر نہ زیادہ خوشی منائی جاتی اور نہ ہی فائرنگ کا اہتمام کیا جاتا۔ ایک ہفتے سے بھی بیشتر ایام تک زچہ کے ہاتھ سے کوئی چیز نہیں کھائی جاتی تھی اور پیدائش والے گھر میں شام کے بعد گھر کا فرد یا کسی رشتہ دار کا آنا برا خیال کیا جاتا۔ لوگوں کے خیال میں رات کو دیر سے آنے سے بچہ بیمار ہوتا اور یہ بیماری جان لیوا بھی ثابت ہو سکتی تھی۔ جب بچہ رات کو کسی کے دیر سے آنے کی وجہ سے بیمار ہوتا تو عموماً لوگ کہتے کہ بچہ ''پاتھن'' ہو گیا ہے۔ بالفرض گھر کا کوئی فرد یا رشتہ دار کو کسی اہم کام کی وجہ سے گھر دیر سے آنا پڑتا تو نووارد گھر میں داخل ہو کر بغیر کسی سے بات کئے دایاں پاؤں بچہ کے جسم پر تین بار چھو لیتا تاکہ بچہ ''پاتھن'' کا شکار نہ ہو۔ ماضی میں زچہ کو 27 دن تک بستر میں رہنے دیا جاتا جبکہ آج

کل 40 دن تک کام نہیں کرنے دیا جاتا اور اس کی خوراک کے لئے دیسی گھی سے بنائے ہوئے طعام پیش کئے جاتے۔ پیدائش کے چند دن بعد تمام رشتہ دار جمع ہوتے جہاں نومولود کا باپ یا دادا نام تجویز کرتا یا مولانا صاحب قرآن کھول کے کسی لفظ پر انگلی رکھتا۔ انگلی ناگہانی طور پر جس حرف پر پڑتی وہی نام رکھا جاتا۔ 27 یا 40 دنوں کے بعد زچہ کا بستر اور کپڑے دھوکر پاک صاف کئے جاتے۔ زچہ، بھیڑ، یاک و اُڑیال کے سینگ جلا کر جو سیال مادہ حاصل ہوتا اُسے اپنے چہرے پر ملتی تاکہ موسمی اثرات سے بچا جا سکے۔ بعض دفعہ نومولود کے چہرے پر بھی اسے ملتے۔ مقامی لوگ اسے ''چوپ'' کہتے ہیں۔ یہ دراصل ہندی لفظ ''چھوپ'' کی بگڑی شکل ہے جو کثرت استعمال کی وجہ سے ''چوپ'' بن گیا ہے اور جو پلستر کرنے کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ پچھلے وقتوں میں راجوں اور رئیسوں کے بچے تو بڑے ناز و نعم کے ساتھ پلتے لیکن عام لوگوں کے بچوں کو وہ سہولیات حاصل نہیں ہوتی تھیں۔ حاملہ عورتوں کے لئے خصوصی روغنی طعام کا اہتمام کیا جاتا۔ البتہ زیادہ پانی کا استعمال زچہ کے لئے مضر تصور کرتے۔ عورت اور مرد کے درمیان دوران حمل ازدواجی تعلقات قائم رہتے۔ البتہ بچے کی پیدائش سے قبل کے مہینے میں قدرے احتیاط کر لیتے۔ دردزہ کے دوران عورت کے لئے روایتی گھر یا اس سے ملحق کسی مناسب جگہ پر اس مقصد کے لئے ہنگامی بنیادوں پر انتظامات کئے جاتے جس کے بارے میں مردوں کو کانوں کان خبر تک نہیں ہوتی۔ اس موقع پر گھر کی کسی تجربہ کار خاتون کی خدمات سے استفادہ کیا جاتا۔ حاملہ عورت کی وضع حمل کے وقت کا اندازہ گھر کی مالکن کر لیتی لیکن وہ اس کی اطلاع سوائے مددگار عورت کے اور کسی کو نہیں دیتی۔ کیوں کہ لوگوں کا خیال ہے کہ بہت ساروں کو پتہ لگے تو وہ، بچہ یا بچی کی پیدائش کی خبر سننے کے لئے بے چین ہوتے ہیں اور ان کی یہ بے چینی حاملہ عورت کے وضعِ حمل کیلئے باعث تکلیف تصور کی جاتی۔ بچہ جننے کے دوران متعلقہ مقام پر مردوں کا داخلہ بند ہوتا ہے۔ بچہ پیدا ہونے کے بعد آنول اور آنول نال زمین میں دفن کر دیتے ہیں۔ بیری ہلیری (زہلدی) راکھ میں دبا کر گرم کر کے اسے پیستے اور ململ کے کپڑے میں چھان کر اس میں سرسوں کا تیل ملاتے اور اس محلول کو ناف کے زخم پر لگاتے اور سوتی کپڑے سے باندھتے۔ یہ عمل چند دنوں تک کرنے سے ناف کا زخم ٹھیک ہوتا۔ پرانے وقتوں میں زچہ چالیس دن بعد غسل کر کے پاک صاف ہوتی جبکہ آج کل تین دن یا ہفتہ بعد یہ عمل کیا جاتا ہے۔ زچہ سے تقریباً چالیس دن تک شوہر ازدواجی تعلقات قائم نہیں رکھ سکتا۔ قبل از وقت اسقاطِ حمل کو مقامی زبان میں ''خاتن'' کہتے ہیں۔ اس کی نہ تو زیادہ تشہیر کی جاتی ہے اور نہ کوئی تعزیت کرتا ہے۔ ماں بچوں کو عموماً دو سے اڑھائی سال تک دودھ پلاتی۔ عورت اس دوران جب بچہ دودھ پی رہا ہو اگر دوبارہ حاملہ ہوتی تو بچے کو دودھ پلانا بند کر دیتی۔ اور اسے مال مویشی کا دودھ دیا جاتا۔ اس دوران اگر ماں کا دودھ آتا ہو اور بچے کی صحت پر منفی اثرات مرتب نہ ہوتے ہوں تو ایسی صورت میں شیر مادر کو ہی ترجیح دی جاتی۔ نومولود بچے کے سارے جسم پر مائیں کڑوی گری کے تیل سے مالش کرتیں۔ بھیڑ بکریوں کی مینگنیوں کے پاؤڈر یا چکنی مٹی (ملہٖ) کو بچے کی بول و براز نکلنے کے جگہ کے ارد گرد چھڑک کر کپڑے میں لپیٹتے اور اس عمل کو ''تلس تھونک'' کہتے۔ اگر زچگی کے دوران عورت بد پرہیزی کرے اور مرچ وغیرہ کا استعمال کرے تو اس سے بچہ بھی متاثر ہوتا اور ماہر عورت ''شُدار سے کھے سیگن'' کہتی۔ ایسی صورت میں ایک کڑوی گری کوٹ کر بچے کا پاخانہ نکلنے کی سوراخ میں ڈالتے تو بچہ ٹھیک ہوتا۔ والدین نوزائدہ بچے کو پہلی بار گھر سے باہر نکالتے اور ابتدائی بال کاٹتے وقت بھی بڑوں اور چھوٹوں کا منہ میٹھا کرنے کا اہتمام کرتے۔ سال بعد ''ڈاڈا'' کی رسم ادا کی جاتی۔

سردیوں میں بچوں کی پیدائش کے ایک یا دو ماہ بعد گائے کا گوبر کسی ایسی صاف جگہ سے جمع کرتے جہاں انسانی گندگی موجود نہ ہو۔ اس گوبر کو خشک کر کے اوکھلی (اڈور) میں کوٹتے اور چھانی میں چھان کر کھردرے ٹکڑوں کو علیحدہ کرتے۔ میدہ کے مانند جو مواد حاصل ہوتا اسے قدرے گرم کرتے۔ بھیڑ کے چمڑے کے بیرونی اونی حصے کو اندر کی طرف کر کے بچے کی سائز کو مدنظر رکھتے ہوئے ایک تھیلہ سا بنایا جاتا اور اس میں گرم گوبر سے حاصل مواد ڈال دیا جاتا۔ اس تھیلے کو مقامی لوگ ''کُتشہ'' کہتے تھے۔ پھر صبح کے وقت بچے کو چمڑے سے بنے ہوئے تھیلے میں ڈال کر اسے اونی دھاگہ سے بنی ہوئی ناڑہ سے باندھ لیتے البتہ بچے کا سر تھیلے سے باہر رکھا جاتا ہے۔ ہر رات کو بچہ تھیلے سے باہر نکالا جاتا اور کتشہ میں موجود گوبر میں سے بچے کی گندگی کو الگ کرنے کے بعد باقی مواد کو گرم کر کے خشک کرتے اور اگلی صبح پھر استعمال کیا کرتے۔ عورت حاملہ ہوتے ہی اہل خانہ کو دیسی گھی کی فکر ہوتی ہے۔ البتہ اہل ثروت اس مقصد کے لئے گھی ذخیرہ کر کے رکھتے۔ کیونکہ زچگی کے دوران تقریباً دو ماہ تک اسے گھی کھلاتے ہیں۔ بچہ پیدا ہونے کے کچھ دن بعد زچہ رشتہ دار اور محلے کی عورتوں کو مدعو کر کے روایتی طعام ''مُل'' سے تواضع کرتی ہے۔ عورتوں کی یہ روایتی ضیافت ''کین'' کے نام سے موسوم ہے۔ ایسے مواقع پر گھی کا زیادہ سے زیادہ استعمال باعث تفاخر سمجھتے ہیں۔ عورتیں آپس میں بڑے فخر سے کہتی ہیں کہ میں نے اس زچگی (چاتر) کے دوران بیس سیر، تیس سیر یا ایک من گھی خرچ کیا۔ عموماً دعوت پر جو عورتیں شریک ہوتیں وہ زچہ کے لئے انڈوں، پیسوں یا کپڑوں کی شکل میں تحفہ دیا کرتیں، جسے مقامی لوگ ''پندر'' کہتے ہیں۔ نومولود کے دائیں کان میں اذان اور بائیں کان میں اقامت پڑھنے کے بعد ہی ماں بچے کو دودھ دیتی۔ زچہ بچہ کی خدمت کے لئے

عموماً ماں، بہن یا خالہ وغیرہ ہفتہ دس دن تک زچہ کے گھر میں رہتی ہیں، بصورتِ دیگر زچہ کو ساس اور نند کے رحم وکرم پر چھوڑ دیا جاتا۔ ماضی میں ایسے مواقع پر زچہ کے سرہانے عموماً چھری یا چاقو رکھ دیتے تا کہ ان کے ڈر سے بدروحیں قریب نہ آئیں۔ بچہ پیدا ہوتے ہی اسے غسل دیتے۔ پھر سرسوں یا گری کے تیل سے مالش کر کے اسے نئے کپڑے پہناتے اور آنکھوں میں سرمہ لگاتے۔ نومولود کی ناف کاٹنے کے لئے گھر کی معمر خاتون کی خدمات حاصل کی جاتی تھیں۔ ضلع دیامر بالخصوص چلاس اور داریل تانگیر میں عورتوں یعنی بیویوں سے پہلے بچے کی پیدائش تک سیدھے منہ بات کرنا معیوب سمجھا جاتا۔ اگر بات کرتے بھی تو کسی اور کو کانوں کان خبر ہونے نہیں دیتے تھے۔ ہر بھائی اپنی اولاد کی بجائے بھائی کی اولاد سے لاڈ پیار کرتا۔

منگنی:

زیادہ تر والدین خود ہی لڑکی کو پسند کرتے اور گاؤں کے کسی بزرگ کو لڑکی والوں کے گھر رشتہ کا پیغام دینے کے لئے بھیج دیا جاتا۔ جب لڑکی والے راضی ہوتے تو دعا پڑھی جاتی۔ لٹھا جسے ''جملی'' کہتے ہیں کے ساتھ سوئی دھاگہ اور ایک چھری یا چاقو لڑکے والوں کو دے دیتے۔ اس چھری کا مطلب یہ تھا کہ وعدہ پکا ہوگیا۔ اگر وعدہ توڑا گیا تو اس کا فیصلہ چھری کرے گی اور کپڑے کا مطلب یہ ہوتا تھا کہ خلاف ورزی کی صورت میں یہ کپڑا وعدہ کرنے والے یعنی لڑکے کے باپ کا کفن ہوگا۔ سوئی اور لٹھے کی صورت میں یہ مطلب لیا جاتا کہ اب بدلہ محض لڑکی کے باپ یا بھائی یا جس نے رشتہ دینے سے انکار کیا، سے لیا جائے گا۔ اور اسے سوئی سے سی کر کفن پہنایا جائے گا۔ دیگر لفظوں میں بعض دفعہ یہ رسم نسلی تصادم پر منتج ہوتی اور خونی واقعات کے لامتناہی سلسلے شروع ہوتے۔ اگر کوئی لڑکا یا لڑکی اپنے کپڑوں کو کسی وجہ سے غصے سے پھینک دیں تو مائیں آج بھی ان کو بد دعا دیتی ہیں کہ ''خدا اس انہہ تھئی جملی تھروت'' یعنی خدا کرے کہ یہ کپڑے تمہارا کفن ثابت ہوں۔

منگنی کے سلسلے میں گلگت میں ایک اور رسم ''لبن پھیونک'' بھی تھی جو عموماً بچپن میں انجام دی جاتی۔ دامن چاک کرنے کو شنا میں ''لبن پھیونک'' کہتے ہیں۔ اس کے مطابق مطلوبہ بچی کے دامن کا معمولی سا حصہ اس کے والدین کی موجودگی میں چاک کر کے کہہ دیتے کہ آپ کی یہ بچی ہمارے فلاں بیٹے کی ہوگئی۔ اس پر لڑکی کے والدین ضرور حامی بھرتے کیونکہ وہ انکار کر کے فریق ثانی کے اعتماد کو ٹھیس نہیں پہنچاتے۔ فریقین اس طرح کے قول واقرار پر سختی سے کاربند ہوتے۔ البتہ چلاس اور اس کی مضافات میں لڑکی کے سر سے چند بال (چونی) نکال کر کہتے کہ یہ لڑکی ہمارے فلاں لڑکے سے منسوب ہوئی۔

آج کل خاص گلگت میں جب منگنی کی بات فریقین میں پکی ہوتی تو سب سے پہلے دعا پڑھی جاتی۔ پھر تاریخ مقررہ کو دولہا کے رشتہ دار خواتین دلہن کے لئے انگوٹھی اور کپڑے وغیرہ لے کر اس کے گھر پہنچ جاتیں۔ دولہا کی طرف سے جانے والی ہر خاتون اپنے ساتھ کیک، مٹھائی، جلابی وغیرہ کا تحفہ جسے مقامی زبان میں ''پھیال'' کہتے ہیں لے کر جاتی۔ دلہن کی ساس اسے انگوٹھی پہناتی۔ نئے کپڑے پہنائے جاتے اور بناؤ سنگھار کا خصوصی اہتمام کیا جاتا اور لڑکی دلہن بنائی جاتی۔

اسکے بعد عورتیں اندرون خانہ ناچ گانے کا اہتمام کرتیں۔ دلہن کے گھر والے دولہا کے رشتہ داروں کے اعزاز میں خصوصی دعوت کا اہتمام کرنے کے بعد انہیں عزت واحترام سے رخصت کرتے۔ البتہ چند مقامات پر یہ رسم کچھ فرق کے ساتھ رائج ہے۔ چند دن بعد دولہا کے گھر والے دلہن کے گھر والوں کو منگنی کی خوشی میں دعوت دے کر اپنا گھر دکھاتے ہیں جس میں دلہن شریک نہیں ہوسکتی۔ دلہن کے گھر والوں کی طرف سے بھی اسی طرح کے خیر سگالی کے جذبات کا اظہار کیا جاتا۔ شادی کی تاریخ مقرر ہونے کے بعد دلہن کو اپنے گھر کھانا بہت کم نصیب ہوتا ہے کیونکہ تمام رشتہ دار اور دلہن کی سہیلیاں اس کے لئے دعوت کا اہتمام کرتی ہیں اور شادی کے دن تک یہ سلسلہ جاری رہتا ہے۔ اہلِ استور اس دعوت کو ''ہلائی ٹکہہ'' کہتے ہیں جبکہ چلاس، داریل، تانگیر میں ''منیجا ٹکہہ'' کہتے ہیں۔ مقامی زبان میں دلہن کو ''ہلال'' اور دولہا کو ''ہلالو'' کہتے ہیں۔ شادی تک جب بھی کوئی تہوار ہوتا ہے تو دولہا والے دلہن کے لئے خصوصی تحفہ بھیجتے ہیں جو کپڑوں، جوتوں اور بناؤ سنگھار کی اشیاء پر مشتمل ہوتا ہے۔

پہلے وقتوں میں شادی سے ایک دن پہلے ''مہندی'' کی رسم ادا کی جاتی تھی۔ شنا میں مہندی کو ''سرونگ'' کہتے ہیں۔ جس میں دولہا اور دلہن کے علاوہ دیگر افراد بالخصوص خواتین بھی اپنے ہاتھوں پر مہندی لگاتی ہیں۔ ماضی میں مہندی، مقامی طور پر دستیاب مہندی کا پودا کوٹ کر تیار کی جاتی تھی۔ اب یہ صورت حال یکسر بدل گئی ہے۔ مہندی والے دن لڑکی کے گھر سے اس کی رشتہ دار لڑکیاں تیار مہندی کے تھال لے کر دولہا کے گھر جاتی ہیں اور مہندی کی رسم میں بھرپور حصہ لیتی ہیں۔ یہ لڑکیاں دولہا کے ہاتھوں پر مہندی خود لگاتی ہیں اور دیر تک فلمی دھنوں کی تھاپ پر ناچتی ہیں۔ پہلے شنا گیت گا کر مقامی انداز میں ناچ کی محفلیں جمتی تھیں لیکن اب ڈیک بجا کر فلمی انداز کے ناچ گانے ہوتے ہیں۔

پہلے وقتوں میں لڑکی کے تحفظ کے لئے کسی بااثر شخصیت کو منہ بولا باپ بنایا جاتا تھا اور نکاح کے وقت اس کا باقاعدہ اعلان بھی کیا جاتا تھا۔ یہ بااثر شخص لڑکی پر کوئی افتاد پڑنے کی صورت میں مدد کرتا۔ یہ طریقہ کار اب ختم ہوتا جارہا ہے۔

شادی:

شنا بولنے والے علاقوں میں شادی کی تقریب بڑے اہتمام کے ساتھ منائی جاتی ہے۔ البتہ ہر علاقے کی شادی کی رسومات دوسرے علاقے سے قدرے مختلف ہوتی ہیں۔ ماضی میں مرد حضرات اکثر اپنی مرضی سے بیوی کا انتخاب کر لیتے تھے لیکن عورت کی مرضی کے مطابق شادی کرنا معیوب سمجھا جاتا تھا۔ شادیوں میں زیادہ تر والدین کی رضامندی کو اولیت دی جاتی۔ تاہم لڑکا اور لڑکی کی رضامندی کا خاص خیال رکھا جاتا۔ پہلے زمانے میں لڑکے کے لئے لڑکی مانگتے وقت ایک عجیب طریقہ رائج تھا۔ لڑکے کا والد لکڑی کی بنائی ہوئی تھالی (شنا زبان میں اسے پتہہ کہتے ہیں) میں ایک چاقو اور سوئی رکھ کر اسے چار گز لٹھے سے ڈھانپ کر لڑکی کے والد کو پیش کرتا۔ بعض اوقات جانوروں کے بالوں سے بنائی ہوئی ایک رسی بھی شامل کی جاتی۔ اگر لڑکی کا والد اس تحفے کو قبول کرتا تو مجوزہ رشتے کے لئے لڑکی کے والد کی رضامندی تصور کی جاتی۔ آسانی کی خاطر شادیاں عموماً جنوری اور فروری میں ہوتی تھیں کیونکہ ان ایام میں کاشتکاری کا کوئی کام نہیں ہوتا تھا اور لوگ عموماً گھروں میں ہی رہتے تھے۔ سردیوں میں گوشت کا بھی ذخیرہ ہوتا تھا۔ اگر شادی ادل بدل کی ہوتی تو معاوضات نہیں لئے جاتے۔ شنا میں ادل بدل کی شادی کو ''دوبان'' کہتے ہیں۔ البتہ وٹے سٹے کی شادی نہ ہوتی تو رقم لے کر لڑکی دی جاتی۔ لڑکے کے والدین کی طرف سے دی جانے والی اس رقم کو مقامی زبان میں ''رپ'' کہتے ہیں۔ پرانے وقتوں میں شادیاں کم عمری میں کرتے تھے۔ لوگ بچے زیادہ پیدا کر کے فخر محسوس کرتے تھے۔ کم بچوں والا گھرانہ کمزور تصور کیا جاتا۔ غریب لوگ گاؤں کی مضافات میں ہی لڑکیاں بیاہنے کو ترجیح دیتے تھے۔ تاکہ وقتاً فوقتاً ان کی خبر گیری کر سکیں۔ لولے لنگڑے، اپاہج اور عقل سلیم سے خالی افراد کی شادی سے یا تو گریز کرتے یا انہیں کے قبیل کے افراد سے رشتہ طے کیا جاتا۔ ایسے افراد کی اولاد نہ ہو تو اسی میں ہی عافیت سمجھی جاتی تاکہ جائداد میں ان کا حصہ بھی ہتھیا سکیں۔ اس طرح کے معذور لوگوں کی اولاد کو محض جائداد کی خاطر ٹھکانے لگانے سے بھی دریغ نہیں کرتے تھے۔ شادی کے لئے ہنرمند اور امور خانہ داری میں ماہر لڑکی کو ترجیح دیتے۔ لڑکی کا قد و قامت، صورت اور سیرت اور ان کے اہل خانہ کی، برادری میں مقام اور مرتبے کو بھی مدنظر رکھ کر شادی کا پیغام بھیجتے۔ جب کہ لڑکیاں حد سے زیادہ موٹا اور حد سے زیادہ کمزور جوان بغرض شادی پسند نہیں کرتی تھیں۔ اس کے برعکس آج کل لڑکے کی محض جائداد اور تعلیمی قابلیت دیکھی جاتی ہے۔ شادی کا دن مقرر کرنے کے لئے علماء سے رجوع کیا جاتا تھا جو فال کے ذریعے کوئی مبارک دن شادی کے لئے مقرر کرتے۔ شادی کی تاریخ اکثر لڑکی والوں کی مرضی سے طے کی جاتی ہے۔ بعض دفعہ نکاح کے بعد رخصتی میں کافی تاخیر کی جاتی تھی۔ البتہ منکوحہ عورت نکاح کے بعد والدین کے گھر میں ہی اپنے خاوند سے ازدواجی تعلقات قائم کرتی تھی۔ ایک بچہ یا کئی بچوں کی پیدائش کے بعد رخصتی کا اہتمام کرنے کے واقعات بھی ماضی میں عام تھے۔ جب بیوی فوت ہو جائے تو بچوں کی دیکھ بھال کے بہانے چند مہینے یا سال بعد شوہر نئی شادی رچاتا جبکہ بیوی بیوہ ہو اور اس کے بچے بھی جوان ہوں تو وہ حتی المقدور باقی ماندہ زندگی میں بیوہ رہنے کو ترجیح دیتی۔ بیوی کی وفات کے چالیس دن کے اندر اگر مرد دوسری شادی کرے تو اسے معیوب سمجھتے اور کہتے کہ کتنا بے وفا مرد ہے اِدھر بیوی کے قبر کی مٹی بھی نہیں سوکھی اُدھر اس نے دوسری شادی رچا دی۔

1894ء کی بندوبست کے نائب مہتمم امیر سنگھ لکھتے ہیں ''شادی ہر ایک قوم کے اندر باہمی ہوتی ہے اور مختلف قومیں ایک دوسرے کو ناطہ دیتے ہیں اور نہ لیتے ہیں اور ناطہ بھی عام طور پر روپیہ لے کر ہوتا ہے۔ بعض جگہ عوض معاوضہ کا رواج ہے مگر مفت ناطہ بالکل نہیں ہوتا'' سونا زرِ مبادلہ کے طور پر مستعمل تھا۔ شنا میں طولو چودہ روپوں کے برابر مانا جاتا تھا۔ اس حساب سے لڑکے والوں سے بارہ طولو روپیہ یا سونا، بکری قیمتی ایک طولو، طلاء، بندوق قیمتی ایک طولو، تلوار قیمتی ایک طولو باقی دیگر اخراجات کے لئے نو طولو روپیہ اور تیرہ گز لٹھا لیا جاتا۔ بچپن یا پیدائش کے فوراً بعد جو رشتے ناطے، بچہ اور بچی کے والدین طے کرتے ان کی پاسداری بھی کی جاتی۔

شادی کی مقررہ تاریخ کو دولہا کے گھر والوں کی طرف سے دو آدمیوں کا چار پانچ سیر گھی لے کر دلہن کے گھر جانے کا بھی رواج تھا۔ یہ اشخاص ''منو یا چُت گر'' کہلاتے۔ یہ بطور سفیر دلہن کے گھر جاتے۔ اگر یہ ایسا نہ کرتے تو دولہا کے گھر رسم تاوُاد انہیں ہوتی اور جس کے نتیجے میں شادی بھی رک جاتی۔ ''چُت گر'' دلہن کے گھر پہنچنے کے بعد ان کے رحم و کرم پر ہوتے جہاں ان سے مشقت کے کام لئے جاتے۔ جب تک دلہن والے انہیں اجازت نہ دیں یہ واپس دولہا کے گھر نہیں جا سکتے۔ اس دور میں اگرچہ وہ سختی باقی نہیں رہی ہے لیکن ''چُت گر'' کا دلہن کے ہاں جانے کی رسم کہیں کہیں اب بھی باقی ہے۔

پہلے وقتوں میں شادیاں عموماً اپنے اپنے خاندان میں کی جاتیں اور دوسرے خاندانوں کے ساتھ بہت کم ہوتی تھیں لیکن آج کل خاندانی شادیوں کے علاوہ دیگر خاندانوں کے ساتھ شادیاں کرنے کا رواج عام ہے۔ طلاق کے معاملات بہت کم ہوتے تھے۔ تاہم ماضی میں طلاق کی صورت میں جرمانے مقرر تھے۔ یہ جرمانے بھی بارہ طولو کے برابر ہوتے تھے۔ اگر کسی عورت کو مرد سے آزاد کرانا ہوتا تو خلع کا سہارا لیا جاتا۔ جس میں عورت اپنے حق مہر سے دستبردار ہو جاتی جو کہ شرعی طریقہ ہے۔ لیکن ہمارے ہاں یہ طریقہ کچھ اور انداز میں بھی رائج تھا۔

جس میں مہر ترک کرنے کے علاوہ عورت کچھ رقم شوہر کے مطالبے پر ادا کرتی اور مجبوری سے ادا کرتی کیونکہ ایسا نہ کرنے کی صورت میں وہ اس مرد سے آزاد نہیں ہو سکتی۔ اس میں ''لبن پرونک'' یعنی میرے مطالبے کی رقم سے ''میرا دامن بھر دو'' پھر خلاصی پاؤ کا طریقہ ہمارے علاقے میں رائج تھا۔ نکاح مولوی صاحب پڑھاتے۔ مولوی صاحب کو پہلے پہل ایک روپیہ معاوضہ کے طور پر دیا جاتا تھا۔ بعد میں رقم بڑھتی گئی اور کئی کئی سو روپے نکاح خواں کو ادا کئے جاتے تھے۔

بعض جگہوں پر یہ بھی رواج تھا کہ شادی کے فوراً بعد لڑکا چند ماہ کے لئے لڑکی والوں کے گھر رہتا۔ ضلع دیامر کے بیشتر علاقوں میں ایک سے زیادہ شادیوں کا رواج عام تھا۔ چند برس قبل بھی پانچ بیویاں داریل کے ایک آدمی کی عقد میں تھیں۔ طلاق دینے کا حق مرد کو حاصل تھا۔ لڑکیوں کی شادی دس سے چودہ سال کی عمر کے درمیان کر دی جاتی تھی۔ بیویاں اپنے شوہروں اور ان کے وارثوں کی ملکیت ہوتیں۔ اب اتنی چھوٹی عمر میں شادی کا رواج ختم ہوا ہے۔ اگر عورت کسی سفر میں یا گھر سے باہر مرد کے ساتھ کہیں جا رہی ہو تو راستے میں اگر مرد کا کوئی دیرینہ تعلق دار ساتھی بھی ملے تو وہ (مرد) اپنے دوست کو سلام تک سے گریز کرتا ہے محض اس لئے کہ عورت اس کے ساتھ ہے۔ ایسی صورت میں اس کا ساتھی بھی سلام کرنے سے باز رہتا ہے۔ دراصل لوگ بیرون خانہ مرد کے ساتھ عورت کی موجودگی میں متعلقہ مرد کو خود سلام کرنا یا اس سے سلام کی توقع رکھنا یا گفت وشنید کرنا معیوب سمجھتے ہیں۔ جب کوئی عورت زیادہ بولنے لگے تو مرد حضرات اسے یہ کہہ کر خاموش کراتے ہیں کہ ''کرکا مش بشی لونا بین'' یعنی مرغی جتنی بھی بولتی رہے صبح نہیں ہوتی کیوں کہ صبح ہونے کے لئے مرغے کی اذان ضروری ہے۔

دولہا کو شادی کے لئے سفید کپڑے، بنیان اور چپن پہنائے جاتے جبکہ بعض جگہوں میں دولہا کے سر پر دستار ''تھٹوہ'' پہنائی جاتی اور دستار پر چاندی سے بنا ہوا زیور جسے ''گنڈو'' کہتے ہیں، لگاتے۔ نکاح کے بعد اپنے گھر آ کر دولہا دستار چھوڑ دیتا اور مرغ زرین کی کلغی سے سجائی ہوئی روایتی سفید ٹوپی پہنتا۔ جب دولہا شادی کے کپڑے وغیرہ پہن کر تیار ہوتا تو اس وقت خواتین وحضرات اپنی اپنی حاجت براری کے لئے اس سے دعا کی فرمائشیں کرتے کیونکہ لوگوں کا خیال ہے کہ شادی کے دن/رات دولہا کی دعائیں ردّ نہیں ہوتیں۔ آج کل شادی کا ہنگامہ تقریباً تین دنوں تک جاری رہتا ہے۔ دولہا کے ہاں پہلے دن رسمِ تاؤ، دوسرے دن روانگی بارات اور تیسرے دن دعوتِ ولیمہ کا اہتمام ہوتا ہے جبکہ دلہن کے گھر شادی کے ہنگامے دو دن تک محدود ہوتے ہیں۔ پہلے دن رسمِ حنا بندی اور دوسرے دن دلہن کی رخصتی کا اہتمام کیا جاتا۔ دولہا کا گھر دھوم دھام اور شادی کے ہنگاموں سے لبریز ہوتا جس کے مقابلے میں دلہن کے ہاں بڑی سادگی سے شادی اختتام پذیر ہوتی ہے۔

ایک دس سالہ لڑکے کے لئے اپنے سے دوگنی عمر کی عورت سے شادی عام دیکھنے میں آتی۔ لڑکا جوان ہونے پر پوچھا جاتا کہ کیا وہ فلاں لڑکی سے شادی کرنا چاہتا ہے کہ نہیں۔ مرحوم بھائی کی بیوہ کے ساتھ شادی سے انکار کو بے عزتی سمجھا جاتا تھا۔ پرانے ہتھیار بڑی حفاظت سے رکھے جاتے اور شادی بیاہ کی تقریبات میں ان کی نمائش کی جاتی۔ اس نمائش کے بغیر تقریب مکمل نہیں سمجھی جاتی۔ اگر دولہا کلہاڑے یا تیر کمان کے بغیر اپنے سسر کے گھر جاتا تو اسے واپس بھیج دیا جاتا۔ اگر وہ پھر بھی خالی ہاتھ آتا تو اس سے فالتو رقم لی جاتی تھی۔

شادی کی مذکورہ رسومات آج سے تقریباً ڈیڑھ صدی قبل کی معلومات پر مبنی ہیں۔ جن میں وقت کے ساتھ ساتھ بڑی تبدیلیاں آئی ہیں۔ ماضی قریب کی شادی کی رسومات کے مطابق بیوی کو خاندان کی عزت کا باعث سمجھا جاتا اور بچپن کی شادی کا رواج اب بہت کم ہوا ہے، البتہ منگنی کی رسم بچپن ہی میں ادا کر دی جاتی۔ شوہر کی وفات کے بعد بھی بیوہ پر اس کے والدین کا بہت کم اختیار ہوتا۔ طلاق کی بری رسم بہت کم تھی۔ اگر کسی کی عورت کے ساتھ کوئی غیر مرد کے ناجائز تعلقات ہوتے تو دونوں کو قتل کر دیا جاتا۔ اگر کوئی شخص صرف طلاق تک اس معاملے کو محدود رکھے تو اس کو نہایت ہی بے غیرت سمجھا جاتا۔ شادی حسبِ سابق والدین کی مرضی کے مطابق ہی ہوتی تھی۔

کلیک ملیک (جہیز) :

پہلے زمانے میں لڑکی کو شادی کے دوران جو اشیاء والدین کی طرف سے ملتیں اور جو چیزیں لڑکے کے گھر والے دیتے ان کی تفصیلات کلیک ملیک کا حصہ ہوتیں۔ یہ اشیاء دلہن کی ملکیت ہوتیں اور اس کا حساب کتاب رکھا جاتا۔ اگرچہ اس وقت والدین کی طرف سے ضروری اشیاء مثلاً لوٹا، پیالہ، چمٹا، بالٹی، دیگچہ، ڈوئی، بستر وغیرہ دیے جاتے۔ جس کا مطلب یہ ہوتا تھا کہ خاتونِ خانہ اپنے شوہر کے گھر پہنچ کر کھانے پکانے اور اوڑھنے بچھونے اور گھر بسائی کے امور میں خود کفیل ہو۔ اگر خدانخواستہ شوہر اور بیوی میں کوئی ناچاقی پیدا ہوتی یا سسرال والوں کی طرف سے کوئی زور زیادتی ہوتی اور شوہر بیوی کی جدائی کی نوبت آجائے تو ایسی صورت میں عورت اپنی ایک ایک چیز واپس لیتی اور یہ معاملہ بھی ''کلیک ملیک'' کا حصہ خیال کیا جاتا تھا۔ جہیز کو مقامی لوگ ''دگنی'' کہتے ہیں۔ شنا میں ''گھرینو'' کی ایک اصطلاح بھی موجود ہے جس کے معنی وہ تمام اخراجات ہیں جو لڑکے والوں کی طرف سے لڑکی والوں کو دیے جاتے۔ اس میں گھی، لکڑی، چاول، آٹا، مرچ مصالحہ، نمک، کپڑے، لٹھا، زیورات اور مختلف اوزان میں طلاء وغیرہ شامل ہیں۔ یہ چیزیں بھی ''رپ'' کے زمرے میں آتی ہیں۔

قدیم دور میں شادی کے مواقع پر ''ترنگفہ'' (لمبردار) بھی اپنا ٹیکس لیتا تھا۔ شادی گاؤں میں ہی ہوتی تو کچھ نہیں لیا جاتا۔ اگر غیر دیہہ میں شادی ہوتی تو لڑکے کا والد ''ترنگفہ'' کو آٹھ آنے نقد اور آٹھ ہاتھ کپڑا دینے کا پابند ہوتا تھا۔

پرانے زمانے میں اگر لڑکی کے ساتھ کوئی جھگڑا اور ناچاقی ہو جاتی یا اس پر کسی اور قسم کی زیادتی سسرال والوں کی طرف سے ہوتی تو اس صورت میں لڑکی کی شادی پر ہونے والے تمام اخراجات بطور جرمانہ خاوند کو ادا کرنے پڑتے تھے۔ آج کل اس طرح کے وعدہ وعید قبل از شادی نہیں ہوتے۔ پھر بھی اگر شادی کے بعد کوئی ایسا مسئلہ پیدا ہو جائے تو علاقے کے معززین خوش اسلوبی سے اسے حل کر دیتے ہیں۔

رسم تاؤ اور رسم مہندی:

تاؤ کی رسم کو پرانے زمانے میں لوگ نیک شگون سمجھتے تھے۔ کیونکہ اس رسم کے تمام اعمال سے پاکیزگی کا اظہار ہوتا تھا یہ رسم مہندی والے دن یعنی نکاح سے ایک روز پیشتر ادا کی جاتی۔ شنا میں اس رسم کو ''رسمِ تاؤ'' کہتے ہیں۔ یہ رسم گلگت اور غذر میں کہیں کہیں اب بھی موجود ہے۔ جبکہ چلاس میں یہ رسم نہیں ہے۔ اس رسم کی ادائیگی کے دوران دولہا کے گھر تمام رشتہ دار یکجا ہوتے اور دوست احباب بھی مدعو کیے جاتے۔ یہ لوگ قیمتی تحائف یا نقد رقم حسب استطاعت ساتھ لاتے اور اسے دولہا یا اس کے سرپرست کو دے دیتے۔ مقامی لوگ اسے ''پندر'' کہتے ہیں۔ ''پندر'' دینے کا طریقہ آج بھی رائج ہے اور لوگ اسے قرض سمجھ کر ادا کرتے ہیں۔ اسلئے اس کا باقاعدہ حساب رکھا جاتا ہے تاکہ دوسروں کی شادی کے مواقع پر اتنی ہی رقم اور ایسا ہی تحفہ لوٹایا جا سکے۔ تاؤ کی رسم ادا کرنے سے پہلے دولہا کی جانب سے دلہن کے گھر ''چوتو گر اور منو'' کے ذریعے گھی بھی بھیجتے ہیں گویا یہ ایک طرح سے شادی کی توثیق ہے۔ جب تک گھی نہیں بھیجتے دلہن کے گھر تاؤ کی رسم ادا نہیں ہوتی۔ یہ رسم، مقامی روایتی گھر میں، جس کی چھت پر ایک بڑا روزن اور گھر کے عین وسط میں دیسی چولہا ہوتا ہے جس پر ''تاؤ'' رکھ کر روٹی پکاتے ہیں اور حسبِ ضرورت چائے یا سالن وغیرہ بھی اسی چولہے پر تیار کرتے ہیں، رات کو ادا کی جاتی ہے۔ اس موقع پر توے کو ہاتھوں میں اٹھا کر چولہے کے گرد ناچنے کے عمل کو رسمِ تاؤ کہتے ہیں۔ تو اٹھا کر ناچنے والا، دولہا کا قریبی رشتہ دار ہوتا ہے جس کو دستار بندھوائی جاتی ہے۔ ہلکی آنچ پر بڑا سا توا چولہے پر رکھتے ہیں۔ ناچنے والا شخص چولہے کے گرد ناچتے ہوئے پہلی بار توا اٹھا کر ایک چکر پورا کرتا ہے تو توے کو چولہے پر رکھا جاتا ہے۔ اس طرح تین چکر پورے کرتا ہے۔ تیسری بار توا چولہے پر رکھ کر ایک بچی جس کے ماں باپ زندہ ہوں، سے تین چھوٹی چھوٹی روٹیاں تیار کروا کر توے پر ڈلوائی جاتی ہیں۔ روٹی پکنے پر گھی کے ساتھ کھاتے ہیں اور لقمے تقسیم کیے جاتے ہیں۔ اس طرح کچھ لوگ ان لقموں سے مستفید ہو جاتے ہیں۔ یہ تمام اعمال نیک شگونی کے تصورات لے کر سرانجام دیے جاتے ہیں۔ توے پر روٹی پکانا اور چولہا جہاں روٹی پکتی ہے، کے گرد نیازمندانہ طواف کرنا گھر بسانے کے حوالے سے نیک شروعات خیال کیے جاتے ہیں۔ ''تو ا ناچ'' ایک خاص دھن پر ادا کی جاتی ہے۔ شادی کو شنا میں ''گر'' اور شادی کے موقعہ پر گائے جانے والے گیتوں کو ''گریا گایئے'' کہتے ہیں۔ اس موقع پر رسم تاؤ کے گیت گائے جاتے اور اس طرح رسمِ تاؤ اختتام پذیر ہوتی ہے۔ دوسری طرف رشتہ دار اور دوست احباب جنس، کپڑے، مال مویشی، گھی یا نقدی کی صورت میں دلہن کے سرپرستوں کو شادی کا تحفہ دیتے، جسے مقامی لوگ ''پندر'' کہتے ہیں۔ دولہا کے سرپرستوں کو اس کے رشتہ دار سوائے کپڑوں کے اس طرح کا پندر دیا کرتے۔ رسم تاؤ ادا ہونے والی رات رنگ رلیوں میں گزر جاتی۔ دولہا کے گھر رسمِ تاؤ کی ادائیگی کی رات کو دلہن کے گھر بھی ''رسم تاؤ و مہندی'' کا اہتمام کیا جاتا۔ جس میں صرف خواتین ہی شرکت کرتی ہیں۔ دولہا کے گھر رسمِ تاؤ کی رات گزارنے کے بعد صبح صادق کے وقت ایک شخص گیت گاتا ہے۔ جب متعلقہ شخص ایک شعر پورا گاتا ہے تو دوسرا اسی کو دہراتا ہے۔ اس گیت کو مقامی لوگ ''لوی گای'' یعنی صبح صادق کا گیت کہتے ہیں۔

اس کے بعد اگر بارات کا کسی دور گاؤں میں جانا مقصود ہو تو دولہا صبح سویرے غسل کر کے لباسِ عروسی زیبِ تن کرتا۔ اس دوران جو رشتہ دار اور دوست احباب دولہا کے ساتھ ہوتے وہ گیت گاتے۔ گویا ایک طرح سے وہ دولہا کو ترغیب دیتے کہ وہ بھی گیت کے بول دہرائے۔ لہٰذا دولہا اس گیت کو گاتے ہوئے ماں کی قدم بوسی کے لئے جاتا:۔

''اورو اکیر گے تو منہ دُدھہ آجٹ سلامٹ تھے ایم''

یعنی میں اندرونِ خانہ جا کر اپنی پیاری اماں کو جس نے مجھے دودھ پلایا ہے، سلام کروں گا۔ جب دولہا ماں کی قدم بوسی کے بعد واپس لوٹتا ہے تو اس کے ساتھی اس موقع پر یہ گیت گاتے ہیں:۔

اگرو بَی لا اگرو بٹ
اش تو شودیزٹ آلو
اگرو بَی لا اگرو بٹ
نہ بٹ سونج تولیجیَ
اگرو بَی لا اگرو بٹ

ترجمہ:

وزن دار پتھر وزن دار ہوگا، آج کا دن بڑا مبارک ہے۔
وزن دار پتھر وزن دار ہوگا۔ اس وزن دار پتھر کا وزن سونے سے کیا

جائے گا۔ وزن دار پتھر وزن دار ہوگا۔ اس طرح گویا دولہا کو ایک طرح سے نصیحت کی جاتی کہ وہ کشمکشِ حیات میں وزن دار پتھر کی طرح ثابت قدم رہے۔ شنا میں ایک مقولہ ہے ''**بٹ توم دشیر اگروبی** ''یعنی پتھر اپنی جگہ پر بھاری ہوتا ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ جو شخص اپنے مقام اور جگہ کو پہچانے تو لوگوں کی نظروں میں اس کی عزت واحترام بڑھ جاتا ہے۔

روانگی بارات/ نکاح:

رسم تاؤ کے دوسرے دن صبح یا شام کو دولہا کی برات بڑی دھوم دھام سے گھوڑوں پر روانہ ہوتی۔ ماضی میں برات میں عموماً پندرہ سے چالیس تک لوگ شامل ہوتے تھے لیکن آج کل یہ تعداد بہت بڑھ گئی ہے۔ تاہم براتیوں کی تعداد پہلے ہی دونوں گھرانوں کے مشورے سے طے کی جاتی ہے۔ متعین تعداد سے زیادہ براتی بھیجنا پسندیدہ خیال نہیں کیا جاتا۔

بارات کی رخصتی کے وقت خوب باجے بجائے جاتے۔ بعد میں لوگ بیاک میں جمع ہوتے۔ جب دولہا شادی کے کپڑے پہن کر اپنے بزرگوں اور دوستوں کے ساتھ باہر نکلتا تو مذکورہ مخصوص گانا گایا جاتا جس پر دولہے کو ناچنا پڑتا۔ اسے مقامی لوگ ''تھپ نٹ'' کہتے ہیں۔ اس کے ساتھ سارے رشتہ دار اور یار دوست بھی دائرے کی شکل میں ناچتے۔ اسی ''تھپ نٹ'' کے اندر ہی ایک اور ناچ ہوتی جسے مقامی زبان میں ''کروئی نٹ'' کہتے۔ ''کروئی'' دراصل ایک ایسا ناچ ہے جس میں ناچنے والے اس طریقے سے ناچتے ہیں کہ دیکھنے والوں کی آنکھوں کے سامنے کھلے ہوئے خوبصورت پھول کا منظر آتا ہے، جس سے لوگ خوب محظوظ ہوتے ہیں۔ چلاس کی ''تمل ناچ'' اور گلگت کی ''کروئی نٹ'' بہت مشہور ہیں۔ ناچ کے آخر میں دائرے کو تنگ بناتے ہوئے بیک آواز مختلف آوازوں سے شور کرتے۔ اسی طرح ڈانس مکمل ہوتا۔ خوشی اور جشنِ فتح کے مواقع پر بجانے والے اس ساز کو مقامی لوگ ''اچوس'' کہتے تھے۔ ماضی میں بارات والوں پر لوگ جو گندگی پھینکتے اس سے برات والوں کی بے عزتی مقصود نہیں ہوتی تھی بلکہ لوگوں کا عقیدہ تھا کہ براتیوں کی تھوڑی بہت بے عزتی سے فصلیں اچھی ہوتی ہیں۔ روایت کے مطابق جب دولہا باراتیوں کے ساتھ دلہن کے گاؤں پہنچتا ہے تو دلہن کے گاؤں والے ان کو اس وقت تک کھڑا رکھتے جب تک وہ دادے کا گانا یعنی ''دادی گای'' نہیں گاتے۔ یہ گانے عموماً نسلی تعارف اور اپنے اسلاف کی تعریفوں پر مشتمل ہوتے تھے۔ ہر نسل اور قبیلے کے لوگوں کے اپنے اپنے گیت ہوتے تھے۔ اسلئے ہر گاؤں میں الگ الگ گیت گائے جاتے۔

چونکہ شنا بولنے والے تمام لوگ مسلمان ہیں اسلئے ان علاقوں میں نکاح کی رسم اسلامی طریقے سے ادا کی جاتی ہے۔ مہر مؤجل اور غیر مؤجل کا تعین بھی ہوتا ہے۔ البتہ پرانے وقتوں میں نکاح کے وقت دلہن کے سرپرست دولہا کے سرپرستوں سے یہ وعدہ لیتے تھے کہ طلاق کی صورت میں ''ہائی تولو'' جو پرانے زمانے میں 1921 روپے کے برابر ہوتے تھے، بطور جرمانہ لئے جائیں گے۔ دلہن گواہوں کے سامنے اپنے کسی محرم کو اپنے نفس اور مہر کا وکیل مقرر کرتی ہے۔ وکیل نکاح کے وقت نکاح خواں کے سامنے دلہن کی طرف سے اپنی وکالت کے ثبوت میں دو گواہ پیش کرتا ہے اور حقِ مہر وغیرہ مقرر کرنے کے بعد نکاح خواں نکاح پڑھاتا ہے۔

چلاس، داریل اور تانگیر میں جب برات دلہن کے گھر جاتی تو اس موقع پر دلہن والوں کی طرف سے نشانہ بازی کی مخصوص روایات کے مطابق کسی اونچے درخت یا پہاڑی کے اوپر لکڑی کے کسی لمبے ڈنڈے کو گاڑ کر اس پر باریک سا نشانہ بناتے جسے مقامی لوگ ''تبک'' کہتے۔ بارات والے باری باری اس نشانے پر فائر کرتے اور جب تک نشانہ نہیں لگتا دلہن کی رخصتی مؤخر کردی جاتی اور کامیاب نشانہ باز کے لئے کھانے کے دوران گوشت کا خصوصی حصہ بطورِ انعام دیا جاتا۔ بعض دفعہ براتیوں اور دلہن والوں کے درمیان کشتی کے مقابلے ہوا کرتے تھے۔ بازی جیتنے والے کو فاتح قرار دیا جاتا اور خصوصی انعام سے نوازا جاتا۔ اس موقع پر دولہا کی طرف سے عورتیں دورانِ نشانہ بازی خوشی کا مظاہرہ کرتے ہوئے مل کر اپنے بھائیوں کی اس طرح قصیدہ گوئی کرتیں۔ ''**دو بیا تبوکے ووا سی زارہ بٹہ دروحے ھن**'' یعنی اے دلہن والو! تم بخوشی ''تبک'' کے دو نشانے گاڑھو۔ اس سے ہمارے بھائیوں کو کوئی فرق نہیں پڑتا کیونکہ ہمارے سارے بھائی (براتی) مشہور نشانہ باز اور شکاری ہیں۔

نکاح کے بعد براتیوں کو خوب کھانا کھلایا جاتا اور بڑی خاطر تواضع کی جاتی۔ امیر لوگ براتیوں کو تحفے تحائف بھی دیتے۔ تمام رسومات تسلی بخش طور پر طے ہوجانے کے بعد دلہن کو باہر لانے کی تیاریاں کی جاتیں۔ دولہا اور اس کے دوست دروازے کے پاس جمع ہوتے اور آٹا چھڑکتے۔ دلہن کو بابل کے گھر سے الوداع کرنے کا منظر بڑا دردناک اور رقت آمیز ہوتا ہے۔ ماں باپ، بہن بھائی، پھوپھیاں اور خالائیں دلہن کو رخصت کرتے ہوئے اپنے جذبات پر قابو نہیں پاسکتے اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتے ہیں۔ جس کی وجہ سے موقع پر موجود تمام خواتین وحضرات کی آنکھیں نم ہوتی ہیں۔ آجکل چلاس اور داریل تانگیر میں دلہن کے گھر بارات نہیں جاتی ہے بلکہ دلہن کی رشتہ دار خواتین ہی دلہن کو دولہا کے گھر پہنچاتی ہیں۔

جب بارات دلہن کو لے کر روانہ ہوتی تو دلہن کے گھر والی عورتیں اس کا

پیچھا کرتیں، دولہا کو گالیاں دیتیں اور اس پر کیچڑ وغیرہ پھینک دیتیں۔ اس طرح دلہن لے جانے پر اپنے غصے کا اظہار کرتیں۔ ایک میل تک یوں چلنے کے بعد دولہا، دلہن کی ماں کو ایک تحفہ دیتا اور یوں ان سے اپنی جان چھڑاتا۔ بعض اوقات رخصتی سے پہلے جوڑے کے سامنے ایک بھیڑ ذبح کی جاتی تھی۔ آٹا چھڑکنے کی رسم ہر جگہ اور ہر موقع پر ادا کی جاتی۔

جب براتی دلہن کو لے کر واپس دولہا کے گھر پہنچتے تو دولہا اور دلہن کے قدموں میں بکرا ذبح کرتے اور دونوں کے پاؤں خون میں آلودہ کرتے۔ برات جب واپس ہوتی تو دلہن بھی ساتھ ہوتی۔ دلہن کے بہت سے رشتہ دار خاص کر ماموں، بھائی، بھتیجے وغیرہ ہمرکاب ہوتے۔ دلہن کے ساتھ جانے والوں کو مقامی زبان میں ''نال'' کہتے ہیں۔ دولہا کے گھر میں ان کی بڑی خاطر داری کی جاتی۔ جب لڑکی والے واپس ہونے لگتے ہیں تو برات میں اگر لڑکی کے ماموں وغیرہ ہوں تو ان کو سات سات گز لٹھا پیش کیا جاتا۔ دیگر لوگوں کو بیل، گائیں، بندوقیں، تلواریں، گھوڑے لاکر پیش کئے جاتے۔ یہ محض عزت افزائی کے مظاہر ہیں۔ لڑکی والے تحفے تحائف لوٹا دیتے ہیں تاہم ماموں لٹھا وغیرہ قبول کرتے ہیں اور اسے لوٹانے کا رواج نہیں۔

اسماعیلی مسلک کے مطابق ماضی میں ہر وہ شخص جس کی داڑھی سفید ہو نکاح پڑھانے کے قابل سمجھا جاتا تھا البتہ آج کل خلیفہ یا مکھی پڑھاتا ہے۔ نکاح کے وقت دولہا اس کے دائیں طرف اور دلہن بائیں جانب بیٹھتی۔ اس موقع پر نکاح خواں کے ہاتھ میں بکری کی بھنی ہوئی کلیجی کے ٹکڑے ہوتے جنہیں وہ دولہا کو بائیں ہاتھ سے اور دلہن کو دائیں ہاتھ سے کھلاتا۔ اس کے بعد پانی کے پیالے میں سے نصف پانی دلہن کو پلاتا اور نصف دولہا کو۔ ایجاب وقبول کے بعد ''کلام پیر'' میں سے چند الفاظ پڑھتا اور اسی طرح نکاح کی رسم مکمل ہو جاتی۔ یاد رہے کہ ''کلام پیر'' فارسی میں لکھی ہوئی ایک کتاب ہے۔ جس پر مذکورہ مسلک کے پیروکاروں کا بڑا عقیدہ ہے۔ وہ یہ کتاب اپنے ہم عقیدہ لوگوں کو ہی دکھاتے ہیں۔ اس مسلک کے پیروکاروں کی ایک کہاوت ہے کہ اپنا عقیدہ اور عورت کو دوسروں سے چھپا کر رکھنا چاہئے۔ یہ طریقہ اب بھی کچھ ترمیم کے ساتھ جاری ہے۔

گریا گایے
(شادی کے موقعوں پر گایا جانے والا گانا)

ایسے گانے جو دولہا کی بہنیں، خالائیں، پھوپھیاں وغیرہ اپنے اہلِ خاندان کی تعریف میں عموماً شادی کے موقعوں پر گاتی ہیں انہیں ''گریا گایے'' کہتے ہیں۔

لووتو سوری گوری تھم لووتو
بٹہ بردی یرگہ لووتو
دنیات سنگ تھریگو
نے لووتو سوری حبیب خان لووتو
بٹہ بردی یرگہ لووتو
دنیات سنگ تھریگو
تھی زززس گہ بودك تھی الاان
سارگن، گمے چھورہ
لووتو ملکی پوجولوتو
تھی زززس گہ بودك تھی الاان
سارگن، گمے چھورہ

ترجمہ:

اے مثل آفتاب گوری تھم! (راجا کے نام کے ساتھ بطورِ احترام ''سورہ'' بمعنی آفتاب استعمال کیا جاتا)۔ صبح ہوگئی، ہمارے گھر خوشی در آئی ہے۔ روئے زمین پر روشنی پھیل گئی اور دنیا چمک اٹھی۔

اے ملک کے پوتے! صبح ہوگئی۔ روئے زمین پر روشنی پھیل گئی اور دنیا چمک اٹھی۔

اے مثل آفتاب حبیب خان! صبح ہوگئی۔ روئے زمین پر روشنی پھیل گئی اور دنیا چمک اٹھی۔

تمہاری والدہ محترمہ نے لوگوں کی فلاح و بہبود کے لئے بہت کچھ کیا ہے تو بھی سارگن گلگت کو سنوار کر رکھ اور اس کی دیکھ بھال میں کوتاہی نہ کر۔

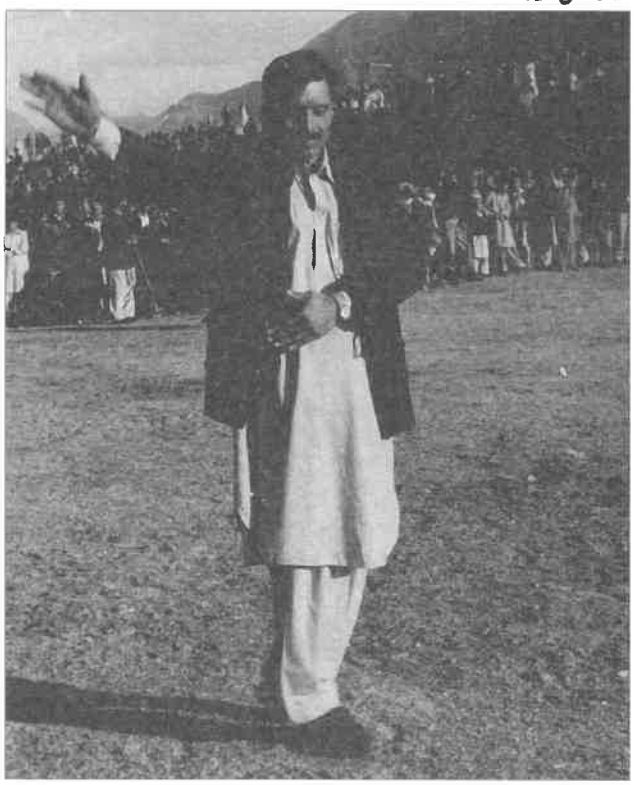
اے ملک کے پوتے! صبح ہوگئی۔ تمہاری والدہ محترمہ نے لوگوں کی فلاح و بہبود کے لئے بہت کچھ کیا ہے تو بھی سارگن گلگت کو سنوار کر رکھ اور اس کی دیکھ بھال میں کوتاہی نہ کر۔

دعوتِ ولیمہ (گری ٹکہ):

دولہا کے گھر دلہن کی آمد کے فوراً بعد لوگوں کو بڑا کھانا دیا جاتا ہے جسے شنا میں ''گرئی ٹکہہ'' کہا جاتا۔ آج کل اس دعوت کو دعوتِ ولیمہ کہتے ہیں جس کا دلہن کی آمد کے اگلے دن دوپہر یا شام کو دولہا کے گھر میں اہتمام کیا جاتا ہے۔ اس دعوت میں دولہا کی طرف سے مدعو کئے گئے دوست احباب اور رشتہ داروں کے علاوہ دلہن کے گھر والے، قریبی رشتہ دار اور ''نال'' بھی شامل ہوتے ہیں۔

ماضی میں سسرال کے گھر داماد کو وہ عزت اور وقار حاصل نہیں تھا جو آج کل ہے۔ داماد کو کبھی بیٹے کا ہمسر قرار نہیں دیتے تھے۔ اسے غیر خاندان کا فرد ہی تصور کیا جاتا تھا۔ جبکہ عصرِ حاضر میں معاملہ بالکل الٹا ہے۔ آج کل داماد کا مقام بیٹوں سے بھی دو قدم آگے ہے۔ پچھلے وقتوں میں بیٹیوں کے گھر والدین اور

بھائیوں کا جانا معیوب سمجھا جاتا تھا جبکہ آجکل والدین کو عزت داماد کے گھر ہی میں میسر ہوتی ہے۔ زمانے کی ہوا ایسی تبدیل ہوئی ہے کہ اپنے پرائے اور پرائے اپنے ہوتے جارہے ہیں۔ شنا کے مشہور شاعر جان علی نے اپنی محبوبہ سے مخاطب ہوکر کہا ہے کہ ''تو م خدا ایسی گہ امو ٹیئے جما حوگی'' یعنی اپنے داماد کی محبت میں کھو کر خدا کو بھی بھلا بیٹھی ہو۔



روایتی ناچ کا ایک انداز

آج کل کی شادیاں:

آجکل شنا بولنے والے علاقوں میں شادی کے رسم ورواج جگہ جگہ مختلف ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ شادی کی تقاریب میں پرانے رسم ورواج خال خال دیکھنے میں آتے ہیں۔ البتہ ''پندر'' کا رواج اب بھی قائم ہے۔ براتیوں کا گھوڑوں پر جانے کا سلسلہ بھی ٹوٹ چکا ہے۔ اگر دولہا دلہن کے گھر قریب ہوں تو بارات پیدل ہی جاتی ہے۔ ورنہ فاصلے دور ہوں تو باراتی گاڑیوں کا استعمال کرتے ہیں۔ دولہا کی بارات دلہن کے گھر کی طرف روانگی کے موقع پر خوب فائرنگ کی جاتی ہے۔ جب بارات دلہن کے گھر کے قریب پہنچتی ہے تو ایک بار پھر فائرنگ کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ اس فائرنگ کا مقصد دلہن کے گھر والوں کو مطلع کرنا ہوتا ہے کہ بارات پہنچ چکی ہے۔ اس طرح کے سفر کے تمام تر اخراجات دولہا کے گھر والے برداشت کرتے ہیں۔ جب باراتی دولہا کو ساتھ لے کر دلہن کے گھر آتے ہیں تو دلہن کے گھر کا دروازہ اس وقت تک نہیں کھولا جاتا۔ جب تک دولہا والے معقول رقم (ایک سو روپے سے ایک ہزار روپے تک یا اس سے بھی زیادہ) دلہن والوں کو ادا نہیں کرتے۔ دولہا جب باراتیوں کے ساتھ دلہن کے گھر میں داخل ہوتا ہے تو سب سے پہلے مولانا نکاح کا اہتمام کرتا ہے۔ مولانا عموماً دولہا کے ساتھ آتا ہے پھر ساس کی طرف سے ''پھیال'' پیش کی جاتی ہے۔ جس میں دولہا کی طرف سے حسبِ استطاعت رقم ڈالی جاتی ہے۔ اس کے بعد باراتیوں کو کھانا کھلایا جاتا ہے اور بعد ازاں دولہے کو ساس کے پاس سلام کے لئے لے جایا جاتا ہے۔ اس موقع پر دولہا کے ساتھ ایک یا دو بھائی یا قریبی رشتہ دار ہوتے ہیں۔ جب دولہا نوٹوں کے ہاروں سے لدا ہوا سسرالی خواتین کے جھرمٹ میں جاتا ہے تو اس وقت اسے کرسی پر بٹھایا جاتا ہے۔ پھر دلہن کی بہنیں یا قریبی رشتہ دار لڑکیاں دولہا کو ایک گلاس دودھ پیش کرتی ہیں اور گھڑی یا انگوٹھی یا دونوں پہناتی ہیں۔ اس موقع پر خوب فوٹو گرافی ہوتی ہے۔ جس کے بعد ہی دولہا کو رخصت کیا جاتا ہے۔ دلہن کے ساتھ ایک مددگار خاتون دولہا کے گھر جاتی ہے۔ جسے عموماً شب زفاف کے فوراً بعد ایک جوڑہ کپڑوں کا تحفہ دے کر رخصت کیا جاتا ہے۔ دولہا اپنے گھر سے ہاروں کے بوجھ تلے دب کر آتا ہے جبکہ دلہن کے گھر میں بھی رشتہ دار عورتوں اور ساس سالیوں کی ہاریں اسے سر اٹھانے نہیں دیتی۔

دلہن کو رخصت کرنے کے لئے جو خواتین وحضرات دولہا کے گھر جاتے ہیں انہیں مقامی لوگ ''نال'' کہتے ہیں۔ جب یہ لوگ دلہن لے کر دولہا کے گھر پہنچتے ہیں تو وہاں ان کی خوب آؤ بھگت ہوتی ہے۔ دورانِ سفر اگر راستے میں ''نال'' میں سے کسی کے رشتہ دار کا گھر پڑتا ہو تو اس پر لازم ہے کہ وہ ''نال'' کے اعزاز میں ''پھیال'' پیش کرے۔ (کوئی طعام یا مٹھائی پیش کرنے کو پھیال کہتے ہیں۔) بصورتِ دیگر ''نال'' ان رشتہ داروں سے جرمانہ بشکل گائے، بیل، بکری، بکرا یا کوئی اور جنس وصول کرنے کے مجاز ہوتے ہیں۔ ''پھیال'' جس برتن میں پیش کی جاتی ہے اس برتن میں ''نال'' حسبِ استطاعت پیسے ڈالتے ہیں۔ جسے پھیال بھیجنے والی خاتون کو یہ کہہ کر حوالہ کیا جاتا ہے کہ تمہارے رشتہ داروں نے دیئے ہیں۔ اس کے بعد ''نال'' کو دولہا کے گھر سے رخصت کرنے سے پہلے دولہا والے ان کے اعزاز میں ہتھیار یا گائے بیل وغیرہ پیش کرتے ہیں جسے عموماً ''نال'' شکریہ کے ساتھ لوٹا دیتے ہیں۔ باراتیوں پر گندگی پھینکنے کا رواج آج کل دم توڑ چکا ہے۔

آج کل دیسی سازندوں کا استعمال کم ہوتا جارہا ہے۔ اگلے زمانے میں دیسی سازندوں سے بڑی بڑی محفلیں سجائی جاتی تھیں۔ دور دور سے لوگ ان محفلوں میں شرکت کے لئے آجاتے تھے۔ اس کے لئے بلاوا ضروری نہ سمجھا جاتا۔ شوقین لوگ ناچنے کے لئے اپنے دوستوں کے ساتھ آتے اور اپنی پسند کی دھن بجواتے اور ناچتے۔ اس مجلس میں کوئی معتبر شخص موجود ہوتا جس کے احکام پر مختلف دھنیں بجتیں اور مختلف قبیلے کے افراد اپنی اپنی باری پر ناچتے۔ ناچنے کے لئے کسی بھی

قبیلے کے فرد کو نظر انداز کرنا ناراضگی کا سبب بن جاتا۔ پہلے زمانے میں دولہا کو دودھ پلانے کی کوئی رسم موجود نہیں تھی۔ اب بارات جب دلہن کے گھر پہنچتی ہے اور نکاح ہو جاتا ہے تو دولہا اپنی ساس اور دیگر لڑکی کے رشتہ دار خواتین سے اشیر باد لینے زنانہ خانے میں جاتا ہے جہاں دلہن کی کوئی بہن، بھائی یا بہن کی کوئی لڑکی دولہا کو دودھ پلاتی ہے۔ اس موقع پر دولہا یا اس کا رشتہ دار کچھ رقم لڑکی کی نظر کرتا ہے۔ پہلے اور آج بھی ایک اور رسم ایسی ہے جس میں دولہا کے گھر میں داخل ہوتے وقت دلہن اور دولہا سے ایک ساتھ دہلیز پار کرواتے ہیں۔ پھر گھر میں دونوں کو ایک ساتھ بٹھاتے۔ اس بات کا خاص خیال رکھا جاتا ہے کہ دولہا دلہن سے پہلے یا دلہن دولہا سے پہلے نہ بیٹھے۔ پہلے وقتوں میں دہلیز پر بکرے ذبح کر کے اس کا خون دلہن کے دائیں پاؤں کے انگوٹھے پر لگایا جاتا۔

آنٹھہ کسَپ تھروئک (آٹا پھینک کی رسم):

پرانے زمانے میں شادی کے چند دنوں کے بعد لڑکی کے والدین رسم کے مطابق لڑکے والوں کے گھر جاتے۔ اس موقع پر آٹا پھینک کی رسم ادا کی جاتی۔ شادی کے بعد جب لڑکی پہلی بار اپنے والدین کے گھر آتی تو یہ رسم پھر دہرائی جاتی۔

چونکہ دولہا کے رشتہ دار دلہن کے لئے نئے اور دلہن کے رشتہ دار دولہا کے لئے نئے اور نامانوس ہوتے ہیں اسلئے ''آنٹھہ کسَپ'' کی تقریب دراصل ایک دوسرے کے رشتہ داروں سے ایک طرح کی تعارفی تقریب ہوتی ہے۔ پچھلے وقتوں میں ایسے مواقع پر دلہن سمیت دولہا کے گھر والے مدعو ہوتے تھے لیکن آج کل اس رسم کا دائرہ اس قدر پھیل گیا ہے کہ یہ بھی کوئی شادی کی تقریب ہی لگتی ہے۔ گلگت خاص میں آج کل کے رواج کے مطابق شادی کے چند دن بعد دلہن کے گھر والے دولہا کے تمام گھر والوں کو اپنے ہاں دعوت پر بلاتے ہیں پھر دولہا، دلہن، دونوں کے قریبی رشتہ دار نئے شادی شدہ جوڑے کو اپنا گھر دکھانے کے لئے خصوصی طور پر مدعو کرتے ہیں۔ اس دوران کھانے کے بعد دلہن کو نئے کپڑوں کا جوڑہ دے کر عزت افزائی کی جاتی ہے۔ مقامی لوگ اس روایتی دعوت کو ''آٹھہ کسپ تھروئک'' کہتے ہیں۔ یہ رواج آج بھی پورے زور و شور سے جاری ہے۔

رَپ:

ماضی میں ان علاقوں میں لوگ دلہن کو جہیز دینے کے بجائے لڑکے والوں سے بھاری رقم وصول کرتے تھے۔ دولہا کی طرف سے دلہن کے گھر والوں کو بطور شادی کا خرچہ اور دیگر ضروریات کے لئے خصوصی امداد کی مقدار قبل از شادی ر کی جاتی تھی۔ اس میں نقدی و دیگر سامانِ خورد و نوش، زیورات اور شادی کے ت دیگر لوازمات شامل ہوتے تھے۔ اسے مقامی لوگ ''رپ'' جبکہ اہلِ استور کہتے ہیں۔ دراصل یہ دختر فروشی کی ایک مذموم رسم تھی جو ترقی یافتہ صورت میں کہیں کہیں اب بھی رائج ہے۔ اگر شادی ادل بدل (دوبان) کی ہوتی تو رقم (رپ) نہیں لی جاتی ورنہ ''رپ'' لے کر لڑکی بیاہی جاتی۔ ''رپ'' لینے کی رسم شنا بولنے والے علاقوں میں موجود ہر قوم میں رائج تھی لیکن ہر ایک کے اپنے اپنے پیمانے تھے۔ آج کل جہیز دینے کا رواج عام ہے۔

کسینو:

کسینو کی رسم بہت پرانی رسم ہے۔ یہ رسم استور میں ''کسینو'' کے نام سے موجود ہے۔ باقی علاقوں میں کسی نہ کسی شکل میں موجود ہے لیکن اس کا کوئی خاص نام نہیں۔ دراصل یہ رسم بیٹی یا بہن کے لئے جن کی شادی قریب ہو مالی امداد کا ذریعہ ہے۔ یہ امداد باپ، ماموں یا چچا کی طرف سے ہوتی ہے۔ ''کسینو'' کی رسم دو طرح کی ہوتی ہے۔

لوسون/ باری کا کسینو:

ان علاقوں میں محلے کے نادار اور غریب شادی شدہ عورتوں کے ساتھ اظہار ہمدردی اور امداد و مدد کرنے کا بھی ایک انوکھا رواج تھا۔ اگر شادی شدہ عورت کسی مالی بحران، قدرتی آفت یا کسی اور وجہ سے امداد کی طلب گار ہوتی تو وہ اپنے آبائی گاؤں کے تمام لوگوں یا رشتہ داروں کیلئے گھی پر تلی ہوئی روایتی روٹیاں جنہیں ''شرک'' Shirik کہتے ہیں گن کر اپنے ساتھ لے جاتی اور ایک ایک ہر گھر میں تقسیم کر دیتی تو گاؤں والے فوراً اسکا مطلب سمجھ جاتے اور ایک مقررہ دن حسب حیثیت متاثرہ عورت کی امداد کرتے اور اس کے حضور یہ امداد مال مویشی، نقدی، کپڑا یا اور کوئی گھریلو ضرورت کے سامان کی صورت میں پیش کرتے۔ اس طرح بڑے باوقار انداز میں حاجت مند عورت کی ضرورت پوری کی جاتی۔ بعض دفعہ حاجت مند عورت اپنی اولاد میں سے کسی کو اس مقصد کے لئے بھیجتی۔ اس موقع پر صرف متاثرہ عورت کے رشتہ دار ہی نہیں بلکہ پورے گاؤں والے اس کی امداد کرنا اپنی اخلاقی ذمہ داری سمجھتے۔ بعض مقامات پر یہ رسم ''لوسون'' جب کہ استور میں ''باری کا کسینو'' کے نام سے موسوم ہے۔

ہنگامی کسینو:

جب بیٹی یا بہن کو سخت مالی بحران کا سامنا ہو تو ''کسینو'' دیا جاتا ہے۔ اسکی چند ممکنہ صورتیں یہ ہیں:-

۱۔ لڑکی نے سسرال والوں سے علٰحیدگی اختیار کی ہو۔

۲۔ لڑکی کی اپنی اولاد میں سے کسی کی شادی بیاہ ہو۔

۳۔ کسی ناگہانی آفت سے لڑکی کو سخت مالی نقصان ہوا ہو۔

پندر:

خوشی کے مواقع پر جو امداد نقد یا جنس کی صورت میں دولہا اور دلہن کے گھر والوں کو دی جاتی ہے اسے مقامی لوگ ''پندر'' کہتے ہیں۔ یہ زیادہ تر کپڑے، مال مویشی، گھی یا نقد رقم پر مشتمل ہوتی ہے۔ پندر عموماً دولہا کے والد یا سرپرست کو دی جاتی ہے۔ اہلِ استور دولہا کے ہاتھ میں پندر (ہتمع) دیتے ہیں۔ کہیں کہیں یہ نوترا کے نام سے بھی موسوم ہے۔

موت کی رسمیں:

گلگت، دیامر اور شمالی علاقوں کے دیگر اضلاع میں شنا زبان بولنے والے لوگوں کا تعلق مختلف مسالک یعنی شیعہ، سنی اور اسماعیلیہ اور مختلف نسلی گروہوں سے ہے۔ اسلئے ان قبائل کے خوشی و غمی کے رسوم میں کچھ اختلافات جہاں علاقائیت کی بنیاد پر ہیں وہاں کچھ اختلافات مذہب کی بنیاد پر بھی ہیں لیکن ان رسومات کا ماخذ تقریباً ایک ہے۔ لوک روایات سے پتہ چلتا ہے کہ اشاعتِ اسلام سے پہلے ان علاقوں میں مُردے جلائے جاتے تھے۔ ماضی میں بعض جگہوں میں مُردوں کے ایصال ثواب کے لئے ''موال'' کی رسم ادا کی جاتی۔ دیتل میتھالوجی کے مطابق یہ ایک ایسی رسم ہے جس میں محلّہ کے لوگ رات بھر بزم کرکے صبح گوشت اور پیاز پر مشتمل ایک روایتی طعام لے کر ''بیاک'' میں جمع ہوتے اور مل کر تناول کرتے۔ جس سے لوگوں کے مطابق انکے مرحوم لواحقین کے ارواح خوش ہوتے۔

ان علاقوں میں جب کبھی کسی کی موت واقع ہوجائے تو تمام رشتہ دار اور محلّہ دار جمع ہوجاتے ہیں۔ مرد کی موت پر میت کے اردگرد مرد بیٹھتے جبکہ عورت کی موت پر عورتیں۔ اسی طرح مردے کو غسل بھی عورت کی صورت میں عورتیں اور مرد کی صورت میں مرد حضرات دیتے۔ گاؤں کے چند تجربہ کار مرد یا خواتین غسل کے اس اہم فریضے کو سرانجام دیا کرتے۔ غسل کے بعد مردے کو سفید کفن پہنایا جاتا ہے جو مرد کی صورت میں دو چادر، ایک قمیص اور عورت کی صورت میں دو چادر، ایک قمیص، ایک سینہ بند اور ایک دوپٹہ پر مشتمل ہوتا ہے۔ مرحوم کے رشتہ دار موت کی خبر سنتے ہی متاثرہ گھر جمع ہوتے اور زاروقطار رونے لگتے جبکہ معمر خواتین و حضرات پسماندگان کو دلاسہ دیتے اور موت کے عظیم صدمے کو برداشت کرنے کی تلقین کرتے۔ موت واقع ہوتے ہی ایک پٹی مردے کی ٹھوڑی کے نیچے سے گزارتے ہوئے سر کی چوٹی پر کس کر باندھ دی جاتی ہے تاکہ مردے کا منہ کھلنے کا احتمال نہ ہو۔

مردے کو کفن پہنانے کے بعد میت کے اوپر چادریں ڈال دی جاتیں اور یہ چادریں دفن کے بعد عموماً غریبوں میں تقسیم کردی جاتی ہیں۔ جنازہ سے پہلے میت کے آخری دیدار کے لئے دعوت عام دی جاتی ہے۔ مرد کی صورت میں تمام لوگ دیدار کرتے ہیں جبکہ عورت کی صورت میں خواتین کے علاوہ صرف محرم مرد ہی کرتے ہیں۔ اس اثناء میں اہلِ تشیع شہدائے کربلا کی یاد میں مرثیے بھی پڑھتے ہیں۔ میت کا اسلامی طریقے سے جنازہ کی نماز پڑھائی جاتی ہے۔ اس کے بعد بڑی احتیاط سے میت قبر میں اتاری جاتی ہے۔ عورت کی صورت میں کوئی محرم مرد ہی میت کو قبر میں اتارنے کا فریضہ انجام دیتا ہے۔ میت کا سر شمال اور پیر جنوب کی طرف کرنے کے بعد قبلہ رو کرکے لٹا دیتے ہیں۔ پھر عالمِ دین تلقین کا فریضہ سرانجام دیتا ہے۔ اہلسنت کے ہاں آجکل مردے کو تلقین کا سلسلہ باقی نہیں رہا ہے۔ کفن دفن کے بعد علماء حضرات جائے قبرستان پر ہی لوگوں کو وعظ و نصیحت فرماتے ہیں۔ جن کے ہاں موت ہوتی ہے ان کے ہاں تین دن تک کھانا نہیں پکتا۔ موت کی خبر سن کر دور دور سے دوست احباب اور رشتہ دار متاثرہ گھر آکر فاتحہ خوانی کرتے ہیں۔ اہل محلّہ میت کی تجہیز و تکفین کا کام رضاکارانہ طور پر کرتے ہیں۔ مرحوم کے گھر کم سے کم تین راتوں تک اہل محلّہ اور رشتہ دار پسماندگان کی تسلی اور غم میں شرکت کے لئے مسلسل جاتے ہیں اور وہاں کچھ دیر ٹھہر کر اجتماعی دعا کرکے واپس لوٹتے ہیں۔ آجکل ایسے مواقع پر علمائے کرام وعظ و نصیحت فرماتے ہیں جبکہ دوست احباب کئی دنوں تک مرحوم کے گھر فاتحہ خوانی کیلئے آتے رہتے ہیں۔ اس دوران بعض مقامات پر فاتحہ خوانی کے لئے آنے والے مہمانوں کی موسم سرما کی صورت میں عموماً چائے اور بسکٹ اور گرما کی صورت میں ٹھنڈے مشروبات سے تواضع کی جاتی ہے، جسے عموماً دوست احباب اور رشتہ دار لاتے ہیں۔ البتہ موت کے اصل دن ایسا نہیں ہوتا۔ استور اور چلاس میں مردے کی قبر پر مٹی ڈالنے کے بعد مولانا کی خدمت میں گھی اور روٹی پیش کی جاتی جو مرحوم کے ایصال ثواب کے لئے فاتحہ خوانی کے بعد وہاں پر موجود لوگوں میں تقسیم کردی جاتی۔ موت کے گھر میں کئی دنوں تک قرآن خوانی کا سلسلہ بھی جاری رہتا ہے۔ متاثرہ گھر میں جتنے بھی مہمان ہوتے ہیں ان سب کی تین دنوں تک کفالت کرنا ہمسایوں اور محلّہ داروں کا فریضہ سمجھا جاتا ہے۔ موت کے تیسرے یا اس کے بعد کسی اور دن کو مرحوم کی روح کے ایصالِ ثواب کی خاطر ایک بڑے کھانے کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ جس میں رشتہ داروں، محلّہ داروں کے علاوہ غرباء کو بھی مدعو کیا جاتا ہے۔ موت کے تین دن بعد پرانے وقتوں میں روٹی کے ساتھ گھی تقسیم کیا جاتا تھا۔ یہ ایک روایت تھی جسے اہلِ استور ''نسیع'' جبکہ اہلِ گلگت ''ختم یا خیرات'' کہتے تھے۔ کسی قریبی رشتہ دار کی موت پر گلگت والے تین دن تک جبکہ استور کے لوگ سات دنوں تک گوشت نہیں کھاتے تھے۔ ان ایام کے بعد مرحوم کے دوست احباب قبر پر جاتے اور وہاں جاکر گھی کے ساتھ کچھ روٹی کھاتے پھر نماز پڑھتے اور گھر واپس جاکر ایک بھیڑ ذبح کرتے۔ ذبح شدہ بھیڑ کے گردے پکا کر اس کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے حاضرین میں تقسیم کئے جاتے اور مرحوم کی یاد میں ایک ضیافت کا اہتمام کیا جاتا۔ کھانے کے بعد

خوانی کی جاتی۔ بعض روایات کے مطابق داریل کے لوگ مردے کے قبر کے ارد گرد بیٹھ کر انگور، گری اور چلغوزہ کھایا کرتے تھے۔ چالیسواں اور برسی کے مواقع پر بھی بعض گھرانوں میں اس طرح کے کھانوں کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ مردے کو اسلامی طریقے سے دفن کرنے کے چند دن بعد قبر کو مٹی سے لیپ دیا جاتا ہے۔ نئی قبر پر رات کو دیا جلایا جاتا ہے۔ اس روشنی کا مقصد درندوں کو قبر سے دور رکھنا ہوتا ہے کہ کہیں وہ قبر کو نہ کھودیں۔ قبر پر دیا جلانا آج بھی پرانی رسم کی یاد دلاتا ہے۔ البتہ اہلسنت گھرانوں میں یہ رسم نہ ہونے کے برابر ہے۔ پرانی قبروں کی طرف کوئی توجہ نہیں دی جاتی۔ قبر کی کھدائی کا تمام کام مرحوم کے محلّہ دار اور رشتہ دار کرتے ہیں جبکہ مرحوم کے قریبی لواحقین جو غم سے نڈھال ہوتے ہیں، کو کام کرنے کی تکلیف نہیں دی جاتی۔

کسی محلے میں موت کی خبر سنتے ہی چند جوان مل کر قریبی پہاڑوں کے دامن میں جاتے اور قبر کی تعمیر کے لئے وہاں سے پتھر اور پتھر کی بڑی بڑی سلیں اپنی پیٹھ پر لاد کر لے آتے ہیں۔ ماضی میں اس موقع پر خواتین اپنے بچوں کو گھروں سے باہر نہیں آنے دیتی تھیں تاکہ قبرستان کے لئے پتھر ڈھولائی کرنے والے لوگوں کا یا جنازے کا بچے سامنا نہ کریں۔ اگر خدانخواستہ بچے جنازہ بردار لوگوں یا قبرستان کے لئے پتھر لانے والے لوگوں کا سامنا کرتے تو یہ ان کے لئے اچھا شگون تصور نہیں کرتے اور یہ سمجھ لیا جاتا کہ اس سے ان پر بدروحوں کا سایہ پڑ جاتا ہے جس کی وجہ سے بچے بیمار ہو کر لقمۂ اجل بن جاتے ہیں۔

ضلع دیامر میں بالخصوص چلاس اور داریل تانگیر میں مردے کو دفن کرنے کے بعد لواحقین جنازے میں شریک لوگوں میں نقد رقم تقسیم کرتے ہیں جسے ''اسکاط'' کہتے ہیں۔ کبھی کبھار نمک یا جانور ذبح کر کے تقسیم کر دیا جاتا ہے۔ ان علاقوں میں ایک رواج یہ ہے کہ مرحوم کے گھر فاتحہ خوانی کے لئے جو رشتہ دار اور دوست احباب جاتے ہیں وہ پسماندگان کے سرپرست کو نقد رقم بھی بطور امداد دیا کرتے ہیں۔ مرحوم کے بھائی کا اس کی بیوہ کے ساتھ شادی کرنا ضروری تصور کیا جاتا ہے۔

نئے گھر میں داخل ہوتے وقت دعوت (منوح)

جب کبھی کوئی نیا گھر تعمیر کرتا تو اس میں داخل ہونے سے پہلے اس کے چاروں کونوں میں مؤذن اذان دیتا ہے۔ قرآن خوانی ہوتی ہے اور پھر تمام رشتہ داروں اور محلّہ داروں کو دعوت دی جاتی۔ مقامی لوگ نئے مکان میں داخل ہوتے وقت دی جانے والی اس دعوت کو ''منوح'' کہتے ہیں۔ اس موقع پر بکرا یا بچھڑا بھی ذبح کیا جاتا ہے۔ یہ رواج کہیں کہیں آج بھی رائج ہے۔ اس میں شرکت کرنے والے لوگ نئے گھر کے مکینوں کو گھر کی ضرورت کا کوئی برتن وغیرہ حسبِ حیثیت دے دیتے، تاکہ نئے گھر کے مکینوں کی ضروریات پوری ہوں۔ شرکاء تناول ماحضر کے بعد اجتماعی دعا کر کے منتشر ہو جاتے ہیں۔

مہمان داری:

پرانے زمانے میں جب ایک بڑا آدمی کسی دوسرے بڑے آدمی کے گھر جاتا تو اس موقع پر ایک رسم ادا کی جاتی۔ جسے ''کوباہ'' کہتے تھے۔ زمین میں بانس گاڑ کر اس پر ایک نشانہ بنایا جاتا اور دونوں طرف کے آدمی گھوڑوں پر سوار ہو کر انہیں بھگاتے ہوئے متعلقہ نشانے پر گولی چلاتے۔ پھر مہمان کے سامنے ایک بھینسا لایا جاتا جو اپنی تلوار کے ایک ہی وار سے اس کی گردن اڑانے کی کوشش کرتا یا پھر وہ اپنے کسی نائب کو یہ فرض سونپ دیتا۔ یہ رسم گلگت، یاسین، ہنزہ اور نگر کے تقریباً تمام علاقوں میں ادا کی جاتی تھی۔ نگر میں بھینسے کو تیر سے ہلاک کرنے کا رواج تھا۔ بعد میں اس رسم میں ترمیم کر دی گئی تھی اور مہمان کو بھینسا زندہ ہی پیش کیا جانے لگا تاکہ اسے اسلامی طریقے سے ذبح کر کے استعمال میں لایا جا سکے۔ کچھ عرصہ قبل تک بعض امیر لوگ اپنی طاقت کے مظاہرے کی خاطر مذکورہ رسم ادا کرتے تھے۔ لیکن آج کل یہ رسم باقی نہیں رہی ہے۔ البتہ ضلع دیامر کے بعض علاقوں میں مہمانوں کے اعزاز میں مال مویشی ذبح کر کے ان کے حضور گوشت پکا کر پیش کرنے کا رواج اب بھی قائم ہے۔ طویل سفر طے کر کے کوئی مسافر کسی کے ہاں مہمان ہوتا تو میزبان سب سے پہلے قابل برداشت حد تک پانی گرم کر کے اس میں کچھ نمک ڈال دیتا اور پہلے اس پانی سے مہمان کے ہاتھ پاؤں دھلائے جاتے۔ لوگوں کے مطابق اس طرح مسافر کی تھکاوٹ دور ہو جاتی۔ سونے سے قبل مہمان کے پاؤں کے تلووں کو گری کے تیل سے مالش کرتے تاکہ مہمان گہری نیند سے لطف اندوز ہو سکے۔ بالائی استور میں آج بھی مہمان کی اسی طرح خاطر تواضع کی جاتی ہے۔

بی پھاؤ:

''بی'' کے معنی بیج اور ''پھاؤ'' کے معنی بکھیرنے یا گرانے کے ہیں۔ ''بی پھاؤ'' یعنی تخم ریزی کی رسم موسم سرما میں گندم کی کاشت کے وقت ادا کی جاتی ہے۔ اس موقع پر ''دشئی پھیال'' کا اہتمام کیا جاتا۔ جب لوگ کھانے پینے سے فارغ ہوتے تو ایک مخصوص قبیلے کا آدمی بیل کی جوڑی لے کر کھیت میں آتا جس کے سر پر لٹھے کا عمامہ بندھا ہوتا تھا۔ اس وقت علاقے کے قدیمی خاندان کا کوئی فرد بیل کے سامنے ''دوبن'' کی رسم ادا کی جاتی۔ اس آدمی کے ہاتھ میں دو برتن جن میں متبرک جنگلی پودا ''اسپندور'' اور جونیپر کی شاخیں ہوتیں، وہ ان شاخوں کا دھواں بیل کو سنگھاتا اور بیل کے سر اور سینگوں پر آٹا چھڑکایا جاتا۔ علاقے کے قدیم آبادکاروں

میں سے کوئی آدمی ہل چلانے کا افتتاح کرتا۔ جو یا گندم کے بیجوں کے ساتھ سونے کے ذرات ملائے جاتے۔ راجہ صاحب چند مخصوص کلمات پڑھ کر ''بی پھاؤ'' کرتا۔ یعنی بیج کھیت میں بکھیرنے کا افتتاح کرتا۔ سب سے پہلے قبلہ کی طرف پھر مختلف اطراف میں بیج بکھیرتا۔ قدیم آباد کار حکم ملتے ہی ہل چلا دیتا۔ اس دوران لوگ ایک دوسرے کو مبارکباد دیتے اور پھر کھیلوں سے لطف اندوز ہونے کے لئے میدان کی طرف روانہ ہوتے تھے۔ اس موقع پر پولو بھی کھیلا جاتا تھا۔ پولو گراؤنڈ میں ایک آدمی گھوڑے پر سوار ہو کر ایک طرف منتظر کھڑا ہوتا اور حکمران کے اشارے پر گھوڑے کو ایک سرے سے دوسرے سرے تک اس طرح دوڑاتا کہ گھوڑا گول کے درمیان سے گزرے۔ اس کے ہاتھ میں پولو اور گیند ہوتے۔ دوڑ کے دوران وہ گیند کو پھینکتا اگر وہ شہسوار گیند سمیت دوڑتے ہوئے گھوڑے کو گول کے بیچ میں گزار دے تو اچھا شگون سمجھا جاتا اور خیال کیا جاتا کہ اس سال علاقے میں نرینہ اولاد کی کثرت ہوگی۔ اس سلسلے میں ایک اور بات کا ذکر بے محل نہ ہوگا کہ کھیت میں رسم ادا کرنے والے سب لوگوں کے ہاتھ میں بید کی چھڑیاں/ڈنڈے ہوتے۔ جنہیں کھیت کے اردگرد لگاتے۔ گویا علاقے میں شجر کاری کا افتتاح بھی اسی دن کیا جاتا۔ یہ رسم پہلے سارے گلگت میں ادا کی جاتی تھی لیکن آج کل متروک ہو چکی ہے۔

شاپ (خیر و برکت کی دعائیں):

شنا میں خیر و برکت کی دعاؤں کو ''شاپ'' کہتے ہیں۔ پرانے زمانے میں ''شاپ'' کی رسم بڑے اہتمام کے ساتھ منائی جاتی تھی جو آج کل نہ ہونے کے برابر ہے۔ ماضی میں رسمِ ''شاپ'' کا اپنا ایک منفرد طریقہ مروج تھا۔ یہ رسم سردیوں کی طویل راتوں کے دوران ادا کی جاتی تھی۔ بالخصوص دسمبر میں ''نسالو'' کی رسم ادا کرنے کے فوراً بعد ''شاپ'' کا سلسلہ شروع ہو جاتا۔ گاؤں کے چھوٹے بڑے الگ الگ ٹولیوں میں اس رسم کو ادا کرتے تھے۔ ہوتا یوں تھا کہ چند نوجوان جمع ہو کر اپنے گاؤں کے ہر دروازے پر جاتے اور اس موقع پر ایک جوان بلند آواز میں دعائیہ کلمات کہتا تو باقی نوجوان باہم مل کر زوردار آواز میں ''ہیں'' کہتے۔ ''ہیں'' دراصل دعائیہ کلمات کی تائید (آمین) کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ نوجوان ''ہیں'' کہہ کے ساتھ ساتھ دایاں پاؤں بھی پورے زور کے ساتھ زمین پر مارتے جس سے بڑی گونج دار آواز ایک ترتیب کے ساتھ پیدا ہوتی اور متعلقہ گھر کے لوگ سمجھ جاتے کہ گھر کے باہر ''شاپ'' کے جوان (شُپنی شُدا ریے) آئے ہیں۔ دروازے پر جو دعائیہ کلماتِ خیر و برکت ادا کئے جاتے وہ اس طرح کے مفہوم کے حامل ہوتے تھے کہ اللہ تعالیٰ اس گھر کے شادی شدہ مردوں کو نیک، صالح اور نرینہ اولاد نصیب کرے اور غیر شادی شدہ جوانوں کی زندگیوں کو نیکوکار دلہنوں سے آراستہ کرے اور علاقہ میں امن اور خوشحالی کا دور دورہ ہو۔ مغرب کی جانب سے دریا اپنے ساتھ سونے کی صورت میں زر و جواہرات لے کر بہتا ہے اور زر و جواہرات کی مدد سے زن حاصل ہوتی ہے اور زن اولاد کا ذریعہ بنتی ہے اور خدا کرے کہ اولاد صالح ہو۔ اگرچہ شنا بولنے والے مختلف علاقوں میں ''شاپ'' کے دعائیہ الفاظ میں قدرے اختلاف ضرور ہے لیکن ان کا مآخذ اور مفہوم تقریباً ایک ہے۔ شاپ کا گروپ محلے کے نوجوانوں پر مشتمل ہوتا ہے جنکی تعداد پندرہ یا بیس یا اس سے بھی زیادہ نفوس پر مشتمل ہوتی ہے۔ سب سے پہلے شاپ گروپ کا نمائندہ متعلقہ گھر جا کر ''مبارک'' کہتا تو اہلِ خانہ روایتی چولہے میں اسپندر یا پدم کی شاخیں جلا کر دھونی دیتے۔ نمائندہ اندرونِ خانہ ہی رہتا جبکہ شاپ کا گروپ باہر شاپ شروع کرتا۔ شاپ کے الفاظ کا نمونہ:

شرو، شاپ ویا !!!	هیـــــــن
اسوسم داریئے تھا!!!	هیـــــــن
اسوسم پوحیئے تھا!!!	هیـــــــن
یب گھییلیئے تھا !!!	هیـــــــن

ترجمہ: خزاں کا ''شاپ'' شروع کرو، (بے شک یا آمین)۔ ہماری طرح جیالے بیٹے پیدا کرو، (آمین)۔ ہماری طرح بہادر پوتے پیدا کرو، (آمین)۔ نہروں کو گھی سے بھر دو، (آمین)۔

مذکورہ دعائیہ کلمات کہنے کے بعد سارے جوان مل کر متعلقہ گھر کے شادی شدہ خواتین و حضرات کے لئے بیٹوں کی اور غیر شادی شدہ خواتین و حضرات کے لئے نیک تمناؤں کی دعا، فرداً فرداً نام لے کر ان الفاظ میں کرتے ہیں:۔

پار خانئی جات ولیگے لا، ولا وسی بیل شل
الہ ولے ولے گوٹ پریگے لا، ولا وسی بیل شل

ترجمہ:

خان سے مراد دراصل خان نامی ایک وسیع النسل اور بے شمار مال مویشی کا مالک فرد کی طرف اشارہ ہے۔ یعنی اس کی طرح نسلِ انسانی بھی بڑھے اور گھر آباد ہوں۔

خان کی طرح انسانی نسل بھی بڑھے اور بھیڑ بکریوں کی بھی فراوانی ہو۔

اس کے بعد شاپ کا گروپ ''مبارک! داریے گہ پوحے اٹے سک تھیکس''، یعنی بیٹوں اور پوتوں کی دعاؤں سے آپ کے دامن بھر دیے، مبارک ہو، کہتے ہیں۔ پھر دروازہ کھلتا ہے اور سب اندر جا کر امداد کا تقاضا کرتے ہیں۔ شاپ کے دعائیہ کلمات ٹھیٹھ شنا میں ہیں۔ تاہم اس کا یہ مطلب نہیں کہ شاپ شین قبیلے کی اختراع ہے۔ شین اور یشکن قبائل یکساں طور پر قدیم دور سے شاپ کی رسم ادا کرتے رہے ہیں۔ وقت کے ساتھ ساتھ مختلف بولیوں، لہجوں اور تلفظ کی وجہ سے

دعائیہ جملوں میں کچھ کچھ تبدیلیاں رونما ہوتی رہی ہیں۔ دعائیہ کلمات کسی کے گھر کے بند چوکھٹ پر کھڑے ہوکر کہے جاتے ہیں۔ سب سے پہلے جس گھر میں ''شاپ'' کی رسم ادا کی جاتی ہے تو اس گھر والوں پر لازم ہوتا ہے کہ وہ جانور کی دم کے ساتھ لگا ہوا ''نسالو'' کے گوشت کا حصہ (پُٹھ) دے دے۔ عبداللہ ملنگ کے مطابق ''شاپ'' کی رسم امداد حاصل کرنے کے بعد اختتام پذیر ہوتی ہے اور ''شاپ'' کا گروپ اسی طرح دوسرے گھر میں جاکر مذکورہ بالا طریقے کے مطابق ''شاپ'' کی رسم سرانجام دیتا ہے۔ اس دوران ناچ گانے کا سلسلہ پچھلے وقتوں میں رائج نہیں تھا البتہ آج کل ''شاپ'' کے جوان دعائیہ کلمات ادا کرنے کے بعد اہلِ خانہ سے اجازت مانگتے ہیں۔ اجازت ملنے پر اندرونِ خانہ انہیں لے جایا جاتا ہے یا بیرونِ خانہ ہی انہیں بٹھایا جاتا ہے اور بوڑھا اور بوڑھی (جروگہ جری) کے لئے خصوصی دھن پر گانا گایا جاتا ہے جس پر بوڑھا بوڑھی مل کر ناچتے ہیں۔ گانے کے بول ختم ہوتے ہی محفل میں موجود تمام جوان خصوصی لے پر تالیاں بجاتے ہوئے زبان سے دھن کے مطابق سریلی آواز نکال کر موسیقی کی کمی کو پوری کرتے ہیں۔ یاد رہے کہ ''شاپ'' پارٹیاں اپنی پارٹی کے دولڑکوں میں سے ایک کو ماسک پہنا کر بوڑھے کا رول دیتے ہیں جبکہ ایک کو زنانہ کپڑے پہنا کر جوڑا مکمل کیا جاتا ہے۔ جس لڑکے کو زنانہ کردار دیا جاتا ہے اس کا نام عموماً صیغہ راز میں رکھا جاتا ہے بصورتِ دیگر اگلے دن تمام گاؤں کے مرد وزن اس پر آوازیں کستے ہیں۔ بوڑھے اور بوڑھی کے لئے بجائی جانے والی خصوصی دھن کے بعد ایک اور دھن پر یا حسبِ فرمائش اہلِ خانہ گانا گاتے ہیں، جس میں صرف بوڑھا ہی ناچتا ہے۔ ناچ گانے کے بعد بوڑھا گھر کے مالک سے امداد کی اپیل کرتا ہے۔ وہ اکثر یہ بہانہ بناتا ہے کہ میری بڑھیا (بیوی) بیمار ہے جس کے علاج کے لئے امداد کی ضرورت ہے۔ جس پر گھر کا مالک حسبِ استطاعت نقد رقم، غلہ یا ''نسالو'' کا گوشت وغیرہ پیش کرتا ہے، جسے حاصل کرکے بوڑھا اجازت مانگتا ہے۔ اگر اس موقع پر گھر کے مالک کے پاس انہیں دینے کے لئے کوئی مناسب انتظام نہ ہو تو اگلے روز آنے کے لئے کہتا ہے اور ''شاپ'' کے جوان اگلی صبح سویرے ہی پہنچ جاتے ہیں اور مال وصول کرتے ہیں۔ پرانے وقتوں میں دو تین دنوں یا ایک ہفتے تک بھی یہ سلسلہ چلتا تھا۔ ''شاپ'' کی رسم ادا کرنے کے بعد جتنا غلہ، گوشت اور پیسہ جمع ہوتا اس سے ایک بڑے عشائیے کا اہتمام کیا جاتا اور اس میں گاؤں کے معزز اور معمر لوگوں کو بھی مدعو کیا جاتا۔ عشائیے کے فوراً بعد نوجوان ناچ گانے کا اہتمام کرتے اور خصوصی طور پر سازندوں کو بلایا جاتا اور یہ سلسلہ رات بھر جاری رہتا۔ بڑے کھانے کے ساتھ ہی ''شاپ'' کا سلسلہ ختم ہوجاتا۔ بوڑھے اور بوڑھی کے لئے بجائی جانے والی خصوصی دھن کے شنابول درج ذیل ہیں:۔

جرس گہ جرك لايم تهے، جرو مكامك بَي هنو
سنَي پريپر ٹوره وتي، ٹورس پهرون دَي هني
تهَي مالَي گوٹر جيك هنو، سون گه ربَي تهله هني

ترجمہ:

بوڑھا، بوڑھی کو پانے کی امید میں جھوم رہا ہے، دریا کے اس پار لکڑی کا ایک ٹکڑا چکر کاٹ رہا ہے۔ تمہارے باپ کے گھر میں بیٹھنے کی جگہ سونے اور چاندی کی بنی ہوئی ہے۔

آج کل شاپ کی رسم اپنی اصلی حالت میں باقی نہیں رہی ہے۔ نوجوانوں نے یہ رسم ترک کردی ہے۔ البتہ چھوٹے چھوٹے لڑکے اس رسم کے تمام مروجہ اصول نظر انداز کرتے ہوئے محض پیسہ حاصل کرکے آپس میں تقسیم کرنے کی خاطر بے موسم بھی شاپ کا اہتمام کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ بچے کچھ نہ کچھ حاصل کرنے کی لالچ میں رات کو بازاروں کا بھی رخ کرتے ہیں۔

نسالو:

موسم سرما کے آغاز میں بکرے، بیل، گائے یا کوئی اور مال مویشی ذبح کرکے اس کا گوشت محفوظ رکھتے تاکہ سخت سردیوں میں اسے استعمال کیا جائے۔ چونکہ موسم سرما کے دوران مال مویشی بڑے کمزور ہوتے اور ان کے گوشت میں وہ مزہ باقی نہیں رہتا جو دوسرے موسموں میں ہوتا تھا۔ اس لئے یہ رسم بڑے اہتمام کے ساتھ منائی جاتی تھی۔ اس رسم کو اہل گلگت ''نسالو'' کہتے۔ ''نسالو'' کرنے کے لئے جانوروں کی گرمیوں میں ہی نشاندہی کی جاتی اور ان کی خوب پرورش کرکے موٹے کیے جاتے۔ نسالو کو چلاس اور استور میں ''دائیکو'' کہتے ہیں۔ جس کے معنی وہ نذرانہ ہے جو دیوتا کیلئے پیش کیا جاتا ہے جبکہ داریل تانگیر کے لوگ اسے ''رِجھیع'' کہتے ہیں۔ ان علاقوں میں نذر و نیاز کا تصور قدیم ہے۔ کیونکہ لوگ اپنے آپ اور اہل خانہ کو تکلیف سے بچانے اور جن بھوت کے شر سے محفوظ رکھنے کیلئے طرح طرح کے نذرانے مانتے۔ دائیکو کے نام سے ہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ صرف اور صرف دیوتا کے نام کی نذر ہے۔ محمد شفیع استوری اس رسم کا پس منظر بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ہر سال موسم گرما میں مال مویشی کھلی چراگاہوں کی طرف لیجاتے ہیں اور ماہ اکتوبر کے آخری حصے میں واپس مستقل بستیوں کی طرف لاتے ہیں۔ ماہ نومبر میں لوگ اپنی بھیڑ بکریوں اور مال مویشی کو باڑہ کے سامنے جمع کرکے ان پر پانی چھڑکاتے۔ اس موقع پر جو جانور جھرجھری بھر کے تھرتھراتے ہوئے اپنے بدن سے پانی گرادیتا تو جانور کا مالک یہ خیال کرتا کہ جانوروں کے محافظ دیوتا نے اسے اپنے لئے منتخب کیا ہے۔ لہٰذا بلاتردد دیوتا کی اشیر باد حاصل کرنے کیلئے متعلقہ جانور ذبح کیا جاتا۔ اب یہ رسم ہماری تہذیب وتمدن کا حصہ بن چکی ہے۔ آج ''دائیکو یا

نسالو'' کی رسم موسم سرما میں گوشت کی ضروریات پوری کرنے کیلئے ادا کی جاتی ہے اور اس کا مذہبی تصور تبدیل ہو چکا ہے۔ بعض مؤرخوں نے نسالو کیلئے ''نوس یا نوز'' کے الفاظ بھی استعمال کئے ہیں۔ ''نسالو'' کے لئے مخصوص دن مقرر ہوتے ہیں۔ بڑے جانور بطور ''نسالو'' 21 دسمبر یعنی سال کے مختصر ترین دن سے چودہ دن پہلے جبکہ چھوٹے جانور سات دن پہلے ذبح کئے جاتے۔ لوگوں کے خیال کے مطابق ان ایام میں ذبح کئے گئے جانوروں کا گوشت اگر سال بھر بھی رکھا جائے تو خراب نہیں ہوتا جبکہ مقررہ ایام میں ''نسالو'' نہ کرنے کی صورت میں گوشت خراب ہونے کا احتمال ہوتا۔ آج کل مقررہ ایام کی پاسداری تو نہیں کی جاتی البتہ نسالو کی رسم کسی حد تک باقی ہے۔ ذبح کئے گئے جانور کے گوشت کے حصے علیحدہ کر کے انہیں ایک خاص ہوادار جھونپڑی نما کمرے میں جو عموماً چھت کے بالائی حصے میں ہوتا لٹکا دیے جاتے۔ گلگت کے لوگ اس کمرے کو ''ڈنگ اوں'' اور اہلِ داریل ''اجینی'' کہتے ہیں۔ بعض مقامات پر لکڑی کی کوٹھری میں گوشت لٹکاتے تھے۔ ''نسالو'' کے رواج میں کمی ضرور آئی ہے لیکن بیشتر مقامات پر یہ رواج اب بھی ہے۔ نسالو کے لئے خریدے گئے بکروں میں سے جس بکرے سے سب سے زیادہ چربی حاصل ہوتی تو لوگ بڑے تفاخر سے کہتے کہ ہمارے نسالو کے جانور سے اتنے سیر چربی حاصل ہوئی ہے۔ چربی پگھلا کر اسے محفوظ کر کے سال بھر تیل کی جگہ پر استعمال کرتے تھے جبکہ باقی ضرورت کی چربی قصائیوں سے خرید کر سٹاک کی جاتی۔ آجکل گلگت خاص اور اس کی مضافات میں لوگ مال مویشی گھر میں لا کر ذبح کرنے کی بجائے بازار سے پانچ چھ من یا حسبِ استطاعت گوشت خرید کر بطور ''نسالو'' سردیوں میں استعمال کرتے ہیں۔ عموماً سینہ (مُتھورو) اور پسلی (پراشی) کے گوشت کو تادیر رکھا جاتا ہے کیونکہ لوگوں کا خیال ہے کہ گوشت کے یہ حصے جلدی خراب نہیں ہوتے۔ اگرچہ درجہ حرارت یکم دسمبر سے ہی گرنا شروع ہوتا ہے لیکن روایتی طور پر موسم سرما کا آغاز ہر سال 21 دسمبر بمطابق یکم برج جدی سے شروع ہوتا ہے۔ اس تاریخ کو سب سے لمبی رات اور سب سے چھوٹا دن ہوتا ہے اور کیل کا بچہ اس دن گرمی سے رونا شروع کر دیتا ہے یعنی اس کے جسم پر اتنی بھاری سمور کی تہہ چڑھ جاتی ہے کہ وہ اس کی گرمی برداشت نہیں کر سکتا۔ شمسی تقویم کے لحاظ سے اس رات سورج برج جدی میں داخل ہوتا ہے جسے یہاں کی روایات کے تحت سورج کا ''ہلول'' میں داخلہ کہتے ہیں۔ اور اس دن کو ''سوری ہلولٹ گئی دیز'' یعنی سورج کے اپنے گھونسلے تک جانے والے دن کے طور پر جانتے ہیں۔ نسالو سے وابستہ ایک اور رسم ''کَٹہ چارو'' کے نام سے موسوم ہے۔ یہ رسم نگر میں اہتمام سے ادا کی جاتی تھی۔ اور یہ زیادہ تر سازندوں (ڈوم) سے وابستہ ہوتی تھی۔ روایتی رسم نسالو کے اگلے دن ڈوم حضرات باری باری اہل محلّہ کے گھر جاتے۔ گھروں میں نسالو کیلئے ذبح شدہ جانور کی موٹی آنت رکھی جاتی۔ اس آنت میں سازندے نسالو کے نرم گوشت کے ٹکڑے کر کے ڈالدیتے حتیٰ کہ آنت گوشت سے بھر جاتی۔ اس کے بعد ایک پیمانہ (ہای) آٹے کے اوپر آنت رکھ کر لے جاتے۔ گوشت سے بھری ہوئی اس آنت کو ڈموڈینڈر کہتے ہیں۔ اس رسم کے اختتام تک سازندوں کیلئے بہت سی آنتیں جمع ہوتیں۔ جنہیں وہ اپنے اہل خانہ کے ساتھ ایک عرصے تک استعمال کرتے۔

باجہ نوازوں کو قدیم رسم ورواج کے مطابق نہ دشمن قتل کرتا ہے اور نہ گرفتار اور نہ ہی انکا مال لوٹنے کی اجازت ہے۔ رسم ورواج کی ادائیگی کے اجتماعات کے مواقع پر باجہ نواز (ڈوم) قلعہ کے اردگرد پہرہ دیتے اور پاؤں کے نشانات تک کا معائنہ کرتے، کہ کہیں دشمن کا کوئی جاسوس قلعہ میں داخل تو نہیں ہوا۔ سازندوں کی اس خدمت کے بدلے ''کَٹہ چارو'' کی رسم ادا کی جاتی تھی۔

رَ ارَن:

''نسالو'' اور ''رارن'' کا چولی دامن کا ساتھ ہے اور یہ دونوں آپس میں لازم وملزوم ہیں۔ کیونکہ ''رَ ارَن'' کی اساس ''نسالو'' پر ہی قائم ہے۔ ''رَ ارَن'' دراصل اس دعوت کو کہتے ہیں جو ''نسالو'' کرنے کی خوشی میں کی جاتی ہے۔ دعوت عموماً ''نسالو'' کرنے والے دن یا اس کے ایک دو دن بعد کی جاتی ہے۔ اس میں قریبی رشتہ داروں اور ہمسایوں کو مدعو کیا جاتا ہے۔ اس دعوت میں زیادہ تر ذبح کئے گئے مال کے فاضل حصے مثلاً اوجڑی، کلیجی، گردے، انتڑیاں وغیرہ شامل ہوتے ہیں۔ بچے ''نسالو'' سے زیادہ ''رَ ارَن'' سے لطف اندوز ہوتے۔ اس دن بچے خوش نظر آتے۔ آج کل ''نسالو'' کی رسم تو کسی حد تک باقی ہے لیکن ''رَ ارَن'' کا سلسلہ ٹوٹ چکا ہے۔

دفینہ سازی:

قدیم زمانے میں گلگت کے لوگوں میں اپنی جائیداد از قسم سونا، چاندی، تلواریں، زیورات، ڈھال وغیرہ زمین کے اندر دفنانے کا رواج عام تھا۔ دفینے کا پتہ صرف دفن کرنے والے کو ہوتا تھا۔ اگر خدانخواستہ کوئی آدمی دفینے کا پتہ بتائے بغیر مر جاتا تو جائیداد زمین کے اندر ہی رہ جاتی۔ اسی لئے گلگت اور اردگرد کے پہاڑ اور علاقے دفینوں سے خالی نہیں۔ اگر کسی کو کہیں پر دفینے کا سراغ ملے تو کھدائی سے قبل قربانی یا خیرات دی جاتی ہے۔ مقامی لوگ اس طرح کے دفینوں کو ''بالکیسئ'' کہتے ہیں۔

اس کے علاوہ بھیڑ بکری پالنے والے لوگ مکھن کو بھوج پتر ''Birch'' کے درخت کے چھلکوں سے حاصل ہونے والے کاغذ ''جوز'' میں بند کر کے زمین

کے اندر دفن کر دیتے اور ایک عرصے کے بعد حسبِ ضرورت نکال کر استعمال کرتے۔ بعض دفعہ دفن شدہ گھی پچاس سال کے بعد بھی نکالا جاتا۔ جس کا رنگ گہرا سرخ ہوتا۔ یہ گھی کافی کڑوا ہوتا اور اس کی یہی کڑواہٹ اس کی شہرت کا باعث بنتی۔ اس گھی سے مختلف بیماریوں کا علاج بھی کیا جاتا تھا۔ اس طرح کا پرانا اور کڑوا گھی شادیوں میں استعمال کرنا دولت مندی اور امارت کا باعث خیال کیا جاتا۔ زیادہ تر چلاس، داریل اور تانگیر میں اس کا رواج عام تھا۔ آج کل دیسی گھی کی قیمت -/250 روپے فی کلو ہے۔ آبادی اور اخراجات میں اضافہ اور پیداوار میں کمی کی وجہ سے دیسی گھی اب نایاب ہے۔ شراب بھی بڑے بڑے مٹی کے برتنوں میں ڈال کر زمین میں دفن کی جاتی مگر یہ ایک سال سے زیادہ عرصے تک نہیں رکھی جاتی تھی۔

ختنہ (بسمون):

ختنہ کو شنا زبان میں ''بسمون'' کہتے ہیں جبکہ اہلِ چلاس ''ستر بیونی'' کہتے ہیں۔ ختنہ کی رسم بھی ان علاقوں میں بڑے اہتمام کے ساتھ منائی جاتی ہے۔ پرانے وقتوں میں شیر خواری کے دوران ختنہ کا رواج عام نہیں تھا۔ دس بارہ سال کی عمر میں ہی لڑکے کا ختنہ کیا جاتا۔ علاقے میں ختنہ کرنے والے چند لوگ ہوتے تھے جو اس کام میں اتنے ماہر تو نہیں ہوتے لیکن پھر بھی اس کام کو سرانجام دیتے اور اس کا انہیں معاوضہ دیا جاتا۔ پرانے وقتوں میں ختنہ کی رسم محلّہ، گاؤں اور رشتہ داری کے لوگ مل کر اجتماعی طور پر انجام دیتے۔ محلے کے تمام ایسے لڑکے جن کا ختنہ مقصود ہو، نیا لباس پہناتے اور سب کو ایک مقام پر جمع کرتے۔ اس موقع پر ان کے گھر والوں کی جانب سے خصوصی دعوت اور تماشے کا اہتمام کیا جاتا۔ عموماً ختنہ کرنے کے لئے لڑکے کے منہ میں کوئی میٹھی چیز ڈال کر اور مخصوص مقام کے چمڑے کو پکڑ کر لڑکے کو کہا جاتا کہ اوپر آسمان کی طرف دیکھو کیسے رنگ برنگ کے پرندے/غبارے ہیں۔ لڑکے کا آسمان کی طرف دیکھنے کے دوران ہی ختنہ کر دیا جاتا۔ اس موقع پر لوگ قریبی رشتہ داروں اور ہمسایوں کو گھر بلاتے اور حسبِ توفیق ان کی خاطر تواضع کرتے۔ اگر کسی گھر میں لڑکے زیادہ ہوں تو ایک ساتھ ان کے ختنہ کا اہتمام کیا جاتا۔ شرکاء ختنہ زدگان کو انڈوں، کوئی اور جنس یا معمولی نقدی کی صورت میں تحفہ پیش کر کے ان کا دل لبھاتے۔ ہفتہ، عشرے کے بعد ان کی پٹی وغیرہ اتار دی جاتی اور وہ چلنے پھرنے کے قابل ہو جاتے۔ اس موقع پر انہیں نئے کپڑے اور جوتے پہنائے جاتے۔ پٹی اتارنے سے قبل اور بعد میں متاثرہ جگہ کو ''اسپندر'' کی دھونی دی جاتی کیونکہ لوگوں کے خیال کے مطابق ''اسپندر'' نامی اس پاک جنگلی پودے کی دھونی سے زخم پر مضر اثرات مرتب نہیں ہوتے اور زخم جلد مندمل ہو جاتا۔ ختنہ کرنے کے بعد زخم ٹھیک ہونے تک متاثرہ لڑکے شلوار نہیں پہن سکتے تھے۔ اسلئے جب کبھی وہ بغیر شلوار کے پیشاب یا یونہی ٹہلنے کے لئے نکلتے تو ان کے ہمجولی ان کی اس حرکت پر خوب آوازیں کستے تھے۔ آج کل پیدائش کے فوراً بعد ہی بغیر کسی خاص اہتمام کے ختنہ کی سنت ادا کی جاتی ہے۔ چلاس کے علاقے میں جب بچے کے زخم ٹھیک ہوتے ہیں اور چلنے پھرنے کے قابل ہوتے ہیں تو ایک مقررہ دن اپنے قبیلے کے تمام رشتہ داروں کو مدعو کیا جاتا اور اس موقع پر بچے کی پھوپھیوں، خالاؤں، نانیوں اور دادیوں کو خصوصی طور پر کپڑوں کا تحفہ دیا جاتا۔ بصورتِ دیگر یہ سب ناراض ہو جاتی ہیں۔

شئی پھیال:

کھیتوں میں گندم کی تخم ریزی (بی پھو) کرنے کے مواقع پر ''شئی پھیال'' کا اہتمام کیا جاتا تھا۔ لوگ گندم کے آٹے سے باریک چپاتیاں یا روایتی ''قسۃ'' بنا کر ان پر مکھن لگا دیتے۔ بعد ازاں یہ مکھن زدہ روٹی مہمانوں اور بزرگوں کو پیش کی جاتی۔ لوگ بہترین فصل کے حصول کے لئے اسے نیک شگون سمجھتے۔ یہ رسم پرانے وقتوں میں ہر نیک کام کے آغاز پر ادا کی جاتی تھی۔

کئی اور مواقع پر بھی ''پھیال'' کا رواج عام تھا لیکن وقت کے ساتھ ساتھ بطور ''پھیال'' پیش کی جانے والی چیزوں میں تبدیلی آتی گئی۔ آجکل کیک، مٹھائی یا جلیبی بطور ''پھیال'' کے استعمال میں لائی جاتی ہیں۔ ماضی میں کسی گھر کا فرد اگر کشمیر یا روالپنڈی ہو آتا تو قریبی رشتہ داروں میں سے ہر گھر سے نمائندہ خاتون خانہ اس کے اعزاز میں ''پھیال'' لے کر جاتی اور نو وارد اسے کچھ نہ کچھ تحفہ دے کر لوٹاتا۔ حج بیت اللہ اور ائمہ کرام کی زیارت کر کے آنے والوں کے اعزاز میں ''پھیال'' پیش کرنے کا رواج آج بھی عام ہے۔ استور میں جب دولہا، دلہن کو اکھٹا کیا جاتا تو اس موقع پر لڑکی کی ماں چاول میں دودھ یا دہی ڈال کر دولہے کو پیش کرتی۔ دراصل دودھ کو پختہ رشتہ کی علامت مانا جاتا۔ یہاں کی رسم کے مطابق بہت ہی پیارے آدمی کو دودھ والی ڈش پیش کی جاتی۔ یہ ''پھیال'' دراصل دولہا کو باقاعدہ بیٹا بنانے کی رواجی تقریب سے منسوب ہے۔ آجکل کسی رشتہ دار کی ترقی اور تقرری پر بھی قریبی رشتہ دار ''پھیال'' لے کر اس کے گھر جاتے ہیں اور مبارکباد دیتے ہیں۔

اُنی لی:

یہ ایک ایسا رشتہ ہوتا ہے جو لوگ از خود اختیار کر لیتے ہیں۔ اگر کوئی شخص کسی کو بیٹا بنائے تو وہ ''انیلوچ''، بیٹی بنائے تو ''انیلی دھی'' اور بھائی بنائے تو ''انیلورا'' کہلاتا ہے۔ گویا ہر رشتہ کے لئے مقررہ ناموں کے ساتھ ''انیلو'' کا سابقہ حسبِ ضرورت لگایا جاتا ہے۔ ان علاقوں میں ایک رسم یہ بھی تھی کہ راجے اپنی اولاد پرورش کے لئے رعایا میں سے عام گھرانے کے کسی فرد کے حوالے کرتے۔ جب

اولاد جوان ہوتی تو انہیں ان کے اصل والدین کے حوالے کرنے کا خصوصی اہتمام کیا جاتا۔ اسطرح عام گھرانوں کے افراد کو بھی راجہ کی قربت اور خوشنودی حاصل ہوتی۔ جب کسی لڑکی کی شادی کسی دوسرے گاؤں میں کردی جاتی تو اس موقع پر دولہا کے گاؤں کے کسی معزز اور بااثر آدمی سے بطور بہن یا بیٹی دلہن کا رشتہ طے کیا جاتا تو اس کے بعد متعلقہ شخص دلہن کا ''انیلو رَا'' یا ''انیلو بابو'' تصور ہوتا جو بوقت ضرورت دلہن کی ہر قسم کی مدد کرتا۔ یہ خود اختیاری رشتے حقیقی رشتوں کی طرح نہ صرف عزیز اور مستحکم ہوتے بلکہ انیلو باپ یا بھائی وغیرہ مشکل وقت پر کسی قسم کی قربانی دینے سے بھی دریغ نہیں کرتے۔ اولاد کی نعمت سے محروم لوگ بھی اپنا دل بہلانے کے لئے کسی کی اولاد حاصل کرکے ان کی پرورش کرتے اور انہیں اپنی وراثت سے حقیقی اولاد کے برابر حصہ دیتے۔ ماضی میں انیلو کے رشتے کو اس قدر تقدس حاصل تھا کہ لوگ اپنے حقیقی بیٹوں یا بیٹیوں کے ساتھ ان کا ازدواجی رشتہ قائم کرنا بھی ناجائز سمجھتے تھے۔ آج کل بھی کسی حد تک یہ سلسلہ جاری ہے۔ اگر کوئی عورت خواب میں کسی کو اپنا بیٹا بناتی یا کوئی مرد کسی عورت کو اپنی ماں بناتا تو ان کے درمیان محض خواب کی بنیاد پر ماں بیٹے کا تعلق قائم ہوتا۔

سومُنہ تَی:

سومُنہ لنگوٹیا یار کو کہتے ہیں۔ جب دو افراد آپس میں تعلقات استوار کرنا چاہیں تو ایک دوسرے کو ''**سومُنہ**'' بناتے ہیں۔ یار دوستی نبھانے کے عہد و پیمان کے بعد آپس میں تعلق محرم رشتہ داروں کی طرح ہی ہوتا ہے۔ پرانے وقتوں میں سومُنہ بنانے کی خوشی میں اہل محلّہ کو بکرا ذبح کرکے کھانا بھی کھلاتے تھے۔ یہ رشتہ بھی اتنا مضبوط ہوتا کہ بوقت ضرورت دوست ایک دوسرے کے لئے مالی و جانی قربانی دینے سے بھی دریغ نہیں کرتے۔ اسطرح کی دوستی کو ''سومُنہ تَی'' کہتے ہیں۔ ''سومُنہ تَی'' کی بدولت دو مختلف قبیلوں کے درمیان نہ صرف گہرا رشتہ قائم ہوتا بلکہ اس رشتے کا پاس متعلقہ دوستوں کی اولاد بھی ایک عرصے تک رکھتی۔ ''سومُنہ تَی'' کا رواج چلاس اور اس کی مضافات میں زیادہ تھا اور وہاں یہ سلسلہ کسی حد تک آج بھی جاری ہے۔

دوبن:

ایک برتن میں انگارے ڈال کر اس پر پاک اور متبرک پودا ''اسپندر'' کی ٹہنیاں رکھ دی جاتی ہیں۔ ان ٹہنیوں کے جلنے سے جو دھواں اٹھتا ہے اسے متبرک سمجھا جاتا ہے۔ سردی کے موسم میں اپنے روایتی بیٹھک میں سردیاں گزارنے کے لئے داخل ہونے سے قبل ''اسپندر'' کی دھونی دی جاتی ہے۔ کہتے ہیں کہ ''اسپندر'' کو صبح شام گھر میں جلانے سے فرشتے خوش ہوتے ہیں۔

ڈاڈا:

یہ ایک حسین خوشگوار یا ایک بہت بڑی عید تاریخ بشریت کے صفحات میں موجود واقعات کا ریکارڈ کہلا سکتی ہے۔ لفظ ''ڈا'' کے معنی ہیں کہ کسی بچے یا فرد کو پیٹھ پر اٹھالینا اور ''ڈاڈا'' کے معنی ہیں کسی بچے کو اس کی پیدائش کی پہلی بہار کے موقع پر پیٹھ پر اٹھالینا۔ اس رسم کے کئی پس منظر بتائے جاتے ہیں۔ ایک یہ کہ بچے کو پہلی بار پیٹھ پر اٹھانا۔ اس کی زندگی کے دوران مسائلِ زندگی سے دو چار ہونے کی صورت میں اس کی بھرپور مدد کرنے کا ایک طرح سے عہد کیا جاتا ہے۔ مگر اس وجہ اور دلیل سے نابلد لوگ رسم کو تو بجالاتے ہیں مگر اسے سمجھتے نہیں کہ کونسے بار بوجھ بچے کو یا اس کے مدد گاروں کو اٹھانے پڑیں گے؟ تمام شمالی علاقوں میں یہ رسم عام نہیں البتہ گلگت شہر کے گرد و نواح میں نہایت تزک و احتشام سے ''ڈاڈا'' کی رسم تہوار کی طرح منائی جاتی تھی۔



رسم ڈاڈا ادا کی جارہی ہے

رسم ڈاڈا کا طریقہ:

رسمِ ''ڈاڈا'' کا طریقہ یہ ہے کہ بچہ جو شمسی مہینے کی پہلی تاریخ یکم حمل سے پہلے عالمِ ہست و بود میں قدم رکھتا تو اس کی زندگی کی پہلی بہار منائی جاتی۔ یہ 21 مارچ یعنی نوروز کا دن ہوتا جو فصلِ بہار کا پہلا دن کہلاتا۔ اس دن ہر نومولود بچے کو دولہا اور دلہن کی طرح سجاتے ہیں۔ والدین خصوصاً مائیں اپنے رشتہ داروں کو

گھر پر مدعو کرتے ہیں۔ مخصوص قسم کے دیسی کیک (چھپٹہ)، خشک میوہ جات، شیرینی اور بھنے ہوئے گندم کے دانے ملا کر ایک مخصوص جگہ پر جمع کر کے خود بھی مقررہ مرکز پر اکٹھے ہو جاتے ہیں۔ اس دن کاروانِ بشریت کے نئے مسافر یعنی بچے ماؤں کی گود میں زرق برق لباس پہنے موجود ہوتے ہیں۔ ایک معمر خاتون کی پیٹھ پر بچوں کو باری باری رکھا جاتا ہے جو بچوں کو پیٹھ سے اتارتے ہوئے میوہ جات کے ڈھیر پر آہستہ سے گرا دیتی ہے۔ اس کے بعد گندم کے دانے، شیرینی وغیرہ حاضرین میں تقسیم کئے جاتے ہیں اور بعض دفعہ خواتین ناچ گانے کا اہتمام بھی کرتی ہیں۔ نوروز کے دن یہ کارروائی عمل میں لائی جاتی ہے اور لوگ سہ پہر کے قریب واپس اپنے گھروں کی طرف روانہ ہو جاتے ہیں۔ عیدین کے ایام بالخصوص عیدالاضحیٰ اور عیدِ غدیر کے مواقع پر بھی رسم ''ڈاڈا'' ادا ہوتی رہی ہے۔ یہ رسم زیادہ تر نرینہ بچوں سے وابستہ رہی ہے لیکن بچیوں کے لئے بھی اس رسم کا اہتمام کبھی کبھار کیا جاتا۔ بچوں کو دولہا دلہن بننے کا نیک شگون یہیں سے ملتا ہے۔ اس میں ایک پرخلوص دعا ہے کہ بچہ جیئے اور زندگی کی اونچ نیچ طے کرتے ہوئے شاد رہے، آباد رہے، پھلے پھولے اور دنیا کے اس باغ کی رونق بنے۔ یہ رسم آج کل تقریباً مفقود ہے۔

گھنگری باگو:

جب کبھی کسی معرکے میں کوئی شخص بہادری کے جوہر دکھاتا تو سے خصوصی اراضی سے نوازا جاتا۔ اس کا انوکھا پہلو یہ ہے کہ متعلقہ بہادر شخص کے ہاتھ میں تیر کمان دے دیے جاتے۔ وہ شرقاً، غرباً اور شمالاً، جنوباً تیر پھینکتا۔ تیر چاروں طرف جہاں جہاں گرتا تو اسے آخری حد تسلیم کرتے اور اس کی حدود کے اندر جتنی بھی اراضی آتی، تیر پھینکنے والا اس کا مالک ہوتا۔ اس طرح حاصل کی گئی اراضی ''کھنگری باگو'' یعنی ''بہادری کا صلہ'' کہلاتی۔

تلینی:

نئے سال کے آغاز کے کچھ دن بعد ''تلینی'' کی رسم منائی جاتی جو گلگت خاص میں تو اب دم توڑ چکی ہے البتہ مضافات میں کہیں کہیں دیکھنے میں آتی ہے۔ بستی میں ایک خاص جگہ پر آگ کا بڑا الاؤ روشن کیا جاتا اور تمام لوگ ہاتھوں میں مشعلیں لئے اس آگ کے اردگرد جمع ہو جاتے تھے۔ رقص و سرود کی محفل گرم ہوتی اور رات بھر جشن کا سا سماں ہوتا۔ صبح کی پہلی کرن پھوٹتے ہی ہر کوئی اپنی مشعل الاؤ میں پھینک دیتا۔ گانا، بجانا اور پولو کا کھیل سارا دن جاری رہتا۔ اس طرح کی تقریبات وقفے وقفے سے ایک ماہ تک جاری رہتی تھیں۔ اہلِ استور ''تلینی'' کی رسم کو ''لومی رلومو'' کہتے۔ جبکہ چلاس اور داریل تانگیر کے لوگ اس رسم کو ''دیواکو'' کہہ کر پکارتے۔

ماریہ:

آدمی دور رہنے والے اپنے قبیلے کے لوگوں کے ہاں جاتا یا کسی رشتہ دار عورت کا مہمان ہوتا تو عام طور پر میزبان بکرا ذبح کر کے روایتی طریقے سے مہمانداری کرتا۔ مہمان کے اعزاز میں مال ذبح کرنے کی اس رسم کو مقامی لوگ ''ماریہ'' کہتے ہیں۔

گلگت میں کارگاہ جنگل اور اس کی چراگاہوں پر اہالیان گلگت کے چند مخصوص گاؤں کے لوگوں کے حقوق ہیں۔ ان گاؤں سے کوئی نمائندہ وفد جب کبھی کارگاہ نالہ کا دورہ کرتا تو اس موقع پر کارگاہ کے لوگ، جن کا جنگل اور چراگاہوں پر کوئی حق نہیں اور کارگاہ میں ان کا قیام چند قواعد اور ضوابط کے تحت عمل میں آتا ہے، اصل مالکوں کے نمائندہ وفد کے اعزاز میں بکرا ذبح کرنے یعنی ''ماریہ'' کرنے کے از روئے روایت پابند ہیں۔

دیشا کی:

دیشا کی دراصل موسم سرما کے لئے ہر چیز ذخیرہ کرنے کے رواج کا نام تھا۔ مال مویشی سے لے کر انسانی خوراک کے لئے درکار تمام ضرورت کی چیزیں موسم سرما کی آمد سے قبل ہی تیار کر لی جاتی تھیں۔ یہ رسم بہت قدیم ہے۔ کیونکہ سردیوں میں پانی جم جاتا تھا اور اس دوران کسی اور مقام سے اشیائے خوردنی درآمد کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اشیائے ضرورت اکٹھا کرتے وقت نہ صرف شادی بیاہ کے اخراجات کی خاطر پیشگی اقدامات کرتے بلکہ اس موسم میں متوقع اموات، جنگ اور فصل کی خرابی جیسی ممکنہ صورت حال سے نبٹنے کے لئے بھی خصوصی اقدامات کئے جاتے۔ یہ دراصل موسم سرما کیلئے بجٹ تیار کرنے کی رسم تھی جو ان علاقوں میں ''دیشا کی'' کے نام سے موسوم ہے۔

دُبان:

وٹہ سٹہ کی شادی کو ''دُبان'' کہتے ہیں۔ اکثر چھوٹی عمر میں ہی فریقین ایسے رشتے آپس میں زبانی طے کرتے۔ دولہا، دلہن سے شریک حیات کے انتخاب کے لئے رائے لینا تو درکنار ان کی منگنی کے لئے بلوغت تک کا انتظار نہیں کیا جاتا۔ گویا دُبان ازدواجی رشتوں کے تبادلے کا نام ہے۔

نذرانے کی رسم:

پرانے زمانے میں ظالم و جابر حکمران اپنی رعایا سے طرح طرح کے نذرانے وصول کرتے تھے۔ مہاراجہ کشمیر بھی ان ظالم حکمرانوں میں سے ایک تھا۔

رعایا کے غریب ترین شخص کا بھی نذرانہ دیئے بغیر جینا ممکن نہیں تھا۔ گلگت اور استور میں بھی ان نذرانوں کا سلسلہ جاری تھا۔ نمبردار، تحصیلدار، نائب تحصیلدار، وزیر وزارت یا راجہ سے جو بھی ملنے جاتا تو تحفے تحائف اور ڈالی ہاتھ میں لئے سلامی دیتا۔ تب کہیں جا کر صاحبِ اقتدار سے ملاقات نصیب ہوتی۔ ڈالی دینا محض ایک رسم نہ تھی بلکہ یہ ایک اخلاقی پابندی تھی۔ شروع شروع میں یہ رسم محاصل کا حصہ تھی کہ آپ اپنے لڑکے کی شادی کریں، نذرانہ راجہ کو دیں، لڑکی کی شادی کریں، تحفے کی تھالی راجہ کی خدمت میں پیش کریں، شکار کریں یا ''نسالو'' ران (پھٹالی) راجہ کو بھیجیں۔ الغرض لوٹ مار کا بازار گرم رہتا۔ بہرحال 1894ء کے بعد بیشتر راجگی، وزیری، نمبرداری محاصل ختم کر دیے گئے لیکن نذرانے گزارنے کی رسم مدتوں تک جاری رہی۔

زیتُو/کلک:

دیامر میں بالخصوص چلاس اور داریل/تانگیر میں گاؤں میں اتفاق واتحاد برقرار رکھنے کے لئے ایک کمیٹی تشکیل دی جاتی۔ جسے مقامی لوگ ''زیتُو یا کلک'' کہتے۔ ان کا کام یہ ہوتا ہے کہ کوئی اس معاہدے کی خلاف ورزی کرے تو اس سے تاوان وصول کرتے۔ فصلوں میں مال مویشی چھوڑنے سے لوگوں کو روکتے اور مسجد میں نماز کے لئے حاضر نہ ہونے والوں سے ناغہ وصول کرتے۔ عوامی کام مثلاً کوہل وغیرہ کی صفائی کے لئے لوگوں کو بلاتے۔

شوچو:

یہ قدیم بدھ مت کی ایک رسم تھی۔ جو داریل کے بہت سے گاؤں میں کچھ عرصہ قبل تک رائج تھی۔ گندم کاٹنے کے بعد یہ رسم منائی جاتی تھی۔ اس دوران دودھ جمع کرنے کے بعد اس کو گرم کر کے لوگوں اور رشتہ داروں میں تقسیم کیا جاتا۔ موسم خزاں میں جب لوگ جنگلوں اور چراگاہوں سے مال مویشی لے کر واپس گاؤں پہنچتے تو اس وقت یہ رسم ادا کی جاتی۔ داریل کے گاؤں منیکال میں یہ رسم بڑے اہتمام سے منائی جاتی تھی۔

رَس:

گلگت میں ہلہ شری کے کاموں کے لئے کسی زمانے میں بذریعہ اعلان لوگوں کو مطلع کیا جاتا تھا کہ آج کوہل کی صفائی کرنی ہے۔ لہٰذا تمام لوگ اس میں شریک ہوں۔ ہر گھر سے ایک فرد کا ہلہ شری کے کام کے لئے جانا ضروری ہوتا۔ ان مواقع پر اگر کوئی شخص غیر حاضر رہتا تو اس سے باقی لوگ جرمانہ وصول کرتے۔ اس جرمانے کو مقامی زبان میں ''رَس'' کہتے تھے۔ دیامر میں کسی کی موت یا میٹنگ (سگاس) کی صورت میں لوگوں کے لئے لازم تھا کہ وہ اس میں شرکت کریں

بصورتِ دیگر ان سے ''گن'' (رس) وصول کیا جاتا۔ بعض دفعہ مسجد میں نماز کے لئے نہ آنے والوں سے بھی جرمانہ (گن) وصول کیا جاتا تھا۔

رسمِ چلی گون:

چلی ایک درخت کا نام ہے جسے یہاں کے لوگ متبرک خیال کرتے ہیں۔ لوگوں کے عقیدے کے مطابق اس کے دھوئیں سے تمام آسیب، بدروحیں اور جن بھوت وغیرہ دور چلے جاتے ہیں، نحوست ختم ہوتی ہے اور انسان شیطانی اثرات سے محفوظ ہوتا ہے۔ زمانہ قدیم میں چلی (پدم) اور بھوج پتر کے درختوں کے چھلکوں (جورَ) کی دھونی جراثیم کشی کے لئے استعمال کی جاتی۔ دولہا، دلہن کو شادی کے موقع پر اور کھیتوں میں تخم ریزی کے موقع پر کسان بیجوں وغیرہ کو دھونی دیتے تھے۔ اگر کوئی معزز مہمان گاؤں میں داخل ہو جائے تو اس کو بھی چلی کی دھونی دی جاتی۔ اس سے بعض مغربی مؤرخین کو مغالطہ ہوا کہ یہ درخت پرستی ہے حالانکہ اس رسم میں ایسی بات نہیں تھی۔ نئے گھر میں منتقل ہوتے وقت، کھلیان میں غلّہ کی ڈھیری کے دوران، نئے کپڑے پہنتے وقت، عورتوں کا حیض ونفاس سے فراغت کے وقت، پن چکی چلاتے وقت، گائے بکری جب بچہ دیتیں تو ان سے دودھ نکالنے کے دوران اور گھوڑے پر کاٹھی یا زین لگانے سے پہلے ''چلی گون'' کی رسم ادا کیجاتی۔ جب نئی فصل پکنے کے قریب ہوتی تو علاقے کے لوگ جمع ہوتے اور پدم کے سبز پتوں کو ایک بیلچے میں رکھ کر اس پر آگ کے انگارے ڈالتے تو اس سے دھواں اٹھتا۔ اس دھواں دار بیلچے کو ہاتھ میں لئے کھیت کے چاروں طرف چکر لگاتے۔ ہر گھرانہ اپنے طور پر یہ رسم ادا کرتا۔ اس موقع پر لوگ اپنے ساتھ دیسی گھی اور روایتی روٹی ''پھپائیں'' بھی ساتھ لیجاتے اور دھونی دینے کے بعد مل کر کھاتے۔ کھانے سے پہلے روٹی کے چند ٹکڑے جن پر گھی لگا ہوا ہوتا کھیت میں فصل کی طرف پھینک دیتے۔ گندم یا جو کے کچھ منتخب خوشوں پر گھی مَل دیتے اور واپسی پر خوشوں کا ایک گچھا بنا کر لاتے اور گھر میں ستون کے ساتھ باندھ دیتے۔ لوگ اپنے اس عمل کو برکت کی علامت تصور کرتے تھے۔ اہل استور اس رسم کو ''چھلی گون'' کہتے ہیں۔

رسمِ چراغ روشن:

جب اسماعیلی برادری میں کسی کی موت واقع ہوتی تو اس کی بہترین اشیاء امامِ زماں کے لئے الگ رکھی جاتیں۔ متوفی کے گھر میں تین دن سے آٹھ دن تک کھانا نہیں پکتا اور دوسرے لوگ یعنی ہمسایہ رشتہ دار اور محلّہ دار نہ صرف غم زدہ خاندان کے لوگوں کو کھانا فراہم کرتے بلکہ پرندوں کے لئے بھی کھانا کھلی جگہ پر رکھا جاتا اور مال مویشی کی خوراک کا انتظام بھی کیا جاتا۔ مقررہ دن خلیفہ متاثرہ گھر آتا

جہاں اس (خلیفہ) کو کھانا پکا کر پیش کیا جاتا۔ خلیفہ تھوڑا سا کھانا کھانے کے بعد متوفی کے جانشین کے منہ میں ایک لقمہ ڈالدیتا۔ یہ گویا کھانے کا ایک طرح سے افتتاح ہوتا، کیونکہ اس کے بعد سارے گھر والے کھانا کھاتے۔ پھر چراغ روشن کیا جاتا اور رات بھر محفل موسیقی جاری رہتی۔ البتہ آج کل یہ رسم کافی ترمیم کے ساتھ جاری ہے۔ اس مسلک کے لوگ عیدین کے علاوہ عید میلاد النبیؐ، عید غدیر، پیدائش و سالگرہ تخت نشینی حاضر امام اور یوم تشریف آوری حاضر امام کے علاوہ ہر قمری ماہ کی چاندرات کی تقریبات بھی پورے جوش وخروش سے مناتے ہیں۔

رسمِ راگ:

ہر گاؤں میں ''راگ'' کا رواج تھا۔ یعنی پھل فروٹ وغیرہ کو استعمال کرنے کے لئے وقت مقرر ہوتا تھا۔ جب تک اجتماعی طور پر استعمال کا اعلان نہیں ہوتا کوئی شخص اپنے باغ کا پھل بھی استعمال نہیں کرسکتا۔ اگر کوئی چوری چھپے اپنے باغ سے پھل کھاتے ہوئے پکڑا جاتا تو اس سے حسبِ رواج جرمانہ (رس) وصول کیا جاتا۔ فصل کاشت کرنے، کاٹنے اور مال مویشی آزاد چھوڑنے کے لئے بھی دن مقرر ہوتے تھے۔ کسی کی کیا مجال تھی کہ وہ ان اصولوں کی پاسداری نہ کرے۔ اگر کسی کے گھر میں آیا ہوا مہمان غلطی سے میزبان کے باغ سے پھل استعمال کرتا تو میزبان سے اس کی پاداش میں جرمانہ وصول کیا جاتا۔ جب کوئی نو وارد پھل وغیرہ طلب کرتا تو اسے کہا جاتا کہ آجکل ''راگ'' کا رواج نافذ ہے اسلئے اسے مہیا کرنے سے قاصر ہیں۔

رسمِ نوس چلی:

کہتے ہیں کہ راجہ ''شری بدھت'' نامی گلگت میں ایک ظالم حکمران تھا اور انسانی بچے اس کی خوراک تھے۔ بعد میں یہاں کے لوگوں نے اس کی نیک دل بیٹی نور بخت سے ساز باز کرکے ظالم شری بدھت کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ لوگوں میں یہ بات مشہور تھی کہ ظالم شری بدھت کی روح چٹور کھنڈ (اشکومن) کے گلیشیئر میں رہتی ہے اور وہ آگ سے ڈرتی ہے۔ چنانچہ ہر سال موسم سرما میں دسمبر کے مہینے میں یہ رسم منائی جاتی تھی۔ اس مہینے کو یہاں کے لوگ ''دواکو'' بھی کہتے تھے۔ یہ علاقائی تقریب ''نوس چلی'' کے نام سے معروف تھی۔ اس تقریب کا دن عموماً ''نسالو'' کے چار پانچ روز بعد مقرر ہوتا تھا۔ جس میں عموماً چند راتیں خوشی و شادمانی میں گزر جاتی تھیں۔ جس میں محلے کے تمام مرد حضرات اپنے اپنے ہاتھوں میں مشعل (تلینی) لے کر اپنے سروں کے گرد لہراتے ہوئے چل پڑتے اور گلگت سے باہر رہنے والے لوگ جلتے ہوئے مشعل گلگت شہر کی جانب پھینک دیتے تھے۔ اس موقع پر ایک عجیب رسم ادا کی جاتی تھی۔ جس کے مطابق جب تمام لوگ اپنے اپنے گھروں کو لوٹتے تو ان کے دروازے مقفل ہوتے۔ ان کی بیوی ان سے پوچھتی کہ رات بھر کہاں رہے۔ میں تمہیں اندر نہیں آنے دوں گی۔ پھر اس کا شوہر التجا کرتے ہوئے کہتا کہ میں نہ صرف تمہارے لئے خوشحالی، بچے اور دولت لے کر آیا ہوں بلکہ ہر وہ چیز لے کر آیا ہوں جس کی تم خواہش رکھتی ہو۔ تھوڑی سی اور گفتگو کے بعد بیوی دروازہ کھول دیتی اور شوہر گھر میں داخل ہوتا۔ بہر حال شوہر کو ایک شہتیر کی مدد سے مزید اندر آنے سے روک دیا جاتا جبکہ عورتیں خاندان کی معمر ترین خاتون جو کمرے کے اندر ہوتی تھی کے پاس جاتیں۔ شوہر اس پر ناراض ہوجاتا اور آگے بڑھنے سے انکار کرتا۔ شوہر کی ناراضگی پر بیوی پچھتاتے ہوئے یہ شنا گانا گاتی تھی:۔

موتٹ سَا بلس وو رجو تولیا
موتٹ سَا بلس وو انسپو، پینو
موتٹ سَا بلس وو تمك گِینو
موتٹ سَا بلس وو کھنگر گینو
موتٹ سَا بلس وو چپن بنو
موتٹ سَا بلس سَا ملی دے گِنم
موتٹ سَا بلس وو گھومَی چھنو
سَا بلس سَاملی دے گِنم
موتٹ سَابلس وو گھِیَی لوٹو
سَابلس سَاملی دے گِنم

ترجمہ:۔

اے راجے کا چہیتا! تو نے مجھے خوش کردیا۔ اے بہادر شہسوار! تو نے مجھے خوش کردیا۔ اے بندوق بردار! تو نے مجھے خوش کردیا۔ اے تلوار بردار! تو نے مجھے خوش کردیا۔ اے پوشاک فضیلت (چپن) پہننے والے! تو نے مجھے خوش کردیا۔ اے گندم (دولت) کے ڈھیر! تو نے مجھے خوش کردیا۔ میں تم سے خوش ہوں اور یہ خوشی میں ہر قیمت پر خریدوں گی۔ اے گھی کا گولا! (بہت پیارا) تو نے مجھے خوش کردیا۔ میں تم سے خوش ہوں اور یہ خوشی میں ہر قیمت پر خریدوں گی۔

یہ گانا سننے کے بعد شوہر بیوی پر ترس کھاتا اور رکاوٹ کو پھلانگتے ہوئے بیرون خانہ جاتا۔ پھر سارے اکٹھے بیٹھ جاتے اور کھانا ایک ساتھ کھاتے۔ اسی طرح ''نوس چلی'' کی تقریب اختتام پذیر ہوتی۔

دیگر متفرق رسومات:

☆ پرانے زمانے میں لوگوں کا مکان ایک بڑا دیسی روایتی گھر اور اس کے ساتھ برآمدہ پر مشتمل ہوتا جہاں پر افراد خانہ بسر اوقات کرتے۔ مالدار لوگوں کے

مکانوں میں البتہ ایک مہمان خانہ اور غسل خانے کا اضافہ ہوتا۔ لوگ سردیوں کے شروع ہوتے ہی یعنی ماہِ اکتوبر کے اوائل میں دیسی روایتی گھر کو چکنی مٹی (ماہِ) سے لیپ دیتے اور خصوصی اہتمام کے ساتھ روایتی گھر میں قدم رنجہ ہوتے۔ اس زمانے کی رسم کے مطابق جس دن گھر میں سردیوں میں قیام کے لئے داخل ہوتے اس رات کو خصوصی طور پر ہمسایوں کو مدعو کیا جاتا۔ گھر میں متبرک جنگلی پودا ''اسپندر'' کی دھونی دی جاتی۔ آمدِ بہار کے ساتھ برآمدے کی صفائی کی جاتی اور اسی تزک و احتشام کے ساتھ گرمیوں میں قیام کے لئے برآمدے میں اہتمام کیا جاتا۔ ان ایام میں لوگ خوشی خوشی یہ کہتے تھے کہ آج ہم گھر میں داخل ہو رہے ہیں یا گھر سے باہر برآمدے میں شفٹ ہو رہے ہیں۔ روٹی تین چار آدمی مل کر ایک تھالی میں کھایا کرتے۔ کھانا دایاں ہاتھ سے کھاتے اور کھانا ختم کرنے کے بعد دائیں ہاتھ کی انگلیاں ایک ایک کر کے چاٹتے۔ حتیٰ کہ کھانے والا تھالی کو بھی اس طرح صاف کرتا کہ جیسے اس میں کھایا ہی نہ ہو۔ کھانے کے بعد دعا کرتے۔ کھانے کے دوران پانی پینے کی حاجت ہوتی تو خود پانی پینے سے پہلے اسے اردگرد موجود ساتھیوں کو احتراماً پیش کیا جاتا جسے ''یہ جو'' یعنی شکریہ کہہ کر قبول نہیں کرتے۔ اگر کوئی شخص ایسا نہ کرے تو لوگ بہت بُرا مناتے۔

☆ ضلع دیامر میں قبائلی اختلافات باقی اضلاع کی نسبت زیادہ ہیں۔ اگر کوئی جانی دشمن اپنے دشمن کے گھر اپنے بال بچوں یا چند اکابرین کے ساتھ اچانک جا کر متاثرہ خاندان سے معافی مانگ لے تو اکثر اوقات معافی مل جاتی ہے لیکن بعض دفعہ معافی تو نہیں ملتی البتہ ان کو معزز مہمانوں کی طرح خاطر تواضع کر کے رخصت کیا جاتا لیکن دشمنی بدستور بحال رہتی۔ فریقین کی طرف سے اگر برابر مارے گئے ہیں تو ایسی صورت میں جرگے کے لئے آسانی ہوتی۔ اگر ایک جانب کا پلہ بھاری ہو تو اس صورت میں زائد قتل کا مناسب خون بہا وصول کر کے مقتول کے ورثاء کو دلایا جاتا۔ بعض جگہوں پر ''صلح نامہ'' کو مزید استحکام بخشنے کے لئے جرگہ فریقین کے درمیان رشتوں کا تبادلہ بھی کراتا۔ جس سے خوشگوار اثرات مرتب ہوتے۔ جرگے میں علماء کرام بھی شامل ہوتے ہیں۔ جب دو فریق کے درمیان جرگہ صلح کراتا تو ایسی صورت میں علاقے کے معززین کے لئے دعوت کا اہتمام کیا جاتا اور برسرِ عام جرگہ کے فیصلے کے بارے میں لوگوں کو مطلع کیا جاتا۔ جس کے بعد متاثرہ فریقین ایک دوسرے سے بغلگیر ہوتے۔ گویا ایک طرح سے وہ اپنے دل سے دشمنی کی کدورتوں کو دور کر دینے کا اعلان کرتے۔

☆ بدن

کسی دشمن کے گھر میں موت کی صورت میں اس کا دشمن دار میت کی قبر پر جاتا اور بعض دفعہ فاتحہ خوانی کے لئے گھر بھی جاتا۔ ایسے مواقع پر مقامی رواج کے مطابق دشمن پر ہاتھ اٹھانے کی بڑی ممانعت تھی۔ عوامی میٹنگ (سگاس) کے دوران بھی گاؤں کے تمام لوگ ایک جگہ جمع ہوتے اس موقع پر بھی دشمنوں پر ہاتھ اٹھانے کی از روئے رواج اجازت نہیں ہوتی۔ قتل کے بدلے قتل کی اجازت تھی لیکن اگر قتل کا سانحہ اپنی نوعیت کے لحاظ سے بہیمانہ اور انسانیت سوز ہوتا اور مقتول کے خاندان کا معاشرہ میں کافی اثر و رسوخ ہوتا تو دباؤ کے تحت عمومی و خصوصی ہرجانہ یا سزا دی جاتی۔ جس میں قاتل کے گھر کو جلانا، اس کی جائیداد کی ضبطی اور اس کے لواحقین کو سزا دینا شامل ہوتا۔ بعض دفعہ فریقین کو جمع کر کے قرآن حکیم پر حلف کی بنیاد پر امن و آشتی کا ماحول پیدا کیا جاتا۔ جہاد پر جانے یا اجتماعی مفاد کے کسی منصوبے پر کام کرنے کے لئے جب کبھی کمیونٹی کے تمام ممبران کی ضرورت پڑتی تو اجتماعی کام سے فارغ ہونے یا جہاد سے واپسی تک دشمنوں پر ہاتھ اٹھانے کی کسی کو اجازت نہیں ہوتی۔ اس سلسلے میں لوگوں کو بذریعہ اعلان مطلع کیا جاتا۔ اس روایت کو مقامی لوگ ''بدن'' کہتے ہیں۔

☆ ضلع دیامر کے سب ڈویژن چلاس اور داریل/تانگیر کے قبائل اپنی دشمنیوں کی وجہ سے بہت مشہور ہیں۔ ان علاقوں میں دشمنیاں زیادہ تر نسلی بنیادوں پر چل رہی ہیں۔ بالخصوص ''شین'' اور ''یشکن'' قبائل روایتی حریف کے طور پر جانے جاتے ہیں۔ بعض مقامات پر شینوں کے مابین اور یشکنوں کا آپس میں بھی بڑی بڑی دشمنیاں موجود ہیں۔ دشمنیاں زیادہ تر زن، زر اور زمین کے جھگڑوں کی بنیاد پر ہوتی ہیں، جبکہ مردوں کے آپس کے معمولی جھگڑے بھی دشمنیوں کا سبب بنتے۔ مخرف فریقوں میں بات چیت نہیں ہوتی اور اگر ہو بھی جائے تو دل صاف نہیں ہوتے۔ طاقت ور کیا کمزور گروپ بھی اپنا بدلہ کئی سال گزرنے کے بعد بھی چکانے سے دریغ نہیں کرتا۔ بدکردار مرد اور عورت اگر رنگے ہاتھوں پکڑے جائیں تو دونوں کو قتل کر دیا جاتا اور علاقائی رواج کے مطابق قاتل کو سزا نہیں دی جاتی۔ تنازعات اور دشمنیوں کے معاملات کے حل کیلئے حکومتی اداروں سے زیادہ علاقائی جرگے سے رجوع کیا جاتا۔ حتیٰ کہ حکومتی ادارے بھی ایسے معاملات زیادہ تر گاؤں کے جرگہ داروں کے پاس برائے فیصلہ بھیجتے۔ اس طرح لوگ تھانہ کچہری کے چکروں سے آزاد رہتے۔ پرانے زمانے میں جب ہتھیار متعارف نہیں ہوئے تھے تو اس وقت کلہاڑیوں کے ذریعے دشمنوں کو موت کے گھاٹ اتارتے۔ ان علاقوں میں سو سالہ دشمنیوں کا سلسلہ بھی کہیں کہیں جاری ہے۔ جبکہ جرگہ داروں کے مؤثر فیصلوں سے بعض پرانی دشمنیاں ختم ہو گئی ہیں۔ البتہ اب دشمنیوں کا زور ٹوٹ رہا ہے۔ ماضی میں چلاس اور داریل/تانگیر کے ہر گاؤں میں آبادی اور رقبے کے لحاظ سے معتبرین جنہیں مقامی لوگ ''جسٹیر و'' کہتے، مقرر کئے جاتے تھے۔ انہیں ان فرائض کے عوض کچھ معاوضہ نہیں ملتا تھا۔ علاقے میں ''جسٹیر و'' کی پوری گرفت اور

طاقت ہوتی تھی اور وہ نظام کا ایک اہم عضو تصور ہوتا تھا جسے پورے علاقے میں انتہائی عزت وقدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ جب دو فریقین کے درمیان کسی مسئلہ یا خرید وفروخت پر تکرار طول پکڑتا اور کوئی حتمی فیصلہ نہیں ہو پاتا تو ایسی صورت میں ثالث حضرات مسئلے کے حل کے لئے کوئی درمیانی صورت نکال کر فریقین کو مجبور کرتے کہ وہ ان کا اور اہل مجلس کا پاس رکھتے ہوئے ثالثی فیصلہ قبول کریں۔ ایسے فیصلے عموماً قبول کئے جاتے کیوں کہ ثالث حضرات کا فیصلہ ٹھکرانا ازروئے روایت معیوب سمجھا جاتا۔ اہل دیامر کے جرگہ داروں کا بطور ثالث کردار لائق تحسین تصور کیا جاتا ہے۔ ایک ہی بیٹھک میں پیچیدہ سے پیچیدہ جھگڑے کی تہہ تک پہنچ جاتے اور جرگہ دار قلیل وقت میں بڑے بڑے قضیوں کے فیصلے کرتے۔

☆ جب کوئی شخص سفر پر جاتا تو سفر میں استعمال کے لئے خشک میوہ اور روایتی روٹی ''چھپٹہ'' ایک چادر میں رکھ کر دیگر اشیاء کے ساتھ اپنے پیٹھ کے اردگرد لپیٹ لیتا۔ سفر پر روانگی سے قبل اپنے رشتہ داروں کے گھر جا کر ان سے ملنے کا رواج بھی عام تھا۔ سفر پر روانگی کے وقت عموماً خدا کے نام پر کچھ نہ کچھ خیرات ضرور دیتے جسے مقامی لوگ ''پوش پاؤ'' کہتے۔ ''پوش پاؤ'' دراصل پانچ مٹھی آٹا یا ایک روپیہ چار آنے پر مشتمل ہوتا۔ پرانے زمانے میں چونکہ ہوٹلوں کا رواج نہیں تھا۔ اسلئے لوگ مساجد کے متصل بنائے ہوئے مخصوص مسافر سرائے (گٹ گی) یا مسجدوں میں جا کر قیام کرتے۔ اس موقع پر مسجد کے مقامی منتظمین مہمان کے قیام اور طعام کے لئے خصوصی اہتمام کیا کرتے اور مہمان اگلے دن اپنی منزل کی طرف روانہ ہو جاتا۔

☆ پرانے زمانے میں ایک مذموم رسم یہ بھی تھی کہ جب کبھی کسی شخص کے مقدمے کا فیصلہ کرنا ہوتا تو اسے آگ سے گزار کے کیا جاتا۔ سات قدموں کا فاصلہ طے کرنے کے بعد مجرم کی ہتھیلی پر آگ میں سرخ کئے گئے کلہاڑے کا پھل رکھا جاتا۔ مجرم کو یہ پھل اپنی ہتھیلی پر رکھ کر سات قدم کے فاصلے پر پہلے سے مقرر کی ہوئی جگہ پر رکھنا ہوتا۔ اگر اس کے ہاتھ پر جلنے کا نشان پڑ جاتا تو یہ اس کے جرم کا ثبوت ہوتا۔

☆ ان علاقوں میں گھر کا سربراہ دادا یا والد ہوتا جو نجی معاملات میں رہبری کرتا اور خاندانی معاملات میں اس کا فیصلہ حرفِ آخر ہوتا۔ گھر کے کمانے والے اپنی آمدنی اسی کے حوالے کرتے جو اسی ماہانہ آمدنی سے کچھ نہ کچھ بچا کر آڑے وقت کے لئے بھی سنبھال کر رکھتا۔ تمام بھائی ایک دوسرے کے مرتبے کا خیال رکھتے۔ گھر کے سرپرست کی اجازت کے بغیر کوئی باپ اپنی زوجہ اور اولاد کو بھی کوئی کپڑا یا کوئی اور چیز نہیں خرید سکتا۔ کیونکہ ضروریات زندگی کی فراہمی کا ذمہ دار گھر کا سربراہ ہی ہوتا جو صاحب روزگار اور بے روزگار بیٹوں کی اولاد میں بلا تفریق اشیائے ضرورت فراہم کرتا۔ جس کی وجہ سے جانبداری اور غیر مساویانہ تقسیم کی کبھی کسی کو شکایت نہیں ہوتی اور گھر کا ماحول بڑا خوشگوار اور پرسکون رہتا۔

☆ پرانے وقتوں میں حراموش میں کھلتارو کے مقام پر فصل کو مضر بیماریوں اور جانوروں سے بچانے کے لئے ایک عجیب سی رسم موجود تھی۔ جہاں بہار کے دوران بکرا بکری کا ایک جوڑہ منتخب کر کے اسے زرعی اراضی میں چھوڑ دیا جاتا جبکہ علاقے کے باقی تمام مال مویشی بلند پہاڑی چراگاہوں پر لے جاتے۔ یہ منتخب جوڑہ جہاں سے چاہے خوراک لے لیتا حتی کہ کسی کے فصل کے اندر گھس کر پیٹ بھر لے تو بھی کسی کو یہ اجازت نہیں تھی کہ ان پر ہاتھ اٹھائے۔ اگر یہ جوڑہ کسی کھیت میں فصل کھانے کے لئے جائے تو لوگ اسے مالک کی خوش بختی اور خوشحالی سے تعبیر کرتے۔ جب لوگ موسم خزاں میں چراگاہوں سے واپس آتے تو مرد حضرات بکرے کو ذبح کر کے اس کا گوشت ایک روایتی ضیافت کے دوران تناول کرتے۔ لوگوں کا خیال ہے کہ اس طرح کرنے سے جانوروں اور فصل پر مضر بیماریاں اثر انداز نہیں ہوتیں۔

☆ استور میں ایک رواج یہ بھی تھا کہ جب کسی کے گھر پیدائش ہوتی تو متعلقہ گھر کا مالک اس روز ضروریات زندگی کا کچھ سامان زیر زمین ذخیرہ کرتا اور یہ اشیائے خوردنی اس وقت نکال کر تقسیم کرتے جب نومولود جوان ہو جاتا اور جس دن اس کی منگنی ہو جاتی۔

☆ ''لوموہ'' کے نام سے ایک رسم ماضی میں استور میں رائج تھی۔ موسم خزاں کے آخری ایام میں جب مال مویشی چراگاہوں سے مستقل آبادیوں کی طرف واپس لوٹاتے تو اہل بستی مقررہ دن Torch Wood کی تیل دار لکڑی کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے جمع کر کے ایک گچھا بناتے اور لمبے ڈنڈے کے ایک سرے پر باندھتے پھر اس پر آگ لگا کر شور مچاتے ہوئے گاؤں سے دور ایک مخصوص جگہ پر ان شعلہ بردار ڈنڈوں کو پھینک دیتے۔ اس رسم کے پس پردہ یہ عقیدہ تھا کہ آگ کے شعلے دکھا کر بدروحوں اور شیاطین کو گاؤں کے حدود سے بھگایا گیا ہے لہٰذا اہل گاؤں اگلے سال تک ان کے ہر شر سے محفوظ ہوں گے۔

☆ کھرن یا مجاری

چلاس، گور، داریل اور تانگیر میں دو افراد یا دو فریقوں میں جھگڑے ایک خصوصی تقریب منعقد کر کے حل کرائے جاتے تھے۔ اس خصوصی تقریب کو اہل چلاس اور داریل تانگیر ''کھرن'' جبکہ اہل کوہستان ''مجاری'' کہتے۔ اس تقریب کے ذریعے ہر مخالف پارٹی اہل محلّہ کے لئے کئی دنوں تک ضیافتوں کا اہتمام کر کے اپنے مخالف کے مقابلے میں اپنے آپ کو زیادہ صاحب جائیداد ثابت کرنے کی کوشش کرتی۔ لہٰذا جو پارٹی سبقت لے جاتی اس کی بات دوسری پارٹی کو ماننی پڑتی۔

نگر میں ''کھورن'' کے نام سے ایک رسم یہ ہے کہ جب کوئی شخص مسجد یا امام بارگاہ تعمیر کرے تو وہ تمام آبادی کو پرتکلف روایتی کھانے کھلاتا ہے۔ اگر

سارے لوگ مل کر اجتماعی طور پر مسجد یا امام بارگاہ بنانا چاہیں تو پوری آبادی مل کر دعوت کا بندوبست کرتی ہے اور یہ ضیافت ''کھورن'' کہلاتی ہے۔

میل جول کے طریقے:

شنا بولنے والے علاقوں میں لوگوں کے میل جول کے طریقے بھی بڑے شاندار اور منفرد تھے۔ جب لوگ ایک دوسرے کے ساتھ ملتے تو خندہ پیشانی اور اخلاص سے ملتے۔ علیک سلیک کے بعد ایک دوسرے سے ہاتھ ملاتے اور خیر خیریت پوچھتے۔ پرانے وقتوں میں جب دو شخص ایک مدت کے بعد ایک دوسرے کے ساتھ ملتے تو ان کا انداز بڑا نرالا اور خوش کن ہوتا۔ پہلے ایک طرف پھر دوسری طرف بغلگیر ہوتے۔ بغلگیر ہونے کا عمل دونوں طرف سے یکساں ہوتا۔ اپنے سے بڑی حیثیت کے لوگوں سے ملتے یا جدا ہوتے وقت ان کے ہاتھوں کو چوما جاتا اور پاؤں چھوئے جاتے۔ جب عورتیں ایک دوسرے کے ساتھ ملتیں تو داہنے ہاتھ سے مصافحہ کرنے کے بعد ہاتھ کو چھوڑے بغیر باری باری ایک دوسرے کا ہاتھ چوم لیا کرتیں۔ عورتیں اپنے بزرگوں اور مرد بزرگ عورتوں کے ہاتھ بھی چوما کرتے تھے۔ ملاقاتوں میں خاندان کے بزرگوں، بچوں اور عورتوں کا حال احوال بھی ایک دوسرے سے پوچھا کرتے۔ سلام میں چھوٹا پہل کرتا البتہ حکمران طبقے کے چھوٹوں کو بھی رعایا کے بڑے بزرگ نہ صرف سلام کرتے بلکہ خاطر خواہ تعظیم بھی کیجاتی۔

جب محلّہ کا کوئی فرد بیمار ہوتا تو محلّہ کے تمام بزرگ خواتین و حضرات اس کی عیادت کرتے۔ قریبی رشتہ دار اور دوست احباب بیمار سے یہ ضرور پوچھتے کہ اسے کسی چیز یا طعام کھانے کی خواہش تو نہیں ہوتی۔ اگر کوئی بیمار کسی چیز کا تقاضا کرتا تو اسے ضرور فراہم کیا جاتا۔ بعض ایسے واقعات بھی مشاہدہ میں آئے ہیں کہ لاعلاج مریضوں سے حالت نزع میں ان کی خواہش دریافت کی گئی تو انہوں نے برف کی فرمائش کی جس کے احترام میں چند جوان پہاڑوں کی چوٹیوں سے بڑی مشقتوں کے بعد برف لاکر ان کو پیش کرتے حالانکہ موسم گرما میں اس طرح کی خواہش پوری کرنا ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہوتا ہے۔

رضاعی تعلقات قائم کرنے کی رسم:

دودھ کے ذریعے تعلقات قائم کرنے کی کسی زمانے میں رسم عام تھی۔ جب کسی کے ہاں لڑکی یا لڑکے کی پیدائش ہوتی تو بعض دفعہ پرورش کے لئے اسے دایہ کے حوالے کیا جاتا تھا۔ جب بچی یا بچہ چھ سال کا ہوتا تب والدین اسے دیکھنے جاتے اور اپنا گھر بھی دکھاتے۔ البتہ پرورش اس کے رضاعی گھر میں ہی ہوتی تھی، اب ایسا نہیں ہے۔ یہاں کے لوگ رضاعی ماؤں کی بھی اسی طرح احترام کرتے جتنا اپنی اصل ماؤں کا۔ البتہ یہ رواج رعایا کی نسبت حکمران خاندان میں زیادہ رائج تھا اور ان میں دودھ کے تعلقات بڑے مضبوط اور مستحکم ہوتے تھے۔ شنا بولنے والے رضاعی ماں کو ''اُنیلی آجہ'' کہتے اور یہ رشتہ خونی رشتے کی طرح تصور کیا جاتا۔ حکمران طبقہ عموماً ان لوگوں کو اپنے بچے عنایت کرتے، جن کا خاندانی پس منظر مضبوط ہو اور جو مصیبت کے وقت کام آسکیں۔ بچہ یا بچی کو گود میں لینے کے بعد دایہ کے افراد خانہ کی قسمت اس بچہ یا بچی سے وابستہ ہوجاتی اور اس کے برے بھلے میں وہ برابر کے شریک ہوتے۔ جلاوطنی کی صورت میں اس کے پالنے والے بھی اس کے ساتھ ہی جاتے۔ اگر وہ مسند اقتدار پر بیٹھتا تو اس کے رضاعی باپ کی حیثیت بھی بڑھ جاتی اور وہ بڑا بااثر ہوتا۔ دودھ کے تعلقات کے علاوہ منہ بولا بیٹا اور بیٹی وغیرہ بھی بنائے جاتے اور ان کو بھی بالترتیب ''انیلوچ'' اور ''اُنیلی دھی'' کہا کرتے تھے۔

عورت کی چھاتیوں کا دودھ آنکھوں کی کئی بیماریوں کا علاج سمجھا جاتا تھا۔ اگر کسی مرد کی آنکھیں کسی عورت کے دودھ سے صحت یاب ہوجائیں تو ان دونوں کے درمیان ہمیشہ کے لئے مقدس رشتہ قائم ہوجاتا۔ آج کل رضاعی تعلقات کا سلسلہ نہ ہونے کے برابر ہے۔ البتہ جوں جوں طب نے ترقی کی، ضرورت مند بیماروں کو خون دینے کا سلسلہ شروع ہوا۔ جب کوئی صحت مند آدمی کسی ایسے بیمار کو جسے خون کی ضرورت ہو اور بیمار کے گروپ کے مطابق اس کے خون کا گروپ برابر ہو تو اسے خون دیتا تو ان کے درمیان بھی خونی رشتے کی طرح بڑا مضبوط تعلق پیدا ہوتا۔ خون دینے کی بنیاد پر رشتہ قائم ہونے کی رسم آج بھی قائم ہے اور یہ رسم جب تک ایک دوسرے کو طبی بنیادوں پر خون دینے کی ضرورت باقی ہے، قائم رہے گی۔

سری کون کی رسم:

کہتے ہیں کہ ''سری کون'' کے نام سے ایک دیوی تھی جو ''نگی سچے مِی'' کی بہن کہلاتی تھی۔ یہ دیوی استور گدی کے قریب ''شکانگ'' گاؤں میں رہتی تھی۔ لوگ اس رسم کے تحت دیوی کے حضور بطور نذرانہ بکریاں پیش کرتے تھے اور اس کے سامنے بیٹھ کر اپنی حاجت براری کیلئے دعائیں مانگتے تھے۔ اس دیوی کے پیروکاروں کو یہ اجازت نہیں تھی کہ وہ گائیں پالیں یا ان کا دودھ پئیں۔ اگر وہ ایسا کرتے تو انہیں اپنے مال مویشی کے ریوڑ اور فصلوں سے ہاتھ دھونے پڑتے۔

لوک علاج، دم، درود، ٹونے ٹوٹکے، توہمات

گلگت اور اس کے مضافات میں شنا بولنے والے لوگ بڑے ہمدرد اور دردمند طبیعت کے مالک ہیں اور بیمار کی تیمارداری کو اپنا فرض سمجھتے ہیں۔ پرانے وقتوں میں بیمار کی عیادت کے لئے آنے والے مرد و زن اسے لوک علاج کی سفارش کرتے۔ علاوہ ازیں جدید سہولیات اور علاج معالجہ کی سہولت نہ ہونے وجہ

سے لوک طریقہ علاج کے علاوہ دوسرا کوئی ذریعہ بھی بہم نہیں تھا۔ علاج کے طور طریقے تقریباً پورے شمالی علاقہ جات میں ایک جیسے تھے۔ یہاں کے لوگ جب کسی بیمار کی عیادت کیلئے جاتے ہیں تو اسے حوصلہ دینے کی بجائے تکلیف پہنچانے اور حوصلہ شکنی کی بات کرتے۔

لوک علاج:

ماضی میں لوگ امراض اور دیگر شکایات کی صورت میں عموماً لوک علاج کا سہارا لیتے تھے جس کے عوض ان کو مال مویشی اور گندم جو وغیرہ دیے جاتے۔ ٹونے ٹوٹکوں کے علاوہ بیماریوں کا زیادہ تر علاج مقامی طور پر دستیاب جڑی بوٹیوں سے کیا جاتا تھا۔

بِسَ کسور:

کہا جاتا ہے کہ چھوگام استور میں ایک بوڑھی عورت کو ایک موذی مرض کا حملہ ہوا اور ڈاکٹروں نے اسے لاعلاج قرار دے دیا۔ بوڑھی موت کو اپنے قریب آتے دیکھ کر بہت پریشان ہوئی۔ اس نے اس اذیت ناک بیماری سے ہمیشہ کے لئے جان چھڑانے کی خاطر ایک زہریلی بوٹی کی جڑ جسے اہلِ استور ''برو مُونلُوں''، اہلِ گلگت ''بس کسور'' اور اہلِ غذر ''بیزار'' کہتے ہیں، کھالی۔ بجائے مرنے کے بوڑھی کی صحت دن بدن بہتر ہوتی گئی اور ایک دن ایسا آیا کہ وہ بالکل صحت مند ہوگئی۔ روایت کے مطابق بوڑھی تادیر یہ جڑی بوٹی استعمال کرتی رہی۔ عام آدمی اس جڑی بوٹی کو چکھنا تو درکنار سونگھ بھی نہیں سکتا۔ اگر یہ بوٹی مال مویشی کھا جائے تو اسی وقت مرجاتے ہیں۔ چرواہے جب مال مویشی چراگاہ یا جنگل لے جاتے تو سب سے پہلے اس زہریلی گھاس کے پتے لاکر مال مویشی کے منہ اور ناک کے اردگرد مل لیتے ہیں تاکہ مال مویشی اس خطرناک اور زہریلی جڑی بوٹی کے مضر اثرات کو پہچان کر اس کے قریب نہ جائیں۔ اس کی جڑوں کو خشک کر کے بخار، کھانسی، نزلہ اور سانپ کے کاٹے کے لئے دوا کے طور پر بھی استعمال کرتے ہیں۔

رون:

اس کو اردو میں افسنطین اور شنا میں ''رون'' کہتے ہیں۔ ریگستانوں میں اگنے والا یہ خودرو پودا ہے۔ خشک اور ریتلی زمین اس پودے کے لئے نہایت ہی مفید ہے۔ پرانے وقتوں میں پیٹ کے کیڑوں، فشارِ خون اور معدہ کے السر کے لئے اسے بطورِ دوائی استعمال کرتے۔ اس کے پھولوں اور پتوں کو شاخوں سمیت پانی میں ابالتے ہیں اور اس سے جو مائع حاصل ہوتا ہے اسے نہار منہ پیتے ہیں۔ یہ مال مویشیوں کی من بھاتی خوراک ہے۔

چُرکی:

چُرکی کو اردو میں کھٹی بوٹی اور شنا میں ''چُرکی'' کہتے ہیں۔ اس خودرو پودے کی جڑیں، پھل، پتوں کا رس اور سفوف بطورِ دوا استعمال ہوتے ہیں۔ یرقان، امراضِ چشم و شکم، معدہ اور لیکوریا کی بیماریوں کے لئے یہ مجرب دوا ہے۔ یہ پودا ان علاقوں میں ہر جگہ کثیر مقدار میں پایا جاتا ہے۔ یہ پودا اتنا عام ہوتا ہے کہ سردیوں کے موسم میں مال مویشی کو گرم رکھنے کے لئے مویشی خانوں میں اسے بچھونے کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔

بھنگ:

بھنگ کو شنا میں ''تھوچہ'' کہتے ہیں۔ پیٹ کے کیڑوں کے خاتمے کے لئے اسے بطورِ دوا استعمال کرتے ہیں۔ جلاب، بخار، ملیریا، دست اور خونی زہریلے فاسد مادوں کے خاتمہ کے لئے یہ مجرب دوا ہے۔ یہ ایک قسم کی نشہ آور بوٹی ہے۔ اسلئے حد سے زیادہ استعمال کرنے والے مال مویشی نشے میں مخمور ہوجاتے ہیں۔

ھَیوّ:

اسے اردو میں زیرہ اور شنا میں ''ھَیوّ'' کہتے ہیں۔ تقریباً استور بھر میں زیرہ وافر مقدار میں دستیاب ہوتا ہے۔ چورت، زیپور، رام پور، ترشنگ، چھوگام، رٹو، ضلع بالا، منیمرگ اور گری کوٹ وغیرہ خودرو زیرہ کے لئے بہت مشہور ہیں۔ پیٹ کے کیڑوں کی صورت میں اسے بطورِ دوائی استعمال کرتے ہیں۔ زیرہ بڑی خوشبودار ہوتی ہے۔ ادویات کے علاوہ اسے مصالحہ جات کے طور پر بھی استعمال کرتے ہیں۔

کھم پوش:

''کھم پوش'' کا پودا بہار کے موسم میں برف پگھلتے ہی یہ خودرو پودا اُگتا ہے۔ اس کا پھول بہت ہی خوبصورت ہوتا ہے۔ پھول سکھا کر اس کا سفوف بطور دوا استعمال کرتے ہیں۔ رٹو، میر ملک، چورت اور رام پور اور اسکے مضافاتی علاقوں میں یہ بڑی مقدار میں پیدا ہوتا ہے۔ تولی، منیمرگ، رامہ اور دیوسائی کے علاقے اس کی پیداوار کے لئے مشہور ہیں۔

صف:

صف کو اردو میں ہنگ اور شنا میں ''صف'' کہتے ہیں۔ اس خودرو جڑی بوٹی کی پیداوار پتھریلی اور خشک جگہوں میں ہوتی ہے۔ وادی استور کے بالائی علاقے اور وادی نیلم وغیرہ اس کی پیداوار کے لئے مشہور ہیں۔ اس کی جڑیں نکال کر سفوف بناتے ہیں اور دودھ کے ساتھ استعمال کرتے ہیں۔ دل کی بیماریوں، کھانسی اور نظامِ دورانِ خون کو درست رکھنے کے لئے اسے بطور دوا

استعمال کرتے ہیں۔ یہ جڑی بوٹی جسم میں حرارت پیدا کرتی ہے، اسلئے موسم سرما میں لوگ اس کا شوربہ بنا کر بھی پیتے ہیں۔ یہ بوٹی اپنی تیز بو کی وجہ سے پہچانی جاتی ہے۔

بھزر بھنگ:

اسے اردو میں اجوائن خراسانی اور شنا میں ''بھزر بھنگ'' کہتے ہیں۔ اس کے پھول، خشک پتے اور بیج بطور دوائی استعمال کرتے ہیں۔ اس کے پتے دمہ اور سخت کھانسی کے لئے بہت مفید ہیں۔ اس کے علاوہ یہ تسکین بخش، خواب آور اور اعصابی تکالیف کو دور کرنے کے لئے موثر دوا ہے۔

چلی:

اس کے درخت کو اردو میں پدم اور شنا میں ''چلی یا چھلی'' کہتے ہیں۔ بیری کی طرح اس خودرو پودے کے گول پھل لیکوریا، کھانسی اور جراثیمی پھیلاؤ والی بیماریوں کے لئے مجرب دوا ہے۔ دمہ اور دل کی بیماریوں کے لئے بھی اسے بطورِ دوا استعمال کرتے ہیں۔

فلیل:

اس کو اردو میں جنگلی پودینہ اور شنا میں ''فلیل'' کہتے ہیں۔ پانی کی نالیوں کے ساتھ ساتھ یہ خودرو پودا بڑی مقدار میں اگتا ہے۔ معدے کی بیماریوں، فشار خون، سر کا چکرانا، گیس ٹربل وغیرہ کی صورت میں اس کا رس نکال کر نہار منہ پیتے ہیں۔ اسے بطور سلاد بھی استعمال کرتے ہیں۔ فلیل خشک کر کے پیس کر بھی استعمال کرتے ہیں۔ تازہ فلیل کوٹ کر چٹنی بھی بناتے ہیں۔ یہ چٹنی بھی سر درد اور چکر کے لئے بہت مفید سمجھی جاتی ہے۔

زوغی پاشا:

اس کو شنا میں ''گاؤزبان'' کہتے ہیں۔ اس کی پیداوار کا مرکز استور ہے۔ اس کا پھول، تنا اور جڑ کا عرق نکال کر خونی بیماریوں اور دل کے امراض کے علاج کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ حکیموں کے مطابق یہ جڑی بوٹی ذہنی اور جنسی کمزوریوں کو کنٹرول کرنے کے لئے بڑی مفید ہے۔ اس کے خشک پھول اور پتے سخت بخار اور دردِ دل کے لئے بہت مفید تصور کئے جاتے ہیں۔ اس جڑی بوٹی کے پتے ابال کر جو محلول حاصل ہوتا ہے اسے بطور کریم چہرے پر لگاتے ہیں۔ خصوصاً سردیوں میں عورتیں رنگت کے دوران استعمال کرتی ہیں۔ اسے کھوار میں ''بسہ پر'' کہتے ہیں۔

اسپندر:

اس کو اردو میں اسپند اور شنا میں ''اسپندر'' کہتے ہیں۔ لوگ اس کا پودا متبرک تصور کرتے ہیں۔ ریگستانی علاقوں میں اگنے والے اس خودرو پودے سے امراضِ چشم میں مبتلا اور زخمی لوگ جراثیم کشی کے لئے دھونی دیتے ہیں۔ گندی چیزوں سے الرجی (دسکر) ہونے پر بھی اسے جلا کر دھونی دیتے ہیں۔ جب تعویز پرانا ہو تو اسے بھی ''اسپندر'' کی دھونی دی جاتی ہے۔ بچوں کی پیدائش پر نومولود کے بستر وغیرہ کو بھی استعمال سے پہلے اسپندر کے دانوں سے دھونی دی جاتی ہے۔

جرو چونٹل:

اسے اردو میں ریوند چینی اور شنا میں ''جرو چونٹل'' کہتے ہیں۔ یہ بھی ایک خودرو پودا ہے۔ اس کی جڑوں کو نکال کر خشک کر کے بطورِ دوا استعمال کرتے ہیں۔ دمہ، کھانسی، ہر قسم کا بخار اور جوڑوں کے درد کے لئے بھی یہ دوا مفید ہے۔

تمورو:

اس کو اردو میں بن اجوائن اور شنا میں ''تمورو'' کہتے ہیں۔ یہ بوٹی خوشبودار اور خوش ذائقہ ہوتی ہے۔ بالائی علاقوں میں کثرت سے پیدا ہوتی ہے۔ قہوہ بنانے کے لئے لوگ اسے چائے کی جگہ پر استعمال کرتے ہیں۔ اس قہوہ میں الائچی اور دار چینی ملانے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اسے امراضِ شکم، گیس اور ہاضمہ کی خرابی کی شکایت ہونے پر بھی استعمال کرتے ہیں۔ ان علاقوں میں بیر (غنیر) کے درخت کے چھلکوں سے بھی چائے بنائی جاتی تھی۔

للیو:

اس کو اردو میں بنفشہ اور شنا میں ''للیو'' کہتے ہیں۔ یہ ایک خوبصورت پھول ہے۔ گردوں کی بیماری، ذہنی انتشار، نزلہ، زکام اور کھانسی کی صورت میں اس کے پھول اور پتے بطورِ دوا استعمال کرتے ہیں۔ ارضِ شمال کے بلند و بالا اور صحت افزا مقامات پر اس کی پیداوار ہوتی ہے۔

سئی بومہ:

اسے اردو میں موری، میٹھا زہر اور شنا میں ''سئی بومہ'' کہتے ہیں۔ استور کے بالائی علاقوں، وادیٔ نیلم اور پھلوی کے پہاڑوں اور نشیبی علاقوں میں اس کی پیداوار بہت ہوتی ہے۔ اکثر کمزور مریض اور پیٹ کے بیمار استعمال کرتے ہیں۔

مرکوچل:

یہ ایک جڑی بوٹی ہے، جسے شنا میں مرکوچل کہتے ہیں۔ اسے خشک کر کے سفوف بناتے ہیں اور زخموں پر مرہم کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ یہ خون صاف کرتا ہے۔ اس سے قہوہ بھی بناتے ہیں۔

بُرُوّ:

اس کو شنا میں ''بُرُوّ'' کہتے ہیں۔ ان علاقوں میں یہ خودرو جھاڑی عام ملتی ہے۔ بہار کے موسم میں نارنجی رنگ کے گول دانے بڑے خوبصورت لگتے ہیں۔ اس جھاڑی کی قدر و قیمت کا اندازہ یہاں کے لوگوں کو حال ہی میں ہوا ہے۔ کیونکہ جدید تحقیق کے مطابق اس جھاڑی کے بیج کو موذی امراض کے لئے مجرب دوا کی حیثیت سے بین الاقوامی سطح پر شہرت ملی ہے۔ اس کے ترش ذائقہ بیج پیٹ کا درد، جگر اور دورانِ خون کو فعال رکھنے کے لئے بطورِ دوا استعمال ہوتے تھے۔ پچھلے وقتوں میں جب چھوٹے چھوٹے بچے اس کے بیج کھاتے تو بڑے یہ کہہ کر منع کرتے کہ اس سے نہ صرف گردن پر گلہڑ ہوتے ہیں بلکہ پاگل پنے کے اثرات بھی مرتب ہوتے ہیں۔ پھیپھڑوں کی شکایات اور کھانسی میں بھی اس کے بیج بطورِ دوا استعمال ہوتے تھے۔ یہ انمول کانٹے دار جھاڑی دیوار کے اوپر بطورِ جنگلہ بھی استعمال میں لائی جاتی ہے جبکہ مختلف جگہوں پر اس سے رکاوٹی دیوار کا کام لیا جاتا۔ مال مویشی کو آزاد چھوڑ کر درختوں کو اس کانٹے دار جھاڑی سے باندھ کر حفاظت کرنے کی انوکھی حکمت عملی کا مشاہدہ بھی ان علاقوں میں کیا جاسکتا ہے۔

کُلت:

اردو میں موٹھ اور شنا میں ''کلت'' کہتے ہیں۔ دال اور ماش کے خاندان سے اس کا تعلق ہے۔ اسے لوگ کھیتوں میں کاشت کرتے ہیں۔ اس کے دانے دال کی طرح ہوتے ہیں۔ جنہیں خشک کر کے پن چکی میں پیس کر آٹا بھی بناتے ہیں اور بغیر پیسے سالن کے طور پر بھی استعمال کرتے ہیں۔ کمزور مال مویشی کے لئے یہ طاقت بخش غذا ہے۔ گردوں میں پتھری کے شکار لوگ اسے پانی میں بھگو کر چھوڑتے ہیں اور اس سے جورس حاصل ہوتا، اسے صبح شام استعمال کرتے ہیں۔ لوگ پتھری کے لئے اسے مجرب دوا تصور کرتے ہیں۔

اِشکین:

اسے شنا میں ''اشکین'' کہتے ہیں۔ یہ ایک جھاڑی دار پودے کی طرح ہوتا ہے۔ اس کی شاخوں پر چھوٹے چھوٹے گہرے نیلے رنگ کے دانے ہوتے ہیں۔ جسے بچے کھاتے ہیں جبکہ بھیڑ بکریاں اس کے پتے غذا کے طور پر بھی استعمال کرتے ہیں۔ کمر اور جوڑوں کے درد کی صورت میں اس کی جڑیں خشک کر کے پیس کر سفوف بناتے ہیں اور صبح شام مکھن، انڈے یا پانی کے ساتھ استعمال کرتے ہیں۔ جسم کے کسی حصے میں fracture ہو تو بھی اسے استعمال کرتے ہیں اور بعض دفعہ زخموں پر مرہم کے طور پر بھی لگاتے ہیں۔ روایت کے مطابق کسی شخص نے ایک چکور شکار کیا۔ چکور کی ٹانگ ٹوٹی ہوئی تھی اور ٹوٹی ہوئی ٹانگ پر ''اشکین'' کا سفوف واضح طور پر نظر آرہا تھا۔ جس کی وجہ سے ٹوٹی ہوئی ٹانگ جڑنے کے قریب تھی۔ اسی کے بعد سے fracture یا ہاتھ، پاؤں ٹوٹنے کی صورت میں اس کا سفوف بطور دوا استعمال ہونے لگا۔ گویا یہ حکمت پرندوں نے حضرت انسان کو سکھائی ہے۔

سوم:

اس کو اردو میں آسمانی بوٹی اور شنا میں ''سوم'' کہتے ہیں۔ اس کے سوئی دار پتوں سے جو گوند نکلتی ہے وہ دمہ اور دیگر بہت سی بیماریوں کے لئے بطورِ دوا استعمال ہوتی ہے، لیکن اس کے مسلسل استعمال سے فشار خون کی بیماری لاحق ہونے کا خطرہ ہوتا۔

کھکامس:

یہ بھی بیابان جگہوں پر ہوتا ہے۔ اس پودے کے پتے جمع کر کے کوٹتے ہیں اور جو پانی نکلتا ہے اسے بیمار کو پلاتے ہیں۔ عموماً پیٹ کے درد کے لئے دوائی کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ بہت کڑوا ہوتا ہے۔ شوگر اور بلڈ پریشر کے مریض بھی اکثر استعمال کرتے ہیں۔ اس کے خشک پتے اور بیج بھی ہاتھ کی ہتھیلیوں میں مسل کر پانی کے ساتھ پیتے ہیں۔

پونگ:

اسے اردو میں زعفران کاذب (قرطم) اور شنا میں ''پونگ'' کہتے ہیں۔ یہ بھی ایک پودا ہے جو کیاریوں میں کاشت کرتے ہیں۔ اس کے پھول کو علیحدہ کر کے اسے پانی میں ڈال کر جوش دلاتے ہیں۔ جو پانی نکلتا ہے، اسے نمونیہ اور دمہ کے مریض کو پلاتے ہیں۔ نمونیہ کے لئے بہت اچھی دیسی دوا ہے۔ اس کے پھول کو سردیوں میں استعمال کے لئے خشک کر کے بھی رکھتے ہیں۔ جب ضرورت پڑے تو پانی گرم کر کے جوش دلاتے ہیں اور اس سے جو پانی نکلتا ہے، اسے استعمال کرتے ہیں۔

مکھوتی:

جامنی رنگ کا ایک جنگلی پھول ہے۔ اس کے پھول اور پتوں کو پانی میں جوش دے کر جو پانی نکلتا ہے اسے بطور دوائی استعمال کرتے ہیں۔ دمہ اور نمونیہ کے لئے استعمال ہوتی ہے۔ سردیوں میں خشک کر کے استعمال کے لئے رکھتے ہیں۔

کشہ پھپھر نگ:

یہ بھی ایک قسم کا خود رو پودا ہے جو اکثر بیابان اور ویران جگہوں پر دستیاب ہوتا ہے۔ لوگ اسے بھی بطورِ دوائی استعمال کرتے ہیں۔ اگر پودے سبز ہوں تو ان کے پتے کوٹ کر جو پانی نکلتا ہے، اسے پیتے ہیں۔ یہ عموماً کیڑے مار

دوائی کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ سردیوں میں استعمال کے لئے اسے سکھا کر رکھتے ہیں۔ جب ضرورت پڑے تو اس کے خشک پتوں کو پانی میں گرم کرتے ہیں۔ جب خوب جوش آئے تو اس سے جو پانی نکلتا ہے، اسے ٹھنڈا کر کے پیتے ہیں۔ اس سے بوقتِ ضرورت ''ڈوڈو'' بھی بناتے ہیں۔

گٹرنگ:

''گٹرنگ'' بھی ایک عام سبزی نما پودا ہے۔ یہ عموماً رواں نالیوں اور چینل کے کناروں پر دستیاب ہوتا ہے۔ اس پودے اور فلیل کے خوشوں کو جمع کر کے کوٹ کر پانی نکالتے ہیں، پھر نہار منہ تھوڑا سا چینی ڈال کر پیتے ہیں۔ یہ دوا بخار کے لئے اکسیر کا کام کرتا ہے۔

کبر:

اس پودے کی شاخیں سطح زمین پر ہی پھیلتی ہیں۔ ریگستانی جگہوں اور شہری علاقوں سے باہر قبرستانوں کے احاطوں میں عام ملتا ہے۔ لوگ اس کے پھول جمع کر کے انہیں پانی میں بھگو کر چھوڑتے ہیں اور ایک دو دن کے بعد متعلقہ پانی کو چھان کر اسے گرم کرتے ہیں اور اس میں کچھ جو کا آٹا بھی ڈالدیتے ہیں۔ یہ ایک طرح کا ''ڈوڈو'' ہوتا ہے، جسے لوگ استعمال کرتے ہیں۔ بادی کے شکار لوگ اسے بطورِ دوا استعمال کرتے ہیں۔ ماہرین کے مطابق مغربی ممالک میں اس پودے سے بنایا گیا اچار مہنگے داموں فروخت ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ بھی ان گنت بیماریوں کے لئے اسے بطورِ دوا استعمال کرتے ہیں۔

شلکو:

اس کو اردو میں ملاٹھی اور شنا میں ''شلکو'' کہتے ہیں۔ اس پودے کی جڑوں کو گلے کی خرابی، کھانسی، زکام اور خرابیٔ شکم کی صورت میں بطورِ دوا استعمال کرتے ہیں۔ یہ تمباکو کو خوشبودار بنانے، بیکری پروڈکٹس کو ذائقہ دار بنانے میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ یہ خودرو پودا گلگت میں دنیور، گلمتی، سلطان آباد، جوتل، رحیم آباد، گورو، جگلوٹ، رابٹ، چھپروٹ، چھلت اور ضلع غذر میں ''چھلپی'' کے مقام پر عام ملتا ہے۔ یہ عموماً کھیتوں کے کناروں پر ہوتا ہے۔

نرستو:

اس کو اردو میں سلاجیت اور شنا میں ''نرستو'' کہتے ہیں۔ جوڑوں اور کمر کے درد کی صورت میں مکئی کے دانے کے برابر گولیاں بنا کر دودھ یا پانی کے ساتھ روزانہ استعمال کرتے ہیں۔ سلاجیت کی افادیت آج کل اور بھی بڑھ گئی ہے۔ مقامی لوگوں کے مقابلے میں بدیسی لوگ اسے زیادہ استعمال کرتے ہیں۔

دنداسہ:

اخروٹ کے درخت کے اندرونی چھلکے کو اردو میں دنداسہ اور شنا میں ''احھویی دِلو'' کہتے ہیں۔ ماضی میں زیادہ تر خواتین اس سے مسواک کا کام لیتی تھیں۔ اخروٹ کے پتے بھی اس مقصد کے لئے استعمال میں لائے جاتے تھے۔ اس کے علاوہ بادام کی گری کے سخت چھلکے (پھوٹ) کو شنا میں ''تُما'' کہتے ہیں۔ اسے جلا کر تھوڑا سا نمک بھی ملا کر ماضی میں انگلی کے ذریعے ٹوتھ پیسٹ کے طور پر استعمال کرتے تھے۔

ٹکور:

چوٹ، دھکا، ٹھیس اور ہلکی ضرب کی وجہ سے اگر جسم کے کسی حصے میں درد ہو تو ایسی صورت میں عموماً ''ٹکور'' کیا کرتے تھے۔ اس کے کئی طریقے ہیں۔ پہلا طریقہ یہ ہے کہ ایک پتھر گرم کر کے اس میں تھوڑا سا پانی چھڑکتے۔ پتھر کو اونی کپڑے میں لپیٹ کر درد والی جگہ پر لگاتے۔ دوسرے طریقے کے مطابق سرسوں کا تیل گرم کر کے اس کے اندر پسی ہوئی ہلدی ڈال دیتے اور درد والی جگہ پر لیپ کر کے اس پر پٹی کرتے۔ ''ٹکور'' کا ایک اور طریقہ یہ بھی تھا کہ نمک کے چھوٹے چھوٹے چند ٹکڑے جمع کر کے انہیں ایک سوتی کپڑے میں باندھ کر پوٹلی سی بناتے اور ایک دوسرے برتن میں سرسوں کا تھوڑا سا تیل نیم گرم کر کے اس کے اندر نمک سے بنائی گئی پوٹلی رکھ دیا کرتے۔ گھر کے کسی بھی فرد کو جب کبھی چوٹ کی وجہ سے جسم میں درد ہوتا تو متاثرہ حصے پر اس پوٹلی سے آہستہ آہستہ مارتے۔ جس سے درد ختم ہو جاتا۔ سردیوں میں بستر کو گرم رکھنے کے لئے بھی سل نما پتھر گرم کر کے کسی کپڑے میں لپیٹ کر بستر میں رکھ دیتے۔

انجئی کلہہ:

کسی کے ہاتھ پاؤں پر اگر ''انجئی کلہہ'' وغیرہ ہو تو اسے سوئی سے چھیدتے ہیں اور سوراخ میں انجیر کے پتے سے حاصل کردہ دودھ اس میں ڈالتے ہیں۔ اس طرح یہ زخم ٹھیک ہوتا ہے۔ یہ کلہہ بے جان قسم کی ہوتی ہے۔ اسے اگر کاٹ بھی دیں تو درد محسوس نہیں ہوتا۔

پیشاب بند ہونے پر عمل:

ڈومیال (حیدر پورہ) گلگت میں موجودہ گرلز ڈگری کالج کی مغربی جانب دریا کے قریب برلبِ ریور ویو روڈ ایک زیارت ہے۔ جس کے بارے میں مشہور ہے کہ جب مال مویشی کا پیشاب بند ہوتا ہے تو مالکان متاثرہ مال مویشی کو زیارت کا طواف کراتے ہیں۔ جس سے دورانِ طواف ہی معمول کے مطابق

پیشاب آنے لگتا ہے۔ اس زیارت میں دفن کونسی بزرگ شخصیت ہے، اس کے بارے میں تو کچھ پتہ نہیں لگ سکا البتہ بعض روایات کے مطابق دریائے گلگت میں 1905ء کے تاریخی سیلاب کے دوران بھی یہ جگہ خشک رہی۔ جس کی وجہ سے لوگوں نے یہ خیال کیا کہ اس جگہ پر کسی بڑے بزرگ کا مدفن ہے اور شاید اسلئے یہ سیلاب سے بھی متاثر نہیں ہوئی۔ حالانکہ اس سیلاب کے دوران مضافاتی مقامات بری طرح متاثر ہوئے تھے اور دریائے گلگت کا پل بھی بہہ گیا تھا، مرکزی جامع مسجد اہل سنت کے متصل موجودہ لکڑی کا پل بھی 1905ء کے بعد تعمیر ہوا۔ جو آج تک اپنی جگہ پر قائم ہے۔ اسی زمانے سے یہ جگہ بطورِ زیارت مشہور ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ زیارت پیشاب بند ہونے کی شکایت کے ازالہ کے لئے مشہور ہوگئی۔

لوک علاج کے ٹوٹکے:

☆ جب کبھی کسی کے ہاتھ پاؤں یا جسم کے بیرونی حصے پر ہلکے زخم کی وجہ سے خون بہتا تو سوتی کپڑے کی ایک پٹی کے برابر ٹکڑا جلا کر اس سے حاصل کردہ گرم راکھ زخم پر رکھ کر انگلی سے دبانے سے خون بند ہوتا اور چند دنوں کے بعد زخم ٹھیک ہوجاتا ہے۔ بعض دفعہ معمولی خراش کی وجہ سے خون بہنے کی صورت میں مٹی کی دیوار سے پاک صاف مٹی کی ایک چٹکی زخم پر لگائی جاتی ہے تو خون بند ہوجاتا ہے۔

☆ ہاتھ پاؤں یا جسم کے کسی حصے پر چوٹ کی وجہ سے شدید درد ہو تو ایسی صورت میں نیم گرم سرسوں کے تیل میں ہلدی اور تھوڑا سا نمک ملاتے اور متاثرہ جگہ پر لگا کر کسی صاف سوتی کپڑے سے پٹی کرتے ہیں تو درد ٹھیک ہوجاتا ہے۔

☆ جب بچوں کی زبان لکنت کا شکار ہوتی تو انہیں عموماً قربانی کے لئے ذبح شدہ سات جانوروں کی زبان کا ایک ایک ٹکڑا حاصل کرکے جمع شدہ ساتوں ٹکڑے پکا کر متاثرہ بچے کو کھلا دیتے۔ لوگوں کا خیال ہے کہ اس طرح کرنے سے زبان کی لکنت ختم ہوتی ہے۔ بعض دفعہ متاثرہ بچے سے ندی نالے سے رکاوٹیں دور کرواتے۔ لوگوں کے مطابق اس طرح کرنے سے بھی لکنت دور ہوجاتی ہے۔

☆ جنگلی پودینہ، گٹرنگ اور ہت مونلو کے خوشے جمع کرکے اسے کوٹ کر پانی نکالتے۔ رات کو یہ پانی کسی برتن میں کھلے آسمان تلے چھوڑتے اور لگاتار بخار کی شکایت کرنے والے بیماروں کو ایک چمچ نہار منہ پلاتے۔

☆ سردیوں میں شدید سردی اور خشکی سے اگر ہاتھ منہ پھٹ جائیں اور جلد کھردری ہو تو کڑوی گری چبا چبا کر متاثرہ ہاتھ اور منہ پر مل لیتے تو جلد ٹھیک ہوتی۔ اسکے علاوہ دودھ کی بالائی بھی ہاتھ منہ پر بطورِ کریم لگاتے۔

☆ اگر آنکھ میں تنکا جیسا نظر آئے تو کہتے ہیں کہ ''تھئی اچھی یر پھک ہن'' یعنی تمہاری آنکھ میں تنکا ہے۔ ایسی صورت میں تھوڑا نبات شکر (مصری) پیس کر اسے چھان کر کے متاثرہ آنکھ میں ڈالتے اور اس کے اوپر کھڑی فصل سے اوس کے چند قطرے حاصل کرکے ڈالتے تو عموماً آنکھیں ٹھیک ہوجاتیں ہیں۔

☆ اگر آنکھ پر کسی چیز سے چوٹ آئے تو متاثرہ شخص کا رخ آسمان کی طرف کرکے لٹا دیا جاتا ہے اور بلاواسطہ کسی بکری کے تھنوں سے متاثرہ آنکھ میں خوب دودھ ٹپکایا جاتا ہے تو آنکھ ٹھیک ہوجاتی ہے۔ بعض دفعہ عورت کے پستان سے بھی براہ راست متاثرہ آنکھ میں دودھ ٹپکایا جاتا ہے۔ آنکھ دکھنے کی صورت میں نمک کا ڈھیلا نیم گرم کرکے تھوڑی دیر متاثرہ آنکھ پر رکھتے جس سے آنکھ ٹھیک ہوجاتی۔

☆ دیسی برف کوٹ کر دست زدہ مرد عورتوں اور بچوں کو خوب کھلاتے، جس سے متاثرہ لوگ ٹھیک ہوجاتے ہیں۔

☆ اگر ہاتھ یا پاؤں کی انگلی میں شدید درد ہو اور اس میں پیپ جمع ہو تو اس میں سرخ رنگت والی گائے کا گوبر گرم کرکے متاثرہ انگلی پر لگا کر سوتی کپڑے سے باندھ دینے سے اگلے دن متاثرہ انگلی کا سارا پیپ اور فاضل مواد نکل جاتا ہے اور انگلی ٹھیک ہوجاتی ہے۔ اگر کبھی کسی کی انگلی اس طرح درد کا شکار ہو تو شنا بولنے والے لوگ کہتے ہیں کہ ''مئی ہگئی ینٹ بین''۔

چشموں کے پانی سے علاج:

ان علاقوں میں گرم اور ٹھنڈے پانیوں کے چشمے جگہ جگہ موجود ہیں۔ چشموں کو شنا میں ''اُنچ'' کہتے ہیں۔ لوگ مختلف بیماریوں کے علاج کے لئے ان چشموں سے فیضیاب ہوتے ہیں۔ ذیل میں چند مشہور چشموں کا تذکرہ کیا جاتا ہے۔

تتہ پانی:

چلاس میں رائیکوٹ کے قریب برلبِ سڑک ابلتے پانیوں کے بہت سے چشمے ہیں۔ جوڑوں کا درد ہو تو لوگ ان گرم چشموں کے پانی سے نہاتے ہیں اور ٹھیک ہوتے ہیں۔ اسی طرح کا ایک چشمہ مشکن استور میں بھی ہے۔ رائیکوٹ اور مشکن کے ان تمام چشموں کا منبع ماہرین کے مطابق ایک ہے۔

بڑولس:

بڑولس (نگر) میں بھی گرم پانی کے چشمے ہیں۔ زیادہ تر گرما کے موسم میں لوگ جوق در جوق ان چشموں کا رخ کرتے ہیں۔ عموماً صاف موسم میں غسل کا اہتمام کرتے ہیں۔ جوڑوں کا درد، بادی اور جلدی بیماریوں کے لئے لوگ ان چشموں کو موثر دوا تصور کرتے ہیں۔

شروٹ کا چشمہ:

سردرد، جوڑوں میں درد، دانے اور جسم میں پھوڑے پھنسیوں کی

صورت میں اس چشمے پر جا کر غسل کرتے ہیں اور ٹھیک ہو جاتے ہیں۔

دماس کا چشمہ:

دماس (ضلع غذر) کے قریب ''بنیو انخ'' کے نام سے ایک چشمہ ہے۔ اس چشمے کا پانی ہاضمہ کے مریض پیتے ہیں۔ بعض روایات کے مطابق اگر بے اولاد اس چشمے سے پانی پی لیں تو بچے پیدا ہوتے ہیں۔

گرونجر کا چشمہ:

''نراتھون انخ'' کے نام سے گرونجر (ضلع غذر) میں ایک چشمہ ہے، جو جوڑوں کے درد کے لئے مفید بتایا جاتا ہے۔ مرتضیٰ آباد (ہنزہ) کے قریب برلب سڑک ایک جگہ ہے جہاں کی گرم گرم ریت پر جوڑوں اور ہڈیوں کے درد کے شکار لوگ اپنی ٹانگیں یا سر کے علاوہ پورا جسم اس میں دفن کر کے تھوڑی دیر کیلئے بیٹھتے ہیں۔ لوگوں کے مطابق ایسا کرنے سے درد ٹھیک ہوتا ہے۔

شولجہ (اشکومن) کے چشمے کا پانی جس سے پتھر بنتے ہیں

شولجہ، اشکومن (ضلع غذر) میں ایک چشمہ ہے۔ لوگوں کے مطابق اس چشمے کے پانی سے پتھر بنتے ہیں اور یہ پتھر تیشے سے تراشے بھی جا سکتے ہیں۔ ان پتھروں کو دیواروں پر بھی چنتے ہیں۔ جب کبھی بارش کی وجہ سے دیوار پر پانی لگے تو اس کی نمی سے یہ پتھر آپس میں اس طرح جڑ جاتے ہیں جیسے ویلڈنگ کر کے جوڑے گئے ہوں۔

سنگ جراحت:

سنگِ جراحت کو شنا میں ''ناسوری بھٹ'' (بٹی نار) کہتے ہیں۔ خراموش اور بگروٹ میں یہ پتھر ملتا ہے۔ یہ پتھر نرم ہوتا ہے۔ اسے پیس کر ناسور کے زخموں پر لگاتے ہیں۔ جسم پر نکلنے والے دوسرے پھوڑوں پر بھی اس کا سفوف بطورِ دوا استعمال کرتے ہیں۔

جوڑوں کا اپنی جگہ سے ہلنا اور فریکچر زدہ لوگوں کا لوک علاج

جب کبھی کسی شخص کے جسم کے کسی حصے کا جوڑ اپنی جگہ سے کھسک جاتا ہے یا کہیں فریکچر ہوتا ہے تو ایسی صورت میں مقامی طبیب روایتی لوک طریقے سے ان کا علاج کرتے ہیں۔ یہ طبیب کسی ادارے سے تربیت یافتہ تو نہیں ہوتے لیکن اس کے باوجود ان کی یہ حکمت عملی بڑی موثر ہوتی ہے۔ یہ طبیب اپنی جگہ سے ادھر ادھر ہونے والے جوڑوں کو کھینچ تان کر اصلی جگہ پر لاتے ہیں۔ عموماً چپٹی نما لکڑیاں فریکچر زدہ بازو کے اردگرد رکھ کر پٹی کے ذریعے انہیں مخصوص طریقے سے باندھ دیتے ہیں اور پٹی کے اوپر انڈے کی سفیدی کے ساتھ گندم کے آٹے کا محلول بنا کر لگاتے ہیں۔ جوان آدمی کی صورت میں ٹھیک ہونے کے لئے 15 دن جبکہ بوڑھوں کی صورت میں 20 یا 21 دن لگتے ہیں۔ اس طرح بازو کی حرکت کی صورت میں بھی فریکچر زدہ جگہ متاثر نہیں ہوتی۔



ہلے ہوئے جوڑ درست کرنے کا روایتی طریقہ

پاؤں کا ٹخنہ اگر اپنی جگہ سے کھسک جاتا ہے تو اسے اپنی اصلی جگہ پر لانے کے لئے جو طریقہ استعمال کرتے ہیں وہ بڑا دلچسپ ہے۔ زمین پر ایڑی کے سرکل کے عین مطابق گھڑا بنا کر اس میں متاثرہ پاؤں کی ایڑی رکھتے ہیں اور اس کے بعد طبیب اپنا پاؤں متاثرہ شخص کے پاؤں پر رکھ کر ماہرانہ حرکت کرتا ہے۔ جس کی وجہ سے ٹخنہ اپنی جگہ پر واپس آتا ہے اور متاثرہ شخص چلنے لگتا ہے۔ ایک اور طریقے سے بھی پاؤں کے متاثرہ ٹخنے کو ٹھیک کرتے ہیں۔ زمین پر لکڑی کے بڑے کیل ٹھونک کر ایک کپڑے کو بطورِ پٹی متعلقہ پاؤں اور لکڑی کے کیل پر باندھ کر کچھ دیر کھینچا تانی کر کے ٹخنے کو اپنی اصلی جگہ پر لاتے ہیں۔ البتہ اس موقع پر درد کی وجہ سے بیمار کو کافی تکلیف ہوتی ہے۔ ایسے مواقع پر طبیب بیمار کو ہدایت کرتا ہے کہ نمی کی جگہ پر ننگے پاؤں نہ چلے۔ متاثرہ پاؤں پر پانی نہ ڈالے اور تھوڑا ریسٹ کرے۔ اس طرح کا لوک علاج طبیب مال مویشی کا بھی کرتے رہے ہیں۔

پھیولو بڑیجونک (کندھے کا درد):

کسی شخص کے کندھے کی کنگی میں اگر درد وغیرہ ہو تو کہتے ہیں کہ ''تھئی پھیولو بڑیلن'' جس کے لفظی معنی ہیں ''تمہارے کندھے کی کنگی ڈوب گئی ہے'' یعنی تمہارے کندھے کا جوڑ ہل گیا ہے۔ لوگوں کے مطابق ایسی صورت میں متاثرہ اشخاص نہار منہ آڑو کے درخت کی شاخوں کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر لٹکنے سے ٹھیک

ہوتے ہیں۔ بعض دفعہ متاثرین ماہر لوگوں سے رجوع کرتے ہیں تو ماہرین متاثرہ شخص کی قمیض اتروا کر کندھے کی پشت کی کنگی کو پکڑتے ہوئے اس کے ہاتھ بازو کو مختلف زاویے پر لے جاتے ہیں۔ یہ عمل دو تین بار کرنے سے متاثرہ لوگ ٹھیک ہوتے ہیں۔

دانت کے درد کا لوک علاج:

جب کسی کے دانت میں شدید درد ہوتا ہے تو ایسی صورت میں کسی عامل سے رجوع کرتے ہیں۔ عامل ایک چٹ پر کچھ لکھ لیتا ہے اور دانت کے درد کے شکار فرد سے کہتا ہے کہ وہ متاثرہ دانت کو انگلیوں سے پکڑے۔ عامل متعلقہ چٹ کسی ستون پر رکھ کر مخصوص جگہ پر کیل ٹھونکتا ہے اور دانت کے بیمار سے کہتا ہے کہ میں نے تیرے متاثرہ دانت پر کیل ٹھونک دیا ہے اب درد ٹھیک ہوگا۔ لہٰذا اس عمل سے دانت کا درد جاتا رہتا ہے۔ اس عمل کو ''دونیچ کِلہ دونک'' یعنی دانت پر کیل ٹھونکنا کہتے ہیں۔

دم درود، تعویذ، ٹونے ٹوٹکے

جب کبھی لوک علاج سے مریض کو افاقہ نہیں ہوتا تو لوگ منتیں مان کر مختلف زیارتوں کا رخ کرتے ہیں۔ صدقہ، خیرات، دم، درود اور ٹونے ٹوٹکے وغیرہ بڑے اہتمام کے ساتھ کیا کرتے تھے۔ تعویذ کا رواج بھی ان علاقوں میں عام تھا۔ تعویذ کا غلاف تکون، چوکور، مستطیل وغیرہ کی شکل میں بناتے اور انہیں گلے، بازو، سینے، ٹوپی یا شانے کی پشت پر لٹکاتے۔ اہم تعویذ چاندی یا چمڑے کے خصوصی خول میں ڈال کر لٹکاتے جبکہ عام تعویذ کے کور کے لئے کپڑا استعمال کرتے۔ گھوڑوں کے علاوہ بعض مال مویشی بالخصوص دودھ دینے والے جانوروں کے گلے میں بھی کوئی نہ کوئی تعویذ ضرور باندھتے ہیں۔ دشمن دار لوگ ''تک بندی'' کا تعویذ بنوا کر اس پر چمڑے کا کور چڑھاتے اور بازو پر باندھتے اور ہر وقت اسے اپنے ساتھ رکھتے۔ لوگوں کا عقیدہ ہے کہ جو شخص تک بندی کا تعویذ باندھے اس پر دشمن کا کوئی بھی وار کارگر نہیں ہوتا۔ حتیٰ کہ گولی بھی اثر انداز نہیں ہوتی۔ تک بندی کے تعویذ کا معاوضہ بھی عامل خوب وصول کرتے ہیں۔ بعض لوگ ایک دوسرے کو نیچا دکھانے، نقصان پہنچانے اور عشق و محبت کے معاملات کے حل کے لئے بھی پیشہ ور عاملین کی خدمات حاصل کرتے ہیں۔ اخوند اور دینل حضرات دونوں تعویذ اور ٹوٹکے کرتے ہیں۔ ان دونوں کے مابین عملیاتی چشمکیں بھی دیکھنے میں آتیں ہیں۔ اخوند حضرات تعویذ بنانے کے لئے عموماً فارسی کتاب ''مجموعۃ دعوات الکبیر'' اور دیگر کتابوں سے استفادہ کرتے۔

ٹونے ٹوٹکے:

☆ ماضی میں ان علاقوں میں جادو اور سحر کا رواج بھی عام تھا اور لوگ اس کے اثرات پر یقین رکھتے تھے۔ عشق و محبت میں کامیابی، دشمن کی تباہی، رزق میں کشادگی، اولاد کی خواہش کی خاطر جادو، سحر اور دوسرے عملیات عاملوں سے کرائے جاتے۔ ایک روایت کے مطابق ہنزہ کے حکمران جادو اور سحر کے زور سے جب چاہتے بارش برساتے تھے۔ گھر کے کسی فرد کی بیماری چند دن طول پکڑے تو اہلِ خانہ فوراً گائے بیل یا بکری حسبِ حیثیت بطورِ صدقہ ذبح کر کے گوشت اہلِ محلّہ تقسیم کرتے ہیں تاکہ ان کے اس عمل سے اللہ راضی ہو کر بیماری سے نجات دے۔

☆ جب کوئی شخص مسلسل بیمار رہنے لگتا تو اس کے رشتہ دار کسی عامل سے رجوع کرتے۔ عامل سات مختلف رنگوں کے دھاگے سے ایک ڈوری بناتا جو بیمار کی گردن میں ڈال دی جاتی۔ اس طرح بیمار ٹھیک ہو جاتا۔

☆ بعض دفعہ کچھ لوگوں کے بچے پیدا ہوتے ہی یا کچھ عرصے بعد متواتر لقمہ اجل بن جاتے ہیں اور بچنے کا نام نہیں لیتے تو ایسی صورت میں اولاد سے محروم لوگ ''صبیان'' کے تعویز کے لئے عاملوں سے رجوع کرتے ہیں۔ ''صبیان'' مقامی لوگوں کے مطابق ایک پری زاد عورت کا نام ہے۔ عاملین یہ تعویز بنا کر بھاری رقم وصول کرتے ہیں۔ کیونکہ ان کا کہنا ہے کہ اس طرح کے تعویز بنانے سے ''صبیان'' کی پری ناراض ہوتی ہے اور عامل کو بھاری نقصان پہنچاتی ہے اور بعض دفعہ ان (عاملین) کی یا ان کی اولاد کی جان لینے سے بھی دریغ نہیں کرتی۔ اسی لئے عاملین عموماً صبیان کا تعویز کرنے سے گریز کرتے ہیں۔ ہر کسی کے لئے یہ تعویذ نہیں بناتے۔ عامل حضرات بعض دفعہ کالی یا سفید رنگت کی مرغی صدقہ کرنے کا تقاضا کرتے۔ الغرض تعویذ کا طلبگار عامل کا ہر تقاضا پورا کرتا۔ اگر مرض شدید ہو اور بیمار شخص صاحب ثروت بھی ہو تو بکرا، گائے اور بیل تک صدقہ کرنے کا تقاضا کیا جاتا۔ یہ سلسلہ مکمل ختم تو نہیں ہوا ہے لیکن کم ضرور ہوا ہے۔

گنو:

گنونک شنا زبان میں باندھنے کو کہتے ہیں۔ لفظ ''گنو'' اسی کا اسم ہے۔ یہ ایک منتر ہے۔ ''گنو'' یا درگنی منتر کے ذریعے کسی عمل یا چیز کو باندھتے ہیں۔ گویا یہ ایک منفی عمل ہے۔ اس میں جن بھوت کو باندھنا، اولاد کی پیدائش کے عمل کو باندھ کر کسی عورت کو بانجھ کرنا، پن چکی کو باندھ کر اس کے پاٹ کی حرکت کو بند کرنا، پریوں کو باندھ کر تابع بنانا، زراعت کے عمل کو باندھ کر فصلوں کو نقصان پہنچانا، باغبانی اور غلّہ بانی کے عمل کو باندھنا، بخت، اقبال اور عقل کو باندھنا اور

مخالف ٹیم کے کھلاڑیوں کو باندھنا وغیرہ شامل ہیں۔ اگر کسی آدمی یا اس کی خواہش وغیرہ کو قید یا محدود کرنا مقصود تو کاہن ''گنو'' کے منتر کو پڑھ کر پتھر پر پھونکتا ہے اور منتر زدہ پتھر کو متعلقہ آدمی کی طرف پھینکتا ہے جس سے اس پر منفی اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ اگر کاہن دوبارہ یہی عمل ''ویو'' کا منتر پڑھ کر کرے تو متاثرہ شخص پر مثبت اثرات ہوتے ہیں اور وہ اپنی اصلی حالت پر آتا ہے۔ بعض دوسرے پیشہ ور اور شکم پرست عاملین بھی یہ منفی عمل کرتے ہیں۔ روایت ہے کہ ایک کاہنہ عورت کو ان کے جن زاد اور پری زاد مؤکلین نے گنو کا جو منتر (بزبان شنا) سکھایا۔

گنو کا منتر:

گنم گنم ترخانیّ زُولی گنم، زُولیّ هزُولی گنم، یُونیّ گنولی گنم، پائیّ پرونی گنم، جن دولوك گنم، ٹپ فلیل گنم، جن جانور گنم، اش پیّ چھورو گنم، رکُنیّ گوکو گنم، ایژیّ اُرن گنم، اَیی چھال گنم، تُمه کیّ سلو گنم، بُنیّ شره گنم، نیلی جُت گنم، شریلای شنی گنم، دیواکیّ چھیّ گنم، چے یے چاترے جو گنم، مُشا بِرگاہ جو گنم، دیواکیّ پون گنم، هگای تارے گنم، بردی یی بتھای گنم، ست کھیپ پریانے گنم، هولیّ سر گنم، سریّ نستای گنم، یُوجنیّ بتھیلی گنم، بتھیلیّ چھیّ گنم، سمُیّ سُمادنگ گنم، جُو جانور گنم، سونی سرپلوئك گنم، ست کھیپ برای گنم، ڈڈنگ اَیّ ڈم گنم، کھٹ ٹے داس گنم، هُنٹے رُنگ گنم، چھِن چلی گنم، نِیلِه نستای گنم، جونیّ آنی گنم، ترویی مسو گنم، ترخانیّ یُدینی گنم، یُدینیّ هزُولی گنم، گوی بسوئے گنم۔''

ترجمہ:

باندھونگا، باندھونگا ترخان (گلگت کا ایک حکمران) کی شہزادی زولی کو باندھونگا، زولی کی بیٹی هزُولی کو باندھونگا، چاند (پری) کی بیٹی گنولی کو باندھونگا، کفِ پا باندھونگا، زیر زمین جن کو باندھونگا، تمام کیڑے مکوڑے باندھونگا، جن جانور باندھونگا، گھوڑی کا بچھیرا باندھونگا، گدھی کا بچہ باندھونگا، بھیڑ کا بچہ باندھونگا، بکری کا بچہ باندھونگا، بندوق کی نالی باندھونگا، جنگل کا مارخور باندھونگا، ہرے بھرے چراگاہ باندھونگا، پریوں کے مسکن کو باندھونگا، جن بھوت کے مراکز کو باندھونگا، حاملہ عورتوں کو باندھونگا، مرد کو جھگڑوں سے باندھونگا، جنات کے راستوں کو باندھونگا، آسمان کے تاروں کو باندھونگا، زمین کے خس وخاشاک کو باندھونگا، سات سو پریوں کو باندھونگا، سمندر کے ابلتے چشموں کو باندھونگا، چشموں کے نکاس کی جگہوں کو باندھونگا، دیامر (ننگا پربت) میں واقع پریوں کا قلعہ باندھونگا، پریوں کے قلعے کی چابی کو باندھونگا، زمین کا جن (سادنگ) کو باندھونگا، تمام جانور باندھونگا، زمین کے اوپر سونی (جن) کو باندھونگا، پریوں کی سات سو بیٹیوں کو باندھونگا، ڈھول کی آواز باندھونگا، مشرقی جانب واقع میدان باندھونگا، مغربی جانب واقع چراگاہ باندھونگا، تمام چلی کے درختوں کو باندھونگا، پریوں کے سبز جھنڈے باندھونگا، سانپ کا منہ باندھونگا، بانسری کی آواز باندھونگا، ترخان کی یُدینی (ڈھول) باندھونگا، یُدینی کی هزولی باندھونگا، گائے کے بچھڑوں کو باندھونگا۔

وِیوّ:

وِیوّ شنا زبان میں کھولنے کو کہتے ہیں۔ لفظ ''وِیوّ'' اسی کا اسم ہے۔ گنوّ کے ذریعے باندھی ہوئی چیزوں کو ''وِیوّ'' کے ذریعے کھولتے ہیں۔ گویا یہ ایک مثبت عمل ہے۔ دینل ہر قسم کی بندھی ہوئی چیزوں کو منتر کے ذریعے کھول دیتا ہے۔ چاہے یہ عمل گنوّ کی ہو یا بھوت پریت کی۔ ''وِیوّ'' دوسرے عاملین بھی کرتے ہیں۔ مذکورہ بالا کاہنہ عورت کو اس کے مؤکلین نے ''ویوّ'' کا جو منتر سکھایا۔

ویو کا منتر:

ویم ویم ترخانیّ زولی ویم، یعنی کھولونگا کھولونگا ترخان (گلگت کا ایک حکمران) کی شہزادی زولی کو کھولونگا۔۔ اور ''مُتِه مُتِه ترخانیّ زولی مُته'' یعنی ترخان کی زولی کی جان خلاصی ہوگئی وغیرہ۔ ویوّ کی صورت میں گنم گنم (باندھونگا باندھونگا) کی بجائے ویم ویم (کھولونگا کھولونگا) اور مُتِه مُتِه (جان خلاصی ہوگئی جان خلاصی ہوگئی) آخر تک لگا کر حسبِ ترتیبِ منترِ گنوّ پڑھتے ہیں۔ مذکورہ عملیات کے علاوہ مختلف قسم کے ٹونے ٹوٹکے بھی کیا کرتے، جن میں سے چند ایک کا ذکر ذیل میں کیا جاتا ہے:-

ثورَے چھنونگ (چھوٹے سر اور بڑے جسم والے بچوں کا علاج):

جب بچے کا سر بڑا اور جسم چھوٹا ہو تو ایسے بچوں کے لوک علاج کا ایک طریقہ یہ ہے کہ انجیر کی ہری تین نازک شاخیں تقریباً ایک فٹ لمبائی کی اپنے ساتھ

لے جاتے ہیں۔ عامل ان نازک شاخوں اور بیمار دونوں پر دم کر کے پھونکتا ہے۔ بیمار بچے کے ساتھ جو سرپرست یا رشتہ دار ہوتا ہے اس سے عامل پوچھتا ہے کہ ''مس تھئی دھی یا پچی ثورے چھنہ ما'' یعنی کیا میں تمہارے بچے کا ''ثورے چھونک'' کا عمل انجام دوں؟ بچے کا سرپرست یا رشتہ دار اثبات میں جب سر ہلاتا ہے تو عامل ان چھڑیوں کو ایک ایک کر کے تیز دھار والے چاقو سے کاٹتا ہے۔ اس طرح یہی عمل تین دفعہ کر کے عامل ہر چھڑی/شاخ کے تین تین ٹکڑے کرتا ہے۔ یہ عمل بھی بلا ناغہ تین جمعہ مبارک کے دنوں تک مسلسل کیا جاتا ہے۔ ماضی میں یرقان (کامل) کے شکار بچے یا بڑے بھی عامل سے یہی عمل کراتے تھے۔ آج کل یہ طریقہ علاج تقریباً ختم ہو چکا ہے۔

دال جھوّ تھوئنک (ڈر اور خوف کا علاج):

جب چھوٹے یا بڑے کسی خوفناک چیز کو دیکھ کر یا کسی اور وجہ سے ڈر گئے ہوں اور اسی خوف و ڈر کی وجہ سے دن بدن بیمار اور کمزور ہو رہے ہوں تو ایسی صورت میں متاثرہ شخص کے سر پر کپڑا یا چادر وغیرہ اس طرح ڈالتے ہیں کہ اس سے بدن بھی ڈھنپ جائے۔ اس کے بعد اس کے سر پر ایک برتن جس میں ٹھنڈا پانی ہوتا ہے، ہاتھوں کی مدد سے رکھ دیتے ہیں۔ سر پر رکھے ہوئے اس ٹھنڈے پانی کے برتن میں گرم گرم راکھ ڈال دی جاتی ہے۔ گرم گرم راکھ ٹھنڈے پانی میں پڑنے سے جو آواز پیدا ہوتی ہے اسے شنا میں ''جھو'' کہتے ہیں جبکہ راکھ کو دال کہتے ہیں۔ اسی لئے اس عمل کا نام ''دال جھو تھوئنک'' پڑا۔ اس راکھ زدہ پانی کو متاثرہ شخص کے گھر کا کوئی فرد کسی ایسی مرکزی جگہ پر جہاں سے مختلف سمت تین راستے جاتے ہوں، برتن سمیت الٹا کے رکھ دیتا ہے اور راکھ کو متعلقہ مرکزی جگہ پر بکھیر دیتا ہے اور اگلی صبح اسی جگہ سے برتن اٹھا کر گھر لے آتا ہے۔ یہ عمل مسلسل تین دنوں تک عموماً رات کے وقت کرتے ہیں۔ متعلقہ شخص جب رات کو یہ عمل کر کے گھر واپس لوٹتا ہے تو متاثرہ شخص کے دونوں کانوں میں باری باری تین دفعہ ''سوسو'' کرتا ہے۔ لوگوں کے خیال کے مطابق خوف اور ڈر کے شکار لوگ یا بچے اس طرح ٹھیک ہوتے ہیں۔

تائک دوئک (آگ سے داغنا):

آگ سے داغنے کے عمل کو شنا میں ''تائک دوئک'' کہتے ہیں۔ Romex spp کی ایک خودرو جڑی بوٹی جو ان علاقوں میں عام ملتی ہے۔ مقامی زبان میں اسے ''ھبابل'' کہتے ہیں۔ ''ھبابل'' کی ڈنڈی کے اندر کا تھوڑا سا مغز حاصل کرتے ہیں، جسے عرفِ عام میں ''کھاپ'' کہتے ہیں۔ جسم کے کسی حصے کے جوڑوں میں درد ہو تو متاثرہ جگہ پر ''کھاپ'' کی معمولی سی مقدار علامتی طور پر رکھ دیتے ہیں اور پلک جھپکنے میں ''کھاپ'' پر آگ رکھ کر اٹھاتے ہیں۔ جس سے متعلقہ جگہ پر داغ بنتا ہے۔ لوگوں کا خیال ہے کہ اس طرح درد ٹھیک ہوتا ہے۔ آگ سے داغنے کا یہ عمل کوئی ماہر ہی کرتا ہے۔ یہ ہر کسی کے بس کی بات نہیں۔ یرقان (کامل) کی صورت میں متاثرہ شخص کی ناک کی لو پر انگوٹھا رکھ کر اسی ہاتھ کی انگشتِ شہادت سیدھا پیشانی کی جانب پھیلاتے ہیں۔ انگشتِ شہادت کا سرا پیشانی کے جس مقام کو چھوتا ہے۔ اسے مرکز مان کر اس پر ''کھاپ'' رکھ کر علامتی طور پر آگ لگاتے ہیں۔ لوگوں کا خیال ہے کہ اس طرح کرنے سے یرقان کے مریض ٹھیک ہو جاتے ہیں۔

ھھر دوئک (نشتر):

نشتر دینے کے لوک طریقے کو مقامی زبان میں ''ھھر دوئک'' کہتے ہیں جبکہ جس تیز دھار آلے یا استرہ کے ذریعے نشتر دیتے ہیں اسے ''ھھر دونی'' کہتے ہیں۔ جب کبھی کوئی شخص پورے یا نصف سر کے درد کا شکار ہو تو لوگ کہتے ہیں کہ تمہارا خون جم کر موٹا ہو گیا ہے اور دورانِ خون کے نظام کی خرابی کی وجہ سے سر درد ہو رہا ہے۔ لہٰذا مریض کو لوگ مشورہ دیتے ہیں کہ وہ نشتر دے کر فاسد اور جما ہوا خون خارج کرائے۔ ایسی صورت میں مریض کسی ماہر آدمی سے رجوع کرتا ہے تو ماہر ایک تیز دھار استرہ کے ذریعے مریض کی پیشانی یا بازو کی کسی رگ پر کاری ضرب لگاتا ہے اور متعلقہ جگہ سے کافی مقدار میں خون بہنے دیا جاتا ہے۔ اس کے بعد زخم پر کچھ دیر روئی رکھ کر دبانے سے خون بند ہو جاتا ہے۔ نشتر پیشانی پر دینا ہو تو مریض کے گلے میں پھندا ڈال کر دباتے ہیں تو پیشانی کی رگیں واضح ہو جاتی ہیں جبکہ بازو کی صورت میں مطلوبہ جگہ کے آگے اور پیچھے ہاتھوں سے دبانے سے رگیں صاف طور پر نظر آتی ہیں۔ اس طرح نشتر دینے کے عمل میں آسانی ہوتی ہے۔

مردہ سپ بوئنک (سوکھے کی بیماری):

جب بھی بچے کسی نامعلوم بیماری کے سبب سوکھ کر کانٹا ہوتے تو کہا کرتے کہ بچہ ''مردہ سپ'' ہو گیا ہے۔ ایسی صورت میں کسی عامل سے رجوع کرتے۔ عامل ایک ہاتھ کی لمبائی اور تقریباً 3 انچ چوڑائی کے برابر لکڑی کی تختی بناتا اور اس پر کچھ لکھتا۔ مذکورہ لکھی ہوئی تختی عامل کی ہدایات کے تحت کسی پرانے قبرستان کے اندر ڈال دیتے۔ لوگوں کا عقیدہ تھا کہ اس طرح بچے صحت مند ہوتے ہیں۔ یہ عمل تین جمعہ مبارک کے دنوں تک بلا ناغہ کرتے۔ گھر کا کوئی فرد یا قریبی رشتہ دار مذکورہ تختی قبرستان میں پھینکتا۔ لکڑی کی تختی پھینکنے والا شخص شام تک بیمار بچے سے نہیں ملتا لیکن جب شام کے بعد اس سے ملاقات کرتا ہے تو اس کے دونوں کانوں میں تین دفعہ پھونکتا۔ (یعنی ''سوَ....سوَ'' کرتا) ہے۔ اس طرح کے بیمار بچوں کے لئے بعض دفعہ ایک اور ٹوٹکہ بھی کرتے ہیں۔ وہ یہ کہ جمعہ کے دن کچے

دھاگہ سے کسی قبر کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک ناپ کر کے متعلقہ دھاگے کو تہہ در تہہ لپیٹ کر بچے کے گلے کے ناپ کے برابر کر کے اس کے گلے میں باندھ دیتے ہیں۔ اگلے جمعہ کو یہ دھاگہ بچے کے گلے سے اتارتے ہیں اور قبرستان میں پھینک کر پھر دوسرے دھاگے سے نیا ناپ لے کر حسب سابق بچے کے گلے میں باندھ دیتے ہیں۔ یہ عمل بھی تین جمعہ مبارک کے دنوں تک بلا ناغہ سرانجام دیتے ہیں۔ مردہ سپ ہونے کی صورت میں بعض دفعہ متاثرہ بچے کو ترازو کے ایک پلڑے میں رکھتے جبکہ دوسرے پلڑے میں ردی کے بوٹ اور چپل وغیرہ جمع کر کے بچے کے وزن کے برابر رکھ دیتے اور اس کے بعد بوٹ آنکھوں سے اوجھل کسی دور مقام پر پھینک دیتے۔ یہ عمل مسلسل تین جمعہ مبارک کے دنوں میں کرتے ہیں۔ لوگوں کے خیال کے مطابق اس طرح بیمار بچے ٹھیک ہو جاتے۔ لال رنگ کی گائے کا تازہ گوبر جمع کر کے ترازو کے ایک پلڑے میں رکھتے جبکہ دوسرے پلڑے میں ''مردہ سپ'' بچے کو رکھ دیتے۔ اسی طرح اس گوبر کو بھی آنکھوں سے اوجھل کسی دور مقام پر پھینک دیتے۔ اس عمل سے بیمار بچے لوگوں کے خیال کے مطابق ٹھیک ہو جاتے ہیں۔

متفرق ٹوٹکے:

☆ جب مال مویشی مسلسل بیماری کا شکار ہو تو ایسی صورت میں متاثرہ جانور کا ایک کان کسی تیز دھار آلے سے چیرتے ہیں اور سیب یا شہتوت کی ایک گیلی چھڑی سے چیرے ہوئے کان پر پے در پے مارتے ہیں تو خون فوارے کی طرح بہنے لگتا ہے۔ اس طرح کافی خون بہنے دیا جاتا ہے۔ لوگوں کے مطابق اس عمل سے گندہ اور فاضل خون گر جاتا ہے اور بیمار جانور ٹھیک ہو جاتے ہیں۔

☆ جب کسی شخص کی مال مویشی گم ہو جاتی ہے تو رات کو ایک عامل مخصوص عمل کے ذریعے کسی تیز دھار چھری پر دم کر کے پھونکتا ہے اور مویشی جس جانب گم ہونے کا گمان زیادہ ہو اس طرف اس دم شدہ چھری کی تیز دھار کا رخ کرتے ہوئے کسی لکڑی کے تختے یا ستون پر چھری گاڑھ دیتا ہے۔ یہ چھری اسوقت تک نہیں اٹھاتے جب تک گمشدہ جانور نہیں ملتے۔ یہ عمل آزمودہ تصور کیا جاتا ہے اور اکثر اوقات گمشدہ مال مویشی مل بھی جاتے ہیں۔

☆ جب کسی کے ہاں چوری ہو جاتی ہے یا کوئی چیز گم ہو جاتی ہے تو ایسی صورت میں بعض عامل حضرات ایک اور حکمت عملی بھی کرتے ہیں۔ وہ یہ کہ ایک نابالغ بچے کو پاک صاف کرا کر عامل اپنے سامنے رکھتا ہے اور بچے کے دائیں ہاتھ کے انگوٹھے کے ناخن پر سیاہی لگاتا ہے اور ایک خاص دم کرنے کے بعد بچے سے سوال کرتا ہے کہ کچھ نظر آ رہا ہے۔ بچہ اپنے ناخن پر جو کچھ دیکھتا ہے، اس سے عامل کو آگاہ کرتا ہے۔ حتیٰ کہ چوری اور گمشدگی جس طرح وقوع پذیر ہوئی اس کا سارا منظر بچے کی آنکھوں کے سامنے آتا ہے اور پیچیدہ معاملات آسانی سے حل ہوتے ہیں۔

☆ پھوڑا نکلنے کی صورت میں تازہ ٹماٹر آگ کی راکھ میں دبا دیتے، جب خوب پکتا تو تھوڑا ٹھنڈا کر کے اسے پھوڑے پر لگا کر سوتی کپڑے سے باندھتے تو کچھ دیر کے بعد پھوڑے کے اندر کا سارا مواد نکلتا اور اس طرح زخم ٹھیک ہو جاتا۔

☆ جب نومولود بچہ پیدائش کے کئی دنوں بعد تک پیشاب نہ کرے تو عموماً عورتوں کے سر کے کچھ بال سرسوں کے نیم گرم تیل میں ڈالتے ہیں پھر انہیں متاثرہ بچے کے مثانے پر رکھ کر کپڑے سے باندھتے ہیں تو پیشاب بند ہونے کی شکایت دور ہوتی ہے۔

☆ زکام، گلے میں درد یا کھانسی ہو تو ایک پیاز آگ کی راکھ میں دبا دیتے اور جب گرم ہو کر پکتا تو اسے نچوڑ کر تیل نکالتے۔ اسے چھوٹے بڑے سب کو ایک چمچ ہر رات کو پلاتے اور متاثرہ شخص کے سینے پر تیل سے مالش بھی کرتے۔

☆ اگر مچھر کاٹے تو نیلا پتھر کسی دوسرے پتھر پر رکھ کر تھوڑا سا پانی ڈال کر رگڑتے اور اس سے حاصل مواد کاٹنے کی جگہ پر لگاتے۔ اگر کاٹنے کی وجہ سے سوجن ہو تو پانی کی نالی سے ٹھنڈے ٹھنڈے پتھر متاثرہ جگہ پر رکھتے، جس سے سوجن ختم ہو جاتی ہے۔

☆ اگر کسی کا مستقل آدھا سر درد ہو یا دانتوں میں درد ہو تو عموماً متاثرہ شخص از خود کسی ایسی مرکزی جگہ پر جہاں سے مختلف سمت تین راستے جاتے ہوں، پتھروں سے ایک چھوٹا سا آتش دان بناتا اور اس کے اوپر ایک سل نما پتھر پر چند صاف شدہ چاول کے دانے، چند بے شعلہ انگارے رکھ دیتے اور آتش دان کے نیچے ہیزم سوختی کے چند ٹکڑے رکھ کر یہ کہتے ہوئے گھر کی طرف جاتے کہ ''لمشر دادو تو ادان بئی تو ہگا رولم'' یعنی اے لمشر دادا آپ یہاں رہیں میں آگ لے کر آؤں گا/آؤنگی۔ گھر کی طرف لوٹنے والا شخص راستے میں کسی کے ساتھ بات نہیں کرتا اور سیدھا گھر جا کر سوتا۔ یہ عمل رات کو ادا کی جاتی۔ لوگوں کا خیال ہے کہ جو شخص سب سے پہلے متذکرہ آتش دان کا سامنا کرتا ہے وہ ان تمام بیماریوں کا شکار ہوتا ہے، جس سے بچنے کے لئے کسی شخص نے یہ پاپڑ بیلے ہیں۔ شنا میں اسے ''لمشر دونک'' کہتے ہیں۔ لوگ عموماً ایسی چیز دیکھتے تو دور بھاگتے۔ بعض مقامات پر اسے ''نمشر'' اور کہیں کہیں ''نم سری'' کہتے ہیں۔ ''نم'' آدھے کو جبکہ ''سری'' سر کو کہتے ہیں۔

☆ ہاتھ پر جو بے ضرر سے دانے نکلتے ہیں انہیں شنا میں ''فِنار'' کہتے ہیں۔ یہ ہاتھوں پر یا جسم کے کسی اور حصہ پر ہوں تو بدنما لگتے ہیں۔ ایسی صورت میں مذکورہ ''فنار'' کی چوٹی چھیل کر خون نکالتے ہیں اور اس خون کو سات سفید کنکریوں پر لگاتے ہیں اور انہیں ایک کپڑے میں لپیٹ کر ایک ایسی مرکزی جگہ پر رکھتے ہیں جہاں سے تین طرف راستے نکلتے ہوں۔ اس کے بارے میں بھی یہی تصور ہے کہ جو



جوڑوں کے درد کا روایتی طریقہ علاج

شخص اس چیز کو اٹھا کر کھولے گا۔ یہ مرض اسی کو لگے گا۔

☆ جلدی مرض ایگزیمہ (داد) جسے مقامی لوگ ''جانرہ'' کہتے ہیں، اگر جسم کے کسی حصے پر ہو تو نہار منہ لعاب دہن اس پر ملتے ہیں۔ چند دن تک اس طرح کرنے سے ایگزیمہ ٹھیک ہوتی ہے۔ مقامی زبان میں نہار منہ کے اس لعاب دہن کو ''اُشٹہہ لال'' کہتے ہیں۔

☆ جب کسی شخص پر جادو یا سحر کے اثرات پائے جاتے تو ایسی صورت میں تین دن یا سات دنوں تک مسلسل سات مختلف چشموں سے تھوڑا تھوڑا پانی جمع کر کے اسی پر عامل سے دم کراتے۔ جسے مقامی زبان میں ''پھیرن'' کہتے ہیں۔ اس کے بعد جادو یا سحر زدہ لوگ اس پانی کو پیتے تو اس کے اثرات زائل ہو جاتے۔

☆ بچہ کمزور ہوتا اور دوا دارو سے کچھ فرق نہیں پڑتا تو ایسے بچوں کو انجیر کے درخت کی جڑوں کے نیچے سے تین دفعہ گزارتے۔ یہ عمل صبح سویرے انجام دیتے۔ متاثرہ بچے کو انجیر کی جڑوں سے گزارنے کے لئے دو اشخاص کے سہارے کی ضرورت پڑتی۔ یہ عمل بھی بلا ناغہ تین جمعہ مبارک کے دنوں میں کیا کرتے۔ لوگوں کے عقیدے کے مطابق یہ عمل کرنے سے کمزور بچے صحت مند ہو جاتے ہیں۔ عموماً دریاؤں کے متصل واقع نشیبی علاقوں میں انجیر کے ایسے درخت دستیاب ہوتے تھے، جن کی جڑوں میں اس طرح کے شگاف ہوتے، جہاں سے بچے آسانی سے گزار دیے جاتے۔ ایسا نہ ہونے کی صورت میں جڑوں کے اردگرد کی مٹی ہٹا کر مناسب جگہ حسبِ ضرورت بنائی بھی جاتی تھی۔

☆ ماضی میں جب کسی کو یرقان (کائل) ہوتا تو اکثر اسے کھٹی چیزیں مثلاً انگور، لسی وغیرہ دے دیتے۔ اس کے علاوہ مکئی کی روٹی اور قہوہ سے بیمار کی بلا ناغہ تواضع کرتے۔ مچھلی کے سات زندہ بچے بھی تھوڑے سے پانی کے ساتھ یرقان زدہ آدمی نگل لیتا۔ مولی کی چٹنی غیر خمیری روٹی کے ساتھ بھی کھلاتے۔ یرقان کے شکار لوگ دیگر ٹونے ٹوٹکے بھی کرتے تھے جس کا ذکر ''ثورے چھنونک'' کے عنوان کے تحت کیا گیا ہے۔

☆ جب کبھی کوئی نمونیا (مشاری) کا شکار ہوتا تو بیمار کو بستر پر لٹا کر اس کی قمیص اتار دی جاتی اور بید مجنوں کے پتے کوٹ کر مریض کی ناف سے لیکر چھاتی تک پھیلا دئے جاتے تو کچھ دیر کے بعد مریض ٹھیک ہوتا۔

☆ جب کبھی کسی لڑکے یا لڑکی کو کھانے پینے میں تکلیف ہوتی تو کہتے ہیں کہ ''تالو وتن'' یعنی تالو آیا ہے۔ ایسی صورت میں تجربہ کار خواتین شہادت کی انگلی پر توے سے کالک مل کر متعلقہ انگلی سے تالو دباتی ہیں تو درد کی شکایت جاتی رہتی ہے۔ اگر شیر خوار بچہ دودھ پینے میں تکلیف محسوس کرے تو اس کے بارے میں بھی یہی کہا جاتا کہ ''شداری تالو وتن'' یعنی بچے کا تالو آیا ہے۔ ایسی صورت میں اکثر دادی یا نانی اماں اپنے منہ میں ایک گھونٹ پانی لے کر تالو کے عین اوپر سر کے نرم حصے میں منہ رکھ کر چوستی ہے اور یہ عمل تین بار کیا جاتا ہے۔ اس کے کچھ دیر بعد بچے کو دودھ

دیتے ہیں تو وہ آرام سے دودھ پینے لگتا ہے۔

☆ گوپس کے بعض مقامات پر لوگ اپنی زمینوں میں پیاز اور مرچ کاشت نہیں کرتے تھے۔ کیونکہ ان کا خیال تھا کہ ایسا کرنے سے افراد خانہ میں سے کوئی مرجاتا ہے۔

☆ پرانے وقتوں میں یاسین جانے والے مسافر گوپس کی حدود میں واقع گوپس۔ یاسین کو ملانے والے پل کے اس پار ''چرتوی'' کے مقام پر ایک مرغی ذبح کر کے رکھ دیتے۔ لوگوں کا خیال تھا کہ ایسا نہ کرنے سے کوئی بڑا نقصان ہوتا ہے۔ جب دولہا دلہن کے قافلے کا وہاں سے گزر ہوتا تو بھی آتے جاتے اس کا اہتمام کیا جاتا۔ یہ سلسلہ چند برس قبل تک جاری تھا۔

☆ جب کسی خاتون کی زچگی میں تاخیر ہو تو عموماً حاملہ عورت کو پل پر لے جا کر سات چکر لگواتے۔ لوگوں کا خیال ہے کہ اس طرح کرنے سے بچے کی پیدائش فوراً ہوتی ہے۔

☆ ماضی میں بچوں کو اکثر ان گھروں سے دور رکھتے، جہاں پر موت واقع ہوئی ہو۔ اگر پھر بھی کوئی بچہ اپنے والدین کے ساتھ کسی کے ہاں کسی متوفی کے کفن دفن یا فاتحہ کے لئے گیا ہو اور وہاں سے اپنے گھر لوٹ کر بیمار ہوا ہو تو والدین یہی خیال کرتے کہ فلاں موت کے گھر جانے کی وجہ سے بچہ بیمار ہوا ہے۔ ایسی صورت میں اسی متوفی کے قبر کا ناپ لے کر کچے دھاگہ کو متاثرہ بچے کے گلے میں باندھ دیتے، جس کے پسماندگان کے گھر فاتحہ خوانی کے لئے جانے کی وجہ سے بچہ بیمار ہوا ہو۔

☆ بھیڑ بکریوں اور دوسرے پالتو جانوروں کے گلے میں بڑے بڑے گھنگرو بھی ڈالتے ہیں۔ جب جانور چلتے ہیں تو گھنٹی کی طرح گھنگرو بجنے لگتے ہیں۔ جس سے دور ہی سے اندازہ ہوتا ہے کہ جانوروں کا ریوڑ آ رہا ہے۔ دودھ دینے والے جانوروں کو نظرِ بد سے بچانے کے لئے ان کے گلے میں کسی حرام اور مردار جانور کی ہڈی باندھتے ہیں تاکہ لوگوں کی نظر تھنوں کی بجائے ہڈی پر پڑے اور وہ نظرِ بد سے محفوظ رہیں۔

☆ جب کسی گائے کا مادہ بچھڑا پیدا ہوتے ہی مرجائے اور اس کی نسل آگے نہ بڑھے تو ایسی صورت میں جوں ہی بچھڑا پیدا ہو تو اس کے کان کا ایک چھوٹا ٹکڑا کاٹ کر اسے گوندھے ہوئے آٹے کے پیڑے میں ملا کر گائے کو کھلاتے ہیں۔ لوگوں کا خیال ہے کہ اس طرح کرنے سے بچھڑے موت کا شکار نہیں ہوتے اور ان کی نسل بھی محفوظ رہتی ہے۔

☆ لوگوں کا اعتقاد تھا کہ اگر قرآن پاک کے کپڑے کا غلاف پانی میں بھگو کے چھوڑ دیا جائے تو موسلا دھار بارش ہوتی ہے۔ نگر ہو پر میں ''رش جھیل'' کے بارے میں بھی مشہور ہے کہ اس کا پانی متبرک ہے۔ جب کوئی اس میں نجس اور گندے کپڑوں سمیت نہاتا ہے تو بارش ہونے لگتی ہے۔ اسلئے عموماً اس جھیل میں نہانے سے لوگ اجتناب کرتے ہیں۔ اہلِ گلگت کے مطابق جنگل میں ایک پھول ایسا ہے کہ اگر اس کو توڑا جائے تو بارش برستی ہے۔

☆ ضلع غذر کے بعض لوگوں کا ایک شگون یہ ہے کہ دودھ دینے والے جانوروں کا تھن کھانے سے بوڑھی ماں یا دادی مرجاتی ہے۔ اسلئے اسے کھانے سے احتراز کرتے ہیں۔

☆ حلال جانوروں کے ایک اندرونی عضو ''تلی'' جسے شنا میں ''شوم'' کہتے ہیں کے بارے میں یہ شگون ہے کہ غیر شادی شدہ مرد یا عورت اسے پکا کر کھائے تو اس کی شادی کے موقع پر چہرہ نیلا ہو جاتا ہے۔ تلی عموماً گرم گرم راکھ میں تھوڑی دیر دباتے ہیں تو پک کر کھانے کے لئے تیار ہوتی ہے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اسے راکھ میں پکا کر کھانے سے دانت کا درد ٹھیک ہوتا ہے۔

☆ یہاں کے لوگوں کے عقیدے کے مطابق کرہ ارض ایک گائے کے سر پر قائم ہے۔ جب دنیا گناہوں اور برائیوں کی آماجگاہ بنتی ہے تو گائے کا سر حرکت میں آتا ہے اور یہی حرکت زلزلے کا سبب بنتی ہے۔

☆ عہدِ عتیق میں یہاں کے لوگوں کا عقیدہ تھا کہ حکمران خاندان کی حفاظت ''یودینی'' نامی ایک پری کرتی ہے۔ اسی لئے حکمران ہر قلعے کے اوپر ''یودینی'' نامی ایک ڈھول رکھتے تھے۔ جو مخصوص قومی تہواروں اور رسومات کے مواقع پر خود بخود بجتا تھا۔ جسے لوگ نیک شگون سمجھتے تھے۔ بگروٹ میں ''وزیر رشوی یودینی'' یعنی وزیر رشو کا ڈھول بہت مشہور ہے۔ لوگ اسے خوش قسمتی کی علامت سمجھتے تھے۔ کوئی شخص نہ بجتے ہوئے ڈھول نہ ''یودینی'' کو دیکھنے کی کوشش کرتا تھا۔ لوگوں کے عقیدے کے مطابق کوئی اگر ایسا کرتا تو ضرور کسی نہ کسی مصیبت میں مبتلا ہو جاتا۔ مثلاً اس کا سر مڑ کر اس کی کمر کے ساتھ لگ جاتا۔ کوئی جنگ اگر یہ ڈھول بجائے بغیر شروع کی جاتی تو اس کا نتیجہ تباہی سے تعبیر کیا جاتا۔

☆ اگر دن کو کسی کے ساتھ کوئی ناخوشگوار واقعہ پیش آتا تو لوگ کہتے کہ آج صبح صبح فلاں شخص کا منحوس چہرہ دیکھا تھا اسلئے ایسا ہوا۔ اسی طرح اگر کوئی خوشگوار واقعہ پیش آتا تو کہتے کہ آج فلاں نیک بخت کا چہرہ دیکھا تھا اسلئے یہ خوشگوار واقعہ پیش آیا۔

☆ سفر پر جانے کے لئے بھی دن مخصوص ہوتے تھے۔ لوگ کچھ دنوں کو منحوس قرار دے کر اس دوران سفر سے گریز کرتے تھے۔ سفر پر جانے سے پہلے فال بھی ڈالتے اور کچھ صدقہ و خیرات بھی کرتے۔

☆ بلیر (کارگاہ) میں ایک جھیل ہے جسے لوگ پریوں کا مسکن تصور کرتے ہیں۔ لوگوں کا خیال ہے کہ دیامر (نانگا پربت) میں پریوں کے محلات ہیں۔ جنہیں

جرمن کے ایک مشہور کوہ پیما نے Fairy Meadow کہا ہے۔

☆ آسمانی کہکشاں کو یہ لوگ ''گائے اور گھوڑے کا راستہ'' تصور کرتے تھے۔ لوگوں کا خیال تھا کہ کہکشاں کے درمیان جو چوڑی جگہ ہے وہاں ایک گھوڑا تیز دوڑتے ہوئے گر گیا تھا جبکہ گائے بغیر کسی تکلیف کے منزل تک پہنچ گئی تھی۔

☆ 21 جون کو سال کا طویل ترین دن اور مختصر ترین رات ہوتی۔ اسلئے جون کی اس تاریخ کو بڑے اہتمام کے ساتھ دیسی گھی پگھلا کر پیتے جبکہ 21 دسمبر کو، جو سال کا مختصر ترین دن اور طویل ترین رات ہوتی، اسلئے اس تاریخ کو کھانے کے لئے خربوزہ خصوصی طور پر محفوظ کر کے رکھتے۔ لوگوں کا خیال یہ تھا کہ ان مخصوص ایام میں جو اس طرح کرتا ہے وہ سال بھر تندرست رہتا ہے۔

☆ چودھویں کی چاندرات میں سرسبز درختوں کے سائے تلے گزرنا بدشگونی تصور کرتے ہیں۔ کیونکہ لوگوں کے خیال کے مطابق ایسا کرنے سے بدروحوں کا سایہ پڑتا ہے۔

☆ لوگوں کا ایک تصور یہ بھی ہے کہ پرانا گھر منہدم کرنے سے مالک مکان کی موت واقع ہوتی ہے۔

☆ آگ سے بجنے کی آواز آنا اور صبح دم کوے کا گھر کے قریب آکر کائیں کائیں کرنا متعلقہ گھر میں مہمان کی آمد کی علامت سمجھتے ہیں۔ بعض لوگوں کے خیال کے مطابق کوے کی دم جس سمت ہو اس سمت سے مہمان متوقع ہوتے ہیں۔ بعض مقامات پر کوّے کے صبح دم کائیں کائیں کرنے کو بدشگون بھی تصور کرتے ہیں۔

☆ جب گھروں میں چوہوں کی بہتات ہو جائے تو یہ خیال کیا جاتا ہے کہ اس سال خوب بارشیں ہونگی اور فصلیں بھی اچھی ہونگی۔

☆ رات کے وقت کتے کے رونے کی آواز آئے تو لوگ یہ تصور کرتے ہیں کہ اس شب کو محلے میں کسی کی موت واقع ہوگی۔ آسمان سے کسی تارے کا گرتے ہوئے نظر آنا بھی کسی کی موت کی علامت سمجھی جاتی ہے۔

☆ کھلیان، جسے مقامی زبان میں ''کھل'' کہتے ہیں، میں جب دانہ بھوسہ سے الگ کیا جاتا ہے تو اناج کے دانوں کو ایک جگہ جمع کر کے چادروں سے ڈھانپ لیتے ہیں اور اس پر قرآنی آیات یا لوہا وغیرہ رکھتے ہیں اور اندھیرے میں کھلیان سے گندم/ جو یا جو بھی فصل ہو بوریوں میں ڈال کر اٹھاتے ہیں۔ اس طرح کرنے سے لوگ سمجھتے ہیں کہ غلہ میں برکت ہوتی ہے اور جنات چوری نہیں کر سکتے۔

☆ مردہ کی ٹانگ پر ٹانگ چڑھی ہوئی ہو تو اسی خاندان میں کسی اور کے بھی مرنے کی علامت سمجھتے ہیں۔ اس کے علاوہ اگر کسی خاندان میں متواتر کئی اموات ہوں تو لوگ کہتے ہیں کہ ''مردس کفن آینٹ ھریگن'' یعنی خاندان کا سب سے پہلے مرنے والے کا کفن منہ میں گیا ہے۔

☆ روایتی چولہوں میں انگاروں کے اچانک روشن ہونے کو خوش بختی کی علامت سمجھا جاتا ہے۔ اسے اہلِ استور انگاروں یا آگ کا ہنسنا کہتے ہیں۔

☆ گھوڑی یا گائے اپنی ہم شکل بچہ جنے تو لوگ سمجھتے ہیں کہ اس سال بچہ دینے والی گھوڑی یا گائے مر جائے گی۔

☆ آسمان پر زیادہ ستارے نظر آئیں تو یہ خیال کیا جاتا ہے کہ بہت جلد بارش ہوگی جبکہ کم ستارے نظر آئیں تو سمجھتے ہیں کہ بارش کا دور دور تک کوئی امکان نہیں۔

☆ کسی کے ہاتھ سے دودھ سے بھرا ہوا برتن گر جائے تو اسے برا شگون سمجھا جاتا ہے۔

☆ اگر مرغی خلاف معمول کبھی اذان دے تو خیال کیا جاتا ہے کہ گھر میں کسی کی موت واقع ہوگی۔ ایسی صورت میں مرغی کو فی الفور ذبح کیا جاتا ہے۔

☆ اگر چھوٹے بچے روایتی جھاڑو ہاتھ میں لے کر صفائی شروع کریں تو خیال کیا جاتا ہے کہ گھر میں کوئی مہمان آنے والا ہے۔

☆ اگر ہتھیلی پر کھجلی آئے تو لوگ سمجھتے ہیں کہ کچھ نہ کچھ ملنے والا ہے۔

☆ دائیں آنکھ پھڑکنے لگے تو لوگ سمجھتے ہیں کہ اچھی خبر ملنے والی ہے جبکہ بائیں آنکھ پھڑکنے پر بری خبر کی توقع رکھتے ہیں۔

☆ اگر کسی شخص کی ایک یا کوئی بھی پاپوش دوسرے پر چڑھے تو سمجھتے ہیں کہ عنقریب سفر نکلنے والا ہے۔

☆ روایتی آتش دان کو پیر کا ''گل خن'' یعنی پیر کا چولہا تصور کرتے اور اس کے اوپر سے پھلانگنا باعثِ عذاب سمجھتے۔ اس کی تقدیس کو ملحوظِ خاطر رکھتے ہوئے اس کے اندر گندگی گرانا اور تھوکنے کی بھی اجازت نہیں ہوتی۔ آج کل نہ وہ روایتی آتشدان باقی ہیں اور نہ ان کی تقدیس۔ ناقدری کا بھوت لوگوں کے ذہنوں پر اس طرح سوار ہے کہ ماضی کی اعلیٰ تہذیبی قدریں دن بدن دم توڑ رہی ہیں۔

☆ پاؤں کے تلووں پر خارش آنا سفر کی علامت، ہتھیلی پر خارج، دولت ملنے کی نشانی اور شلوار کے پائنچے کا مڑنا، کپڑوں کا تحفہ ملنے کی علامت سمجھتے ہیں۔

☆ اگر کسی عورت کی ٹھوڑی پر خارش آئے اور دایاں ہاتھ ٹھوڑی کی طرف بڑھے تو متعلقہ عورت کہتی کہ آج محلّہ کی کوئی حاملہ عورت بچہ جنے گی اور اگر بایاں ہاتھ بڑھے تو یہ سمجھتی کہ حاملہ عورت بچی جنے گی۔

☆ گھروں میں مارخور کا چمڑا یا اس کے سینگ رکھنے کو نہ صرف نیک شگون تصور کرتے بلکہ انہیں راحھ یعنی حفاظت کرنے والا خیال کرتے۔

☆ گھر میں بچے یا بڑے چولہے میں آگ کو ادھر ادھر کرنے کے لئے استعمال ہونے والا چمٹہ (اونچوہ) اور بیلن (تنوسہ) ہاتھ میں رکھ کر خواہ مخواہ کھیلتے رہیں تو اسے کسی متوقع جھگڑے کی علامت سمجھتے ہیں۔



چلاس کا روایتی ھتن ڈانس

☆ رواتی آتش دان میں آگ جلانے کے دوران اگر کوئی انگارہ کھڑا دکھائی دے تو کسی عزیز ترین مہمان کی متوقع آمد تصور کرتے جبکہ اس کھڑے انگارے کو گرانا بدشگونی خیال کرتے۔ چنانچہ قصہ مشہور ہے کہ ایک ناسمجھ عورت نے آتش دان میں ایسے ہی ایک انگارے کو نکال کر پانی میں پھینک دیا۔ تو اتفاق سے اس کا باپ جو اپنی بیٹی (اس سے) ملنے کے لئے محوِ سفر تھا راستے میں پل پر گزرتے ہوئے دریا میں گر کر ہلاک ہو گیا۔

☆ اگر معمول سے ہٹ کر کسی بھی موسم میں موسلا دھار بارش ہوتی تو یہ خیال کیا جاتا کہ یاسین کا حکمران گلگت کی طرف پیش قدمی کرے گا۔

☆ اگر فضا میں بے شمار چیل (کنٹی) محوِ پرواز ہوں تو یہ خیال کیا جاتا کہ نگر کے لوگ گلگت پر حملہ کریں گے۔

☆ اگر رات کو بھیڑیوں کا آزادانہ آنا جانا ہو اور بھیڑ بکریوں کا بے شمار نقصان ہو تو یہ یقین کیا جاتا تھا کہ ہنزہ کے حکمران حملہ آور ہو کر لوٹ مار کا بازار گرم کریں گے۔

☆ اگر خلافِ معمول فصل کی بہتات ہوتی تو یہ خیال کیا جاتا کہ پنیال کے حکمران گلگت پر حملہ کریں گے۔

☆ جولڑکی یا لڑکا کھانے کی ڈوئی یا ہانڈیا چاٹتا رچاٹتی تو لوگوں کے مطابق ان کی شادی کے موقع پر آندھی آتی یا بارش ہوتی۔

☆ جب گڑگڑاہٹ کے ساتھ زلزلہ آئے تو یہ خیال کیا جاتا کہ عنقریب راجہ رہا بادشاہ مرے گا۔

☆ جس جگہے پر کوئی خزانہ دفن ہو تو لوگوں کا خیال ہے کہ اس خزانے یا دفینے کے تحفظ کے لئے ایک مؤکلہ مامور ہوتی ہے۔ جو کسی جانور یا انسانی قربانی کے بعد ہی دفینہ تلاش کرنے دیتی ہے۔ اسے راضی کرنے کا یہی طریقہ ہے کہ قربانی (ماری) دی جائے۔

☆ جب کسی شخص کی نظر کام یا سفر کے لئے صبح گھر سے نکلتے وقت کسی عورت پر پڑتی تو اس دن کو منحوس تصور کرتے۔ اور انہیں یقین ہوتا کہ سفر میں کوئی نہ کوئی مصیبت ضرور آن پڑے گی۔ اور ان کا سفر باعثِ وسیلۂ ظفر نہیں ہوگا۔

☆ دوران سفر راستے میں چکور نظر آئیں تو مسافر اسے خوشگوار سفر کے لئے نیک شگون جبکہ لومڑی نظر آئے تو اسے بدشگون تصور کرتے ہیں۔

☆ لوگوں کا خیال ہے کہ اس خطے کے ابتدائی باشندگان ایک غیبی مخلوق تھی جسے ''دیوا کو'' کہتے۔ اسی مخلوق نے کئی کوہل تعمیر کر کے علاقے میں کاشت کاری کی بنیاد رکھی۔ لیکن سال کے بعد انہیں کسی نئی جگہ منتقل ہونا پڑا کیوں کہ ایسا نہ کرنے کی صورت میں ان کی کاشت کی ہوئی فصل زہر آلود ہوتی۔ لوگوں کے مطابق کئی مشکل ترین پہاڑی مقامات پر دیوا کو کے تعمیر کئے ہوئے کوہل اور کھیت ماضی قریب تک دیکھے جا سکتے تھے۔

☆ ماضی قریب تک بعض مقامات پر لوگ اپنے گھروں، دکانوں اور دوسری عمارتوں کی چوکھاٹ پر گھوڑے کے نال چپکا دیتے تھے۔ لوگوں کا خیال تھا کہ اس طرح کرنے سے بلاؤں سے حفاظت ہوتی ہے۔

☆ گھوڑوں کو ''دیوا کو'' یعنی متبرک تصور کرتے اور دیوتاؤں کی خصلتوں

کے حامل تصور کئے جاتے۔ جن، بھوت، پریت کے تصور سے لوگ آج بھی خوفزدہ ہوتے ہیں۔ لیکن جب گھوڑا ساتھ ہو تو بالکل نہیں گھبراتے۔ روایت پرست لوگ آج بھی گھوڑے کو دیوا کو سمجھتے ہیں۔ بعض قومیں تو گھوڑے کو انسانوں پر بھی فوقیت دیتیں۔ چنانچہ تاریخ میں ایسے واقعات بھی ہیں کہ گھوڑے کی قصاص میں آدمی قتل کردیے گئے۔

نظرِ بد:

نظر بد کے تخیلات ان علاقوں میں عام ہیں بعض افراد نظر بد کی وجہ سے اتنے مقبول ہیں کہ لوگ ان سے اپنے جاذب نظر جاندار اور غیر جاندار اشیاء حتی المقدور چھپانے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہاں تک ایسے گائے بکری، جن کے تھنے دودھ سے بھرے ہوتے ہیں انہیں ایسے لوگوں کی نظروں سے بچانے کے لئے کپڑے کا تھیلا چڑھا کر ڈھانپتے ہیں۔ بعض لوگ نظر بد سے بچنے کے لئے فیروزہ انگوٹھی میں پہنتے ہیں۔ بعض مردوں اور عورتوں کی نگاہ میں ایسی طلسماتی تاثیر ہوتی ہے کہ وہ جس شخص یا شئے کو تحسین، لالچ، رشک یا حسد کی نظر سے دیکھیں تو اسے لازماً ضرر پہنچتا ہے۔ بسا اوقات نظر بد رکھنے والے مردوں اور عورتوں کو خود بھی پتہ نہیں ہوتا کہ وہ نظر بد رکھتے ہیں۔ عورتیں اپنے بچوں کو نظر بد سے بچانے کے لئے چیتے کے ناخن یا ہرن کے سینگ کا ٹکڑا چاندی میں منڈھوا کر ان کے گلے میں لٹکا دیتی ہیں۔ اسلامی دنیا میں ہر کہیں نظر بد کا عقیدہ پایا جاتا ہے۔ ایک روایت کے مطابق عرب شیوخ کی خلیجی ریاستوں میں جو سیاح مغرب سے آتے ہیں انہیں کڑی ہدایت کی جاتی ہے کہ وہ میزبان شیخ کے کسی بچے کی تعریف نہ کریں، کیوں کہ اس سے نظر بد لگ جانے کا اندیشہ ہوتا ہے۔ کہتے ہیں سکار کوئی (گلگت) کا فضل نور مارتولی (مارتول سے پتھر توڑنے والا) کہیں پر کام کررہا تھا کہ ایک بڑا اور خوبصورت پتھر جو ''اوکھلی'' یعنی اڈھور، کے لئے نہایت موزوں تھا، دریافت ہوا، جسے دیکھ کر فضل نور نے بے ساختہ کہا کہ ایسا خوبصورت پتھر میں نے بحیثیت مارتولی اپنی پیشہ ورانہ زندگی میں نہیں دیکھا تھا۔ فضل نور کی زبان سے ان الفاظ کا نکلنا تھا کہ دیکھتے ہی دیکھتے وہ پتھر دو ٹکڑے ہوگیا۔

بدنظری سے بچاؤ کے ٹوٹکے:

☆ کسی ایسی جگہ سے جہاں سے تین راستے مختلف سمت جاتے ہوں، اس کی مرکزی جگہ سے مٹھی بھر مٹی اٹھاتے ہیں اور کسی سے بات کئے اور پیچھے مڑ کر دیکھے بغیر متاثرہ شخص یا بچے کے سر پر تین دفعہ پھیرا کر ہر دفعہ اس مٹھی بھر مٹی پر برائے نام تھوکتے ہیں۔ اس کے بعد روایتی آتشدان میں اس مٹی کو پھینکتے ہیں۔ لوگوں کے مطابق اس سے نظرِ بد ختم ہوجاتی ہے اور متاثرہ شخص صحت یاب ہوجاتا ہے۔ جب کوئی شخص بہت خوبصورت لگے یا کسی اپنے عزیز کی قابلیت، ذہانت، حسنِ اخلاق اور اچھی کارکردگی دیکھ کر دل خوش ہو تو ایسی صورت میں وہ شخص جس کا دل خوش ہوا ہو متعلقہ شخص کی طرف دیکھ کر ''تھُہ تھُہ'' کہتا ہے۔ جب کسی گائے یا بکری وغیرہ کے تھن دودھ سے لبریز ہوں تو انہیں دیکھ کر بھی لوگ ''تھُہ تھُہ'' کہتے ہیں۔ لوگوں کا خیال ہے کہ ایسا کرنے سے نظرِ بد نہیں لگتی۔

☆ نظر بد سے بچنے کے لئے سات گھروں کی دہلیزوں سے ایک ایک مٹھی بھر مٹی لے کر تین، پانچ یا سات سرخ مرچوں (کوئے) کے ساتھ آگ میں ڈال دی جاتی۔ اگر مرچ کی بو تیز نہ ہوتی تو کہا جاتا کہ نظر بد نے گھیر لیا ہے۔ یہ عمل سات سات بار کیا جاتا اور عمل کرنے والی خاتون اس دوران کوئی بات نہ کرتی۔

☆ نظرِ بد سے خلاصی کے لئے بھی لوگ طرح طرح کے روایتی ٹونے ٹوٹکے کرتے ہیں۔ خاندان کی معمر عورتیں مکئی یا گندم کا آٹا گوندھ کر اس سے بانٹوں کے برابر سات گول دانے بناتیں۔ ان سات دانوں کو کسی مٹی یا سلور کے برتن میں ڈال کر نظرِ بد کے شکار شخص کے سر کے اردگرد ہاتھ سے سات دفعہ گھماتے ہوئے ایک خاص منتر پڑھتے۔ اسکے بعد ان دانوں کو ایک ایک کرکے گرم راکھ میں دبا دیتے۔ جب یہ دانے اونچی آواز کے ساتھ پھٹتے تو یہ خیال کیا جاتا کہ نظر بد سے خلاصی ہوگئی۔ بصورتِ دیگر یہ عمل اس وقت تک دہرایا جاتا۔ جب تک سات کے سات گول دانے گرم راکھ کے اندر زوردار دھماکے کے ساتھ نہیں پھٹتے۔ نظرِ بد سے بچنے کے لئے ایک طریقہ اور بھی ہے۔ وہ یہ کہ بچے کے گلے میں کالے دھاگے کی سات تاریں اکٹھی کرکے عامل سے دم کرا کر باندھتے ہیں اور یہ دھاگہ ماں کا دودھ چھوٹنے تک بچے کے گلے سے نہیں نکالتے۔ خوبصورت مکانوں کو نظر بد سے بچانے کے لئے چھتوں پر گھوڑوں اور گدھوں کی کھوپڑیاں یا کوئی بھی نامعقول چیز لٹکاتے اور اچھی فصلوں کے حامل کھیتوں پر بھی اسی طرح کا عمل کیا جاتا تھا۔

☆ نومولود بچوں کو نظر بد سے بچانے کے لئے ان کے ماتھے اور گالوں پر سرمہ کی سلائی سے طرح طرح کے نقوش بناتے تاکہ بچے کے چہرے کے بجائے یہ نقوش لوگوں کی توجہ اپنی طرف مبذول کرائیں اور اس طرح بچہ نظرِ بد سے محفوظ رہے۔

☆ جب دودھ دینے والے جانوروں پر نظر بد لگے تو ان کے دودھ میں خون کی آمیزش ہونے لگتی ہے۔ ایسی صورت میں لگاتار تین بار ہر شام کو درانتی گرم کرکے متاثرہ دودھ میں ڈالتے ہیں۔ اس کے بعد یہ دودھ کسی صاف جگہ پر پھینک دیا جاتا ہے۔ لوگوں کے مطابق اس عمل سے نظرِ بد کے اثرات ختم ہوجاتے ہیں۔

☆ کسی پر نظرِ بد لگے تو سیسہ کو فرائی پان (چمڑوری) میں پگھلاتے اور متاثرہ شخص کے سر پر ایک آہنی تھالی میں پانی رکھتے اس کے بعد پگھلا ہوا سیسہ تھالی میں ڈالتے۔ اگر سیسے سے طرح طرح کی شکلیں بن جاتیں تو کہا جاتا کہ متعلقہ شخص

پر نظرِ بد کا سخت حملہ ہوا ہے۔ لیکن اگر شکلیں وجود میں نہ آتیں تو کہتے کہ نظرِ بد کا اثر نہیں۔ نظرِ بد کی صورت میں سیسہ کے ٹکڑوں کو تھالی سے نکال کر نہ صرف متاثرہ شخص کے سر کے گرد گھماتے بلکہ ان ٹکڑوں کو اس کے بدن کے مختلف جوڑوں سے بھی چھوتے۔ لوگوں کے مطابق اس طرح کرنے سے نظرِ بد کا شکار آدمی ٹھیک ہوتا ہے۔

توہمات

پرانے وقتوں میں یہاں کے لوگ طرح طرح کی خرافات کا نہ صرف شکار تھے بلکہ اوہام اور وسوسوں میں بھی بری طرح مبتلا تھے۔

گلگت پر اردگرد کے حکمرانوں کے آزادانہ حملوں کا یہ عالم تھا کہ لوگوں کے دلوں میں پیدا ہونے والے کچھ شگون اور توہمات بھی اسی بنیاد پر قائم ہوئے تھے۔ ماضی میں لوگوں کے ذہن توہمات کے مسکن ہوتے تھے۔ لوگ عموماً یہ شکایتیں کرتے کہ ہم پر جادو کیا گیا ہے، کسی جن بھوت کا سایہ ہے، کوئی بلا چمٹ گئی ہے۔ مردوں کی نسبت عورتیں زیادہ توہم پرستی کا شکار ہوتی ہیں اور شہروں کی نسبت دیہاتوں میں اس کی شرح زیادہ ہے۔ ساس بہو سے مشکوک ہوتی ہے کہ اس نے جادو کرایا ہے اور بہو ساس پر جادو کا الزام دیتی ہے۔ کسی شخص کی ایک سے زیادہ بیویاں ہوں تو وہ ایک دوسرے پر جادو کرواتی رہتی ہیں۔

چند شگون اور توہمات

تیبان، ناران اور شیستم دیوتا:

پرانے وقتوں میں یہاں کے لوگ مافوق الفطرت مخلوق پر نہ صرف اعتقاد رکھتے تھے بلکہ ان کا خیال تھا کہ وہ نفع ونقصان پہنچانے کی بھی قدرت رکھتے ہیں۔ وہ دنیا کو ''سرپلوک'' اور عقبیٰ کو ''دلوک'' کہتے تھے۔ ظہور اسلام سے قبل یہاں مختلف علاقائی دیوتاؤں کی پرستش کی جاتی تھی۔ مثلاً گوہر آباد (گور) کے لوگ ''تیبان'' دیوتا کو پوجتے تھے۔ گوہر آباد میں ایک چٹان پر گھوڑے کی شکل کندہ ہے جسے یہاں کے لوگ تیبان دیوتا کا گھوڑا سمجھ کر پوجا کرتے تھے۔ چلاس کے قدیم باشندے ''ناران'' دیوتا کی پوجا کرتے تھے جبکہ سُمال (گوپس) کے لوگ ''شیستم'' دیوتا کو مانتے تھے۔

چشمہ دیوتا:

جب کبھی علاقے میں خشک سالی ہوتی اور چشمے سوکھ جاتے تو گاؤں کی عورتیں چشمہ دیوتا کو خوش کرنے اور اس کی رضامندی حاصل کرنے کی خاطر کھانے پینے کی اچھی اچھی چیزیں ساتھ لے کر مضافات میں واقع چشموں پر جا کر انہیں بطور نذرانہ خیالی دیوتا کے حضور پیش کرتیں اور منت سماجت کر کے واپس لوٹتیں۔ لوگوں کا ایک تصور یہ بھی تھا کہ کھوکھلے درخت اور چٹانیں بھی نفع ونقصان کا باعث بنتے ہیں۔ چنانچہ سبز رنگ کی چٹانوں پر سالانہ چڑھاوے بھی چڑھائے جاتے تھے۔

یُدینی (موسیقاروں اور شاہی خاندان کی مؤکلہ):

موسیقاروں، باجہ نوازوں اور شاہی خاندان کی مؤکلہ (عورت) کو یُدینی کہتے ہیں۔ یہ کوکھ (جات) کی دیوی بھی سمجھی جاتی ہے۔ کہتے ہیں کہ یہ ایک علاقے سے دوسرے علاقے کو جانے والی دلہن اور بارات کو ''ماری'' یعنی قربانی نہ دینے کی صورت میں دلہن کو بانجھ بنا دیتی ہے۔ شنا شاعری کے رزمیہ نظموں میں راجوں کی قصیدہ خوانی میں ان کی ''یُدینی'' کا ذکر بھی آتا ہے۔

یچھولے (بونا مخلوق):

ایک تصوراتی بونا مخلوق کو ''یچھولے'' کہتے ہیں۔ یہ مخلوق شکل وشباہت میں ''یچھ'' جیسی ہوتی ہے۔ یہ مخلوق بڑی بے ضرر اور نرم مزاج ہوتی ہے۔ لوگوں کا کہنا ہے کہ یہ مخلوق مکانوں اور ان کے مکینوں کی حفاظت کرتی ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ کھلیانوں سے غلّہ چوری کرنے کی بری عادت بھی ان میں پائی جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ لوگ اس مخلوق کا دل لبھانے اور انہیں شرارتوں سے باز رکھنے کے لئے جب غلّہ تیار ہوتا ہے تو ان کے اعزاز میں ایک خاص ڈش جسے ''مُل'' کہتے ہیں، تیار کر کے کسی مناسب جگہ پر رکھ دیتے ہیں۔ اگر کھانے پر کوئی بال یا انگلیوں کے نشانات نظر آئیں تو لوگ سمجھتے ہیں کہ ''یچھولے'' کھانا تناول کر چکے ہیں وگرنہ ان کی ناراضگی کا پتہ چلتا ہے۔ ناراضگی کی صورت میں یہ عمل کئی مرتبہ کرتے ہیں۔ بعض مقامات پر اس مخلوق کو دولت کی نشانی تصور کرتے ہیں۔ اگر یہ مخلوق راضی رہے تو دولت کی فراوانی ہوتی ہے۔ علاوہ ازیں گھروں اور بکر کوٹھوں میں بھی یچھولے کے لئے مُل رکھتے ہیں تاکہ یہ راضی رہیں۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ مُلائی نامی چھپروٹ کا ایک شخص رات کو گندم کے کھیت میں پانی دینے کے لئے گیا۔ پانی کی نگرانی کے ساتھ ساتھ وہ مشکیزہ میں دہی متھ رہا تھا۔ اچانک کھیت میں پانی بند ہوا تو وہ کوہل کی طرف چل نکلا۔ جب وہ سر بند پہنچا تو اس نے دیکھا کہ کسی نے پانی دوسری طرف بہا دیا ہے۔ ملائی پانی اپنی طرف کھول کر واپس آیا اور اپنے کام میں مصروف ہوا۔ اتنے میں پانی پھر بند ہو گیا۔ وہ پھر مشکیزہ چھوڑ کر کوہل کیطرف چل پڑا۔ وہاں پہنچ کر اس نے دیکھا کہ پانی پھر اس کی طرف بند کیا گیا ہے۔ ملائی سمجھا کہ کوئی شخص جان بوجھ کر شرارت کر رہا ہے۔ لہٰذا اس نے پانی کا رخ اپنے کوہل کی طرف کر کے پاس ہی کسی جھاڑی میں چھپ گیا تاکہ اصل صورتحال معلوم کر سکے۔ اتنے میں ایک انسان نما

مخلوق نمودار ہوئی اور پانی کا رخ پھر دوسری طرف کر دیا۔ ملائی فوراً جھاڑی سے نکل آیا اور اسے پکڑ کر پوچھا کہ پانی کیوں بند کرتے ہو؟ اس نے کہا کہ ہمارے ہاں شادی کی ایک تقریب ہے جس کے لئے پانی کی ضرورت ہے۔ اس پر ملائی نے کہا کہ تمہارے استعمال کے لئے چند ڈول پانی کافی ہے، تم پورے کوہل کا پانی کیوں بند کر رہے ہو۔ لہٰذا میں تمہیں جان سے مارے بغیر نہیں چھوڑوں گا۔ اس پر مذکورہ انسان نما مخلوق نے ملائی سے کہا کہ مجھے مت مارو میں تمہیں دعا (شاپ) دوں گا کہ خدا تمہارے دودھ سے مکھن زیادہ نکالے۔ اور تمہاری اولاد ہمیشہ چھپروٹ پر حکمرانی کرے۔ ملائی یہ سن کر سمجھ گیا کہ یہ ''یچھولو'' ہے۔ اس لئے اس نے اسے چھوڑ دیا اور واپس آ کر اپنے کام میں مصروف ہوا۔ آخر میں اس نے دیکھا کہ اس کی مشکیزہ واقعی مکھن سے بھر گئی تھی۔ روایت کے مطابق ''سین بر'' کی وزارت اور نمبرداری اس نظام کے اختتام تک ملائی کی اولاد میں چلتی رہی۔

یمالے: (تصوراتی عورت ذات مخلوق):

یہ ایک تصوراتی عورت زاد مخلوق چھوٹی حسین وجمیل لڑکیوں کی شکل میں ہوتی ہے۔ کہتے ہیں کہ یہ مخلوق ٹولیوں کی شکل میں رات کو اڑتی ہے۔ اس مخلوق کا کمال یہ ہے کہ یہ ہر جانور کی آواز میں بول سکتی ہے۔ یہ انسان کو ضرر بھی پہنچاتی ہے۔ یمالے کی اصطلاح شنا میں بطور محاورہ بھی استعمال ہوتی ہے۔ عموماً زیادہ کھانے والے لوگوں کو یمالے کے پیٹ سے تشبیہ دیتے ہیں۔

ست ماں دجارے (سات ماں بیٹیاں):

ست ماں دجارے یعنی سات ماں بیٹیاں۔ لوگوں کا خیال ہے ست ماں دجارے کے نام سے ایک تصوراتی گھرانہ موجود ہے۔ چھ بیٹیوں کی ماں ہر وقت اپنی بیٹیوں کے بال سنوارنے میں مصروف رہتی ہے۔ خاص مقامات پر یہ غیر مرئی گھرانہ مقیم ہوتا اور لوگوں پر ساحرانہ اثرات ڈالتا۔ اگر کوئی شہ سوار کسی ایسے مقام سے گزرتا جہاں پر یہ گھرانہ موجود ہو تو گھوڑا آگے بڑھنے سے ہچکچاتا۔ ایسے میں سوار یہ تصور کر لیتا کہ آگے گھرانہ مذکور نے راستہ روکا ہوا ہے اس لئے اسے اپنا راستہ بدلنا پڑتا۔

زلزلہ:

زلزلہ کو شنا میں ''ٹینل'' کہتے ہیں۔ لوگوں کا خیال ہے کہ سمندر میں ایک مچھلی تیرتی ہے اور اس پر ایک سانڈ سوار ہے۔ سانڈ کے ایک سینگ پر زمین ہے اور زمین پر ایک آدمی جبکہ فضا میں ایک پرندہ محو پرواز ہے۔ جب سانڈ تھک کر زمین کا بوجھ دوسرے سینگ پر ڈالنے کے لئے حرکت کرتا ہے تو اس کی وجہ سے زمین ہل جاتی ہے جس سے زلزلہ آتا ہے۔

چاند گرہن:

شنا میں چاند کو ''یون'' اور گرہن کو ''گراں'' کہتے ہیں۔ ''گراں'' کے بارے میں لوگوں کا خیال ہے کہ یہ ایک اژدہا کا نام ہے۔ یہ اژدہا چاند کا عاشق ہے۔ قمری مہینے کی 14 تاریخ کو جب چاند پوری جوبن پر ہوتا ہے تو اس دن عاشق کا اضطراب بڑھ جاتا ہے۔ جس کی وجہ سے وہ چاند کو اپنی آغوش میں لینا چاہتا ہے لیکن وہ چاند کے اس حصے تک نہیں پہنچ پاتا جس میں ایک انجیر کا درخت نظر آتا ہے۔ ایسے مواقع پر ان علاقوں کے لوگ روایتی روٹی پکانے والے بڑے بڑے توے گھروں سے باہر نکال کر زور زور سے بجاتے ہوئے گرہن (گراں) سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں کہ ہم تیرے خلاف بڑی فوج لے کر چل پڑے ہیں۔ لہٰذا چاند کو آزاد کرو یا مرنے کے لئے تیار ہو جاؤ۔ اس اثناء میں گرہن ختم ہوتا ہے اور لوگ اپنی کامیابی پر خوش ہو جاتے ہیں۔

سورج گرہن:

لوگوں کا خیال ہے کہ جب کبھی رعایا کے کسی منظورِ نظر حکمران کی موت واقع ہوتی ہے تو سورج گرہن ہو جاتا ہے۔ حکمران کی موت کے غم میں گرہن سورج کو مکمل یا جزوی طور پر اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے جس کی وجہ سے سورج کی روشنی مدہم پڑ جاتی ہے۔

راچھی:

اس کے معنی محافظ کے ہیں۔ بعض لوگوں کے دیومالائی عقیدے کے مطابق یہ ایک غیر مرئی اور تصوراتی کردار کا نام ہے جبکہ بعض اسے پری تصور کرتے ہیں۔ ہر فرد کی اپنی اپنی ''راچھی'' ہوتی ہے۔ کسی کی ''راچھی'' طاقتور اور کسی کی کمزور ہوتی ہے۔ ''راچھی'' طاقت کے معنوں میں بھی استعمال کی جاتی ہے۔ کمزور آدمی کو طعنہ دینا ہو تو لوگ کہتے ہیں کہ ''راچھہ نس تو موریے ناتھہ'' یعنی ہمت یا طاقت نہیں تو باتیں کیوں کرتے ہو۔ اسی طرح ''بگر راچھی'' یعنی بری ''راچھی'' والا شنا کی ایک مشہور گالی ہے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ہر بنی نوع انسان اور جانور کے ساتھ ایک مؤکل ہوتا ہے جو ان کی حفاظت کرتا ہے جسے ''راچھی'' کہتے ہیں۔ اسی طرح قبیلہ اور ریوڑ کا بھی ایک مؤکل ہوتا ہے۔ چنانچہ چرواہا جب بکریوں کے پاس سوتا ہے تو اس کو کوئی بلا نقصان نہیں پہنچاتا۔ اسی طرح جہاں دینل یا پشوء ہو وہاں بھی کوئی بلا، چڑیل وغیرہ انسان کو نقصان نہیں پہنچا سکتے۔ موسیقی، شکار، شکاری اور بندوق (سامان حرب) کی بھی مؤکلات ہوتی ہیں۔

سیلی:

پرانے زمانے میں ایک توہم یہ بھی تھا کہ سالانہ ایک دن غیر شادی شدہ عورتوں کو جمع کرتے اور ان کے درمیان ایک قشقہ بکری چھوڑتے۔ بکری جس عورت کے سامنے سرنگوں ہوکر ممیاتی تو وہ عورت ''سیلی'' یعنی پاک دامن کہلاتی۔ ایسی عورتیں عموماً قلعوں کی حفاظت پر مامور کی جاتیں۔ جس قلعے میں ''سیلی'' عورت موجود ہوتی تو وہ قلعہ ناقابل تسخیر تصور ہوتا۔ اور دشمن ایسے قلعے پر حملہ کرنے کی جرأت نہیں کرسکتا تھا۔ چھپروٹ میں ایک قلعہ ''سیلی کوٹ'' کے نام سے اب بھی مشہور ہے۔ شنا میں ایک کہاوت ہے کہ ''گانی چی سہ سیلی چی ار احری'' یعنی فاحشہ عورت پاک و پاکیزہ عورت کو اپنی بدکرداری اور چرب زبانی کی وجہ سے مات دے گی۔

مُرکُم:

روایت کے مطابق مُرکُم ایک دیوی تھی جسے یہاں کی ایک مخصوص وادی کی عورتیں پوجا کرتی تھیں۔ پرستش کے دوران عورتوں کے غول میں ایک مرد بھی ہوتا جسے ''زبان'' کہتے۔ یہ مرد (زبان) یا مٹوہ کو ہرن یا دیگر جانوروں یا انسانوں کے جسم کے ٹکڑے کرنے کا کام سونپ دیا جاتا۔ چڑیلیں یا پرستش کرنے والی عورتیں اس مرد کو مار مار کر اسے حسبِ منشا استعمال کرتیں۔ لوگوں کا کہنا ہے کہ یہ دیوی (مُرکُم) دوران زچگی پیش آنے والی تکلیف دہ مراحل کو نہ صرف آسان کرنے کا سبب بنتی تھی بلکہ زچہ بچہ کے تحفظ کی ضامن بھی ہوتی تھی۔

یچھ و یچھہ نی (بھوت):

شنا میں کسی بھلا یا بھوت کو ''یچھ'' کہتے ہیں۔ یہ مذکر ہوتا ہے اور عموماً تنہا رہتا ہے۔ اسے تمام بھوتوں سے طاقتور تصور کیا جاتا ہے۔ جب کبھی والدین اپنی اولاد سے ناراض ہوتے ہیں تو بطور بددعا کہتے کہ ''تو رُنی یچھو آنیٹ گا'' یعنی تم چڑیل اور بھوتوں کا لقمہ بنو۔ یچھ کی مونث ''یچھہ نی'' کہلاتی۔ کارگاہ نالہ میں ایک چٹان پر موجود گوتم بدھ کی مورتی جو کہ یچھہ نی کے نام سے موسوم ہے، کے بارے میں یہ لوک روایت مشہور ہے کہ ماضی میں گلگت سے پونیال یا کارگاہ نالہ جب دو آدمی جاتے یا گلگت کی جانب آتے تو آنے جانے والے دو راہگیروں میں سے ایک کھا جاتی اور ایک کو چھوڑ دیتی۔ اگر راہگیر چار ہوتے تو دو کھا جاتی اور دو کو چھوڑ دیتی۔ لوگ یچھہ نی کے اس ظلم سے بے حد تنگ آئے تھے۔ ایک دن ایک کاہن کا وہاں سے گزر ہوا۔ اس نے جب یچھہ نی کے مظالم کے قصے لوگوں کی زبانی سنے تو اسے بہت دکھ ہوا۔ کاہن نے دل ہی دل میں لوگوں کی جان یچھہ نی کے مظالم سے چھڑانے کی ٹھان لی۔ کاہن یچھہ نی کے پاس گیا اور کہا کہ کیا تمہیں خبر ہے کہ تمہارا بیٹا مر گیا ہے۔ یچھہ نی نے ہائے کہہ کر اپنا ایک ہاتھ جونہی بطور افسوس سینے پر رکھا تو کاہن نے منتر (دُرگنی) پڑھ کر لوہے کی ایک میخ ٹھونک دی۔ جس سے وہ پتھر کی مورت بن گئی۔ اس طرح لوگوں کو اس کے مظالم سے نجات ملی۔ اس واقعے کے بعد سے لوگوں کے دلوں میں یچھہ نی اور کاہن (دینل) کا تصور اس قدر راسخ ہوگیا کہ اسے بُدھ مت کے مبلغ بھی نہ مٹا سکے۔ یچھ اور یچھہ نی کے متعلق لوگوں کا ایک تصور یہ بھی ہے کہ یہ انسان کو اس طرح چیر پھاڑ کر کھا جاتے ہیں جس طرح درندے۔ ان دونوں کا علاج کاہن کے منتر (دُرگنی یا گتو) کے علاوہ کچھ بھی نہیں۔

سونی چی (سونے کی رکھوالی):

سونے کی رکھوالی، غیر مرئی اور تصوراتی عورت کو ''سونی چی'' کہتے ہیں۔ لوگوں کا خیال ہے کہ جہاں کہیں سونا یا اور کوئی خزانہ پایا جاتا ہے وہاں ایک عورت بطور محافظ بیٹھی ہوتی ہے۔ انسان اس وقت تک سونے کے دفینے کی تلاش کا کام شروع نہیں کرتا جب تک وہ کسی جانور یا انسانی قربانی کا اہتمام نہیں کرتا۔ اگر قربانی کے اہتمام کے بغیر دفینہ کی تلاش کا کام شروع کیا جائے تو متلاشی کو جان سے ہاتھ دھونے پڑتے ہیں۔ جان کا خطرہ ''سونی چی'' کی طرف سے لاحق ہوتا ہے۔

لیلی چی (خونی عورت):

جس مقام پر انسان کا خون گرے اور وہاں کسی جانور کی قربانی (ماری) نہ کی گئی ہو تو وہاں پر خونی عورت (لیلی چی) اپنا مسکن بناتی ہے اور لوگوں کے مطابق ایسے مقام پر انسانی خون گرنے کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔

دُھوم ددی چی رپس بدی چی (دوخیالی عورتیں):

دوم ددی چی اور پس بدی چی دوخیالی عورتوں کے نام ہیں۔ دُھوم ددی چی بدبختی نحوست، افلاس اور شکست کی علامت تصور کی جاتی ہے۔ جبکہ پس بدی چی سکھ کی علامت تصور ہوتی ہے۔ روایتی دھوم نکھا رسم کے دوران بکرا ذبح کرکے کھانے پینے کے بعد ''دَرا'' نامی درخت کی دو لچکدار چھڑیاں جسے ''جھلی'' کہتے ہیں، کو فرش، دیواروں اور چھت پر مارتے ہوئے کہتے کہ ''دُھوم ددی بوہ، پس بدی وہ'' یعنی نحوست کی عورت جاؤ اور سکھ کی عورت آؤ۔ لوگوں کے مطابق اس طرح کرنے سے گھر میں خوشحالی آتی ہے۔ شنا میں ایک کہاوت ہے کہ ''ہتھوج پس ویونک پاؤج جٹ ویونک'' یعنی ہاتھوں پر اون اور پاؤں پر بکری کے بالوں کی طرح گھنے بال اگنا، جس سے بہت ہی عیش و عشرت میں ہونا مراد لیا جاتا ہے۔

اُشوٹی چی:

ماضی میں عورتوں کو ان کے مخصوص ایام میں نجس سمجھ کر گھر میں نہیں رکھا

جاتا تھا۔ان کے لئے آبادی سے باہر اس مقصد کے لئے موجود مکان میں منتقل کیا جاتا اور انہیں کھانا پینا گھر سے پہنچاتے۔ جب ان کے مخصوص ایام ختم ہوتے تو غسل کے بعد پاک صاف ہوکر وہ اپنے گھر میں داخل ہوتیں۔گھر لانے سے پہلے گھر میں اسپند رسے دھونی دی جاتی۔متاثرہ عورت ''اُشوٹی چَی'' کہلاتی۔

گورپھہ چنگ (تصوراتی پرندہ):

ہما کی طرح گورپھہ چنگ بھی ایک تصوراتی پرندے کا نام ہے۔لوگوں کا خیال ہے کہ یہ پرندہ جس کسی کا تابع ہو اسے بہت فائدہ پہنچاتا ہے اور ہر انسانی خواہش پوری کرنے کی طاقت رکھتا ہے۔ ناممکن کو ممکن بنانا اس کے دایاں ہاتھ کا کھیل ہے۔کوئی بھی فرد اس تصوراتی پرندے کو رضاعی ماں قبول کرے تو تب یہ پرندہ اسکے قابو میں آتا ہے۔ایک روایت کے مطابق سونی کوٹ (چھلت بالا) کے قلعے میں گودا کھانے والی رانی (موکھای سونی) قیام پذیر تھی۔رانی کو رفع حاجت کی ضرورت پیش نہیں آتی تھی۔رانی نے اس تصوراتی پرندے کو رضاعی ماں کی حیثیت سے قبول کیا تھا۔ چنانچہ گورپھہ چنگ نامی پرندہ رانی کو مارخور اور کیل کا گودا کھلاتا رہا۔اگر کاہن اصل ہو تو اس پرندے پر نہ صرف قابو پاسکتا ہے بلکہ اسے رضاعی ماں کے طور پر قبول کرنے پر بھی قادر ہوتا ہے۔اگر کاہن (دینل) میں ذرہ برابر بھی رٹھس پن ہو تو وہ کسی صورت اس خیالی پرندے کو قابو نہیں کرسکتا۔

کسری کُوتُو (کسر کی زنبیل):

یہ ایک تصوراتی تھیلے کا نام ہے۔لوگوں کا خیال ہے کہ اس میں دنیا جہان کی چیزیں سمائی جاسکتی ہیں۔کسر ان علاقوں میں ایک دیومالائی بادشاہ کے طور پر مشہور ہے۔

سجی (پاک صاف):

پاک کو شنا میں ''سُجی'' کہتے ہیں۔چنانچہ درختوں میں چلی (پدم) کو پاک سمجھتے ہیں۔پھولوں میں ایک پھول کا نام بھی ''سجی پھُنز'' یعنی پاک پھول ہے۔لوگوں کے خیال کے مطابق اگر اس پھول کو گندگی میں رکھیں تو بارش برستی ہے۔اسی طرح جانوروں میں بکری اور جڑی بوٹیوں میں ''اسپندز'' پاک (سجی) سمجھے جاتے ہیں۔سجی کا مذکر ''سُجو'' ہوتا ہے۔

مچھہ گون:

لوگوں کے مطابق کسی بھی فن میں جب کوئی شخص ماہر اور یکتا ہوتا ہے تو ایک مؤکلہ اس سے وابستہ ہوتی ہے، جسے لوگ ''مچھہ گون'' کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔

شاپال:

کاہنوں کے مطابق پریوں (راھمے یا برای) کا ایک بادشاہ بھی ہوتا ہے جس کو ''شاپال'' کہتے ہیں۔

میل گُس:

عورت کی شکل کی ایک بلا کو ''میل گُس'' کہتے ہیں۔ یہ ایک پہاڑ سے دوسرے پہاڑ تک آگ برساتے ہوئے جاتا ہے۔یہ بلا جہاں بیٹھے وہاں پر بجلی گرتی ہے اور سیلاب آتا ہے۔گویا آسمانی اور زمینی آفات اس کے نقل وحمل سے وقوع پذیر ہوتے ہیں۔

درنجی:

ہر ماہر شکاری کی ایک تصوراتی مؤکلہ ہوتی ہے جسے ''درنجی'' کہتے ہیں۔یہ ایک عورت ہوتی ہے۔اس کے پہنے ہوئے زیورات کی جھنکار شکاری دور سے ہی سن لیتا ہے۔درنجی شکاری کو ہدایات دیتی ہے اور شکار کی طرف رہنمائی بھی کرتی ہے۔یہ مطلوبہ جانوروں کو اس مقام تک لے آتی ہے جہاں سے شکاری آسانی سے انہیں نشانہ بنا سکتا ہے۔درنجی کی ناراضگی شکاری کی ناکامی کا باعث بنتی ہے۔درنجی جنگلی حیات کو ناجائز نقصان پہنچانے والے شکاری یا اس کی اولاد کو جانی نقصان پہنچاتی ہے۔یہ دیوی جنگلات اور چراگاہوں کو آلودہ کرنے والوں کو بھی نقصان پہنچاتی ہے۔

سارپو دیوا کو:

لوگوں کے خیال کے مطابق یہ انسان کی طرح ہوتا ہے اور پرندوں کی طرح اڑتا ہے۔لیکن دیو صفت ہونے کی وجہ سے ''دیوا کو'' کہلاتا ہے۔بعض لوگ دیوا کو کے معنی دیوتاؤں کی خصلت والا کے بھی لیتے ہیں۔ پرستان اس کا مسکن ہوتا ہے۔جب یہ گائے کا گوشت کھائے یا اس کے جسم کا کوئی حصہ گوبر سے چھو جائے تو وہ اڑنے کی خاصیت کھو بیٹھتا ہے۔یہ اپنی زندگی انسانوں کی طرح گزارتا ہے۔لیکن اس کا جسم اور دیگر اعضاء گوشت پوست کی بجائے دھات کے ہوتے ہیں۔دیوا کو غیر معمولی طاقت کا حامل ہوتا ہے۔اسے مارنے کے لئے پہلے یہ معلوم کیا جاتا ہے کہ اس کا دل کس دھات کا بنا ہوا ہے۔اگر لوگوں کو یہ پتہ ہو کہ اس کا دل سیسے کا بنا ہوا ہے تو اسے آگ کی حرارت سے مار دیتے ہیں۔ چنانچہ گلگت کے قدیم راجہ شری بدھت کے متعلق ایک روایت یہ بھی ہے کہ اس کا دل سیسے کا تھا اس لئے اس کو آگ کے خندق میں ڈال کر مار دیا گیا۔شری بدھت کی طرح راجہ شاہلی شاہ نگر، راجہ عیشو ہنزہ اور راجہ آذر جمشید گلگت کو نہ صرف دیوا کو تصور کرتے ہیں بلکہ بعض

لوگ انہیں انسان پر بھی فوقیت دیتے ہیں۔لوگوں کا خیال ہے کہ ایسے کرداروں میں حکومت کرنے کی اہلیت بھی عام انسانوں سے زیادہ ہوتی ہے۔ان کے علاوہ بھی طرح طرح کے توہمات لوگوں میں پائے جاتے ہیں۔

کاہن، جن بھوت، پری اور چڑیل

کاہن:

دینل کو کہیں کاہن، کہیں شامان اور کہیں بٹن کہتے ہیں۔دینل شنا زبان کا لفظ ہے۔اسے دال پر زبر، ی پر زبر، نون غنہ اور لام پر جزم کے ساتھ پڑھا جاتا ہے۔دینل لفظ ''دَخَل'' سے ماخوذ تصور کیا جاتا ہے۔پاگل پنے کی سی کیفیت کو دَخَل کہتے ہیں۔مائیں اپنے بچوں کو عموماً نصیحت کرتی ہیں کہ قبرستان نہ جاؤ وہاں پہ دَخَل وغیرہ کا اثر ہوتا ہے۔گھر کی طرف یا باہر کسی ویرانے کی طرف جاتے ہوئے غیر مرئی مخلوقات کی طرف سے طرح طرح کی آوازیں سنائی دیتی ہوں یا سنگ باری ہو تو کہتے ہیں کہ ''آن چھج دِجین''، یعنی اسے آسیب اور جن بھوت کا حملہ تصور کیا جاتا ہے۔جس شخص پر کسی جن بھوت یا غیر مرئی مخلوق کے شر سے متاثر ہو کر اس پر ڈر اور خوف کے دورے پڑنے لگیں تو لوگ عموماً کہتے ہیں کہ ''**انے سیج دخلک ساتن**''، یعنی یہ جن بھوت کے دخل کا شکار ہوا ہے۔اس سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لئے لوگ تعویذ اور ٹونے ٹوٹکوں کا سہارا لیتے ہیں۔راکاپوشی کے پہاڑ اور دوبانی کے اردگرد کے علاقے کاہن کے زون تصور ہوتے ہیں۔اگرچہ کاہن اپنی گیتوں میں بلچھار، دوبانی کے ساتھ ساتھ دیامر (نانگا پربت) کا تذکرہ بھی کرتا ہے۔لیکن اس کے باوجود ماہرین اس کا زون دوبانی کے اردگرد کے علاقے جس میں حراموش، بگروٹ، دنیور، نومل، نلتر، شین براور ہنزہ نگر کے زیریں علاقے گردانتے ہیں۔شاید چلاس اور اس سے ملحقہ علاقوں میں کاہن موجود نہ ہونے کی وجہ بھی یہی ہو۔دینل جہاں کہیں کا بھی ہو وہ گیت شنا زبان میں گاتا ہے۔اس لئے شنا زبان ہی دینل کی زبان کہلاتی ہے۔دینل مختلف کیفیات کا شکار ہوتا ہے۔جب پدم کے پتوں سے دھونی دینے کے بعد دینل اپنا ہوش وحواس کھو بیٹھتا ہے تو اس کی اس کیفیت کو ''تھم رِجونک'' کہتے ہیں۔جب کبھی کاہن اپنی مخصوص حالت میں بھاگنے لگے تو اسے واپس لانے کے لئے شہنائی (سُرنی) یا بانسری (تُنک) کے ذریعے ایک خاص سُر جسے ''بُرگو'' کہتے ہیں، گاتے ہیں تو دینل اس سے محظوظ ہو کر واپس لوٹتا ہے۔جب کبھی ایسا واقعہ رونما ہو تو لوگ کہتے ہیں کہ ''دینل بُرگو جھوتو''، یعنی بھاگا ہوا کاہن ''بُرگو'' سُر بجانے سے واپس آیا۔یہ سُر صرف کاہن کے لئے مخصوص ہے۔کاہن کو جوش دلانے اور دائرہ سے باہر جائے تو واپس لانے کے لئے ایک اور سُر بھی بجائی جاتی ہے جسے ''احھوس'' کہتے ہیں۔اس موقع پر خوب شور وغوغا ہوتا ہے اور ہوائی فائرنگ بھی کی جاتی ہے۔ساتھ ساتھ ''بکشور'' بھی بجاتے ہیں۔اگر دینل کی مؤکلات (برایے) یا روحیں گم جائیں تو یہ سُر بجانے سے وہ بھی واپس آتی ہیں۔دینل کو لاشعوری حالت سے شعور میں لانے کے لئے اس پر پانی چھڑکتے ہیں تو وہ ہوش میں آتا ہے۔لاشعور سے شعور میں آنے کی اس حالت کو ''اِسپہ نی جونک'' کہتے ہیں۔جب دینل بد پرہیزی کرتے ہیں تو بیمار ہو جاتے ہیں اور وہ اپنی مافوق الفطرت خاصیت کھو بیٹھتے ہیں۔اصلی خاصیت کھونے کی اس حالت کو ''دِم لی جونک'' کہتے ہیں۔ایک روایت کے مطابق میجر ای، ایچ کاپ پولیٹیکل ایجنٹ گلگت کھیل تماشوں کا انتہائی دلدادہ تھا۔اس نے اپنے دور حکومت (1945--1942ء) میں دینل نچوانے کے بڑے بڑے شو کرائے۔سال 1944ء میں نائی کئی میں کئی کاہنوں کو نچوانے کا جو عظیم الشان اہتمام کیا تھا اس کی نظیر نہیں ملتی جسے بزرگ لوگ اب بھی یاد کرتے ہیں۔

کاہنوں کی قسمیں:

۱) رُھس ۲) ڈنگ رُھس ۳) پشو ۴) رُینی مٹوہ

رُھس:

وہ مرد عورتیں جن پر پریاں اترتی ہیں ان کا شمار دینل ''رُھس'' میں کیا جاتا ہے۔بعض دفعہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ پریاں مارخور کے سینگ کے خول میں خون اور کیل کے سینگ کے خول میں دودھ بھر کر لاتی ہیں۔وہ کاہن کو خون پلانے کے لئے بہت کوشش کرتی ہیں۔یہ ایک طرح کی آزمائش ہوتی ہے۔اگر کاہن خون پینے سے انکار کرے تو اسے دودھ پلاتی ہیں جو اصل دینل کی نشانی ہوتی ہے۔اگر وہ ڈر کے مارے خون پئے تو وہ دینل کے بجائے رُھس بنتا ہے۔اسی طرح ''چھتی ٹوکی'' کے موقعہ پر دینل کو ایک خاص مقدار میں خون پلاتے ہیں۔مقررہ مقدار سے اگر ایک قطرہ بھی وہ خون زیادہ پی لے تو اس میں رُھس پنا آتا ہے، جس کی وجہ سے اس کی پیشگوئیاں صحیح ثابت نہیں ہوتیں۔اس کا انحصار اس کاہن پر ہوتا ہے جو ''چھتی ٹوکی'' دیتے وقت موجود ہوتا ہے۔وہ کاہن کو مقررہ مقدار سے زیادہ خون پلانے سے باز رکھتا ہے۔پہلی بار کڑھا (کاؤ) بناتے وقت کبودی رنگ کی دوسالہ بکری جسے مقامی زبان میں ''چھتی'' کہتے، ذبح کرتے تو بکری کی گردن پر منہ رکھ کر کاہن خون پی لیتا۔اس تمام کھیل کی سرپرستی راجے مہاراجے کرتے اس لئے بکری کا اہتمام بھی کیا جاتا۔یوں یہ عمل ''چھتی ٹوکی'' کہلاتی۔چلی کی دھونی اور بانسری کی آواز بھی کاہن کی مخصوص کیفیت میں اضافے کا باعث بنتی۔جب تک کڑھا کاہن اپنی کلائی میں رکھتا تو وہ کہانت کی کیفیت سے دوچار نہیں ہوتا۔جب کہانت کی کیفیت مطلوب ہوتی تو اسے اتار دیا جاتا۔

ڈنگ رٹھس:

اس قسم کے کاہن (دینل) کو مجسمۂ شر تصور کرتے ہیں۔ یہ وہ دینل ہوتے ہیں جو پریوں کی آزمائش کے وقت سینگ کے خول میں دیے ہوئے خون کو پیتے ہیں اور آخر میں اسے چاٹ بھی لیتے ہیں۔ یہ ''دینل'' زنے (چڑیل) سے زیادہ خطرناک ہوتے ہیں۔ اس سے انسان کو کوئی فائدہ نہیں پہنچتا۔

پشُو:

پشو تک شنا زبان میں دیکھنے کو کہتے ہیں۔ لفظ پشُو سے مراد دیکھنے والا لیا جاتا ہے۔ دینل جب پریوں کی آزمائش سے گزرتا ہے تو اس وقت جو دینل نہ کامیاب ہوتا ہے نہ ناکام یعنی نہ خون پیتا ہے نہ دودھ تو وہ ''پشُو'' بنتا ہے۔ اس کا کام چڑیل کو ''طولن'' دے کر اس کے پنجوں سے انسان کو چھڑانا ہوتا ہے۔ جب کسی انسان کو چڑیل، یمالے، یحھ اور بھوت وغیرہ غیر مرئی طور پر شکار کرنے کے لئے لے جاتے ہیں تو دینل، پشو یا مٹوہ، متاثرہ شخص کو ان بلاؤں سے چھڑاتا ہے۔ ایسی صورت میں چڑیل وغیرہ، دینل، پشو یا مٹوہ کے ذریعے تقاضہ کرتی ہیں کہ متاثرہ شخص اس جان بخشی کے بدلے کوئی حلال جانور ذبح کرے۔ چڑیل وغیرہ کا یہ پیغام دینل، پشو یا مٹوہ متاثرہ شخص تک جونہی پہنچائے تو وہ اس کی تعمیل میں دیر نہیں کرتا۔ کیونکہ لوگوں کے مطابق ان پیغامات کو نظر انداز کرنے کی صورت میں نہ صرف کوئی نہ کوئی نقصان ہوتا ہے بلکہ بعض دفعہ جان سے بھی ہاتھ دھونے پڑتے ہیں۔ اس عمل کو ''طولن'' کہتے ہیں۔ روایت کے مطابق کسی کے مرنے کی صورت میں اس کو قبل از وقت علم ہوتا ہے۔ پشو اور رُینی مٹوہ کے کام تقریباً ایک طرح کے ہوتے ہیں۔ ماضی میں چونکہ یہاں پر ڈاکٹرز اور میڈیکل علاج معالجے کی سہولیات نہیں تھیں اسلئے عموماً لوگ اپنے مسائل، معاملات اور بیماریوں کے بارے میں معلومات اور رہنمائی حاصل کرنے کے لئے چند طرح کے مخصوص لوگوں سے رجوع کرتے۔ اس طرح کے مرد/عورت کو مقامی لوگ ''پشو چی' یا پشو مشاء'' کہا کرتے۔ متاثرہ شخص کے کرتے سے ایک بٹن یا زیرِ استعمال کپڑے کا ٹکڑا یا دھاگہ ''پشو چی/مشاء'' کو دیتے جو متعلقہ چیز کو اپنے سرہانے کے نیچے رکھ کر سو جاتے اور متاثرہ شخص کے بارے میں خواب میں جو کچھ دیکھتے، اگلے دن اس کے بارے میں متعلقہ لوگوں کو بتاتے اور خواب کی روشنی میں متاثرہ لوگوں کی رہنمائی بھی کیا کرتے اور بعض دفعہ صدقہ، خیرات، ٹوٹکہ اور دم درود کے لئے کہتے۔ اس طرح کے عاملین آج کل بھی کہیں کہیں پائے جاتے ہیں۔ عاملین کو اس عمل کا معاوضہ بھی دیا جاتا ہے۔

رُینی مٹوہ:

اہرن کو شنا میں مٹوہ کہتے ہیں۔ رُینی مٹوہ یعنی چڑیل کا اہرن۔ رُینی مٹوہ عموماً مرد ہوتا ہے۔ چڑیلیں اس مرد کو بطور اہرن (مٹوہ) استعمال کرتے ہوئے بیمار اور چڑیل زدہ شخص کے حصے بخرے کرتیں۔ کبھی کبھار مٹوہ چڑیلوں کے ساتھ مقابلہ کر کے بیمار شخص کو ان کے چنگل سے آزاد بھی کراتا لیکن اس کے معاوضے کے طور پر وہ بیمار کے گھر والوں سے کہتا کہ میں نے تمہارے فلاں بکرے یا بکری وغیرہ کے بدلے تمہارے فلاں فرد کو چڑیلوں سے بچایا ہے لہٰذا مطلوبہ جانور کی قربانی کریں۔ چڑیل زدہ آدمی کے گھر والے بلا چون وچراں اس کے حکم کی تعمیل کرتے۔ یہ سلسلہ کسی حد تک اب بھی جاری ہے۔ مٹوہ چڑیلوں کی رات بھر کی سرگرمیوں پر نظر رکھتا ہے۔ جب کبھی کوئی انسان چڑیلوں کا شکار ہو تو اس موقعہ پر رُینی مٹوہ پہنچ جائے تو چڑیل اس طرح منتشر ہوتی ہیں جس طرح شاہین کبوتروں کو منتشر کر دیتا ہے۔ پشُو کی طرح اس کا کام بھی صرف چڑیل کو ''طولن'' دے کر کے اس کے پنجوں سے انسان کو چھڑانا ہوتا ہے۔ روایت کے مطابق اسے بھی کسی کی موت کا پیشگی علم ہوتا ہے۔

لفظ کاہن کا مؤنث کاہنہ ہے اور کاہن کے پیشے کو کہانت کہتے ہیں۔ کہانت کی کئی قسمیں ہوتی ہیں اسلام سے قبل انفرادی اور اجتماعی دونوں زندگیوں میں کاہنوں کا بڑا عمل دخل تھا۔ تمام قبائلی اور ملکی اہم معاملات میں ان سے رائے لی جاتی تھی۔ بالخصوص جنگی مہمات میں ان کا فیصلہ اٹل ہوتا تھا۔ کاہن یا کاہنہ خوابوں کی تعبیر کرتے اور گمشدہ چیزوں، چوریوں اور قتل وغیرہ کا پتہ بھی بتاتے۔ اس زمانے میں کہانت نہ صرف ایک رسم کے بلکہ ایک عقیدے کے طور پر ذہن انسانی پر حکمرانی کر رہی تھی۔ اس کی ایک قسم تو وہ ہے جسے جن ایک دوسرے سے پاس کرتے ہوئے کاہن تک پہنچاتے ہیں اور ان باتوں میں کچھ باتیں اپنی طرف سے بھی ملاتے ہیں۔ دوسری قسم جس میں جن اپنے آقا کو ایسی باتیں بتاتا ہے جو اوروں کو معلوم نہیں ہوتی ہیں۔ اسکی تیسری قسم وہ ہے جس کی بنیاد ظن، تخمینے اور اندازے پر ہے۔ اللہ تعالیٰ یہ قوت کسی بھی انسان کو عطا کر دیتا ہے لیکن انسان اس سے بہت سی جھوٹی باتیں بھی ملا دیتا ہے۔ اس کی چوتھی قسم کا دارومدار تجربے اور عادت پر ہوتا ہے جس میں انسان گذشتہ واقعات کو سامنے رکھ کر متوقع واقعات کا پتہ لگاتا ہے۔ کاہن کو یہاں کے مقامی لوگ ''دینل'' کہتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ کوئی شخص جب خواب میں ''برای'' دیکھتا ہے اور وہ اس پر مہربان بھی ہوتی ہے تو ایسے شخص میں مافوق الفطرت طاقت پیدا ہو جاتی ہے۔ اب وہ شخص آسمانوں اور زمینوں کی خبریں بھی دیتا ہے اور پیشگوئیاں بھی کرتا ہے۔ ''دینل'' کا فن خواہشمند لوگ عالمِ شباب میں ہی سیکھ لیتے ہیں جو تادمِ زیست ان کے ساتھ رہتا ہے۔ بعض لوگ اس فن کو موروثی سمجھتے ہیں مگر ایسا ہونا ضروری نہیں۔ ''دینل'' کا تعلق زیادہ تر ان شین قبائل سے ہوتا ہے۔ جو گلہ بانی کے پیشے سے منسلک ہوتے ہیں۔ ان کے

بال لمبے لمبے ہوتے ہیں۔ خواتین وحضرات دونوں اس فن کو حاصل کر سکتے ہیں۔ بچپن یا جوانی میں کاہن میں کچھ علامتیں ظاہر ہوتی ہیں۔ اسے ''ساپھوٹ'' کی تکلیف ہوتی ہے جو غصہ وخوف کی ملی جلی کیفیت کا نام ہے۔ شنا میں دم گھٹنے کو ''ساپھوٹ'' کہتے ہیں۔ شروع شروع میں، متوقع کاہن یا کاہنہ سوتے میں مچھر، مکھیوں یا بھڑوں کو حملہ آور ہوتے ہوئے محسوس کرنے لگتا ہے یا پھر آگ کے شعلوں کو اپنی طرف آتے ہوئے محسوس کرتا ہے۔ وہ اس صورت حال سے خوفزدہ ہوتا ہے اور اس غرض سے کہ اسے کچھ نظر نہ آئے اپنا منہ چھپانے لگتا ہے۔ اس کیفیت کے دوران وہ اپنے بازوؤں کا گوشت اپنے دانتوں سے کاٹتے ہوئے اپنی انگلیاں چبانے لگتا ہے۔ جوں جوں یہ سلسلہ طول پکڑتا ہے اس کی بے چینی میں بھی اضافہ ہوتا ہے اور وہ لاشعوری طور پر ادھر ادھر بھاگنے لگتا ہے۔ جب بھی اس پر نیم بے ہوشی کی کیفیت طاری ہوتی ہے تو وہ ہاتھ پاؤں رگڑنا شروع کر دیتا ہے اور ساتھ ہی اس کے منہ سے جھاگ بھی نکلنے لگتی ہے۔ اس کے بعد اسے خوبصورت دوشیزائیں نظر آنے لگتی ہیں جنہیں ''برای'' یا ''راھمی'' کہتے ہیں۔ جہاں کہیں سے بانسری یا ڈھول بجانے کی آواز آئے تو ''دینل'' لاشعوری طور پر اچھل کود شروع کر دیتا ہے۔ اس طرح کے آثار جب کسی مرد/عورت میں ہوں تو تصدیق کے لئے پدم کی دھونی دے کر اسے شعور کی حالت سے عالم لاشعوری میں داخل کر دیا جاتا ہے۔ اس موقع پر کوئی ماہر ''دینل'' لاشعوری کی اس حالت میں ''گنو'' یا ''درگنی'' منتر کے ذریعے اسے آزماتا ہے۔ اس وقت اگر متعلقہ شخص لاشعور سے فوراً شعور میں آتا ہے تو اس کے دینل ہونے کی تصدیق ہوتی ہے۔ دینل ہونے کی تصدیق کے بعد اسے اگر آزاد چھوڑا جائے تو لاشعوری کے عالم میں کہیں نہ کہیں گر کر ہلاک ہونے کا ہر وقت خطرہ ہوتا ہے اس لئے اس کی سخت نگرانی کی جاتی ہے۔ اس فن کے حامل لوگوں پر پہلے پہل ایک لمبی غنودگی طاری ہو جاتی ہے۔ پھر متاثرہ شخص کے کان کے قریب ہلکی ہلکی موسیقی بجائی جاتی۔ آہستہ آہستہ وہ شخص آنکھیں کھولتا۔ پھر ایک بکری اس کے پاس لا کر ذبح کی جاتی اور ذبح شدہ بکری کی گردن نوآموز ''دینل'' کی خدمت میں پیش کی جاتی۔ درحقیقت ایسا بطورِ امتحان کیا جاتا ہے۔ اگر واقعی اس پر غیب کے حالات منکشف ہوتے تو وہ بکری کی خون آلود گردن پکڑ کر چوسنا شروع کر دیتا ہے۔ جو ایسا نہیں کر سکتے ان کے بارے میں یہ خیال کیا جاتا کہ وہ اس فن میں کمزور ہیں۔ دینل بکری کے سر کو ہاتھ میں اٹھائے ناچتا بھی ہے۔ ادھر ماہر دینل ایک تار پر منتر (درگنی) پڑھ کر دم کرتے ہوئے مروڑتا جاتا ہے اور مروڑتے مروڑتے اس تار سے بازو بند کڑھا بناتا ہے جسے شنا میں ''کاؤ'' کہتے ہیں۔ نامور کاہنوں کو خاص تہواروں اور دیگر مواقع پر بلا کر انہیں اپنے فن کا مظاہرہ کرنے کا موقع فراہم کیا جاتا اور وہ اس طرح پیشگوئیاں کرتے۔

لوگوں کا عقیدہ ہے کہ زمستان کے موسم میں مستقبل کے بارے میں پیشگوئیاں کرنے والی روح سست پڑ جاتی ہے جبکہ گرمیوں کا موسم شروع ہوتے ہی ہوشیار ہوتی ہے۔ جب اس فن کے مظاہرے کا اہتمام کیا جاتا تو لوگ ایک دائرہ بنا کر بیٹھ جاتے۔ ایک بڑے پتھر پر پدم (چلی) کی شاخوں سے آگ جلائی جاتی۔ پھر آگ کے اندر سفید بھیڑ یا بکری کا دودھ بھی انڈیل دیا جاتا۔ کاہن (دینل) چادر اوڑھ کر آگ کے قریب جاتا اور سارا دھواں منہ کے ذریعہ اندر لے جاتا۔ اس وقت اس کی آنکھیں سرخ اور ڈراؤنی ہوتیں اور وہ اپنا ہوش وحواس کھو بیٹھتا۔ اس لئے چھوٹے چھوٹے بچے اور کمزور دل لوگ اس حالت میں اس سے آنکھ نہیں ملا سکتے۔ اس دوران ہلکے سروں پر موسیقی بھی بجائی جاتی۔ جب دھواں پوری طرح اندر جاتا تو اس سے اس کا سر چکرانے لگتا ہے۔ کچھ دیر کے بعد کاہن جذب کی حالت میں آجاتا۔ کاہن وجد کی حالت میں اپنا سر آگے پیچھے مارتا اور تھک ہار کر بے سدھ ہو کر زمین پر گرتا ہے۔ جب تماشائی کاہن کے اندر نئی روح کی موجودگی محسوس کرتے ہیں تو زور زور سے تالیاں بجانے لگتے ہیں۔ اس دوران موسیقی کے سر بھی بلند ہونے لگتے ہیں۔ فن کے مظاہرے کے دوران دینل کی محفل میں کوئی شخص سرخ کپڑے پہن کر نہیں بیٹھ سکتا۔ تھوڑی دیر کے بعد موسیقی کی لے تبدیل کر کے قدرے کرخت کی جاتی ہے۔ کاہن موسیقی کی تال پر بے سرا رقص شروع کرتا ہے۔ اس کی تھکی ہوئی آنکھیں، لڑکھڑاتی ہوئی چال اور ہوا میں لہراتے ہوئے لمبے لمبے بال بڑا دردناک منظر پیش کرتے ہیں۔ تماشائی اس دوران ہاتھوں سے زور زور سے تالیاں بجاتے ہیں جبکہ منہ سے شور مچاتے ہیں۔ کاہن کی تھکاوٹ کی وجہ سے برا حال ہوتا ہے۔ جوں جوں کاہن سے دھویں کے اثرات ختم ہوتے جاتے ہیں۔ پیشگوئی کا وقت قریب آتا ہے۔ موسیقی فوراً دھیمی ہونے لگتی ہے۔ کاہن کے قدم ڈگمگانے لگتے ہیں اور وہ خالی نظروں سے لوگوں کی طرف دیکھتا ہے۔ کاہن اپنے کان موسیقی کے کسی آلے کے قریب لے جا کر لوگوں کو یہ تاثر دیتا کہ وہ دوسروں کو نہ سنائی دینے والی کوئی خاص آواز سنتا ہے۔ اس کے بعد وہ دائرے کے گرد چکر کاٹنے لگتا ہے۔ کاہن سرگوشی کے عالم میں جو کچھ کہتا موسیقار اسے بڑے غور سے سنتے۔ جب ''دینل'' کی پیشگوئی لوگوں تک پہنچتی تو وہ زور زور سے شور مچاتے اور کسی خوشخبری کی صورت میں ایک دوسرے کو مبارکباد دیتے۔ ''دینل'' کا اچھل کود تقریباً ایک گھنٹہ تک جاری رہتا۔ جب وہ جنون کے عالم میں ہوتے ہیں تو پریاں اور جن ان کے پاس آکر مستقبل کے بارے میں پیشگوئیاں کرتے ہیں اور بعض دفعہ بیمار لوگوں کے لئے علاج بھی تجویز کرتے ہیں۔ آخر دم جب ''دینل'' تھکاوٹ کی وجہ سے نڈھال ہو جاتا تو باہر سے ایک آدمی اندر آکر ''دینل'' کو اپنی پشت پر رکھ کر باہر لے جاتا۔ اسی طرح یہ تماشا اختتام پذیر ہوتا۔ لوگ کاہنوں سے اپنی مرضی

کے مطابق نہ کوئی سوال پوچھ سکتے اور نہ ہی اپنی خواہش کے مطابق ان سے پیشنگوئی کرنے کے لئے کہہ سکتے۔ گویا پیشنگوئی کے معاملے میں وہ بالکل آزاد ہوتے ہیں۔

''دینل'' کے لئے گائے کا دودھ پینے پر سخت پابندی ہے جبکہ ماضی میں شین قبیلے کے لوگ بھی گائے کے دودھ سے عموماً پرہیز کرتے تھے۔ کاہن اپنے فن کے مظاہرے کے دوران بارہا دائرے سے باہر نکلنے کے لئے ہاتھ پیر مارتا ہے لیکن لوگ اسے ہر بار دائرے کے اندر دھکیل دیتے ہیں۔ بعض دفعہ وہ اپنی مرضی کے خلاف بھی پیشنگوئی کرتے ہیں۔ ان کی پیشنگوئیاں کبھی کبھار ہی درست ثابت ہوتی ہیں۔ بعض دفعہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ وہ کسی خاص آدمی، کتے یا رنگ کو دیکھ کر وجد میں آتے ہیں اور انہیں نقصان پہنچانے کی کوشش بھی کرتے ہیں لیکن تماشائی کاہنوں کو دائرہ میں دھکیل کر ایسا کرنے سے باز رکھتے ہیں۔ ان لوگوں کو معاشرہ میں کوئی خاص مقام حاصل نہیں ہوتا۔ جب ''دینل'' کی کارکردگی اختتام پذیر ہوتی ہے اور ماہر کاہن کڑھا (کاؤ) تیار کرتا ہے تو لوگ اس کے چہرے پر پانی چھڑک دیتے ہیں جس سے وہ ماہیٔ بے آب کی طرح تڑپنے لگتا ہے۔ لوگ اسے تھام لیتے ہیں اور کچھ دیر کے بعد وہ ہوش میں آتا ہے۔ بازو بند کڑھا اس کے بازو میں باندھا جاتا ہے جس سے دینل کو لاشعوری حالت میں کہیں گر کر ہلاک ہونے کا خطرہ نہیں رہتا۔ جب تک منتر کا یہ کڑھا اس کے بازو میں ہوگا وہ شعور میں رہے گا اور جب ضرورت پڑے تو اسے اتارنے کے بعد پدم کی دھونی دے کر لاشعوری کی کیفیت میں بھی لایا جاسکتا ہے۔ بعض مؤرخین کے مطابق اس قسم کا فن سیہ پوش کافروں میں بھی پایا جاتا ہے۔ جوں جوں اسلام کا نور پھیلتا گیا یہ فن زوال پذیر ہوتا گیا۔ البتہ گلگت، ہنزہ اور نگر میں کہیں کہیں کاہن اب بھی موجود ہیں۔ معروف پیشنگو ''دینل کھمیٹو'' کا نام آج بھی لوگوں کے دلوں میں زندہ ہے۔

دینل سے متعلق توہمات میں سے ایک توہم یہ ہے کہ پریاں ''چھالو'' نامی ایک خوبصورت لڑکے کو ایک ٹوکرے میں ریشم بھر کر اس پر بٹھا کر لاتی ہیں۔ کبھی کبھار اس لڑکے (چھالو) کی لمبی ریش بھی ہوتی ہے۔ چھالو کو لانے کا یہ مطلب ہوتا ہے کہ اب ساری پریاں (مؤکلات) کا سیٹ Set پورا ہوگیا یعنی کوئی پری پیچھے نہیں رہی۔ چھالو جب تک نہیں لایا جاتا تب تک سیٹ پورا نہیں ہوجاتا۔ چھالو، پریوں، مکھ کُر اور دینل کا طالع ہوتا ہے جو ان میں ہم آہنگی پیدا کرتا ہے۔ کہتے ہیں کہ بگروٹ کا مشہور دینل مسمی ''طالی'' جو عالم پُل سے آگے حراموش کی طرف جاتے ہوئے اپنے ہمسفر ساتھیوں سے اچانک غائب ہوا تھا۔ جس کو غائب ہوئے ڈیڑھ سو سال سے بھی زیادہ کا عرصہ گزر چکا ہے۔ روایت کے مطابق برای نے اس کو چھالو بنالیا ہے جو اب تک زندہ ہے۔ اس کو ریشم سے بھری ٹوکری میں رکھا گیا ہے۔ شنا میں یہ ضرب المثل مشہور ہے کہ ''چھالو بالو نے مسی جونک'' یعنی طالع کا ایک نہ ہونا اور جب تک طالع ایک نہ ہو دو آدمیوں میں دوستی نہیں ہوسکتی، آپس میں وہ اکھٹے نہیں رہ سکتے۔ اسی طرح چھالو نہ ہو تو پریاں دینل اور ''مکھ کر'' جمع نہیں ہوسکتے۔ مکھ کر آجی ایک عمر رسیدہ مؤکلہ ہوتی ہے جو چھالو برای کا سیٹ اور دینل کو تابع رکھتی ہے۔ سب اس کے حکم کی تعمیل کرتے ہیں۔ اسی کے حکم سے برای یا راجھیئے دور دور جا کر خبریں لاتی ہیں اور دینل کی زبان سے گیت کی شکل میں سرُ کے ساتھ کہلواتی ہیں۔

کہانت میں ایک اصطلاح ''سُجہ کُم'' یعنی پاکیزگی کے معنوں میں مستعمل ہے۔ دینل اپنے آپ کو غیر پاکیزہ چیزوں سے دور رکھتا ہے۔ دینل نہ گائے کا دودھ پیتا ہے نہ گوشت کھاتا ہے۔ کسی گھر میں موت واقع ہونے کی صورت میں جب تک متاثرہ گھر میں کسی جانور کی قربانی نہ کی جائے دینل اس میں نہیں جاتا۔ اسی طرح عورتوں کے حیض ونفاس کے دنوں میں بھی وہ گھر میں داخل نہیں ہوتا۔ یہ ایک طرح سے دینل کا پرہیز ہے۔ اگر دینل بدپرہیزی کرے تو اس سے اس کی مؤکلات (راجھیئے یا برائے) ناراض ہوتی ہیں۔ جس کی وجہ سے کاہن بیمار ہوتا ہے۔ جسے ''ڈِملجونک'' کہتے ہیں۔ جب راجھیئے یا برائے ناراض ہوتی ہیں تو ایسی صورت میں دینل سات ایسی چھوٹی لڑکیوں کو جن کے ماں باپ زندہ ہوں، بلا کر چھت پر بادریہ کے اردگرد بٹھاتا ہے اور اکیس عدد چھوٹی روٹیاں پکوا کر ان پر مکھن کی لپائی کرتا ہے اور ان روٹیوں کے ساتھ اخروٹ کے اکیس دانے اور تین دانے انار ایک برتن میں ڈال کر بادریہ کے ذریعے چھت پر بیٹھی ہوئی لڑکیوں میں تقسیم کرتا ہے۔ لڑکیاں مل کر روٹی اور پھل کھا کر دعائیہ اشعار (شاپ) گاتی ہیں۔ دینل کے مطابق اس عمل سے راجھیئے یا برائے راضی ہوجاتی ہیں اور دینل ٹھیک ہوجاتا ہے۔

راجہ گوہرامان کی کہانی:

بعض روایات کے مطابق راجہ گوہرامان کی گلگت میں حکمرانی کے دوران اہل بگروٹ اور حراموش نے ان کی حکمرانی قبول نہیں کی۔ جس کی وجہ سے ان مؤضع جات کے لوگ اکثر انکے عتاب میں رہے۔ گوہرامان نے انہیں زیر کرنے کیلئے مقامی جاسوسوں کا جال پھیلایا۔ ان جاسوسوں کا سرغنہ بگروٹ سے تعلق رکھتا تھا۔ جس کا نام ڈوڑو تھا۔ گوہرامان نے ڈوڑو کو یہ لالچ دی کہ سِنکر (بگروٹ) کا قلعہ اگر تم نے فتح کرایا تو وزیر کے منصب پر فائز کردونگا۔ اس دور میں راجہ اسحاق علی حراموش اور بگروٹ کا راجہ تھا۔ ڈوڑو نے گوہرامان کی فوج کو سنکر قلعہ کے باہر چھوڑ کر خود حالات کا جائزہ لینے کیلئے اندر چلا گیا۔ اس وقت قلعہ کے اندر صرف ایک من غلہ تھا۔ مکانوں کی چھتوں پر خواتین مختلف ٹولیوں میں بیٹھ کر غلہ صاف کررہی تھیں۔ وہ کئی ٹولیوں میں بیٹھ کر گوہرامان کی فوج کو یہ تاثر دینا چاہتی

تھیں کہ قلعے کے مکینوں کیلئے اناج وافر مقدار میں موجود ہے۔ڈوڑو اندر کی صورتحال دیکھ کر سمجھ گیا کہ غلے کا ذخیرہ ختم ہوگیا ہے۔لہٰذا اگلے دن ہی ڈوڑو کے کہنے پر قلعے پر حملہ کردیا گیا جس کے نتیجے میں محصورین نے ہتھیار ڈال دئے۔ ڈوڑو اپنی اس کامیابی پر پھولے نہیں سمایا اور اسے یقین ہوگیا کہ اب وزارت کا منصب اس کے قدم چومے گا۔ادھر گوہرامان کے مشیروں نے اسے یہ مشورہ دیا کہ لالچی آدمی کسی کا نہیں ہوتا۔آج اس نے اپنے لوگوں سے غداری کی ہے کل کلاں آپ (راجہ گوہرامان) سے بھی غداری کرسکتا ہے۔لہٰذا عمائدین دربار کے مشورے پر ڈوڑو کو قتل کردیا گیا۔راجہ گوہرامان نے بگروٹ کے بعد حراموش کے علاقے کو اپنی عملداری میں لانے کے لئے کمر باندھ لی۔لہٰذا اس سلسلے میں جاسوسی کیلئے سلم بیگ نامی شخص کی خدمات حاصل کیں۔عبداللہ ملنگ کے مطابق جاسوس کے مشورے پر حکمران نے اعلان کیا کہ آئندہ جب بھی کسی کی شادی ہوجائے تو دلہن، دولہا کے پاس بھیجنے سے پہلے میرے حرم میں لائی جائے۔یہ اعلان سن کر اہل حراموش بڑے پریشان ہوئے اور اسی خوف میں تقریباً تین سال تک کسی کی شادی نہیں کی گئی۔لوگوں نے حکمران کے خلاف پے درپے اجلاس کئے اور سلم بیگ کو کانوں کان خبر ہونے نہیں دی۔آخر کار راجہ کے خلاف سازش تیار کی گئی، جس میں سلم بیگ کو بھی ملوث کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔لوگوں نے منصوبے کے تحت راجہ گوہر امان کو پیغام بھیجا کہ حراموش میں بارہ دلہن تیار ہیں۔انکے لئے یا تو راجہ گوہرامان خود آئے یا بارہ دولہے بھیجے۔باراتیوں کی کوئی قید نہیں، جتنے لاسکتے ہیں لائے جائیں۔لہٰذا گوہرامان تک اہل حراموش کا یہ پیغام پہنچایا گیا۔ایک روایت کے مطابق بارہ لڑکوں کو زنانہ لباس عروسی پہنا کر دلہن بنائے گئے تھے۔اس دوران گوہر امان نے دینل کھیل کھیلنے کیلئے گلگت کی مشہور کاہنہ ''دینل کوٹی'' کو دربار میں بلایا۔ کوٹی شنا میں بہری کو کہتے ہیں شاید یہ کاہنہ عورت بہری ہونے کی وجہ سے اس نام سے موسوم ہوئی ہوگی۔اس کا اصل نام معلوم نہیں۔دینل کھیل کیلئے پنڈال سجا کر اس کا آغاز کیا گیا۔کاہنہ پر جب مخصوص کیفیت طاری ہوئی تو اس موقع پر جو پیشن گوئیاں اس نے اپنی مخصوص لے میں بیان کیں اس کا شنا متن اور اردو ترجمہ درج ذیل ہے:-

رَون، پُھرو سنگئہ لین بُلَی ھگای کوٹ درُو
رَون، پُھرو سنگئہ لین ماگی پشی آلِس
یم چِدن حِنین نا ھگای بُلے درُو
یم چِدن حِنین نا ماگی پشی آلِس
سارپو نوسی گہ تھین ھگای بُلے درُو
سارپو نوسی گہ تھین ماگی پشی آلِس
لیل گُروئے گہ بین ، ھگای بُلے درُو
لیل گُروئے گہ بین کائیں بگاں گہ بین

ترجمہ:

بُلے داس حراموش میں ایک تاریخی مقام کا نام ہے۔اس داس کے آس پاس بلندی پر ایک قلعہ (کوٹ) تھا، جسے بلندی پر واقع ہونے کی وجہ سے ''ھگای کوٹ'' یعنی آسمان کے مانند بلند قلعہ، کہتے تھے۔کاہن یا کاہنہ پیشن گوئی کے الفاظ شاعری کے وزن پر ادا کرتے ہیں۔لیکن اس میں قافیہ ردیف کی کوئی پابندی نہیں ہوتی۔پہلی پیشن گوئی کا ترجمہ یہ ہے کہ اہل حراموش فساد کی آگ بھڑکانے کیلئے بُلے داس میں واقع ''ھگای کوٹ'' میں سر کنڈے اور افسنتین جمع کررہے ہیں یعنی سازشیں عروج پر ہیں۔جسے میں اے میرے پیارے! دیکھ آئی ہوں۔

غیر مرئی مخلوق ''یمالے'' بُلے نامی مقام پر دیگ چڑھائینگے یعنی ان میں انسانی گوشت پکے گا۔جسے میں اے پیارے دیکھ آئی ہوں۔یہ پیشن گوئی متوقع انسانی قتل عام کی طرف اشارہ کرتی ہے۔

ھگای کوٹ میں انسان ''نسالو'' کے جانوروں کی طرح ذبح کئے جائینگے۔جسے میں اے میرے پیارے دیکھ آئی ہوں۔

بُلے داس میں واقع ''ھگای کوٹ'' میں خون کی ہولی کھیلی جائے گی۔ اور کوے آپس میں انسانی گوشت تقسیم کریں گے۔یعنی اتنا قتل عام ہوگا کہ انسانی لاشیں جگہ جگہ بکھری ہوئی ہوں گی اور کوے ایک عرصے تک ان پر گزر بسر کرینگے۔

جب کاہنہ یہ پیشن گوئیاں کرچکی تو وزیروں سے گوہرامان نے پوچھا کہ یہ کیا کہہ رہی ہے۔وزیروں کو بھی کچھ سمجھ نہیں آیا تھا لیکن انہوں نے بلاسوچے سمجھے کہا کہ کاہنہ نے اچھی باتیں کیں اور سب کچھ ٹھیک کہا۔لہٰذا بات آئی چلی گئی اور سنی ان سنی کردی گئی۔

راجہ گوہرامان نے اہل حراموش کی شرط منظور کی اور راجہ خاندان کے بارہ جوانوں کی دستار بندی کی اور انہیں دولہے بنا کر اسی (80) باراتیوں کی معیت میں حراموش روانہ کردیا۔ادھر سلم بیگ بھی اہل حراموش کے بگڑے تیور دیکھ کر انکے ساتھ مل گیا۔اہل حراموش کے نمائندہ لوگوں میں سے بعض نے کہا کہ دولہوں اور باراتیوں کی آمد پر سلم بیگ پنڈال میں تلوار رقص کرتے ہوئے باراتیوں کے لیڈر پر حملہ کرکے لڑائی کا آغاز کرے گا جبکہ بعض نے کئی اور لوگوں کے نام تجویز کرتے ہوئے کہا کہ سلم بیگ لاف زنی میں مشہور ہے۔مردانہ کام کی توقع اس سے نہیں

کرنی چاہئے۔ گویا سلم بیگ کی غیرت جگانے کے لئے اسطرح کی باتیں منصوبے کے تحت ہوئیں۔ اس دوران حراموش میں غلام علی نامی ایک نمبردار (ترنگفہ) تھا۔ قلعے میں سٹیج سجائی گئی اور بارہ شہزادوں (دولہوں) کو ترتیب سے سٹیج پر رکھا گیا۔ ترنگفہ غلام علی باراتیوں کے قافلہ سالار کی پشت پر تلوار ہاتھ میں لئے نگہبان کی طرح کھڑا رہا۔ اسی (80) باراتیوں کو اس ترتیب سے رکھا گیا کہ ہر باراتی کے دونوں جانب دو حراموش کے جوان حسب سازش بٹھائے گئے ادھر ڈھول باجے بجنے لگے ادھر تلوار رقص کیلئے ایک دو دفعہ جوان پنڈال میں آئے اور ناچ کر چلے گئے تاکہ باراتی مشکوک نہ ہوں۔ بعد میں جب ایک جوان رقص کر رہا تھا تو پنڈال سے کسی حراموشی نے گونجدار آواز میں کہا کہ یہ کیا ناچے گا۔ اگر رقص سے محظوظ ہونا ہے تو سلم بیگ اور ساتھیوں کو بھیجو۔ چنانچہ سلم بیگ کے ساتھ گیارہ اور جوان تلوار ہاتھ میں لئے پنڈال میں کود پڑے اور اپنے رقص کے جوہر کی کچھ جھلکیاں دکھائیں اور سٹیج پر براجمان قافلہ سالار کے قریب جا کر سلم بیگ نے اس پر اچانک تلوار سے وار کر دیا۔ جبکہ ترنگفہ غلام علی نے پشت سے تلوار چلائی دیکھتے ہی دیکھتے سٹیج پر موجود شہزادوں کا کام تمام کیا گیا اور تمام باراتیوں کی گردنیں کاٹ دی گئیں۔ جن کی کل تعداد 92 تھی۔ البتہ ان میں ایک باراتی کی جان بچ گئی۔ کیونکہ وہ قتل عام کے دوران حراموش کے کسی معتبر سے لپٹ گیا اور اس کی پستان پر ہونٹ رکھے۔ جسکی وجہ سے حسب روایت اسے امان ملی۔ اسکے بعد زندہ بچے ہوئے باراتی کو آزاد کیا گیا۔ وہ جانب منزل روانہ ہوئے۔ لیکن جونہی وہ سسی اور ھنوحل کے درمیان واقع مقام جسے ''**تُرنَی شونگ**'' کہتے ہیں، پہنچا تو وہاں پر موجود پہرہ داروں نے اسے باغی سمجھ کر پکڑا اور دوبارہ حراموش کے عمائدین کے سپرد کر دیا۔ اس دفعہ معتبروں نے اجلاس بلایا اور یہ فیصلہ کیا کہ اسے صحیح سلامت رہا کرینگے تو یہ جلدی سیدھا راجہ گوہرامان کے پاس جا کر صورت حال سے آگاہ کرے گا تو وہ (راجہ گوہر امان) فوراً حراموش پر چڑھائی کرے گا۔ لہٰذا بہتر یہی ہے کہ اسے رہائی اس طرح دی جائے کہ راجہ کے پاس پہنچتے پہنچتے کافی دن گزر جائیں۔ جسب فیصلہ اسکے ہاتھ پیٹھ کے پیچھے باندھے گئے ایک ڈھول گلے میں ڈالا گیا اور زبان کی نوک پر زخم کر دیا تاکہ دربار میں جا کر بات بھی نہ کر سکے اور اسطرح گوہرامان کے عذاب سے بچ جائیں۔ اِدھر گوہرامان شہزادوں اور باراتیوں کے انتظار میں بے قرار تھا۔ اس موقع پر بھی اس نے دینل کا سہارا لیا اور کاہنہ کوٹی کو بلا کر پھر محفل سجائی۔ کاہنہ پر جب مخصوص کیفیت طاری ہوئی تو اس نے پیشن گوئی ان الفاظ میں کی۔

ڈڈرَی انوہ بِگیت نا آجَی حراموشی
ڈڈرَی انوہ بِگیت نا کو اُسہ چوئک دُبین

ترجمہ:

اے میرے حراموش کے بیٹو! تم پتھریلی جگہ پر گرا ہوا انوہ (کنگنی) کے باریک دانے کی طرح لاحاصل ہو گئے۔ اسلئے تم تک کوئی نہیں پہنچ سکتا یعنی تم کامیاب منصوبہ ساز ہو اور ذہانت میں تمہارا کوئی ثانی نہیں۔ انوہ کی فصل سے چاول کی طرح کی ڈش بنتی ہے۔ اسے چاول کا متبادل کہا جاسکتا ہے۔ اس قتل عام کے بعد سارے لوگ گوہرامان کے حملے کے خوف سے حراموش سے مفرور ہوئے اور بلتستان کی طرف ہجرت کی اور گوہرامان کی موت تک حراموش کا رخ نہیں کیا۔ مذکورہ شعر میں اہل حراموش کے لاحاصل ہونے کا اشارہ شاید اسی فرار کی طرف ہی ہے۔

گوہرامان نے اپنے وزیروں سے پھر پوچھا کہ اس (کاہنہ) نے کیا باتیں کیں۔ مصاحبوں نے پھر ''سب ٹھیک'' کا اشارہ دیا۔ اس کے بعد حراموش سے زخمی حالت میں چھوڑا ہوا راجہ گوہرامان کا آدمی دربار میں پہنچا تو اسکے ہاتھ کھول دئے گئے۔ وہ زبان سے تو کچھ نہ کہہ سکا۔ البتہ ہاتھوں کے اشارے سے سارا ماجرا سنایا۔ راجہ گوہرامان تمام صورت حال جان کر آگ بگولا ہو گیا اور اس کے غصے کی انتہا نہ رہی۔ گوہرامان نے کوٹی کاہنہ کو تیسری بار بلایا اور اسے غلط بیانی کا الزام دیکر قتل کر دیا گیا۔ حالانکہ اس کی پیشن گوئیاں سچ پر مبنی تھیں۔ لیکن گوہرامان کے مشیروں نے غلط بیانی سے کام لیا تھا۔ ادھر سلم بیگ اپنے سابقہ کرتوتوں کی وجہ سے قابل اعتبار نہیں رہا تھا اسلئے اہل حراموش بعد میں جب اس کے قتل کے درپے ہوئے تو اس (سلم بیگ) نے اپنے بھانجے کے ہاتھ میں تلوار دے کر کہا کہ کسی اور کے ہاتھ سے مرنے سے بہتر ہے کہ تم خود مجھے قتل کر دو۔ بھانجے نے تلوار چلائی تو سر تن سے جدا ہوا۔ تلوار چلاتے وقت سلم بیگ نے بھانجے کیلئے اس تابعداری پر اپنی زبان سے شاباش کے الفاظ ادا کرنا چاہا تو اتنے میں سر تن سے جدا ہوا اور روایت کے مطابق زمین پر پڑے کٹے ہوئے سر سے ''شاباش'' کے الفاظ ادا ہوئے۔

کاہن سے لیے جانے والے دیگر کام:

کاہن سے یہاں کے لوگ ایک اور کام بھی لیتے تھے۔ جب کبھی کسی کے گھر میں بیماری کا دور دورہ ہو جائے تو متاثرہ گھر کے لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ کسی دشمن نے ضرر پہنچانے کے لئے گھر میں ٹونا ٹوٹکہ یا تعویذ وغیرہ کیا ہے۔ اسی لئے گھر میں بیماریوں نے ڈھیرے ڈالے ہیں۔ ایسی صورت میں کاہن کی خدمات حاصل کی جاتیں۔ کاہن کو صندل کی شاخوں سے دھونی دی جاتی۔ جب اس پر مخصوص کیفیت طاری ہوتی تو وہ اپنی جگہ سے اٹھتا اور گھر کے اندر یا باہر عین اس مقام کی طرف اشارے سے نشاندہی کرتا جہاں پر ٹونا ٹوٹکہ یا تعویذ وغیرہ کر کے دفن

کیے گئے ہوں۔ متاثرہ گھر کے افراد فوراً اس جگہ پر زمین کی کھدائی کرتے تو تعویذ یا ٹونہ، ٹوٹکہ وغیرہ ضرور نکلتا۔ جسے گھر کے لوگ کسی عالم یا عامل کے پاس لے جا کر دکھاتے تو وہ بتاتا کہ دشمن نے فلاں ضرر پہنچانے کے لئے یہ عمل کیا ہے۔ ایسے مواقع پر کاہن کو موسیقی وغیرہ کے سہارے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ کاہن بھی کسی حاجت مند سے کوئی نشانی لے کر اسے سوتے وقت اپنے سرہانے کے نیچے رکھ دیتا ہے رات کو خواب یا نیم خوابی میں کاہن کا تابع جن باتوں سے آگاہ کرتا ہے صبح وہی باتیں کاہن حاجت مند کو بتلا دیتا ہے۔ کہانت پیشہ لوگ آج کل نہ ہونے کے برابر ہیں۔ یہاں کے نامور کاہنوں میں دینل کھمیٹو کے علاوہ ضرب علی، تالی، نومل کا محمد شفا عرف شفایو، بڑولس کا اصغر، نلت کا بیکو، چھروٹ کا غریبو، دنیور کا شکور علی (سکار) اور محمد علی، نوپورہ بسین کا عبدالمجید، بر کا رئیس خان، گلمت کا رجب، جلال آباد کا غلام مصطفیٰ، مورتوضی (مرتضیٰ) وغیرہ بہت مشہور ہیں۔ ایک روایت کے مطابق اگر کوئی کاہن، کہانت سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہے تو وہ تعویذ اور دم درود کے علاوہ کم از کم اکیس میتوں کو غسل دے کر اس سے اپنی جان چھڑا سکتا ہے۔ ہمارے معاشرے میں کہانت کے نقوش گہرے ہیں۔ یہاں کی موسیقی، شاعری، زبان، رسم ورواج اور تہذیب وتمدن کہانت کے اثرات سے بھری پڑی ہیں۔ جس سے پتہ چلتا ہے کہ کہانت ان علاقوں میں ابتدا ہی سے موجود رہی ہے۔ اگرچہ دینل بذاتِ خود کچھ نہیں جانتا ہے لیکن اس کی مؤکلات (برایے) اس کو علاج معالجے کا طریقہ سکھاتی ہیں۔ علاج معالجے کے علاوہ اگر کوئی حاجتمند اپنی حاجت براری کیلئے نیت کر کے دینل کی خدمات حاصل کرے تو دینل اس کی حاجت براری کا طریقہ بتا دیتا ہے۔ اگر حاجت کا پورا ہونا ناممکن ہو تو اس سے بھی مطلع کرتا ہے۔ دردِ زہ کے وقت حاملہ خواتین کاہن سے کسی چیز یا پانی پر ''ویو'' کا عمل کراتی ہیں، جس سے وضعِ حمل میں آسانی ہوتی ہے۔ دینل اپنے عمل کے ذریعے نہ صرف مال مسروقہ برآمد کرتا ہے بلکہ بعض دفعہ چور تک کی نشاندہی بھی کرتا ہے۔ الغرض کاہن انسان کے دکھ درد کا ساتھی سمجھا جاتا ہے۔

روایت کے مطابق کاہن منتر (دُرگنی) سے کسی پری کو نہ صرف تابع کر سکتا ہے بلکہ چاہے تو شادی بھی ہو سکتی ہے اور اولاد بھی پیدا کر سکتا ہے۔ البتہ ایسا کرنا خطرناک تصور کرتے ہیں۔ کیونکہ اس سے نقصان کا احتمال ہوتا ہے۔ کہتے ہیں کہ بگروٹ کے ''طالی'' نامی کاہن منتر کے ذریعے ایک پری سے شادی کی تھی۔ جس سے ایک لڑکی بھی پیدا ہوئی۔ اس نے منتر (دُرگنی) گنو کے ذریعے پری کے سر کے بالوں میں گانٹھیں لگا کر تابع کیا تھا۔ کاہن ''تالی'' ڈوگرہ دورِ حکومت میں گلگت سے سرکاری سامان لے کر سکردو جانے والے قلیوں کے قافلے میں شامل تھا۔ جب قلیوں کا یہ قافلہ عالم پل سے آگے خراموش کی طرف جاتے ہوئے کچھ دیر ستانے کیلئے راستے میں ٹھہرا تو اس اثناء میں کاہن طالی اچانک پہاڑ کی جانب روانہ ہوا اور دیکھتے ہی دیکھتے آنکھوں سے اوجھل ہوا۔ ادھر بگروٹ میں طالی کی بیٹی نے اپنی ماں، جو کہ اصل میں پری تھی اور سوئی ہوئی تھی، کے بالوں کی گانٹھیں کھولنی شروع کیں۔ گانٹھوں کا کیا کھلنا تھا ماں (پری) غائب ہوگئی اور اپنے شوہر طالی کی تلاش میں خراموش پہنچ گئی اور اپنے ساتھ اسے بھی غائب کر دیا۔ اس کے بعد سے کاہن طالی کا کچھ اتہ پتہ نہیں۔ بعض لوگوں کے مطابق طالی کو پریوں نے ''چھالو'' بنا کر ٹوکری میں رکھا ہے جو بہت لاغر حالت میں آج بھی زندہ ہے۔

جن کا قصہ:

ماضی میں توہمات اور بے یقینی کا یہ عالم تھا کہ ہر بیمار کو ''بدنظری'' جن بھوت اور پریوں کا شکار ٹھہرا کر متعلقہ عاملوں سے رجوع کرتے۔ بعض حضرات ہاتھ دیکھ کر لوگوں کی قسمت کے بارے میں پیشگوئیاں کرتے، جو کبھی ٹھیک اور کبھی غلط ثابت ہوتیں۔ یہاں کی روایات کے مطابق جب بچے روتے یا تنگ کرتے تو مائیں یا دوسرے بہن بھائی بچوں کو جنوں، بھوتوں اور غیر مرئی مخلوق کے خوفناک تذکرے کر کے ان کے منہ بند کراتے۔ کبھی کبھی بلیوں اور کتوں کا خوف ان کے دل میں ڈال کر انہیں سلاتے۔ عامل چلہ کاٹ کر تسخیر جن کرتے ہیں۔ شروع شروع میں عامل کو جنات کی ڈراؤنی شکلیں دکھائی دیتی ہیں۔ کہتے ہیں کہ وہ ثابت قدم رہے تو چالیسویں روز شاہ جنات حاضر ہوتا ہے اور کسی جن کو عامل کی خدمت پر مامور کرتا ہے۔ اس کے بعد وہ جن عامل کے حکم کے مطابق عمل کرتا ہے۔ اسی کو تسخیر جن کہتے ہیں۔ عامل اپنے عمل کے ذریعے جب جن کو پکڑتا ہے تو آخر میں اسے حضرت سلیمانؑ کا واسطہ دیا جاتا ہے جس سے وہ خوفزدہ ہو کر بھاگ جاتا ہے۔ کہتے ہیں کہ جن نمک، لوہے، مہندی اور چمڑے سے دور بھاگتے ہیں اور تیز روشنی کے قریب بھی نہیں پھٹکتے۔ بعض اوقات جن نکالنے کے لئے روئی کی بتی بٹ کر اسے دم کئے ہوئے چراغ میں جلاتے ہیں۔ اس موقع پر ضرورت پڑے تو عامل مریض کے جسم پر تشدد کرنے سے بھی دریغ نہیں کرتا۔ اس تشدد کی وجہ بتاتے ہوئے عامل کہتا ہے کہ دراصل وہ یہ تشدد مریض پر نہیں کرتا بلکہ جن پر کر رہا ہے۔ جو لوگوں کو نظر نہیں آ رہا ہے۔ عامل جن کو حضرت سلیمانؑ کی انگوٹھی پر قسم دلاتا ہے کہ وہ آئندہ متاثرہ شخص کو تنگ نہیں کرے گا۔

جادو:

ان علاقوں میں جادوگری کا کام بھی ہوتا رہا ہے۔ جب کبھی کسی شخص پر جادو کرنا مقصود ہوتا تو بعض دفعہ جادوگر مطلوبہ شخص کے بال، ناخن اور پیروں کے نیچے کی خاک لے کر اس پر منتر وغیرہ پڑھتے۔ کالا سفید مرغی، مرغا، بکرا، بکری وغیرہ

کے خون سے ٹونے ٹوٹکے لکھنے کے بہانے ان جانوروں کے گوشت سے مزے اڑاتے۔ کبھی کبھار منتر پڑھ کر دھاگے میں گرہ ڈال دیتے تو ان کے دعوے کے مطابق گائے بھینس دودھ دینا بند کر دیتیں یا مرد اکثر بیماریوں کا شکار رہتے۔ عورتیں اپنے خاوندوں پر قابو پانے کے لئے انہیں تعویذ گھول کر پلا دیتیں۔ جس گھر میں لڑائی جھگڑا کرانا مقصود ہوتو اس کے کسی کونے میں چوری چھپے تعویذ دفن کر دیتے تو واقعی گھر میں فساد برپا ہوتا اور متاثرہ گھر کے لوگ یہی کہتے کہ ''گوٹ تمری کھٹے گین''، یعنی گھر میں کسی بدخواہ نے تعویذ دفن کئے ہیں۔ ایسی صورت میں کاہنوں کی خدمات حاصل کی جاتیں جو اپنی مخصوص حالت میں اس جگہے کی نشاندہی کرتے جہاں تعویذ دفن کئے گئے ہوں لہٰذا تعویذ نکال کر حسبِ ہدایت تلف کئے جاتے اور لڑائی جھگڑے سے خلاصی حاصل ہوتی۔ فال گیری کے بھی کئی طریقے ان علاقوں میں مروج ہیں۔

پری کا قصہ:

گوہر آباد (غور) چلاس کے نامور شاعر اور شین قوم کے چشم و چراغ محمد حسین مرحوم کے مطابق وہ ننگا پربت کی چراگاہ میں زمانہ لڑکپن میں بھیڑ بکریاں چرا رہا تھا۔ جب دن بھر کی مشقت سے بدن ٹوٹنے لگا تو کسی سایہ دار جگہ پر ستانے بیٹھ گیا۔ بیٹھے بیٹھے نیند کا غلبہ ہوا۔ نیم بیداری کے عالم میں کیا دیکھتا ہے کہ اچانک ایک پری پیکر عورت پہلو میں آ کر بیٹھ گئی۔ محمد حسین نے جب اس عورت سے پوچھا کہ تم کون ہو تو اس نے کہا کہ وہ پری زاد ہے اور کوہ قاف سے آئی ہے۔ پری نے مزید بتایا کہ ایک دن میں (پری) اپنی دوسری پری زادوں کے ساتھ گوہر آباد (غور) کی فضاؤں میں سے پرواز کر رہی تھی کہ اس دوران میری نظر تجھ (محمد حسین) پر پڑی کیونکہ تیری ماں تجھے کھیت کے باہر چھوڑ کر گوڈی کر رہی تھی۔ اس دوران تو بچہ اور تیرا چہرہ آسمان کی طرف تھا۔ تیرا خوبصورت چہرہ، طفلانہ حرکتیں اور اچھل کود دیکھ کر میں تم پر عاشق ہوگئی۔ اس کے بعد سے میں اکثر تجھے چھپ چھپ کر دیکھا کرتی تھی۔ میں ایک لمبے عرصے تک تمہارے قریب ہو کر بھی دور رہی لیکن آج میں نے فیصلہ کیا کہ تجھ سے ضرور ملوں۔ سو آج تمہارے روبرو آئی ہوں۔ پری ملاقات کے وقت پردہ کیا کرتی تھی۔ محمد حسین کی طرح پری بھی شاعری کرتی تھی۔ جب وہ شاعری کرتی تو محمد حسین ناچتا اور جب محمد حسین شاعری کرتا تو وہ اسے خاموشی سے دیکھتی۔ ان دونوں کے درمیان ملاقاتوں کا یہ سلسلہ ایک عرصے تک جاری رہا۔ ایک دفعہ محمد حسین نیم بے ہوشی کے عالم میں تھا تو اس (پری) نے اسے جگایا اور کہا کہ جلدی سے اٹھو کہ تمہاری بھیڑ بکریوں پر چیتا حملہ آور ہوا ہے۔ جب محمد حسین نے دیکھا تو واقعی چیتا بکریوں کے ریوڑ پر حملے کے لئے تیار تھا۔ تقریباً تین مہینے تک اسی طرح کی رفاقت کے بعد ایک دن اچانک محمد حسین کی زبان بند ہوگئی۔ جب وہ آدم زاد کے پاس آتا تو بات نہیں کر سکتا لیکن پری زاد کے پاس جاتا تو زبان کھل جاتی۔ اس کی یہ حالت دیکھ کر اس کے ماموں زاد بھائی مسمی عبدالغفار نے علاقے کے علماء سے تعویذ بنوائے، ختم شریف اور دم درود کا بندوبست کیا۔ جب دم درود کا عمل زور پکڑتا گیا تو محمد حسین کے مطابق اسے یوں محسوس ہونے لگا کہ اسکے جسم پر بجلی کی کرنٹ لگی ہے۔ محمد حسین اشاروں سے انہیں ایسا نہ کرنے کے لئے کہتا لیکن علماء اپنے عمل سے باز نہ آتے۔ اس کے بعد سے اس پری کی آمد کا سلسلہ بند ہوا۔ لیکن تقریباً 20 دنوں کے بعد وہ پری ایک عام عورت کی شکل میں پھر نمودار ہوئی۔ پری کا رو رو کر برا حال ہوا تھا۔ اس نے محمد حسین سے کہا کہ تیرے بھائی نے دم درود کے ذریعے مجھے تمہاری ملاقات کیا تمہارے علاقے سے بھی دور کر دیا ہے۔ آج اپنی جان جوکھوں میں ڈال کر تم سے الوداعی ملاقات کے لئے آئی ہوں۔ اس کے بعد پری نے محمد حسین سے مصافحہ کیا اور خدا حافظ کہہ کر چلی گئی۔ جدائی کا یہ منظر دیکھ کر محمد حسین بے ہوش ہو گیا اور ایک پورا دن اور رات بھر وہ بے ہوشی کے عالم میں وہاں پڑا رہا۔ دوسرے دن جب وہ ہوش میں آیا تو اس کے ہاتھ میں ایک خوشبودار رومال تھی۔ اسے دیکھ کر سونگھا تو ایک بار پھر بے ہوش ہوا اور دوسرے دن بھی وہاں پر بے یار و مددگار پڑا رہا۔ جب دیر تک گھر نہیں لوٹا تو تیسرے دن اس کا بھائی اس کی تلاش میں چراگاہ کی جانب نکلا۔ دوسری جانب اپنے مالک کو بے ہوش پا کر ایک بکرے نے جسے محمد حسین اپنے ہاتھوں سے نمک کھلاتا تھا، اس کے پاؤں کے تلوے چاٹنے شروع کئے۔ جس پر وہ بیدار ہوا۔ بیدار ہوتے ہی اس کے کان میں اپنے بھائی کی آواز گونجی تو اس نے اپنی موجودگی کی اطلاع دینے کی خاطر سیٹی بجائی تو بھائی سمجھ گیا کہ محمد حسین زندہ و سلامت ہے۔ آخر کار ڈھونڈتے ڈھونڈتے بھائی محمد حسین کے پاس پہنچ گیا۔ محمد حسین کی حالت زار دیکھ کر بھائی کی آنکھوں میں آنسو آئے اور وہ محمد حسین سے لپٹ کر زار و قطار رونے لگا۔ بھائی محمد حسین کو گھر لے گیا اور اس کے بعد محمد حسین نے چرواہے کا کام چھوڑ دیا۔ محمد حسین کا دل گاؤں میں نہیں لگا۔ وہ تعلیم کے بہانے گاؤں سے ہجرت کر کے ایک عرصے تک غریب الوطنی کی زندگی گزارتا رہا۔ وہ زندگی بھر اس پری زاد یا اس کی ہم شکل کی تلاش میں مارا مارا پھرتا رہا لیکن لذتِ وصل سے محروم رہا۔ دورانِ رفاقت ایک دفعہ جب محمد حسین نے اس پری پیکر سے کہا کہ وہ (پری) اپنے جسم کا دیدار کرائے تو اس کا کہنا تھا کہ تم (محمد حسین) صرف میرا رومال سونگھ کر بے ہوش ہوتے ہو۔ اگر سارا جسم دیکھو گے تو جل کر راکھ ہو جاؤ گے۔ پھر (پری) اور محمد حسین کے درمیان شنا میں منظوم مکالمہ ہوا اس کے چند شعر:-

پری:　　مئی مقام کوہِ قاف ھنی، چل گی تٹ مراد ھنی
وینا نہ تھہہ ایتو سیل گی دون دورا

محمد حسین : وقتہ مازگری ھنو ، غیبی آوازک بئ ھنو
پشوبالس نے بلہہ ڈوبئ خزانا
پری : مئی مقام صحیح نہ بئ تھئی تصور اصلی نہ بئ
پشوبا نہ ھن مٹ جو کئی تھان گلا
محمد حسین : مج غموانہہ حال ھنی تگہ چھجونی تیار ھنی
جندئی پشوکی نصیب تھہہ یااللہ!

ترجمہ:

اے محمد حسین! تجھے پہلے سے ہی پتہ ہے کہ میرا مسکن کوہ قاف میں ہے۔ تو میرے لئے بے قرار ہونے کی بجائے میرے ساتھ آؤ تو تجھے اپنے علاقے کی خوب سیر کراؤں گی۔ (پری)

عصر کا وقت ہے، مجھے کوئی غیبی آواز سنائی دے رہی ہے لیکن میں اس انمول چھپے ہوئے خزانے کو دیکھ نہ سکا۔ (محمد حسین)

مجھے نہ اپنا مقام اور نہ تیرا تصور اصلی لگتا ہے۔ مجھے تو دیکھ نہیں سکتا تو اس میں میرا کیا قصور ہے؟ لہٰذا مجھ سے گلہ نہ کر۔ (پری)

میں تمہارے غم میں نڈھال ہوتا جا رہا ہوں کیونکہ تو مجھے داغِ مفارقت دینے والی ہے۔ یا اللہ مجھے اپنی زندگی (محبوب) کا دیدار پھر نصیب فرما۔ (محمد حسین)

چڑیل (رُنی):

چڑیل کو شنا زبان میں ''رُنی'' کہتے ہیں۔ روایات کے مطابق چڑیلوں کی درج ذیل چار قسمیں ہوتی ہیں:-

۱۔ اتولی رُنی

کمزور چڑیل کو ''اتولی رنی'' کہتے ہیں۔ یہ عموماً اپنے خاندان کے لوگوں کو شکار کرتی ہے۔ شنا میں ایک کہاوت ہے کہ ''اتولی رنی سے تو موک چپی'' یعنی کمزور چڑیل اپنوں کو شکار کرے، بہت مشہور ہے۔

۲۔ سُتولی رُنی

یہ چڑیل اتولی رُنی کی نسبت طاقت ور ہوتی ہے اور عموماً خاندان سے باہر کے لوگ اس کا نشانہ بنتے ہیں۔

۳۔ سبنی رُنی

اس چڑیل کو کہتے ہیں جس کا شکار چھوٹے چھوٹے بچے ہوتے ہیں۔

۴۔ شوشولی رُنی

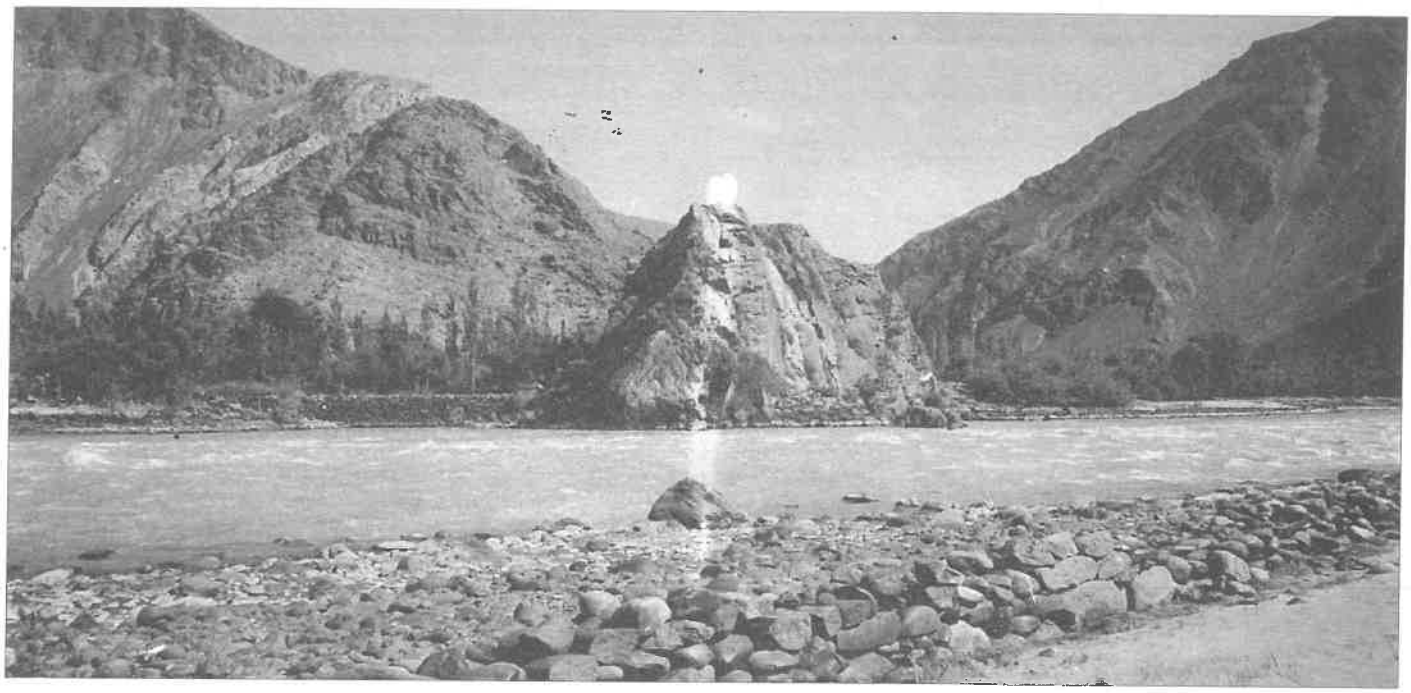
یہ چڑیل عموماً دائمی مریضہ ہوتی ہے جو اپنا شکار ہضم نہیں کر سکتی۔ اسی نسبت سے بیمار بوڑھی عورتوں کو شوشولی سے تعبیر کرتے ہیں۔

یہاں کے لوگوں میں چڑیل کے تذکرے عام ملتے ہیں۔ چڑیل پر کوئی پری وغیرہ نازل نہیں ہوتی ہے لیکن وہ ایک خاص کیفیت اور طاقت کی حامل ہوتی ہیں جس سے انسان کو غیر مرئی طور پر کھا جاتی ہیں۔ چڑیلیں عموماً ٹولیوں کی شکل میں اکھٹی بیٹھتی ہیں۔ لوگوں کا خیال ہے کہ جب ''رنی'' پر مافوق الفطرت اثرات مرتب ہوتے تو اس کے منہ سے آگ کے شعلے برستے ہیں اور اس کے پاؤں آگے سے پیچھے کی طرف مڑ جاتے ہیں۔ ''رنی'' عورت زاد ہوتی ہے اور عام حالت میں دوسری عورتوں کی طرح ہی ہوتی ہے۔ چڑیل کی ضد جو مرد ہوتا ہے اسے ''**رنی یی مٹوہ**'' کہتے ہیں۔ ''رنی'' اور ''**رنی یی مٹوہ**'' ایک دوسرے کی حقیقت خوب جانتے ہیں۔ ''مٹوہ'' عموماً چڑیل کی سرگرمیوں پر نظر رکھتا ہے اور اس کی منفی سرگرمیوں پر مزاحمت بھی کرتا ہے اور بعض اوقات چڑیل کی شب بھر کی مخفی کارستانیوں سے پردہ بھی اٹھاتا ہے۔ ''مٹوہ'' بعض دفعہ ایسے دعوے بھی کرتے ہیں کہ گزشتہ رات فلاں چڑیل فلاں کے بچے کی روح لے کر جا رہی تھی کہ راستے میں میرے ہتھے چڑھی اور میں نے مدبھیڑ کر کے روح آزاد کرائی۔ اگر میں نہ ہوتا تو بچے کی جان سے ہاتھ دھونے پڑتے۔ ایسے مواقع پر بچے کے والدین سے صدقہ خیرات کے لئے بھی کہا جاتا۔ چڑیل کی کاروائیاں عموماً رات کو ہوتی ہیں۔

چڑیل کا پاؤں اگر چلتے چلتے پانی سے تر ہو تو وہ اصل انسانی حالت میں آتی ہے۔ جنسی بھوک مٹانے کے لئے اگر کوئی مرد چڑیل کے ناڑے کی طرف ہاتھ بڑھائے تو وہ دور بھاگتی ہے۔ چڑیل کو کسی نے رات کو غیر انسانی حالت میں خوب پٹائی کر لی ہو تو اگلی صبح چڑیل اس شخص سے ملنے کی کوشش کرتی ہے جبکہ چڑیل کی پٹائی کرنے والا شخص کوشش کرتا ہے کہ وہ اسے نظر نہ آئے۔ لوگوں کا خیال ہے کہ اگر چڑیل متعلقہ شخص کو دیکھے تو وہ شخص مر جاتا ہے وگرنہ چڑیل خود لقمہ اجل بنتی ہے۔

روایت کے مطابق گندگی پسند عورت ''**رنی**'' ہوتی ہے۔ یہ ہر جاندار کا روپ دھار سکتی ہے لیکن زیادہ تر بلی کی شکل اختیار کرتی ہے۔ چڑیل (**رنی**) آگ سے بھی خوفزدہ ہوتی ہے۔ کہتے ہیں کہ بندوق کی گولی بھی اس پر اثر انداز نہیں ہوتی۔ اکثر بیمار لوگوں اور زچہ بچہ کے گرد منڈلاتی رہتی ہے اور انہیں نقصان پہنچانے کے درپے ہوتی ہے۔ اسی لئے زچہ بچہ کی خواب گاہ چالیس دن تک رات بھر روشن رکھتے ہیں تاکہ روشنی کی وجہ سے چڑیل کے شر سے محفوظ رہیں۔ اگر چڑیل کا سامنا ہو تو اس کے ناڑے کی طرف ہاتھ بڑھائیں تو وہ بے بس ہو جاتی ہے یا مرد اپنا ناڑہ کھول کر پردہ دکھائے تو چڑیل بھاگ جاتی ہے۔

رات کو محلے کی تمام چڑیلیں ایک جگہ جمع ہوتی ہیں۔ اس دوران آپس میں قرعہ اندازی (تُولہ) کرتی ہیں اور جس کسی کے نام قرعہ نکلتا ہے اسے شکار کرنے کا منصوبہ بناتی ہیں۔ قرعہ اندازی اگر ان کے اپنے بیٹے اور بیٹی کے خلاف



ہموچل کے مقام پر چڑیلوں کا مسکن ٹیلا

بھی نکلے تو اس پر بھی کوئی چھوٹ نہیں ملتی۔ چڑیل اپنے شکار کا خون پی کر مار دیتی ہے۔ کہتے ہیں کہ چڑیل انسانی روحیں ایک دوسرے کو اس طرح پھینکتی ہیں جس طرح باسکٹ بال کے کھلاڑی گیند ایک دوسرے کو پھینکتے ہیں۔ چڑیل مطلوبہ شکار (شخص) کا سامنا کرتے وقت اگر مطلوبہ شخص کا ستارہ بلند ہے تو چڑیل کو اس (شکار) کی پیشانی پر روشنی نظر آتی ہے۔ گویا یہ اس کا محافظ ستارہ ہوتا ہے۔ اسلئے یہ انسان چڑیلوں کے حملے سے محفوظ رہتا ہے۔ بصورتِ دیگر چڑیل اسے شکار کرتی ہیں۔ روایت کے مطابق چڑیل، پن چکی کے اوپر والے متحرک باٹ پر لڑکیوں کو رکھ کر اپنے فن کی تربیت دیتی ہے۔ چڑیل اگر کسی گھر میں جاتی ہے تو اہلِ خانہ کے پاؤں کے تلووں کو چاٹتی ہے۔ جس سے تمام گھر والے بے ہوش ہوتے ہیں۔ اگر ایک آدمی رات کو حملہ آور چڑیل کو زخمی کرتا ہے تو کہتے ہیں کہ تین دن تک متعلقہ شخص چڑیل کا سامنا نہیں کرتا۔ کیونکہ چڑیل اس شخص کو دیکھنے کی تاک میں رہتی ہے اور چڑیل اگر اسے دیکھے تو وہ مر جاتا ہے اور اگر نہ دیکھے تو وہ خود مر جاتی ہے۔ کہتے ہیں کہ کسی شخص کی چڑیل بیوی اگر رات کو بستر سے اٹھ کر چلی جائے تو شوہر کو پتہ نہیں چلتا۔ اول تو وہ ہوش میں ہی نہیں آتا۔ اگر آئے تو بھی وہ یہی سمجھتا ہے کہ اس کی چڑیل بیوی اس کے پہلو میں موجود ہے۔ کہتے ہیں کہ راجہ پونیال اکبر خان نے اپنے دور حکمرانی 92-1880ء کے دوران چڑیلوں کا اجلاس بلا کر پوچھا کہ آپ لوگوں کو کس طرح شکار کرتی ہیں تو چڑیلوں نے راجہ سے ایک انار لانے کی فرمائش کی۔ جب انار لایا گیا تو اسے باری باری ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں ڈالتی گئیں۔ اسکے بعد انار راجہ کے ہاتھ میں تھماتے ہوئے کہا کہ اسے توڑ کر دیکھیں۔ جب انار توڑا گیا تو وہ اندر سے خالی تھا۔ چڑیلوں نے کہا کہ ہم اسی طرح انسانی جان شکار کرتی ہیں۔ روایت کے مطابق گورنجر (بوبر) ضلع غذر چڑیلوں کا مسکن ہے اور وہاں پر ایک خاص مقام اب بھی ''رُیوں کوٹ'' (چڑیلوں کا مسکن) کے نام سے موسوم ہے۔ دلناٹی کے قریب دریا کی دوسری جانب ایک ٹیلہ ہے جسے آج بھی ''رُنی یَی ٹھوکوہ'' یعنی چڑیلوں کا ٹیلہ کہتے ہیں۔ محلے میں اگر کوئی شخص قریب المرگ ہو تو چڑیل کی حالت بھی بیماروں کی طرح ہوتی ہے اور وہ اکثر سر درد کے بہانے سر پر چادر باندھتی ہے۔

برای یا پری:

جن بھوت کے برخلاف ''برای'' یا پریاں زیادہ مضبوط اور حسین ہوتی ہیں۔ لوگوں کے مطابق ننگا پربت (دیامر) کی چوٹی پر ایک خوبصورت قلعے میں یہ رہتی ہیں جہاں تک کسی کی رسائی ممکن نہیں۔ لوگوں کا خیال ہے کہ یہ قلعہ بلور کا بنا ہوا ہے اور جنونی وخیالی لوگ اسے دیکھ بھی سکتے ہیں۔ لوگ اسے ''شل بٹی کوٹ'' یعنی شیشے کا بنا ہوا قلعہ کہتے ہیں۔ یہ پری زاد لڑکیاں (برایے) مختلف افراد سے وابستہ ہو کر ان کی حفاظت کرتیں۔ شنا میں ''برای بے ٹن'' ایک محاورہ ہے جس کے معنی برکت ہونے کے ہیں۔ یہ ان مواقع پر استعمال کرتے ہیں جب کسی چیز کی بہتات ہو جائے۔ مثلاً زید کے گھر میں دودھ کی فراوانی ہو تو کہتے ہیں کہ ''زیدی گوٹرڈدی برای بے ٹن'' یعنی زید کے ہاں دودھ کی پری (برای) بیٹھی ہوئی ہے۔

ناراض پریوں کو راضی کرنے کے عمل کو ''تھوبن'' جبکہ ناراض لوگوں کو

منانے کے عمل کو ''شیلّن'' کہتے ہیں۔ کاہن کی بد پرہیزی سے جب پریاں ناراض ہوتی ہیں تو کاہن تھوبن کے ذریعے پریوں سے معافی مانگتا ہے۔ تھوبن کا طریقہ یہ ہے کہ کاہن اپنے مکان کی چھت کے وسط میں موجود بادریہ پر نابالغ لڑکیاں جن کے والدین زندہ ہوں، رکھ دیتا ہے۔ اکیس عدد چھوٹی موٹی روٹیاں پکا کر ان پر مکھن کی لپائی کر کے ایک برتن میں رکھ دیتا ہے۔ دوسرے برتن میں اکیس عدد اخروٹ کے دانے مع خشک میوہ مثلاً توت، گری، خوبانی، انگور وغیرہ رکھ کر اس کے اوپر انار رکھ دیتا ہے۔ پدم کے پتوں کی دھونی کے بعد ان برتنوں کو ایک ایک کر کے بادریہ کے ذریعہ چھت پر موجود لڑکیوں کو دیتا ہے، جسے وہ مل کر کھالیتی ہیں۔ کھانے کے بعد دعائیں (شاپ) دیتے ہوئے کہتی ہیں کہ تم سے تمہاری پریاں راضی ہوں۔ کبھی کبار پریاں تھوبن سے بھی راضی نہیں ہوتیں تو دوسرے کاہن منتر پڑھ کر متاثرہ کاہن پر دم کرتے رہتے ہیں۔ جس سے بیمار (دم لیدو) کاہن ٹھیک ہوتا ہے اور اس کی پریاں اُس سے راضی ہوتی ہیں۔ ناراض لوگوں کے مابین صلح کرانے کیلئے، جو فریق غلطی کا مرتکب ہوا ہے، وہ ثالثوں کی ہدایت کے مطابق معززین محلّہ ساتھ لے کر ناراض فریق کے گھر جا کر ان کی خدمت میں بیل یا بکرا وغیرہ پیش کر کے ان سے معافی کا خواستگار ہوتا ہے تو انہیں معافی مل جاتی ہے۔ اس عمل کو ''شیلّن'' کہتے ہیں۔

بگروٹ میں تشوٹ کی مشرقی جانب برف سے ڈھکا ہوا ایک پہاڑ ہے، جسے دوبانی کہتے ہیں۔ اس سلسلے میں لوگوں میں اس طرح کا توہم ہے کہ اس پہاڑ کی چوٹی پر ایک درخت ہے جس پر موتی لگتے ہیں۔ یہ درخت پریوں اور دیوزاد مخلوق کی ملکیت ہے۔ لوگوں کے مطابق ایک دفعہ ایک کوہ پیما اس پہاڑی کی چوٹی پر گیا، واپسی پر اس نے وہاں سے بہت سارے موتی سمیٹے۔ چلتے چلتے واپس مڑ کر اس نے دیکھا تو دیووں اور پریوں کا ایک قافلہ ان کا پیچھا کر رہا تھا۔ اس نے خوف کے مارے سارے موتی پھینک دئے۔ جس سے دیو پری واپس لوٹ گئے۔ لیکن ایک پری گھر تک اس کا پیچھا کرتی رہی۔ گھر آ کر اس نے خوف کے مارے دروازہ بھی بند کیا۔ جب اس نے بوٹ اتارے تو اس کے اندر ایک موتی غلطی سے رہ گیا تھا۔ لہٰذا اس موتی کو بھی اس نے پری کی طرف پھینک دیا تو وہ اسے لے کر غائب ہوگئی۔ اسی طرح کا ایک توہم ننگا پربت کے بارے میں بھی بتایا جاتا ہے۔

جسمانی کھیل اور لوک تماشے

ماضی میں چند کھیل گلگت میں غیر معمولی طور پر مقبول تھے۔ ان میں بلہ، گٹل بلہ (پولو کی اقسام) بسراہ، رن ٹھس، پنڈوک، لش پیش، بلی بلا، ٹک رُسا، مسٹ کاہ، اخروٹ پھینکنا، راہیلا، بھٹ پھل، رسہ کشی وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔ یہ کھیل صرف گلگت تک محدود نہیں تھے بلکہ ذرا سی تبدیلی اور نام کے فرق سے پورے گلگت بلتستان میں کھیلے جاتے تھے۔

شنا میں فٹ بال کو ''بمپھو'' اور فٹ بال کھیلنے کو ''بمپھوا دونک'' کہتے ہیں۔ پرانے وقتوں میں بیل یا گائے کے یورین بلیڈر (مجوءِ ہ) کو صاف کر کے اس میں منہ کے ذریعے ہوا بھر کر اس سے فٹ بال کھیلا کرتے تھے۔ وقت کے ساتھ فٹ بال کی ہیئت تبدیل ہوتی گئی۔ ایک روایت کے مطابق کسی گھر میں میاں بیوی کے درمیان جھگڑا ہوگیا۔ ان کا پانچ سالہ بچہ ماں باپ کے جھگڑے کا بغور جائزہ لے رہا تھا۔ میاں بیوی کے درمیان نوبت ہاتھا پائی تک پہنچ گئی۔ شوہر کا پارہ چڑھ گیا، وہ اٹھا، ڈنڈا ہاتھ میں لیا اور گرج دار لہجے میں بیوی سے کہا کہ میں تجھے ابھی مار ڈالتا ہوں۔ بچہ کو معلوم تھا کہ جب جانور مارے جاتے ہیں تو ان کا یورین بلیڈر فٹ بال (بمپھو) کے کام آتا ہے۔ لہٰذا اس نے بڑی معصومیت سے اپنے ابو سے مخاطب ہو کر کہا۔ ''ابو.....! ابو.....! آجہ مریگات بمپھو مٹ دہ'' یعنی ابا جان! امی کو مار دیا تو اس کا یورین بلیڈر مجھے دینا تا کہ میں اس سے فٹ بال کھیل سکوں۔ یہ سن کر امی ابو کا نہ صرف جھگڑا ختم ہوا بلکہ ہنس ہنس کا ان کا برا حال ہوا اور بچے کی اس معصوم حرکت سے وہ دیر تک محظوظ ہوتے رہے۔

خالص مردانہ کھیل:

بُلہ:

شنا زبان میں پولو کو ''بُلہ'' کہتے ہیں۔ دراصل پولو ہی وہ کھیل ہے جو وقت اور رویوں کی تبدیلیوں کے باوجود آج بھی زندہ ہے۔ ماضی میں پولو کے کھیل کو تمام کھیلوں کا سردار سمجھا جاتا تھا۔ پولو گراؤنڈ جسے مقامی زبان میں ''شوارن'' کہا جاتا ہے، میں جب پولو کھیل ہوتا تو سارا علاقہ امڈ آتا۔ جسکی وجہ سے سارا شہر سنسان ہوتا اور سڑکیں ویران ہوتیں۔ لوگوں کی مصروفیات سمٹ کر ''شوارن'' تک محدود ہو جاتیں۔ گلگت کے موجودہ ائرپورٹ کے قریب کھیل کا ایک بہت بڑا میدان تھا۔ جہاں پر نہ صرف گھوڑوں پر پولو کھیلتے تھے بلکہ پیدل پولو یعنی ''گٹل بُلہ'' کا کھیل بھی کھیلتے تھے۔ اس میدان کو حسبِ ضرورت بطور ریس کورس بھی استعمال میں لاتے۔ میدان کے چاروں طرف کافی رقبہ موجود تھا۔ انگریز اس میدان کو ''گاف گرونڈ'' کے طور پر استعمال کیا کرتے تھے۔ اس مقام پر خاص تقریبات کے مواقع پر کھیلوں کے علاوہ ناچ گانوں کا بھی اہتمام کیا جاتا تھا۔ عیدین کے مواقع پر نوجوان وہاں جمع ہو کر انڈے لڑاتے اور دیگر علاقائی کھیل کود کے مقابلے بھی ہوا کرتے۔ بعض روایات کے مطابق انگریزوں کے دور حکومت میں سالانہ پولیٹیکل

جلسہ کے موقع پر ''سونی کوٹ ڈے'' منایا جاتا تھا۔ مذکورہ وسیع میدان میں خصوصی میلے لگتے اور دن بھر کھیل تماشوں کا اہتمام ہوتا۔ گھڑ دوڑ، رسہ کشی، تیراکی، نیزہ بازی، تمبک بازی اور بسراہ کے مقابلوں کے علاوہ بوائے سکاؤٹس کے کھیل تماشے بھی یہاں پر ہوتے۔ میجر کاب پولیٹیکل ایجنٹ کے زمانے میں چاندنی رات کو بھی یہاں پر پولو کھیلا جاتا تھا۔ یہ میدان نشیب میں ہونے کی وجہ سے سردیوں میں پانی سے بھرا رہتا جس کی وجہ سے مرغابیوں کا شکارگاہ ہوتا۔ موسم بہار میں میدان خشک ہو جاتا تو اسے سپورٹس سٹیڈیم کے طور پر استعمال میں لایا جاتا۔ ولیئم براؤن اس کھیل کے بارے میں کہتا ہے کہ ''پولو ہی گلگت ہے، پولو کھیلنے کے موسم میں گلگت کے لوگ پولو کے بارے میں بولتے ہیں، پولو کے بارے میں سوچتے ہیں اور پولو کے متعلق ہی خواب دیکھتے ہیں''۔ ماضی میں جلسوں کے علاوہ گلگت خاص میں یہ کھیل ہفتے میں دو دن یعنی سوموار اور جمعرات کو کھیلتے تھے۔ لوگ ان دنوں میں صبح سے کھیل دیکھنے کی تیاری کرتے اور کھیل شروع ہونے سے کافی دیر قبل ہی اپنے لئے کوئی مناسب جگہ منتخب کر کے بیٹھ جاتے۔ ابتدائی دور میں گلگت اور اس کے نواحی علاقوں میں عجیب وغریب شرائط طے کر کے پولو کھیلا جاتا۔ اس سلسلے میں ایک



روایتی پولو کا ایک منظر

مقابلہ اس کے سالوں کے ساتھ ہوا تھا۔ اس کے سالوں کا تعلق داریل سے تھا۔ ان کے درمیان یہ شرط طے پائی کہ ہارنے والی ٹیم کے کھلاڑی قتل کر دیے جائیں گے۔ یہ پولو دو دن تک کھیلا گیا بالآخر ترا خان پولو جیت گیا اور حسب شرط اپنے سالوں کو قتل کر دیا۔

اسی طرح مسٹر ڈریو اس کے متعلق لکھتے ہیں ''بوڑھے لوگ اس وقت تک پولو کھیلتے ہیں جب تک وہ گھوڑے کی پشت پہ بیٹھنے کے قابل رہتے ہیں۔ کھیل پر عام شرطیں لگائی جاتی ہیں اور ہارنے والے کھلاڑیوں پر آوازیں کسی جاتیں۔''

گلگت اور آس پاس کے علاقوں میں پولو دو طرح سے کھیلا جاتا ہے۔ ایک انشپا ربلہ جبکہ دوسرا گٹل بلہ۔

گھوڑے پر پولو (انشپا ربلہ):

اس سے گھڑ سوار پولو مراد ہے جو یہاں سب سے زیادہ پسندیدہ اور ہیجان انگیز کھیل ہے۔ بہت قدیم زمانے سے شمالی علاقہ جات یعنی گلگت بلتستان میں پولو کھیل کھیلا جاتا ہے۔ قدیم ادوار میں بڑے بڑے مقابلوں کی کہانیاں موجود ہیں۔ روایت کے مطابق مغل شہنشاہ اکبر کو پولو کھیل سے بے حد لگاؤ تھا۔ وہ رات کو چراغاں کا اہتمام کر کے پولو کھیلتا تھا جبکہ میجر کاب پولیٹیکل ایجنٹ کے زمانے میں گلگت میں چاندنی رات میں بھی پولو کے مقابلے ہوتے تھے۔ پولو کھیلنے کے لئے اچھے اچھے گھوڑے پالے جاتے اور ان کا خاص خیال رکھا جاتا۔ گھوڑے کے لئے خوراک کے علاوہ ورزشی امور پر بھی توجہ دی جاتی۔ اسے ''یرق'' کہتے ہیں۔ ''یرق'' ترکی لفظ ''یراق'' سے ماخوذ ہے۔ یہاں پہلے نو گول بنانے کا اصول تھا۔ بعد میں اس اصول میں تھوڑی تبدیلی کر کے خاص مقابلوں کے لئے وقت کا تعین کیا جانے لگا۔ موسیقی کی وجہ سے اس کھیل میں جان پڑتی ہے۔ اس لئے پولو کھیل کے دوران موسیقی کو خصوصی اہمیت دی جاتی ہے۔ کھیل شروع ہونے، ختم ہونے، درمیانی وقفے اور گول ہونے پر الگ الگ دھنیں بجائی جاتی ہیں۔ جن کے باقاعدہ نام بھی ہیں۔ دیسی بینڈ کی حربی دھنیں اور کھلاڑیوں کی ہیجان خیز کیفیت سارے ماحول کو جذباتی کرتی ہے۔ یہ ساز جو دوران پولو بجائے جاتے، قدیم زمانوں میں نہ صرف طبل جنگ کے طور پر جانے جاتے بلکہ ان سازوں میں لوگوں کیلئے مخصوص پیغام بھی چھپا ہوا ہوتا تھا، جسے وہ (لوگ) آسانی سے سمجھتے تھے۔ ان علاقوں میں موسیقاروں اور طبلہ نوازوں کو ''ڈوم'' کہتے ہیں۔ یہ طبقہ قدیم ایام سے اپنا مسکن ایک جگہ رکھتا ہے۔ اس نسبت سے جس مقام پر یہ لوگ رہتے ہیں وہ ''ڈومیال'' کہلاتا ہے۔ پولو کو اہل گلگت بلہ اور اہل استور ''ٹھوپ'' کہتے ہیں۔ چھٹی کے دنوں اور دیگر خوشی اور جشن کے مواقع پر بھی یہ کھیل ازمنۂ قدیم سے کھیلا جاتا رہا ہے۔

پولو ٹیم تشکیل دینے کے روایتی طریقے:

پرانے زمانے میں پولو کے لئے کھلاڑی تقسیم کر کے دو ٹیمیں تشکیل دینے کا بھی اپنا ایک منفرد انداز ہوتا تھا۔ کھلاڑیوں کے تمام پولو سٹک جمع کئے جاتے اور ایک اجنبی شخص کو پکڑ کر لاتے اور اسے کہتے کہ وہ پولو سٹکس کو برابر تقسیم کرے وہ چھ ایک طرف اور چھ ایک طرف رکھ دیتا، تو جس کا پولو سٹک جس طرف ہو وہ متعلقہ

ٹیم کا کھلاڑی ہوتا۔ اسی طرح دو ٹیمیں تشکیل پاتیں اور دونوں میں مقابلہ ہوتا۔ اگر ٹیمیں تشکیل دینے کے لئے اجنبی آدمی دستیاب نہیں ہوتا، تو ایک کھلاڑی کی آنکھیں بند کرا کے اس سے یہ کام لیا جاتا تھا۔ انشپار بلہ کی ٹیمیں بھی ماضی میں اسی طرح تشکیل دی جاتی تھیں۔ ٹیمیں تشکیل دینے کیلئے ایک اور طریقہ یہ ہوتا تھا کہ کھلاڑیوں میں سے دو نامور کھلاڑی متفقہ طور پر منتخب کر کے انہیں اختیار دیا جاتا کہ وہ دو ٹیمیں تشکیل دیں۔ یہ دو نامزد کھلاڑی ''گتھری'' کہلاتے، جو ٹیمیں تشکیل دیتے وقت اپنی دانست کے مطابق حتی المقدور اس بات کا خیال رکھتے کہ دونوں ٹیمیں ہم پلہ ہوں۔ دو ٹیمیں تشکیل دینے کا ایک اور طریقہ بھی رائج ہے۔ وہ یہ کہ تمام جوان دو، ہمسر کھلاڑیوں کو ''ریفری یا گھتری'' نامزد کرتے ہیں۔ دونوں ''گھتری'' ایک جانب بیٹھتے ہیں۔ باقی جوان برابری کی بنیاد پر دو دو ساتھیوں میں تقسیم ہوتے ہیں۔ دو دو کی جوڑی ریفریوں کی نظروں سے ذرا دور جا کر ایک دوسرے کا فرضی نام مقرر کرتی ہے۔ مثلاً اقبال اور مسرور کی ایک جوڑی ہے۔ دونوں اپنے فرضی نام باہم مشاورت اور رازداری سے اقبال کیلئے ریت اور مسرور کیلئے مٹی طے کرتے ہیں۔ یہ جوڑی دونوں ریفریوں کے سامنے آ کر یوں گویا ہوتی ہے کہ ''ڈاک ڈاک کس کی ڈاک'' تو ریفریوں میں سے جس نے پہلے بوجھنا ہے وہ کہتا ہے میری ڈاک۔ تو افراد کی جوڑی اس کے سامنے آ کر کہتی ہے کہ آپ مٹی پسند کریں گے یا ریت۔ فرض کریں ریفری کہتا ہے ریت تو اقبال اسکی ٹیم کا کھلاڑی ہوا جبکہ مسرور دوسرے کی ٹیم کا۔ اسی طرح دوسری جوڑی یہی عمل دوسرے ریفری کے پاس جا کر انجام دیتی ہے۔ یوں افراد کی تمام جوڑیاں باری باری یہ عمل دہراتی ہیں تو دو ٹیمیں تشکیل پاتی ہیں۔ اس عمل کو ''ڈاک ڈاکی یا موریے کھجونک'' کہتے ہیں۔

''لولیو شراک'' کے نام سے ٹیمیں تشکیل دینے کا ایک اور طریقہ بھی رائج ہے۔ دو سے زیادہ افراد کسی کھیل کو شروع کرنے سے پہلے ٹاس کے طور پر ''لولیو شرانک'' کرتے ہیں۔ تینوں یا اس سے زیادہ افراد اپنا دایاں ہاتھ منہ کے قریب لے جاتے ہیں اور ''لولیو شرانک'' کہتے ہوئے ہاتھوں کو الٹا یا ہتھیلی کی جانب سیدھا کر کے تینوں ایک جگہ آمنے سامنے پیش کرتے ہیں۔ جس کے ہاتھ کا انداز باقیوں سے منفرد ہوگا وہ فرسٹ ہوتا ہے۔ اسی طرح سیکنڈ اور تھرڈ کا فیصلہ بھی ہوتا ہے۔ یعنی ایک فرد ہاتھ کی ہتھیلی اوپر کی طرف کرتا ہے جبکہ دوالٹے ہاتھ سامنے کرتے ہیں تو ایسی صورت میں ہتھیلی اوپر کرنے والا فرسٹ ہوگا۔ اس طرح سیکنڈ اور تھرڈ کیلئے پھر تینوں یہی عمل کرتے ہیں۔

کھیلیں عموماً شرط باندھ کر کھیلی جاتیں۔ شرط باندھنے کو شنا میں ''بلی بون'' کہتے ہیں۔ زیادہ تر بھیڑ، بکرا اور بیل وغیرہ شرط رکھتے۔ ہارنے والی ٹیم جیتی ہوئی ٹیم کو شرط کی ادائیگی میں تاخیر نہیں کرتی۔ بعض دفعہ اس بنیاد پر بھی شرطیہ کھیلیں کھیلتے، کہ ہاری ہوئی ٹیم جیتی ہوئی ٹیم کے اعزاز میں ضیافت کا اہتمام کرتی۔ نو گول کرنے تک میچ جاری رہتا ہے۔ ذرا ذرا سی بات پر خوب لڑائی جھگڑے بھی ہوتے۔ لیکن چونکہ دل صاف ہوتے ہیں اسلئے کچھ ہی دیر میں صلح صفائی کے بعد اگلی بار پھر سے جوش و جذبے سے کھیل شروع کر دیتے ہیں۔ گلگت میں پولو کی ترقی میں مقامی راجاؤں کی سرپرستی نے ماضی میں نہایت اہم کردار ادا کیا۔ جبکہ موجودہ دور میں پولو کی سرپرستی این ایل آئی، پولیس، اور پی ڈبلیو ڈی کے علاوہ مقامی انتظامیہ بھی کر رہی ہے۔ پولو سٹک کھلاڑی دائیں ہاتھ میں پکڑتے ہیں اور بائیں ہاتھ میں چابک (تھر) ہوتی ہے۔ پولو سٹک جنگلی بادام سے بناتے ہیں جبکہ اس کا سر بید اور شہتوت سے۔ انشپار بلہ کی گیند بھی لکڑی کی بنائی جاتی ہے جسے مقامی زبان میں ''ٹھرہ'' کہتے ہیں۔ جب گھڑسوار کھیل شروع ہونے سے پہلے اپنے اپنے گھوڑوں پر سواری کے لئے جاتے ہیں تو اس وقت اپنے گھوڑے کے چہرے اور پیشانی پر دایاں ہاتھ پھیر کر اپنے ہاتھ کو بوسہ دیتے ہیں یا بلاواسطہ گھوڑے کی پیشانی کو چومتے ہیں۔ درحقیقت دوران کھیل اپنی اور گھوڑے کی جان کے تحفظ کے لئے یہ ایک خاموش دعا ہے۔

یہاں کا پولو فری اسٹائل ہوتا ہے، اسلئے اسے خطرناک سمجھا جاتا ہے۔ کھلاڑی ایک دوسرے کو زوردار کہنیاں مارتے ہیں۔ اس کے علاوہ مخالف کھلاڑی کو گیند پہ ضرب لگانے سے روکنے کے لئے اسکے پولو کو نہ صرف ہک کرتے ہیں بلکہ پولو اسٹک کا آزادانہ استعمال کرنے سے بھی دریغ نہیں کرتے۔ کھیل کے دوران پولو سٹک اور سخت لکڑی کی گیند سے چوٹ لگنا یا زخمی ہونا معمول کی بات ہے، بعض دفعہ اسٹک مخالف کھلاڑی کے جسم پہ بھی لگتی ہے۔ لیکن چونکہ یہ سب کھیل کا حصہ ہوتا ہے اسلئے درگزر کیا جاتا ہے۔ یہاں کا پولو دراصل ایک چھوٹی سی جنگ کا منظر پیش کرتا ہے۔ ایک کھیل نو گول پر مشتمل ہوتا ہے۔ جو ٹیم نو گول پہلے سکور کرتی وہ فاتح قرار دی جاتی۔ اس طرح بعض دفعہ ایک کھیل ختم ہونے میں دو تین گھنٹے بھی لگ جاتے۔ آج بھی نو گول کی شرط قائم ہے لیکن فائنل پولو میچ میں نو گول یا ایک گھنٹے کا وقت دونوں مقرر ہوتے ہیں۔ جو ٹیم پہلے نو گول کرتی یا مقررہ ایک گھنٹے کے دوران جس ٹیم کے گول زیادہ ہوتے وہ فاتح کہلاتی۔ پولو کھیل فری سٹائل ہونے کی وجہ سے اس میں کوئی ریفری نہیں ہوتا۔ البتہ آج کل چند ریٹائرڈ کھلاڑی نامزد کئے جاتے ہیں جو ڈائس پر بیٹھ کر جیوری کی خدمات انجام دیتے ہیں۔ دوران کھیل اگر گھوڑے کی زین، رکاب کا آہنی حصہ یا گھوڑے کے منہ میں موجود سلاخ ٹوٹ جائے، گھوڑا زخمی ہو یا مر جائے یا کھلاڑی گھوڑے سے گر کر زخمی ہو تو مخالف ٹیم کے اسی نمبر کے کھلاڑی کو بھی کھیل سے آؤٹ کرتے ہیں۔ لیکن اگر کھیل کے دوران گھوڑے کی زین یا کسی اور حصے کا چمڑہ کٹ جائے یا گھوڑا تھک ہار کر نہ چلے تو ایسی صورت میں مخالف ٹیم کا

کھلاڑی کھیل سے باہر نہیں ہوتا بلکہ یہ صورتحال متاثرہ کھلاڑی کی اپنی کوتاہی تصور ہوتی ہے اور ایسی صورت میں مقابلہ پانچ اور چھ کھلاڑیوں کے درمیان ہوتا ہے۔ جس سے اکثر یتی ٹیم بھرپور فائدہ اٹھاتی ہے۔ اگر گیند گراؤنڈ سے باہر جائے تو اسی کے سیدھ میں گراؤنڈ کے اندر پھینک دی جاتی ہے۔ گیند آؤٹ ہونے کی صورت میں سینٹر کی جانب پھینک دیتے ہیں۔ اگر گھوڑا تھک کر کھیلنے کے قابل نہ رہے تو اس کا سوار گھوڑے سے اتر کر گول پوسٹ کے درمیان بیٹھ کر ''گٹل بلہ'' کے گول کیپر کی طرح مخالف ٹیم کے خلاف کھیل سکتا ہے، البتہ اس دوران گھوڑوں کی ٹکر یا کسی اور حادثے کی صورت میں اگر متعلقہ کھلاڑی کی جان بھی چلی جائے تو کوئی ذمہ دار نہیں ہوتا۔ گویا وہ اپنے رسک پر کھیلنا چاہے تو کھیلنے کا حق رکھتا ہے۔ شنا میں آؤٹ کو ''ہل جیکے'' اور گول کو ''ہالے'' کہتے ہیں۔ گول ہونے پر متعلقہ ٹیم کا کھلاڑی گیند ہاتھ میں لئے گھوڑے کو سرپٹ دوڑاتا ہے اور عین سنٹر لکیر کے پاس پہنچ کر گیند کو اوپر اچھالنے کے بعد اس پر ہوا میں ہی پولو سٹک کے مخصوص حصے کے ذریعے کاری ضرب لگاتا ہے تو بعض دفعہ فضائی گول بھی ہو جاتا ہے۔ اس عمل کو ''ٹھوکی دونک'' کہتے ہیں۔ ٹھوکی کے ذریعے جو کھلاڑی گول کرتا ہے اسے اس کا انفرادی کارنامہ تصور کرتے ہیں۔ ٹھوکی لگاتے وقت مخالف کھلاڑی کو مزاحمت کرنے کی اجازت نہیں ہوتی۔ گویا ٹھوکی لگانے والے کھلاڑی کو فری ہٹ لگانے کا موقع دیتے ہیں۔

جشنِ بہاراں کے نام سے کھیلا جاتا ہے۔ گزشتہ کچھ عرصے سے چترال اور گلگت میں شندور کے مقام پر پولو کے مقابلے ہوتے ہیں۔ ساری دنیا سے پولو کے شائقین اس بلند بالا پولوگراؤنڈ میں پولو میچ دیکھنے آتے ہیں۔ شندور، گلگت اور چترال کی سرحد پر واقع ہے۔ گلگت سے شندور کا فاصلہ تقریباً دوسو کلومیٹر بنتا ہے۔ شندور کا پولوگراؤنڈ سطح سمندر سے 12500 فٹ بلندی پر واقع ہے۔ ''شندور''، شنا میں زیادہ سرد جگہ کو کہتے ہیں جبکہ ''پھنڈر'' پانی کا قدرتی ذخیرہ کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ ایک روایت کے مطابق عظیم حکمران علی شیر خان نے سترھویں صدی عیسوی میں پہلی بار شندور میں پولو کھیلا۔ جبکہ بعض روایات سے یہ پتہ چلتا ہے کہ شندور میں پولو کے مقابلوں کا سلسلہ 36-1935ء میں شروع ہوا۔ اس کے بعد وقفے وقفے سے یہاں پر پولو کھیلنے کا سلسلہ جاری رہا۔ البتہ 1982ء کے بعد سے گلگت اور چترال کی پولو ٹیموں کے درمیان شندور کے مقام پر پولو مقابلوں کو باقاعدہ سالانہ ٹورنامنٹس کی حیثیت دے دی گئی ہے اور آج کل انہیں بین الاقوامی شہرت حاصل ہے۔ یہ مقابلے عموماً جولائی کے مہینے میں ہوتے ہیں۔ پولوگراؤنڈ (شوارن) کے اردگرد عموماً چار فٹ اونچی دیوار ہوتی ہے جس پر بیٹھ کر تماشائی پولو سے محظوظ ہوتے ہیں۔ گراؤنڈ کی دونوں جانب گول پوسٹیں ہوتی ہیں۔ پچھلے وقتوں میں پتھر رکھ کر گول پوسٹ قائم کرتے تھے۔ جبکہ آج کل لکڑی کے دو بڑے گول پلر زکھڑے کر کے ان کے



روایتی تلوار ڈانس

گلگت میں آج کل سال میں دو دفعہ پولو کے ٹورنامنٹ ہوتے ہیں۔ ایک نومبر کے ابتدائی دنوں میں جشنِ آزادی کے طور پر جبکہ دوسرا ٹورنامنٹ اپریل مئی میں

اردگرد سفید اور سرخ کپڑے لپیٹتے ہیں اور پلر کے اوپر جھنڈیاں گاڑھ دی جاتی ہیں۔ گراؤنڈ کے وسط میں ایک طرف پتھروں سے ابھرا ہوا چبوترہ بناتے، جس کے

فرش پر کھیل کے دنوں میں قالینیں بچھا کر اس کے اوپر قطاروں میں کرسیاں رکھ دی جاتیں۔ جہاں پر مقامی اور غیر مقامی آفیسر اور راجہ صاحبان بیٹھ کر پولو دیکھتے۔ اشرافیہ کی حفاظت کیلئے چبوترہ کے سامنے کی جانب جالی لگائی جاتی تاکہ گیند سے چبوترہ پر موجود خصوصی مہمانوں کو نقصان نہ پہنچے۔ اس چبوترہ کے بالکل سامنے گراؤنڈ کی دوسری جانب ایک اور چبوترہ ہوتا ہے جس پر عموماً روایتی بینڈ والے بیٹھتے ہیں اور اس کے ساتھ ہی سکور بورڈ آویزاں ہوتا ہے۔ عام تماشائی گراؤنڈ کے اردگرد بنائی گئی دیواروں پر بیٹھ کر کھیل سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ خواتین کیلئے بھی چبوترہ پر خصوصی نشستیں رکھی جاتی ہیں۔ ماضی میں پولو کے گھوڑے پامیر اور بدخشان سے منگوائے جاتے تھے۔ جبکہ آج کل پاکستان کے مختلف علاقوں سے لاکر انہیں روایتی پولو کھیلنے کی خصوصی تربیت دیتے ہیں۔ شنا میں ایک کہاوت ہے کہ ''**انشپوہ چھوہ تھرے چکا، دونو بیے چکا، ٹمک ترن تھے چکا**'' یعنی گھوڑا سرپٹ دوڑا کر، بیل کو ہل میں جوت کر اور بندوق کو فائر کر کے تسلی کرنے کے بعد خریدو، بہت مشہور ہے۔ گھوڑے کے متعلق ایک اور کہاوت ہے کہ ''**انشپس یا بسپورج نٹ دَی یا بلگنج نٹ دَی**'' یعنی گھوڑا یا تو اپنی وافر ملنے والی خوراک کی مستی میں رقص کرے گا یا اپنے جسم کے زخموں کی تاب نہ لاکر ناچے گا۔ مفہوم کے مطابق جب گھوڑے کو خوب خوراک (بسپور) دی جاتی ہے تو وہ کھا کھا کر صحت مند اور فربہ ہوتا ہے اور اسی مستی میں رقص کرتا ہے۔ لیکن اگر گھوڑے کی پیٹھ پر زخم ہو اور اس پر کاٹھی اور زین وغیرہ بھی کسی جائیں اور سوار کی چابک بھی زخموں پر پڑے تو اس سے گھوڑا درد کی تاب نہ لاکر ناچنے لگتا ہے۔ گویا تکلیف اور خوشی دونوں صورتوں میں اس کی قسمت میں ناچ ہے۔ کھلاڑی کھیل کے دنوں میں گھوڑوں کو بڑی خوبصورتی سے سجاتے ہیں۔

گٹل بُلہ:

''گٹل بُلہ'' پیدل پولو کو کہا جاتا ہے۔ یہ کھیل دیہاتوں میں بہت مقبول ہے۔ پھٹے پرانے کپڑوں کو لپیٹ کر گولا سا بنایا جاتا ہے اور موٹے دھاگے سے اسے سی دیتے ہیں۔ اس گول گیند کو مقامی لوگ ''**لوٹہ**'' کہتے ہیں۔ مقابلے میں حصہ لینے والی ٹیموں کے لئے مخصوص تعداد مقرر نہیں البتہ گیارہ کھلاڑیوں کی ٹیم مناسب خیال کی جاتی۔ ہر ٹیم میں ایک ایک گول کیپر ہوتا ہے۔ اس کھیل کے لئے کوئی قانون بھی مقرر نہیں۔

''گٹل بلہ'' آج کل بہت کم دیکھنے میں آتا ہے اور اس قسم کے کھیل کی گیند جسے مقامی زبان میں ''**لوٹہ**'' کہا جاتا ہے، تقریباً معدوم ہوگئی ہے۔ اب اس کی جگہ ٹینس بال یا ربڑ کے دیگر بال استعمال ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ ماضی میں گدھے پر سوار ہوکر بھی پولو کھیلا جاتا تھا۔

بسراہ:

''بسراہ'' خالص مردانہ کھیل ہے۔ اس میں مہارت کے علاوہ جسمانی طاقت کا بھی زبردست عمل دخل ہوتا ہے۔ موسم گرما کی شاموں میں یا پھر موسم سرما کی دوپہروں میں باغیچوں میں یا پھر نرم اور ریتلی زمین والے میدانوں میں اس کھیل کے مقابلے ہوتے۔ ماضی میں یہ کھیل مردانگی اور بہادری کی پہچان کے طور پر مشہور تھا۔ یہ بڑا ہی دلچسپ اور مشکل کھیل ہے۔ مقابلہ انفرادی بھی ہوتا ہے اور ٹیم کی شکل میں بھی کھیلا جاتا ہے۔ انفرادی مقابلے میں دو کھلاڑی حصہ لیتے ہیں۔ یہ کھیل کھیلتے وقت کھلاڑی اپنی قمیص اتارتے ہیں اور شلوار تہہ کر کے نیکر کی مانند کرتے ہیں۔ فریقین ایک ایک ٹانگ پہ لڑتے ہیں۔ دوسری ٹانگ سرین کی طرف موڑ کر ایک ہاتھ کے ذریعے مڑی ہوئی ٹانگ کے پاؤں کا انگوٹھا پکڑ لیتے ہیں۔ دونوں کھلاڑی اپنے ایک ایک کھلے ہاتھ کے ذریعے کشتی کے انداز میں ایک دوسرے پہ وار کرتے ہیں۔ چھینا جھپٹی، دھکم پیل اور زور آزمائی کے ذریعے ایک دوسرے کو گرانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس دوران جس کھلاڑی کا ہاتھ پاؤں کے انگوٹھے سے چھوٹ جائے وہ ہار جاتا ہے۔ کھیل کے دوران مڑی ہوئی ٹانگ کے خمدار گھٹنے کے ذریعے ایک دوسرے پہ بھرپور ضربیں لگاتے ہیں۔

ٹیم کی شکل میں یہ کھیل خاصا دلچسپ بن جاتا ہے۔ اس میں دونوں طرف مخصوص فاصلوں پر پتھروں کے ذریعے یا ہاتھ سے لکیر ڈال کر ایک گول دائرہ سا بناتے ہیں۔ جسے گول پوسٹ کہا جاتا ہے۔ دونوں طرف کے کھلاڑی ایک ٹانگ پر کھڑے ہوکر دوسری ٹانگ سرین کی طرف موڑ کر بسراہ کے مخصوص انداز میں کھیل شروع کرتے ہیں۔ دونوں طرف ایک ایک کھلاڑی نامزد کیا جاتا ہے جو مخالف گول پوسٹ تک جانے کی کوشش کرتا ہے۔ مقامی زبان میں اسے ''بسر'' کہتے ہیں۔ مخالف ٹیمیں ایک دوسری ٹیم کے ''بسر'' پر حملہ آور ہونے کا کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کرتیں کیونکہ بسر کو گرانا پوری ٹیم کو آؤٹ کرنے کے مترادف ہوتا ہے۔ مخالف ٹیم کے کھلاڑی اس کی راہ روکنے کی جتن کرتے ہیں لیکن وہ (بسر) گول پوسٹ یعنی ''چوچوہ'' تک جانے کے لئے کسی موقع کو ضائع نہیں کرتا۔ مقابلے کے دوران کھلاڑی ایک دوسرے کو گرانے اور پاؤں کے انگوٹھے سے ہاتھ چھڑانے کی بھرپور کوشش کرتے ہیں۔ اگر گرنے کے باوجود بھی کسی کھلاڑی کا ہاتھ انگوٹھے سے چھوٹ نہ جائے تو مقابلے سے باہر نہیں ہوتا۔ ٹیم کی شکل کے مقابلوں میں صرف وار کرنا یا مقابلہ کرنا ہی کافی نہیں ہوتا بلکہ بسراہ کے مخصوص انداز میں تیز دوڑنا بھی اہمیت کا حامل ہوتا ہے۔ مقابلے کے دوران ایک طرف کے کھلاڑی اگر زیادہ بچ جائیں تو وہ بسر کو اپنے ایک پھرتیلے اور طاقت ور ساتھی کے ذریعے گول پوسٹ جسے شنا میں ''چوچوہ'' کہتے ہیں، تک پہنچانے میں مدد کرتے ہیں۔ اگر کھلاڑی مخالف گول پوسٹ میں داخل ہو تب ان کا ایک پوائنٹ بنتا ہے۔



روایتی کھیل بسراہ کھیلتے ہوئے کھلاڑی

بھٹ پھل (شارٹ پٹ):

شنا میں ''بھٹ'' پتھر کو اور ''پھل'' پھینکنے کو کہتے ہیں۔ گویا بھاری پتھر پھینکنے کو ''بھٹ پھل'' کہا جاتا ہے۔ یہ کھیل بھی خالص مردانہ اور بہادری کی علامت ہے۔ اس کھیل میں کھلاڑی پتھر پھینکنے کا مقابلہ کرتے ہیں۔ کھلاڑی گول سا وزنی پتھر اپنے کندھے پہ رکھ کر ایک مخصوص جانب پھینکتے ہیں۔ پتھر کے پھینکتے وقت مقررہ لکیر سے آگے قدم بڑھانے کی اجازت نہیں۔ لکیر سے آگے پاؤں پڑے تو جتنا بھی دور پتھر پھینکے اُسے پوائنٹ نہیں ملتے۔ جس کھلاڑی کا پتھر قاعدے کے مطابق دور جا کے گرے وہ جیت جاتا ہے۔ ان علاقوں میں یہ کھیل کافی عرصے سے جاری تھا لیکن آج کل نہ ہونے کے برابر ہے۔ بھٹ پھل کھیل کی ایک اور بھی نوعیت ہے۔ اس میں بھاری پتھر کے بجائے چھوٹے چھوٹے پتھروں سے کام لیا جاتا ہے۔ یہ کھیل زیادہ تر دریا کے کنارے کھیلا جاتا ہے۔ کھلاڑی شرط بد کر چھوٹے چھوٹے پتھر اپنی پوری طاقت سے ہاتھ گھما کے پھینکتے ہیں۔ دریائے گلگت کا پاٹ زیادہ تر چوڑا ہے جو کھلاڑی دریا کی دوسری طرف جتنا دور پتھر پھینک دے وہ جیت جاتا ہے۔

تنبک بازی:

تنبک بازی زیادہ پرانا کھیل نہیں۔ اس کا آغاز بیسویں صدی کے اوائل سے ہوا ہے۔ یہ کھیل زیادہ مشہور نہیں۔ خاص خاص مواقع پر یہ کھیل کھیلا جاتا۔ شادی کے موقع پر دلہن والے ایک بلند درخت پر یا پھر کسی پہاڑی پر ایک نشان لگاتے۔ دولہا کے براتی اس نشان کو فائرنگ کے ذریعے ہٹ کرتے ہیں۔ جب تک مخصوص ٹارگٹ کا نشانہ نہ لیا جائے، دلہن لے جانے کی اجازت نہیں ہوتی۔ اس کے علاوہ عام طور پر بھی یہ کھیل ذرا سی تبدیلی سے کھیلا جاتا۔ اس میں ایک اونچے پول پر چھوٹے سے خشک کدو میں راکھ ڈال کر باندھا جاتا یا ہوا سے بھرے غبارے لٹکائے جاتے۔ گھڑسوار تیز گھوڑا دوڑاتے ہوئے بندوق سے اس کا نشانہ باندھتے۔ اگر نشانہ صحیح لگے تو راکھ باہر نکلتی اور اس کھلاڑی کو کامیاب قرار دیا جاتا۔

تنبک بازی کا آج کل رواج نہیں۔ اس کی بنیادی وجہ بدلتے حالات ہیں۔ لوگوں کے دلوں کے بیچ نفرت کی دیواریں کھڑی ہوگئی ہیں جس کی وجہ سے ہتھیاروں کا عام استعمال ممنوع ہے۔ اس لئے تنبک بازی بھی ختم ہوتی جارہی ہے۔

نیزہ بازی:

گلگت میں نیزہ بازی کا بھی رواج رہا ہے۔ یہ کھیل بھی زیادہ پرانا نہیں۔ انگریزوں کے دور میں اس کھیل کے آغاز کے شواہد ملتے ہیں۔ نیزہ بازی میں ایک دوسرے پر وار نہیں کیا جاتا بلکہ زمین پر کاغذ کے بنے ہوئے پائپ نما نشانے رکھے جاتے ہیں اور گھڑسوار گھوڑا دوڑاتے ہوئے آتا ہے اور نیزے سے نشانہ باندھ کر پائپ نما کاغذ کو نیزے کی انی میں پرونے کی کوشش کرتا ہے۔ نیزہ بازی کے مقابلے گلگت میں جشنِ آزادی اور جشنِ بہاراں کے دنوں میں شاہی پولو گراؤنڈ میں پولو ٹورنامنٹس کے دوران منعقد ہوتے تھے اور لوگوں کی دلچسپی کا سامان بنتے تھے۔ بعض دفعہ تیراندازی کا مظاہرہ بھی کیا جاتا تھا۔ لیکن یہ کھیل زیادہ تر ہنزہ نگر میں مقبول تھا۔

سمولو (کشتی):

شنا میں فری سٹائل کشتی کو "سمولو" کہتے ہیں۔ اس کھیل کے لئے کوئی قاعدہ قانون مقرر نہیں بس اتنی سی بات دیکھی جاتی ہے کہ فریقین جسمانی اور عمر کے لحاظ سے برابر ہوں۔ سمولو ماضی میں طاقت اور تکنیک کا مظہر ہوتی تھی۔ دو کھلاڑی کھڑے کھڑے زور آزمائی کرتے۔ بغلگیر ہونے کے انداز میں ایک دوسرے کو گرانے کی کوشش کرتے۔ اگر دونوں کھلاڑی ایک ساتھ گر جاتے اور کسی کا پلہ بھاری نہ ہوتا تو مقامی زبان میں اسے "ھرکہہ گیے" کہتے، جس کے معنی ہیں کسی کو برتری حاصل نہیں۔ گرانے کے لئے بازوؤں کی طاقت کے ساتھ ساتھ اڑنگا لگانا بھی جائز ہوتا تھا۔ جسے شنا میں "کھاں دوئک" کہتے ہیں۔ کھیل کے دوران فریقین کے حامی خوب نعرہ بازی اور شور وغل کرتے، سیٹیاں بجاتے اور غیرت دلانے کے لئے طرح طرح کے حربے استعمال کرتے۔ چونکہ کشتی میں ہارنا اپنے لئے شرمندگی کا باعث سمجھا جاتا اسلئے مخالف کھلاڑی کو زیر کرنے کے لئے کوئی کسر نہیں چھوڑتے۔ جو نوجوان مقابلے میں ہار جاتا تو اس پر نہ صرف طرح طرح کی آوازیں کسی جاتیں بلکہ اسے لعن طعن بھی کرتے، جس پر وہ غضبناک ہو کر میدان میں کود پڑتا اور از سر نو مقابلے کے لئے چیلنج دیتا۔ کسی بھی کھیل میں ہار جیت تو ہوتی ہی ہے لیکن لوگ ہار کو کھیل کا حصہ سمجھ کر خندہ پیشانی سے قبول کرنے کی بجائے ہارنے والے کی اس حد تک تضحیک کرتے کہ وہ بلا جواز اشتعال میں آ کر مد مقابل کے ساتھ مرنے مارنے کے لئے تیار ہوتا۔ یہی حال یہاں کی دیگر روایتی کھیلوں کے دوران بھی ہوتا۔

مسٹ کاہ:

مسٹ کاہ بھی دراصل طاقت آزمائی کا ہی نام ہے۔ عموماً دو ہم پلہ جوان آستین چڑھا کر ایک دوسرے کا مقابلہ کرتے ہیں اور کھلے ہاتھوں سے مد مقابل کے سینے پر چپت لگا کر ایک ہاتھ سے اس کے ہاتھ اور بازو مروڑ کر کمزور کرنے کی بھرپور کوشش کرتے ہیں۔ آجکل مسٹ کاہ کے نام سے بھی کوئی آشنا نہیں۔ البتہ اس کی جگہ باکسنگ وغیرہ کی اصطلاحات مستعمل ہیں۔

بالہ رَ اس تھوئک (رسہ کشی):

رسہ کشی بھی جسمانی طاقت اور مہارت کی علامت کا کھیل ہے۔ گاؤں کے صحت مند اور قد آور کھلاڑی منتخب کئے جاتے تھے۔ قبیلہ وار یا محلّہ وار مقابلے ہوتے تھے۔ خاص طور پر جشنِ آزادی یعنی نومبر کے مہینے میں رسہ کشی کے مقابلے ہوتے تھے۔ اس مقابلے میں دس دس یا اس سے کم وبیش نوجوان شامل ہوتے تھے۔ خاصی زور آزمائی ہوتی تھی۔ سازندے ایسی تیز اور جوشیلی دھنیں بجاتے، جس سے کھلاڑیوں کا جوش وخروش بڑھ جاتا تھا۔ موٹی رسی کے درمیان میں نشان لگایا جاتا اور درمیان سے ایک جانب ایک ٹیم اور دوسری جانب دوسری ٹیم ہوتی۔ ٹیمیں رسی کو دو مخالف سمت کھینچ کر زور آزماتے تھے۔ ہر ٹیم کے حامی اپنی اپنی ٹیموں کا حوصلہ بڑھانے کیلئے مختلف طریقوں سے داد دیتے۔ زور آزمائی کے وقت جو ٹیم درمیانی لکیر کراس کرتی وہ ہار جاتی تھی۔ شروٹ کے مہربان نامی پہلوان، کشروٹ کے امیر اللہ اور مجینی محلّہ کا مہربان المعروف "چھانو" رسہ کشی کے نامور کھلاڑی گزرے ہیں۔

زنانہ کھیل

بلّہ ساً (جھولا جھولنا):

شنا زبان میں جھولا جھولنے کو "بلّہ سا" کہتے ہیں۔ بہت پہلے سے یہ لڑکیوں کا پسندیدہ کھیل رہا ہے۔ یہ کھیل صرف چھوٹی عمر کی لڑکیاں ہی نہیں بلکہ بڑی عمر کی عورتیں بھی کھیلا کرتی تھیں۔ کسی درخت کی اونچی شاخ پر بالوں کی مضبوط رسی ڈال کر جھولا بناتے۔ لڑکیاں اور عورتیں اس پر جھولتی تھیں۔ آج کل یہ کھیل بھی جدید کھیلوں اور مشینی مصروفیات کے سیلاب میں مٹتا جا رہا ہے۔ بالخصوص مختلف تہواروں کے موقع پر لڑکیاں اور عورتیں ٹولیوں کی شکل میں اپنی ہمجولیوں کے ساتھ جھولا جھولنے کا کھیل کھیلا کرتی تھیں۔

رابیلہ/ چھلے دوئک:

یہ کھیل چھوٹی عمر کی لڑکیوں کا نہایت پسندیدہ کھیل ہے۔ چھوٹی عمر کی لڑکیاں کہیں کہیں اب بھی "رابیلہ" کھیلتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ البتہ آجکل یہ کھیل پہلے کی نسبت بہت کم دیکھنے میں آتا ہے۔ خاص کر گرلز سکولوں میں تفریح کے اوقات میں لڑکیاں چاک کے ٹکڑوں سے یا چھوٹی کنکریوں سے یہ کھیل کھیلتی ہیں۔ اس کھیل میں چھوٹے چھوٹے کنکر استعمال ہوتے ہیں۔ جو تعداد میں پانچ یا سات ہوتے ہیں۔ ایک کنکر کو تھوڑا سا اچھالا جاتا ہے۔ باقی کنکریاں جو زمین پر قریب قریب ہوتی ہیں پہلے انہیں ایک ہی بار جھپٹ کر مٹھی میں لینے کی کوشش کرتی ہیں۔ ساتھ ہی اوپر اچھالے گئے کنکر کو بھی تھامتی ہیں اور نیچے گرنے سے بچاتی ہیں۔ اس کھیل کی دلچسپ بات یہ ہے کہ لڑکیاں صرف ہاتھ ہی نہیں چلاتی ہیں بلکہ زبان بھی چلاتی ہیں۔ گانے کے انداز میں کچھ مخصوص بول ادا کرتی ہوئی وہ کنکریوں کو پکڑتی اور کھیل جاری رکھتی ہیں۔

بلّی بلا:

"بلّی بلا" بڑا ہی دلچسپ اور لڑکیوں کا پسندیدہ کھیل ہے۔ ایک طرح سے یہ ہی وہ واحد کھیل ہے جو اب بھی باقاعدگی سے کھیلا جاتا ہے۔ اس میں لڑکیاں زمین پر مستطیل شکل کے خانے بناتی ہیں۔ یہ خانے تعداد میں آٹھ ہوتے ہیں اور ان کے آخر

میں ہاف گول دائرہ ہوتا ہے جسے ''آمبو'' کہتے ہیں۔ روایت کے مطابق پہلے وقتوں میں لڑکے بھی یہ کھیل کھیلتے تھے۔

لڑکیاں ایک چھوٹا سا پتھر جس کا چپٹا ہونا ضروری ہوتا ہے، شروع میں پہلے خانے میں پھینکتی ہیں۔ جولڑکی پتھر پھینکتی ہے وہ ایک پاؤں اوپر اٹھا کر پھدکتی ہوئی اس خانے میں داخل ہوتی ہے اور اسی حالت میں زمین پر رکھے پاؤں کے ذریعے سے چپٹے پتھر کو باقی خانوں میں سے گزارتے ہوئے مقررہ حدود سے باہر نکالتی ہے۔ پتھر اگر خانوں کے درمیان لکیر پر رک جائے یا لڑکی کا پاؤں لکیر پر لگے تب وہ آؤٹ کہلاتی ہے اور دوسری کی باری آتی ہے۔ اگر پتھر سارے خانوں سے گزارا جائے تب ایک خانہ اس کے حصے میں آتا ہے۔ یوں جولڑکی زیادہ خانے حاصل کرتی ہے وہ کامیاب کہلاتی ہے۔ اس کے ہر خانے کا علیحدہ نام ہوتا ہے۔ چلاس کے لوگ اس کھیل کو ''سونا مونا'' کہتے ہیں۔

ٹپّہ:

ٹپّہ اور بلّی بلّا میں قدرے فرق ہے۔ کیونکہ بلّی بلّا میں پتھر کو سیدھا آگے کی سمت گزارتے ہوئے پوائنٹ حاصل کرتے ہیں۔ جبکہ ٹپّہ میں پتھر کو الٹی سمت گزار کر پوائنٹ حاصل کئے جاتے ہیں۔

ہپ جھکی:

یہ کھیل عموماً دو عورتیں یا لڑکیاں مل کر کھیلتی ہیں۔ دو لڑکیاں ایک دوسرے کے دائیں ہاتھ سے دایاں اور بائیں ہاتھ سے بایاں ہاتھ پکڑ کر ہاتھوں سے کراس کی شکل بنا کر درج ذیل گیت دہراتے ہوئے پاؤں کو جھٹکا دے کر تیزی سے گھومنے لگتی ہیں:۔

ھپ جُھکی دادونی
ماں گہ مہ خاتونی
تھی سر احھونی

راجہ بنانے کا کھیل:

گلگت اور اس کی مضافات میں ماضی میں ایک اور کھیل بھی کھیلتے تھے۔ محلّہ یا گاؤں کے نوجوان اپنے محلے کے کسی صاحب ثروت اور بے وقوف شخص کو فرضی طور پر راجہ قرار دے کر اس کو اسی نام سے پکارتے۔ مصنوعی راجہ بھی ترنگ میں آ کر دوست احباب کی دعوتوں کا اہتمام کرتا۔ دراصل محلے کے نوجوان مصنوعی راجہ بھی محض دعوتیں اڑانے کیلئے ہی بناتے تھے۔

اسی طرح تھک (چلاس) میں سید غازی شاہ نامی ایک ہوشیار اور چالاک شخص تھا، جو حکومت سازی کا کھیل کھیلتا۔ وہ دن کے وقت لڑکوں کو جمع کرتا اور انہیں اپنے اپنے گھروں سے اخروٹ لانے کیلئے کہتا۔ ایک دن کی حکومت بنا کر لڑکوں کے ذریعے حاصل شدہ اخروٹ سے خزانہ قائم کرتا اور تمام لڑکوں میں عہدے تقسیم کر کے تنخواہ مقرر کرتا۔ دن بھر لڑکوں سے ان کے عہدے کے مطابق کام لیتا تھا۔ کسی کو چور بناتا تو کوئی کوتوال ہوتا، کوئی لیوی ہوتا تو کوئی ڈنڈا مار ہوتا۔ سید غازی خود بادشاہ اور منصف کے فرائض سرانجام دیتا۔ شام کے وقت سب کو اپنے دربار میں طلب کر کے ان پر نہ صرف فرد جرم عائد کر کے سزاوار ٹھہراتا بلکہ تمام اخروٹ جرمانے کے طور پر ان سے وصول کرتا اور اس کے بعد اپنی ایک روزہ حکومت کو تحلیل کر کے گھر کو سدھارتا۔ غیر مستحکم حکومتوں کو دیکھ کر چلاس اور تھک کے لوگ آج بھی یہی کہتے ہیں کہ ''غازی شاہ حکومت ہِن'' یعنی موجودہ حکومت بھی غازی شاہ کی حکومت کی طرح تماشا معلوم ہوتی ہے۔

بچگانہ کھیل

لیش پیش:

شنا زبان میں آنکھ مچولی کے کھیل کو ''لیش پیش'' کہتے ہیں۔ یہ بچوں کا کھیل ہے۔ اس میں دو پارٹیاں بنتی ہیں۔ ایک پارٹی والے ادھر ادھر چھپتے ہیں جبکہ دوسری پارٹی کے لڑکے ان کو تلاش کرتے ہیں۔ اگر کسی ساتھی کو تلاش کرنے میں کامیابی نہ ہو تو ایسی صورت میں ان کا ایک پوائنٹ ضائع ہوتا ہے اور دوسری پارٹی کو پوائنٹ ملتا ہے۔ تلاش کرنے کی صورت میں ضروری ہوتا ہے کہ مخالف کھلاڑی کے سر پہ ہلکی چپت ماری جائے ورنہ نمبر نہیں ملتا۔ یہ کھیل بھی اب مٹتا جا رہا ہے۔ کیونکہ آبادی کے بڑھنے کی وجہ سے چھپنے کے مناسب مقام دستیاب نہیں۔

پنڈوک:

''پنڈوک'' درمیانی عمر کے لڑکوں کا پسندیدہ کھیل سمجھا جاتا ہے۔ یہ زیادہ پرانا نہیں۔ اس میں چھوٹے سے کپڑے میں تھوڑی سی مٹی ڈال کر پوٹلی سی بنائی جاتی۔ اس پوٹلی کو ہوا میں اچھال کر ایک پاؤں کو ذرا سا ٹیڑھا کرتے ہیں۔ جب پوٹلی پاؤں پر پڑتی ہے تب پاؤں ہی کے ذریعے اوپر اچھالا جاتا ہے اور تعداد کی گنتی کرتے ہیں۔ جولڑکا پوٹلی کو زیادہ بار پاؤں کی مدد سے اوپر اچھالتا ہے وہ کامیاب ہوتا ہے۔ ''پنڈوک'' کا کھیل بھی اب بہت کم دیکھنے میں آتا ہے۔

ٹکروسا (گلی ڈنڈا):

شنا میں گلی ڈنڈا کو ''ٹکروسا'' کہتے ہیں۔ موسم سرما میں جب شدید سردی کی وجہ سے تین چار مہینوں تک زمین کاشت نہیں کی جاتی تب کھیتوں میں

اس کھیل کو کھیلنے کا موقع ملتا ہے۔ اس میں ایک چھوٹی لکڑی گلی کے لئے اور ایک موٹی اور لمبی لکڑی ڈنڈے کے لئے استعمال کی جاتی ہے۔ گلی کے دونوں کناروں کو چاقو سے تراش کر نوک دار بناتے ہیں۔ شنا میں گلی کو ''ٹکروس'' اور ڈنڈے کو ''ٹھولو'' کہتے ہیں۔ گلگت میں ''ٹکروسا'' کا کھیل دو طرح سے کھیلا جاتا ہے۔

پہلی صورت میں زمین میں چھوٹی سی تقریباً 4 انچ لمبی، آدھا انچ چوڑی اور پونے انچ گہری نالی سی بنا لیتے ہیں۔ اس پہ گلی کو ٹکا دیتے اور ڈنڈے کے نوکیلے سرے کی مدد سے اسے دور پھینکتے۔ مخالف کھلاڑی پھینکی گئی گلی کو پکڑنے کی کوشش کرتے۔ اگر پکڑنے میں کامیاب ہوئے تو کھیلنے والا آؤٹ ہو جاتا۔ اگر پکڑ نہ سکے تو جہاں پہ گلی گری تھی وہاں سے متعلقہ جگہ پر رکھے گئے ڈنڈے کا نشانہ لے کر پھینکتے۔ گلی اگر ڈنڈے سے ٹکرائی تو وہ کھلاڑی آؤٹ ہو جاتا ہے۔ اگر گلی ڈنڈے سے نہ ٹکرائی تب وہ ڈنڈے کی مدد سے گلی پر ضرب لگاتا ہے۔ گلی تھوڑی سی اوپر اچھلتی ہے اور اسی دوران ڈنڈے سے زور سے پھر ضرب لگاتے ہیں اور یہ عمل تین بار کرتے ہیں۔ اگر تینوں بار چوٹ مس ہو تو چوٹ لگانے والا آؤٹ ہوتا ہے۔ لیکن ڈنڈے کی چوٹ ایک بار بھی گلی کو لگے تو اس دوران گلی جتنی دور جائے، پھینکنے کی جگہ سے اس جگہ تک پیائش کرتے ہیں۔ پیائش کے لئے گلی کا سائز استعمال کیا جاتا ہے۔ کھیل کے آغاز میں ایک مخصوص تعداد کے نمبر مقرر کئے جاتے ہیں۔ جو ٹیم پہلے وہ نمبر سکور کر لے اس کی جیت ہوتی ہے۔

دوسری صورت یہ ہے کہ زمین پر گول دائرہ بنایا جاتا ہے۔ ٹاس میں جو ٹیم جیت جاتی ہے۔ اس ٹیم کا کوئی کھلاڑی ڈنڈے سے گلی کو اوپر اچھالتا ہے۔ زمین پہ گرنے سے پہلے جتنی بار ڈنڈے کی مدد سے اچھالتا ہے، اتنی بار وہ گلی کو ضرب لگا کر دائرے سے دور پھینکتا ہے اور مخالف کھلاڑی اس جگہ سے دائرے میں گلی پھینکتا ہے۔ اگر گلی دائرے کے اندر جائے تب وہ کھلاڑی آؤٹ ہوتا ہے ورنہ یہ کھیل جاری رہتا ہے۔ اہل چلاس گلی ڈنڈے کے کھیل کو ''ٹھوپ گہ ٹھوکی'' کہتے ہیں۔

پٹھو دوئک:

اس کھیل میں چھوٹے چھوٹے پتھروں کی ایک مینار بنائی جاتی ہے۔ اور دو ٹیمیں بنا کر یہ کھیل کھیلتے ہیں۔ مخالف ٹیم کا کھلاڑی کپڑے سے بنائی گئی گیند سے مینار کو دس قدم کے فاصلے سے تین دفعہ نشانہ بناتا۔ اگر تینوں بار نشانہ خطا ہو تو ٹیم کا دوسرا آدمی یہ عمل دہراتا۔ اگر ایک ٹیم کے تین کھلاڑیوں کا نشانہ مسلسل خطا ہو جائے تو متعلقہ ٹیم آؤٹ تصور ہوتی ہے۔ لیکن اگر کسی ایک کھلاڑی کی گیند کا مینار ایک بار بھی نشانہ بن کر گر جائے تو گیند پھینکنے والا بھاگ جاتا جبکہ دوسری ٹیم کے کھلاڑی اسی گیند سے مخالف ٹیم کے بھاگنے والے کھلاڑی کو مارنے کی کوشش کرتے۔ اگر گیند بھاگنے والے پر لگ جاتی تو پوری ٹیم آؤٹ ہو جاتی اور دوسری ٹیم اسی طرح گیند سے مینار کو نشانہ بناتی۔ اگر بھاگنے والے پر گیند کا نشانہ خطا ہو جاتا تو وہ مخالف گیند بردار کھلاڑی کے حملے سے بچتے ہوئے مینار کو از سرِ نو تعمیر کرنے کی کوشش کرتا۔ اگر گیند لگنے سے پہلے مینار تعمیر ہوئی تو ٹیم کامیاب تصور ہوتی۔ لیکن اگر مینار تعمیر کرنے والے کو قبل از تعمیر گیند لگ جاتی تو پوری ٹیم آؤٹ ہوتی اور مخالف ٹیم کے کھیلنے کی باری آتی۔ یہ لڑکوں کا پسندیدہ کھیل رہا ہے۔

رن ٹھسا:

''رن ٹھس'' شنا میں کیکر کی ایک قسم کو کہتے ہیں جسے انگریزی میں ایلانتھس کہتے ہیں۔ یہ کھیل کرکٹ یا امریکن بیس بال طرز کا ہوتا ہے۔ اس میں زمین پہ ایک دائرہ کھینچ لیا جاتا ہے۔ دائرہ بڑا سا ہوتا ہے۔ دائرے کی لکیر پہ تقریباً دو دو گز کے فاصلے پہ پتھر رکھے جاتے ہیں۔ کھلاڑی دو ٹیموں میں تقسیم ہوتے ہیں۔ کھیلنے کے لئے ''رن ٹھس'' کا ایک موٹا خمدار ڈنڈا بطور بیٹ استعمال ہوتا ہے۔ گیند کے طور پر ''لوٹھ'' استعمال ہوتی ہے۔ ''لوٹھ'' کپڑے کے بہت سے ٹکڑے لپیٹ کر بنائی جاتی ہے۔ اوپر سے موٹے اور مضبوط دھاگے سے سیتے ہیں۔ دائرے کے ایک مخصوص نشان پہ مخالف کھلاڑی کھڑا ہو کر لوٹی پھینکتا ہے۔ کھلاڑی اس کو ''رن ٹھس'' کی مدد سے زوردار ضرب لگا کر دور پھینکتا ہے۔ ''لوٹھ'' ہوا میں ہی پکڑے جانے کی صورت میں کھلاڑی آؤٹ ہوتا ہے۔ ورنہ بھاگ کر دائرے کی لکیر پہ موجود پتھروں پر سے گزرتا ہے۔ جب تک مخالف کھلاڑی ''لوٹھ'' کو واپس دائرے تک پہنچا دیں وہ کھلاڑی جتنے پتھروں سے گزرتا ہے، اس کے اتنے پوائنٹ بنتے ہیں۔ اسی طرح وہ پورے دائرے کا چکر لگاتا ہے۔ پورے دائرے کا چکر لگانے سے قبل اگر ''لوٹھ'' واپس پہنچائی جائے اور کھلاڑی مخصوص فاصلوں پر موجود پتھروں تک نہ پہنچے تب وہ کھلاڑی آؤٹ سمجھا جاتا ہے اور اگر پتھروں پہ کھڑا رہے، چاہے چکر بھی پورا نہ ہو تب اس کی باری ختم نہیں ہوتی۔ بلکہ اسی ٹیم کا دوسرا کھلاڑی بال کو ضرب لگا کر اسے دور پھینکتا ہے۔ اس کا ساتھی اور وہ خود بھی ممکن ہوا تو بھاگ کر دائرے کے گرد چکر پورا کرتے ہیں۔ اس طرح تمام چکر شمار کئے جاتے ہیں۔

پہاڑی دوڑ:

پہاڑی دوڑ ایک زمانے میں گلگت میں بڑا مقبول اور سنسنی خیز کھیل ہوا کرتا تھا۔ گلگت کے بلند و بالا پہاڑوں پہ مضبوط اور چاق و چوبند نوجوان دوڑ لگاتے اور مقررہ راستوں سے ہوتے ہوئے مخصوص جگہ پہ پہنچ کر واپس آجاتے۔ اس میں کوئی قاعدہ قانون نہیں ہوا کرتا۔ محض مقررہ راستوں کی شرط ہوتی۔ گلگت کے کسی مرکزی مقام سے نوجوان دوڑ لگانا شروع کرتے اور پہاڑ پہ موجود کسی نشان تک پہنچ کر سب سے

پہلے جونو جوان واپس مقررہ مقام پہ آجاتا وہ جیت جاتا۔ یہ کھیل زیادہ تر ماہِ نومبر میں جشنِ آزادی کے موقع پر اور جشنِ بہاراں میں منعقد ہوتا تھا۔

کھکائیں پھل تھوئک (اخروٹ پھینکنا):

اخروٹ پھینکنا یہاں کا ایک مشہور اور لڑکوں کا پسندیدہ کھیل ہے۔ اس میں ایک چھوٹا سا گڑھا بنایا جاتا ہے۔ اس گڑھے سے دو، تین گز کے فاصلے پر ایک چھوٹا سا پتھر بطور نشان رکھا جاتا ہے۔ دو لڑکے یا اس سے زیادہ اپنے اخروٹ لے کر اس کھیل میں شامل ہوتے ہیں۔ اخروٹ کی تعداد پہلے ہی طے کر دی جاتی ہے یعنی آٹھ، دس، بارہ وغیرہ۔ سب سے پہلے ایک ایک اخروٹ بطورِ ٹاس مدمقابل گڑھے میں پھینکتے۔ جس کا اخروٹ آخر میں گڑھے میں جاتا وہی کھیل کا ابتدا کرتا۔ بطور ٹاس اس ابتدائی اخروٹ پھینکنے کو ''پھرگسیلی ویونک'' کہتے ہیں۔ ہر کوئی یہ کوشش کرتا کہ وہ ''پھرگسیلی'' آخر میں پھینکے۔ اس سلسلے میں ایک اصول یہ تھا کہ اخروٹ کا کھیل کھیلنے والوں میں سے جو لڑکا سب سے پہلے ''سرپھاٹ'' کہتا تو وہ اس کے بدلے میں سب سے آخر میں ''پھرگسیلی'' پھینکتا۔ پھر دوسرا ''ورپھاٹ'' کہتا وہ Next Last تصور ہوتا۔

پہلے کھیلنے والا کھلاڑی دوسرے کھلاڑی سے دو یا چار اخروٹ لے کر اس میں اپنے بھی اتنے ہی اخروٹ شامل کرتا ہے پھر انہیں ایک ہاتھ میں لے کر پتھر کے نشان سے گڑھے میں پھینکتا ہے۔ گڑھے کے اندر جتنے اخروٹ گرتے وہ پھینکنے والے کھلاڑی کے ہوتے۔ جو باہر رہ جاتے ان میں کسی ایک کا نشانہ لینے کے لئے مخالف کھلاڑی کہتا۔ اگر وہ اپنے اخروٹ سے جسے ''کونو'' کہا جاتا ہے اس کا صحیح نشانہ باندھے تب باہر والے سارے اخروٹ بھی اس کے ہو جاتے ہیں۔ اگر نشانہ خطا ہو جائے اور مخالف کھلاڑی کے بتائے گئے اخروٹ کے بجائے کسی اور اخروٹ سے اس کا ''کونو'' ٹکرائے یا گڑھے کے اندر جائے تو اسے جرمانہ ادا کرنا پڑتا ہے۔ اس صورت میں صرف گڑھے کے اندر ڈالے گئے اخروٹ ہی نہیں بلکہ اپنی جیب سے بھی ایک اضافی اخروٹ دینا ہوتا ہے۔ اب دوسرا کھلاڑی یہی عمل کرتا ہے۔ اس طرح جو کھلاڑی بہتر نشانہ بازی کا مظاہرہ کرتا، اخروٹ سمیٹنے میں کامیاب ہوتا۔ آجکل اخروٹ کی جگہ اسی اصول پر سکے کھیلے جاتے ہیں۔ اخروٹ یا سکے کھیلنے کا ایک اور طریقہ بھی ہے۔ جس کے مطابق ایک لمبی ڈنڈی کہیں کھڑی کی جاتی ہے اور دور سے اس کی طرف اخروٹ یا سکہ پھینکتے ہیں، جس کسی کا سکہ یا اخروٹ ڈنڈی کے قریب تر ہو وہ سارے سکے اٹھاتا ہے۔ اسی طرح پہلے مقرر شدہ سکے یا اخروٹ کی تعداد پر دو کھلاڑیوں میں سے ایک کے جیتنے پر اور دوسرے کے ہارنے پر کھیل ختم ہو جاتا۔ یہ کھیل اب بھی کہیں کہیں دیکھنے میں آتا ہے۔ بالخصوص عیدین کے مواقع پر لڑکے ضرور کھیلتے ہیں۔ اخروٹ یا سکہ پھینکنے کا کھیل ایک اور طریقے سے بھی کھیلا جاتا ہے۔ جس کے مطابق دو لڑکے چار چار اخروٹ یا سکے یا اس سے بھی زیادہ پہلے آپس میں طے کرتے ہیں۔ پھر ان میں سے ایک لڑکا گڑھے سے چار پانچ فٹ کے فاصلے سے اخروٹ یا سکے پھینکتا ہے۔ اگر گڑھے میں گرے ہوئے اخروٹ یا سکوں کی تعداد جفت ہے تو پھینکنے والا ان کا حقدار ہوتا ہے لیکن طاق کی صورت میں مدمقابل حقدار ہوتا ہے۔ اسی طرح اس وقت تک یہ سلسلہ جاری رہتا ہے جب تک تمام سکوں یا اخروٹ کا فیصلہ نہ ہو۔ اس طرح کے کھیل کو ''کاشغر جا ویونک'' یعنی کاشغریوں کے طرز پر کھیل کھیلنا کہتے ہیں۔

برونو جپ تھوئک (انگوٹھی چھپانا):

لڑکے دو گروپس میں تقسیم ہوتے ہیں۔ ایک گروپ اپنے ہاتھوں میں سے کسی ایک میں انگوٹھی یا کوئی بٹن چھپا لیتا ہے اور مٹھی بند کئے ہوئے تمام اپنے اپنے ہاتھ مدمقابل کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ مدمقابل گروپ مخالفین کے ایک ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بوجھتا ہے کہ انگوٹھی یا بٹن اس میں ہے۔ اگر بٹن یا انگوٹھی واقعی اس میں ہو تو بوجھنے والا گروپ ان سے انگوٹھی یا بٹن اٹھاتا ہے اور چھپانے کا عمل خود سرانجام دیتا ہے۔ دوسرا گروپ جب تک نہیں بوجھتا یہ عمل اتنی دیر تک جاری رہتا، جو جتنی بار زیادہ بوجھتا ہے اسے کامیاب قرار دیا جاتا ہے۔ دراصل یہ کھیل بڑے اور چھوٹے لڑکوں کے بیٹھے بیٹھے مشغول رہنے کا ایک منفرد ذریعہ ہے۔ اس کھیل میں عموماً شرط بھی لگاتے ہیں۔

چھوپے ویونک:

سب سے پہلے لڑکے دو گروپوں میں تقسیم ہوتے ہیں اور ایک چھوٹا سا سکہ نما پتھر کی ایک سطح تھوک سے گیلی کر کے اوپر اچھالتے ہیں۔ گیلی سطح کو ''ارو'' (ابر آلود) اور خشک سطح کو ''بیرہ'' (مطلع صاف) کہتے ہیں۔ یہ ایک طرح سے ٹاس ہوتا ہے۔ پتھر اوپر اچھالنے والا مخالف گروپ سے معلوم کرتا ہے کہ وہ ''اَرو'' اور ''بیرَہ'' میں سے کونسی سطح پسند کرے گا۔ اچھالے ہوئے پتھر کی جو سطح اوپر کی جانب ہوگی متعلقہ گروپ کامیاب تصور ہوگا اور وہ گروپ کھیل کا آغاز کرے گا۔ ٹاس کا ایک اور طریقہ ''چھچ دونک'' ہے۔ جس کے تحت دونوں گروپس کا ایک ایک فرد اپنے ہاتھوں کے مخصوص حرکات وسکنات کے ذریعے ٹاس کرتے ہیں۔ اس کے بعد ٹاس جیتنے والا گروپ مختلف نامعلوم جگہوں پر جا کر مخصوص وقت میں مٹی کے چھوٹے چھوٹے تقریباً آدھ انچ اونچے ٹیلے جنہیں مقامی لوگ ''چھوپے'' کہتے ہیں، بناتے اور پھر مدمقابل گروپ کو دعوت دیتے کہ وہ مٹی کے ٹیلوں (چھوپے) کو ڈھونڈ نکالیں۔ اس پر مخالف گروپ ''چھوپے'' تلاش کرنے نکلتا اور انہیں جہاں جہاں مٹی کے ٹیلے (چھوپے) نظر آتے، تلف کرتے۔ اس کے بعد مخالف ٹیم کے

پاس آ کر کہتے کہ ہم نے تمہارے تمام ٹیلے تلف کر دیے ہیں۔ اس موقع پر مخالف ٹیم کی نظروں سے پوشیدہ اگر کچھ ''چھوپے'' باقی رہ گئے ہیں تو دوسری ٹیم مخالف ٹیم کو ان ٹیلوں کی نشاندہی کراتی ہے کہ اتنے چھوپے باقی ہیں۔ جنہیں تم ڈھونڈ نہیں سکے۔ لہٰذا بعد میں تلاش کئے گئے ٹیلے (چھوپے) شمار کئے جاتے ہیں۔ یہی عمل دوسرا گروپ سرانجام دیتا ہے۔ آخر میں حساب کتاب کے بعد جو گروپ ٹیلوں (چھوپے) کی تعداد زیادہ ثابت کرتا ہے، کامیاب قرار دیا جاتا ہے۔ آجکل یہ کھیل باقی نہیں رہا ہے۔ اس کھیل کو اہل چلاس ''چھوٹی پوٹی'' کہتے ہیں۔

انڈے لڑانے کا کھیل:

پرانے وقتوں میں انڈے لڑانے کا کھیل بھی بہت مشہور تھا۔ بالخصوص مختلف تہواروں کے موقع پر نوجوان لڑکے یہ کھیل کھیلتے۔ تہواروں کے مقررہ ایام سے چند دن قبل ہی انڈوں کے انتخاب کے لئے دوڑ دھوپ شروع ہوتی۔ بالخصوص جامع مسجد، سبزی منڈی اور ائرپورٹ کی مضافات اور رقص سنیما چوک کے اردگرد کا علاقہ اس کھیل کے لئے مشہور تھا۔ جس کسی کا انڈا لڑائی میں ٹوٹ جاتا تو انڈے کا مالک ہار جاتا اور ٹوٹا ہوا انڈا جیتنے والے کو دیا جاتا۔ الغرض شام تک جیتا ہوا بہت سارے انڈے لے کر گھر لوٹتا جبکہ ہارا ہوا اپنا سا منہ لے کر خالی ہاتھ جاتا۔

تم دونک (تیراکی):

ماضی میں تیراکی کا کھیل منظم طریقے سے ہوتا تھا۔ اس مقصد کے لئے جگہ جگہ تالاب ہوتے تھے۔ بالخصوص چنار باغ میں موجود تالاب میں اس کے مقابلے ہوتے تھے۔ جس میں بہترین تیراک کا انتخاب کیا جاتا اور اسے انعام واکرام سے نوازا جاتا۔ دریا میں بھی تیراکی کے مقابلے ہوتے تھے لیکن اب یہ کھیل زمیندار اور تجربہ کار لوگ تھوگور (Stud sheep) کا چمڑا کما کر اس سے ''میوس'' بناتے جو مشکیزہ کی طرح ہوتی۔ چمڑہ کمانے کے دوران سیب کے پتے اور دہی بھی استعمال میں لائے جاتے جس سے ''میوس'' کا رنگ پیلا ہوتا۔ تیراک ''میوس'' پر سوار ہو کر تیراکی کے جوہر دکھاتے۔ میوس پر سواری سے پہلے ہوا بھری جاتی۔ شنا میں ایک محاورہ ہے کہ ''سن دور آ میوس دور'' یعنی دریا اور مشکیزہ دونوں سامنے موجود ہیں حوصلہ ہے تو تیراکی کے لئے میدان میں اترو۔ یہ محاورہ ان موقعوں پر استعمال ہوتا ہے جب کوئی شخص بغیر کسی اہلیت کے خواہ مخواہ شیخی بگھارنے لگے۔ چھوٹے لڑکے قمیص اتار کر شلوار کے ناڑے کو خوب کھینچ کر باندھ دیتے اور شلوار کے دونوں پائنچوں کو گھٹنوں کے آس پاس ناڑہ نما پٹی سے کس کر باندھتے اور دریا یا نالے میں اتر کر شلوار کو گیلا کرنے کے بعد منہ کے ذریعے اس میں ہوا بھر دیتے جس سے تیراکی میں آسانی ہوتی۔ اس طرح تیراکی سے ناآشنا لڑکے بھی تیر سکتے کیوں کہ اس طرح ڈوبنے کا احتمال کم ہوتا۔ پل روڈ گلگت سے ملحقہ کوٹ محلہ کے لوگ تیراکی کے ماہر مانے جاتے تھے۔ راجہ شبیر ولی آج کل تیراکی کے فن میں بہت مشہور ہیں۔ تیراکی کے متعلق شنا کی یہ کہاوت کہ ''گی گہورگی وای گہوریٹ شونگ تھے'' یعنی گزشتہ موج جیسی بھی گزری، گزر گئی، آنے والی موج سے محتاط رہ، بھی مستعمل ہے۔ تیراک لڑکے دریا میں ایک دوسرے کے چہرے پر دونوں ہاتھوں سے پانی پھینک کر بھی مقابلہ کرتے ہیں۔

شکاریات کی قدیم روایت:

قدیم روایات، جنگلی حیات میں شامل گھاس خور حیوانات کو انتہائی پاک و پاکیزہ ماحول میں بسنے والی مخلوق قرار دیتی ہیں۔ جنہیں شنا زبان میں ''سُجہ'' کہا گیا ہے اور ان جنگلی حیوانات میں کیل کو بہت اہمیت دی جاتی ہے۔ چھوٹے بڑے دنوں میں جب یہاں گھی اور تیل میں تلی ہوئی روٹیاں پکائی جاتیں تو سب سے پہلے گوندے ہوئے آٹے سے ایک کیل کا مجسمہ بنایا جاتا اور اس کو تیل میں پکا کر ٹوکرے میں رکھ دیا جاتا۔ جس میں بعد کی پکائی ہوئی روٹیاں رکھی جاتیں اور اس عمل کو باعثِ خیر و برکت تصور کیا جاتا۔ علاوہ اس کے ایسے ہی اور اسی طرح تیار کئے ہوئے کیل کے مجسمے بنا کر موسم خزاں کے آغاز پر جنگل سے مال مویشی اور بکریوں کو واپس لانے والے گلہ بانوں کے حضور گاؤں کی حدود میں داخل ہونے سے پہلے استقبال کے لئے جانے والے بچے پیش کیا کرتے۔ ان کے خیال میں اس عمل سے بکریوں اور مالِ مویشی میں اضافہ ہوتا اور مالک اور مال مویشی دونوں وبائی امراض اور ناگہانی آفات سے محفوظ رہتے۔ پرانے زمانے میں شکار کے بھی کئی طریقے تھے۔ جانوروں کو دھوکہ دے کر گڑھے میں گراتے اور پھندے سے پکڑتے تھے۔ ضرورت پڑنے پر تیر کمان سے بھی شکار کرتے۔ لوگ بڑے جفاکش تھے اور شکار کے لئے دور دراز علاقوں تک چلے جاتے تھے۔ جشن نوروز کے آخری ایام یعنی مارچ کی آخری تاریخوں میں سکار کوئی (بلداس) کے قریب واقع سطح مرتفع ''ہرالی'' میں ''ڈم دروع'' یعنی ہانکے کا شکار ہوتا تھا۔ جس میں شکار کے لئے مطلوب جانوروں کو ہانکے کے ذریعے بھگا کر اس کے پیچھے گھوڑا دوڑا کر شکار کرتے تھے۔ شکاری، کیل، شکاری کا ساتھی، ان کا کتا اور ایک برفانی چیتے کا سٹیج ڈرامہ برطانوی دور حکومت میں ہر بڑی تقریب میں بڑے اہتمام اور تیاری کے ساتھ پیش کیا جاتا رہا ہے اور دور دور سے لوگ رات کے وقت اس تماشے کو دیکھنے کے لئے آیا کرتے تھے۔ طلاکشی اور شکار کے بارے میں ایک توہم یہ ہے کہ یہ دونوں کام جو کوئی بھی کرتا ہے وہ آباد نہیں ہوتا۔ گویا دونوں پیشوں سے بے برکتی جھلکتی ہے۔ اس سلسلے میں ایک کہاوت ہے کہ ''لیجی مروع، لیجی دروع'' یعنی شکار اور طلاکشی کے کام بے برکتی کی علامت ہیں، بہت مشہور ہے۔

شکار کے عقیدے اور روایات:

جب انسان فنِ شکار سے آشنا ہوا تو وہ اس وقت فطری ضابطے کا پابند تھا۔ مثلاً گرمیوں میں شکار کرنا جبکہ مادہ بچے جنتی ہے، خلاف روایت تصور کرتے تھے۔ اس کے علاوہ مادہ اور بچے کا شکار کرنا یا حد سے زیادہ شکار کرنا اپنے اور اپنی اولاد کے لئے خطرہ سمجھتے تھے۔ بعض لوگوں کا یہ عقیدہ تھا کہ اگر کوئی انسان حد سے زیادہ شکار کرے تو وہ اولادِ نرینہ سے محروم ہو جاتا ہے۔ ان کے عقیدہ اور خیال کے مطابق ان جانوروں کی نگرانی قدرتی طور پر ایک مافوق الفطرت دیوی کرتی ہے۔ جس کو مقامی زبان میں ''درنجی'' کہتے ہیں۔ وہ ایسے شکاریوں کی اولاد اور ان کی جان کو نقصان پہنچاتی ہے جو اس ضابطے کی خلاف ورزی کرتے ہیں۔ یہ توہمات انسان کا حیوان سے تعلق اور انسیت کی آئینہ دار ہیں۔ درنجی کے لفظی معنی ''باہر والی'' کے ہیں، جو کہ شنا زبان کے لفظ ''درینو'' سے نکلا ہے۔ ''درنجی ماں'' یہ اصطلاح سب سے پہلے لاریمر نے استعمال کیا تھا۔ جس کا مفہوم بیرونی ماں کے ہے۔ یہ اس مخلوق سے تعلق رکھتی ہے جو کہ انسانی دنیا سے باہر موجود خیال کی جاتی۔ بقول ڈاکٹر کارل جیٹمار ''درنجی'' دیوی نہیں بلکہ ایک فائدہ مند روح ہے۔ لیکن ناراضگی کی صورت میں سخت خطرناک ثابت ہوتی ہے۔ یہ دیوی عورت کی شکل میں بھڑکیلے لباس میں ملبوس، سر سے پاؤں تک سونے کے زیورات پہنے، مکمل طور پر بناؤ سنگھار کئے ہوئے کبھی خواب اور کبھی بیداری کی حالت میں انتہائی ماہر شکاریوں کو نظر آتی ہے۔ بیداری میں اس کی موجودگی کا پتہ اس کے زیورات کی جھنکار سے لگتا ہے۔ خوشی کی حالت میں انتہائی جاذب نظر ہوتی ہے اور ناراضگی کی حالت میں انتہائی غضبناک، بدصورت، ڈراؤنی اور کریہہ المنظر عورت کی شکل میں ظاہر ہوتی ہے۔ اگر شکاری سے خوش ہو تو اسے اپنا بھائی اور بیٹا بناتی ہے اور ایک نہایت خوبصورت بچے کے مجسمے کو عمدہ لباس پہنا کر سونے کے زیورات سے آراستہ و پیراستہ کر کے شکاری کو تحفے کے طور پر خواب میں پیش کرتی ہے۔ جسے شنا زبان میں ''بری یو چھالو'' کہا جاتا ہے۔ جس کا یہ مطلب ہوتا ہے کہ شکاری کی دیوی (درنجی) اس شخص کو بحیثیت شکاری تسلیم کرتی ہے اور یہ کہ اسے شکار کے مسلمہ اصول وضوابط پر عمل پیرا ہوتے ہوئے شکار کرنے کی مکمل اجازت دیتی ہے اور یہ کہ وہ کبھی بھی شکار کئے بغیر اپنی مہم سے ناکام نہیں لوٹتا۔ علاوہ ازیں ''درنجی'' اس عمل کے بعد شکاری کو اس کے ہاتھ شکار ہونے والے جانوروں کی تعداد کا بھی قبل از وقت بتا دیتی ہے۔ ایک روایت کے مطابق پریوں کی ایک جماعت کنواری لڑکیوں کی طرح سفید ٹوپیاں پہنتی ہے۔ یہ پریاں جو ''راھھئے'' کے نام سے موسوم ہوتی ہیں، شکاری اور شامال کی مدد کرتی ہیں۔ راھھی، رھونک یعنی حفاظت کرنے کے معنوں میں مستعمل ہے۔ یہ شکاریوں کو خواب میں جب نظر آتی ہیں تو ان کے ہاتھوں میں پھول اور پھل نہیں ہوتے بلکہ وہ شکاری کے حضور کٹا ہوا ایک انسانی سر پیش کرتی ہیں۔ شکاری سمجھ جاتا ہے کہ یہ انسانی سر دراصل اس مارخور یا آئی بیکس کی روح ہے، جو وہ اگلے دن شکار کرنے والا ہے۔ درنجی جہاں شکاری پر مہربانی اور شفقت سے پیش آتی ہے وہاں پر شکار کے اصول وضوابط کی خلاف ورزی کرنے پر قہرناک بھی ہوتی ہے۔ حد سے زیادہ شکار کرنے والے، مادہ اور بچوں کو مارنے اور حمل اور دودھ پلانے کے دوران شکار کرنے والے شکاری کو اس دیوی کے غیظ وغضب کا شکار ہو کر جان سے ہاتھ دھونے پڑتے ہیں یا وہ اولادِ نرینہ سے محروم ہوتا ہے۔ لہٰذا ماہر اور پیشہ ور شکاری ان ایام میں شکار کرنے سے قطعاً پرہیز کرتا ہے۔ معاشرے میں نہ صرف شکاری کو معزز فرد سمجھا جاتا تھا بلکہ شکار کے فن کو بھی بہادری اور جرات مندی کا نشان سمجھا جاتا۔ کیونکہ اچھا شکاری وہی ہوتا تھا جو کسی مقررہ ضابطے کا پابند ہو اور جنگلی جانوروں کو جائز مصرف میں لاتا ہو۔ شکار کے گوشت کو متبرک تصور کیا جاتا تھا۔ کتے، بلی اور بدقماش لوگوں کو شکار کا گوشت نہیں دیا جاتا تھا۔ یہاں تک کہ گوشت کھانے کے بعد ہڈیاں دفنائی جاتی تھیں اور یہ خیال کیا جاتا تھا کہ اگر شکار کا گوشت بلی یا برے شخص کے منہ لگا تو شکاری شکار کی مہم سے ناکام واپس آئے گا۔ شکاری کے لئے جو روٹی پکتی تھی اس میں خاص طور پر پاکیزگی کا خیال رکھا جاتا تھا۔ بندوق، گولیاں اور بارود وغیرہ کو ''اسپندز'' کی دھونی دی جاتی تھی اور شکاری نہا دھو کے اور پاک صاف کپڑے پہن کر منہ اندھیرے گھر سے نکلتا تھا تا کہ کوئی دوسرا شخص اس کے راستے میں نہ آسکے۔ کیونکہ اس موقع پر کسی برے آدمی کا سامنا کرنا بدشگون خیال کیا جاتا تھا۔ اگر شکاری کا شکار پر جاتے ہوئے عورت کا سامنا ہو جاتا تو اسے بھی بدشگونی سے تعبیر کیا جاتا۔ یہاں تک کہ شکار کی مہم پر روانگی سے قبل شکاری اپنی بیوی سے ہم بستری بھی نہیں کرتے۔ شکاری عموماً ایک آدمی ساتھ رکھتے تھے جو ان کا مددگار ہوتا تھا۔ پاپوش جسے شنا زبان میں ''تھوٹی'' کہا جاتا ہے۔ وہ بکرے یا بکری کے چمڑے سے تیار ہوتی۔ کیونکہ گائے بیل کے چمڑے سے تیار کئے ہوئے ''تھوٹی'' سے درنجی کو نفرت تھی اور اسے استعمال سے شکار میں ناکامی کا احتمال ہوتا تھا۔ آج کل ''تھوٹی'' کی جگہ پلاسٹک کے بنے ہوئے جوتے جو سستے داموں ہر جگہ دستیاب ہیں، استعمال ہوتے ہیں۔

''تھوٹی'' شکاری ہی کیا بلکہ ہر پہاڑی مرد اور عورت دونوں کا اہم پاپوش ہوا کرتا تھا۔ یہ ہاتھ سے کمائے ہوئے چمڑے کے چند پٹوں اور اسی چمڑے سے بنائے ہوئے سموں پر مشتمل ہوا کرتا تھا۔ سخت سردی اور برف باری میں اس کے اندر اونی کپڑے اور اونی پتاوے بھی استعمال کئے جاتے تھے۔ ان کو پٹی کی طرح خاص مہارت سے دونوں پاؤں پر لپیٹا جاتا تھا۔ سخت ترین پہاڑی راستوں اور پھسلنے والی عمودی چٹانوں سے گزرنے کے لئے ''تھوٹی'' ہی کام دیتی تھی۔ اس

سے نہ پاؤں پھسلتا تھا اور نہ ہی برف اور سخت سردی میں پاؤں جلنے کا احتمال رہتا تھا۔ غرضیکہ یہ شکاری کے لباس کا اہم جزو تھا۔ قدیم انسان وسائل کی نایابی کی وجہ سے یہ پاپوش استعمال کرتا رہا لیکن پہاڑی بوٹ کے حصول کے بعد بھی شکاری کے لئے تھوٹی کی اہمیت کم نہیں ہوئی۔ ایک روایتی شکاری کا لباس ''تھوٹی'' کے علاوہ ایک دیسی پٹو کا چوغہ، پٹو کا کھلا کرتہ اور پٹو کا پاجامہ اور پٹو کی ٹوپی پر مشتمل ہوا کرتا تھا۔ کمر باندھنے کے لئے ایک سوتی چادر بھی اس کے لباس میں شامل ہوا کرتی تھی۔ رات بسر کرتے ہوئے تھوٹی سے سرہانہ، پاجامہ سے تلائی اور چوغہ اوپر اوڑھ لیا جاتا تھا۔ یہ شکاری کا کل سامان تھا۔ البتہ اس کے مددگار کے پاس ایک چمڑے کا تھیلہ ہوتا تھا جسے شنا زبان میں ''برکو'' کہا جاتا۔ اس میں پکی پکائی روٹی کچھ نمک اور خشک میوہ وغیرہ رکھا جاتا۔ علاوہ اس کے رسیاں بندوق، گولیاں، بارود، چقماق کا پتھر، فولاد کا ایک ٹکڑا اور روئی جسے ''خاپ'' کہتے ہیں، اس سامان میں شامل ہوتے۔ اس سامان کے علاوہ اور کوئی چیز اٹھانے کی پابندی تھی اور نہ ہی اس دشوار خطے میں اس سے زیادہ سامان اٹھا کر گھومنا پھرنا کوئی آسان کام تھا۔ شکار کے فن میں مزید ترقی ہوئی تو شکاری کتے بھی استعمال ہونے لگے۔ یہ بڑا ہی بے رحمانہ فعل تھا۔ کیونکہ کتے شکار کو ہانک کر ایک ایسی جگہ جمع کرتے تھے جہاں سے نکل کر بھاگنا ناممکن ہوتا اور شکاری آسانی سے ان کا شکار کرتے۔ بعض لالچی اور ناعاقبت اندیش شکاری تمام جانوروں کو ختم کرتے تھے۔ ان کے نزدیک جنس، عمر اور تعداد کا کوئی لحاظ نہیں ہوتا تھا۔ شکار کیلئے ہانکا بھی کرایا جاتا جس کو مقامی زبان میں ''ڈم دروع'' کہتے ہیں۔ اس قسم کا شکار والیانِ ریاست، رئیس اور بڑے بڑے صاحبِ ثروت لوگ کیا کرتے تھے۔ مروجہ طریقہ کار کے مطابق سینکڑوں لوگوں کو جمع کیا جاتا تھا۔ ڈھول باجے ساتھ رکھے جاتے تھے۔ منہ اندھیرے شکارگاہ پہنچ کر شکار کے بھاگنے کے تمام راستے مسدود کئے جاتے تھے۔ ان کے گرد حصار باندھتے اور قطار بنا کر شور مچاتے تھے اور ساتھ ساتھ ڈھول بھی بجاتے تھے۔ نیزہ اور بندوق بردار شکاریوں کو مخصوص جگہوں پر متعین کیا جاتا تھا۔ جب جانور گھات لگائے ہوئے شکاریوں کی زد میں آتے تو بندوقیں چلنی شروع ہو جاتی تھیں اور جانور گرنے لگتے تھے۔ اس طریقہ شکار سے ایک دن میں سینکڑوں جانور مارے جاتے تھے۔ شنا کی یہ کہاوت کہ ''**شُنہ مریع گہ مور سرح مریع گہ موز**'' یعنی مارخور مرے تو بھی گوشت اور کتا مرے تو بھی گوشت، اس موقع پر مستعمل ہوتی ہے جب کوئی شخص حلال وحرام میں تمیز نہ کرے۔ شنا میں ایک اور کہاوت کہ ''**شَرح بُنیر چھوریع گوٹیر باگے تھوئک**'' یعنی ابھی مارخور کا شکار کیا نہیں ہے، لیکن شکاری اپنے گھر میں بیٹھ کر متوقع شکار کے گوشت کے پیشگی حصے کر کے تقسیم کرتا ہے، یعنی بے محل کام کرنے کے معنوں میں استعمال ہوتی ہے۔ کیونکہ ہر کام اپنے اپنے وقت پر اچھا لگتا ہے۔ جب کوئی شخص اتنا بدمست ہو جائے کہ متوقع خطرات بھانپ نہ سکے تو ایسے موقع پر بھی ایک کہاوت استعمال میں لائی جاتی ہے کہ ''**اُرین دار مراک بے اموشین**'' یعنی اُڑیال اوٹ پر چلا جائے تو سب کچھ بھول جاتا ہے، یعنی اسے وہ خطرہ بھی یاد نہیں رہتا کہ شکاری اس کے تعاقب میں ہے۔

1892ء میں جب انگریزوں نے ہنزہ اور نگر کی ریاستیں فتح کیں اور لوگوں کو غیر مسلح کرتے ہوئے مسگر پہنچ گئے تو وہاں کے لوگوں نے ان فاتحین کی تفریح طبع کے لئے وہ ڈرامہ پیش کیا، جس کا ذکر ای۔ ایف کائٹ نے اپنی مشہور کتاب ''WHERE THREE EMPIRES MEET'' میں کیا ہے۔

جوڑا کھانے یعنی ملاپ کے موسم کو ''بُروی'' کہتے ہیں۔ پہاڑی بکریاں ملاپ کے تقریباً پانچ مہینے بعد بچے دیتی ہیں۔ اس موسم کے شروع ہونے سے قبل ہی جانور سینگ مارنا (سنگ گرونک) شروع کرتا ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ملاپ کیلئے بیتاب ہے۔ مادہ مارخور بچہ پیدا کرنے کے بعد دو دنوں تک اسے (بچے کو) اپنے ساتھ رکھتی ہے۔ کیونکہ اس دوران عقاب کے شکار ہونے کا احتمال ہوتا ہے۔ ان دنوں حملے کی صورت میں مادہ مارخور اس کا تحفظ کرتی ہے۔ جبکہ اڑتالیس گھنٹے کے بعد بچہ خود عقاب کا مقابلہ کرنے کے قابل ہوتا ہے۔ ماہرین مارخور کے حمل کی میعاد 162 تا 170 دن، کیل کی 150 دن اور اُڑیال کی 134 دن مقرر کرتے ہیں۔ شکار کے گوشت کو تبرک کے طور پر کھایا جاتا ہے۔ عورت اپنے مخصوص ایام میں شکار کئے ہوئے جانوروں کے کسی حصے کو چھو نہیں سکتی۔ شکاری جس جانور کا شکار کرتے تو اس کے سینگوں اور چمڑوں سے ٹرافیز اور یادگاری اشیاء تیار کر کے فخر و مباہات کے طور پر مکان کے کسی نمایاں جگہ پر نصب کرتے۔ یہ ٹرافیز زیادہ تر مارخور، آئی بیکس وغیرہ کی ہوتیں۔ کیل کے معدوں کے شروع کے خانوں میں طرح طرح کی معدنیات کے ملنے سے سخت گول ٹکیاں بن جاتیں، جن کے متعلق لوگوں کا یہ تصور ہے کہ ان میں بیماریوں سے شفایابی کی جادوئی خصوصیات پائی جاتی ہیں۔ اور نومولود بچوں کو لاحق دست اور ہیضہ کی بیماریوں کے دوران ان سے علاج کرتے ہیں۔ مقامی زبان میں انہیں ''تریاق'' کہتے ہیں۔ جب بھی یہ جانور ذبح ہوتے ہیں تو لوگ ان کے معدوں سے یہ ٹکیاں نکال کر حفاظت سے رکھتے ہیں۔ محلّہ اور گاؤں کے لوگوں کو جب بھی ضرورت پڑے تو پتھر پر رگڑ کر اسے متاثرہ بچے کو پلاتے ہیں۔ کیل کا پتہ غلط طریقے سے جُڑی ہوئی انسانی ہڈیوں کو نرم کرتا ہے اور دوبارہ توڑنے کے کام میں استعمال ہوتا ہے۔ دیسی معالج متاثرہ جوڑ توڑنے کے بعد دوبارہ صحیح طریقے سے جوڑتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ مارخور سانپ کھاتا ہے اور کھانے کے بعد کچھ دن بغیر کھائے پیے مست رہتا ہے۔ اس دوران

اس کے منہ سے ایک جھاگ نکلتی ہے جو پتھروں پر جمع ہوکر ٹکیوں کی شکل اختیار کرتی ہے۔ یہ بھی تریاق کہلاتی ہے۔ اور سانپ کے کاٹے ہوئے کا اس سے علاج کرتے ہیں۔ لوگوں کے مطابق اس میں بھی جادوئی اثر ہوتا ہے۔

لوگوں کا عقیدہ تھا کہ ان جنگلی جانوروں کے ساتھ ''درنجی'' کے علاوہ دوسری مؤکل پریاں بھی ہوتی ہیں۔ جو مقامی زبان میں ''مچی گون'' کہلاتی ہیں۔ یہ مؤکل پریاں نابالغ، چنچل اور انتہائی خوش باش لڑکیوں کی شکل میں زرق برق لباس پہنے ہاتھوں میں پھول اور پھل لئے ماہر شکاری کو خواب میں نظر آتی ہیں اور شکار ملنے اور نہ ملنے کی اطلاع دینے کے علاوہ دوسرے دن پیش آنے والے واقعات کا بھی پیش گوئی کرتی ہیں۔ ماہر شکاری اپنی زندگی میں اس قسم کے خواب دیکھتے ہیں۔ ماہر اور پیشہ ور شکاری ان موکل پریوں کو خوش کرنے کے لئے ان کے نام پر قربانیاں اور صدقے دیا کرتے۔ اگر کوئی موکل پری کسی شکاری کے صدقات اور قربانیوں سے زیادہ خوش ہو تو اسے زیادہ شکار کرنے کے مواقع فراہم کرنے کے علاوہ اسے اپنی جھلک بھی دکھایا کرتی۔ درنجی کے علاوہ ایک اور مؤکل پری ''مورکون'' کہلاتی ہے جس کے بارے میں مشہور ہے کہ ایک زمانے میں خواتین اس کی پوجا کرتی تھیں۔ کیونکہ لوگوں کے مطابق ''مورکون'' خواتین کی زچگی کے دوران زچہ، بچہ دونوں کا تحفظ کرتی ہے۔ ایک تصور یہ بھی ہے کہ تمام جنگلی بکرے اور بکریوں کی واحد مالکن ''مورکن'' پری ہے۔ شکاری بھی اس مؤکل پری کا بے حد احترام کرتے ہیں۔ خراموش کے لوگوں کا اب بھی یہ عقیدہ ہے کہ بعض اوقات مادہ کیل کی شکل میں انسانی روحیں بھی ظاہر ہوتی ہیں۔

مارخور اور کیل کے ریوڑ میں ایک خوبصورت چتکبرا قوی الجثہ جانور بھی ہوتا ہے۔ جو اس نگران دیوی کا پسندیدہ کیل یا مارخور ہوتا ہے۔ مارخور کے ریوڑ کے اس نمایاں جانور کو ''نُمی بہورو'' کہتے ہیں۔ یہ نر مارخور ہوتا ہے۔ جبکہ آئی بیکس (کیل) کے ریوڑ میں موجود اس نمایاں جانور کو ''کلی کینل'' کہتے ہیں۔ یہ دونوں جانور اپنے اپنے ریوڑ کے سردار تصور ہوتے ہیں جو عموماً ریوڑ کے آگے آگے چلتے ہیں اور دوسرے جانور ان کی پیروی کرتے ہیں۔ یہ جانور خطرات کی صورت میں سیٹی بجا کر سارے ریوڑ کو خبردار کرتے ہیں۔ بیشتر شکاری ایسے بکروں کو شکار کرنے سے عموماً گریز کرتے ہیں کیونکہ لوگوں کے مطابق اس سے موکل دیوی (درنجی) ناراض ہوکر شکاری کو ہولناک نقصان سے دوچار کرتی ہے۔ یہ دونوں بکرے اس خطے میں پائے جانے والے تمام نر کیل اور مارخور کے ریوڑ میں انتہائی قدآور، بال اور پشم سے بھرپور، چست و چالاک، پھرتیلے اور سب سے دراز سینگ کے مالک ہوتے ہیں۔ ان کے سینگ بھی بناوٹ میں چپکاؤ اور پھیلاؤ میں اپنے ریوڑ کے ساتھی بکروں سے مختلف ہوتے ہیں اور انہی واضح علامات اور شکل و شباہت سے ان کی منفرد ہیئت کا پتہ چل جاتا ہے۔

نر بکروں کے علاوہ ریوڑ میں ایک مادہ کیل بکری یا مارخور دوسری بکریوں سے قد و قامت، چال ڈھال، رنگ اور بالوں کے مقابلہ میں مختلف ہوا کرتی ہیں۔ ان کے سینگ بھی لمبے اور کالے ہوتے اور عام بکریوں کے مقابلہ میں بہت موٹی تازی اور قد میں بڑی ہوتی۔ ان بکریوں کو شنا زبان میں ''میرماں'' کہا گیا ہے اور انہی بکریوں کے شکار سے بھی اجتناب کیا جاتا۔ کیونکہ یہ بکریاں مؤکل دیوی (درنجی) کی پسندیدہ بکریاں ہوتیں۔ شکار کے حوالے سے ''**بیونی**'' کے نام سے ایک استعارہ بھی ہے۔ کہتے ہیں کہ جب چیتا شکار کے لئے نکلتا ہے تو وہ اپنے دونوں پنجوں سے مٹی جمع کرتا ہے۔ اور پھر اس مٹی کو پھیلا دیتا ہے۔ اگر اس مٹی میں کوئی بال نظر آئے تو چیتا اسے شکار ملنے کا اشارہ سمجھ کر روانہ ہوتا ہے۔ ماضی میں یہاں کی عورتیں اُڑیال اور مارخور کے سینگ جلا کر اس سے ایک سیال مادہ حاصل کرتیں جو بوقت ضرورت موسمی اثرات سے بچنے کے لئے چہرے پر ملا جاتا۔ بلند و بالا مقامات پر بسنے والے لوگ اسے آج بھی استعمال کرتے ہیں۔



پلی اور رسی کی مدد سے دریا عبور کرنے کا طریقہ

حلولَی میارو:

گھونسلے کو شنا زبان میں ''حلول'' کہتے ہیں۔ اور ''میارو'' بمعنی مارخور استعمال ہوتا ہے۔ لہٰذا ''حلولَی میارو'' کا لفظی معنی گھونسلے کا مارخور بنتا ہے۔ یہاں

کے مقامی لوگ اکیس جون اور اکیس دسمبر کے بارے میں کہتے ہیں کہ ان میں ''سُوری حلولٹ بجن'' یعنی ان دنوں سورج اپنے گھونسلے میں جاتا ہے۔ اور وہاں اڑھائی اڑھائی دن قیام کرتا ہے۔ شنا کیلنڈر کے مطابق ہر ماہ تیس دنوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ اور اس طرح سال میں 360 دن بنتے ہیں۔ سورج کو اکیس جون اور اکیس دسمبر کو اپنے گھونسلے میں اڑھائی، اڑھائی دن قیام کرا کر باقی ماندہ پانچ دنوں کی کمی کا ازالہ کر کے سال کے 365 دن پورے کرتے ہیں۔ اس حوالے سے ایک مشہور روایت یہ ہے کہ نومل جگلوٹ کے شمال میں واقع ایک چٹان پر ہر سال بلا ناغہ اکیس دسمبر کو ایک مارخور دکھائی دیتا ہے جسے ''حلولی میارو'' کہتے ہیں اور لوگ اسے عیدالفطر کے چاند کی طرح اشتیاق سے دیکھتے ہیں۔

جب شکاری سو جانور از قسم مارخور، کیل یا اڑیال شکار کر لیتا تھا تو سویں شکار کے جانور کے خون سے ہاتھ دھو لیتا تھا۔ جس کا مطلب موکل پریوں اور درنجی کی مہربانیوں پر خراج عقیدت پیش کرنا یا ایک سنچری سکور کرنے کا اعلان ہوتا تھا۔ لہٰذا ایک ماہر اور پیشہ ور شکاری سے اس کا سکور دریافت کرنے کے لئے یہ پوچھا جاتا تھا کہ اس نے کتنی دفعہ خون سے ہاتھ دھویا ہے اور وہ جواب بھی سنچری کے حساب سے دیا کرتا تھا۔ شکار کرنے کے بعد درنجی کی خوشی کی خاطر یہ ضروری تھا کہ جانور کو ذبح کرنے کے بعد چمڑا اتارتے ہی فوراً اس کا پیٹ چاک کر کے کلیجہ نکالا جائے اور جلتی آگ پر ڈال کر کچا پکا کلیجہ شکاری اور بعد میں اس کے ساتھی کھالیں۔ اس طرح کے کلیجہ کھانے سے شکاری کا منہ اور ہاتھ بری طرح خون آلود ہوتے۔ جس سے یہ خیال کیا جاتا کہ مؤکل پریاں اس عمل سے خوش ہوئی ہیں اور اس طرح شکاری درنجی کے اشیر باد کا مستحق سمجھا جاتا۔

شکار کے روایتی طریقے

کپگہ:

یہ لوہے کا پھندا ہوتا ہے۔ جسے گوشت خور اور نقصان دہ جانوروں کو پکڑنے کے لئے استعمال میں لایا جاتا ہے۔ مثلاً برفانی چیتا، بھیڑیا، لومڑی، جنگلی بلی، مسیر، شانچہ وغیرہ۔ ان جانوروں کو پکڑنے کا ایک اور فائدہ یہ ہوتا تھا کہ ان کا چمڑا مارکیٹ میں مہنگے داموں فروخت ہوا کرتا۔ یہ پھندا عموماً رات کو تیار کر کے چھوڑا جاتا اور صورتحال کا صبح سویرے جائزہ لیا جاتا۔

دھڑپ:

پرندے پکڑنے کے لئے جو لکڑی کا پھندا استعمال کیا جاتا تھا اسے ''دھڑپ'' کہتے ہیں۔

کوپہ:

زمینی خوراک حاصل کرنے والے پرندے مثلاً چکور اور رام چکور کو پکڑنے کے لئے جو روایتی پھندا استعمال میں لایا جاتا، اسے ''کوپہ'' کہتے ہیں۔

مچھلی کا شکار:

یہاں کے دریا اور نالوں میں دیسی اور ٹراؤٹ مچھلی پائی جاتی ہے۔ خاص کر یہاں کی ٹراؤٹ مچھلی اور گولڈن فش ذائقے کی وجہ سے بہت مشہور ہیں۔ ٹراؤٹ مچھلی نالوں میں جبکہ دیسی مچھلی دریا میں پائی جاتی ہے۔ مچھلی پکڑنے کے حوالے سے یہ تو ہم بھی پائی جاتی ہے کہ ہر کوئی مچھلی پکڑنا چاہے تو نہیں پکڑ سکتا بلکہ وہ مچھیرا ہی ڈھیر ساری مچھلیاں پکڑ سکتا ہے، جس پر دیوی (راٹھی) مہربان ہو۔ اس سلسلے میں جو مچھیرا زیادہ مچھلیاں پکڑتا تو لوگ کہتے کہ ''انے بیج راٹھی بے ٹن'' یعنی اس پر دیوی مہربان ہوئی ہے۔

مچھلی کا شکار کئی طرح سے کیا جاتا ہے۔ ایک تو کانٹا استعمال کیا جاتا ہے جو بڑا صبر طلب کام ہے۔ دوسرا جال کا استعمال کیا جاتا ہے۔ دو نوجوان جال پکڑ کر کھڑے ہوتے ہیں اور باقی نوجوان کچھ فاصلے سے پانی کے بہاؤ کے رخ سے ہانکا کرتے ہوئے آتے ہیں۔ ان سے بچنے کے لئے مچھلیاں جال کی سمت آتی ہیں اور جال میں پھنس جاتی ہیں۔ تیسرا طریقہ یہ ہے کہ تقریباً 5 گز لمبی ڈوری پر تین چار کانٹے دار سوئیاں لگا کر ان پر کیڑے مکوڑے، ذبح شدہ مویشیوں کا خشک خون، پھیپھڑے کا گوشت، تازہ توت یا خشک توت گرم کر کے ٹانک دیتے ہیں۔ ڈوری کے ایک سرے پر پانچ چھ سیر بڑا پتھر باندھتے ہیں جبکہ دوسرے سرے پر چھوٹا سا نوکدار پتھر باندھتے ہیں۔ بڑے پتھر والے سرے کو دریا کے کنارے سے ذرا اندر لے جا کر پانی میں اس طرح چھوڑتے ہے کہ کسی دوسرے کو اس کا پتہ معلوم نہ ہو۔ دوسرے سرے کے چھوٹے پتھر کو دریا کی گہرائی کی طرف پھینک دیا جاتا ہے۔ متعلقہ جگہ پر کوئی خاص نشان رکھ دیا جاتا تا کہ تلاش کرنے میں آسانی ہو۔ اگلے دن صبح سویرے یا سرِ شام آ کر ڈوری کھینچی جاتی۔ جس میں ایک دو مچھلیاں ضرور پھنس جاتیں ہیں۔ ایک اور طریقہ جو مچھلی کی نسل کشی کے مترادف ہے وہ دریاؤں اور نالوں میں بارود کا دھماکہ کر کے مچھلیوں کا پکڑنا ہے۔

لوک لباس، زیورات اور دیگر سامان آرائش

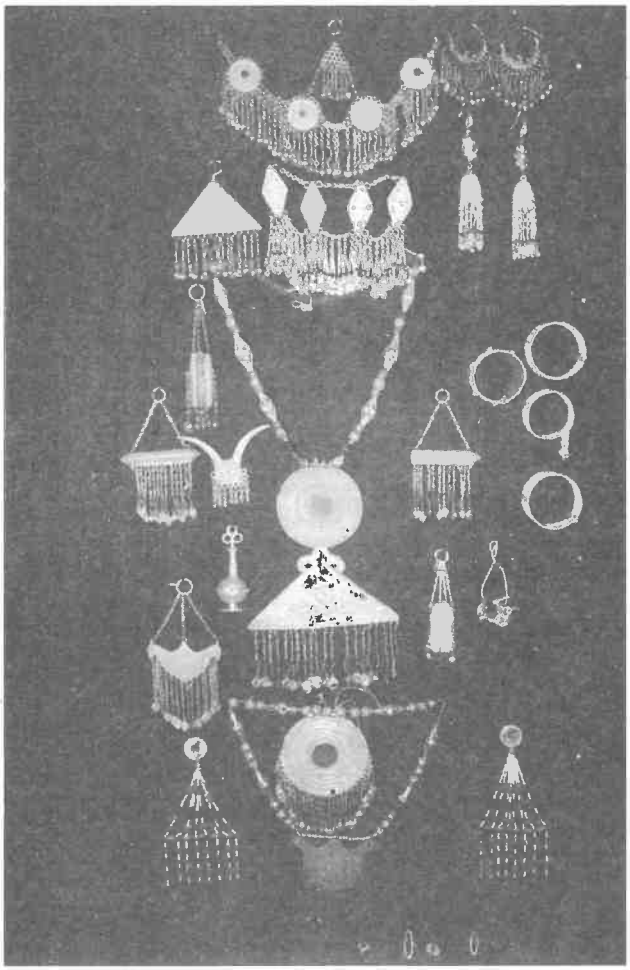
لوک لباس:

عہد عتیق میں گلگت اور گردونواح کے علاقوں میں آبادی بہت کم تھی۔ زندگی بڑی سادہ اور آسائشوں سے خالی تھی۔ لوگ جنگلی جانوروں کا شکار کر کے ان کا گوشت بطور خوراک استعمال کرتے تھے۔ ان کی ہڈیوں سے ہتھیار کا کام لیتے اور کھالوں سے تن ڈھانپتے تھے۔ رفتہ رفتہ لوگوں میں شعور پیدا ہوا تو وہ بھیڑ بکریوں

کے اون اور بالوں سے استفادہ کرتے ہوئے اونی لباس زیب تن کرنے لگے۔ یہاں کا روایتی لباس نہ صرف خوش رنگ، بارعب اور باوقار تھا بلکہ لوگوں کے اعلیٰ ذوق کا مظہر بھی تھا۔ علاقائی لباس میں قمیص، شلوار، ٹوپی وغیرہ ان علاقوں میں بڑی حد تک مشترک ہیں۔ سردیوں کے موسم میں چلاس اور دیامر میں اونی حنری اور باقی ماندہ علاقوں میں چوغہ (شکہ) پہننے کا رواج آج بھی ہے۔ چوغے میں یہ خصوصیت ہوتی ہے کہ اس سے تقریباً سارے جسم کو ڈھانپ کر شدید سردی کا مقابلہ کیا جا سکتا ہے۔ ملازم پیشہ افراد ڈھیلے ڈھالے پن کی وجہ سے چوغہ پہننے سے احتراز کرتے ہیں۔ مالدار لوگ چوغہ پر ریشمی دھاگے سے کڑھائی کر کے پہن لیتے ہیں۔ جس سے ان کی شخصیت نکھر جاتی ہے۔ جبکہ چلاس اور داریل تانگیر کے لوگ مقامی طور پر تیار کی گئی جس اونی چادر سے جسم ڈھانپتے وہ ''**حنری**'' کے نام سے موسوم ہے۔ اس کے دونوں پلّوں پر بھی بڑی دلکش اور خوبصورت کڑھائی کی جاتی ہے۔ **حنری** کا رنگ بھی مجموعی طور پر سفید، کالا اور بھورا ہوتا ہے۔ یہاں کی چھوٹی بڑی علاقائی تہذیب اور معاشرتی اکائیاں ایک دوسرے سے ہم آہنگ ہو کر نہ صرف ایک وسیع تر رشتے میں نمودار ہوتی ہیں بلکہ قومی و علاقائی پہچان کا باعث بھی بنتی ہیں۔ یہاں کے لوگ عام طور پر قناعت پسند ہیں اور شنا محاورہ ''کھونٹ حکے پاریک تھونگ''، یعنی کمبل دیکھ کر پاؤں پھیلانے کا عملی مظاہرہ کرتے ہیں۔ مقامی طور پر اون کا بنایا ہوا لوک لباس نہ صرف پائیدار ہوتا بلکہ کئی سالوں تک اسے استعمال میں لایا جاتا۔ سال میں بمشکل ایک دفعہ انہیں دھونے کی نوبت آتی ہے یا کئی سالوں کے بعد دھونے کی زحمت گوارا کرتے ہیں۔ ماضی میں یہاں غریب لوگوں کا لباس ایک جوڑے سے زیادہ نہیں ہوتا تھا۔ شنا محاورہ ''نانک اک چھک ناؤ پرونک ہر چھک ناؤ''، یعنی نیا لباس ایک دن کے لئے نیا اور پرانا لباس ہمیشہ کے لئے نیا سے، یقیناً یہاں کے لوگوں کے رویوں کی نشاندہی ہوتی ہے۔ اونی کرتے کو مقامی زبان میں ''پھرن'' کہتے جبکہ شلوار کو ''**حنلو**''۔ کرتا اور شلوار لمبے، سادہ اور ڈھیلے ڈھالے ہوتے تھے۔ سر پر اونی ٹوپی جس کا رنگ سفید، کالا اور بھورا ہوتا، مرد حضرات پہنتے تھے۔ شوقین مرد حضرات نہ صرف روایتی ٹوپی پر پھول لگاتے بلکہ سارس کے قسم کا ایک پرندہ جسے مقامی لوگ ''منڈاک'' کہتے ہیں، کے چمکدار سفید پر ''پھرگو''، مرغابیوں کے خمدار اور گھونگریالے کالے رنگ کے پر ''جُرونے'' اور مرغ زرین کی کلغی ''شانٹی'' ٹوپی پر لگاتے۔ روایتی ٹوپی کو مقامی زبان میں ''کھوی'' کہتے ہیں۔ کسی زمانے میں ٹوپی کا نہ پہننا اور ننگے سر رہنا معیوب سمجھا جاتا تھا۔ ٹوپی کو سر پر ٹیڑھی کر کے رکھنا اور ہونٹوں کی سیٹی کے ذریعے کسی لوک دھن کو چھیڑتے ہوئے خراماں خراماں چلنا باعث مستی و تفاخر تصور کیا جاتا۔ شنا میں مستعمل کہاوت ''کھوی بنی تک بُٹے مشے یے بین نا؟''، یعنی ہر ٹوپی پہننے والا مرد (بہادر) تو نہیں ہوتا، سے بھی روایتی ٹوپی کی اہمیت جھلکتی ہے۔ گلگتی اپنے دوستوں اور مہمانوں کو روایتی ٹوپی بطور تحفہ پیش کر کے فخر محسوس کرتے ہیں۔ دو دوست اپنی دوستی کے اظہار کے لئے اپنی ٹوپیاں تبدیل کرتے اور عمر بھر اپنی دوستی کے رشتے کو مستحکم رکھتے۔ وقت کے ساتھ ساتھ ٹوپی کی وضع قطع میں بھی تبدیلی آتی رہی۔ مثلاً قدیم ایام میں دیسی اونی ٹوپی کا زیریں حصہ جسے مقامی زبان میں ''کونز'' کہا جاتا ہے، خاصا طویل ہوتا تھا اور ٹوپی کی پٹی (پھراٹی) خاصی موٹی دکھائی دیتی تھی اور بالائی حصہ جسے ''کھُوع'' کہتے، تنگ ہوتا تھا۔ اب نچلا حصہ مختصر اور بالائی گولائی قطر میں بڑی رکھی جاتی ہے۔ اب یہاں چترالی اونی ٹوپی پہننے کا رواج بھی ہو چلا ہے۔ شیر خوار بچوں کے سر پر نرم اور ملائم رومال رکھ کر پیشانی اور سر کے اردگرد ایک پٹی باندھی جاتی۔ یہ پٹی پیشانی کی جانب نگینوں سے مرصّع ہوتی جو شنا زبان میں ''کُلہ'' کہلاتی۔ اس کے علاوہ جب بچہ بیٹھنے اور کھانے پینے کے قابل ہوتا تو سینے پر کپڑے کی ایک رومال باندھی جاتی جو بچے کی ناک اور چہرے کی صفائی کے کام آتی اور لعاب دہن وغیرہ سے بچے کے کپڑے صاف رہتے۔ مقامی زبان میں اس رومال کو ''لالم'' کہتے ہیں۔ بچوں کے سینے پر بھی نگینوں سے مرصّع ہار وغیرہ لٹکائے جاتے۔ علماء حضرات اکثر دستار پہنتے ہیں۔ اہلسنت کے علمائے کرام سفید اور سبز دستار سروں پر باندھتے ہیں اور کندھے پر چادر یا رومال رکھتے ہیں جبکہ شیعہ علماء میں سادات کرام کی دستار کالے رنگ کی اور غیر سادات سفید دستار پہنتے ہیں۔ ماضی میں پرندوں اور جانوروں کی کھالوں سے بڑا عمدہ کپڑا بنایا جاتا تھا۔ کھال سے جسم ڈھانپنے کے لئے واسکٹ نما پوستین بھی بنائے جاتے۔ کھال کا چوغہ جس کا اونی حصہ اندر کی طرف ہوتا ہے، اگرچہ دیکھنے میں آرام دہ نہیں لیکن بڑا نرم ہوتا۔ البتہ اس سے ایک قسم کی بو آتی ہے جو طبیعت پر بڑی ناگوار گزرتی ہے۔ اسے صرف مالدار لوگ ہی بنواتے تھے۔ گرم کپڑوں کیلئے پشم کی بھی ماضی میں بڑی مانگ تھی لیکن اس میں سے بھی بو آتی تھی۔ بعض مقامات پر یہاں کے بزرگ اور عمر رسیدہ لوگ کندھے پر ایک چادر بھی رکھتے جسے ''**کار**'' کہتے ہیں، جو نہ صرف گرمی سردی سے بچاتی بلکہ بوقت ضرورت اسے اوڑھنا بچھونا، سرہانہ اور دسترخوان کے طور پر بھی استعمال کرتے۔ گویا اس چادر (کار) سے کئی کام لئے جاتے تھے۔ بزرگ لوگ کہیں کہیں آج بھی اسے استعمال کرتے ہیں۔ پاپوش کے لئے بکری یا کیل کی کھال کما کر نرم کرتے اور اس سے پاؤں ٹخنوں سے کچھ اوپر تک باندھ لیتے اس پازیب کو اس وقت کے لوگ ''**تھوٹیئے**'' کہتے۔ **تھوٹیئے** زیادہ تر عام لوگ یا شکاری حضرات استعمال کرتے جبکہ خاص افراد ''**کوریئے**'' پہنتے تھے۔ فرق یہ تھا کہ کوریئے آرائش اور زیبائش کے ساتھ بنائے جاتے۔ شنا میں ایک کہاوت ہے کہ ''تھوٹیئے گنے گات تھور تھونگ اکی وائن''، یعنی تھوٹیئے اگر پاؤں پر

باندھے جائیں تو ان کا استعمال خود بخود سمجھ میں آتا ہے۔ جس کا مفہوم یہ ہے کہ خدا جب حسن دیتا ہے نزاکت آ ہی جاتی ہے۔ کسی لکڑی پر پاؤں کا نقش اتار کر لکڑی ہنر مندی سے کاٹ دی جاتی اور اس کے اگلے حصے پر چمڑے کی ایک پٹی چڑھا کر کیل لگاتے اور گرمیوں میں اسے بطور ہوائی چپل استعمال کرتے تھے۔ اسے مقامی زبان میں ''کھڑپیے'' کہتے ہیں۔ پرانے وقتوں میں بعض مقامات پر چاول کاشت کی جاتی تھی۔ گندم کی خشک ڈنڈیوں (تیری) کو تر کر کے اس سے ٹوکرے، روٹی رکھنے کے ظروف اور دوسری اشیاء وغیرہ بنائے جاتے اور چاول گاہنے کے بعد جو گھاس (کچ) حاصل ہوتی اس سے ایک طرف ہنر مند لوگ بچھونے (چھستن) بناتے، تو دوسری طرف اس سے رسی بٹی جاتی اور ان سے دیسی چارپائیاں بھی بنائی جاتیں۔ مونج کی بنی ہوئی بان (پھروٹے) سے پازیب بھی بناتے۔ جس سے غریب لوگ پاؤں ڈھانپتے۔ مقامی زبان میں اس پازیب کو ''کے لیے'' کہتے۔ ماضی میں ''چپن'' بھی عزت اور وقار کا حامل لباس رہا ہے۔ یہ اوورکوٹ کی طرح کھلا ہوتا ہے اور پھول دار کپڑے سے بنایا جاتا ہے۔ یہ پیراہن عموماً حکمران خاندان کے لئے مخصوص تھا۔ تاہم راجہ جب کسی شخص کے کارناموں سے خوش ہوتا تو اسے خراج تحسین پیش کرتے ہوئے چپن فضیلت عطا کرتا جسے ''راس چپن بنریگو'' یعنی راجہ نے چپن پہنایا، کہتے تھے۔

عورتیں لمبے اور کھلے اونی کپڑے پہنتی تھیں جو شلوار، قمیص، دوپٹہ اور ٹوپی پر مشتمل ہوتا۔ زنانہ کرتہ مرد کے مقابلے میں زیادہ کھلا اور لمبا ہوتا تھا۔ ماضی میں کرتوں میں بٹن نہیں لگائے جاتے تھے بلکہ دھاگے کے گانٹھ بطور بٹن استعمال میں لائے جاتے۔ دوپٹہ کا استعمال ہمارے معاشرے میں بہت بعد میں متعارف ہوا۔ ایک وقت وہ تھا جب چادر کا استعمال سرے سے ہوتا ہی نہیں تھا جبکہ ایک وقت یہ بھی آیا جب عورتوں کا سر سے چادر کا سرکنا بہت برا سمجھا جانے لگا۔ زنانہ ٹوپی پر طرح طرح کے پھول بنائے جاتے اور اس کے اندر اتنی گنجائش رکھی جاتی کہ سارے بال سما سکیں۔ ماضی میں پہننے والی زنانہ ٹوپیاں سائز میں کافی بڑی ہوتی تھیں۔ لیکن رفتہ رفتہ ٹوپی کا سائز بھی کافی متاثر ہوا۔ یہی وجہ ہے کہ آجکل بنائی جانے والی زنانہ ٹوپیاں ماضی کی ٹوپیوں کے مقابلے میں کافی چھوٹی ہوتی ہیں۔ یہاں کی عورتیں بڑی پردہ دار ہیں البتہ محلّہ اور رشتہ داری میں اس کا اہتمام سختی سے نہیں کیا جاتا۔ مالکن کی اجازت سے ہی خواتین گھر سے باہر قدم رکھتیں۔ ان علاقوں میں ظہور اسلام کے بعد عورتوں کا گاؤں سے باہر کہیں جانا ہوتا تو ایک لمبا چوڑا برقعہ پہن کر جاتیں۔ برقعے کی آنکھوں کی جگہ جالی دار ہوتی جس سے برقعہ پوش عورت کو سب کچھ نظر آتا لیکن کوئی اور اسے دیکھ نہیں سکتا۔ بوڑھی عورتیں پردے کا اہتمام بہت کم کرتیں۔ عورتیں ڈھیلی ڈھالی ٹوپیاں پہنتیں جو عموماً گہرے رنگ کی ہوتی تھیں۔ بعض مقامات پر غیر شادی شدہ لڑکیاں سفید ٹوپیاں پہنتیں جبکہ شادی شدہ عورتوں کو معاشرتی روایات اس کی ہرگز اجازت نہیں دیتیں۔ البتہ خوشحال خواتین شادی کے بعد کالی ٹوپیاں پہنتیں۔ یہی وجہ ہے کہ بعض مقامات پر اب بھی غیر شادی شدہ اور سفید ٹوپی پہنی ہوئی نوجوان لڑکی کو ''شیئی کھوئی'' یعنی سفید ٹوپی والی کہتے ہیں۔ یہ اصطلاح غیر شادی شدہ کے معنوں میں استعمال ہوتی ہے۔



چاندی کے روایتی زیورات

عورتیں ٹوپی کے اوپر چادر اوڑھ لیا کرتیں۔ اب زنانہ ٹوپی پہننے کا رواج بہت کم ہو گیا ہے۔ خواتین سامنے کے سو، دو سو بالوں کو آپس میں مروڑ کر تہہ کرتیں تو قلم کے برابر دو چھوٹی گتھیاں بن جاتیں۔ ایک گتھی کو مانگ کی ایک طرف پیشانی کی بالائی حدود سے کان کی جانب تہہ کر کے اس قدر سلیقے سے رکھ دی جاتی جیسے پیشانی اور سر کی حد بندی کر دی گئی ہو۔ یہی سلوک دوسری گتھی کے ساتھ کیا جاتا۔ عورتیں سر کے عین وسط میں بالوں کو دو برابر حصوں میں تقسیم کر کے مانگ (باگن) نکال دیا کرتیں۔ مقامی لوگ اسے ''سونخوں باگن'' یعنی سیدھی مانگ

کہتے۔ البتہ مرد حضرات عورتوں کی طرح سر کے عین وسط میں مانگ نکالتے تو اسے معیوب سمجھا جاتا۔ آج کل مانگ نکالنے کے انداز بھی بدل گئے ہیں۔ بالوں کی ان گتھیوں کو دونوں کانوں کے اوپر سے گزار کر وہاں سے نیچے کی جانب چوٹی گوندھ کر لٹکا دی جاتی تو ان کے سرے سینے کو چھوتے۔ اس کے بعد سر پر ٹوپی پہن کر یا اس کے بغیر چادر اوڑھی جاتی۔ وقت کے ساتھ ساتھ اس میں بھی تبدیلی آئی۔ بالوں کی زلفوں کو کانوں کے اوپر سے گزار کر لٹکانے کی بجائے انہیں کانوں کے بالائی حصے سے پیچھے موڑ کر پراندے سے ایک زلف بنائی جاتی اور اسے سر کے پیچھے کمر پر لٹکا دی جاتی۔ بعض مقامات پر عورتیں بالوں کے ریشوں کو مروڑ کر چابک کی مانند کئی گھتیاں بناتی تھیں۔ لیکن آجکل ایسا بہت کم دیکھنے میں آتا ہے۔ بعض دفعہ بچوں کے سروں کو ٹنڈ کر کے سامنے کی جانب کچھ بال رہنے دیئے جاتے۔ گلگت خاص کے لوگ ان بالوں کو ''گائہہ'' کہتے ہیں۔ پرانے وقتوں میں خواتین جسم کے مخصوص حصوں کے غیر ضروری بالوں کو روایتی آتش دان سے نیم گرم راکھ لے کر اسے متعلقہ جگہ پر ملتے تو بال نرم ہوتے جسکی وجہ سے انہیں آسانی سے صاف کئے جاتے۔ بعدازاں چیڑ و پدم کے درختوں کا گوند بھی اس مقصد کے لئے استعمال ہوتا رہا۔ دور دراز کے دیہاتوں میں خواتین آج بھی اس لوک حکمت عملی سے استفادہ کر رہی ہیں۔



بچیاں چاندی کے روایتی زیورات پہنے ہوئے

زنانہ شلوار کی ایک اور منفرد قسم بھی ہوتی تھی جو ''شروالی'' کہلاتی جس میں عام شلوار سے زیادہ کپڑا خرچ ہوتا۔ یہ تہہ دار شلوار ٹخنوں کے مقام پر بہت تنگ ہوتا، جس کی وجہ سے ایسا لگتا کہ اس میں ہوا بھری گئی ہو۔ یہ روایتی شلوار اور چھمٹ (قمیض) اب بھی چلاس میں دلہن کے لئے بناتے ہیں۔ شروالی میں لفہ سادہ جب کہ باقی حصہ پھولدار ہوتا ہے۔ اس لوک لباس کی خوبصورتی کے لئے کڑھائی دار پٹی مقامی سطح پر ہنر مند خواتین بناتی ہیں اور اسے شروالی کے پائنچوں اور قمیض (چھمٹ) کی کلائی پر لگاتے ہیں۔ مقامی زبان میں یہ پٹی ''ونن جی'' کے نام سے مشہور ہے۔ اسی طرح کی خوبصورت پٹی قمیض (چھمٹ) کے گریبان پر بھی زیبائش کی خاطر لگاتے ہیں۔ چھمٹ کو خوبصورت بنانے کے لئے اس پر لونگ (زُرہ) اور سیپ (چگس) بھی لٹکائے جاتے۔ ماضی میں چلاس اور داریل تانگیر میں عورتیں خلقہ نامی ایک قمیض کالے زین کے کپڑے سے بناتی تھیں۔ جس پر آرائش کے لئے کڑھائی بھی کی جاتی۔ یہ قمیض فراک کی طرح اوپر سے تنگ اور نیچے سے کھلی ہوتی ہے۔ عورتیں لونگ (زُروی بوزو) کی ایک لڑی بنا کر روایتی قمیض (پھرن) کے گریبان کے قریب لٹکاتیں۔ یہ بہت خوشبودار ہوتی اور اسے بطور عطر استعمال میں لاتے۔ اس کی خوشبو مرد حضرات کو راغب کرنے میں بھی اہم کردار ادا کرتی تھی۔ اس کا ہار بنا کر بھی عموماً عورتیں مختلف بیماریوں سے بچانے کے لئے بچوں کے گلے میں پہناتی تھیں۔ گھر کی مالکن اپنے سینے کے بائیں جانب قمیض پر ایک صدف یا چاندی کی بنی ہوئی ایک کانٹے دار چیز باندھتی، جس پر چابیاں لٹکائی جاتیں جو ''چھمہ'' کہلاتا ہے۔ جب وہ چلنے لگتی تو چابیوں کے بجنے کی آواز سن کر اجنبی بھی ایک دم سمجھ جاتا کہ گھر کی مالکن یہی ہے۔ یاد رہے کہ گھر کی چابیاں رکھنا اعزاز کی بات ہوتی تھی اور یہ اعزاز سوائے گھر کی مالکن کے ہر کسی کو حاصل نہیں ہوتا تھا۔

آجکل عورتیں اپنے لباس میں کڑھائی بھی شوق سے کراتی ہیں۔ البتہ ضلع گلگت، دیامر اور غذر کے لوگوں کے روایتی لباس کی کانٹ چھانٹ اور ڈیزائن میں تھوڑا سا فرق ضرور ہوتا ہے۔ لیکن تمام لباس پردہ دار اور اسلامی تقاضوں کے مطابق ہوتے ہیں۔ یہاں کی خواتین صدف بھی استعمال کرتی تھیں جو موتی کا خول ہوتا ہے۔ اسے عورتیں مختلف شکلوں میں تراش کر بطور زیور استعمال کرتی تھیں۔ اسے عموماً ٹوپیوں پر، گلے میں یا کپڑوں پر بھی ٹانک دیتی تھیں۔ دولہا نہ صرف شادی کے کپڑوں کے ساتھ پھول دار ''چغہ'' زیب تن کرتا بلکہ اسے سفید روایتی ٹوپی بھی پرندوں کے پروں اور مرغِ زرین کی کلغی سے سجا کر پہنائی جاتی۔ کمر بند کے ساتھ روایتی کلہاڑہ (چٹل) لٹکایا جاتا لیکن بعد میں کلہاڑے کی جگہ تلوار نے لے لی۔ آجکل تلوار لٹکانے کا سلسلہ بھی تقریباً متروک ہو چکا ہے۔ مقامی اون سے یہاں کے لوگ بہت بڑا کمبل (کمہ لوہ) بناتے جو رضائی کا کام دیتا۔ اس کی لمبائی تقریباً چودہ فٹ اور چوڑھائی چھ فٹ تک ہوتی۔ جسے دوہرا کر کے چار پانچ آدمی سردیوں میں آرام سے سو سکتے۔ بعض مقامات پر نظرِ بد سے بچنے کے لئے مرغ، باز اور دیگر پرندوں کے بڑے بڑے نوک دار ناخن بھی بچوں کے روایتی لباس پر ٹانکتے تھے۔ جو تعویذ کے ساتھ ساتھ آرائش کا باعث بھی بنتے تھے۔ اس کے علاوہ مسافر اور محنت مزدوری کرنے والے لوگ کمر پر ایک چادر بھی باندھتے جو

عموماً ''ڈک بونی'' یعنی کمر بند کہلاتی۔ اس میں ضروری سفر خرچ اور روٹی وغیرہ رکھ کر باندھتے تھے۔ کھانا کھانے اور آرام کرتے وقت یہ عموماً کھول دی جاتی۔ وقت کے ساتھ ساتھ زمانہ ترقی کرتا گیا۔ اونی دھاگوں سے خواتین بچوں اور بڑوں کے لئے سویٹر بننے لگیں۔ مرغ اور مرغیوں کے پروں سے سوئی کا کام لیا جانے لگا، کپڑوں پر ریشمی دھاگوں سے کڑھائی کا کام اس قدر اعلیٰ معیار کا ہونے لگا جس کی مثال عصرِ حاضر میں ملنی مشکل ہے۔ عہد جدید میں یہاں لوک لباس کا سلسلہ متروک ہو چکا ہے۔ البتہ روایتی اونی ٹوپی، چوغہ اور حنری کا استعمال کسی حد تک اب بھی رائج ہے۔ شاید کچھ عرصہ بعد چوغہ اور حنری کا استعمال ختم ہو جائے کیونکہ بازار میں ان کے مقابلے میں خاصے سستے سلے سلائے جیکٹ مل جاتے ہیں جبکہ اونی پٹی کے دام بھی بہت بڑھ گئے ہیں۔

زیورات (ہرکون):

شنا بولنے والے علاقوں کے لوگ زیورات بڑے شوق سے استعمال کرتے ہیں اور تقریباً ہر دور میں انواع واقسام کے زیورات پہننے کا رواج رہا ہے۔ البتہ زیورات کا معیار پہننے والوں کی مالی استطاعت کے مطابق ہوتا ہے۔ معیار اور وزن کے اعتبار سے ماہرین گوہر آباد (غور) اور چلاس میں استعمال ہونے والے زیورات کو پہلے نمبر پر، گلگت اور نگر کے دوسرے نمبر پر جبکہ ہنزہ اور غذر کے تیسرے نمبر پر درجہ بندی کرتے ہیں۔ زیورات کو مقامی زبان میں ''ہرکون'' کہتے ہیں۔ یہ شنا بولنے والے لوگوں کی ثقافت اور تہذیب کا ایک نہایت خوبصورت حصہ ہیں۔ دیومالائی قصوں میں یہاں شکار کئے جانے والی جنگلی حیات کی دیوی (درنجی) اور طلائی خزانوں کی تصوراتی دیوی ''سونی جی'' کے متعلق مشہور ہے کہ وہ ہر وقت زیورات سے مزین رہتی ہیں۔ ان کے زیورات کی جھنکار مخصوص حالات میں شکاری اور سونے کے متلاشی سن بھی لیتے ہیں۔ البتہ جہاں تک ان علاقوں کے لوگوں میں زیورات کے استعمال کے آغاز کا سوال ہے تو اس بارے میں بعض روایات کے مطابق زیورات استعمال کرنے کی تہذیب گندھارا خورد یعنی کشمیر، لداخ اور بلتستان کے ذریعے یہاں متعارف ہوئی۔ زیورات عورتوں کے بناؤ اور سنگھار کا ایک اہم جز ہیں۔ شادی بیاہ، عیدین اور دیگر مقامی روایتی تہواروں کے مواقع پر خواتین اس کا استعمال ضرور کرتی ہیں۔ ماضی قریب تک یہاں پر صرف چاندی کے زیورات بنتے تھے اور تمام لوگ انہیں استعمال کرتے تھے۔ سونے کے زیورات کا استعمال شاہراہ ریشم کی تعمیر کے بعد ہونے لگا۔ چاندی کے زیورات بنانے والے کو بھی مقامی زبان میں زرگر (سنار) ہی کہتے ہیں۔ ماضی میں سنار کا کام کرنے والے تمام کاریگر کشمیری تھے۔ ان لوگوں کا نام تو سنار تھا لیکن وہ کام چاندی کا کرتے تھے۔ البتہ آج کل یہ پیشہ مقامی کشمیریوں کے علاوہ دیگر کئی غیر مقامی لوگوں نے بھی اختیار کیا ہے۔ سنار جب چاندی کے زیورات دھو کر سکھانے کے لئے دھوپ میں پھیلا کر رکھتے ہیں تو بہت نفیس اور خوبصورت نظر آتے ہیں۔ یہ نفیس اور دیدہ زیب زیورات سنار کی انتھک محنت کے بعد ہی خواتین کی زینت بنتے ہیں۔ سنار زیورات کو طرح طرح کی نقش نگاری سے بھی مزین کرتے ہیں۔ خواتین چاندی کے جو زیورات ماضی میں پہنتی تھیں ان میں سے بعض اپنی بناوٹ کے لحاظ سے بہت ہی عمدہ ہوتے تھے۔ اکثر جگہوں پر مرد حضرات بھی چاندی کی انگوٹھیاں جس میں فیروزہ، عقیق، یاقوت اور دیگر خوبصورت قیمتی نگینے جڑے ہوتے، پہنتے ہیں۔ پرانے وقتوں میں زیورات کا استعمال زیادہ تر برسر اقتدار خاندانوں تک محدود تھا کیوں کہ اس زمانے میں عام لوگ وہ کپڑے اور زیورات استعمال نہیں کر سکتے تھے جو امراء استعمال کرتے تھے۔

یہاں کے لوگوں کے ہتھیار تیر و کمان، کلہاڑی اور ڈھال پر مشتمل ہوتے تھے۔ ہر علاقے کے کلہاڑے کی شکل بھی مختلف ہوتی اور اس پر نقش ونگار بھی بنائے جاتے۔ مالدار لوگ زرہ بکتر اور سر پر آہنی خول بھی پہنتے تھے۔ شادی بیاہ کی تقریبات میں ہتھیاروں کی نمائش بھی کی جاتی تھی۔ وقت کے ساتھ ساتھ کمان اور کلہاڑے کی جگہ تلوار اور توڑے دار بندوق نے لے لی۔ یہاں کے لوگ اپنے ہتھیار کو زیور تصور کرتے ہیں۔ بالخصوص چلاس اور داریل تانگیر کے لوگ بندوق کو گلے میں لٹکانا اب بھی باعث فخر تصور کرتے ہیں۔ کمانیں ہرن کے سینگوں کو نرم کر کے بنائی جاتی تھیں اور اس زمانے میں یہ ایک بڑا ہتھیار تصور ہوتا تھا۔ یہاں کے لوگ نہ صرف اپنے گلے، بازو اور سینے پر کئی کئی تعویذ باندھتے تھے بلکہ گھوڑوں کے ایال اور ماتھوں پر بھی تعویذ باندھا جاتا تھا۔ ان کے علاوہ بھی بعض مال مویشی کے گلے میں کوئی نہ کوئی تعویذ یا گھنگرو ضرور باندھ دیا جاتا۔ آج کل روایتی لباس اور چاندی کے زیورات کا استعمال تقریباً متروک ہو چکا ہے۔

روایتی زیورات:

پچولیس:

یہ تکونی شکل کا ہوتا ہے۔ مختلف رنگ کے نگینے اس میں لگا کر خوبصورت بناتے ہیں۔ اسے چھاتی پر لگایا جاتا ہے۔ ماضی میں بھانجی کی شادی کی صورت میں ماموں کی طرف سے اکثر پچولیس کا تحفہ پیش کرنے کا رواج تھا۔

بازی بند:

یہ گول شکل کا ہوتا ہے، جسے حسبِ حیثیت بڑا چھوٹا بنواتے ہیں۔ اسے بھی سینے پر لٹکایا جاتا ہے۔ اس کے ساتھ دھاگے کی ڈوری ہوتی ہے جس میں چاندی کے بُلسنگ اور بدم نامی زیور اور رنگارنگ موتی پرو کر اسے اور دلکش



شرماباف اپنے بنائے ہوئے شرما کو فنش ٹچ دے رہا ہے

بنایا جاتا ہے۔ اسے پورے شنا بولنے والے خطے میں یکساں طور پر استعمال کرتے ہیں۔ البتہ گوہر آباد (غور) میں اسے سینے کی بجائے زنانہ ٹوپی پر لگاتے ہیں اور اس میں ڈوری نہیں ہوتی لیکن اس میں منوک نامی چاندی کے چورس دانے پروئے ہوتے ہیں۔ اس پر مختلف رنگ کے موتی بھی لگائے جاتے ہیں۔ ماضی میں اسے بھی عموماً بھانجی کی شادی کی صورت میں ماموں کی طرف سے بطور تحفہ دیا جاتا تھا۔

سلسلہ:

یہ زیور عورتیں اپنی ٹوپی کے سامنے کی جانب لگاتی ہیں۔ اس پر گھنگرو بھی لٹکے ہوئے ہوتے ہیں۔ اسے نگینوں سے بھی مرصّع کیا جاتا ہے۔

زمی یا مشٹیے:

یہ زیور چاندی کے بنائے جاتے ہیں۔ ان کی ساخت گول، بیضوی اور چورس بھی ہوتی ہے۔ انہیں دھاگے کی ڈوری میں پروکر ہار بنایا جاتا ہے اور پھر گلے میں لٹکایا جاتا ہے۔ ایک مشٹی سے دوسری مشٹی کی درمیانی جگہ پر طرح طرح کے رنگدار موتی پروکر خوبصورت بنایا جاتا ہے۔ اسے بطور نیکلس استعمال کرتے ہیں۔

طوطہ:

یہ طوطے کی شکل کا زیور ہوتا ہے۔ اس پر چاندی کے گھنگرو لٹکے ہوئے ہوتے ہیں۔ ایک طوطہ سینے کی ایک جانب جبکہ دوسرا دوسری جانب قمیض پر لٹکائے جاتے ہیں۔

گسمور:

یہ دراصل جھمکے ہوتے ہیں جو دونوں کانوں پر لٹکائے جاتے ہیں۔ ایک جھمکے (گسمور) کا وزن تقریباً ایک چھٹانگ کے برابر ہوتا ہے۔ ان پر بھی گھنگرو (ڈڈوکیے) لٹکے ہوتے ہیں۔

چولیے:

کان کی بالیوں کو شنا میں ''چولیے'' کہتے ہیں۔ ان کو حسبِ فرمائش رنگارنگ موتیوں سے مرصّع بھی کیا جاتا ہے۔ بالیوں کو ''گس'' بھی کہتے ہیں۔ البتہ ''گس'' بالی نما سادہ تار پر مشتمل ہوتی ہے۔

اِسکاؤتمر:

بیلن کو شنا میں ''اسکاؤ'' اور تعویذ کو ''تمر'' کہتے ہیں۔ چونکہ اسکاؤتمر بیلن کی طرح گول دوڈنڈیوں کی شکل میں ہوتے ہیں اس لئے انہیں ''اسکاؤتمر'' کہتے ہیں۔ موتیوں سے مرصّع چاندی کی ڈوریاں اس پر لٹکائی جاتی ہیں جس کے سروں پر گھنگرو بھی ہوتے ہیں۔ خواتین اسے عموماً سینے پر قمیض کے اوپر لٹکاتی ہیں۔

تُمر:

شنا زبان میں تعویذ کو ''تُمر'' کہتے ہیں۔ چاندی کے تعویذ پر ایک خاص پرندہ جسے مقامی زبان میں ''روز'' کہتے ہیں، کے جب دانت لگائے جاتے ہیں تو اسکی شکل کمان کی طرح بن جاتی ہے۔ اس پر بھی چاندی کی ڈوریاں اور گھنگرو لٹکے ہوئے ہوتے ہیں۔ اسے کبھی کبھار بچوں کی ٹوپی پر سامنے کی جانب یا بازو پر کپڑے کے اوپر لٹکاتے ہیں۔ مذکورہ پرندے کی کھال پر تعویذ بھی بناتے ہیں۔

برونو:

انگوٹھی کو فارسی میں انگشتری اور شنا میں ''برونو'' کہتے ہیں جبکہ نگینے کو ''پھٹ''۔ ماضی میں ایک دلہن کے لئے کم از کم آٹھ عدد انگوٹھیاں ضرور بنوائی جاتیں۔ انگوٹھیوں پر عقیق، یاقوت، نیلم اور فیروزہ کے نگینے جڑے جاتے۔ نگینے عموماً گاہک خود سنار کو فراہم کرتے۔ انگوٹھی کے اوپر کی جانب مطلوبہ نگینے کے برابر سانچہ رکھتے ہیں اور آخر میں نگینہ نصب کیا جاتا ہے۔ بعض دفعہ درمیان میں نصب شدہ نگینے کے اردگرد کئی نگینے نصب کر کے بھی انگوٹھیاں بنائی جاتیں۔ انگوٹھی کے نگینوں کا انتخاب یہاں کے لوگ بڑی سنجیدگی سے کرتے ہیں۔ کیونکہ لوگوں کے خیال کے مطابق ہر نگینے کی اپنی ایک خاصیت ہوتی ہے۔ سورج کی شعائیں ان

کے ذریعے منعکس ہوکر طرح طرح کے اثرات مرتب کرتی ہیں۔ عقیق کے نگینے کے انتخاب کا ایک مقصد یہ بھی بتاتے ہیں کہ پتھروں میں سب سے پہلے خدا کی وحدانیت کا اقرار عقیق نے کیا تھا۔ بعض نگینوں کو انگوٹھی میں پہننا باعث علاج بھی سمجھتے ہیں۔ جیسے گردوں میں پتری ہو تو مرجان کے نگینے کی انگوٹھی پہنتے ہیں۔ عقیق اور فیروزہ کے نگینے بعض لوگ نگہبان (راھ) تصور کرتے ہوئے اپنی انگوٹھیوں میں نصب کرواتے ہیں۔ آفات اور نظرِ بد سے بچانے کے لئے بھی اکثر مائیں اپنے بچوں کے گلے میں فیروزہ اور عقیق کی لڑیاں پہناتی ہیں۔ آجکل طلائی انگوٹھیاں بنوائی جاتی ہیں۔ عورتوں کے ساتھ ساتھ چاندی کی انگوٹھیاں بعض مرد حضرات بھی استعمال کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ چھلہ بھی استعمال کرتے ہیں۔ انگوٹھی اور چھلّے میں فرق یہ ہوتا ہے کہ انگوٹھی پر نگینہ ہوتا ہے جبکہ چھلّہ پر کوئی چیز نہیں ہوتی۔ چھلہ دراصل انگوٹھی نما چاندی کی سادہ تار پر مشتمل ہوتا ہے۔ برونو کو اہل چلاس ''دھنکسیلو'' کہتے ہیں۔

حلقہ بند:

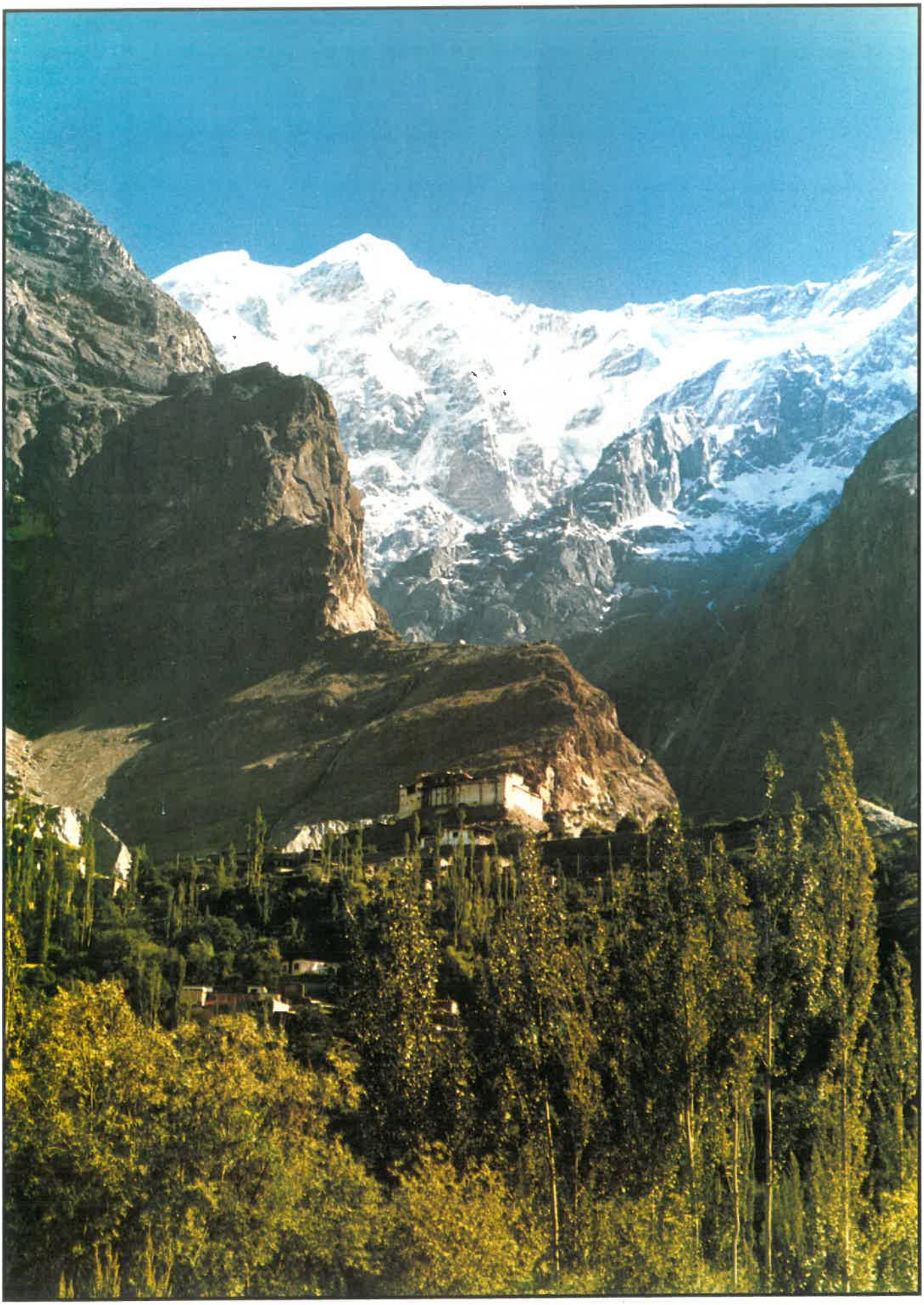
یہ زیور چاندی کی تقریباً ایک انچ چوڑی پٹی پر مشتمل ہوتا ہے جو گردن کے سامنے کے ناپ کے مطابق بنایا جاتا ہے۔ یہ فولڈ بھی کیا جاسکتا ہے۔ اس پر نہ صرف گھنگرو لگے ہوتے ہیں بلکہ یہ نگینوں سے بھی مرصّع کیا ہوا ہوتا ہے۔ یہ ہار کی طرح کا زیور ہوتا ہے البتہ اسے گلے میں لٹکانے کی بجائے جلد سے متصل باندھ دیا جاتا ہے۔

بموئیں/کائے:

ایک کنگن کو شنا میں ''بمّی'' جبکہ کئی کنگنوں کو ''بموئیں'' کہتے ہیں۔ چاندی کے ایک کنگن کی چوڑائی ایک انچ سے بھی زیادہ ہوسکتی ہے جبکہ وزن تقریباً دو چھٹانک ہوتا ہے۔ کنگن دراصل ''کرگہن'' سے ماخوذ ہے جو سنسکرت کا لفظ ہے۔ سنسکرت میں ''کر'' کے معنی کلائی جبکہ ''گہن'' سے مراد گہنہ یعنی زیور ہے۔ گویا کرگہن کثرت استعمال کی وجہ سے کنگن ہوگیا ہے۔ کنگن سونے یا چاندی کے حلقے کو کہتے ہیں۔ مرصّع کنگن پر قیمتی جواہرات مزین کئے جاتے ہیں۔ ماضی میں عورتیں بڑے بڑے آہنی کڑے بھی استعمال کرتی تھیں لیکن رفتہ رفتہ چاندی کے منقّش کنگن کا استعمال ہونے لگا۔ جبکہ آجکل چاندی کے زیورات کا سلسلہ صرف غریب لوگوں تک محدود ہوکر رہ گیا ہے۔ اس کے علاوہ چاندی سے بازو کے کڑے بھی بنائے جاتے جسے خواتین شوق سے استعمال کرتیں۔ کلائی پر پرانے وقتوں میں چاندی کی چوڑیاں پہننے کا بھی رواج تھا جو دھیرے دھیرے کم ہوتا جارہا ہے۔ ان چوڑیوں کی میناکاری کے ذریعے تزئین بھی کی جاتی۔ چوڑیوں کو شنا میں ''کائے'' کہتے ہیں۔

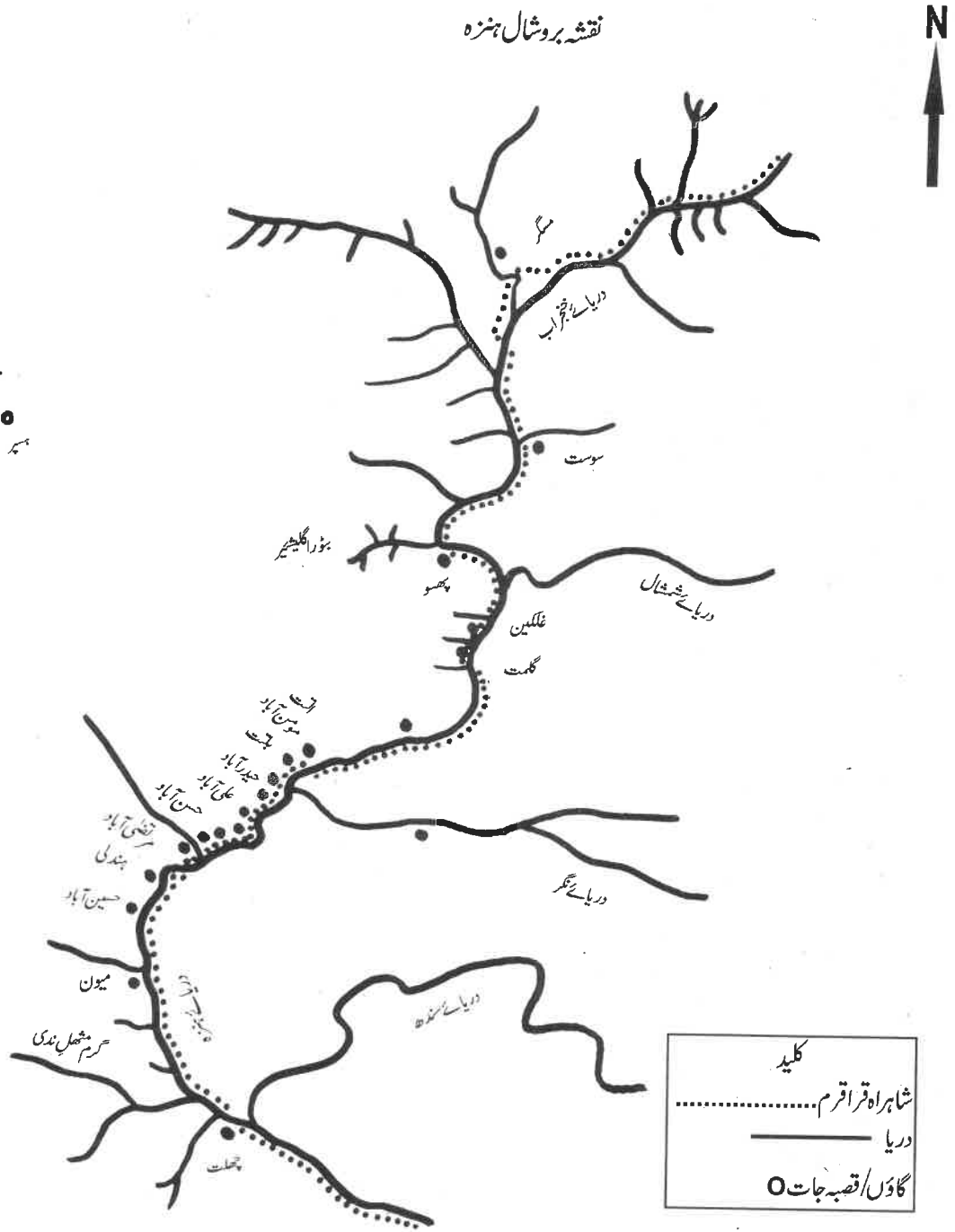
دیگر چاندی کی اشیاء:

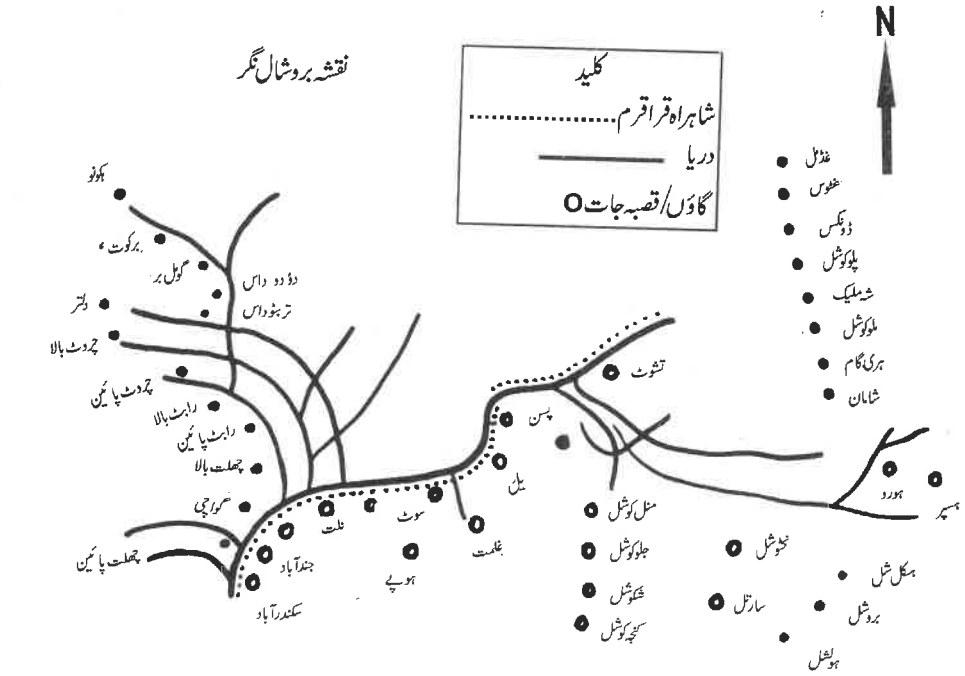
گذشتہ وقتوں میں یہاں کے لوگوں کے پاس چاندی کی ایک ڈبیا بھی ہوتی تھی جس کے اندر ٹوتھ پکس، سوئیاں، چھوٹی سی قینچی اور کان صاف کرنے کی کوئی چیز رکھی جاتی۔ یہ ڈبیا کہیں کہیں ''سوحوکوہ'' کہلاتی اور کہیں کہیں پرس کے طور پر استعمال میں لائی جاتی۔ پرس کو مقامی زبان میں ''پھٹّن'' کہتے ہیں۔ اس کے علاوہ چاندی کی صراحی نما ایک چیز بنائی جاتی جسے سرمہ دانی کے طور پر استعمال میں لائی جاتی۔ ان چیزوں کو لوگ حسبِ ضرورت گھر میں یا جیب میں رکھتے۔ قبل ازیں یہ جانور کی مخصوص ہڈی ''دھونی'' کی بنتی تھی۔ لیکن بعد میں چاندی کی بننے لگی۔ ناک کی زیبائش کے لئے اس کی نرمی پر سوئی سے سوراخ کرکے دھاگہ باندھ کر چھوڑ دیا جاتا۔ جب زخم ٹھیک ہوتا تو دھاگہ نکال دیتے جسکی وجہ سے سوراخ بن جاتا۔ ناک کی اس سوراخ میں خواتین چاندی کا نتھ (چارگل) ڈال دیتیں۔ چارگل بھی آج کل سونے کے بنائے جاتے ہیں۔

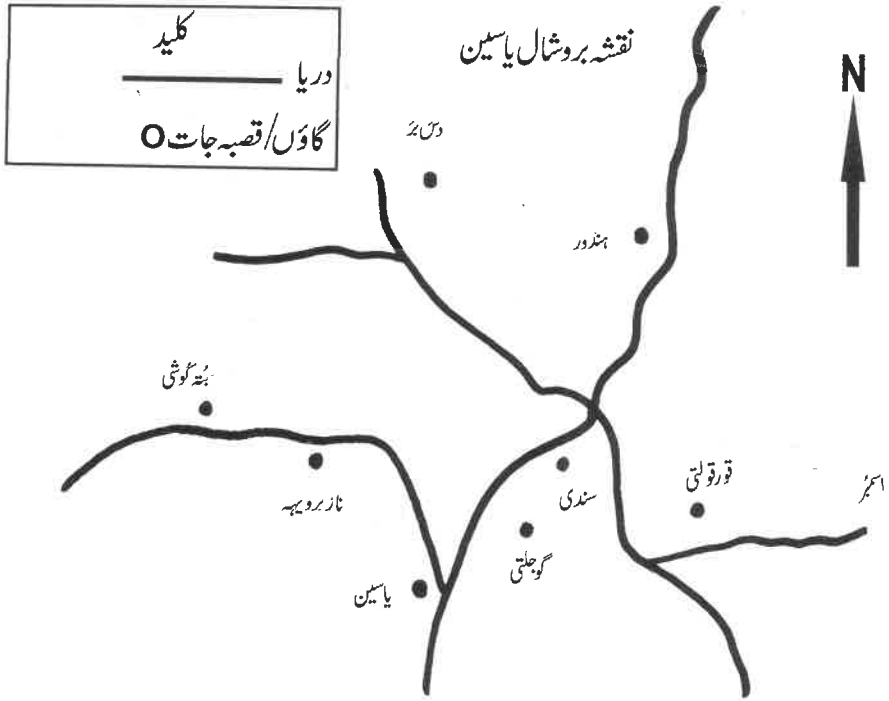


کریم آباد ہنزہ کا خوبصورت منظر بلتت فورٹ نظر آرہا ہے

کریم آباد ہنزہ کا خوبصورت منظر بلتت فورٹ نظر آرہا ہے


نقشہ بروشال ہنزہ
N
مسگر
دریائے ہنزہ
سوست
بٹورا گلیشیر
پھسو
دریائے غشتشال
غلکین
گلمت
موسن آباد
حیدر آباد
علی آباد
حسن آباد
مرتضیٰ آباد
ہندی
حسین آباد
دریائے نگر
میون
گرم مشعل ندی
دریائے سندھ
چھلت
کلید
شاہراہ قراقرم.....
دریا
گاؤں/قصبہ جات O


نقشہ بروشال نگر
N
کلید
شاہراہ قراقرم.....
دریا
گاؤں/قصبہ جات O
غذل
غنوس
ڈونکس
پلوکوشل
شہ ملیک
ملوکوشل
ہری گام
شامان
ہکونو
برکوٹ
گول بر
دلتر
چودٹ بالا
چودٹ پائین
راہٹ بالا
راہٹ پائین
چھلت بالا
کوراچی
چھلت پائین
دؤدو داس
تربٹو داس
تشوٹ
پسن
یل
غلمت
سوٹ
ہوپے
نلت
جندآباد
سکندرآباد
مثل کوشل
جلوکوشل
شکوشل
کچھ کوشل
نخوشل
سارتل
ہوشل
بسکل شل
بروشل
ہورو
ہسپر


نقشہ بروشال یاسین
N
کلید
دریا
گاؤں/قصبہ جات O
دس بر
ہندور
بُتہ کوشی
نازبرویہہ
سندی
گوجلتی
قورقولتی
اسپر
یاسین

بروشال ہنزہ، نگر، یاسین

جغرافیہ

حدود اربعہ (بروشال ہنزہ):

عوامی جمہوریہ چین کا مسلم اکثریتی صوبہ سنکیانگ اور برزخی پٹی وخان ہنزہ کی شمالی سرحد کے متصل ہیں جبکہ جنوبی سمت میں بروشال نگر، مشرق میں بلتستان اور مغرب میں اشکومن واقع ہیں۔

بروشال نگر:

شمال کی طرف دریائے ہنزہ، جنوب کی طرف مشہور چوٹی راکاپوشی، مشرق کی طرف، سپر گلیشیر جبکہ مغرب کی طرف چھیروٹ کے سلسلہ کوہ ہیں۔

بروشال یاسین:

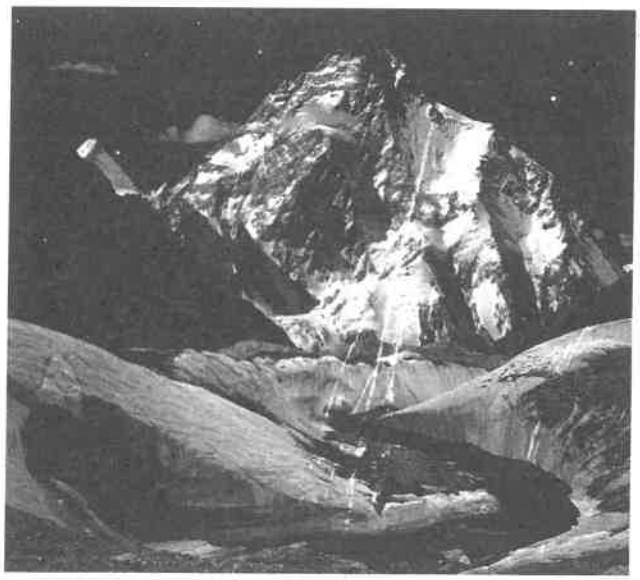
شمال میں وخان، مغرب کی طرف شندور اور شمال مشرق کی طرف چلنجی پاس واقع ہیں۔

ہنزہ اور نگر کی وادیاں ۱۹-۳۶ ڈگری درجہ عرض بلد اور ۳۸-۴۷ درجہ طول بلد میں واقع ہیں جن کا شمار منطقہ معتدل میں ہوتا ہے جبکہ بالائی خطے منطقہ باردہ میں آتے ہیں۔ دونوں علاقے سلسلہ ہائے کوہ قراقرم کا حصہ ہیں جہاں راکاپوشی (۷۷۸۸ میٹر) دیران (۷۲۵۷ میٹر) گولڈن پیک (۷۰۲۷ میٹر) ہراج پیک (۴۷۳۰ میٹر) حہ چھندر (۴۲۷۰ میٹر) بولیموٹینگ (۶۰۰۰ میٹر) عطا آباد (۵۱۸۰ میٹر) اور اُلتر پیک (۷۳۸۸ میٹر) چوٹیاں استادہ ہیں۔ ان کے علاوہ بھی کئی ایک کم بلند بے نام چوٹیاں ہیں جو کوہ پیمائی کے حوالے سے کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتیں۔

نگر اور ہنزہ متصل وادیاں ہیں تاہم دریائے ہنزہ دونوں میں حد فاصل ہے۔ ان وادیوں کا شمار ایک ہی ثقافتی پٹی میں ہوتا ہے۔ وادی ہنزہ اپنی قدرتی بناوٹ کے اعتبار سے تین حصوں بالائی، وسطی اور زیریں میں منقسم ہے۔ قدیم زمانے میں بالائی ہنزہ "ہر بر" بھی کہلاتا تھا جو نظیم آباد سے مسگر اور چپورسن تک پھیلا ہوا خاصا بڑا علاقہ ہے، جس میں بیسوں گاؤں آباد ہیں۔ بذات خود یہ علاقہ بھی بالائی اور زیریں گوجال میں بٹا ہوا ہے۔ بالائی گوجال کی شمالی سرحدیں درہ کلک وفتکہ کے ذریعے سنکیانگ جبکہ ارشاد اور دل سنگ دروں کے پاس افغان پامیر سے ملتی ہیں۔ زیریں گوجال نظیم آباد سے پھسوتک پھیلا ہوا ہے۔ ہر دو علاقوں میں وخی اور بروشو لوگ آباد ہیں۔ مرکزی ہنزہ میں خالص بروشو افراد بستے ہیں۔ ڈوم طائفہ کے بہت سے گھرانے بھی قدیم دور سے وسطی ہنزہ میں آباد ہیں جن کی بولی ڈوماکی یا (بیری ژسن کی) کہلاتی ہے۔ نشیبی ہنزہ شنا کی کہلاتا ہے جہاں بروشو اور شین لوگ رہتے ہیں۔

دوسری طرف نگر بھی دو حلقوں میں بٹا ہوا ہے۔ نگر بالا اور نگر پائین۔ نگر بالا دریائے ہنزہ کے جنوب کی طرف واقع ہے جس میں خاص نگر، ہسپر اور ہوپر کے علاوہ دریائے ہنزہ کے جنوبی حاشیے پر واقع جملہ دیہات شامل ہیں۔ خاص نگر سے مراد وہ قدیم بستی ہے جو سابقہ ریاست کا صدر مقام بھی تھا۔ زیریں نگر دریائے ہنزہ کے شمالاً واقع مواضعات پر مشتمل ہے۔ اس حصے میں شینا بولنے والوں کی اکثریت ہے جبکہ بالائی نگر میں بروشو قبائل بستے ہیں۔

ہنزہ کا کل رقبہ سات ہزار نو سو مربع کلومیٹر جبکہ نگر کا سات ہزار ایک سو سینتیس مربع کلومیٹر ہے۔ خضر آباد، حسین آباد، میون، خانہ آباد، ناصر آباد مرتضیٰ آباد، حسن آباد، علی آباد، ڈورکھن، حیدر آباد، کریم آباد، مومن آباد، گنش، گرلت، احمد آباد، سرٹ، نظیم آباد، غوش بن، ششکٹ، مورخون، پھسو، غلکین، حینی، شمشال، مسگر اور چپورسن ہنزہ کے مشہور گاؤں ہیں۔ اسی طرح گواچی، چھلت بالا و پائن، رابٹ بالا و پائین، چھیروٹ بالا و پائین، وئیتر، ہوکونو، برکوٹ، گومل بر، دو دو داس، تر بٹو داس، بڑالس، اکبر آباد، سونیکوٹ، جعفر آباد، سکندر آباد، نلبت، تھول، مسوٹ، ہوپی، غلمت، یل، پسن، مناپن، پھکر، میاچھر، مورکو، اسقر داس، ششوٹ، کوچھر، غمہ دس، شایار، ہمدری، غطومل، غطوشل، رتلی، بروشل، ہوشل اور بوشت نگری کی نئی پرانی چھوٹی بڑی بستیاں ہیں۔



کے ٹو پہاڑ اور گلیشیر کا خوبصورت منظر

بروشال یاسین، ہنزہ اور نگر سے خاصے فاصلے پر واقع ہے۔ اس کے شمال مغرب میں چترال، شمال مشرقی جانب وخان، جنوب مشرق کی طرف اشکومن اور یہال جبکہ جنوبی رخ پر گوپس کا علاقہ پڑتا ہے۔ یاسین ۲۲۵۸ مربع کلومیٹر پر محیط ایک سرد علاقہ ہے۔ نازبَر، بَرکولتی، سَندی، طاؤس، سلطان آباد، کریم آباد، تھوئی، ہُندور، درکوت، تھلتی اور نلتی یاسین کے بڑے گاؤں ہیں۔

دریائے ہنزہ بٹورا گلیشیئر، پھسو گلیشیئر، غلکین گلیشیئر گلمت گلیشیئر اور شمشال ندی کے پانیوں سے تشکیل پاتا ہے۔ بروشال کے تینوں علاقوں کے دریا سطح زمین سے کافی نیچے بہتے ہیں اس لئے یہ دریا کسی مصرف کے نہیں۔ تاہم دریائے ہنزہ سونے کے ذرات کیلئے مشہور ہے۔ طلاکش (سونیوال) دریائے ہنزہ کے حاشیے پر دھجیوں والے خیموں میں ڈیرے ڈالے نظر آتے ہیں۔ یہ نامعلوم زمانے سے یہ پیشہ اپنائے ہوئے ہیں اور آج تک مقامی آبادی میں گھل مل نہیں سکے۔ موضع گنش کے مقام پر دریائے نگر ہنزہ کے دریا میں مدغم ہو جاتا ہے۔ اس سنجوگ کے بعد یہ دریا اپنے حجم میں اضافہ کرتے ہوئے دینور کے مقام پر ہنیسارا دریا میں شامل ہونے کے بعد مزید فاصلہ طے کر کے بونجی کے مقام پر عظیم دریائے سندھ کا حصہ بن جاتا ہے۔

موسم کے اعتبار سے یہاں بڑا تنوع پایا جاتا ہے۔

آب وہوا کا کیفیت نامہ:

موسم	مہینہ	اوسط درجہ حرارت زیادہ سے زیادہ	اوسط درجہ حرارت کم از کم	اوسط بارش
بہار	یکم اپریل تا اوسط مئی	۶۷ ڈگری فارن ہیٹ	۴۷ ڈگری فارن ہیٹ	۹۰، انچ
خزاں	یکم ستمبر تا اکتوبر	۷۵ ڈگری فارن ہیٹ	۴۵ ڈگری فارن ہیٹ	۳۰، انچ
گرما	سولہ مئی تا اکتیس اگست	۸۰، ڈگری فارن ہیٹ	۵۷ ڈگری فارن ہیٹ	۳۰، انچ
سرما	سولہ اکتوبر تا اکتیس مارچ	۵۰ ڈگری فارن ہیٹ	۳۲، ڈگری فارن ہیٹ	۲۵، انچ

گلیشیئر کی اقسام:

قطبین سے باہر سب سے زیادہ گلیشیئر پاکستان کے شمالی علاقہ جات میں پائے جاتے ہیں۔ گلیشیئر گیر رقبہ ۱۳۶۸۰ مربع کلومیٹر تک بنتا ہے۔ ہنزہ کا بٹورا گلیشئی دنیا میں ساتویں نمبر پر آتا ہے۔ اس کے علاوہ شِشپر، اُلتر، پھسو، غلکین اور گلمت گلیشیئر بھی ہنزہ میں پائے جاتے ہیں۔ نگر میں پسن، مناپن، ہوپر، سپر اور میار نام کے گلیشرز موجود ہیں۔ بعض مقامات پر روایتی طریقہ کار بروئے کار لاتے ہوئے مصنوعی گلیشئرز بھی پیدا کئے جاتے ہیں۔ انہی فیض رساں گلیشیئروں کے آس پاس چراگاہیں پائی جاتی ہیں۔ جہاں موسم گرما میں لوگ اپنے مال مویشی چراتے ہیں۔ بارش کی کمی کی وجہ سے نگر اور ہنزہ کے پہاڑ جنگلات سے محروم ہیں۔

جڑی بوٹیاں:

ہنزہ نگر اور یاسین ادویاتی جڑی بوٹیوں اور بعض نایاب قسم کے درختوں کیلئے مشہور ہیں۔ جنگلی درختوں میں بھوج پتر، سپروس، چیڑ اور بیوشامل ہیں۔ جبکہ ادویاتی نباتات میں طلسمی بوٹی، افسنتین، جدوار، دھتورہ، آسمانی بوٹی، ترشق بوٹی، مشکطارا، قُرطم، کاہنی دشتی، ریحان، دار چوبہ، کر، بچھناک، بھنگ، بنفشہ، اونٹ کٹارا اور اسپند جابجا اگتے ہیں اور روائتی علاج معالجہ میں مستعمل ہیں۔

فصلیں:

فصلوں میں گندم، مکئی، ترنبہ اور جو وغیرہ کی کاشت کی جاتی ہے۔ سبزیات میں آلو، بند گوبھی، ٹماٹر، خرفہ، لوسرن اور پالک بوئی جاتی ہیں۔

جانور:

زاغ ابلق، کوا، باز، گدھ، چڑیا، بطخ، رام چکور، فاختہ اور کبوتر ہنزہ نگر اور یاسین میں عام پائے جاتے ہیں۔ لیکن ان میں سے بعض پرندوں کے بے دریغ شکار کے باعث انکی نسلیں تیزی سے ختم ہوتی جارہی ہیں۔ اس طرح بعض جنگلی جانوروں کی قسمیں بھی روز بروز معدوم ہورہی ہیں۔ فی الوقت محدود تعداد میں چیتا، مارخور، سیاہ گوشن، بھیڑیا، یاک، مارکوپولوشیپ، بلیوشیپ، روز، کیل اور مارموت پائے جاتے ہیں۔

جھیل، چشمے:

ہنزہ کی بوریت جھیل بہت مشہور ہے جہاں مرغابیوں کا شکار کیا جاتا ہے۔ اس طرح مرتضیٰ آباد کا گرم چشمہ جوڑوں کے درد کے علاج کیلئے معروف ہے۔ اس طرح کے گرم چشمے نگر کے علاقوں بڑالس اور ہکوچیر میں بھی موجود ہیں۔ یہ چشمے جلدی امراض اور جوڑوں کے درد کے شکار افراد کیلئے اکسیر کا درجہ رکھتے ہیں۔

بزرگان دین:

ہنزہ نگر اور یاسین میں مذہب اسلام کی تبلیغ وترویج کا سہرا متعدد مبلغین واولیائے کرام کے سر سجتا ہے۔ اب ان بزرگان دین کے مزارات مرجع خاص وعام



بلتت فورٹ کریم آباد، ہنزہ

ہیں۔غلمت نگر میں واقع سید شاہ ولی رحمۃ اللہ علیہ کی زیارت اور چپورسن میں آستانہ بابائے غندی بہت مشہور ہیں۔ان کے علاوہ بھی ہنزہ نگر میں بیسوں آثار ہیں مثلاً زیارت پنجہ شاہ اور حسینی میں آستانہ شاہ طالب بھی زائرین کی توجہ کا مرکز ہیں۔ان بزرگان دین کے کشف وکرامات کی داستانیں مقبول عام ہیں۔

ہنزہ نگر کے قابل ذکر مقامات میں نگر ڈونگس میں موجود والئی نگر میر شوکت علی خان کا قدیم محل، بلتت اور التت کے قدیم قلعے آج بھی موجود ہیں۔ڈونگس محل شکستگی کے آخری مراحل میں ہے لیکن ہنزہ بلتت کا قلعہ ہز مائی ہنس آغا خان چہارم کی مالی اعانت سے اپنی اصلی حالت کو سو فیصد برقرار رکھتے ہوئے محفوظ کیا گیا ہے۔اسی طرح قلعہ التت کو محفوظ کرنے کا منصوبہ بھی زیر غور ہے۔

شاہراہ قراقرم:

شاہراہ قراقرم کی تعمیر سے پہلے ان علاقوں تک رسائی بہت مشکل تھی۔ قراقرم ہائی وے کی تعمیر سے پہلے راولپنڈی تک پہنچنے کا متبادل راستہ بابوسیر روڈ کی شکل میں موجود تھا لیکن یہ راستہ سال کے تین چار مہینے ہی کھلا رہتا تھا اور سردیوں میں برفباری کی وجہ سے اکثر بند رہتا تھا۔

۱۹۵۰ء کی دہائی میں حکومت پاکستان اور عوامی جمہوریہ چین کے مابین شاہراہ قراقرم کے عظیم منصوبہ کے بارے میں گفت وشنید ہوئی۔سروے پر کام ۱۹۵۴ء میں شروع ہوا اور ۱۹۵۶ میں جا کر ختم ہوا۔اس کا آغاز بٹگرام سے ہوا تھا جو بشام تک جا کر تمام ہوا۔بعد ازاں سروے کا بقیہ کام بھی پورا کیا گیا۔۱۹۵۹ء میں اس کی تعمیر شروع ہوئی۔اس عجوبہ روزگار کام میں ۲۴۵۰۰ افراد نے حصہ لیا۔تقریباً ۴۰۰ کارکن دوران تعمیر لقمہ اجل بن گئے اور ۱۹ برسوں میں یہ عظیم منصوبہ تکمیل کو پہنچا۔اور ۱۸، جون ۱۹۷۸ء کو پاکستان کے چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر جنرل محمد ضیاء الحق اور چین کے نائب وزیر اعظم نے تھاکوٹ کے مقام پر اس کا باقاعدہ افتتاح کیا۔شمالی علاقہ جات کی مثالی معاشی ترقی میں اس شاہراہ کا نمایاں کردار ہے۔

خطہء بروشال (ہنزہ نگر) کی جغرافیائی اہمیت کا اندازہ اس امر سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے کہ وکٹورین انگلستان کے فرنگی اہلکار انیسویں صدی کے نصف آخر میں یہاں پہنچے تو انہوں نے ہنزہ کو (Where Three empires meet) کہا کیونکہ ہنزہ کے انتہائی شمال میں چین، روس، اور برطانوی ہند کی سرحدیں ملتی تھیں۔مغربی سیاحوں اور صیغہ خاص کے لوگوں نے اسے (The end of The

world) بھی کہا کیونکہ اس خطہ سے آگے روس کا ''آہنی پردہ'' تھا اور دوسری طرف چین کی اشتراکی حکومت۔ بعض فرنگیوں نے اسے (The Hinterland of Asia) کے نام سے بھی یاد کیا۔ اب اس خطے کو (The Centre of the world) کہا جاتا ہے کیونکہ اب یہ پانچ ممالک چین، تاجکستان، پاکستان، اور افغانستان کا مقام اتصال ہے۔

تاریخ:

خطہ ہائے بلور و دردستان قدیم زمانہ سے چار مختلف عمرانی منطقوں میں منقسم تھے جو ''پُر یا کوئی'' ولایت پیراں، ''رجا کوئی'' ولایت راجگاں، ''شنا کوئی'' ولایت شیناں اور ''کِفِرا کوئی'' یعنی ولایت کافراں کہلاتے تھے۔ ''رجا کوئی'' میں موروثی حکمرانی کا سلسلہ تھا جہاں ''تھم'' اپنی راجدھانی کے بلاشرکت غیرے مالک کہلاتے تھے اور پَرجا انہیں ''میّوے دَمَن'' یعنی پُرکھوں کا ان داتا کہتی تھی۔ ''پُر یا کوئی'' میں بھی بظاہر راجے ہوتے تھے لیکن پس پردہ زعمائے مذہب کی طاقت کارفرما ہوتی تھی جبکہ ولایت شیناں میں متعلق العنان حاکمیت کیلئے کوئی جگہ نہیں ہوتی تھی بلکہ امور ولایت مجلس جسٹیراں کے ذریعے نمٹائے جاتے تھے۔ متشرقین نے ایسی ریاستوں کو (Dardic Republics) کا نام بھی دیا ہے۔ تاریخ میں صرف ایک شخص پختون ولا نے شینا کوئی کے باغی قبائل پر براہ راست حکمرانی کی لیکن وہ بھی کچھ عرصہ کے بعد جان سے ہاتھ دھو بیٹھا۔

القصہ ہنزا نگر قدیم رجا کوئی کا حصہ تھے۔ معلوم تاریخ مظہر ہے کہ اِن علاقوں میں اول اول سفید ہنوں کے قدم پڑ گئے۔ آج بھی ہنزہ میں ہُنو کُوشل نام کی ایک بستی آباد ہے۔ یہ سفید ہن بروشال ہنزا نگر میں کب وارد ہوئے اس بارے میں محققین کسی حتمی تاریخ کا تعین کرنے سے قاصر ہیں۔ تاہم بڑی بڑی چٹانوں پر کندہ تحریری آثار جو براہمی، سوگدیانی، خروشتی، شاردھا اور گپتا زبانوں میں ثبت ہیں اس بات کا ثبوت ہیں کہ مختلف تہذیبوں کے کارواں یہاں سے گزرتے رہے۔ یہ تحریریں پہلی اور آٹھویں صدی عیسوی سے تعلق رکھتی ہیں۔ اس قسم کے سنگی نقوش موضع گنش ہنزہ کے مضافات میں شاہراہ قراقرم کے کنارے آج بھی عہد رفتہ کی کہانی سناتے ہیں۔ ماہرین کی رائے کے مطابق یہ کندہ کاری بدھ زائرین اور کشان بادشاہوں کے سُفرا کے مشاق ہاتھوں کی یادگار ہیں۔ آثاریات کی حقیقت اپنی جگہ ہنزا والے خور کسکندر اعظم کے ایک بھولے بھٹکے عسکری دستے کی سل سے بتاتے ہیں اور یہ روایت انہیں بہت عزیز ہے۔ کہتے ہیں کہ قدیم علاقہ باختر سے چار فوجی سرداراں دِرَم، ہَمُو، شانو اور صفر ہنزہ وارد ہوئے۔ یہ دراصل سکندر اعظم کی فوج کے ایک گم گشتہ دستے کا حصہ تھے جو مارا مار بروشال میں داخل ہوئے اور راستے کی صعوبتوں کے باعث بیمار پڑ گئے۔ دستہ میں شامل دیگر فوجیوں نے انہیں یہیں رہنے دیا۔ کہتے ہیں کہ وقت روانگی فوجیوں نے پسماندگان کو ایک ایک مُٹھی جو دیا تا کہ یہ لوگ بھوکے نہ رہیں۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ دستہ میں شامل فوجیوں کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ اُس زمانے کے رواج کے مطابق فوجیوں کے ساتھ بیوی بچے بھی تھے۔ یوں یہ لوگ مستقلاً ان علاقوں میں بس گئے اور اسی جگہوں کو اپنا مسکن بنایا جہاں پانی کی فراوانی تھی یا کوئی چشمہ پھوٹتا تھا۔ صفر کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ ایک سیلابی ریلے میں بہہ کر مر گیا۔ ہَمو اور شانو کی نسل خوب پھلی پھولی اور آج یہ لوگ خرو کُز اور براتلنگ کے نام سے معروف ہیں۔ وِرم چھبُو رَم سے آگے بڑھی۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بدخشان، چترال، وخان، بلتستان، یاغستان اور کشمیر تک سے لوگ آکر ہنزہ نگر اور یاسین میں بس گئے۔



میر ہنزہ صفدر علی خان جو انگریزوں سے شکست کے بعد
چین میں پناہ گزین ہوا اور بقیہ عمر وہیں گزاری

پندرھویں صدی کے وسط تک ہنزہ نگر میں مختلف النسل خاندان قبائلی طرز پر زندگی گزارتے تھے تاہم یہ لوگ راجگان گلگت (آل تزاخان) کے باجگزار تھے۔ یہ گروہ آپس میں سخت عناد رکھتے تھے اور موقعہ ملتے ہی ایک دوسرے کو جانی و مالی نقصان پہنچانے سے دریغ نہیں کرتے تھے۔ غرض طوائف الملوکی اور غیر یقینی کا دور تھا۔ اسی دوران گلگت کے حکمران خاندان تزاخان کا آٹھواں راجہ شاہ ملک

عُرف ''شہ'' نے ہنزا نگر کی ایالت اپنے دو توام نواسوں جمشید خان عرف مغلوٹ (نرینولا) اور صاحب خان عرف گرکس (چوہا) کے مابین تقسیم کرنے کا فیصلہ کیا۔ یہ جڑواں شہزادے تھے۔ کہتے ہیں پیدائش کے وقت دونوں کی پشت ملی ہوئی تھی۔ کسی جراح نے نشتر کے ذریعے دونوں کو جُدا کیا۔ کاہنوں نے اس واقعہ کو بدشگونی سے تعبیر کیا کیونکہ پیدائش کے وقت ہی دونوں میں نشتر چلا۔ آگے چل کر وقت نے یہ صحیح بھی ثابت کیا جوں جوں ان قوام شہزادوں نے ہوش سنبھالا تو توں آپس میں ہمیشہ آمادہ فساد رہے۔ تاہم رواج کے مطابق دونوں رضاعت میں دیئے گئے۔ شہزادہ جمشید کا رضاعی باپ مُغل بیگ نام کا ایک شخص تھا جس کا تعلق گلگت کے ایک مضافاتی قصبہ شُروٹ سے تھا جبکہ گرکس کی پرورش موضع گلاپور کے ایک با اثر خاندان میں ہوئی۔ دونوں شہزادے جوان ہوئے تو ہر دو شہزادگان کے حمایتی ایک دوسرے کے دشمن بن گئے اور علاقے میں فساد کا خطرہ پیدا ہوا۔ اس صورت حال کو دیکھتے ہوئے والئی گلگت راجہ شاہ ملک نے ہنزہ نگر دونوں نواسوں میں بانٹنے کیلئے گلگت کے ایک رئیس برچہ محوسنگھ کو مقرر کیا۔ ہر چند کہ نگر، ہنزہ کے مقابلے میں زیادہ متمول تھا لیکن موخرالذکر چین کی ہمسائیگی میں ہونے کی وجہ سے خاصی اہمیت رکھتا تھا۔ لہذا دونوں شہزادے ہنزہ حاصل کرنا چاہتے تھے۔ بہر حال صاحب خان نے برچہ موسنگھ کی حمایت کے بَل پر ہنزہ ہتھیالیا۔ جمشید عرف مغلوٹ برچہ موسنگھ کے فیصلے سے اختلاف نہیں کر سکا۔ لیکن من ہی من میں دشمنی کا روگ پالتا رہا۔ یوں کچھ عرصہ بعد جمشید کے رضاعی باپ مُغل بیگ عرف شروحل نے تیر چلا کر صاحب خان کو قتل کیا۔ شہزادہ صاحب خان کی نرینہ اولاد نہیں تھی ہاں ایک شہزادی نور بیگم نام کی موجود تھی۔ عوام نے شہزادی کو تخت پر بٹھا دیا۔ کچھ عرصہ بعد شہزادی کی شادی اپنے ایک یک جدی شہزادہ شاہ خان اول سے ہوئی جو کسی زمانے میں کسر نامی ایک راجہ کے خوف سے بدخشاں میں اقامت پذیر تھا۔ یہ شہزادہ جونہی ہنزہ وارد ہوا تو شہزادی کے رضاعی باپ وزیر بٹو نے مشہور کیا کہ آسمان سے ایک شہزادہ اُترا ہے۔ مشہور ہے کہ اس شہزادے کی آمد پر ہنزہ میں خوشیاں منائی جارہی تھیں تو اہالیان نگر نے طنزاً پوچھا،

''مَیاٹس اَپی می شوبہ سَن شُر یارن ایچو بان؟

ترجمہ۔ اے بے حکمران لوگ کیا خوشیاں منا رہے ہو؟

اس پر ہنزہ والوں نے جواب دیا۔

''اَیاش لُوم اَیاشون دیژون

ترجمہ۔ آسمان سے ایک مخلوق لائے ہیں۔

وہ دن اور آج کا دن راجگان ہنزہ کو ''اَیاش کوژ'' کہا جاتا ہے۔ وزیر بٹو کا تعلق گلگت کی رونو قومیت سے تھا جس نے راجہ صاحب خان عرف گرکس کے قاتل مغل بیگ کو ہلاک کر کے اس کا کلیجہ گرکس کی بیٹی نور بی بی کو پیش کیا۔ وزیر بٹو کی اس وفاداری سے والیان ریاست بہت خوش تھے لہذا جب تک ہنزہ کی ریاست قائم رہی راجگان ہنزہ وزیر بٹو کے قبیلے کے افراد کو انکی شادی یا بچوں کے ختنہ کے موقعہ پر زر عروسی ادا کرتے رہے۔



انیسویں صدی کے راجگان بروشال

(دائیں) میر محمد نظیم خان والئی ہنزہ، بائیں) میر سکندر خان والئی نگر، درمیان میں)

راجہ عبدالرحمان خان والئی یاسین

راجگان ہنزہ و نگر عوام کو قابو میں رکھنے کیلئے بعض خرق عادت باتیں خود سے منسوب کرتے تھے۔ مثلاً ایک قدیم حکمران ہری تھم کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ پیدائش کے موقعہ پر اُسکی مٹھی میں جَو کے دانے تھے۔ میر سلیم خان ثانی کے بارے میں مشہور ہے کہ اُسکی دُعا یا تعویز سے کسی بھی وقت بارش ہوتی تھی۔ میر سلیم خان اپنے بھائی راجہ مرزا خان کی مخاصمت سے تنگ آ کر وخان، بگروٹ اور نگر میں پناہ گیر رہا۔ ادھر اہالیان ہنزہ ست الوجود حکمران مرزا خان سے تنگ آئے ہوئے

تھے اور سلیم خان کو تخت پر بٹھانا چاہتے تھے۔ ان کا یہ منصوبہ کامیاب ہوا۔ سلم خان اپنے حمایتیوں کے ساتھ جونہی موضع ہندی پہنچا تو ہنزہ کے اس پہلے گاؤں کی آبادی نے میر سلیم خان سے بارش کیلئے درخواست کی۔ سلیم نے عاجزی سے اللہ کے حضور دعا کی اور تعویز بھی تیار کیا۔ کہتے ہیں موسم گرمیوں کا تھا لیکن اس کے باوجود برفباری ہوئی۔ یوں اہالیان ہنزہ نے دل و جان سے میر سلیم خان کی امارت کو قبول کیا۔

تاریخ بروشال میں بعض ناقابل فراموش کرداروں کا تذکرہ بھی ملتا ہے۔ ہنزہ میں گرگس تھم سے پہلے کسر نامی ایک راجہ بھی گزرا ہے۔ سینہ بہ سینہ روایت ہے کہ یہ راجہ ایک بت پرست دیوداز تھا۔ کسر کی بیوی بھی پری زاد تھی جس کا نام بُبلی گس تھا لیکن خود کسر ایک بلتی خاتون لنگی بونگر کے زلف گرہ گیر کا اسیر تھا۔ ایک مرتبہ کسی پری نے کسر کو بتایا کہ لنگی بونگو ایک مرد غیر سے یارانہ رکھتی ہے۔ یہ سن کر کسر کے تن بدن میں آگ لگ گئی اور اُس نے اپنی بیوی کو ایک مرغی میں تبدیل کیا اور اُسے بلتت کے ایک فلک بوس پہاڑ کی چوٹی پر رکھا۔ وہ پہاڑ اب بھی ''بُبلی موٹینگ''، یعنی ببلی کی چوٹی کے نام سے معروف ہے۔ کچھ وقت کے بعد کسر گلگت چلا گیا جہاں وہ راجہ شری بدت کے ہاتھوں ہلاک ہوا۔

ماضی میں قبائل بروشال اپنے راجگان جنہیں وہ تھم کہتے تھے بہت عزت کرتے بلکہ انکو دیوتا کا درجہ دیتے تھے۔ تھم کی رہائش گاہ کو تھانگ کہتے ہیں۔ ایک برطانوی پولیٹیکل ایجنٹ کرنل جان بڈلف جو ۱۸۷۸ء سے ۱۸۸۱ء تک گلگت میں فرائض انجام دیتا رہا اپنی مشہور تصنیف (Tribes of Hindukush) میں لکھتا ہے کہ اہالیان ہنزہ اسلام کی آمد سے پہلے جانوروں کو محل کی طرف پھیر کر ذبح کرتے تھے۔ ماضی میں راجوں کو تھمو بو یو اور شہزادوں کو سپُو وے او سکو موژ کہنے کا بھی رواج تھا جسکے معنی بالترتیب دیوتا اور دیوتا کی اولاد کے ہیں۔ عوام کا راسخ عقیدہ تھا کہ راجگان کی ناراضگی سے فصلیں تباہ ہو جاتیں ہیں اور قحط پھوٹ پڑتا ہے جبکہ انکی خوشنودی سے علاقے میں رزق کی فراوانی ہوتی ہے۔ پرجا اپنے حکمرانوں کو علامتاً ''بتشا' پگڑی کا لقب بھی دیتے تھے جو وقار کی علامت ہے۔ وقت ملاقات عوام راجہ کو ''نذر''، رانی کو ''زی زی'' یا ''غنش''، شہزادیوں کو گس اور شہزادوں کو ''گشپور'' جیسے تعظیمی الفاظ سے مخاطب کرتے تھے اور جھک کر ان کا ہاتھ چومتے تھے۔ اُن کے سامنے گھوڑے پر سوار ہو کر جانا معیوب سمجھتے تھے۔ اُن کا جھوٹا کھانا بھی اپنے لئے باعث خوش بختی سمجھتے تھے۔ تھم کسی کو دشنام دے تو کافی مدت تک بڑے فخر سے اس کا ذکر کرتا تھا۔ لوگ راجگان سے منسوب مافوق الفطرت باتوں کو من وعن قبول کرتے تھے لیکن انگریزوں کے ہاتھوں راجگان بروشال (ہنزہ نگر) کی شکست نے اس طلسم کا خاتمہ کر دیا۔ اب علم کی روشنی نے توہمات اور شخصی راج کا بھی قلع قمع کر دیا ہے۔



کریم آباد ہنزہ مین میر آف ہنزہ کا موجودہ محل

ریاست بروشال کا خاتمہ:

۱۸۹۲ء میں اینگلو بروشو جنگ برپا ہوئی۔ اس جنگ کی وجوہات کچھ یوں تھیں کہ حکومت برطانوی ہند صوبہ سنکیانگ تک ڈاک کی بحفاظت ترسیل کیلئے ہنزہ نگر کے راستے سڑک تعمیر کرنا چاہتی تھی۔ لیکن اس زمانے کے والئی ہنزہ میر محمد غزن خان اول نے جسے چین اور روس کے ساتھ دوستی پر بڑا ناز تھا اور انگریز بیزاری اسکے رگ و پے میں بسی ہوئی تھی برطانوی پولیٹیکل ایجنٹ متعینہ گلگت کو ٹکا سا جواب دیا۔ زمانے کی الٹ پھیر دیکھئے کہ میر غزن خان کو اسکے بیٹے صفدر علی خان نے قتل کیا لیکن اس نے بھی انگریز مخالف پالیسی جاری رکھی بلکہ اُس نے تو خطرناک نتائج کی بھی دھمکی دی۔ اس رویہ کا یہ نتیجہ نکلا کہ پولیٹکل ایجنٹ کرنل الجرنن ڈیورینڈ کو وائسرائے ہند کی طرف سے ۲۹، نومبر ۱۸۹۱ء کو بروشال پر حملے کیلئے احکامات صادر ہوئے۔ لہذا یکم دسمبر ۱۸۹۱ء کو جنگ شروع ہوئی اور ۱۱ جنوری ۱۸۹۲ء تک جاری رہی۔ اس جنگ میں تین برطانوی افسران کو وکٹوریہ کراس دیا گیا۔ انگریزوں نے یہ جنگ جیت لی اور انہوں نے اس کامیابی کے بعد مختصر وقت کیلئے ہنزہ نگر میں اپنے ایجنٹ متعین کئے اور دونوں ریاستوں کو ذیلی ایجنسیاں قرار دیا۔ والئی ہنزہ نظیم خان اور والئی نگر سکندر خان انگریزوں کے حامی تھے لہذا انہیں موروثی حکمرانوں کے طور پر تخت پر بٹھایا گیا اور فرنگی انہیں اپنا تابع فرمان بنا کر گلگت واپس لوٹے۔ یکم نومبر ۱۹۴۷ء کو یہ علاقے انگریزوں اور ڈوگروں کے اثر سے آزاد ہوئے۔ حکومت پاکستان نے انکی سابقہ حیثیت کو برقرار رکھا۔ پاکستان کے سابق وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو نے ۲۳، اگست ۱۹۷۲ء کو ریاست نگر اور ستمبر ۱۹۷۴ء کو ریاست ہنزہ کی آزاد حیثیت کا خاتمہ کیا۔

آبادی کے اجزائے ترکیبی، زبان اور بولی:

بروشال ہنزہ جغرافیائی لحاظ سے زیریں، بالائی اور وسطی حصوں پر مشتمل ہے۔ بالترتیب زیریں ہنزہ شین اور بروشو قبائل اکھٹے رہتے ہیں۔ اس حصے میں خضر آباد، حسین آباد، خان آباد، میون اور ہندی نام کے گاؤں ہیں۔ میون قدیم گاؤں ہے جو کئی بار آباد اور برباد ہوتا رہا۔ یہاں آباد ہونے والا قدیم ترین قبیلہ رونو تھا۔ اُن کے ساتھ ساتھ کم کم شین نسل کے لوگ بھی آباد تھے۔ کہتے ہیں دونو قبائل ایک کہی قلعے میں بستے تھے جسے ''لیوکوٹ'' کہا جاتا تھا۔ اس قلعہ کے بریدہ آثار آج بھی دکھائی دیتے ہیں۔ کچھ عرصہ بعد مرکزی ہنزہ سے قبیلہ ''دِرم ہرائی'' کے کچھ گھرانے بھی آکر بس گئے جو بعد ازاں ''ہراکندرو'' کے نام سے معروف ہوئے۔ روایت کے مطابق رونو قبیلہ خودسر اور مغرور تھا۔ اس قبیلہ نے ایک مرتبہ میر ہنزہ ایاشوثانی کو مالیہ دینے سے انکار کیا تو مرکزی ہنزہ سے میر کے کہنے پر حملہ کیا گیا اور اس قبیلہ کے تمام مرد و زن قتل کیے گئے۔ شین قبیلہ میر کے حکم کا پابند تھا اور مالیہ کی ادائیگی کے سلسلے میں بھی ان کی طرف سے کوئی رکاوٹ نہیں تھی اس لئے اُن کا نقصان نہیں ہوا لہذا آج بھی وہاں شین نسل آباد ہے اور لوگ شینا زبان بولتے ہیں جو ہند آریائی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ رحمت بیگ کوژ، گسر اٹنگ، فوتے، سموئے اور علی شیرے شین قبیلہ کے مشہور خاندان ہیں۔ اس قبیلہ کے افراد دراز قامت، خوبصورت اور صاف گو ہوتے ہیں۔ گلہ بانی ان کا آبائی پیشہ ہے۔ طبعاً موج میلے والے لوگ ہیں۔

مرکزی ہنزہ سیاسی اور سماجی اعتبار سے بہت اہم ہے۔ التت بلتت اور گنش یہاں کی قدیم ترین بستیاں ہیں۔ سینہ بہ سینہ روایات سے پتہ چلتا ہے کہ التت میں پہلے پہل ہون نسل کے کچھ لوگ آباد ہوئے جبکہ موضع گنش میں ہما چاٹنگ نام کا ایک قبیلہ آباد تھا۔ ایک مدت کے بعد مُغل تیتم، شانو، صفر، ماموا اور فلولو نام کے افراد بلتت اور گنش میں آباد ہوئے۔ کہتے ہیں یہ سکندر مقدونی المعروف بہ سکندر اعظم کے ایک فوجی دستے کے پسماندگان تھے جو راستہ بھٹک کر اس طرف آنکلے اور بیمار ہونے کے سبب یہیں کے ہو کر رہ گئے۔ مغل تیتم کی نسل آج درا اٹنگ ماموکی نسل خروکوژ، شانو کی نسل بَراتلنگ، فلولو کی نسل فلولوکوژ جبکہ صفر کی نسل سفر ہرائی کہلاتی ہے۔ آج مرکزی ہنزہ میں قرب و جوار سے آئے ہوئے بہت سے قبائل آباد ہیں لیکن اُن کی کوئی انفرادی پہچان نہیں بلکہ بروش معاشرے میں رچ بس گئے ہیں اور بروش کہلاتے ہیں اور زبان بھی بروشسکی بولتے ہیں۔ تاہم قابل ذکر بات یہ ہے کہ قبائل کے نام بدستور بزرگوں کے حوالے سے چل رہے ہیں مثلاً گوہر آباد چلاس سے غلام عرف غلونامی ایک شخص ہجرت کر کے ہنزہ آیا جس کے نام پر آج غلوا ٹنگ نام سے قبیلہ بستا ہے۔ اسی طرح بختہ کوژ کا مورث اعلیٰ ایران سے آکر ہنزہ میں آباد ہوا۔ جٹوری کوژ کا تعلق بھی داریل دیامر سے بتایا جاتا ہے جس کے جد اعلیٰ جٹور نے سب سے پہلے ہنزہ میں نسوار کشی شروع کی۔ قبیلہ مُشکین کوژ بلتی الانسل ہے۔ گنش کا قبیلہ برچہ گلگت سے تعلق رکھتا ہے۔ مموسنگھ ابن برچہ پہلا شخص تھا جو ہنزہ گنش میں آباد ہوا۔ مرکزی ہنزہ میں ڈوم طائفہ بھی آباد ہے جن کی زبان ڈوما کی ہے۔ ان کا مسکن پہلے ''بیریشل'' کہلاتا تھا اب مومن آباد کے نام سے معروف ہے۔ اس قبیلہ میں لوہار اور ساز ندے دونوں شامل ہیں۔ یہ لوگ آپس میں ڈوما کی بولتے ہیں جو بروشسکی سے یکسر مختلف زبان ہے۔ ان کی تعداد زیادہ سے زیادہ تین چار ہزار ہوگی۔

بالائی ہنزہ گوجال کہلاتا ہے جبکہ قدیم نام ہربر تھا۔ یہاں بروشو اور وخی لوگ آباد ہیں لیکن اکثریت وخی بولنے والوں کی ہے۔ غازی کُتار، بختی کُتار اور باقی کُتار یہاں کے مشہور قبائل ہیں۔ مرکزی ہنزہ سے بھی سینکڑوں گھرانے گوجال کے مختلف علاقوں میں آباد ہوئے اور اُسی ثقافت میں رچ بس گئے۔

وخی افراد کی شکل وصورت الگ سے پہچانی جاسکتی ہے۔ کِھلی کِھلی سرخ وسفید رنگت سرخی مائل بال انکی الگ قومیت کی گواہی دیتے ہیں۔ کچھ عرصہ پہلے تک یہاں کی آبادی کی غالب اکثریت گلہ بانی جیسے قدیم پیشے سے منسلک تھی۔ شاہراہ قراقرم کی تعمیر کے بعد بہت سے لوگ کاروبار اور سرکاری ملازمتوں سے منسلک ہو گئے۔ یہاں تعلیم کی شرح بھی بہت بلند ہے۔

وخی زبان کا تعلق بھی انڈوآرین شاخ سے ہے جو غلچہ زبانوں کا گروہ کہلاتا ہے۔

بروشال نگر اور ہنزہ میں زیادہ تر مشترک نسلیں آباد ہیں۔ ہنزہ کی طرح نگر میں بھی بلتستان اور علاقہ دیامر سے کافی تعداد میں لوگ یہاں آکر بس گئے۔ مثلاً قبیلہ گشک کوژ جو اویوم نگر میں آباد ہے گور چلاس سے ہجرت کر کے یہاں آبسا۔ اسی طرح غوشوٹ کوژ غوٹ کوژ، ستی لونگ، مشر کوژ، کونجو کوژ، ہسکل کوژ، نام کے قبائل بھی دیامر سے آئے۔ کچھ خاندان براستہ شگر بلتستان سے بھی آئے۔ راجہ کمال خان کے دور میں کچھ خاندان کشمیر سے بھی آئے۔ ان میں سنگین علی اور ابوالمن مشہور ہیں جو ولی کامل حضرت سید شاہ ببریا کے خدام کے حیثیت سے آئے تھے۔ یہ لوگ اپنی دینی خدمات کے باعث علاقہ بھر میں مشہور ہیں۔ جروکوژ نیپال سے نقل مکانی کر کے اسقردا س نگر میں آباد ہوئے جبکہ مششو کوژ جو شایار میں اقامت پذیر ہیں ان کا تعلق حراموش سے بتایا جاتا ہے۔ اس وقت بروشال نگر میں بروشسکی اور شینا دونوں زبانیں بولی جاتی ہیں۔

بروشال یاسین میں بھی کثیر النسل لوگ آباد ہیں۔ اطراف واکناف

سے جو لوگ مختلف اوقات میں ہجرت کر کے یہاں آباد ہوئے مقامی رنگ میں رنگ گئے۔ یہاں درہ اور بروشونسل کے لوگ قدیم زمانے سے آباد چلے آرہے ہیں۔ کھوار اور بروشسکی یہاں کی دو بڑی زبانیں ہیں۔ کھوار بولنے والوں کا تعلق مختلف گروہوں سے ہے البتہ خاندان خوش وقت اور کٹور نمایاں لوگ ہیں۔ کسی زمانے میں یہ یہاں کے حاکم تھے۔ ان کا تعلق امیر تیمور گورگان سے جوڑا جاتا ہے۔ جبکہ بروشو لوگ فینو یوگرک بتائے جاتے ہیں۔ یاسینی اکہرے بدن کے تیز طراز لوگ ہیں۔ جنگجو طبیعت کے ہیں جنہوں نے انیسویں صدی میں ڈوگروں کا ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ بلا کے چائے نوش ہیں۔

نامور خاندان:

قرائے، پستاکے، زندرے، مناتے، مسانے، پتی کرائے، ہلائے، برچاتنگے، بروشے، کتورے، شامونے، ہوکیائے، غلغوائے، شلائے، قلاتنگائے، متائیلائے، مندو کائی، پھوکائی، تھولائی، قرابیگائی، خوشالائی، بندلاء، تھلائی، پھونائی، وزیرائی، برگوشائی، بولوکائی، قنبرائی، پپائی، حتامائی، دجائی، خوتوتائی، شوکور بیگائی، ہلتینگائی، نونائی اور مشگولائی یہاں کے نامور خاندان ہیں۔

زبانیں:

بروشسکی، ہنزہ، نگر اور یاسین کی اکثریت کی زبان ہے۔ تینوں علاقوں کا لہجہ مختلف ہے لیکن سمجھنے میں چنداں دشواری پیش نہیں آتی۔ ہنزہ میں مروج لہجہ ''ہونزوسکی'' نگری لہجہ ''کھجونا'' اور یاسینی لہجہ ''ورچھکوار'' ''بولتم'' اور یسنسکی کے نام سے معروف ہے۔ ہنزہ نگر والے اپنی بولی کو مشاسکی بھی کہتے ہیں جس کا مطلب ہے اپنی زبان۔

بروشسکی گو کہ ہنزہ کے مرکزی حصے کی زبان ہے البتہ بالائی ہنزہ گوجال کے بعض گاؤں آئین آباد، نظیم آباد، خیبر، سوست بالا و پائن، جمال آباد، خیر آباد، اور مسگر کے علاوہ زیریں ہنزہ کے علاقوں خضر آباد، حسین آباد اور خان آباد بالا میں بھی بروشسکی بولنے اور سمجھنے والوں کی خاصی تعداد آباد ہے۔ وادی نگر میں تھول، نلت، چھلت، مناپن، براور بڑالس پر مشتمل شینا علاقوں کے سوا مرکزی حصے کی زبان بروشسکی ہے۔

یاسین کے اکثریتی علاقے کی زبان بھی بروشسکی ہے البتہ یہاں کھوار بولنے والے بھی کم نہیں جبکہ درکوت گاؤں میں بروشسکی اور وخی دونوں زبانیں بولی جاتی ہیں۔ ان علاقوں کے بعد ضلع غذر کے گاؤں بار جنگل، چٹورکھن، پکوڑ اور گلوداس میں بھی مجموعی طور پر سینکڑوں بروشو گھرانے آباد ہیں۔

۹۲-۱۸۹۱ کی اینگلو بروشو جنگ کے خاتمے کے بعد یہ علاقے زیادہ دیر اپنی انفرادیت برقرار نہیں رکھ سکے۔ انگریزوں نے مقامی لوگوں سے دوستانہ تعلقات استوار کرنے کیلئے والیان ہنزہ و نگر کو کشمیر گلگت اور مضافات میں جاگیریں عطا کیں جنکی آبادکاری کیلئے بہت سے برشو خاندان، متم داس (موجودہ رحیم آباد) دینور، سلطان آباد اور اوشی کھن داس میں بس گئے۔ گزشتہ صدی کی تیسری دھائی کے بعد مرکزی گلگت، نومل، پنیال، اور بلتستان میں بھی بہت سے بروش افراد نے زمینیں خرید لیں۔ ۱۹۴۰ء کے بعد بہت سے بروش گھرانے بہتر مستقبل کی تلاش میں کراچی اور پاکستان کے دیگر بڑے شہروں میں بھی جا بسے۔ ۱۹۸۱ء کی مردم شماری کے مطابق سب ڈویژن ہنزہ کی آبادی ۲۸۴۳۶، نگر کی ۴۷۳۷۶ اور سب ڈویژن گوپس یاسین کی آبادی ۳۸۴۰۲ تھی۔ مردم شماری میں چونکہ لسانی تناسب کا اظہار نہیں کیا گیا تھا اس لئے ایک اندازے کے مطابق برشو افراد کی تعداد پچپن اور ساٹھ ہزار کے درمیان بنتی تھی جو اب بیس برس کے عرصے میں بڑھ کر نوے سے پچانوے ہزار تک پہنچ گئی ہے۔

شینا بند ایرانی زبانوں سے تعلق رکھتی ہے۔ اس کا دائرہ وسیع ہے۔ ضلع گلگت دیامر اور غذر میں بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ شنا لوک ادب میں بہت سے شہ پارے ہیں جن پر یورپی ماہرین نے خاصا کام کیا ہے۔ بروشسکی زبان میں شینا کے بہت سے الفاظ داخل ہو گئے ہیں اسی طرح گلگتی شینا پر بھی بروشسکی کے اثرات پائے جاتے ہیں۔

کھوار آریا الاصل لوگوں کی زبان ہے۔ یہ چترال اور غذر کے ایک وسیع خطے میں بولی جاتی ہے۔ بروشسکی میں کھوار کے بہت سے دخیل الفاظ ہیں۔ اس زبان میں اب کتابیں لکھی جانے لگی ہیں انجمن ترقی کھوار نے اس زبان کے فروغ کیلئے بہت کام کیا ہے۔

مقامی خصوصیات:

بروشال کی بعض وادیاں اپنی ایک الگ پہچان رکھتی ہیں۔ خطہ یاسین وہ تاریخی مقام ہے جہاں آٹھویں صدی عیسوی کے وسط میں تبتی اور چینی افواج میں معرکے کا رن پڑا۔ دشت طاؤس میں کھدائی کریں تو آج بھی بلم، تبر اور تیر کے ٹکڑے ملتے ہیں۔

ہر چند کہ یاسین یخ بستہ وادی ہے لیکن گندم کی فراوانی کے باعث ہمسایہ علاقے ہمیشہ اسکے محتاج رہے۔ یاسین کی قسہ روٹی کی کسی زمانے میں بڑی دھوم تھی۔ فرنگے بَر (فرنگی نالہ) بھی درکوت یاسین میں ہی واقع ہے۔

یاسین شیر دل انسانوں کی سرزمین ہے۔ شہید کارگل حوالدار لالک جان کا تعلق بھی ہندور یاسین سے ہے۔ شاہ نعمت اللہ ولی کے کلام میں بھی یاسین کا ذکر

موجود ہے۔ جس میں پیشگوئی کی گئی ہے کہ کسی وقت اسی نگری میں زبردست جنگ ہوگی اور گھوڑے گھٹنوں گھٹنوں تک انسانی خون میں ڈوب جائینگے۔

مرتضیٰ آباد ہنزہ کا گاؤں ہے۔ یہاں کا چشمہ جوڑوں کے درد کیلئے امرت کا کام کرتا ہے۔ اس چشمے سے مختلف سوتے پھوٹتے ہیں۔ ایک سوتا بہت گرم ہے۔ بھاپ کے بھبکے اڑتے ہیں۔ لوگ آلو اور انڈے ایک پوٹلی میں باندھ کر اس گرم پانی میں رکھتے ہیں۔ ذرا ہی دیر میں پک جاتے ہیں۔ ایک اور سوتے سے نیم گرم پانی پھوٹتا ہے۔ جہاں خواتین کپڑے دھوتی ہیں۔ وہیں شاہراہ قراقرم کے حاشیے پر گندھک آمیز مٹی کے ٹیلے ہیں جہاں عرق النساء، بادی اور جوڑوں کے درد کے مریض ناف تک مٹی ڈال کر لیٹتے ہیں اور شفا پاتے ہیں۔

غلمت نگر کی ایک معروف بستی ہے۔ سید شاہ ولی رحمتہ اللہ علیہ یہیں آسودہ خاک ہیں۔ یہ علاقہ دیو پیکر چناروں اور ایک قدیم راجہ غوری تھم کے مقتل کی وجہ سے معروف ہے۔ مناپن بھی نگر کا ہی ایک گاؤں ہے۔ یہاں کی خوبانی اور اسکی چراہ گاہ کچیلی علاقہ بھر میں مشہور ہیں۔ پسن بھی ایک قدیم گاؤں ہے۔ کسی زمانے میں یہاں کی گندم کی اپنی ایک شہرت تھی۔ صرف یہی نہیں یہاں کا قلعہ گئے دنوں میں ناقابل تسخیر سمجھا جاتا تھا۔ تھول شاہراہ ریشم کے ساتھ ہی آباد ہے۔ یہاں اس شاہراہ کی تعمیر سے پہلے ایک سٹوپا استادہ تھا۔ روایت کے مطابق یہ سٹوپا نہیں بلکہ مغل فوجوں نے ایک مینار تعمیر کیا تھا اب یہ مینار نہیں رہا۔ تاہم تاریخ میں اس کا کثرت سے تذکرہ ملتا ہے۔ چھپروٹ بروشال نگر کا شینا علاقہ ہے جو ایک عرصہ تک ہنزہ نگر کے مابین تختہ مشق بنا رہا پھر ڈوگرے آبراجمان ہوئے۔ ماضی بعید میں یہ خطہ مردم خور راجہ شری بدت کے مظالم کا شکار بھی رہا لیکن اہلیان چھپروٹ نے ہر قسم کے حالات کا ڈٹ کا مقابلہ کیا۔

چپورسن بالائی ہنزہ کا ایک دور افتادہ کوہستانی علاقہ ہے جہاں سے آگے درہ ارشاد آتا ہے۔ اس درے کے پار پامیر کا علاقہ شروع ہوتا ہے۔ چپورسن کی وجہ شہرت حضرت بابائے غندی کی زیارت گاہ ہے جو وادی کے آخری میں ایک دلکش جگہ پر واقع ہے۔ شمالی علاقہ جات کے کونے کونے سے لوگ زیارت کیلئے وہاں جاتے ہیں۔ اس زیارت سے وابستہ بہت سی داستانیں سننے کو ملتی ہیں۔ یہ وادی جرائم سے خالی ہے۔ تشوٹ کو ۱۹۴۷ء کی جنگ آزادی کے صف اول کے ایک ہیرو کیپٹن بابر خان سے نسبت کا اعزاز حاصل ہے۔ اس گاؤں میں غازی بابر خان مرحوم کا آبائی گھر ہے۔ ہوپر اور ہسپر نامی گاؤں اپنے گلیشیرز کی وجہ سے پہچانے جاتے ہیں۔ یہیں پر دریائے نگر کا دھانہ بھی ہے۔ چھلت کسی وقت والئی نگر کا سرمائی صدر مقام تھا۔ آج یہ گاؤں ایک معروف قصبہ کی شکل اختیار کر گیا ہے۔

بلتت قدیم راجگان ہنزہ کا پایہ تخت تھا۔ اس جگہ پانچ چھ سو برس پرانا قلعہ ایستادہ ہے جسکو حال ہی میں اپنی اصلی شکل میں محفوظ کیا گیا ہے۔ ساتھ ہی التت نام کا گاؤں ہے اس جگہ بھی ایک قدیم قلعہ التت موجود ہے۔ دونوں قلعے محض مٹی اور گارے کے بنے ہوئے ہیں۔

عورتوں اور مردوں کے نام

ہنزہ نگر اور یاسین میں ناموں کے حوالے سے دلچسپ روایات کا پتہ چلتا ہے۔ بچے یا بچی کی پیدائش کے ساتویں روز نام رکھا جاتا ہے۔ اُس دن زچہ بچہ کو نہلاتے اور انکے کپڑے بھی دھوئے جاتے ہیں۔ اس رسم کو بروشسکی زبان میں ''تھلِہ کُوڑے گُوٹنک بالتس'' کہتے ہیں۔ اس روز پورے گھر کی صفائی کی جاتی ہے۔ ماضی میں صفائی کے بعد حرمل کی دھونی بھی دی جاتی تھی۔ خواتین بڑے اہتمام کے ساتھ ''بُروم بیک'' باریک پتیری روٹیاں اور گھی تیار کرتی ہیں۔ اس موقعہ پر قریبی عزیزوں کو مدعو کیا جاتا ہے۔ نام رکھنے کا فریضہ (اسماعیلی مولوی) انجام دیتا ہے۔ بچے یا بچی کو خلیفہ کی گود میں رکھتے ہیں۔ خلیفہ ساعت گیری اور طالع بینی کیلئے مخصوص کتاب سے استفادہ کرتا ہے اور نومولود کا کوئی مفرد یا مرکب نام رکھتا ہے۔ اس کے بعد خلیفہ بچے کے کان میں کلمہ پڑھتا ہے۔ اس عمل کو ''اُویک ہُو اُوتس'' کہتے ہیں۔ آج کل خلیفہ کے علاوہ والدین بھی اپنی پسند کا کوئی نام رکھتے ہیں۔ علاوہ ازیں خاندان میں کسی پڑھے لکھے شخص سے بھی کوئی موزوں سا نام تجویز کرنے کیلئے کہا جاتا ہے۔ نام رکھنے کے بعد بچے کو لکڑی کے گہوارے میں لٹاتے ہیں۔ اس رسم کو ''گورار گُوس'' کہتے ہیں۔ اس کا رواج ہنزہ میں زیادہ ہے۔

قدیم دور میں جب بروشال میں ہندومت کا دور دورہ تھا تو مرد و زن کے نام بھی ہندو مسلک کے مطابق رکھے جاتے تھے جیسے شری بدت، شری بگور تھم، گوری پُن، پُنی، سکھی، سکینو، دودھیل، دودھیلو، مُکھن، سوہنی وغیرہ۔ اسی طرح سکھوں کے سے نام رکھنے کا بھی رواج تھا جیسے جُو ور سنگھ، مل سنگھ، موسنگھ، چُمر سنگھ، چوسنگھ، ہری سنگھ، اور مونسنگھ وغیرہ۔ پرانے وقتوں میں جانوروں کی نسبت سے بھی نام رکھنے کا چلن تھا مثلاً گرگس (چوہا) ہُک (کتا) گگو (گدھے کا بچھیرا) مغلوٹ (نرینولا) کھرو (جوں) کتورو (کتے کا پلا) قدیم عقیدے کے مطابق بچوں کو نومولودی اموات سے بچانے کیلئے جانوروں کے سے نام بھی رکھے جاتے تھے۔ جان بڈلف کی تحقیق کی رُو سے پشکن قبیلہ اس طرح کے نام رکھتا تھا۔ جانوروں اور چرند پرند کے نام آج بھی رکھے جاتے ہیں لیکن ایک ذرا فرق یہ ہے کہ فی زمانہ پسندیدہ جانوروں کے نام منتخب کئے جاتے ہیں جیسے طوطا، باز، بُلبُل،

شیر، میون وغیرہ۔

نیا کے معروف ممالک اور شہروں کے نام بھی ملتے ہیں جیسے کابل، نجف، مصری، یونان، جرمن، اروس (روس) ولایت، عرب، یمن یا شیراز وغیرہ۔ ریاستی زمانے میں بروشال کے حکمرانوں نے اپنے نام کے ساتھ منگولیائی خطاب ''خان'' کا اضافہ بھی کیا جیسے شہباز خان، نظیم خان، غزن خان، جمال خان، غضنفر خان، صفدر علی خان، شوکت علی خان، محمد علی خان، بابر خان، دو ھت خان، سلطان خان، فضل خان، اور رحیم خان وغیرہ۔ بالائی ہنزہ میں ہر دوسرا شخص اپنے نام کے ساتھ ''بیگ'' کا اضافہ کرتا ہے چاہے وہ مغل ہو یا غیر مُغل جیسے قرا بیگ، قزل بیگ، مغل بیگ، دارا بیگ، خوش بیگ، کریم بیگ، مستی بیگ، رحیم بیگ، دردانہ بیگ وغیرہ۔

بروشال ہنزہ میں بعض مردوں کے نام آرائشی اشیاء کے طرز پر بھی اختیار کئے جاتے ہیں جیسے گمبوری (بگلے کے براق لمبے پَر) مُجوتو (جھومر) شرینگو (جھنجھنا) وغیرہ۔ سابق حکمران طبقہ کی خواتین کے نام وسط ایشیائی انداز کے ہوتے تھے جیسے پری چہرہ مکہر نگار، بادشاہ بیگم، بی بی روشن، دولت خانم، دولت بی بی، نسیم خاتون، بی بی آفتاب، بی بی طاہرہ، زیب النساء، بی بی زریں، بی بی زاہدہ، بی بی گلشہ، بی بی حیات، بی بی نبات، وگل چہرہ وغیرہ۔

کچھ عرصہ پہلے تک طبقہ عوام کی خواتین کے نام حسب ذیل قسم کے ہوتے تھے۔

خونزو، بی بی سہ، خانم، مرجانی، شوربان، اسفیہ، دُرا، نرزک، سلطانی، سِکم، پُنا کی، موئی، سَمائی، زرنامہ، عزتی، نیتی، بناپو، شمولی، غنچہ، سَداتو، افزوں، شاور، سلطون، ساؤرو، طونو، فیہات، گُل اندام، ماہی رُوم، زی یو، رُانما، افیرو، اشرفی وغیرہ۔

بروشال یاسین میں درج ذیل قسم کے نام کثرت سے رکھے جاتے ہیں۔

دردانہ، فیض امان، شیر امان، اکبر امان، گوہر امان، شیر غضب، فولاد بہادر، ملک امان، لالک جان، بلاور خان، زبر خان، پنین، گُل سمبر، مراد پناہ، بختاور، تتی، فلوک جان، گُل جاجی، خوش مراد، حاصل پناہ، صاحب نظر، دولت نظر، خدا نظر، ارباب نظر، علی نظر وغیرہ۔

مرکزی ہنزہ کے یہ نام بدخشاں اور وخان سے تاریخی تعلق کو ظاہر کرتے ہیں۔ جیسے سرہنگ محمد، سُو جنگ، شاہ گل، گوہر شاہ، نادعلی، عبداللہ جان، ریحان، نگاہ شاہ، گرگ علی، سگ علی، شاہ رندان، دینار، سنگی خان وغیرہ۔

انگریزوں کے دور میں بعض افراد نے بچے بچیوں کے نام فرنگی طرز کے بھی رکھے جیسے ملکہ میری، شمبر (شومبرگ) روزی، گرینی، جوبلی سارا یا مارگریٹ وغیرہ۔ بیسوی صدی کے آغاز کے بعد حسب ذیل قسم کے نام رکھنے کا رواج چلا۔

شاہ پرین، دادری، تیغون، تیجان، جمی، حرمت، طیرو، دلالت، قنبر، طیفور، مجاور، دودھار، بختاور، سلطانو، وفی، خواجہ، پنو، فدائی مَک، درویش، طولی، موجود، کلو، قلمو، برو، ریمو، شلہ پیر، گل بہار، شمشیر، مستان، نبات، کریمو، سعدن، حیدار، شاہ مراد، گُل بہار، تھیپو وغیرہ۔

بروشال نگر میں اشاعت اسلام کے بعد اس طرح کے نام رکھے گئے۔

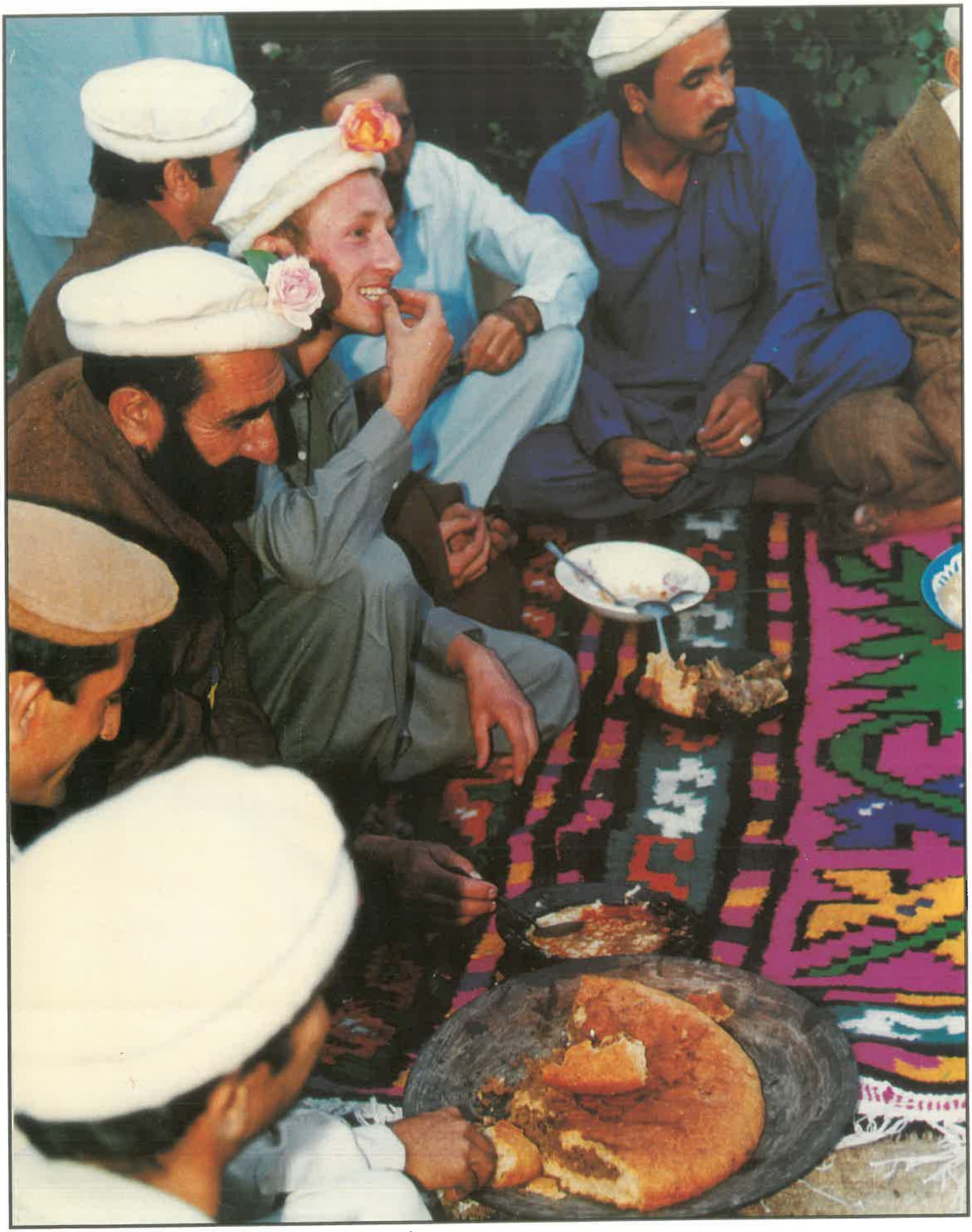
شعبان، رمضان، محرم علی، مختار، حبیب مظاہر، جابر، حسن، حسین، خوشتر، قربان، علی مدد، گوہر علی، فدا حسین، فدا علی، سیاب، شکور، نیاز نیت علی وغیرہ۔

خاص خاص پکوان اور آداب اکل ونوش:

ہنزہ اور نگر گزشتہ صدی کی ساتویں دہائی تک جغرافیائی تنہائی کا شکار ہے۔ ترقی یافتہ دنیا سے دوری نے انہیں قرن ہا قرن تک افلاس زدہ رکھا۔ یہ حالات بالخصوص معیشت پر شدومد سے حاوی رہے۔ قحط اور کمی خوراک کی یہ کیفیت تھی کہ چینی ترکستان سے آنے والے عازمین حج یہ شکایت کرتے تھے کہ کنجوتی غارت گران سے دیگر اشیاء کے علاوہ سفری گُلچے تک چھین لیتے ہیں۔ یہ سلسلہ کرنل لاک ہارٹ کے دورہ ہنزہ اور کرنل ڈیورینڈ کے ہاتھوں ۹۲۔۱۸۹۱ء کے بعد کہیں جا کر رک گیا۔

ہنزہ، نگر میں آلو کی کاشت بھی انگریزوں کی آمد کے بعد شروع ہوئی۔ ورنہ مقامی طور پر ترنبہ تلخ وشیریں، جو، جوار، باقلہ دشتی اور شلجم کی کاشت ہوتی تھی۔ فصلوں پر بیماریوں کے حملے کی صورت میں ناتمام فاقہ کشی کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ اس لئے اہل ہنزہ ونگر خوراک کے بارے میں بہت محتاط ہوتے تھے۔ غلہ کا استعمال کم سے کم کرتے تھے تاکہ خوشی وغمی کے ایام میں تنگ دستی نہ ہو۔ مانگنا بروشو معاشرے میں آج بھی انتہائی معیوب سمجھا جاتا ہے۔ ان حالات نے بروشو معاشرے میں انتہائی سادگی کو فروغ دیا۔ شادی بیاہ، عرس وعیدین نوروز عالم افروز اور دیگر اہم سماجی تقریبات کے موقعوں پر بڑے پُرتکلف اور لذیذ پکوان تیار کیئے جاتے تھے۔ تاہم شاہراہ قراقرم کی تعمیر کے بعد یہاں کے لوگوں کی عادات خورد ونوش پر بھی خاصا اثر پڑا ہے اور روایتی پکوانوں کا رنگ دھیما پڑ رہا ہے۔ چائے، مغربی طرز کی یخ بستہ مشروبات، مغلئی ومغربی کھانے عام پکتے ہیں۔ اب افغانی، چینی اور وسط ایشیائی کھانوں کا بھی زبردست چلن ہے۔ ہنزہ کے روایتی پکوان درج ذیل خصوصیات کے حامل ہیں۔

ا۔ موسمی شدت کا مقابلہ کرنے کی صلاحیت ہے۔



شمالی علاقہ جات، روایتی کھانے اور گپ شپ

۲۔ غذایت سے بھرپور ہوتے ہیں۔
۳۔ خالص اور کیمیائی اجزاء سے پاک ہوتے ہیں۔
۴۔ ان میں حد درجہ سادگی ہے۔
۵۔ تیز مصالحہ جات کا کم سے کم استعمال کیا جاتا ہے۔
۶۔ بعض سفر میں ساتھ لے جائے جاسکتے ہیں اور کئی کئی روز تک خراب نہیں ہوتے۔

شادی بیاہ کے پکوان

شربت:

اردو میں لغوی طور پر شربت پینے کی چیز کو کہا جاتا ہے لیکن بروشسکی میں ایک ایک ٹھوس غذا کا نام ہے۔ یہ پکوان خالص اور کڑوے دیسی گھی، پانی اور موٹے پسے ہوئے گندم کے آٹے سے تیار کیا جاتا ہے۔ بہت لذیذ ہوتا ہے۔ نگر کی شربت کچھ زیادہ مقوی اور مرغن ہوتی ہے اور اس کا آٹا بھی قدرے باریک پسا ہوا ہوتا ہے۔ شادی والے گھر پر لازم ہوتا ہے کہ تمام محلّہ کو شربت کھلائے لہذا کافی مقدار میں پکائی جاتی ہے۔ شربت پکانے کا برتن بھی مخصوص قسم کا ہوتا ہے جو بڑے شہروں سے منگوایا جاتا ہے۔ اُسے مقامی طور پر ''ژنہ'' کہا جاتا ہے۔ گول پیندے کا خاصا بڑا برتن ہوتا ہے جس میں قریباً ایک من تک آٹا پکایا جاسکتا ہے۔ ایک من آٹے کیلئے دس پندرہ سیر گھی مناسب ہوتا ہے۔ گھی پگھلنے پر اتنا پانی ڈالا جاتا ہے کہ جس میں مطلوبہ آٹے کیلئے دس پندرہ سیر مقرر معیار کے مطابق پک سکے۔ گھی اور آٹا ملے پانی میں اُبال آنے پر موٹا پسا ہوا آٹا ڈالتے ہیں اور کسی کانٹے دار ڈنڈے سے مسلسل ہلاتے رہتے ہیں تاکہ مواد دیگچے سے چپک نہ جائے۔ گھی چھوڑنے پر اُسے چولہے سے اتارا جاتا ہے۔ پس حلوہ نما یہ نمکین پکوان باراتیوں اور اہل محلّہ کو پیش کیا جاتا ہے۔ شہروں میں اب اس کا رواج نہیں رہا۔

سُپرا:

بکرے یا بھیڑ کا گوشت بڑے بڑے ٹکڑوں میں کاٹ کر صرف نمک ملے پانی میں پیاز وغیرہ ڈال کر پکایا جاتا ہے۔ باراتیوں کو شربت کے ہمراہ پیش کرتے ہیں۔ معاط نہ ڈالنے کے باوجود یہ گوشت بڑا مزہ دیتا ہے۔

غمی کے پکوان

ہریسہ:

یہ پکوان بروشو علاقوں اور خصوصاً اسماعیلی گھرانوں میں اموات کے تیسرے روز پکایا جاتا ہے۔ گندم پر پانی کے چھینٹے دیتے ہیں اور گراٹ میں موٹا موٹا پسواتے ہیں۔ بعد ازاں کسی غربال کے ذریعے چھانتے ہیں اور باریک و موٹے آٹے کو الگ کرتے ہیں۔ دوسری طرف دیگ میں گوشت کے بڑے بڑے ٹکڑے ڈال کر پکاتے ہیں۔ نیز تیار ہونے پر گوشت نکال کر اسی یخنی میں پہلے موٹا پھر باریک آٹا کم کم ڈالتے ہوئے کسی کھردرے یا کانٹے دار ڈنڈے کی مدد سے برابر ہلاتے رہتے ہیں اور پکنے پر اتار کر رسم چراغ روشن کے بعد مدوئین کو پیش کرتے ہیں۔ اسماعیلی گھرانوں میں مذہبی ضیافتوں کے بعد بھی یہ کھانا پیش کیا جاتا ہے لیکن اس کا رواج آہستہ آہستہ دم توڑ رہا ہے۔

روٹیوں کی اقسام

خمہ لی:

پتلی اور قدرے پھیلی ہوئی پتیری روٹی خمہ لی کہلاتی ہے۔ سخت گندھے ہوئے آٹے کا پیڑا لے کر بڑے توے کے برابر روٹی بناتے ہیں۔ یہ صرف گندم کے آٹے سے تیار کی جاتی ہے۔ تازہ مکھن کے ساتھ بڑا مزہ دیتی ہے۔ یہ روٹی گلگت بلتستان کے ہر علاقے میں مقبول ہے۔ شینا زبان میں ایک ضرب المثل مشہور ہے ''گھی گہ پھپھاؤں'' ایسا جوڑ جیسے گھی اور پھپھاؤں۔

قستہ:

قستہ دراصل خستہ کا بگڑا ہوا نام ہے۔ خستہ جیسا کہ فارسی لفظ ہے جسکے معنی ہیں نرم لہذا خمیری روٹی قستہ کہلاتی ہے۔ کہتے ہیں چترال کی ایک خاتون ہنزہ کے ایک وزیر سے بیاہی گئی تو وہ اپنے ہمراہ قستہ کی ترکیب بھی ہنزہ لائی۔ قستہ کیلئے پہلے خمیر تیار کی جاتی ہے جسے ''ایمہ'' کہا جاتا ہے آٹا قدرے پتلا گوندھا جاتا ہے۔ گرمیوں میں ٹھنڈے اور سردیوں میں شیر گرم پانی سے آٹا گوندھتے ہیں۔ قستہ زود ہضم روٹی ہے۔ اس لئے بڑے بوڑھے بڑی رغبت سے کھاتے ہیں۔

گیل:

ہنزہ نگر میں گیل روٹی مہمانوں کی پزیرائی کیلئے مخصوص ہے۔ مائل بہ سیال آٹا گوندھا جاتا ہے جیسے جلیبی کا مواد۔ پھر اسی مواد کو بڑی روٹی کے برابر توے پر گول گول پھیلا کر پکاتے ہیں۔ لچکیلی، پتلی اور انتہائی نرم روٹی تیار ہوتی ہے۔ اس روٹی کو دیسی گھی لگا کر پیش کرتے ہیں۔ پرانے دنوں میں بہت ہی معزز مہمانوں کیلئے یہ روٹی تیار کی جاتی تھی۔ ترنبہ کے آٹے سے بھی گیل روٹی تیار کی جاتی ہے جو یخنی میں ڈبو کر کھاتے ہیں۔ یہ نسواری رنگ کی کھردری اور قدرے تلخ ذائقے کی روٹی ہوتی ہے۔

بَروُے گیل:

ترنبہ کے آٹے کی لئی سی بناتے ہیں۔ تیز آنچ دے کر توے پر انگلیوں کی مدد سے خوب پھیلا کر پکاتے ہیں۔ اس دوران توے پر ہلکا سا گھی لگاتے ہیں ورنہ چپکنے اور جل جانے کا خطرہ ہوتا ہے۔ یہ نسواری رنگ کی کھردری اور قدرے تلخ ذائقے کی روٹی ہوتی ہے۔ کسی گہری رکابی میں اس کے ٹکڑے ڈال کر اوپر سے گوشت کی یخنی انڈلتے ہیں اور ایک ذرا ٹھنڈا کر کے کھاتے ہیں۔ یہ غریب لوگوں کی کھاجا ہے۔ ایک قدیم بروشسکی کہاوت ہے،

یہ پھت اے اِنہ ہالے بَروے گیل اَپی
چھوڑو جی! اس کے گھر میں تو بروے گیل بھی نہیں

مفید طبی خواص کے باعث اب اس کی طلب بڑھ رہی ہے اور ترنبہ کا آٹا مہنگے داموں بکتا ہے۔

بری کُوژ:

یہ اُمرا کی روٹی ہے۔ پہلے ''خَمہ لی'' روٹی تیار کی جاتی ہے پھر خوبانی کی گری پیستے ہیں اور اُس کا چُورا، دھنیا، پودینہ نمک اور سرخ مرچ میں ملاتے ہیں۔ بعد ازاں ان تمام اشیاء کو سل پر دوبارہ پیستے ہیں اور گھی میں تر بتر روٹیوں پر یہ مواد پھیلاتے ہیں۔ انتہائی مرغن اور مقوی روٹی ہوتی ہے۔

پھل ژ پھقو:

''پھل ژ''، جنگلی سنجد کی ایک قسم ہے جو میٹھی ہوتی ہے۔ ان میٹھے دانوں کو سکھا کر گندم کے ساتھ پسواتے ہیں اور اسکی روٹی بناتے ہیں۔ اس میں گندم کی مقدار زیادہ ہوتی ہے۔ میٹھی اور ذائقہ دار ہوتی ہے۔ لسی کے ساتھ کھائی جاتی ہے۔

چھپ شُورو:

گوشت کے بہت چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کرتے ہیں اور مصالحہ جات میں خوب بھونتے ہیں۔ پکنے اور بھننے پر دو درمیانے سائز کی روٹیوں میں اس مواد کو رکھ کر اور کناروں سے بند کر کے توے پر سینکتے ہیں۔ یہ پیزا کی طرح ہوتی ہے۔ یہ روٹی چرواہے اور مسافر اپنے ہمراہ سفری خوراک کے طور پر لے جاتے ہیں۔

شُورو:

یہ خاصی موٹی روٹی ہوتی ہے جو توے پر سینکنے کے بعد راکھ میں پکاتے ہیں آج کل اس کا رواج قریب قریب ختم ہو چکا ہے۔

بُلکہِ شپیک:

باقلہ دشتی (جنگل مٹر) کے خشک دانوں کو پیس کر آٹا تیار کرتے ہیں جس میں حسب ذائقہ نمک اور بالکل تھوڑا سا گندم کا آٹا ملا کر روٹیاں تیار کی جاتی ہیں۔ اس کا رواج کبھی کا ختم ہو چکا ہے تاہم کراری روٹی تیار ہوتی ہے۔

بسِس ژِگیل:

گھیوں کے آٹے کی لئی تیار کرتے ہیں بعد ازاں بکری یا بھیڑ کی چربی کے ٹکڑے اور نمک ملاتے ہیں۔ اس مواد کو توے پر گول گول پھیلا کر پکاتے ہیں۔

شکر کوُژے پھقو:

میتھی کے خشک ڈنٹھل اور پتیاں سکھاتے ہیں۔ انہیں کوٹنے کے بعد گراٹ میں باریک پسواتے ہیں۔ اس میں گھیوں کے آٹے کی معمولی مقدار ملا کر روٹیاں تیار کی جاتی ہیں۔

بُروش پشیک:

بری کوژ سپیک کے طریقے پر ہی پکاتے ہیں تاہم اس میں تازہ پنیر کی تہہ کا اضافہ کیا جاتا ہے جس سے ذائقے میں خوشگوار اضافہ ہوتا ہے۔

غُملدَیِ:

باریک پتیری روٹیاں پکاتے ہیں پھر دہی یا تازہ پنیر میں مصالحہ جات ملاتے ہیں۔ اب دوسری طرف گھی یا تیل میں پیاز کو گہرا بادامی ہونے تک بھونتے ہیں اور تھوڑی سی سُرخ مرچ بھی شامل کر کے یہ مواد دہی یا پنیر پر ڈالتے ہیں۔ کسی اُتھلے تھال میں ہر روٹی کے اوپر یہ کرارا مواد تہہ بہ تہہ پھیلاتے ہیں اور چھری سے مناسب ٹکڑوں میں کاٹ کر مہمانوں کو پیش کرتے ہیں۔

دیژرِمُ:

چھلکہ دار السی اور خوبانی کی گریوں کو بھونتے ہیں پھر دونوں کو ہاون دستے میں باریک باریک کوٹتے ہیں۔ اب گھیوں کی گیل روٹی میں اس روغنی مصالحے کو شامل کر کے چوری کی طرح تیار کرتے ہیں۔ قوت باہ اور درد کمر کیلئے مفید خوراک سمجھی جاتی ہے۔

ملیدہ:

قدرے موٹی پتیری روٹی پکاتے ہیں۔ پھر گاڑھی لسی میں ہرا دھنیا، پودینہ، نمک اور سرخ مرچ شامل کر کے تین چار روٹیوں پر یہ مواد انڈیلتے ہیں البتہ سب سے اوپر والی روٹی پر گہرا سا گڑھا بنا کر اس میں گھی یا گری کا روغن بھی ڈالتے ہیں۔ بروشال کے بڑھے بوڑھے بہت شوق سے یہ روٹی کھاتے ہیں۔ خاصی ثقیل اور مقوی خوراک ہے۔

خمولُٹ:

گیہوں کے آٹے میں نمک، سرخ مرچ اور پیاز باریک باریک کاٹ کر ملاتے ہیں اور خوب گوندھنے کے بعد خاصی موٹی چپاتی تیار کر کے راکھ میں رکھ کر پکاتے ہیں۔ چٹ پٹی روٹی تیار ہوتی ہے۔

سی سر:

پانی میں خمیر، دو تین چٹکی زعفران کا ذب کی پتیاں اور نمک ڈال کر ہاتھوں سے مَل مَل کر پتلا سا مواد تیار کرتے ہیں پھر اس میں آٹا ڈال کر گوندھتے ہیں اور چھوٹی سائز کی روٹیاں تیار کر کے خوبانی کی گری کے تیل میں پکاتے ہیں۔ آج کل سرسوں کے تیل میں پکانے کا رواج ہو چلا ہے۔ یہ روٹیاں کئی کئی روز تک خراب نہیں ہوتیں۔ شادی شدہ لڑکیاں میکے سے سسرال جائیں تو والدین ڈھیر سارے سی سر ساتھ بھیجتے ہیں۔

اَرذوق:

آٹا چھان کر میدہ تیار کرتے ہیں جس میں گھی، دودھ اور انڈے ڈال کر ذرا سخت گوندھتے ہیں۔ گندھے ہوئے آٹے میں اٹھان آنے پر تکون شکل کی روٹیاں بنا کر گھی یا تیل میں تلتے ہیں۔ چائے کے ساتھ کھائے جاتے ہیں۔ کئی کئی دن تک خراب نہیں ہوتے۔

چھاپھقو:

یہ باجرے کی روٹی ہوتی ہے۔ پانی میں باجرے کا آٹا ڈال کر گوندھتے ہیں۔ ذرا سخت سی روٹی پکتی ہے۔ اب باجرے کی کاشت نہیں ہوتی۔

بئی اے پھقو:

بئی باجرے ہی کی ایک قسم ہے لیکن اس کے دانے چاولوں سے مشابہ ہوتے ہیں۔ اس کی روٹی بھی سادہ طریقے سے تیار کی جاتی ہے۔

ہری اے قِستہ:

بروشسکی زبان میں ہَری جو کو کہتے ہیں۔ اس کی خمیری روٹی بنائی جاتی ہے۔ ثقیل ہوتی ہے اس لئے زیادہ پسند نہیں کی جاتی۔ دیہاتوں میں خال خال پکائی جاتی ہے۔

شِلک پھٹی:

یہ موٹی پتیری روٹی ہوتی ہے جو توے پر پکائی جاتی ہے۔ چائے یا لسی کے ساتھ کھائی جاتی ہے۔

پُرونٹہ:

مقامی طور پر پراٹھے کو پرونٹہ کہتے ہیں۔ مقبول عام طریقے سے پکائی جاتی ہے۔ تہہ دار پراٹھے کو پسند کرتے ہیں۔ مہمانوں کی آمد پر چائے کے ساتھ کسی بھی وقت پیش کرتے ہیں جبکہ شہروں میں ناشتے میں کھایا جاتا ہے۔

خِمشدون:

خمشدون دراصل کماچدان کا بگڑا ہوا نام ہے۔ کماچدان ترکی زبان میں اُس گول سانچے کو کہتے ہیں جس میں موٹی روٹی تیار کی جاتی ہے۔ اس نسبت سے روٹی کا نام بھی خمشدون پڑ گیا۔ عام طریقے سے آٹا گوندھ کر سانچے کے مطابق چھوٹی بڑی روٹی تیار کی جاتی ہے۔ گول کیک کی شکل کی پکتی ہے۔ کھاتے پیتے گھرانے دودھ، انڈے اور روغن ڈال کر تیار کرتے ہیں۔ یہ سفری روٹی بھی ہے اور گھر پر روز کے روز ناشتے کیلئے بھی تیار کی جاتی ہے۔

چھمور یکی:

چوری کو چھموریکی کہتے ہیں۔ گرم گرم روٹی اور دیسی گھی کو ہاتھوں سے خوب مسل مسل کر تیار کرتے ہیں۔ لسی یا چائے کے ساتھ کھاتے ہیں۔ بچے بوڑھے سب پسند کرتے ہیں۔

سالن کی اقسام

شکر کُوژے:

ہنزہ نگر میں میتھی کا استعمال کچھ زیادہ ہے۔ خشک، تازہ دونوں مستعمل ہیں۔ اس مقبول عام سالن کا طریقہ انتہائی سادہ ہے۔ میتھی کی تازہ پتیاں چُن کر دھوتے ہیں اور معمولی مقدار میں پانی ڈال کر پکاتے ہیں۔ آخر میں آلو بھی شامل کرتے ہیں اور گھی کا تڑکا لگا کر کھاتے ہیں۔ اس سالن کے ساتھ قستہ روٹی بڑا مزہ دیتی ہے۔

شپتینگے ہوئی:

لوسرن (الفلفا) جب تازہ اُگے اور چننے کے قابل ہو تو خواتین ڈھیر سارا اکھٹا کرتی ہیں۔ یہ سبزی اواخر مارچ میں کھلے کھیتوں میں عام اگتی ہے۔ اُن ایام میں لڑکیاں اکثر یہ سبزی چنتے ہوئے نظر آتی ہیں۔ مطلوبہ مقدار میں سبزی جمع کرنے کے بعد کھلے پانی میں خوب دھو کر چولہے پر چڑھاتی ہیں۔ یہ سبزی اپنے پانی میں ہی پکتی ہے۔ تڑکا دینے کے بعد قستہ روٹی کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔ بعض لوگ سرخ مرچ کے ساتھ پسند کرتے ہیں۔

ژوُرے ہوئی:

خرفا کا ساگ اگنے کے بعد دو تین انچ بڑھے تو خواتین جڑ سمیت چنتی ہیں اور خوب دھو کر چولہے پر چڑھاتی ہیں۔ پکنے پر تیل کا تڑکا لگا کر پیش کرتی ہیں۔ اس سالن کے ساتھ بھی کُٹی ہوئی سرخ مرچ کا استعمال عام ہے۔

ماشے شکر کوژ:

یہ میتھی کے خشک ڈنٹھلوں کا سالن ہوتا ہے۔ ڈنٹھلوں کو خشک کر کے پیستے ہیں اور چھان کر باریک سفوف کو محفوظ کرتے ہیں۔ اب بقدر ضرورت ایک حصہ سفوف میتھی اور آدھا حصہ گیہوں کا آٹا ملا کر دیگچی میں تڑکا لگے پانی میں ڈال کر ہلاتے رہتے ہیں۔ گاڑھا ہونے پر قسته روٹی کے ساتھ کھاتے ہیں۔ ہرے رنگ کا سالن بنتا ہے۔

ہوسرے ہوئی:

یہ گھیئے کی ترکاری ہوتی ہے۔ گھیے کے ٹھوس گودے کو مناسب سائز میں کاٹتے ہیں۔ پیاز کو گھی یا تیل سرسوں میں ہلکا بادامی ہونے تک بھونتے ہیں پھر سرخ مرچ، حسب ذائقہ نمک اور گھیا ڈال کر اسکے اپنے پانی میں پکاتے ہیں۔ گھیا زیادہ خشک ہو تو مناسب مقدار میں پانی بھی ڈالتے ہیں۔ یہ سالن ہلکا میٹھا سا ذائقہ دیتا ہے۔ تاہم یہ ترکاری زیادہ پسند نہیں کی جاتی ہے۔

ہوئی لُم گرما:

خرفا کا ساگ عام طریقے سے پکاتے ہیں پھر اس میں مناسب سائز کی کچی پتیری روٹیاں ڈالتے ہیں۔ روٹیاں دم پخت ہوں تو ڈوئی کی مدد سے ساگ اور روٹیوں کو خلط ملط کرتے ہیں۔ یہ ہوا ہوائے لُم گرما۔ اس کے ساتھ دیگر کوئی روٹی نہیں کھائی جاتی۔ بڑا زود ہضم کھانا ہوتا ہے۔ نئی نسل اسکو پسند نہیں کرتی۔

گوشت کے سالن

بلانیشو:

بکری یا بھیڑ کی اوجھڑی اور آنتوں کو خوب صاف کرتے ہیں۔ پھر آنتوں کو اوجھڑی کے ٹکڑوں پر اس طرح لپیٹتے ہیں کہ ان کی شکل کریم رول کی سی بن جاتی ہے۔ اب ان کو مرچ مصالحوں اور گھی کے ساتھ دیگچی پر چڑھاتے ہیں۔ پکنے پر قسته کے ساتھ کھاتے ہیں۔

چھپے خَم:

گوش کے عام سالن کو ''چھپے خَم'' کہتے ہیں۔ تاہم پسند کے مطابق شلجم آلو، کدو یا کوئی اور سبزی ڈال کر پکاتے ہیں۔ پتیری و خمیری روٹی یا چاول کے ساتھ کھاتے ہیں۔

یوٹس یٹی سہ خَم:

یہ سری پائے کا عام سالن ہوتا ہے۔ اس میں شلجم ضرور ڈالتے ہیں۔ ترنبہ کی گئیل روٹی، پتیری روٹی یا قسته کے ساتھ کھاتے ہیں۔

میار تک دوژرس:

یہ پکوان شب دیگ کی قسم کا ہوتا ہے۔ بھیڑ بکری یا گائے بیل کے گوشت کا سخت حصہ مثلاً گردن کی ہڈی پائے یا اس طرح کی چیز چولہے پر چڑھاتے ہیں۔ ساتھ چھلکے والی لوبیا، شلجم یا گاجر بھی ڈالتے ہیں۔ صبح چپاتی کے ساتھ کھاتے ہیں۔

متفرق سالن

ہنَی مِناژے مُلوغشون:

گاجر اور شلجم کے ٹکڑے کر کے سادہ پانی میں پکاتے ہیں۔ دَم پخت ہونے پر مغز خوبانی کی کھلی ملاتے ہیں۔ یہ غذائیت سے بھرپور اور کولیسٹرول سے پاک خوراک سمجھی جاتی ہے۔

گِر گِر آلو:

ثابت مسور کی دال اور آلو کے دو دو ٹکڑے کر کے پکاتے ہیں۔ گھی کا تڑکا دیکر یا قسته روٹی کے ساتھ کھاتے ہیں۔

پکائی ہوئی ٹھوس غذائیں

جوقسش:

بھیڑ بکری کی سالم اوجھڑی کو تیز گرم پانی سے خوب دھو کر صاف کرتے ہیں۔ اب کلیجی، گردوں اور چربی کے باریک ٹکڑے کر کے اس میں لہسن، سرخ یا سبز مرچ اور پیاز کا پیسٹ بھی ملاتے ہیں۔ آخر میں ترنبہ یا گیہوں کا آٹا معمولی مقدار میں شامل کر کے ہاتھوں سے یک جان کرتے ہیں۔ پھر دستیاب ہو تو زیرہ چھڑک کر اس مواد کو تھیلی نما اوجھڑی میں ٹھونس ٹھونس کر بھرتے ہیں۔ اور اس کے منہ کو کس کر باندھتے ہیں اور پانی میں دیر تک پکاتے ہیں۔ پکنے کیلئے تین سے چار گھنٹے تک لگ جاتے ہیں۔ جوقس پکے پانی کو ضائع نہیں کرتے بلکہ ترنبہ کی روٹی بھگو کر کھاتے ہیں۔

جوقسِ کو ٹھنڈا کر کے اور چھری سے قاشیں نکال کر کھاتے ہیں۔ یہ سردیوں کا پکوان ہے جب ''یوشایا شوسواس'' رسم کے موقع پر تمام لوگ اجتماعی طور پر جانور ذبح کرتے ہیں اور گوشت کی قدرے فراوانی ہوتی ہے۔ یوں سردیوں

کے طویل دورانیے کیلئے صاف گوشت محفوظ کیا جاتا ہے جبکہ ''یول ایچر'' اوجھڑی کلیجی اور گردے جوقسِ وغیرہ میں استعمال ہوتے ہیں۔

شوپَن:

جوقسِ اور شوپن میں مستعمل اشیاء یکساں ہیں تاہم شوپن میں آٹا نہیں ڈالتے اور چھوٹی اوجھڑی میں جوقسِ والی اشیاء ڈالی جاتی ہیں۔ ذائقہ بھی دونوں کا ایک ہی طرح کا ہوتا ہے۔

آٹے کی نرم غذائیں

مُل:

کسی دیگچے میں مطلوبہ مقدار میں پانی ابالتے ہیں اور گیہوں کا آٹا آہستہ آہستہ ڈالتے ہوئے ڈوئی سے برابر ہلاتے رہتے ہیں حتیٰ کہ حلوہ کی شکل اختیار کرتا ہے۔ کسی برتن میں ڈال کر درمیان میں گھی یا مکھن رکھتے ہیں۔ بعض خواتین توت کی جیلی (خندہ) یا شہد بھی ملاتی ہیں۔ گھی اور نمک پر بھی اکتفا کیا جاتا ہے۔ یہ دراصل زچہ کی خوارک ہے۔ زچہ کو مبارکباد دینے گھر آئی خواتین کو بھی یہ خوراک پیش کی جاتی ہے۔

مُتوک:

دوحصہ دیسی گھی میں ایک حصہ گیہوں کا آٹا ڈال کر ہلکا بادامی ہونے تک بھونتے ہیں آٹا خوشبو دینے لگے تو معمولی مقدار میں پانی اور حسب ضرورت نمک ڈال کر ڈوئی سے مسلسل ہلاتے ہوئے پکاتے ہیں۔ گھی چھوڑنے لگے تو اتار کر پیش کرتے ہیں۔ یہ بھی زچہ کی مخصوص خوراک ہے۔ بزرگ خواتین بھی شوق سے کھاتی ہیں۔

میٹھے پکوان

دِرمَ پھٹی:

یہ بروشال کی پسندیدہ میٹھی روٹی ہے۔ گندم صاف کر کے تین روز تک کسی اتھلے برتن میں بھگو کر رکھتے ہیں۔ اس دوران ہاتھوں سے گندم کے دانے ہلاتے اور الٹتے پلٹتے ہیں۔ دراین اثنا کونپلیں پھوٹنے کے آثار نظر آتے ہیں۔ اب برتن سے پانی الگ کرتے ہیں اور مزید تین روز تک گندم یونہی رہنے دیتے ہیں۔ تیسرے روز گندم پر پانی کے چھینٹے دیتے ہیں۔ یوں مکمل طور پر کونپلیں نکل آتی ہیں۔ تقریباً ایک ماہ تک تین تین روز کے وقفے کے بعد گندم کے ریشہ دار دانوں کو الٹا پلٹا اور گتھے ہوئے دانوں کو الگ الگ کرنا پڑتا ہے۔ آخر میں ان گیلے اور ریشہ دار دانوں کو کسی صاف کپڑے پر پھیلا کر دھوپ میں سکھاتے ہیں۔ سکھانے کے مرحلے پر بھی کئی روز لگ جاتے ہیں۔ دانے کڑک سوکھ جائیں تو چکی میں پسواتے ہیں۔ اب اس آٹے سے چھوٹی چھوٹی روٹیاں پکاتے ہیں اور پرانے دیسی گھی کے ساتھ کھاتے ہیں۔ بہت لذیذ اور میٹھی روٹی تیار ہوتی ہے۔

ڈنگ دِرمَ:

سنگ خارا کی بڑی ہانڈی میں مطلوبہ مقدار میں پانی ڈال کر چولہے پر چڑھاتے ہیں۔ پھر حسب ضرورت دِرمَ آٹا لے کر پانی میں گھولتے ہیں اور جلیبی کا سا مواد تیار کرتے ہیں دوسری طرف خوبانی کی میٹھی کر کی اتنی ہی مقدار میں لیکر اس کی کھلی بناتے ہیں۔ پانی کے ابال آنے پر گری کی کھلی ڈالتے ہیں۔ تھوڑے ہی وقفے کے بعد دِرمَ کا سیال مواد بھی تھوڑا تھوڑا کر کے دیگچی میں انڈیلتے ہیں اور کسی چوبی ڈنڈے سے مسلسل ہلاتے رہتے ہیں۔ یہاں تک کہ کھل اور دِرمَ خوب پکنے کے بعد گھی چھوڑتے ہیں۔ اب ہانڈی کو چولہے سے اتارتے ہیں اور نیم گرم یا ٹھنڈا ہونے پر نوش کرتے ہیں۔ یہ میٹھا پکوان کئی کئی روز تک خراب نہیں ہوتا۔ امراء کی پسندیدہ خوراک ہے۔

دِرمَ شورو:

ایک حصہ گیہوں کا آٹا اور دو حصے درم آٹا لیکر توت شیریں کے شیرہ میں گوندھتے ہیں۔ گندھے ہوئے آٹے کی قدرے موٹی موٹی روٹیاں تیار کرتے ہیں۔ جیسے ہی روٹیاں تیار ہوتی ہیں کسی گہرے برتن میں انہیں مسل مسل کر حلوہ سا بناتے ہیں۔ پھر اس حلوے کے وسط میں ڈھیر سارا گھی رکھتے ہیں جو پگھل کر ادھر ادھر پھیل جاتا ہے۔ نیم گرم ہونے پر کھاتے ہیں۔

ژیڈیو دِرمَ:

نصف نصف مقدار میں دِرمَ آٹا اور گری کی کھلی پانی میں ڈال کر ابالتے ہیں۔ گھی چھوڑنے پر کچھ اور پانی ڈال کر قدرے پتلا سا دلیہ بناتے ہیں۔ سردیوں کی خوراک ہے۔ کڑاکے کی سردی میں کھائیں تو پسینے چھوٹتے ہیں۔

ماگولات مغزیات:

بروشال میں مغزیات کا استعمال بہت ہے۔ اس سے نرم غذائیں بھی تیار کی جاتی ہیں جنہیں ژمیک کہا جاتا ہے۔

ہَنی اے ژمیک:

خوبانی کی میٹھی گری کو سل بٹے پر باریک پیستے ہیں۔ پیستے ہوئے پانی کا ہلکا چھینٹا دیتے ہیں یا صرف ترانگلیوں سے پسی ہوئی گریوں کو یکجا کرتے ہیں۔ اس طرح لئی سی بن جاتی ہے۔ اس لئی کو مختلف طریقوں سے استعمال کرتے ہیں۔ چاہے سبزیوں پر تڑکے کی جگہ ڈال دیں یا روٹی کے ساتھ یونہی کھائیں۔ گری کی

جگہ مغز بادام مغز اخروٹ، دانہ خشخاش، دانہ بھنگ، دانہ قرطم سے بھی ژمیک تیار کرتے ہیں۔ ژمیک مقوی خوراک میں شمار ہوتی ہے۔ زچہ کو کھلاتے ہیں کیونکہ اس سے دودھ بڑھتا ہے اور شیر خوار بچے قوی ہوتے ہیں۔ دودھ چھوڑے بچے کو بھی لازماً کھلاتے ہیں۔

آش کی اقسام:

بروشسکی زبان میں آش (Soup) کو ڈوڈو کہتے ہیں جسکی کافی اقسام ہیں۔

ا۔ خَرنِہ ڈوڈو:

دیگچے میں حسب طلب آٹا اور گھی ڈالتے ہیں اور ہلکی آنچ پر آٹے بھونتے ہیں۔ آٹا خوشبو دینے لگے تو اس میں ذائقہ کے مطابق نمک اور حسب ضرورت پانی ڈالتے ہیں۔ پکنے پر اتار کر نیم ٹھنڈا کر کے کھاتے ہیں۔ یہ مریضوں کیلئے عمدہ خوراک شمار کی جاتی ہے۔

قُرت ژہ ڈوڈو:

قُرت (خشک دہی) کے ٹکڑوں کو بقدر ضرورت پیس کر سفوف سا بناتے یا پانی میں گھول کر نرم مواد تیار کرتے ہیں تا کہ بطور کھٹائی استعمال کریں۔ گوشت کے بھی چھوٹے چھوٹے ٹکڑے بناتے ہیں۔ پھر پیاز، ادرک اور ٹماٹر کے ساتھ گوشت کو خوب بھونتے ہیں۔ قدیم زمانے میں یہ چیزیں میسر نہیں تھیں صرف پانی میں بھی گوشت کو گلاتے تھے۔ گوشت بھنتے ہی پتلا شوربہ بنانے کیلئے افراد کی تعداد کے مطابق پانی ڈالتے ہیں۔ شوربہ میں جیسے ہی ابال آئے پتیری روٹی کے لمبے لمبے لچھے کاٹ کر ڈالتے ہیں اور ذرا گاڑھا ہونے پر اتارتے ہیں۔ آش کی یہ قسم بروشال میں بہت مقبول ہے۔

بَیرٹنگ ژ ڈوڈو:

صاف اور بے داغ خشک خوبانی مطلوبہ مقدار کے مطابق لے کر کھلے پانی میں دو تین مرتبہ دھوتے ہیں اور خوبانی سے چار پانچ گنا زیادہ پانی کے ساتھ دیگچے میں ڈال کر چولہے پر رکھتے ہیں۔ خوبانی گلنے پر اتارتے ہیں اب مناسب مقدار میں آٹا لیکر اُس پر پانی کا ہلکا ہلکا چھینٹا دیتے ہوئے مسلتے رہتے ہیں جس سے آٹے کی باریک باریک سے دانے بنتے ہیں۔ اب ان دانوں کو الگ سے پکاتے ہیں اور پکنے پر خوبانی کے ساتھ ملا کر پیش کرتے ہیں۔ یہ فرنی سی بن جاتی ہے اور خاصی لذیذ ہوتی ہے۔

مَموژہ ڈوڈو:

حسب ضرورت دودھ ابالنے کے بعد اس میں کچی روٹی کے لمبے لمبے لچھے ڈالتے ہیں اور پکنے تک ہلاتے رہتے ہیں۔ پسند کے مطابق نمک یا چینی کے ساتھ کھاتے ہیں۔ زود ہضم اور نرم خوراک ہے۔

چھَپ ژہ ڈوڈو:

اس کی ترکیب بھی ہو بہو قُرت ژہ ڈوڈو جیسی ہے۔ ایک ذرا فرق یہ ہے کہ اس میں قُرت نہیں ڈالتے ہیں۔

برس ژہ ڈوڈو:

دودھ اور پانی برابر مقدار میں لیکر چولہے پر چڑھاتے ہیں اور حسب ضرورت صاف کیئے ہوئے چاول اس میں ڈالتے ہیں۔ چاول گل جائیں تو نمک ڈال کر کھاتے ہیں۔ اس کا شمار بھی پرہیزی کھانوں میں ہوتا ہے۔

غَشو نیسقُل ڈاوڈو:

پیاز کو گھی میں گہرا بادامی تلتے ہیں اور اس میں حسب ضرورت پانی ڈالتے ہیں۔ ابال آنے پر اس میں روٹی کے لچھے ڈالتے ہیں۔ یہاں اس سے کچی روٹی مراد ہے۔

نسکی ژہ ڈوڈو:

غَشُوژہ ڈوڈو میں "نسکی" تلسی خشک پتیاں مسل مسل کر ڈالتے ہیں تو یہ نسکی ژہ ڈوڈو کہلاتا ہے۔ نزلہ زکام سر درد اور اعصابی تکلیف کیلئے یہ ڈوڈو اکسیر کا درجہ رکھتا ہے۔

تمُو روژہ ڈوڈو:

اس ڈوڈو کی تیاری کا طریقہ وہی ہے جو اوپر بیان کیا گیا ہے۔ تاہم اس میں تلسی کی پتیوں کی جگہ افسنتین کی پتیاں ڈالی جاتی ہیں۔ یہ پودا پانچ ہزار فٹ سے زیادہ بلندی پر پایا جاتا ہے۔ چرواہے گرمیوں میں اسکے پودے جمع کرتے ہیں اور پتیاں خشک کر کے قہوہ یا ڈوڈو میں ڈالتے ہیں۔

جوعیات

رَقپینے ژمیک:

لسی کے پانی میں آٹا ڈال کر اور کافی دیر تک پکانے کے بعد جو ٹھوس شکل میں کھٹائی بچتی ہے اُسے رقپن کہا جاتا ہے۔ اُسے صابن کی ٹکیوں کی شکل میں ڈھال کر خشک کیا جاتا ہے۔ بہت ہی کھٹی چیز ہوتی ہے۔ ان ٹکیوں کو ضرورت کے وقت پانی میں حل کر کے مواد کو استعمال میں لاتے ہیں۔ عموماً مُل میں ڈال کر کھاتے ہیں۔ اشتہا انگیز چیز ہے۔

قروٗت:

دہی پنیر بنانے کے بعد جو پانی بچتا ہے اُسے ضائع نہیں کرتے بلکہ دیر تک پکانے کے بعد جو تلچھٹ بچتی ہے اُسے گول گول ٹکیوں کی شکل میں خشک کرتے ہیں۔ اُسے کھٹائی کے طور پر مُل اور ڈوڈو میں ڈالتے ہیں۔ اس سے مزہ دوچند ہو جاتا ہے۔

پھٹا سنگ:

زیادہ پکی ہوئی خوبانی لے کر انہیں کھلے پانی میں خوب دھوتے ہیں۔ بعد ازاں تنگ منہ والے برتن میں ڈالتے ہیں۔ جتنی خوبانیاں ہوں اُن سے کچھ زیادہ پانی ڈالتے ہیں اور برتن کا منہ کسی صاف کپڑے سے کس کر باندھتے ہیں۔ پندرہ بیس روز کے بعد سرکہ بن جاتا ہے۔ اسے مقامی زبان میں پھٹا سنگ کہتے ہیں۔ اسے بھی ڈاوڈو میں کھٹائی کے طور پر ڈالتے ہیں۔ بعض لوگ پھٹا سنگ میں نمک اور سرخ یا سبز مرچ ڈال کر روٹی کے ساتھ نوش کرتے ہیں۔

پَر پٹ:

قدیم زمانے میں شراب کشید کرنے کے بعد کچلے اور مسلے ہوئے انگور کے جوادانے بچتے تھے لوگ اُسے کھاتے تھے۔ کھٹ میٹھی چیز ہوتی تھی۔ اب اس کا رواج نہیں رہا۔

مشروبات

چائے:

بروشال میں چائے کا رواج انگریزوں کی آمد کے بعد شروع ہوا۔ اب یہ سب سے زیادہ پی جانے والی مشروب ہے۔ دَم والی چائے کم لوگ ہی پیتے ہیں۔ پتی زیادہ دیر تک ابالتے ہیں پھر دودھ شامل کر کے پیتے ہیں۔ سر درد ہو تو کالی مرچ اور خشک ادرک بھی ڈالتے ہیں۔ گھروں میں میٹھی چائے کا زیادہ چلن نہیں بلکہ نمکین چائے بہت پی جاتی ہے۔ بعض مقامات پر تو کھانے کی جگہ بھی لوگ چائے ہی پیتے ہیں۔ چائے کے ساتھ کماچدان میں پکائی ہوئی روٹی ''پھٹی'' کھائی جاتی ہے۔

بلنگہ چائے:

پانی میں عام چائے کی پتی ڈالنے کے بعد اُس میں دودھ کی جگہ اخروٹ کے مغز سے تیار کردہ سیال مواد ڈالتے ہیں۔ بالکل دودھ کی چائے کی طرح بنتی ہے۔

تُمورو چائے:

یہ ایک ہاضم مشروب ہے۔ تمورو جنگلی اجوائن کو کہتے ہیں۔ جنگلی اجوائن کی خشک پتیاں ابلتے ہوئے پانی میں ڈال کر پتیلی کا ڈھکنا بند کرتے ہیں۔ دس پندرہ منٹ بعد اجوائن کی خوشبو محسوس ہونے پر پیالیوں میں انڈیل کر پیتے ہیں۔ بہت عمدہ مشروب ہے۔

دِلتر:

بروشسکی میں لسی کو دِلتر کہتے ہیں۔ بروشال میں لسی پتلی ہوتی ہے۔ دہی میں پانی ملا کر مَشک یا ''سَغو'' (لسی تیار کرنے کا مخصوص چوبی برتن) میں دیر تک بلوتے رہتے ہیں۔ یوں مکھن حاصل کرنے کے بعد بچا ہوا پانی پیتے ہیں۔ روٹی کے ٹکڑے کر کے کسی گہرے برتن میں ڈالتے ہیں اوپر سے دلتر ڈال کر نوش کرتے ہیں۔

بَستمود:

سگھڑ مائیں بہنیں پکے ہوئے سیبوں کو خوب دھو کر اُن کا چھلکا اتارے بغیر مناسب ٹکڑوں میں کاٹتی ہیں اور کسی صاف چادر پر بچھا کر دھوپ میں سکھاتی ہیں۔ کڑک سوکھنے پر انہیں پسواتی ہیں یا کوٹ چھان کر سفوف تیار کرتی ہیں۔ گرمیوں میں ٹھنڈے پانی کے گلاس میں ایک بڑا چمچ ڈال کر نوش کیا جاتا ہے۔ بہت مقوی شربت ہے۔

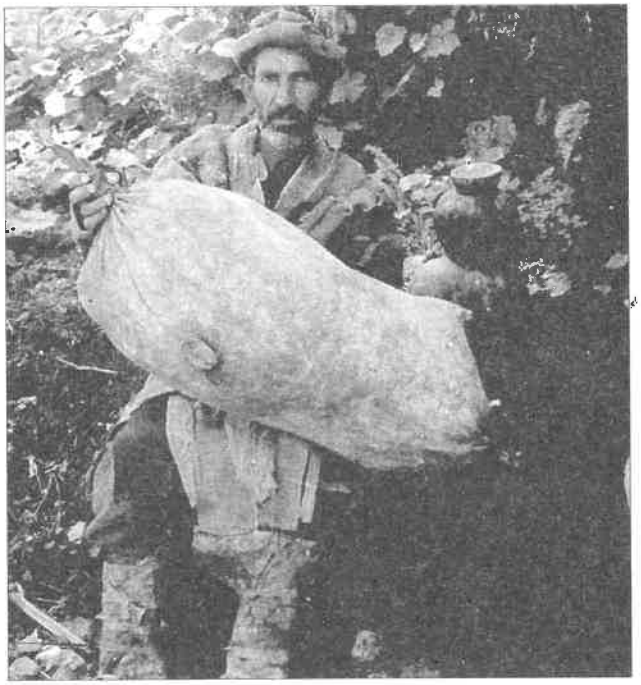
چھموس:

عمدہ، بے داغ، بے کرم اور خشک خوبانیوں کو تین چار مرتبہ کھلے پانی میں دھوتے ہیں پھر مطلوبہ مقدار کے مطابق پانی میں خشک خوبانیاں ڈال کر ہاتھوں سے رگڑ رگڑ کر جوس نکالتے ہیں جب آخری خوبانی بھی گھل جائے تو سمجھئے مشروب تیار ہے۔ ٹھنڈا کر کے روٹی کے ساتھ یا یونہی پیتے ہیں۔ زیادہ پینے سے ریاح کی شکایت ہوتی ہے۔

متفرقات اکل ونوش وآداب دسترخوان

بروشال میں سو فیصد مسلمان آباد ہیں اس لئے حلال وحرام کے حوالے سے اسلامی تعلیمات پر سختی سے عمل کیا جاتا ہے۔ کھانے پینے کو ''شیاس فیاس'' روٹی کو ''شپیک'' ''نانی مان'' اور ''اَونس'' بھی کہتے ہیں۔ خوراک یا طعام کیلئے ''شس'' اور سبزیات کیلئے ''ہوئی چہ'' کہا جاتا ہے۔ کھانا پکانے کو ''دہ خِ رَس و یقولائس'' کہتے ہیں۔

کھانا عموماً تین وقت کھایا جاتا ہے۔ ناشتے کو ''چوردیمو چائے'' دوپہر کے کھانے کو ''دوغُو یموشپیک'' اور رات کے کھانے کو ''ساسٹے موپیک'' کہتے ہیں آج کل صبح دس بجے اور شام چار بجے بھی چائے پینے کا سلسلہ شروع ہو گیا ہے۔ بعض گھرانے رات کے کھانے کے بعد چائے پیتے ہیں جسے ''گری ژہ چائے'' کہا جاتا ہے۔



مشک میں لسی بنانے کا روایتی طریقہ

علاقہ چونکہ سخت سرد ہے اس لئے موسم سرما میں گوشت اور گھی کی طلب زیادہ ہوتی ہے۔ کچھ عرصہ پہلے تک علاقے میں پیشہ ور قصاب یا قصاب خانے نہیں ہوتے تھے اس لئے سردیوں کے دوران لوگ خود ہی اہتمام کرتے تھے۔ ہر سال دسمبر کی اکیس تاریخ کو لوگ اپنی مالی حیثیت کے مطابق جانور ذبح کرتے ہیں۔ یاک گائے، بیل، بھیڑ، بکری، غرض ہر طرح کے جانور ذبح کیئے جاتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ ۲۱ دسمبر کو ذبح کئے جانے والے جانوروں کا گوشت آنے والے ۲۱ دسمبر تک خراب نہیں ہوتا۔ یہ گوشت جتنا زیادہ پرانا ہو اتنا ہی پسند کیا جاتا ہے۔ اسے ''یوشایا شووے چھپ'' کہا جاتا ہے۔ خاص مہمانوں کیلئے پکایا جاتا ہے۔ یہ رسم آج بھی جاری ہے اور جانوروں کا پرانا گوشت بہت پسند کیا جاتا ہے۔

دسترخوان بچھنے سے پہلے سلفچی اور لوٹا گردش میں آتے ہیں اور ہاتھ دھلائے جاتے ہیں۔ خواتین اور مرد الگ الگ نشست رکھتے ہیں۔ اس کے بعد دسترخوان بچھاتے ہیں۔ کھانا شروع کرنے سے پہلے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ضرور پڑھتے ہیں۔ کھانے کا آغاز بزرگ کرتا ہے۔ کھانا کھانے کے بعد دوبارہ ہاتھ دھلائے جاتے ہیں۔

عوامی پیشے اور دستکاریاں

علاقے میں زمانہ قدیم سے چند پیشے رائج ہیں جو اپنی افادیت کے باعث اب تک اپنے وجود کا احساس دلا رہے ہیں۔ سماجی حوالے سے ایک درجہ بند معاشرہ ہونے کی وجہ سے پیشے افراد کی حیثیت کا تعین کرتے ہیں۔ بعض قدیم پیشے حسب ذیل ہیں۔

نجاری: (ہونے درو) (بڑھئی)

نجار کو بروشسکی میں چکا لو کہتے ہیں۔ یہ پیشہ کسی خاص نسل سے منسوب نہیں۔ کسی بھی قوم کا آدمی یہ کام اختیار کرتا ہے۔ نجاری کے اوزار بہت دیر سے بروشال میں متعارف ہوئے۔ ڈوگروں اور انگریزوں کی آمد کے ساتھ ساتھ حسب ضرورت نجاری کے نت نئے اوزار ان علاقوں میں پہنچتے رہے۔ آرا، تیشہ، ہتھوڑی، رندا وغیرہ اس پیشہ کے بنیادی اوزار شمار ہوتے ہیں۔ لیکن یہ بھی ہر کسی کی دسترس میں نہیں تھے۔ زیادہ سے زیادہ تیشہ اور کہلاڑی سے کام چلاتے تھے۔ وخان، بدخشان اور کاشغر سے بھی گاہے بگاہے اوزار درآمد کئے جاتے تھے۔

۱۹۲۳ء کے بعد بروشال میں لکڑی کا عمدہ کام دیکھنے میں آیا کیونکہ اسی عشرے میں ہنزہ میں جماعت خانے (اسماعیلی عبادت خانے) تعمیر ہونے شروع ہوئے جو جدید طرز پر تعمیر کئے گئے۔ مقامی افراد نے لکڑی کا نفیس کام سیکھا۔ ایک روایت کے مطابق ہنزہ میں لکڑی کا ڈھنگ کا کام سکھانے والا چھنکن لسکر تھا جو بلتستان کا باشندہ تھا۔ اس شخص نے قلعہ التت میں لکڑی کا کام کیا۔ یہ شخص شگر کے راجہ ابدال خان کی دختر شہ خاتون کے ساتھ ہنزہ آیا تھا۔ شہ خاتون سکردو کے راجہ ابدال خان کی بیٹی تھی جو ہنزہ کے چوتھے راجہ میر ایاشو ثانی سے بیاہی گئی تھی۔ قلعہ تعمیر ہوا تو میر ایاشو ثانی نے ایک دن چھنکن لسکر سے دریافت کیا کہ قلعہ کے دروازے کا چوکٹھا الٹا لگا ہے اس میں کیا مصلحت پوشیدہ ہے؟ چھنکن لسکر نے ترت جواب دیا، ''تمہاری قسمت خراب ہے یا میری اب کیا ہوسکتا ہے''

یہ تلخ جملہ سن کر میر ایاشو نے چھنکن لسکر کو قتل کروا دیا۔ چھنکن لسکر ملکہ شاہ خاتون کا منہ بولا باپ تھا۔ التت اور بلتت کے قلعے بلتی و تبتی طرز تعمیر سے قریبی مشابہت رکھتے ہیں اور آج بھی آن بان کے ساتھ ایستادہ ہیں۔

اُستاد سیراتو، استاد عَریو، استاد نیاتو اور استاد میون کا شمار کاریگروں میں ہوتا ہے۔

سازندے:

سازندے اور لوہار ''ہیر بچو'' کہلاتے ہیں۔ لوہار گھریلو استعمال کی اشیاء از قسم آتش گیر، چھومرے مُوچشک (روٹی پلٹنے کا آلہ) مشی (پایہ دار چولہا) آتش بِل، ڈوری (ڈوئی) بناتے ہیں۔ بعض مشاق قسم کے لوہار چھوٹے موٹے ہتھیار، چھرا اور تلوار بھی بناتے تھے۔ توپ سازی کیلئے میر آف ہنزہ نے بدخشان سے کاریگر منگوائے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کام میں مقامی کاریگر مہارت



ہنزہ کا دستکار روایتی پٹو کا دھاگہ بنتے ہوئے

سے عاری تھے۔ آج اس طرح کی چیزیں استعمال میں ہیں نہ اُن کی طلب ہے۔

سازندوں کی ضرورت ہر دور میں محسوس کی گئی ہے۔ لہذا یہ طبقہ آج بھی اپنے پیشے سے منسلک ہے۔ شادی بیاہ اور کھیل تماشے کے موقعوں پر ان کو مدعو کیا جاتا ہے۔ یہ عموماً تین قسم کے ساز ڈڈک (دُھل) ڈامل (ڈوام طبلے) اور سرنائی (شہنائی) ستعمال کرتے ہیں۔ بالائی ہنزہ میں دف کا استعمال بھی ہے۔ ریاستی دور میں بیٹر بچو لئے دیئے رہتے تھے۔ یہ آپس میں ہی رشتے کرتے ہیں۔ بروشوان سے شادی بیاہ نہیں کرتے۔ اب ان میں سے کئی ایک سرکاری ملازمت بھی کرنے لگے ہیں اور اچھے عہدوں پر بھی فائز ہیں۔



چرواہا اپنے مال مویشی لے جارہا ہے

شبانی (چرواہے):

علاقے میں کچھ مدت پہلے تک معیشت کے دو ہی قابل ذکر ذرائع تھے۔ ایک زراعت اور دیگر چوپانی۔ نوجوانوں کی اکثریت شبانی سے منسلک ہوتی تھی۔ نوجوان اپنے اپنے گاؤں کی بھیڑ بکریاں لے کر اپریل کے وسط میں چراگاہوں کا رخ کرتے اور ستمبر کے اواخر میں گاؤں آتے تھے۔ چراگاہوں میں قیام کے دوران گھی اور پنیر تیار کرتے اور آتے ہوئے یہ اشیاء لیکر گاؤں آتے تھے۔ جانور بھی تازہ گھاس کھا کر صحت مند ہوتے تھے۔

اس وقت بھی بہت سے ناخواندہ نوجوان شبانی سے منسلک ہیں۔ کیونکہ یہ بڑا منافع بخش اور بابرکت پیشہ ہے۔ کوئی لڑکا نوجوانی کے دور میں قدم رکھے تو بروشسکی زبان میں کہتے ہیں "ماشااللہ گوئی ہوئیلتر ژی یَر دَ تقلیتمی"

ترجمہ: ماشااللہ تمہارا بیٹا شبانی کے قابل ہوگیا۔

آسیابانی (آبی چکی):

علاقہ بھر میں ضرورت کے مطابق پن چکیاں تعمیر کی جاتی ہیں۔ یہ اس جگہ تعمیر کی جاتی ہیں جہاں پانی اونچائی سے گرتا ہو۔ قدیم دور میں یہ بڑی توانا اور مفید صنعت سمجھی جاتی تھی۔ پن چکیوں کو مقامی زبان میں یانک کہا جاتا ہے اور اس پیشے سے منسلک شخص یانک گوئن۔ جو لوگ پسائی کیلئے کسی کی چکی میں غلہ لے جاتے تھے پسائی کے بعد ایک مقررہ مقدار میں آٹا دیتے تھے۔ ہچوق فلو (دس سیر غلہ) پر آدھ سیر آٹا اور ولتی چوق (ایک من) پر تقریباً ڈیڑھ سے دو سیر آٹا دینا پڑتا ہے۔ پانی کی کمی نہ ہو اور چکی دن بھر چلتی رہے تو دو من غلہ پیستی ہے۔

زیور سازی:

بروشال میں زرگری کا پیشہ بھی قدیم زمانے سے چلا آرہا ہے۔ ہنزہ میں زیادہ تر چاندی کے زیور تیار کیئے جاتے ہیں۔ اس پیشے سے منسلک افراد اب نہیں رہے کیونکہ گلگت اور ملک کے بڑے شہروں سے زیور خریدے جاتے ہیں۔

ٹوکرا سازی:

یہ علاقے کی قدیم دستکاری ہے۔ کارخانوں میں تیار برتن جب نایاب تھے تو مقامی طور پر کئی چیزیں تیار کی جاتی تھیں۔ ان دنوں ٹوکروں کی بڑی مانگ تھی۔ کھیت کھلیان کی معروفیات میں قدم قدم پر ان کی ضرورت پیش آتی ہے لہذا ٹوکرا سازی بھی ایک اہم گھریلو صنعت بن گئی تھی۔ مختلف نوعیت اور ساخت کے ٹوکرے ٹوکریاں ایک مخصوص قسم کے بید کے درخت (ششک) کی لچکیلی شاخوں سے بنائے جاتے تھے۔

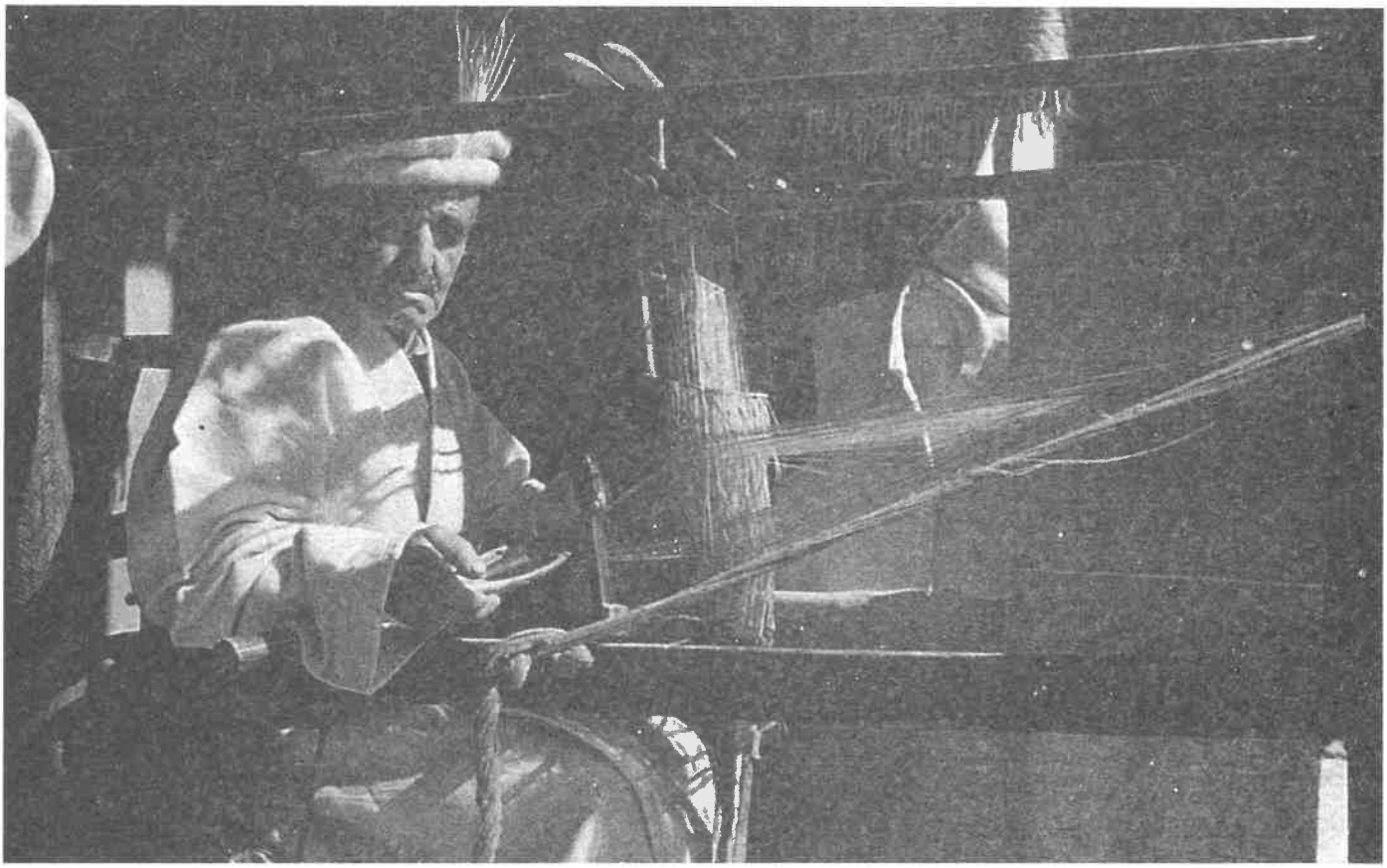
ٹوکریوں کی اقسام:

چُورا:

یہ گول پیندے کا خاصا بڑا ٹوکرا ہوتا ہے۔ بھوسا اور چارا وغیرہ لانے لے جانے کے کام آتا ہے۔

چُورا گرَن:

یہ چُورا سے قدرے چھوٹا اور پچکا ہوا ہوتا ہے۔ یہ بھی بھوسا یا گھاس پھوس ڈھونے کے کام آتا ہے۔



ہنزہ کا دستکار کھڈی پر روایتی پٹی بن رہا ہے

کھور:

یہ تنگ منہ کی مٹکہ نما ٹوکری ہوتی ہے۔ خشک خوبانی رکھنے کے کام آتی ہے۔ اس کا دستہ نہیں ہوتا۔

کھریٹ:

یہ عام دستہ کے ساتھ ٹوکری ہوتی ہے۔ تازہ میوہ رکھنے کے کام آتی ہے۔

شق:

یہ چارفٹ قطر کا گول چھابہ ہوتا ہے اس پر خوبانی سکھاتے ہیں۔

شپیکے شق:

یہ روٹیاں رکھنے کی چنگیر ہوتی ہے۔

پٹی بافی (گشِش کوئین):

پٹی بافی بروشال کی قدیم صنعت ہے پٹی کو مقامی زبان میں پھل کہتے ہیں جو مختلف معیار کا تیار کیا جاتا ہے۔

اونٹ کا اون سب سے قیمتی ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ بھیڑ کے اون سے بھی پٹی تیار کی جاتی ہے۔ بکری اور یاک کے بالوں سے شرما تیار کرتے ہیں۔ یہ بکری کے کھردرے بالوں سے تیار کردہ بچھونا ہوتا ہے۔ اب اس کی اتنی مانگ نہیں رہی مقامی صنعت کے طور پر اس فن کو زندہ رکھنے کیلئے ایک مقامی غیر حکومتی ادارہ ''قراقرم ایریا ڈویلپمنٹ آرگنائزیشن'' مصروف عمل ہے۔

جفت ساز (ہوچواوتاشو):

یہ فن بھی کبھی کا دم توڑ چکا ہے۔ آج سے تیس چالیس برس پہلے تک بروشال میں مرد وزن خال خال ہی ہوچو (خانہ ساز جوتے) پہنتے تھے۔ اب اس کا قطعاً رواج نہیں رہا۔ کوئی مخصوص طبقہ یا نسلی گروہ اس پیشے سے وابستہ نہیں تھا۔ مختلف گھرانوں کے لوگ من مرضی سے یہ کام کرتے تھے۔ بہ الفاظ دیگر اس کام کو معیوب نہیں سمجھتے تھے۔

مارخور کے چرم سینے ہوئے ہوچو سب سے معیاری سمجھے جاتے تھے جنہیں ''گری یے ہوچو'' کہا جاتا ہے۔ یہ جوتے ساخت یا بناوٹ میں لانگ بوٹ کی طرح ہوتے ہیں۔ فرق یہ ہے کہ تلوا اور اوپری حصہ دونوں نرم چمڑے کے ہوتے ہیں اور تسمے بھی نہیں ہوتے۔ ہوچو تیار کرنے سے پہلے چمڑے کو رنگتے بھی تھے۔ رنگ حاصل کرنے کیلئے بید، اخروٹ یا خوبانی کے درخت کے چھلکوں کو دیر تک ابالتے ہیں۔ اس سے گہرا ارغوانی رنگ کا پانی تیار ہوتا ہے۔ بس اسی پانی میں

چمڑے کو دیر تک رکھتے ہیں۔ اس سے چمڑے کا رنگ نکھر آتا ہے۔

ژُک چُروک اتیاس:

علاقے میں سلائی کڑھائی کا فن اتنا ہی قدیم ہے جتنا کہ خود علاقہ۔ بروشو اشرافیہ کی خواتین سلائی کڑھائی کے ذریعے وقت گزارتی تھیں۔ بعد میں یہ شغل عام خواتین کی ضرورت بن گیا۔ شاہراہ قراقرم کی تعمیر کے بعد گھریلو سطح پر تیار ہونے والی دستکاری کی چیزیں گلگت بازار میں اچھے داموں بکنے لگیں۔ اراغی، مشکلان، زردوزی اور قلمی یہاں کی سلائی کڑھائی کے مختلف نمونے ہیں جو زنانہ ٹوپیوں، بیڈشیٹس، چوغوں اور گھوڑے کے پالان پر نظر آتے ہیں۔ یہ فن اب بہت ترقی کر رہا ہے۔

برتن سازی:

بروشال ماضی میں ایک دُور افتادہ، پسماندہ اور زمین بند علاقہ تھا۔ رسل ورسائل کی سہولتیں نہ ہونے کے برابر تھیں لوگ مقامی وسائل پر ہی انحصار کرتے تھے۔ دھات یا پلاسٹک کے برتن بہت مشکل سے دستیاب ہوتے تھے۔ ایک زمانہ تھا جب خشک کدو برتن کے طور پر استعمال ہوتے تھے۔ پھر سنگ خارا سے برتن تیار ہونے لگے۔ لکڑی کے خرادی برتن سب سے زیادہ استعمال میں رہے ہیں۔

سنگی برتن:

بلوش:

یہ مٹی کی ہانڈی کی شکل کا بناتے تھے۔ چھوٹا بلوش سالن پکانے اور بڑا بلوش شراب ذخیرہ کرنے کے کام آتا تھا۔

چدِن:

یہ کڑاہی یا بغیر دستے کے فرائنگ پین کی شکل کی ہانڈی ہوتی تھی۔ اس میں روغنی روٹیاں (شِسر) تلتے تھے۔

گورُکون:

یہ فرائینگ پین کی شکل کا ہوتا ہے اور روٹیاں تلنے کے کام آتا ہے۔

چرِق:

چراغ کو مقامی بولی میں چرِق کہتے ہیں سنگ خارا کا ہی بناتے تھے۔ سہ گوشہ ہوتا ہے۔ اس میں گری کا تیل ڈالتے تھے اور کپاس کا فلیتہ ڈبو کر روشن کرتے تھے۔

سَل:

پتھر کے چوکور سِل کو بروشسکی زبان میں سَل کہتے ہیں اس پر خواتین مغزیات پیس کر تیل نکالتی تھیں۔

تنوس:

ہاؤن کو تنوس کہا جاتا ہے۔ کسی بڑے پتھر میں سوراخ کر کے بھی بناتے ہیں یا الگ سے بھی تیار کرتے ہیں۔

چوبی برتن

گُڈُر:

یہ سب سے بڑا چوبی برتن ہوتا ہے جو چھموس تیار کرنے، ملیدہ بنانے اور شادی بیاہ کے موقعوں پر مشترکہ طور پر کھانا پیش کرنے کیلئے استعمال ہوتا ہے۔

پھتہ:

یہ قدرے گہری رکابی ہوتی تھی جس میں افراد خانہ مل کر کھانا کھاتے تھے۔

فُل:

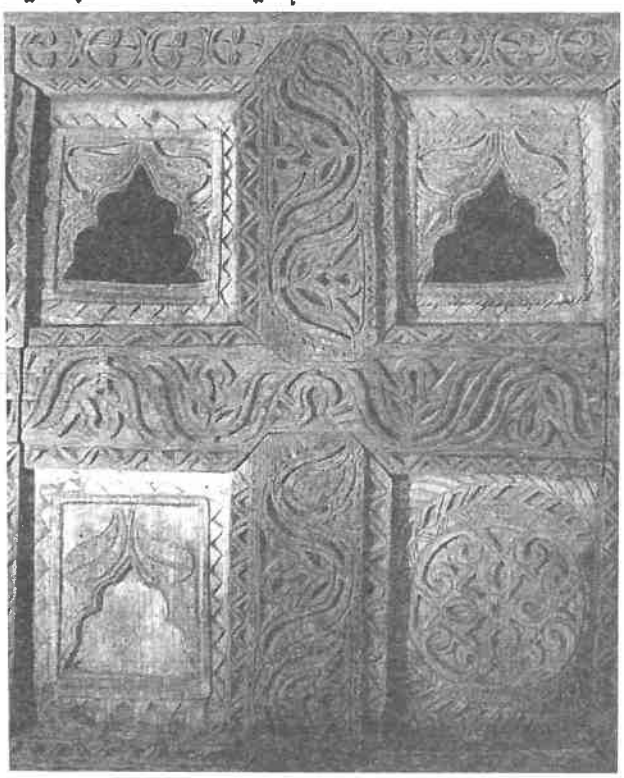
یہ کٹورے کی شکل کا برتن ہوتا تھا جس میں چھوٹے بچے کھانا کھاتے تھے۔

کھپون:

چمچہ کو کھپون کہتے ہیں یہ بھی لکڑی کے بنائے جاتے ہیں اور آج بھی آرائشی اشیاء کے طور پر بناتے ہیں۔

گِلت:

لکڑی کی ڈوئی "گِلت" کہلاتی ہے۔ یہ بڑے سائز میں بنائے جاتے ہیں۔



لکڑی کے کام کا ایک خوبصورت نمونہ

تھنس:

گئے دنوں میں عام گزرگاہوں پر مسقف کنویں ازراہ ثواب تعمیر کئے جاتے تھے اور کنویں کی چھت پر تھنس رکھتے تھے تاکہ آنے جانے والے مسافر پانی پی سکیں۔ تھنس پانی پینے کا چوبی برتن ہوتا ہے۔

رسم ورواج

گرمینس (شادی بیاہ):

وکٹورین مستشرقین نے انیسویں صدی کے اواسط کے بعد جب بروشال ہنزہ نگر اور یاسین میں قدم رکھا تو وہ یہاں کی رسومات دیکھ کر دنگ رہ گئے۔ انہوں نے اس خطے کو بشریات کے ماہرین کیلئے ایک دلچسپ میدان قرار دیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ یہ علاقے ماضی قریب تک باقی دنیا سے قدرے الگ تھلگ ہی رہے اور مقامی رسم ورواج میں بہت کم تبدیلی آئی۔ تاہم شاہراہ قراقرم کی تعمیر کے بعد یہاں بیرونی عناصر کا عمل دخل تیزی سے بڑھ گیا۔

بروشو علاقوں کے مابین رسوم ورواج میں بڑا تنوع پایا ہے۔ اس کی ایک وجہ تو ہنزہ نگر میں دو مختلف مکاتب فکر کا ہونا ہے اور پھر ان دونوں علاقوں سے بروشال یاسین کی جغرافیائی دوری ہے۔ پھر بھی تینوں بروشو علاقوں میں بہت سی باتیں مشترک بھی ہیں۔ البتہ عصر حاضر میں قدیم رسومات کا قریب قریب خاتمہ ہو چکا ہے۔

ماضی میں بروشال ہنزہ میں یک جدی قبائل کے مابین شادیاں نہیں ہوتی تھیں۔ بروشو تحریمات کی رُو سے ایسی آپسی شادیوں سے غیرت اور قبائلی یک جہتی کا خاتمہ ہو سکتا تھا کیونکہ شادی کے بعد جوڑے میں ناچاقی یا طلاق کی صورت میں ایک ہی قبیلے کے دو گھرانوں میں دشمنی پیدا ہو سکتی تھی۔ لیکن ہنزہ کے قبیلہ دوامیتنگ اور قبیلہ خروکوز میں یہ پابندی نہیں تھی۔ یہ قبائل اس پابندی سے اس لئے مستثنیٰ تھے کہ ہمسایہ علاقوں سے وقتاً فوقتاً آمدہ آبادکار بھی اُن قبائل کا حصہ بن گئے تھے۔ ایسے آبادکار خاندان خراٹومیشو کہلاتے ہیں۔ پھر انیسویں صدی کے آغاز میں ایک اسماعیلی مبلغ پیر ابوالمعانی ہنزہ وارد ہوئے اور انہوں نے اس سماجی پابندی ''تابو'' کا خاتمہ کیا۔

ہنزہ نگر اور یاسین کے حکمران خاندان اپنی بیٹیاں بروشو گھرانوں میں نہیں بیاہتے تھے لیکن خود عام گھرانوں کی لڑکیوں سے شادیاں کرتے رہے ہیں۔ اسی شادیوں سے جو بچے پیدا ہوں انہیں ''ارغون'' کہا جاتا ہے۔ بروشال نگر میں سادات اور راجگان میں رشتے استوار کرنے کا عام چلن رہا ہے۔ گلگت بلتستان اور بروشال میں بہت سے حکمران خاندان تھے جو آپس میں شادی بیاہ کرتے تھے۔ میران ہنزہ نے چترال، بدخشان بلتستان اور سریقول کے حکمران خاندانوں میں رشتے کئے۔ بروشال میں ڈوم طائفہ سب سے کم تر شمار ہوتا ہے لہذا بروشو لوگ ''بریچو'' ڈوم برادری میں شادی نہیں کرتے ہیں۔ راجگان کی بیٹیوں کشو کا رشتہ راجگان کے ہاں ہی طے پاتا ہے۔ اس طرح وزیر طبقہ بھی اپنی بچیاں عام گھرانوں کو نہیں دیتے تھے۔ ایک آدھ عام گھرانوں نے رشتہ مانگا بھی تو اُن کا ٹھٹھہ اڑایا۔ بروشال نگر میں سادات اور راجگان میں رشتہ تو ہو سکتا ہے لیکن سادات لڑکیاں غیر سادات گھرانوں میں بہت کم ہی بیاہی جاتی ہیں۔ اب تعلیم عام ہوتے ہی یہ بے جا اور فضول پابندیاں بھی ختم ہو رہی ہیں۔ بس دیکھا یہ جاتا ہے کہ لڑکا باروزگار اور شکل صورت سے معقول ہو۔

آزادی یعنی ۱۹۴۷ء سے پہلے ملازمتوں اور روزگار کے مواقع نہیں تھے۔ معدود چند خواندہ افراد کو ہی سرکاری ملازمتیں نصیب ہوتی تھیں۔ مشہور ہے کہ ڈھنگ کے رشتے گلگت سکاؤٹس کے جوانوں، ڈرائیوروں، منشیوں اور اساتذہ کو ملتے تھے۔ وقت کے ساتھ ساتھ معیار بھی بلند ہوا۔ اب چیدہ رشتے فوجی افسران، این جی اوز سے وابستہ نوجوانوں، ڈاکٹر اور انجینئر حضرات کو ترجیح دی جاتی ہے۔

قدیم ایام میں انتہائی کم عمری میں شادی کرنے کا رواج تھا۔ لڑکی نو برس کی اور لڑکا پندرہ برس کا ہو تو شادی کیا کرتے تھے۔ اُن دنوں ہر گھرانے کی کوشش ہوتی تھی کہ وہ بلگوئین کثیر السیال خاندان کہلائے۔ ہوموئین قلیل السیال گھرانہ کمزور تصور ہوتا تھا۔ لڑکی والوں کی کوشش ہوتی تھی کہ اپنے گاؤں قریہ میں ہی رشتہ ہو۔ دور دراز علاقوں میں لڑکی بیاہنے کی صورت میں اسکی خیر خیریت دریافت نہیں کر سکتے تھے۔ لیکن وہ جو کہتے ہیں رشتے آسمانوں میں ہی طے پاتے ہیں ہنزہ نگر اور یاسین کی لڑکیاں چترال، استوار اور گلگت تک بیاہی گئیں۔

فاتر العقل اور جسمانی لحاظ سے ناکارہ افراد کی شادی سے اجتناب کیا جاتا ہے پھر بھی زور زبردستی سے ایک آدھ رشتے ہو ہی جاتے ہیں ہنزہ کے اسماعیلی گھرانے غیر مذاہب میں بہت کم ہی رشتے کرتے ہیں۔ بروشال یاسین میں یہ صورت نہیں ہے۔ ان علاقوں میں فی الحال کورٹ میرج کا بھی کوئی تصور نہیں۔ والدین ہی عموماً اپنے بچوں کا رشتہ طے کرتے ہیں۔ لڑکے لڑکیاں خال خال اپنے جیون ساتھی کا انتخاب خود بھی کرتے ہیں۔

والدین جب اپنے بیٹے کیلئے رشتہ تلاش کرتے ہیں تو اُن کی کوشش ہوتی ہے کہ انہیں لڑکی ملے جو امور خانہ داری میں یکتا ہو۔ خرک چُرک، سلائی کڑھائی کا ہنر بھی جانتی ہو، خواندہ ہو اور غریش کیس باتونی نہ ہو۔

بروشال میں لڑکی کی خوبصورتی کا معیار کچھ یوں ہے۔

- بازے مُولچوموز یعنی باز کی سی آنکھیں۔
- جرپامُوڈیم۔سروقامت ہو(جرپا ایک مقامی درخت ہے)
- مہ مُووے؟ دودھیا رنگت ہو۔

لڑکے کی خوبصورتی کا پہلا اور نمایاں معیار دراز قامت اور گندم گوں رنگت ہے۔زیادہ فربہ یا بہت لاغر نوجوان پسند نہیں کیئے جاتے۔موٹے شخص کو ڈُڈُنگ یعنی ڈھول سے اور کمزور کو شکل یعنی زنجیر سے تشبیہ دیتے ہیں۔

مخصوص رسوم:

ڈی ڈرنگ مناس، نیونگ ان برنیاس، اور دسی نن مُر بنیاس جیسی اصطلاحات موزوں رشتہ یا لڑکی تلاش کرنے کیلئے مستعمل ہیں۔لڑکے کی ماں، بہنیں یا قریبی رشتہ دار خواتین چپکے چپکے لڑکی تلاش کرتی ہیں۔کوشش ہوتی ہے کہ برابر کا کوئی رشتہ ملے۔اسے موقعہ پر ہرانگوس پیغام رساں بھی اپنے طور پر لڑکی کا چال چلن، عادات واطوار، ہنرمندی، تعلیم یا کسی کام میں مہارت کے بارے میں سُن گُن لیتا ہے۔مشاہدے کی بات ہے کہ بعض عادی بدخواہ افراد رشتے بگاڑنے کے درپے ہوتے ہیں۔ایسے لوگ پَر کا کوا بناتے ہیں۔ایسے موقعوں پر پیغام رساں کا کردار اہمیت کا حامل ہوتا ہے۔وہ طرفین کے شکوک وشبہات دور کرتا ہے اور بدخواہوں کی باتوں پر کان نہ دھرنے کی تلقین کرتا ہے۔پیغام رساں کا نام شادی طے پانے تک خفیہ رکھا جاتا ہے تاہم اُس کی مخصوص سرگرمیوں کی وجہ سے یہ شخص پہچانا جاتا ہے۔

کافی چھان پھٹک کے بعد جب لڑکی پسند کی جاتی ہے اور لڑکی کو اپنے منگیتر کا پتہ چل جائے تو اس کا سامنا نہیں کرتی۔منگیتر قریبی رشتہ دار ہو، ساتھ پلا بڑھا ہو یا ایک ہی قریہ محلّہ کا رہائشی ہو تو چوری چھپے بات چیت ہو ہی جاتی ہے۔

مُوسلگِنَس (منگنی):

منگنی سے پہلے پیغام رساں لڑکی کے کسی دور پار کے رشتہ دار سے پتہ کرتا ہے کہ کہیں اور نسبت تو طے نہیں ہوئی۔ایسا نہ ہونے کی صورت میں بات مزید آگے چلائی جاتی ہے۔اس دوران پیغام رساں کو لڑکی والوں کے ہاں متعدد بار پھیرے لگانے پڑتے ہیں۔دراصل اس دوران لڑکی والے اپنی طرف سے اس رشتہ کے بارے میں پوری پوری تسلی کرتے ہیں۔آخر کار پیغام رساں کو بروم حتک یعنی خوان ابیض لانے کو کہا جاتا ہے۔یہ منگنی کے آغاز میں لڑکی والوں کو پیش کیئے جانے والے ایک روائتی خوان کا نام ہے۔بروم حتک پانچ پتیری روٹیوں ''خمہ لی چنگ'' کے اوپر دو سیر کے قریب دیسی گھی کا ایک بڑا ڈھیلا اور اس کے اوپر بھی اتنی ہی روٹیاں رکھ کر لڑکی والوں کی طرف لے جایا جاتا ہے۔پہلے زمانے میں بروم حتک کے ساتھ ایک جوڑا کپڑا بھی رکھتے تھے۔اب بوٹ، چپل، انٹرلاک، گھڑی، سونے کی انگوٹھی، سہراہار، لاکٹ، جھومر، پرفیوم، تولیہ، صابن، ٹوتھ پیسٹ، ٹوتھ برش، رومالی، نیل پالش اور آئینہ جیسی اشیاء کا بھی اضافہ ہو چکا ہے۔لڑکی کی تمام چیزیں ایک سوٹ کیس میں رکھ کر لے جاتے ہیں۔لڑکے والوں کی طرف سے کوئی بزرگ خاتون یا مرد کسی رکابی میں آٹا لیکر مہمانوں کے استقبال کیلئے بیرونی دروازے کے پاس کھڑے ہوتے ہیں۔مہمان جونہی دروازے کے پاس پہنچیں اُن کے شانوں پر آٹا چھڑکا جاتا ہے اور علیک سلیک کے بعد انتہائی احترام سے انہیں گھر کیاندر بٹھایا جاتا ہے۔اس موقع پر لڑکی والوں کی طرف سے کھانا ہوتا ہے۔کھانے سے فراغت کے بعد لڑکے والے سوٹ کیس کھولتے ہیں اور بروم ہنک دیکھتے ہیں۔سب سے پلے بروم ہنک کے تین نوالے لڑکی کو کھلاتے ہیں۔نوالے کھانے کے بعد لڑکی احتراماً تین بار خوان کو چھوکر بوسہ دیتی ہے۔پھر خوان ہٹایا جاتا ہے۔اس کے بعد ایک ایک کر کے کپڑوں کے جوڑے اور دیگر اشیاء لڑکی والوں کے سامنے رکھتے ہیں۔لڑکے والوں کی خواتین لڑکی کو کہار پہناتی ہیں۔اسی طرح کا ایک خوان ''بروم ہنک'' لڑکی والوں کی طرف سے لے جا کر لڑکے والوں کو بھی کھلاتے ہیں۔یوں یہ رسم پوری ہوتی ہے۔آج کل اس طرح کی ان تقریبات کی وڈیو فلم بھی تیار کی جاتی ہے۔

پھتہ ایتس (خوان کی تیاری):

اس تقریب میں بھی لڑکے والے لڑکی کیلئے تقریباً دس جوڑوں کیلئے مختلف کپڑے، جوتے، موزے، شال، دوپٹے، سویٹر، کوٹ اور گھڑی لیکر جاتے ہیں۔پرانے وقتوں میں محض چغن (ایک لمبا پیراہن) لیکر جاتے تھے۔کہیں کہیں آج بھی اس کا اہتمام کیا جاتا ہے۔اس موقع پر خوبانی کی گری کا تیل بھی لے جاتے ہیں جو لڑکی کے سر پر تھوڑا سا تھپکاتے ہیں۔ان تحائف کے علاوہ لڑکے والے ایک مخصوص میٹھی روٹی درم پھٹی اور گھی کا ڈھیلہ بھی لیکر جاتے ہیں جو وزن میں دو ڈھائی سیر کے قریب ہوتا ہے۔اب لڑکی والے مکھن کو دو برابر حصوں میں کاٹتے ہیں۔ایک حصہ الگ کر کے اپنے ہاں سے اتنی ہی مقدار میں مکھن رکھ کر لڑکے والوں کو دیتے ہیں۔اب لڑکی لڑکے والوں کی طرف سے ارسال کردہ مکھن سے تھوڑا سا چکھتی ہے۔اس تقریب کے ایک روز بعد آج کل مہندی کی رسم بھی مناتے ہیں۔تیسرے دن شادی کی مکمل تیاری ہوتی ہے تاہم طرفین پہلے ہی باراتیوں کی تعداد طے کرتے ہیں پھر باراتیوں کی مقررہ تعداد کے مطابق بیک رکابیوں کا اہتمام کیا جاتا ہے۔عموماً ایک بڑی رکابی میں چھ چھ باراتی ''شربت'' (گُھٹے ہوئے

گندم اور گھی سے تیار کردہ ایک طعام) کھاتے ہیں۔ شادی کیلئے عموماً ''شِمشِر'' ہفتہ کا دن مقرر کیا جاتا ہے۔ آج کل ''بروم ہنیک'' اور ''پھتہ ایتس'' تقاریب ایک ہی دن مناتے ہیں۔

شادی سے پہلے ہر دو فریقین کو اختیار حاصل ہے کہ خدانخواستہ کوئی غیر معمولی ناچاقی ہونے کی صورت میں منگنی منسوخ کریں۔ اگر لڑکے والوں کی طرف سے منسوخی کا فیصلہ ہو تو لڑکی والے ہر وہ چیز اپنے پاس رکھتے ہیں جو ''بروم ہنیک'' اور ''پھتہ ایتس'' تقاریب کے موقعہ پر انہیں ملتی ہیں۔ اگر لڑکی والے منسوخ کریں تو اُن پر لازم ہے کہ ہر چیز لوٹا دیں۔ اس میں وہ رقم تک شامل ہوتی ہے جو دعوت وغیرہ پر لڑکے والے خرچ کر چکے ہوتے ہیں۔

''مارا یسکرخس'' (مہر مقرر کرنا)

مہر کا تقرر بھی بعض اوقات ''پھتہ ایتس'' تقریب کے موقع پر ہوتا ہے۔ مہر لڑکی کی حیثیت کے مطابق مقرر کیا جاتا ہے۔ مثلاً لڑکی اگر لیڈی ڈاکٹر ہے تو اُس کا مہر ساٹھ سے اسی ہزار تک ہوسکتا ہے۔ محض گریجویٹ ہونے کی صورت میں پچیس سے تیس ہزار اور میٹرکولیٹ کی دس یا دس ہزار روپے سے کم بھی ہوسکتی ہے۔ اسماعیلی فرقے میں لڑکی کو آدھا مہر نکاح کے موقع پر ہی ادا کرنے کا رواج ہے۔ پوری رقم خدانخواستہ طلاق کی صورت میں ہی ادا کی جاتی ہے۔ مہر کی رقم بہت معمولی ہوا کرتی تھی۔ یہی کوئی پانچ یا دس روپے۔

گرے گٹوک (شادی بیاہ کا لباس):

شادی کے موقع پر دولہا ''بُرُوم کُری گُپلِگ'' سفید شلوار قمیض زیب تن کرتا ہے۔ موسم کے لحاظ سے ہلکے رنگ کا کوٹ بھی پہنا جاسکتا ہے۔ سیاہ رنگ سخت ناپسند کیا جاتا ہے۔ شدید سردیوں میں ''شے شوقہ'' لمبے آستینوں والا اونی چوغہ پہنا جاتا ہے۔ بعض لوگ شوقہ کی جگہ عبا نما لباس بھی زیب تن کرتے ہیں۔ سر پر زرتار پگڑی اور تاج کا رواج بھی ہو چلا ہے۔ عموماً سفید ٹوپی پہنتے ہیں اور ٹوپی پر ''گمبوری'' بگلے کے پر اور ''شاں ٹی'' مور کی کلغی ٹکاتے ہیں۔ دولہا بوقت روانگی گلے میں نوٹوں والے یا آرائشی ہار پہنے ہوئے ہوتا ہے۔ پاؤں میں سرخ رنگ کے بوٹ ہوتے ہیں۔ قدیم ایام میں دولہا اونی واسکٹ کے اوپر بندھے کمر بند میں بائیں جانب خنجر لٹکا کر چلتا تھا جسے ''قوشوم'' کہتے تھے۔

دلہن عموماً سرخ عروسی لباس میں ہوتی ہے جو شلوار قمیض پر مشتمل ہوتا ہے دوپٹہ بھی سُرخ ہوتا ہے جبکہ پرانے زمانے میں کوئی مخصوص رنگ طے نہیں تھا۔ اگر موسم سرد ہو تو کوٹ پہنتی ہیں۔ ہار چوڑیاں، مندری، سلسلہ اور گھڑی پہننے کا رواج بھی ہے۔ کہتے ہیں پہلے عورتیں پگڑی بھی پہنتی تھیں جسکے ساتھ گرے مخوق آرائشی پھندنا لٹکا ہوا ہوتا تھا۔

گرَ ے گُونشک (شادی کا مصروف ہفتہ)

شیعہ اخوند، سنی مولوی یا اسماعیلی خلیفہ فال گری کے ذریعے کوئی سعد دن شادی کیلئے مقرر کرتے ہیں۔ تاہم گزرے دنوں میں راجگان ہی دن کا تعین کرتے تھے۔ آج کل دلہا دلہن کے والدین اور عزیز و اقارب اپنی فرصت اور ضرورت کو پیش نظر رکھ کر شادی یا رخصتی کیلئے دن کا تعین کرتے ہیں۔ جہاں تک دیگر مصروفیات کا تعلق ہے وہ کسی بھی وقت طے پاسکتے ہیں۔ بروشو علاقوں میں شادیاں عموماً سردیوں میں رچاتے تھے کیونکہ ان ایام میں لوگ کھیتی باڑی اور کھیت کھلیان کی جھمیلوں سے یکسر فارغ ہوتے تھے۔ شادی کی سرگرمیاں ہفتہ عشرہ تک جاری رہتی ہیں۔ اس کا آغاز بدھ سے ہوتے ہوئے سوموار پر ختم ہوتا ہے۔ البتہ شادی ہفتہ کو ہوتی ہے۔

دَوُوشی یس (تو ارکھنا)

بدھ کی رات کو ماہر خواتین ''قستہ'' خستہ یا خمیری روٹیاں پکاتی ہیں جبکہ جمعرات کو ''خمہ لیچنگ'' پتیری روٹیاں تیار کی جاتی ہیں۔ جمعہ کو ہر دو خاندان اپنے ہاں اہل محلّہ اور عزیز و اقارب کو ضیافت پر مدعو کرتے ہیں۔ ماضی قریب تک اس دن کُٹی ہوئی گندم پانی، نمک اور دیسی گھی ملا کر ایک مخصوص پکوان ''شربت'' پکاتے تھے۔ شربت کا آٹا پن چکی میں موٹا موٹا پسوایا جاتا تھا۔ اب بھی دیہات میں کہیں کہیں شربت کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ نگر والے شربت پکانے میں بہت ماہر بھی ہیں اور گھی کے استعمال میں فراخدلی دکھاتے ہیں اور انکے شربت کا آٹا پن چکی میں موٹا موٹا پسوایا جاتا تھا۔ اب بھی دیہات میں کہیں کہیں شربت کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ نیم شہری قصبات میں گوشت کا سالن ہی پکایا جاتا ہے۔ ساتھ چاول (پلاؤ یا سادہ) اور روٹیاں پیش کی جاتی ہیں۔ اس روز سازندے بھی بلائے جاتے ہیں نوجوان ناچتے ہیں۔

ہفتہ کو دولہا والے اپنے عزیز و اقارب حتیٰ کہ لڑکی والوں کو بھی دوپہر کی ضیافت پر مدعو کرتے ہیں۔ عموماً لڑکی والے کم ہی آتے ہیں کیونکہ وہ بھی برابر مصروف ہوتے ہیں۔ اس موقع پر بھی گوشت پکایا جاتا ہے اور پتیری روٹیاں تیار کی جاتی ہیں۔ گوشت کیلئے گائے بیل اور بھیڑ بکریاں ذبح کی جاتی ہیں۔ اس روز بھی باجے گاجے کا بندوبست ہوتا ہے۔ دولہا جب سسرال جانے کیلئے برآمد ہوتا ہے تو ایک مخصوص دھن ''اشپیری'' بجائی جاتی ہے۔ اسماعیلی ہونے کی صورت میں دولہا، دولہن کے علاقے میں واقع جماعت خانہ جاتا ہے جبکہ شیعہ اور سنی ہونے کی صورت میں دولہن کے گھر پر ہی نکاح خوانی ہوتی ہے۔ شیعہ بھی خال خال مساجد میں نکاح

خوانی کی رسم پوری کرتے ہیں۔ دولہا کی گھر سے روانگی کا وقت دلہن کے گھر تک فاصلے پر منحصر ہے۔ دلہن کا گھر کافی فاصلے پر ہو تو اسی کے مطابق وقت طے کیا جاتا ہے۔ بالعموم سہ پہر تین بجے دولہا باراتیوں کے جلوس میں روانہ ہوتا ہے۔ باراتیوں کی تعداد ''پھتہ ایتس'' تقریب کے موقع پر ہی طے کی جاتی ہے۔ باراتیوں میں دولہا اور نکاح خواں شمار نہیں ہوتے۔ باراتیوں کا شمار عموماً ہنیک بڑی رکابیوں کے حوالے سے کیا جاتا ہے۔ مثلاً ایک رکابی کے گرد چھ آدمی بیٹھتے اور کھاتے ہیں۔ یوں ''التہ ہنیکوز'' یعنی دو رکابیاں کہیں گے تو اس سے مراد بارہ آدمی ہونگے۔

دلہن اسماعیلی ہو تو وہ بھی عزیز و اقارب کے ساتھ جماعت خانہ جاتی ہے جہاں نکاح خوانی ہوتی ہے۔ بوقت نکاح دلہا دلہن الگ الگ بیٹھتے ہیں۔ دونوں کے اپنے اپنے وکیل ہوتے ہیں۔ یہ ضروری نہیں کہ تمام لوگ جماعت خانہ جائیں تاہم کھانے پر ہر کوئی موجود ہوتا ہے۔ نکاح خوانی کے بعد باراتی دلہن کے گھر جاتے ہیں جہاں ضیافت کا اہتمام ہوتا ہے۔ جیسا کہ پہلے ذکر کیا گیا ہے قدیم ایام میں شربت اور سپرا باراتیوں کے سامنے رکھا جاتا ہے۔ کھانے سے فراغت کے بعد دولہا اور باراتی اپنے گھر روانہ ہوتے ہیں۔ ساتھ ہی دلہن کی رخصتی بھی عمل میں آتی ہے۔ دلہن اسکی ماں اور بہنیں ایک دوسرے سے لپٹ کر روتی ہیں۔ قدیم الایام میں اس موقع پر ''اجولی گیت'' اور دھن بجائی جاتی تھی۔ دلہن کی باراتیوں میں اُس کا کوئی بھائی، ماموں، پھوپھی یا چچی رات دلہن کے گھر گزارتے ہیں۔

رنگ دِیوسس (جانور کا خون بہانا):

دلہا کے باراتی جب دلہن کے گھر کے نزدیک پہنچتے ہیں تو دہلیز کے پاس کسی بھیڑ یا بکری کو ذبح کیا جاتا ہے۔ اس رسم کے بعد ہی باراتی اندر جاسکتے ہیں۔

دغوک غسپ (آٹا اُچکنا):

اتوار کی صبح دلہن والے اور اُن کے قریبی رشتہ دار ''دغوک غسپ'' تقریب میں شرکت کیلئے جاتے ہیں۔ اس موقعہ پر تیس سے ساٹھ تک مہمان شرکت کرتے ہیں۔ چاول گوشت تازہ میوہ جات یا سویٹ ڈش سے تواضع کی جاتی ہے۔ کھانے کے بعد مہمانوں کو شلوار قمیض کا کپڑا اور بیڈ شیٹس (کڑھائی والے) دیئے جاتے ہیں۔ بعض متمول لوگ خشک خوبانی کی گری، رضائیاں، یا اس طرح کی اور چیزیں بھی دیتے ہیں۔ ان تحائف کو اُویا نوسک کہا جاتا ہے۔

سوموار کی مصروفیات:

سوموار کی دوپہر کو دلہا اور اُسکے قریبی عزیز دلہن کے گھر جاتے ہیں۔ اس موقع پر دولہا دلہن کے شانوں پر چٹکی بھر آٹا چھڑکا جاتا ہے۔ مہمانوں کو پُر تکلف کھانا دیا جاتا ہے۔ کہتے ہیں پرانے وقتوں میں اس روز دلہن کے گھر والے دولہا والوں کو بکری کے بالوں سے بنے ہوئے قالین ''شرما'' اور نمدے بھی دیتے تھے جنہیں ''تکنا کھمنگ'' کہتے تھے۔ اس زمانے میں ایک اور رسم ''گیرانے نی یَسن'' بھی مناتے تھے۔ ہوتا یوں تھا کہ دلہن شادی کے کچھ دنوں بعد خاوند کے ہمراہ اپنے میکے جاتی تھی اور ہفتہ عشرہ تک وہیں رہتی تھی۔ واپسی پر میکے والے اس کیلئے ''درم پھٹی'' میٹھی روغنی روٹیاں تیار کرتے تھے تاکہ بیٹی خالی ہاتھ سسرال نہ جائے۔

قدیم زمانے میں نکاح اور رخصتی میں طویل وقفہ بھی ہوتا تھا۔ یعنی محض نکاح کے بعد وہ خاوند کے ساتھ میل جول رکھ سکتی تھی لیکن رہتی باپ کے گھر ہی تھی۔ رخصتی میں چھ ماہ سے لیکر سال تک بھی لگ سکتا تھا۔ اس کے بعد دلہن مستقلاً اپنے سسرال منتقل ہوتی تھی۔ فی زمانہ اس نوعیت کی شادیاں اس صورت میں ہوتی ہیں جب دیگر تقریبات کیلئے وقت میسر نہ ہو۔ مثلاً کوئی شخص فرائض منصبی کی وجہ سے از حد مصروف ہو یا اسکو قلیل وقت کیلئے چھٹی ملی ہو تو بقیہ تقریبات کیلئے وہ دلہن والوں سے آئندہ کیلئے وقت مانگتا ہے۔ کچھ لوگ شادی بیاہ کی تقریبات کو مختصر کرتے ہوئے بدھ کی بجائے جمعہ یا جمعرات سے آغاز کرتے ہیں۔

پرانے وقتوں میں سال میں دو مخصوص موقعوں پر ''درم پھٹی'' میٹھی روغنی روٹی پکاتے تھے جسکا ایک حصہ دلہن کے گھر پہنچایا جاتا تھا۔ انہی ایام میں دلہا دلہن پر لازم تھا کہ وہ شادی کے دن گھر میں داخل ہوتے ہوئے ایک ساتھ دہلیز پر قدم رکھیں۔ پہل کرنے والے کو کمتر سمجھا جاتا تھا۔ عموماً دلہن پہلے قدم رکھتی ہے۔ ایسا وہ جان بوجھ کر کرتی ہے تاکہ وہ خاوند سے پہلے موت سے ہمکنار ہو تاکہ بیوگی کی سفاک زندگی گزارنا نہ پڑے۔

شریک حیات کی جدائی:

جب کوئی خاتون اپنے پیچھے چھوٹے چھوٹے بچے چھوڑ کر فوت ہو تو اُس کا خاوند بچوں کی تربیت کی خاطر دو تین ماہ بعد دوسری شادی رچاتا ہے۔ اگر بچے بڑے ہوں لیکن گھر کا انتظام چلانے کے قابل نہ ہوں تو رنڈوا پانچ چھ ماہ یا سال بعد شادی کرسکتا ہے۔ فوری طور پر شادی کرنے والے کو اچھا نہیں سمجھا جاتا۔ ایسے موقع پر اکثر کہا جاتا ہے ''اپنے بے نی لی یے ہربے'' یعنی اس کا کیا نقصان مردیوں ہی ہوتے ہیں۔

خاوند فوت ہو اور اسکی اولاد نہ بھی ہو تو بیوہ اپنے میکے جاتی ہے اور پانچ چھ ماہ بعد شادی کرتی ہے۔ اگر بچے چھوٹے ہوں تو وہ اپنے ہمراہ انہیں لے جاتی ہے اور ہوش سنبھالنے تک اُن کی پرورش کرتی ہے۔ اگر بچے سیانے ہیں تو اپنے مرحوم شوہر کے گھر رہتی ہے وہ دوسری شادی کا سوچ بھی نہیں سکتی۔ اگر کسی وجہ سے

بیوہ اپنے میکے جانا چاہے تو سسرال والے بچوں کی دیکھ بھال کرتے ہیں۔ بیوہ سسرال میں رہے یا میکے جائے یتیم بچے ہر حال خاوند کے گھر کے افراد تصور ہوتے ہیں۔ بچے ذرا بڑے ہونے کے بعد دھیال جائیں تو بیوہ دوسری شادی کر سکتی ہے۔

چِتری (طلاق):

طلاق کو بروشو معاشرے میں طعنہ سمجھا جاتا ہے اور یہ اتنا عام بھی نہیں ہے۔ جن گھرانوں کے مابین طلاق ہو وہ آپس میں بات چیت تک ختم کرتے ہیں۔ یوں دشمنی کی بنیاد پڑتی ہے۔ طلاق عموماً مندرجہ ذیل وجوہات کی وجہ سے ہوتی ہے۔

۱۔ خاوند نامرد ہو۔
۲۔ بیوی کا کردار مشکوک ہو۔
۳۔ بیوی جھگڑالو ہو۔
۴۔ خاوند نان ونفقہ نہ دے سکے تو بیوی طلاق کا مطالبہ کر سکتی ہے۔
۵۔ ساس کے ساتھ نا چاقی۔

تاہم بچیوں کی پیدائش کے بعد طلاق کی نوبت کم ہی آتی ہے۔ خدانخواستہ حالات ناموافق ہوں اور بچیوں کی پیدائش کے باوجود طلاق ہو تو چھٹپن تک بچے ماں کے پاس اور پانچ چھ برس کی عمر کے بعد بچے والد کے پاس ہی رہتے ہیں۔ بچے جب تک ماں کے پاس رہیں اُن کی نان ونفقہ کی ذمہ داری باپ کے ذمہ ہوتی ہے۔

مرد طلاق دے تو فوراً مہر ادا کرتا ہے اور مہر کی رقم کسی مناسب شخص کے ساتھ بیوی کو ارسال کرتا ہے۔ نیز دُوک عورت کی ذاتی اشیاء بھی واپس کرتا ہے۔ دوسری طرف اگر عورت طلاق مانگے تو وہ چپ چاپ اپنے میکے جاتی ہے اور خاوند طلاق دے دیتا ہے۔ اگر مرد راضی نہ ہو تو ''اَستم (ایوان بزرگان) میں معاملہ پیش ہوتا ہے۔ اگر خاوند مسلسل انکار کرے تو عورت میکے میں ہی رہتی ہے وہ دوسری شادی نہیں کر سکتی۔ پھر اسی صورت میں عورت کے پاس دو ہی راستے رہ جاتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ وہ اپنے کسی رشتہ دار مرد کو خاوند سے طلاق کی طلبی کیلئے بھیجے اور دھونس کے ذریعے طلاق لے یا خلع کی رقم ادا کرے۔ جب خلع کی ادائیگی ہوتی ہے تو ''چبر بونگ'' راجہ کے پیادے عورت کے جہیز کا سامان اٹھاتے ہیں۔ چربونگ یہ بھی دیکھتے ہیں کہ خلع کی ادائیگی ہوئی ہے یا نہیں۔ بزرگ راوی ہیں کہ پرانے دنوں میں مرد بیوی کو طلاق دینے کے بعد محض پانچ روپے ادا کرتا تھا یا اُس سے بھی ذرا اور پیچھے ''دُو کے پچی'' بارہ گز لٹھا دیتا تھا۔ یہ کپڑا طلاق نہ ہونے کی صورت میں نسل در نسل چلتا تھا حتیٰ کہ اس کا رنگ تک بدل جاتا تھا۔ مرد حکام کو بھی کچھ نہ کچھ دیکر جان چھڑاتا تھا۔ وہ ''بھم'' یعنی راجہ کو ''بائی'' باجرے کے دانے کی جسامت کا سونا دیتا تھا۔ وزیر اور ترنگنہ بھی ڈیڑھ ڈیڑھ سیر وزن کے مکھن کے ڈھیلے لیتے تھے۔

ہنزہ نگر میں طلاق کی ایک اور صورت بھی تھی جسے ''بُرچسکی اورس'' کہتے تھے۔ اس صورت میں عورت کو کچھ بھی نہیں دیا جاتا تھا۔ یہ اس وقت ہوتا تھا جب عورت کسی کے ساتھ ناجائز تعلقات استوار کرے۔ بلکہ خاوند سسرال والوں سے کچھ لیتا تھا۔ آج اس قسم کی طلاق کا کوئی تصور نہیں۔

پیدائش کی رسومات:

علاقہ بروشال میں شادی کا بنیادی مقصد نسل بڑھانا ہے۔ ''بل نیاس'' لاولدی بھی طعنہ ہے۔ ہوموئین قلیل التعداد خاندان کمزور تصور ہوتا ہے جبکہ بلگوئین کثیر العیال خاندان رحمت خداوندی سمجھا جاتا ہے۔

شادی کے بعد عورت کی گود ہری نہ ہو تو ایک دو برس تک پریشانی نہیں ہوتی لیکن زیادہ وقت گزرنے کی صورت میں تعویذ گنڈے کا اہتمام کیا جاتا ہے یا کاہن بلوایا جاتا ہے۔ فی زمانہ ہسپتال سے رجوع کیا جاتا ہے۔ تاہم بعض لوگ ''چاپ آتیس گش'' معائنہ کرنے والی عورت کے پاس بہو کو لے جاتے ہیں۔ اس طرح کی عورتیں رحم سے بیضہ کے خروج کیلئے کام کرتی ہیں تاکہ حمل ٹھہر سکے۔ اس طریق علاج کی ماہر عورت، بانجھ عورت کی پیٹھ پر لیٹ جاتی ہے اور اپنے دونوں ہاتھ اس کے پیٹ پر اوپر سے نیچے تک پھیرتے ہوئے پیڑو تک لے جاتی ہے۔ آج کل یہ طریق علاج متروک ہے۔

نَس چُھویَس (بُو لینا)

عورت حاملہ ہو تو بعض اوقات اسے کسی مخصوص خوراک کی از خود شدید طلب ہوتی ہے جیسے نَس چُھویَس کہتے ہیں۔

حاملہ عورتوں کو پہلے بہت کم پانی پلاتے تھے۔ زیادہ سے زیادہ روغنی چیزیں کھلائی جاتی تھیں اب حاملہ خواتین ڈاکٹروں کے کہنے پر ہر قسم کا کھانا کھالیتی ہیں۔ اور وقفے وقفے سے طبی معائنہ کراتی ہیں۔ دوران حمل بھی ازدواجی تعلقات جاری رہتے ہیں لیکن آخری تین چار مہینوں میں احتیاط سے کام لیا جاتا ہے۔ وضع حمل کیلئے عموماً ''حہ'' روائتی گھر یا ''چی کش'' سٹور روم منتخب کیا جاتا ہے۔ اس کیلئے پہلے سے ہی تیاری کی جاتی ہے۔ زچگی کے دوران خاتون کی ساس یا ماں خدمت پر مامور ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ خاوند کی کوئی بہن یا دیور کی بیوی بھی موجود ہوتی ہے۔ اس دوران مرد کا داخلہ ممنوع ہوتا ہے۔ آج کل پیشہ ور دایہ کی خدمات لی جاتی

ہیں۔ دردزہ کو ''اُشول گیاس'' کہتے ہیں شدید قسم کے دردزہ کو ''ڈَ کو اُشُل'' کہا جاتا ہے۔ پیدائش کے بعد آنول دفنایا جاتا ہے۔ ناف کاٹنے کے بعد اُسے بھی دَفناتے ہیں۔ انہیں ''گنداگی منگ'' کہتے ہیں۔ مائیں ہفتہ عشرہ تک خوبانی کی کڑوی گریاں منہ میں خوب چبا کر اسکی لئی بچے کے ناف کے زخم پر رکھتی ہیں۔ تین چار روز کے بعد زچہ اٹھ کر گھوم پھر سکتی ہے۔ ہفتہ عشرہ کے بعد غسل کرتی ہے۔ پرانے وقتوں میں دو تین ماہ بعد غسل کرتی تھیں۔ آج کل بیس یوم کے بعد دوبارہ غسل کرتی ہیں اور مکمل طور پر صحت یاب ہوتی ہیں۔ ابتدائی تین روز تک عورت کو انڈے دودھ، چوزے کی یخنی، مُتوک اور مُل جیسی نرم خوراک دی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ آشن بھی دیا جاتا ہے جو بھیڑ بکری کی چربی، گوشت اور آٹے کے لچھوں سے تیار کیا جاتا ہے۔ اسے مقامی زبان میں ڈاوَڈو کہتے ہیں۔ پہلے ابتدائی دنوں تک زچہ کو صرف متوک ہی دیا جاتا تھا۔

اگر کسی خاتون کے ہاں مُردہ بچہ پیدا ہو تو کہتے ہیں کہ زچہ نے دوران حمل جسمانی مشقت کی ہے۔ بعض جوڑے حمل گرانا چاہیں تو ابتدائی تین ماہ کے دوران ایسا کرتے ہیں۔ قدرتی اسقاط کو ''اولجی بلاس'' کہتے ہیں۔ اس صورت میں جو بچہ پیدا ہوتا ہے والدین مغموم تو ہوتے ہیں لیکن لوگ تعزیت نہیں کرتے۔ پہلوٹی کے بچے کی پیدائش پر ننہال والے ''پھٹی موز'' موٹی روٹیاں اور ''ہنی بٹر نگ'' خشک خوبانی اور گریاں لے کر جاتے ہیں۔

سپوئی کِش (زچگی):

بچے کی پیدائش کے بعد قریب چھ ماہ تک عورت صرف اپنے نوزائیدہ بچے کی دیکھ بھال میں لگی رہتی ہے۔ پھر کچھ اور مدت گزرنے کے بعد چھوٹی موٹی گھریلو مصروفیات میں جت جاتی ہے۔ اس مدت میں مصروف عورت کو ''سپوئی کِش'' کہتے ہیں اگر کوئی عورت اپنے دودھ سے محروم ہو تو بچے کو گائے بکری یا بھیڑ کا دودھ پلاتے ہیں۔ بکری کا دودھ دستیاب نہ ہونے کی صورت میں گائے کا دودھ بھی پلاتے ہیں۔ بعض اوقات کسی قریبی رشتہ دار خاتون کا دودھ بھی پلایا جاتا ہے۔ ایسی خاتون کو ''اُوشم'' یا اُوشم مما'' کہتے ہیں۔ بچے کو دو سال تک یہی ماں کا دودھ پلایا جاتا ہے۔ کم سے کم مدت تین ماہ بھی ہے۔ اگر عورت بچے کی شیر خوارگی میں دوبارہ حاملہ ہو تو بچے کو دودھ پلانا بند کرتی ہے۔ پرانے زمانے میں لڑکیوں کو تین سال اور لڑکے کو دو برس دودھ پلایا جاتا تھا۔

بروشو علاقوں میں ''جوٹ پٹ'' بچوں کی بڑی قدر ہے۔ لیکن بچیوں کی پیدائش کو اچھا نہیں سمجھا جاتا تھا۔ راجگان کے بچے رضاعت میں دیئے جاتے تھے جسے ''اوشامیشوور اویاس'' کہتے تھے، شیر خوار بچے کو ''گیاس'' نو سال تک کے بچے کو جوٹ پٹ اور نوجوانوں کو ''لوڈر''۔ جڑواں بچوں کو ''اُلو'' کہتے ہیں۔

ناجائز تعلقات کو ناقابل برداشت فعل سمجھا جاتا ہے۔ کوئی عورت ''لِڈو'' ناجائز بچہ جنے تو ایسے بچے اور عورت زانی مرد کے حوالے کئے جاتے ہیں جسے ''اینچی ایواشیاس'' کہتے ہیں۔ اگر اس طرح کا قصوروار مرد حکمران خاندان کا ہو تو وہی صورت میں ''پھوپھوش'' ناجائز بچے کو کپڑے میں لپیٹ کر کسی کی چھت پر رکھتے تھے۔ صبح لوگ بچے کو لیکر ''دھم'' راجہ کے پاس لے جاتے تھے۔ راجہ ناجائز بچے کو کسی نہ کسی خاندان کے حوالے کرتا تھا اور اس کے عوض انہیں مناسب خوراک اور خرچہ ادا کرتا تھا۔ اس طرح کے افراد کو بعد میں راجہ زمین عطا کرتا تھا اور ''پھوپھوس'' معمول کی زندگی بسر کرتا تھا۔

ماضی میں بچے بچیوں کو مائیں ''تِلَش'' کپڑے میں لپیٹتی تھیں۔ پہلے پورے جسم پر کڑوے گری کے تیل کی مالش کرتی تھیں۔ اس عمل سے معصوم بچیوں بچوں کا جسم سڈول اور گداز بنتا تھا۔ پھر ''بغنیک'' گائے کے خشک گوبر کے پاؤڈر کو بچے کے پیشاب گاہ کے اردگرد چھڑک کر کپڑے میں لپیٹے تھے۔ اس عمل کو ''اُلتالی پس'' کہتے ہین۔ ہنزہ میں نوزائیدہ بچوں بچیوں کو گہوارے میں سُلانے کا رواج ہے۔ جبکہ نگر اور یاسین میں ایسا نہیں ہے۔ گہوارے میں سلانے سے بچوں کا سر پیچھے سے چپٹا ہوتا ہے۔ بچے کی پیشانی پر ایک دھجی بھی باندھتے ہیں جسے پیشانی بھی چپٹی ہوتی ہے۔ اس دھجی کو ''گُلی'' کہتے ہیں۔

نام رکھنا (اویک اوسس):

بچے کی پیدائش کے سات ماہ کے اندر اندر نام رکھا جاتا ہے۔ اسماعیلی برادری میں خلیفہ (مذہبی رہنما) کو بلایا جاتا ہے۔ وہ اپنی کتاب سے سعد ساعت کا حساب لگا کر نام رکھتا ہے۔ اس طرح شیعہ گھرانوں میں اخوند سے رجوع کرنے کا رواج ہے۔ اسماعیلیوں میں بیگ، مَلُو، کریم، رحیم، خانو اور لالو جیسے نام کثرت سے رکھتے ہیں جبکہ نگر بروشال میں شعبان، رمضان، حسن، حسین، حیدر، اصغر، مختار، حُر جیسے ناموں کا رواج ہے۔ اس طرح یاسین بروشال میں فلوک جان، گمبوری، للّی اور مہتر قسم کے نام رکھے جاتے ہیں۔ خلیفہ کلمہ پڑھ کر نام رکھتا ہے اور کان میں پھونکتا ہے جسے مقامی طور پر ''اُولقومل لو اُوَیک ہُو اوتاس'' کہتے ہیں۔ ایسے ناموں کو ''چپ لُوم یا اُوَیمو اوَیک'' کہا جاتا ہے۔ جبکہ عام استعمال کیلئے الگ سے نام رکھنے کی روایت ہے۔ اگر کسی بچے کا نام دادا کے نام پر رکھا جائے تو اُسے نام سے نہیں پکارا جاتا بلکہ احتراماً اسے دادو کہتے ہیں۔ مثلاً کسی بچے کے دادا کا نام ہاشم تھا اُس کی یاد میں بچے کا نام بھی ہاشم رکھا گیا تو اُسے ہاشم کے نام سے کبھی نہیں پکاریں گے بلکہ دادو کہیں گے۔ اس سے بروشو معاشرے میں بزرگوں کے حد درجہ احترام کا

پتہ چلتا ہے۔ بعد میں ہوسکتا ہے خلیفہ کا تجویز کردہ نام پس منظر میں چلا جائے اور والدین کا نام ہی مشہور ہو۔ نام رکھنے کے بعد خلیفہ بچے کو گہوارے میں لٹاتا ہے۔

بروشال میں نام بگاڑ کر پکارنے کا بھی بڑا رواج ہے۔ مثلاً سرہنگ محمد کو ''سرنگ مامت''، محمد بیگ کو بیگو خان زادی کو خُن زو، گلشن کو گُلو، بہرام علی کو برم لی، عافیت کو فیا تو اور حوران کو حوری وغیرہ۔

ہولے دُوئی سس (باہر نکالنا):

پرانے وقتوں میں والدین نوزائیدہ بچوں کو جب پہلی مرتبہ باہر نکالتے تھے تو اس رسم کو ''ہولے دُوئی سس'' کہتے تھے۔ ایسے موقعوں پر باقاعدہ ایک رسم ادا کی جاتی تھی۔ ''پھٹی''، موٹی روٹیاں، ''دِرَم پھٹی''، میٹھی روغنی روٹیاں پکاتے تھے اور بچوں بزرگوں کو کھلاتے تھے۔ آج کل اس کا رواج نہیں رہا البتہ بچوں کو جماعت خانہ لے جاتے ہیں جبکہ شیعوں میں یہ رسم ڈاڈا کے نام سے مشہور ہے۔ بعض بروشو علاقوں میں ''ڈاڈا'' کی متبادل ایک رسم ''چی اویانسن'' بھی مروج ہے جو دراصل رسم ''ہولے دُوئی سس'' کی ترقی دادہ شکل ہے۔ اس رسم میں بھی ''پھٹی'' اور ''درم پھٹی'' پکاتے ہیں۔ اس کے علاوہ گندم کے بھنے ہوئے دانے، باقلہ کے دانے، خوبانی کی میٹھی گریاں، شیرینی اور ریز گاری آپس میں ملاتے ہیں۔ اب ایک صاف چادر فرش پر بچھاتے ہیں اور اُس چادر کے اوپر بچے کو رکھتے ہیں۔ گھر کا کوئی بزرگ تین بار مٹھی بھر یہ دانے بچے کے سر پر بکھیرتا ہے۔ باقی بڑے بچے تالیاں بجا بجا کر خوشیاں مناتے ہیں۔ مائیں بچے کی بلائیں لیتی ہیں۔ مابعد گھر کا بزرگ بچے کو پیٹھ پر اٹھا کر تو ڑی دیر گھومتا ہے۔ اس کے بعد مہمانوں کی پزیرائی کی جاتی ہے۔ بچے کی زندگی میں یہ بڑی خوشیوں والی رسم ہوتی ہے۔

قدیم زمانے میں اولاد کی کثرت نعمت خداوندی سمجھی جاتی تھی لیکن طبی سہولتوں کے فقدان اور خوراک کی کمی کے باعث بہت سے بچے شیر خوارگی میں ہی فوت ہوتے تھے۔ بروشال میں بچوں سے محبت اور شفقت کی بڑی مضبوط روایت قائم ہے۔ لڑکا پیدا ہو تو باپ اُسے ''اشپنگے شست'' کہتا ہے جسکے معنی ہیں پشت کی طاقت جبکہ لڑکی پیدا ہو تو اُسے ''مُومُوی یے بلبلی'' کہتے ہیں۔

بچوں کی تربیت:

بروشال میں بچوں کی تربیت پر خصوصی توجہ دی جاتی ہے۔ سب سے پہلے انہیں دینی تعلیم سے بہرہ ور کیا جاتا ہے۔ دینی ادارے بہت خدمات انجام دے رہے ہیں جماعت خانوں اور مساجد میں دینی تعلیم کا باقاعدہ اہتمام ہوتا ہے۔ جہاں جسمانی صفائی سے لیکر روزمرہ معاملات کے ہر پہلو کے بارے میں تربیت دی جاتی ہے۔

بچہ یا بچی سات برس کی عمر تک پہنچ جائیں تو انہیں شیر خوار بچوں کا گہوارہ ہلانے پر لگا دیا جاتا ہے۔ لڑکا نو برس کا ہو تو پہلے وقتوں میں مائیں اُس کیلئے پھٹی چھوٹی سی دوہری موٹائی والی روٹی تیار کر کے دیتی تھیں جسے ''اورینوم بھٹی'' کہتے تھے۔ بچہ یہ روٹی لیکر مال مویشیوں کو چرانے لے جاتا تھا۔ یہ شبانی کی پہلی تربیت ہوتی تھی شام کو وہ اپنے ہمراہ جلانے کیلئے خشک لکڑی بھی لے کر آتا تھا۔ پھر اپنے باپ کے ساتھ کبھی کبھار باہر جا کر کھیتوں کو پانی دیتا یا بند کی نگرانی کرتا۔ پندرہ برس کا ہونے پر اسے رَجا کی کار بیگار پر بھیجا جاتا تھا۔ اس کے علاوہ وہ ''تر'' چراگاہ بھی جاتا۔ ہنر سیکھنے کے خواہشمند بچوں کو بڑھئی، راج، درزی، جولاہا اور اخون کے پاس بھی بھیجتے تھے۔

بچیاں جب دس بارہ برس کی عمر تک پہنچتیں تو مائیں انہیں گُندھے ہوئے آٹے کے پیڑے اور چپاتیاں بنانے کے کام پر لگاتی تھیں۔ یہ گھر داری کی ابتدائی تربیت ہوتی تھی۔ اتنی ہی عمر کی بچیوں کو سلائی کڑھائی کی تربیت بھی دی جاتی تھی۔ آج کل بچوں بچیوں سے گھر کا کام نہیں لیا جاتا۔ تقریباً سارے بچے سکول جاتے ہیں اور سکول سے واپسی پر بھی لکھائی پڑھائی پر زور دیا جاتا ہے۔ ایک ذرا فرصت ملے تو دینی تعلیم کے حصول کیلئے جماعت خانہ اور مساجد بھیجے جاتے ہیں۔ ایک آدھ کوئی بچہ لکھائی پڑھائی کی طرف راغب نہ ہو تو اُسے کسی ہنر وغیرہ سیکھنے پر لگایا جاتا ہے۔

بِسمن (ختنہ):

کافی پرانی بات ہے بروشال میں ختنہ کا رواج نہیں تھا۔ اٹھارویں صدی کے آس پاس ختنہ کا سلسلہ شروع ہوا۔ کہتے ہیں پہلے پہل بہت سے بچوں کا ختنہ ایک ساتھ کیا جاتا تھا۔ دس پندرہ برسوں کے بعد ایک ہی مرتبہ بہت سے بچوں کا ختنہ کیا جاتا تھا۔ جس لڑکے کا ختنہ کرنا ہو اُس کے گھر والے روغنی فتیری روٹی ''گی یَل'' تیار کرتے تھے۔ بچہ یہ روغنی روٹیاں لیکر ''چتق'' اجتماعی جگہ جاتا تھا جہاں دیگر بیسیوں بچے بھی اپنے بزرگوں کے ساتھ جمع ہوتے تھے۔ وہیں خلیفہ بھی ہوتا تھا جو دُعا پڑھنے کے بعد جراح کو ختنہ کرنے کیلئے کہتا تھا۔ پہلا ختنہ ہوتے ہی بزرگ مکانوں کی چھتوں پر بندوقیں داغ کر خوشی کا اظہار کرتے تھے۔ ختنہ کیلئے پہلے سے ہی ایک مکان خالی کرایا جاتا تھا جس میں بچوں کے والدین بھی جمع ہوتے تھے۔ ختنہ سے پہلے چھت کی روشندان سے ڈوری کی مدد سے ایک سیب لٹکایا جاتا تھا۔ جراح بچے کو سیب کی طرف دیکھنے کیلئے کہتا۔ بچہ جونہی اوپر دیکھتا جراح ختنہ کرتا۔ تگڑے اور دلیر بچے ہنستے جبکہ کمزور بچے رونے لگتے۔ جس گھر میں یہ ختنے کئے

جاتے اُس کی چھت پر ایک بکرے کو روشندان کے اردگرد طواف کرایا جاتا پھر اُسے روشندان کے سوراخ سے نیچے اتارا جاتا اور ذبح کیا جاتا۔ پھر اسے وہیں پکا کر ضیافت کا اہتمام کرتے اور پوری رات وہیں گزارتے اور ناچ گانے کا اہتمام ہوتا۔ مائیں ختنے کے گیت گاتی تھیں۔ عورتیں جونہی اپنے حصے کا بند گاتیں اُن کے بعد جواب میں مرد بھی گاتے۔ اگر کسی خاتون کو اس طرح کا گیت یاد نہ ہوتا تو دوسری خواتین کو کھانے پینے کی کوئی شے دیکر منت سماجت کرتی اور گیت سیکھتی۔ اگر پھر بھی نہ گا سکے تو اُسے جرمانہ دیکر جان چھڑانی پڑتی تھی۔ یہ جرمانہ پکوان کی شکل میں ہوتا تھا۔ یوں مرد خواتین اور ختنہ شدہ بچے ہنسی خوشی میں پوری رات گزارتے تھے۔ اس موقع پر حاملہ خواتین تو خصوصی طور پر لذیذ قسم کے پکوان تیار کر کے لاتی تھیں اور کہتی تھیں کہ لڑکا پیدا ہونے کی صورت میں وہ بھی ایسی ہی ضیافت اور خوشی و تفریح کا اہتمام کریں گی۔ اگلی صبح کو خلیفہ یا اخون قرآن مجید لیکر آتا تھا اور گھر کے دروازے پر قرآن مجید کو بلند کر کے کھڑا رہتا تھا۔ اس دوران باقی افراد ختنہ شدہ بچوں کو لیکر کلام پاک کے نیچے سے ایک ایک ہو کر گزرتے تھے اور اپنے اپنے گھروں کا رُخ کرتے تھے اور بھیڑ بکری کا گوشت پکا کر رشتہ داروں کو ضیافت دیتے تھے۔ ایک اور روایت کے مطابق تمام اہل دیہہ ایک اجتماعی جگہ ''چتق'' میں جمع ہوتے تھے جہاں ختنہ شدہ بچوں کے والدین گھروں سے خمہ لی روٹیاں، گوشت اور مکھن لیکر وہاں جاتے تھے۔ وہاں سے مختلف خوان ''تھم'' راجہ، وزیر اور ترنگلفہ گان کے گھر بھیجے جاتے تھے۔ باقی کھانا موقع پر موجود افراد میں تقسیم ہوتا تھا۔ بروشال یاسین اور نگر میں بھی تقریباً اسی نوعیت کی تقریبات منعقد ہوتی تھیں۔ شہزادگان کے ختنے شاندار طریقوں سے کئے جاتے تھے۔ اس موقع پر راجہ ہر گاؤں والوں کو ایک راس یاک، مکھن کا ایک بڑا ڈھیلہ اور غلہ وافر مقدار میں دیا جاتا تھا۔ وہ ضیافت کر کے مشترکہ طور پر کھاتے تھے۔ آج کل بچوں کا ختنہ ہسپتال میں کرایا جاتا ہے یا ڈسپنسر کو گھر بلا کر خدمات لی جاتی ہیں۔

گھر میں داخل ہونے کی رسم:

بروشو علاقوں میں ہر خاندان ایک مخصوص قسم کا روائتی گھر تعمیر کرتا ہے جسے ''مِشاسکی حَہ'' یا ''گوچسکی حَہ'' کہتے ہیں۔ چھت چار مضبوط اور نقش و نگار والے ستونوں پر تعمیر کی جاتی ہے۔ جیسے ہی گھر کے اندر داخل ہوں جوتے رکھنے کی جگہ ہوتی ہے اور سامنے لکڑی کی آڑ ہوتی ہے جسکے دوسری جانب الماری ہوتی ہے جس میں برتن رکھتے ہیں۔ جوتے اتارنے کے بعد اندر جائیں تو درمیان میں چولہا جبکہ دائیں جانب عورتوں کے بیٹھنے کیلئے چبوترہ اور بائیں طرف مردوں کیلئے چیمبر سا بنا ہوتا ہے۔ چولہے کے اردگرد کی جگہ بزرگوں یا خواتین خانہ کیلئے مخصوص ہوتی ہے۔ گھر میں داخل ہونے والا مہمان اگر اسماعیلی ہو تو ''یا علی مدد'' کہتا ہے جواب میں اہل خانہ ''مولا علی مدد'' کہہ کر جواب دیتے ہیں۔ سہ پہر کے بعد آنے والا مہمان ''شام سلام'' کہتا ہے اور میزبان ''روز علیکم'' کہہ کر جواب دیتا ہے۔ دوسری طرف بروشال کے شیعہ گھرانوں میں ''السلام علیکم'' کہنے کا رواج ہے۔ میزبان اور مہمان قریبی رشتہ دار ہوں تو ایک دوسرے کا ہاتھ چومتے ہیں۔ بڑوں کو ''اُیوم مَن'' یعنی مردانہ چبوترے پر بٹھاتے ہیں جبکہ بزرگ خواتین کو ''جوٹمن'' پر جگہ دیتے ہیں۔ قدیم زمانے میں دروازے کے بغلی حصے میں بھی ایک چھوٹا سا چبوترہ ہوتا تھا جسے ''بر بچومَن'' کہتے تھے۔ یہ صرف سازندوں کے بیٹھنے کیلئے مخصوص ہوتا تھا۔ ڈوم یا کسی ڈومن کے آنے کی صورت میں اسے ''اُیوم'' یا ''جوٹ مَن'' پر بیٹھنے کی اجازت نہیں ہوتی تھی۔

چھوٹے بڑے کے بارے میں رسومات:

بروشال میں خاندان کا تصور توانا ہے۔ بزرگوں کو ''حاگمُون'' یا ''حاتَل'' مراد گھر کی بنیاد یا گھر کی چھت کہا جاتا ہے۔ گھر کے معاملات میں ان کی رائے کو اولیت حاصل ہوتی ہے اور ہمہ وقت اُن سے مشورہ لیا جاتا ہے۔ شادی بیاہ، اموات اور دیگر ہر قسم کے امور میں بزرگوں سے رائے لی جاتی ہے۔ بزرگوں سے کام نہیں لیا جاتا تاہم بزرگ خود ہی چھوٹے موٹے کام کرتے ہیں تاکہ اولاد انہیں بوجھ نہ سمجھیں۔ وہ اون کاتتے، رسیاں بٹتے، ٹوکریاں بناتے یا کھیتی باڑی کا معمولی کام کرتے ہیں۔ خاندان کا کوئی بزرگ باہر سے گھر آئے تو بچے اور خواتین احتراماً کھڑے ہوتے ہیں اور السلام علیکم یا علی مدد کہہ کر استقبال کرتے ہیں اور بزرگ کے ہاتھ پر بوسہ دیتے ہیں۔ راہ چلتا کوئی بزرگ بوجھ اٹھاتا نظر آئے تو نوجوان انکی مدد کرتے ہیں۔ ایک قدیم بروشسکی کہاوت بھی ہے کہ ''گرن لوکہ نو روپیر'' یعنی بزرگ ٹوکرے میں بھی گوشہ گیر ہو تو مشورہ لو۔ مراد یہ کہ کوئی شخص بہت بوڑھا ہو اور ضعیفی کے باعث ٹوکرے کو اپنا مسکن بنائے تو تب بھی اس سے مشورہ لو۔ اس طرح بچوں کی اہمیت بھی مسلم ہے۔ ''گیاس اپم حہ'' یعنی بچوں کے بغیر گھر کو گھر ہی نہیں سمجھا جاتا۔ تاہم بچیوں کے مقابلے میں بچوں کو زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ پہلوٹی کے بچے کو ''یَر دوخروم اسقور'' پہلے کھلنے والا پھول کہا جاتا ہے جبکہ آخری بچے کو ''ایلچی کی مُو'' کہتے ہیں اور یہ بچہ بڑا لاڈلا ہوتا ہے۔ جیسے ہی بچہ کھیلنے کودنے کے قابل ہوتا ہے نظر بد سے بچانے کیلئے اُس کے ماتھے اور گالوں پر سرمہ کی سلائی سے نقطے اور نقوش و نگار بناتے ہیں۔ تاکہ دیکھنے والوں کی توجہ بچے کے چہرے سے ہٹ جائے۔ اُس کے ہاتھ میں ''پھینچ'' یعنی کسی درخت کی ٹہنی سے بنی ہوئی پولو سٹک تھما دی جاتی ہے اور جیب میں گلچہ نما روٹی پھٹی رکھ دی جاتی

ہے تاکہ کھیل کود کے دوران بھوک لگے تو کھا سکے۔

حال دینا حال لینا، میل جول:

اثنائے راہ کوئی بزرگ ملے تو اُس کا زبردست احترام کیا جاتا ہے۔ یاسین اور ہنزہ میں ملاقات کے وقت یا علی مدد کہنے کا رواج ہے۔ قریبی عزیز بوقت ملاقات ایک دوسرے کا ہاتھ چومتے ہیں۔ ملاقات کے وقت اس طرح کے جملے کہتے ہیں۔

یا علی مدد کاکو، مولا علی مدد بے مئی با، حالے شُو وابانا، مولا مہربانی بلہ

(بروشال یاسین)

یا علی مدد لے، مولا علی مدد گو بے حال دُوالے، مولا مہربانی

دُوا گوسینا! بجہ کہ شُوابالہِ للّی۔

(نگر بروشال)

سلامنالیکم ناجناب، وعلیکم سلام بہ مئی بالہ، کھوت بیسا شگولو،

مینیکو ھینگ قچی بیسن ایچو با، کھینے حادمانے اَوَر ڈوبئی۔

دیر سے ملنے والے یار دوست معانقہ بھی کرتے ہیں اور خواتین ہوں تو ایک دوسرے کا ہاتھ بھی چومتی ہیں۔ چھوٹے بچوں کا ہاتھ چومنے کا بھی رواج ہے۔

دوستی دشمنی کی رسومات:

گلگت، چلاس، داریل تانگیر کے مقابلے میں بروشال، ہنزہ، نگر اور یاسین میں دشمن داری کی روایت نہ ہونے کے برابر ہے۔ یہ علاقے شروع سے پُرامن اور راجوں کی کڑی سرپرستی میں رہے ہیں۔ تاہم بندہ بشر ہونے کے ناطے لڑائی جھگڑے تو ہوتے ہی رہتے ہیں۔ بعض اوقات یہ معمولی قسم کے تنازعات قتل و غارت گری پر منتج ہوتے ہیں۔ یوں بیٹھے بٹھائے دشمنی کی بنیاد پڑتی ہے۔ بروشال میں بھی دشمنی کی بنیاد زن زر زمین کے حوالے سے استوار ہوتی ہے۔ افراد یا خاندان برادری کے درمیان دشمنی کا سلسلہ شروع ہوتے ہی دونوں فریقین کے مابین تعلقات ختم ہوتے ہیں۔ قوی فریق لڑائی اور سر پھٹول کے بہانے ڈھونڈتا ہے جبکہ کمزور فریق صلح کیلئے بھاگ دوڑ میں لگا رہتا ہے۔ راجگی نظام کے دور میں ترنگفہ گان (ریاستی عہدیدار) دونوں فریقین سے صلح کے نام پر زیادہ سے زیادہ کھانے پینے کی چیزیں اینٹھتے تھے۔ آج یونین کونسل، ثالثی کونسل اور مذہبی رہنما اس قسم کے تنازعات اور دشمنی کا خاتمہ کراتے ہیں۔ پھر بھی لوگ حکومتی اداروں پر کچھ زیادہ بھروسہ نہیں کرتے بلکہ عُلما یا جماعت کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ عدالت اور پولیس کے چکر میں نہیں پڑتے۔ بروشال میں ہتھیاروں کی نمائش کی ریت بھی نہیں۔ لڑائی ہو تو ڈانگ سوٹے کا استعمال ہوتا ہے۔

دو قبائل کے درمیان عموماً کسی پہاڑی چراگاہ یا حقوق چرائی کے حوالے سے دشمنی کی بنیاد پڑتی ہے۔ بعض اوقات ہر دو قبائل کے درمیان قتل تک نوبت آتی ہے۔ یہ قبائل دشمنی پیدا ہونے کے بعد ایک دوسرے سے قطع تعلق کرتے ہیں۔ ایک دوسرے کی شادی غمی میں شرکت نہیں کرتے۔ تنازعہ کا تصفیہ ہونے کی صورت میں بھی خاصے عرصے تک دشمنی کے آثار برقرار رہتے ہیں۔ دو برادریوں کے مابین کسی بہو بیٹی کی طلاق کی وجہ سے یا اُن کے ساتھ سسرال میں زیادتی ہونے کی صورت میں دشمنی شروع ہوتی ہے۔ اس طرح کے گھرانے بھی برسہابرس تک ایک دوسرے کے خلاف سازشوں کا جال بُنتے رہتے ہیں۔ ایک دوسرے کے ہاں آنا جانا موقوف ہوتا ہے۔ اس کو ''چتری نیاس'' کہتے ہیں۔

اگر کوئی شخص کسی خاتون کے ساتھ ناجائز تعلقات استوار کرے تو دونوں کو قتل کیا جاتا ہے ایسی صورت میں قاتل کو سزا نہیں ہوتی۔ اگر کوئی شخص کسی خاتون کی عصمت دری کرے جسے بروشسکی میں ''مُوچی دونس'' کہتے ہیں تو لڑکی کی برادری والے اور راجہ کے باڈی گارڈ اُس شخص کا گھر گراتے تھے۔ لڑکی کنواری ہونے کی صورت میں اس مرد کے عقد میں دیتے تھے۔

دو بھائیوں کے درمیان زمین کی تقسیم اُن کی حد بندی یا درختوں کے تجاوزات کے سلسلے میں دشمنی جڑ پکڑتی ہے۔ ہمسایوں میں زمین یا عورتوں کے باعث غلط فہمیاں اور دشمنی چل پڑتی ہے۔ یہ سب کچھ اپنی جگہ لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ بروشال میں قتل جیسے گھناونے جُرم کی شرح سب سے کم ہے۔

دوستی کیلئے بروشسکی زبان میں ''شگولئی'' کا لفظ مستعمل ہے۔ بروشو لوگوں کیلئے یہ ایک سرور آور لفظ ہے۔ دوست ایک دوسرے کی تکلیف و راحت میں شریک ہوتے ہیں۔ کھیتی باڑی اور دیگر کام کاج میں ایک دوسرے کا ہاتھ بٹاتے ہیں۔ ایک دوست کہیں دور چلا جائے تو دوسرا اسکے گھر خیر خیریت دریافت کرتا ہے ضروریات کا پوچھتا ہے۔ کسی ایک دوست کی جان پر بن آئے تو دوسرا اس کی مدد کو پہنچتا ہے۔

سفر پر جانے کی رسومات:

پرانے زمانے میں سفر پر جانا ایک جوکھم سے کم نہیں تھا۔ سفر کی سہولتیں ناپید تھیں۔ انگریزوں نے اپنے زمانے میں سڑکیں تعمیر کیں تو سفر آسان ہوا۔ سفر پر نکلنے والے کو گھر والے زادراہ کیطور پر بہت سی ''پھٹی'' روٹیاں یا ''چھمورکی'' چوری دیتے تھے۔ جہاں بھوک لگتی مسافر کسی ندی کنارے پھٹی یا چوری کھاتا اور ندی کا پانی پی کر آگے روانہ ہوتا۔ اُس زمانے میں سفر کے حوالے سے کئی ایک توہمات نے بھی جالے بُن رکھے تھے۔ مثلاً کسی کے تلوے میں اچانک کھجلی ہو تو کہتے تھے لو اب سفر پر جانا پڑیگا یا دوران سفر کسی کے ہاتھ سے لاٹھی یا چھڑی گر گئی تو

سمجھتے تھے کہ اسی راستے پر چند روز میں دوبارہ سفر پر جانا پڑے گا۔ کوئی شخص سفر پر نکلے تو پیچھے گھر والے اس روز جھاڑو نہیں دیتے تھے یا ہمسائے سے کوئی آگ (قدیم زمانے میں ماچس دستیاب نہ ہونے کے باعث صبح ایک دوسرے سے آگ مانگنے کا رواج تھا) مانگنے آئے تو آگ بھی نہیں دیتے تھے۔ اس طرح گھر کا کوئی آہنی سامان بھی عاریتاً مانگنے والوں کو نہیں دیتے تھے۔ عقیدہ یہ تھا کہ دینے کی صورت میں مسافر کا پاؤں زخمی ہوگا، ہاتھ بھی اُس روز نہیں دھوتے تھے نیز تھموشلنگ تہوار کے موقع پر جلانے کیلئے جمع کی گئی لکڑی بھی استعمال نہیں کرتے تھے۔ سفر پر لیجانے والی لاٹھی کی بڑی قدر تھی۔ سفر سے واپسی پر اُسے چھت میں کسی اونچی جگہ پر رکھتے تھے۔ بروشال کے شیعہ گھرانوں میں آج بھی سفر پر جانے سے پہلے بازو پر امام ضامن باندھنے کی رسم موجود ہے۔

''تومرا ویانس''

تومر یعنی تعویزوں پر بڑا اعتقاد ہے۔ یہ نیک و بد ہر دو مقاصد کیلئے تیار کرائے جاتے ہیں۔ کوئی پُراسرار بیماری ہو، گائے دودھ نہ دے یا بیمار ہو، کسی پر جادو کا اثر ہو تو اخوند، کاہن، مولوی یا عامل سے تعویذ بنوائے جاتے ہیں۔ کسی کو نقصان پہنچانے یا کسی خوبصورت خاتون کو اپنی طرف مائل کرنے کیلئے جو تعویذیں بنوائی جاتی ہیں انہیں ''شقہ بوٹرنگ'' کہا جاتا ہے۔ ایسے عامل کو اچھی نظر سے نہیں دیکھا جاتا لیکن لوگ اُس سے خوفزدہ بھی بہت ہوتے ہیں۔

تعویذ تکون، چوکور، مستطیل اور سلنڈر نما بھی تیار کیئے جاتے ہیں۔ یہ تعویذیں گلے میں لٹکائے یا بازو پر باندھ جاتے ہیں۔ بعض لوگ ٹوپی کے ساتھ بھی لٹکاتے ہیں۔ اہم قسم کی تعویزوں کیلئے چاندی کے منقش خول بھی تیار کیئے جاتے ہیں جبکہ عام قسم کی تعویذوں کیلئے مخمل، کمخواب، تِوار، یا کسی بھی زرتار قسم کے کپڑے کے ٹکڑے استعمال ہوتے تھے۔ یہ رنگ برنگ کے ٹکڑے درزی سے حاصل کیئے جاتے تھے۔ بعض بچوں کو نظر بد سے بچانے، صحت مند رکھنے اور جادو کے اثر سے محفوظ رکھنے کیلئے درجنوں تعویزیں کسی ڈوری سے باندھ کر گلے میں ترچھا ترچھا لٹکاتے ہیں۔

مردوں اور عورتوں کی گھریلو ذمہ داریاں:

(گُس گیاس کی ہرسیسہ دُرومَس)

بروشال میں گھریلو ملازم رکھنے کی روایت نہ ہونے کے برابر ہے۔ البتہ ماضی میں راجگان کے ہاں بیسوں ملازم بلا معاوضہ کام کرتے تھے جنہیں ''خون'' کہا جاتا تھا انہیں راجہ کے ہاں سے رٹی اور کپڑا ملتا تھا نقد ادائیگی کی روایت نہیں تھی۔ باقی ہر شخص خواہ کیسی ہی سماجی رتبہ کا حامل کیوں نہ ہو اپنے ہاتھ سے کام کرنا فخر سمجھتا ہے۔ جو شخص کاہل ہو اُسے ہمیشہ طعن و تشنیع کا سامنا رہتا ہے۔

بروشال کے مردوں کے ذمے حسب ذیل کام ہوتے ہیں۔

۱۔ آبپاشی اور آبپاشی کی نہروں اور تالابوں کی صفائی۔

۲۔ کھیتی باڑی، کھیتوں تک کھاد ڈھونا، فصل کی کٹائی اور اسے کھلیان تک لے جانا، گاہنا، حاصل شدہ غلہ کو تھیلوں میں بھرنا، ڈنٹھلوں کو باندھنا اور انہیں مویشی خانہ منتقل کرنا، غلے کی چکیوں میں پسائی اور پسے ہوئے آٹے کو گھر لانا۔

۳۔ بھیڑ بکریوں کی اون کُترنا، لکڑیاں پھاڑنا، ٹہنیاں کاٹنے کیلئے درختوں پر چڑھنا، پھل اتارنا، مویشی چراگاہ لے جانا اور وہاں دودھ دوہنا، لسی بنانا، مکھن بلونا اور حاصل شدہ مکھن کو بھج پتر کی پرتوں میں لپیٹ کر زمین میں دفنانا، رسیاں بٹنا، اونی پٹیاں بنانا، ضرورت کے موقع پر جانور ذبح کرنا، گری ہوئی دیواریں اٹھانا۔

کام کاج کی تقسیم عُمر، جنس اور حیثیت کے حوالے سے طے ہے۔ باپ اپنے بیٹے کو کھیتوں کو پانی دینے، ''رجا کی'' اجتماعی کار بیگار میں حصہ لینے کیلئے بھیجتا ہے جبکہ ماں بیٹوں کو کھیتوں میں ''بلیشنگ'' تلائی کیلئے بھیجتی ہیں۔ پڑھے لکھوں سے کھیتی باڑی کا کام کم ہی لیا جاتا ہے۔ اس طرح عورتوں کے گھریلو نوعیت کے کام کاج مخصوص اور لگے بندھے قسم کے ہوتے ہیں۔ مثلاً افراد خانہ کیلئے ناشتہ، دوپہر اور رات کا کھانا تیار کرنا، برتنوں کی منجھائی، سلائی، کڑھائی، مویشیوں کیلئے چارہ کی فراہمی، نلائی اور فصلوں کی کٹائی میں مردوں کی مدد کے علاوہ سبزیوں کی بوائی وغیرہ۔

بوڑھوں اور بزرگوں کے مشاغل:

''میپرنک'' یعنی بزرگوں کی حد درجہ تعظیم کی جاتی ہے۔ اُن سے جسمانی مشقت کا کام نہیں لیا جاتا۔ ہر طرح کے معاملات میں اُن سے مشورہ لیا جاتا ہے۔ بزرگ من مرضی سے خود ہی چھوٹا موٹا کام کرتے ہیں جیسے اون کاتنا، رسیاں بٹنا، لکڑی کے چمچ بنانا، گھر کے آس پاس کے کھیتوں کو پانی دینا، قریبی عزیزوں کے ہاں خیر خیریت دریافت کرنے کیلئے جانا، نیز کم سن پوتے پوتیوں اور نواسے نواسیوں کو ادھر اُدھر گھمانے لے جانا وغیرہ۔

فرصت کے لمحات میں گرمیوں کی طویل دوپہر کو گاؤں کے بزرگ کسی چھتا درخت کے سائے تلے بیٹھ کر عہد رفتہ کی کھٹی میٹھی باتیں کر کے وقت گزارتے ہیں۔

بچوں کے مشاغل:

چھوٹے بچے گھر کے معمولی کام کاج میں والدین کا بہت ہاتھ بٹاتے

ہیں۔ آس پاس واقع کھیتوں میں مویشی چرانا اور گھاس چارہ گھر لانا معمول کی مصروفیات ہیں۔ اس طرح بچیاں بھی اپنے سے چھوٹے بہن بھائیوں کی دیکھ بھال کرتی ہیں اور سوئے ہوئے ہوں تو اُن کے گہواروں کو ہلکورے دیتی ہیں جسے مقامی زبان میں ''گورالانگ ایتس'' کہتے ہیں۔ فارغ اوقات میں محلے کی بچیوں کے ساتھ کھیل کود کر وقت گزارتی ہیں۔

لوک داستانیں، کہانیاں اور روایات

داستان گوئی اور قصہ خوانی کا رواج تقریباً دنیا کے ہر معاشرہ میں پایا جاتا ہے اور یہ سلسلہ اتنا ہی قدیم ہے جتنا کہ خود انسانی تہذیب۔ پھر لوک کہانیوں کا اپنا ایک طلسم ہے۔ یہ لوک کہانیاں اور داستانیں انتہائی دلنشیں، سادہ اور حسن فطرت کی عکاس ہوتی ہیں اور اپنے مقامی رنگ کے باعث مخصوص پہچان رکھتی ہیں۔ ان کہانیوں اور لوک داستانوں سے اُس معاشرے کے قدیم ثقافتی اقدار اور تہذیبی روایات کا پتہ چلتا ہے۔

بروشال ہنزہ نگر میں بھی تفریح طبع، اصلاح معاشرہ، پند و نصائح اور وقت گزاری کیلئے کہانیاں سنی اور سنائی جاتی تھیں۔ گرمیوں کے دنوں میں لوگ روزی روٹی کے حصول اور کھیت کھلیان کے جھمیلوں میں جتے رہتے اور جاڑے کی طویل اور سفاک راتوں کو اہل قریہ و محلّہ پاس پڑوس کے کھاتے پیتے گھروں کا رخ کرتے اور دیئے کی مدھم اور لرزتی روشنی میں رات گئے تک بیٹھے رہتے جسکو بروشسکی زبان میں ''گری چہ نی لیس'' کہتے ہیں۔ اب میزبان گھرانہ شب مہمانوں کی پزیرائی اپنے لئے واجب سمجھتا۔ اُن دنوں چائے کا رواج تو تھا نہیں خشک خوبانی، توت، انگور اور مغزیات یا جو بھی چیزیں گھر میں دستیاب ہوتیں پیش کی جاتی تھیں۔ بروشال کے روایتی گھروں کا اپنا ایک الگ رنگ ڈھنگ ہوتا ہے جس میں خواتین، بچوں اور بڑھے بوڑھوں کیلئے الگ الگ جگہیں مخصوص ہوتی ہیں۔ یوں چھوٹے بڑے حسب مراتب بیٹھتے۔ خواتین لگائی، بجھائی یا اون کتائی میں مصروف ہوتیں۔ جواں جہاں لڑکیاں آپس میں راز و نیاز کی باتیں کرتیں، بچے بالے ہنسی ٹھٹھول کرتے، خشک میوہ ٹھونگتے جبکہ بزرگ کہانیاں سناتے، کہانی دلچسپ ہونے کی صورت میں سب انہماک سے سنتے اور بعض ہوشیار افراد از بر بھی کرتے۔

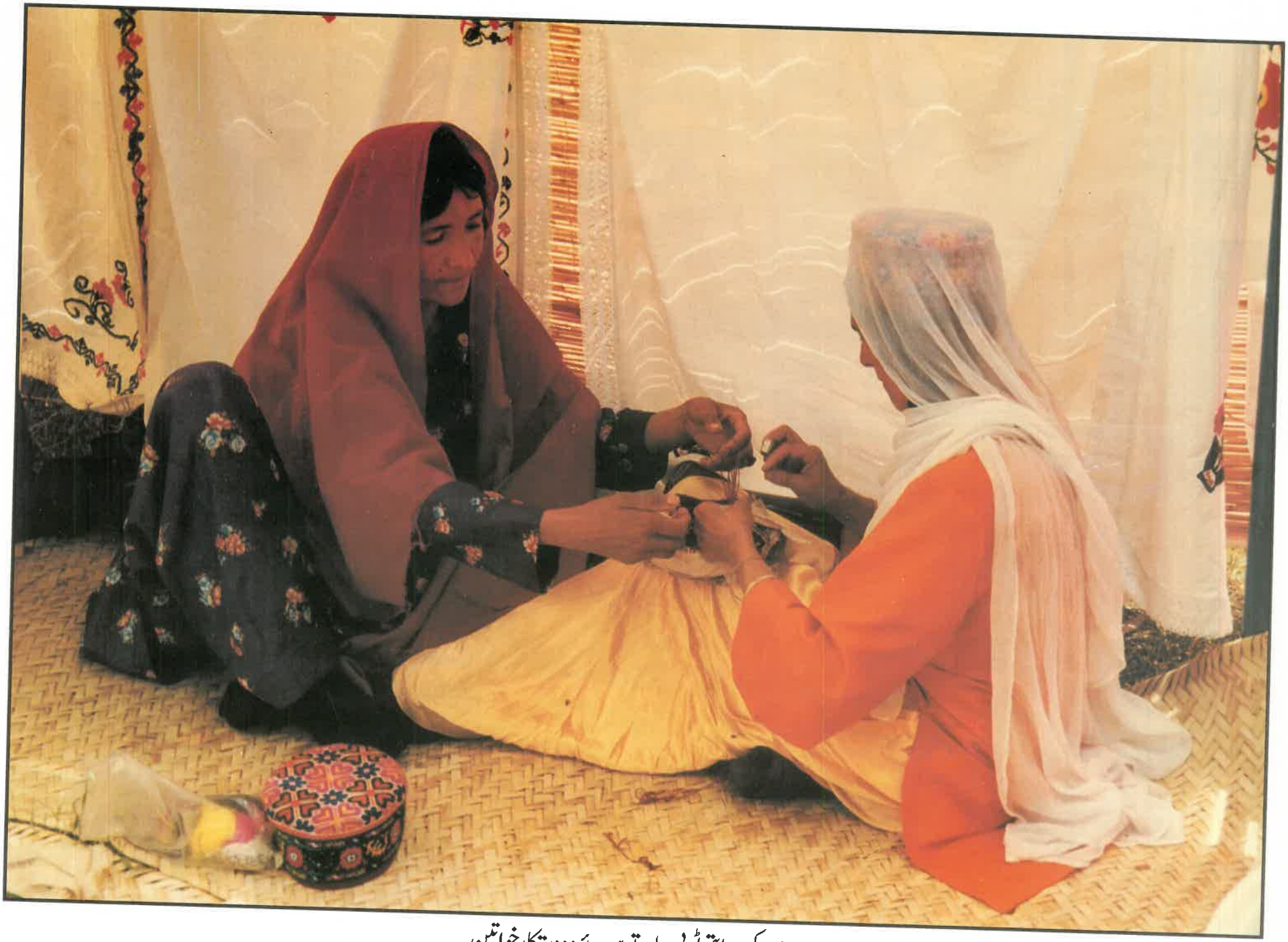
خطہ بروشال میں بعض مقامی کہانیاں بہت قدیم اور طبع زاد ہیں جبکہ چند ایک ترجمہ کا غازہ لگا کر بروشسکی کا حصہ بن گئی ہیں۔ مقامی کہانیوں میں نیکی بدی، ظلم و جبر، وفا شعاری، ہرجائی پن، بہادری و بزدلی اور فتح و شکست جیسے عام انسانی رویوں اور حالات کا جابجا تذکرہ ملتا ہے۔ ان قصے کہانیوں میں کاہن، چڑیل، بھوت پریت، پریاں، جنات اور دیگر مافوق الفطرت کردار علاقائی انداز میں نظر آتے ہیں۔ ان علاقوں میں اسلام کی آمد کے بعد مذہبی نوعیت کے قصے بھی پورے آب و تاب کے ساتھ در آئے۔ خصوصاً اولیائے کرام اور آئمہ طاہرین علیہ السلام سے منسوب ایمان افروز داستانیں مقبول عام ہوئیں۔

ہنزہ و نگر سے متعلق ان مقامی کہانیوں کو ایک انگریز پولیٹیکل ایجنٹ ڈی ایل آر لارنمر (D.L.R.Lorimer) نے وزیر امامیار بیگ نامی ایک مقامی معروف شخصیت کے تعاون سے انگریزی زبان میں منتقل کرنے کے بعد ۱۹۳۵ء میں اوسلو سے شائع کیا۔ یہ مجموعہ نایاب تھا لیکن ۱۹۸۷ء میں لوک ورثہ اسلام آباد نے اُسے دوبارہ طبع کیا ہے۔ اب حال ہی میں دو مقامی قلمکاروں عبداللہ جان ہنزائی، اور سید یحییٰ شاہ نے بالترتیب ''ہنزہ کی لوک کہانیاں'' اور ''بروشال کی مقبول اور سچی دیومالائی کہانیاں'' کے عنوان سے شائع کیں۔

خطہ بروشال کی لوک کہانیاں

کاہن تالی اور اُسکی پری زاد بیوی:

کہتے ہیں کہ علاقہ بگروٹ گلگت میں ایک زبردست کاہن تھا۔ اُس نے اپنے فن کے زور سے ایک پری کو تابع کر کے اُس سے شادی رچائی۔ ایک عرصہ کے بعد اس پری زاد کے بطن سے ایک لڑکی بھی پیدا ہوئی۔ ہوا یوں کہ ایک دن اُس زمانے کی ڈوگرہ انتظامیہ کو سرکاری سامان سکردو پہچانے کیلئے قلیوں کی ضرورت پیش آئی۔ اُس دور میں بیگار لی جاتی تھی اور اتفاق سے اُس وقت اہلیان بگروٹ کی باری آئی۔ اب جو لوگ سامان ڈھونے کیلئے منتخب ہوئے ان میں معروف کاہن تالی بھی شامل تھا۔ یوں قلیوں کا یہ قافلہ سامان پیٹھ پر اٹھائے سکردو روانہ ہوا۔ راستے میں ''مقپونی شوارن'' اور ''عالم پُل'' کے درمیان کسی مقام پر یہ قافلہ ستانے کیلئے رک گیا۔ اس دوران کاہن تالی پر عجیب سی کیفیت طاری ہوئی۔ وہ سدھ بدھ ہو کر خلاؤں میں گھورنے لگا اور یکا یک ایک طرف نکل کھڑا ہوا اور ساتھ ہی پہاڑ پر چڑھ کر دیکھتے ہی دیکھتے غائب ہو گیا۔ یہ دیکھ کر اُس کے ساتھی حیران و پریشان ہو گئے۔ ایک عرصہ کے بعد پتہ چلا کہ شامان تالی کو اسکی پریزاد بیوی اٹھا کر لے گئی تھی۔ کیونکہ پیچھے تالی کی غیر موجودگی میں اُسکی بیٹی نے لاعلمی میں ماں کے بالوں کی وہ گانٹھیں کھولی تھیں جنہیں ایک عرصہ پہلے شامان تالی نے مخصوص منتر پڑھ کر لگائی تھیں اور جن کے اثر سے پری تابع ہو گئی تھی۔ جونہی بیٹی نے گانٹھیں کھولیں وہ اپنی اصلی ہیئت میں آ گئی اور آزاد ہو گئی لیکن ساتھ ہی شوہر اور بیٹی کو بھی نامعلوم مقام پر



ہنزہ کی روایتی ٹوپی بناتے ہوئے دو دستکار خواتین

لے گئی۔ لوگوں میں مشہور ہے کہ شامان تالی آج بھی زندہ ہے اور پری نے اُسے ایک آرام دہ ٹوکری میں رکھا ہوا ہے۔

شون گُگر اور ہُو کے مموٗ:

ایاشوتھم (ہنزہ کا ایک قدیم حکمران) کے زمانے میں دو مشہور کاہن شون گُگر اور ہو کے گزرے ہیں۔ شون گگر چپ دست تھا جسکی اولاد آج بھی ہنزہ میں آباد ہے۔ کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ ایک حاملہ گائے التت (ہنزہ کا ایک معروف گاؤں) میں چر رہی تھی۔ ایاشوتھم نے دونوں کاہنوں سے پوچھا کہ گائے کے پیٹ میں جو بچھڑا ہے اُس کا رنگ کیسا ہے؟ شون گگر نے پیشین گوئی کی کہ بچھڑا نر ہے اور اُس کے ماتھے پر سفید دھبہ ہے جبکہ ہو کے مموٗ نے بتایا کہ بچھڑا مادہ ہے اور اسکی دُم پر سفید نشان ہے اور اتفاق سے وہی دُم اُس کے ماتھے پر آ گئی ہے۔ بعد میں گائے نے بچھڑا دیا تو شون گگر کی بات سو فیصد ثابت ہوئی۔

کہتے ہیں کہ ایک دوسرے موقعہ پر دونوں کاہن چنار کے ایک درخت کے نیچے ناچنے لگے اور بیخودی کی کیفیت میں پیشین گوئی کی کہ حاملہ رانی کے بچے کی بند مٹھی میں جو کے دانے ہیں اور دوسری مٹھی میں اون ہے۔ بعد میں اُن کی یہ پیشن گوئی بھی درست ثابت ہوئی۔ یوں نومولود کا نام ہری تھم رکھا گیا۔ بروشسکی زبان میں جو کو ہری کہتے ہیں اور تھم کا مطلب ہے راجہ۔ اُن کی ایک اور پیشن گوئی تو بہت ہی مشہور ہے۔ انہوں نے بہت پہلے کہا تھا کہ آنے والے دنوں میں لوگ پرندوں سے بھی بلند تر پرواز کریں گے (مراد جہاز اور سیارے) اور نیلی آنکھوں والا بادشاہ (مراد انگریز) گلگت ہنزہ اور نگر پر حکومت کرے گا۔ پھر دریاؤں پر لوہے کے پُل نصب ہونگے کہتے ہیں کہ شون گگر اسی دوران پیشن گوئی کرتے کرتے اچانک اوجھل ہوا اور ایک برس بعد دسمبر کے مہینے میں وارد ہوا۔ وہ اپنے ہمراہ جو کے ہرے خوشے بھی لایا تھا۔ غائب ہونے کی وجہ بتاتے ہوئے کہا کہ اُسے پریاں اٹھا کر لے گئی تھیں۔ انہوں نے اُس کے ساتھ بہت عمدہ سلوک کیا اور واپس آنے دیا۔ واپس آتے ہوئے وہ ایک جنگل سے گزرا جہاں کسی نوکدار چیز کے لگنے سے اسکی ایک آنکھ بھی ضائع ہوگئی۔ شون بروشسکی زبان میں کانے یا اندھے کو کہتے ہیں لہذا اس واقعہ کے بعد اُس کا نام شون گگر پڑ گیا۔

چپورسن کی تباہی:

قدیم دور میں وادی چہ پرساں (وادی چپورسن کا ایک گاؤں) (چپورسن) گنجان تھا اور اس علاقے میں تین سو گھرانے آباد تھے اور بتاتے ہیں کہ اُس زمانے میں وہاں کا موسم بہت معتدل ہوتا تھا اور گندم بھی کاشت کی جاتی تھی۔ انہی دنوں ایک پیر بزرگ حضرت بابائے غندی بخارا سے براستہ غنڈ (بلتستان کی ایک مشہور وادی) ہنزہ تشریف لائے۔ بعض لوگ انہں امام پنجم حضرت امام محمد باقرؑ سمجھتے ہیں۔ جس وقت آپ چپورسن پہنچے تو بدمست لوگوں نے بجائے پزیرائی اور خاطر مدارت کے ستایا اور پتھر برسائے۔ دراصل انہیں آپ کے پند و نصائح پسند نہیں آئے۔ آپ رشت نامی گاؤں سے سپنج کی طرف تشریف لے گئے۔ وہاں ایک بوڑھی عورت نے آپ کو رات بسر کرنے کیلئے جگہ دی اور دودھ روٹی سے تواضع کی۔ اگلے روز روانگی سے پہلے آپ نے بڑھیا سے فرمایا کہ وہ اپنا ساز و سامان کسی محفوظ مقام پر لے جائے۔ بڑھیا نے جواب دیا کہ ایک غربال کے سوا اُس کا کوئی خاص سامان نہیں اور وہ بھی کوئی ہمسایہ لے گیا ہے۔

اگلے روز سیاہ بادل امنڈ آئے، پہاڑوں پر بجلی کڑکی، موسلا دھار بارش شروع ہوئی اور ندی نالوں سے پانی ابلنے لگا۔ نتیجہ یہ کہ وادی میں زبردست سیلاب آیا۔ اہل وادی اس طوفان میں غرقاب تو ہو گئے لیکن بڑھیا کی جھونپڑی سلامت رہی۔ وہ جگہ اب بھی ''کمپیر ے دیور'' یعنی بڑھیا کی جھونپڑی کے نام سے معروف ہے۔ بڑھیا نے سیلاب کے دوران دیکھا کہ پیر محترم سبز لباس میں ملبوس پانی کے اوپر یوں چل رہے ہیں جیسے لوگ زمین پر چلتے ہیں اور غربال بھی پانی میں تیر رہا ہے۔ بڑھیا نے حضرت صاحب سے اپنا غربال مانگا تو آپ نے اپنی عصائے مبارک بڑھا کر غربال تھما دیا۔ اس کے بعد پیر محترم اشکوک تشریف لے گئے۔ اشکوک پاس ہی سو گھروں پر مشتمل ایک گاؤں تھا جو ایک نیلگوں جھیل کے کنارے واقع تھا۔ روایت ہے کہ اُس جھیل میں ایک آبی عفریت کا بسیرا تھا جسکی خوراک کیلئے گاؤں والے روزانہ ایک جوان کی قربانی دیتے تھے۔ پیر بزرگ جس وقت گاؤں تشریف لے گئے تو ایک ستم رسیدہ نوجوان خود کو قربان کرنے کیلئے جھیل کے کنارے اداس بیٹھا تھا۔ ادھر پیر بزرگ نوجوان کے ساتھ ہی اژدھا کے انتظار میں بیٹھے رہے اور جونہی وہ نمودار ہوا بزرگ نے روحانی طاقت سے اسے ختم کیا۔ جھیل اب خشک ہوگئی ہے لیکن عفریت کی ہڈیاں اب بھی وہاں ٹکڑوں کی صورت میں ملتی ہیں۔ اس کے بعد پیر محترم اشت نالہ تشریف لے گئے۔ وہاں بزرگ کے پنجہ مبارک کے نشانات اب بھی دیکھے جا سکتے ہیں۔ علاوہ اس کے شہر سبز (وادی چپورسن کا ایک گاؤں) میں وہ پتھر بھی موجود ہے جس پر آپ نے عبادت کی تھی۔

بتایا جاتا ہے کہ میر ہنزہ شاہ سلیم خان کے دور میں چپورسن کی تمام آبادی ایک اور سیلاب کے باعث تباہ ہوگئی لیکن مرزا مبارک محفوظ رہا۔ کئی برس بعد ایک اور بزرگ سید شاہ تعلیم اپنے فرزند کے ساتھ چپورسن تشریف لائے اور دونوں وہیں مدفون ہیں۔

والی ہنزہ شاہ بیگ کے زمانے میں ایک دوسرے بزرگ سید شاہ ولی بابائے غندی کی زیارت کیلئے تشریف لائے اور حضرت شاہ تعلیم سے بھی ملے۔ انہوں نے حضرت شاہ ولی کو روانگی کی اجازت نہیں دی لہذا آپ درویشوں کی ایک مختصر سی جماعت کے ساتھ پہاڑ پہاڑ سفر کرتے ہوئے ہنزہ وارد ہوئے۔ آپ کچھ عرصہ ہنزہ میں مقیم رہے اور کہا جاتا ہے کہ وہاں ایک پہاڑی مقام پر اپنے عصائے مبارک سے سوراخ کیا جہاں سے چشمہ پھوٹ پڑا۔

حضرت شاہ بریا ولی کی داستان:

ایک مرتبہ کا ذکر ہے کہ ریاست نگر کا ایک راجہ شاہ کمال، دنیگ ملک (مقامی حکمران طبقے کا ایک فرد) کے قبیلے کے ایک فرد کے ہاتھوں تاج وتخت سے ہاتھ دھو بیٹھا اور بہر کے راستے شگر (بلتستان کی ایک مشہور وادی) پہنچا اور ایک صاحب کشف بزرگ سید شاہ بُریا کے حضور بازیابی تخت کیلئے التماس دعا کیا۔ پیر بزرگ نے شاہ کمال کو واپس نگر جانے کی ہدایت کی اور ساتھ ہی مدد کا بھی یقین دلایا۔ شاہ کمال حسب ہدایت اپنے دو معتبران کے ساتھ روانہ ہوا لیکن علاقہ ہو پر (علاقہ نگر کا ایک پہاڑی اور گلیشیائی مقام) میں مخالفین کی طرف سے موانداندانہ پیشوائی سے سخت پریشان ہوا۔ آخر کار ایک لولے لنگڑے شخص کی معیت میں وہ نگر پہنچا تو دیا جلا لنے کا وقت ہو چکا تھا۔ قلعے کے صدر دروازے پر پہنچا تو دربان کو محو خواب پایا۔ وہ بے دھڑک اندر گھس گیا پھر خوش بختی کہ اس پر کسی کی نظر بھی نہیں پڑی۔ یوں اُس نے غاصب شخص کو قتل کیا اور دوبارہ تخت پر جا بیٹھا۔

اس واقعے کے ایک برس بعد موسم سرما میں حضرت شاہ بریا ولی براستہ ہسپر نگر تشریف لے گئے۔ خون جمانے والی سردی تھی لہذا شاہ محترم کے ایک ساتھی نے خود کو گرم کرنے کیلئے آگ روشن کرنے کی درخواست کی۔ شاہ صاحب نے کراماتی طاقت سے آگ روشن کی۔ دریں اثنا اُن میں سے ایک درویش ایک برفانی شگاف میں گر کر غائب ہو گیا۔ پیر بزرگ نے فوراً اپنی لاٹھی شگاف میں پھینک دی۔ شاہ صاحب اور اُنکے ساتھی گلیشیر کے دوسری طرف پہنچے تو بچھڑے ہوئے ساتھی کو سلامت پایا۔

اثنائے سفر انہوں نے پتھر کی ایک مسطح سل دیکھی جسے شاہ صاحب نے نماز کیلئے موزوں سمجھا لہذا جماعت پتھر کی سل اپنے ساتھ لے گئی جو آج بھی ''چھ ملنگ'' نگر میں موجود ہے۔ پیر صاحب جب نگر پہنچے تو شاہ کمال نے زبردست استقبال کیا اور خوب خاطر مدارت کی جس کے بدلے میں آپ نے ایک درویش کو ناشپاتی کے ایک درخت پر چڑھنے کا حکم دیا۔ ہر چند کہ موسم سرما کا تھا لیکن روایت کے مطابق درویش نے جونہی درخت کی شاخیں ہلائیں پکی ہوئی ناشپاتیاں ٹھک ٹھک گرنے لگیں۔ حضرت صاحب نے وہ ناشپاتیاں شاہ کمال کو بھجوا دیں۔ شاہ کمال آپ کی کراماتی طاقت سے بہت مرعوب ہوا اور آپ سے دریافت کیا کہ یہ کرامت کیسے رونما ہوئی لیکن آپ نے کچھ بتانے سے انکار کیا۔ شاہ کمال کے برابر اصرار پر آپ نے اُس کے ہاتھ پر تھوک دیا جس سے فوراً ایک مینڈک پیدا ہوا۔ شاہ کمال نے مینڈک اپنے رومال میں لپیٹا اور گھر کی طرف روانہ ہوا۔ گھر میں داخل ہونے سے پہلے مینڈک کو ایک جانب پھینک دیا اور رومال اپنی ایک شہزادی کو دیا۔ شہزادی نے اس رومال سے جب اپنا منہ صاف کیا تو وہ پوشیدہ چیزیں بھی دیکھنے کی قابل ہوئی۔ آخر کار حضرت صاحب گلگت تشریف لے گئے۔ گلگت پہنچے تو وہاں کے راجہ نے آپ کی ''پشوائی'' کیلئے کسی کے ہاتھ ایک مردہ بلی بھیج دی۔ آپ نے دست مبارک بلی کے جسم پر پھیرا تو بلی زندہ ہو گئی اور ایک طرف بھاگ گئی اور راجہ صاحب کیلئے شرمندگی کا باعث ہوئی بہر حال راجہ نے آپ سے معافی مانگی آپ نے اُسے بخش دیا اختتاماً آپ عازم چترال ہوئے اور والئی گلگت سے چترال چلنے کو کہا تا کہ وہاں آپ کی زیارت کی مجاوری کر سکے۔ لیکن والئی گلگت نے مجاوری پر تاج وتخت کو ترجیح دی جسکے باعث آپ سنگ علی نامی ایک خدمت گار کے ساتھ خود ہی چترال روانہ ہوئے۔ سنگ علی باوفا خدمتگار تھا اسلئے ایک عرصہ تک زیارت کی خدمت کی۔ مہتر چترال نے اس وفاداری کے عوض سنگ علی کو نہ صرف رہنے کیلئے مکان دیا بلکہ اپنا جانشین بھی مقرر کیا کیونکہ مہتر کی نرینہ اولاد نہیں تھی۔ اس کے بعد سنگ علی نے عنان حکومت سنبھالی۔ اس لئے ہنزہ نگر اور چترال میں آج بھی ازراہ طنز کہتے ہیں ''لوبھی اولاد سنگ علی بھی حاکم بن گئی'' مراد بیٹھے بٹھائے حکومت مل گئی۔

عیاشو ملک اور منکر نکیر:

ہنزہ میں عیاشو ملک اور منکر نکیر کی کہانی بہت مقبول ہے۔ روایت کے مطابق بہت پہلے ہنزہ میں عیاشو ملک نام کا ایک طاقتور راجہ تھا جو بعض مخفی طاقتوں کا مالک تھا۔ عوام واکابرین عیاشو ملک سے حد درجہ مرعوب رہتے تھے۔ رضائے الٰہی ایک مرتبہ راجہ بیمار پڑ گیا اور بیماری طول پکڑ گئی اور بچنے کی کوئی امید نہ رہی۔ اپنی مخدوش حالت دیکھتے ہوئے راجہ کے دل میں ایک بات آ گئی اور اُس نے اپنے مقربین اور ہمراز معتبران کو دربار میں طلب کیا۔ جب جملہ اکابرین جمع ہوئے تو راجہ نے انہیں بتایا کہ اُس کا آخری وقت قریب آیا ہے لہذا وہ چاہتا ہے کہ بطور وصیت چند ایک اہم باتیں اُن کے گوش گزار کرے تا کہ بعد میں لوگ اُس پر فی الفور عمل کریں۔ لہذا اُس نے تاکیداً انہیں بتایا کہ اُس کے فوت ہوتے ہی قبر میں

اسکی لاش کے ساتھ ایک خنجر ضرور رکھ دیں کیونکہ وہ منکر نکیر کے ساتھ مقابلہ کرنا چاہتا ہے۔ اوروں کی طرح اُن فرشتوں کے سامنے سر جھکانا نہیں چاہتا۔ راجہ کی باتیں سن کر اکابرین مایوس تو ہوئے لیکن زبان سے کچھ کہہ نہیں سکے۔ راجہ نے بات آگے بڑھاتے ہوئے کہا کہ ''جس روز اس کی لاش قبر میں لٹائی جائے تو قبر پر صرف پتھر کی سل رکھ دیں اور زرا دور بیٹھ کر لوگ منکر ونکیر کے ساتھ اسکی کشمکش کی آوازیں سن لیں۔ جب کشتی اور زور آزمائی کی دھما چوکڑی بند ہو تو نزدیک آکر سل کو ذرا ہٹا کر قبر میں جھانکیں۔ اور ہاں خنجر اگر زمین میں الف گڑا ہوا ہو تو خیال کرنا کہ میں جیت گیا ہوں۔ خنجر زمین پر یونہی پڑا ہوا ہو اور میں چت لیٹا ہوا دکھائی دوں تو اس کا مطلب ہے کہ منکر نکیر وار کر گئے ہیں۔

اس وصیت اور بات چیت کے بعد کچھ دن گزر گئے اور عیاشو ملک فوت ہوا۔ اکابرین و معتبرین نے راجہ کی وصیت کے مطابق قبر میں ایک خنجر رکھا اور قبر پر ایک سل ٹکا دیا اور ذرا ہٹ کر دھڑکتے دلوں کے ساتھ آنے والے پراسرار حالات کا انتظار کرنے لگے۔ کچھ وقت گزرا ہی تھا واقعی خوفناک آوازیں آنی شروع ہوئیں جیسے دو مست سانڈ لڑ رہے ہوں یا زلزلہ آیا ہوا ہو۔ کچھ دیر یہ سلسلہ جاری رہا پھر آہستہ آہستہ آوازیں مدھم ہوئیں اور خاموشی چھا گئی۔ لوگ اسی لمحے کا انتظار کر رہے تھے پھر بھی ڈرتے ڈرتے آگے بڑھے اور سل ہٹا کر قبر میں جھانکا تو کیا دیکھتے ہیں کہ خنجر زمین میں سیدھا گڑھا ہوا ہے اور عیاشو ملک منہ کے بل لٹا ہوا تھا۔ لوگ اُن دنوں مذہب سے بیگانہ تھے۔ مہتر کی جیت سمجھتے ہوئے بہت خوش ہوئے اور بعد ازاں حسب دستور قبر کو مٹی سے ڈھک دیا اور تعجب کا اظہار کرتے ہوئے گھروں کو لوٹے۔

ایک اور روایت کے مطابق جب بھی کسی شخص یا جانور کا پاؤں عیاشو ملک کی قبر پر پڑ گیا تو لوگوں نے دیکھا کہ بعد میں اس کا پاؤں ضرور زخمی ہوا۔ اس طرح لوگ خوف کے مارے قبر سے دور ہی رہے۔ یوں قبر کو خود رو اور قد آور جھاڑیوں نے ڈھک دیا اور خود بخود یہ مزار محفوظ رہا۔ آج بھی یہ قبر بلتت میں موجود ہے اور لوگ اس سے طرح طرح کی مافوق الفطرت باتیں منسوب کرتے ہیں۔

لوک گیت

گریئیے بیئت:

بروشو لوک ادب میں ''گریئیے بیئت'' ایک مقبول لوک گیت ہے۔ یہ دراصل ایک قریب المرگ زخمی ہرنی اور اُس کے بچے کا جزباتی مکالمہ ہے۔ ہرنی ایک بے رحم شکاری کی گولی کا نشانہ بنتی ہے لیکن اپنی بے بسی اور لمحہ بہ لمحہ قریب آتی ہوئی موت کو بچے پر ظاہر کرنا نہیں چاہتی لیکن وہ ایسا نہیں کر پاتی۔ بچے کے سامنے خون آلود ماتھے کے ساتھ دم توڑتی ہے۔ یہ المیہ مکالمہ کچھ یوں ہے۔

	بروشسکی	ترجمہ
بچہ	واوامی شکر مماحئ	ہاں میری پیاری ماں، ہائے!!
	وایارے ایسے دلامینن دیابرے نا	آہ دیکھو تو! نیچے نہر کنارے کوئی آرہا ہے
زخمی ہرنی	واوامی اونیا ائی ہونکترژن بئ	ہاں میرے لخت جگر کوئی چرواہا ہے
بچہ	وا اوامی شکر مماحئ ! وتو ماقے ژوون ژک ہیئے نا	آہ ماں! اُس کے پاس تو بندوق کے فلیتے ہیں
زخمی ہرنی	واوامی اونیا ایئی وگشکے ایفاغوبی نا!	ہاں میری جان! اُس کے پاس رسی کی لاٹھی ہے
بچہ	واوامی شکر مماوا تو ماقے نظرار گیمی نا!	ہائے میری پیاری ماں وہ تو نشانہ باندھ رہا ہے
زخمی ہرنی	واونیا ائی! ہوئے سہ ژرائی ٹے بئ نا!	آہ میرے بچے! وہ تو مویشیوں کی نگرانی کر رہا ہے
بچہ	واوامی شکر مما گوپھئ خہ ملتن نن یے شبانا	ہائے ماں! میں تو تمہارے ماتھے پر خون دیکھ رہا ہوں
زخمی ہرنی	واواوا اونیا ایئی ! اُن دوکو منومولو تُرملترابا!	ہاں میرے بچے! تمہاری پیدائش پر میں نے ابٹن ملا تھا
بچہ	واوامی شکر مماوا موجہ بہ میابانی؟	ہائے ماں! اب میں کہاں جاؤں؟
زخمی ہرنی	وا اوا اونیا ایئی ! واگری ہلدن اے کامنے نا!	ہاں میرے گوشہ جگر تو ہرنوں کے ریوڑ میں شامل ہو جانا!
بچہ	وا اوا می شکر مماحئ !تورنگ آٹم تورنگ آژاوش چی یے نا!	ہائے ماں! وہ تو مجھے سینگوں پر رکھ لیں گے
زخمی ہرنی	وا اوا اونیا ائی ! تھریسئی اے میراث بلہ نا	ہاں میرے نور نظر یتیمی کی یہی میراث ہے
بچہ	واوامی شکر مما! واٹیے چھرژ ریس اتوسم نی	ہائے ماں کاش کہ تو پہاڑ پر چڑھ دوڑتی
زخمی ہرنی	وا اوا اونیا ایئی ، جا مشقت اکھولے بلونا	ہاں میرے بچے میری قسمت میں یہ تکلیف نقش تھی
بچہ	واوامی شکر مما! واجا اسن چہ پھوون چھی چی لہ	ہائے ماں میرے سینے میں آگ سی لگی ہے

زخمی ہرنی	واواوالہ اونیا ایئی! ایتی دوغائسن دشن لودوعاشی	ہائے میرے بچے! اس کا فیصلہ روز آخرت میں ہوگا
بچہ	واواوامی لشکر مماحئی! واغقئی گوچھونگ ترنگ نہ گودیلیا؟	ہائے ماں! کیا اُس ظالم نے تمہاری آنتوں کو چھلنی کر دیا
زخمی ہرنی	واواوالہ اونیا ایئی! ایئے ایمی ین یسن یردوغونیش	ہاں بچے! یہ دن شکاری کی ماں بہن کو بھی دیکھنے پڑ جائیں

قُلیولسکر اور پراسرار گدھا:

بزرگ بتاتے ہیں کہ قدیم زمانے میں بلتت ہنزہ میں اخروٹ کا ایک سالخوردہ درخت ہوا کرتا تھا جس پر کسی چڑیل کا بسیرا تھا۔ اندھیرا پھیلتے ہی کسی کی کیا مجال کہ اُس کے قریب بھی پھٹکے۔ مشہور تھا کہ رات کے وقت جو بھی وہاں سے گزرے بچتا نہیں ہے۔ پھر یہ بات بھی زبان زد عام تھی کہ دو آدمی اُس درخت کے پاس جائیں تو ایک جان سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے اور دوسرا بچ نکلتا ہے۔ کہتے ہیں کہ یہ سلسلہ ایک عرصہ تک جاری رہا۔ ہوتے ہوتے راجہ کو بھی اس کی خبر ہوگئی۔ راجہ، راجہ ہوتا ہے طیش میں آیا اور درخت کو بیخ و بن سے اکھیڑنے کا حکم دیا۔ لوگ تو اسی دن کا انتظار کر رہے تھے لہذا تیشے کلہاڑے لیکر درخت کے پاس جمع ہوئے اور ضربیں لگانی شروع کیں۔ لیکن یہ کیا؟ جونہی درخت پر ضرب پڑتی خون بہنے لگتا۔ جیسے درخت نہ ہو بلکہ جیتا جاگتا انسان ہو۔ لوگ اُس درخت کے وجود سے تنگ آئے ہوئے تھے اس لئے اُن کے ہاتھ نہیں رُکے اور وہ لوگ برابر وار کرتے رہے اور آخر کار درخت کو گرا کر دم لیا۔ جونہی درخت دھڑام سے زمین بوس ہوا گرے ہوئے تنے سے تنومند گدھا برآمد ہوا اور بیچ مجمع اکڑ کر کھڑا ہوا۔ لوگ حیران تھے کہ اب کیا کیا جائے۔ وہیں قلیولسکر نام کا ایک دلیر شخص بھی موجود تھا جو بھوت پریت سے بالکل بھی نہیں ڈرتا تھا۔ اس جری جوان کا تعلق ہنزہ کے غلوانگ نامی ایک قدیم خاندان سے تھا۔ اُس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ ایک لٹھ گھما کر گدھے کی پیٹھ پر رسید کیا۔ اُس کے دیکھا دیکھی ایک اور جوان آگے بڑھا اور ڈنڈے کا ایک زوردار وار کیا۔ مار کھاتے گدھا آہستہ آہستہ چلتا رہا اور ایک جگہ پہنچا جو آج بیریشل کے نام سے معروف ہے۔ اُس جگہ ایک چٹان تھا جس کے اندر جا کر وہ گدھا غائب ہوا۔

یہ وہ زمانہ تھا جب ہنزہ کے دو مشہور شامان ہُو کے مو اور شون گلگر کا ڈنکہ بجتا تھا۔ لوگ ایسے موقعوں پر فوراً انہی سے رجوع کرتے تھے۔ لہذا دونوں حاضر ہوئے اور اپنے مخصوص منتروں کے ذریعے گدھے کے اثرات بد سے لوگوں کو محفوظ کیا۔ وہ دن آج کا دن پھر کسی بندہ بشر نے اُس پراسرار گدھے کو نہیں دیکھا۔

لوک لباس، زیورات اور دیگر سامان آرائش:

سینہ بہ سینہ سے پتہ چلتا ہے کہ علاقہ بُروشال قدیم زمانے میں لباس اور پہناوے کے حوالے سے جمالیاتی کمال سے عاری اور نفاست کے اعتبار سے سادہ تھا۔ اس کی وجہ متمدن دنیا سے دُوری اور وسائل کی کمی تھی۔ لوگ محدود پیمانے کی چوپانی کاشتکاری سے جُڑے ہوئے تھے۔ بھیڑ بکریوں سے جو اون حاصل ہوتی اُس سے کھردرا اور موٹا کپڑا تیار کرتے جسے مقامی زبان میں پھلم کہا جاتا ہے۔ یہ اون سیاہ، سفید اور بھورا تین رنگوں میں ملتی ہے۔ بھورا یا خاکستری رنگ میل خور خاصیت کی وجہ سے یہاں بہت مقبول ہے۔ یہ پٹو مختلف معیار کا تیار ہوتا ہے۔ اونٹ کے اون کا پھلم سب سے عمدہ سمجھا جاتا ہے۔ یاک کے اون کا پٹو بھی تیار کیا جاتا ہے جسے مقامی طور پر ''غوروپ پھلم'' کہتے ہیں۔ بہت گرم پٹو ہوتا ہے۔ بہت معیار کا پٹو اُوَخر پھلم کہلاتا ہے۔ اون باف طائفے کو ''گوشش کویو'' کے تحت اون باف سے اپنی ضرورت کے مطابق اونی پٹو حاصل کرتے تھے اور خواتین اس سے لباس تیار کرتی تھیں۔

زنانہ اور مردانہ آرائشی لباس:

گئے دنوں میں خطہ بروشال کے مردوں کا عام پہناوا ایک لمبا کرتا ہوا کرتا تھا جسکو فراجی یا در بسسکی گُردی کہتے تھے۔ البتہ سردیوں میں اس کُرتے کے اُوپر طویل بازوؤں والا ڈھیلا ڈھالا چوغہ بھی پہنتے تھے جسے شوقہ بھی کہتے ہیں۔ شوقہ آج بھی اپنی افادیت کے باعث مقبول ہے اور سردیوں کا عام لباس ہے۔ پرانے دنوں میں شوقہ کے اوپر پٹکا بھی باندھتے تھے جسے ''اوش شم'' کہا جاتا ہے۔ اوش شم'' جہاں شوقہ کو سنبھالتا تھا وہاں بھوک کے احساس کو بھی دباتا تھا۔

بروشو معاشرہ میں ٹوپی کو خصوصی اہمیت حاصل ہے لہذا مرد و زن بلکہ لڑکے بھی ٹوپی ضرور پہنتے تھے۔ وقت کے ساتھ ساتھ رویوں میں تبدیلی لازمی امر ہے۔ لہذا اب پرانی بات نہیں رہی ننگے سر گھومنا اب اتنا معیوب نہیں رہا۔ مردوں کی ٹوپی وہی ہے جو صوبہ سرحد میں پہنی جاتی ہے۔ البتہ خواتین کڑھائی والی ٹوپیاں پہنتی ہیں۔ یہ ٹوپیاں ''گوشسکی پھرچن'' کہلاتی ہیں۔ اس طرح کی کڑھائی کو اراغی اے چُک کہتے ہیں۔ یہ دراصل دُوغلا ٹانکا ہوتا ہے جس میں دلکش ہندسی شکلیں ہوتی ہیں۔ اس طرح کی ٹوپیاں ذرا ایک تبدیلی کے ساتھ ازبک اور تاجیک خواتین بھی پہنتی ہیں۔ یہ ٹوپی اطراف سے گول اور اوپر سے سمسطح ہوتی ہے۔ اندر کی جانب زم گتہ بھی لگایا جاتا ہے تاکہ ٹوپی پچک نہ جائے۔

قدیم زمانے میں خواتین اور مرد لمبے اونی کرتے زیب تن کرتے تھے

خواتین ایسے کُرتے کے اوپر سینے کے ساتھ ایک تھیلی بھی لٹکائے رکھتی تھیں جس میں سرمہ کی سلائی اور توتیا کا ڈھیلہ بھی رکھتی تھیں جسے دُلے بٹون کہتے تھے۔ایک روایت کے مطابق ہنزہ میں پاجامہ ۱۸۰۰ء کے آس پاس جبکہ نگر میں ۱۸۳۰ء میں کہیں متعارف ہوا۔البتہ لمبے اونی کرتے، پاجامہ اور قمیض دونوں کیلئے کافی تھے۔

ہنزہ نگر کی اشرافیہ اور حکمران طبقہ کاشغر، بدخشان، سریقول اور کشمیر سے درآمد شدہ کپڑے سے اپنے لئے لباس بناتے تھے۔اس طرح کے سوتی اور ریشمی کپڑے پاس پڑوس کے علاقوں پر حملے کے دوران بھی ہتھیا لیے جاتے تھے۔اُس زمانے میں مردانہ کپڑا ''خام'' کہلاتا تھا۔یہ سفید رنگ کے کھدر کی طرح کا کپڑا ہوتا تھا جو عموماً یارقند یا کاشغر سے آتا تھا۔یہ بھی ہر کس و ناکس کی پہنچ سے باہر تھا۔محدود پیمانے پر صاحب حیثیت افراد حکمران یا وزراء کا طبقہ استعمال کرتا تھا۔۱۸۶۰ء کے بعد کشمیر سے کورالٹھا، جاپانی مارکہ لٹھا، سمر اور دوگھوڑا بوسکی کا بھی چلن رہا۔رعایا میں سے کسی کو قیمتی سے مزین دیکھتے تو راجے اُس شخص کی سخت باز پرس کرتے بلکہ سزائیں تک دیتے تھے۔

زنانہ پارچات میں شاہی لمبوق ادرسی اُرُوسی فرنگی تیکے پچی، جلوان، توار، قم خاب (کمخواب)، ماحوت وغیرہ شامل تھے۔

۱۸۶۰ء کے بعد ہی اِن علاقوں میں سلائی مشین پہنچ گئی تو اُن کپڑوں سے قدرے نفیس ملبوسات تیار ہونے لگے۔ان علاقوں میں خواتین کا لباس ہمیشہ سے ڈھیلا ڈھالا رہا ہے۔چست لباس عریانی کے مترادف جانتے ہیں۔تکے پچی ایک لکیردار کپڑا ہوتا تھا جس سے خواتین اپنے لئے شلوار تیار کرتی تھیں۔اُروسی فرنگی پھولدار پرنٹ کا کپڑا ہوتا تھا۔اس طرح توار اور ماحوت کا شمار بھی اچھے اور قیمتی کپڑوں میں ہوتا تھا۔مزری، ڈبرذین اور ڈکے پچی عوامی کپڑا تھا جو مردوں کیلئے مخصوص تھا۔لوگوں میں قوت خرید نہیں تھی۔محنت مزدوری سے جو معمولی رقم ملتی اُس سے شادی بیاہ، عیدین یا مقامی تہواروں کے موقع پر نیا جوڑا بنوایا جاتا تھا۔مردانہ جوڑے کو ''کرڈی گوپلتنگ'' اور زنانہ جوڑے کو ''اُوٹس اُیاٹسے گٹو'' کہتے تھے۔کھاتے پیتے گھرانوں کی خواتین خاص موقعوں پر گلُبوری دون (دوپٹہ) اوڑھتی تھیں جو چین سے آتا تھا۔پاپوش کیطور پر خواتین اور مرد حضرات مارخور یا بکرے کے چمڑے سے مقامی طور پر تیار شدہ جوتے پہنتے تھے۔ان جوتوں کا تلوار بھی نرم ہوتا تھا۔یہ جوتے گھر گھر بنتے تھے۔بعض شوقین حضرات چمڑے کو رنگتے بھی تھے۔رنگائی کیلئے خوبانی کے درخت کے چھلکوں کو ابالتے تھے جس سے غضب کا تیز سرخ رنگ نکلتا ہے۔اسی رنگین پانی میں چمڑا گھنٹوں تک بھگوئے رکھتے۔بعد ازاں چمڑے کو خشک کر کے اس سے ناپ کے مطابق پاپوش تیار کیا جاتا تھا۔اِن جوتوں کو بُچو کہتے ہیں۔یہ جوڑے بڑے آرام دہ ہوتے ہیں۔اس طرح کے جوتوں کا رواج بھی کب کا ختم ہو چکا ہے۔اب لوگ نت نئے فیشن کے تیار شدہ جوتے پہنتے ہیں۔

فی زمانہ ہنزہ نگر میں ادھیڑ عمر افراد سردیوں میں عام شلوار قمیض کے اوپر خانہ سازیا بنے بنائے سویٹر، کوٹ اور اُن کے اوپر شوقہ پہنتے ہیں۔سردیوں میں بوٹ پہننے کا عام رواج ہے۔گرمیوں میں سادہ شلوار قمیض اور پشاوری چپل پہنتے ہیں۔

شادی بیاہ اور تہواروں کی ملبوسات:

شادی بیاہ کے موقعوں پر دولہا کو سفید شلوار قمیض، سفید اونی ٹوپی اور سرخ رنگ کے بوٹ پہنائے جاتے ہیں۔اس موقعہ پر سیاہ رنگ سے اجتناب کیا جاتا ہے کیونکہ اسے سوگوار اور ماتمی رنگ سمجھا جاتا ہے۔دلہا کی ٹوپی پر مور کی کلغی (لیش) اور کونج کی دُم کے سفید لچکیلے پَر (گمبوری) بھی ٹکائے جاتے ہیں جنہیں گمبوری دولس کہتے ہیں۔اس طرح دُلہن کیلئے ٹشو کپڑے کا جوڑا تیار کیا جاتا ہے۔گھر سے برآمد ہوتے وقت باراتیوں کے جلوس میں دلہا سب سے آگے ہوتا ہے اور کندھے پر تلوار لٹکا کر چلتا ہے۔میاں کو شوخ اور رنگین کپڑے میں لپیٹتے ہیں۔

زیورات:

عورتوں میں زیورات کا قدیم الایام سے رواج ہے۔البتہ اُن کا معیار اور وضع قطع مختلف ادوار میں مختلف رہا ہے۔حکمران طبقہ کی خواتین طلائی اور عام گھرانوں کی عورتیں نقری زیورات استعمال کرتی ہیں۔ان زیورات کا نین نقشہ بدخشانی اور کشمیری ہے۔ان کے نام بھی مقامی نہیں بدیسی ہیں۔اس پیشہ سے منسلک افراد کا تعلق کشمیر سے ہے۔مقامی لوگ یہ کام نہیں کرتے۔علاقے میں حسب ذیل قسم کے زیورات مستعمل ہیں۔

۱۔　ہغوُ رتُومَر:

یہ تکون شکل کا نقری زیور ہے جسے گلے میں لٹکایا جاتا ہے۔اب اس زیور کا بروشال میں کچھ زیادہ رواج نہیں رہا۔خال خال ہی کہیں نظر آتا ہے۔

۲۔　چَسکور:

یہ گول شکل کا تعویز نما زیور ہوتا ہے۔گلے کی زینت کیلئے مستعمل ہے۔چاندی سے تیار کیا جاتا ہے۔

۳۔　چِی یُو:

چاندی کے دو چھوٹے سے خوبصورت پرندے بالمقابل مخالف رُخ پر جڑے ہوئے ہوتے ہیں۔ پیچھے بکسوا لگا ہوا ہوتا ہے جسکی مدد سے خواتین قمیض کے اوپر سینے کے ساتھ ٹانکتی ہیں۔ اس کا رواج بھی ختم ہو رہا ہے۔ البتہ دور دراز دیہاتوں میں کہیں دیکھنے میں آتا ہے۔

۴۔ بازو بینگ:

اس کو پنجاب، سندھ اور بلوچستان کے دیہاتوں میں مستعمل چمپا کلی کی طرح کا زیور کہہ سکتے ہیں۔ یہ دراصل چاندی کے قرص نما صدف ہوتے تھے جو تعداد میں چار پانچ سے زیادہ نہیں ہوتے۔ یہ ہار کی طرح خواتین گلے میں پہنتی تھیں۔ وزنی ہونے کے باعث اب یہ اپنی طلب کھو بیٹھا ہے۔

۵۔ کشوار:

یہ کانوں کی وزنی سی بالیاں ہوتی ہیں۔ چاندی کی تیار کروائی جاتی ہیں۔

۶۔ بُوریئے ہار:

چاندی کی باریک زنجیروں سے جُڑے ہوئے قرص نُما صدف ہوتے تھے جو بطور ہار خواتین گلے کی زینت بناتی تھیں۔

۷۔ چلی بُلبک:

یہ انتہائی باریک موتی ہوتے ہیں جنہیں دھاگے میں پرو کر خواتین گلے میں لٹکاتی تھیں۔

۸۔ کنے زیک:

چاندی کے موتی نما منقش دانے ہوتے ہیں۔ خواتین گلے میں لٹکاتی تھیں۔

۹۔ شاہ مقصودی:

یہ بھی کنے زیک دانوں سے تیار کردہ ہار کی طرح کا زیور ہوتا تھا۔

۱۰۔ بوریئے بدمَ:

یہ کیپسول نما منقش نقرئی دانے ہوتے ہیں۔ انہیں بھی خواتین گلے کی زینت کے لئے استعمال کرتی تھیں۔

۱۱۔ بوریئے بروندو:

یہ چاندی کی سادہ انگوٹھی ہوتی ہے جس میں یاقوت، زمرد، لعل، فیروزہ اور یمن کے ٹکڑے جڑے ہوتے ہیں۔

۱۲۔ وسوسی بروندو:

یہ چاندی کی سہ نگینہ انگوٹھی ہوتی ہے۔ یعنی ایک ہی انگوٹھی کے اوپر تین خول ہوتے ہیں جس میں تین نگینے جڑے ہوتے ہیں۔

۱۳۔ غئی شو:

یہ لباس کے ساتھ مستعمل زیور ہوتا تھا۔ شہادت کی انگلی جتنی لمبی منقش اور مجوف سلاخیں ہوتی تھیں جو اوپر تلے جوڑوں کی شکل میں ہوتی تھیں جسکے ایک رُخ پر بکسوا ہوتا تھا خواتین قمیض پر ٹکاتی تھیں۔

۱۴۔ طوطا موڑ:

یہ بھی پیراہنی زیور ہے۔ مخالف رخ پر دو طوطے ہوتے ہیں۔ ان کے نیچے لمبائی کے رخ پر دانہ دار زنجیر کے یکساں ٹکڑے جھالر کی طرح لٹکے ہوتے ہیں۔ خواتین یہ زیور پہن کر چلتی ہیں تو جلترنگ کی سی مسحور کُن آواز آتی ہے۔

۱۵۔ سلسلہ:

یہ چاندی کا بہت دلکش زیور ہوتا ہے جو بروشال کی خواتین ٹوپی پر سامنے کے رخ ٹکاتی ہیں۔ اب ٹوپی پہننے کا رواج نہیں رہا تو یہ "سلسلہ" بھی ختم ہوا۔

۱۶۔ پرطاؤس:

طوطوں کی طرح یہ بھی لباس کی زینت کا زیور ہے۔ مور کی شکل کا نقرئی زیور ہوتا ہے جو تمغے کی طرح قمیض کے اوپر ٹکایا جاتا ہے۔

۱۷۔ زَمنگ:

یہ گلے کی زینت کا زیور ہوتا تھا لیکن ہار کی طرح نہیں بلکہ گلے کے گرد پیوستہ ہوتا تھا۔ یہ بھی نقرئی اور منقش ہوتا تھا۔

جانوروں کی آرائش اور زیورات:

گئے وقتوں میں ہر بڑے گاؤں کے وسط میں یا حاشیے پر ایک پولو گراؤنڈ ہوتا تھا۔ راجواڑہ کے زمانے میں اچھے چوگان بازوں کی زبردست حوصلہ افزائی ہوتی تھی۔ کھلاڑی اپنے گھوڑوں کو خوب کھلا پلا کر صحتمند اور چاق و چوبند رکھتے تھے۔ نہ صرف یہ بلکہ اپنے گھوڑوں کی آرائش و زیبائش پر بھی خصوصی توجہ دیتے تھے۔ بالخصوص گھوڑوں کے پالان پر خواتین تیز اور چبھتے رنگوں سے کڑھائی کرتی تھیں۔ شادی بیاہ کے موقعوں پر دلہا کے گھوڑے کو حلوان (ایک سرخ رنگ کا کپڑا) کا نقاب سا پہنایا جاتا تھا۔ آنکھوں کی جگہ پر دو چھید سے بنائے جاتے تھے تاکہ گھوڑ دیکھ سکے باقی کپڑا آرائشی ہوتا تھا۔ شادی کے موقعہ پر گھوڑے کے پالان پر کلابتو دھاگے سے کڑھائی کی جاتی تھی جسے کچم کہتے تھے۔

لوک علاج، دم درود اور ٹونے ٹوٹکے

بروشال ہنزہ نگر میں انگریزوں کے عمل دخل سے پہلے مقامی لوگ مغربی عطاری سے قطعاً ناواقف تھے۔ انگریزوں نے ۹۲-۱۸۹۱ء میں ہنزہ نگر کو فتح کیا اور اس واقعہ کے پانچ چھ برسوں کے بعد ان علاقوں میں ڈسپنسریوں کا قیام عمل میں آیا اور بروشو لوگ ایلوپیتھی سے واقف ہوئے۔ ماقبل کسی شخص کے بیمار ہونے کی صورت میں عزیز و اقربا اُسے اخون (دینی عالم) یا بٹین کاہن کے پاس لے جاتے تھے جبکہ فی زمانہ ہر کوئی ہسپتال جانا پسند کرتا ہے۔ تاہم دوا دارو سے کوئی ٹھیک نہ ہو تو لوگ آج بھی کاہن اور اخون سے رجوع کرتے ہیں اور بعض تو واقعی مرض سے چھٹکارا بھی پاتے ہیں۔

دم درود کے ذریعے علاج:

بروشو معاشرے میں اخون طبقہ کیلئے بہت احترام پایا جاتا ہے۔ کیونکہ یہ لوگ تجہیز و تکفین، دینی تعلیم اور علاج معالجہ تک کے فرائض انجام دیتے ہیں۔ اور قدم قدم پر ان کی ضرورت پیش آتی ہے۔ اخون کو بلانے کی صورت میں وہ کوئی مخصوص دُعا پڑھ کر مریض کی طرف پھونکتا ہے جسے ''پھواتیس'' کہتے ہیں۔ مریض کے بارے میں اگر یہ خیال ہو کہ اس پر کسی بد روح کا سایہ پڑ گیا ہے تو کاہن سے بھی رجوع کیا جاتا ہے۔ وہ مریض کا تفصیلی معائنہ کرنے کے بعد ہی تعویذ بناتا ہے۔ اگر مریض شدید علیل ہو تو حسب حیثیت کوئی حلال جانور از قسم گائے بیل، بکرا بھیڑ وغیرہ ذبح کر کے گوشت اہل محلہ و قریہ میں تقسیم کیا جاتا ہے جسے ''خُدئی'' کہتے ہیں۔ علاوہ ازیں بہ لحاظ فرقہ مسجد یا جماعت خانہ میں خصوصی دعا کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ اسماعیلی معاشرے میں اُسے ''تشیمی یہ وشی یس'' جبکہ اہل تشیع و اہل سنت حلقوں میں بالترتیب ''اعمال ان اوتس'' اور ''ختم ان اوتس'' کہتے ہیں۔ جماعت خانوں میں تسبیح خوانی کے دوران ''یا علی'' اور ''یا محمد'' کا ورد کیا جاتا ہے۔

قدیم ایام میں چیچک زدہ افراد کو ''قرنطینہ'' یا طبی بندی گھر میں رکھا جاتا تھا۔ ایسے طبی قید خانے عموماً آبادی سے بہت دور دریا کے کنارے بنائے جاتے تھے۔ کھانے پینے کی چیزیں بھی وہیں پہنچائی جاتی تھیں۔ مرض سے چھٹکارے کے بعد ہی مریض گھر آ سکتا تھا۔ آج کل طبی قید خانوں کا بھی کوئی وجود نہیں۔

اخون حضرات بعض مخصوص قسم کی تعویذیں بھی تیار کرتے ہیں جنہیں ''شیسکہ تومر'' اور دشچا پچنگ کہتے ہیں۔ ''شیسکہ تومرُ یا سیسہ کی تعویذ بد نظری کے علاج کیلئے مستعمل ہے۔ بعض سفلی عملیات کے عامل بڑے مقاصد کیلئے بھی تعویذ گنڈے بناتے ہیں جنہیں ''شقہ بوٹرنگ'' کہا جاتا ہے۔ عامل اس مقصد کیلئے ''مطلوب'' کے سر کے بال، قدموں کے نیچے سے مٹی یا اسکے زیر استعمال لباس کا کوئی ٹکڑا حاصل کر کے عمل پورا کرتے ہیں۔ اس کا مقصد مطلوب کو جسمانی اور ذہنی نقصان پہنچانا ہوتا ہے۔ ایسی خطرناک تعویذوں کا توڑ کاہن کے پاس ہوتا ہے۔ متاثرہ شخص کو ایسے کسی تعویز کا شک ہو تو وہ فوراً کاہن سے رجوع کرتا ہے۔ کاہن کو چیڑ کے خشک پتوں کی دھونی دی جاتی ہے۔ وہ عالم مدہوشی میں چلا جاتا ہے۔ وہ گہرے گہرے سانس لیکر چیڑ کے پتوں کا گاڑھا دھواں پھیپھڑوں میں داخل کرتا ہے۔ اس دوران دو تین مضبوط جوان اسے پکڑتے ہیں کیونکہ وہ انگاروں کی طرف لپکتا ہے۔ تھوڑی دیر بعد کاہن وجد میں آتا ہے اور گانے لگتا ہے۔ وہ گانے کے دوران پیش آمدہ خطرات اور عملیات کی تفصیلات بیان کرتا ہے یا اُس مقام کی طرف لپکتا ہے جہاں کوئی ضرر رساں تعویز دفن ہو۔ وہ تعویز کے مقام کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ وہاں فوراً احتیاط سے کھدائی کی جاتی ہے اور ہر دفعہ کوئی نہ کوئی تعویز نکل آتی ہے۔

بعض اوقات کاہن حضرات نامعلوم بیماری کے علاج کیلئے ایک چھوٹے فرائینگ پین قسم کے برتن میں سیسہ پگھلاتے ہیں۔ دوسری طرف مریض کے سر پر پانی کا ادھ بھرا برتن رکھتے ہیں۔ کاہن گرم اور سیال سیسے کو پانی والے برتن میں احتیاط سے انڈیلتا ہے۔ پانی میں گرم سیسہ گرتے ہی ''شوں'' کی سی زور دار آواز آتی ہے۔ اب کاہن پانی والے برتن میں دیکھتا ہے جس میں سیسہ مختلف شکلیں اختیار کرتا ہے۔ ان اشکار کی مدد سے وہ مرض یا سفلی عامل کا کھوج لگاتا ہے۔

''دشچاپ'' کا عمل بھی امراض کے علاج کیلئے مستعمل ہے۔ ایسی تعویزیں زعفران سے لکھی جاتی ہیں اور پھر ان کو حرمل کی دھونی کے ساتھ جلاتے ہیں اور مریض کو دھواں کشی کیلئے کہا جاتا ہے۔ اخون حضرات بعض اوقات زعفران سے پیالی کیا ندر مخصوص آیات لکھ کر اور انہیں پانی میں گھول کر مریض کو پلاتے ہیں۔

ماضی میں قلت خوراک، عدم صفائی، آئیوڈین کی کمی اور علاج معالجہ کی سہولتوں کے فقدان کے باعث جسمانی کمزوری اور بدوضعگی عام تھی۔ لیکن جہالت کی وجہ سے لوگ اسے اللہ کی رضا سمجھتے تھے۔ ایسے بدوضع افراد کو ''لغن'' یا ''چانٹو'' کہا جاتا ہے۔ ایسے لوگوں کی شادی بھی نہیں کی جاتی ہے کیونکہ یہ نہ صرف فاتر العقل ہوتے ہیں بلکہ جسمانی معذوری کے باعث محنت مزدوری بھی نہیں کر سکتے۔

بروشسکی زبان میں تندرستی کیلئے ''صحت'' کا لفظ ہی مستعمل ہے۔ البتہ کسی سے از راہ التفات صحت و تندرستی کے بارے میں پوچھنا ہو تو کہتے ہیں ''گوڈیم شووا بیا'' جسکا لفظی ترجمہ بنتا ہے کیا تمہارا بدن ٹھیک ہے؟ مرض کیلئے بی

یئی کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔

اس حقیقت میں کوئی کلام نہیں کہ ماضی میں لوگوں کی عمریں لمبی ہوتی تھیں۔ چائے سگریٹ اور مہلک منشیات کا رواج نہیں تھا۔ لوگ مقامی پیداوار اور خالص خوراک پر انحصار کرتے تھے۔ بلڈ پریشر، اختلاج قلب اور ذہنی امراض نہ ہونے کے برابر تھے۔ آج صورتحال مختلف ہے۔ ادویات اور علاج معالجہ کی جدید سہولتوں کی فراوانی کے باوجود شرح اموات میں اضافہ ہوتا جارہا ہے۔

آج سے قریب ڈیڑھ دوسو سال پہلے ہنزہ نگر میں اخون حضرات طبابت بھی کرتے تھے اُن کے پاس فارسی زبان میں طب کی کتابیں ہوتی تھیں جنکی مدد سے علامات دیکھتے ہوئے مرض کی تشخیص کرتے تھے۔ دیسی ادویات میں سلاجیت، بیش، فلفل دراز وسیاہ، جدوار، ہلیلہ زنگی اور زرد چوبہ کا استعمال عام تھا۔ یہ ادویات قرہ تنگ، وخان، بدخشان، سریقول، یارقند اور کشمیر سے لائی جاتی تھیں۔ اس کے علاوہ مقامی جڑی بوٹیوں سے بھی علاج کیا جاتا تھا۔ مقامی ادویاتی پودوں میں مشکطارا، اونٹ کٹارا، ملٹھی، افسنتین، زعفران کاذب اور گُٹھ قابل ذکر ہیں۔

بعض طبیب شکستہ ہڈیوں کو جوڑنے اور اپنی جگہ سے ہٹے ہوئے جوڑوں کو ملانے میں مہارت نامہ رکھتے تھے اور خون جمنے کی صورت میں چہار فلیتہ کا علاج عام تھا۔

جسمانی کھیل اور لوک تماشے:

ہنزہ نگر کے روایتی کھیل تماشے خندہ آور، دلچسپ، مسرت افزا اور حد درجہ ورزشی نوعیت کے ہیں۔ ان میں سے کئی ایک کھیل تو ختم ہو چکے ہیں جبکہ زیادہ تر اب بھی رائج ہیں جبکہ بعض کھیلوں پولو اور کوہ پیمائی نے بین الاقوامی شہرت حاصل کی ہے۔ ان مقامی نوعیت کے کھیلوں کے علاوہ کرکٹ، ہاکی، فٹ بال، والی بال اور مارشل آرٹس بھی فروغ پا رہے ہیں۔ مقامی کھیل روایتاً حسب ذیل خانوں میں بٹے ہوئے ہیں۔

۱۔ خالص مردانہ کھیل　۲۔ زنانہ کھیل　۳۔ خالص بچگانہ کھیل وغیرہ۔

خالص مردانہ کھیل

بُلہ:

پولو یا چوگان بازی کو بروشسکی زبان میں ''بُلہ'' کہتے ہیں۔ آگے اس کی بھی دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ جو گھوڑے پر سوار ہو کر کھیلا جاتا ہے اور دوسرا ''کھل بُلہ'' کہلاتا ہے جو بچے اور نوجوان پیدل کھیلتے ہیں۔ کھل بلہ کے خم دار ڈنڈے توت کی مضبوط ٹہنیوں سے تیار کئے جاتے ہیں جسکی شکل کچھ یوں ہوتی ہے۔

کھل یا گٹل بُلہ دیہاتوں میں بہت مقبول ہے۔ مقابلے میں چھ چھ یا آٹھ آٹھ تک بچے حصہ لیتے ہیں۔ گیند پرانے کپڑوں کی دھجیوں سے تیار کی جاتی ہے۔ اس سے چوٹ لگنے کا خطرہ نہیں رہتا اور اس کھیل کیلئے کوئی قاعدہ قانون بھی مقرر نہیں۔ کسی کشادہ کھیت یا میدان میں کھیلتے ہیں۔ سردیوں میں جب کھیت کھلیان فصلوں سے خالی ہوں تو بچوں کیلئے عید ہوتی ہے۔ بچوں کی ٹولیوں کی ٹولیاں دھول اڑاتے ہوئے گٹل بُلہ میں مصروف نظر آتی ہیں۔ سر پھٹول ہوتا ہے اور تھکن سے نڈھال ہونے تک یہ سلسلہ جاری رہتا ہے۔

ہغور سیکی بُلہ:

اس سے گھڑ سوار پولو مراد ہے جو گلگت بلتستان کا قومی کھیل ہے۔ ان علاقوں میں یہ کھیل کب رائج ہوا اس بارے میں وثوق سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ البتہ گلگت بلتستان کے ہر بڑے گاؤں میں قدیم الایام سے پولو گراؤنڈ موجود ہیں جنہیں بروشسکی زبان میں شارن کہتے ہیں۔ ماضی میں والیان ریاست اس کھیل کی خوب سرپرستی کرتے تھے اور پولو کے کھلاڑیوں کی معاشرے میں بڑی قدر و منزلت تھی۔ انہیں راجے انعام و اکرام سے نوازتے تھے۔ تاہم تمام تر مالی مشکلات کے باوجود شائقین نے اس کھیل کو زندہ رکھا ہوا ہے۔ انگریزوں نے بھی اپنے زمانے میں اس کھیل میں دلچسپی لی۔ نئے پولو گراؤنڈ تعمیر کیئے اور ٹورنامنٹس منعقد کرواتے رہے۔ بعض اوقات خاص خاص موقعوں پر یہاں کے نامور کھلاڑیوں کو پولو میچ کھیلنے کیلئے سری نگر اور کلکتہ تک لے گئے۔

ایک معیاری پولو گراونڈ ساڑھے تین سو گز لمبا اور پچاس سے ساٹھ گز تک چوڑا ہوتا ہے۔ پولو گراؤنڈ کے طولاً ہر دو کناروں کے وسط میں دو دو پول نصب ہوتے ہیں جن کا درمیانی فاصلہ بیس فٹ کے قریب ہوتا ہے۔ تماشائیوں کے بیٹھنے کیلئے چار پانچ فٹ اونچی دیوار سے بنا ہوا چبوترہ ہوتا ہے۔ خواص کے بیٹھنے کیلئے مزید اونچا چبوترہ بنایا جاتا ہے جس کے سامنے جالی لگائی جاتی ہے اور اوپر شامیانہ تنا ہوا ہوتا ہے۔ بالمقابل کھلاڑیوں کی تعداد چھ چھ ہوتی ہے۔ سکور بورڈ کے عین نیچے سازندے بیٹھتے ہیں جو پولو کیلئے مخصوص دھن بجانے پر مامور ہوتے ہیں۔ یہ دھن تعداد میں تیرہ کے قریب بتائے جاتے ہیں۔ مثلاً بکشو ور وہ دھن ہے جو پولو کھیلنے سے ایک دن پہلے بجایا جاتا ہے۔ یہ ایک طرح کا اعلان ہوتا ہے کہ اگلے روز پولو کھیلا جائیگا۔ مقررہ دن جب کھلاڑی گھوڑوں پر سوار ایک شان اور دبدبہ کے ساتھ

پولو سٹک کندھوں پر ٹکائے میدان میں آتے ہیں تو سازندے ''اشپری'' دھن بکھیرتے ہیں۔ کھیل کے دوران ''غلہ ور'' بجاتے ہیں جبکہ کوئی کھلاڑی گول کرنے میں کامیاب ہوتو ''یسُول غلہ ور'' بجتا ہے۔ فاتح ٹیم کیلئے ''بودھ دھنی'' مقرر ہے۔

ہنزہ نگر اور گلگت بلتستان میں رائج پولو فری سٹائل ہے۔ اس لئے اُسے خطرناک سمجھا جاتا ہے۔ دوران کھیل سر پھٹول کے مناظر عام دیکھنے میں آتے ہیں۔ کھلاڑی ایک دوسرے کو زوردار کہنیاں مارتے اور دبوچتے ہیں اور گھوڑے سے گرانے کی کوشش بھی کرتے ہیں۔ معاملہ جب زیادہ سنگین ہوتو کھلاڑیوں کے طرفدار بھی میدان میں کود پڑتے ہیں۔ ایسے میں ایک میدان جنگ کا سا سماں دکھائی دیتا ہے۔ دوران کھیل بعض کھلاڑی گیند کو ہوا میں پکڑنے کی بھی کوشش کرتے ہیں۔ کامیابی کی صورت میں اس کھلاڑی کی بڑی درگت بنتی ہے۔ کیونکہ مخالف ٹیم کے کھلاڑی اس سے گیند چھیننے اور اچکنے کی کوشش کرتے ہیں جبکہ وہ بچ بچا کر گول سے گزرنے کیلئے جدوجہد کرتا ہے۔

مقابلے کے دوران چھ چھ سوار میدان میں اترتے ہیں۔ کھلاڑی جودھ پوری برجس اور جیکٹ پہنتے ہیں۔ ہر دو مدمقابل ٹیموں کے جیکٹوں کا رنگ مختلف ہوتا ہے اور پیٹھ پر نمبر لگا ہوا ہوتا ہے۔ کھیل کے دوران کھلاڑیوں اور تماشیوں کا زخمی ہونا معمول کے واقعات شمار ہوتے ہیں۔ بعض اوقات گھوڑا یا کھلاڑی بھی جان سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں۔ کھیل کا دورانیہ گھنٹہ بھر کا ہوتا ہے۔ کہیں کہیں کسی ایک ٹیم کی طرف سے نو گول پورے کرنے پر کھیل ختم کیا جاتا ہے۔

درابی:

درابی رسہ کشی کا مقامی نام ہے۔ رسہ کشی کے مقابلے یہاں عید نوروز، آغا خان چہارم کی یوم پیدائش یا تخت نشینی کی سالگرہ کے موقعوں پر ہوتے ہیں۔ اس طرح بروشال نگر میں گنانی رسم کی تقریبات کے دوران اس کے مقابلے دیکھنے میں آتے ہیں۔ گاؤں کے صحتمند نوجوان قبیلہ وار، قریہ وار یا علاقہ وار مقابلوں میں حصہ لیتے ہیں۔ اس مقابلے میں دس دس یا اس سے کم وبیش نوجوان شامل ہوتے ہیں جو خالص دیسی گھی سے تیار شدہ مقوی پکوان کھا کر آتے ہیں۔ خوب زور آزمائی ہوتی ہے۔ سازندے حربی دھنیں بجاتے ہیں۔ جیتنے والی ٹیم کیلئے الگ دھن مخصوص ہے جسے مسول کہتے ہیں۔ اس موقعہ پر بسا اوقات لڑائی جھگڑے بھی ہوتے ہیں فاتح ٹیم کو پرتکلف کھانا دیا جاتا ہے اور ہار پہنائے جاتے ہیں۔

سُلما:

یہ کشتی کی ایک قسم ہے جو سندھ کی ملاکھڑا سے ملتی ہے۔ بچے اور جوان اس میں حصہ لیتے ہیں۔ اس کیلئے کوئی قاعدہ قانون مقرر نہیں۔ البتہ فریقین میں جسمانی لحاظ سے برابری ضروری ہے۔ کھڑے کھڑے زور آزمائی ہوتی ہے۔ فریقین بغلگیر ہو کر ایک دوسرے کو گرانے کی کوشش کرتے ہیں۔ گرانے کیلئے اڑنگا دینے کا طریقہ رائج ہے'' جسے کھئی وشی لیس'' کہتے ہیں۔ فریقین کے حامی خوب نعرے بازی کرتے ہیں اور سیٹیاں بجاتے ہیں۔ جیتنے والوں کو کندھوں پر اٹھاتے ہیں۔ بعض اوقات ہٹیلے قسم کے کھلاڑی آسانی سے اپنی شکست تسلیم نہیں کرتے اور دوبارہ مقابلے کا تقاضا کرتے ہیں۔ اس طرح کئی کئی مرتبہ مقابلے ہوتے ہیں۔

بُچر:

یہ خالص نوجوانوں کا کھیل ہے۔ مقابلے میں دو کھلاڑی حصہ لیتے ہیں۔ فریقین ایک ایک ٹانگ اٹھا کر لڑتے ہیں۔ دائیں ٹانگ کو رانوں کے رُخ موڑتے ہیں اور بائیں ہاتھ کے ذریعے پشت کی طرف سے انگوٹھا پکڑتے ہیں۔ اب کھلاڑی چھینا جھپٹی، دھکم پیل اور زور آزمائی کے ذریعے ایک دوسرے کو گرانے کی کوشش کرتے ہیں یا جس کا ہاتھ انگوٹھے سے چھوٹ جائے وہ ہار جاتا ہے۔ گھٹنے کے ذریعے مخالف کھلاڑی کے پیٹ میں ضربیں بھی لگاتے ہیں۔ چوٹ لگنے کا خاصا خطرہ رہتا ہے۔

دَن پھَل ایتس:

اس کھیل میں کھلاڑی بھاری پتھر پھینکنے کا مقابلہ کرتے ہیں۔ کھلاڑی گول سا وزنی پتھر کندھے پر ٹکا کر اور مقررہ لکیر پر بایاں پیر رکھ کر پتھر آگے پھینکتا ہے۔ جس کھلاڑی کا پتھر دور گرے جیت جاتا ہے۔ اس کھیل میں صحت مند اور اچھے قد کاٹھ کے کھلاڑی حصہ لیتے ہیں۔ بعض منچلے کھلاڑی شرطیں بھی بدتے ہیں۔

تَم دیلس:

تیراکی کو بروشسکی زبان میں تَم دیلس اور تیراک کو تَم گوئین کہتے ہیں۔ گئے وقتوں میں نوجوان لازماً تیراکی سیکھتے تھے۔ تیراکی سے ناآشنا نوجوان کمزور اور بزدل سمجھے جاتے تھے۔ اب خال خال لوگ ہی اس میں دلچسپی لیتے ہیں۔ ہنزہ نگر کے دریا شمالی علاقہ جات کے دیگر دریاؤں کی طرح منہ زور، سرکش اور طوفانی ہیں۔ ان میں تیراکی جان جوکھوں کا کھیل ہے۔ پھر بھی ماہر تیراک موسم گرما کے بپھرے ہوئے دریا میں بھی آسانی سے تیراکی کرتے ہیں۔ ایسے تیراک دریا برد ہونے والے افراد کی جان بچاتے ہیں۔ اس لئے انہیں قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔

زنانہ کھیل

خنو مناس:

جھولا جھولنے کو مقامی طور پر خنو مناس کہتے ہیں۔ نوروز اور دیگر تہواروں کے موقعہ پر لڑکیاں خصوصی اہتمام کے ساتھ نئے کپڑے زیب تن کر کے کسی باغ میں جمع ہو کر جھولا جھولتی ہیں۔ پینگیں کسی درخت کی اونچی شاخ کے ساتھ باندھتی ہیں اور باری باری جھولا جھولتی ہیں۔ یہ لڑکیوں کا بہت ہی پسندیدہ کھیل ہے۔

اُولُو یانے:

یہ بھی خالصتاً لڑکیوں کا دل بہلاوا ہے۔ چھ سات لڑکیاں گھٹنوں کے بل دائرے کی شکل میں بیٹھتی ہیں اور ایک ساتھ ہاتھوں کی انگلیاں اپنے ہونٹوں سے لگا کر کورس کی شکل میں زور سے ''اُولُو یانے'' کہتی ہیں اور فوراً ہی اپنی ہتھیلیاں سامنے لاتی ہیں۔ اب اگر سب کی ہتھیلیاں سیدھی ہوں تو دوبارہ یہی عمل دہرایا جاتا ہے تا آنکہ کسی لڑکی کا ایک ہاتھ الٹا اور دوسرا سیدھا ہو۔ ایسی صورت میں لڑکی جیت جاتی ہے اور وہ لڑکی دائرے سے الگ ہوتی ہے۔ اس طرح آخری لڑکی تک یہ سلسلہ چلتا رہتا ہے۔

لوٹو مناس:

آٹھ دس لڑکیاں ربر کی گیند کو باری باری زور سے زمین پر مارتی ہیں اور گھوم کر پکڑنے کی کوشش کرتی ہیں۔ جو لڑکی دس مرتبہ گیند کو بغیر گرائے پکڑ لے وہ جیت جاتی ہے۔

پُوپُو رمناس:

دو لڑکیاں آمنے سامنے ایک دوسرے کے ہاتھ تھام کر اور دھڑ کو ذرا پیچھے گرا کر اچھلتے ہوئے دائرے میں گھومتی ہیں اور کہتی جاتی ہیں بم چکی دُودُونی مَل مَلی خاتونی۔

بُوڈیموششک:

اس کھیل کو گورکھ دھندا کہیں تو بے جا نہ ہوگا۔ تین ساڑھے تین فٹ لمبے دھاگے کا ایک ٹکڑا لیکر اُس کے دونوں سروں کو گانٹھ دیکر باندھتے ہیں۔ اب دو لڑکیاں گھٹنوں کے بل آمنے سامنے بیٹھ کر دھاگے کے اس چھلے کو ایک دوسرے کی انگلیوں میں اس طرح پھنساتی ہیں کہ ہوبہو شکلیں بن جاتی ہیں۔ جتنی زیادہ اور پیچیدہ شکلیں بن جائیں اتنی ہی قابل تعریف سمجھی جاتی ہیں۔ بچے بچیاں اور بڑی عمر کے لوگ بھی کھیلتے ہیں۔

حکور:

یہ ایک سادہ کھیل ہے اور لڑکیوں کیلئے مخصوص ہے۔ تین چار لڑکیوں کی ٹولی باری باری کھیلتی ہے۔ ٹاس کے بعد جیتنے والی لڑکی زمین پر بیٹھ کر چھ سات مناسب سائز کی کنکریاں سامنے رکھتی ہے۔ پھر ایک کنکر ہتھیلی میں لیکر اُسے اوپر اچھالتی ہے اور اُسکے زمین پر گرنے سے پہلے سامنے پڑی ہوئی دو کنکریاں اُچک لیتی ہے۔ یوں باری باری کنکریوں کی تعداد میں اضافہ کرتے ہوئے ساری کنکریاں سمیٹنا ہوتی ہیں۔

بچگانہ کھیل

مینڈک:

کپڑے کی کسی دھجی میں تھوڑی سی مٹی ڈال کر اُسے کسی مضبوط دھاگے سے باندھتے ہیں۔ اب اُس کی شکل منہ بند ایک چھوٹی تھیلی کی سی ہوتی ہے۔ بڑے لڑکے فرمائش پر سیسے کا بھی بنواتے ہیں۔ بنانے کا طریقہ یہ ہے کہ زمین میں ایک سے ڈیڑھ انچ قطر کا ایک چھوٹا سا گڑھا کھودتے ہیں اور اس میں پگھلا ہوا سیسہ ڈالتے ہیں۔ جمنے پر باہر نکالتے ہیں اب اس کی شکل ہوبہو سکے کی سی ہوتی ہے۔ اسے کسی ہتھوڑی کی مدد سے مزید چپٹا کرتے ہیں اور عین وسط میں چھید ڈالتے ہیں۔ اب اس سوراخ میں بکری کے بال مضبوطی سے پروئے جاتے ہیں۔ دائیں پاؤں سے اچھالتے رہتے ہیں جو کھلاڑی جتنی دیر تک اچھالتا رہے جیت جاتا ہے۔ بچوں کا انتہائی پسندیدہ کھیل ہے۔

دَغہ دَغہ:

''دغہ یَس'' بروشسکی زبان میں چھپنے کو کہتے ہیں۔ اس رعایت سے ''دَغہ دَغہ'' آنکھ مچولی ہوئی۔ چار پانچ یا اُس سے بھی زیادہ تعداد میں لڑکے حصہ لیتے ہیں۔ شریک کھلاڑی دو ٹولیوں میں بٹ جاتے ہیں اور ٹال ڈالنے کے بعد جیتنے والی ٹولی چھپ جاتی ہے۔ اب متلاشی ٹیم چند ثانیوں کے لئے آنکھیں بند کرتی ہے جس وقت پوشیدہ ٹیم میں سے کوئی بلند آواز سے ''دَغہ من'' کہے تو تلاش شروع ہو جاتی ہے۔ تمام کھلاڑیوں کو تلاشنے تک یہ کھیل جاری رہتا ہے پھر دوسری ٹیم چھپ جاتی ہے۔

ٹسکوری:

گلی ڈنڈے کو بروشسکی میں ٹسکوری کہا جاتا ہے۔ پانچ چھ سے دس بارہ برس تک کے لڑکے اس میں حصہ لیتے ہیں۔ گلی اور ڈنڈا لکڑی کے تیار کیئے



شمالی علاقہ جات، شمشال کے سکول کے بچے

جاتے ہیں۔ گلی کے دونوں سرے پنسل کی شکل میں تراشتے ہیں۔ ڈنڈا یہی کوئی دو فٹ لمبا ہوتا ہے۔ ٹاس کے بعد جو ٹیم جیت جائے اُن میں سے ایک کھلاڑی کھیل کا آغاز کرتا ہے۔ زمین میں چھ سات انچ لمبا چھید ڈالتے ہیں پھر گلی کو اس کے آر پار رکھا جاتا ہے۔ اب کھلاڑی ڈنڈے کی مدد سے گلی کو دور تک اچھالتا ہے۔ اس دوران مخالف ٹیم میں سے کوئی اُسے فضا میں اُچک لے تو پہلی ٹیم ہٹ جاتی ہے اور دوسری ٹیم کو کھیلنے دیتی ہے۔ بصورت دیگر پہلا کھلاڑی گلی کے ایک سرے پر ڈنڈے سے ضرب لگاتا ہے۔ گلی جونہی فضاء میں اچھلے ڈنڈے کی ٹھوکر سے اُسے دور پھینکا جاتا ہے اور جس جگہ گلی گرے وہاں سے چھید والی جگہ ڈنڈے سے ہی فاصلہ ماپا جاتا ہے اور جتنا فاصلہ بنے اتنے ہی نمبر بنتے ہیں۔ جو ٹیم جتنے نمبر حاصل کرے جیت جاتی ہے۔

چھُت دیلس:

دو آدمی گھٹنوں کے بل آمنے سامنے بیٹھتے ہیں۔ پھر سیدھے ہاتھ کی بند مٹھی کان کے پوؤں تک لیجا کر بازو ایک ساتھ تیزی کے ساتھ ناف کے برابر نیچے لاتے ہوئے تین مختلف انداز سے مُٹھی کھولتے ہیں۔ کوئی کھلاڑی صرف شہادت کی انگلی سیدھی کرے اور دوسر پوری ہتھیلی کھولے تو اس کا مطلب ہوتا ہے تیر ڈھال کو چھید رہا ہے۔ لہذا پہلا کھلاڑی فاتح ہوتا ہے۔ اگر کسی نے بند مُٹھی آگے کی اور دوسرے نے مصافحے کے انداز میں ہاتھ بڑھایا تو دوسرا کھلاڑی فاتح قرار پاتا ہے۔ کیونکہ بند مُٹھی ڈھال اور کھلی ہتھیلی تلوار کی علامت ہوتی ہے۔ اگر کسی نے کھلی ہتھیلی آگے کی اور دوسرے نے شہادت کی انگلی، تو پہلا جیت جاتا ہے۔ یہ بذات خود کھیل نہیں ہے بلکہ ٹاس کے طور پر کیا جاتا ہے۔

حصہ بروشال

روایتی طرز تعمیر، آرائش اور رہن سہن:

قدیم دور میں لوگ دیوار بند رہائشی علاقوں میں رہتے تھے۔ مقامی زبان میں ان گروہی رہائش گاہوں کو ''کھن'' کہتے ہیں۔ کھن کی تعمیر کیلئے ایسی جگہ منتخب کی جاتی تھی جہاں کم از کم تین اطراف سے قدرتی طور پر محفوظ ہو۔ لاقانونیت اور شخصی راج کا دور تھا۔ ایک گاؤں دوسرے گاؤں پر اور ایک قبیلہ دوسرے قبیلہ پر حملہ کرتا تھا۔ اس لئے دن رات جان بچانے کی فکر لگی رہتی تھی۔ مختلف قبائل جھنڈ کی صورت میں گھر بنا کر رہتے تھے۔ ایک قبیلے کے اندر مختلف گوت اپنی اپنی برجیاں (شکاری) تعمیر کرتے تھے جن پر نوبت بہ نوبت پہرہ رہتا تھا۔ کہیں کہیں کھن کے وسط میں تالاب بنائے جاتے تھے۔ وہیں سے ضرورت کے مطابق پانی استعمال کرتے تھے۔

طرز تعمیر میں حد درجہ سادگی ہوتی تھی۔ تعمیراتی آلات بھی نایاب تھے لہذا قدیم عمارتوں میں جمالیاتی عنصر بھی دکھائی نہیں دیتا۔ بروشال کے طرز تعمیر میں بلتستان، کشمیر اور بدخشان کا رنگ غالب نظر آتا ہے۔ مساجد، امام بارگاہوں یا خانقاہوں میں اونچے کلس بلکل کشمیری طرز پر بنائے جاتے تھے۔ یہ اس بات کی علامات ہے کہ ان علاقوں میں مذہب اسلام کی تبلیغ کیلئے کشمیر سے ہی لوگ آتے رہے۔ مسطح چھتوں کا انداز بدخشاں سے متاثر دکھائی دیتا ہے۔

موروثی حکمرانی کے دور میں لوگ قدرے محفوظ تھے لہذا کھن کے باہر بھی مکانات تعمیر ہونے لگے۔ ایسی بستیوں کو ''گرم'' کہتے ہیں۔ انگریزوں کی آمد کے بعد بروشال میں مکمل تحفظ کا احساس پیدا ہوا۔ یوں ''کھن'' کی ضرورت نہ رہی اور گرم پھیل گئے۔

ایک بروشو گھر کی اکائی ''حہ'' مشترکہ کمرہ ''چیکس'' گودام ''اگون'' بالائی مسقّف برآمدہ ''تروک'' مال مویشیوں کا باڑا ''غوشپور'' بھوسہ خانہ پر مشتمل ہوتی ہے۔

حہ:

ایک کثیر المقاصد کمرہ ہوتا ہے جس میں سونے، کھانا کھانے، پکانے مہمانوں کی پذیرائی، شادی بیاہ اور غمی کے دنوں میں سرگرمیوں کی گنجائش ہوتی ہے۔ یہ خاصا وسیع کمرہ ہوتا ہے۔ اس کے بیچوں بیچ چولہا اور عین اوپر روشندان ہوتا ہے۔ پرانے طرز کے ''حہ'' میں کھڑکیوں کا رواج نہیں تھا لہذا آگ جلاتے ہی پورا کمرہ دھویں سے بھر جاتا تھا۔ افراد خانہ کھانستے اور آنکھیں ملتے رہتے تھے۔ وقت کے ساتھ ساتھ ڈیزائن میں تبدیلی آتی رہی۔ آج کل اس طرح کے کمرے صرف مہمان خانہ کے طور پر استعمال ہوتے ہیں۔ چولہے میں لکڑیاں نہیں جھونکی جاتیں بلکہ بجلی یا گیس کے ہیٹر جلائے جاتے ہیں۔ کھانا پکانے کیلئے جدید طرز کا باورچی خانہ تعمیر کیا جاتا ہے۔ ''حہ'' وہی گھر کے داخلی دروازے کے بالکل مقابل ایک دیوار گیر الماری کی پشت ہوتی ہے جسے ''کنجی جش'' یا ''کنج'' کہتے ہیں۔ اس کے بعد کمرے کے انتہائی بائیں اور دائیں جانب 5X12 فٹ یا اس سے کم وبیش طول و عرض کے ابھرواں چبوترے ہوتے ہیں۔ ان چبوتروں کے درمیان بھی اتنی ہی جگہ ہوتی ہے جہاں بیچ میں چولہا ہوتا ہے۔ موجودہ دور میں اس طرح کے کمرے تعمیر کرنے کا رواج قریب قریب ختم ہو رہا ہے۔ پرانے دنوں میں گھر سے قدرے فاصلے پر کسی کھیت کے گوشے میں ''چوک'' دیسی طرز کا بیت الخلا تعمیر کیا جاتا تھا جو مستعمل ہوتا تھا۔ کہیں کہیں آج بھی اس طرح کے بیت الخلا دیکھنے کو ملتے ہیں۔ یہ ایک چھوٹے سے کمرے کے مشابہ ہوتا ہے جسکی چھت پر رفع حاجت کیلئے خاصا

کشادہ سوراخ رکھا جاتا ہے۔ پاس ہی طہارت کیلئے مٹی کے ڈھیلے اور لوٹے میں پانی رکھا ہوتا ہے۔ فضلہ نیچے گرتا ہے جس پر ہر مرتبہ مٹی ڈالی جاتی ہے۔ چھ سات ماہ بعد اس کی صفائی کی جاتی ہے۔

ہر گھر کے سامنے دیوار بند صحن ہوتا ہے۔ صحن کافی کشادہ ہو تو تب بھی اکہری باڑ کی دیوار تعمیر کرتے ہیں تاکہ مال مویشی گھروں میں داخل نہ ہوں۔ صحن میں کسی مناسب جگہ پر چھ سات فٹ گہرا کنواں کھودتے ہیں جسکے گرداگرد تین چار فٹ دیوار تعمیر کر کے اور چھت بھی ڈالی جاتی ہے اور ایک جانب دروازہ لگایا جاتا ہے۔ کیونکہ لوگ پانچ پانچ سیر کے مکھن کے ڈھیلے بھوج پتر میں لپیٹ کر اس کنویں کے پانی میں رکھتے ہیں۔ چوری کے خدشے کے پیش نظر دروازے کو مقفل بھی کیا جاتا ہے۔

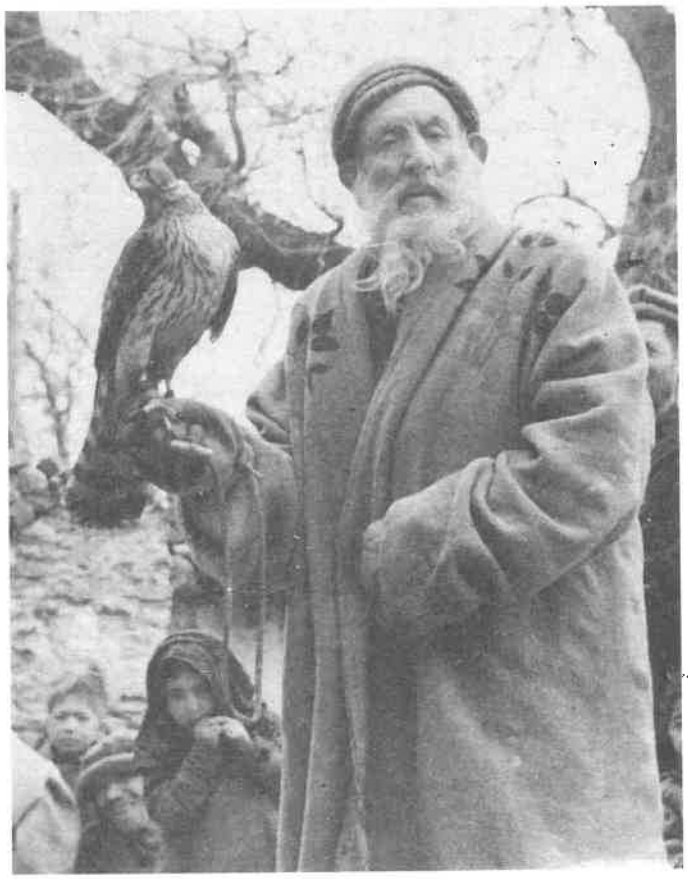
بعض لوگ صدقہ جاریہ کے طور پر بھی کنویں تعمیر کرتے ہیں جہاں سے ہر کوئی پانی لے جاسکتا ہے۔ اسی طرح بزرگوں کے ایصال ثواب کیلئے کسی شارع عام پر ''بلدی'' مستطف برآمدہ بھی تعمیر کرتے تھے تاکہ آتے جاتے مسافر ستا سکیں۔ پاکباز خواتین کی یاد میں بھی ''من'' سنگی چبوترہ کسی راستے کے حاشیے پر تعمیر کرنے کا رواج تھا۔ یہ مسطح پتھر کی سلیں ہوتی ہیں جنہیں اس انداز سے رکھا جاتا ہے کہ دو تین آدمی آرام سے بیٹھ سکیں۔

جس گاؤں میں پانی کی قلت ہو وہاں پانی کے مصنوعی تالاب بنائے جاتے ہیں۔ ایسے تالاب کو پھبری کہتے ہیں۔ یہاں نوجوان نہاتے بھی ہیں۔ اس طرح کے تالاب مشترکہ بھی ہوتے ہیں اور انفرادی بھی۔

راجگان کی رہائش گاہ کو ''تھاک'' کہا جاتا ہے۔ یہ بھی سادگی کا نمونہ ہیں۔ گارے، مٹی، پتھر اور لکڑی کے استعمال سے دو تین منزلہ وسیع و عریض مکان ہوتا ہے۔ اس طرح کے قدیم ''تھاک'' اب شکستگی سے دوچار ہیں۔ تاہم بلتت اور التت کے تھانگ بلتت ہیریٹج ٹرسٹ کی نگرانی میں محفوظ کیئے گئے ہیں اور سیاحوں کیلئے کھول دیئے گئے ہیں۔

پرانے وقتوں میں آباؤ اجداد کے نام پر چھوٹی چھوٹی مساجد تعمیر کرنے کا رواج تھا جو آج بھی کہیں کہیں موجود ہیں۔ ۱۹۲۰ء کے بعد دھیرے دھیرے مساجد کا رواج ختم ہوا اور جماعت خانے تعمیر ہوئے۔ تاہم نگر میں شیعہ مسلک کے لوگ رہتے ہیں اس لئے وہاں نئی اور پرانی ہر دو طرح کی مساجد شاد و آباد ہیں۔ نئی طرز کی مساجد بڑے شہروں کی طرز پر تعمیر کی جارہی ہیں۔ جن میں گنبد اور مینار بھی ایستادہ کیئے جاتے ہیں۔ شوخ قسم کے رنگ استعمال کیئے جاتے ہیں اور دیواروں پر آرائشی گل بوٹے بھی بنائے جاتے ہیں۔

بروشال ہنزہ کے
روایتی لوک ساز، گیت اور ناچ



بروشال ہنزہ کا ایک بابا اپنے باز کے ساتھ

لوک ساز، گیت اور ناچ:

''تمہ شہ'' ناچ گانا اور ''ڈڈنک حریپ'' ساز و طرب بروشو ثقافت کا لازمی حصہ اور تفریح طبع کا موثر ذریعہ ہیں۔ میدان کارزار ہو یا مذہبی رسومات ہوں یا شادی بیاہ کی کوئی تقریب ہر موقع پر موسیقی کی ضرورت محسوس کی جاتی رہی ہے۔ ایک قدیم بروشسکی کہاوت ہے،

''تھمو وے کھن یومُلو بیر یچووے اَ کی دیم جُوَن''

ترجمہ: راجوں کا قلعہ پر قبضہ کے وقت سازندوں کا رُفع حاجت کیلئے جانا۔

ماضی میں قبائل اپنے راجے کی سرکردگی میں جب کوئی قلعہ فتح کرتے تھے تو سازندے ایک مخصوص جنگی دُھن ''مَسلہ'' بجاتے تھے۔ اس دُھن سے قلب

وجگر میں انگیخت پیدا ہوتی ہے۔ لہذا ایسے ہی کسی موقع پر ساز ندے غائب ہوئے تو یہ کہاوت بن گئی۔ اب یہ بات اس وقت کہی جاتی ہے جب کسی اہم ضرورت کے وقت مطلوبہ آدمی غائب ہو۔

گیت:

بروشسکی زبان انیسویں صدی کے وسط تک تنہائی کا شکار رہی۔ تاہم اس میں لوک کہانیوں، پہیلیوں، ضرب الامثال، محاوروں، اقوال اور چند ایک لوک گیتوں کا انمول ذخیرہ موجود ہے۔ یہ ایک حیران کن امر ہے کہ بروشسکی میں شاعری کیلئے کوئی لفظ ہی نہیں۔ شعر کیلئے فارسی لفظ ''بیت'' مستعمل ہے۔ فی زمانہ شاعری کا جائزہ لیں تو ہمیں شادی بیاہ اور آباء کے سورمائی گیت، لوریاں، شینا سے مستعار رزمیے، مناقب، حمد، نعت اور نظمیں ملتی ہیں۔ ماضی میں رومانی شاعری کی حوصلہ شکنی ہوئی۔ چھوٹا سا معاشرہ تھا۔ لوگ ایک دوسرے کے دکھ درد کے ساجھن تھے چنانچہ رومانی ابیات کہنا معاشرتی اقدار کو للکارنے کے مترادف سمجھا جاتا تھا۔ ایک خیال یہ بھی ہے کہ قدیم بروشو معاشرے میں شاعری تابو کے زمرے میں آتی تھی۔ بہت سے نوجوان نئے لہجے میں رومانی شاعری کرتے ہیں اور معاشرے میں ان کی پذیرائی بھی ہوتی ہے۔ بروشسکی زبان میں ادبی روایات اور رجحانات پر آج تک کوئی مبسوط تاریخ مرتب نہیں ہوئی۔ گزشتہ دو ڈھائی سو برس کے دورانیے میں جو نام ہمیں ملتے ہیں اُن میں اخون تراب، اخون علی، گشپور جمال خان، سید رسول شاہ، سید عباس شاہ، میر غزن خان، سید عبدالحمید، کریم اور محمد رضا بیگ شامل ہیں۔ یہ حضرات بھی بروشسکی سے زیادہ فارسی میں مشق فرماتے رہے۔ ایک ذرا پیچھے وزیر محمد دارا بیگ مرحوم اور رواں زمانے میں علامہ نصیرالدین ہنزائی، غلام الدین غلام ہنزائی، فدا علی ایثار، عزیز اللہ نجیب اور حامد اللہ بیگ اکابر شعرا میں گنے جاتے ہیں۔ ان حضرات کے علاوہ نئے شعرا میں اسلم ساجل، صغیرالدین صغیر، کریم خان عاجز، کریم مطرب، داور منعیم، غلام جعفر، اکرم نجمی، مہ جبین اور غلام عباس حسن آبادی کا تعلق بروشال ہنزہ سے جبکہ غلام محمد، محمد اسماعیل، نوید نگری، شاہ رئیس سیفی، شاہ جہاں مضطر، قربان علی اور ایوب صابر نگر کے ابھرتے ہوئے شعرا ہیں۔ اُدھر بروشال یاسین میں سرفراز، علی مدد بائی، رمضان اور فیض امان نئے دور کے نمائندہ شعرا ہیں۔

گیتوں کی رنگارنگی

آباء پرستی کے سورمائی گیت:

اس قسم کے گیت اب ناپید ہیں اور اب اس کا رواج بھی نہیں رہا۔ ماضی میں ''گئی مالو'' گیت گوا اپنے بہادر آباء کے کارناموں کو ترنم سے گاتے تھے۔ کہتے ہیں اس طرح کے گیت شینا میں ہی گائے جاتے تھے۔

چرواہوں کے گیت:

مارچ کے مہینے میں بھیڑ بکریاں جب بچے جنتی ہیں تو پہلے بچے کی پیدائش پر چرواہے کو ''شورو روٹی'' دی جاتی ہے۔ یہ انگاروں میں پکائی ہوئی دو انچ موٹی اور دو فٹ قطر کی روٹی ہوتی ہے۔ دوسرے بچے کی پیدائش پر چرواہے کو خوبانی کی گریاں اور خشک خوبانیاں دی جاتی ہیں جبکہ بعد میں پیدا ہونے والے بچوں کی پیدائش پر صرف خوبانیاں دی جاتی ہیں۔



روایتی تلوار ڈانس

ایک دعائیہ گیت:

بروشال میں ماہ جنوری کے دوران کڑاکے کی سردی پڑتی ہے۔ نہروں میں پانی جم جاتا ہے۔ سماجی سرگرمیاں بھی منجمد ہوتی ہیں۔ لیکن نوجوانوں کے موج میلے کے بھی یہی دن ہوتے ہیں۔ دراصل اس مہینے میں لڑکے بالے ''ہویا'' کی تیاریوں میں مصروف ہوتے ہیں۔ ''ہویا'' ایک دلچسپ رسم ہے۔ یہ رسم شین قبیلہ اپنے ہمراہ لایا تھا۔ جب اُس نے اپنا اصل مسکن آریانم وائجو سے خروج کیا اور قراقرم و ہندوکش کی وادیوں میں مستقلاً بود و باش اختیار کیا۔ یہ رسم علاقائی تقاضوں کے باعث اتنی مقبول ہوئی کہ مقامی لوگوں نے بھی دل و جان سے قبول کیا۔

ہوتا یہ ہے کہ جنوری کے مہینے میں ہر محلہ قریہ کے بچے بیس پچیس کی ٹولیوں میں بٹ جاتے ہیں ہر ٹولی میں ذرا سیانے بچوں کو دلہا دلہن کا سوانگ رچانے کیلئے منتخب کیا جاتا ہے۔ یہ لڑکے چہروں پر خشک کدو کے ماسک چڑھاتے ہیں۔ دلہا کے ماسک پر داڑھی لگائی جاتی ہے۔ خود دلہا ایک پرانا شوقہ (اونی چوغہ) پہنے ہوتا ہے جسکے پیچھے کپڑا ٹھونس کر اسے کُبڑا ظاہر کرتے ہیں۔ ''بوڑھا دلہا'' لاٹھی ٹیکے ہوئے آتا ہے اُس کے پیچھے کھلنڈرے اور منچلے لڑکوں کی ٹولی ہوتی ہے جو گیت گاتے جاتے ہیں۔



کیل

اَجولی:

یہ رخصتی کا گیت ہے۔ اب الفاظ کی ادائیگی نہیں ہوتی بلکہ شہنائی نواز سناتے ہیں۔ انتہائی رقت انگیز دُھن ہوتی ہے۔ عورتیں اس دُھن کو سن کر روتی ہیں۔

لوک ساز:

بروشال میں آلات موسیقی اتنے زیادہ نہیں۔ تاہم تمام علاقے میں اس حوالے سے بڑی یکسانیت پائی جاتی ہے۔ ڈڈک (دُہل) ڈامل (توام طبلے) سرنائی (نفیری) توتک (بانسری) گبی (چھوٹی بانسری جو ترچھا کر کے بجاتے ہیں) پوریلو (یہ بانسری اُس وقت بجائی جاتی ہے جب کاہن کو نچوانا مقصود ہو) ساخت میں دوسری بانسریوں کے مقابلے میں طبی ہوتی ہے۔ دَف یہ ساز بالائی ہنزہ میں مستعمل ہے۔ رباب، یہ عارفانہ موسیقی کیلئے مخصوص ہے۔ ستار، یہ دراصل چترالی ساز ہے لیکن بروشال میں بھی مقبول ہے۔

ان سازوں سے جو دھنیں بجائی جاتی ہیں اُن کی چھ اقسام ہیں جو الغنی، تاجور، دنی، بزمی، سوز اور کابلی کے نام سے معروف ہیں۔ یہ جملہ دھنیں رقص کیلئے مخصوص ہیں۔ ان کے علاوہ پولو کیلئے الگ دھنیں ہیں جن میں زبردست ہیجانی کیفیت ہوتی ہے۔ ان چوگانی دھنوں کی تعداد سات تک ہے جو حسب ذیل ہیں۔

۱۔ چوگان بہار ۲۔ جوور حریپ ۳۔ گُل آور جو مقامی طور پر غلوور کے نام سے مقبول ہے، ۴۔ چُھوموحریپ (اس میں ڈھول کی آواز مسلسل اور غالب ہوتی ہے) ۵۔ کلے حریپ۔ ۶۔ مَسُول (فاتح کھلاڑی کیلئے مخصوص ہے)

قبائلی، خاندانی، شخصی اور تاریخی دھنیں:

بروشال ایک درجہ بند سماج کا حامل تھا۔ خاندانی وقار اور عظمت کیلئے لوگ جنگوں اور معرکوں میں بخوشی جان نچھاور کرتے تھے۔ جس خاندان میں کوئی نامور شخص نہ گزرے پست خیال کیا جاتا تھا۔ اس طرح کے معاشرے میں آباء پرستی کا عام چلن تھا اور سورماؤں کے نام پر دھنیں تخلیق کی جاتی تھیں۔ یوں ایک طرح سے خراج عقیدت پیش کی جاتی تھی۔ حکمران خاندان کی بعض شخصیات کے نام پر بھی دھنیں وجود میں آگئیں۔

۱۔ شاہ بودے حریپ　　۲۔ گشپور بختاور شاہ حریپ
۳۔ گشپور جمشیدے حریپ　　۴۔ غزن خان (القوم اے) حریپ
۵۔ گشپور غنی خانے حریپ　　۶۔ تھرا بیگ اے حریپ
۷۔ سلطان علی اے حریپ　　۸۔ گشپور عبداللہ خانے حریپ
۹۔ منگی خانے حزیپ　　۱۰۔ یرپہ مراتووے حریپ
۱۱۔ چوشابوٹوے حریپ　　۱۲۔ ترنگفہ زوار احریب
۱۳۔ ترنگفہ قلندرے حریپ　　۱۴۔ روپی کُڑے حریپ
۱۵۔ تیمور کوڑے حریپ　　۱۶۔ کویو کوڑے حریپ
۱۷۔ قراہ بیگ کوڑے حریپ　　۱۸۔ ژپو کوڑے حریپ
۱۹۔ بروکے حریپ　　۲۰۔ خرو کوڑے حریپ
۲۱۔ براقلنکے حریپ　　۲۲۔ درامڑ کے حریپ
۲۳۔ ترنگفہ مہربانے حریپ　　۲۴۔ ترنگفہ نصیروے حریب
۲۵۔ ترنگفہ عنایت حریپ　　۲۶۔ ترنگفہ میرزا حریپ
۲۷۔ ترنگفہ کریم حریپ　　۲۸۔ ترنگفہ ہمایوں حریپ
۲۹۔ ترنگفہ دینار حریپ　　۳۰۔ ترنگفہ سرور حریپ
۳۱۔ ترنگفہ سلیمان حریپ　　۳۲۔ ترنگفہ دینار حریف
۳۳۔ ترنگفہ دادو میون حریپ　　۳۴۔ ذونانگ شکراللہ بیگ حریپ
۳۵۔ ارباب دولیک حریپ　　۳۶۔ ارباب نایاب حریپ
۳۷۔ ترنگفہ یوسف حریپ　　۳۸۔ استاد بُدُل حریپ
۳۹۔ قولیکوڑے حریپ　　۴۰۔ استاد حکمت شاہ حریپ
۴۱۔ برچہ تنگ حریپ　　۴۲۔ شاہنو حریپ
۴۳۔ ارباب شگوفہ حریپ　　۴۴۔ ترنگفہ نیت شاہ حریپ
۴۵۔ پوسلیم حریپ　　۴۶۔ لیمان حریپ
۴۷۔ مورو حریپ　　۴۸۔ کچو برک حریپ
۴۹۔ موسنگھ حریپ　　۵۰۔ جی کوڑے حریپ
۵۱۔ ترنگفہ خیط اللہ حریپ　　۵۲۔ بُلبُل شیریں حریپ
۵۳۔ رمضانی حریپ　　۵۴۔ گُل پونا کی حریپ
۵۵۔ خوش بیگم حریپ　　۵۶۔ گرکس حریپ

۵۷۔ بگل دنی کہ تنو بگل حریپ　　۵۸۔ نائب خان حریپ

۵۹۔ چن چن حریپ۔

کاہنوں کیلئے مخصوص دُھن:

بروشال میں کبھی شامان مَت کا دور تھا۔ لہذا شامان کو نچانے کیلئے مخصوص دھنیں تخلیق کی گئی تھیں جن میں ''گُل گُل''، ''لٹسی''، ''آشوس لبیدو''، ''شیریں زبان''، ''ختون'' اور ''شمہ شور'' نام کی دھنیں مروج تھیں۔

تاریخی دھنیں:

بروشال ہنزہ کے ایک قدیم راجہ شاہ غضنفر خان کے دور میں نگر کے ساتھ ایک محاربہ میں ہنزہ کو فتح ملی۔ اس واقعہ کی یاد میں ایک دھن تخلیق کی گئی۔

برکھٹ ملو ہنزہ کے ایک قدیم راجے کا باغی تھا۔ اس پاداش میں اسکے سگے بھانجے حلوفقیر نے برکھٹ ملو کو قتل کیا۔ میر ہنزہ بڑا خوش ہوا اور شاہ بیگی نام سے ایک دھن حلوفقیر کیلئے مخصوص کی۔

قومی دھنیں:

''بو پھاؤ''، ''تھموشلنگ''، ''گنانی'' اور ''پیا قمر'' بروشال ہنزہ نگر کے مقامی تہوار ہیں۔ ان تمام تہواروں سے متعلق دھنیں بھی بہت مقبول ہیں۔ جن میں سے چند مستعار اور چند مقامی ہیں۔ شادی بیاہ کیلئے بھی دھنیں مخصوص تھیں جن میں اجولی اور اشپیری بہت مشہور ہیں۔ یہ بھی درآمدی دھنیں ہیں۔ اب جدید سازوں اور دھنوں کا رواج ہو چلا ہے۔ یزھائی نیس آغا خان کی سالگرہ کے موقع پر علاقہ بھر میں بینڈ کی مختلف منڈلیاں اپنے فن کا مظاہرہ کرتی ہیں۔ اُجلی، زرق، برق اور جھالردار وردی میں ملبوس یہ بینڈ نواز طائفے جدید دھنیں بکھیر کر خوب داد پاتے ہیں لیکن دیسی نفیری اور دُہل کا اپنا ایک رنگ ہے جنکی گونج محفل کی ہاؤ ھو سے ہم آہنگ ہو کر دلوں میں رچ بس جاتی ہے۔

عرس اور میلے

بروشال کے عُرس میلے مقامی زرعی تقدیم سے جُڑے ہوئے ہیں۔ کیونکہ ان علاقوں میں ماضی قریب تک معیشت کا دارومدار زرعی چوپانی پر تھا۔ کچھ تہوار ایسے بھی ہیں جو پاس پڑوس سے درآئے اور بعض خالص مذہبی نوعیت کے ہیں جن کا رواج زیادہ پرانی بات نہیں۔

بروشال ہنزہ نگر اور یاسین میں کُلہم آبادی مسلمان ہے۔ نگر میں شیعہ جبکہ ہنزہ اور یاسین میں اسماعیلی بستے ہیں لہذا مذہبی نوعیت کے تہواروں میں تھوڑا بہت فرق نظر آتا ہے۔ ہنزہ میں ہر دو عیدین کے علاہ ہز ھائی نس آغا خان چہارم کی پیدائش اور گلگت میں پہلی مرتبہ تشریف آوری کے حوالے سے سالگرہ جوش و جذبے سے منائی جاتی ہے۔ سال بہ سال اس میں مزید تقویت آرہی ہے۔ نوجوان ان تقریبات کے دوران تفریحی عنصر زیادہ شامل کر رہے ہیں۔ سالگرہ کے دنوں میں بروشال کی قدیم ثقافتی ورثہ کو زیادہ سے زیادہ اجاگر کیا جاتا ہے۔ مقامی پکوان جنکا لوگوں نے محض نام ہی سنا ہوا ہوتا تھا اب انکے باقاعدہ سٹال لگتے ہیں اور ان پکوانوں کے کاریگروں کی حوصلہ افزائی کی جاتی ہے۔ اس طرح روائتی کھیل تماشے بھی سٹیج کیئے جاتے ہیں۔ نہ صرف یہ بلکہ چوب کاری، موسیقی، پٹی بافی، شرمہ سازی اور روایتی علاج معالجہ کے ماہرین کو بھی دعوت دی جاتی ہے تاکہ وہ اس موقعہ پر اپنے فن کا بھرپور مظاہرہ کر سکیں۔ دوسری طرف بروشال نگر میں مذہب کا رنگ زیادہ غالب نظر آتا ہے۔ چہاردہ معصومین علیم السلام کی ولادت اور رحلت کے علاوہ محرم الحرام کے دس ابتدائی ایام اور چہلم امام حسین علیہ السلام انتہائی عقیدت سے منائے جاتے ہیں۔

کِت دِت:

یہ بالائی ہنزہ میں آمد بہار اور رخصت سرما کا تہوار ہے۔ ہنزہ اور بالخصوص ''ہربَر'' میں کڑاکے کی سردی پڑتی ہے اور اس کا دورانیہ بھی خاصا طویل ہوتا ہے۔ لہذا بہار کا انتظار خصوصی اہمیت رکھتا ہے۔ بہار کے پُر جوش استقبال کو اہلیان گوجال نے ''کِت دِت'' کا نام دیا۔

اس تہوار کو منانے کا اعلان خلیفہ (مذہبی رہنما) کرتا ہے۔ گاؤں کی خواتین اس اعلان کے بعد گھر باڑوں کی صفائی ستھرائی میں جت جاتی ہیں۔ صفائی کے بعد پورے گھر کو چڑ کے پتوں یا حرمل کی دھونی دی جاتی ہے تاکہ بھوت پریت اور آفات و بلیات سے گھر کو نجات ملے۔ اس تہوار کے موقعہ پر ''شگون پتوک'' افراد کو خصوصی اہمیت دی جاتی ہے۔ یہ افراد ہر گاؤں میں پائے جاتے ہیں۔ ان کے بارے میں مشہور ہے کہ ابنائے خاک اور ''سعد گوئین'' یعنی خوش قدم ہوتے ہیں۔ لہذا عرس تہواروں کی ابتدا انہی کے ہاتھوں ہوتی ہے۔ ''کِت دِت'' تہوار سے پہلے ''شگون پتوک'' جنگل سے چڑ کے پتوں کی شاخیں لاتا ہے اور اُس کے چھوٹے چھوٹے گچھے لوگوں میں تقسیم کرتا ہے۔ ان گچھوں کی مدد سے لوگ گھر کے شہتیروں اور ستونوں کی جھاڑ پونچھ کرتے ہیں اور آئندہ برس تک انہیں کسی اونچی اور محفوظ جگہ پر رکھتے ہیں۔ صفائی کے بعد دروازے کے بالائی حصوں اور ستونوں پر آٹا چھڑکا جاتا ہے۔ سہ پہر کو گاؤں کے مرد و زن اور بچے جماعت خانہ (اسماعیلی عبادت گاہ) میں جمع ہوتے ہیں اور اپنے ہمراہ لائے ہوئے لذیذ پکوان مل جُل

کر کھاتے ہیں۔ گوجال میں دودھ مکھن اور دہی سے تیار کردہ کھانوں کا کچھ زیادہ ہی رواج ہے۔ اس کے بعد ڈھول تاشے اور کھیلوں کا اہتمام ہوتا ہے۔ موسیقی کی گونج اور ہاؤ ہو میں نوجوان خوب ناچتے ہیں۔ آخر میں گاؤں کا خلیفہ پورے علاقے کی سلامتی، خوشحالی اور براری حاجات کیلئے خصوصی دعا پڑھتا ہے۔ اس طرح دن ڈھلتے ہی اس تہوار کا اختتام ہوتا ہے اور لوگ شاداں وفرحاں اپنے اپنے گھروں کا رُخ کرتے ہیں۔

چیز:

یہ بھی بالائی ہنزہ میں فصل کٹائی کا تہوار ہے۔ یہ جَو کی فصل تیار ہونے پر دس یا بارہ جولائی کو منایا جاتا ہے۔ فصل کٹائی کا کام مرد حضرات انجام دیتے ہیں۔ کٹائی کے دن مرد پتلی پتیری روٹیوں پر تازہ بہ تازہ مکھن رکھ کر کھیتوں کا رُخ کرتے ہیں۔ یہ لوگ اپنے ہمراہ حرمل کی خشک پتیاں اور دانے بھی لے جاتے ہیں۔ اس موقع پر ایک چھوٹی سی رسم ادا کی جاتی ہے۔ خاندان کا بزرگ مرد حرمل یا چڑ کی خشک پتیاں انگاروں پر ڈالتا ہے یوں تیز خوشبودار دھواں اٹھتا ہے۔ فضا معطر ہوتی ہے۔ اب ایک آدمی جو کے چند خوشے توڑتا ہے اور گھر بھیجتا ہے۔ یہ رسم کسی قریبی کھیت میں ادا کی جاتی ہے۔ خواتین خانہ اس دوران لذیذ پکوان تیار کرتی ہیں اور اس پکوان کے اوپر جو کے چند دانے رکھتی ہیں۔ اس کے بعد ہر کوئی اپنے اپنے لذیذ کھانے لیکر ایک مشترکہ جگہ پر جمع ہوتا ہے جہاں سارے مل کر کھانا کھاتے ہیں۔ طعام کے بعد خلیفہ فراوانی رزق کیلئے خصوصی دعا پڑھتا ہے۔ پھر فصل کی باقاعدہ کٹائی شروع ہوتی ہے۔ فراغت کے بعد نوجوان اور بچے بچیاں کھیل کود میں مصروف ہوتے ہیں۔

تگھم:

یہ بھی خطہ گوجال کا ہی ایک قدیم تہوار ہے۔ تگھم دراصل تخم کی بگڑی ہوئی شکل ہے۔ یہاں تخم سے مراد محض بیج نہیں بلکہ بیج بوائی ہے۔ مارچ کے اوائل میں ہی اس تہوار کا آغاز ہوتا ہے اور صرف دو روز تک جاری رہتا ہے۔ خواتین اس روز نئے کپڑے زیب تن کرتی ہیں۔ گھروں میں حسب دستور حرمل کی دھونی دی جاتی ہے۔ بڑھے بوڑھے اپنے اپنے گھروں کے چاروں ستونوں اور شہتیروں پر آٹا چھڑکتے ہیں۔ عورتیں ایک مخصوص میٹھی روٹی سمن شپک، ملیدہ اور شربت (آٹا، پانی اور گھی سے تیار شدہ پکوان) تیار کرنے کیلئے نہروں میں رواں دواں گلیشئر کا تازہ پانی لاتی ہیں۔ اب ہر گھرانے کا سربراہ اپنے کھیت میں جا کر علامتی طور پر بیج ڈال کر ہل چلاتا ہے۔ خواتین کے سوا خاندان کا ہر نرینہ فرد اس رسم میں حصہ لیتا ہے۔

اس کے بعد لوگ اپنے دوست احباب کو مدعو کرتے ہیں اور مخصوص کھانوں سے مہمانوں کی پذیرائی کی جاتی ہے۔ شام کو ناچ گانا اور پولو کا اہتمام ہوتا ہے۔ اس موقع پر شگون پتوک قبیلہ کو فوقیت دی جاتی ہے اور دوسرے روز تخم بوائی کی رسم کی ابتدا شگون پتوک کے ہاتھوں ہوتی ہے۔ اگلے روز شگون کے گھر کے باہر لوگ اپنے اپنے صحتمند اور موٹے تازے بیل ہانک کر لاتے ہیں۔ بیلوں میں زور آزمائی کرائی جاتی ہے۔ جیتے ہوئے بیلوں کے مالکان پھولے نہیں سماتے۔ اس دوران گاؤں کے معتبران شگون کے گھر جمع ہوتے ہیں۔ سارے معتبران یکجا ہوں تو گھر کی کھڑکیاں، دروازے اور روشندان بند کیئے جاتے ہیں اور چیڑ کے خشک پتیوں کی دھونی دی جاتی ہے۔ یہ گاڑھا دھواں اور حبس زدہ ماحول معززین کو چکرا کر رکھ دیتا ہے۔ ان بیچاروں کی آنکھیں لال انگارہ بن جاتی ہیں اور کھانس کھانس کر ادھ مواہ ہو جاتے ہیں۔ یہ کیفیت دیکھ کر گھر کا کوئی فرد روشندان کھول دیتا ہے۔ یہ دھواں مرغولے کی شکل میں روشندان سے خارج ہوتا ہے اور جس سمت کا رُخ کرے اسی جانب کے کھیت میں بوائی کی رسم پوری کی جاتی ہے۔ شگون پتوک اس دن عجیب و غریب حلیہ بناتا ہے۔ پوستین الٹی پہنتا ہے۔ چہرہ آٹے سے لپا ہوا ہوتا ہے اور ٹوپی ترچھی کر کے جب باہر نکلتا ہے تو بچوں کی ٹولیوں کی ٹولیاں اسے دیکھنے آتی ہیں۔ اس موقع پر بیلوں کی ایک تگڑی جوڑی ہل جوتنے کیلئے تیار کی جاتی ہے۔ اور مقررہ کھیت میں شگون پتوک بیج ڈالتا ہے۔ اس کے بعد گاؤں کا ہر فرد ہل چلانے میں تھوڑا بہت حصہ لیتا ہے۔ کھیت تیار ہونے کے بعد خلیفہ دستور کے مطابق تمام گاؤں کی خوش حالی اور شادمانی کیلئے دُعا مانگتا ہے۔ اس روز بھی خوب کھیل تماشے ہوتے ہیں اور عید کا سا سماں ہوتا ہے۔

گنانی:

گنانی تہوار جو اور گندم کی فصل پکنے پر جون میں منایا جاتا ہے۔ یہ مسرتوں اور امیدوں بھرا تہوار ہے۔ اس تہوار پر کچھ زیادہ ہی خوشی دیکھنے کو ملتی ہے۔ قدیم ایام میں پورے علاقے میں قحط کی سی کیفیت رہتی تھی۔ لہذا فصل پکنے کا موسم قحط کے خاتمے کی نوید لیکر آتا تھا۔ اس نسبت سے گنانی تہوار کی بہت اہمیت تھی۔ لوگ ہفتہ عشرہ پہلے سے ہی گنانی کی تیاریوں میں مصروف ہوتے تھے۔ مدفون دیسی گھی کے ڈھیلے نکالے جاتے تھے۔ صاحب حیثیت گھرانے افراد خانہ کیلئے نئے جوڑے بھی سلواتے تھے۔ دِرَم پھٹی (ہنزہ نگر اور یاسین کی مخصوص میٹھی روٹی) دِرَم پسوایا جاتا ہے۔ دِرَم پھٹی گنانی کا خصوصی پکوان ہے۔ چرواہے اس دن کیلئے خصوصی طور پر پنیر اور تازہ مکھن لیکر چراگاہوں سے گھروں کا رُخ کرتے ہیں۔

ریاستی دور میں گنانی کا ایک الگ لطف تھا۔ سارندے گنانی سے کچھ دن پہلے والیان ہنزہ نگر کے محلات کے باہر مخصوص دھن بجاتے تھے۔ عوام سمجھتے تھے کہ گنانی کی تیاریاں آخری مرحلوں میں ہیں۔ گنانی سے ایک دن پہلے غیر معمولی چہل پہل ہوتی تھی۔ رات کو بچے ہاتھوں پر مہندی لگاتے تھے اور صبح ہوتے ہی دیکھتے کہ رنگ کس قدر نکھرا ہے۔ مائیں بچوں کو نہلاتی اور انکے سر پر خوبانی کی گری کا تیل لگاتیں۔ آنکھوں میں سرمہ پھیرتیں اور نئے یا دھلے دھلائے کپڑے پہناتیں۔ والیان ریاست دن چڑھے، شہزادوں اور شہزادیوں کے ساتھ درباریوں کے جلو میں نعروں کی گونج کے ساتھ ایک عجب شان سے برآمد ہوتے اور کسی مقررہ کھیت میں جا کر کٹائی کا آغاز کرتے۔ اُن کے دیکھا دیکھی عوام بھی جو کی کٹائی شروع کرتے تھے۔ اس موقع پر قدیم دستور کے مطابق لوگ اپنے ہمراہ لسی، مکھن اور دِرم ساتھ لیجاتے اور کٹائی سے پہلے گندم یا جو کے چند خوشے توڑ، ہاتھوں میں مسل اور پھونک صاف کر کے لسی میں ڈالتے اور تمام افراد خانہ مل کر ایک ہی برتن (گوڈور) میں (خمہ لی) پتیری روٹی کے ساتھ نوش جان کرتے تھے۔ اس کے بعد فصل کی کٹائی شروع ہوتی۔ اگلے دن پولو، رسہ کشی اور دیگر کھیلوں کا اہتمام ہوتا۔ یوں یہ دن ہنسی خوشی اور خندہ آور مصروفیت کے ساتھ اختتام پذیر ہوتا تھا۔

ووتھ چک:

ماہ فروری کے آخری ہفتے میں بالائی بروشال ہنزہ میں خوشیوں سے بھرپور ایک دن منایا جاتا ہے جو ووتھ چک کے نام سے مشہور ہے۔ یہ دراصل نہروں کی مرمت اور بھل صفائی کا دن ہوتا ہے۔ نئے سال کی زرعی سرگرمیوں کی شروعات سے پہلے نہروں کی مرمت اور انکی دیکھ بھال ضروری ہوتی ہے۔ اس مخصوص دن سے منسوب تہوار کا آغاز علی الصبح ہی ہوتا ہے۔ کت دت تہوار کی طرح اس دن بھی دروازوں اور کھڑکیوں کی بالائی چوکھٹوں اور ستونوں پر آٹا چھڑکا جاتا ہے۔ یہ رسم گھر کا کوئی بزرگ انجام دیتا ہے۔ گاؤں کے چھوٹے بڑے اس روز دَل گرم نہر کا رُخ کرتے ہیں۔ نہر کے پاس خلیفہ کی آمد کا انتظار کیا جاتا ہے تاکہ دعائے خیر کے بعد کام کا آغاز کیا جاسکے۔ خلیفہ آتے ہی پانی اور غلے کی افزائش اور اہل دیہہ کی صحت و تندرستی اور خوشی کیلئے دعا پڑھتا ہے تو حاضرین با آواز بلند آمین کہتے ہیں۔ اس کے بعد شگون پتوک لوگوں میں پانی کی تقسیم کا فیصلہ کرتا ہے۔ قدیم زمانے میں ی تقریب ایک سابق والئی ہنزہ سلیم خان سوئم کے مزار کے پاس منعقد ہوتی تھی یہ وہی حکمران تھا جس نے گلگت کے علاقے میں نہروں کا جال بچھایا۔ آج کل یہ رسم جماعت خان کے صحن میں ادا کی جاتی ہے۔ وہیں ایک مقامی پکوان ''بَت'' سے حاضرین کی پزیرائی کی جاتی ہے۔ گئے وقتوں میں اس تہوار کے خاتمے پر پولو بھی کھیلا جاتا تھا۔

ووتگوستوئی (پرندوں کی شادی):

یہ تہوار بھی خالصتاً بالائی ہنزہ سے متعلق ہے جو ماہ جون کے دوسرے اور تیسرے ہفتے میں منایا جاتا ہے۔ اس موسم میں جو کی فصل تیار ہوتی ہے۔ خطہ گوجال جیسے قحط زدہ خطوں میں جو کی فصل اختتام افلاس کی خوش خبری لے کر آتی ہے۔

پرندے عموماً فصلوں کے دشمن خیال کیئے جاتے ہیں اور ان پر قابو پانا بھی دشوار ہوتا ہے لہذا خطہ گوجال کے لوگ اس صورتحال کے تدارک کیلئے ذرا دلچسپ سا انداز اختیار کرتے ہیں۔ کاشتکار پرندوں کیلئے ایک خصوصی خوراک تیار کرتے ہیں۔ جسے مقامی زبان میں بت کہا جاتا ہے۔ کاشتکار پُر امید ہوتے ہیں کہ پرندوں کے ساتھ دوستی کے باعث اُن کی فصلیں تباہ نہیں ہوں گی۔ بڑے شہروں سے اشیائے خوردونوش کی برابر فراہمی نے اب قحط کا خطرہ ٹال دیا ہے تاہم کاشتکاروں کی کوشش ہوتی ہے کہ پرندوں کو بھگانے کی بجائے انہیں پیٹ بھر خوراک دے کر ٹالا جائے۔ یہ طریقہ وہاں کارگر بھی ہے۔

کُچ کھمک خدوئی:

اختتام ستمبر یا اکتوبر کے پہلے ہفتے میں مویشی چراگاہوں سے واپس لائے جاتے ہیں۔ ان جانوروں کی واپسی کیلئے عموماً جمعرات کا دن منتخب کیا جاتا ہے۔ کُچ کھمک خدوئی مسرتوں اور تقریبات کا دن ہوتا ہے کیونکہ اس موقع پر کسان فصل کٹائی اور میوہ جات کو خشک کر کے بالکل فارغ ہوتے ہیں اور زرعی سال کی سرگرمیوں کا اختتام ہوتا ہے۔ اب دیہاتی تفریح کیلئے ذہنی طور پر بالکل تیار ہوتے ہیں اور سرما کے طویل دورانیے کیلئے خوراک کی ذخیرہ کاری بھی ہو چکی ہوتی ہے۔ چراگاہوں سے آنے والے جانوروں کے ساتھ گھی، پنیر اور خشک دہی (قروت) کی شکل میں خوراک کی ترسیل بھی ہوتی ہے۔ جانور اس دوران خوب موٹے تازے ہوتے ہیں۔ اب ان تھل تھل کرتے جانوروں میں سے کسی بھیڑ بکری یا سرا گائے (یاک) کو ذبح کر کے ''مرا'' یعنی دیسی سٹور میں اس کا گوشت محفوظ کیا جاتا ہے تاکہ پورے موسم سرما میں گوشت دستیاب ہو۔ یہ گوشت دھیرے دھیرے خشک ہو کر انتہائی مزیدار ذائقہ دیتا ہے۔ اس قسم کے گوشت کو مرکزی ہنزہ میں ''اوشایا شوہے چھپ'' اور گلگت میں ''نسالئی موز'' کہتے ہیں۔ جس دن جانور ذبح ہوں ہر گھر میں ''خمشد ون'' روٹی پکائی جاتی ہے تاکہ جماعت خانہ میں عبادت گزاروں کو دی جاسکے۔ نمازی خدا کے حضور شکرانہ کیلئے علی الصبح ہی جماعت خانہ میں حاضری دیتے ہیں۔ وہ حضرات جو اپنے مال مویشی خُدائی (اللہ کے حضور نذرانہ) کے طور پر ذبح کرنا چاہیں، لے آتے ہیں۔ وہیں گاؤں کی تمام آبادی کیلئے پرتکلف کھانے کا اہتمام ہوتا

ہے۔اس موقع پر گاؤں کے مسائل اور دیگر اہم امور پر بھی صلاح مشورہ کیا جاتا ہے۔

پیر باڈر:

زیادہ وقت نہیں گزرا بروشال ہنزہ میں پیر باڈر (پیر بہادر) کے نام سے ایک عجیب وغریب رسم رائج تھی۔ گاؤں کا کوئی شخص اپنے ہمسایوں اور دوست احباب کو رات کھانے پر مدعو کرتا تھا۔ میزبان انتہائی پتلی پتیری روٹی ''خمچنگ'' اور چابت مسور کی دال کے سالن سے پذیرائی کرتا تھا۔ مسور کی دال کا شمار اُن دنوں پر تعیش کھانوں میں ہوتا تھا۔ ایسی دعوتوں میں خواتین کیلئے مُل (دلیہ کی طرح پکا ہوا آٹے کا پکوان) پیش کیا جاتا تھا اور انہیں سر پر لگانے کیلئے خوبانی کی گریوں کا تیل بھی دیا جاتا تھا۔ کسی بھی دن یہ دعوت ہوتی تھی۔ میزبان دراصل یہ اہتمام اپنے مرحومین کی ارواح کو ثواب پہنچانے کیلئے کرتا تھا۔

پیا قمر:

یہ شکرانے کا تہوار ہے جو عموماً ۱۵، اگست کے بعد گندم کی کٹائی سے فرصت پاتے ہی منایا جاتا ہے۔ اس تہوار میں والیان ریاست شامل نہیں ہوتے تھے بلکہ گاؤں کے بزرگ معتبران اور دیگر لوگ حصہ لیتے تھے۔ اس تہوار سے ایک روز پہلے گاؤں والے مشترکہ طور پر کوئی بیل یا گائے خریدتے اور اُسے ذبح کر کے دعوت کا بندوبست کرتے تھے۔ جس گھر میں کھانا پکتا وہیں ناچ گانے کا اہتمام بھی ہوتا تھا۔ کیا چھوٹے کیا جوان اور کیا بوڑھے سب ناچتے اور ھاؤ ھو میں پورا دن گزارتے۔

نوروز:

ہر چند کہ یہ بدیسی تہوار ہے اور وسط ایشیاء سے مخصوص ہے لیکن بروشال ہنزہ، گلگت، پونیال، اور یاسین میں قدیم دور سے لیکر آج تک انتہائی جوش وخروش سے منایا جاتا ہے۔ خصوصاً شیعہ اور اسماعیلی گھرانے اس تہوار کو ابھی تک جاری رکھے ہوئے ہیں۔ مقامی طور پر اسے (نوروزے عیت) کہتے ہیں۔ ایران اور وسط ایشیاء کی طرح ان علاقوں میں بھی یہ عید ۲۱، مارچ کو منائی جاتی ہے۔ مارچ کا مہینہ ویسے بھی روئیدگی اور تروتازگی کی خبر لے کر آتا ہے۔ اسلئے نوروز کے ساتھ لوگوں کی فطری انسیت ہے۔ برف سے منجمد علاقے میں حیات نو کی سی کیفیت دیکھنے کو ملتی ہے۔ گلیشیئر پگھلنے کے باعث خشک ندی نالوں میں پانی رواں دواں ہوتا ہے۔ بادام اور خوبانی کے درخت کھلنے لگتے ہیں۔

اس روز لوگ معمول سے بہت سویرے جاگتے ہیں۔ بچوں کی خوشی دیدنی ہوتی ہے۔ خواتین گھر اور گلی کوچوں کی صفائی اور جھاڑ پونچھ میں لگ جاتی ہیں۔ ان سرگرمیوں سے فراغت کے بعد افراد خانہ نئے کپڑے زیب تن کرتے ہیں۔ جو گھرانے نئے جوڑے نہ سلوا سکیں مجبوراً پرانے ہی دھو دھلا کر پہنتے ہیں۔ اس کے بعد عزیز واقارب اور یار دوستوں کو مدعو کیا جاتا ہے۔ اس روز شادی شدہ بہنوں اور بیٹیوں کو ہر حال میں مدعو کیا جاتا ہے۔ جسے مقامی زبان میں ''سِلہ خن مُر قاؤ اِیتس'' کہتے ہیں۔ اس روز کے خصوصی طعام میں دِرِم پھٹی، دہی، باقلہ کے اُبلے ہوئے دانے، پتیری روٹی کے ساتھ مکھن شامل ہیں۔ باقلہ کے ادھ پکے دانوں کے ہار بھی تیار کیئے جاتے ہیں جو ایک دوسرے کو تحفے میں دیئے جاتے ہیں۔ بچے بہت شوق سے یہ ہار پہنتے ہیں۔ خورد ونوش کے بعد کھیل کود کا دور شروع ہوتا ہے۔ لڑکے کٹل بُلہ (پیدل پولو) مینڈک، دغہ دغہ (آنکھ مچولی) کھیلتے ہیں، لڑکیاں کسی باغ میں جھولا جھولتی ہیں جبکہ جواں گھوڑے پر پولو کھیلتے ہیں۔

بو پھاؤ:

یہ وسطی ہنزہ، نگر اور یاسین کا وہ تہوار ہے جس میں گوجال کی رسم ''تگھم'' کی طرح بیج بوائی کی جاتی ہے۔ یہ تہوار عموماً ماہ دلو کی پندرھویں یا عیسوی تقویم کے مطابق فروری کی بیس یا پچیس تاریخ کے درمیان منایا جاتا ہے۔ اس تاریخ کا تعین نیک ساعت دیکھنے کے بعد خلیفہ ہی کرتا ہے۔ ہفتہ عشرہ پہلے ہی دن مقرر کرنے کے بعد خوشیوں کی ریل پیل شروع ہوتی ہے۔ گھروں کی صفائی کی جاتی ہے۔ حرمل اور چڑ کے پتوں کی دھونی دی جاتی ہے۔ پرانے دنوں کی بات ہے انہی ایام میں خوبانی کی کونپلیں پھوٹنے پر ''گھنی'' بھنے ہوئے گندم کے دانے ادھ کھلے درختوں کے نیچے کھانے کا رواج تھا اور رات کو ''مُل'' آٹے کا دلیہ نما پکوان گھی کے ساتھ کھاتے تھے۔

ریاستی زمانے کے دنوں میں التت قلعہ کے اندر بھی رنگا رنگ کھیل تماشوں کا بندوبست ہوتا تھا۔ لوک گویئے اپنے گیتوں میں والیان ریاست، نامور سرداران اور بہادر لوگوں کے کارنامے رزمیہ انداز میں گاتے تھے۔ ان تقریبات میں حکمران خود بھی بنفس نفیس موجود ہوتے تھے۔ درایں اثنا بلتستان سے ماخوذ ایک مخصوص ناچ ''اَپی چووے نُٹ'' کا اہتمام بھی ہوتا تھا۔ ریاستی زمانے میں راجگان بروشال اس تہوار سے متعلق تمام رسوم میں بذات خود حصہ لیتے تھے۔ اس حوالے سے ایک مقامی قلمکار عبداللہ جان ہنزائی اپنی کتاب میں لکھتے ہیں،

''بیج تیار کرنے کا طریقہ یوں تھا کہ چمڑے کے ایک تھیلے میں تقریباً آٹھ دس سیر جو کے دانے ڈالے جاتے تھے اور آخر میں سونے کے تین ٹکڑے جن کا وزن رتی بھر کا ہوگا، تین مختلف رنگوں کے کپڑوں کی دھجیوں میں لپیٹ کر جو کے دانوں کے اوپر رکھے جاتے تھے۔ اس دوران سازندے اپنی طرف سے میر ہنزہ کی خدمت میں اپنے ہاتھ کے تیار کردہ تیر بطور تحفہ پیش کرتے تھے۔ اس کے علاوہ بھی آداب ولوازمات تھے۔ مثلاً بیج کی تیاری کے ساتھ چوپن بھی تیار کرنا ہوتا تھا۔

چوپن کیا تھا؟ سب سے پہلے خشک توت کے دانے پیس کر آٹا سا تیار کرتے تھے جسے بروشسکی زبان میں ''بیک'' کہتے ہیں۔ کوئی آٹھ دس سیر ''بیک'' لیکر اس میں ایک پاؤ دیسی گھی شامل کر کے گوندھا جاتا ہے اور پھر اسے لکڑی کی ایک بڑی قدیم طشتری میں مخروطی شکل میں سیدھا رکھا جاتا ہے اور باہر کی طرف آٹا اور تازہ مکھن سے گلکاریاں کی جاتیں۔ اس کے بعد اسکی چوٹی پر ناشپاتی رکھی جاتی جبکہ ناشپاتی کے اوپر سنبل کے سرسبز کونپلوں کے گچھے باندھے جاتے۔ جس لکڑی کی طشتری میں مزکورہ چوپن تیار کیا جاتا تھا وہ ایک تاریخی نوعیت کی طشتری بیان کی جاتی ہے۔ اس کے پیندے کے ساتھ چار جگہوں میں لوہے کی زنجیریں لٹکی ہوتی تھیں علاوہ اس کے چوپن کے ساتھ ''خمہ لی'' روٹیاں تیار کی جاتی تھیں۔ نیز اس روز بیل کی چربی پگھلا کر اس میں آٹا اور پانی ملا کر دلیہ سا تیار کرتے تھے۔ پچھلی رات ''بو پھاؤ'' کے حوالے سے میر ہنزہ جو بیل ذبح کرواتے تھے اس رات اس کا گوشت روسٹ کروایا جاتا تھا''۔

عبداللہ ہنزائی رسم بو پھاؤ کے حوالے سے مزید لکھتے ہیں:۔

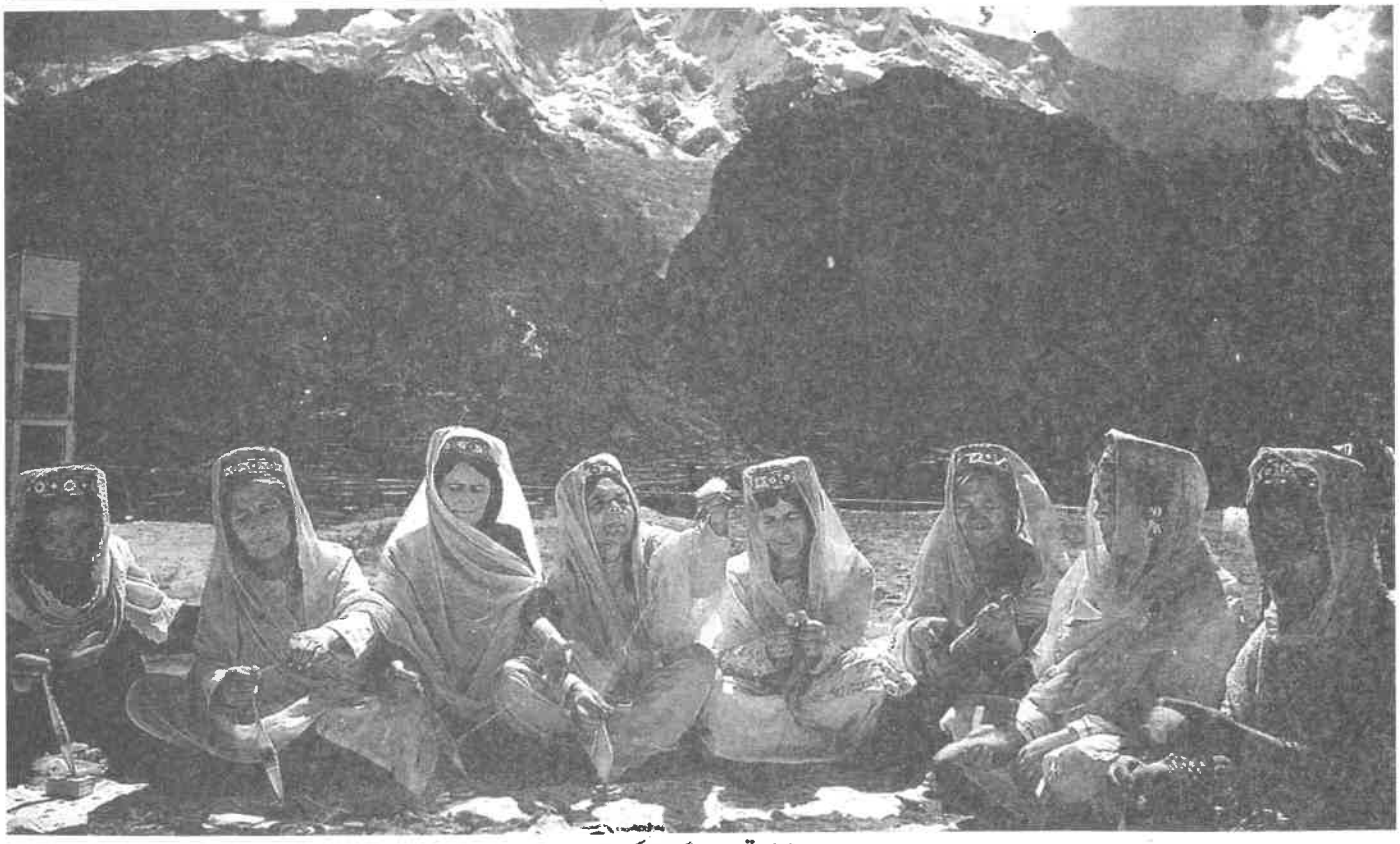
'' ذرا پرانے وقتوں میں بو پھاؤ کا ذکر کرتے ہیں تو اس میں کچھ اور آداب ولوازمات کا پتہ چلتا ہے۔ اس زمانے میں جب میر ہنزہ معہ اراکین ''بوائم تھامک'' میں جمع ہو جاتے تھے تو پہلے سے موجود سازندے ''گل آواز'' یودینی بجاتے تھے یعنی یہ ساز نیک شگونی کی علامت سمجھا جاتا تھا۔ پھر اس کے ختم ہوتے ہی میر ہنزہ اپنے وزیر کو خصوصی خلعت پہناتا اور یودینی پر پہلا ناچ وزیر کو پیش کرتا تھا۔ یہ بھی خوشی کی علامت تھی۔ اس کے بعد میر ہنزہ کے پھلوں کے گودام کا نگران ''گلچین'' میر کو گودام سے ناشپتیوں سے بھری رکابی پیش کرتا تھا میر کے بعد درباری بھی ایک ایک ناشپاتی اٹھاتے تھے۔ اس کے ساتھ ہی ساعت گیر ایک لکڑی کی طشتری میں آٹا لے کر آتا اور سب کو مبارکباد سلامت کہتے ہوئے میر کے شانوں پر چٹکی بھر آٹا چھڑکتا پھر یہی عمل درباریوں کیلئے بھی دہراتا۔ واضح رہے کہ ''بوواٹم تھانگ'' میں بجالانے والی تمام رسومات از قسم بیج تیار کرنا، چوپن بنانا وغیرہ التت کے ایک خاندان لخن کوژ کے افراد بجالاتے تھے۔''

ان تمام ابتدائی لوازمات کو بجالانے کے بعد آخر میں دلیہ تقسیم ہوتا تھا۔ ایک زمانے میں ''چوچو'' نامی ایک شخص ہوا کرتا تھا جس کا کام لکڑی کی ایک چمچ ''گیالت'' کے ذریعے دلیہ نکالنا اور تقسیم کرنا تھا۔

تھوڑے تھوڑے فرق کے ساتھ اس طرح کی رسومات تقریباً تمام بروشال میں ادا کی جاتی تھیں۔ تاہم ایک مشترکہ بات یہ تھی کہ بیج بوائی والے دن کو زبردست اہمیت حاصل تھی۔ اس رسم کے بعد اخون یا خلیفہ فارسی میں دعا پڑھتا اور اور بو پھاؤ کا عمل مکمل ہوتا۔ اس روز ہر گھر میں آٹا پانی اور نمک ملا ایک خصوصی پکوان ''مُل'' تیار ہوتا تھا جسے گھی کے ساتھ بڑی رغبت سے کھایا جاتا تھا۔

تھموشلینگ:

تھموشلینگ تہوار نہ صرف ہنزہ نگر بلکہ علاقہ غذر میں بھی منایا جاتا ہے۔ تاہم ان علاقوں میں اسے تلینی کہتے ہیں۔ فی زمانہ اس تہوار کے حوالے سے اتنا جوش وخروش تو دکھائی نہیں دیتا لیکن ماضی میں اسے ایک قومی تہوار کی حیثیت حاصل تھی۔ اس تہوار کا تاریخی پس منظر بہت دلچسپ ہے۔ کہتے ہیں کہ قدیم زمانے میں گلگت میں شری بدت نام کا ایک طفل خور راجہ تھا جو اپنی مردم آزاری کی وجہ سے بڑا بدنام تھا۔ لوگ اُس سے لرزہ براندام رہتے تھے۔ اس کے بطخ میں صبح وشام بھیڑ یا بکری کے دو بچے پکائے جاتے تھے۔ بھیڑ بکری کے بچوں کا یہ ٹیکس علاقے کے طول وعرض میں ہر گھر پر عائد تھا۔ ایک روز شرعی بدت کو گوشت کچھ زیادہ ہی لذیذ لگا۔ اس نے باورچی سے اس کا سبب دریافت کیا تو پتہ چلا کہ اب کی دفعہ بھیڑ کا جو بچہ شاہی باورچی خانہ میں پکایا گیا تھا اسے ایک بیوہ بڑھیا نے اپنا دودھ پلا کر پالا پوسا تھا اور اُسے بڑا عزیز رکھتی تھی۔ لیکن سرکاری کارندوں نے ٹیکس کے طور پر اس سے زبردستی ہتھیا لیا۔ اب راجہ نے دل میں سوچا کہ انسانی دودھ پر پل کر بھیڑ کا بچہ اتنا لذیذ ہوسکتا ہے تو لامحالہ انسانی بچے تو اس سے کہیں زیادہ مزہ دینگے۔ لہذا اس دن سے منادی کرادی گئی کہ روزانہ ایک شیر خوار بچہ شاہی باورچی خانہ کیلئے فراہم کیا جائے۔ مرتے کیا نہ کرتے غریب رعایا روتے پیٹتے اپنے جگر گوشوں کو خود اپنے ہاتھوں سے راجہ کے کارندوں کے حوالے کرتی رہی تاکہ وہ انہیں ذبح کر کے شری بدت کی من پسند خوراک کا بندوبست کریں۔ یہ سلسلہ کچھ عرصہ چلتا رہا۔ اللہ کا کرنا ایک نووارد شہزادہ آذر جمشید کی سرکردگی میں گلگت اور قرب وجوار کے علاقوں پر حملہ آور ہوا اور لوگوں نے شری بدت کے محل پر حملہ کیا اسے پہلے سے تیار ایک گہرے گڑھے میں دھکیل دیا اور اس پر جلتے ہوئے چوب چراغ ڈال دیئے۔ شری بدت جل بھن کر خاک ہوا۔ لیکن دوسری طرف توہم پرست لوگ اس کی موت کے باوجود خوف کا شکار رہے۔ ان کا خیال تھا کہ شری بدت کی روح معصوم لوگوں کو ضرور ستائے گی۔ لہذا اس وقت سے اب تک یہ رسم چلی آرہی ہے کہ ماہ جدی کے پہلے ہفتے میں رات کو لوگ چوب چراغ ''تلینی'' روشن کر کے شور وشیون کے ساتھ جلوس کی شکل میں دریا یا کسی بڑی نہر کا رُخ کرتے اور الاؤ وہیں پھینک آتے۔ ایک عقیدہ یہ تھا کہ شری بدت کا دل گھی کا بنا ہوا ہے۔ جوں ہی حدت ہوگی شری بدت کی موت واقع ہوگی اور آئندہ برس تک چھٹکارا مل جائے گا۔ لیکن بات یہاں ختم نہیں ہوتی۔ اس تہوار کیساتھ اور بہت سی رسومات وابستہ ہیں۔ یہ تہوار ۲۱، دسمبر کی یخ بستہ



بروشو خواتین دھاگہ تیار کر رہی ہیں

رات کو منایا جاتا ہے۔ تھوشلنگ سے ہفتہ بھر پہلے متمول لوگ گائے بیل ذبح کرتے ہیں جبکہ بھڑ بکریاں ایک روز پہلے ہی ذبح کی جاتی ہیں۔ تھوشلنگ کی رات جانوروں کی چربی، اوجھڑی اور آنتوں کا سالن تیار کیا جاتا ہے۔ قدیم زمانے میں آدھی رات کے بعد وقفے وقفے سے دُہل یا نقارے بجائے جاتے تھے۔ صبح کاذب کے وقت نقارے کی آواز سنتے ہی لوگ جاگ اُٹھتے اور چیڑ کی خشک شاخوں سے تیار کردہ چوب چراغوں کو ہاتھوں میں بلند کئے گھروں سے نکل پڑتے اور ایک مقررہ جگہ پر ڈھیر کرتے رہتے۔ آج یہ رسم بھی آہستہ آہستہ دم توڑ رہی ہے۔

مزارات:

بروشال میں کبھی شامان مت، بدھ مت، ہندو مت، آتش پرستی اور بون مت جیسے عقائد کا چلن رہا ہے۔ پندرھویں صدی کے بعد ان علاقوں میں اسلام کی اشاعت شروع ہوئی۔ کشمیر بدخشاں اور ایران سے مبلغین اسلام کا ورود مسعود شروع ہوا۔ ان اولیائے کرام کی تبلیغ سے ان دور دراز علاقوں میں وحدانیت کی روشنی پھیل گئی۔ بروشال میں تشریف لانے والے ان اولیائے کرام کے مزارات مرجع خلائق ہیں۔

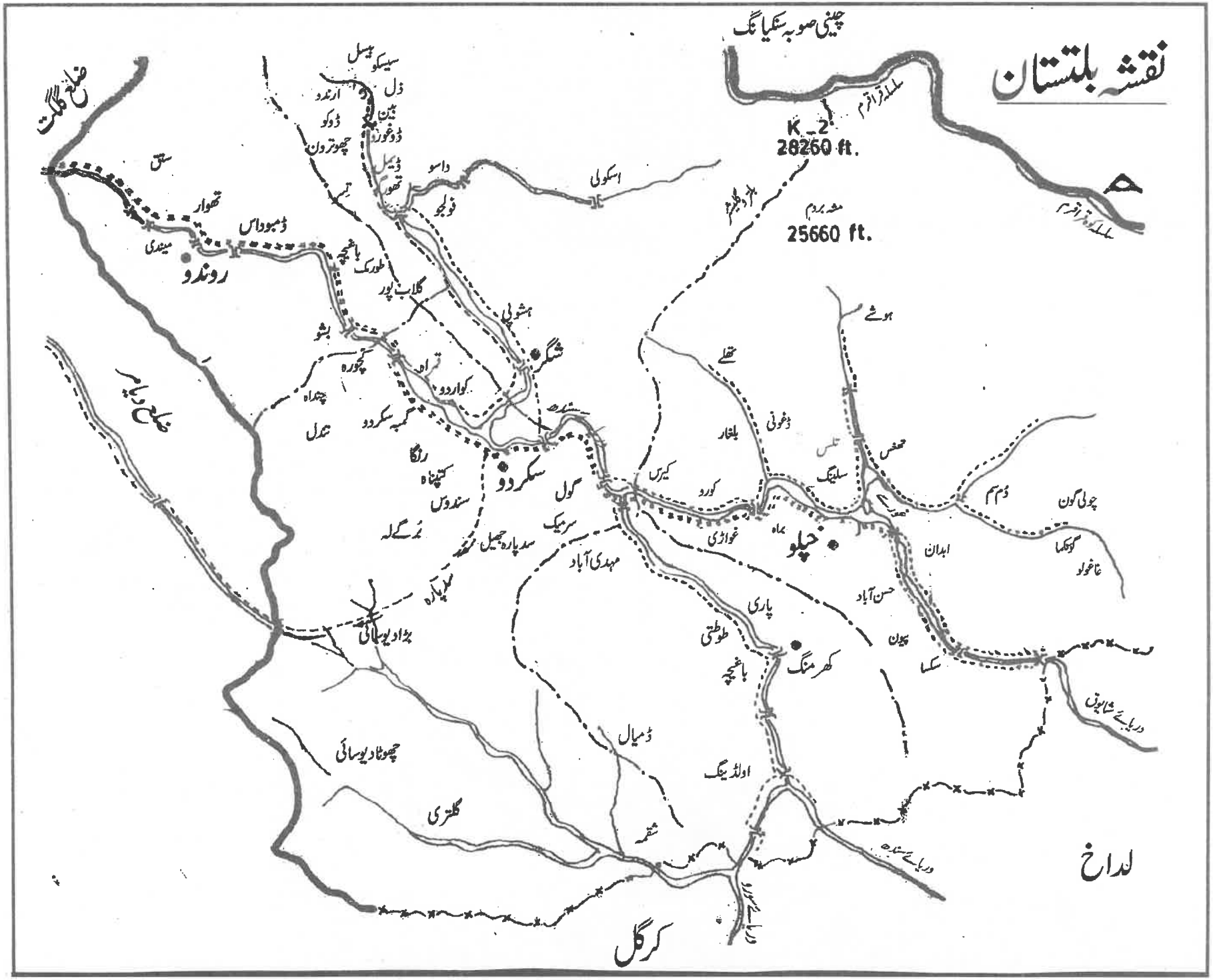
چپورسن میں آسودہ خاک حضرت بابائے غندی کا ذکر مبارک پچھلے ابواب میں شرح وسبط کے ساتھ آچکا ہے۔ آپ کے آستانہ پر گرمیوں میں زائرین کا تانتا بندھا رہتا ہے۔ کسی زمانے میں یہاں سریقول اور وخان تک سے زائرین آتے تھے۔

کہتے ہیں ابتداء میں مزار سادہ تھا۔ پھر بروشال ہنزہ کے اٹھارویں صدی کے ایک حکمران میر سلیم خان نے مزار کی چار دیواری بنوائی بعد کے چند اور حکمران غزن خان اور نظیم خان کے نواسے راجہ مظفر حسین نے زائرین کی سہولت کیلئے کمرے تعمیر کروائے۔ مزار کی دیکھ بھال پر موروثی مجاورین مامور ہیں۔

شمشال کے علاقے میں حضرت شاہ شمس الدین کا مزار واقع ہے۔ مزار کے باہر مارخور کے سینگ اور رنگین کپڑے کی دھجیوں سے آرائش کی گئی ہے۔ لوگ ازراہ ثواب جانور ذبح کر کے لوگوں کو کھلاتے ہیں۔

حینی میں حضرت شاہ طالب رحمۃ اللہ علیہ کا آستانہ مشہور ہے کہ آپ افغانستان سے تشریف لائے۔ بہت سی کرامات آپ سے منسوب کی جاتی ہیں۔ مقامی لوگ ہی عقیدتاً مزار کی دیکھ بھال کرتے ہیں۔

حضرت سید شاہ ولی اسم بامسمی مارزاد ولی کامل تھے۔ آپ اصفہان سے افغانستان گئے پھر کشمیر کا رُخ کیا۔ وہاں کچھ عرصہ قیام کے بعد بلتستان وارد ہوئے۔ وہاں کچھ عرصہ تبلیغ دین کا فریضہ انجام دینے کے بعد ۱۸، ذالحجہ ۱۱۲۵ھ بروز عید غدیر نگر تشریف لائے۔ آپ کے ہمراہ چند ایک عقیدت مند بھی تھے۔ آپ جس کٹیا میں رہے وہ آج بھی موجود ہے اور سادگی کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ مزار کی عمارت نئے سرے سے تعمیر کی گئی ہے۔ یہاں بھی عقیدت مندوں کی آمد و رفت رہتی ہے۔


نقشہ بلتستان
چینی صوبہ سنکیانگ
ضلع گلگت
ضلع دیامر
لداخ
کرگل
K_2
28260 ft.
مشہ برم
25660 ft.
روندو
ڈمبوداس
تھوار
مینڈی
سق
طورک باغیچہ
گلاب پور
بشو
کچورہ
چنداہ
تندل
شگر
ہشولی
کوارڈو
گمبہ سکردو
سکردو
رنگا
کتپناہ
سندوس
برگے لہ
سدپارہ جھیل
کچپارہ
بڑادیوسائی
چھوٹا دیوسائی
گلتری
شگر
ڈمیال
اولڈینگ
مہدی آباد
گول
سرمیک
کیرس
کورو
غواڑی
بماہ
خپلو
بلغار
ڈغونی
تلس
سلینگ
ہوشے
تھلے
خمخس
ڈم ہم
چولی گون
گوکھا
عاغولو
ابدان
حسن آباد
پیون
سکسا
پاری
طوطتی
باغیچہ
کھرمنگ
دریائے شیوک
دریائے سندھ
دریائے شگر
دریائے سکردو
اسکولی
واسو
فولجہ
تھور
ڈیبل
ڈوغورو
بین
ڈل
ارندو
ڈوکو
چھوترون
سیسکو ہیسل
سلسلۂ قراقرم
سلسلۂ ہمالیہ

بلتستان

جغرافیہ:

پاکستان کے انتہائی شمال میں سلسلہ کوہ قراقرم و ہمالیہ کے درمیان دس ہزار ایک سو اٹھارہ مربع میل پر پھیلا ہوا پہاڑی علاقہ 'بلتستان'' کہلاتا ہے جو سکردو' چلو' شگر' کھرمنگ' رونگ یُل اور گلتری کی وادیوں پر مشتمل ہے۔ انتظامی لحاظ سے یہ علاقہ دو اضلاع سکردو اور گنگ چھے میں منقسم ہے اور سکردو پورے بلتستان کا تجارتی مرکز اور دیگر علاقوں کے ساتھ رابطے کا جنکشن ہے۔ بلتستان کے جنوب میں وادی کشمیر' مشرق میں لداخ و پوریگ (کرگل)' مغرب میں ضلع گلگت اور دیامر کی وادیاں واقع ہیں جبکہ شمال میں کوہ قراقرم کے برف پوش سلسلے بلتستان کو چینی صوبہ سنکیانگ سے جدا کرتے ہیں۔

یہ علاقہ ۳۴ درجہ سے ۳۶ درجہ عرض بلد اور ۷۵ درجہ سے ۷۷ درجہ طول بلد کے درمیان سطح سمندر سے ساڑھے سات ہزار تا آٹھ ہزار فٹ کی بلندیوں پر واقع ہے۔ آب و ہوا مجموعی طور پر سرد خشک ہے۔ نومبر سے مارچ کے آخر تک جاڑے کا موسم ہوتا ہے اور اس دوران خوب برف پڑتی ہے۔ موسم سرما میں درجہ حرارت اوسطاً کم سے کم منفی ۲۴ ڈگری سنٹی گریڈ اور زیادہ سے زیادہ ۴ ڈگری سنٹی گریڈ رہتا ہے۔

بلند و بالا پہاڑی حصار میں واقع ہونے کے باوجود بلتستان کے چاروں طرف ایسے درّے موجود ہیں جن سے گزر کر گردونواح کے ملکوں اور علاقوں یعنی سرینگر کشمیر' کرگل' لداخ' نوبراہ' یارقند' کاشغر' نگر' گلگت اور استور سے رسائی کی جا سکتی ہے۔ ان میں درّہ زوجی لہ' چھور بٹ لہ' سلتورولہ' تھلے لہ' برزل لہ' عالم پی لہ' برالدولہ' باشہ لہ' غنڈولہ اور ہینگولہ قابل ذکر ہیں۔ ان میں سے بعض درّے اب گلیشیئر بڑھنے کی وجہ سے ناقابل عبور ہو چکے ہیں۔ البتہ بعض درّوں سے اب چھوٹی گاڑیاں گزرنے کے راستے بنائے گئے ہیں۔ بلتستان کو دیگر علاقوں سے ملانے کیلئے ہوائی سفر کے علاوہ سب سے بڑی شاہراہ گلگت' سکردو سڑک ہے۔

کوہستانی علاقہ ہونے کے باعث بلتستان کی زمین میں ریت زیادہ اور زرخیز مٹی کی مقدار بہت کم ہے۔ ہوا میں خشکی کی وجہ سے آبپاشی کے بغیر یہاں زراعت ممکن نہیں۔ آبپاشی کا دارومدار چشموں' قدرتی و مصنوعی گلیشیئروں اور برفانی پانی پر ہے۔ بلتستان کا مجموعی مزروعہ رقبہ تقریباً بیس ہزار ہیکٹر ہے۔ ربیع کی فصلوں میں گیہوں' جو' مٹر' مسور اور باقلہ کاشت کئے جاتے ہیں جبکہ خریف میں چنا' کنگنی' ترنبہ' شلغم اور تمباکو کی فصلیں حاصل کی جاتی ہیں۔ سبزیوں میں شلغم' آلو' گوبھی' ٹماٹر' بینگن' مولی' مرچ' پالک' سلاد' گاجر' پیاز' چقندر' لوبیا اور کدو اگائے جاتے ہیں۔ خربوز' تربوز اور کھیرے بھی کم و بیش پیدا ہوتے ہیں۔

مون سون ہواؤں کی رسائی نہ ہونے کے باعث بلتستان میں قدرتی جنگلات کی بہت قلت ہے۔ جغرافیائی' لسانی اور نسلی لحاظ سے بلتستان از منہ قدیم سے تبت کے ساتھ منسلک ہے۔ اسی لئے تاریخ میں یہ علاقہ تبت خورد موسوم ہوا ہے۔ یہاں کے قدیم لوک تصورات کے مطابق دنیا مکھن کے ڈلے سے وجود میں آئی ہے جو دودھ کے سمندر سے جم گیا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ تبت اور گردونواح کا پراسرار خطہ اس وقت آباد ہوا جب دودھ کے سمندر سے مکھن کا ڈلا نکلا۔ اس کے اوپر مٹی کی تہیں جمنے لگیں۔ آہستہ آہستہ سمندر کی تہ سے چاروں اطراف میں نوکدار پہاڑ ابھرے۔ کہا جاتا ہے کہ اس علاقے کی ابتدائے آفرینش کے وقت سب سے پہلے چندن کا درخت پیدا ہوا تھا جسے قدیم بلتی لوک روایات کے مطابق درختوں کا بادشاہ قرار دیتے ہیں۔ اگرچہ بلتستان میں اب یہ درخت نایاب ہے تاہم متعدد دیومالائی کہانیاں اور لوک روایات چندن کے درخت سے اب بھی منسوب ہیں۔ تخلیق کائنات کے تبتی نظریئے کے گیت ''سومالیک'' میں چندن کا بڑا ذکر آیا ہے۔ بلتستان میں کھرمنگ' سکردو اور روندو کے مغربی اطراف کے نالوں میں کہیں کہیں چیڑ' جونیپر' سلوفر اور بھوج پتر کے درخت پائے جاتے ہیں اور قدرتی جنگلات کا مجموعی رقبہ ۲۶۶۷ ہیکٹر ہے۔ بلتستان میں جنگلات کی کمی کو پورا کرنے کے لئے سفیدے' بید اور بیر کے درخت بکثرت لگائے جاتے ہیں۔ ان کے علاوہ چنار' بید مشک اور بید مجنوں کے درخت بھی پائے جاتے ہیں۔

پہاڑ اور گلیشیئر:

بلتستان میں دنیا کی دوسری بلندترین چوٹی کے ٹو (۸۶۱۵ میٹر) کے علاوہ مشہ بروم (۷۳۲۰ میٹر) رگاشہ بروم (۸۳۵۵ میٹر) اور پھل چن ری یعنی براڈ پیک (۸۰۴۷ میٹر) بہت مشہور ہیں۔ سلسلہ قراقرم کی تین سو بلند چوٹیوں میں سے ایک سو پچاس چوٹیاں بلتستان کے حدود میں واقع ہیں۔ علاوہ ازیں کوہ قراقرم کے سلسلے میں کم و بیش چالیس چھوٹے بڑے گلیشیئر بھی گنے جاتے ہیں جن میں قطبین کے بعد دنیا کا سب سے وسیع اور عالمی شہرت یافتہ گلیشیئر ''سیاچن'' بھی ہے۔ بلتستان میں واقع دیگر بڑے گلیشیئروں میں بیافو' بلتورو' چھوغولونگمہ اور رینگمو گلیشیئر قابل ذکر ہیں۔ ان قدرتی گلیشیئروں کے علاوہ یہاں گلیشیئر پالنے کا ایک قدیم اور اپنی نوعیت کا منفرد رواج بھی رہا ہے۔ پالتو گلیشیئروں سے جہاں آبپاشی کیلئے پانی حاصل کیا جاتا ہے وہاں اس کے پالنے کے کلاسیکی طور طریقے اور آداب بھی اپنی جگہ بڑے دلچسپ ہیں۔

میدان اور جھیلیں:

بلتستان میں جہاں خشک ریتلے میدان موسومہ بیانا نقپو' ماگنگ گنگ' ہوتو تھنگ' خوتو نگ تھنگ' نرتھنگ' کوسومبوری تھنگ' ٹیکم چن بیانا اور بلغار رنا وغیرہ موجود ہیں وہاں صاف وشفاف جھیل جیسے کچورہ لوژھو اور فوروق ژھو' سد پارہ ژھو' کپتناہ ژھو' شگر جربہ ژھو' دیوسائی ژھو اور غندوس غوارشی ژھو وغیرہ اس کوہستانی علاقے میں فیروزے کے خوبصورت نگینوں کی طرح جڑی ہوئی نظر آتی ہیں۔

دیوسائی پلین:

سکردو کے جنوب میں مشہور سطح مرتفع دیوسائی ''غویارسہ'' ایک وسیع و عریض دیو مالائی اور پرفریب سبزہ زار واقع ہے جہاں گرما کے موسم میں ہزاروں اقسام کی خودرو جڑی بوٹیاں اور پھول اگتے ہیں۔

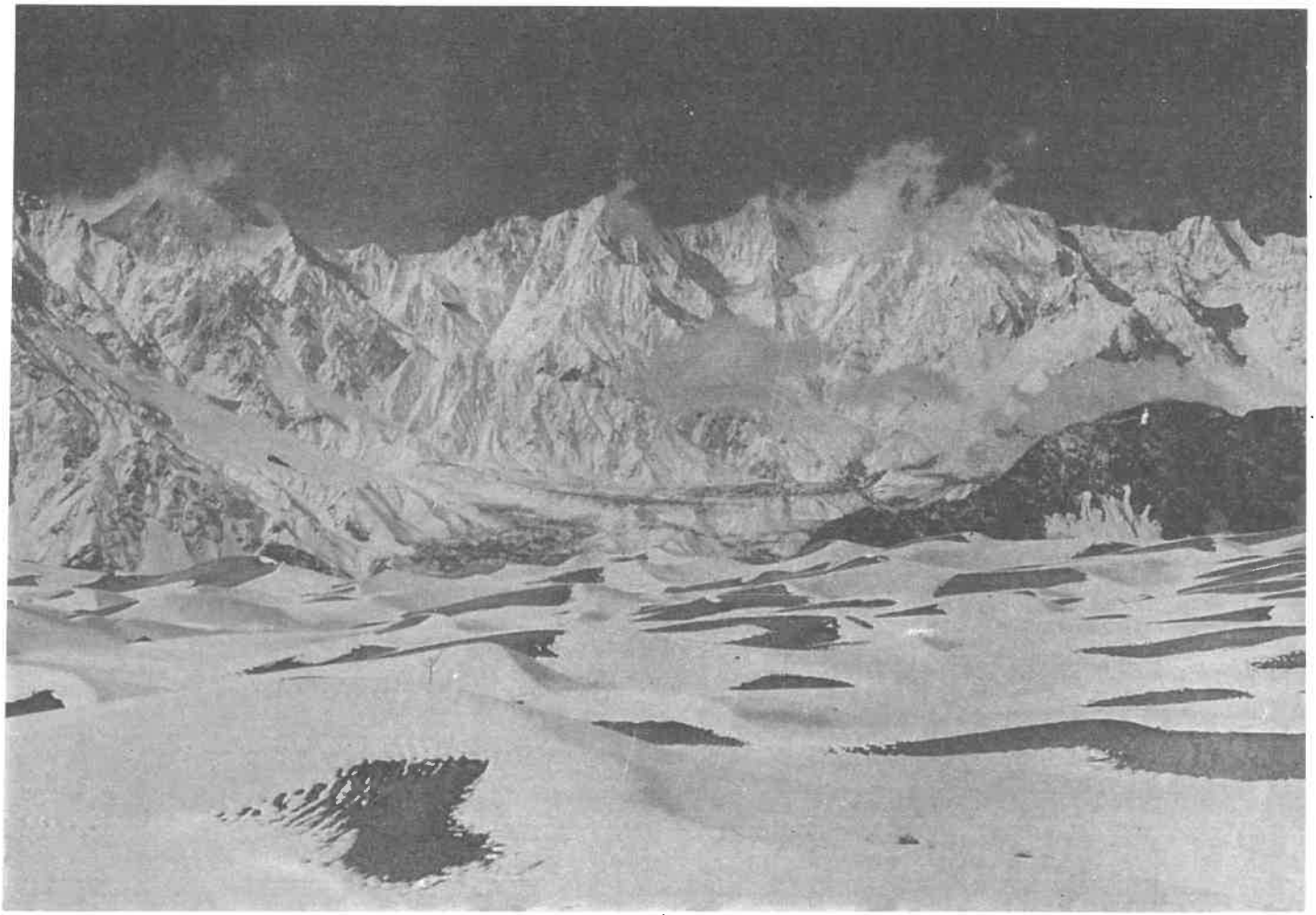
گرم پانی کے چشمے:

بلتستان میں مختلف مقامات پر گرم پانی کے چشمے ابلتے ہیں۔ یہ چشمے وادی شگر میں چھوترون' بیسل' چونگو' چھقپو' اور روندو میں طورمک نالہ' تریکو نالہ اور یلبو کے علاوہ برومدو نالہ اور شینگوس کے قریب لب دریا موجود ہیں۔ اسی طرح خپلو کے نالہ کوندوس میں چھوغوگرونگ اور خورکن میں بھی دو گرم چشمے نکلتے ہیں۔ ان سب میں بیسل چشمے کا پانی کافی گرم ہے جس سے گندھک کی بو آتی ہے اور بلتستان بھر سے لوگ بالخصوص چھوترون اور بیسل چشموں سے جلدی اور ہاضمے کی بیماریوں کا علاج کرتے ہیں۔

دریائے سندھ (انڈس):

پاکستان کے زیرین علاقوں کو سیراب کرنے والا سب سے بڑا ذریعہ دریائے سندھ جو علاقہ ہائے تبت کی قدیم تہذیب وتمدن اور ماضی کے حسن وعشق کی دلگداز کہانیاں سناتے ہوئے بلتستان سے گزرتا ہے۔ تبت کے لوگ کہتے ہیں کہ یہ دریا شیر کے منہ سے نکلتا ہے اسی لئے انہوں نے اسے ''سینگے چھو'' یعنی شیر دریا کا لقب دیا ہے۔

یہ دریا تبت اصلی (لہاسہ) کے مغرب میں کوہ کیلاس کے نزدیک جھیل مانسرور سے نکلتا ہے۔ لداخ پہنچ کر دریائے زانسکار اس میں جاملتا ہے جبکہ مورول کے مقام پر شنگھو شگر' پھلٹو کس' دراس' سورو اور واکھا کا متحدہ دریا کریس پر دریائے



موسم سرما میں برف پوش پہاڑ اور ریگ زار

شیوق اور سکردو پہنچ کر دریائے شگر بھی اس میں شامل ہوجاتے ہیں۔ان دریاؤں کے علاوہ سینکڑوں چھوٹے بڑے ندی نالے بھی دریائے سندھ کے معاون بنتے ہیں جو آگے چل کر پاکستان کے زیرین علاقوں میں ایک کثیر رقبۂ آبادی کو سیراب کرتا ہے۔

پرندے/ جانور:

بلتستان میں یاک' بزو' بزومو' تول' تولمو' گر' گرمو' بیل' گائے' بکری' بھیڑ' گھوڑا' گدھا' لٹخ اور مرغیاں پالی جاتی ہیں۔ یاک اس علاقے کی خصوصی شناخت ہے۔ جنگلی حیوانات میں کیل' ہرن' مارخور' اڑیال' آہو' بھیڑیئے' چیتے' کالے اور بھورے ریچھ' سیاہ گوش' لومڑی' آبی کتے' جنگلی بلی' خرگوش اور مارمٹ (Marmot) پائے جاتے ہیں۔ پرندوں میں چکور' رام چکور' مرغابی' کبوتر' فاختہ' ہدہد' کوا' بیا' باز' چیل اور بٹیر کے علاوہ بہت سی اقسام کی چڑیاں موجود ہیں۔

بلتستان کے طول وعرض میں روحانی شخصیات کی متعدد مزار موجود ہیں۔ ان میں بعض تو اب امتداد زمانہ سے گمنام ہوچکی ہیں اور بعض مزاروں پر اب بھی لوگ حاضر ہوکر منتیں مانتے ہیں۔ان مزارات مقدسہ کو مقامی طور پر ''آستانہ'' کہتے ہیں۔ بلتستان کے اکثر مقامات پر کربلائے معلیٰ کی شبیہہ کے طور پر زیارت گاہیں بنائی ہوئی ہیں جنہیں مقامی اصطلاح میں ''قتلگاہ'' کہتے ہیں۔سکردو شہر میں موجود شبیہ قتلگاہ بہت مشہور ہے۔بلتستان کے سادہ لوح اور عقیدت مند افراد یہاں آکر منتیں مانتے ہیں۔ نذر و نیاز ڈالتے ہیں اور اکثر عقیدتمند اپنی مرادیں پالیتے ہیں۔اس کے علاوہ بلتستان کے تاریخی وتفریحی مقامات میں سکردو کا قلعہ کھرپوچو' قلعہ راجہ خپلو' سد پارہ جھیل' کچورہ جھیل وشنگریلا' وادی شگر اور سطح مرتفع دیوسائی قابل ذکر ہیں۔

قدیم عوامی تصورات کے مطابق کسی زمانے میں ہمالیہ کی وادیوں میں اتنی خوشحالی' شادابی اور امن وسلامتی کا دور دورہ تھا کہ یہاں ایک تخیلاتی جنت وجود میں آئی جسے ''شنگریلا'' کہتے تھے۔ یہ جنت صدیوں پہلے سے ایک ایسے مقام پر موجود تھی جہاں زمین یا سمندر کا ملاپ آسمان سے ہوتا تھا۔جب لوگ شدید گناہوں کے مرتکب ہوئے تو وہ جنت یہاں سے غائب ہوگئی۔ایک باذوق شخص نے وہ گمشدہ جنت شنگریلا کو بازیاب کیا ہے اور یہ سکردو کچورہ میں اب سیاحوں کا مرکز ہے۔

تاریخ:

جس خطہ کو آج کل 'بلتستان' کہا جاتا ہے تاریخ میں پلو' بلور' بلتی اور تبت خورد جیسے مختلف ناموں سے موسوم ہوتا رہا ہے۔ بلتستان کی قدیم تاریخ پر مبنی کوئی دستاویز موجود نہیں۔تاہم لوک روایتوں اور داستانوں سے پتہ چلتا ہے کہ قبل مسیح کے دور میں علاقہ ہائے تبت (لہاسہ' لداخ' کرگل اور بلتستان) پر ایک دیومالائی کردار کے مالک ''کیسر'' (Kesar) کی حکمرانی تھی جس نے گردونواح کی ریاستوں بالخصوص خوریل (چینی ترکستان) گلگت' ہنزہ اور نگر کو بھی نہ صرف تاخت وتاراج کیا بلکہ ان علاقوں پر تبتی تہذیب وتمدن کے انمٹ نقوش بھی مرتب کئے۔ لوگوں کا عقیدہ تھا کہ کیسر دیوتاؤں کی اولاد ہے اور انہیں دنیا میں غریب عوام کو ظلم و بربریت سے نجات دلانے اور معاشرے میں عدل وانصاف قائم کرنے کے لئے بھیجا گیا تھا۔کیسر کے دور میں اس کے رعایا تبتی الاصل مذہب ''بون چھوس'' کے پیروکار تھے۔ بارہ ابواب پر مبنی رزمیہ کیسر داستان اس علاقے سے متعلق کلاسیکی ادب کا ایک لاثانی شاہکار ہے جو اب تک سینہ بہ سینہ چلی آرہی ہے۔

تاریخی حوالوں سے اس علاقے میں سود وسو سال قبل مسیح کے دوران بدھ مت کی تبلیغ کے آثار ملتے ہیں۔ بعدازاں بون مت کے اختلاط سے ''لامازم'' وجود میں آیا۔ پانچویں اور چھٹی صدی عیسوی کے دوران بلتستان پر پلو لاشاہی حکمرانوں کا تذکرہ ملتا ہے جس کی سلطنت کی سرحدیں لداخ سے گلگت تک پھیلی ہوئی تھیں۔

۹۰۰ تک بلتستان بدستور تبت کا ایک صوبہ تھا اور اسی دوران خانہ جنگی کی وجہ سے تبت کا آخری بادشاہ خلنگ دھرما قتل ہوا تو بلتستان تبتی سلطنت سے الگ ہوگیا اور اس کی مختلف وادیوں میں چھوٹی چھوٹی ریاستیں قائم ہوئیں۔ اس دوران لوک روایات میں جن افسانوی حکمرانوں کا تذکرہ ملتا ہے ان میں ''رگیالوسترالبو' کا نام قابل ذکر ہے۔ بتایا جاتا ہے کہ وادی سکردو پر رگیالبوسترالبو کی حکومت تھی جس کا صدر مقام رگیایول تھا۔اس کے بعد اس کا بیٹا رگیالو چو لوبزانگ کا نام رگیایول نامی ریاست کے دیومالائی حکمرانوں میں گنا جاتا ہے۔

تقریباً ۱۲۰۰ء میں سکردو کا شاہی خاندان اولاد نرینہ سے محروم ہوا۔اسی دوران بعض روایات کے مطابق مصری اور بعض کے مطابق ایرانی نژاد نوجوان ابراھیم براہ کشمیر سکردو آپہنچا اور مقامی حکمران ''شکری'' کا خانہ داماد بن کر ابراھیم مقپا کہلایا اور اسی سے سکردو میں مقپون خاندان کی بنیاد پڑ گئی۔بعض روایات میں اس کی وجہ تسمیہ ''ہرمقپون'' یعنی سالار قوم بتایا جاتا ہے۔ بہرحال اس خاندان نے آہستہ آہستہ عروج حاصل کیا اور کم وبیش ساڑھے چھ سو سال تک برسراقتدار رہا۔ اگرچہ بلتستان کی وادی خپلو اور شگر میں علی الترتیب ترک خاندان ''یبگو'' اور ختائی خاندان ''اماچہ'' کی حکمرانی رہی تاہم مجموعی طور پر پورے علاقے میں مقپون حکمرانوں کی بالادستی تھی۔مقپون ابراھیم کے بعد ستق سینگے' زک سینگے' بروک سینگے' سک سینگے' سنم گوری تھم' سہ گوری تھم' کھوکھرو سینگے اور غوطہ چو سینگے نے یکے بعد دیگرے تخت سکردو پر حکومت کی۔ بتایا جاتا ہے کہ غوطہ چو سینگے کے دور میں حضرت

امیر کبیر سید علی ہمدانیؒ وارد بلتستان ہوئے اور اشاعت اسلام کا عظیم انقلاب برپا ہوا۔ اس سے پہلے یہاں بدھ مت اور بدھ مت سے پہلے بون مت نامی مذہب رائج تھا۔ غوطہ چو سینگے کے بعد ۱۴۶۴ء تا ۱۴۹۰ء کے دور میں اس کا بیٹا بہرام چو برسر اقتدار آیا جس نے روندو کے حکمران لون چھے اوت چو سے بشو تک کا علاقہ چھین کر سکردو میں شامل کر لیا اور یہیں سے سکردو کی ریاست میں وسعت کا آغاز ہوتا ہے۔ بہرام چو کے بعد جب اس کا بیٹا مقپون بوخا (۱۴۹۰ء تا ۱۵۱۵ء) تخت سکردو پر متمکن ہوا تو موجودہ سکردو شہر کو آباد کیا اور کھرپوچھے پہاڑی پر مشہور زمانہ قلعہ تعمیر کر کے دارالحکومت کو شگری سے سکردو منتقل کر دیا۔ بوخا ہی کے زمانے میں میر شمس الدین عراقی بت شکن کشمیر سے بلتستان تشریف لائے اور اسلام کی تبلیغ و اشاعت میں آٹھ سال تک یہیں گزارے۔ قیاس کیا جاتا ہے کہ اسی دور سے قدیم بلتی رسم الخط کی جگہ فارسی رسم الخط نے لے لی۔ بوخا کے بیٹے شیر شاہ کا دور (۱۵۱۵ء تا ۱۵۴۰ء) میں والی کاشغر سلطان سعید خان نے ۹۳۹ ھجری میں بلتستان پر حملہ کیا۔ خپلو کے راجہ بہرام چو کی مدد سے شگر کو تاراج کر کے وہ واپس چلا گیا۔ اس وقت شگر میں راجہ عبداللہ خان کی حکومت تھی۔ لیکن سکردو پر حملہ کی بابت سلطان سعید خان کے جرنیل مرزا حیدر دوغلت کی تحریر کردہ کتاب تاریخ رشیدی میں کوئی ذکر نہیں۔

شیر شاہ کے بیٹے علی خان کے دور (۱۵۴۰ء تا ۱۵۶۵ء) سے مقپون خاندان کا عروج شروع ہوتا ہے۔ علی خان نے شنگھو شغر اور دراس کو مستقل طور پر اپنی ریاست میں شامل کر لیا۔ علی خان کے بیٹے غازی میر کے دور (۱۵۶۵ء تا ۱۵۹۵ء) میں سکردو کی حکومت کو وسعت ملی۔ اس کے زمانے میں روندو کے لون چھے خاندان کا آخری حکمران لاولد فوت ہوا تو اس نے فوراً روندو پر قبضہ کر لیا۔ لون چھے خاندان کا دارالحکومت ستق تھا۔ خانوادۂ مقپون کے سربرآوردہ راجاؤں میں علی شیر خان انچن (اعظم) کا نام تاریخ میں سنہرے حروف میں رقم ہے جنہوں نے تبت پورانگ سے گلگت و چترال تک فتح کر کے ایک وسیع و عریض خطے پر جرأت و بہادری کا سکہ بٹھایا۔ علی شیر خان انچن نے لداخ کو فتح کرنے کے بعد راجہ لداخ کو اس امر کا پابند کر دیا کہ وہ لامہ یورو گومپہ کی وساطت سے سکردو دربار میں سالانہ خراج ادا کرے اور یہ خراج انچن کے دور سے لے کر ڈوگرہ یلغار تک وہ ادا کرتا رہا۔ انچن نے لداخ کے راجہ جمیانگ نمگیل کی بیٹی سے شادی بھی رچالی لیکن بعد میں وہ شادی جدائی پر منتج ہوگئی۔ جب علی شیر خان انچن نے اس رانی کو طلاق دے دی تو لداخی شہزادی نے اپنے شوہر نامدار انچن کی داغ مفارقت میں جو گیت ''ہلال باغ'' کے عنوان سے گایا ہے وہ بلتی لوک ادب کا سرمایہ ہے۔ علی شیر خان انچن کی تعریف میں لداخ کے کسی اہم شخص کا ''سکردو لہویل' کے نام سے گایا ہوا گیت لداخی لوک ادب کا اہم حصہ ہے جس میں اس شخص نے انچن کو اپنی تمام تر وفاداریوں کی یقین دہانی کرائی ہے۔ اسی طرح ''بیانہ نقپو'' نامی بلتی لوک گیت بھی انچن کی جرات و بہادری اور حسن تدبیر کا قصیدہ ہے۔ اسی طرح جب علی شیر خان انچن نے چترال کو فتح کیا تو فتح کی نشانی کے طور رچترال کے برونشل گاؤں کے قریب چنار کا ایک درخت لگایا اور اس درخت میں چکی کا ایک پاٹ پرو دیا۔ بتایا جاتا ہے کہ وہ پاٹ بہت بعد تک چنار کے تنے میں پیوست تھا۔ دوسری طرف علی شیر خان انچن کی رسائی ہندوستان کے مغل اور ایران کے صفوی بادشاہوں تک ہوئی۔ انچن کی بیٹی مغل شہنشاہ اکبر اعظم کے صاحبزادے سلیم جہانگیر کی عقد میں دینے کے بعد ان شاہی خاندانوں میں قریبی تعلقات قائم ہوئے۔ بتایا جاتا ہے کہ یارقند اور ایران کے شاہی درباروں میں یہاں سے باقاعدہ سفیر جاتے تھے۔ بعد ازاں انچن کے پوتے مقپون شاہ مراد نے بھی مغلیہ دربار سے وابستگی کو مزید تقویت دی۔ یوں ایران، ہندوستان اور یارقند سے باہمی روابط کے ذریعے بلتستان میں تہذیب و تمدن اور ادب و شائستگی کے فروغ کے لئے مزید دروازے کھل گئے۔

جیسا کہ پہلے ذکر کیا گیا کہ چودھویں صدی عیسوی میں ایرانی مبلغین کے ہاتھوں اس علاقے میں اسلام کی شمع فروزاں ہوئی اور اس تبلیغی کاروان میں امیر کبیر سید علی ہمدانیؒ پہلے نقیب تھے۔ بعد ازاں سید محمد نوربخش، سید شمس الدین عراقی، طوسی برادران، میر عارف اور متعدد دیگر علمائے کرام وقتاً فوقتاً تبلیغی مشن پر یہاں آتے رہے۔ بلتستان کے طول و عرض میں جن مشائخ عظام کے مقبرے موجود ہیں ان میں سید محمود طوسی، سید علی طوسی، سید حیدر طوسی، میر عارف، میر ابوسعید، میر مختار، سید ابراہیم اور سید اسماعیل کے مقبرے قابل ذکر ہیں۔ ان مقبروں کے ساتھ بلتستان کے لوگوں کی عقیدت وابستہ ہے۔

علی شیر خان انچن کے بعد خانہ جنگی اور باہمی کشمکش کے نتیجہ میں بلتستان کی مرکزی حکومت کمزور پڑ گئی۔ انچن کے تین بیٹے آدم خان (ولی عہد) عبدال خان اور احمد خان تھے۔ اس نے اپنی حیات میں عبدال خان کو پرکوتہ و کرتخشہ اور احمد خان کو روندو بطور گذارہ دے دیا تھا۔ لیکن انچن کی وفات کے بعد آدم خان اور عبدال خان کے درمیان جانشینی پر تنازعہ ہوگیا۔ عبدال خان چونکہ طاقتور تھا اس لئے تخت پر قبضہ کر لیا اور آدم خان فرار ہو کر براستہ کشمیر دہلی چلا گیا۔ اس کے بعد عبدال خان نے شگر کے حکمران خاندان کے گیارہ بھائیوں کو قتل کر کے شگر پر قبضہ کر لیا۔ ان میں سب سے چھوٹا بھائی حسن خان بھاگ کر دہلی چلا گیا۔ ۱۶۳۴ء میں شہنشاہ ہند کے حکم پر حاکم کشمیر کی مدد سے حسن خان نے حملہ کر کے عبدال خان کو شگر میں قید کر دیا جہاں وہ حالت اسیری میں فوت ہوگیا۔ کشمیری فوج کے سردار ظفر خان عبدال خان کو معزول کرنے کے بعد حکومت احمد خان کے بیٹے مراد خان کے حوالے کر دی۔ مراد خان نے چند سال عبدال خان کی نیابت میں حکومت کی۔ عبدال خان

کے ظلم وستم کی داستان لوک روایات میں زبان زد خلائق ہیں۔ اسی لئے لوگ ان کو ''می زوس'' یعنی آدم خور کے لقب سے یاد کرتے ہیں۔ می زوس عبدل خان کے ظلم و بربریت کی بابت کہتے ہیں کہ اس کا ایک کتا مر گیا تو کتے کی لاش پر بین کرنے کے لئے پیشہ ور خواتین کو بلایا گیا۔ ان خواتین نے کتے کی لاش پر جو بین کی وہ ایک مقولے کی شکل میں آج بھی بلتستان کی لوک روایت کا حصہ ہے۔ بلتی میں وہ مقولہ ہے ''سنینگلہ ژھک میدنامکلہ تک میدلے عبداخانی کھی فو'' ترجمہ (اگر دل میں کوئی درد نہ ہو تو آنکھوں میں آنسو کہاں سے ہوگی اے عبدل خان کا کتا!) اس کے علاوہ خپلو کے راجہ شاہ بہرام چو کو قتل کرنے کے بعد اس کی بہن کو عبدال خان سکردو لے آیا تھا۔ عبدال خان نے اس کے ساتھ جو سلوک روا رکھا تھا خاتون نے اپنی حالت زار کو ایک لوک گیت میں بیان کیا ہے

اس کے بعد شاہ ہند نے سکردو کی حکومت آدم خان کو واپس کر دی۔ آدم خان خود سکردو نہ آیا بلکہ اس نے مرزا خان والی کھرمنگ کو بطور نائب سکردو میں بٹھایا جس نے دس سال آدم خان کی نیابت میں حکومت کی۔ ادھر مرزا خان کی نیت بدل گئی اور ادھر مراد خان دہلی جا پہنچا تو آدم خان نے اسے اپنا داماد بنا کر وارث تسلیم کر لیا۔ ۱۶۵۱ء میں جب آدم خان دہلی سے شاہی مدد لے کر سکردو پہنچا تو مرزا خان بھاگ گیا۔ بعد میں مرزا خان کو معافی دی گئی اور اسے کھرمنگ کی ولایات پر قائم رکھا۔ وہی مراد خان بعد میں شاہ مراد کے نام سے مشہور ہو گیا۔

شاہ مراد نے امام قلی خان راجہ شگر کی مدد سے کھرمنگ سے مرزا خان کو بھگا کر اپنے بھائی شیر خان کو کھرمنگ کا حاکم بنا دیا۔ مرزا خان کو راجہ خپلو نے پناہ دی تو مراد خان نے خپلو پر حملہ کر کے کھرکوہلدی اور سومہ کھر کے قلعوں کو زیر کرنے کے بعد تھور سے کھر کو بھی فتح کر لیا۔ مرزا خان کو آدم خان کے پاس بھیج دیا اور رحیم خان راجہ خپلو کو اپنے پاس قید کر دیا۔ رحیم خان اور حسن خان بھائی تھے۔ حسن خان کی وفات کے بعد رحیم خان نے تخت پر زبردستی قبضہ کر کے حسن خان کی بیوہ (شاہ مراد کی بہن) اور دونوں بیٹوں یعقوب اور بابر کو لداخ کی طرف نکال دیا جو راجہ لداخ کے پاس نظر بند تھے۔ شاہ مراد نے اس کے بعد بودھ کھر بو پر حملہ کر کے نوسو لداخی سپاہیوں کو قید اور باقیوں کو موت کے گھاٹ اتار کر بودھ کھر بو پر قبضہ کر لیا۔ راجہ لداخ نے شاہ مراد کی بہن اور یعقوب و بابر کے عوض نوسو جنگی قیدیوں کو چھڑا لیا۔ خپلو کی ریاست پر شاہ مراد نے اپنے بھانجے یعقوب و بابر کو بٹھا دیا۔

اسی اثنا میں آدم خان کی وفات کی خبر ملی تو شاہ مراد دہلی میں شاہ جہان کے حضور پیش ہوا۔ دہلی دربار میں اس کی بڑی عزت ہوئی۔ آدم خان کا منصب اسے عطا ہوا۔ کچھ روز بعد براہ کشمیر سکردو واپس چلا آیا۔ دو تین سال بعد حبیب خان راجہ گلگت کے بیٹے کے ساتھ اپنی بیٹی کی شادی کرادی۔ حبیب خان کے دوسرے بیٹے نے بغاوت کر دی تو شاہ مراد نے امام قلی خان راجہ شگر کی سرکردگی میں فوج بھیج کر بغاوت فرو کر دی۔ قلعہ نومل کو فتح کر کے باغیوں کو سکردو لایا۔ اسی دوران تین ماہ بیمار رہ کر شاہ مراد فوت ہو گیا۔ شاہ مراد کی ان فتوحات کے پس منظر میں ایک شنالوک گیت اب بھی موجود ہے۔ جس میں شاہ مراد اور اس کے جرنیل شیر شاہ و علی شاہ کی جرات و بہادری کا گن گایا ہے۔

علی شیر خان انچن کے بعد شاہ مراد برآمد برراجہ ثابت ہوا۔ بروشال تا لداخ سب کو اپنے زیر نگیں رکھا۔ شاہ مراد کے دور میں بلتستان کے انتظامی و تعمیری امور میں بڑی ترقی ہوئی۔ ہندوستان اور کشمیر سے سنگ تراش، زرگر، موچی اور دیگر پیشہ وروں کو سکردو لا کر آباد کیا۔ اسی دور میں یہاں تعمیرات میں سنگ مرمر کے استعمال کا رواج شروع ہوا۔ کاشغر، کشمیر اور ہندوستان کے ساتھ تعلقات کی وجہ سے تہذیب و شائستگی نے ترقی کی۔ اس نے انتقال کے وقت اپنے تینوں بیٹوں محمد رفیع خان، رضی خان اور دولت خان کو اپنے بھائی والیٔ روندو علی شاہ کی سرپرستی میں دے دیا۔ علی شاہ نے بے وفائی کی اور اپنے بھائی شیر خان والی کھرمنگ کو سکردو پر قبضہ کرنے کی دعوت دی۔ ولی عہد محمد رفیع خان شیر خان کا داماد تھا۔ شیر خان نے تعزیت کے بہانے فوج سمیت آ کر سکردو پر قبضہ کر لیا۔ اس کے بعد شیر خان شگر کے راجہ امام قلی خان کے ساتھ برسرپیکار ہو گیا۔ اسی اثنا میں رفیع خان کو حکومت پر بٹھانے کی سازش شروع ہوئی تو شیر خان نے رفیع خان کو قید کر دیا۔ شیر خان نے ۱۶۸۰ء تا ۱۷۱۰ء سکردو اور کھرمنگ دونوں پر حکومت کی۔ اس دوران میں پورے بلتستان میں خانہ جنگی اور بدنظمی کی کیفیت رہی۔ تقریباً ۱۷۱۰ء میں اہل سکردو نے شیر خان کو بھگا کر رفیع خان کو سکردو کے تخت پر بٹھا دیا۔ شیر خان نے کھرمنگ پر قناعت کی۔ اس وقت امام قلی خان شگر میں، امیر خان کریس میں، حاتم خان خپلو میں، علی شاہ روندو میں اور شاہ سلطان استور میں حاکم تھے۔



راجہ خپلو کا تاریخی محل

رفیع خان کے دور (۱۷۱۰ء تا ۱۷۴۵ء) میں بلتستان کے معاشرے میں طلاق کا رواج زیادہ ہوگیا تو اس نے اسے روکنے کے لئے مہر کے علاوہ ایک تولہ سونے کا تاوان طلاق کے اوپر چڑھا دیا۔ یہ آج تک ''رفیع خانی تولو'' کے نام سے مشہور ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس تاوان کی وجہ سے رعایا میں کثرت طلاق کا رجحان ختم ہوگیا۔

رفیع خان کے بعد سکردو کی مقپون حکومت کا زوال شروع ہوا۔ رفیع خان کے بیٹے سلطان مراد کا دور ۸۰-۱۷۴۵ء ہے جبکہ ۱۷۷۵ء میں کشمیر کے صوبیدار حاجی کریم داد خان نے سکردو پر حملہ کر کے تہس نہس کر دیا اور یہاں سے باج وخراج اور یرغمالی لے کر کشمیر چلا گیا۔ شگر کا راجہ اعظم خان سلطان مراد کا بہنوئی تھا۔ اعظم خان نے سلطان مراد کو دعوت دے کر شگر بلایا اور سازش کر کے سلطان مراد کو دریا میں غرق کر دیا اور اعظم خان خود نے تخت سکردو پر قبضہ کر کے پانچ سال حکومت کی۔ اس واقعے کے بعد سلطان مراد کی بہن فخر النساء نے برق نق کو اردو حق مہر میں لے کر اعظم خان سے علیحدگی اختیار کر لی۔ بھائی کے قتل کا بدلہ لینے کے لئے اپنے بیٹے سلمان کے شیر پدروزیر ولی کے ذریعے شگر میں بغاوت کرادی جس کے دوران اعظم خان قتل ہوگیا۔ اعظم کے قتل ہونے پر سکردو کے تخت پر سلطان مراد کا بیٹا محمد ظفر خان متمکن ہوا۔ ظفر خان کے بعد اس کا بیٹا علی شیر خان ثانی ۱۷۸۷ء میں تخت نشین ہوا اور ۱۸۰۰ء تک اس کی حکومت رہی۔

اس زمانے میں شگر کے حسین خان کی وفات کے بعد قلی خان اور اعظم خان کے درمیان جانشینی کا تنازعہ چلا آ رہا تھا۔ قلی خان علی شیر خان ثانی کا بھانجا تھا۔ علی شیر خان نے تین بار قلی خان کو شگر کے تخت پر بٹھایا لیکن تینوں بار اعظم خان خپلو کی فوج کی مدد سے شگر کی حکومت پر قابض ہوگیا۔ ان لڑائیوں اور جھگڑوں نے بلتستان کی تینوں حکومتوں یعنی مقپون، اماچا اور یبگو کی بنیادیں ہلا کر رکھ دیں۔ ان گھمبیر حالات کے ساتھ ۱۸۰۰ء میں علی شیر خان ثانی کا بیٹا احمد شاہ تخت سکردو پر متمکن ہوا جو بلتستان کا آخری تاجدار ثابت ہوا۔ اس وقت شگر میں راجہ حیدر خان حاکم تھا جس کی ہمشیرہ دولت خاتون احمد شاہ کی زوجہ تھی۔ اسی دوران اہل خپلو نے پرکوتہ پر دست درازی کی تو احمد شاہ نے اپنے بھتیجے عبدال خان کی سرکردگی میں ایک فوج خپلو پر حملہ کرنے کے لئے بھیج دیا۔ اس وقت خپلو میں مہدی کی حکومت تھی جس نے اپنے بھائیوں دولت خان، علی خان اور محمد شاہ کو راجہ لداخ کی مدد سے نوبرا میں قید کر رکھا تھا۔ احمد شاہ کی فوج کو مہدی علی خان کے مقابلے میں شکست ہوئی اور عبدال خان مہدی علی خان کے پاس قید ہوگیا۔ عبدال خان کی رہائی کے لئے احمد شاہ نے اس کے عوض اس کے وزن کے برابر سونے کی پیش کش کی تو مہدی نے عبدال خان کو رہا کرنے کی بجائے دماغ میں کیل ٹھونک کر اسے قتل کر ڈالا۔ اس پر احمد شاہ نے مشتعل ہو کر بذات خود خپلو پر حملہ آور ہو کر مہدی علی خان کو قید کر دیا اور بعد میں اسے ہلاک کر ڈالا۔ احمد شاہ نے خپلو میں یبگو خاندان کی حکومت ختم کر کے یول سترونگ کریم کو وہاں کا حاکم مقرر کر دیا۔ ۱۸۰۰ء سے ۱۸۴۰ء کے دوران بظاہر پورے بلتستان پر مقپون احمد شاہ کی حکومت تھی لیکن اندرونی طور پر یہ علاقہ انتشار کا شکار تھا۔ اس لئے کشمیر کے ڈوگرہ مہاراجہ گلاب سنگھ نے موقع سے فائدہ اٹھا کر اس علاقہ پر حملہ کیا۔ ڈوگروں کو بلتستان پر حملہ کرنے کی دعوت دینے والوں میں راجہ احمد شاہ کا اپنا بڑا بیٹا محمد شاہ اور کھرمنگ کے راجہ علی شیر خان پیش پیش تھے کئی مقامات پر بلتی اور ڈوگرہ افواج کے درمیان دست بدست لڑائیاں ہوئیں۔ آخر کار محمد شاہ اور علی شیر خان کے علاوہ دیگر کئی ننگ وطن افراد کی غداریوں کی وجہ سے ڈوگروں کو بلتستان پر تسلط جمانے کی راہیں ہموار ہوگئیں۔ راجہ احمد شاہ کو اہل وعیال کے ساتھ گرفتار کر کے کشمیر لے گئے اور اس کے ساتھ ہی بلتستان کی آزاد اسلامی ریاست اور مقپون سلطنت کا چراغ گل ہوگیا۔ مقپون احمد شاہ کے ایک بیٹے امیر حیدر کی ماں نے اس المناک واقعے کو ایک پرسوز گیت میں بیان کیا ہے اور یہ حزنیہ گیت ''چوامیر حیدر'' کے نام سے اب بھی زبان زد عام ہے۔ اس گیت کے پس منظر میں مشہور حزنیہ راگ ''مقپونی فوتونگ کار'' بھی رائج ہے جسے مقپون خاندان کی شکست کی علامت سمجھی جاتی ہے۔ ایک سال کے بعد شگر کے راجہ حیدر خان اماچہ نے علم بغاوت بلند کر کے بلتستان میں آزادی کا جھنڈا لہرا دیا لیکن آزادی کی یہ نعمت جلد ہی دوبارہ قعر غلامی میں ڈوب گئی۔ راجہ حیدر خان بھی ڈوگروں کے ہاتھوں اسیر ہوگئے۔ یوں بلتستان پر مہاراجہ گلاب سنگھ کا مکمل تسلط قائم ہوگیا۔ راجہ حیدر خان کی اسیری کے بعد بلتستان میں خوشی وشادمانی اور اطمینان وسکون کا سورج غروب ہوا۔ عوام الناس کے درمیان کسی چیز کا بھی مزہ نہ رہا۔ اسی لئے حیدر خان کی اسیری کے بعد اس کے کسی چاہنے والے نے ''چوحیدر خان'' نامی گیت میں اپنے دلی جذبات کا اظہار کرتے ہوئے کہا تھا:

اے راجہ حیدر خان! میں جب خوبانی کے باغ میں گیا (تو دیکھا) بہت ساری خوبانیاں پکی ہوئی ہیں۔ میں جب سیب کے باغ میں گیا (تو دیکھا) بہت سارے سیب پکے ہوئے ہیں۔ میں جب گلاب کے باغ میں گیا (تو دیکھا) بہت سارے گلاب کھلے ہوئے ہیں۔ لیکن اے راجہ حیدر خان! میرے گھبرو نہ ہونے سے یہ خوبانیاں اور یہ سیب بے ذائقہ اور یہ گلاب بدرنگ لگتے ہیں۔

ڈوگروں نے اپنے سو سال سے بھی زائد عرصہ کے دور حکومت میں یہاں کے باسیوں پر طرح طرح کے مظالم ڈھائے۔ لیکن اہل بلتستان نے ڈوگرہ استبدادی حکومت کو دل سے کبھی تسلیم نہیں کیا۔ انسانیت سوز مظالم سہتے رہے لیکن جب دنیا کے نقشے پر پاکستان معرض وجود میں آیا تو اس علاقے کے لوگوں نے بھی

اپنی مدد آپ کے تحت ڈوگرہ حکومت کے خلاف جہاد کا اعلان کیا۔ کم وبیش چھ ماہ کی خون ریز جنگ کے بعد جب یہ علاقہ ڈوگروں کی نحوست سے پاک ہوکر آزاد ہوا تو یہاں کے لوگوں نے اسلامی رشتے کی بنیاد پر اس کا الحاق پاکستان کے ساتھ کر دیا۔ گلگت بلتستان کے حریّت پسندوں کی لڑی گئی یہ جنگ آزادی اور پاکستان کے ساتھ الحاق کا منصوبہ تاریخ کا ایک اہم باب ہے۔

اس وقت گلگت بلتستان پر مشتمل ''شمالی علاقہ جات'' ایک انتظامی یونٹ ہے جو براہ راست وفاقی حکومت کے زیر انتظام ہے۔ پاکستان کی قومی اسمبلی اور سینٹ میں فی الحال اس علاقے کی کوئی نمائندگی نہیں البتہ مقامی طور پر سب سے بااختیار ادارہ ''ناردرن ایریا قانون ساز کونسل'' ہے۔ وفاقی وزیر برائے امور کشمیر وشمالی علاقہ جات اس کونسل کا چیئرمین اور چیف ایگزیکٹیو کہلاتا ہے۔ البتہ ڈپٹی چیف ایگزیکٹیو قانون ساز کونسل کے ممبران میں سے اکثریتی رائے دہی کی بنیاد پر منتخب کیا جاتا ہے۔

آبادی کے اجزائے ترکیبی، زبان اور بولی

۱۹۹۸ء کی مردم شماری کے مطابق بلتستان کی کل آبادی ۳۰۳۲۱۴ ہے۔ اس کے علاوہ کم وبیش ایک لاکھ کی آبادی حصول تعلیم اور تلاش روزگار کے سلسلے میں پاکستان کے دیگر شہروں کے علاوہ ایران وعرب ممالک میں اپنے اصلی تشخص کے ساتھ مقیم ہے جو مذکورہ اعداد وشمار میں شامل نہیں۔ بلتی زبان بولنے والوں نے جہاں جہاں نقل مکانی کی ہے اس مقولے کے تحت ''پھہ یول بجید نہ پھہ سکت مہ بجید'' (ترجمہ) ''آبائی وطن بھول بھی جائے تو آبائی زبان نہ بھولے'' کے مصداق اپنی زبان کو زندہ رکھا ہے۔ جیسا کہ قیام پاکستان سے قبل متحدہ ہندوستان کے شہر شملہ، منسوری، ڈلہوزی، نینی تال، رام پور اور کشمیر وغیرہ میں ہزاروں بلتی آباد تھے۔ اس وقت پاکستان کے شہر کراچی، راولپنڈی، مری، لاہور، کوئٹہ اور ایران میں قم، مشہد، اصفہان اور تہران میں بلتستان کی کثیر تعداد آبادی مقیم ہے جن کے درمیان بلتی زبان مستعمل ہے۔

بلتستان کی مقامی زبان جو ''بلتی'' کہلاتی ہے، تبتی زبان کی ایک شاخ ہے۔ یہ زبان بلتستان کے علاوہ بھوٹان، سکم، ریاست مستنگ، نیپال کے مشرقی علاقوں لداخ، کرگل تبت اور چین کے صوبہ یونن، سیچھوان، گانسو اور ژھینگائی میں معمولی فرق کے ساتھ بولی جاتی ہے۔ دنیا میں اس وقت تبتی زبان بولنے والوں کی مجموعی تعداد ۳۵ لاکھ سے ۴۰ لاکھ کے درمیان بتائی جاتی ہے۔ اس زبان کا اصل رسم الخط سنسکرت دیوناگری سے لیا گیا ہے جو اس وقت بلتستان میں متروک ہے۔ البتہ تبت اور لداخ میں وہی رسم الخط رائج ہے۔ اس علاقے کے اہل علم حضرات نے اشاعت اسلام کے بعد مذہبی اشعار لکھنے کے لئے فارسی رسم الخط میں لاشعوری طور پر ایک نئے طرز تحریر کا اجراء کیا جو آج بھی رائج ہے اور اب تک کا تمام تر بلتی ادبی سرمایہ اسی رسم الخط میں موجود ہے۔

بلتستان میں تقریباً پانچ سے سات فیصد شنا بولنے والے ہیں۔ بلتی اور شنا کے علاوہ ضرورت کے تحت اردو، فارسی، عربی، انگریزی اور کشمیری بھی بولی جاتی ہے۔ شنا زبان سکردو میں سدپارہ، شغرتھنگ اور تندل میں، روندو میں شنگوس سے لے کر ہینگو تک دریائے سندھ کے جنوب مغربی علاقوں اور کھرمنگ کے بعض دیہاتوں میں بولی جاتی ہے۔ جبکہ کشمیری زبان سکردو کے موضع رنگا میں محدود ہوکر رہ گئی ہے اور اب رنگا میں بھی کشمیری زبان دم توڑ رہی ہے۔

ماضی میں گردوپیش کے مختلف ممالک کے ساتھ بالواسطہ یا بلاواسطہ جغرافیائی، سیاسی، نسلی، لسانی اور مذہبی تعلقات کے باعث قدیم زمانے سے متعدد قوموں اور نسلوں کے لوگ وقتاً فوقتاً آکر یہاں آباد ہوتے رہے اور رفتہ رفتہ ان کی نسلیں آپس میں ملتی گئیں۔ اس وقت یہاں سوائے پانچ سے سات فیصد شین (درد نسل) اور تقریباً دو فیصد کشمیری نژاد کے علاوہ باقی سب لوگ مشترکہ شناخت رکھتے ہیں۔

نمایاں نسلی گروہ اور قبائل

منگول:

یہ بلتستان کا قدیم اور اکثریتی نسلی گروہ ہے جس کی کل آبادی تخمیناً ساٹھ فیصد ہے۔ ان کو منگول کی ذیلی شاخ ''تبتی'' بھی کہا جاتا ہے۔ یہ نسل پورے بلتستان میں پھیلی ہوئی ہے اور انہی کی وساطت سے تبتی زبان نے اس علاقے میں فروغ پایا۔ گویا یہاں کے معاشرے کا بنیادی ڈھانچہ تبتی تہذیب ہے۔ اس نسل کے لوگوں کی رنگت کالے پر زردی مائل، گول چہرے کے ساتھ چھوٹی اور کچھی ہوئی گول آنکھیں، قدرے چپٹی ناک اور رخسار کی ہڈیاں ابھری ہوئی ہوتی ہیں۔ داڑھی کے بال بہت کم اور قد اوسط درجے کا ہوتا ہے۔ انسانی شکل پر نسلی ومذہبی امتیازات کے علاوہ آب وہوا کے اثرات کے باعث بلتستان میں بسنے والے تبتی نژاد لوگوں کی شکل وصورت اور جسمانی خصوصیات تبت ولداخ والوں سے بہتر ہے۔ البتہ بلتستان کے انتہائی مشرقی علاقوں بالخصوص چھورٹ میں لوگوں کی شکل وشباہت لداخیوں سے ملتی جلتی ہے۔

مون:

شمالی ہندوستان کے ایک مخصوص خطے کو قدیم تبتی اصطلاح میں

''مون یل'' کہتے ہیں۔ غالباً دوسری صدی عیسوی کے وسط میں مون قبائل کے ہزاروں افراد بدھ مت کی تبلیغ کے لئے اپنے وطن سے نکل کر بلتستان آ پہنچے۔ ان کی نسل اب بھی بلتستان کے اکثر علاقوں میں ہے اور کچھ عرصہ قبل تک یہ لوگ پیشے کے لحاظ سے موسیقار، موچی اور لوہار تھے۔ اب یہ طبقہ اپنا پیشہ ترک کر کے دیگر لوگوں میں تحلیل ہو گیا ہے اس لئے ان کا تشخص اب تقریباً مٹ چکا ہے۔ البتہ بعض خاندان اور دیہاتوں کے نام اب بھی مون کی مناسبت سے پہچانے جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر مون جونگ، لہنگ کھونگ اور گربونگ جیسے گاؤں کے نام انہی پیشوں سے منسوب ہیں۔ یہ لوگ قد کے میانے، رنگ کے قدرے کالے اور ہندوستانی چہرے رکھتے ہیں۔

بروشو:

دسویں یا گیارہویں صدی عیسوی میں چلاس اور کوہستان کے شنا کی علاقے سے جب شین قبائل گلگت کی طرف منتقل ہوئے تو اس علاقے میں شینوں کی بالادستی کے باعث پہلے سے آباد بروشو المعروف یشکن قبائل ہجرت کر کے بلتستان کی طرف نکلے۔ یہ لوگ نسل کے لحاظ سے تورانی بتائے جاتے ہیں۔ بروشو نسل بلتستان کے تقریباً ہر گاؤں میں جبکہ ان کی زیادہ تعداد شگر اور رونگ یل میں آباد ہیں۔ یہ لوگ اب مکمل طور پر تبتی تہذیب میں مدغم ہو چکے ہیں۔ بروشو نژاد اکثر دراز قد، سرخ چہرہ، اونچا ماتھا، قدرے سنہرے بال، کہیں کہیں نیلی آنکھیں، اونچی اور موٹی ناک جس میں کہیں کہیں طوطے کی خمیدگی بھی موجود ہے اور بیضوی چہرے رکھتے ہیں۔

شین:

بلتستان میں آباد ایک نسلی گروہ مقامی اصطلاح کے مطابق ''بروقپا'' کہلاتا ہے۔ یہ لوگ دراصل ہندی آریائی نسل کے شین (دارد) ہیں۔ یہ گروہ بلتستان کی وادی کھرمنگ سے لے کر روندو کی آخری سرحد تک جنوبی اطراف کے بالائی علاقوں میں ہے۔ بعض شین قبائل چلاس و کوہستان کی طرف سے مختلف ادوار میں اپنے اپنے ریوڑ کے ساتھ چراگاہوں کی تلاش میں نکلے تھے اور یہاں پہنچ کر اپنے لئے بالائی چراگاہوں میں الگ دیہات آباد کر کے خانہ بدوشانہ زندگی گزارنے لگے۔ چونکہ تبتی زبان میں پہاڑی چراگاہ کو ''بروق'' کہتے ہیں۔ اس لئے یہ ''بروقپا'' (Broqpa) یعنی بالائی چراگاہوں کے باشندے کہلانے لگے۔ اس کے علاوہ سولہویں اور سترہویں صدی عیسوی میں سکردو کے مقپون حکمران راجہ علی شیر خان انچن، شاہ مراد، شیر شاہ اور علی شاہ نے یکے بعد دیگرے گلگت، چترال اور چلاس وغیرہ کو فتح کرنے کے بعد وہاں سے شین قبائل کو بحیثیت قیدی لا کر ان بالائی علاقوں میں آباد کیا۔ شین قبائل کے ان دیہاتوں میں اب بھی داردی تہذیب و تمدن محفوظ ہے اور وہ لوگ اب بھی اپنی مادری زبان شنا بولتے ہیں۔ ضرورت کے موقع پر یہ شنا بولنے والے لوگ غیر شستہ طریقے سے بلتی زبان بھی بول لیتے ہیں۔ اس نسل کے لوگ لمبا قد، فربہ جسم، سیاہ بال، سیاہ آنکھیں اور کھڑی ناک کے ساتھ لمبے چہرے رکھتے ہیں۔ ان کی رنگت داردستان (گلگت، چلاس، کوہستان) میں بسنے والے داردوں کی طرح زیادہ صاف نہیں۔ یہ لوگ تندخو ہیں اور باتیں ہمیشہ اونچی آواز میں کرتے ہیں۔

خور یا ہور:

ماضی بعید میں ترکستان (یارقند و کاشغر وغیرہ) کی طرف سے جو ترک قبائل کوہ قراقرم کو عبور کر کے پہنچے تھے وہ زیادہ تر بلتستان کی وادی خپلو اور شگر میں آباد ہوئے جو مقامی اصطلاح میں خور یا ہور کہلاتے ہیں۔ ان میں ایک قبیلہ ''یبگو'' (YABGO) نے خپلو اور کریس پر سات سو سال حکومت کی۔ کہا جاتا ہے کہ ''یبگو'' قدیم ریاست تخارستان کے حکمران کا لقب تھا۔ بعض ہور قبائل تجارت کی غرض سے آ کر سکردو میں بھی آباد ہوئے لیکن ان کا الگ تشخص نہیں ہے۔ یہ نسلی گروہ عام طور پر منگولیائی شکل رکھتا ہے۔ ان میں بعض تو دراز قد ہیں لیکن اکثر پستہ قد۔ چہرے اکثر زرد رنگ اور آنکھیں چھوٹی ہیں۔

کشمیری:

بلتستان کا ایک واضح نسلی گروہ کشمیری ہے جو مقامی اصطلاح میں ''کھچے'' (Khache) کہلاتا ہے۔ ان میں بعض قبائل کا تعلق مختلف پیشوں سے ہے جن کو مقپون راجاؤں کے دور میں خصوصی طور پر لائے گئے تھے جبکہ بعض کشمیری قبیلے تجارت اور امن و آشتی کی تلاش میں یہاں آئے۔ بلتستان میں ڈوگرہ حکومت کے دور میں سرکاری ملازمت کے سلسلے میں بھی کشمیر سے بہت سے لوگ یہاں آئے اور پھر مستقلاً آباد ہوتے رہے۔ ان کشمیریوں نے بہت سی نئی رسومات بالخصوص شادی کی تقریبات، کشمیری کھانوں، زیورات اور فنون لطیفہ کو یہاں مروج کیا۔ سکردو کے سکمیدان اور رنگا میں کشمیری نسل کا واضح تشخص اب بھی برقرار ہے اور رنگا گاؤں میں کشمیری زبان بھی بولی جاتی ہے۔ یہ کشمیری اکثر قد آور اور فربہ جسم کے ساتھ لمبا چہرہ، کھڑی اور لمبی ناک رکھتے ہیں۔ سکمیدان اور رنگا میں آباد ان کشمیریوں کی جسمانی ساخت اور رنگت میں کافی فرق ہے۔ کشمیریوں کے بارے میں کئی ضرب الامثال بلتی لوک ادب کا حصہ ہیں۔

سادات:

بلتستان میں ایک خاص تعداد آبادی سادات کرام کی ہے جن کا تعلق حسینی، زیدی، موسوی اور رضوی سلسلہ نسب سے ہے۔ یہ سادات ایران سے کشمیر اور پھر کشمیر سے تبلیغ اسلام کے لئے یہاں آ کر آباد ہوئے۔ یہی وجہ ہے کہ ان میں عربی، عجمی، کشمیری اور بلتی چاروں رنگ موجود ہیں۔ اگرچہ زبان اور طرز معاشرت کے اعتبار سے اب مقامی تہذیب وتمدن میں مدغم ہو چکے ہیں تاہم ان کا اپنا ایک الگ مقام اور تشخص برقرار ہے۔ یہ طبقہ بلتستان میں سب سے زیادہ معزز ہے اور ان کی انتہائی عزت وتکریم کی جاتی ہے۔ سید خاندان کے لوگ اکثر دینی تبلیغ کے شعبے سے وابستہ ہیں۔ تاہم اب نظریہ ضرورت کے تحت سرکاری ملازمت اور تجارت بھی کرتے ہیں۔

مقپون:

یہ بلتستان کا نامور اور طویل المدت حکمران خاندان گزرا ہے جس کی کم وبیش سات سو سال تک حکومت رہی اور اس کی سلطنت کی سرحدیں کبھی چترال سے لے کر تبت پورانگ تک پھیلی ہوئی تھیں۔ اس خاندان کے اولوالعزم راجہ علی شیر خان انچن کا دور تاریخ بلتستان میں سنہرا دور مانا جاتا ہے۔ خانوادۂ مقپون کا بانی ابراھیم شاہ تھا جو بعض مورخین کے مطابق نسلاً مصری تھا اور بعض ایرانی یا کشمیری قرار دیتے ہیں۔ اس خاندان کے اکثر لوگ خوش شکل، سفید جلد اور میانہ قد ہیں۔ بلتستان کے لوگ مقپون خاندان کے افراد کی اب بھی بڑی عزت کرتے ہیں۔

چترالی:

بلتستان میں چترالی بھی قرون وسطیٰ سے آباد ہیں۔ ان میں بعض تو مقپون حکمرانوں نے قیدی کے طور پر لائے اور وقتاً فوقتاً چترالی طائفے بھی آ کر یہاں آباد ہوتے رہے۔ ان میں چند ایک خاندان ''گوقپا'' کے نام سے موسوم ہیں۔ جو چترال کا تبتی نام ''گوق یل'' سے منسوب ہے چونکہ اس نسلی گروہ کی آبادی قلیل تھی اس لئے ان کا کوئی الگ تشخص برقرار نہ رہ سکا۔

پٹھان:

بعض پٹھان قبائل تقریباً ایک سے ڈیڑھ صدی قبل کاروبار کے سلسلے میں بلتستان آ کر آباد ہوئے۔ اب ان کی اولاد سکردو اور شگر خاص میں کئی خاندانوں پر مشتمل ہیں اور بلتی معاشرے میں گھل مل چکی ہیں۔ ان کا چہرہ اپنے نسلی تشخص کا واضح ثبوت دیتا ہے۔ اس کے علاوہ گزشتہ پندرہ بیس سالوں کے دوران تجارت کی غرض سے آنے والے پٹھانوں میں برابر اضافہ ہوتا جا رہا ہے لیکن یہ لوگ اب تک بلتی معاشرے سے الگ تھلگ ہیں۔

مقامی خصوصیات

ویسے تو بلتستان فلک بوس پہاڑوں اور وسیع وعریض گلیشیروں پر مشتمل ایک پراسرار منطقہ ہے اور اسی وجہ سے دنیا بھر میں پہاڑوں کی سرزمین مشہور ہے۔ سرحدوں پر کھڑے نگہبانوں کی طرح پہاڑوں کی یہ قطاریں اس علاقے کے لوگوں کو عزم وحوصلہ اور بلند ہمتی کا درس دے رہی ہیں۔ قراقرم اور ہمالیہ کے سلسلوں میں جا بجا اونچے ٹیلے یہاں کی تاریخ اور تہذیب وثقافت کے عروج وزوال کا پتہ دے رہے ہیں۔ اسی لئے ہر سال ہزاروں غیر ملکی سیاح کوہ پیمائی اور تحقیقی مشن پر یہاں آتے ہیں۔ دنیا کی دوسری بلند ترین چوٹی کے ٹو کے علاوہ دیگر بہت سی عالمی شہرت یافتہ چوٹیاں بھی یہاں موجود ہیں۔

دریائے سندھ (انڈس) پانی کے حصول کا ایک بہت بڑا ذریعہ بلتستان سے گزرتا ہوا ملک کے زیریں علاقوں کو سیراب کرتا ہے۔ کہتے ہیں یہ دریا شیر کے منہ سے نکلتا ہے اسی لئے اسے ''سینگے چھو'' یعنی شیر دریا بھی کہا جاتا ہے۔

جدید ترقی کے حوالے سے بلتستان ابھی پسماندہ ہے تاہم مناظر قدرت اور حسن فطرت سے یہ علاقہ مالا مال ہے۔ جہاں چہار اطراف میں دیوہیکل پہاڑ اس علاقہ کو حلقہ کیئے ہوئے ہیں، وہاں ان پہاڑوں کے درمیان ریگستان بھی ہیں اور ان کے بیچ میں خوبصورت نگینوں کی طرح جڑی ہوئی شفاف جھیلیں بھی۔ جنگلی جانوروں میں مثلِ ہرن، آہو، مارخور، اڑیال، چکور، رام چکور وغیرہ پائے جاتے ہیں۔ یہاں انگور، سیب، ناشپاتی، خوبانی، گلاس، اخروٹ، شہتوت اور دیگر اقسام کے پرلطف میوے وافر دستیاب ہیں مگر یہ سب سال میں ایک مختصر مدت کے لئے۔ کیونکہ بلتستان میں بہار کا دورانیہ مئی سے ستمبر تک ہوتا ہے۔ بلتستان کا موسم بھی عجیب ہے کبھی یہاں شہر کے مرکز میں بھی روئی کے گالوں کی طرح برف کے پھول کھلتے ہیں اور کبھی پندرہ ہزار فٹ بلند سطح مرتفع ''غیارسہ'' میں بھی ہزاروں اقسام کی خوشنما اور رنگ برنگے پھول کھلتے ہیں اور علاج ومعالجہ کے لئے کام آنے والی مختلف النوع جڑی بوٹیاں اگتی ہیں۔

علم وادب:

بلتستان کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ یہ ادب کی سرزمین ہے۔ یہاں کا ہر باشندہ فطری طور پر شاعر، ادیب اور فنکار ہے۔ یہ اور بات ہے کہ کسی کے اندر یہ فن ہوتے ہوئے بھی اس کا مظاہرہ نہ کرے۔ شاعری، ادب اور فنکاری کے لئے بنیادی شرط امن وسکون ہے اور یہ خوش قسمت خطہ امن کا گہوارہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بلتستان شعر وادب کے اعتبار سے ثروت مند ہے۔ یہ لوگ انسانی اقدار کے

امین اور اخلاق و روحانیت کے علمبردار ہیں۔ یہاں قتل و غارت گری، چوری وڈاکہ زنی اور اغوا و غنڈہ گردی جیسے جرائم کا تصور ہی نہیں۔ بلتستان کے لوگ انتہائی سیدھے سادھے، نرم مزاج، مہمان نواز، دیانت دار اور دوسروں کے لئے بے ضرر ہیں۔ بلتستان کے مجلسی آداب پڑوس کے علاقوں میں ''آداب بلتستان'' کے نام سے قدیم الایام سے مشہور ہیں۔ یہ خطہ اسلامی علوم کا مرکز بھی ہے۔ پاکستان کے کسی بھی علاقے کی نسبت دینی عالموں کی تعداد بلتستان میں زیادہ ہے۔ اسی لئے یہاں کے عام اور ناخواندہ لوگ بھی دینی احکام و معلومات سے بخوبی آگاہ ہیں۔ مقدمات کا فیصلہ کرنے کے لئے غیر سرکاری طور پر محکمہ شرعیہ قائم ہے۔ بلتستان کے لوگ مزاجاً جفاکش اور بردبار ہیں۔ اہل بلتستان اب تک ہر آزمائش کی گھڑی میں کامیاب ہوتے رہے ہیں۔ دیکھنے میں یہ لوگ نااہل لگتے ہیں لیکن موقع ملنے پر ہر میدان میں سبقت لے جاتے ہیں۔ بہ ظاہر بلتستان کے باسی بزدل معلوم ہوتے ہیں لیکن بلتستان کی قدیم و جدید تاریخ اٹھا کر دیکھیں تو ان کی جرأت و بہادری اور فتح و کامرانی کی داستانوں سے کتابیں بھری پڑی ہیں۔ اہل بلتستان کی زبان انتہائی شستہ ہے۔ بلتی کے علاوہ دنیا کی کوئی بھی زبان سیکھنے کے بعد یہ لوگ اہل زبان کی طرح بولتے ہیں جیسا کہ یہاں کا اردو دان طبقہ دہلی اور لکھنؤ والوں کی طرح رواں اور شستہ اردو بول سکتا ہے۔ اسی طرح قرآنی قرأت میں بھی بلتستان کے لوگ عربوں سے کسی طور بھی پیچھے نہیں اور یہ ساری خصوصیات بلتی زبان کی دین ہیں۔

تہذیب و ثقافت کے اعتبار سے بلتستان قابل رشک علاقہ ہے۔ تاریخی حوالوں سے سینہ بہ سینہ منتقل ہونے والی روایتوں کے مطابق معروف اور پرحشم کھیل ''پولو'' کو دنیا میں متعارف کرانے کا سہرا بلتستان ہی کے سر ہے۔ اس کے علاوہ باہمی تعاون کے لوازمات، شعروشاعری، مجلسی آداب اور رقص و موسیقی وغیرہ میں بھی یہ علاقہ اپنی پسماندگی و دور افتادگی کے باوجود منفرد ہے۔ اب نئی تہذیب کے سیل رواں ان روایتی آثار کو بہا کر لے جا رہے ہیں۔ جدید تقاضوں کے تحت بلتستان بھی اب ترقی کی راہ پر گامزن ہے۔ یوں پرانی قدروں کی جگہ نئے اقدار نے لی ہیں۔ تعلیم، تجارت، مواصلات، سیاحت، زراعت، جنگلات، تعمیرات، ذرائع رسل و رسائل غرض زندگی کے ہر شعبے میں روز افزوں ترقی ہو رہی ہے۔ لیکن یہاں کی صدیوں پرانی اور زرخیز تہذیب و ثقافت تیزی سے مٹ رہی ہے۔

عورتوں اور مردوں کے نام

بلتستان میں اشاعت اسلام سے پہلے مقامی باسیوں کے نام کیسے تھے اور اس وقت نام رکھنے کے کیا رجحانات تھے، ان سوالوں کا شافی جواب ملنا بہت مشکل ہے کیونکہ یہاں کی قدیم تہذیب و تمدن کے حوالے سے کوئی کتاب موجود نہیں۔ لوک گیتوں میں جو شخصی نام ملتے ہیں ان میں اکثر اشاعت اسلام کے بعد سے متعلق ہیں۔ تاہم داستان کیسر، داستان رگیالو چولو بزانگ اور چند دیگر لوک کہانیوں میں جو نام ملتے ہیں وہ مقامی الاصل کہہ سکتے ہیں۔ لیکن یہ داستانیں اور کہانیاں اتنی مافوق الفطرت بن چکی ہیں کہ ان میں موجود کرداروں کے نام بھی سچ مچ غیر فطری لگتے ہیں۔ البتہ راجگان بلتستان کے شجرہ نسب اور ان سے وابستہ بعض افراد کے نام تاریخ کی کتابوں میں درج ہیں جن سے قبل از اسلام کے دور میں نام رکھنے کے رجحانات کو سمجھنے میں ضرور مدد ملتی ہے۔

خاندان مقپون کے حکمران ستک سینگے، زیک سینگے، بروک سینگے، غوطہ چوسینگے، بہرام چو، بوخا، خاندان اماچہ کے حکمران چاتھم، بولگوتھم، یولگوتھم، رزی تھم، تزن تھم اور غوری تھم۔ سکردو کے چندرو، ساستانو ٹوک ٹوک، ستانو نے شے، ستانو کنائی، ستانو بابو، ملاتم زیرپا، گچا۔ کھرمنگ کے چند آبادکاروں کے نام مایور، چندن، اومہ چکپا اور کانگ کسپہ وغیرہ ملتے ہیں۔ مذکورہ مرکب ناموں میں سے ایک جزو بلتی اور دوسرا غیر بلتی ہے۔ اسی طرح بعض نام اصلی ہیں اور بعض صفتی یا عرفی۔ جیسا کہ تم زیرپا، کانگ کسپہ، ستانو ٹوک ٹوک وغیرہ صفتی نام ہیں۔ سکردو کے حکمرانوں کے اکثر نام سینگے یعنی شیر، شگر کے حکمرانوں کے نام تھم (راجہ بزبان بروشسکی) اور خپلو کے حکمرانوں کے اکثر نام میر اور بیگ (یعنی سردار بزبان دری) استعمال ہوئے ہیں۔

شگر کی منظوم تاریخ ''شغرنامہ'' میں راجہ شگر کے بعض بہادر افراد کے نام درج ہوئے ہیں جیسے قچو، بغدور، نقٹیر ی، رگیال سینگے، رگیال ملک، رگیالو، غوتہ چو، قلی اور شلمک وغیرہ۔ یہ سارے نام خالص بلتی نام ہیں۔ ان کے علاوہ بعض نام ایسے ہیں جو بلتستان میں قدیم الایام سے رائج چلے آ رہے ہیں اور انہیں ہم غیر اسلامی بھی کہہ سکتے ہیں۔ ایسے ناموں میں مردوں کے نام واتھول، واچو، کھی تھول، کھی چو، کھی فرو، کھی سوک، بغدول، رگیالو، قلی، اسون چو، اوت چو، سودے، سنگ سنگ اور سینگے جبکہ عورتوں کے نام بوٹو لدن، کھی نولدن، سوتی، دبلت، بیوروزوم، چھوقمی، شوربی، چھوقمن، رگیالموا ور رگیالبی وغیرہ شامل ہیں لیکن فی زمانہ ایسے نام متروک ہو چکے ہیں۔ چودھویں صدی عیسوی میں اشاعت اسلام کے بعد بلتستان کے لوگوں نے اپنے نومولود بچوں کا نام پیغمبروں، آئمہ اطہار اور دیگر بزرگان دین سے منسوب کر کے عیسیٰ، موسیٰ، داؤد، الیاس، یحییٰ، یعقوب، یوسف، ابراہیم، اسماعیل، احمد، محمد، علی، حیدر، حسن، حسین، عباس، مسلم، سجاد، باقر، جعفر، کاظم، رضا، تقی، نقی، عسکری، مہدی، عبداللہ، عبدالستار، عبدالرحمٰن، عبدالرحیم وغیرہ مردوں کے لئے جبکہ مریم، آمنہ، حاجرہ، آسیہ، خدیجہ، حبیبہ، فاطمہ، زہرا، بتول، زینب، کلثوم، لیلیٰ، روقیہ، سکینہ اور فضہ

وغیرہ عورتوں کے لئے رکھنا شروع کیا۔ عام طور پر مذکورہ مردانہ ناموں کے ساتھ غلام اور زنانہ ناموں کے ساتھ کنیز کی اضافت کے ساتھ موسوم کیا جاتا ہے۔

بلتی معاشرے میں لوگ اپنے بیٹوں کو ''شاہ'' اور ''خان'' کے نام رکھنے سے گریز کرتے ہیں کیونکہ یہاں یہ دونوں نام علی الترتیب سادات اور راجہ خاندان کے افراد کے لئے مخصوص ہیں۔ اس اصول پر بلتستان کا معاشرہ اب بھی پابند ہے۔

مذکورہ بزرگان دین کی مناسبت سے نام رکھنے کے علاوہ عربی و فارسی کتابوں سے اخذ کر کے نام رکھنے کا رجحان بھی یہاں غالب رہا اور یوں مردوں کے لئے دولت، برکت، روزی، امیر، فقیر، محمود، مرزا، مختار، رستم، فرمان، اکبر، اصغر، سلطان، نثار اور رحمت وغیرہ جبکہ خواتین کے لئے خاتون، بیگم، بانو، ملکہ، حمیدہ، زبیدہ، نرگس، صفیہ وغیرہ عام ہو گئے۔ اب گذشتہ تین چار عشروں سے پاکستان کے دیگر علاقوں کے ساتھ رابطہ کے باعث بلتستان میں ناموں میں بھی بڑی جدت آئی ہے۔ اب یہاں کے لوگ اپنے بچوں کو بشیر، نذیر، ولایت، شجاعت، کرامت، عنایت، بشارت، عارف، کاشف، آصف، اشرف، ساجد، عابد، نسیم، وسیم، خادم، شکیل، ذاکر، ناصر، افضل وغیرہ اور بچیوں کو زرینہ، فریدہ، ساجدہ، عابدہ، شکیلہ، نائلہ، انیلہ، سجیلہ، سمیرہ، آسیہ، ناظرہ، راضیہ، نازنین اور نیلوفر جیسے نام رکھنا پسند کرتے ہیں۔

بلتستان کے لوگ عام طور پر ناموں کو توڑ کر یا ادھورے ناموں سے مخاطب ہونے کے عادی ہیں۔ مثال کے طور پر محمد حسین کو ماسین، ابراہیم کو باہین، اسماعیل کو مایول، محمد علی کو ماتلی، ماتل، تلی، مم تلی، ملی یا مالی، محمد جان کو ماجان، محمد علی خان کو محمد چو، ابوالحسن کو ابولو یا ابول، عبدالرحمن کو رحمان وغیرہ۔ اس کے علاوہ کسی کے نام میں دو جزو ہوں تو ایک کو چھوڑ کر صرف ایک جزو سے پکارا جاتا ہے۔ حقیقی ناموں کے علاوہ سوقیانہ طور پر لوگوں کو ''پھیس مینگ'' یعنی عرف سے بھی پکارنے کا رواج ہے۔ جو اس خاندان یا شخصی کردار کے ساتھ کسی نہ کسی طریقے سے تعلق رکھتا ہے جیسے نقو حسن، چھٹ علی، فاچو پی غلام، تقی اخون پا اور کھ ٹوق محمد۔ آج کل بلتستان میں شاعر ہو یا غیر شاعر لوگوں میں تخلص یعنی ''تھیس مینگ'' رکھنے کا رجحان تیزی سے بڑھ رہا ہے۔ مثلاً محمد حسین کے ساتھ آزاد، موسیٰ کے ساتھ کلیم، ابراہیم کے ساتھ خلیل، محمد علی کے ساتھ جوہر، احسان کے ساتھ دانش کے علاوہ باقی ناموں کے ساتھ دیوانہ، پروانہ، مستانہ، آرزو، تمنا، تبسم، داغ، بسمل، خیالی اور عاشق تخلص رکھتے ہیں۔ نیز بعض لوگ اپنے علاقے کی مناسبت سے نام کے ساتھ شگری، کھرمنگی، پاروی، بلغاری، سرمیکی، حسین آبادی، کوروی، کھرکوئی، چھوربٹی اور بلتستانی رکھنے کے بھی عادی ہو رہے ہیں۔ اسلامی مدارس میں زیر تعلیم طلبا اپنے ناموں کے ساتھ عربی تخلص یعنی فاضلی، عابدی، جعفری، زاہدی، مدبری، فصیحی، صابری، انصاری، واعظی، ناصری، حافظی اور طاہری کا اضافہ کرتے ہیں۔ جدید دور میں یہ ایک پسندیدہ رجحان ہے اور ہر انسان کی انفرادی تسکین وشوق کی مثال بھی کہی جا سکتی ہے۔

آج کل بلتستان کے قوم پرست افراد نے اپنے بچوں کے نام پھر سے بلتی میں رکھنا شروع کیا ہے۔ مثلاً لوبسانگ، سینگے ژھیرینگ، غدیانگ چن، ستنگ چن، انچن، اوت چن، رگیال چن، سکر چن اور رینگچن وغیرہ۔

مقامی کھانے اور آداب دسترخوان

بلتستان کے لوگوں کے مزاج کی طرح یہاں کے مقامی کھانے بھی نہایت سادہ ہیں۔ محدود وسائل کے ساتھ ساتھ کفایت شعاری کے اصول کو اپناتے ہوئے نصف صدی قبل تک یہاں کے لوگ صرف دو وقت کھانا صبح وشام کھاتے تھے اور دن کو پھلوں اور ہلکی پھلکی غذا سے گزارہ کر لیتے تھے۔ مقامی اجناس میں گندم، جو، باقلہ، کنگنی، ترنبہ اور باجرہ کو یہ لوگ زان، ترو، سکھور، ازوق، ہرژب، کھور، پلاپو، پھور پھور، کسر، بلے اور خونے کو لق کی شکل میں استعمال کرتے تھے۔ اب ان میں اکثر چیزیں متروک ہوتی جا رہی ہیں۔ آیئے ان لوک کھانوں کی تفصیل کا مطالعہ کریں۔

زان:

گندم یا جو کے آٹے کو ابلتے ہوئے پانی میں ملا کر حلوانما کھانا پکایا جاتا ہے جو ''زان'' کہلاتا ہے۔ یہ عام پکوان ہے۔ البتہ شادی بیاہ، ولادت واموات کے مواقع، عرسہائے چہاردہ معصومینؑ کے ایام میں اور مہمانوں کی تواضع کے لئے ''زان'' کے بیچ میں گڑھا بنا کر پگھلا ہوا مکھن یا خوبانی کا تیل ڈالا جاتا ہے اسے ''مارزان'' کہتے ہیں۔ بلتستان کے روایتی کھانوں میں ''مارزان'' کو سب سے اہم کھانا تصور کیا جاتا ہے۔ بلتی معاشرہ میں شادی بیاہ، ولادت واموات اور دیگر دعوت کے موقعوں پر سالوں پرانا گھی کو کھلانا خاندانی افتخار اور شہرت کا باعث سمجھا جاتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ بلتستان کے دور افتادہ دیہاتوں میں ان کے پڑدادوں کا محفوظ کردہ گھی اب بھی اسی طرح محفوظ ہے۔

ہرژب کھور:

گندم کو پانی میں ابال کر کئی دنوں تک بگھو کر رکھا جاتا ہے اور جب دانے رطوبت کی وجہ سے پھوٹتے ہیں تو اسے دھوپ میں سکھا کر آٹا پسوایا جاتا ہے جسے ''ہرژب'' کہتے ہیں۔ اس کا ذائقہ شیریں ہوتا ہے۔ ڈھائی تین سیر سادہ آٹے میں ایک پاؤ میٹھا آٹا ملایا جائے تو بھرپور ذائقہ پیدا ہوتا ہے۔ اس سے ''ہرژب کھور'' یعنی میٹھی روٹی بنائی جاتی ہے جو صرف پگھلے ہوئے گھی کے ساتھ کھائی جاتی ہے۔ یہ روٹی عام طور پر خوشیوں کے موقعوں پر یعنی بیٹے کی پیدائش یا شادی کے



روایتی بلتی کھانے

اختتام پر بنائی جاتی ہے۔ گویا یہ روٹی خوشحالی کی علامت ہے۔ اس کے علاوہ میٹھے آٹے سے ''ہرژب بلے'' یعنی کھیر بھی بنائی جاتی ہے جو عام طور پر عید الفطر کے موقعوں پر یا نزلہ زکام ہونے کی صورت میں گرم کرنے کے لئے مروج ہے۔

پلاپو:

ترنبہ اور جو کے آٹے سے ''پلاپو'' بنائی جاتی ہے جس کا طریقہ یہ ہے کہ گندھے ہوئے آٹے کے دانے اخروٹ کے برابر اور اس کو تین انگلیوں سے دبا کر سہ پہلو کی شکل میں بنایا جاتا ہے۔ اس کے بعد اس کو پانی میں پکایا جاتا ہے۔ بعد ازاں خستہ گیری' اخروٹ کے مغز' مرچ اور دھنیا وغیرہ سل پر کوڈ کر اس مصالحہ دار چٹنی کے ساتھ یہ کھایا جاتا ہے۔ یہ کبھی کبھار گھر کی خواتین تفریح طبع اور خوراک میں تبدیلی کے لئے بناتی ہیں۔

کِسر:

ترنبہ یا گندم کے آٹے کو پانی سے لئی کی طرح بنا کر توے پر ڈال دی جاتی ہے اسے بلتی میں ''کِسر'' کہتے ہیں۔ یہ انڈے ملا کر بھی بنایا جاتا ہے اور چائے کے ساتھ کھایا جاتا ہے۔ اس کی کئی قسمیں ہیں۔

اذوق:

انڈے اور دودھ سے گندم کا آٹا گوندھ کر گیری کے تیل میں پکایا جاتا ہے جسے ''اذوق'' کہتے ہیں۔ اس کے پیڑے کو پہلے چپاتی کی طرح گول اور پھر دونوں کناروں کو لپیٹ کر چوکور شکل میں بنایا جاتا ہے۔ اذوق خصوصی طور پر عید کی محفلوں اور مجالس عزائے محرم کے دوران تبرکات کے طور پر بنایا جاتا ہے اور یہ نمکین چائے کے ساتھ کھانے والی سب سے اچھی چیز ہے۔ گویا یہ چیز بلتستان کی محافل میں دسترخوان کی زینت ہے۔

پُھر پُھر:

یہ چاول کے نعم البدل ہے جو مقامی طور پر آٹا گوندھ کر سوئیاں کے مترادف تیار کیا جاتا ہے۔ دھوپ میں سکھانے کے بعد چاول کی طرح پانی میں پکا کر سالن کے ساتھ کھایا جاتا ہے۔ یہ کھانا خاص مہمانوں کی خاطر تواضع کے لئے ہوتا ہے۔ گویا یہ بھی درباری کھانا ہے۔

کھُوربا:

گندم کے آٹے سے بنائی جانے والی روٹی جس کی قطر تقریباً دو فٹ اور اونچائی ڈیڑھ انچ ہوتی ہے۔ یہ عام گھرانوں میں پکنے والی روٹی ہے۔ کچھ عرصہ قبل شادی کی تقریبات میں ''مارزان'' کے بعد ذائقہ بدلنے کے لئے ''کھوربا'' باریک توڑنے کے بعد شوربے میں بھگو کر لایا جاتا تھا۔ گویا یہ بھی مجلسی اور درباری کھانوں میں شامل ہے۔ عام طور پر یہ روٹی نمکین چائے کے ساتھ بھی کھائی جاتی ہے۔

چاپھے:

جو کے دانوں کو پانی میں پکا کر پھر اسے بھونا جاتا ہے اور پسوانے کے بعد یہ ''چاپھے'' یعنی ستو کہلاتا ہے۔ یہ آٹا نمکین چائے اور لسی کے ساتھ کھایا جاتا ہے جسے ''کولق'' کہتے ہیں۔ اس کو باقاعدہ کھانوں میں شمار نہیں کیا جاتا۔ اس کے علاوہ خشک خوبانی کے رس میں کنگنی کا آٹا ڈال کر لوگ ''کولق'' کی شکل میں کھاتے ہیں۔ یہ دونوں چیزیں درباری کھانے نہیں۔

بلے:

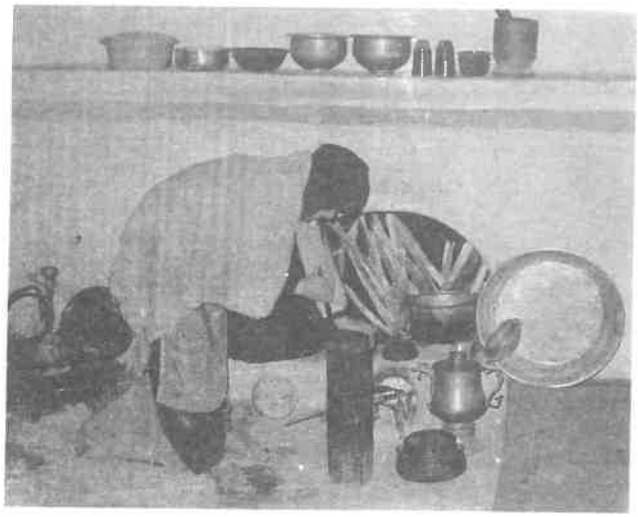
اس کی کئی قسمیں ہیں۔ گندم کے دانوں کو کھرل میں کوٹ کر گوشت یا سری پائے کے ساتھ پکایا جاتا ہے جسے ''چوبلے'' کہتے ہیں۔ آٹے کو گوندھ کر چھوٹے چھوٹے دانوں کی شکل میں پانی میں پکا کر کھایا جاتا ہے جسے ''پھر پھری بلے'' کہتے ہیں۔ اسی طرح میٹھے آٹے سے ''بلے'' بنایا جاتا ہے اس کا ذکر پہلے کیا جاچکا ہے۔ یہ عام طور پر تفریح طبع اور سردیوں کی لمبی راتوں کو کاٹنے کے لئے بنائے جاتے ہیں۔ ویسے بھی یہ درباری کھانے میں شمار نہیں۔

پھوروس:

لسی کو آنچ پر رکھ کر گرم کر لیتے ہیں جس سے پانی الگ ہوجاتا ہے اور سفید مادہ بچ جاتا ہے۔ اس کو کسی کپڑے کے تھیلے میں ڈال کر ٹانگ لیتے ہیں۔ پانی رس رس کر نکلتا ہے اور تھیلے میں جو مواد بچتا ہے اسے ''پھوروس'' یا ''لاگو'' کہتے ہیں۔ اگر لسی کے بدلے دہی کو اسی عمل کے مطابق بنایا جائے تو وہ ''چکہ'' کہلاتا ہے۔ یہ دونوں چیزیں گرمیوں کے موسم میں سالن کے طور پر استعمال کی جاتی ہیں۔

نمکین چائے:

اہل بلتستان کی خوراک میں ''نمکین چائے'' گزشتہ ایک صدی سے نہایت اہم اور لازمی جزو تصور کی جاتی رہی ہے۔ یہ دنیا میں ''تبتی چائے'' سے پہچانی جاتی ہے۔ اس میں سبز چائے کی پتی، سوڈا، دودھ، نمک اور تازہ مکھن استعمال کیئے جاتے ہیں۔ بلتستان کے لوگوں کو اس چائے سے اتنا عشق ہے کہ انہیں اسے دن میں ایک بار پیئے بغیر چین نہیں آتا۔ اسے باقاعدہ سالن کے طور پر استعمال کی جاتی ہے۔ شادی بیاہ اور دیگر تقریبات کی محفلوں میں کھانے کے بعد نمکین چائے سے خاطر تواضع کرنے کا رواج عام ہے۔ لوگ یہ چائے بیک وقت چار چار، پانچ پانچ کپ بھی پی لیتے ہیں اور کبھی اس سے بھی زیادہ۔ گویا نمکین چائے کو بلتستان کا قومی مشروب کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔



ایک بلتی خاتون نمکین چائے ''چارونگ'' میں بلو رہی ہے

خندہ:

توت کے رس سے ''خندہ'' تیار کیا جاتا ہے جو بہت زیادہ میٹھا اور لذیذ مشروب ہے۔ اسے پگھلے ہوئے گھی میں ڈال کر بھی کھایا جاتا ہے۔

مذکورہ بالا تمام چیزیں بلتستان کے مقامی لوک کھانے ہیں جبکہ پچھلے سو ڈیڑھ سو برسوں میں کشمیر اور بعد ازاں پاکستان کے دیگر شہروں کے ساتھ روابط کی وجہ سے کشمیری اور دیگر کھانوں کے اقسام بھی یہاں عام طور پر پکائے جاتے ہیں۔ آج سے چار پانچ سال قبل تک سکردو کے شہری علاقوں میں نوبت یہاں تک پہنچی تھی کہ شادیوں پر پندرہ سے لے کر بیس قسم کے سالن پیش کیئے جاتے تھے جو کشمیری روایت کا اثر تھا۔ شادیوں پر سویٹ ڈش کا رجحان بھی حد سے زیادہ بڑھ گیا ہے۔ اب کفایت شعاری سے کام لیتے ہوئے ان کھانوں اور سالن کی تعداد میں کمی شروع ہوگئی ہے تاہم بلتستان میں شادی بیاہ کی تقریبات پر کھانے پینے کے اخراجات اب بھی حد سے زیادہ تجاوز کرتے جارہے ہیں۔ محدود وسائل کے باوجود ہر شخص معاشرہ کے فرسودہ رسوم و قیود کے ہاتھوں ان کی بجا آوری پر مجبور ہے۔

کھانے پینے کے مجلسی آداب:

بلتستان کے مجلسی آداب بہت مشہور ہیں اور یہ منفرد آداب و شائستگی دوسروں کے لئے نمونہ عمل کے لائق ہیں۔ بلتستان کی روایات کے مطابق کھانے سے پہلے اور کھانے کے بعد مہمانوں کے ہاتھ دھونے کے لئے طشتری اور لوٹے یا آفتابے میں پانی لایا جاتا ہے۔ ایک شخص پانی ڈالتا ہے اور مہمان باری باری ہاتھ دھو لیتے ہیں۔ کھانا کھانے سے پہلے بسم اللہ پڑھتے ہیں اور جب تک میر محفل کھانے پر ہاتھ نہ ڈالے کوئی شخص لقمہ اٹھانے کی جسارت نہیں کرتا۔ یہاں تک کہ

مجلسوں میں چائے کی پیالی اٹھانے اور پہلے رکھنے میں میر محفل کا انتظار کیا جاتا ہے۔ بلتستان کی تقریبات میں عام طور پر کھانے تین افراد کے لئے ایک بڑی تھالی میں لائے جاتے ہیں جس کی بابت کہا جاتا ہے کہ مل کر ایک ہی تھالی میں کھانے سے باہمی محبت بڑھ جاتی ہے۔ کھانے کے اختتام پر تمام چھوٹے بڑے گھر کے مالک سے مخاطب ہوکر اسے ''برکت'' یا ''خانہ آباد'' کے دعائیہ الفاظ سے نوازتے ہیں اور اس کے جواب میں میزبان معافی طلب کرتا ہے۔ بلتستان کے معاشرے میں پانی پینے کے بعد شہدائے کربلا بالخصوص حضرت امام حسینؑ کو لازمی طور پر یاد کرتے ہیں اور جس گھر میں بھی دعوت ہو کھانے کے بعد اس گھر کی ارواح گذشتہ کے نام ایصال ثواب کے لئے فاتحہ پڑھا جاتا ہے۔

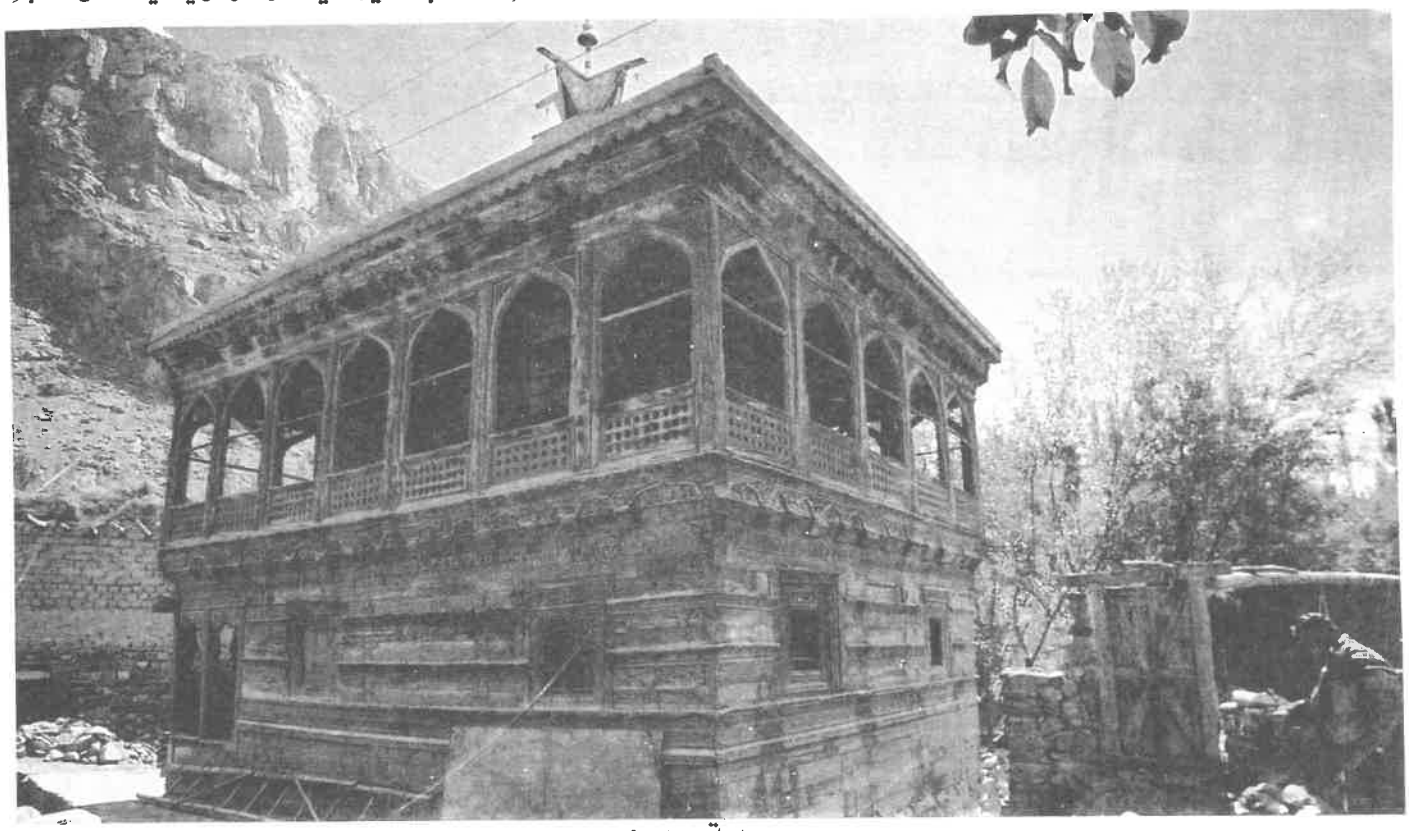
روایتی تعمیر و آرائش اور رہن سہن

لوگوں کا رہن سہن:

بلتستان کے معاشرے میں دادا، باپ، تایا، چچا، بیٹے، بیٹیاں، ساس، بہو، نندیں اور بھاوجیں سبھی مشترکہ طور پر ایک ہی مکان میں رہائش پذیر ہوتے ہیں۔ تمام افراد خانہ اپنی بساط کے مطابق کام کرتے اور آمدنی خاندان کے سربراہ کے حوالے کر دیتے ہیں جو اس کو حسب ضرورت گھر میں خرچ کر دیتا ہے۔ البتہ عام طور پر والدین کی وفات کے بعد بھائی اپنی بیویوں کی کشیدگیوں کے باعث ایک دوسرے سے الگ ہونے پر مجبور ہو جاتے ہیں اور جب علیحدہ گھر بسانے کا وقت آتا ہے تو باپ کی جائیداد ان میں برابر تقسیم ہو جاتی ہے۔ برابر تقسیم کرنے کے بعد پہلا انتخاب بڑے بھائی کو حاصل ہوتا ہے۔ والدین کی حیات میں بیٹوں کا علیحدہ مکانوں میں رہنے کی مثال بلتی معاشرے میں بہت کم ملتی ہے۔ اگر شاذ و نادر ایسا واقعہ پیش آ جائے تو والدین کے لئے معقول خرچہ مختص کیا جاتا ہے جسے ''خسوس'' کہتے ہیں۔ بہوئیں الگ مرغیاں پال رکھتی ہیں اور ہنگامی ضروریات کی چیزیں مثلاً خشک خوبانی، خستہ گیری، کھانے کا تیل اور ستو وغیرہ کسی صندوق میں محفوظ رکھتی ہیں جسے ''ٹیانگ کھنگ'' یا ''نٹا کھوڑو'' کہتے ہیں۔ آزادی سے قبل مشترکہ خاندان بسانے کا رواج بہت زیادہ تھا کیونکہ ڈوگرہ دور میں بیگار کا بوجھ فی گھرانہ کے حساب سے اٹھانا پڑتا تھا۔ مشترکہ رہنے سے روزینہ، بیگار، زگل ریس (باربرداری کی باری)، نوریس اور بہ ریس (مویشیاں چرانے کی باری) اور ہرکونگ ریس (کوہل صاف کرنے کی باری) جیسے مشکلات سے ایک ہی باری پر چھٹکارا مل جاتا۔ اس غرض سے دو تین پشتوں تک ایک ہی گھرانے میں مشترکہ طور پر رہتے تھے۔ اب ایسا نہیں ہے۔ بلکہ والدین کی حیات میں بھی بیٹے الگ رہنے کی روایت زور پکڑتی جا رہی ہے۔

طرز تعمیر عمومی:

بلتستان کے مکانات عام طور پر شدید موسمی حالات کے پیش نظر کچی اینٹوں سے دو منزلہ بنائے جاتے ہیں۔ یہ اینٹیں چکنی مٹی یا دریا کے لیس دار کیچڑ



روایتی طرز تعمیر کا ایک نمونہ

میں ریت کی آمیزش سے بنی ہوئی اور دھوپ میں سکھائی ہوتی ہیں۔ قدیم عمارتوں کی بلندی چھ فٹ سے زیادہ نہیں ہوتی تھی اور ان میں چھوٹے سے دروازے ہوا کرتے تھے۔ بلتستان میں عمارتوں کی بنیاد رکھتے وقت قبلہ کا خاص خیال رکھا جاتا ہے اور مکان کے طول وعرض کے بارے میں بھی نجوم کی کتابوں سے ہدایات اخذ کیئے جاتے ہیں۔ سنگ بنیاد رکھنے، بیم چڑھانے اور چھت لگانے کے لئے عام طور پر اتوار کا دن مقرر ہوتا ہے۔ البتہ قمری تاریخ کا بھی خیال رکھا جاتا ہے کہیں اس دن نحس ساعت یا قمر در عقرب تو نہیں۔

بلتستان میں عمومی طور پر قدیم مکانات کی پہلی منزل چھ سات کمروں یعنی کہ ژہ، پہ ٹھل، را یا تقرہ، چھولود، ہرتہ کھنگ، پھونگ کھنگ اور شغرہ وغیرہ پر مشتمل ہوتے ہیں اور عموماً ان دو منزلہ رہائشی مکانات کی آدھی بلندی زمین دوز ہوتی ہے۔ با اثر اور صاحب ثروت لوگوں کے گھر کے اندر صحن کے چاروں طرف رہائشی کمرے اور درمیان میں دالان ہوتے ہیں البتہ دیواریں سب کی کچی ہوتی ہیں۔ سردیوں میں لوگ اپنی رہائش نچلی منزل کے ''کہ ژہ'' میں رکھتے تھے جسے ''کہ ژہ ببفا'' کہتے ہیں۔ اس موقع پر قریبی رشتہ داروں کو دعوت دی جاتی تھی۔ نیز بہار کے آغاز میں دوسری منزل میں منتقل ہوتے تھے جو ''بلٹیا بیونگما'' کہلاتا ہے اور اس موقع پر بھی خصوصی ضیافت کا اہتمام کیا جاتا تھا۔ اب یہ رواج تقریباً ختم ہو چکے ہیں۔ بلکہ لوگ صرف ایک منزلہ مکان بنانے کو ترجیح دیتے ہیں۔

نچلی منزل کا ''کہ ژہ'' ہو یا دوسری منزل کی ''بلٹی'' کمرے کے وسط میں تین برابر کے پتھروں ''زگید پو'' کو حلقہ بنا کر چولہا جلایا جاتا اور دھواں نکلنے کی غرض سے آتش دان کی سیدھ میں چھت کے اوپر گول یا چوکور روشن دان رکھا جاتا تھا۔ سردیوں میں اسی چولہے کے ارد گرد حلقہ بگوش ہو کر تاپتے۔ اب یہ طریقہ رفتہ رفتہ بدل گیا ہے اور آج کل کمرے کے کسی کونے میں چمنی ''اوچاق'' بنائی جاتی ہے اور گرمائش کے لئے بخاری (گول آہنی آتش دان) جلائی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ ترقی یافتہ علاقوں میں تیل اور گیس کے چولہے بھی استعمال ہونے لگے ہیں۔ مکان کی دوسری منزل میں ''دوک کھانگ'' (بیٹھک) رافسل (مہمان خانہ) ژھیلے (برآمدہ نما گرمائی بیٹھک)، بزود (اسٹور)، کھوڑو (حجرہ) وغیرہ کے نام سے کمرے بنائے جاتے ہیں اور آج کل ساتھ ہی غسل خانہ بنایا جاتا ہے۔ قدیم گھروں میں غسل خانہ بنانے کا رواج نہ تھا۔ بلکہ غسل کرنے کے لئے دیہاتوں کے مختلف مقامات پر مخصوص آبشار بنائے ہوئے ہوتے تھے جن کے گرد پردے کی خاطر دیواریں بنی ہوتی تھیں۔ گویا بلتستان میں یہ مکانات اس طرح بنائے جاتے ہیں کہ رہنے والے موسم سرما میں سردی سے محفوظ رہ سکیں۔ یہاں کے ہر گھر میں ایک بڑا کمرہ ''رافسل'' یا ''دیوان خانہ'' کے نام سے خصوصی طور پر بنایا جاتا ہے جو مخصوص ایام میں عید کی محافل اور مجلس عزا منعقد کرنے اور دیگر خوشی وغم کے موقعوں پر اجتماعات کے لئے ہوتا ہے۔

بلتستان کے مقامی طرز کے بیت الخلا پورے ملک میں ایک منفرد انداز کے حامل ہیں جو قدیم طرز کے ہوتے ہیں۔ یہ ایک قسم کی دو منزلہ عمارت ہوتا ہے جس کی پہلی منزل کی چھت میں کئی سوراخ رکھے جاتے ہیں اور خشک مٹی وغیرہ کا اہتمام کیا جاتا ہے تاکہ بدبو نہ پھیلے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ طریقہ چین کے شہر کاشغر، لداخ، نوبراہ اور تبت میں بھی مروج ہیں۔ اب بلتستان کے شہری علاقوں میں جدید فلش سسٹم کا رواج شروع ہوا ہے۔

بلتستان کے اکثر قدیم مکانات ایک دوسرے کے پاس بنائے جاتے تھے جن کا منظر دور دراز وادیوں میں اب تک دیکھا جا سکتا ہے۔ اس بارے میں کہا جاتا ہے کہ عہد رفتہ میں یہاں کے مرد عام طور پر جنگ وجدل کے سلسلے میں گھر سے باہر رہتے تھے اور صرف عورتیں، بوڑھے اور بچے گھروں میں ہوتے تھے۔ اس لئے محلے کے تمام مکانات قریب قریب ہونے سے ایک دوسرے کی تکلیفات سے فوری طور آگاہ ہو جاتے۔ اس کے علاوہ اجتماعی دفاعی نقطہ نگاہ سے اس قسم کے گاؤں سے محلے قلعے کی طرح مضبوط و مستحکم ثابت ہوتے تھے۔ اب یہاں کے شہری علاقوں میں جستہ جستہ جدید طرز کے تعمیرات کا کام زور وشور سے جاری ہے۔ پاکستان بننے سے قبل یہاں سیمنٹ کے استعمال کا تصور ہی نہ تھا۔ اب سرکاری عمارتوں کے علاوہ نجی تعمیرات میں بھی سیمنٹ کا استعمال شروع ہوا ہے۔

بلتستان کے دیہاتی مکانوں کی چھت کثیر المقاصد استعمال میں لائی جاتی ہیں۔ جیسا کہ گھاس پھوس، لکڑی اور گوبر وغیرہ انہی چھتوں پر رکھے جاتے ہیں جو سردیوں کے موسم میں مویشیوں کو کھلانے اور جلانے کے کام آتے ہیں۔ اس کے علاوہ خوبانی، توت اور دیگر پھل وسبزیاں بھی مکانوں کی چھتوں پر سکھائی جاتی ہیں۔

طرز تعمیر خصوصی:

بلتستان میں راجاؤں کے قلعے اور محل عام طور پر سہ منزلہ ہوتے تھے جن میں بالکونی ضرور ہوتی ہے۔ ان کی دیواریں عام طور پر لکڑی کی چوکھٹوں سے بنائی جاتی جسے مقامی اصطلاح میں ''ٹھٹھر'' کہتے ہیں۔ نیز لکڑی پر مختلف ڈیزائنوں میں کندہ کاری کے ذریعے منقش ستون، الماریاں، دروازے، کھڑکیاں، ختم بام، پنجرے اور جافری وغیرہ بنائے جاتے ہیں۔ علاوہ ازیں مسجدوں، امام بارگاہوں، خانقاہوں اور مزاروں کو بھی ایسے ہی نقش ونگار سے سجایا جاتا ہے۔ یہ عمارتیں مغل، ایرانی اور کشمیری طرز تعمیر کی آمیزش ہیں۔ بلتستان کو ترقی یافتہ فن تعمیر کا یہ ورثہ چودھویں صدی عیسوی میں ایرانی مبلغین کے ذریعے اشاعت اسلام کے ساتھ ہی ملا۔ اس



روایتی بلتی گھر کا باورچی خانہ

کے علاوہ بلتستان کے نامور حکمران علی شیر خان انچن (1580ء تا 1624ء) کی بیٹی کی شادی مغلیہ خاندان کے تاجدار سلیم جہانگیر کے ساتھ ہوئی۔ یوں مغل شہنشاہوں کے ساتھ بھی ان کے تعلقات پیدا ہوئے۔ اس کے علاوہ ایک مقامی روایت یہ بھی ہے کہ ایک مغل شہزادی گل خاتون کی شادی سکردو کے راجہ علی شیر خان انچن سے ہوئی تو گل خاتون نے دہلی سے اپنے ساتھ بہت سے اہل حرفہ اور معمار بلتستان لائے جس سے یہاں مغل طرز تعمیر کی گہری چھاپ لگ گئی۔ ان تعمیرات کے قدیم ترین نمونوں میں قلعہ کھرپوچو کے علاوہ بلتستان بھر کے راجاؤں کے قدیم قلعے، مسجد چقچن، خانقاہ خپلو، خانقاہ تھغس، خانقاہ کریس، مقبرہ میر مختار کریس، مقبرہ میر عارف تھغس، مسجد امبوڑک شگر، مسجد چھ برونجی شغر، خانقاہ غاسنگ و منٹھو کھہ اور مسجد مونو پی تھا یور قابل ذکر ہیں۔ ان کے علاوہ بلتستان میں سینکڑوں امام بارگاہیں اور خانقاہیں ایسی موجود ہیں جن میں لگے ہوئے پنجرے، ختم بام، جافری، چوب کاری، ممبر اور محرابیں نفیس فن دستکاری اور فنون لطیفہ کے شاہکار نمونے ہیں۔ بلتی کاریگروں کی بنای ہوئی عمارتیں شکر چکتن، لداخ اور لہاسہ کے علاوہ نگر اور ہنزہ میں بھی موجود ہیں۔ جن میں ہنزہ التت اور بلتت کے مقام پر موجود قدیم قلعے تاریخی اہمیت حاصل کر چکے ہیں۔ بلتستان کی ان عمارتوں پر ایرانی، مغلی اور کشمیری طرز تعمیر کے گہرے نقوش نمایاں ہیں۔ امام بارگاہوں کے اردگرد مستورات کے لئے غلام گردش بنی ہوئی ہوتی ہیں جن میں پردے کی غرض سے لکڑی کی مخصوص جالیاں یعنی چوبی پنجرے اور جافریاں لگی ہوئی ہیں۔ ان چوبی جالیوں کی بہت سی اقسام درج ذیل ہیں۔ دوازدہ سر، چہار سر، شش سر، ہفت سر، ہشت سر، شش دہ سر، شست رومی، جان شیرین، موج حیدر، موج حسین، موج اصغر، موج بست و یاک، کندور، کاغذ گھر، آبشار (کئی قسام) ثین زیل اور عنکبوت ہیں۔ انہی ناموں سے ختم بام بھی بنائے جاتے ہیں البتہ طرز فن الگ ہیں۔ بلتستان کی تعمیرات کا فن ختم بام میں یونگ درونگ اور طومار چہ بہت مشہور ہیں۔ بعض محققین کا دعویٰ ہے کہ یونگ درونگ بلتستان کا قومی نشان ہے جسے امن وسلامتی کی علامت سمجھی جاتی ہے۔ بلتستان کی عمارتوں کی کھڑکیوں اور دروازوں کے چوکھٹوں پر عام طور پر یہی نقش کندہ ہوتے ہیں۔

قدیم بلتستان میں تالے اور چابیاں لکڑی کے بنائے جاتے تھے جو دیواروں میں نصب ہوتے تھے۔ بعض عمارتوں میں بلّیوں کی چٹخنیوں کا رواج تھا جو ''غدوُنگ'' کہلاتی تھی۔ ایسی چٹخنیاں عام طور پر قدیم قلعوں اور شاہی محلات میں استعمال ہوتی تھی۔

قلعہ کھرپوچھے:

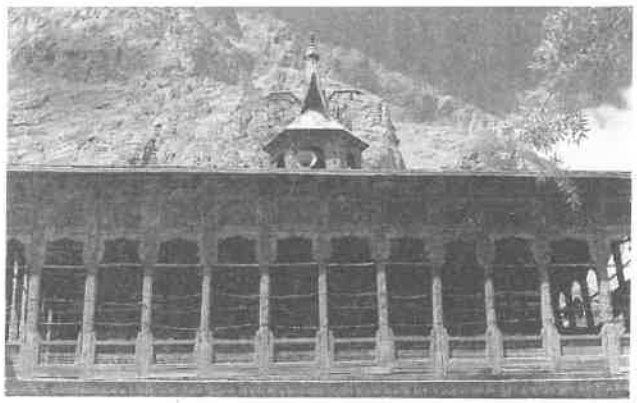
سکردو کا یہ عظیم قلعہ ''کھرپوچھے'' ایک پہاڑی کی عمودی چٹان پر اپنے

سینے میں سینکڑوں تاریخی وتہذیبی داستانیں چھپائے خاموش کھڑا ہے۔ یہ عمارت بلتستان کی تابناک ماضی کی عظمت وسطوت کی امین ہے جو مقپون بوخا (1490ء تا 1515ء) کے دور میں تعمیر ہوئی اور علی شیر خان انچن نے اسے مزید وسعت دی۔ یہ قلعہ 1840ء میں ڈوگروں کے ہاتھوں سقوط بلتستان تک کم وبیش ساڑھے تین سو سال مقپون حکمرانوں کا دارالحکومت رہا۔ یہ اس قدر مستحکم تھا کہ توڑے دار اور ٹوپی دار بندوق کے زمانے میں اس کا زیر کرنا ممکن نہ تھا۔ اس لئے یہ ناقابل تسخیر خیال کیا جاتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ڈوگروں نے اسے فوجی چھاؤنی کے طور پر استعمال کیا۔ پاکستان بننے کے کچھ عرصہ بعد سے یہ قلعہ اپنی کہنگی اور عدم توجہی کا ماتم کرتے ہوئے ویران پڑا ہے۔ قلعہ کھرپوچھے کی پرسکوت دیواریں صرف پتھر، گارے اور لیپ سے ہی مرتب نہیں بلکہ ان میں وطن کے سینکڑوں سرفروشوں کے خون کی آمیزش اور مقپون حکمرانوں کی ہیبت وجلالت کی تاریخ بھی رقم ہے۔ اس عمارت نے اہل بلتستان کی مسرت وشادمانی کے نغمات بھی سنے ہیں اور پراسرار سازشوں کی مدھم مدھم سرگوشیاں بھی۔ اس تاریخی قلعے نے تاجداروں کے اقتدار کا سورج ابھرتے ہوئے بھی دیکھا اور ڈوبتے ہوئے بھی۔ گویا قلعہ کھرپوچھے بلتستان کی تاریخ وتہذیب کا ایک اہم باب ہے۔ اس عمارت کا ہر پتھر اور ہر ذرہ ہمیں اس لئے محترم ہے کہ ہمارے آباءواجداد کا تہذیبی یادگار اور قومی ورثہ ہے۔

مسجد چقچن:

جامع مسجد چقچن امیر کبیر سید علی ہمدانی کے عظیم روحانی انقلاب کی یادگار ہے جو بلتستان کے ضلع گنگ چھے کے صدر مقام خپلو میں واقع ہے۔ یہ مسجد خانقاہ معلیٰ سرینگر کی طرز پر بنائی گئی ہے جس میں کچیکاری اور پچیکاری کے اعلیٰ نمونے پائے جاتے ہیں۔ مسجد کے مختلف حصوں میں بنے ہوئے بیل بوٹے اور نقش ونگار جن کی وضع کہیں خوبصورت پرندوں کی شکل میں، کہیں گل لالہ اور سوسن کی اشکال کے ہیں۔ کہیں جیومیٹری کی مدد سے دائرے بنے ہوئے ہیں تو کہیں زنجیر سے زنجیر ملاتے ہوئے کبوتروں کی قطاریں ہیں۔ یہ نقش ونگار ایک طرف قدرت کی رنگینیوں کا اظہار ہے تو دوسری طرف انسانوں کو اتفاق واتحاد کی دعوت بھی دیتی ہے۔ اس میں جہاں موج دریا ہفت سر اور ہشت سر کے نقوش نمایاں ہیں وہاں قدیم سواستیکا نشان کلاک وائز اور اینٹی کلاک وائز دونوں صورتوں میں پائے جاتے ہیں۔ جسے بلتی زبان میں ''یونگ درونگ'' کہتے ہیں۔ چھت میں جو خوبصورت ختم بام نصب ہے اس کی وضع قطع آج کے ماہرین آرکیٹیکچر کے لئے کھلا چیلنج ہے۔

بتایا جاتا ہے کہ 1362ء سے قبل اس مسجد کی جگہ بدھ مت کا گومپہ موجود تھا۔ حضرت شاہ ہمدان کی تبلیغ بلیغ سے متاثر ہوکر جب یہاں کی پوری آبادی مسلمان ہوئی تو یہاں مسجد تعمیر کی گئی۔ آج یہ عمارت نہ صرف ایک اہم تاریخی آثار ہے بلکہ اس سے بلتستان کے لوگوں کی دینی عقیدت بھی وابستہ ہے۔ یہ پاکستان کی اہم قومی عمارتوں میں بھی شامل ہے۔



آثار شاہ ہمدان خپلو ''خانقاہ چقچن''

چوپال (ہلچنگرہ):

بلتستان کے ہر گاؤں میں مرکزی مقام پر چوپال بنے ہوتے ہیں جسے ''ہلچنگرہ'' کہتے ہیں۔ چوپال کے اردگرد چنار کے بڑے بڑے درخت ہوتے اور چنار کے ان درختوں کی گھنی چھاؤں میں محلے کے سب لوگ جمع ہو جاتے ہیں، باہم مشورے کرتے اور اپنے اپنے گاؤں سے متعلق سماجی ومعاشرتی مسائل کے حل کے لئے فیصلے کرتے ہیں۔ یہاں باہمی نزاع کے فیصلے بھی ہوتے ہیں اور گاؤں کے سماجی انتظامات کے سلسلے میں لائحہ عمل وضع کرتے ہیں۔ ماضی میں بلتستان کے گاؤں کے عام لوگ اپنے فارغ اوقات میں چوپال پر گپیں ہانکتے اور حالات حاضرہ پر تبصرے کرتے تھے۔ پولو کھیل سے پہلے اور بعد میں سب اسی جگہ جمع ہو جاتے اور خصوصی راگ وحریب بجائی جاتی تھی۔ بلتستان میں راجاؤں کے محل کے سامنے جو چوپال ہوتے تھے ان کی رونقیں مرجھائے ہوئے دلوں کو پھر سے تازگی بخشتی تھیں۔ وہاں ہر وقت موسیقی کی صدائیں گونجتی رہتی تھیں۔ ان کے علاوہ بلتستان میں جس چوپال نے تاریخی اہمیت حاصل کر لی وہ سکردو کا ''غوڑی ہلچنگرہ'' ہے۔ کئی بلتی لوک گیتوں میں اس چوپال کا ذکر موجود ہے۔ اب کچھ عرصے سے چوپالوں کی نشست وبرخاست بھی محض قصہ پارینہ ہوکر رہ گئی ہے۔

جھیل اور تالاب:

بلتستان میں آبپاشی کے لئے پانی کی قلت کے پیش نظر بہت سی جھیلیں اور تقریباً ہر گاؤں میں تالاب یعنی ''رزینگ'' بنے ہوتے ہیں جن میں لوگ پانی جمع کرتے اور پھر آبپاشی کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ تالاب میں پانی جمع کرنے اور اس کی باری کے سلسلے میں مختلف دیہاتوں میں مختلف نظام رائج ہیں۔ جھیلوں

میں سد پارہ جھیل سب سے اہم ہے جس سے سکردو کا بیشتر رقبہ سیراب ہوتا ہے۔

باغات:

تواریخ سے پتہ چلتا ہے کہ قدیم بلتستان میں باغبانی کا رواج صرف راجاؤں کی ملکیت تک محدود تھا اور سکردو میں مقپون راجاؤں کے چھ ایسے باغ مشہور تھے جو تاریخی حیثیت حاصل کر چکے تھے۔ ان باغوں کے نام رگیا ژھر، غورو ژھر، نانگمہ ژھر، مقپون ژھر، ہلال باغ اور چہار باغ تھے۔ اب گذشتہ نصف صدی سے عوامی اور سرکاری دونوں سطح پر باغبانی کے تجربے شروع ہوئے ہیں اور بلتستان میں سیب اور بادام کے باغ اب بہت سودمند ثابت ہو رہے ہیں۔

عوامی پیشے اور دستکاریاں

جغرافیائی لحاظ سے دنیا سے منقطع اور تعلیمی اعتبار سے پسماندہ ہونے کے باوجود بلتستان میں صدیوں کے دوران محدود پیمانے پر جن فنون دستکاری اور عوامی پیشوں نے فروغ پایا تھا اب وقت کے رفتار کے ساتھ ساتھ ان پر بھی زمانے کی گرد جم رہی ہے۔ اگرچہ یہ سائنسی اور تیکنیکی دور ہے اور بلتستان میں کسی بھی شعبے کے حوالے سے خام مال کی کوئی کمی نہیں لیکن یہاں وسیع پیمانے پر اب تک کوئی کارخانہ کا قیام عمل میں نہیں آیا ہے سردیوں میں موسم کی شدت کے باعث اکثر علاقوں میں زمین سے ایک فصل سے زیادہ حاصل نہیں کی جاسکتی جبکہ دیگر کاروبار زندگی بھی تقریباً جام ہو کر رہ جاتی ہے۔ تاہم یہ بڑی خوش آئند بات ہے کہ لوگوں میں تعلیم کا رجحان روز بروز بڑھ رہا ہے۔ آج کل بلتستان نئے نئے تجربات کے ساتھ جدید فنون کے آزمائشی دور سے گزر رہا ہے اور زندگی کے دوڑ میں ہر شخص کو چیلینج کا سامنا ہے۔ اکثر خاندان اپنے موروثی پیشوں کو چھوڑ کر تن آسانی اور دیگر شعبوں کی تلاش میں سرگرداں ہیں۔ ورنہ بلتستان کے لوگ صدیوں پرانے اپنے خاندانی پیشوں اور کاروبار زندگی کو بغیر کسی ردوبدل کے اپنانے کے پابند تھے اور مقولہ بھی مشہور تھا ''اتی چورنگ بولا'' (ترجمہ) باپ کا کلٹہ (ٹوکرا) بیٹے کیلئے۔ یعنی بیٹا وہی کام کرے گا جو اس کا باپ کرتا رہا ہے۔ آج کل ایسا نہیں ہے۔ ماضی میں بلتستان کے اندر جو عوامی پیشے اور دستکاریاں مروج تھیں ان کا تذکرہ ذیل میں کیا جاتا ہے۔

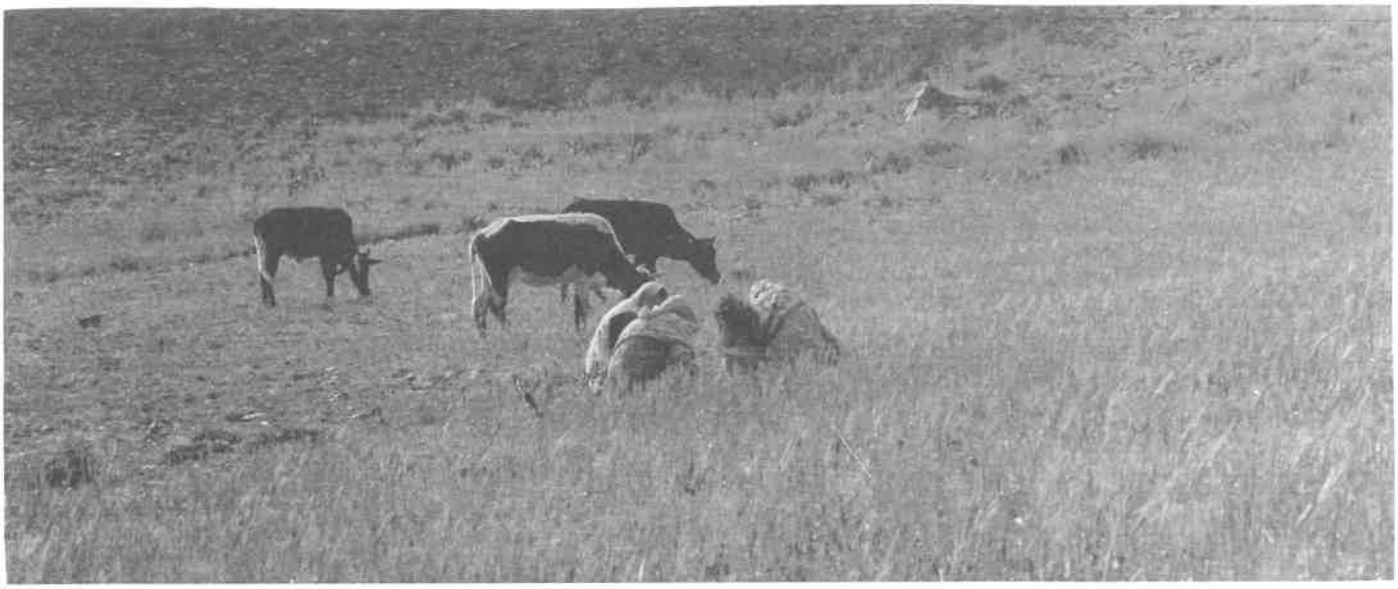
کاشتکار (سہ گیدپا):

اگرچہ پہاڑی علاقہ ہونے کی وجہ سے اچھی اور زرخیز زمین کی یہاں کمی ہے اس کے باوجود بلتستان ایک زرعی علاقہ کہلاتا ہے اور یہاں کی کم وبیش پچانوے فیصد آبادی کا انحصار کاشتکاری پر ہے۔ گویا زمین کو بلتستان کی معیشت کا بنیادی ذریعہ سمجھا جاتا ہے۔ اسی لئے بزرگوں کا بلتی میں مقولہ ہے ''بو بنا سا ہرتین'' (ترجمہ) گر جائے تو زمین کا سہارا لو یعنی معاشی اونچ نیچ ہو جائے تو زمین ہی کا سہارا حاصل کرو۔ یہاں ہر ایک کنبے کے پاس چاہے وہ کتنا ہی غریب کیوں نہ ہو کاشت کے لئے تھوڑی سی زمین کے علاوہ خوبانی، توت، بید، بیر اور سفیدے کے چند درخت ضرور ہوتے ہیں جو ان کی معاش کے بنیادی ذرائع ہیں۔ زراعت پیشہ لوگوں کو اس علاقے میں انتہائی محنت کرنی پڑتی ہے جبکہ اس محنت شاقہ کے مقابلے میں فصلوں کی آمدن بہت کم ہوتی ہے۔ بلتستان کے لوگ سالہا سال سے اپنے چھوٹے چھوٹے کھیتوں میں قدیم طریقے سے کاشتکاری کرتے چلے آرہے ہیں۔ تاہنوز تجارتی نقطہ نگاہ سے زراعت کے شعبے میں کام نہیں ہوا ہے۔ البتہ اب آغا خان دیہی ترقیاتی پروگرام کی کوششوں کی بدولت آلو اور خوبانی کی وجہ سے لوگوں میں تجارتی مقاصد کے لئے زراعت کرنے کا شعور بیدار ہو رہا ہے۔ بلتستان کے بعض پائنی علاقوں میں دو فصل کاشت ہو سکتی ہیں۔ کچھ عرصہ قبل ربیع کے بعد خریف کی کاشت لازمی تصور کیا جاتا تھا۔ اس ضمن میں بلتی زبان میں ایک مقولہ مشہور تھا ''اتی روسکیورے شول توب'' (ترجمہ) باپ کی لاش چھوڑ کر خریف کی فصل کاشت کر۔ گویا اس حد تک فصل خریف کی کاشت کی اہمیت تھی۔ اب اس اہمیت میں کمی آرہی ہے۔

گذشتہ وقتوں میں راجاؤں کی زمینیں ان کے مزارع کاشت کرتے تھے اور وہ لوگ جن کی زمین کم ہوتی وہ زیادہ زمین والوں کے کھیت ساجھے پر لیتے۔ کاشتکاری کے علاوہ پھلدار و غیر پھلدار درخت بھی لگائے جاتے جن سے ضروریات زندگی پوری کر لیتے۔ کھیتی باڑی کا کام زیادہ تر مردوں کی ذمہ داری ہے لیکن عورتیں بھی ان کے ہاتھ بٹاتی ہیں اور بلتستان کے بعض علاقوں میں مردوں سے زیادہ عورتیں یہ فرائض نبھاتی ہیں۔

گلہ بانی (لورزی پا):

زراعت کے علاوہ گلہ بانی بھی اہل بلتستان کا بنیادی پیشہ ہے۔ شروع میں اس پیشے کو مغرب کی طرف سے آنے والے ان شین قبائل نے اپنایا جو بلتستان کے بالائی علاقوں میں آباد ہوئے۔ رفتہ رفتہ یہ دونوں پیشے یعنی کاشتکاری اور گلہ بانی بلتستان کے ہر کس و ناکس کی زندگی کا لازمی جزو بن گیا۔ ہر گھر میں محدود پیمانے پر محض اپنی گھریلو ضروریات پوری کرنے کی حد تک مویشیاں پالی جاتی ہیں کیونکہ یہاں جنگل اور چراگاہوں کا بھی فقدان ہے۔ البتہ بالائی علاقوں میں گلہ بانی کا



بلند پہاڑوں پر چراگاہ

شعبہ نسبتاً زیادہ وسیع ہے۔ بلتستان میں گلہ بانی کا ایک مقصد تو زراعت کے لئے قدرتی کھاد تیار کرنا اور کشاورزی ہے۔ اس کے علاوہ دودھ اور گوشت کی خاطر بھی مویشیاں پالی جاتی ہیں۔

یاک بلتستان کا خاص جانور ہے جو دنیا میں علاقہ ہائے تبت اور چین کے علاوہ اور کہیں پایا نہیں جاتا۔ یاک بلتی زبان ''ہیاق'' کی بگڑی شکل ہے جس کا تبتی (بلتی) لفظ ہونے میں تمام مستند ڈکشنریاں گواہی دے رہی ہیں۔ بلتستان کے بعض علاقوں میں سدھائے ہوئے یاک اور اس کی ذیلی شاخ ''بزو'' سے بار برداری اور سواری کا کام بھی لیا جاتا ہے۔ یاک کی کئی نسلیں ہیں جو بزو، بزومو، تول، تولمو، گرگرمو اور ہلوق ہلوقمو کہلاتی ہیں۔ موخرالذکر شاخ انتہائی نازک صنف میں شمار ہوتی ہے جس کی پرورش بڑی مشکل سے ہی ہوسکتی ہے۔ ان کے علاوہ بھیڑ، بکری، گائے، مرغی اور کبوتر پالنے کا رجحان عام ہے۔ گذشتہ وقتوں میں بار برداری اور سواری کے لئے گدھے اور گھوڑے بھی پالے جاتے تھے۔ اب ان کی ضرورت نہ رہی۔

گڈریا بلتستان کے جوانوں میں ایک روایتی کردار ہے جو صبح طلوع آفتاب کے وقت بکریاں چراگاہوں میں لے جاتے ہوئے آواز دے دے کر لوگوں کو خبردار کرتا ہے۔ اس وقت گھر گھر سے بچے بچیاں اور نوجوان لڑکے لڑکیاں اپنی اپنی بکریوں کا گلہ ریوڑ میں شامل کرنے کے لئے لے جاتے ہیں۔ یہ گاؤں کا انتہائی دلکش منظر ہوتا ہے۔ بکریوں کا گلہ باہر نکالتے وقت بچے اپنے بزرگوں کی ہدایت کے مطابق روزانہ بکریوں سے مخاطب ہوکر یہ الفاظ کہتے ہیں ''نور گولامہ سونگ ھبوفوقتوک، نور جوک لامہ دوک ھلطانوفوقتوک، نور سکلا دوک ہے رینمو شونگ'' (ترجمہ) اے پیارے! ریوڑ کے سب سے آگے نہ جانا کہیں بھیڑیا نہ کھا جائے، سب سے پیچھے بھی نہ رہنا کہیں گڈریئے کی لاٹھی نہ پڑ جائے، بلکہ ریوڑ کے بیچ میں رہنا۔ اسی میں سلامتی ہے۔

بلتستان میں چراگاہوں پر ہر علاقے کے لوگ اپنے اپنے حدود میں حق تصرف رکھتے ہیں اور دوسرے علاقے کے افراد کو کسی اور علاقے کے چراگاہ میں مویشی چرانے کی اجازت نہیں ہوتی۔

بلتستان میں چرواہے یاک اور بزو کے سینگ سے بنایا ہوا بگل ''ٹوٹو'' اپنے ساتھ رکھتے ہیں۔ چراگاہ میں پہنچ کر وہ مختلف اوقات میں اس سینگ کے اندر پھونگ کر ''ٹوٹو'' بجاتا ہے جس کی آواز سے چراگاہ کی پوری فضا گونج اٹھتی ہے اور ٹوٹو کی آواز سے بھیڑیئے اور دیگر جنگلی درندے خوفزدہ ہوکر بھاگ جاتے ہیں۔ ریوڑ چراتے چراتے چراگاہ میں اگر کوئی بکری یا بھیڑ بچہ دے تو گڈریا اس بکری یا بھیڑ کے بچے کو چھڑی سے لمبائی میں ناپ کر اپنے ساتھ گاؤں لے آتا ہے۔ گڈریئے کو چونکہ اس دن معمول سے زیادہ زحمت اٹھانا پڑتی ہے اس لئے وہ مالک سے کھانے پینے کے کچھ تحائف طلب کرنے کا حقدار ہوتا ہے جو مالک اسے دے دیتا ہے۔ بسا اوقات نہ دینے سے گڈریا اس جانور کے بچے کے جسم کے برابر ناپ کی ہوئی چھڑی توڑ دیتا ہے۔ اس وقت دروغ بہ گردن راوی بکری یا بھیڑ کا بچہ مرجاتا ہے۔

بڑھئی (شنگ کھن):

عہد رفتہ کے دوران بلتستان میں مکانات کی تعمیر کے علاوہ گھریلو

ظروف' کاشتکاری کے اوزار اور کھڈیاں بنانا ''شنگ کھن'' یعنی بڑھئی کی اجتماعی ذمہ داری تھی۔ یہ کام صرف ایک خاندان یا ایک نسل کے افراد نے نہیں کیا بلکہ ہر نسل کے لوگوں میں اس کے کاریگر موجود تھے۔ البتہ بعض دفعہ یہ پیشہ موروثی بھی بن گیا اور اس پیشے سے تعلق رکھنے والے اکا دکا بلتستان کے ہر دیہات میں اور بعض دفعہ الگ بستی بنا کر بھی رہتے تھے جو ''شنگ کھونگ'' یعنی محلّہ بڑھائیاں کہلاتا تھا۔ ماضی میں یہاں کے ترکھانوں نے کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں۔ ''شنگ کھن چن دن اور شنگ کھن کوفہ'' نامی بڑھئی کے نام بلتی لوک داستانوں اور گیتوں میں اب بھی زندہ ہیں۔ بلتستان کے شنگ کھن ''لسکر'' کے فنکارانہ صلاحیتوں کی گواہی ہنزہ میں بلتت کا قلعہ سینکڑوں سال گزرنے کے بعد بھی دے رہا ہے۔ ان کے علاوہ اس پیشے کے سینکڑوں افراد نے ماضی میں اپنے فن کا شاندار طریقے سے مظاہرہ کیا۔ جب اس علاقہ کا تعلق مغل ہندوستان اور کشمیر سے پیدا ہوا تو ان علاقوں سے نامور ہنرمند یہاں آئے اور فن تعمیر کو بڑی ترقی ملی۔ بلتستان کے طول وعرض میں موجود قدیم مساجد' خانقاہیں اور راجاؤں کے قلعے فن وثقافت کے انمٹ نقوش کے طور پر آج بھی شاہد ہیں۔ ان عمارتوں میں لگے ہوئے پنجرے' ختم بام' جافری' چوب کاری' ممبر اور محرابیں انتہائی نفیس فنون لطیفہ کے شاہکار ہیں۔ بلتی کاریگروں کی بنائی ہوئی عمارتیں شکر چکتن' لداخ اور لہاسہ کے علاوہ نگر اور ہنزہ میں بھی ہیں جو فن تعمیر سے دلچسپی رکھنے والوں کی مرکز نگاہ بنی ہوئی ہیں۔ ان کارناموں کے باوجود بلتی زبان میں ایک مقولہ مشہور ہے۔ ''شنگ کھنی نانگنو پھوتو چھقپو'' (ترجمہ) بڑھئی کے گھر میں کٹورے ٹوٹے ہوئے ہوتے ہیں۔ یعنی یہ فنکار اپنے گھر کے کام کاج کے حوالے سے سست ہوتے ہیں۔

قیام پاکستان سے کچھ عرصہ قبل تک بلتستان میں لکڑی کے روایتی ظروف اور دیگر آلات مستعمل تھے، ان میں کٹورے (پھوتو)' چمچ (پھراغون)' آٹا گوندھنے کی پرات (ٹھالو)' ڈونگہ (رینگ سکور)' ٹوپہ (برے)' آٹے کا برتن (کچو)' ڈوئی (زربو)' چائے بلونے والا مکسر Mixer (چادونگ یا غُرغُر)' مقامی ترازو (سترانگ)' تالے (لمیک ژھنگ)' سہاگہ (براشنگ)' پنج انگلی (کھ ژے) اور لکڑی کا بیلچہ (شنگ لیب) وغیرہ سب کے سب یہاں کے مقامی بڑھیوں کے بنائے ہوئے ہوتے تھے۔

لوہار (گربہ):

یہاں یہ پیشہ موروثی اور سامان کشاورزی کی تیاری کی وجہ سے نہایت اہم سمجھا جاتا رہا ہے۔ شروع میں یہ پیشہ شمالی ہندوستان سے آئے ہوئے ''مون'' قبائل کے لوگوں نے اختیار کیا تھا۔ بلتستان کے ہر گاؤں میں لوہار خاندان آباد ہیں۔ شروع میں اس پیشے سے منسلک بعض لوگ الگ بستی بسا کر بھی رہنے لگے جو ''گربونگ'' یعنی محلّہ لوہاریاں کہلایا۔ ماضی قریب تک جن علاقوں میں لوہار نہ ہوتے تو دیگر علاقوں میں رہنے والے لوہاروں کی خدمات حاصل کی جاتی تھیں۔ بلتی زبان میں لوہار سے متعلق ایک ضرب المثل مشہور ہے ''گربہ لا ان میدنا ہلیخ لا پھنڈ پھونگ'' (ترجمہ) اگر لوہار طاقتور نہ ہو تو لوہے میں شکستگی آجائے۔ مقصد یہ ہے کہ لوہار کا طاقتور ہونا ضروری ہے۔

بلتستان کے یہ لوہار زرعی آلات اور گھریلو استعمال کی بنیادی اشیاء مثلاً کدال' درانتی' چاقو' چھرے' کلہاڑی اور تیشہ کے علاوہ قدیم طرز کی بندوق ''ٹوپی دار'' اور ''ماشہ دار'' تلوار اور دیگر آلات حرب مقامی طور پر بناتے تھے۔ لوہار کو بعد میں فصل اٹھانے پر معاوضہ کے طور پر محلے کی سطح پر مقررہ مقدار میں غلہ جمع کر کے دیا جاتا تھا۔ جسے مقامی اصطلاح میں ''ٹھالو'' کہتے تھے اور یہ ان کا ذریعہ معاش ہوتا تھا۔ معاوضہ دینے کا یہ طریقہ کار نہ صرف لوہار بلکہ دیگر پیشہ ور افراد مثلاً بڑھئی' موسیقار' موچی اور اخوند کے لئے بھی لاگو تھا۔ اب یہ سلسلہ متروک ہے اور ان آلات کو بازار سے خریدنے کا رواج عام ہو گیا ہے۔ بلتی سماج میں اس پیشہ کو حقیر سمجھا جاتا تھا۔

موچی (ہلنگ کھن):

یہ پیشہ بھی مون قبائل سے منسلک تھا جو عرصہ دراز تک موروثی رہا۔ اس پیشے سے تعلق رکھنے والے لوگ ماضی میں الگ بستی بسا کر بھی رہتے تھے جو ''ہلنگ کھونگ'' یعنی محلّہ موچیاں کہلاتا تھا۔ بلتستان میں اس پیشے کو حقیر سمجھا جانے لگا تو انہوں نے رفتہ رفتہ اپنا پیشہ ترک کر دیا۔ اب ان کا تشخص تقریباً مٹ چکا ہے اور اس وقت سکردو بازار میں کام کرنے والے موچیوں میں بلتستان کا مقامی کوئی بھی نظر نہیں آتا بلکہ سب کے سب پاکستان کے قیام کے بعد پنجاب اور صوبہ سرحد سے آئے



موچی کام کرتے ہوئے

ہوئے پیشہ ور لوگ ہیں۔ بلتستان کے روایتی موچی اونی پٹو اور کچے چمڑے سے جوتے بناتے تھے جنہیں ''پپو'' اور ''ہلم'' کہتے ہیں۔ اس کے علاوہ لکڑی کے کھڑاؤں ''کنگ شنگ'' اور گھاس کی چپلی ''پلا'' بھی بنائی جاتی تھی۔ جوتوں کے علاوہ یہ پیشہ ور لوگ گھوڑے کے سامان یعنی زین، لگام اور چابک وغیرہ بھی بنا دیتے تھے۔

نائی (ٹھاکر):

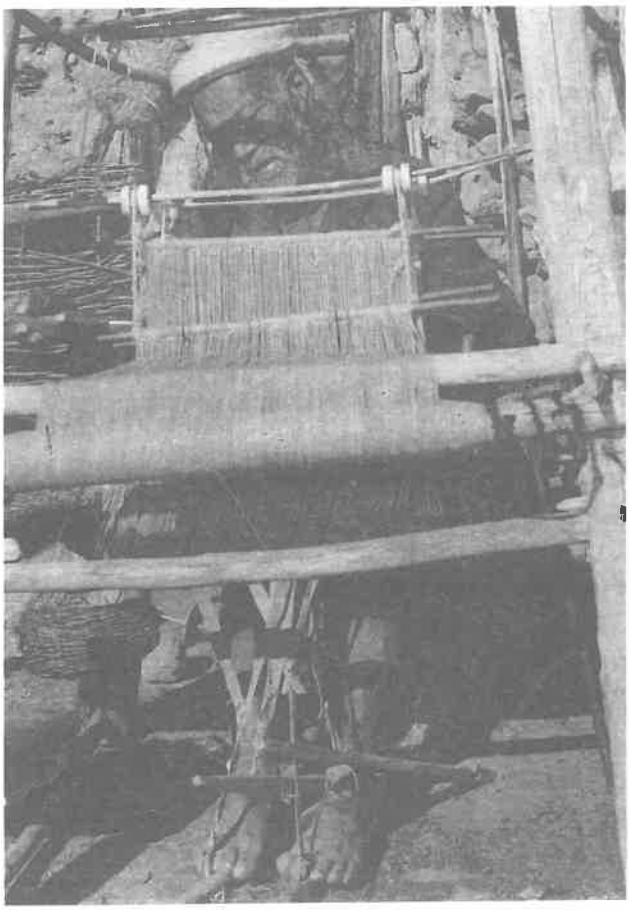
بلتستان کے بعض دیہات میں حجامت بنانے اور بچوں کا ختنہ کرنے کے لئے ماہرین کا ایک طبقہ موجود ہے جنہیں ''ٹھاکر'' کہتے ہیں۔ اس پیشے کے لوگوں کا تعلق کشمیری خاندانوں سے ہے۔ یہ پیشہ بعض خاندانوں میں موروثی ہے اور کئی کئی پشتوں سے وہ یہی پیشہ اختیار کرتے آئے ہیں۔ ان کو حجامت بنانے اور بچوں کا ختنہ کرنے کا معقول معاوضہ دیا جاتا ہے جو رقم، خشک پھل، آٹا اور مرغیوں کی شکل میں ہوتا ہے۔ دور دراز کے جن علاقوں میں ٹھاکر نہیں ہوتے وہ دوسرے علاقوں سے سال میں ایک دن مقرر کر کے ان کے گاؤں میں اس سال پیدا ہونے والے تمام بچوں کا ختنہ بہ یک وقت کرا دیتے ہیں۔ کچھ عرصے سے اس پیشے کے مقامی خاندان بھی اپنے کام سے روگردانی کرنے لگے ہیں اور آج کل سکردو بازار میں کام کرنے والے نائیوں میں اکثر کا تعلق پنجاب اور صوبہ سرحد سے ہے۔

اخوند:

بلتستان میں دینی معاملات کی انجام دہی میں رہنمائی کرنے والے کو ''اخوند'' کہتے ہیں جو اشاعت اسلام کے بعد کا اثر ہے۔ یہ پیشہ بھی بعض خاندانوں میں موروثی بن چکا ہے۔ دیگر خاندان کے لوگ بھی دینی علوم حاصل کر کے یہ پیشہ اختیار کرتے ہیں۔ آج کل دینی مدرسوں سے فارغ التحصیل علماء اور ملاؤں کی تعداد روز بروز بڑھ رہی ہے۔ بلتستان میں چودھویں صدی عیسوی کے دوران ایرانی مبلغین کے ساتھ آنے والے لوگوں میں اکثر یہاں آباد ہوئے اور ان میں سے دینی علم حاصل کرنے والوں نے پہلے پہل یہ شعبہ سنبھال لیا۔ بلتستان میں اس پیشے سے تعلق رکھنے والوں کو بڑا مقدس و معزز مقام حاصل ہے اور کچھ عرصہ قبل تک لوگ ان کے حکم کو حرف آخر سمجھتے تھے۔ اب عراق و ایران جا کر علم حاصل کرنے والے علماء کی ایک بڑی تعداد واپس لوٹ کر بلتستان آ چکی ہیں جس سے مقامی سطح پر فارغ التحصیل اخوند حضرات کی سرگرمیاں ماند پڑ چکی ہیں اور رفتہ رفتہ غیر موثر ہوتے جا رہے ہیں۔ ماضی میں ان اخوند خاندانوں کے لئے محلّہ کی سطح پر لوگ سال میں ایک دفعہ گندم، مکھن، خوبانی کا تیل، پٹو اور بھیڑ بکریاں حسب مقررہ پیش کی جاتی تھیں جن کی مقدار مختلف علاقوں میں مختلف تھی۔ اب یہ رسم تقریباً ختم ہو چکی ہے۔

جولاہا (تھق سکن):

یہ ایک قدیم پیشہ ہے کیونکہ بلتستان کے لوگ صدیوں تک مقامی سطح پر کھڈیوں پر تیار کئے جانے والے اونی پٹو سے اپنے تن ڈھانپنے پر اکتفا کرتے رہے ہیں۔ اس فن سے وابستہ افراد کو ''تھق سکن'' کہتے ہیں اور بلتی میں یہ لفظ مکڑی کے لئے بھی مستعمل ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ فن مکڑی کے جالے بنتے ہوئے سیکھ لیا ہو۔ بلتستان میں استعمال ہونے والی کھڈیوں کی بھی دو قسمیں ہیں۔ ایک بلتی ''تھقشہ'' اور دوسرا ''کھچے تھقشہ'' کہلاتا ہے۔ نام سے واضح ہو جاتا ہے کہ اول الذکر کھڈی مقامی باشندوں اور دوسری قسم کو کشمیر سے آئے ہوئے جولاہوں نے رواج دیا ہے۔ یہ جولاہے اب بھی محدود پیمانے پر روایتی انداز میں کام کرتے ہیں۔ ان کھڈیوں پر اعلیٰ درجہ کی اونی و پشمینہ کی لوئیاں اور پٹو تیار ہوتے تھے جنہیں بلتی زبان میں ''قار'' اور ''گوس'' کہتے ہیں۔ پٹو کی بھی کئی قسمیں ہیں جن میں چشم بلبل اور ''پھڑوکس'' زیادہ ممتاز ہیں۔ اونی لوئیاں اور پشمینہ کی چادریں قیام پاکستان سے پہلے عموماً لداخ، لہاسہ اور کشمیر بھی بھیجی جاتی تھیں۔



بلتی جولاہا کھڈی پر پٹو بن رہا ہے

اس کے علاوہ بلتستان میں قالین کی طرح کھڈی پر ''چھرافانی'' کی صنعت بھی عام ہے جو بکری کے بالوں سے تیار کی جاتی ہے۔ اس کام کو انجام دینے کے لئے کوئی الگ پیشہ ور موجود نہیں بلکہ لوگ ہر گھر میں اپنے طور پر ہی ''چھرا'' تیار کر لیتے ہیں۔

کمہار (رزیم کھن):

بلتستان میں لکڑی کے علاوہ پتھر و مٹی کے ظروف اور گھریلو استعمال کی چیزیں بھی بنائی جاتی ہیں اور ان میں یہاں کے کاریگر اپنا خوب فنی کمال دکھاتے ہیں۔ یہ پیشہ محدود خاندانوں میں رائج تھا اب وقت کے ساتھ ساتھ یہ دستکاریاں بھی شدید بحران کا شکار ہیں اور یہ روایتی برتن اب نوادرات میں شامل ہوتے جا رہے ہیں۔ بلتستان میں سنگی ظروف دو قسم کے ہیں۔ ایک زہر مہرہ اور دوسرا سنگ خارا' زہر مہرہ سبز مائل' نرم لچکدار اور نیم شفاف پتھر ہے جس کی شگر میں بڑی کان ہے۔ اس پتھر سے نفیس قسم کے ٹی سیٹ' گلاس' چلم' انگوٹھی' ہار' اسٹار اور سجاوٹی اشیاء تیار کی جاتی ہے۔ چھوربٹ' سلترو اور بلغار میں سنگ خارا کے کان ہیں جس کا پتھر نسبتاً نرم مگر کثیف ہے۔ اس پتھر سے قسم قسم کے برتن یعنی ہانڈی' شمعدان اور چراغ وغیرہ بنائے جاتے رہے ہیں۔ ظروف پر اس فن کے ماہرین مختلف اشکال اور مورتیاں بھی بناتے ہیں۔ آج کل اس پتھر سے سجاوٹی اشیاء کے طور پر ہانڈی اور دیگر چیزیں بنائی جاتی ہیں۔ مہدی آباد (پرکوتہ) میں مٹی کے برتن یعنی گڑھا' لوٹا اور کوزہ وغیرہ تیار کئے جاتے تھے۔ عہد رفتہ میں اس دستکاری کا بڑا عروج تھا۔ اب یہ صنعت بھی ماند پڑ گئی ہے۔ کمہاروں سے متعلق ان صنعتوں کو اگر تجارتی نقطہ نگاہ سے منصوبہ بندی کے تحت زیر کار لایا جائے تو بلتستان کی معیشت میں روشن تبدیلی آ سکتی ہے۔



بلتی دستکار سنگ خارا کے برتن بنا رہا ہے

سُنّار (خسیر گر):

یہ پیشہ ور بنیادی طور پر سونے اور چاندی دونوں زیورات بناتے ہیں لیکن پیشے کا نام ''خسیر گر'' یعنی سنار سے منسوب ہے۔ یہ موروثی پیشہ ہے جو اکثر کشمیری خاندانوں میں مروج ہے۔ ماضی میں اس پیشے سے منسلک افراد الگ بستیاں بسا کر رہتے تھے جو ''خسیر گرونگ'' یعنی سناروں کا محلہ کہلاتا تھا۔ بلتستان میں اب بھی کئی محلے اس نام سے منسوب ہیں۔ شروع میں ان فنکاروں کا کام صرف شاہی خاندانوں کے امیر گھرانوں کی خواتین کے لئے زیورات بنانے کے لئے محدود تھا۔ رفتہ رفتہ معاشی خوشحالی کی وجہ سے عوام میں بھی سونے اور چاندی کے زیورات کا رجحان فروغ پا گیا۔ یوں اب سناروں کا پیشہ روز افزوں وسعت اختیار کرتا جا رہا ہے۔

درزی (ہیلم):

بلتستان کے لوگوں کا روایتی لباس نہایت سادہ تھا جو ہر گھر میں بڑے آسان طریقے سے تیار کیا جا سکتا تھا۔ تاہم راجگی دور میں شاہی خاندان اور رؤسا کے لباس تیار کرنے کے لئے درزی مقرر تھے جو مقامی اصطلاح میں ''ہیلم'' کہلاتا تھا۔ ماضی میں یہ بھی خاندانی پیشہ تھا چونکہ عوامی حلقوں میں درزی کی ضرورت نہیں ہوتی تھی اس لئے راجاؤں کے علاوہ اجتماعی طور پر اس سے کام لینے کا رواج نہ تھا۔ اب سلائی مشین کی آمد کے بعد سے پرانی رسم ختم ہو چکی ہے۔

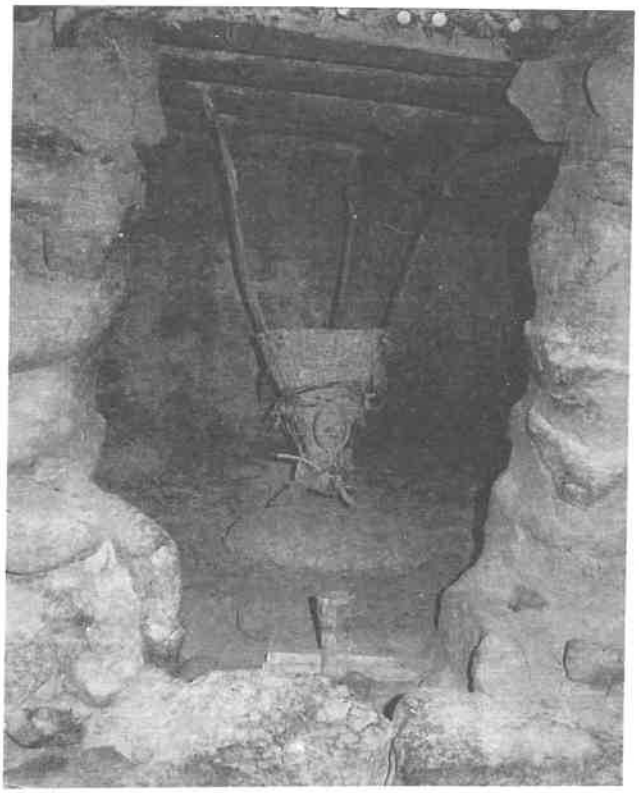
موسیقار (مون):

موسیقار کو بلتی زبان میں ''مون'' کہتے ہیں۔ شمالی ہندوستان کی طرف سے یہاں آنے والے وہ قبائل ''مون'' کہلاتے تھے اور بدھ مت کی تبلیغ کے لئے وہ اپنے ساتھ ساز بھی بجاتے ہوئے آتے تھے۔ اس لئے انہی قبائل سے منسوب کر کے اسلام کی اشاعت کے بعد بھی یہ موسیقار ''مون'' کہلائے۔ اس پیشے سے منسلک افراد کو بلتستان میں راجاؤں کے دور میں کافی مراعات حاصل تھے۔ انہیں کئی جگہوں پر الگ بستیاں بسا کر دی گئیں جو ''مون گرونگ'' یعنی موسیقاروں کا محلہ کہلائے۔ شاہی محلات میں باقاعدہ نوبت خانے موجود تھے اور مقررہ اوقات میں مناسب حریب اور ساز بجائے جاتے تھے۔ ایک روایت کے مطابق علی شیر خان انچن کی مغل شہزادی ''میندوق رگیالمو'' یعنی گل خاتون نے مغل نقارچیوں اور دیگر فنکاروں کی ایک کثیر تعداد کو بلتستان لا کر آباد کیا تھا۔ بلتستان میں معاشرتی انقلاب کی وجہ سے اب یہ ساز ندے نایاب ہوتے جا رہے ہیں۔ ماضی میں موسیقی

کے ذریعے بیماریوں کا علاج کرانا یہاں کے عوام اور اہل حکمت کا ایک مقبول عقیدہ اور فن تھا۔ اس کے علاوہ جنگوں میں عسکری نقطہ نگاہ سے موسیقی کے ان شہہ پاروں کی بڑی اہمیت تھی۔ یہ ایک خاندانی پیشہ تھا اور یہاں کے حکمران دل کھول کر ان کی سرپرستی کیا کرتے تھے اور ڈوگرہ دور تک سرکاری محصولات سے بھی یہ لوگ مستثنیٰ تھے لیکن سماج میں انہیں نیچ ذات سمجھ کر معاشرتی مقام نہیں دیا جاتا تھا۔

مالکان پن چکی (رینٹھق پا):

بلتستان میں آٹا پیسنے کے لئے ہر محلے میں نہایت سادہ طریقے سے پن چکیاں بنی ہوئی ہیں جس کے پاٹ کے علاوہ تقریباً سارے کل پرزے لکڑی کے ہوتے ہیں۔ اس کو چلانا بھی ایک پیشہ تصور کیا جاتا تھا۔ کہا جاتا ہے ایک پن چکی کی آمدن چوبیس کنال زمین (ایک یُل) کی آمدن کے برابر ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ قبل از تاریخ کے دور میں لوگ غلہ پتھر کے سل اور ہاوند میں کوٹ کر کھاتے تھے۔ جب پن چکی ایجاد ہوگئی تو بلتی زبان میں اس کا نام ''رنگ تھق'' یعنی خودکار پسائی پڑ گیا۔ جو بعد میں کثرت استعمال سے ''رینٹھق'' بن گیا۔ مالکان پن چکی کو ایک ''کھل'' یعنی بیس سیر غلہ کی پسائی کا معاوضہ ڈیڑھ سے دو سیر کے قریب آٹا دیا جاتا ہے جو مقامی اصطلاح میں ''خلہ'' کہلاتا ہے۔ اب گذشتہ ایک دہائی سے جدید برقی مشینی چکیاں درآمد ہونے پر مقامی چکیاں ویران پڑی ہیں۔



روایتی پن چکی کا اندرونی منظر

تاجر (ژھونگپہ):

بلتستان کے لوگ زمانہ قدیم سے تجارت کا کام کرتے آئے ہیں لیکن یہ پیشہ کسی خاندان یا قبیلہ تک محدود نہ تھا۔ ہر صاحب حیثیت تجارت کا پیشہ اختیار کر سکتا تھا۔ یہ لوگ ایک طرف لداخ ولہاسہ کی طرف ہزاروں من خوبانی کی تجارت کرتے تھے۔ جبکہ دوسری طرف ہندوستان کو خستہ بھیجا جاتا تھا۔ لداخ کو مکھن برآمد کیا جاتا اور اس کے بدلے اون، اونی لوئیاں، پشمینہ اور پشمینہ کی چادریں درآمد کی جاتی تھیں۔ گلگت کو مکھن اور بھیڑیں برآمد کی جاتی جبکہ استور سے ''لشی'' (ایک قسم کی لکڑی جس سے چراغ روشن کیا جاتا ہے) درآمد ہوتی تھی اور اس کے بدلے خوبانی وخشک توت استور کی طرف بھیج دی جاتی تھیں۔ بلتستان کے سنگ خارا کے ظروف لداخ اور کرگل میں جبکہ سنگ زہرمہرہ کے برتن کشمیر اور ہندوستان بھیجے جاتے تھے۔ یارقند سے قالین، نمدے، ساوار، گھوڑے اور گھوڑے کے سامان درآمد ہوتے تھے۔ کپڑا، لوہا، چائے، شکر، گڑھ اور نمک وغیرہ ہندوستان سے درآمد ہوتی تھیں۔ اب آزادی کے بعد سے درآمد اور برآمد کا سلسلہ پاکستان کے زیرین علاقوں کے ساتھ ہو رہا ہے اور روز بروز تجارت کا پیشہ وسعت اختیار کر رہا ہے۔

ادبی اور ثقافتی شخصیات

بلتستان میں شاعری کا آغاز قافیہ، ردیف اور اوزان سے مبرا لوک گیتوں سے ہوا جو ''رگیا خلو'' کہلاتا ہے اور اس صنف شاعری میں کسی کو باقاعدہ شاعر نہیں گردانا جاسکتا ہے۔ البتہ بلتی زبان میں باقاعدہ شاعری کا دور 1840ء میں ڈوگروں کے ہاتھوں سقوط بلتستان کے بعد سے شروع ہوتا ہے۔ یہاں کی شاعری کا زیادہ حصہ مذہبی موضوعات پر مشتمل ہے۔ البتہ عشق ومحبت، سیاست اور معاشرتی اونچ نیچ کو بھی موضوع سخن بنایا گیا ہے۔ جدید شاعری میں ملی نغمے اور زرعی نغمے وغیرہ بھی بلتی ادب کا سرمایہ ہیں۔ ذیل میں مختلف ادوار کے نمائندہ شعراء اور ادباء کا مختصر تذکرہ کیا جاتا ہے۔

پہلا دور:

بلتی زبان کے مرثیہ گو شعراء میں راجہ حسین علی خان محبّ (مقپون سکردو) کا مقام سب سے بلند ہے۔ آپ کو 1840ء میں اپنے والد راجہ احمد شاہ کے ساتھ اسیر کر کے کشمیر لے گئے اور وہیں آسودۂ خاک ہیں۔ محبّ نے نہ صرف بلتی مرثیہ گوئی کو تاب وتوانائی بخشی بلکہ غزل گوئی، قصیدہ درشان اہل بیت اطہارؑ اور نوحہ گوئی کے فن کو بھی اوج کمال تک پہنچایا۔ زبان کی سلاست، منظر کشی، اثر انگیزی

اور روانی ان کے کلام کا خاصہ ہے۔ فن مرثیہ گوئی میں منفرد اسلوب کے شاعر محبؔ کے پایہ کا شاعر اب تک پیدا نہ ہو سکا ہے۔

محبؔ کے علاوہ دور متقدمین کے شعراء میں مرثیہ گوئی کے فن میں نام پیدا کرنے والوں میں انہی کے برادران لطف علی خان عاشقؔ، امیر حیدر مخلصؔ اور ملک حیدر بیدلؔ کے علاوہ محبؔ کے بھتیجے محمد علی خان ذاکرؔ کے نام قابل ذکر ہیں۔ یہاں یہ کہنا کافی ہوگا کہ بلتی فن مرثیہ گوئی میں جہاں حسین علی ان محبؔ کو انیسؔ کا درجہ حاصل ہے وہاں محمد علی خان ذاکر مرزا دبیر کے رتبے پر فائز ہیں۔

اسی پر آشوب دور میں راجگان شگر اما چہ حیدر خان حیدرؔ اور ان کے فرزند مراد علی خان مرادؔ بھی کشمیر کے ڈوگرہ افواج کے ہاتھوں اسیر ہوئے جو علی الترتیب منقبت اور غزل کے فن کے شہسوار تھے۔ راجہ حیدر خان کو بلتستان کے سب سے پہلے قومی شاعر ہونے کا بھی اعزاز حاصل ہے۔

دوسرا دور:

دور متوسطین میں بہت سے شعراء منظر عام پر آئے جن میں شگر کے سید شاہ عباس قصیدہ گو، گوشوارہ نگار، ہلدی کے بابا جوہر علی جوہرؔ بحر طویل نگار و قصیدہ گو، خپلو کے بابا سلطان علی قصیدہ گو، سکردو کے بابا سلطان شاہ قصیدہ گو و بحر طویل نگار، خپلو کے راجہ حاتم خان حاتمؔ و اسفندیار خان قصیدہ گو، سکردو کے حسن خان بیدلؔ قصیدہ گو، شگر کے سید منصور علی شاہ قصیدہ گو و مرثیہ گو، بلغار کے بابا اکبر مرثیہ گو، سکردو کے شاہ عباس بیدل قصیدہ گو اور ولی پاو زیر رستم قصیدہ گو، خپلو کے مظفر علی خان ظفرؔ قصیدہ گو، شگر کے اخون محمد علی طنز نگار، سکردو کے اخون محمد علی مرثیہ گو و نوحہ گو، راجہ محمد علی شاہ بیدلؔ قصیدہ گو و مرثیہ گو، گمبہ سکردو کے سید فاضل علی شاہ قصیدہ گو، مرثیہ گو، نوحہ گو و قطعات تاریخ نگار، قمراہ کے اخوند حسین قصیدہ گو و مرثیہ گو، کوار دو کے اخوند خدایار قصیدہ گو و طنز نگار و بحر طویل نگار، اخوند غلام حسین مرثیہ گو، رگیایل کے اخوند حسن قصیدہ گو، مرثیہ گو، نوحہ گو، وطنز نگار، بحر طویل نگار، گمبہ سکردو کے سید ناصر الدین غزل گو، ہجو گو، کے نام قابل ذکر ہیں۔

مذکورہ شعراء میں سے فن قصیدہ گوئی میں جس شخصیت نے نام پیدا کیا وہ شگر کے سید شاہ عباس کے اسم گرامی ہے جن کا مجموعہ کلام بنام ''گلدستہ عباس'' شائع ہو چکا ہے۔ سید شاہ عباس علیہ الرحمہ کو بلتستان کی ادبی تاریخ میں ملک الشعراء کا مقام حاصل ہے۔

ان کے بعد ہلدی کے بابا جوہر علی جوہرؔ نے بحر طویل نگاری کے فن میں کارہائے نمایاں انجام دیئے جو رزمیہ شاعری کی بہترین مثال ہے۔ انہوں نے اس فن کے ذریعے اسلامی جنگوں کے علاوہ مذمت دنیا اور دیگر کئی حکایات اور قصوں کو بلتی میں منظوم کیا ہے۔ ان کے علاوہ اخوند خدایار کوار دو اور سید سلطان شاہ تھایور کے بحر طویل پولو اور طغرل اس فن کے لازوال شہکار ہیں۔ ان شعراء کے کلام بالخصوص منظر کشی، حضرت علیؑ سے عقیدت اور مبالغہ آرائی کا فن بدرجہ اتم موجود ہے۔

تیسرا اور موجودہ دور:

دور حاضر کے بلتی شعراء میں شگر کے راجہ محمد علی شاہ صباؔ، اخوند محمد حسین حکیمؔ، شیخ غلام حسین سحرؔ، خپلو کے شجاعت علی خان شجاعؔ، فدا حسین شمیمؔ، محمد علی خان واحد مرحوم، سکردو کے حشمت علی کمالؔ الہامی، غلام حسن حسنیؔ، غلام حسن طالبؔ، غلام مہدی شاہدؔ، غلام مہدی مرغوبؔ، غلام محمد بسملؔ اور روندو کے وزیر احمد نمائندہ حیثیت رکھتے ہیں۔ بلتستان میں اردو شاعری کرنے والے نوجوانوں کی فہرست تو خاصی طویل ہے اور بلتی میں بھی طبع آزمائی کرنے والوں کی کوئی کمی نہیں۔

بلتستان میں گذشتہ ڈیڑھ دو دہائیوں میں شاعری کے علاوہ تحقیق و تنقید کے میدان میں بھی اہل قلم کی ایک خاص تعداد ابھری ہے۔ ان لکھاریوں کی جو کتابیں اب تک منظر عام پر آچکی ہیں ان کی تفصیل یوں ہے۔

☆ محمد یوسف حسین آبادی (۱) بلتستان پر ایک نظر (۲) بلتی زبان (۳) بلتی میں قرآن کا ترجمہ

☆ سید محمد عباس کاظمی (۱) بلتی لوک گیت

☆ فدا حسین شمیم (۱) آئینہ بلتستان

☆ بریگیڈیئر محمد ذاکر (۱) سیاچن گلیشیئر

☆ غلام حسن لوبسانگ (۱) می مانگ رگیاستر ید بلتستان (پانچ سیریز) (۲) بلتی گرائمر (۳) تاریخ بون فلسفہ

☆ راجہ محمد علی شاہ صباؔ (۱) نقیب آزادی (۲) گل عباس

☆ محمد قاسم نسیم (۱) بلتستان تاریخ و سیاست (۲) صدائے شمال

☆ محمد حسن حسرتؔ (۱) تاریخ ادبیات بلتستان (۲) بلتستان تہذیب و ثقافت (۳) شملہ سے بلتستان تک (۴) انیسؔ بلتستان

☆ غلام حسن سہروردی (۱) تاریخ بلتستان

☆ شاکر شمیم (۱) بلتستان کی جنگ آزادی

☆ محمد نذیر (۱) مطالعہ بلتستان (۲) بلتستان ادب و ثقافت (۳) عکس جمہور

ان کے علاوہ ریڈیو پروگراموں کے لئے لکھنے والوں کی بھی ایک خاص تعداد موجود ہے۔ بالخصوص بلتی ریڈیائی ڈرامے کا شعبہ بہت اہم سمجھا جاتا ہے اور ان ڈرامہ نگاروں میں راجہ حامد حسین کلیم' آغا شاکر حسین شاکر' محمد عباس کھرگرونگ اور غلام عباس سودے کے نام قابل ذکر ہیں۔

رسم ورواج اور دیگر روایات

طرز معاشرت اور عادات وخصائل:

بلتستان میں رہن سہن اور طرز معاشرت سے متعلق لوک روایات کا مطالعہ انتہائی دلچسپ ہے جن میں قدیم معاشرت اور تہذیب وتمدن کے کئی نمونے ملتے ہیں۔ بلتستان کے معاشرے میں چند ایسے رسوم ورواج اور روایات بھی پائے جاتے ہیں جو صدیاں پہلے یہاں رائج تھے اور نسل درنسل ورثے میں آئے۔ اس علاقے کے لوگوں کا زیادہ تر حصہ دور دراز چٹانی دیہاتوں میں رہتا ہے۔ اس لئے یہاں کی انفرادی تہذیب میں دیہاتی زندگی کو بہت دخل ہے۔ سکردو اس تہذیب کا مرکز ہے اور اسے بلتستان کا دل کہا جاسکتا ہے۔ اس کے علاوہ باقی تمام علاقوں میں چھوٹے چھوٹے گاؤں اور بستیاں آباد ہیں اور یہ دیہات بلتی قدیم تہذیب و تمدن کے امین ہیں۔ یہ دیہاتی لوگ سالہا سال سے اس پرانے طریقے پر زندگی بسر کرتے آئے ہیں۔ البتہ اب رجحان طبع قدرے جدت کی طرف ہو رہا ہے۔ ورنہ ان کی زندگی ایک صدی قبل تک بغیر کسی خاص تبدیلی کے ایک ہی نہج سے گزرتی رہی تھی۔

بلتستان کے اکثر دیہات پہاڑی ڈھلوانوں اور چٹانوں پر آباد ہیں جہاں سے دریا کا منظر بڑا خوبصورت معلوم ہوتا ہے۔ ہر ایک کنبہ کے پاس چاہے وہ کتنا ہی غریب کیوں نہ ہو' کاشت کے لئے تھوڑی سی زمین' خوبانی' توت' بید اور بیر کے چند درخت ہیں۔ گائے' بز' چند بھیڑیں اور بکریاں ضرور ہوتی ہیں جو ان کی معاش کے بنیادی ذرائع ہیں۔

بلتستان کے باشندے انتہائی سیدھے سادھے' امن پسند' خوش اخلاق' مہمان نواز' وفادار' دیانت دار' مہذب ومؤدب اور دوسروں کے لئے بے ضرر ہیں۔ قتل وغارت' چوری وڈاکہ زنی' اغوا اور غنڈہ گردی جیسے جرائم کا تصور ہی نہیں۔ انتہائی افسوس کا مقام ہے کہ آج کل دیگر علاقوں کے مختلف طائفوں کی آمیزش سے بلتستان کی امن وسلامتی کو بھی خطرہ لاحق ہو گیا ہے۔

جدت زمانہ اور مادہ پرستی کے ساتھ ساتھ آپس کی محبت وشفقت کا سلوک کم سے کم ہوتا جا رہا ہے۔ اس حقیقت سے کسی کو انکار نہیں کہ خوش طبعی' کسر نفسی اور صبر وتحمل یہاں کے باسیوں کی فطرت کا خاصہ ہے لیکن ان خوبیوں کو چند نافہم لوگ ان کی کمزوری اور بزدلی پر محمول کرتے ہیں ورنہ دوستوں کے لئے یہ لوگ جتنے نرم وگداز ہیں' اتنے ہی دشمنوں کے لئے چٹانوں سے بھی زیادہ سخت ہیں۔ البتہ ان کو غصہ بہت دیر سے آتا ہے اور رفع ہونے میں بھی وقت لگتا ہے۔ بلتی فطری طور پر خاموش طبع اور نرم گفتار ہوتے ہیں لیکن ان کی مودبانہ اداؤں میں شرمیلا پن جھلکتا ہے۔ انتہائی مذہب پرست' اجتماعیت پسند ہوتے ہیں۔ انسان دوستی اور حب الوطنی ان کا طرۂ امتیاز ہے۔ یہ لوگ اپنے عقائد میں پختہ اور اصولوں پر مضبوطی سے قائم رہتے ہیں ایک روایتی بلتی ظاہر بظاہر پست اخلاق کا مالک نظر آتا ہے اور روز مرہ کی زندگی میں قدرے کمزور دل بھی معلوم ہوتا ہے لیکن جونہی کوئی اہم معاملہ پیش آجائے یا کوئی نازک مرحلے سے گزرنا پڑے تو اس وقت یہ لوگ ان تقاضوں پر پورا پورا اترتے ہیں اور اپنے کردار کا بہترین مظاہرہ کر سکتے ہیں۔ یہ لوگ ایک اجتماعی نصب العین کے لئے اپنے ذاتی مفادات اور مادی فائدوں کو قربان کر دیتے ہیں۔ بلتیوں کی اخلاقی اور سماجی خوبیاں اور آداب دیکھ کر ملکی وغیر ملکی سیاح اور اہل قلم ان کی برملا تعریف کرنے پر مجبور ہوئے ہیں اور خود بلتستان کے لوگوں کو بھی اپنی روایات اور تہذیب پر بڑا ناز ہے۔

بلتستان کے لوگ اپنے معاشرتی رشتوں سے بخوبی آشنا ہوتے ہیں اور محلے کی سطح پر ان کا منظم معاشرہ ہوتا ہے جس میں گھل مل کر زندگی بسر کرتے ہیں۔ قومی معاملات اور ان کی پیچیدگیوں کو اپنے بزرگوں اور رہنماؤں کی ہدایات کے مطابق حل کرتے ہیں اور ایک ملی وقومی طاقت بن کر صف آرا ہو جاتے ہیں جو ان کی سیاسی زندگی کی پختگی کا ثبوت ہے جس سے کامیابی حاصل کرتے ہیں۔

بلتستان کے مجلسی آداب پڑوس کے علاقوں میں ''آداب بلتستان'' کے نام سے قدیم الایام سے مشہور ہیں۔ یہاں کے بوڑھے بزرگ اب بھی مجلس میں داخل ہوتے وقت سلام کے ساتھ جھک کر دائیں ہاتھ کو پیشانی تک لے جاتے ہیں اور ہتھیلی پیشانی کی طرف ہوتی ہے جو یہاں کی قدیم تہذیب کی ایک یادگار ہے۔ گلے ملتے وقت تین دفعہ باری باری سینے کی دونوں طرف بغلگیر ہوتے ہیں۔ یہاں کے معاشرتی آداب وتہذیب منفرد انداز کے ہوتے ہیں اور دوسروں کے لئے نمونہ عمل ہیں۔ عمر' خاندانی رتبہ' علم اور پیشے کی بنیاد پر عزت ووقار کا رتبہ معین ہوتا ہے اور اسی لحاظ سے منکسرانہ طریقے سے آداب بجا لاتے ہیں جن میں جھک کر سلام کرنا' ہاتھ چومنا' ایک دوسرے کو آگے بٹھانا' بزرگوں کے سامنے کم بولنا اور

طعام ونوش کی پہلے پیش کش کرنا وغیرہ شامل ہیں۔ یہاں تک کہ مجلسوں میں چائے کی پیالی پہلے اٹھانے اور پہلے رکھنے میں بھی میر محفل کا انتظار کیا جاتا ہے۔ کسی مجلس میں مرد کا آستین چڑھائے اور ننگے سر جانا معیوب سمجھا جاتا تھا۔ اب یہ رسم ختم ہو چکی ہے۔ بلتی معاشرے میں سادات، علمائے دین اور راجہ خاندان کے افراد کی بڑی عزت وتکریم کی جاتی ہے۔ بزرگوں کا کہنا ہے کہ ڈوگرہ دور استبداد میں عوام کی درخواست پر سادات، علماء اور راجہ خاندان کے افراد، ملاؤں اور مرثیہ خوانوں کو سرکاری ریس اور بیگار کے سلسلے سے مستثنیٰ رکھا جاتا تھا۔ عام لوگ اب بھی اپنے بیٹوں کو ''شاہ'' اور ''خان'' کے نام رکھنے سے گریز کرتے ہیں کیونکہ بلتی معاشرہ میں یہ دونوں نام علی الترتیب سادات اور راجہ خاندان کے افراد کے لئے مخصوص ہیں جبکہ دوسری اقوام میں یہ نام ہر خاص وعام کو رکھنے میں کوئی مضائقہ نہیں سمجھا جاتا۔ گویا بلتستان تہذیب وتمدن کا گہوارہ اور یہاں کے لوگ حسنِ اخلاق اور شرافت کا نمونہ ہیں۔

بلتستان کے معاشرہ میں اچانک کوئی مہمان پہنچے تو فوری طور پر خشک پھلوں یعنی سوکھی خوبانی، گیری، زرشک، توت اور اخروٹ کے مغز وغیرہ سے خاطر تواضع کی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ گھر کی استطاعت کے مطابق مہمان کی ہر طرح سے خدمت کی جاتی ہے۔ اگر مہمان خصوصی حیثیت کا حامل ہے یا صاحب خانہ کے اس کی محبت وعقیدت کا واسطہ زیادہ پُرتکلف ہے تو حسب رتبہ مینڈھا، بکرا، بیل، بزو اور یاک بطور تحفہ ''پھیاق ستد'' پیش کیا جاتا ہے۔ اگرچہ عام طور پر اسے وہیں واپس کیا جاتا ہے اس سے مہمان کی عزت افزائی ضرور محسوس کی جاتی ہے اور یہی ایک دوسرے کی محبت میں اضافہ کا باعث بنتا ہے۔

بلتستان کے معاشرے میں دادا، باپ، تایا، چچا، بیٹے، بیٹیاں، ساس، بہو، نندیں اور بھاوجیں سبھی مشترکہ طور پر ایک ہی مکان میں رہائش پذیر ہوتے ہیں۔ ان کا گزارہ زیادہ تر کاشت کاری، سرکاری ملازمت اور مزدوری پر منحصر ہے۔ کاشت کے لئے رقبہ اراضی کم ہے اور تجارت بھی عموماً باہر سے آئے ہوئے لوگوں کے ہاتھوں میں ہے۔ زمین بہت کم زرخیز ہے یہی وجہ ہے کہ یہاں غربت زیادہ ہے۔ تمام افراد اپنی آمدنی خاندان کے سربراہ کے حوالے کر دیتے ہیں جو اسے حسب ضرورت گھر میں خرچ کر دیتا ہے۔ البتہ عام طور پر والدین کی وفات کے بعد بھائی اپنی بیویوں کی کشیدگیوں کے باعث ایک دوسرے سے الگ ہونے پر مجبور ہو جاتے ہیں اور جب علیحدہ گھر بسانے کا وقت آتا ہے تو باپ کی جائیداد اُن میں برابر تقسیم ہو جاتی ہے۔ برابر تقسیم کرنے کے بعد پہلے انتخاب کا اختیار بڑے بھائی کو حاصل ہوتا ہے۔ والدین کی حیات میں بیٹوں کا علیحدہ مکانوں میں رہنے کی مثال بلتی معاشرے میں بہت کم ملتی ہے۔ اگر شاذ و نادر ایسا واقعہ پیش آ جائے تو والدین کے لئے معقول خرچہ مختص کیا جاتا ہے جسے ''خسوس'' کہتے ہیں۔ بہوئیں الگ مرغیاں پال رکھتی ہیں اور ہنگامی ضروریات کی چیزیں مثلِ خشک خوبانی، خشتہ گیری، تیل اور ستو وغیرہ کسی صندوق میں محفوظ رکھتی ہیں جسے ''ٹیانگ کھنگ'' یا ''ننا کھوڑو'' کہتے ہیں۔ آزادی سے قبل مشترکہ خاندان بسانے کا رواج بہت زیادہ تھا کیونکہ ڈوگرہ دور میں بیگار کا بوجھ فی گھرانہ کے حساب سے لیا جاتا تھا۔ مشترکہ رہنے سے روزینہ بیگار، زنگل ریس (بار برداری کی باری)، نوریس اور بہ ریس (مویشیاں چرانے کی باری) اور ہرکونگ ریس (کوہل صاف کرنے کی باری) جیسی مشکلات سے ایک ہی باری پر چھٹکارا مل جاتا۔ اس غرض سے دو تین پشتوں تک ایک ہی گھرانے میں مشترکہ طور پر رہتے تھے۔



ایک بلتی لکڑہارا

بلتستان میں محلے کی سطح پر منظم سماجی نظام ''شربا'' کو بڑی اہمیت حاصل ہے جو محلے میں رہنے والے سارے خاندانوں کا یعنی رعایا کا مجموعہ ہوتا ہے۔ بلتی معاشرے میں شادی، اموات اور دیگر اہم تقریبات پر محلّہ کے سبھی لوگ جمع ہو کر ایک دوسرے کے دُکھ سُکھ میں حصہ لیتے ہیں۔ عام طور پر لڑکے لڑکیوں کی چھوٹی عمر میں اور برادری کے اندر ہی رشتہ جوڑنے کا رواج زیادہ ہے۔ خاندان کے بزرگ

اپنی مرضی سے رشتہ طے کر دیتے ہیں اور بعد ازاں سماجی رواج کے مطابق اسی فیصلہ کو لازمی طور پر قبول کرنا پڑتا ہے۔ چھوٹی عمر میں اور برادری کے اندر شادی کرنا اکثر وبیشتر بعد میں اَن بَن اور نزاع کا باعث بھی بنتا ہے۔ اس خوف کی وجہ سے انقطاعی نکاح پڑھنے کا رواج عام رہا ہے۔ بلتستان میں دو دو تین تین شادیاں کرنے کا رواج بھی پایا جاتا ہے لیکن بعد کی شادیاں کسی معقول جواز کے ساتھ ہی کی جاتی ہیں۔ مثال کے طور پر کسی شخص کی پہلی بیوی سے کوئی اولاد نہ ہوئی ہو یا پہلی بیوی بیمار اور معذور ہو یا اپنے قریبی رشتہ دار عورت کے بیوہ ہونے کی وجہ سے اس کے یتیم بچوں کی دیکھ بھال کی خاطر اس عورت سے نکاح کیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ کسی کی اولاد نرینہ نہ ہونے کی صورت میں بسا اوقات اپنے کسی قریبی رشتہ دار کی چھوٹی عمر کا ایک بچہ ان سے عاریتاً مانگ کر لیا جاتا ہے اور اس کی پرورش کی جاتی ہے۔ بعد میں اسی لڑکے کو اپنا پسرِ متبنیٰ بنا کر وارث قرار دے دیا جاتا ہے۔ تاہم بعض دیہاتوں میں یہ رسم ہے کہ شادی کے بعد والدین اپنی بیٹیوں کو اِرث کی نشانی کے طور پر خوبانی کا ایک درخت اور سالانہ کم وبیش ایک ''کھل'' یعنی انگریزی وزن کے تحت بیس سیر غلہ مقرر کرتے ہیں۔

جیسا کہ پہلے بھی ذکر ہوا ہے کہ بلتستان میں محلّہ کی سطح پر جو رعایا ہوتی ہے وہ ''شربا'' کہلاتی ہے اور اس میں سیکریٹری کی حیثیت سے انتظامات کے لئے ''ترانا'' مقرر ہوتا ہے جو بزرگوں سے صلاح ومشورہ کرنے کے بعد لوگوں کو اہم فیصلوں اور لائحہ عمل سے آگاہ کرتا ہے۔ مال مویشیوں سے فصلوں کو بچانے کی خاطر ہر محلّہ میں اجرت پر ''لورا پا'' یا ''بارا پا'' مقرر کیا ہوا ہوتا ہے جس کی ذمہ داری فصل اٹھانے سے پہلے جانوروں کو آزاد چھوڑنے والوں کے خلاف سماجی کارروائی کرنا ہے۔ مویشیوں کو چرانے کے لئے بھی ہر گھرانہ کی باری مقرر ہوتی ہے یعنی ہر گھر کا ایک ذمہ دار فرد محلّہ کے تمام بھیڑ بکریوں اور دیگر مویشیوں کو اپنی باری پر چرانے کے لئے لے جاتا ہے۔

بلتستان کے باسی فطرتاً امن پسند ہونے کے ناطے آپس میں لڑنے جھگڑنے سے بہت گریز کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں کی سرکاری عدالتوں میں مقدمہ بازی کی شرح بہت کم ہے۔ گویا سب سے زیادہ قیمتی چیز جو اِس وقت بلتستان کے لوگوں کو حاصل ہے وہ امن وسلامتی اور ان کا قومی وملی اتحاد ہے۔ اگر کبھی کوئی فساد برپا ہو بھی جائے تو محلّہ کی سطح پر مقررہ سماجی حیثیت کے مالک ذمہ دار افراد ثالثی کا کردار ادا کرتے ہوئے ان کا تصفیہ کر لیتے ہیں اور جرم کے مرتکب شخص پر سماجی جرمانہ ''چھدپا'' تعین کر کے دوسرے فریق کو دلاتا ہے نیز اس سے معافی طلب بھی کراتا ہے۔ یہ ادارہ گویا قبائلی علاقوں کا جرگہ اور پنجاب میں موجود پنچائیت کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ ایسے معاشرے کی عدالت ہے جس میں کوئی تحریری قوانین وضع نہیں ہیں بلکہ ہر فیصلہ کرنے والا شخص اپنے معاشرے کی رسم کے مطابق اپنی صوابدید پر فیصلہ دیتا ہے۔ یوں مقدمات تو کم ہو جاتے ہیں لیکن کبھی کبھار آپس میں دھڑے بندیاں ہو جاتی ہیں جو بعض دفعہ شدت اختیار کر جاتی ہیں۔ بلتستان کی دیہی پارٹی بازی افراد کے درمیان نہیں بلکہ پورے گاؤں کی سطح پر کنبوں کے درمیان ہوتی ہیں۔ بعض دفعہ ایک دوسرے سے بول چال اور رسمی علیک سلیک بھی روا نہیں رکھا جاتا۔ آپس کا لین دین ختم کر دیا جاتا ہے۔ دوسروں سے نہ کوئی ضرورت کی چیز مانگی جاتی ہے اور نہ دی جاتی ہے۔ موت، شادی بیاہ، مذہبی اجتماعات اور دیگر سماجی امور کے انجام دہی کے مواقع پر بھی قطع تعلق ہو جاتا ہے۔

قدیم زمانوں میں بلتستان میں راجاؤں، وزیروں اور صاحب عزت شخصیات کے سامنے کوئی گستاخی سرزد ہوتی تو اس فرد کو منہ میں گھاس اور گلے میں لوئی (اونی چادر) ڈال کر معافی طلب کرنا پڑتی تھی۔ یہ معافی طلب کرنے کا ایک منفرد اور پر تکلف انداز تھا۔ اب یہ طریقہ کچھ عرصے سے متروک ہے اس کے علاوہ حقوق کے حصول کے لئے بلتستان میں علماء کی سرکردگی میں نجی طور پر شرعی عدالتیں بھی قائم ہے۔ بہت سے مقدموں کا شرعی عدالت میں فیصلہ ہو جاتا ہے جو سستے انصاف کی ایک بہترین مثال ہے۔ ان اداروں میں مقدموں کے فیصلے اگر گواہ موجود نہ ہو تو اسلامی احکام کے مطابق قسموں پر ہوا کرتے ہیں۔ قسمیں کھلانے کے لئے باوضو ہو کر مساجد، خانقاہوں اور زیارت گاہوں میں چھوڑ دیتے ہیں اور مخصوص کلمات پڑھوا کر قسم کھلاتے ہیں۔ ان اداروں میں کچھ خامیاں بھی پائی جاتی ہیں۔ تاہم ان خامیوں کو دور کر کے ان اداروں کو چلایا جائے تو سستے انصاف کا بہترین ذریعہ بن سکتے ہیں۔

بلتستان میں عہد رفتہ میں تمام کاروبار زبانی ہوا کرتا تھا۔ کسی چیز کو تحریر میں لانے کی ضرورت محسوس نہیں کرتے تھے۔ کیونکہ جب کوئی شخص کسی بات کا وعدہ کرتا تو اسے پورا کیا جاتا اور سب لوگ ایک دوسرے پر اعتماد کرتے تھے۔ اب زمانہ بدل گیا ہے اور پچھلے چند عشروں سے لین دین کا حساب تحریری طور پر ہونے لگا ہے۔ کم وبیش تین چار عشرے قبل تک بلتی معاشرے میں یار دوست اور عزیز واقارب کے مابین باقاعدہ خط وکتابت کی روایت بھی بہت کم تھی۔ البتہ ایک دوسرے کو علاقے کے قدیم کلاسیکی گیت جن کے پس منظر میں کوئی نہ کوئی تاریخی یا رومانی واقعہ ہوتا ہے، کو بطور پیغام بھیج دیا جاتا اور پیغام وصول کرنے والا دوست یا عزیز اس لوک گیت

کے پس منظر کی روشنی میں پیغام دہندہ کے مافی الضمیر اور اس کا نتیجہ اخذ کر لیتا تھا۔ اس کے علاوہ مختلف چیزیں مثلاً پھول، کوئلہ، کنکر یا سوکھی لکڑی وغیرہ بطور تحفہ بھیج دیئے جاتے جن کا نتیجہ ان چیزیوں کے مزاج کے مطابق اخذ کیا جاتا۔ مثلاً لالہ نامی پھول یا ''شنگ کھن کوفہ پا'' نامی لوک گیت کے بھیجے جانے پر ''بے وفائی'' کا پیغام تصور کیا جاتا۔ اسی طرح ''کوئلہ کا ٹکڑہ'' فراق کی آگ میں جھلسنے کی علامت، کنکر کو سنگ دلی کی نشانی اور سوکھی لکڑی کو جدائی کے غم میں ناتوانی کا نتیجہ سمجھا جاتا۔

بلتستان میں تمباکو پینے کا دستور سالہائے دراز سے رائج تھا جو اکثر یاک کے سینگ سے بنے ہوئے حقوں میں پیتے تھے۔ یہ حقے اس طرز پر بنے ہوئے ہیں کہ دھواں پینے والے کے منہ میں آنے سے پہلے پانی میں سے گزرتا ہے جس کی وجہ سے تمباکو کی سمیت دفع ہو جاتی ہے۔ تمباکو تیار کرتے وقت اس میں تھوڑا سا پانی ڈالا جاتا پھر تمباکو چلم پر رکھا جاتا ہے اور اس کے اوپر آگ کے دہکتے ہوئے انگارے رکھ دیتے ہیں۔ اس کے بعد لکڑی کے پائپ ''نایو'' کے سرے کو منہ سے کھینچتے ہیں۔ اور ذرا سے کش سے دھواں منہ میں آتا ہے۔ درباروں اور محفلوں میں ایک آدمی اسے پکڑ کر رکھتا اور دوسرے باری باری اس سے لطف اندوز ہوتے۔ ان میں قدیم شاہی حقے پیتل سے مزین کئے ہوئے بہت ہی خوبصورت ہوتے تھے۔ غالباً ۱۸۴۰ء کے بعد کشمیر اور متحدہ ہندوستان سے باقاعدہ روابط کے نتیجے میں پیتل کے بنے ہوئے حقے ''جاجر'' درآمد کر کے استعمال کرنے لگے تو سینگ کے بنے ہوئے حقے رفتہ رفتہ متروک ہو گئے۔ راہ چلتے مسافر اور ریوڑ چرانے والے گڈریئے چراگاہوں، چوپالوں اور شاہراہوں کے کناروں پر زمین پر ہی مٹی کے حقے بنا کر تمباکو پیتے تھے جسے 'سہ چلم'' کہتے ہیں۔ اب حقے کا رواج تقریباً اختتام پذیر ہے۔ البتہ سگریٹ کا رجحان روز بروز بڑھتا جا رہا ہے اس کا آغاز آزادی کے بعد سے ہوا تھا جو صحت کے لئے نسبتاً زیادہ مضر ہے۔ بزرگوں کا کہنا ہے کہ آزادی سے پہلے یہاں نسوار کھانے کا رواج بھی نہ تھا۔ اب بہت سے لوگ اس کے عادی ہو گئے ہیں۔

بلتستان کے لوک دھونی ''شولی'' دینے کے بہت شوقین ہیں۔ کسی برتن یا کشمیری کانگڑی میں دہکتے ہوئے آگ کے انگارے رکھتے ہیں۔ اس کے اوپر اسپند یا بھوج پتر کے درخت کے چھلکے ڈالتے ہیں اور پھونک کر دھواں نکلواتے ہیں۔ کسی معزز مہمان، دولہا اور دلہن وغیرہ کا ''شولی'' سے استقبال کیا جاتا ہے۔ کسی نئے مکان میں منتقل ہوتے وقت یا بکریوں کو بکر کو ٹھے میں داخل کرتے وقت پہلے اس مکان میں ''شولی'' دی جاتی ہے جس سے یہاں کے لوگوں کے عقائد کے مطابق وہ مکان باطنی طور پر پاک ہو جاتا ہے اس کے علاوہ فصلوں میں کیڑے مکوڑے یا کسی اور بیماری کا احتمال ہوتا ہے تو ''شولی'' یعنی دھونی دیتے ہوئے کھیتوں کے اردگرد گھومتے ہیں۔

پیدائش:

بلتستان میں بچے کی پیدائش پر سب سے پہلے دائی آ کر چھری سے اس کی ناف کاٹتی ہے پھر غسل مولود دے کر دائیں کان میں اذان اور بائیں کان میں اقامت پڑھی جاتی ہے۔ پہلے تو چند بہت ہی قریبی رشتہ دار عورتوں اور گھر کی بیٹیوں کے علاوہ زچہ کی پھوپھی اور والدین وغیرہ کو بلا لیتے ہیں۔ بعد ازاں دیگر رشتہ دار اور محلے کی تعلق دار خواتین زچہ سے ہاتھ ملانے کے لئے اپنے ساتھ انڈے، تیل میں تلی ہوئی روٹی ''ازوق'' بھونے ہوئے خوبانی کے مغز اور گندم کے دانے ''یوس'' کے علاوہ حسب توفیق پیسے بھی لے کر آتی ہیں جسے ''لقپہ مینمہ'' کہتے ہیں۔ یہ سلسلہ عرصہ دس پندرہ دنوں تک جاری رہتا ہے۔ بلتستان میں عام طور پر گھروں پر روایتی طور طریقے سے دائیاں زچگی کراتی ہیں جن کو معاوضہ کے طور پر دوپٹہ یا جوڑا دیا جاتا ہے۔ بیٹا ہونے کی صورت میں ساتویں روز رسم ختنہ ادا کی جاتی ہے اور تمام رشتہ داروں کو مدعو کر کے انہیں ''مرزن'' اور ''ہرژب کھور'' وغیرہ سے تواضع کی جاتی ہے۔ بلتی معاشرے میں لڑکا لڑکی سے اس خیال کے ساتھ عزیز سمجھا جاتا ہے کہ بیٹے کی وجہ سے خاندان زندہ رہتا ہے اور وقار بلند ہو جاتا ہے۔ جبکہ لڑکی کو شادی کے بعد چلی جانا ہے۔ اسی لئے بیٹی کی ولادت پر زیادہ خوشی کا مظاہرہ کرتے ہوئے میٹھی روٹی ''ہرژب کھور'' کھلانا ناگزیر سمجھا جاتا ہے۔ بلتستان کے معاشرے میں سالگرہ منانے کا رواج سرے سے ہی نہیں ہے۔ البتہ ختنہ ایک اہم رسم ہے۔ بعض لوگ تو اسے چھوٹی سی شادی کی طرح مناتے ہیں۔ پہلے زمانے میں بعض دفعہ ختنہ کی رسم تاخیر سے ادا کی جاتی تھی لیکن اب ایسا نہیں۔

شدید موسمی حالات کے پیش نظر یہاں بھیڑ کی کھال سے گہوارہ بنا کر اس میں بکری کی مینگنی کا گرم سفوف ڈال کر بچے کو اس میں رکھا جاتا ہے جسے ''ژھمبو'' کہتے ہیں۔ جھولے اور پنگوڑے کا رواج بلتستان میں نہیں۔ زچہ کو بھوسے کا بستر بنا کر بٹھایا جاتا ہے اور خوراک کے لئے علاقے کے رواج کے مطابق مقررہ گھی اور شوربا پلایا جاتا ہے۔ گھی کی مقدار گھر کی استطاعت پر منحصر ہوتی ہے۔ مولود کی آنکھوں میں خوبانی کا تیل ڈالا جاتا ہے۔ زچہ کی ماں کم از کم ایک ہفتہ تک زچہ کی خدمت کے لئے حاضر رہتی ہے۔ زچہ کم از کم دس بارہ دن تک اپنی مخصوص بستر پر رہتی ہے اس دوران اس کے سرہانے پر ایک چھری یا کلہاڑی رکھ دی جاتی ہے تاکہ خوف سے بدروحیں اس سے دور رہیں۔

اموات:

بلتستان کے معاشرے میں موت واقع ہونے پر اسی وقت تمام رشتہ داروں کے علاوہ گاؤں کی سماجی تنظیم کے لوگ ''شربا'' جمع ہو جاتے ہیں۔ محلے کے مرد قبر کھودنے لگ جاتے ہیں جبکہ عورتیں میت کو غسل دینے کے لئے پانی گرم کرنے میں لگ جاتی ہیں۔ ہر علاقے میں محلے کی سطح پر مشترکہ قبرستان کی جگہ مختص کی جاتی ہے۔ میت کو غسل دینے اور کفن پہنانے کے بعد لاش کو کسی چارپائی یا سیڑھی پر رکھ دیا جاتا ہے اور جنازے کے اوپر بہت سے نئے کپڑے اور چادر ڈالے جاتے ہیں۔ یہ کپڑے گاؤں کے خاص تعلق دار اور رشتہ دار میت کے نام وقف کر کے ڈالتے ہیں جو بعد ازاں میت کے نام قرآن خوانی کرنے والوں کو بطور اجرت دیئے جاتے ہیں۔ تابوت پر سوگواروں کو میت کی آخری دیدار کے لئے بلایا جاتا ہے اور اس وقت شہدائے کربلا کی یاد میں مرثیے پڑھے جاتے ہیں۔ ماں، بہنیں اور بیٹیاں مقامی مخصوص انداز میں دونوں ہاتھوں کو تابوت کے اوپر سے پھراتے ہوئے بین کرتی ہیں اور زار و قطار گریہ و بکا کرتی ہیں۔ اس وقت پرسہ دینے والے لوگ لواحقین کو مختلف مثالیں اور اسلامی حکایات سناتے ہوئے تسلی و تشفی دیتے ہیں۔ جنازہ کو قبرستان لے جا کر کسی عالم دین سے نماز جنازہ پڑھائی جاتی ہے۔ ساتھ ہی بعض علاقوں میں صدقہ کے طور پر ایک بکرا یا مینڈھا ذبح کر کے اس کا پکا ہوا گوشت لوگوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ جسے ''روپھیوک'' کہتے ہیں۔ رشتہ داروں میں سے دو شخص قبر میں جا کر میت کو بڑی احتیاط سے اتارتے ہیں۔ اسلامی احکامات کے مطابق میت کو قبر میں لٹا دیا جاتا ہے۔ میت کا سر شمال میں، پیر جنوب کی طرف اور چہرہ قبلہ کی طرف ہوتا ہے۔ اس وقت میت کو ہلاتے ہوئے تلقین پڑھی جاتی ہے جس میں اللہ کی وحدانیت، محمدؐ کی رسالت، کعبہ قبلہ، قرآن مجید آخری کتاب الٰہی اور بارہ اماموں کے برحق ہونے کی شہادتیں تلقین کی جاتی ہیں۔ اس کے بعد قبر پر مٹی ڈالی جاتی ہے اور سب لوگ قبر پر ہاتھ رکھ کر سورہ فاتحہ ایک اور سورہ اخلاص تین بار پڑھ کر دعائے مغفرت کرتے ہیں۔ فاتحہ سے فارغ ہو کر سوگواروں کو گھر پہنچایا جاتا ہے۔ قدیم رسم کے مطابق اس موقع پر ''مرزن'' کھلایا جاتا تھا جسے ''ساپھنگ'' کہتے ہیں۔ اب اسے اکثر علاقوں میں ترک کر دیا گیا ہے۔ البتہ دور دراز دیہاتوں میں کہیں کہیں اب بھی وہی پرانی رسوم و رواج دیکھنے میں آتی ہیں۔ یہاں موت کے بعد کی رسموں میں سوئم، ہفتم، پندرہویں، چالیسواں اور برسی کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ موت کے تیسرے دن بعض علاقوں میں گھر والے ایک کھانا دیتے ہیں جو ''خہ تون'' کہلاتا ہے۔ متوفی کی روح کے ایصال ثواب کے لئے احباب و اعزاء بڑی تعداد میں جمع ہو کر قرآن خوانی کرتے اور فاتحہ پڑھتے ہیں میت کی تدفین کے بعد والے سوموار، جمعرات یا جمعہ کے ایام میں سے جو دن پہلے آئے اس دن سوگواروں کے سر دھلائے جاتے ہیں۔ جو ''گو چھوس'' کہلاتا ہے۔ یہ رسم غم سے فارغ ہونا تصور کیا جاتا ہے۔ ساتویں کے بعد تمام رشتہ دار اور تعلق دار باری باری سوگواروں کو دعوت کر کے لے جاتے ہیں جسے ''زدوک سکیور'' یعنی ''مصیبت چھوڑ'' کہتے ہیں۔ اگر کوئی قریبی رشتہ دار کہیں مسافرت میں ہو تو اس کو پرسہ دینے کے لئے کسی جگہ اس کے دوست احباب اور رشتے دار جمع ہو کر مرثیہ پڑھتے ہیں اور پھر اس کو اپنے عزیز کی موت کی خبر سنا دیتے ہیں۔ بلتستان میں چالیس دن تک قبر پر پانی ڈالنے کا رواج عام اور فاتحہ بدستور پڑھی جاتی ہے۔ ساتویں تک قبر پر اور اس جگہ جہاں میت کو غسل دیا گیا ہو، چراغ جلایا جاتا ہے۔

شادی بیاہ:

بلتستان کے سماج میں رنگ و نسل اور ذات پات کی تمیز پہلے سے ہی چنداں اہمیت نہیں رکھتی تھی اور نہ ہی شادی بیاہ کے رشتوں اور دوسرے تعلقات باہمی میں مانع تھی۔ ایک طبقے کے لوگ دوسرے طبقے کے لوگوں سے رشتہ جوڑ سکتے تھے۔ شاہی خاندان کے لوگ طبقہ امراء میں اور اسی طرح امرا دوسرے عام طبقوں میں شادی بیاہ کرنا معیوب نہیں سمجھتے تھے۔ صرف تین خاندان ایسے تھے جن کے ساتھ دوسرے خاندانوں کے لوگ رشتہ پسند نہیں کرتے تھے۔ یہ خاندان مون (موسیقار)، ہلم کھن (موچی) اور گربا (لوہار) تھے۔ ان خاندانوں میں شادی بیاہ اپنے حلقوں تک محدود تھیں اب کچھ عرصے سے یہ امتیاز بھی ختم ہو چکا ہے۔

بلتستان کے مختلف قبائل و طبقہ کے ازدواجی رسوم ایک دوسرے سے جزوی اختلاف رکھتے ہیں تاہم اکثر طور طریقے ملتے جلتے ہیں۔ مختلف قبائل کی آمیزش کی وجہ سے اور وقتاً فوقتاً ہونے والی تبدیلیوں کے باعث ان رسوم میں کافی رنگینی آئی ہے۔ ان رسوم کی جڑیں مسلسل عمل اور پابندی کی وجہ سے اتنی گہرائی میں چلی گئی ہیں کہ اب یہ باقاعدہ معاشرتی و سماجی قانون کی شکل اختیار کر چکی ہیں۔ رسم کی خلاف ورزی کی وجہ سے معاشرے میں اس شخص کے ساتھ سماجی بائیکاٹ تک کی نوبت آتی ہے یا رواج کے مطابق جرنامہ لیا جاتا ہے جسے ''چھد پا'' کہتے ہیں۔

بلتستان میں بسنے والے کشمیری اور درد قبائل میں شادی بیاہ کی رسم باقیوں سے بالکل مختلف ہیں۔ جبکہ دیگر لوگوں میں جاگیردار طبقہ اور ان کے وزراء خاندانوں میں بھی یہ رسوم انتہائی پر تکلف ہیں۔ ان خاندانوں میں عام بلتی معاشرے میں مروجہ

رسوم کے علاوہ جو رسم ورواج موجود ہیں ان میں ''ہرتہ سیر''''انوے اونارن''''ہرتہ فسوس ولم زان''''تو قلے نن ما''جہیز''ہرژوستروس''''مارسترق'' وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ چونکہ یہ رسوم بعض اعلیٰ طبقہ کے مخصوص خاندانوں میں مروج ہیں اس لئے ان کا یہاں تذکرہ مناسب نہیں۔ البتہ اس باب میں عام بلتی شادیوں کے رسم ورواج کا تذکرہ مختصر طور پر کیا جاتا ہے۔

بلتستان میں مروج شادی بیاہ کی رسوم کا تذکرہ ''حسوری حیدر'' نامی بلتی لوک گیت میں ہوا ہے۔ یہ لوک گیت دراصل ایک نوجوان لڑکی کی اپنے منگیتر سے شکایات پر مبنی ہے جو اسے بیاہ کر لے جانے میں تاخیر کر رہا تھا۔ لوک گیت کا متن یہ ہے۔

۱۔ مینتخ گونگ ہلتاری بوٹو زونے اونگمہ نہ نایاری شا
بوٹو گنگ سی گانگ ری لا بوٹو جیکسید' زیمسید
تھونمہ میدیالاری شا

۲۔ بوٹو گب ہلتاری زونے اونگمہ نانایاری شا
دریانہ رگیا مژھولا بوٹو جیکسید' زیمسید
تھونمہ میدیالاری شا

۳۔ یانی مینتخ کھیر بونا یودنارے لے
چھوغوے کھڑیمسی یاری پویانی کلے
کھیر باتو نگ یالاری شا

۴۔ نادولہ مہ بیورنہ یاری شانا مہ بیورنہ
یاترق چھوسی کھڑیم سی لے یا کھہ میتھل یانی کلے
کھیر باتو نگ یالاری شا

۵۔ تادولا مہ بیورنا یاری شانا مہ بیورنہ
یا کھچے کھڑیم سی لے یانی وردن کلے
کھیر باتو نگ یاری شا

۶۔ تادولا مہ بیورنہ یاری شانا مہ بیورنہ
یا بروقپی کھڑیم سی لے بروقپی دب نچالے
کھیر باتو نگ یاری شا

۷۔ نادولا مہ بیورنا یاری شانا مہ بیورنہ
یا بلتی کھڑیم سی لے یانی لنگ کنی بزو یکھہ
کھیر باتو نگ یاری شا

ترجمہ:

۱) آپ کی قسم! یہ لڑکی (میں) بالائی راستے سے جب آتی ہوں تو (میں) لڑکی گلیشیر سے ڈرتی ہے' سہم جاتی ہے۔ (اس لئے) آپ کی قسم! نہیں پہنچ سکتی۔

۲) آپ کی قسم! یہ لڑکی (میں) جب پائنی راستے سے آتی ہوں تو (میں) لڑکی دریا سے ڈرتی ہے اور سہم جاتی ہے۔ (اسی لئے) آپ کی قسم! نہیں پہنچ سکتی۔

۳) اگر آپ نے سچ مچ مجھے لے جانا ہے تو بڑوں کی رسم کے مطابق مجھے لے جا۔ میں آپ کی قسم کھاتی ہوں۔

۴) اگر میں اس قابل نہیں' آپ کی قسم میں اس قابل نہ بن سکی تو آپ مجھے ترق چھوس (وزیر خاندانوں) کی رسم کے مطابق ''کھہ میتھل'' خصوصی پکوان بھیج کر لے جا۔

۵) اگر میں اس قابل بھی نہیں۔ آپ کی قسم! میں اس قابل نہ بن سکی تو آپ مجھے کشمیری رواج کے مطابق ''واردن'' یعنی کپڑوں کے جوڑے بھیج کر لے جا۔

۶) اگر میں اس قابل بھی نہیں۔ آپ کی قسم! میں اس قابل نہ بن سکی تو آپ مجھے ''بروقپی'' یعنی دارد قبائل کے رواج کے مطابق ''دب'' یعنی پیشگی رقم ادا کر کے لے جا۔

۷) اگر میں اس قابل بھی نہیں۔ آپ کی قسم! میں اس قابل نہ بن سکی تو آپ مجھے بلتی رواج کے مطابق ''لنگ کنی'' یعنی سادہ طریقے سے صرف نکاح پڑھ کر لے جا۔

اس گیت سے معلوم ہوتا ہے کہ شروع میں بلتستان میں شادی بیاہ کی رسوم انتہائی سادہ تھیں لیکن رفتہ رفتہ دیگر اقوام کی آمیزش نے یہاں کی ان تقریبات کو رنگین اور پر تکلف بنا دیا۔

شادی کا ابتدائی مرحلہ:

بلتستان میں زیادہ تر لوگ قریبی رشتہ داروں میں شادی کرنا پسند کرتے ہیں اور یہ خیال کیا جاتا ہے کہ اس قسم کی شادیوں سے رشتہ داری کے تعلقات محدود ہونے کے ساتھ ساتھ مضبوط اور مستحکم ہو جاتے ہیں۔ اس لئے چچیرے' ممیرے' پھپھیرے اور خلیرے بھائی بہنوں میں شادیاں کرنے کو عام طور پر ترجیح دی جاتی ہے۔ یہاں یہ رواج عام ہے کہ رشتہ کے لے پیغام ہمیشہ لڑکے والوں کی طرف سے دیا جائے۔ لڑکے والوں کی طرف سے بہت زیادہ اصرار کے بعد ہی لڑکی کی طرف سے رضامندی کا اظہار ہوتا ہے اس امر کے پیش نظر مقررہ دن اور تاریخ کو لڑکے کے والدین اپنے خاندان کے کسی بزرگ یا گاؤں کے ایک معزز اور بارسوخ شخص کو ''ہلپا'' یعنی رابطہ کار بنا کر لڑکی کے والدین کے پاس بھیج دیتے ہیں۔ اس شخص کو یہ ہدایت ہوتی ہے کہ وہ رشتہ کا پیغام پہنچانے کے بعد اس کے جواب کا انتظار کرے۔ دریں اثناء لڑکی کے والدین اپنے رشتہ داروں سے مشورہ کرتے ہیں

اور ان میں رسماً فیصلہ کا زیادہ تر اختیار لڑکی کے ماموں کے پاس ہوتا ہے۔ لڑکی والوں کی طرف سے رضامندی ملنے کی صورت میں ''ہلپا'' ان کو اس پیغام سے مطلع کر دیتا ہے اور شادی کی باقاعدہ تیاریاں شروع ہو جاتی ہیں۔ بلتی شادیوں میں والدین اور ان کے رشتہ دار لڑکی یا لڑکے کو رشتہ کے لئے منتخب کر دیتے ہیں اور رسم کے مطابق انہیں اپنے والدین کے فیصلے پر پابند رہنا پڑتا ہے۔ اکثر و بیشتر لڑکی اور لڑکے کی کمسنی میں ان کے باپ یا دادا نہ صرف ان کی شادی کے عہد و پیمان پر اکتفا کرتے ہیں بلکہ ان کی اپنی سرپرستی میں نکاح بھی کروا دیتے ہیں۔ کم سنی میں ادا کرنے میں اس رسم کو ''لزوق بخستون'' یعنی قابل واپسی شادی کہتے ہیں۔ یہ رسم لڑکی اور لڑکا دونوں کی بلوغت کے بعد دوبارہ ادا کی جاتی ہے۔

کھہ میتھل:

یہ بلتی کے دو الفاظ ''کھہ'' بمعنی منہ اور ''میتھل'' بمعنی تجاوز نہ کرنا سے مشتق ہے۔ یعنی لڑکی کے والدین کے منہ پر قفل بندی۔ کھہ میتھل کی رسم کے بعد دونوں فریقین روایتی طور پر اپنے وعدوں کے پابند ہو جاتے ہیں اور یہ رسم شادی کی تجویز قبول ہونے کے بعد ادا کی جاتی ہے۔ اس رسم میں لڑکے والے اپنے وعدوں کے پابند ہو جاتے ہیں اور یہ رسم شادی کی تجویز قبول ہونے کے بعد ادا کی جاتی ہے۔ اب کھہ میتھل شادی کے موقع پر بھیجا جاتا ہے۔ یہ رسم شروع میں مذکورہ لوک گیت کے مطابق صرف طبقۂ امرا میں مروج تھی۔ رفتہ رفتہ تمام چھوٹے بڑے خاندانوں میں رواج پایا۔ اس رسم میں لڑکے کے والدین پہلے سے مقررہ تاریخ کو گول شکل میں پکی ہوئی پچاس روٹیاں ''کھر با'' خوبانی کے مغز کا تیل (چولی مار) دو سیر، ایک بکرا، بیس سیر گندم یا جو اور بارہ ٹکڑے کپڑے لڑکی کے گھر بھیج دیتے تھے۔ ان کی تعداد مختلف علاقوں میں مختلف ہو سکتی ہیں۔ لیکن آج کل اس رسم میں کافی حد تک تبدیلی آئی ہے اور بعض علاقوں میں ''کھہ میتھل'' کا رواج ہی ختم ہو گیا ہے۔ بلتستان کی مروجہ رسم کے مطابق کھہ میتھل کا تحفہ لڑکی کے والدین، رشتہ دار اور مہمانوں کے سامنے رکھا جاتا ہے جس کا گانٹھ دلہن کے ماموں کو کھولنا پڑتا ہے۔ اس رسم میں ایک پر لطف مذاق بھی رائج ہے کہ کھہ میتھل کو جس چادر میں باندھا جاتا ہے اس کے گانٹھ رسمی طور پر اتنے سخت کس دیئے جاتے ہیں کہ کھولنے والے کے لئے انتہائی دقت کا سامنا ہوتا ہے۔ کھہ میتھل کے گانٹھ کو کھولنے کے بعد ماموں سر مجلس سجدۂ شکر بجالاتا ہے۔ اس کے بعد کھہ میتھل کو مہمانوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ اس میں سب سے زیادہ حصہ دلہن کے ماموں اور ''ہلپا'' کا ہوتا ہے۔

رسم نکاح خوانی:

رشتۂ ازدواج طے ہونے کے بعد کوئی مذہبی عالم لڑکا اور لڑکی یا ان کی طرف سے مقرر کردہ وکلاء سے رضامندی حاصل کر کے نکاح پڑھتا ہے اور نکاح خوان کو کچھ رقم اجرت کے طور پر دی جاتی ہے جو کم و بیش ایک مرغی کی قیمت کے برابر ہوتی ہے۔ کچھ عرصہ قبل تک رسم نکاح خوانی عام طور پر شادی کے دن ہی ل میں لائی جاتی تھی۔ اب ایسا نہیں ہے۔

شادی کی تاریخ کا تعین:

شادی کی تاریخ مقرر کرنے کے لئے ہر دو فریق سے مشورہ کرنا ''ہلپا'' کی ذمہ داری ہوتی ہے۔ بلتستان میں شادیوں کے لئے بہترین اور مناسب موسم ستمبر اور اکتوبر ہے۔ اولاً اس موسم میں تمام فصل کی آمدنی گھر میں جمع ہو چکی ہوتی ہے۔ دوسرا یہ کہ وہ ان مہینوں میں اپنے کام کاج سے بھی فارغ ہو جاتے ہیں اور گرمی و سردی کے لحاظ سے بھی یہ دورانیہ معتدل ہوتا ہے۔ شادیوں پر کسی مذہبی عالم سے نجوم کی کتاب دیکھے بغیر تاریخ کا تعین نہیں کیا جاتا۔ جمعرات، جمعہ اور اتوار کے دنوں کو شادی کے لئے ترجیح دی جاتی ہے۔ نیز ساتھ ہی قمری حساب سے بھی تاریخ کا نیک ہونا لازمی تصور کیا جاتا ہے۔ شادی کے موقع پر کھانے پینے کی تمام سرگرمیاں رات کو ہوتی ہیں۔

رسم قرآن خوانی:

عام بلتی معاشرے میں شادی کی تقریب کا آغاز قرآن خوانی سے ہوتا ہے۔ فریقین کے گھروں میں رشتے دار، علماء، سادات، آخوند اور محلے کے قرآن پڑھ سکنے والے لوگوں کو قرآن خوانی کے لئے دعوت دی جاتی ہے۔ کچھ عرصہ قبل مہمانوں کو ''مرزان'' ''کھر با'' اور گوشت سے تواضع کی جاتی تھی۔ بلتی معاشرہ میں شادی کے مواقع پر برسوں پرانا گھی کھلانا خاندانی افتخار اور وجہ شہرت سمجھا جاتا تھا۔ لیکن اب یہ باتیں قصہ پارینہ بن چکی ہیں اور آج کل چاول کے ساتھ کشمیری طرز کے سالن بنائے جاتے ہیں۔

کھور ہرکق:

اگلے دن قریبی رشتہ داروں اور گاؤں کے معززوں کو دوبارہ دعوت دی جاتی تھی جن کے یکے بعد دیگرے قہوہ، کلچہ اور مقبول خوراک ''پھور پھور'' سے تواضع کی جاتی تھی لیکن یہ بھی گذشتہ وقتوں کی بات ہے۔ نمکین چائے سے محفل اختتام پذیر ہونے کی روایت اب بھی باقی ہے۔ یہ دن ''کھور ہرکق'' کہلاتا ہے۔ اسی دن سے شادی کے لئے روٹیاں پکانا شروع کرتے تھے۔ ان روٹیوں کو توڑ کر

چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کر کے چمڑے کی تھیلیوں میں بھر دیا جاتا تھا اور حسب ضرورت آب گوشت میں بھگو کر مہمانوں کو پیش کیا جاتا تھا۔ اب ''کھوربا'' کی جگہ چاول استال ہو رہے ہیں۔

تھُودمہ:

شرکائے تقریب اپنی استطاعت کے مطابق اور حسب رواج لڑکا اور لڑکے کے والدین کو نقد یا اجناس کی شکل میں امداد دیتے ہیں جو ''تھودمہ'' کہلاتا ہے۔ گویا یہ شادی کے اخراجات پورا کرنے کے لئے ایک قسم کا چندہ ہے۔ بلتی اصطلاح میں اسے ''قارمی کوقپی بولون'' یعنی تقاضا نہ کیا جانے والا قرضہ بھی کہتے ہیں۔ کیونکہ اس امداد کو یاد رکھ کر اس شخص کو مقروض کی طرح دوسروں کی شادیوں پر واپس کرنا پڑتا ہے۔ واضح رہے کہ یہ امداد نقد رقوم' گندم' جو' مکھن' بکرے اور کپڑوں پر مشتمل ہوتی ہے۔ آج کل لوگ نقد ہی دیتے ہیں۔

''سیر موسینگ'' اور ''مار بجوس'':

شادی سے ایک روز قبل لڑکے اور لڑکی کے تمام رشتہ داروں' دوستوں اور بزرگوں کو ہر دو گھروں میں عشائیے کے لئے دعوت ہوتی ہے جسے ''سیر موسینگ'' یعنی رسم حنا کہتے ہیں۔ اسی شب بلتستان کے رواج کے مطابق لڑکی کے ماموں اور چچا وغیرہ پر مشتمل کم سے کم چار رکنی ایک وفد خصوصی طور پر لڑکے کے گھر جاتا ہے۔ بلتی اصطلاح میں انہیں ''مار بجوسپا'' کہتے ہیں۔ بلتی شادی کی تقریب میں سب سے اہم مہمان یہی ''مار بجوسپا'' ہوتے ہیں جن کی تعداد چار سے آٹھ تک ہوتی ہے۔ اس وفد کے دولہا کے گھر جانے کا بنیادی مقصد لڑکے کے گھر کا جائزہ لینا' رشتہ داروں کو پہچاننا' باراتیوں کو کھانے کے لئے گھی کا معائنہ کرنا اور ان کے لئے کمرے کا انتخاب کرنا بتایا جاتا ہے۔ عہد رفتہ میں یہ لوگ باراتیوں کے لئے گھی پگھلا کر کسی دیگچی میں ڈالتے اور اسے ایک الگ کمرے میں بند کر کے اس کمرے کی چابی خود اپنے پاس رکھتے تھے۔ اس رسم میں ایک اور دلچسپ بات یہ تھی کہ گھی تول کر لیا جاتا تھا اور تولتے وقت ماموں اپنے ہاتھ کی صفائی اور مہارت کا مظاہرہ کرتے ہوئے زائد گھی حاصل کر لیتا جسے وہ اپنے ذاتی تحفظ میں رکھتا۔ شادی کے بعد خرچہ کر کے جو گھی بچ جاتا اسے گھر والوں کو واپس کر دیتا تھا۔ اس طرح بسا اوقات یہ بھی ہوتا تھا کہ ساٹھ ستر باراتیوں کا اتنا سارا گھی کھانے کے باوجود وہی مقدار واپس ہوتی تھی جو انہوں نے تول کر حاصل کر لی تھی۔ اس طریقے کو بلتی اصطلاح میں ''مارتھین'' کہتے ہیں۔ یہ ادا صرف ایک بے مقصد شغل کے طور پر کی جاتی تھی۔

مہندی کی رات کھانے سے فارغ ہونے کے بعد جب بزرگ لوگ اپنے اپنے گھروں کی طرف منتشر ہو جاتے تو دولہا کے دوست اور ہم رلڑکے اور دلہن کی سہیلیاں الگ الگ متعلقہ گھروں میں رقص و موسیقی اور بلتی گانوں کی محفلیں جمانے میں لگ جاتے ہیں۔ تقریباً آدھی رات کو لڑکا اور لڑکی کے ہاتھوں میں مہندی لگائی جاتی ہے۔ اب کچھ عرصے سے موسیقی کی یہ محفلیں بھی ماند پڑ رہی ہیں۔ ورنہ ماضی قریب تک موسیقی کی یہ محفلیں شادی کی تقریبات میں لازمی تھیں اور زور دار طریقے سے محفلیں جمتی تھیں۔

سکون تھق :

دولہا کو رشتہ داروں' دوستوں اور گاؤں کے معززین کے روبرو عروسی لباس پہنایا جاتا ہے۔ وہ پہلے رسمی طور پر دلہن کے گھر پر مدعو ہوتے ہیں۔ دولہا ایک گھوڑے پر جلوہ افروز ہوتا ہے اور چند رشتہ دار اور معزز افراد درود پڑھتے ہوئے جلوس کی شکل میں پاپیادہ ہوتے ہیں۔ بارات کا جلوس دیکھنے کے لئے راستے میں آئے ہوئے لوگوں اور بچوں کے درمیان مٹھائیاں' خوبانی کے مغز اور سکے کی ریز گاریاں نچھاور کی جاتی ہیں۔ اب یہ جلوس پیدل جانے کی بجائے گاڑیوں کی لمبی قطاروں میں بدل گئے ہیں۔ دلہن کے گھر پہنچ کر رواج کے مطابق تواضع کرنے کے بعد دولہا کو ''سکون تھق'' اور قریبی رشتہ داروں کو ''پھیاق ستد'' کے نام سے نقد اور اجناس کی شکل میں تحائف پیش کئے جاتے ہیں۔ دولہا اپنے سسرال والوں کو آداب بجالاتا ہے۔ اس کے بعد دولہا معہ دیگر ساتھیوں کے اجازت لے کر اپنے گھروں کو واپس چلا جاتا ہے۔ یاد رہے کہ یہ رسم بھی کچھ عرصہ سے ختم ہو چکی ہے البتہ ''سکون تھق'' اور ''پھیاق ستد'' کے نام سے کچھ رقم اور کپڑے باراتیوں کے ساتھ دولہا کے گھر بھیج دیئے جاتے ہیں۔

بل تھود:

یہ بلتی شادیوں میں ایک انوکھی رسم ہے۔ جو بلتی اصطلاح میں دو الفاظ ''بل'' بمعنی اون اور ''تھود'' بمعنی پگڑی کا مجموعہ ہے۔ دولہا کے سر پر پگڑی باندھی جاتی ہے اور اس کے اوپر اون سے بنی ہوئی لڑیاں سجائی جاتی ہیں اور ان لڑیوں کو ''بل تھود'' کہتے ہیں۔ سفید اون سے گالوں کو بنا کر اون ہی کے دھاگوں سے انہیں جوڑ دیا جاتا ہے اور چہاردہ معصومین علیہم السلام کے نام پر لڑی کی تعداد چودہ ہوتی ہیں۔ لڑیاں پگڑی پر اس طرح سجائی جاتی ہیں کہ اس کی سات لڑیاں دائیں اور سات بائیں رخسار پر لٹک جائیں۔ دلہن کو بھی چاندی کے زیورات سے مزین ٹوپی کے اوپر بل تھود پہنایا جاتا ہے۔ یہاں کے لوگ بل تھود کو عروسی لباس میں سب سے

زیادہ متبرک سمجھتے ہیں اور والدین اسے شادی کے بعد ممکنہ عرصہ تک اپنے گھروں میں محفوظ رکھتے ہیں۔ دولہا عروسی لباس زیب تن کرنے کے بعد سجدہ میں جا کر دعا کرتا ہے اور تقریب میں شریک تمام لوگ اس وقت دولہا کے دامن کو پکڑ کر اپنی اپنی حاجت روائی کے لئے دعا مانگتے ہیں اور دولہا سے دعا کی درخواست کرتے ہیں۔ یہی طریقہ دولہن کے ہاں بھی ہوتا ہے۔ بعدازاں دولہا اور دلہن اپنے والدین، بہنیں، بھائی، ماموں اور دیگر قریبی رشتہ داروں سے معافی مانگتے ہیں اور زار و قطار روتے ہوئے اظہار تشکر کرتے ہیں۔ دولہا اور دولہن دونوں الگ الگ اپنے رشتہ دار جوانوں اور دوشیزاؤں کی معیت میں محلّہ کے قبرستان پر فاتحہ خوانی اور متبرک مقامات کی زیارت کے لئے روانہ ہوتے ہیں۔ اس موقع پر نذر و نیاز کے طور پر پیسے بھی دیئے جاتے ہیں۔ دولہا کے جلوس میں ریزگاری اور مٹھائیاں نچھاور کی جاتی ہیں۔

سنیو (باراتی)

شام کے وقت دلہن کو عروسی لباس اور زیورات پہنائے جاتے ہیں۔ تمام قریبی رشتہ دار روتے ہوئے اسے الوداع کہنے کے لئے جمع ہو جاتے ہیں۔ جب دلہن اپنے والدین سے وداع ہونے گلے ملتی ہیں تو تمام عزیز و اقارب اپنے دبے ہوئے احساسات و جذبات کا مظاہرہ کرتے ہوئے رونے لگتے ہیں اور یہ انتہائی کرب انگیز منظر ہوتا ہے۔ راجہ خاندانوں میں اس موقع پر مخصوص کلاسیکی دھن ''چیلا ہو'' بجائی جاتی ہے جس پر کوئی آنکھ ایسی نہیں ہوتی جو تر نہ ہو۔ لیکن یہ عام خاندانوں میں نہیں ہے۔

رخصتی کیلئے دلہن کا ماموں دلہن کو اپنی پیٹھ پر اٹھاتا ہے اور دولہا کے گھر تک لے جاتا ہے۔ مسافت دور ہونے کی صورت میں گھوڑے یا گاڑی پر سوار کی جاتی ہے۔ اس کے ساتھ تقریباً پچاس ساٹھ رشتے داروں اور گاؤں کے معزز لوگوں پر مشتمل ایک بارات جاتی ہے جسے ''سنیو پا'' کہتے ہیں۔ دولہا کو اپنے گھر سے باہر نکالتے وقت سارے باراتی مل کر بہ آواز بلند محمدؐ و آلِ محمدؐ پر درود پڑھتے ہیں اور راہ چلتے ہوئے نعت و قصائد پڑھے جاتے ہیں جبکہ گذشتہ وقتوں میں راجہ خاندانوں کی شادیوں پر اس موقع کی مناسبت سے مخصوص دھن ''سنیو پا'' بجائی جاتی تھی۔ باراتیوں کے آگے آگے موسیقاروں کا گروہ ہوتا تھا۔ اب نہ وہ راجے رہے اور نہ ہی موسیقار اور وہ باذوق افراد۔ تاہم زرق برق لباس میں ملبوس طمطراق کے ساتھ آنے والے باراتیوں کی آمد کا منظر اب بھی بڑا دلکش ہوتا ہے۔ ان کی آمد پر دلہا کے گھر کے صحن میں آگ کا الاؤ لگاتے جسے ''تھالا پھہ با'' کہتے ہیں پہلے زمانے میں ''شوکپا'' کی لکڑی اور پتوں کا خوشبودار دھواں فضا میں لہرانے لگتا یا بھوج پتھر کے چھلکے اور ہرمل جلا کر اس کی خوشبو سے پورا ماحول معطر کر دیا جاتا تھا۔ اب ایسا نہیں ہے۔ لداخ میں باراتیوں ''فی ما'' اور گھر والوں ''نانگما'' کے درمیان سوال و جواب کے منظوم مکالمے ہوتے تھے۔ لداخ میں مروج اٹھارہ گیت کا چوسکندر خان نے اپنی کتاب قدیم لداخ میں دیئے ہیں لیکن بلتستان میں اب تک ان گیتوں کا کوئی سراغ نہیں ملا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ یہ امتداد زمانہ کے ہاتھوں ناپید ہو چکے ہوں ورنہ سوائے مذہب کے اختلاف کے لداخ اور بلتستان کی تہذیب و ثقافت میں کوئی فرق نہیں۔

بلتستان کی شادیوں میں ایک خدمت گار خاتون بھی دلہن کے ساتھ جاتی ہے جو ''منا'' کہلاتی ہے اور وہ ایک ہفتہ تک اس کے ساتھ ٹھہرتی ہے۔ بتایا جاتا ہے کہ اگلے وقتوں میں حکمران خاندان کی کوئی شہزادی کہیں بیاہ کر لے جائے تو اس کے ساتھ جو منا جاتی تھی وہ زندگی بھر اس شہزادی کے ساتھ رہنے کی پابند ہوتی تھی۔ بہرحال اب یہ رواج نہیں ہے۔ دولہا کے گھر میں باراتیوں کی بڑی عزت و تکریم اور مہمان نوازی کی جاتی ہے۔ دولہا کی خدمت اور دیکھ بھال کے لئے اس کے کسی قریبی دوست یا ہم عمر عزیز کو اس کی اپنی مرضی کے مطابق نامزد کیا جاتا ہے جو ''پھاپا'' کہلاتا ہے۔

کھہ زوس:

شادی کے دوسرے دن گاؤں کی عورتیں اور دولہا کے دوست خشک پھلوں کا تحفہ لے کر اس کمرے میں آتے ہیں جہاں دولہا اور دلہن اکٹھے بیٹھے ہوتے ہیں۔ دلہن کی سہیلیاں اور دولہا کے دوست ان سے ''کھہ زوس'' مانگتے ہیں جو ازدواجی زندگی کے آغاز کا نذرانہ سمجھا جاتا ہے۔ دولہا اور دلہن شرماتے شرماتے وہاں موجود مرد و خواتین میں خشک پھل اور مٹھائیاں بطور ''کھہ زوس'' تقسیم کرتے ہیں۔

گرون زان:

شادی کی دوسری رات دولہا کے والدین دلہن کے گھر والوں کو دعوت پر بلاتے ہیں۔ اس وقت صرف خاص خاص رشتے دار موجود ہوتے ہیں اور کسی غیر کو مہمان نہیں بنایا جاتا۔ یہ ضیافت شادی کے اختتام کی نشانی ہوتی ہے اور اسے ''گرون زان'' کہا جاتا ہے۔

بوس زان:

شادی کے بعد ہر رشتہ دار دولہا اور دولہن کو اس کے اہل خاندان کے

ساتھ باری باری دعوت پر لے جاتا ہے جسے ''بوس زان'' کہتے ہیں۔ اس موقع پر ان کی اچھی خاصی خاطر تواضع کی جاتی ہے اور ''پھیاق ستد'' کے طور پر خشک پھل اور مٹھائیاں تحفہ پیش کئے جاتے ہیں۔ اس ضیافت کا مقصد دلہن اور دولہا کے رشتہ داروں کا تعارف کرانا ہوتا ہے۔

توہمات اور جن بھوت

توہمات کے مآخذ دراصل دیو مالائی اعتقادات اور جن بھوت پر مبنی ہوتے ہیں جو دنیا کی ہر قوم اور ہر معاشرے میں پائے جاتے ہیں۔ بلتستان کے لوگ اپنا پرانا مذہب ''بون چھوس'' اور بعد ازاں ''بدھ چھوس'' چھوڑ کر مسلمان تو ہو گئے مگر تعلیم کی کمی اور بیرونی دنیا سے منقطع ہونے کی وجہ سے ان میں اوہام پرانے عقائد روایتی اقدار اور مولات لاشعوری طور پر بدستور ہیں۔ جیسا کہ بلتستان کے بوڑھے لوگ اس کرہ ارض پر جن وانس کے علاوہ ایک دیو مالائی اور بابرکت جنس ہلا اور ہلانو کے وجود پر یقین رکھتے ہیں۔ ان کا بیان ہے کہ مارخور، کیل، شاپھو، ہرن اور آہو وغیرہ ان کے پالتو جانور ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اگر کسی وقت شکارگاہ میں منفرد ضع کا جانور دیکھنے میں آئے تو شکاری اس کا شکار کھیلنے سے کتراتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ مارخور اور کیل وغیرہ کو پہلے ''ہلا'' اور ''ہلانو'' کھاتے ہیں اور وہ ان ہڈیوں کو پھینک دیتے ہیں۔ وہ ہڈیاں آپس میں جڑ کر دوبارہ زندہ ہو جاتی ہیں اور ان کی دوسری زندگی میں وہ بنی نوع انسان کے ہاتھوں شکار ہو جاتے ہیں۔ بعض شکاریوں کا کہنا ہے کہ بعض اوقات جب ہرن، ہرنی یا مارخور کا نشانہ باندھتے ہیں تو اس جنگلی حیات کی جگہ ایسے ہی کسی ہنستی ہوئی خوب رو لڑکی کا چہرہ انہیں نظر آتا ہے۔ شکاری اسے بدشگونی سمجھ کر اپنا ہاتھ روک لیتا ہے اور گولی نہیں چلاتا۔ گولی چلانے کی صورت میں شکاری کو خود نقصان ہونے کا خطرہ ہوتا ہے۔ کہتے ہیں کہ کیسر کی داستان اگر کوئی بغیر کسی تحریف اور کمی وبیشی کے سنائے تو داستان گو کو انعام واکرام سے نوازا جاتا ہے۔ چنانچہ ایک روایت پورے بلتستان میں زبان زد عام ہے کہ قدیم زمانے میں کسی شخص نے کیسر کی داستان تحریفات کے بغیر سنایا تو جس دن داستان ختم ہوگئی اس کو خواب میں کسی نے خوشخبری دی ''اے داستان گو! آفرین ہو تم پر! تم نے میری داستان میں کوئی کمی بیشی نہیں کی۔ تمہارا انعام ژھری ژھوک کے مقام پر تمہیں ملے گا۔'' کہتے ہیں کہ جب وہ شخص راہ چلتے چلتے ژھری کے میدان میں پہنچا تو دو مارخور آپس میں ایک دوسرے کے سینگ جوڑ کر موجود تھے۔ اس شخص نے انہیں پکڑ کر ذبح کیا اور اس طرح اپنا انعام پالیا۔ یہاں کے معمر لوگوں کی روایت کے مطابق اس جنس کے افراد موسیقی اور رقص وسرور کے دلدادہ ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ خطہ بلتستان ''ہلایُل''، یعنی دیوتاؤں کی سرزمین ہے اس لئے ان کو خوش رکھنے کے لئے آج سے کچھ عرصہ قبل تک گاؤں کی سطح پر موسیقی کی محفلیں جمانا ناگزیر سمجھی جاتی تھیں لیکن اب یہ رسم ختم ہو چکی ہے۔ چند ایک بزرگوں کا کہنا ہے کہ عوامی سطح پر موسیقی کے متروک ہونے کے بعد سے علاقے میں برکات مفقود ہیں۔ فصل کم آتی ہے، خوبانی کے درختوں پر پھل کم لگتے ہیں، مویشی دودھ کم دیتے ہیں اور ان سے مکھن بھی قلیل تعداد میں حاصل ہوتا ہے۔ لوگوں کا خیال ہے کہ یہ جنس یعنی ہلا او رہلانو کبھی کبھار انسان کو اغواء کر کے بستیوں سے غائب بھی کر دیتے ہیں۔ بلتستان میں ایسے واقعات بار بار رونما ہونے کی عام روایت ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ہلا فروکیسر (دیوتا) اور اس کی بیوی ہلانو (دیوی) بروگموا سی جنس سے تعلق رکھتے ہیں جو لافانی ہیں۔ اس کے علاوہ کئی اور مخلوقات یعنی اپی سار دونگ مو اپی یق چھمو، غدونگ جون اور یولی فرو جیسے متعدد توہماتی کردار زبان زد ہر خاص وعام ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان ماورائی قوتوں اور اَن دیکھی مخلوق کا خوف ہر چھوٹے بڑے کے دل ودماغ پر چھایا ہوا ہے۔ صحیح معنوں میں یہاں کے تعلیم یافتہ لوگ ان پر یقین نہیں رکھتے بلکہ جدید سائنسی ترقی اور تمدن کے ارتقاء کے ساتھ ساتھ قدیم اوہام میں تیزی سے زوال آ رہا ہے۔ لیکن ناخواندہ افراد کی ایک بڑی تعداد ابھی تک اوہام میں گھری ہوئی ہے۔

بلتستان کے معاشرے میں جب کوئی بیمار پڑتا ہے تو مجوم کی کتابوں سے وما چشم بد یا آسیب زدگی تشخیص ہوتی ہے۔ اکثر مصیبت کو کسی زندہ یا مردہ سید، عالم، فقیر یا اپنے والدین کی بددعا کا نتیجہ سمجھا جاتا ہے اور تقریباً ہر بیماری کو پریوں کا سایہ کہا جاتا ہے۔ کتابی نجومیوں کے علاوہ یہاں ان کی ایک اور قسم بھی موجود ہے جو ''بان'' یا ''مِک تھونگ'' کہلاتا ہے۔ اور یہ لوگ بالکل ناخواندہ ہوتے ہیں۔ بلتستان میں عاملوں نے بھولے بھالے عوام کا ذہن ایسا بنا دیا ہے کہ اب وہ ہر تکلیف اور پریشانی، ہر بیماری اور ناکامی کو آسیب کا اثر سمجھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس ترقی یافتہ سائنسی دور میں بھی بلتستان کے لوگ علم نجوم، رمل، علم الاعداد اور علم جفر کے علاوہ بہت سی غیر مرئی مخلوق کے وجود اور پھر عاملوں کے ذریعے ان مخلوقات سے مقابلہ کے سخت معتقد ہیں۔ عام حالات میں بھی طالع نامہ دیکھ کر اکثر لوگ اپنا ستارہ اور برج منتخب کر بیٹھتے ہیں۔ تعویز پہننے کی رسم عام ہے۔ چشم بد سے دور رکھنے کے لئے تعویذوں کی یہاں بڑی مانگ ہے۔ بلتستان میں یہ کام زیادہ تر عورتیں کراتی ہیں۔ آسمان پر دمدار ستارہ ''جوک رینگ'' کا نمودار ہونا انتہائی نحوست سمجھا جاتا ہے۔ تیرہ کا عدد منحوس خیال کیا جاتا ہے۔

ایک مقامی پرندہ ''خہ شیب یا خہ شق''، یعنی زاغ ابلق جس کا نصف بدن

سفید اور نصف سیاہ ہوتا ہے' کو بلتستان کے بعض علاقوں میں اچھی نظر سے نہیں دیکھا جاتا۔ تاہم گھر کی منڈھیر پر یا باغ کے کسی درخت پر آ کر آواز دے تو اس کی آواز کو نیک شگون اور خوش خبری سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ منڈھیر پر بیٹھا ہوا کوا بولے تو یہ خیال کیا جاتا ہے کہ گھر میں کوئی مہمان ضرور آنے والا ہے کہتے ہیں کہ جس علاقے میں جھانپل نامی یہ پرندہ موجود ہو وہ علاقہ طاعون کی مرض سے محفوظ رہتا ہے۔ بہار کے آغاز میں آنے والا پرندہ ''ہلی'' یا ''ہلی مایون'' یعنی بیا کو لوگ بہار کا پیامی تصور کرتے ہیں اور اسے پہلی بار اڑتے ہوئے دیکھنا سال بھر محنت و مشقت کا سامنا تصور کیا جاتا ہے۔ ''غوتینگ'' فاختہ کو امن کا پیامبر کہا جاتا ہے۔ مرغے کی بے وقت اذان بدشگونی کی علامت سمجھی جاتی ہے۔ مرغی کی بانگ بھی نحوست کی علامت سمجھ کر اسے اسی وقت ذبح کیا جاتا ہے۔ ایک پرندہ ''ژیرک میرک'' کا چہچہانا ''کوجینگ'' ابابیل کے غول کا اڑتے پھرنا موسم کی خرابی کا پیش خیمہ خیال کیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ انسان کے کسی حادثے میں ہلاک ہو کر لاش کا نہ ملنا وغیرہ زیادہ بارش برسنے کے اسباب میں گردانا جاتا ہے۔ کہتے ہیں کہ اگر جس شخص کی دونوں بھویں آپس میں ملی ہوئی ہوں یعنی ''سمنمہ سمن تھوک'' اور ٹیڑھے دانتوں والے ''سوسوٹھے'' شخص کے علاوہ سفید چھڑی سے جن اور بھوت خوفزدہ ہو جاتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ رات کے وقت ایک آدمی گھوڑے پر سوار ہو اور گھوڑے کے دونوں کانوں کے درمیان سے دیکھ لے تو انسان بھوت کو دیکھ سکتا ہے۔ اکثر و بیشتر مشاہدے میں آیا ہے کہ گرمیوں میں بارش برسنے کے بعد درختوں پر پکے ہوئے توت کے دانے اچانک غائب ہو جاتے ہیں۔ بزرگوں کا کہنا ہے کہ یہ مافوق الفطرت جنس ہلا اور ہلاٹو لے جاتی ہے۔ رات کو کچا گوشت اور تازہ دودھ گھر میں لانا آسیب زدگی کا باعث سمجھتے ہیں۔ بلتی معاشرے میں پاؤں کے تلوے میں خارش آنا سفر کا امکان اور ہتھیلی پر خارش آنا کسی بچھڑے ہوئے عزیز سے ملاقات یا کوئی مال و زر ہاتھ آنے کی نوید تصور کی جاتی ہے۔ خیال کیا جاتا ہے کہ حلق میں لعاب کے پھنس جانے سے اس شخص کو کھانے کے لئے گھی مل جائے گا۔ چولہے میں آگ کی غور غور کی آواز کسی مہمان کی آمد کی اطلاع سمجھی جاتی ہے۔ اگر کوئی شخص اچانک کسی کے گھر عین کھانے پر پہنچ جائے تو کہتے ہیں کہ اس کی ساس بڑی ہمدرد ہے اور اس سے محبت رکھتی ہے۔ جبکہ کھانا ختم ہوتے ہی پہنچ جائے تو اس کی الٹ تعبیر لی جاتی ہے۔ کوئی غیر حاضر شخص اس موقع پر آ دھمکے جہاں اس کے اپنے بارے میں کوئی بات ہو رہی ہو تو وہاں یہ گمان کیا جاتا ہے کہ اس کی رلمی ہے۔ بے وقت بلی اور لومڑی کا چیخنا یا چلانا بدشگونی کی علامت سمجھی جاتی ہے۔ کہتے ہیں کہ قبرستانوں سے بدروحیں بلی کی صورت میں نکل آتی ہیں۔ نیز کفن پوشی کی حالت میں بھی آنے کی روایات زبان زد عام ہیں جسے یہاں قدیم میتھالوجی میں ''پھیلین'' یعنی ہمزاد کہتے ہیں۔ کسی میت کا آنکھیں کھول کر انتقال ہونا اس امر کا باعث سمجھا جاتا ہے کہ اس کا کوئی اور رشتہ دار بھی جلد وفات پائے گا۔ چھوٹے بچوں کا زیادہ رونا بدشگونی میں شامل کیا جاتا ہے۔ بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ کسی مرد کی متعدد بیویاں فوت ہو جاتی ہیں یا عورت کی جہاں شادی ہو جاتی ہے اس کے خاوند کے بعد دیگرے فوت ہو جاتے ہیں تو یہ بھی بدشگونی میں شمار کیا جاتا ہے۔ اس وقت متعلقہ مرد یا عورت کے پاؤں پر آگ سے داغا جاتا ہے اور پھر شادی کی جاتی ہے۔ کسی شخص کے گلے میں غیر ارادی طور پر اچانک جلن محسوس کرتے ہوئے کھانسی آ جائے تو یہ تصور کیا جاتا ہے کہ اس کی غیبت ضرور ہو رہی ہے۔ کھانا کھاتے ہوئے اچانک کسی کے گلے میں لقمہ پھنس جائے تو کہتے ہیں کہ اسے اپنا کوئی عزیز یاد آ رہا ہے۔ راستہ چلتے ہوئے دو شخص کی ٹانگیں آپس میں ٹکرا جائیں تو آپس میں کشیدگی کا باعث سمجھ کر اسی وقت ایک دوسرے سے ہاتھ ملاتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ سفر کو جاتے وقت ٹوٹا ہوا برتن' کلٹہ اور عورت ذات کو دیکھنا بدشگونی ہے اور وہ سفر مبارک نہیں ہوگا۔ کسی اہم کام پر روانہ ہونے سے پہلے کمرے سے باہر پہلے دایاں پاؤں رکھنے کو نیک فال تصور کیا جاتا ہے۔ کسی کو بہ یک وقت دو اطراف سے کوئی چیز ہاتھ آ جائیں تو کہا جاتا ہے کہ یہ اسے بیٹا ہونے کی نوید ہے۔ پرانے لوگوں کے خیال کے مطابق ساری دنیا ایک بیل کے سینگوں پر استوار ہے جب بیل سر ہلاتا ہے تو زلزلہ آتا ہے۔ ان لوگوں نے آسمان پر نمودار ستاروں کے کہکشاں کو کھلیان میں موجود خرمن اور بھوسہ ''اونگنہ پھونگمہ'' کا نام دے رکھا ہے۔ بلتستان کے قدیم عقیدوں کے مطابق چاند یا سورج گرہن ہونے کو راس نامی کسی مخلوق کا سورج یا چاند کو نگل لینا تصور کیا جاتا ہے۔ اس وقت ڈھول بجاتے' تو اور برتن پیٹتے اور شور کرتے تاکہ ڈر کے مارے راس سورج یا چاند کو نگلنے سے چھوڑ دے۔ اب اسلامی اور جدید سائنسی علوم کی آمد کے بعد سے یہ رواج تقریباً ختم ہو چکا ہے۔

جب کسی خاندان میں ایک یا دو بچے چھوٹی عمر میں مر جائے تو بدقسمتی کو دور کرنے کے لئے نوزائیدہ بچوں کا عجیب نام رکھنا شروع کر دیتے تھے۔ مثلاً کھی فرو (کتے کا بچہ)' کھی چو (کتے کا راجہ)' واتھول (جاہل)' سینگے (شیر) وغیرہ۔ اب یہ رواج ختم ہو چکا ہے۔ اگر کسی انسان کے جسم پر مکڑی چڑھتے ہوئے دیکھنے میں آئے تو کہتے ہیں کہ اسے کوئی خلعت ملنے والی ہے۔

بلتستان میں جگہ جگہ بہت سے ایسے پتھر ہیں جن کے ساتھ مخصوص توہماتی قصے کہانیاں منسوب ہیں۔ سکردو نیاثیور کے جنوب میں واقع پہاڑ پر ایک بہت بڑا پتھر ہے جسے ''اپی بل کھورردوا'' کہتے ہیں اسی پہاڑی کی چوٹی پر دو انسان نما پتھر بھی نظر آتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ ایک بوڑھی اور اس کی پوتی کو کسی فقیر نے ان کے کسی نیک کام کی وجہ سے کہا تھا کہ تم دونوں اپنی بستی سے دور چلے جاؤ۔ اس بستی کو غرق کیا جارہا ہے۔ ان کو فقیر نے ہدایت بھی کی تھی کہ واپس مڑ کر اپنی بستی کی طرف نہ دیکھنا لیکن ان سے رہا نہ گیا۔ پہاڑ کی چوٹی پر پہنچ کر مڑ کر دیکھا تو دونوں پتھر بن گئیں۔ ان کے ہاتھوں میں ''بل کھور'' اون ڈالنے کا برتن بھی تھا جو گر کر نیچے پتھر بن گیا ہے۔

کہتے ہیں کہ بشوتھنگ میں طبلہ بجانے کی چھڑی کے نقوش اب بھی کسی پتھر پر نمایاں ہیں۔ دیو مالائی مخلوق اور جنات کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ اس علاقے کے ابتدائی مکین اور اصل باشندے تھے۔ بزرگوں کا بیان ہے کہ کوئی گھر خاص مدت کے لئے خالی رکھا جائے تو اس میں جن اور بھوت آ کر ڈیرہ جماتے ہیں۔ اس لئے نیا مکان بنا کر اس کی کھڑکیوں کو فوری طور پر لکڑی کی چپٹیوں سے لگا کر آنے جانے کا راستہ روک دیا جاتا ہے۔

ایک روایت ہے کہ کسی زمانے میں نرگاؤں میں دو اشخاص شکار کے لئے گئے۔ کئی دنوں تک پھرتے رہے لیکن کوئی شکار ہاتھ نہ آیا۔ ان کے پاس راشن ختم ہو چکا تھا۔ رات کو کسی غار میں قیام کیا۔ صبح دونوں جاگے تو ایک عورت نے ان دونوں کو الگ الگ مٹھی بھر آٹا دے دیا۔ اس عورت نے کہا کہ میرے خاوند کے جاگنے سے قبل یہ آٹا لے کر گھر چلے جانا۔ تمہارے گاؤں کے نزدیک موجود چشمہ تک جو آٹا بچ جائے اسے اسی چشمہ میں پھینک دینا۔ وہ دونوں شخص وہی مٹھی بھر آٹا کھاتے ہوئے آئے اور کئی دن تک کھانے کے باوجود آٹا بچ گیا۔ اس چشمے پر جس کی نشاندہی کی گئی تھی پہنچے تو ایک شکاری نے آٹا ہدایت کے مطابق وہیں پھینک دیا جبکہ دوسرے نے کہا کہ اتنا بابرکت آٹا۔ میں تو اسے اپنے ساتھ لے جاوں گا۔ یہ کہہ کر وہ آٹا اپنے ساتھ گھر لے گیا اور اپنے سٹور میں موجود آٹے میں ملا دیا۔ کہتے ہیں کہ یہ عورت ہلافو کیسر کی بیوی ہلاٹو بروک موتھی۔ نرکا وہ خاندان جس کے پڑدادا نے چڑیل کا دیا ہوا آٹا اپنے گھر کے آٹے میں ملا دیا تھا اب اس کی کوئی اولاد باقی نہیں جبکہ دوسرے شخص جس نے آٹا چشمہ میں پھینک دیا تھا اس کا خاندان اس وقت اپنے علاقے میں امیر ہے۔ اسی طرح کے کئی دلچسپ واقعات بلتستان کی لوک روایات کا حصہ بن چکے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ پہاڑوں پر شکار کھیلنے والے چرواہے عام طور پر اس قسم کے توہمات کا زیادہ شکار ہو جاتے ہیں۔

شکاریات

بلتستان کی قومی تفریحات اور مشاغل میں شکار کو بڑی اہمیت حاصل رہی ہے۔ سلسلہ کوہ قراقرم اور ہمالیہ کے درمیان واقع پہاڑی علاقہ ہونے کے ناطے بلتستان میں مختلف قسم کے حلال اور حرام گوشت جانور یعنی چرند پرند بکثرت پائے جاتے ہیں۔ جن کا شکار کسی زمانے میں یہاں کے باسیوں کے لئے ایک اہم اور دلچسپ مشغلہ تھا۔ مارخور (رداخ)' کیل (سکن)' اڑیال (شافو)' ہرن (خلا) جیسے حلال گوشت جانوروں کے لئے سکردو میں کواردو' ژھری' بشو' شغرتھنگ' نر' غوڑو' سدپر' شگر میں ہشوپی' الچوڑی' باشہ' برالدو اور ثیالی' خپلو میں تھلے' کاندے' ہوشے' کوندوس' سلتر و اور فرانو' کھرمنگ میں کتی شو' گنگ چھے لہ' طولتی' مانٹھو اور روندو میں طورمک' ستق' ہرکیو اور ژھنگمہ چھو وغیرہ کے نالہ جات مشہور شکارگاہ ہیں۔

شکار سے متعلق توہمات اور روایات:

کہا جاتا ہے کہ جب یہاں کے لوگ شروع شروع میں شکار کے فن سے آشنا ہوئے تو فطری طور پر ضابطوں کے بڑے پابند تھے۔ مثلاً گرمیوں میں شکار نہ کرنا جبکہ مادہ بچے جنتی ہے۔ مادہ اور بچے کا شکار یا حد سے زیادہ شکار کرنا وغیرہ اپنے اور اپنی اولاد کے لئے خطرے کا باعث سمجھتے تھے۔ بعض لوگوں کا یہ عقیدہ تھا کہ اگر کوئی انسان حد سے زیادہ شکار کرے تو وہ اولاد نرینہ سے محروم ہو جاتا ہے۔ ان کے عقیدہ و خیال کے مطابق ہلا ہلو یعنی دیوی دیوتا ان جانوروں کی نگرانی کرتے ہیں کیونکہ یہ ان کے پالتو جانور سمجھے جاتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ ہلا اور ہلو وغیرہ ایسے شکاریوں کی اولاد اور ان کی جان کو نقصان پہنچاتے ہیں جو اس ضابطے کی خلاف ورزی کرتے ہیں۔ یہ توہمات انسانوں کا ان جنگلی جانوروں سے تعلق اور ان سے انسیت کی آئینہ دار ہیں۔

بلتستان کے معاشرے میں شکار کے فن کو بہادری اور جرات مندی کا نشان سمجھا جاتا ہے کیونکہ اچھا شکاری وہی ہوتا ہے جو کسی مقررہ ضابطہ کا پابند ہو اور جنگلی جانوروں کو جائز مصرف میں لاتا ہو۔ شکار کے گوشت کو متبرک سمجھا جاتا تھا۔ کتے' بلی اور بدقماش لوگوں کو شکار کا گوشت نہیں دیا جاتا تھا۔ یہاں تک کہ شکار کا گوشت کھانے کے بعد ہڈیاں دفنائی جاتی تھیں اور یہ خیال کیا جاتا تھا کہ اگر شکار کا گوشت بلی یا کسی برے شخص کے منہ لگا تو شکاری آئندہ شکار کی مہم سے ناکام واپس آئے گا۔ بندوق' گولیوں اور بارود وغیرہ کو ہرمل کی دھونی دی جاتی تھی اور شکاری منہ اندھیرے گھر سے نکلتا تھا تاکہ کوئی دوسرا شخص اس کے راستے میں نہ آسکے۔

شکاری عام طور پر ایک آدمی اپنے ساتھ رکھتے تھے جو ان کا مددگار ہوتا تھا۔

اگر کسی وقت شکارگاہ میں منفرد وضع کا کیل اور مارخور وغیرہ نظر آئے تو شکاری اس کا شکار کرنے سے گریز کرتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ مارخور اور کیل وغیرہ ہلا ہلاٹو (دیوتا اور دیوی) کے پالتو جانور ہیں اور پہلے وہ انہیں کھاتے ہیں اور وہ ان کی ہڈیاں پھینک دیتے ہیں تو وہ ہڈیاں آپس میں جڑ کر دوبارہ زندہ ہو جاتے ہیں گویا ان کی دوسری جنم میں بنی نوع انسان کے ہاتھوں شکار ہو جاتے ہیں۔ بعض شکاریوں کا کہنا ہے کہ بعض اوقات جب ہرن، ہرنی یا مارخور کا نشانہ باندھتے ہیں تو اس جنگلی حیات کی جگہ کسی ہنستی ہوئی خوبرو لڑکی کا چہرہ انہیں نظر آتا ہے۔ اس وقت شکاری اسے بدشگونی سمجھ کر اپنا ہاتھ روک لیتا ہے اور گولی نہیں چلاتا۔ گولی چلانے کی صورت میں خود شکاری کو نقصان پہنچنے کا خطرہ ہوتا ہے۔

بلتی لوک ادب شکار کے قصوں اور شکار کی روایات سے مالا مال ہے۔ دیگر بہت سی دیومالائی کہانیوں کے علاوہ کیسر داستان میں ذکر آیا ہے کہ برونگ خمپہ یابزو ٹورو یونمو کا شکار کر کے اس کی کھال لانا بروک مو کے سوئمبر کی شرط تھی۔

بلتی زبان میں جنگلی جانوروں بالخصوص مارخور سے متعلق لوک گیت بھی ہے جسے ''روا خسی خلو'' کہتے ہیں۔ ان گیتوں میں جہاں قراقرم کی اونچی چٹانوں اور ڈھلوانوں میں پھرنے والے مارخوروں کے قدرتی حسن کی تعریف و توصیف ہے وہاں دوسری طرف بے رحم انسانوں کے ہاتھوں ان کے بے تحاشا شکار اور ان کے انحطاط کا شکوہ بھی کیا گیا ہے۔ ایک بلتی لوک گیت کا نام ''سکن چن برغیم'' ہے۔ اس گیت کا مرکزی کردار کیل سے بے پناہ محبت کرنے والا ایک شخص ''الدے'' ہے۔ جب الدے کیل کے جذبہ محبت میں ڈوبا ہوا تھا تو اس کے عالم تصور میں ایک کیل آ کر اپنی گوناگوں صفات اور خوبصورتی کا ذکر کرتے ہوئے بنی نوع انسان کے ہاتھوں اپنی تباہی پر یوں اظہار افسوس کرتا ہے۔

بلتی متن:

سکن چنی رواؤ بیوروی روچو یود پالے الدے
آدمی بوژھونگلہ تھوبسے سکن چنی ستروق لاگوید
سکن چنی دے مک پومیگی رینمو شے یود پالے الدے
آدمی بوژھونگلہ تھوبسے سکن چنی ستروق لاگوید
سکن چنی رگو بوتھود پو چو یود پالے الدے
آدمی بوژھونگلہ تھوبسے سکن چنی ستروق لاگوید
چھومک نہ ہرژواژل ژل زوسے سکن چن براق لابونکس
آدمی بوژھونگلہ تھوبسے سکن چنی ستروق لاگوید
سکن چنی ژھیو بودہ ژھیو بومین تھیبو سے یود
آدمی بوژھونگلہ تھوبسے سکن چنی ستروق لاگوید
سکن چنی گوتھود پو چو یود لے الدے
آدمی بوژ ھونگلہ تھوبسے سکن چنی ستروق لاگوید
میندوغی چو چو گارنہ شخص لے میندوغی چو چو
میندوغی چو چو ناشخص لے میندوغی چو چو
میندوغی چو چو چی لاتھدیت لے میندوغی چو چو
میندوغی چو چوسیکیم لاتھدیت لے میندوغی چو چو

ترجمہ:

اے الدے! کیل کے سینگ کے سرے تو لعل سے مزین ہیں لیکن افسوس ہے کہ ایسے سینگوں والے کیل کی زندگی آدم کی اولاد کے ہاتھوں ختم ہو رہی ہے۔

اے الدے! کیل کی آنکھیں تو تمام آنکھوں میں ہیرا ہے یعنی بہت خوبصورت ہیں لیکن ایسی خوبصورت آنکھوں والا کیل بنی نوع انسان کے ہاتھوں تباہ ہو رہا ہے۔

اے الدے! کیل کا جسم تو بہت ہی تندومند ہے لیکن بنی آدم کے ہاتھوں یہ کیل ختم ہو رہا ہے۔

چشمہ کے کنارے تھوڑا سا گھاس کھا کر کیل (مجھ) کو سنگلاخ پہاڑوں پر چڑھتے ہوئے بھاگنا پڑا ورنہ نسل انسانی کے ہاتھوں کیل کی جان چلی جاتی۔

کیل کے (میرے) سُم سُم نہیں بلکہ یہ کھُر ہیں جو سختی سے زمین پر جمنے والے ہیں (یعنی سنگلاخوں پر چڑھنے اور قدم جمانے کی اہلیت رکھتے ہیں) ورنہ انسان کے ہاتھوں کیل تو ختم ہو جاتا۔

اے الدے! کیل کا سر بہت بڑا ہے اور کیل کی آنکھیں بہت خوبصورت ہیں۔

(پھر کیل پہاڑ کی چوٹی پر کھلے ہوئے پھول سے پوچھتا ہے) اے میندوغی چوچو! تم کہاں سے آ کر یہاں کھل چکے ہو؟ شگفتہ پھول (کی طرف سے جواب ملتا ہے) کہ میندوغی چوچو پہاڑوں سے آ کر کھلا ہے۔

اے میندوغی چوچو! تم کس چیز کو پسند کرتے ہو؟ جواب ملتا ہے کہ میندوغی چوچو کو تمہارے جسم پر موجود ریشم جیسا پشم بہت پسند ہے۔

بلتستان میں ان جنگلی جانوروں کے علاوہ مرغابیوں اور دیگر آبی پرندوں



کیل

کے شکار کے لئے دریائے سندھ کے کنارے اور جھیل کتپناہ موزوں ترین شکارگاہ ہیں۔ اس کے علاوہ پہاڑوں پر چکور (سترقپہ) اور رام چکور (گونگمو) کا شکار جگہ جگہ کھیلا جاسکتا ہے۔ سدپارہ جھیل، کچورہ جھیل اور دیوسائی جھیل کے علاوہ دریائے سندھ اور متعدد نہروں میں مچھلی کا شکار کھیلا جاتا ہے۔ نصف صدی قبل تک یہاں شکار پر کوئی پابندی نہیں تھی اور شکار بھی کثرت سے ہاتھ آتے تھے۔ آج کل لائسنس کے بغیر کوئی کسی قسم کا شکار نہیں کرسکتا۔ معلوم ہوتا ہے کہ قدیم زمانے میں بلتستان میں شکار کے دلچسپ قوانین اور ضابطے مقرر تھے اور آج بھی یہاں شکار کھیلنے کے کئی طریقے مروج ہیں۔ پہاڑی جانوروں کا بڑا شکار بندوق اور کتے کی مدد سے کھیلا جاتا ہے جس میں کتا شکار سے پہلے مخصوص طریقے سے شکار کو شکاری کے سامنے پہاڑی گھاٹیوں میں محصور کرکے بھونکتا ہے۔ اس کے بعد شکاری اپنی مرضی کے تحت مختلف قسم کے بندوق سے شکار کرلیتا ہے۔ اب شکار کے لئے مخصوص کتوں کی پرورش نہیں کی جاتی اور عوام جمع ہوکر شور وغل کرکے پکڑنا (ہرمق لنگ) یعنی لشکری شکار کے علاوہ عام طور پر چھوٹے پرندوں کے شکار کے لئے باز پالے جاتے تھے۔ رفتہ رفتہ قدیم طرز کی ٹوپی دار، توڑے دار اور ماشہ دار بندوق کے علاوہ تیر و کمان، مختلف قسم کے پھندے (سنیو اور بیاشق) غلیل (ٹیانگونگ) جانوروں کو دھوکہ دے کر گڑھے میں گرانا (ہلڑاب اور گونگ دونگ) گھونسلے میں بند کرکے پکڑنا (ژھنگ زگق) جیسے روایتی ذرائع استعمال ہوتے تھے۔ اُس وقت لشکری شکار یعنی ہرمق لینگ کی غرض وغایت صرف تفریح اور شغل نہیں بلکہ جنگی مشق بھی مقصود تھی۔ اس میں ایک شکارگاہ کے گرد تمام رعایا اور احاطہ باندھتے تھے، جانوروں کو گھیر کر لاتے اور ان پر نکلنے کے راستے بالکل بند کردیتے تھے۔ پہلے راجہ خود شکار مارتا تھا۔ پھر عام لوگوں کو بھی اجازت ہوتی تھی۔ بلتستان میں بھی یہ لشکری طریقہء شکار راجاؤں کے دور میں رائج تھا۔ کہا جاتا ہے کہ ہر قبیلے کی اپنی شکارگاہ الگ تھی جہاں دوسرے قبائل کو شکار کھیلنے کی اجازت نہیں ہوتی تھی۔ آج بلتستان اور آس پاس کے علاقوں میں آبادی کے پھیلاؤ اور انسانی دستبرد کے نتیجے میں شکارگاہوں کی وسعت روز بروز کم ہوتی جارہی ہے اور جنگلی حیات کی تعداد تیزی سے گھٹ رہی ہے۔ لوگ چوری چھپے جدید رائفلوں سے شکار کرکے ان جنگلی جانوروں اور پرندوں کی نسل کشی کررہے ہیں۔ اگر یہ صورت حال جاری رہی تو وہ دن دور نہیں جب جنگل ان خوبصورت جانوروں سے خالی ہوجائیں گے۔ اب حکومت نے ان کے تحفظ کے لئے قانون سخت کردیئے ہیں۔ دیکھنا یہ ہے کہ لوگ ان قوانین پر کہاں تک عمل کرتے ہیں۔

مچھلی کے شکار کے لئے دوشاخہ لکڑی کا ڈنڈا درمیان میں تیز میخ لگا ہوا آلہ جسے ''کھالو یا تروق'' کہتے ہیں، ندیوں سے کوہل کی شاخ نکالنا (ئیارا چدپا) دھول اور ڈوری معہ کانٹا (بلخچہ) وغیرہ اب بھی استعمال کئے جاتے ہیں۔ واضح رہے کہ ''کھالو'' کا استال صرف رات کو لالٹین کی روشنی میں کیا جاسکتا ہے۔ یہ مچھلی پکڑنے کیلئے اپنی نوعیت کا ایک منفرد طریقہ ہے۔

بلتی تقویم اور کیلنڈر:

جس طرح دنیا کی مختلف اقوام میں تقویم کے مختلف طریقے رائج ہیں مثلاً مغربی ممالک میں شمسی عیسوی، ہندوستان میں شمسی بکرمی، ایران میں شمسی ہجری اور عرب ممالک کے علاوہ دیگر اسلامی ممالک میں سنہ عام الفیل اور قمری ہجری کی جنتریاں مستعمل ہیں۔ اسی طرح علاقہ ہائے تبت، لداخ، پوریگ اور بلتستان میں عیسوی، بکرمی اور ہجری تقویموں کے ساتھ ساتھ زمانہ سلف سے مقامی طور پر تبتی جنتری (کیلنڈر) بھی موجود ہے جو یہاں کی قدیم تہذیب کا ایک بنیادی حصہ ہے۔ چونکہ تبت سے بلتستان کا نسلی، لسانی رشتہ صدیوں پرانا ہے۔ کسی زمانے میں یہ تاریخی اور جغرافیائی لحاظ سے ایک ہی علاقہ تصور کیا جاتا تھا۔ اسی لئے تاریخ میں تبت اصلی (لہاسہ)، تبت بزرگ (لداخ) اور تبت خورد (بلتستان) مذکور ہوئے ہیں۔ نیز علاقہ ہائے تبت یعنی لہاسہ، لداخ اور بلتستان کا تشخص نسلی اور لسانی اعتبار سے اب بھی ایک ہے۔ لیکن اشاعت اسلام کے بعد سے بلتستان کے تبت اور لداخ کے ساتھ مربوط پرانا رشتہ رفتہ رفتہ منقطع ہونے لگا اور آزادی کے بعد سے آمدورفت کا سلسلہ بھی کلی طور پر مسدود ہوگیا۔ اس سے معاشرتی زندگی کے دیگر معاملات میں تبدیلیاں آنے کے علاوہ بلتستان میں مروجہ صدیوں پرانی تبتی

جنتری بھی متروک ہوگئی۔ یہی وجہ ہے کہ آج کل چند بزرگوں کے علاوہ بلتستان کے لوگ اس تقویم کے حساب سے نابلد ہیں۔

تبتی جنتری میں مہینے کا شمار قمری حساب پر مبنی ہے جو مولوی حشمت اللہ خان مولف تاریخ جموں کے مطابق غالباً ہندوستان سے لیا گیا ہے۔ مذکورہ محقق اپنی کتاب میں مزید لکھتے ہیں کہ تبتی جنتری میں چھتیس (۳۶) مہینوں کے درمیان تیس مہینے انتیس دن کے اور چھ مہینے تیس دن کے شمار ہوتے ہیں۔ جس وقت پورے تیس دن کا اختلاف اس شمار میں بمقابلہ حساب شمسی کے ہو جاتا ہے تو اس وقت ایک مہینہ لوند کا یعنی لیپ سال بڑھا دیا جاتا ہے۔ یہ امر مسلمہ ہے کہ مغربی ممالک میں علم نجوم کی بنیاد نظام شمسی پر ہے اور عیسوی تقویم میں دس سال کا ایک عشرہ ہوتا ہے جبکہ منطقہ البروج کی طرح چینی قمری کیلنڈر کا اپنا ایک بارہ سالہ منطقہ ہے جس کا ہر سال ایک جانور کے نام سے منسوب ہے۔ اور اسی طرح تبتی یا بلتی جنتری میں بھی وہی بارہ سالہ دور موجود ہے جسے ''لوسکور'' کہتے ہیں۔ اس بارہ سالہ منطقہ میں ہر ایک سال ایک ایک علامت کے ساتھ مختص ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ جنتری میں ساٹھ سالوں کا ایک لمبا دور یا قرن بھی ہوتا ہے جسے ''رب جونگ'' کہتے ہیں۔ اس جنتری میں دو شمسی مہینے رامن اور رشی من بھی موجود ہیں لیکن عام طور پر قمری مہینوں کے اسلامی نام رائج ہیں جو ۲۹ یا ۳۰ دنوں کے بارہ مہینے گنے جاتے ہیں۔ یہی حال چینی تقویم کا بھی ہے کہتے ہیں کہ چینی علم نجوم دنیا کا قدیم ترین علم نجوم ہے۔ اس کی معلوم ابتداء تقریباً ڈھائی ہزار سال قبل مسیح ہے۔ رسالہ پیامی (شمارہ جون ۱۹۹۱ء) میں محقق رقمطراز ہے کہ دو ہزار سال قبل مسیح میں چین کے پاس ایک قابل استعمال کیلنڈر موجود تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ تقویم پہلے چین میں رائج ہوئی تھی پھر تبت میں منتقل ہوئی۔

مولوی حشمت اللہ خان کے مطابق تبت اصلی (لہاسہ) کا حکمران نم ری شونگ چن گیالپو کے عہد حکومت (۶۲۹ء) میں علم طب اور علم حساب چین سے لایا گیا اور ان علوم کی تعلیم زبانی طور پر لہاسہ میں رائج ہوئی مندرجہ بالا شواہد سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ زیر بحث جنتری کا حساب پہلے چین سے لہاسہ منتقل ہو کر پھر آس پاس کے علاقوں میں مروج ہوا۔

چینی تقویم کے بارہ بروج بھی انہی جانوروں کے نام اور تصویریں علامات کے طور پر دیئے گئے ہیں جو تبتی تقویم میں رائج ہیں۔ البتہ چند جزوی اختلافات پائے جاتے ہیں۔ مثلاً چینی تقویم کے زائچے میں تیسرے، نویں، دسویں اور بارھویں سال کی علامات علی الترتیب شیر، بندر، مرغ اور ریچھ دکھائی گئی ہیں جب کہ تبتی جنتری انہی سالوں کو چیتا، لنگور، چڑیا اور سور کی علامات ظاہر کرتی ہے۔ نیز چینی کیلنڈر کے بارے میں ہیرلڈ یم لکھتا ہے کہ ''چین کا دائرہ وقت تنگ خاندان کے ایک آئینہ پر بطور آرائش مرقسم ہے۔ مرکز میں پرکار کے چار بنیادی نقطے دکھائے گئے ہیں۔ پھر بارہ جانوروں کا دائرہ شروع ہوتا ہے۔'' اس زائچہ کے دائرہ میں صرف بھیڑ کے بدلے بکرا دکھایا گیا ہے۔ باقی جانوروں کی شکلیں تبتی جنتری کی علامات سے مشابہ ہیں آٹھ پراسرار شکلوں کے دائرے سے باہر چاند کے ہیئتی بروج دکھائے گئے ہیں۔ چینیوں کے حساب وقت اور فال میں یہ تمام چیزیں داخل تھیں اور اسے دائرہ خطا کہتے تھے۔ رسالہ پیامی شمارہ جون ۱۹۹۱ء میں ایک جدید نیپالی کیلنڈر دیکھ کر معلوم ہوا کہ نیپال میں بھی تقویم کی وہی علامات مروج ہیں جو تبتی تقویم میں موجود ہیں۔

بلتستان میں موسمی تبدیلی کے چار مراحل کے نام خچت (بہار) غبیار (گرما)، ستون (خزاں) اور رگون (سرما) ہیں۔ ۲۱ دسمبر تا ۲۰ جون ''غبیار ثیم کھیم'' ۲۱ جون سے ۲۰ دسمبر تک کے عرصے کو ''رگون ثیم کھیم'' کے نام سے سال کو دو بڑے حصوں میں تقسیم کر رکھا ہے۔ بلتستان میں ہر دو ''کھیم'' کے موقعوں پر اپنے مال مویشیوں کو نمک کھلانے کا رواج عام ہے ''رگون ثیم کھم'' کے آغاز یعنی ۲۱ دسمبر کی شام کو اپنے اپنے گھروں سے مشعل لے کر نکلتے ہیں اور اونچی جگہوں پر لے جا کر پھینک دیتے ہیں یہ ایک قسم کا چراغاں ہوتا ہے۔ ساتھ ہی ایک دوسرے کو صدقہ بھی بانٹ دیتے ہیں۔ آج سے دو تین عشرہ قبل تک اس رسم ''مے پھنگ'' کا بڑا زور تھا اور اس موقع پر رات بھر رقص و موسیقی کی محفلیں بھی جمتی تھیں۔ ۲۱ مارچ سال کا نیا دن یعنی ''لوسر'' شمار کیا جاتا ہے جسے آج کل نوروز کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ محققین کے مطابق زمانہ قدیم میں یہ دن واقعی نوروز کے دن منایا جاتا تھا مگر گیالپو جمیانگ نمگیل نے ایک دفعہ سیاسی ضروریات کی بناء پر اس تہوار کو تاریخ معینہ سے قبل یعنی گیارھویں مہینے کی پہلی تاریخ کو منایا۔ اس وقت سے یہی تاریخ اس تہوار کے لئے معین ہوگئی ہے۔ بلتستان میں سردی کے آغاز میں بکرا، مینڈھا یا گائے، بیل وغیرہ ذبح کر کے سردیوں کے لئے گوشت محفوظ کیا جاتا ہے۔ اس رسم کو ''لوسر'' کے نام سے پکارتے ہیں۔

یہ ایک دلچسپ بات ہے کہ جس طرح یونانی اور چینی تقویم میں شمسی بروج جانوروں کے ناموں سے منسوب ہیں۔ اسی طرح تبتی جنتری میں بارہ کے بارہ سالوں کے نام مختلف النوع جانوروں کی علامات اور ناموں سے منسوب ہیں۔ اس بارے میں بلتی میں ایک ضرب المثل مشہور ہے ''لوگو بیوا کھیرس'' یعنی پہلا سال

چوہا لے گیا۔ بزرگوں کا کہنا ہے کہ حضرت نوح نے طوفان سے بچنے کے لئے کشتی تیار کی اور اپنے مصاحبوں کے ساتھ سوار ہوگئے تو اس کشتی میں تمام جانوروں کا ایک ایک جوڑا رکھا گیا۔ جب طوفان تھم گیا اور زمین پر دوبارہ آباد کاری شروع ہوئی تو اس وقت زمین پر سب سے پہلے قدم رکھنے کے لئے بیل کو منتخب کیا۔ کہتے ہیں کہ بیل نیک شگون کی علامت ہے لیکن بیل ایک سست جانور ہونے کے ناطے لوگ اسے کھینچ کر کشتی سے باہر نکالنے تک اس کے کان میں پوشیدہ ایک چوہا فوراً ہی زمین پر کود پڑا۔ اس وقت شاید کسی نے کہا..... ''لومگو بیوا کھیرس'' یعنی پہلا سال چوہا لے گیا۔ اے وبر نے ''کیتھ پاتھا برہمنا'' جورگ وید کی تشریح ہے' کے حوالے سے آریہ قوم کے مورث اعلیٰ منو مہاراج کے بارے میں ایک کہانی بیان کی ہے اور یہ استشہاد کیا ہے کہ منو مہاراج حضرت نوح علیہ السلام سے ملتے جلتے وجود کے تھے جس کو ایک مچھلی نے اطلاع دی کہ ایک خطرناک سیلاب آنے کو ہے' کشتی تیار کر لیں اور سیلاب کے وقت اس کشتی میں سوار ہو جائیں۔ پس سیلاب آیا اور ہر چیز زیر وزبر ہوگئی۔ منو مہاراج کشتی میں سوار ہوگئے۔ زوردار سیلاب کی وجہ سے کشتی ہمالیہ کی اونچی چوٹی پر چڑھ گئی۔ ان دونوں میں فرق یہ ہے کہ کیتھ پاتھا برہمنا کی اس کہانی میں منو مہاراج مرکزی کردار کے مالک ہیں اور عرب روایات میں حضرت نوح علیہ السلام اصل ہستی ہیں۔ اگرچہ بلتستان میں موجود اس لوک روایت کا تاریخ سے کوئی رشتہ مربوط نہیں ہے۔ تاہم ضرب المثل اور لوک روایت کی تصدیق بلتستان میں مروجہ قدیم تبتی جنتری سے ضرور ہوتی ہے جو ''بیوالو'' یعنی چوہا کے سال سے شروع ہو کر علی الترتیب یوں گنا جاتا ہے:

(۱) بیوالو (چوہا سال) (۲) خلنگ لو (بیل کا سال) (۳) ستق لو (چیتا کا سال) (۴) ریونگ لو (خرگوش کا سال) (۵) بروک لو (اژدہا کا سال) (۶) غبول لو (سانپ کا سال) (۷) ہرتا لو (گھوڑے کا سال) (۸) لُگ لو (بھیڑ کا سال) (۹) شدی لو (لنگور کا سال) (۱۰) بیالو (چڑیا کا سال) (۱۱) کھی لو (کتے کا سال) (۱۲) فاق لو (سور کا سال)

بلتستان کا علاقہ ایرانی مبلغین کے ہاتھوں مشرف بہ اسلام ہونے کے بعد سے یہاں مذہبی رسومات اور دیگر امور کے لئے عام طور پر اسلامی مہینے شمار کئے جاتے ہیں۔ محرم' رجب' شعبان' شوال' ذیقعدہ اور ذوالحجہ کے لئے مقامی طور پر علی الترتیب ماتم' لزا خسوم روزہ' برات' سکیا لزا' چھون لزا اور قربان کے نام استعمال ہوتے ہیں اور باقی مہینوں کے نام اصلی حالت میں مستعمل ہیں۔ قدیم بلتستان میں وقت شماری کے مختلف طریقے رائج تھے البتہ سورج وقت کا بنیادی پیمانہ تھا اور اب بھی ہے۔ جدید گھڑیاں پہنچنے سے پہلے یہاں دوپہر' شام' رات' آدھی رات' ہفتہ' ماہ اور سال وغیرہ کا شمار سورج' چاند اور ستاروں کی حرکت کے حوالے سے کیا جاتا تھا۔ مرغے کی بانگ سے وقت کے بارے میں اندازے لگائے جاتے۔ رات کو مرغے کی پہلی اذان کے ساتھ رمضان المبارک کے مہینے میں سحری کھانے کے لئے جاگتے اور وقفہ در وقفہ دی جانے والی تین بانگوں کے بعد طلوع سحر کا اندازہ کیا جاتا۔ پالتو پرندوں کے بسیرا ڈھونڈنے پر شام کے آثار سمجھنے کے لئے مدد مل جاتی۔ علاوہ ازیں عصر اور ظہر کے اوقات کے لئے سایہ کے اتار چڑھاؤ اور سورج کا مقام دیکھتے ہیں۔ اس طرح دن کو چار بڑے حصوں میں تقسیم کرتے ہیں۔ دس بجے (زان توس) ساڑھے بارہ بجے (پشین)' تین بجے (فیتر و) اور پانچ بجے (پین گنگ) بلتستان کے بوڑھے ناخواندہ لوگ اب بھی اپنی اور بچوں کی روں کا حساب رکھنے کے لئے مختلف اہم واقعات بالخصوص 1948ء کی جنگ آزادی سے سالوں کا شمار کرتے ہیں۔ یعنی فلاں کی رجنگ آزادی کے وقت اتنے سال کی تھی یا فلاں شخص جنگ آزادی کے اتنے سال بعد پیدا ہوا۔ اس کے علاوہ فتح چترال' نومل کی جنگ' ڈوگروں کے حملہ بلتستان اور دوسری جنگ عظیم وغیرہ کو بھی تاریخی حوالے کے طور پر شمار کیا جاتا ہے۔



بلتستان میں چٹان پر کندہ بدھا کے نقوش

شمسی مہینے قوس اور جدی (21 دسمبر تا 21 جنوری) کو بلتی میں رامن اور رشی من کہتے ہیں جس کا اوپر ذکر کیا ہے۔ سردیوں میں تبدیلی یعنی 10 جنوری کو ''کھی تروت'' (کتے کی گرمی)' 20 جنوری کو ''بیا تروت'' (مرغی کی گرمی)' یکم فروری کو ''کھانگ تروت'' (گرمی خانہ) اور 20 فروری کو ''سہ تروت'' (زمینی گرمی) کے حساب سے گنا جاتا ہے۔ بلتستان کے لوگ یہاں کے میدانی علاقوں

میں 2 مارچ کو ''گوتب'' کاشت کا پہلا وقت 8 مارچ کو ''سکل تب'' کاشت کا درمیانی وقت اور 12 مارچ کو ''جوک تب'' کاشت کا آخری وقت قرار دیتے ہیں۔ یہ اوقات دوفصلی زمینوں میں فصل خریف کی کاشت کے پیش نظر فصل ربیع کی کاشت کے لئے معین ہیں۔

بلتی اور شناز بان میں ہفتہ کے دنوں کے نام:

ہفتے کے دنوں کے نام بلتی میں حسب ذیل ہیں جو شناز بان میں بھی مشترک ہیں: ادیت (اتوار) ژندرال (سوموار) انگارو (منگل) بودھو (بدھ) بریسپوت (جمعرات) شگورو (جمعہ) شنگشیر (سنیچر) دنوں کے یہ نام دراصل سنکسرت اور ہندی سے ماخوذ ہیں۔

بلتستان کے لوگ عام طور پر شمسی برجوں کے تحت دن اور ساعت دیکھنے کے قائل ہیں۔ شادی بیاہ، تیر مکان، سفر کرنا، کاشت کرنا، شاخ تراشی کرنا، بچوں کو سکول میں داخلہ دلانا اور حجامت بنوانا غرض کوئی بھی چھوٹا بڑا کام کرنا ہو تو وہ اسلامی تقویم کی کتابوں سے نیک و بد کا فال دیکھے بغیر نہیں کرتے ہیں کیونکہ اشاعت اسلام کے بعد سے یہاں اسلامی تقویم اور اسلامی تہذیب و تمدن کو بڑی اہمیت حاصل رہی ہے۔ البتہ سرکاری امور کے لئے اس وقت عیسوی تقویم مروج ہے۔ نیز 1840ء تا 1948ء کے ڈوگرہ دور میں سرکاری کاغذات میں بکرمی حساب بھی درج ہوا ہے۔

تبتی جنتری میں ''لوسکور'' یعنی بارہ سالہ دور کے بعد لمبے دور کا شمار یعنی ''رب جونگ'' کے ساٹھ سالہ قرن کے لئے پانچ امتیازی نشانات یعنی (۱) لکڑی (شنگ) (۲) آگ (مے) (۳) زمین (سا) (۴) لوہا (لچگ) (۵) پانی (چھو) مقرر ہیں۔

مذکورہ پانچوں علامتوں کو تاریخی کتابوں میں ''کھمس'' لکھا گیا ہے جو مذکورہ اقتباس کے مطابق چینی تقویم سے لیا گیا ہے۔ شاید یہ طریقہ تبت اور لداخ میں رائج ہو لیکن بلتستان کے بزرگ اس وقت ان ناموں سے ناآشنا ہیں۔ محققین کے مطابق تبتی جنتری کے اصول کے تحت یہ ''کھمس'' اسی ترتیب میں جو اوپر درج کیا گیا ہے دو دو دفعہ مندرجہ بالا سالوں پر لگائے جاتے ہیں۔ دسویں سال میں ان کا دور ختم ہو جاتا ہے اور گیارھویں سال سے پھر شروع کیا جاتا ہے۔ اس طرح سے ساٹھ سال کا ''رب جونگ'' پورا کیا جاتا ہے۔ ایک رب جونگ میں ''لوسکور'' کے پانچ دور اور ''کھمس'' کے چھ دور آتے ہیں۔ بلتستان میں رب جونگ کے شمار کا سراغ نہیں ملتا بلکہ مولوی حشمت اللہ خان نے تبت کے بارے میں لکھا ہے کہ اس ملک میں پہلے ''لوسکور'' کا شمار رائج تھا بعد میں جنتری مرتب ہوئی تو ''رب جونگ'' کو رواج دیا گیا۔ چونکہ اس وقت چوتھا سال تھا اس لئے اسی سال سے رب جونگ کا آغاز کر دیا گیا۔ لیکن مولف مذکور لکھتا ہے کہ رب جونگ کا استعمال اس نے اقصائے تبت میں کہیں نہیں دیکھا۔ البتہ یہ بات وثوق کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ بلتستان کے معاشرے میں صرف اس امر کا تصور ضرور ملتا ہے کہ بزرگ لوگ مختلف لوگوں کو پانچ مختلف امتیازی علامتوں سے جوڑ دیتے ہیں۔ مثلاً خلونگ سکر (بادی)' مے سکر (آتشی)' ساسکر خاکی)' چھوسکر (آبی) اور شنگ سکر (ہیزمی)۔ یہی امتیازی علامات حکمائے یونان کی وضع کردہ اسلامی جنتریوں میں بھی موجود ہیں۔ بلتستان کے بزرگوں کا عقیدہ ہے کہ جس آدمی کی مطابقت پانی سے ہو آگ اس سے ڈرتی ہے اور اس آدمی سے آگ کا سلگانا مشکل ہو جاتا ہے۔

تبتی جنتری کے بارہ سالہ دور میں ہر سال کے لئے الگ الگ تاثیر مخصوص ہے لیکن اس کے متروک ہونے کی وجہ سے بلتستان کے لوگ اس کی تفصیل بتانے سے قاصر ہیں۔ تاہم مختلف مرافراد سے اخذ کئے گئے سالوں کے مختصر تاثرات حسب ذیل ہیں۔

1- بیوالو (چوہے کا سال): یہ مال جمع کرنے کا سال ہے۔ اس سال پیدا ہونے والا بچہ بخیل ہوگا۔

2- خلنگ لو (بیل کا سال): نیک شگون اور برکت والا سال۔ ایک ضرب المثل ہے۔ ''ترنگ مومی لا بزنگ موخلنگ'' یعنی سادہ لوح آدمی کے لئے اچھا بیل۔ اس سال پیدا ہونے والا سست ہوتا ہے۔

3- ستق لو (چیتے کا سال): پُرامن سال ہے البتہ پانی کی قلت ہوگی۔

4- ریونگ لو (خرگوش کا سال): اسے ''یوس لو'' بھی کہتے ہیں۔ فصل اچھی ہوگی۔ پچھلے سال کے پانی کی قلت سے قحط کا اثر اس پر پڑے گا۔ ضرب المثل 'ستق لا ژھکنہ یوس لا خاؤ'' یعنی چیتا سال میں فصل جل جائے تو خرگوش کے سال مزید جل جانا۔

5- بروک لو (اژدہا کا سال): نیک سال اور برکت والا سال ہے۔ لوگ بہت زیادہ محنت کریں گے اس کا اصل لفظ ''بروک'' کے بجائے ''دروک'' ہے جو اژدہا کو کہتے ہیں۔

6- غبول لو (سانپ کا سال): اس سال لوگ ایک دوسرے سے حسد کریں گے۔ جھوٹ زیادہ بولیں گے۔ سانپ کی زہریلی زبان کے اثرات کے نتیجے میں ایک دوسرے کے خلاف چغلی زیادہ کریں گے۔ اس سال پیدا ہونے والا بچہ چست و

چالاک ہوتا ہے۔

7- ہرتالو (گھوڑے کا سال): نامعلوم۔

8- لک لو (بھیڑ کا سال): یہ سال نیک اور پُرامن سال ہے۔ اس سال پیدا ہونے والا بچہ نرم مزاج اور صابر ہوگا۔ یہ بابرکت سال بھی ہے۔

9- شدی لو (بندر کا سال): اسے ''پسی لو'' بھی کہتے ہیں۔ اس سال جھگڑا فساد زیادہ ہونے کا خدشہ ہوتا ہے۔ قحط ہوگی۔ بڑا منحوس سال ہے۔ کہتے ہیں کہ اسی سال دجال پیدا ہوگا۔

10- بیالو (چڑیا کا سال). یہ بے برکت سال ہوتا ہے۔

11- کھی لو (کتے کا سال): اس سال جھگڑا زیادہ ہوگا۔ اس سال پیدا ہونے والا بچہ سخت مزاج اور جھگڑالو ہوگا۔

12- فاق لو (سور کا سال): اس سال غیبت گوئی زیادہ ہوگی۔ فصل بھی اچھی ہوگی۔

قارئین کی دلچسپی کی خاطر تبتی تقویم کے مطابق 1901ء تا 2019ء کی صدی میں سال کی علامات ذیل میں دی جاتی ہیں جس کی روشنی میں ہر کوئی اپنی تاریخ پیدائش کے سال سے اپنی علامت معلوم کر سکتا ہے مثلاً 1901ء میں پیدا ہونے والا شخص ''خلنگ لو پا'' یعنی بیل کے سال کا کہلائے گا۔ اسی طرح 2000ء میں جنم لینے والا بچہ ''دروک لو پا'' یعنی اژدہا کے سال والا ہوگا۔ واضح رہے کہ یہی رسم چین میں بھی موجود ہے۔ ماہنامہ چین باتصویر اگست 1991ء کے مطابق چین میں بارہ سالہ دور کے ہر سال کی مناسبت سے یادگاری ٹکٹ جاری کیا گیا ہے۔ 1980ء میں بندر کے سال کا پہلا ٹکٹ اور علی الترتیب 1991ء تک بارہ ڈاک کے یادگاری ٹکٹ جاری کئے جا چکے ہیں۔ یادگاری ٹکٹوں کے اس سیٹ میں خوبصورت لوک انداز اور قومی رنگ جھلکتا نظر آتا ہے۔ ٹکٹوں پر چھپی ہوئی بارہ جانوروں کی تصاویر کا سیٹ مذکورہ ماہنامہ میں دیا گیا ہے۔ جن میں شریر بندر، بانگ دیتا ہوا مرغ، قوی ہیکل کتا، آرائشی اشیاء سے سجا ہوا سور، ذہین چوہا، آن بان سے آگے قدم بڑھاتا ہوا بیل، ہیبت ناک شیر، معصوم خرگوش، اڑتا ہوا اژدہا، منہ میں ''لینگچی'' بوٹی لئے ہوئے سانپ، من موہنا اور بھالا ٹٹو اور سر سینگ ہوڑائی ہوئی بھیڑ شامل ہیں۔

ناپ تول کے مقامی پیمانے:

پوری دنیا میں وزن اور پیمائش کے دو مقبول ترین پیمانے یعنی اعشاری نظام اور برطانوی نظام رائج ہیں۔ جن سے حساس مقداریں اور فاصلے بھی آسانی کے ساتھ تولے اور ناپے جا سکتے ہیں۔ یہی نظام آج کل بلتستان میں بھی رائج ہیں لیکن یہاں ناپ تول کا حساب ہاتھ، بالشت، انگلیوں، قدموں اور برتنوں اور ''سترانگ'' نامی مخصوصی روایتی ترازو کے ذریعے بھی کیا جاتا تھا جو صدیوں پرانا ہے۔

مقامی پیمانے کے مطابق کہنی کی نوک سے ہاتھ کی درمیانی انگلی کے سرے تک کا فاصلہ ایک ہاتھ ''کھڑو'' شمار کیا جاتا ہے اور دو ہاتھ ایک گز کے برابر ہوتا ہے بالشت کو ''تھو'' کہا جاتا ہے اور ایک بالشت کے لئے ہاتھ پھیلا کر چھنگلی سے انگوٹھے تک شمار کیا جاتا ہے۔ چار انگلیوں کو پھیلا کر رکھی جائیں تو اسے ''چرچی'' کا پیمانہ کہا جاتا ہے اور چار انگلیاں ایک سیدھ میں باہم ملائے رکھی جائیں تو اسے ''سورجی'' کہتے ہیں۔ جو تقریباً پونے تین انچ سے تین انچ کے برابر ہوتا ہے۔ ایک انگلی ''سور چک'' کہلاتا ہے اور یہ پیمائش کا سب سے چھوٹا پیمانہ ہے۔ یہ پیمانے کپڑا، پٹو اور لکڑی وغیرہ ناپنے کے لئے استعمال ہوتے ہیں۔

زمین کی پیمائش میں قدم استعمال کرتے ہیں۔ ایک قدم دو فٹ سے کچھ زیادہ یا دو قدم ایک کرم کے برابر سمجھا جاتا ہے۔ لمبے فاصلوں پر چلنے کے لئے پڑاؤ بنیادی اکائی ہے۔ یہ منزل شمار کیا جاتا ہے جو انسان آسانی سے پیدل چل کر ایک دن میں طے کر سکتا ہے۔ یہ فاصلہ سولہ میل کے برابر ہوتا ہے زمین کی پیمائش پیداوار کے حصول کی مناسبت سے بھی کی جاتی ہے۔ بلتستان میں زمین کا رقبہ معلوم کرنے کے لئے پیمائش کا اکائی ''کھل'' Khall ہے اور اس کا اندازہ بیج کی مقدار کے لحاظ سے کیا جاتا ہے۔ ایک قطعہ زمین جو بارہ کھل کے برابر ہوتا ہے ایک دن میں ایک جوڑی بیلوں سے جوتا جا سکتا ہے۔ اس طرح زمین کی پیمائش ورقبہ کے درج ذیل پیمائش مروج ہیں۔

10 برے = ایک کھ پھید	2 چہ گل یا 3 کھل = ایک چوکول
20 برے = ایک کھل	2 چوکول یا 6 کھل = ایک یل پھید
ڈیڑھ کھل = ایک چہ گل	2 یل پھید یا 4 چوکول = ایک یول

بلتستان میں آبپاشی کے لئے پانی کی تقسیم بھی اسی حساب سے کی جاتی ہے۔ قدیم بلتستان میں اجناس کا تبادلہ کاروبار کا ایک اہم ذریعہ تھا۔ گندم کے عوض کپڑا، خشک پھلوں کے بدلے نمک اور گائیوں و بکریوں کے بدلے اناج دیا جاتا تھا۔ اناج تولنے کے لئے لکڑی کا ٹوپہ جسے مقامی طور پر ''برے'' کہتے ہیں، استعمال کیا جاتا ہے۔ اس میں ایک سیر یا پانچ پاؤ وزن اناج کی گنجائش ہوتی ہے۔ اس قسم کے بیس ''برے'' ایک ''کھل'' ہوتا ہے۔ جس کے مختلف معیار چڑی، کھ چت، بریانگ، کھ پھید اور کھل ہیں۔ ٹھوس اشیاء مثلاً مکھن، نمک اور اون کے گانٹھ وغیرہ کا

وزن کرنے کے لئے لکڑی کا بنایا ہوا ایک مخصوص آلہ مستعمل تھا جسے ''سترانگ'' کہتے ہیں۔ اس لکڑی کے ایک سرے پر لکڑی کا ہی ایک گولہ اور دوسرے سرے پر تین مضبوط ڈوریوں سے لٹکا ہوا چمڑے کا پلڑا ہوتا ہے۔ پکڑنے والے سرے کی طرف ڈنڈے پر لکیروں کی شکل میں پیمانے کندہ کئے ہوتے ہیں۔ پلڑے میں چیزیں ڈال کر ان لکیروں میں ایک اور ڈوری ڈال کر وزن کیا جاتا ہے۔ وزن اس وقت صحیح ہوتا ہے جب وہ ڈنڈا جس کی ایک طرف گولہ اور دوسری طرف پلڑا ہے، رہیں۔ یہ برابر میں نہ رہنے کی صورت میں ڈوری کو پیمانے کی لکیروں پر آگے پیچھے کیا جاتا ہے ''سترانگ'' کی خصوصیت یہ ہے کہ اس کا پیمانہ کسی بھی وزن یعنی سیر اور کلوگرام وغیرہ میں بدلا جا سکتا ہے۔ ''سترانگ'' کا پیمانہ درج ذیل ہے تاہم ممکن ہے کہ بلتستان کی مختلف وادیوں میں یہ پیمانے بھی مختلف ہوں۔

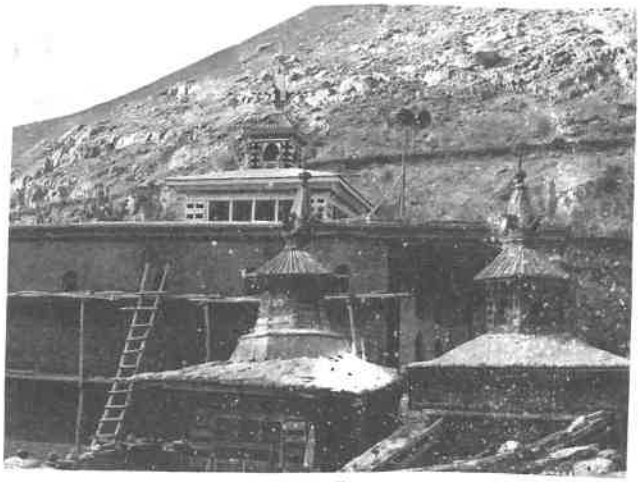
بجی ما= ۳ سیر	خسوما= ۴ سیر ایک پاؤ
دوما= ۱ سیر ۳ پاؤ	کھل پا= ۱ سیر ۱ پاؤ
بریانگپا= ۱ سیر	چھوغو چڑی= ۳ پاؤ
ژھونژے چڑی= ۲ پاؤ	برے بدون پا= ڈیڑھ پاؤ
برے غاپا= ۱ پاؤ	

مائع چیزوں کے لئے ایک ہی وزن رائج ہے جسے ''گنگپا'' کہتے ہیں۔ جو تقریباً ایک پاؤ کے برابر ہوتا ہے۔ بلتستان میں قدیم سکے بھی رائج تھے س کی اکائی ''جہ وو'' کہلاتی تھی۔ لیکن اس کے نمونے اب دستیاب نہیں ہیں۔

عرس اور میلے

مجالس محرم واسد اور دیگر عرسہائے مقدسہ:

بلتستان کی سو فیصد آبادی مسلمان ہے جس میں سے نوے فیصد امامیہ اثنا عشریہ شیعہ اور نوربخشیہ پر مشتمل ہے۔ بلتستان میں یہ دونوں فرقے ایران اور لکھنؤ کے طرز پر محرم الحرام اور شمسی ماہ اسد میں واقعہ کربلا کی یاد میں نہایت عقیدت کے ساتھ مجالس عزا منعقد کرنے میں پابند ہونے کے علاوہ منفرد انداز بھی رکھتے ہیں۔ محرم کا چاند دیکھ کر لوگ سراپا غم واندوہ کا نمونہ بن جاتے ہیں اور امام بارگاہوں کو سیاہ پوش کیا جاتا ہے۔ محرم کے پہلے دس روز بالخصوص اور چہلم تک بالوم دنیاوی مصروفیات ترک کر کے زیادہ سے زیادہ شہدائے کربلا کے سوگ میں وقف کر دیتے ہیں۔ ان شہداء کو نذرانہ عقیدت پیش کرنے کے لئے صبح سے شام تک بلتستان بھر کے سینکڑوں امام بارگاہوں میں مجالس عزائے حسینؑ برپا کی جاتی ہیں۔ سال بھر کے ایام مخصوصہ اور عرسہائے چہاردہ معصومین علیہم السلام اور ان کی ولادت کے ایام محلے کی سطح پر ہر گھرانے کے لئے منقسم ہیں جو پابندی کے ساتھ ہر گھر میں منائے جاتے ہیں۔ محرم کی یاد تازہ کرنے اور زیادہ سے زیادہ وعظ ونصیحت کے مواقع فراہم کرنے کے لئے گرمیوں میں یعنی شمسی ماہ اسد کے دوران محرم کی طرح عشرۂ ماتم کی مجالس منعقد کی جاتی ہیں۔ عاشورائے محرم واسد کے دن بلتستان بھر کے مرکزی مقامات کے علاوہ بڑے بڑے مواضع میں ماتمی جلوس نکالے جاتے ہیں جس کا



خانقاہ تھخس خپلو

رواج صدیوں سے چلا آ رہا ہے۔ بلتستان میں جلوس کا سب سے بڑا اجتماع سکردو میں ہوتا ہے۔ ان جلوسوں میں اردو اور بلتی زبانوں میں نوحہ خوانی ہوتی ہے اردو نوحوں کا رواج 1953ء سے شروع ہوا اس سے قبل فارسی اور بلتی نوحے پڑھے جاتے تھے۔ بعض حلقوں یعنی سکردو میں سکمید ان اور رنگا اور کھرمنگ خاص میں کشمیری زبان میں بھی نوحے پڑھے جاتے تھے اب یہ تقریباً متروک ہو چکا ہے۔

بلتستان کے ان جلوسوں میں انتہائی عقیدت واحترام کے علاوہ نظم وضبط کا جو مظاہرہ ہوتا ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔ تمام عقیدت مند حزن وملال کی تصویر بنے ہوئے ننگے سر، ننگے پاؤں، زنجیر زنی کرتے یا حسینؑ یا حسینؑ کی آواز بلند کرتے ہوئے سینہ کوبی کرتے ہیں۔ ان جلوسوں میں کربلا کے ظلم وبربریت کی انسان سوز داستان سن کر لوگ زار وقطار روتے ہیں اور ان واقعات کو بار بار دہراتے ہیں۔ بلتستان میں ہر مجلس کے بعد تبرکات تقسیم کئے جاتے ہیں جن کے لئے محلوں کی سطح پر باقاعدہ باری مقرر ہوتی ہیں۔ محرم اور عرسہائے چہاردہ معصومین علیہم السلام کے موقعوں پر رات کو محلہ کی سطح پر گھروں میں قرآن خوانی اور مجالس عزاء منعقد کی جاتی ہیں۔ یہاں کی روایت کے مطابق ہر دن کی مناسبت سے مخصوص مرثیے اور نوحے پڑھے جاتے ہیں جو بڑے دلسوز ہوتے ہیں۔ نیز بلتی شاعری کا بہت بڑا حصہ مرثیہ

ونوحہ جات پر مشتمل ہے۔

بلتستان میں ان محافل کی نشست و برخاست کے لئے مخصوص آداب و اطوار وضع کئے ہوئے ہیں جن کو بحسن وخوبی بجالانا ہر شخص کے لئے معاشرتی، اخلاقی اور ادبی فرض سمجھا جاتا ہے۔ بلتستان کے یہی منفرد آداب بلتی معاشرہ کو دیگر اقوام سے ممتاز مقام بخشتے ہیں۔ ان محافل ومجالس میں خوشبو کے لئے لوبان، اسپند اور عود وغیرہ مستقل جلانے کا رواج عام ہے۔

بلتستان کے معاشرے میں واقعہ کربلا کے سوگ میں محرم اور صفر دونوں مہینوں میں کسی قسم کی خوشی نہیں منائی جاتی اور لوگ شادی بیاہ کی تقریبات منعقد کرنے سے بھی گریز کرتے ہیں۔

عیدیں:

بلتستان میں ایام ولادت ہائے معصومین علیہم السلام کو انتہائی عقیدت کے ساتھ عید کے طور پر منایا جاتا ہے۔ رات کو محلے کی سطح پر اور دن کو امام بارگاہوں اور خانقاہوں میں محافل میلاد منعقد کی جاتی ہیں۔ بالخصوص 12-17 ربیع الاول کو عید میلاد النبیؐ، 13 رجب کو یوم علیؑ، 3 شعبان کو یوم الحسینؑ، 4 شعبان کو یوم العباسؑ، 11 شعبان کو یوم ولادت علی اکبرؑ، 15 شعبان کو یوم العصرؑ حضرت امام مہدیؑ، 27 رجب کو شب معراج اور 18 ذوالحجہ کو عید غدیر کے سلسلے میں بڑی آب و تاب کے ساتھ جلسے منعقد کئے جاتے ہیں۔ عید کی ان محفلوں میں بلتی زبان میں حمد و نعت، قصائد چہاردہ معصومینؑ، گوشوارے (مثنوی) اور بحر طویل (رزمیہ) جیسے اصناف سخن کے گلدستے نچھاور کئے جاتے ہیں اور دینی علماء حاضرین جلسہ کو فن خطابت سے مستفید کرتے ہیں۔

علاوہ ازیں عید الفطر اور عید الاضحیٰ کے روز عیدگاہوں اور مسجدوں میں نماز عید ادا کی جاتی ہے۔ بلتستان کے معاشرے میں نوروز، عید الفطر اور عید غدیر کے روز ہاتھوں میں مہندی لگانا، نئے کپڑے پہننا اور ایک دوسرے کے گھروں میں مبارک باد کے لئے جانا انتہائی ناگزیر سمجھا جاتا ہے۔

حج بیت اللہ وزیارات مقامات مقدسہ:

اگرچہ بلتستان کے عام لوگ معاشی طور پر پسماندہ اور غریب ہیں تاہم اسلامی اقدار کی پاسداری اور اصول واحکام کے مطابق استطاعت رکھنے والے لوگ حج بیت اللہ کی بجا آوری کے سلسلے میں بڑے پابند ہیں۔ اس کے علاوہ شیعہ اور نوربخشیہ مسلک کے پیروکار کربلائے معلیٰ، نجف اشرف، کاظمین اور مشہد مقدس میں موجود آستانہ ہائے اہلبیت علیہم السلام کی زیارت کرنا انتہائی سعادت اور خوش قسمتی سمجھتے ہیں۔

بلتستان میں مروجہ روایات کے مطابق حج یا زیارات کے عازم کو اپنے رشتہ دار اور تعلق دار گھر پر مدعو کرتے ہیں اور ضیافت کے بعد ان کو اپنی استطاعت کے تحت کچھ رقوم بطور تحفہ دیتے ہیں اور ساتھ ہی انہیں اپنے حق میں دعائیں کرنے کی درخواست کرتے ہیں۔ عازم سفر شخص مذہبی اجتماعات میں لوگوں سے اپنی سابقہ لغزشوں اور کوتاہیوں کے بارے میں ندامت کا اظہار کرتے ہوئے معافی طلب کرتا ہے۔ سفر سے ایک روز پہلے اپنے تمام حقداران اور عزیز واقرباء کو اپنے گھر دعوت کرتا ہے اور رخت سفر باندھتا ہے۔ صبح سویرے عزیز واقارب اور گاؤں کے لوگ صلوٰۃ ودرود کی گونج میں انہیں الوداع کرتے ہیں۔ حجاج جب اپنا مقدس سفر مکمل کر کے واپس آتے ہیں تو تمام رشتہ دار اور اعزاء انتہائی عقیدت واحترام کے ساتھ استقبال کے لئے جوق در جوق میلوں دور تک ان سے ملنے جاتے ہیں اور ہفتہ بھر ان کے گھر میں کھانے پینے کا دور چلتا ہے۔ حاجی یا زوار ہر ملاقاتی کو سجدہ گاہ، تسبیح، خرما، شیرینی اور آب زم زم اپنے ساتھ لا کر بطور تحفہ پیش کرتا ہے۔ قریبی رشتہ دار خواتین کے لئے جوڑے اور دوپٹے بھی دیتا ہے۔ نیز عمر رسیدہ اور مخصوص قریبی رشتہ داروں کے لئے کلمہ شہادت لکھا ہوا کفن بھی سوغات کے طور پر لاتا ہے۔ بعد ازاں حاجی یا زوار کو تمام رشتہ دار اور تعلق دار پہلے کی طرح باری باری اپنے ہاں دعوت پر بلاتے ہیں۔

ختم قرآن:

بلتستان میں ختم قرآن کی تقریبات مختلف مواقع اور ایام کی مناسبت سے منعقد ہوتی ہیں۔ مثلاً اموات، برسی، عرسہائے چہاردہ معصومین علیہم السلام، شادی بیاہ اور نذر ونیاز کے موقعوں پر قرآن خوانی کی جاتی ہے جو ''ختم قرآن'' کہلاتی ہے۔ ان تقریبات میں شریک ہر شخص قرآن مجید کے ایک یا دو پارے پڑھتا ہے اور مرحومین کی ایصال ثواب کے لئے فاتحہ خوانی کی جاتی ہے۔ بعد ازاں ''مرزن'' اور ''کھوربا'' معہ گوشت اور چاول سے ان قرآن خواں اور ملاؤں اور قاریوں کی خاطر تواضع کی جاتی ہے۔ اب کھانے پینے کی چیزوں میں جدیدیت آچکی ہے۔

شب برات:

شعبان المعظم کی چودہ اور پندرہ کی درمیانی رات کو بلتستان بھر میں

انتہائی عقیدت کے ساتھ منائی جاتی ہے۔ رات کو پہاڑوں' اونچی جگہوں اور گھروں میں خوشی کے اظہار کے طور پر چراغاں کیا جاتا ہے۔ شام کے وقت سب لوگ صدقہ وخیرات لے کر قبرستانوں پر پہنچ جاتے ہیں اور اپنے بچھڑے ہوئے عزیزوں کی قبروں پر چراغ جلانے کے بعد فاتحہ پڑھتے ہیں۔ کچھ عرصہ قبل تک رواج کے مطابق محلے کی سطح پر مقررہ ملاؤں کی ذمہ داری ہوتی تھی کہ وہ گھر گھر جا کر اپنے اپنے حلقے کے لوگوں کو اون کی بتیاں ''سیار'' بنا کر دے دیں۔ ان بتیوں کے عوض ہر گھرانے پر لازم تھا کہ متعلقہ اخوند یا ملا کو کم از کم ایک ٹوپہ ''برے'' (برابر ہے پانچ پاؤ) آٹا دے دیں۔ آج کل کے رواج کے مطابق بازار سے موم بتیاں لا کر جلائی جاتی ہی۔ اس دن جگہ جگہ عید کی محفلیں منعقد کی جاتی ہیں۔ آخر شب کو امامیہ مسلک سے تعلق رکھنے والے حضرات عریضہ پھینکنے کی غرض سے دریا کے کنارے پہنچ جاتے ہیں۔ عریضہ مخصوص عربی عبارت میں دستیاب ہوتا ہے۔ اس میں ہر شخص اپنی حاجت لکھ کر گندھے ہوئے آٹے میں ڈال کر ''یا حسین بن روح'' پکارتے ہوئے دریا میں ڈال دیتا ہے اور یوں مرادیں پانے کا عقیدہ رکھتے ہیں۔

جشن نوروز:

بلتستان میں جن تہواروں کو شروع سے عوامی اور سرکاری سطح پر تسلیم کیا گیا ان میں نوروز کا تہوار سب سے زیادہ مقبول ہے۔ یہ 21 مارچ کو منایا جاتا ہے جو شمسی سال کا پہلا دن ہوتا ہے۔ اس مناسبت سے اس دن ایران کی طرح بلتستان میں بھی بڑی دھوم دھام سے جشن منایا جاتا ہے۔ گھروں میں ہر قسم کے لذیذ کھانوں سے دسترخوان کو سجایا جاتا ہے اور مبارک باد کے لئے آنے والوں کی خوب تواضع کی جاتی ہے۔ نوروز کے دن ہاتھوں میں مہندی لگانا' نئے کپڑے پہننا' خوشبو لگانا اور ایک دوسرے کے گھروں میں مبارک باد کے لئے جانا ناگزیر سمجھا جاتا ہے۔ بلتستان میں اس روز انڈوں کا کھیل بہت مقبول ہے جسے انڈے لڑانا کہتے ہیں۔ بلتستان میں نوروز کے دن آج بھی بچوں کو رنگین انڈے بطور عیدی دیئے جاتے ہیں۔ داماد اور سسرال کے مابین بھی انڈوں اور پکے ہوئے کھانوں کے تبادلہ کا رواج عام ہے۔ نوروز کے دن بلتستان بھر میں خوشیاں منائی جاتی ہیں۔ سرکاری سطح پر خصوصی جلسہ منعقد کیا جاتا ہے جس میں موسیقی' پولو اور دیگر کھیلوں کے مظاہرے ہوتے ہیں۔

یوم آزادی:

چونکہ 14 اگست 1948ء کو بلتستان کی آزادی کا دن ہے۔ یہ حسن اتفاق ہے کہ پاکستان کی آزادی کا دن بھی اسی تاریخ کو پڑتا ہے۔ اس لئے یہ دن سرکاری اور عوامی سطح پر نہایت دھوم دھام سے منایا جاتا ہے اور اس موقع پر کھیلوں کے مقابلے' ثقافتی مظاہرے' مشاعرے اور تقریری اجلاس منعقد کئے جاتے ہیں۔ 14 اگست کی شام کو تمام دوکانوں' بڑی بڑی ارتوں اور اونچی اونچی جگہوں پر چراغاں کیا جاتا ہے اور اہم قومی ارتوں پر پاکستان کا پرچم لہرایا جاتا ہے۔

مے پھنگ (آتش بازی)

بلتستان کا ایک قدیم تہوار ''مے پھنگ'' کہلاتا ہے جو ہر سال 21 دسمبر یا اس کے بعد مسلسل تین جمعرات کی شاموں کو چراغاں کی شکل میں منایا جاتا ہے۔ 21 دسمبر چونکہ تبتی جنتری کی رو سے سال کا نیا دن ہے۔ اس لئے یہ دن بلتستان سمیت تمام ملک ہائے تبت میں لوسر تہوار یعنی ''نیا سال'' کے نام سے منایا جاتا ہے۔ ''لوسر'' بلتی زبان کے دو الفاظ کا مجموعہ ہے۔ ''لو'' بمعنی سال اور ''سر'' بمعنی نیا۔ اس موقع پر ہر گھر میں دعوت خاص کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ البتہ بلتستان کے مختلف علاقوں اور وادیوں میں اس تہوار کے طریقے قدرے الگ ہیں۔

بلتستان کے بعض بزرگ اس رسم کو مقپون راجہ عبدل خان ''می زوس'' یعنی آدم خور کے قتل کے واقعے سے مربوط کرتے ہیں اور بعض لوگ اسے 21 دسمبر کے بعد سے رات چھوٹی اور دن لمبا ہونے کی خوشی کے اظہار سے تعبیر کرتے ہیں۔ بعض کا کہنا ہے کہ پہلے پہل یہ ایک جنگی سگنل کے طور پر ادا کیا گیا تھا۔ بعد میں یہی ایک مستقل روایت بن گئی۔ یہ رسم کبھی علاقہ گلگت میں بھی عروج پر تھی جسے شنا زبان میں ''تالینی'' کہتے ہیں جو روایت کے مطابق وہاں کے ایک جابر وظالم راجہ شری بدت (آدم خور) کو مارنے اور اس کی روح کو ڈرانے کے لئے شروع کیا تھا۔ چترال میں یہ رسم ''چاؤ ماس'' کہلاتی ہے اور بتایا جاتا ہے کہ کیلاش متھالوجی میں اس تہوار کا تعلق سورج کے روایتی سفر کے ساتھ ہے اور وہ بھی اسے نیا سال شروع کرنے کا ایک طریقہ قرار دیتے ہیں۔ گردوپیش کے علاقوں میں موجود ان روایات کی روشنی میں معلوم ہوتا ہے کہ بلتستان میں بھی یہ تہوار خالصتاً موسمی نوعیت کا ہے۔

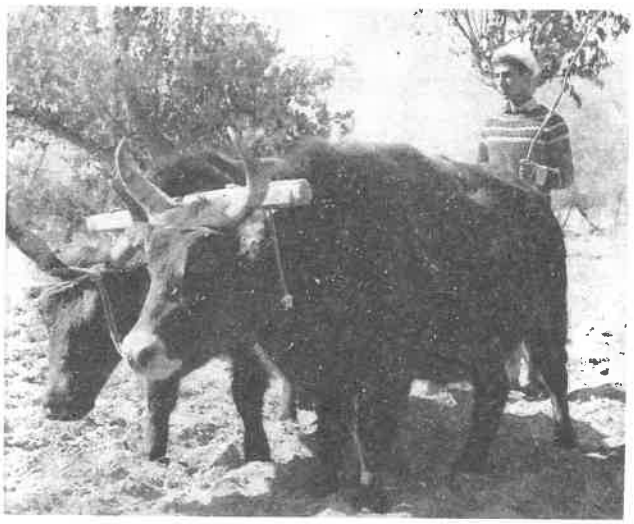
بلتستان میں مذکورہ تاریخ کو شام کے وقت ہر گاؤں کے نوخیز لڑکے ترجیحاً جونیپر یا کسی بھی خشک لکڑی کے تنکوں کو گچھا بنا کر اسے آگ جلاتے ہیں جسے ''ڈنڈر'' یا ''رنڈر'' کہتے ہیں۔ جوان لڑکے یہ مشعل ہاتھوں میں اٹھائے ہوئے اونچی جگہوں' پہاڑوں اور ٹیلوں پر نکلتے ہیں اور ان کو ہوا میں لہراتے ہوئے نیچے اتر جاتے ہیں۔ ہر کوئی اپنے ساتھ کھانے کی کوئی چیز مثلاً ہرژب کھور' کیسر اور کھور با وغیرہ بطور صدقہ لے جا کر ایک دوسرے کو بانٹ دیتے ہیں۔ ان مشعلوں کو

'بلافرکھیر'' یعنی رد بلا کہہ کر پھینک دیتے اور واپس آتے ہیں۔ اس رات ہر گھر میں خصوصی طور پر کھانے پینے کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ بالخصوص سری پائے ضرور پکائے جاتے ہیں۔ جس گھر کا کوئی فرد سفر پر ہونے کی وجہ سے گھر پر نہ ہو تو اس گھر سے مشعل نکالنا بدشگون سمجھا جاتا ہے۔ نصف صدی قبل تک بلتستان میں اسی تہوار کے مواقع پر رات کو تمام چھوٹے بڑے مل کر ناچ گانے کی محفلیں منعقد کرتے تھے جس کا مقصد روایات کے مطابق ''ہلا اور ہلاٹو'' یعنی دیوی اور دیوتاؤں کو خوش رکھنا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اس تہوار سے متعلق مقامی راگ بھی موجود تھے لیکن اب مستعمل نہیں اور گذشتہ پندرہ بیس سالوں سے رسم ''مے پھنگ'' کا زور ہی ٹوٹ رہا ہے۔ البتہ دور دراز دیہاتوں میں علامتی طور پر اس تقریب کو مناتے ہیں۔ ثقافتی یلغار کے اس پُرآشوب دور میں یہ بھی بڑی بات ہے۔

سَون بَور (بوائی):

بلتستان کے کاشتکار صدیوں سے اپنے آباء و اجداد کے روایتی طور طریقوں پر کاشت کاری کرتے رہے ہیں۔ یہاں جدید مشینی کاشت کا دور اب کچھ عرصے سے شروع ہوا ہے۔ بلتستان کی مختلف وادیوں میں کاشت کے نظام الاوقات بھی مختلف ہیں۔ پائنی علاقوں میں یکم مارچ سے تیس مارچ تک کا عرصہ فصل ربیع کی کاشت کا وقت معین ہے۔ البتہ بالائی بستیوں میں اپریل میں بھی کاشت کی جاتی ہے۔ جب کاشتکاری کا موسم شروع ہوتا ہے لوگ محلے کے کسی اخوند یا عالم دین سے اسلامی تقویم کے مطابق نیک ساعت کا پوچھ کر پہلے کچھ دانے زمین میں دبا لیتے ہیں۔ جسے ''سَون بَور'' کہتے ہیں۔ بعدازاں اپنے علاقے کے رواج کے مطابق دو بیلوں یا بزو (یاک اور گائے کی مشترکہ نسل) اور بعض علاقوں میں گھوڑے پر جوا چڑھا کر کھیت میں ہل جوتا جاتا ہے۔ بلتستان میں کھیتی باڑی کے کاموں کو منظم امداد باہمی کے ذریعے انجام دیا جاتا ہے۔ کھیتی باڑی کے لئے ایک دوسرے کی مدد کرنے کو ''روخ زدے'' یا ''لق زدے'' کہتے ہیں۔ ایک دوسرے کی مدد اس شرط پر کی جاتی ہے کہ کل دوسرا بھی اسی طرح فریق اول کے ساتھ مل کر اس کا کام نمٹائے گا۔ کھیتی باڑی کے مویشیوں کو بھی امداد باہمی کے مروجہ قوانین کے تحت دو گھرانے مل کر کام کرتے ہیں۔

بلتستان میں پہلی بار کاشت کے لئے بیلوں کو کھیت میں لے جاتے وقت کھاچی ''زان'' ایک پلیٹ ''ذویر'' جس میں مکھن ڈال کر یا میٹھی روٹی ''ہرژب کھور'' کو اپنے قریبی رشتے دار اور حقدار یعنی ہمسائے' بہنیں اور بیٹیاں جن کی شادیاں ہو چکی ہوں کو اپنے شوہروں اور بچوں سمیت بلا کر ''خلنگ زون'' یعنی ہل



ایک بلتی کسان یاک نسل کے جانور ''بزو'' سے ہل چلا رہا ہے

چلانے کی رسمی ضیافت دی جاتی ہے۔ یہ عمل فصل ربیع کی کاشت پر کیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ فصل خریف کے موقع پر بھی ہل چلایا جاتا ہے۔ نیز فصل اٹھانے کے بعد زمین کو نرم رکھنے کی خاطر ایک دفعہ ''لوق چق'' اور ایک دفعہ ''لوقمہ'' کے نام سے ہل چلائے جاتے ہیں۔ لیکن ان موقعوں پر دعوتیں نہیں ہوتیں۔ واضح رہے کہ بلتستان میں زمین کو زرخیز بنانے کے لئے چوپایوں کے لید اور گوبر سے کھاد بنایا جاتا ہے۔ نیز بیت الخلاء کا کھاد بھی کھیتوں میں استال کیا جاتا ہے۔ اب پچھلے دو تین عشروں سے پاکستان کے زیرین علاقوں سے کیمیائی کھاد برآمد کر کے استال کیا جا رہا ہے۔

بلتستان میں دو دفعہ پانی دینے کے بعد کھیت سرسبز ہو جاتے ہیں اور گوڈی کرنے کے قابل بن جاتے ہیں۔ عہد رفتہ میں کھیتوں میں گوڈی کرتے وقت یہاں کی عورتیں دھیمی آواز میں گنگنایا کرتی تھیں اور اس گنگناہٹ کے لئے مخصوص گیت بھی موجود تھا جو ''یورمی خلو'' کہلاتا ہے۔ اس گیت میں عام طور پر عورتیں اپنے عزیزوں اور والدین کی محبت' اپنے میکے نہ پہنچنے کے غم اور زندگی کے مختلف تجربات و مشاہدات کا ذکر کیا کرتی تھیں۔ ان گیتوں کے ذریعے جہاں وہ اپنا دکھ درد اور جذبات کا اپنی سہیلیوں کے سامنے اظہار کرتی تھیں وہاں کھیتوں میں چلچلاتی دھوپ میں کئی کئی گھنٹے گوڈی وغیرہ کرنے کی تھکن اور بوریت کو دور کرنے کے لئے تفریحی ذریعہ بھی بن جاتے تھے۔ گیت کا ایک نمونہ معہ ترجمہ درج ذیل ہے۔

ا۔ بونو بنگ بنگ بگیو کے لستیا نکسی ٹوق لاتھون
لستیا نگ خسیری ٹوق لانگ اتی رنگ یُل تھوفید
اتی رنگ یولی تھوقنہ ترنگ لق خیون لق سکوروک

لقپو نگ بوٹو ے خلدنا درگی فو تو نگ سکوروک
فو تو نگ بوٹو ے چھدنا جہانی ستروق سکوروک

۲۔ بوٹو بنگ بنگ بگیو کسے گونگمہ رزینگ کھی کھہ تھون
گونگمانہ رزینگ کھی کھہ غدونگنہ لقپو نہ ریونگ کھڑوس
بوٹو غدونگپو کھڑو سے جند ینگ لقپہ چک تنگس
جند ینگ لقپہ بور بنا لقپینگ میلونگ یو اونگس
میلونگ سینگ ہلتا نہ بوٹو ہر کا بید سونگسوک

۳۔ بوٹو ے اتی شز دیکھہ بہ خسومی بجون کلسید
گومگو یکھی گونگبو ریونگ ہلڑ خمہ نا چونبجو نی سکل
دوبی جوگی گونگبو ریونگ بوٹو ے نیا مژھری سکل
دوبی جوگی گونگبو ریونگ اپو میسپو نی سکل
دوبی جوگی گونگبو ریونگ بوٹو ے گوسکوت سونگسوک

ترجمہ:

۱۔ میں سرپٹ دوڑتی ہوئی اوپر ٹیلے پر پہنچ گئی۔ اسی سنہرے ٹیلے سے مجھے اپنا وطن نظر آتا ہے۔ وطن سے محبت کے اظہار کے لئے میں اپنے ہاتھوں کو ہلاؤنگی۔ میرے ہاتھ تھک جائیں تو ریشمی آستینوں کو ہلاؤنگی۔ اگر آستین پھٹ جائیں تو میں اپنی عزیز جان قربان کروں گی۔

۲۔ میں سرپٹ دوڑتی ہوئی اوپر تالاب پر پہنچ گئی۔ اوپر تالاب کے پانی سے میں نے ہاتھ منہ دھو لئے۔ میں نے منہ دھو کر جیب میں ہاتھ ڈالا۔ جیب میں ہاتھ ڈالنے سے آئینہ ہاتھ میں آیا۔ آئینہ میں دیکھنے سے معلوم ہوا کہ میری زلفیں جھڑ چکی تھیں۔

۳۔ میرے باپ کی مہربانی سے تین گائے کے مکھن بھیجے ہیں۔ اس کا پہلا حصہ چودہ معصومین کے نام اس کے بعد کا حصہ آباواجداد کے نام اس کے بعد کا حصہ میری سہیلیوں کے نام اور اس کے بعد کا حصہ میرے بالوں کے لئے مالش ہوگی۔

ستروب لہ (خوشوں کا میلہ):

جو کے خوشوں میں سبز دانے بھرنے پر بلتستان میں ''ستروب لہ'' کی رسم منائی جاتی ہے۔ ''ستروب لہ'' کے معنی ہیں خوشوں کا میلہ۔ گویا اس تہوار کا محرک مسرّت وشادمانی کی وہ لہر تھی جو فصل کے پکنے پر کسانوں کے رگ وپے میں دوڑ جاتی ہے۔ اس موقع پر کھیت سے سبز خوشوں کو چن کر گھر لاتے ہیں۔ انہیں گچھے کی شکل میں پانی میں ڈال کر پکاتے ہیں اور کلٹہ کی پشت سے رگڑ کر دانے نکالتے ہیں۔ دانوں کو ہاوند میں کوٹتے' مرچ ونمک ڈالتے اور سب سے پہلے ایک پلیٹ محلے کی مسجد' امام بارگاہ' خانقاہ میں صدقہ کے طور پر لے جاتے ہیں۔ باقی اپنے گھر میں استعمال کرتے ہیں۔ یہی طریقہ ہر گھر میں ہوتا ہے۔ اس کا فلسفہ یہ بتایا جاتا ہے کہ نئی فصل تیار ہوگئی اور علاقے سے اناج کی قلت دور ہوگئی۔ اس موقع پر خوشیاں منائی جاتی ہیں۔ گویا یہ نئی فصل کی خوشی کا تہوار ہے۔ اس کے ساتھ ہی بلتستان کے بعض علاقوں میں ایک رسم ''پھوق'' بھی ادا کی جاتی ہے یعنی ایک برتن میں لوبان' اسپند اور بھوج پتر کے چھلکے ''چوا'' جسے یہاں متبرک سمجھا جاتا ہے کو جلا کر کھیتوں کے اردگرد پھرایا جاتا ہے جس کا مطلب کھیتوں اور فصلوں کو آسیب سے پاک کرنا اور چشم بد سے محفوظ رکھنا ہے۔ یہ اپنی نوعیت کا ایک منفرد سماجی تہوار تھا۔ اب گزشتہ پندرہ بیس برسوں سے اختتام پذیر ہے۔ بتایا جاتا ہے کہ قدیم بلتستان میں ''ستروب لہ'' کے موقع پر عظیم الشان جلسہ منعقد ہوتا تھا جس میں ناچ گانے پیش کیئے جاتے تھے۔ ضیافتیں ہوتی تھیں اور لوگ اس کی رنگینیوں سے لطف اندوز ہوتے تھے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اشاعت اسلام کے بعد ان رنگینیوں کو اسلامی روایات میں منتقل کیا گیا ہے۔

بروق کھیر (مویشیوں کی بالائی چراگاہوں کی طرف منتقلی):

بلتستان کے پالتو چوپایوں میں گائے' بکری' بھیڑ' بزو' یاک (ہیاق) گدھے اور گھوڑے قابل ذکر ہیں۔ ان کی افزائش محدود اور آمدن بہت کم ہے۔ چونکہ یہاں میدانی علاقوں کی نسبت چراگاہوں کی کمی ہے اس لئے یہاں ملک کے زیرین علاقوں کی نسبت ریوڑ میں مال مویشوں کی تعداد کم ہوتی ہے اور موسمی شدت کی وجہ سے مویشی نہایت پستہ قد بھی ہوتی ہیں۔ بلتستان میں بالائی طبقہ کے اکثر خاندان اپنے مویشیوں کے لئے گھر سے دور کھیتوں کے کنارے جگہ بناتے ہیں جسے ''برہ'' ''ہرال'' ''شقرا'' یا ''تغرہ'' کہا جاتا ہے۔ موسم گرما میں یہ مویشیاں چرائی کے لئے اونچی پہاڑی چراگاہوں پر لے جائے جاتے ہیں۔ بلتستان کے ہر گاؤں کے لئے ایک پہاڑی چراگاہ مخصوص ہے جسے مقامی زبان میں ''بروق'' کہتے ہیں۔ وہاں بھی جگہ جگہ بکر کوٹھے بنائے جاتے ہیں جو ''خلاس'' کہلاتے ہیں۔ ہر سال جون کے اوائل میں مویشیوں کو اس جگہ لے جاتے ہیں۔ اس تہوار کے لئے

بڑی تیاری کرنی پڑتی ہے۔ فصل خریف کے اٹھاتے ہی پہاڑوں پر برف باری کی وجہ سے سردی جب بڑھنے لگتی ہے تو مویشیوں کو چراگاہوں سے پائینی علاقوں میں لایا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ جو مویشی بستی میں پابند ہوتے ہیں انہیں بھی چرائی کے لئے آزاد چھوڑ دیا جاتا ہے۔ صرف کھاد حاصل کرنے اور مویشی کو درندوں سے بچانے کے لئے شام کو بند کر دیتے ہیں۔ گاؤں میں کسی کے گھر پہاڑی چراگاہ پر جانے والا کوئی مناسب فرد موجود نہ ہو تو وہ اپنے مال مویشی محلے کے کسی دوسرے کو ''مارچھد'' یعنی گھی کے لئے کرایہ پر دیتا ہے اور اس کے معاوضے میں اس شخص سے دودھ کے حساب سے مکھن وصول کیا جاتا ہے۔ مال مویشی پہاڑی چراگاہ پر لے جانے کی رسم کو ''بروق کھیر'' کہا جاتا ہے۔ اس موقع پر شام کو قریبی رشتہ دار مدعو کیئے جاتے ہیں اور مویشیوں کو پہاڑ پر لے جانے کے لئے رات بھر تیاریاں ہوتی ہیں اور علی الصبح بڑی دھوم دھام کے ساتھ روانہ ہوتے ہیں اور اس قافلہ میں عورتیں، بچے اور جوان سبھی شامل ہوتے ہیں ۔ بلتستان کی بعض وادیوں اور دیہاتوں میں شراکت کی بنیاد پر بھی مویشی پالے جاتے ہیں جو عام طور پر دو افراد کے درمیان ہوا کرتے ہیں۔ اگر دو افراد کے درمیان ایک جانور شراکت کی بنیاد پر ہو تو اس کی پرورش اور اس کے دودھ سے استفادہ لینے کے لئے ایک سال کی باری لگائی جاتی ہے یا ایک ہی فریق کے پاس رکھ کر دوسرے فریق کو اس کے عوض مختلف علاقوں میں مروجہ رواج کے مطابق مکھن دیا جاتا ہے۔

گڈریا بلتستان کے جوانوں میں ایک روایتی کردار ہے۔ یہ گڈریئے صبح طلوع آفتاب کے وقت بکریاں چراگاہ میں لے جاتے ہوئے آواز دے دے کر لوگوں کو خبردار کرتا ہے۔ اس وقت گھر گھر سے بچے، بچیاں اور نوجوان لڑکیاں اپنی اپنی بکریوں کا گلہ ریوڑ میں شامل کرنے کے لئے لے جاتے ہیں۔ یہ گاؤں کا انتہائی دلکش منظر ہوتا ہے۔ بکریوں کا گلہ باہر نکالتے وقت بچے اپنے بزرگوں کی ہدایت کے مطابق روزانہ ان بکریوں سے مخاطب ہو کر یہ الفاظ کہتے ہیں۔

''نور گولا مہ سونگ ہبو فو قتوک' نور جوک لہ مہ دوک ہلٹا نو فو قتوک' نور سکل لہ دوک ہے رینمو شونگ'' (ترجمہ) سب سے پہلے نا جانا کہیں بھیڑیا کھا جائے گا۔ سب سے پیچھے بھی نہ رہنا' گڈریئے کی لاٹھی پڑ جائے گی بلکہ ریوڑ کے بیچ میں رہنا۔ اسی میں سلامتی ہے۔

بلتستان میں چرواہے یاک یا بزو کے سینگ سے بنایا ہوا بگل ''ٹوٹو'' اپنے ساتھ رکھتے ہیں۔ چراگاہ میں پہنچ کر وہ مختلف اوقات میں اس سینگ کے اندر پھونک کر ''ٹوٹو'' بجاتا ہے جس کی آواز سے پوری چراگاہ کی فضا گونج اٹھتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ''ٹوٹو'' کی آواز سے بھیڑیئے اور دیگر جنگلی درندے خوفزدہ ہو کر بھاگ جاتے ہیں۔



بلتستان میں فصل گاہنے کا روایتی انداز

ریوڑ چراتے چراتے چراگاہ میں اگر کوئی بکری یا بھیڑ بچہ دے تو گڈریا اس بکری یا بھیڑ کے بچے کے جسم کو چھڑی سے لمبائی میں ناپ کر اپنے ساتھ گاؤں لے آتا ہے۔ گڈریئے کو چونکہ اس دن مول سے زیادہ زحمت اٹھانا پڑتی ہے۔ اس لئے وہ مالک سے کھانے پینے کے کچھ تحائف طلب کرنے کا حقدار ہوتا ہے جو مالک اسے دے دیتا ہے۔ بسا اوقات نہ دینے کی صورت میں گڈریا اس جانور کے جسم کے برابر ناپ کی ہوئی چھڑی توڑ دیتا ہے۔ اس وقت دروغ بہ گردن راوی بکری یا بھیڑ کا بچہ مر جاتا ہے۔

بلتستان بے حد سرد علاقہ ہے جس کی بنا پر کئی کئی دن تک دودھ دہی کی شکل اختیار نہیں کرتا۔ گرمیوں میں دودھ کو تازہ رکھنے کے لئے گھر سے باہر کوہلوں کے قریب گھنی چھاؤں میں فریزر کے طور پر چھوٹا سا زمین دوز گڑھا ''اوتا کھوڑو'' یا ''بجون کھنگ'' بنایا جاتا ہے۔ دہی بننے اور اس کی معقول مقدار جمع ہونے کے بعد وہی بکرے یا بھیڑ کی مشک یا مٹی کے مٹکوں میں ڈال کر بلو لیتے ہیں۔ اس کے بعد مکھن اور لسی الگ الگ کیئے جاتے ہیں۔ لوگ اسلامی عقائد کی بنیاد پر مکھن کا کچھ حصہ جو شروع میں حاصل ہوتا ہے چہاردہ معصومین علیہم السلام کے نام نذر و نیاز کے طور پر قرابت داروں میں بانٹ دیتے ہیں۔

اونگ چوس:

بلتستان میں فصل کو گاہنے کے لئے گندم کے پودوں کو ایک گول چبوترے

''خیول''، یعنی کھلیان میں بکھیر دیا جاتا ہے جس کے مرکز میں ایک قد آدم کھونٹا گاڑا جاتا ہے۔ اسے ''خیول شینگ'' کہتے ہیں۔ آٹھ دس بیل یا گدھے، گھوڑے اور بزو کو باہم ایک دوسرے کے ساتھ چمڑے کی پٹی نمارسی ''بڑانگمہ'' سے باندھ کر اس کا سرا کھونٹے کے ساتھ باندھ دیا جاتا ہے۔ گندم یا جو کی کٹے اور سوکھے ہوئے ڈھیروں ''سوق'' کے اوپر جانور کی یہ قطار دن بھر چکر کاٹتی ہے۔ کسان پنج انگلی 'سوق کھ ژے'' سے گندم کے تنکوں کو الٹ پلٹ کر کے درست کرتا اور باری باری ایک شخص اس قطار کے پیچھے جانوروں کو ہانکتا رہتا ہے۔ اس طرح یہ جانور اپنے پاؤں تلے بچھے ہوئے گندم کے ڈھیروں کو کچل کر بھوسہ بنا دیتے ہیں چونکہ یہاں مویشیوں کی تعداد زیادہ نہیں ہے۔ اس مقصد کے لئے اوسطاً ہر گھر میں ایک بیل' ایک بزو یا ایک گدھا ہوتا ہے۔ اس لئے یہاں کے لوگ سوکھی ہوئی فصلوں کو گاہنے کے لئے اپنے بیل گدھے اور گھوڑے ایک دوسرے سے باہمی تعاون کے طور پر مستعار لیتے ہیں اور آپس میں باریاں مقرر کر لیتے ہیں۔ گندم کو گاہنے کا یہ وہی طریقہ ہے جو ہزاروں سال پرانا ہے۔ فصل گاہنے کا ل ختم ہونے کے بعد ان جانوروں کو چھوڑتے وقت گھر کی مالکن درج ذیل دعائیہ کلمات پڑھتے ہوئے ان کو چھوڑ دیتی ہے:

اونگ بور ' اونگ بور ' اونگ بور
بخشش بیوس ہے لے رینمو شیونگ
بیا زوسپونگ 'بیو زوسپونگ 'بیاروغی زوسپونگ
بانی زوسپونگ 'لڑانو زوسپونگ' گنگمہ کھیونگ سے نابرکت بور
پنجتنؑ برکت پو' ہلہ حمہ چوبجی برکت پو' امام چونسیؑ برکت پو
گنگمہ کھیونگ سے نئی اونگ پو ینگ بور

ترجمہ:

فصل زیادہ ہو۔ خرمن ڈال اے بے گناہ حیوانو! تم معاف کرنا چوہے کے کھائے ہوئے' پرندوں کے کھائے ہوئے' کوّے کے کھائے ہوئے' بیل گائے کے کھائے ہوئے' مینڈک کے کھائے ہوئے سب کو لاکر برکت دے۔ پنجتن پاکؑ کی برکت' چہاردہ معصومینؑ کی برکت' بارہ اماموںؑ کی برکت سب لاکر ہمارے خرمن کے ڈھیر میں شامل کر۔

بعد ازاں کھلیان میں بھوسے کے ڈھیر ''برزلیس'' کو چھوٹی پنج انگلی ''پھیار کھ ژے'' سے ہوا میں اچھال اچھال کر دانے الگ کرتے ہیں۔ جس دن دانے صاف ہو کر الگ ہو جائیں تو اس رات کو دانے گھر میں لانے کے لئے خصوصی اہتمام کیا جاتا ہے جسے ''اونگ چوس'' یا ''اونگ دق'' کہتے ہیں۔ رات کو اپنے قریبی رشتے داروں کو ضیافت ہوتی ہے اور صدقہ وغیرہ دے کر اور ایک بزرگ شخص باوضو ہو کر کھلیان میں دعائیں پڑھتے ہوئے غلہ کو چمڑے کی بڑی بڑی تھیلیوں (کیالبو) میں بھر دیتا ہے۔ اس کے بعد ان تھیلوں کو گھر میں لاتے ہیں۔ واضح رہے کہ غلے کے انبار ''اونگ'' کو تھیلیوں میں بھرتے وقت بات چیت کرنا یا کسی اور کام کی طرف توجہ دینا روایتی طور پر سخت ممنوع سمجھا جاتا ہے۔ کہتے ہیں اس دوران بات چیت کرنے سے برکت نہیں آتی۔ اب پچھلے ایک عشرے سے تھریشر مشین کے استعمال کے بعد میدانی علاقوں میں یہ رواج تقریباً متروک ہو چکا ہے۔ یاد رہے کہ سکردو میں سب سے پہلے تھریشر مشین 1979ء میں پہنچی ہے۔ البتہ دور دراز پہاڑی علاقوں میں جہاں تھریشر مشین نہ پہنچی ہو فصل گاہنے کا وہی پرانا طریقہ اب بھی مروج ہے۔

شہ لین اور گرون (نوجوانوں کی تفریحی ضیافت):

سردیوں کے موسم میں جوان لڑکے اپنی سوسائٹی میں مل کر شوقیہ طور پر بکرا یا مینڈھا ذبح کرتے ہیں اور اس کا گوشت راتوں رات پکا کر برابر تقسیم کر کے کھاتے ہیں۔ اسکی قیمت گندم یا روپیہ کی صورت میں ہر حصہ دار ادا کرتا ہے۔ یہ رسم ''شہ لین'' کہلاتی ہے۔ اس موقع پر تفریح کے لئے ذبیحہ بکرے کی پکی ہوئی ران کی ہڈی کو توڑنے کی شرط لگتی ہے۔ بازی جیتنے والے کو شہ لین کی تقسیم میں سے ایک حصہ مزید دیا جاتا ہے جس سے بکرا یا مینڈھا خریدا جاتا ہے اس کو بطور قمت اگلی فصل سے غلہ دیا جاتا تھا کیونکہ نقد پیسوں کی سخت قلت تھی۔

اسی طرح محلے کے ہم راور ہم خیال لڑکے کبھی کبھار اپنی بوریت دور کرنے کے لئے ایک جگہ جمع ہو کر چندہ کر کے کھانے پینے کا خصوصی انتظام کرتے ہیں جسے ''گرون'' اور بعض علاقوں میں ''دوس کیوس'' کہتے ہیں۔ یہ رسم محض سوسائٹی میں مل بیٹھنے کی غرض سے بجالاتے ہیں جہاں داستان اور کہانیاں سنائی اور سنی جاتی ہیں۔ بعض اوقات پہیلیاں بھی بوجھتے ہیں یا دو ٹیمیں بنا کر انگوٹھی چھپانے کا کھیل ''خسوروب بوربا'' وغیرہ کھیلا جاتا ہے۔ آج کل مصروفیات میں اضافہ اور جدت پسندی کی وجہ سے ان رسوم کا رجحان بہت کم ہو گیا ہے اور شہری علاقوں میں بالکل ختم ہو گیا ہے۔

لوسر یا ستون پھیوک

(خزاں میں خصوصی طور پر گوشت نکالنے کی رسم):

مخصوص موسمی حالات کے پیش نظر بلتستان کے لوگ ہر سال نومبر

کے اواخر میں گھرانے کی سطح پر بکرا' مینڈھا' بیل یا بزو وغیرہ ذبح کر کے گوشت نکالتے ہیں جو روزانہ حسب ضرورت استال میں لاتے ہیں۔ یہ ''لوسر'' یا ''ستون پھیوک'' کہلاتا ہے۔ یہ رسم بلتستان کی نسبت علاقہ ہائی گلگت میں زیادہ پر تپاک طریقے سے آج بھی رائج ہے اور شنا زبان میں اسے ''نسالو'' کہتے ہیں۔ بلتستان میں اس رسم کو بجالاتے ہوئے آس پاس کے لوگوں سے صیغہ راز میں رکھتے ہیں اور یہاں کے بزرگوں کا خیال ہے کہ لوگوں کے پاس کہنے سے وہ گوشت کھانے والوں کے لئے مفید نہیں ہوتا ہے۔ جبکہ گلگت میں لوگ یہ رسم انتہائی فخریہ انداز میں بجالاتے ہیں۔ عہد رفتہ میں بلتستان میں یہ رسم بجالانا ہر امیر وغریب کے لئے ناگزیر تھا کیونکہ ان دنوں پیشہ ور قصاب کا کوئی تصور نہ تھا۔ اس لئے ہر کوئی اپنے طور پر حسب توفیق گوشت نکالنے پر مجبور تھا۔ اب جدت زمانہ اور مال مویشیوں کی نایابی کے باعث شہری علاقوں میں یہ رسم ختم ہو چکی ہے۔ البتہ دیہی علاقوں میں اب بھی کم وبیش مروج ہے۔

کھہ ستون (برف باری کی رسم):

سطح سمندر سے کافی بلندی پر واقع ہونے کی وجہ سے بلتستان بھر میں نومبر سے مارچ کے دوران اکثر برف باری ہوتی ہے۔ یہاں ایک موسمی تقریب کی رسم ''کھہ ستون'' قدیم زمانے سے چلی آرہی ہے۔ بلتی زبان میں لفظ ''ستون'' ایک معنی میں موسم خزاں کو کہتے ہیں جبکہ دوسری جگہ تقریب کے لئے مستعمل ہے۔ مثلاً شادی کی تقریب کے لئے ''بخ ستون'' اموات کے لئے 'شی ستون'' نئے مکان میں پہلی بار اقامت گزیں ہونے کے لئے جو تقریب منائی جاتی ہے اسے ''ننگ ستون'' کہتے ہیں۔ اسی طرح ''کھہ ستون'' برف کی تقریب ہے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ یہ ''کھہ ہلتون'' کی بگڑی شکل ہے جس کا مطلب ''برف دکھانا'' ہے۔ اس میں رواج یہ ہے کہ موسم سرما کی پہلی برفباری کے موقع پر تفریح طبع کے لئے لوگ ایک دوسرے کے گھروں میں برف کے گولے بنا کر لے جاتے ہیں۔ جو چولہے میں پھینکنے کی کوشش کرتے ہیں یا مخفی طور پر اس گھر کی کسی جگہ چھوڑ آتے ہیں اور باہر آ کر آواز دیتے ہیں کہ ہم نے فلاں جگہ ''کھہ ستون'' یعنی برف کا گولہ رکھا ہے۔ اگر آنے والا برف کا گولہ رکھتے ہوئے پکڑا جائے تو میزبان آنے والے کے منہ پر کالک لگانے کی کوشش کرتا ہے اور برف لانے والا بھاگنے کی سعی کرتا ہے۔ یوں پکڑے نہ جانے کی صورت میں رسمی طور پر ان گھر والوں پر دعوت واجب الادا ہو جاتی ہے۔ اگر اس گھر کے مکین ہوشیار ہوں تو وہ پہلے سے تیاری کر بیٹھتے ہیں کہ اس دن یعنی جس دن موسم کی پہلی برف باری ہوئی ہو جو کوئی شخص ان کے گھر آجائے تو ان کو کالک مل کر چھوڑ دیتے ہیں۔ یوں ''کھہ ستون'' لانے والا نوجوان خود ان کو گھر پر مدعو کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ یہ رسم آپس کی ہنسی مذاق اور قربتوں کو فروغ دینے کے لئے ایک خوشگوار رسم تھی۔ مگر آج کل یہ رسم متروک ہو چکی ہے اور یہ صرف قصہ پارینہ بن کر رہ گئی ہے۔

میندوق ہلتنمو (پھولوں کا تہوار):

بلتستان کے ضلع گنگ چھے میں ایک موسمی تہوار ''میندوق ہلتنمو'' یعنی پھولوں کا تہوار یا پھولوں کی نمائش قدیم دور سے آج تک بہت مقبول طریقے سے رائج ہے۔ قیاس کیا جاتا ہے کہ یہ رواج بلتستان کی دیگر وادیوں میں یا تو سرے سے تھا ہی نہیں یا رفتار زمانہ کے ساتھ ختم ہو چکا ہے۔ محققین کے مطابق پھولوں کا تہوار وسط ایشیا کی ریاست ازبکستان کے لوگ بھی موسم بہار کے آغاز پر نہایت شان و شوکت سے مناتے ہیں۔ اس لئے یہ قیاس بعید از امکان نہیں کہ علاقہ خپلو (گنگ چھے) میں ترک خاندان ''یبگو'' کی حکمرانی کے باعث انہوں نے اپنی قومی روایات وثقافت کو زندہ رکھنے کے لئے یہ تہوار یہاں بھی رائج کر کے اب تک اس روایت کو نہ صرف قائم رکھا بلکہ فراخدلی کے ساتھ اس کی سرپرستی بھی کی۔ اس لئے آج بھی یہ تہوار یہاں پوری آب وتاب کے ساتھ منایا جاتا ہے۔

بلتستان کے لوک گیتوں میں زندگی کو موسم بہار سے تشبیہ دی گئی ہے۔ جیسے بہار کا مختصر دورانیہ امنگوں اور رنگینیوں کا موسم ہوتا ہے اسی طرح زندگی کا دامن بھی ممکنہ حد تک خوشیوں اور شادمانیوں کے پھولوں سے بھرا رہنا چاہئے تاکہ زندگی خوشگوار گذرے۔ چنانچہ ہر بلتی کی زبان پر یہ شعر ہوتا تھا۔

غبیا رلزا خسوم پوچی لیس ناگا نگ لیس
می ژھے چک چکپو چی خسوت ناگا نگ خسوت

ترجمہ:

''بہار کے تین مہینے اس لئے ہیں کہ ان میں انواع واقسام کے پھول کھلیں۔ اور زندگی اس لئے ہے کہ یہ ہر قسم کی آرام و راحت سے ہمکنار رہے''

موسم بہار کی آمد کے ساتھ اس تہوار کو منانے کی خاطر علاقے کے سرکردہ لوگ باہم صلاح مشورہ کر کے جشن منعقد کرنے کے لئے دن مقرر کرتے ہیں۔ یہ تقریب عام طور پر اپریل' مئی میں منعقد ہوتی ہے۔ جشن سے ایک دن قبل گاؤں کے تمام جوان سازندوں اور موسیقاروں کی معیت میں پہاڑوں کی طرف

روانہ ہو جاتے ہیں۔ وہاں پہنچ کر لوگ خود رو پہاڑی پھول چننے میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ ان پھولوں کو گلدستوں کی شکل میں ترتیب دیتے اور بید کی چھڑی کے سروں کو چیر کر یہ گلدستے ان میں سجا دیتے ہیں۔ یہاں کے خوش طبع نوجوان اپنی ٹوپیوں پر بھی پہاڑی پھول خوب سجاتے ہیں۔ جشن کے مقررہ دن کو علی الصبح رقص و موسیقی کے ساتھ یہ لوگ قافلے کی شکل میں گاؤں واپس لوٹتے ہیں۔ اس وقت ایک مخصوص دھن ''پراسل'' بجائی جاتی ہے۔ روایات کے مطابق پہاڑی چراگاہوں پر مقیم چرواہے ان لوگوں کو مکھن کے پیڑے اور لسی وغیرہ بطور تحفہ پیش کرتے ہیں۔ جب رقاصوں کا یہ قافلہ بستی کے کنارے پہنچ جاتا ہے تو علاقے کے سارے لوگ استقبال کے لئے آتے ہیں اور یہ جلوس مقررہ گراؤنڈ میں چلا جاتا ہے جہاں پہنچ کر یہ لوگ کچھ دیر کے لئے آرام کرتے ہیں۔ اس دوران افراد پہاڑوں سے لائے ہوئے پھولوں کے گلدستے گاؤں والوں میں تقسیم کرتے ہیں جو وہ اپنی ٹوپیوں پر سجاتے ہیں۔ اس موقع پر نوجوان افراد اپنی منظور نظر محبوباؤں اور دوستوں کو خصوصی گلدستے دیتے ہیں جنہیں محبت کو فروغ دینے کا باعث تصور کرتے ہیں۔ اس کے بعد سات افراد ہاتھوں میں تلوار لئے ایک خاص کلاسیکی رقص کا مظاہرہ کرنے لگتے ہیں جو اس موقع کی مناسبت سے ''میندوق ہلتمو'' کہلاتا ہے۔ بتایا جاتا ہے کہ بلتستان میں اس تہوار سے منسوب ایک گیت بھی تھا لیکن زمانے کی دستبرد سے اب نایاب ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ رسم لداخ میں بھی رائج ہے جہاں ''سغولہ'' تہوار کے نام سے مشہور ہے وہاں اس موقع پر پھول والے ''سغولہ'' کا مخصوص گیت گاتے ہوئے آتے ہیں۔

لوگوں کا ایک یہ خیال ہے کہ اس میلے کے منانے سے ہلا (دیوتا) اور ہلانو (دیوی) خوش ہوتے ہیں اور وہ میلہ دیکھنے کے لئے پہاڑوں سے نیچے اتر آتے ہیں۔ بعض لوگ تو اپنی آنکھوں سے دیوی دیوتاؤں کو خود دیکھنے کے دعوے بھی کرتے ہیں۔ بعض افراد کا یہ خیال ہے کہ میلے کے ختم ہونے پر وہ چیزیں انہیں مل جاتی ہیں جو پہاڑ سے واپسی کے وقت اُن سے گر گئی تھیں۔ واضح رہے کہ بلتستان کے پرانے لوگ انسان، جن اور فرشتوں کے علاوہ کئی قسم کی غیر مرئی مخلوق کے بھی قائل ہیں جو غالباً قدیم مذہب ''بون چھوس'' کا اثر ہے۔ غرض اس مخلوق کی خوشنودی حاصل کرنے کی خاطر اور انہیں بستی میں لا کر برکت پیدا کرنے کی امید میں ''میندوق ہلتمو'' کا میلہ اور اس نوعیت کی موسیقی کی محفلیں منعقد کی جاتی تھیں۔ اب جدت زمانہ کے ہاتھوں میندوق ہلتمو اور دیگر موسیقی کے پروگرام دم توڑ رہے ہیں۔

لوک داستانیں، کہانیاں اور روایات

بلتستان میں موسم سرما کی طویل راتیں گزارنے کے لئے داستان گوئی کی روایت عہد قدیم سے چلی آ رہی ہے۔ محلے کی سطح پر کسی گھر میں یا باری باری ہر گھر میں تمام چھوٹے بڑے اور مرد و زن شام کا کھانا کھانے کے بعد جمع ہو جاتے ہیں۔ خواتین اپنے ساتھ اون کاتنے کا کام لے جاتی ہیں جبکہ اسی اثناء میں مرد بکری کے بال سے رسّی بنانے کا کام سرانجام دیتے رہتے ہیں۔ یہ محفلیں نومبر کے وسط سے فروری کے اواخر تک جمتی ہیں۔ فصل بونے کے بعد سے لے کر فصل اٹھانے تک کہانی و داستان گوئی نحوست سمجھی جاتی ہے۔ بلتستان کے اکثر علاقوں میں گاؤں کی سطح پر داستان گو موجود ہیں۔ سردیوں کے موسم میں کسی ماہر اور چرب زبان داستان گو کو خصوصی طور پر بلایا جاتا ہے اور وہ اپنے فن کا مظاہرہ کرنے لگتا ہے اور سامعین اسے سن کر محظوظ ہوتے ہیں۔ بلتستان کے چند بزرگ داستان گوئی کی اس رسم کو ادا کرنے میں کئی فوائد بھی گردانتے ہیں جن میں سارے محلّہ والے ایک جگہ جمع ہونے سے گرم کرنے کے لئے ایندھن کی بچت، ان دنوں تیل کی گرانی اور بجلی کا تصور نہ ہونے کے ناطے روشنی میں کفایت شعاری، بوریت کا ازالہ، داستانوں کے ذریعے پند و نصائح اور عقل و شعور کی باتوں سے مستفید ہونا، مل بیٹھنے سے آپس میں پیار و محبت کا اضافہ ہونا اور ساتھ ساتھ گھریلو دستکاری کے کاموں کی انجام دہی وغیرہ شامل ہیں۔ ان کے علاوہ ان کہانیوں اور لوک داستانوں سے قدیم معاشرے کے ثقافتی اقدار اور تہذیبی روایات کا پتہ چلتا ہے۔ ان کہانیوں سے درس حاصل کر کے عقل و شعور میں اضافہ ہوتا ہے۔

یہ داستانیں دیسی اور بہ دیسی دو قسم کی ہوتی ہیں یعنی ایک تو وہ لوک داستانیں اور کہانیاں جو خاص مقامی روایات ہیں۔ مثلاً ہلافو کیسر، رگیالوستر البو، شینگ کھن چندن، اپی ژھوفرو وا، رگیالو چولو بزنگ، ژھونگپہ نسو، بدھ یلی رگیالفو، سلمہ چوچو، شینگ کھنی خسوسبو، مایون ژھنگسہ، شینگ کھن مہامد اور بہ سیر موو وغیرہ۔ ان سب میں ہلافو کیسر کی دیو مالائی داستان کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ جو بلتستان کے علاوہ تبت، لداخ، سکم، بھوٹان، نیپال، گلگت، ہنزہ اور وسطی ایشیاء کے بعض ممالک میں منظوم رزمیہ داستان پر مبنی ایک قدیم کلاسیکی شہہ پارہ ہے۔ اسے سننے کے لئے لوگ دیگر کہانیوں کی نسبت زیادہ ترجیح دیتے ہیں۔ یہ لوک داستانیں اور کہانیاں عرصہ دراز سے سینہ بہ سینہ چلی آ رہی ہیں۔ ان میں بعض باتیں مشترک ہیں اور بعض مختلف بھی۔ اگر کسی کہانی میں عشق و محبت کا بیان ہے تو کسی رقابت و دشمنی کا ذکر، کسی کہانی میں زنانہ حسن و جمال کا تذکرہ ہے تو کسی میں مردانہ طاقت اور بہادری کا



بلتستان کی بالائی چراگاہوں کے بکر کوٹھے ''خلاس'' پر مشکوں کے ذریعے لسی بنا رہے ہیں

واقعہ بیان ہوتا ہے۔ لیکن اکثر کہانیوں میں جن، بھوت، پری، چڑیل یا کوئی اور مافوق الفطرت کردار ضرور ہوتا ہے۔ اگر ایسا کردار نہ بھی ہو تب بھی ان میں محیر العقول واقعات ضرور ہوتے ہیں جن کا تعلق انسانی فطرت سے بہت کم ہوتا ہے۔

دوسری قسم وہ داستانیاں اور کہانیں ہیں جو قدیم فارسی کتابوں سے اخذ کی گئی ہیں جیسے الف لیلیٰ، داستان امیر حمزہ، یوسف زلیخا، پند نامہ، شیرین فرہاد، لیلیٰ مجنون، گل بکاولی، رستم و سہراب اور گلستان و بوستان سعدی وغیرہ۔ پرانے زمانے میں دنیا کے دیگر مختلف علاقوں کی طرح بلتستان میں بھی داستانوں اور اخلاقی درس پر مبنی کتابیں مقبول رہیں اور ناخواندہ لوگ خواندہ لوگوں کی زبانی یہ کتابیں بامحاورہ بلتی میں سنتے اور اثر لیتے تھے۔ داستان گوئی کے رواج کے مطابق بلتستان میں داستان گو کو سامعین کی طرف سے بار بار داد و تحسین ملتی ہے اور ''ژھے رینگمو'' یعنی عمر دراز ہو کے دعائیہ کلمات سے نوازا جاتا ہے۔ داستان کے اختتام پر صاحب خانہ خشک میوہ جات خوبانی، توت، خستہ اور اخروٹ وغیرہ پیش کرتا ہے جسے ''ذدرونگ خیاب'' کہتے ہیں۔ اب جدید زمانے میں مصروفیات میں اضافہ، ریڈیو اور ٹیلی ویژن جیسے سمعی و بصری ذرائع ابلاغ کے عام ہونے اور حصول تعلیم کی طرف رجحان طبع کے زیادہ ہونے کی وجہ سے داستان گوئی کا رواج تقریباً ختم ہو رہا ہے۔

بلتستان میں مروجہ قدیم مقامی لوک داستانوں اور کہانیوں کو اگر اچھی طرح کھنگالا جائے تو گذشتہ زمانے کی معاشرت کا مکمل نقشہ سامنے آجاتا ہے اور لوگوں کے عقائد اور رجحانات، رسوم و رواج اور میلانات کا پتہ چل جاتا ہے مثلاً یہاں کی اکثر دیسی داستانوں اور کہانیوں میں مردہ جسم پر ''دستہ چھومک'' کا پانی اور ''اوکپہ ستیا قبو'' کی مٹی چھڑکاتے ہوئے ''خیومہ رگیا ہلچنگ'' کی چھڑی مار کر مردہ انسان کو زندہ کرنے کی روایات موجود ہیں جیسے ہندوؤں کے عقیدے کے مطابق مردہ انسان امرت چھڑک کر زندہ کر لئے جاتے تھے۔ علاوہ ازیں ان داستانوں میں کنواری لڑکیوں کا جلسہ عام میں اپنے من پسند خاوند کا انتخاب کرنے کا تذکرہ بھی موجود ہے جو ہندوؤں کے رسم سوئمبر کے مترادف ہے۔ یہاں بلتستان کی بعض مقبول عام داستانوں، کہانیوں اور روایتوں کا خلاصہ دیا جاتا ہے۔

داستانِ کیسر (پس منظر):

بلتستان کی رزمیہ داستانوں میں داستانِ کیسر (KASAR SAGA) کو سب سے زیادہ مقبولیت حاصل ہے۔ یہ تبت لہاسہ سے لے کر بلتستان تک کے وسیع وعریض علاقے کا مشترکہ تاریخی، ادبی اور ثقافتی ورثہ ہے۔ محققین کے مطابق اس داستان کے دو بیانات بتائے جاتے ہیں۔ تبتی بیان کی کتابی شکل تبت کے صوبہ کھم میں ضخیم جلدیں موجود ہیں مگر لداخ و بلتستان میں یہ داستان ابتداء ہی سے سینہ بہ سینہ چلی آ رہی ہے اور یہاں بھی مختلف وادیوں میں مختلف بیانات موجود ہیں۔ بلتستان میں اب بھی بہت سے داستان گو ایسے ملیں گے جنہیں اس شہرۂ آفاق داستان کے چند ابواب یاد ہوں گے لیکن ایسے لوگ بہت کم ملتے ہیں جنہیں پوری داستان زبانی یاد ہو جو بلتستان کی روایات کے مطابق بارہ ابواب (یلداق) پر مشتمل بتایا جاتا ہے۔ آثار و قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ داستان قبل مسیح کے دوران بون مت کے عروج کے زمانے میں تخلیق ہوئی اور اس داستان کا مرکزی ہیرو ''ہلافو کیسر'' بون مت کے دیوتاؤں میں سے تھا۔ داستان کے مطابق کیسر آسمانی دیوتا ''ہلایو کپون'' کا سب سے چھوٹا بیٹا تھا جسے انسانوں کو ظلم و بربریت سے نجات دلانے کے لئے اس دھرتی پر بھیجا گیا تھا۔ اگرچہ اس کی تاریخی حیثیت اپنی جگہ مسلمہ ہے اور کہا جاتا ہے کہ کیسر نے اٹھارہ خود مختار سلطنتیں اور بارہ باج گزار ملک فتح کئے جن میں ہوریل (ترکستان)، الجانگ یل (واقع تبت)، کڑویل (واقع تبت)، سوق یول (منگولیا)، رگیاغر (ہندوستان)، رگیانق (چین)، کھچول (کشمیر)، لنگ یول (ختن)، چوق یل (سکم) اور لہویل (ریاست مستانگ) جانے پہچانے ملک ہیں لیکن امتداد زمانہ کے ساتھ ساتھ اس میں تحریفات ہوتی گئیں۔ آج یہ داستان ایک افسانوی رنگ اختیار کر چکی ہے جس میں بے شمار کردار ایسے ہیں جو مافوق الفطرت اور غیر مرئی محسوس ہوتے ہیں۔ بلتی لوک ادب میں کیسر داستان کا مقام بہت اونچا ہے جس کا دلکش پہلو اس کے منظوم مکالمے ہیں۔ ان مکالموں میں رزم و بزم، مناظر قدرت، فطرت انسانی، حصول مقصد کے لئے جہد مسلسل کی اہمیت، رسم و آئین، پند و نصیحت، عشق و محبت، طنز و مزاح اور سزا و جزا جیسے تمام موضوعات پر طبع آزمائی کی گئی ہے۔ غرض یہ کہ رزمیہ کیسر داستان اس علاقے کی قدیم تہذیب و تمدن کا حسین مرقع ہے۔ اس داستان میں زبان و بیان کے جواہر کے ساتھ ساتھ منطق، فلسفہ، تاریخ، بون عقائد، ہندو مت و بدھ مت کی تعلیمات اور آثار قدیمہ جیسے مختلف علوم پوشیدہ ہیں۔

کیسر داستان کا خلاصہ:

دھرتی پر ابتری کا دور دورہ تھا۔ انسانوں نے ایک آسمانی دیوتا ''ہلایو کپون'' کو اس بات پر مجبور کیا کہ وہ اپنے بیٹوں میں سے کسی ایک کو ظلم و ستم سے نجات دلانے کے لئے دھرتی پر بھیج دے۔ یو کپون دیوتا نے اپنے سب سے چھوٹے بیٹے کیسر کو حکم دیا کہ وہ اس مہم پر دنیا میں چلا جائے۔ کیسر نے باپ سے کچھ شرائط باندھی جن میں ایک شرط یہ بھی تھی کہ اس کی بہن ''ہلاموبروک مو'' کو دنیا میں اس کی بیوی بنا کر دیا جائے۔ یو کپون دیوتا نے یہ شرط مان لی۔ پس بعض روایات کے مطابق دودھ کی شکل میں بعض کے مطابق کیسر اور ہلاموبروک مو کو جلا کر اس کی راکھ کو زمین پر اتارا گیا۔ پھر سنگ کھہ راسکیس کی بیوی ممی گوقزا نے پہاڑ پر ایک گڑھے میں وہ دودھ یا راکھ کا پانی پیا جس میں کیسر کی روح موجود تھی اور وہ حاملہ ہوگئی۔ اسی طرح ایک اور سردار ہیاق ستن پا ابا کی بیوی کے ساتھ بھی ایسا ہی واقعہ پیش آیا اور یوں ان دونوں عورتوں نے علی الترتیب کیسر اور ہلاموبرو کمو کو آواگون کے ذریعے جنم دیا۔ کیسر نے اپنے مشن کی تکمیل کے لئے ایک بدصورت گونگے کا روپ اختیار کیا۔ جوان ہونے پر کیسر نے رسم سوئمبر کے ذریعے ہلاموبروک مو کو اپنی بیوی منتخب کر لیا۔ اس کے ساتھ اس کی تخت نشینی کی رسم بھی عمل میں آتی ہے اور پھر اس کے معرکوں اور جنگی کارناموں کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ روایات کے مطابق دھرتی پر اس کی مدد کے لئے ایک پراسرار غیبی طاقت موجود ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ کیسر کے بہت سے ایسے سورما بھی موجود ہوتے ہیں جن کی پشت پناہی اور مدد سے وہ اپنے ہر مشن میں کامیابی حاصل کر لیتا ہے۔ کیسر بذات خود ہتھیاروں کا استعمال بہت کم کرتا اور زیادہ تر حکمت عملی سے کام لیتا ہے لیکن جہاں حکمت عملی نہیں چلتی وہاں اپنی مخفی قوتوں سے استفادہ کرتا ہے۔ اس پوری داستان میں کیسر کا کردار ناقابل تسخیر دکھایا گیا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ سئو نپوژھویل (نیلے پانی کی جھیل والا ملک) میں ایک دیو ''شمار گیال'' نامی رہتا تھا۔ ایک دن کیسر کو اس کے ساتھ کیا ہوا معاہدہ یاد آیا جس میں یہ طے ہوا تھا کہ جو حملے میں پہل کرے گا وہ دوسرے کو مار دے گا۔ پس کیسر ہلاموبروک مو سے رخصت ہوا۔ راستے کی صعوبتوں کا سامنا کرتا ہوا وہ شمار گیال کے محل تک پہنچا اور اس کی بیوی کی مدد سے محل کے اندر جانے میں کامیابی حاصل کی۔ اس نے شمار گیال کی بیوی کو دام محبت میں پھنسا کر ان تمام رازوں کا کھوج لگایا جن کے ذریعے اسے قتل کیا جا سکتا تھا۔ آخر کار کیسر نے شمار گیال کو قتل کر دیا اور اس کے پیٹ کو چاک کیا تو اس میں سے وہ تمام چیزیں باہر نکل آئیں جن کو شمار گیال

نے نگل لیا تھا۔ ان میں شمار گیال کی بیوی ملد ابروم سکد کے دو بھائی رگیالو رینگچن اور سلام رینگچن بھی تھے جو پیٹ میں ہضم ہو کر چھوٹے چھوٹے ہو گئے تھے۔ کیسر نے ان دونوں کی پرورش کی اور دونوں بھائی پھر سے بحال ہو گئے۔ کچھ عرصہ کے بعد ان دونوں بھائیوں نے محسوس کیا کہ یہ ایک غیر معمولی آدمی ''کیسر'' ان کی بہن کے ساتھ رہ رہا ہے۔ انہوں نے کیسر سے کہا کہ وہ ان کے ساتھ چند بازیاں لگائے۔ اگر وہ بازی جیت جائے تو ٹھیک ورنہ اسے اپنی بہن کے ساتھ رہنے نہیں دیا جائے گا۔ کیسر نے شرط مان لی اور ان کے ساتھ کئی بازیاں لگائیں لیکن وہ ہر دفعہ ہار گیا۔ پس معاہدہ کے مطابق ان دونوں بھائیوں نے اسے گھوڑے کی کھال میں ڈال کر سی لیا اور کسی پرانے گھراٹ کے نیچے پھینک دیا۔ کیسر ایک عرصہ تک وہاں پڑا رہا۔ اسی دوران ہوریل (ترکستان) کے بادشاہ پاغلدے نے لنگ کھایل پر حملہ کر کے تاراج کیا اور کیسر کی بیوی ہلاموبروک مو کو اغوا کر کے اپنے ساتھ لے گیا۔ ابو دونگبو اور اس کے بیٹے بومالیفتن نے ترک حملہ آوروں کا تعاقب کیا اور ہلاموبروک مو کی بازیابی کے لئے جدوجہد کی لیکن وہ دونوں اس میں ناکام ہوئے اور بومالیفتن اسی لڑائی میں مارا گیا۔ اس شکست کے بعد لنگ کھایل کے عوام میں انتشار و بددلی پھیل گئی۔ ایک دن ابو دنگبو نے بڑی کوشش کے بعد ان دونوں پرندوں کو تلاش کر کے نکالا جو کیسر کی روح کے ساتھ وابستہ تھے اور ان پرندوں کو کیسر کی تلاش میں بھیج دیا۔ ان پرندوں نے چہار اطراف میں چکر لگایا اور آخر کار کیسر کو اس جگہ پر پایا جہاں وہ گھوڑے کی کھال میں گھراٹ کے نیچے پڑا ہوا تھا۔ ان پرندوں نے اسے کھال سے باہر نکالا اور پھر ترکوں کے ہاتھوں لنگ کھایل کی بربادی کا قصہ سنایا۔ کیسر نے سب سے پہلے ملد ابروم سکد کے دونوں بھائیوں سے بدلہ لینے کا فیصلہ کیا جنہوں نے اسے کھال میں بند کر کے اس کی زندگی اجیرن کر دی تھی۔ پس ان دونوں بھائیوں کو گہری زمین میں دبا کر وہ اپنے ملک کی طرف روانہ ہوا۔ کٹھن پہاڑی راستوں کے علاوہ ان محافظوں کو عبور کرنا جوئے شیر لانے کے مترادف تھا جن کو ترکستان کے بادشاہ نے اہم چوکیوں پر بٹھایا تھا۔ کیسر تمام مشکلات کا مقابلہ کرتے ہوئے ''ہوریل'' ترکستان پہنچا اور ایک لوہار ہمیسل کے ہاں قیام کیا۔ اور ہمیسل کی بیٹی کتشمن مو سے شادی بھی کر لی اور وہیں موقع کی تاک میں بیٹھا رہا۔ اس دوران کیسر نے گونگے کی شکل اختیار کر لی تھی تاکہ ہوریل کے لوگ اس پر شک نہ کر سکے۔ کہا جاتا ہے کہ ہوریل کے بادشاہ پاغلدے گیالپو نے لنگ کھایل سے ابو دونگبو کے بیٹے بومالیفتن کو مار کر اس کے تیر و کمان کو ہوریل لے گیا تھا۔ وہ تیر اور کمان اتنے بھاری تھے کہ ایک تیر کو اٹھانے کے لئے دو دو آدمیوں اور ایک کمان کو اٹھانے کے لئے چار آدمیوں کی ضرورت پڑتی تھی۔ ایک دن ہوریل کے بادشاہ نے اعلان کیا کہ بومے لیفستن کے کمان کو اٹھا کر تیر اندازی کرنے والا کوئی ہو تو اس شخص کی مرضی کے مطابق انعام دوں گا۔ کوئی شخص اس کے لئے آمادہ نہ تھا۔ البتہ کیسر تیار ہوا اور اس نے کہا کہ عوامی میلہ لگایا جائے تاکہ وہ یہ کرتب دکھا سکے۔ پس پاغلدے گیالپو کے حکم پر عوامی میلہ لگ گیا اور کیسر نے کمان میں تیر لگا کر کھینچنا شروع کیا۔ اس وقت کیسر نے دل میں یہ سوچا اور دعا کی کہ وہ خود لوہار ہمیسل کے افراد خانہ اور بادشاہ کے افراد خانہ کے علاوہ تیر تمام رعایا کے دائیں پہلوے سے گزر کر بائیں طرف نکل جائے۔ اس نے تیر چھوڑا اور اسی ایک تیر سے تمام رعایا ہلاک ہو گئی۔ کیسر نے وعدے کے مطابق انعام کے طور پر اپنی ٹوپی بھر تانبا مانگا۔ اس نے دل میں سوچا اور دعا کی کہ ہلاموبروک مو کے سونے کی زیوارات کے بغیر ٹوپی نہ بھرے۔ بادشاہ نے قلعہ میں موجود تانبے کے تمام اسباب ڈالے اور آخر کار ہلاموبروک مو کے سونے کی زیورات کا ایک ٹکرہ ڈالا تو ٹوپی بھر گئی۔ کیسر واپس ہمیسل کے گھر گیا اور پوچھا کہ اے بابا ہمیسل! آپ کی جائیداد میں تانبے کی کتنی اشیاء موجود ہیں؟ اس کے پاس لکڑی کی ایک تھالی (ٹھالو)' دو کٹورے (پھوتو) اور مٹی کی بنی ہوئی ایک ہانڈی (کواد) کے علاوہ تانبے کا کوئی سامان نہ تھا۔ کیسر کو اس کے پاس قلیل اسباب کی حالت دیکھ کر اپنے آپ پر غرور آیا اور ہمیسل سے الگ ہو گیا۔ کیسر کا یہ معمول تھا کہ رات بھر لوہار کا کام کرتے ہوئے کتشمن مو سے زبو کپا (لوہار کی وہ چمڑے کی مشک والی دھونکنی جس سے ہوا دیتے ہیں) سے پھونکنے کا کام لیتا تھا۔ جب اس کو نیند آتی تو چمٹا گرم کر کے اس کے چہرے پر رکھتا۔ آخر کار کتشمن مو نے تنگ آ کر اپنی ماں سے شکایت کی۔ ماں نے ایک ترکیب سکھائی اور کہا کہ تم بیماری کا بہانہ بنا کر بستر میں لیٹ جاؤ تاکہ اس مشقت سے جان چھوٹ جائے۔ کتشمن مو نے ایسا ہی کیا تو کیسر نے اس کو اپنی پیٹھ پر اٹھا کر لوری دیتے ہوئے سلا دیا۔ کتشمن مو کو نیند تو نہیں آئی بہر حال یہ ایک بہانہ تھا۔ کیسر نے اسے بستر پر سلانے کے بعد خود اپنی اصلی صورت میں نمودار ہوا۔ اس نے اپنے ''الیکرمان'' یعنی مافوق الفطرت سورماؤں کو حکم دیا کہ ایک ایسا صندوق بنا کر لائیں جس میں ایک کنبہ کے افراد آ سکیں۔ اس وقت کتشمن مو چوری چھپے یہ حرکات دیکھ رہی تھیں۔ اپنے شوہر کی اصل روپ اور حسین و جمیل صورت دیکھ کر وہ ضبط نہ کر سکی اور ہنس پڑی تو اتنے میں ایک ہی دھماکے کے ساتھ وہ سب کچھ غائب ہو گئے اور کمرے میں اندھیرا چھا گیا۔ کچھ دیر بعد کیسر بھی اسی گونگے کی صورت میں نظر آنے لگا۔ اس وقت کتشمن مو نے کہا میں نے تمہاری چالاکی پکڑ لی ہے۔ کیسر

نے بھی جواب میں یہی کہا کہ میں نے بھی تمہاری چالاکی پکڑ لی ہے۔ جن اور دیوتا دونوں آئے ہوئے تھے اور اب وہ چلے گئے۔ تم اس کونے میں تھی اور میں اس کونے میں۔ اب اٹھو اپنا کاروبار شروع کرتے ہیں۔ صبح ہوتے ہی کتشمن مو نے باہر جانے کی خواہش ظاہر کی۔ کیسر نے اسے اجازت دے دی۔ باہر برف پڑی ہوئی تھی۔ کتشمن مو بہانہ کر کے اپنی رضاعی ماں کے پاس چلی گئی تھی۔ کیسر بھی اس کے پاؤں کے نشان دیکھتے گیا تو معلوم ہوا کہ وہ اپنی رضاعی ماں کے ہمراہ پاغلد ے رگیالفو کے محل کی طرف گئی تھی۔ وہاں جا کر دیکھا کہ وہ دونوں بادشاہ اور ہلامو بروک مو کے دائیں بائیں بیٹھ کر ایک خواب بیان کر رہی تھیں۔ کتشمن مو نے اپنا خواب سنایا کہ اس نے آج شاہی محل کو آگ لگنا' بادشاہ کے گلے پر چھری چلنا' زہریلے مرغے کا اذان دینا اور دریا کا مخالف سمت میں بہنا دیکھا ہے۔ اتنے میں کیسر ان کے تعاقب میں وہاں پہنچ گیا۔ اس نے بادشاہ سے عرض کی کہ خواب کتشمن مو نے دیکھا ہے لیکن اس کی تعبیر میں بتا دوں گا۔ بادشاہ نے اجازت دے دی۔ اس وقت کیسر کہتا ہے کہ یہ خواب بہت ہی خوب ہے۔ شاہی قلعہ میں آگ لگنا بادشاہ کی اقبال مندی کی علامت ہے' زہریلے مرغے کا اذان دینا بادشاہ کی میراث کی علامت ہے' گلے پر چھری چلنا شکار کی طرف اشارہ ہے اور دریا کا مخالف سمت میں بہنا بادشاہ کے رعایا ہیں۔ بادشاہ اس سے بہت خوش ہوا اور اسے انعام واکرام سے نوازا۔

اسی دن بادشاہ پاغلد ے رگیالپو نے ایک اور اعلان کیا کہ بومے لیفستن کے گھوڑے پر سوار ہونے والا کوئی ہو تو اس کو بھی انعام سے نوازا جائے گا۔ اس مقابلے کے لئے بھی کیسر آمادہ ہوا اور گھوڑے پر بیٹھ کر اسے لنگ کھایل لے گیا چونکہ یہ ہوائی گھوڑا تھا اور وہاں سے اس کے بدلے ایک گھوڑا لے آیا لیکن کوئی اسے پہچان نہ سکا۔ پس کیسر (گونگا) انعام کا حقدار ٹھہرا۔ بادشاہ کے ہاں سے انعام حاصل کرنے کے لئے کیسر کے پاس کوئی برتن نہ تھا۔ لہذا اسے ایک ترکیب سوجھی اور وہ جنگلی چوہے یعنی پوق پوق کے شکار کے لئے گیا تا کہ اس کے چمڑے میں آٹا وغیرہ ڈال کر لا سکے۔ اس کے پاس شکار کے اوزار میں خمپہ نامی بوٹی کے کمان' خسمار نامی بوٹی کے تیر' انسانی بال کی رسی اور ہڈی کی چھری موجود تھی۔

کیسر ایک دن پاغلد ے رگیالپو کے خواب گاہ میں گھس گیا اور کشتی کے فن کا مظاہرہ کر کے بادشاہ کو بھی مار دیا۔ بادشاہ کا کام تمام کرنے کے بعد ہلامو بروک مو کو بازیاب کر کے ہوریل کے بادشاہ کا خزانہ سمیت اپنے ملک واپس لوٹ آیا۔ اس مہم کے بارے میں ہلامو بروک مو پہلے سے ہی باخبر تھی اس لئے وہ خاموش تماشائی بن کر دیکھتی رہی۔ ہوریل کے بادشاہ پاغلد ے رگیالپو کے ساتھ ہلامو بروک مو کے دو بیٹے بھی ہوئے تھے۔ ان کے سر قلم کر کے کیسر نے ان سروں کو اپنی پوستین کی جیبوں میں چھپا لیا تھا۔ متعین راستوں سے ہوتے ہوئے آخر کار سرحد پار کر لی۔ برق شرینگ زگو (سنگی دروازہ) سے گزرنے کے بعد ایک میدان پر پہنچا۔ کیسر نے اپنے گھوڑے کو سرپٹ دوڑاتے ہوئے مقتول بچوں کے سروں کو یکے بعد دیگرے ہوا میں اچھالا اور اپنی لاٹھی سے نشانہ مار کر دوبارہ ہوا میں اچھال دیا۔ نشانہ ٹھیک لگنے پر کیسر نے کہا "درافوقس" یعنی سیدھا لگ گیا۔ گھوڑا دوڑاتے دوڑاتے ہلامو بروک مو کو جب پتہ چلا کہ جو چیز نشانہ بنائی گئی تھی وہ تو اس کے بچوں کے سر تھے۔ ممتا کی محبت کی ماری وہ غش کھا گئی اور گھوڑے سے گر پڑی۔ کیسر نے سنگ دلانہ حرکت کرتے ہوئے ہلامو بروک مو کے بال گھوڑے کے دم کے ساتھ باندھ کر دوڑایا۔ دو چار ٹھوکروں کے بعد کھوپڑی سے بال الگ ہو گئے۔ گھوڑے کی لگام ڈھیلی کر دی گئی اور رانی کو ہوش میں لایا گیا۔ یہ ہلامو بروک مو کے لئے ایک قسم کی سزا تھی کہ اس نے پاغلد ے رگیالپو کے ہاں بچوں کو کیوں جنم دیا۔ اس رقیبانہ رد عمل کے بعد دونوں اپنے دارالحکومت میں وارد ہوئے۔ کہا جاتا ہے کہ پاغلد ے رگیالپو کے نائب السلطنت اور امراء نے کیسر اور ہلامو بروک مو کا تعاقب تو کیا تھا لیکن مقابلے کی نوبت نہ آئی۔ سرحد پار جس میدان میں بچوں کے سر پائے گئے انہیں اپنے ساتھ لے کر واپس ہوئے۔ اس تعاقب کے بارے میں تصدیق ان افراد نے کی جو ہلامو بروک مو کے ساتھ اسیر ہو کر ہوریل میں زندگی گزار رہے تھے۔ پاغلد ے رگیالپو کے مارے جانے کے بعد یہ اسیر فرار ہو کر اپنے وطن واپس پہنچ گئے۔

دوسری طرف داستان گو حضرات کی روایات کے مطابق ہلامو بروک مو کو اپنے دونوں بچوں کے قتل کے راز کا پتہ چلنے کے بعد کیسر سے اتنی نفرت ہو گئی کہ اپنی پستان سے دودھ نچوڑ کر زمین پر گرا دیا اور دعا کی کہ اس کے اور کیسر کے درمیان کوئی اولاد نہ ہو۔ یہ دعا قبول ہوئی اور ان کے درمیان کوئی اولاد نہ ہوئی۔ جس وقت وہ دونوں واپس اپنے گھر پہنچے تو معلوم ہوا کہ حکومت کی باگ ڈور کیسر کے چچا کھی ماکھی رگود کے ہاتھ میں ہے۔ چند دن گزرے تھے کہ لنگ کھایول کے پہاڑی چراگاہ میں ایک خون خوار اور خطرناک قسم کا جانور آ پہنچا تھا جس نے مال مویشیوں کو سخت نقصان پہنچایا۔ ملک کے بادشاہ کھی ماکھی رگود فوج لے کر اس جانور کو مارنے کے لئے روانہ ہوا۔ راستے میں اتفاق سے اس کی ملاقات لہویل کے بادشاہ کروچن گیالپو سے ہوئی جو اپنی فوج کے ساتھ ان پہاڑوں پر سیر و تفریح اور

شکار کے لئے آیا ہوا تھا۔ اس موقع پر ان دونوں بادشاہوں یعنی کھی ماکھی رگود اور کروچن گیاپو کے مابین محبت کے اظہار کے طور پر ایک معاہدہ طے پایا کہ آئندہ ان کے ہونے والے بچے اور بچیوں کی آپس میں شادی کی جائے گی تاکہ وہ رشتے کی وجہ سے زیادہ قریب ہو سکے۔ قصہ مختصر اس معاہدے کے بعد ان دونوں نے اپنی اپنی راہ لی۔ کھی ماکھی رگود اپنے مقصد کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کے لئے آگے بڑھا اور جب وہ درندہ کے قریب پہنچا تو درندے نے اس پر حملہ کیا۔ اس کے سپاہیوں نے اسکے ساتھ بے وفائی کرتے ہوئے راہ فرار اختیار کی۔ کھی ماکھی رگود اپنی زندگی بچانے سے ناامید ہو گیا۔ اس وقت اس نے اپنی انگلی سے خون نکال کر اپنے گھوڑے کی زین پر یہ عبارت لکھ دی کہ اس کے اور کروچن گیاپو کے درمیان اس قسم کا معاہدہ ہوا ہے جسے پورا کیا جائے۔ گھوڑے کی زین پر یہ لکھا تھا کہ اگر اس کے ہاں بیٹا ہو جائے تو اس کے لئے حسب وعدہ کروچن گیاپو کی بیٹی بیاہ کر لائی جائے اتنے میں درندہ نے اس کو لقمہ بنا لیا لیکن اس کا گھوڑا بھاگ کر محل پہنچنے میں کامیاب ہوا۔ کچھ عرصے کے بعد کھی ماکھی رگود کی بیوی نے ایک بیٹے کو جنم دیا۔ نجوم کی کتابوں میں دیکھ کر اس لڑکے کا نام خیو مالدے ستر البو رکھا۔ خیو مالدے ستر البو جب جوان ہوا تو اس کی غیر معمولی صلاحیتوں کی وجہ سے کیسر حسد کرنے لگا اور اس کی جان کے درپے ہوا۔ کیسر نے دھوکے سے اسے مروانے کی خاطر اس درندہ کو مارنے کے لئے خیو مالدے ستر البو کو پہاڑوں پر بھیجا۔ جس نے کھی ماکھی رگود کو پہلے ہڑپ کر لیا تھا۔ خیو مالدے ستر البو بڑا بہادر ثابت ہوا اور مختلف طریقوں سے اس درندہ کو مار کر اپنے باپ کے خون کا انتقام چکا دیا اور واپس بستی آ پہنچا۔ کسی دن وہ پولو کھیل رہا تھا کہ اس کے گھوڑے کی زین ٹوٹ گئی تو داروغۂ اصطبل نے ایک اور زین خیو مالدے کو لا کر دی جس پر اس نے وہ تحریر پڑھی جو اس کے باپ نے مرنے سے قبل لکھی تھی۔ اس نے باپ کی وصیت پر عمل کرنے کا فیصلہ کیا اور اپنے تین معتمد افراد کو لہویل کے بادشاہ کروچن گیاپو کے پاس بھیج دیا تاکہ وہ اس کی بیٹی کو خیو مالدے ستر البو کے لئے شادی کر کے لے آئے۔ جب یہ تینوں ایلچی وہاں پہنچے تو کروچن گیاپو کی بیٹی چو چوسوغر کی شادی گیاپا والوں میں طے ہوئی تھی۔ انہوں نے کھی ماکھی رگود کے بیٹے کی طرف سے رشتہ کا ذکر کرتے ہوئے اسے اپنا وعدہ یاد دلایا۔ کروچن گیاپو نے وعدہ کو تسلیم کیا لیکن یہ کہا کہ لنگ کھایل والوں نے رشتے کے لئے پیغام بھیجنے میں کافی تاخیر کی اس لئے اس نے اپنی بیٹی کا رشتہ گیاپا والوں کے ساتھ کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ چونکہ اس معاملے میں دو گروہ دعویدار ہیں اس لئے میرا فیصلہ یہ ہے کہ ان دونوں گروہوں کے آپس میں چند مقابلے ہوں گے جس کی بھی جیت ہو گی لڑکی کی شادی اس کے ساتھ کی جائے گی۔ اس فیصلے پر لنگ کھایل اور گیاپا کے لوگوں کے مابین مقابلے منعقد ہوئے جن میں لنگ کھایل کے افراد جیت گئے اور وہ چو چوسوغر کو اپنے ساتھ لے کر لنگ کھایل چلے گئے۔ جب وہ شہر کے قریب پہنچے تو ابو دونگبو کو ان کی آمد کی خبر ہو گئی تو وہ دلہن کے استقبال کے لئے تیاریاں کرنے لگے۔ کیسر کے چچا کھڑوق تھونگ بڑا چالاک قسم کا آدمی تھا۔ وہ سب سے پہلے استقبال کے لئے روانہ ہوا۔ جب وہ بارات سے ملا اور چو چوسوغر کو دیکھا تو دلہن کے حسن و جمال سے متاثر ہو کر اس کی نیت میں فتور آ گیا۔ کھڑوق تھونگ نے چو چوسوغر کو اپنی محبت کی جال میں پھنسانے کے لئے کہا کہ خیو مالدے ستر البو اور کیسر دونوں مر چکے ہیں ساتھ ہی چو چوسوغر کو اپنی طرف سے شادی کی پیش کش بھی کی۔ چو چوسوغر اس بات پر سخت برہم ہو گئی اور واپس لہویل جانے کے لئے تیار ہو گئی۔ جب ابو دونگبو کو اس بات کا پتہ چلا تو وہ ان کے تعاقب میں گیا۔ راستے میں انہیں پکڑ لیا اور صحیح صورت حال سے آگاہ کر کے ان کو مطمئن کر لیا اور اپنے شہر لے آیا۔ یوں خیو مالدے ستر البو اور چو چوسوغر کی شادی شان و شوکت سے رچائی گئی۔ چو چوسوغر کو دیکھ کر کیسر کے دل میں رقابت کی آگ بھڑک اٹھی اور خیو مالدے ستر البو کے ساتھ مخالفت شروع ہو گئی۔ اس دوران لنگ کھایل پر گیاپا والوں نے حملہ کر دیا جسے ابو دونگبو وغیرہ نے شکست دے دی اور ساتھ ہی کیسر اور خیو مالدے ستر البو کے مابین صلح وصفائی کرا دی۔ صلح کے بعد چو چوسوغر کو خیو مالدے کے حوالے کر دیا۔

اس زمانے میں کہیں ایک بادشاہ بہت مشہور تھا (بعض داستان گو نوشیروان کا نام لیتے ہیں لیکن راقم کو اس سے اتفاق نہیں ہے) ایک دن اس بادشاہ نے درباریوں سے پوچھا کہ اس دنیا میں مجھ جیسا طاقتور اور بہادر کوئی ہے؟ درباریوں میں ایک منجم تھا جس نے معذرت طلب کر کے عرض کیا۔ آپ سے بڑھ کر اب تک کوئی طاقت ور موجود نہیں ہے البتہ اس سال ایک لڑکا پیدا ہو گا جو آپ سے بہت زیادہ طاقت ور ہو گا۔ اس پر بادشاہ بڑا فکر مند ہوا اور رعایا کو حکم دیا کہ حاملہ عورتوں کا پیٹ چاک کر کے کوئی بھی بچہ پیدا ہونے نہ دیا جائے۔ اس حکم کے ساتھ اس کے سپاہی چہار اطراف میں پھیل گئے اور ان میں سے بعض شگر بھی آ پہنچے۔ شگر کے حکمران کے محل میں ایک گونگی کنیز حاملہ تھی۔ ان مہم جو سپاہیوں نے اس کا پیٹ بھی چاک کر کے خود روانہ ہو گئے۔ وہ گونگی کنیز خود تو مر گئی لیکن اس کا بچہ زندہ تھا۔ ایک چیل نے اس نوزائیدہ بچے کو دیکھا تو اسے اپنے پنجوں میں دبوچ کر لے اڑا۔ وہ بچہ چیل کے پنجوں میں سے نکل کر نیچے گرا۔ جہاں وہ بچہ گرا تھا وہ شگر

کیوژھوق نامی کانٹوں کا جنگل تھا۔ ایک بڑھیا برونگ لیش منمو نے اس لڑکے کو گرتے دیکھ لیا اور وہ اسے اٹھا کر اپنے گھر لے گئی اور اس کی پرورش شروع کی۔ یہ لڑکا گنجا نکلا اور اس کا نام اپی ژھوفڑا یعنی دادی کا گنجا پوتا پڑ گیا۔ وہ جلد ہی جوان ہو گیا لیکن اپنی بدصورتی اور غربت کی وجہ سے گاؤں میں تذلیل و تضحیک کا نشانہ بنتا رہا۔ ایک دن بہت تنگ آ کر اس نے دریا میں چھلانگ لگا کر خودکشی کا قدم اٹھایا لیکن وہ دریا برد ہونے کے بجائے دریا کی تہہ میں ایک دروازہ پر جا پہنچا۔ اپی ژھوفڑا اس دروازے سے اندر چلا گیا تو دیکھا کہ وہاں ایک خوبصورت محل ہے اور اس محل کے صحن میں ایک مرد بزرگ کو ذکر الٰہی میں مصروف پایا۔ اس بزرگ نے اپنا تعارف کراتے ہوئے بتایا کہ میرا نام خضر ہے۔ تم گھبرانا نہیں۔ میں تجھے ایک ایسی طاقت دوں گا کہ تم نامی گرامی پہلوان بن جاؤ گے اور کوئی بھی تمہارا مقابلہ نہیں کر سکے گا اور تم اپنے دشمنوں سے باآسانی انتقام لے سکے گا۔ اس مرد بزرگ نے اپی ژھوفڑا کو آنکھیں بند کرنے کا حکم دیا۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں اور تھوڑی دیر بعد جب اس نے آنکھیں کھول کر دیکھا تو وہ دریا کے اسی کنارے پر کھڑا تھا جہاں سے اس نے چھلانگ لگا دی تھی۔ اس نے اپنے تئیں دیکھا تو مشاہدہ ہوا کہ اس کا قد چالیس گز لمبا ہو گیا تھا۔ اس کے ہاتھ میں اٹھارہ من وزنی فولادی گرز تھا اور ساتھ ہی اس کے قد کی مناسبت سے ایک گھوڑا بھی تیار تھا۔ وہ گھوڑے پر سوار ہو کر اپنے گاؤں چلا گیا اور سب سے پہلے غیبی طاقت کے ذریعے اپنے لئے ایک فولادی محل بنوایا۔ اس کے بعد اپی ژھوفڑا نے اس گاؤں میں اپنے دشمنوں اور ظالموں سے انتقام لینا شروع کیا۔ ایک دفعہ وہ کہیں جا رہا تھا تو سرِ راہ ایک خوبصورت محل دیکھا جس میں میندوق پری رہتی تھی۔ اپی ژھوفڑا اس محل میں گیا اور میندوق پری سے تعلقات پیدا کر کے اس کے ساتھ شادی بھی کر لی۔ کچھ عرصہ کے بعد وہاں اس نے گانگسی گابوری نامی خاتون سے شادی کر لی مگر طبیعت وہاں بھی نہ ٹھہری۔ چند دن اس خاتون کے ساتھ گزارنے کے بعد وہ لاچی چوچو نامی خاتون کے حسن و صورت کا افسانہ سن کر اس کی تلاش میں نکلا۔ طویل سفر طے کرتے اور بڑی مشکلات کا سامنا کرتے ہوئے اپی ژھوفڑا اس جگہ پہنچ گیا جہاں لاچی چوچو کا محل واقع تھا۔ یہ محل کلی طور پر لاکھ کا بنا ہوا تھا اور اس کے اندر جانے کا کوئی راستہ نہ تھا۔ اس نے ایک جنگل کو آگ لگا کر وہاں سے بہت سے کوئلے اور اس محل کے گرد ڈھیر لگا کر اس میں آگ سلگا دی۔ آگ کی تپش سے لاکھ کا محل پگھل کر ایک طرف گرنے لگا۔ یہ حالت دیکھ کر لاچی چوچو بہت گھبرا گئی اور دروازہ کھلوا کر اپی ژھوفڑا کو بصد احترام اندر بلوایا اور جان بخشی کی درخواست کی۔ اپی ژھوفڑا نے آگ کو پانی چھڑک کر ٹھنڈا کیا اور خود محل میں چلا گیا۔ لاچی چوچو نے اس کی بڑی خاطر مدارت کی۔ دعوت و ضیافت کھانے کے بعد اس نے لاچی چوچو کو بھی اپنی زوجیت میں لے لی۔ چند دن کے بعد اپی ژھوفڑا اپنی تمام دلہنوں کو ساتھ لے کر واپس اپنی دادی کے پاس جا پہنچا اور کہا کہ اس نے اپنے لئے دلہنوں کا بندوبست خود کیا ہے لیکن شادی کی تقریبات کا انتظام وہ کرے۔ بوڑھی نے جواب دیا کہ یہ سارے انتظامات وہ اکیلی نہیں کر سکتی۔ لہٰذا یہ بات طے ہو گئی کہ ان انتظامات کو بحسن و خوبی انجام دینے کے لئے وہ شاکھر لدیم کھر جا کر کیسر اور اس کے خاندان کے افراد کو بلا لائے۔ چنانچہ اپی ژھوفڑا شاکھر لدیم کھر جا کر کیسر ہلا موبروک مؤا کو دونگبو کھروق تھونگ وانوے بو جولی اور ریوٹی بوتھود کر کو اپنی شادی میں شرکت کرنے اور مختلف ذمہ داریاں سنبھالنے کی دعوت دے دی۔ جب اپی ژھوفڑا واپس مہمانوں کے ساتھ گھر پہنچ گیا تو بوڑھی دادی نے کہا کہ اس کا ماموں جو ایک بوڑھے کیل کی شکل میں پہاڑوں میں ہے اور اسے بھی اس شادی میں شرکت کی دعوت کی جائے۔ اپی ژھوفڑا ماموں کی تلاش میں پہاڑوں کی طرف نکلا۔ پھرتے پھرتے اس نے اپنے ماموں کیل کو ایک پہاڑی غار میں دبکا پایا۔ اس نے ماموں کو اپنی شادی میں شرکت کی دعوت دی تو عمر رسیدہ کیل نے جواب دیا کہ گردوپیش میں کئی بھیڑیئے اس پر حملہ کرنے کے لئے تاک میں ہیں۔ اس لئے وہ پہلے کتوں کے دیس میں جا کر دو کتے لے آئے اور ان بھیڑیوں کو بھگا دے۔ پھر وہ غار سے نکل کر اس کے ساتھ جا سکے گا۔ اپی ژھوفڑا اس جگہ سے بہت دور کتوں کے دیس میں چلا گیا اور کتوں کے بادشاہ ''کھی سیر ہلا'' سے دو کتے مانگے۔ کھی سیر ہلا نے اسے ایک مخصوص کتا ''کھی روڈونگ'' دیا اور وہ اسے لے کر واپس اپنے ماموں کے پاس پہنچا۔ اس کتے نے چاروں طرف موقع کی تاک میں بیٹھے ہوئے بھیڑیوں کو بھگا دیا اور ماموں کیل کو لے کر اپنے گھر کی طرف روانہ ہوا۔ راستے میں اپی ژھوفڑا نے جنگل کاٹ کر ماموں کیل کے سینگوں پر چڑھایا تاکہ شادی کے دوران کام آ سکے۔ جب وہ دونوں محل پہنچے تو بوڑھی نے پوتے ''اپی ژھوفڑا'' سے کہا کہ وہ اس کی شادی کی تیاری اس وقت تک نہیں کرے گی جب تک وہ اس کے لئے بھی خاوند کا بندوبست نہ کرے۔ اپی ژھوفڑا پھر گھر سے نکلا اور کہیں سے ایک بوڑھا ڈھونڈ لایا اور اسے بڑھیا کے سامنے پیش کیا۔ بوڑھی اسے دیکھ کر بہت خوش ہوئی اور اپنی شادی کے ساتھ ساتھ اپی ژھوفڑا کی شادی کا اہتمام بھی کیا۔ بڑی دھوم دھام سے ان کی شادی ہو گئی۔ اس بوڑھی نے بھی دوسرے جوانوں کے ساتھ رقص و سرور کی محفلوں کو خوب گرمایا۔ یوں یہ شادی کی تقریب خوشیوں کے ساتھ ختم ہو گئی۔

کہا جاتا ہے کہ ایک دن کیسر اپنے محل کی کھڑکی پر بیٹھا ایک کتاب کا مطالعہ کر رہا تھا۔ اس کتاب میں ایک خاتون کے بارے میں پڑھا کہ وہ بہت ہی حسین وجمیل ہے اور اس کا نام آئینہ خاتون ہے۔ اس مضمون کے پڑھتے ہی کیسر پر ایک جنونی کیفیت طاری ہوئی اور عزم کیا کہ وہ کسی قیمت پر بھی اس خاتون کو حاصل کرے گا۔ وہ گھر سے نکلا اور جو بھی ملتا اس سے آئینہ خاتون کے بارے میں پوچھتا مگر لوگ لاعلمی کا اظہار کرتے۔ آخر کسی نے بتایا کہ اس ملک کے راستے کا صرف ''بیانگونگمو'' نامی پرندے کو علم ہے جو ہرداس نامی گاؤں کے چٹانوں میں بسیرا کرتے ہیں۔ کیسر نے اپنے گھوڑے کے دُم سے کئی پھندے بنائے اور ان کے درمیان مارخور کے گوشت کے ٹکڑے رکھ دیئے۔ جب یہ پرندے گوشت کی خاطر یہاں اترے تو ان میں سے دو پرندے پھندے میں پھنس گئے۔ کیسر نے ان کو پکڑ لیا اور آئینہ خاتون کے ملک کا راستہ بتانے پر مجبور کیا۔ ان دونوں پرندوں نے کیسر کو باری باری اپنے کندھوں پر اٹھائے کافی دور لے جا کر چھوڑا اور آگے راستے کا پتہ بھی بتادیا۔ کیسر آگے بڑھتا گیا اور چلتے چلتے اربوم بادشاہ کے محل تک جا پہنچا۔ وہاں اسے معلوم ہوا کہ اس محل کی شہزادی ''مک سلمو'' بیمار ہو کر قریب المرگ ہے۔ کیسر نے اس کا علاج شروع کیا اور چند روز کے اندر وہ صحت یاب ہوگئی۔ اس کارنامے پر اربوم کیسر سے بہت متاثر ہوا اور اپنی بیٹی مک سلمو کو کیسر کے عقد میں دے دیا۔ کچھ عرصہ تک کیسر اربوم کے محل میں عیش وعشرت کی زندگی گزارتا رہا۔ اسی دوران ایک دن اچانک افق پر اندھیر چھا گیا تو کیسر نے نجومیوں سے اس تاریکی کے بارے میں استفسار کیا۔ نجومیوں نے بتایا کہ علاقے میں ماخرخرمو نامی چڑیلوں کی ایک قسم ہے جو بسا اوقات آئنہ خاتون کے باپ کا دل نکال کر لے جاتی ہیں اور وہ مردہ ہو جاتا ہے اس پر آئینہ خاتون برہم ہو کر سورج کو نگل لیتی ہے۔ جب کئی دن تک اسی طرح تاریکی رہتی ہے تو وہ چڑیل خود آئینہ خاتون کے باپ کا دل واپس کر دیتی ہیں۔ جب آئینہ خاتون کا باپ اپنا دل واپس ملنے کے بعد پھر سے زندہ ہو جاتا ہے تو آئینہ خاتون سورج کو اپنے منہ سے نکال باہر کرتی ہے۔ یہ سن کر کیسر نے مک سلمو سے اجازت لے لی اور آئینہ خاتون کی تلاش میں اس کے محل تک جا پہنچا۔ کیسر نے دیکھا کہ آئینہ خاتون سورج کو نگل کر غصہ کے عالم میں کھڑی ہے۔ کیسر نے ایک بچے کے ذریعے آئینہ خاتون کے کپڑے اتروانا شروع کیا۔ اس وقت آئینہ خاتون اچانک بول پڑی جس سے سورج اس کے منہ سے باہر گر پڑا اور پھر سے دن کی روشنی نمایاں ہوگئی۔ کیسر نے آئینہ خاتون کے غصے کو ٹھنڈا کرتے ہوئے کہا کہ وہ خود جا کر اس کے باپ کا دل لے آئے گا۔ چنانچہ کیسر اسی وقت روانہ ہوگیا اور ماخرخرمو کے ٹھکانے پر جا پہنچا۔ اس نے موقع پا کر آئینہ خاتون کے باپ کے دل کو چرالیا اور بھاگ گیا۔ بھاگتے بھاگتے جب وہ تھک گیا تو کہیں سرِ راہ سو گیا۔ جب کیسر عالم خواب میں تھا تو ایک کوا آ کر اس کے جیب سے اس دل کو نکال کر لے اڑا اور لا کر آئینہ خاتون کو دے دیا۔ جب کیسر جاگ گیا تو دل اسکے جیب میں نہ تھا۔ وہ ندامت وافسردگی کی حالت میں واپس آئینہ خاتون کے پاس پہنچا۔ آئینہ خاتون نے کیسر کا حوصلہ بڑھاتے ہوئے کہا کہ مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ میرے باپ کے دل کو تم نے چڑیلوں سے چھڑایا ہے۔ اگر کوا اتنا باصلاحیت ہوتا تو اس نے یہ کام پہلے کیوں نہیں کیا۔ اس کے بعد کیسر اور آئینہ خاتون کی شادی ہوئی اور وہ عیش وعشرت سے رہنے لگے۔

ہلاموبروک مو نے لینگ کھایل میں یہ خبر سن لی تھی کہ کیسر نے آئینہ خاتون سے شادی کر کے اس کو محبت کا مرکز بنالیا ہے۔ ہلاموبروک مو نے آئینہ خاتون کے ساتھ رقابت رکھنے کے بجائے محبت کے اظہار کے طور پر کوئی نہ کوئی تحفہ بھیجنے کا فیصلہ کیا۔ اس نے ایک شخص کے ساتھ کچھ چیزیں بطور تحفہ آئینہ خاتون کو بھیج دیں۔ جب اس آدمی نے تحفہ لے جا کر آئینہ خاتون کی خدمت میں پیش کیا تو وہ اسے دیکھ کر بہت خوش ہوئی اور اس نے بھی جواباً ہلاموبروک مو کو چند چیزیں بطور تحفہ بھیج دیں۔ وہ شخص تحفوں کی پوٹلی لے کر اپنے وطن کی طرف روانہ ہوا۔ راستے میں اسے ایک بڑھیا کے ہاں رات گزارنی پڑی۔ بڑھیا نے رات کو اس کی پوٹلی سے وہ ساری اچھی چیزیں نکال لیں جو ہلاموبروک مو کو تحفہ میں بھیج دی تھیں اور اس کے بدلے پرانے کپڑے اور پرانے پھٹے جوتے اس میں رکھ دیئے۔ وہ شخص لاعلمی میں اس پوٹلی کو لے کر ہلاموبروک مو کے پاس پہنچا اور آئینہ خاتون کی طرف سے وہ تحفہ کی پوٹلی پیش کی۔ ہلاموبروک مو نے جب اسے کھولا تو ان چیزوں کو دیکھ کر وہ بڑی شرمندہ ہوئی۔ وہ اسی ندامت ودق کے باعث بیمار پڑ گئی۔ کیسر کو جب ہلاموبروک مو کی بیماری کا علم ہوا تو وہ اپنے وطن لنگ کھایل کے لئے روانہ ہوا۔ اس وقت آئینہ خاتون نے ہلاموبروک مو کے لئے ایک ایسی دوا بھیج دی جو انسان کو موت کے مرض سے بھی صحت یاب کر سکتی تھی۔ پس کیسر اپنے محل میں پہنچا اور دیکھا کہ ہلاموبروک مو زندگی کی آخری سانس لے رہی ہے۔ کیسر نے ہلاموبروک مو سے اس کی سوکن آئینہ خاتون کی بھیجی ہوئی دوائی کھانے کو کہا تو ہلاموبروک مو کو اعتبار نہ آیا اور کہا کہ وہ اپنی چہیتی بیوی کی دوا محل کی کتیا کو کھلا دے جو عرصہ دراز سے بیمار ہے۔ کیسر نے وہ دوائی کتیا کی طرف پھینک دی۔ کتیا نے دوا کھالی اور اسی وقت ٹھیک ہوگئی۔ اسے دیکھ کر ہلاموبروک مو کو اب یقین آ گیا اور کیسر سے یہی دوائی

لانے کی تاکید کی۔ کیسر نے کہا جو دوائی میں لے آیا تھا وہ تم نے کتیا کو کھلا دی اب دوا کہاں میسر ہے۔ یہ سن کر ہلامو بروک مو اپنی زندگی سے نا امید ہوگئی اور چند سانس لینے کے بعد مر گئی۔ کیسر کچھ دیر اس کی لاش پر بین و بکا کرتا رہا اور پھر اس لاش کو ایک ٹیلے پر لے جا کر جلا دیا اور یہ دعا کی کہ اگر ہلامو بروک مو نے دوبارہ جنم لینا ہے تو وہ خاص طور پر فلاں گھر میں پیدا ہو اور اس کی ہی بیوی بن جائے۔ چنانچہ تھوڑے ہی عرصہ بعد ہلامو بروک مو نے اس گھر میں جنم لیا جس کے لئے کیسر نے دعا کی تھی۔ ہلانو بڑی تیزی سے جوان ہوگئی۔ کیسر نے اس سے شادی کرنے کی خواہش کا اظہار کر کے جب پیغام بھیجا تو اس نے انکار کر دیا اور کیسر کو ان ساری زیادتیوں کا یاد دلایا جو اس کے ساتھ روا رکھی گئی تھیں لیکن کیسر نے بھی اس کا پیچھا نہ چھوڑا۔ آخر کار ان کے آپس میں شکوہ شکایتوں کے تبادلے کے بعد یہ وعدے طے ہوئے کہ آئندہ ایک دوسرے کا ساتھ نہیں چھوڑیں گے اور اس معاہدے کے لئے انہوں نے اپنے مذہب میں موجود قسمیں کھالیں اور دوبارہ شادی کر کے خوش و خرم اور عیش و عشرت کی زندگی گزارنے لگے۔

کیسر سے منسوب تمثیلی آثار:

لوک روایات کے مطابق بلتستان میں کیسر سے منسوب درج ذیل آثار زبان زد عام ہیں اور یہ آثار اس علاقے کے قدیم باشندوں کے مافوق الفطرت ذہنی تصورات کے عکاس ہیں:

☆ کیسر کی جنم بھومی ''پھونگ کٹو'' روندو ہردا میں ہے جواب بھی چٹانی غار کی شکل میں موجود ہے۔

☆ کیسر کے گھوڑے کی کھرلی ''پھونگ کٹو'' کے پاس واقع ہے۔

☆ کیسر سے منسوب طغری ''ہلڑ اٹا'' پتھر کی شکل میں ہردا گاؤں میں واقع ہے۔

☆ گربیداس کے قریب ایک پتھر شق کیا ہوا ہے جو راوی کے مطابق کیسر نے تلوار سے کیا تھا۔ اسی طرح ہردا سے نیچے پورتھنگ میں ایک پتھر کو کیسر سے منسوب کیا ہوا ہے کہ اس نے تلوار سے اسے دو ٹکڑے کیئے تھے۔

☆ پاری ''ہرتیلم تھنگ'' کے مقام پر کیسر سے منسوب مٹی کا ڈھیر اور ''فرید'' نامی جگہ پر گوندھا ہوا آٹا ''بغرن'' پتھر کی شکل میں موجود بتایا جاتا ہے۔ ''بغرن'' نامی پتھر پر انگلیوں کے نشان بھی بتایا جاتا ہے۔ اسی جگہ پر ایک پتھر ''کیسری لق لین'' کے نام سے ایک پتھر موجود ہے۔ پاری کے ''ڈونگسی فرید'' کے مقام پر ایک بڑے چٹان پر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ رنگ سے بچوں کے نقوش بنے ہوئے ہوں جنہیں لوگ کیسر کے بچوں سے منسوب کرتے ہیں۔

☆ ''ژھری تھنگ'' میں ایک پتھر پر ''ہلانو بروک مو'' کا عکس منقش بتایا جاتا ہے جس پر اس نے غسل کیا تھا۔

☆ ''بشوتھنگ'' میں ایک پتھر پر کیسر کا ''ڈامن'' (ڈھول) اور ''ڈانگ شنگ'' (ڈھول اسٹک) کے نقوش ہونے کی روایت ہے۔

☆ بتایا جاتا ہے کہ کیسر کی تیر ''تریکو روندو'' میں پتھر کی شکل میں ''دافنگسی کتپا'' نامی جگہ پر چبھی ہوئی ہے۔

☆ ''بومے لیفتان'' نے جس آبشار سے پانی پیا تھا' وہ چوپال جہاں وہ سویا تھا اور ''ابودونگبو'' نے جس پتھر کے دو حصے کیئے تھے ''روندو تونگوس'' میں واقع بتایا جاتا ہے۔

☆ ''برق شیرنگ مرمو'' اور ''ارینگ کورینگ'' کا پل ''گربیداس'' اور ''تونگوس'' کے درمیان واقع بتایا جاتا ہے۔ روایت ہے کہ آس پاس کے علاقے کے لوگ بارات لے جاتے وقت اس جگہ سے گذرتے ہوئے ہچکچاتے ہیں جہاں ''برق شیرنگ مرمو'' نامی افسانوی خود کار سنگی دروازہ منسوب ہے۔ ان کا وہم ہے کہ اس جگہ سے دلہن کو گذار دے تو اس کی کوئی اولاد زندہ نہیں رہتی۔ دوسری طرف یہی سنگی دروازہ ''شگر اسکولی'' اور ''بیافو گہنگ'' کے درمیان کھڑے پہاڑ کی طرف بھی نشاندہی کرتے ہیں۔

☆ ''تھور گوپل'' سے شگر کی طرف جاتے ہوئے ''ژھے تھنگ'' میدان کے اختتام پر کیسر کے ''اونگنہ پھونگمہ'' یعنی خرمن اور بھوسہ کے نام سے کنکر کے دو ٹیلے موجود بتائے جاتے ہیں۔

☆ ''کھرمنگ شیر ٹینگ خمش'' کے دریا پار کیسر کا گھوڑا منقش بتایا جاتا ہے۔

☆ ''یشہ رت کژہ'' نامی زمین دوز ہال ''روندو ستق'' اور ''حراموش'' کے درمیانی پہاڑ پر موجود بتایا جاتا ہے۔

☆ ''کیسری شغرن'' یعنی کیسر کا پولوگراونڈ'' کے ٹو'' کے قریب مستنع قراقرم پر واقع ہے جو اب گلیشئر کی شکل اختیار کر چکا ہے۔

☆ ''رونگمہ ردن چوے شغرن'' یعنی کیسر کا ہمعصر راجہ ''رونگمہ ردن چو'' کا

پولوگراونڈ ''روندوستق'' میں بتایا جاتا ہے۔

☆ ''ہنزہ کریم آباد'' میں ''کیسری دَلا'' کے نام سے ایک کوہل اب بھی زیر استعمال ہے۔

☆ ''ہنزہ کریم آباد'' کی پشت پر واقع پہاڑی چوٹی پر مرغی کی شکل میں ایک پتھر ''ہلاٹو بروک موسے منسوب ہے جو خیالی روایت کے مطابق دانہ چگ رہی ہے۔

☆ ''کھرمنگ غندوس'' کے نالہ ''گنگ چھے شہ کرل سہ'' اور ''غوارشی'' کے درمیان ''غوارشی جھیل'' کے قریب ایک پہاڑی راستہ ''کیسری ستاغو'' یعنی کیسر کا دروازہ کے نام سے مشہور ہے۔ اس پہاڑی درّے کو دیکھ کر ایسا لگتا ہے کہ کسی ماہر سنگ تراش نے تعمیر کا اچھوتا نمونہ پیش کیا ہے۔

☆ ''ژھانگمہ چھو'' اور ''شینگوس'' کے درمیان ''جُون نالہ'' میں سانپ کی شکل کا ایک بہت بڑا پتھر ہے اور اس سانپ نما پتھر کے سر پر ایک اور پتھر پڑا ہوا ہے جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ کیسر نے غلیل سے اس سانپ کو مارا تھا اور پتھر بن گیا ہے۔

☆ ''چپلو سلینگ'' میں کسی جگہ ایک چشمہ ہے جہاں سدا بہار رہتا ہے اور چشمہ کو کیسر سے منسوب کیا جاتا ہے۔

☆ ''چپلو ژھوغا'' اور ''کھرکو'' کے درمیان ایک بڑے پتھر پر دو لکیریں ہیں جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس پتھر کو کیسر نے رسی سے باندھ کر لایا تھا اور وہ دو لکیریں رسّی کے نشانات ہیں۔

☆ ''ہلاٹو بروک موے پھو لو'' ''چپلو کاندے'' میں ''کھری داس'' کے مقام پر پہاڑ کے بیچ میں نشان کے طور پر عیاں ہے۔

☆ کیسر کا حقہ ''چپلو دم سم برق مر'' کے مقام پر پہاڑ میں منقش پایا جاتا ہے۔

☆ ''چپلو براہ'' کے ''ہلطانو بروق'' پہاڑ پر بندوق کی شکل منقش ہے جو کیسر کی بندوق سے منسوب ہے۔

☆ ''شگر خاص'' کے نالے میں ایک غار ''کیسری کژہ'' سے منسوب ہے۔ جہاں روایت کے مطابق ایک ڈھولک لٹک رہا ہے اور ایک بلی بھی وہاں ہمیشہ موجود رہتی ہے جس کے ہاتھ میں ڈھول بجانے والی چھڑی بھی ہے کہا جاتا ہے کہ کسی زمانے میں ایک شخص نے اندر جا کر ڈھول بجایا تھا جس کی وجہ سے بھڑ کے غول اس شخص کے جسم سے چمٹ کر اس کو وہیں مار دیا۔ اس کے بعد کوئی شخص اس غار میں نہیں گیا۔

☆ ''شگر تھوگمو'' میں پہاڑ کے بیچ میں ایک مربع نما پتھر ابھرا ہوا ہے جو کیسر کے ڈامن سے منسوب کیا جاتا ہے۔

رگیالو چولو بزانگ اور دوسروں والا کبوتر:

۱ کہتے ہیں کہ کسی زمانے میں سکردو رگیالو نامی ریاست پر ایک ظالم بادشاہ کی حکومت تھی۔ اس کا نام رگیالو ستر البو تھا۔ اس کی سخت گیر پالیسی سے لوگ بہت تنگ تھے۔ لوگوں نے اسے ظلم سے روکنے کی بہت کوشش کی لیکن وہ کسی کے قابو میں نہ آیا۔ آخر کار لوگوں نے اعلان کیا کہ جو شخص عوام کو بادشاہ کے ظلم سے نجات دلائے گا اسے جواہرات انعام میں دیئے جائیں گے۔ یہ اعلان باقی لوگوں کے علاوہ اس شہر کے کنارے پر رہنے والی ایک بڑھیا نے بھی سنا تو وہ بڑھیا لوگوں کے سامنے آئی اور کہا کہ ''یہ مہم میں انجام دوں گی'' یہ کہہ کر وہ دائیں طرف کے نالے میں چلی گئی۔ ادھر کالے پہاڑ میں دوسروں والے کبوتر کا گھونسلہ تھا۔ بڑھیا نے کبوتر سے درخواست کی کہ اس کی خوراک کی تھیلی میں جو سونے کا بانٹا ہے وہ ایک رات کے لئے اسے ادھار دے دیں۔ کبوتر نے کہا ''یہ بانٹا میں تجھے نہیں دے سکتا کیونکہ میرا وجود اور میری زندگی کا انحصار اسی پر ہے۔ اس کے ہونے کی وجہ سے مجھے کھانے پینے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے آج تک اپنے گھونسلے سے باہر قدم نہیں رکھا۔ بڑھیا نے بہت اصرار کیا تو آخر کبوتر نے وہ بانٹا اس کے حوالے کر دیا۔ بڑھیا وہ بانٹا لے کر گاؤں آ گئی اور محل میں گئی۔ بڑھیا نے پہلے آش بنایا اور پھر اس بانٹے کو آش میں بھگو کر بادشاہ کو پلایا۔ اس کا پلانا تھا کہ بادشاہ کے اندر ظلم اور سختی کا مادہ یکسر ختم ہو گیا۔ بادشاہ کی طبیعت میں اتنی نرمی آ گئی کہ ملک کا نظام درہم برہم ہو کر رہ گیا۔ رعایا کو احساس ہو گیا کہ بادشاہ کا سخت مزاج ہونا ہی ملک کے حق میں بہتر تھا۔ انہوں نے بڑھیا کو بلایا اور اس سے درخواست کی کہ بادشاہ کی طبعیت کو بدل کر پھر سخت مزاج بنا دے۔ بڑھیا صبح سویرے محل میں گئی پھر آش تیار کیا اور اس میں کئی مکھیاں پکڑ کر ڈال دیں۔ جب بادشاہ نے آدھا آش پی لیا تو بڑھیا نے کہا ''بادشاہ سلامت آش میں مکھی نظر آتی ہے کہیں کوئی مکھی آپ کے پیٹ میں نہ گئی ہو'' یہ سننا ہی تھا کہ بادشاہ کو الٹیاں آنے لگیں۔ اس طرح وہ بانٹا باہر نکل آیا جو بادشاہ کو آش کے ساتھ کھلایا تھا۔ بادشاہ کا مزاج پھر وہی ہو گیا۔ بڑھیا نے سوچا کہ بانٹا دوسروں والے کبوتر کو واپس کیا جانا چاہیے۔ چنانچہ بڑھیا بانٹا لے کر دائیں نالے میں کبوتر کے گھونسلے پر پہنچ گئی تو دیکھا کہ کبوتر غائب ہے۔ اس کبوتر

کے ساتھ جو کچھ ہوا داستان گو کے مطابق تفصیل یوں ہے۔

کہتے ہیں کہ اس کبوتر کے دو سر تھے ایک سونے کا اور دوسرا فیروزے کا۔ ایک سر سوتا تو دوسرا جاگتا۔ اس کی خوراک کی تھیلی میں سونے کا ایک بانٹا تھا جس کی موجودگی میں اسے کھانے پینے کی ضرورت نہ ہوتی تھی۔ کبوتر نے جب وہ بانٹا بڑھیا کو دے دیا تو اسے بھوک کی شدت نے بے حال کر دیا تھا۔ اسی دوران موسم بہت خراب ہو گیا اور دیکھتے ہی دیکھتے چار ہاتھ (دو گز) برف زمین پر جم گئی۔ جاگے ہوئے سر نے سوئے ہوئے سر کو بھی جگا دیا اور بھوک کو مٹانے کے لیے دونوں نے آپس میں مشورہ کیا۔ اب کبوتر خوراک کی تلاش میں اڑا اور گمبہ سکردو کے کنارے ایک گھراٹ (پن چکی) میں اتر گیا جس کے پہلو کی دیوار گری ہوئی تھی۔ چکی کے اندر کافی تلاش کے بعد گندم کا ایک دانہ نظر آیا۔ دونوں سروں کے درمیان یہ معاہدہ تھا کہ جو بھی چیز کھائے دونوں آدھا کر کے کھائیں گے۔ جاگے ہوئے سر نے سوئے ہوئے سر کو جگانے کی کافی کوشش کی لیکن وہ نہ جاگا۔ جاگے ہوئے سر نے گندم کا وہ دانہ نگل لیا۔ وہ دانہ خوراک کی نالی سے گزرنے لگا تو اتنے میں سویا ہوا سر جاگ اٹھا۔ اس نے دوسرے سر سے شکوہ کیا تو دوسرے سر نے سارا قصہ سنا دیا اور کہا کہ اس نے اسے جگانے کی بہت کوشش کی تھی لیکن وہ نہ جاگا تھا۔ جاگے ہوئے سر نے اب کی بار دیوتا کے ساتھ قسم کھائی کہ اس کے بعد اسے جو کچھ بھی کھانے کو ملے گا وہ اکیلا نہیں کھائے گا اگر اکیلا کھائے تو وہ سوکھ جائے گا۔ اس معاہدے کے بعد سونے کا سر پھر سو گیا۔ فیروزے کا سر پھر دانہ تلاش کرنے لگا۔ اتنے میں اسے مسور کا ایک دانہ ملا۔ اس نے وہ منہ میں لیا اور مزید تلاش جاری رکھی تا کہ دوسرا کوئی دانہ مل جائے تو دونوں سر ایک ایک کر کے کھا سکیں۔ مسور کا دانہ منہ میں لے کر اور دانے کی تلاش کے دوران منہ میں پانی بھر آیا اور پانی کے ساتھ مسور کا دانہ بھی اس نے نگل لیا۔ اس دوران دوسرا سر جاگ اٹھا اور وعدے کی خلاف ورزی پر جاگے ہوئے سر کو ٹوکا تو دیکھا کہ دیوی دیوتا کے ساتھ قسم کی خلاف ورزی کے نتیجے میں وہ سر سوکھ چکا ہے۔ سونے کے سر کو بڑا افسوس ہوا کہ اس نے فیروزے کے سر سے قسم کیوں لی۔ اس نے سوچا کہ اب گپ شپ کے لئے دوسرا سر بھی زندہ نہیں۔ گھونسلے میں واپس جانا چاہیے۔ کبوتر ابھی گھونسلے میں واپس پہنچا ہی تھا کہ گھونسلے کے اوپر سے برفانی تودہ گرا جس نے کبوتر کو بھی بہا کر نالے کے دامن میں پہنچا دیا۔ ادھر رگیا یول کے دو چرواہے بھیڑ بکریاں چرا رہے تھے۔ انہوں نے سوچا کہ برفانی تودے سے کچھ برف گھروں کو لے کر چلیں گے۔ وہ اس تودے کے قریب پہنچے تو عجیب الخلقت کبوتر مرا پڑا تھا جس کے دو سر ہیں۔ انہوں نے وہ عجیب الخلقت کبوتر اٹھا کر اپنے ساتھیوں کے پاس لے گیا۔ سارے لڑکے حیران ہو گئے۔ انہوں نے وہ کبوتر نیچے بستی میں یعنی رگیا یول لانے کا فیصلہ کیا اور باری باری اٹھا کر اسے گاؤں میں پہنچا دیا۔ ان لڑکوں میں سے ایک لڑکے کا دادا بوڑھا تھا جس کا نام رگیہ تھیمبہ تھا۔ بھیڑ بکریوں کو چرا کر واپس لانے کے بعد ہر روز وہ لڑکا اپنے دادا کو عبادت خانہ تک پہنچایا کرتا تھا۔ اس روز اس عجیب الخلقت کبوتر کی وجہ سے لڑکے کو واپس پہنچنے میں دیر ہو گئی تو دادا بہت پریشانی کے عالم میں نالے کی طرف چلا۔ گاؤں کے کنارے لڑکوں سے ملا جو دو سروں والا کبوتر اٹھائے آ رہے تھے۔ رگیہ تھیمبہ نے لڑکوں کو ادھر روکا۔ چھری نکالی اور اس کبوتر کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے۔ ایک ٹکڑا مشرق میں ہلو یول کی طرف، دوسرا ٹکڑا مغرب میں چو یول کی طرف، تیسرا جنوب کی طرف اور چوتھا شمال کی طرف پھینک دیا۔ اس کے بعد بوڑھے نے ایک دعائیہ گانا گایا:

اے دو سروں والے کبوتر! تیرا ایک سر دیوی "یوچق" بن جائے
اے دو سروں والا کبوتر! تیرا دوسرا سر دیوی "برلنا" بن جائے
اے دو سروں والا کبوتر! تیرا جسم "رگیا لولو بزانگ" بن جائے
اے دو سروں والا کبوتر! تیری آنکھ چھورتن کھر اور شیشہ بن جائے
اے دو سروں والا کبوتر! تیرا پر "پلے کنجہ" بن جائے
اے دو سروں والا کبوتر! تیرے پاؤں "ہلتیانہ وزیر" بن جائے

یہ دعا گانے کے بعد بوڑھا اپنے گھر آیا۔ چند روز کے بعد بوڑھا دائیں نالے میں چلا تو ایک حسین و جمیل نوجوان اس کے انتظار میں بیٹھا تھا۔ اس نوجوان کو لے کر بوڑھا گھر آیا۔ اس دوران رگیا یول کا بادشاہ رگیا لوستر البو مر گیا تھا اور نیا بادشاہ چننے کے لئے شاہین اور ہاتھی چھوڑے ہوئے تھے۔ جب وہ لڑکا پہنچا تو وہ شاہین اس کے عین سر پر اتر گیا اور ہاتھی نے اس کے سامنے گھٹنے ٹیک دیئے۔ اب سب نے اس لڑکے کو اپنا بادشاہ تسلیم کر لیا۔ اس لڑکے کا نام رگیا لو چولو بزانگ تھا۔ کچھ عرصہ گزرنے کے بعد ملک کے سرداروں نے مشورہ کیا کہ بادشاہ کی شادی ہونی چاہئے۔ اس کام کے لئے ہلتیانہ وزیر کو بھیجنے کا فیصلہ ہوا۔ چنانچہ کافی سونا چاندی لے کر وزیر بادشاہ کے لئے دلہن کی تلاش میں روانہ ہو گیا۔ وزیر نے راستے میں ہر گاؤں، ہر شہر اور ہر ملک میں اعلان کیا "کوئی ہے جو رگیا لو چولو بزانگ سے شادی کر لے"۔ اس اعلان کے جواب میں سات عورتیں اس کے پاس جمع ہو گئیں۔ جن میں جوان دوشیزائیں بھی تھیں اور بوڑھی عورتیں بھی۔ وزیر ان سب کو لے کر اپنے شہر پہنچ گیا۔ رگیا لو چولو بزانگ نے دیکھا کہ وزیر کے ساتھ محل کے

سامنے عورتوں کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا ایک سمندر موجود ہے۔ محل کی کھڑکی سے وہ گیت گانے لگا:

یہ لال لباس میں ملبوس خواتین کہاں کی ہیں؟
یہ سیاہ لباس میں ملبوس خواتین کہاں کی ہیں؟
یہ پیلے لباس میں ملبوس خواتین کہاں کی ہیں؟
یہ سفید لباس میں ملبوس خواتین کہاں کی ہیں؟

میری بیوی بنے گی دیوی یوچق اور دیوی برانہ جو پچاس ہزار سال کی مسافت پر ہیں۔ یہ بدصورت عورتیں میری بیوی نہیں بن سکتیں۔

اس پر ساری عورتیں بھاگ گئیں۔ وزیر کی بیوی کا نام پلمے کنجہ تھا۔ وزیر نے اس کے پاس جا کر سارا قصہ بیان کر دیا۔ پلمے کنجہ اپنے محل کی چھت پر چڑھی اور یہ گیت گایا:

دائیں نالے میں جاؤ تو دیوی یوچق ملے گی
بائیں نالے میں جاؤ تو دیوی برانہ ملے گی
نیچے آبادی میں رگیالو چولو بزانگ ملے گا

اس کے بعد پلمے کنجہ نے ہوائی گھوڑے کو بلا کر کہا کہ وہ اس کے شوہر وزیر کو پچاس ہزار سال کی مسافت پر دیوی یوچق اور دیوی برانہ کی سرزمین میں پہنچا دے۔

وزیر ہوائی گھوڑے پر سوار ہوا جس نے پلک جھپکنے کے عرصے میں اسے دیوی برانہ کے محل کے سامنے پہنچا دیا۔ اس نے دیوی برانہ کے محل میں جانے کی بہت کوشش کی لیکن فولادی دیوار کی وجہ سے وہ اندر نہ جا سکا۔ آخر کار اس نے باہر سے ہی اونچی آواز میں گاتے ہوئے کہا ''میں رگیالو چولو بزانگ کی طرف سے رشتے کا پیغام لے کر آیا ہوں۔ مجھے ہاں یا نہ میں جواب دو'' یہ سنا تو برانہ نے کھڑکی سے سر باہر نکال کر گاتے ہوئے کہا ''رگیالو چولو بزانگ کی بیوی بننا مجھے قبول ہے۔ اگر آٹھ روز تک دیر کی تو برانہ نہیں مل سکے گی۔ کیونکہ سیرلو بادشاہ کی طرف سے پیغامات آ رہے ہیں جو آٹھ دنوں کے اندر ہی مجھے زبردستی اٹھا کر لے جائے گا'' وزیر فوراً رگیالو کے پاس آیا اور سارا واقعہ بیان کر دیا تو رگیالو نے فوج تیار کر لی اور جلدی سے کوچ کر کے دیوی برانہ کے محل کے قریب جا پہنچا۔ وہاں پہنچ کر اس نے دیکھا کہ سیرلو کی فوج نے برانہ دیوی کے محل کا محاصرہ کر رکھا ہے۔ رگیالو چولو بزانگ نے سیرلو بادشاہ سے کہا آؤ آج ہم دونوں لڑتے ہیں جو جیت جائے دیوی برانہ اسی کو مل جائے گی۔ سیرلو بادشاہ نے یہ تجویز قبول کر لی۔ فیصلہ ہوا کہ پہلے سیرلو وار کرے گا۔ اس کے ہر وار کو دیوی نے سونے کا بال پھینک کر بیکار کر دیا۔ اس کے بعد رگیالو کی باری آئی۔ رگیالو نے ایک ہی وار میں سیرلو بادشاہ کا سر تن سے جدا کر دیا۔ اس کے بعد رگیالو کی فوج سیرلو بادشاہ کی فوج پر ٹوٹ پڑی۔ فوج کو تہس نہس کرنے کے بعد رگیالو محل میں داخل ہو گیا۔ ادھر چار پانچ دن آرام کرنے کے بعد دیوی برانہ کو لے کر رگیالو اپنے ملک کو روانہ ہو گیا۔ کئی منزلیں طے کرنے کے بعد ایک روز قافلہ ایک گاؤں سے گزر رہا تھا اور رگیالو قافلے سے تھوڑا پیچھے تھا۔ اس نے قافلے کے ساتھ پہنچنے کے لئے گھوڑے کو تیز دوڑایا۔ اتنے میں اس کے گھوڑے کے سم کی ٹھوکر سے ایک بڑھیا کا ٹوکرا الٹ گیا جس میں جلانے کے لئے لکڑیاں چنی ہوئی تھیں۔ اس بڑھیا کو سخت غصہ آیا اور کہا ''ارے دیکھو اسے بدصورت دیوی برانہ ملی تو اس کی نظریں آسمان پر پہنچی ہیں۔ اگر اسے دیوی یوچق مل جائے تو پھر یہ کیا کرے گا'' یہ سنا تو رگیالو گھوڑے سے اترا اور بڑھیا سے دیوی یوچق کے بارے میں پوچھنے لگا۔ بڑھیا نے ٹال مٹول کیا اور کہا مجھے غصہ آیا تھا تو ویسے ہی کہا تھا۔ مجھے یوچق کے بارے میں کچھ بھی معلوم نہیں ہے۔ جب نرمی سے کام نہ چلا تو رگیالو نے بڑھیا کو چابک سے مارنا شروع کیا۔ بڑھیا نے کہا ''کتنا عمر رسیدہ ہو جائے تو لمبی انگڑائی لیتا ہے' گھوڑا بوڑھا ہو جائے تو زور سے ہوا چھوڑتا ہے اور جب انسان بوڑھا ہو جاتا ہے تو اپنی حیثیت سے بھی بڑھ کر بات کرتا ہے۔ میں نے غصے میں آ کر بڑی بات کی ہے حقیقت کچھ بھی نہیں ہے''۔ حقیقت میں یہ بوڑھی عورت دیوی یوچق کے راستے کی نگہبان تھی۔ رگیالو نے چابک سے اسے خوب پیٹا تو وہ کہنے لگی ''اے نوجوان! سنو یہاں سے جانے کے بعد فلاں منزل پر دو آدم خور دیو کمین گاہوں میں بیٹھے ہوئے ہیں وہ دونوں ہلانو یوچق کے چوکیدار ہیں۔ یوچق کی طرف جانے والے ہزاروں بادشاہ اور شہزادے ان دونوں کا لقمہ تر بن چکے ہیں۔ تمہارے ساتھ بھی ایسا ہی ہونا ہے کیونکہ تمہاری مدد کے لئے کوئی فوج بھی نہیں ہے۔ تم اپنے اوپر رحم کرو اور اپنی راہ پکڑ کے واپس چلے جاؤ'' یہ باتیں سننے کے بعد رگیالو نے برانہ اور اپنے آدمیوں کو شہر کی طرف روانہ کر کے خود یوچق کی طرف روانہ ہو گیا۔ دن بھر چلنے کے بعد رگیالو شام کو شینکپہ سپنگ لیپ کے اگلے گاؤں میں پہنچا۔ رگیالو نے رات کو اس بوڑھے آدم خور دیو کو خواب میں دکھایا کہ اس کے باڑے میں بھیڑ بکریوں کی تعداد ہزاروں میں اور گائے بیل کی تعداد سینکڑوں میں پہنچ چکی ہے۔ اس کے گھر میں برکت آئی ہے۔ اتنے میں بوڑھے کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے گاتے ہوئے اپنی بوڑھی بیوی سے کہا ''تم سوئی ہوئی ہو ہماری قسمت بدل چکی ہے' بھیڑ بکری گائے بیل اور ساز و سامان سے ہمارا گھر بھر گیا ہے'' رگیالو

نے بوڑھے کی بیوی کو بھی ویسا ہی خواب دکھایا۔ دونوں نے کمروں میں جا کر دیکھا تو خواب کو سچ پایا۔ اب میاں بیوی نے مشورہ دیا کہ یہ کسی برکت والے آدم زاد کے قدموں کی برکت سے ہوا ہے۔ آؤ عہد کرتے ہیں کہ آج کے بعد ہم کسی آدم زاد کو نقصان نہیں پہنچائیں گے۔ دوسرے روز رگیالو چولو بزانگ اس بوڑھے کے ہاں پہنچا تو انہوں نے اس کی بہت بڑی عزت کی اور اپنے گھر میں بیٹا بنا کر رکھ لیا۔ کچھ دنوں بعد رگیالو چو بوڑھے دیو کی بھیڑ بکریاں چرانے لے گیا۔ جب رگیالو بھیڑ بکریاں چرانے لگا تو شینگپہ سپنگ لیپ نے اس سے کہا کہ دائیں نالے میں چرانے نہ جانا بلکہ بائیں نالے میں لے جائے۔ چند روز کے بعد جب ایک دوسرے سے مانوس ہو گئے تو ایک روز رگیالو نے بوڑھے سے کہا' ابا جان! دیوی یوچوق کا بہت چرچا سنا ہے وہ کدھر رہتی ہے؟ دیو نے کہا بیٹا! تمہیں بھوک لگی ہے تو روٹی دوں گا۔ پیاس لگی ہے تو لسی اور دودھ پلاؤں گا اور اگر سردی لگے تو نئے کپڑے پہناؤں گا۔ دیوی یوچوق کا پتہ معلوم کر کے تمہیں کیا ملے گا۔ اس بات کو چھوڑو اور کوئی بات کرو۔ رگیالو نے کہا' ابا جان! یوچوق سے مجھے کیا کام۔ صرف بوریت ختم کرنے کے لئے یہ باتیں کر رہا ہوں۔ دیو کو اس پر اعتماد ہوا اور اس نے کہا' بیٹا! میں یوچوق دیوی کے راستے کا پہرہ دار ہوں۔ وہ دائیں نالے میں رہتی ہے۔ یہاں سے تھوڑا سا آگے جر بہ چونگول نامی ایک دیو ہے۔ کوئی شخص اس تک پہنچ جائے تو یوچوق دیوی سے رابطہ ہو سکتا ہے۔ رگیالو اگلی صبح کو یوچوق کی طرف دائیں نالہ کی جانب روانہ ہو گیا اور دن بھر چل کر جر بہ چونگول کے گھر میں پہنچ گیا۔ اس نے دیکھا کہ جر بہ چونگول کے سامنے کئی تھالیاں بھر کر کھاچی پڑی ہے۔ اور جر بہ چونگول ایک طرف سے کھاچی کھا رہا ہے۔ رگیالو نے چپکے سے دوسری طرف سے کھانا شروع کیا۔ کھاچی ختم ہو گئی لیکن دیو کا پیٹ نہیں بھرا۔ اس نے دوبارہ کھاچی تیار کر کے کھانا شروع کیا تو رگیالو نے بھی ساتھ کھایا۔ دیو کا پیٹ اب کی بار بھی نہ بھرا۔ اسے شک ہو گیا کہ کھانے کو کسی آدم زاد کا ہاتھ لگا ہے۔ یہ سوچ کر کھانے کے اوپر ہاتھ پھیرا تو رگیالو کا ہاتھ اس کے ہاتھ میں آ گیا۔ ہاتھ پکڑتے ہی رگیالو چو نے کہا' ابا جان! میں ہوں۔ دیو نے کہا' تم نے مجھے ابا جان کہا اس لئے چھوڑ دیتا ہوں ورنہ میں تمہیں کباب بنا کر کھا لیتا۔ یہاں پر پرندہ بھی مشکل سے پہنچتا ہے۔ تم کیسے پہنچے ہو؟ رگیالو چو نے اپنے آپ کو ایک سادہ انسان ظاہر کیا جس سے متاثر ہو کر دیو نے اسے اپنے گھر میں رکھ لیا۔ دو چار دنوں کے بعد رگیالو نے دیو کی بھیڑ بکریاں چرانا شروع کیا۔ دو چار دن اسی طرح اور گزر گئے۔ ایک دن جر بہ چونگول نے رگیالو چو سے پوچھا کہ اس کی شادی ہوئی ہے کہ نہیں۔ رگیالو نے کہا کہ اس کی شادی نہیں ہوئی ہے۔ جر بہ چونگول نے اپنی پوتی کے ساتھ رگیالو چو کی شادی کرا دی۔ جس کا نام کتی شوتھا۔ وہ حسب معمول روزانہ بھیڑ بکریاں چرانے لے جاتا اور واپسی پر گول مٹول پتھر لے آتا۔ ان پتھروں کو چولہے میں گرم کر کے دیو کی پوتی کے بدن پر رکھ کر اس کی جلد کو داغا کرتا تھا۔ وہ لڑکی ڈر کے مارے چپ رہتی تھی۔ ایک روز صبح رگیالو چو بھیڑ بکریاں لے کر چلا۔ ریوڑ کو بائیں نالے کی طرف دھکیل کر وہ خود دائیں نالے کی طرف چلا۔ ادھر گھاس کا میدان تھا۔ میدان کے بیچ میں ایک حوض تھا۔ حوض کے قریب گھاس کے درمیان ایک کھڈا تھا وہ اس کھڈے میں چھپا بیٹھا رہا۔ اتنے میں یوچوق کی دو کنیزیں چھوخرخرمو اور مے خرخرمو ادھر پہنچ گئیں۔ چھوخرخرمو قہقہ لگاتی تو سارا میدان بارش برسا کر پانی پانی ہو جاتا اور مے خرخرمو اُف کرتی تو ہر چیز کو آگ لگ جاتی تھی۔ بہر حال دونوں نے چمن کی صفائی کی۔ اتنے میں یوچوق دیوی دودھ کے حوض میں غسل کرنے کے لئے پہنچ گئی۔ پہنچتے ہی اس نے کہا کہ مجھے آدم زاد کی بو آ رہی ہے۔ کنیزوں نے ادھر ادھر طائرانہ نظر دوڑائی اور بتایا کہ یہاں کوئی نہیں ہے۔ اب یوچوق زمین پر اتر گئی اور کپڑے اتار کر حوض میں نہانے لگی۔ اس دوران رگیالو فوراً دوڑ کر گیا اور یوچوق کے کپڑے لے کر بھاگ نکلا۔ یوچوق رگیالو کے پیچھے دوڑنے لگی اس نے رگیالو کو پکار کر کہا میں تمہاری بیوی بنوں گی تم مجھے دیکھو تو سہی۔ رگیالو نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو یوچوق کی نظروں نے اسے جلا کر راکھ کر دیا۔ یوچوق کپڑے لے کر واپس چلی گئی۔ شام کو بوڑھے دیو کے گھر میں اس کی بھیڑ بکریاں ایک ایک کر کے واپس پہنچ گئیں لیکن اران کے نامی بکرا اور رگیالو چو دونوں واپس نہیں پہنچے۔ یہ بکرا ہمیشہ چرواہے کے ساتھ ہی ہوتا تھا۔ جر بہ چونگول کو معلوم ہو گیا رگیالو چو دائیں نالے میں گیا ہے اور کسی حادثے کا شکار ہو گیا ہے۔ وہ اندھا تھا۔ پوتی کا ہاتھ پکڑ کر دائیں نالے میں چلا گیا۔ ادھر دیکھا کہ ایک راکھ کے ڈھیر پر اران کے بکرا بیٹھا ہوا ہے۔ اس نے لدام لدوم نامی چشمے سے پانی لا کر اس راکھ پر چھڑکایا۔ سفید بید کی ایک شاخ ہاتھ میں اٹھائی اور اس راکھ پر مارا۔ اتنے میں رگیالو چھینکتے ہوئے زندہ ہو کر کہا' تم نے مجھے مزیدار نیند سے جگایا۔ دیو نے اسے ڈانٹا کہ اس کی ہدایت پر عمل نہ کرنے کی وجہ سے وہ مارا گیا تھا۔ شکر ہے بکرے نے راکھ کو بکھرنے نہ دیا ورنہ دوبارہ زندہ کرنا بھی مشکل تھا۔ بہر حال اسے لے کر جر بہ چونگول گھر آیا۔ کچھ روز کے بعد رگیالو نے دائیں نالے میں جانے کا ارادہ ظاہر کیا تو جر بہ چونگول نے اسے نصیحت کی یوچوق دیوی ہر ہفتے دودھ کا غسل کرنے اس میدان والے حوض پر آتی ہے۔ اب کی بار تم اڑگ پہ چق ردوا اور می کھل مو چقماق لے کر جانا۔ اس کے ذریعے جو کے تین دانے جلا دو تو تم دیوی پر

جیت سکو گے ورنہ نہیں۔ دوسرے ہفتے رگیالو چو پھر اسی حوض پر جا بیٹھا۔ اب کی بار وہ حوض کے پہلو میں موجود چنار پر چڑھ کر گھنے پتوں کی آڑ میں چھپا بیٹھا رہا۔ اتنے میں یوچوق کی دونوں کنیزیں آ پہنچیں اور چمن کی صفائی کی اور قالین بچھایا۔ اس کے کچھ دیر بعد یوچوق پہنچ گئی۔ اس نے آتے ہی کہا مجھے آدم زاد کی بو آ رہی ہے۔ کنیزوں نے سارے کھڈوں کو چھان مارا لیکن کوئی انسان نہ ملا۔ تسلی کرنے کے بعد یوچوق کپڑے اتار کر حوض میں نہانے لگی۔ رگیالو چو چنار سے کودا اور یوچوق کے کپڑے لے کر تیزی سے بھاگ گیا۔ یوچوق اس کے پیچھے پیچھے آئی اور کہا' میں تمہاری بیوی بنوں گی' تم میری طرف ایک بار دیکھو تو سہی۔ رگیالو نے فوراً چقماق نکال کر جو کے تین دانے جلائے اور پیچھے مڑ کر دیکھا۔ اب یوچوق اس کی بیوی بن چکی تھی۔ رگیالو چو اسے پیدل چلا کر اپنے ساتھ جربہ چونگول کے گھر کی طرف لے آ رہا تھا۔ گھر کے قریب پہنچے تو یوچوق زور سے گاتے ہوئے رگیالو سے کہنے لگی ''ارے رگیالو چو! مجھے ماں باپ' بھائی بہنوں سے جدا کر کے لے جا رہے ہو' تم کیسے سنگ دل ہو۔ مجھے تنہا پیدل چلا کر ننگی حالت میں لے جا رہے ہو۔ ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ مجھے تم نئے کپڑے پہنا کر گھوڑوں کے قافلے میں لے جاؤ۔ کم سے کم میرے اپنے کپڑے تو مجھے پہناؤ اور عورت زاد ہوں مجھے تمہارے ہوائی گھوڑے پر چڑھاؤ اور تم پیدل چلو''۔

یہ باتیں سنیں تو رگیالو نے یوچوق کو اس کے کپڑے واپس کیئے اور خود گھوڑے سے اتر کر گھوڑے پر اسے چڑھایا۔ گھوڑے پر چڑھتے ہی یوچوق نے گھوڑے کو مہمیز دیا اور گھوڑے کو اڑا کر دیکھتے ہی دیکھتے ایک نالے کی طرف جا کر غائب ہوگئی۔ یہ منظر دیکھا تو رگیالو بے ہوش ہوگیا۔ کافی دیر کے بعد اسے ہوش آیا۔ گھر جا کر جربہ چونگول کو سارا قصہ سنایا تو جربہ چونگول نے اسے ملامت کی کہ تم نے یوچوق کو اپنی بیوقوفی سے کھو دیا ہے۔ رگیالو نے ایک رات جربہ چونگول کے گھر میں گزاری۔ دوسری صبح یوچوق کی تلاش میں ایک طرف کو روانہ ہوگیا۔ وہ بہت سے شہروں سے گزرتا ہوا آخر کار تھک کر ایک اور شہر کے کنارے پہنچا۔ ادھر ایک بڑھئی اپنی ورکشاپ میں کام کر رہا تھا۔ رگیالو اس کے پاس چلا گیا۔ بڑھئی نے اس کو تاپنے کے لئے آگ سلگائی اور اس کا حال پوچھا تو رگیالو نے سارا قصہ اسے سنا دیا۔ رگیالو کی باتیں سننے کے بعد بڑھئی نے گاتے ہوئے اسے جواب دیا ''یوچوق کی طرف کے راستے میں چٹانیں' پہاڑیاں' ریتلے میدان' خارزار اور خطرناک پڑیاں ہیں' رگیالو نے جواب میں گاتے ہوئے کہا ''ارے بڑھئی! یوچوق کی طرف کا راستہ مجھے مل جائے تو مجھے باقی دشواریوں کی کوئی فکر نہیں کیونکہ چٹانوں کو جمپر سے لڑھکاتا جاؤں گا' ریت کو بیلچے سے ہٹاتا جاؤں گا اور کانٹوں کو کلہاڑے سے کاٹتا جاؤں گا'' بڑھئی نے کہا ''اگر تمہارے اندر اتنی ہمت ہے تو تم چلو راستہ یہی ہے۔ فلاں نالے سے تم چلے جاؤ'' بڑھئی کے بتائے ہوئے راستے پر رگیالو روانہ ہوگیا اور چٹانوں' ریتلے میدانوں اور خارستانوں سے گزرتا ہوا وہ ایک سرسبز میدان میں پہنچ گیا جہاں چند گھوڑے چر رہے تھے۔ رگیالو نے ان میں سے ایک چست گھوڑے پر سوار ہو کر سفر جاری رکھا۔ بہت سی منزلیں طے کرنے کے بعد وہ دیوی یوچوق کے محل کے سامنے پہنچ گیا۔ اس وقت رگیالو سردی سے ٹھٹھر رہا تھا۔ اس نے گاتے ہوئے زور سے کہا ''میرا پاؤں رکاب کے ساتھ ایک ہوگیا ہے' میرا دامن زین سے چپک گیا ہے' میرا ہاتھ گھوڑے کے لگام کے ساتھ ایک ہوگیا ہے۔ کونزوق موباجی دروازہ کھولو' کونزوق مو نے محل سے جواب دیا ''اوپر کی طرف جانا ہے تو وہ راستہ ادھر سے ہے اور اگر نیچے محل کی طرف جانا ہے تو وہ راستہ سامنے ہے' اگر راستہ بھول کر آئے ہو تو میں تمہیں راستے پر پہنچا دوں گی اور اگر زادراہ کی کمی ہے تو میں تمہیں زادراہ دوں گی اور اگر جوتے پھٹ گئے ہیں تو میں تمہیں نئے جوتے پہناؤں گی۔ چھمورتن کھر سے تم کو کیا واسطہ ہے'' یہ جواب سن کر رگیالو کو غصہ آیا۔ اس نے کہا ''اری کونزوق! تم مجھ سے ایسی بات کرتی ہو تمہارے ہاتھ میل سے کالے ہیں' منہ سے رال ٹپک رہا ہے' ٹانگیں مرغی کی طرح ہیں'' کونزوق نے جا کر یوچوق کو بتایا کہ اسے اتنے طعنے سننے پڑے۔ یوچوق نے کہا تم محل کا دروازہ بند کئے رکھو۔ وہ خود تنگ آ کر واپس چلا جائیگا۔ جب کافی اصرار اور کوشش کے باوجود محل کا دروازہ نہ کھلا تو رگیالو نے ژونگ کایول نامی شہر کے سارے لوگوں کو جمع کیا اور شہر کے پہلو میں جو بنجر میدان تھا ان سے میدان کے لئے پہاڑ کاٹ کر نہر بنوایا اور کھیت بنا کر آباد کرنے پر مجبور کر دیا۔ جس کسی نے لیت ولعل سے کام لیا انہیں چابک مار مار کر لہولہان کر دیا۔ ژونگ کایول پر یوچوق کی حکومت تھی۔ اس نے جب دیکھا کہ اس کی رعایا مصیبت میں گرفتار ہے۔ اس نے کونزوق سے کہا تم جاؤ اور رگیالو چو کو چند اچھی باتیں سناؤ تو وہ واپس چلا جائے گا۔ کونزوق محل کی چھت پر نکلی اور گاتے ہوئے اس نے کہا ''ارے رگیالو چو! اس شہر کا کوئی بادشاہ نہیں ہے تم مکے نہ دکھانا بلکہ واپس چلے جاؤ' اس شہر میں پانی کی سخت قلت ہے تم نئے بڑے کھیت نہ بنواؤ بلکہ واپس چلے جاؤ۔ جہاں پانی دستیاب نہیں اس شہر میں پانی کی سخت قلت ہے تم نئے نئے بڑے کھیت نہ بنواؤ بلکہ واپس چلے جاؤ۔ جہاں پانی دستیاب نہیں ایسی ڈھلوان پر نئی بڑی نہر نہ نکلواؤ بلکہ تم واپس چلے جاؤ'' کونزوق کی یہ باتیں سن کر رگیالو چو نے گاتے ہوئے جواب دیا ''تم محل کی مشکی ہو اور تمہاری پیٹھ پر ٹوکرے میں مٹی

اٹھانے کے نشانات ہیں۔تم بات کرتی ہو'' کونزوق نے واپس جا کر یوچوق سے کہا رگیالو نے مجھے طعنہ دیا اور کہا کہ وہ واپس جانے والا نہیں۔ یوچوق نے اپنے وزیر سے کہا کہ وہ جا کر رگیالو چو کو چند اچھی باتیں سنائے تا کہ وہ واپس چلا جائے۔ وزیر محل کی چھت پر چڑھ کر گاتے ہوئے کہنے لگا'' یہ کالا گدھ اور نیلا کبوتر یوچوق کے دربان ہیں۔انہیں تیر کا نشانہ بناؤ تو تمہیں راستہ مل جائے گا۔ یہ سنتے ہی رگیالو چو نے نیلے کبوتر کو تیر سے مار کر نیچے گرا دیا۔اس کے بعد گدھ کی باری آئی۔ گدھ کی خوراک کی تھیلی پر ایک پھوڑا نکلا ہوا تھا۔جس میں پیپ بھرنے کی وجہ سے وہ نالی سوجھی ہوئی تھی۔ رگیالو چولو بزانگ نے اس پھوڑے پر ایک تیر مارا جس کی وجہ سے وہ پیپ بہہ گیا اور گدھ کو آرام آ گیا۔ گدھ نے رگیالو چو کو سونے چاندی کا ڈھیر انعام میں پیش کیا۔ رگیالو چو نے کہا کہ اسے سونا چاندی نہیں چاہئے بلکہ وہ اسے اپنے پروں پر اٹھا کر چھورتن کھر کی چھت پر پہنچا دے۔ کہا جاتا ہے کہ اسی دوران یوچوق نے کھڑکی سے دیکھا کہ رگیالو نے جو نئے کھیت بنوائے تھے ان میں فصل کاشت کر کے فصلیں لہلہا رہی ہیں۔اس نے قہقہہ مارا تو باقی سب کچھ جل گیا لیکن اس کی فصلیں جوں کی توں رہ گئیں۔اب یوچوق نے اپنی دوسری کنیز چھوخرخر موکو بلا کر کہا تم اُف کر کے رگیالو کی فصلوں کو پانی سے غرق کر دو تا کہ رگیالو واپس چلا جائے۔کنیز نے اُف کیا تو باقی سب پانی میں غرق ہو گیا لیکن رگیالو کی فصلوں کو کوئی نقصان نہ ہوا بلکہ فصلوں کو پانی کی ضرورت تھی۔ فصلیں سیراب ہو گئیں۔ رگیالو کو بہت آمدنی ہوگئی۔ غلے کو تھیلوں میں بھر کر محل کے پہلو میں ٹال کر دیا۔اس ٹال پر چڑھ کر رگیالو نے زور سے کہا میں نے تو گندم' جو' باقلہ اور غرس یعنی دال مسور کے چھوٹے چھوٹے دانے کاشت کئے تھے لیکن تمہاری شرارتوں کی بدولت کبوتر' کوے اور مرغے کے برابر دانے مجھے فصل کی آمدنی میں ہاتھ آئے۔ اتنے میں گدھ آ گیا۔ رگیالو اس کی پیٹھ پر سوار ہو کر چھورتن کھر کی چھت پر پہنچ گیا۔چھت پر پہنچا تو اس نے محل کی مرکزی کھونٹی کو پکڑ کر سارے محل کو ہلا دیا اور یوچوق سے کہا وہ اگر محل سے نکل کر نہ آئی تو وہ محل کو گرا دے گا۔اتنے میں یوچوق گھبرا کر محل سے باہر نکل آئی تو اوپر سے گدھ نے اس پر تھوکا۔ وہ تھوک میں لت پت ہوگئی۔ یوچوق نے رگیالو چو سے معافی مانگی اور اسے تھوک سے نکالنے کی درخواست کی۔ رگیالو چو نے اسے اس گندگی سے نکالا تو وہ فوراً محل کے ایک کمرے میں چھپ گئی۔اب رگیالو چو نے یوچوق کو پکار کر کہا تم مجھے ایک بار اپنا چہرہ دکھاؤ میں واپس چلا جاؤں گا۔ یوچوق نے بناؤ سنگھار کر کے محل کی کھڑکی سے اپنا سر نکالا۔ رگیالو چو نے عکس شیشے کو الٹا گھما کر یوچوق کی شکل کو بدصورت کر دیا اور وہاں سے چلا آیا۔ یوچوق کو اس کی کنیزوں نے طعنہ دیا کہ رگیالو سے شادی نہ ہوئی تو اب اور کسی سے اس کی شادی نہیں ہو سکے گی۔اس لئے بہتر ہے کہ رگیالو کا پیچھا کر لے۔ یوچوق نے جلدی سے رگیالو کا پیچھا کرنا شروع کیا۔رگیالو گھوڑے پر جا رہا تھا۔ یوچوق اس کے پیچھے دوڑنے لگی اور راستے میں ایک ٹیلے پر چڑھ کر وہ رگیالو سے کہنے لگی'' ارے رگیالو چو تم مجھے اس حال میں چھوڑ کر مت جاؤ بلکہ واپس چلے آؤ'' رگیالو چو پیچھے مڑے بغیر چلتا رہا۔ اب یوچوق نے پھر تیزی سے اس کا پیچھا کیا اور رگیالو چو کے گھوڑے کا لگام پکڑ لیا اور رکاب پر سر رکھ کر اس سے معافی مانگ لی۔ رگیالو چو نے معاف کیا اور اس کے ساتھ محل میں واپس آ گیا۔محل میں پہنچتے ہی یوچوق نے محل کی ساری چابیاں رگیالو چو کے حوالے کر دیں اور خود چونکہ بہت تھک چکی تھی اس لئے اس کی آنکھ لگ گئی۔ رگیالو چو نے دیکھا کہ یوچوق کے بالوں کے بیچ ایک چھوٹی سی چابی ہے۔اس نے وہ چابی اٹھائی اور محل کے کمروں کے تالوں میں اسے ڈالتا گیا۔ایک کمرے کا تالا کھل گیا۔اندر گیا تو دیکھتا ہے سارا عالم اس کمرے میں سے نظر آتا تھا۔اس نے رگیایول کی طرف دیکھا تو رگیایول ویران ہو چکا ہے اس کا محل کھنڈر بن چکا ہے اور برانہ دیوی اس کی جدائی میں کمزور ہوگئی ہے اور چکیوں کے دروازوں پر بھیک مانگتی پھر رہی ہے۔ یہ منظر دیکھ کر رگیالو زار و قطار رونے لگا۔ کمرہ بند کر کے چابی یوچوق کے بالوں میں رکھ دی۔اسی دوران اس کے آنسو کا ایک قطرہ یوچوق کے گال پر گر گیا۔ رگیالو چو نے چاقو کے ذریعے وہ قطرہ اٹھانے کی کوشش کی تو یوچوق جاگ اٹھی اور گھبرا گئی کہیں رگیالو چو چاقو سے اسے مار نہ رہا ہو۔ رگیالو چو نے یوچوق کو سارا قصہ سنایا اور کہا کہ وہ رگیایول واپس جانا چاہتا ہے۔ یوچوق نے کہا کہ تم واپس مت جاؤ کہیں برانہ دیوی بھلانے والا کھانا کھلا کر مجھے تمہارے ذہن سے فراموش نہ کرا دے۔ رگیالو چو ضد کر کے رگیایول روانہ ہوگیا۔ رگیایول کے لوگوں نے استقبال کر کے محل کو پھر سے بنایا۔ برانہ نے اسے اس طرح مصروف رکھا کہ وہ یوچوق کو بھول گیا۔اِدھر ایک ملک کے بادشاہ نے یوچوق کو اغواء کرنے کے لئے اس کے شہر پر چڑھائی کر دی۔ یوچوق نے کوے کے ذریعے رگیالو چو کو اپنی انگوٹھی بھیج دی۔کوے نے انگوٹھی رگیالو چو کی طرف پھینک دی تو اس کی انگلی میں بیٹھ گئی۔ اب اسے یوچوق یاد آ گئی۔ رگیالو چو یوچوق کی طرف جانے لگا تو برانہ نے کہا! تم ''چھوپری'' اور ''مے پری'' یعنی پانی والی اور آگ والی پری کو ساتھ لے جاؤ تا کہ کوئی مشکل پیش آئے تو کام آئیں۔ رگیالو چو انہیں ساتھ لے کر یوچوق کے محل تک پہنچا تو معلوم ہوا کہ یوچوق اغوا ہو چکی ہے۔ یوچوق نے اغوا ہوتے وقت اپنے دونوں پالتو مارخور اور ٹیڑھی سینگ والی دونوں زوموکے پاس پیغام چھوڑا تھا

کہ آنکھوں میں آنسو بھرا ایک انسان میری تلاش میں پہنچے گا۔ اسے تم میرے پاس پہنچا دینا۔ انہوں نے پیغام دیا تو رگیالو چو اس ملک کی طرف روانہ ہوگیا۔ راستے میں سرو کا ایک درخت ملنے لگا تو رگیالو چو نے اس سے پوچھا کہ کہیں اس کو یوچوق کے بارے میں کچھ معلوم تو نہیں۔ اتنے میں وہ دونوں مارخور آ گئے اور رگیالو کو سینگوں پر اٹھا لیا جب سینگ کے اوپر پہنچا تو رگیالو کو یوچق نظر آنے لگی۔ رگیالو چو نے سوچا جلدی سے اس کے پاس پہنچنے کے لئے سینگوں سے نیچے کودا تو یوچوق پھر ہزاروں سال کی مسافت پر رہ گئی۔ وہ تیزی سے آگے چلنے لگا۔ راستے میں ایک جھاڑی ملنے لگی۔ رگیالو نے اس جھاڑی سے پوچھا کہ اس کے پاس یوچوق کی کوئی خبر تو نہیں۔ اتنے میں ٹیڑھی سینگ والی ''زومو'' اسے اٹھا کر چلنے لگیں۔ رگیالو نے سوچا یہ دونوں ''زومو'' آہستہ چلتی ہیں' میں خود دوڑ کر یوچوق کو پکڑ لوں گا۔ یہ سوچ کر وہ اتر گیا تو یوچوق پھر نظروں سے غائب ہوگئی۔ چلتے چلتے وہ ایک شہر میں پہنچا تو وہاں کے لوگوں نے بتایا کہ کسی ملک کے بادشاہ نے پانچ سو سپاہیوں کے ساتھ آ کر یوچوق کو اغواء کر کے فلاں گلیشیئر کے راستے لے گیا ہے۔ وہ اسی راستے روانہ ہوگیا۔ گلیشیئر کے ایک کریوز میں گر گیا۔ ''مے پری'' نے اسے گرم تو رکھا لیکن وہ اسے وہاں سے نہ نکال سکی۔ اتنے میں ادھر دو کوے پہنچے انہوں نے سوچا کہ اس آدمی کو کھالیں گے۔ وہ ادھر پہنچے تو رگیالو نے ان سے کہا ارے کوے میں ادھر مر رہا ہوں تم دونوں میری آنکھیں نکال کر کھالو۔ لیکن ''ہلانو یوچوق'' کو میرا سلام پہنچادو۔ کوؤں کا گھونسلہ یوچوق کے محل کے پہلو میں تھا وہ دیر سے واپس پہنچے تو یوچوق نے دیر ہونے کا سبب پوچھا تو انہوں نے قصہ سنا دیا۔ یوچوق نے ان کوؤں سے کہا کسی کو بتائے بغیر کل اسے کریوز سے نکال لو۔ دوسرے کوؤں نے رگیالو کو ادھر سے نکال کر ایک میدان میں پہنچا دیا۔ رگیالو نے ادھر اس ملک کے بادشاہ کے پانچ سو مویشیوں کو مار کر کوؤں کے لیے دو سال کی خوراک تیار کر دی۔ اس کے بعد وہ یوچوق کے محل میں پانی لے جانے والے گھاٹ کے قریب چھپا بیٹھا رہا۔ اتنے میں یوچوق کی کنیز کنزوق ادھر آ پہنچی۔ کنزوق نے دیکھا کہ ادھر ایک بہت ہی حسین جوان بیٹھا ہے۔ کونزوق نے سوچا میں خود بھی اتنی حسین ہوں۔ کیوں نہ کسی شہزادے سے شادی کرلوں۔ میں یوچوق کی نوکرانی بن کر کیوں رہوں۔ یہ سوچ کر اس نے مٹی کا لوٹا توڑ دیا اور ایک طرف کو چلا گیا۔ تھوڑا دور جا کر آئینہ دیکھا تو کیا دیکھتی ہے اس کی شکل بوڑھی ہو چکی ہے اور شادی کی قابل نہ رہی ہے۔ روتی ہوئی واپس گھاٹ پر آئی۔ رگیالو چو نے رونے کا سبب پوچھا تو کونزوق نے سارا قصہ اسے سنایا۔ رگیالو چو نے اس کا لوٹا پھر سے جوڑ دیا۔ کونزوق پانی لے کر یوچوق کے پاس پہنچ گئی تو اس نے دیر ہونے کا سبب پوچھا۔ کونزوق نے سارا قصہ بیان کیا تو یوچوق نے خواہش ظاہر کی کہ اسے اس جگہ لے جائے جہاں وہ جوان بیٹھا ہوا ہے۔ کونزوق نے یوچوق کو اس جگہ پہنچا دیا۔ یوچوق رگیالو چو سے ملی۔ اس نے بتایا کہ رات کو پانچ سو سپاہی ہمارے اردگرد پہرہ دیتے ہیں۔ رگیالو چو نے کہا میں رات کو سارے سپاہیوں کو ختم کروں گا' تم بادشاہ کا سر قلم کر دو۔ رات ہوئی تو رگیالو چو نے ایک سپاہی کا سر تلوار سے اڑا دیا اور سر دوسرے سپاہی پر جا لگا اس نے سر اٹھایا تو رگیالو چو نے اس کا سر تلوار سے اڑا دیا۔ وہ سر تیسرے پر جا لگا۔ اس طرح اس نے سب کا سر اڑا دیا۔ آخری سپاہی کا سر بادشاہ پر جا لگا۔ بادشاہ نے سر اٹھایا تو یوچوق نے اس کا سر قلم کر دیا۔ اس کے بعد دونوں نے محل کی قیمتی چیزیں اڑن تخت پر جمع کیا اور دونوں اس پر بیٹھ کر رگیایول پہنچ گئے۔ رگیایول میں ہلانو برانہ تھی۔ یوچوق کے پہنچنے پر وہ اداس ہوگئی۔ یوچوق دیوی کہنے لگی! ارے برانہ دیوی تم پریشان کیوں ہوتی ہو؟ ہم سب ایک ہی جسم کے حصے ہیں۔ میں اس دو سر والے کبوتر کے سونے کا سر ہوں' تم فیروزے کا سر ہو' اس کبوتر کے دھڑ سے رگیالو چو پیدا ہوگیا ہے۔ اس کے پر سے پلمے کنجہ پیدا ہوگئی ہے اور اس کے پاؤں سے پلمے کنجہ کا شوہر پیدا ہوگیا ہے۔ اب تم اس محل کی مالکن ہو۔ میں تمہاری خدمت میں زندگی گزار دوں گی۔ اس طرح سے دو سروں والے کبوتر کے مختلف اعضاء سے بنے ہوئے سارے آدمی پھر ایک جگہ جمع ہوگئے۔ رگیالو چو اپنی دونوں بیویوں اور وزیر اور اس کی بیوی کے ساتھ خوش خوش زندگی گزارتے ہوئے رگیایول پر حکومت کرنے لگا۔

شینگ کھن چندن:

کہا جاتا ہے کہ کسی زمانے میں بلتستان کی وادی چھور بٹ میں ایک عقل مند ترکھان رہتا تھا جو کندہ کاری' پچی کاری اور چوبکاری کے دیگر فنون میں انتہائی مہارت رکھتا تھا۔ اس ترکھان کا نام شینگ کھن چندن تھا۔ اکلوتے بیٹے کے سوا اس کی کوئی اولاد نہ تھی۔ وہ عموماً تعمیرات کے سلسلے میں گھر سے باہر رہتا تھا اور اس کے گھر کی دیکھ بھال اور بیٹے کی پرورش اس کی بیوی کیا کرتی تھی۔ شینگ کھن چندن کا بیٹا تو جوان ہوگیا مگر اس کی ماں مرگئی۔ اب شینگ کھن چندن کے لئے گھر سے باہر کام کے لئے جانا مشکل ہوگیا۔ کیونکہ بیوی کے مرنے کے بعد گھر کی دیکھ بھال کے لئے کوئی اور نہ تھا۔ صرف اس کا اکلوتا بیٹا تھا جو کام کرنے کا عادی نہ تھا۔ ادھر لداخ کے راجہ کی طرف سے پیغام آیا کہ اس کے محل کی تعمیر کے لئے شنگ کھن چندن جلد از جلد لداخ پہنچ جائے۔ چنانچہ چندن نے لداخ جانے سے پہلے اپنے

بیٹے کی شادی کا فیصلہ کیا۔ تیاریاں مکمل کر لینے کے بعد ایک لڑکی سے اس کی شادی کر دی۔ کچھ روز گزرنے کے بعد چندن نے بہو سے کہا کہ صبح میں اور تمہارا میاں لداخ کی طرف سفر پر جا رہے ہیں۔ تم ہمارے لئے زادہ راہ کی تیاری کر لو۔ بہو نے ایک تھیلی میں ترکھان کے اوزار اور دوسری تھیلی میں چند روٹیاں ڈال کر سامان باندھ لئے۔ صبح سویرے باپ بیٹا دونوں سفر پر روانہ ہو گئے۔ سامان پیٹھ پر اٹھائے چلتے چلتے وہ دونوں ایک پہاڑ کے قریب پہنچ گئے۔ اس جگہ پہاڑ کی چوٹی پر پہنچنے کے لئے نو چکر لگانے پڑتے تھے کیونکہ اس چڑھائی میں نو موڑ تھے۔ پہلا موڑ عبور کیا تو چندن نے بیٹے سے کہا ''درہ عبور کرنے کا بندوبست کرو'' بیٹے نے تھیلی میں سے روٹیاں نکال لیں اور دونوں نے ایک ایک روٹی کھالی۔ دوسرے موڑ پر پہنچے تو باپ نے پھر وہی الفاظ دہرائے' بیٹے نے کہا صرف دو ہی روٹیاں تھیلی میں تھیں جو ہم نے کھالی ہیں اور اب اور کچھ ہمارے پاس نہیں ہے۔ باپ نے کہا اتنے لمبے سفر کے لئے تمہاری بیوی نے صرف دو روٹیاں تھیلی میں ڈالی تھیں۔ یہ بیوقوف بیوی میری بہو نہیں بن سکتی۔ چلو واپس چلتے ہیں۔ واپس گھر پہنچنے پر چندن نے بہو کو طلاق دلوائی اور کسی اور کو اپنی بہو بنالیا۔ اس بہو کے ساتھ بھی ایسا ہی واقعہ پیش آیا۔ اس طرح چندن نے یکے بعد دیگرے دس لڑکیوں کو بیاہ کر لایا لیکن طلاق دلواتا گیا۔ اب چندن نے فیصلہ کیا کہ جب تک ایک عقل مند بہو کا بندوبست نہیں ہوتا لداخ کا سفر ملتوی رکھا جائے گا۔ چندن اب بہو کی تلاش میں خود نکل کھڑا ہوا۔ دن بھر چلنے کے بعد وہ کسی گاؤں کے کنارے پہنچا تو اس نے دیکھا کہ ایک جگہ تین لڑکیاں اون دھن رہی ہیں۔ چندن نے لڑکیوں سے پوچھا کہ میں دور جگہ سے یہاں تک پیدل چل کر آیا ہوں تو بتاؤ کہ میں نے ادھر سے ادھر کتنے قدم اٹھائے ہوں گے۔ یہ سن کر دو لڑکیوں کو سخت غصہ آیا اور کہا ہم تمہارے قدم تھوڑے گنتے رہے۔ تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے اور بیہودہ سوال پوچھتا ہے۔ لیکن تیسری لڑکی نے چندن سے کہا۔ تم ادھر سے یہاں تک نظریں ہم پر جما کر آئے ہو۔ اب بتاؤ کہ تمہارے یہاں پہنچنے تک ہم نے چھڑیوں سے اون پر کتنی بار ضرب مارا ہے۔ چندن لڑکی کی بات سن کر اس کی دانائی سے متاثر ہوا اور اس کے گھر جا کر رشتہ مانگا اور اپنے لڑکے کے ساتھ اس لڑکی کی شادی کرالی۔ شادی کے چند روز بعد چندن نے پھر لداخ جانے کا ارادہ کر لیا اور بہو کو سامان سفر تیار کرنے کے لئے کہا۔ رات کو بہو نے اپنے شوہر سے پوچھا کہ تم اتنی ساری بیویوں کو کس وجہ سے طلاق دیتے رہے ہو۔ لڑکے نے سارا قصہ سنا دیا۔ یہ سب کچھ سننے کے بعد بیوی نے شوہر سے کہا کہ جب تمہارا باپ تم سے کہے کہ بیٹا ''چڑھائی چڑھنے کا بندوبست کرو'' تو تم اسے پہلے ایک دو موڑ پر روٹی اور خوبانی وغیرہ کھلا دینا۔ پھر جب وہ دوبارہ تم سے ایسا ہی کہے تو تم شور مچاتے ہوئے پہاڑ کی چوٹی کی طرف دوڑو کہ چیتا آ گیا ہے۔ باپ بھی یہ سن کر دوڑ کر وہ چڑھائی عبور کرے گا اور آئندہ پھر طلاق کی نوبت نہیں آئے گی۔ صبح باپ بیٹا دونوں سفر پر روانہ ہو گئے۔ بیٹے نے پہلے موڑ پر باپ کو روٹی کھلا دی اور دوسرے موڑ پر خوبانی کا خشتہ کھانے کو دیئے۔ تیسرے موڑ پر پہنچتے ہی باپ کے کچھ کہنے سے پہلے ہی بیٹے نے شور مچا کر اوپر کی طرف بھاگنا شروع کر دیا۔ کل نو موڑ تھے دو گزر چکے تھے۔ باپ نے وہ شور سن کو بیٹے کے پیچھے دو موڑ اور دوڑ کر طے کر لئے۔ پھر پیچھے مڑ کر دیکھا تو کوئی چیتا نظر نہ آیا۔ بیٹا برابر دوڑے جا رہا تھا۔ چندن وہیں پر ٹھہرا اور لڑکے کو آواز دے کر بلایا پھر کہا واپس چلو۔ اسے بہو کی شیطانی کا پتہ چلا تھا لہذا گھر پہنچتے ہی اسے طلاق دلوا کر فارغ کر دیا۔ کچھ دن اس فکر میں گزارے کہ اسے ایک عقل مند بہو کیوں کر مل سکتی ہے۔ پھر ایک روز عقل مند بہو کی تلاش میں دوبارہ سفر پر روانہ ہو گیا۔ راستے میں ایک شخص ملا جو اسی راستے پر سفر کر رہا تھا۔ چندن اس کے ساتھ چلنے لگا۔ وہ شخص جوتا پہنے جا رہا تھا۔ اور چندن جوتا اتار کر ہاتھ میں لئے ننگے پاؤں جا رہا تھا۔ تھوڑی دور جانے کے بعد وہ ایک ندی پر پہنچ گئے۔ اب ندی کو عبور کرنا تھا۔ چندن نے جوتے پہن لئے لیکن اس کے ساتھی نے اپنے جوتے اتار دیئے۔ دونوں نے ندی کو پار کیا۔ ندی کے دوسری طرف نکلتے ہی چندن نے جوتے اتار دیئے اور اس آدمی نے اپنے جوتے پھر پہن لئے۔ اس شخص نے سوچا کہ چندن پاگل ہے۔ کچھ دیر اور ساتھ چلنے کے بعد دوپہر کے کھانے کا وقت آ گیا۔ دونوں نے ایک ایک روٹی کھالی اور پھر چلنے لگے۔ راستہ بھر چندن یہ کہتا ہوا چلتا رہا ''ایک روٹی میں نے خود کھالی اور دوسری روٹی پانی میں پھینک دی'' اس شخص کو یہ سن کر سخت غصہ آیا کہ یہ کتنا کنجوس آدمی ہے میں نے ایک روٹی ہی تو کھالی تھی وہ اسی کو بار بار دہرا رہا ہے۔ لیکن وہ چندن سے کچھ پوچھے بغیر چلتا رہا۔ ایک گاؤں میں پہنچے تو انہوں نے دیکھا کہ چند لوگ ایک جنازہ اٹھائے جا رہے ہیں۔ چندن نے پوچھا بھئی یہ لاش نئی ہے کہ پرانی؟ ساتھی کو سخت غصہ آیا اور برہم ہو کر کہا آج کوئی مرا ہو گا جسے یہ لوگ دفنانے لے جا رہے ہیں دنیا میں کوئی پرانی لاش بھی ہوتی ہے؟ ساتھی کو اب یقین آ گیا کہ چندن ضرور پاگل ہے۔ کیونکہ یہ الٹی سیدھی باتیں کرتا ہے۔ کچھ دور جانے کے بعد وہ دونوں ایک مکان کے پاس سے گزرے۔ اس مکان کی چمنی سے دھواں نکل رہا تھا۔ دھواں دیکھ کر چندن نے پوچھا ارے بھئی یہ دھواں گرم ہے یا ٹھنڈا؟ ساتھی نے اس بیہودہ سی بات پر جل کر کہا دھواں گرم ہی ہوتا ہے۔ چندن خاموش ہو گیا۔ دونوں چلتے رہے۔ ایک جگہ

انہوں نے دیکھا کہ ایک آدمی کاشت میں مصروف ہے۔ چندن نے ساتھی سے پوچھا ارے بھئی! یہ آدمی کھا کر کاشت کر رہا ہے یا کہ کھانے کے لئے؟ ساتھی اب چندن سے اتنا تنگ آچکا تھا اس نے مجبوراً جواب دیا فصل کھانے ہی کے لئے کاشت کی جاتی ہے۔ اتنے میں چندن کے ساتھی کا گھر قریب آ گیا۔ رات ہو رہی تھی وہ آدمی گھر جانے لگا تو چندن نے اس سے کہا: میں سامنے والے عبادت خانے میں رات گزاروں گا تم گھر جاؤ لیکن گھر میں داخل ہونے سے پہلے تین بار کھانس لو۔ اس شخص نے ناراض ہو کر چندن سے جان چھڑانے کے لئے تین بار کھانسنا شروع کیا۔ اتفاق سے اس شخص کی بیٹی صحن میں نہا رہی تھی کھانسنے کی آواز سن کر جھٹ کپڑے پہن لئے اتنے میں باپ اندر داخل ہو گیا۔ جب بیٹی نے باپ کو افسردہ پایا تو اس نے پوچھا سفر میں کوئی تکلیف تو نہیں ہوئی؟ باپ نے کہا اور تو کوئی تکلیف نہیں ہوئی' صرف اتنا ہوا کہ صبح سویرے ہی ایک پاگل آدمی میرا ہمسفر بن گیا اور راستہ بھر پاگلوں کی سی باتوں اور حرکتوں سے مجھے پریشان کرتا آیا۔ اتنا کہنے کے بعد باپ نے بیٹی کو چندن کی ساری باتیں سنا دیں۔ سارا قصہ سننے کے بعد بیٹی بولنے لگی وہ شخص پاگل نہیں بلکہ بہت ہی عقل مند ہے۔ اس کی ساری باتیں حکمت سے بھری ہوئی ہیں۔

پہلی بات یہ ہے کہ اس نے پانی میں جوتے پہن لئے۔ خشکی پر ننگے پاؤں چلنے میں کوئی حرج نہیں ہے کیونکہ راستہ اور راستے میں موجود ہر چیز ہمیں نظر آتی ہے۔ اس لئے ننگے پاؤں چلنے میں کوئی نقصان نہیں۔ لیکن پانی میں چونکہ راستہ صاف نظر نہیں آتا جس کی وجہ سے کوئی چیز چبھ جائے' آبی کیڑے مکوڑوں کے کاٹنے اور پھسل کر گرنے کا بھی خطرہ رہتا ہے اس لئے اس شخص نے پانی میں جوتے پہن لئے ہیں۔ دوسری بات یہ کہ وہ شخص بار بار یہ کہتا رہا ''ایک روٹی میں نے خود کھالی اور دوسری دریا میں پھینک دی'' یہ بھی اس کی عقل مندی کی علامت ہے۔ آپ نے جو مفہوم سمجھ لیا ہے وہ درست نہیں۔ وہ آپ کی کھائی ہوئی روٹی کا ذکر نہیں کر رہا تھا بلکہ اس سے مراد یہ تھی کہ جو روٹی اس نے خود کھالی وہ صرف پیٹ بھرنے کے لئے کام آئی' اس لئے یہ روٹی بیکار تھی جب کہ جو روٹی اس نے آپ کو کھلائی ہے وہ اس کے لئے اجر کا سبب بن گئی۔ بیٹی کی یہ باتیں سن کر باپ حیران رہ گیا۔ اس نے پوچھا تو پھر بتاؤ پرانی لاش اور نئی لاش سے کیا مراد ہے؟ بیٹی کہنے لگی پرانی لاش سے مراد غریب اور نادار شخص ہے جس کا دنیا میں کوئی پرسان حال نہیں ہوتا۔ وہ بیمار ہو یا صحت مند' سفر ہو یا حضر میں گمان ہی ہوتا ہے۔ وہ مہینوں فاقے کرے کوئی نہیں پوچھتا۔ اس لئے غریب آدمی زندہ رہ کر بھی چلتی پھرتی لاش ہی ہوتی ہے۔ جب یہ مرجاتا ہے تو بس دفنانے کی رسم عمل میں آتی ہے لیکن حقیقت میں وہ ایک پرانی لاش ہی ہوتی ہے۔ اس کے مقابلے میں امیر آدمی کے ہاں چہل پہل رہتی ہے۔ اس کے اردگرد نوکر چاکر ہوتے ہیں۔ شان و شوکت ہوتی ہے۔ اس کے پاؤں میں کانٹا چبھ جاتا ہے تو اسے نکالنے کے لئے بیسوں لوگ ٹوٹ پڑتے ہیں۔ جب وہ مرجاتا ہے تو وہ نئی لاش بن جاتی ہے۔ باپ نے کہا تم خواہ مخواہ اس کی باتوں کی تاویل کرتی ہو۔ اچھا یہ بتاؤ کہ گرم دھواں اور ٹھنڈے دھواں والی بات کا کیا مطلب ہے؟ بیٹی نے کہا کہ امیر گھرانے کے چولہوں سے جو دھواں نکلتا ہے وہ گرم دھواں ہوتا ہے کیونکہ ان چولہوں پر قسم قسم کے کھانے پک رہے ہوتے ہیں لیکن غریب لوگوں کے چولہوں پر صرف تاپنے کے لئے لکڑی جل رہی ہوتی ہے لیکن اس پر پکتا کچھ نہیں۔ یہ دھواں ٹھنڈا دھواں ہوتا ہے۔ یہ سن کر باپ کو بھی اس آدمی سے عقیدت ہونے لگی۔ باپ نے اس کی کھا کر کاشت کرنے یا کھانے کے لئے کاشت کرنے والی بات کی تاویل پوچھی تو بیٹی بولنے لگی' یہ حقیقت ہے کہ کچھ کھا کر کاشت کرتے ہیں یہ وہ لوگ ہوتے ہیں جو کفایت شعاری سے کام نہیں لیتے بلکہ سب کچھ ختم کرنے کے بعد قرض مانگ کر گزارہ کرتے ہیں اور پھر کاشت کے موسم میں کاشت کرنے لگتے ہیں تاکہ اس کی فصل سے کھایا ہوا قرض چکا دیں۔ ایسے لوگ ایک بار جب اس طرح پھنس جاتے ہیں تو اس سے نکل نہیں پاتے اور ہمیشہ کھا کر کاشت کرتے رہتے ہیں۔ اب باپ کو یقین ہو گیا کہ وہ نہایت عقل مند آدمی ہے لیکن اس نے تین بار کھانس کر گھر میں داخل ہونے کی جو ہدایت کی وہ اس کی سمجھ میں نہ آئی۔ بیٹی سے پوچھا تو اس نے بتایا کہ وہ اس خیال سے صحن میں نہا رہی تھی کہ باپ ابھی نہیں پہنچے گا۔ اگر باپ داخل ہوتے ہوئے تین بار نہ کھانستا تو وہ اسی بے پردگی کے عالم میں اندر پہنچ جاتا۔ اب اسے چندن سے اتنی عقیدت ہو گئی کہ سیدھا اس کے پاس جا کر اسے گھر آنے کی دعوت دی۔ شینگ کھن چندن نے انکار کیا اور کہا کہ وہ اسی عبادت خانے میں ہی رات گزارے گا اور صبح سویرے بہو کی تلاش میں نکلے گا۔ اس شخص نے گھر جا کر بیٹی کو وہ ماجرا سنایا اور کہا کہ اس کے لئے کھانا بنالو وہ یہاں نہیں آ رہا ہے کیونکہ صبح سویرے وہ عقل مند بہو کی تلاش میں نکلنے والا ہے۔ بیٹی کے دل میں یہ خیال آیا کہ مجھے ایسے عقل مند آدمی کی بہو بننا چاہئے۔ خیر اس نے کھانا تیار کیا' روٹیاں دسترخوان میں لپیٹ لیں۔ پھر کٹورے میں ترکاری ڈالی اور ترکاری میں گوشت کی بوٹیاں ڈال دیں۔ پھر باپ سے کہا کہ یہ اس آدمی کے پاس لے جائیں اور اس سے یہ کہنا کہ آج تاروں کی تین اور چاند کی دو تاریخ ہے اور موسم ابر آلود ہے۔ باپ وہ کھانا لے کر گیا۔ راستے میں اس نے

اس کھانے میں سے ایک روٹی اور گوشت کی دو بوٹیاں خود کھالیں اور ترکاری کا آدھا حصہ پی لیا۔ اس کے بعد باقی کھانا چندن کے سامنے رکھ دیا اور کہا میری بیٹی نے کہا ہے کہ آج تاروں کی تین اور چاند کی دو تاریخ ہے اور موسم ابر آلود ہے۔ چندن نے کھانا کھالی اور اس آدمی سے کہا کہ اپنی بیٹی سے کہنا کہ آج تاروں کی بھی یکم اور چاند کی بھی یکم تاریخ ہے اور موسم صاف ہے۔ اس آدمی نے گھر آ کر چندن کی باتیں بیٹی کو سنائیں تو بیٹی سمجھ گئی کہ باپ نے ایک روٹی' آدھی ترکاری اور گوشت کی دو بوٹیاں راستے میں خود ہڑپ کر لی ہیں۔ پوچھا تو باپ نے تصدیق کی۔ چندن اس آدمی کی بیٹی کی بات سے اتنا متاثر ہوا کہ صبح سویرے خود اس کے ہاں چلا گیا اور بیٹے کے لئے رشتہ مانگ لیا۔ رشتہ منظور ہوا اور کچھ دنوں بعد دھوم دھام سے شادی ہوگئی۔ اب چندن نے لداخ جانے کا ارادہ کیا اور ایک دن بہو سے کہا کل میں اور تیرا میاں لداخ روانہ ہو رہے ہیں ہمارے سفر کے لئے سامان تیار کرلو۔ بہو نے نو خانوں والا ایک تھیلہ بنایا اور ہر خانے کو خوبانی کے خستہ اور بادام سے بھر دیا۔ ایک اور تھیلی میں گوشت کے پکے ہوئے ٹکڑے ڈال دیئے۔ دوسرے تھیلے میں ترکھان کے اوزار ڈالے۔ اس طرح سامان تیار کر دیا۔ اس کے بعد اپنے شوہر کو بلا کر سمجھایا کہ جب وہ چڑھائی پر پہنچیں اور باپ کہے ''چڑھائی چڑھنے کا بندوبست کرو'' تو ہر موڑ پر اس تھیلی کے ایک خانہ کو کھول کر اس میں جو کچھ ہے وہ اسے کھانے کو دے اور جب باپ تھکن دور کرنے کے لئے آرام کرے تو یہ گوشت کے ٹکڑے اس کو پیش کرے۔ اسی طرح چڑھائی ختم ہو جائے گی جب چڑھائی کے آخری مرحلے پر باپ آرام کرنے بیٹھ جائے تو بیٹا بانسری بجائے۔ یہ کہہ کر اس نے شوہر کے سامان میں ایک بانسری بھی رکھ دی۔ جب دوسری صبح وہ دونوں روانہ ہوگئے تو چندن کے بیٹے نے ایسا ہی کیا۔ دونوں نے خستہ' بادام اور گوشت کھاتے ہوئے درّے کو عبور کیا اور درّے کی چوٹی پر جب وہ آرام کرنے کے لئے بیٹھے تو بیٹا اس انداز سے بانسری بجانے لگا کہ چندن کی تھکن اور پریشانیاں دور ہوگئیں۔ بانسری کی آواز سن کر لداخ کے بادشاہ کے آدمی ان کے استقبال کو پہنچ گئے۔ وہاں سے آگے گھوڑوں پر سوار ہو کر انہوں نے سفر کیا۔ لداخ پہنچے تو بادشاہ نے ان کا خیر مقدم کیا۔ اب محل کی تعمیر کی تیاریاں شروع ہوگئیں۔ تیاریاں مکمل ہونے کے بعد چندن نے تعمیر کا کام شروع کر دیا۔ چندن کی خدمت کے لئے راجہ نے ایک نوکر بھی دے رکھا تھا۔ چند سالوں میں محل کی تعمیر کا کام مکمل ہوگیا۔ ایسا عالی شان محل اردگرد کے علاقوں میں کسی بادشاہ کو نصیب نہ تھا۔ محل دن میں سات رنگ اختیار کرتا تھا اور اپنی جگہ سورج کے ساتھ ساتھ گھومتا بھی تھا۔ اس کی کندہ کاریاں بھی عجوبہ روزگار تھی۔ جب بادشاہ محل کو دیکھنے کے لئے پہنچا تو دنگ رہ گیا۔ بادشاہ چندن اور اس کے بیٹے پر اتنا خوش ہوگیا کہ اسے اپنے پاس موجود ہر چیز انعام میں دینے کے لئے حقیر دکھائی دینے لگی۔ چنانچہ اس نے درباریوں سے مشورہ مانگا کہ چندن کو کیا انعام دیا جائے۔ ہر کسی نے مختلف رائے دی۔ کسی نے کہا کہ خزانے کا دروازہ کھول کر ان دونوں سے کہا جائے کہ جتنا سونا چاندی اٹھانا چاہیں اٹھا کر لے جائے۔ کسی نے کہا ان دونوں کے وزن کے برابر تول کر سونا چاندی دینا چاہئے۔ کسی نے کہا کہ انہیں اتنا مال دولت دینا چاہئے کہ دس پشتوں تک مالا مال رہیں۔ اسی دوران ایک وزیر اٹھ کر کہا کہ چندن کو آپ جو چاہیں انعام میں دیں لیکن چندن کے دونوں ہاتھ کاٹ دیئے جائیں تا کہ وہ کسی اور راجہ کے لئے ایسا عالی شان محل نہ بنا سکے۔ دربار میں موجود سارے لوگوں کو یہ تجویز پسند آ گئی۔ راجہ نے حکم دیا کہ صبح اس کے دونوں ہاتھ کاٹ دیئے جائیں۔ دربار میں اتفاق سے وہ لڑکا بھی حاضر تھا جس کو بادشاہ نے چندن کی خدمت پر مامور رکھا تھا۔ اس نے جب چندن کے ہاتھ کاٹنے کی بات سنی تو دوڑ کر چندن کے پاس آیا اور روتے ہوئے سارا قصہ سنایا کہ صبح اس کے ہاتھ کاٹے جائیں گے۔ چندن یہ سن کر دم بخود رہ گیا۔ اس نے لڑکے کو تسلی دی اور چپ ہوگیا۔ رات کو چپکے سے چندن محل میں گیا اور اس کی مرکزی چابی کی میخ نکال لی جس سے محل ٹیڑھا ہوگیا۔ صبح راجہ کو پتہ چلا کہ محل ٹیڑھا ہوگیا ہے تو اس نے چندن کو بلا کر اس کا سبب پوچھا۔ چندن نے کہا کہ ہو سکتا ہے کہ راجہ کی نیت ٹیڑھی ہوگئی ہو جس کی وجہ سے محل ٹیڑھا ہوگیا ہے۔ راجہ اس سے اس ٹیڑھا پن کو ٹھیک کرنے کی خواہش کی تو چندن نے کہا کہ ٹیڑھا پن کو ٹھیک کرنے کا سامان وہ گھر پر چھوڑ کر آیا ہے اگر بادشاہ چاہتا ہے تو آدمی بھیج کر منگوا سکتا ہے۔ لیکن وہ بھاری بھرکم ہے اس لئے کم از کم بارہ آدمیوں کو بھیجنا پڑے گا وہ نازک بھی ہے اس لئے سمجھ دار وزیروں کو ساتھ جانا پڑے گا۔ بادشاہ نے بارہ وزیروں کو جانے کا حکم دے دیا۔ جب وہ جانے لگے تو چندن نے کہا تم لوگ جا کر میری بہو سے کہنا کہ سسر نے ٹیڑھا پن ٹھیک کرنے کا سامان لانے کے لئے بھیجا ہے جس کا نام ''مسترانگمی سترانگ شینگ اڑانگ کوڑانگ از بری ٹھواق'' ہے۔ میری بہو وہ سامان لا کر دے گی۔ وزیر روانہ ہوگئے اور چندن کی بہو کو وہ پیغام سنایا تو وہ سمجھ گئی کہ باپ بیٹے پر برا وقت آن پڑا ہے اور یہ کہ ان وزیروں کو سزا دینے کے لئے بھیجا ہے۔ بہو نے خندہ پیشانی کے ساتھ خوب خاطر تواضع کی اور کہا کہ اس نازک چیز کو نکالنے کے لئے گھر کے سامنے والا سفیدہ کاٹنا پڑے گا اور اسے نہایت احتیاط سے چیرنا پڑے گا کیونکہ وہ چیز سفیدے کے تنے کے اندر ہے۔ وزیروں

نے اس سفیدے کو گرا کر اس کے تنے کو چیرنے کے لئے کھونٹیاں لگا دیں۔ تنے کے اندر شگاف پڑ گیا تو بہو نے کہا کہ تم لوگ اس شگاف کے اندر ہاتھ ڈال لو میں بھی کنارے سے ہاتھ ڈالتی ہوں اس کے بعد احتیاط کے ساتھ وہ چیز نکال لیتے ہیں۔ جب سارے وزیروں نے اس شگاف میں اپنے دونوں ہاتھ ڈالے تو چندن کی بہو نے تیزی سے کھونٹی نکال لی جس سے ان کے ہاتھ شگاف میں پھنس گئے۔ بہو نے ان سے پوچھا کہ اب بتاؤ شینگ کھن چندن اور اس کا بیٹا کہاں اور کس حال میں ہیں۔ سب نے سچ سچ بتا دیا کہ وہ کس پریشانی میں مبتلا ہیں۔ باقی دس وزیروں نے ان دونوں وزیروں جن میں سے ایک نے چندن کے ہاتھ کاٹنے کی تجویز دی تھی اور دوسرے نے تائید کی تھی کے نام دیئے۔ بہو نے ان دونوں میں سے ایک کی زبان اور دوسرے کی ناک کاٹ ڈالی اور کہا کہ جاؤ راجہ سے کہو کہ ٹیڑھا پن ٹھیک کرنے کا سامان مل گیا ہے۔ چندن اور اس کے بیٹے کو ان کی خدمت کا معاوضہ دے کر صحیح وسلامت ادھر پہنچا کر اپنے وزیروں کی جان چھڑا لے۔ وہ دونوں وزیر بڑی بدحالی میں بادشاہ کے پاس دربار میں پہنچ کر داستان سنانے لگے۔ لیکن کسی کی سمجھ میں ان کی باتیں نہیں آتی تھیں کیونکہ زبان اور ناک کے کاٹنے کے بعد الفاظ صحیح ادا نہیں ہو رہے تھے۔ ان کی باتیں سن کر دربار میں کچھ لوگ ہنسنے لگے اور بعض رونے لگے۔ آخر بادشاہ نے زبان حال سے معاملہ سمجھ لیا۔ اس نے چندن سے بہت شرمندگی کا اظہار کیا اور معافی مانگی اور ڈھیر سارا مال انعام میں دے کر اسے عزت کے ساتھ اپنے گھر روانہ کر دیا۔ باپ بیٹا گھر پہنچے تو انہوں نے وزیروں کو آزاد کر دیا۔ چندن نے اپنی بہو کی اس عقل مندی پر شاباش دی اور اپنے بیٹے اور بہو کے ساتھ اطمینان سے زندگی گزارنے لگا۔

شینگ کھنی خسوسبو:

کہتے ہیں کہ کسی ملک کے بادشاہ کی کوئی اولاد نہ تھی اور وہ ہمیشہ اسی فکر و غم میں بڑا پریشان رہتا تھا۔ اس کے کئی وزیر تھے ان میں سے ایک وزیر ترکھان تھا جو بادشاہ کے پاس بہت ہی عزیز تھا۔ بادشاہ کی طرح ترکھان وزیر کی بھی کوئی اولاد نہ تھی۔ ایک دفعہ بادشاہ اور ترکھان وزیر دونوں نے اولاد کے لئے منت مانی۔ وزیر نے بادشاہ سے کہا اگر ہم دونوں کے ہاں بیٹے ہوئے تو دونوں بیٹوں کو میں پالوں گا۔ بادشاہ نے کہا ٹھیک ہے۔ اللہ کا کرنا کہ چند ماہ بعد دونوں کے ہاں ایک ہی دن میں بیٹے ہو گئے۔ خوشی میں بادشاہ وزیر کی طرف دوڑا اور وزیر بادشاہ کی طرف۔ راستے میں دونوں ملے۔ ایک دوسرے کو خوشخبری سنا کر اپنے گھروں کو واپس چلے گئے۔ اب وزیر نے شہزادے کو بھی اپنے گھر لایا اور اپنے بیٹے کے ساتھ اس کی پرورش شروع کی۔ عام بچے مہینوں میں جتنے بڑھتے ہیں یہ دونوں بچے ہفتوں میں اتنے بڑھتے اور عام بچے جتنے ہفتوں میں بڑھتے ہیں یہ بچے دنوں میں بڑھتے۔ جب یہ بچے کچھ بڑے ہو گئے تو ترکھان وزیر نے انہیں گاؤں کے اخوند کے پاس پڑھنے کے لئے بھیج دیا۔ وہ دونوں ہر روز اخوند کے گھر جاتے اور پڑھ کر واپس آتے۔ تقریباً سال اس طرح گزر گیا۔ ایک دن اخوند وزیر کے گھر آیا اور پوچھا کہ یہ بچے بیمار تو نہیں۔ ترکھان وزیر نے حیرت سے استفسار کیا اور اخوند نے کہا کہ ایک ہفتے سے وہ بچے پڑھنے کے لئے نہیں آ رہے ہیں۔ دونوں بچے صبح گھر سے جاتے تھے۔ دوسری صبح بچوں کے جانے کے بعد وزیر چھپ کر ان کے پیچھے چلا تو معلوم ہوا کہ وہ راستے میں کھیل میں مصروف رہ کر واپس آتے تھے۔ وزیر نے دونوں کو گھر لایا اور خوب سمجھایا لیکن انہوں نے پڑھنے سے انکار کر دیا۔ دوسری صبح وزیر نے سزا کے طور پر ان دونوں کی پیٹھ پر ٹوکرے چڑھائے اور انہیں مویشی چرانے کے لئے نالے میں بھیج دیا۔ نالے میں پہنچنے پر مویشیوں کو ایک طرف چرنے کے لئے چھوڑ کر شہزادہ بانسری بجانے لگا۔ بانسری کی سریلی آواز سن کر پرندے، چرندے، مچھلیاں سب مسحور ہو گئے اور لوگوں کا ایک ہجوم وہاں جمع ہو گیا۔ ادھر ان کی بھیڑ بکریاں واپس گاؤں میں پہنچ کر لوگوں کے کھیتوں میں گھس گئیں تو لوگ ترکھان وزیر کے پاس شکایت لے کر پہنچ گئے۔ وزیر حیران ہو کر نالے کی طرف دوڑ پڑا۔ دور سے دیکھا ادھر ایک ہجوم جمع ہے وہ بہت گھبرایا کہ کہیں کوئی حادثہ نہ ہوا ہو۔ بہر حال وہ ادھر پہنچا اور دونوں بچوں کو لے کر گھر واپس آ گیا۔ اس واقعے کی خبر بادشاہ کو ہو گئی تو بادشاہ نے ترکھان وزیر اور دونوں بچوں کو بلا کر صورت حال کی بابت پوچھا۔ ترکھان وزیر نے کہا، حضور! میرے اصرار کے باوجود دونوں نے پڑھنے سے انکار کر دیا ہے۔ بادشاہ نے کہا کہ اب یہ دونوں بڑے ہو گئے ہیں آج کے بعد یہ دونوں میرے پاس رہیں گے اور میں ان کی تربیت کروں گا۔ چنانچہ دونوں لڑکے بادشاہ کے محل میں رہنے لگے چونکہ بچپن سے ایک ساتھ پلے بڑھے تھے اس لئے ان کے عادات و اطوار ایک جیسے تھے۔ شکل بھی کچھ ملتی جلتی تھی۔ لباس بھی ایک جیسے پہنتے تھے ملکہ کو معلوم نہیں ہوتا تھا کہ شہزادہ کونسا ہے۔ اس نے اپنی سہیلیوں سے اس کا ذکر کیا تو انہوں نے کہا کہ تم آج حرم کے دروازے پر لکھوا دو کہ شہزادہ حرم میں داخل ہو اور کوئی دوسرا داخل نہ ہو۔ ترکھان وزیر کا بیٹا یہ دیکھ کر واپس چلا جائے گا۔ بادشاہ زادہ اور وزیر زادہ دونوں محل سے باہر گئے ہوئے تھے۔ جب واپس محل کے دروازے پر پہنچے تو شہزادہ محل میں داخل ہو گیا جبکہ وزیر زادہ دروازے پر لکھی ہوئی تحریر دیکھ کر واپس ہوا اور اپنے گھر کی طرف چل دیا۔ شہزادے نے پیچھے مڑ کر

دیکھا تو اسے وزیرزادہ نظر نہ آیا۔ جلدی سے باہر نکل آیا تو دیکھا وہ اپنے گھر جا رہا ہے۔ دوڑ کر اسے پکڑ لیا اور واپس ہونے کو کہا تو وزیرزادہ نے کہا تمہارے گھر کے دروازے پر کچھ لکھا ہوا ہے وہ پڑھ لو۔ وہ تحریر دیکھ کر شہزادہ شرمندہ ہوا۔ اس نے پھر بھی ساتھ چلنے کے لئے اصرار کیا لیکن وزیرزادہ نے انکار کر دیا۔ اس طرح وہ دونوں الگ الگ ہو کر اپنے اپنے گھروں میں رہنے لگے۔ اب شہزادہ جوان ہو چکا تھا۔ بادشاہ نے دوسرے ملک کے بادشاہ کی بیٹی سے شہزادے کا رشتہ طے کر دیا۔ وہ شہزادی اپنی مثال آپ تھی۔ ابھی شادی کا دن طے نہیں ہوا تھا کہ شہزادہ ایک روز شکار سے واپس آ رہا تھا۔ گاؤں کے کنویں کے گرد کچھ عورتیں پانی لانے کے لئے بیٹھی تھیں۔ شہزادے کے گھوڑے کی ٹھوکر لگ کر ان میں سے کسی عورت کا مٹکا ٹوٹ گیا۔ اس عورت کو سخت غصہ آیا اور وہ کہنے لگی ایک بڑی ناک والی بیوی سے رشتہ ہونے پر تمہاری نظر اتنی اونچی ہو گئی ہے کہ میرا مٹکا نظر نہ آیا۔ اگر تمہیں شہزادی نیلم مل جائے تو تم لوگوں کو قتل کرتے پھرو گے۔ شہزادی نیلم کا نام سن کر شہزادہ پریشان ہو گیا۔ رات بھر سوچتا رہا۔ جب صبح ہوئی تو شہزادی نیلم کی تلاش میں شہزادہ ایک طرف کو چل پڑا۔ ایک جگہ سے اپنی سلطنت کی سرحد کو عبور کیا اور کئی روز چلنے کے بعد وہ ایک جگہ پہنچ گیا جہاں پر تھوڑا سا سبزہ تھا۔ گھوڑے کو ادھر چرنے کے لئے چھوڑ کر خود آرام کرنے لیٹ گیا وہ لیٹ کر ہی اِدھر اُدھر گھور رہا تھا کہ اس کی نظر ایک جھونپڑی کے اندر پڑی دیکھا تو ایک بوڑھی عورت اکیلی بیٹھی ہے۔ اس نے سلام کیا اور اس کے پاس ایک دو روز رہنے کی اجازت مانگی۔ بڑھیا نے اجازت دے دی۔ دو روز کے بعد شہزادے نے بڑھیا کو بتایا کہ وہ شہزادی نیلم کی تلاش میں آیا ہے اسے کچھ معلوم ہے تو بتا دے۔ بڑھیا نے کہا تمہیں یہ نام کس دشمن نے بتایا ہے تم خوبصورت نوجوان ہو مجھے تمہاری جوانی پر رحم آتا ہے۔ تم واپس چلے جاؤ۔ یہ ارادہ چھوڑ دو کیونکہ جو بھی اس کام پر گیا ہے وہ واپس نہ آ سکا ہے۔ شہزادے نے ضد کی کہ اس نے بہرصورت یہ مہم سر کرنی ہے۔ وہ بوڑھی عورت پری زاد تھی۔ اس نے شہزادے کے اصرار پر کہا کہ میرے اصطبل سے تم یہ گھوڑا لو اور یہ پولو اور پولو سٹک بھی اٹھا لو۔ اس گھوڑے پر سوار ہو کر اسے دوڑاؤ اور اس سٹک سے گیند کو ہٹ مارو۔ جس جگہ یہ گیند رک جائے وہاں سے گھوڑے سے اتر کر پیدل چلو۔ دائیں بائیں سے لاکھوں قسم کی ڈراؤنی آوازیں سنائی دیں گی۔ تم ڈرنا نہیں۔ آگے چلتے جاؤ تم شہزادی نیلم کے محل کے سامنے پہنچ جاؤ گے۔ ادھر ایک پنجرے میں ایک طوطا ہو گا اس سے بات چیت کرو اور جیسا وہ کہے اسی پر عمل کرو۔ شہزادے نے ایسا ہی کیا۔ قصہ مختصر طوطے کے پاس جا پہنچا اور طوطے کو سلام کیا۔ طوطے نے ہنستے ہوئے اس سے آنے کا سبب پوچھا تو شہزادے نے بڑے میٹھے انداز میں سارا قصہ سنا دیا۔ طوطے نے کہا کہ اس وقت شہزادی نیلم فلاں جگہ سوئی ہوئی ہے۔ اس کے سرہانے کی طرف جوتی اور پاؤں کی طرف تلوار رکھی ہوئی ہے تم سیدھے جاؤ اور تلوار کو سرہانے کی طرف اور جوتی کو پاؤں کی طرف رکھ کر آ جاؤ۔ شہزادی تمہاری ہو جائے گی۔ اس نے ایسا ہی کیا۔ کچھ دیر کے بعد شہزادی اٹھی تو دیکھا کہ کوئی آدم زاد اس کے سرہانے تک پہنچ چکا ہے۔ شہزادی فوراً طوطے کے پاس آئی۔ ادھر شہزادے سے ملی۔ اسے شہزادہ پسند آیا اور اسے ساتھ لے کر محل میں چلی گئی اور ان کی شادی ہو گئی۔ کچھ روز اس طرح گزر گئے۔ ایک دن شہزادے نے کہا میرے بھی ماں باپ ہیں محل اور سلطنت ہیں۔ میں صرف تمہاری تلاش میں آ تھا جو مجھے مل گئی۔ اب میں واپس جانا چاہتا ہوں۔ شہزادی نے کہا کہ جہاں سوئی جائے گی وہاں دھاگہ بھی جائے گا۔ میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گی۔ انہوں نے تیاریاں مکمل کر لیں شہزادے نے کہا کہ جانے سے پہلے میں تمہارے باغ کی سیر کروں گا۔ یہ کہہ کر دونوں باغ میں پھرنے لگے۔ شہزادے نے باغ میں قسم قسم کے قد آدم پتھر دیکھے تو شہزادی نیلم سے پوچھا کہ باغ میں یہ پتھر کیوں ہیں۔ شہزادی نے ہنس کر جواب دیا یہ پتھر نہیں بلکہ تمہاری طرح کے شہزادے ہیں جو میری تلاش میں یہاں آئے تھے۔ راستے میں ڈراؤنی آوازیں سنیں اور انہوں نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو وہیں پتھر بن گئے ہیں۔ شہزادے نے کہا کہ کیا انہیں زندہ کیا جا سکتا ہے؟ شہزادی نے جواب دیا انہیں زندہ تو کیا جا سکتا ہے لیکن یہ سب تمہارے دشمن بن جائیں گے۔ شہزادے نے کہا کہ یہ بھی کسی کے بیٹے اور کسی کے بھائی ہوں گے۔ ان کی مائیں اور بہنیں ان کے انتظار میں ہوں گی۔ میں اکیلا مارا بھی جاؤں تو کوئی بات نہیں مگر انہیں زندہ کیئے بغیر نہیں جائیں گے۔ شہزادی نے ان پتھروں پر دستہ چھومیک سے پانی لا کر چھڑک دیا اور خیومہ رگیہ ہلچنگ سے ایک چھڑی لا کر ان پر مارا تو سب چھینکتے ہوئے زندہ ہو گئے۔ سب نے شہزادے کا شکریہ ادا کیا اور اپنے اپنے وطن کو روانہ ہو گئے۔ اس کے بعد شہزادی نیلم کو لے کر شہزادہ اپنے ملک میں چلا گیا۔ اس کے ماں باپ مر چکے تھے۔ تخت پر اس کے باپ کا ایک وزیر اپو منے بیٹھا حکومت کر رہا تھا۔ ملک کے سبزے اور درخت اجڑ گئے تھے اور ہر طرف قحط تھا۔ شہزادہ پہنچا تو اپو منے نے حکومت اس کے سپرد کر دی اور تھوڑے ہی عرصے میں خوشحالی واپس آ گئی۔ اپو منے اندر سے شہزادے کا مخالف تھا اور اسے مار ڈالنے کا منصوبہ بنا رہا تھا۔ ایک روز اپو منے نے بادشاہ کو شکار پر لے گیا۔ جب جنگل میں پہنچ گئے تو اس نے بادشاہ کی ایک آنکھ نکال دی ایک ٹانگ توڑ دی اور اسے پتھروں کے نیچے دبا کر خود واپس آ گیا۔

شام کو شہزادی نے سنا کہ اپو منے واپس آ گیا ہے لیکن شہزادہ نہیں پہنچا ہے۔ اس نے اپو منے کو بلا کر پوچھا کہ شہزادہ کہاں ہے؟ اپو منے نے کہا کہ وہ صبح واپس آ رہا ہے۔ اپو منے نے شہزادی کو دیکھا تو وہ اسے بہت پسند آئی۔ دوسری صبح شہزادی خود شکارگاہ کی طرف چلی۔ ایک جگہ پہنچی تو تھکاوٹ دور کرنے کے لئے وہ ایک پتھر پر بیٹھ گئی۔ سامنے رام چکوروں کا ایک جوڑا بیٹھا باتیں کر رہا تھا۔ مادہ نے نر سے کہا کوئی خبر سناؤ۔ نر نے کہا ملک کا بادشاہ اپو منے کے ہاتھوں زخمی ہو کر فلاں جگہ پتھروں کے نیچے دبا ہوا ہے۔ اپو منے نے تو اپنے خیال میں اسے قتل کیا ہے لیکن وہ ابھی تک زندہ ہے۔ کل دن کو چرواہے اسے وہاں سے نکالیں گے۔ یہ باتیں سنیں تو شہزادی نے کچھ ٹکڑے روٹی کے رام چکور جوڑے کی طرف پھینک دیئے اور کہا کہ کل جب وہی زخمی تمہارے پاس لنگڑاتے پہنچے گا تو اس کو یہ پیغام دینا ''کل تھوڑی سی برف پڑی ہوگی اور برف پر لومڑی کے پاؤں کے نشانات ہوں گے۔ انہی نشانات کے پیچھے وہ چلے آئے۔ شہر میں راستے کے دائیں طرف پھلوں سے لدے ہوئے درخت ہوں گے۔ انہیں ہاتھ لگائے بغیر وہ چلا آئے تو وہ مجھ تک پہنچ جائے گا'' دوسرے روز چرواہوں نے شہزادے کو پتھروں کے نیچے سے نکال باہر لایا۔ شہزادے کو دیکھا تو رام چکوروں نے اسے شہزادی نیلم کا پیغام پہنچا دیا۔ راستے میں جو پھل دار درخت تھے وہ اپو منے نے جادو سے بنائے تھے۔ شہزادہ واپس محل میں پہنچا تو اپو منے نے معافی مانگ لی۔ شہزادے نے اسے معاف کر دیا۔ کچھ عرصہ بعد اپو منے پھر شہزادے کے ساتھ شکار پر گیا۔ اب کی بار اس نے شہزادے کو قتل کر دیا اور واپس آ کر تخت پر بیٹھ گیا۔ اس نے شہزادی نیلم کو اس کے ساتھ شادی کرنے کو کہا لیکن نیلم اپنے مردہ خاوند کی لاش اٹھائے پھرتی رہی۔ جب اپو منے نے اس لاش کو زبردستی جلانے کا پروگرام بنایا تو شہزادی نے کہا کہ لاش کو آگ میں میں خود پھینک دوں گی۔ جب آگ جلائی گئی تو نیلم لاش کو لے کر اس آگ میں کود پڑی۔ اس طرح لاش کے ساتھ جل کر خود بھی راکھ بن گئی۔ اپو منے نے ان دونوں کی راکھ کو نصف کر کے آدھے کو نالے کے اس پار اور آدھے کو دوسری طرف پھینک دی۔ جہاں راکھ پھینک دی گئی تھی وہاں سفیدے کے دو درخت پیدا ہو گئے دونوں درختوں کے سر ملے رہتے تھے۔ بھیڑ بکریاں ان درختوں کے سائے میں پتے گرنے کا انتظار کرتے بیٹھی رہتی تھیں اس طرح کمزور ہونے لگیں تو اپو منے کو معلوم ہو گیا کہ وہ دونوں درختوں کی شکل میں بھی اکٹھے رہ رہے ہیں۔ اس نے وہ دونوں درخت کاٹ کر پانی میں پھینک دیئے تو دو مچھلیاں بن گئے۔ اپو منے نے مچھلی کو پکڑنے کے لئے خود کیڑا بن کر ان کا پیچھا شروع کیا تو وہ دونوں کبوتر بن کر اڑنے لگے۔ اتنے میں اپو منے شاہین بن کر ان کے پیچھے دوڑا۔ آگے جا کر وہ دونوں ہرن بن گئے تو اپو منے چیتا بن کر ان کا تعاقب کرنا شروع کیا۔ تھوڑا چل کر وہ دونوں رام چکور بن گئے تو اپو منے شاہین بن گیا۔ اتنے میں نالے میں جھونپڑی آئی تو دونوں ادھر چرواہوں کے مشکیزے میں مکھن کی شکل میں بیٹھ گئے۔ اپو منے واپس محل میں چلا گیا۔ چرواہوں کو مکھن زیادہ ہوا تو انہوں نے اپو منے کو دعوت دی۔ کھانا تیار ہوا اور اپو منے گھی پینے لگا تو برتن خشک ہو گیا اور دونوں کبوتر بن کر اڑ گئے تو اپو منے پھر شاہین بن کر ان کے پیچھے چلا۔ آگے ایک محل تھا جس کی کھڑکی پر ایک شہزادی سر باہر نکالے بیٹھی تھی۔ وہ دونوں اس شہزادی کے گلے میں ہار بن کر بیٹھ گئے۔ اپو منے نے فوراً فقیر کا روپ دار کر اس شہزادی سے ہار مانگ لیا۔ شہزادی نے ہار نیچے پھینک دیا تو وہ دونوں چنبا اور کنگنی کے دانے بن گئے۔ اپو منے فوراً مرغا بن کر وہ دانے کھانے لگا تو وہ دونوں بلی بن گئے اور فوراً اس مرغے کو چیر پھاڑ کر کھا لیا۔ اس طرح اپو منے اور اس کے جادو کو ختم کرنے کے بعد شہزادہ اور شہزادی نیلم محل میں پہنچے اور سکون کے ساتھ حکومت کرتے ہوئے زندگی گزارنے لگے۔

ایک شکاری کی کہانی:

کہا جاتا ہے کہ کسی زمانے میں بلتستان کا ایک شکاری بہت مشہور تھا جو اکثر و بیشتر اکیلا شکار کے لئے جایا کرتا تھا۔ ایک دن اس نے ایک مارخور کا شکار کھیلا۔ اسے ذبح کرنے تک رات ہو گئی۔ اندھیرا چھا گیا جس کی وجہ سے وہ پہاڑی شکارگاہ سے گاؤں کی طرف نہ آ سکا۔ وہ چراگاہ کے بکر کوٹھے میں مقیم رہا۔ چراگاہ کے بکر کوٹھے کو بلتی زبان میں ''خلاس'' کہتے ہیں۔ جہاں گاؤں کے لوگ گرمیوں میں آبادی سے دور پہاڑی پر بھیڑ بکریوں کے ساتھ قیام کرتے ہیں۔ پس شکاری نے آگ جلائی تو اتنے میں ایک نہایت ہی خوبصورت عورت وہاں آ پہنچی۔ شکاری اسے دیکھ کر حیران رہ گیا کہ آدھی رات کو اس پہاڑ کی بلندی پر اکیلی عورت کہاں سے آئی۔ غور سے دیکھا تو معلوم ہوا کہ وہ عورت چڑیل ہے۔ شکاری نے اپنا ہوش سنبھالتے ہوئے پوچھا۔ کیوں آئی ہو؟ وہ بولی آپ سے ملنے کے لئے۔ ''خلاس'' کے اندر دونوں بیٹھے رہے۔ آگ جل رہی تھی۔ اس پر مارخور کا پورا ران رکھ کر کباب پک رہا تھا۔ شکاری نے چوری چھپے مارخور کے معدے کو دو تین چھوٹے چھوٹے سوراخ کر کے چڑیل کو دیا اور اسے اس میں پانی لانے کو کہا۔ وہ چلی گئی لیکن واپس آتے آتے راستے میں پانی ٹپک کر ختم ہو گیا۔ چڑیل واپس گئی لیکن پھر وہی حالت ہو گئی۔ آخر کار شکاری نے کہا کہ تو آگ پھونکتی رہو اور میں پانی لانے جاؤں گا۔ شکاری اٹھا۔ چڑیل چولہے پھونکنے لگی۔ جونہی اس نے سر جھکائی شکاری



شکاری روایتی بندوق چلاتے ہوئے

نے آگ پر تپتے ہوئے مارخور کے ران کو اٹھایا اور زور سے چڑیل کے سر پر دے مارا۔ اس چوٹ کا لگنا تھا کہ چڑیل کے سر کے بال سارے کے سارے اتر آئے۔ اس میں ایک سنہرے بال (خسیری ہرکالو) بھی تھا۔ وہ شکاری کے ہاتھ میں آیا تو چڑیل اس کے ہاتھوں اسیر ہوگئی۔ کہا جاتا ہے کہ چڑیل اس سنہرے بال کے بغیر اپنی اصلی صورت میں برقرار نہیں رہ سکتی ہے۔ پس وہ چڑیل شکاری کے ساتھ گاؤں آ گئی اور کئی سال تک وہ اس کے گھر میں خادمہ کی حیثیت سے رہی۔ ایک دن ایسا آیا کہ کاشت کا وقت تھا اور شکاری کھیت میں ہل چلا رہا تھا۔ اسے تیشے کی ضرورت پڑی تو اس نے چڑیل کو تیشہ لانے کے لئے گھر جانے کا حکم دیا۔ اس نے گھر جا کر شکاری کی بیوری سے تیشہ مانگا۔ بیوی نے کہا کہ تیشہ اسٹور میں ہے تم جا کر لے جاؤ۔ وہ اسٹور میں گئی اور اپنا سنہرا بال (خسیری ہرکالو) جسے شکاری نے ایک ٹوکری میں چھپا کر رکھا تھا پر اس کی نظر پڑ گئی۔ جھپٹ کر اسے اتار کر ٹٹولا۔ بالوں کو پھر سے اپنے گنجے سر پر سجایا۔ چڑیل اپنی اصل صورت میں باہر نکل آئی اور بددعائیں دیتی ہوئی بھاگ نکلی۔ اے شکاری! تمہاری نسل نہ بڑھے اور نہ ختم ہو۔ راوی کہتا ہے کہ یہ شکاری موضع کوار دو کا رہنے والا تھا۔ جہاں منو پا نامی خاندان اب بھی آباد ہے اور یہ شکاری اسی خاندان کا فرد تھا۔ ویسے یہ لوک کہانی بلتستان کے ہر علاقے میں لوگ اپنے اپنے انداز میں سناتے ہیں اور اپنے ہی علاقے سے منسوب کرتے ہیں۔

لوک شاعری:

یہ کہنا بہت مشکل ہے کہ بلتستان میں لوک شاعری کی ابتداء کب اور کہاں سے ہوئی البتہ یہ بات سبھی جانتے ہیں کہ یہاں کی ابتدائی شاعری اور ان کے اوزان اصولوں سے مبرا تھی لیکن ردیف سے کلی طور پر آزاد نہ تھی اور بسا اوقات اس میں قافیہ کی پابندی بھی ضروری نہ تھی۔ کسی میں قافیہ بندی ہوتی تھی اور کسی گیت میں نہیں۔ جہاں تک ردیف کا تعلق ہے ردیف تو ان لوک گیتوں کی پہچان کا ذریعہ ہے۔ بہر کیف اس قسم کی شاعری کو بلتی اصطلاح میں ''رگیا خلو'' کہا جاتا ہے۔ دراصل یہ لوک گیت بلتستان کی کلاسیکل شاعری کہلاتے ہیں جو اس علاقے کی تاریخ اور ثقافت کی بھرپور عکاسی کرتے ہیں۔ یہ گیت کسی ایک شاعر کا کلام نہیں بلکہ یہ ان لوگوں کے ہونٹوں سے نکلے ہوئے بے ساختہ اور موزوں کلمات ہیں جنہوں نے دکھ درد سہے۔ ان میں کوئی تصنع، ابہام یا بناوٹ نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان لوک گیتوں کو سننے کے بعد اہل ذوق پر ایک خاص کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ ان لوک گیتوں میں علاقے کے اہم تاریخی واقعات کے علاوہ جدائی کی داستان، بے وفائی کی شکایتیں، محبوب کا انتظار، والدین کی نصیحت، شادی بیاہ کی توقعات، ساس بہو کی رقابتیں اور خوشی و غم کی کیفیتیں سب کچھ موجود ہیں۔ گویا ان لوک گیتوں کے پس منظر میں کوئی نہ کوئی عشقیہ، رزمیہ، ناصحانہ، تاریخی یا سیاسی واقعہ ضرور ہوتا ہے۔ بلتی لوک ادب کے ذخیرے میں رنگا رنگ کلاسیکی لوک گیتوں کی فراوانی ہے۔ چند ایک

گیتوں کے اردو ترجمے مع پس منظر بطور نمونہ یہاں درج کیئے جاتے ہیں۔

برق مایور چو:

سکردو ہوائی اڈہ کے بالمقابل واقع پہاڑ کو ''برق نق'' یعنی کالا پہاڑ کہتے ہیں۔ آج سے کم وبیش ایک ہزار سال قبل برق نق کے دامن میں ایک طاقت ور حکمران خاندان کی حکومت قائم تھی۔ اس خاندان کے آخری راجہ ''برق مایور چو'' نالائق اور نااہل ثابت ہوا۔ جب وہ زمام حکومت سنبھالنے میں ناکامی کا منہ دیکھنے لگا تو ایک بوڑھے اور دانا شخص نے ایک گیت گا کر اسے نصیحت کی لیکن راجہ پر کوئی اثر نہ ہوا۔ آخر سکردو کے مقپون خاندان نے اس کی حکومت پر قبضہ کر لیا۔ یہ گیت اسی راجہ برق مایور چو کے نام سے مشہور ہے۔ اس کی لے بزمیہ ہے اور اس کے ساتھ ڈیانگ اور ڈامن بجایا جاتا ہے۔

گیت کا ترجمہ:

اے میرے طاقتور شکاری کے بیٹے! اے میرے برق مایور چو!
جس گھوڑے پر ابھی زین نہ کسی ہو اس پر چڑھ کر (پولو گراؤنڈ میں) پے در پے گول کرنا کہاں کا انصاف ہے۔

اے میرے طاقتور شکاری کے بیٹے! اے میرے برق مایور چو!
جس ''بزو'' (گائے اور یاک کی مشترکہ نسل) کے جوان بچے پر ابھی ہل کی پنجالی نہ رکھی گئی ہو اسے کھیت کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک ہل چلانا کون سا انصاف ہے۔

اے میرے طاقتور شکاری! اے میرے برق مایور چو! کتے کے جس بچے نے ابھی کوئی شکار نہ سیکھا ہو اس سے مارخوروں کا شکار کھیلنا کہاں کا انصاف ہے۔

اے میرے طاقتور شکاری! اے میرے برق مایور چو! جس شہزادے نے ابھی سہرا نہ باندھا ہو اس پر سلطنت کے انصاف اور انتظام کی ذمہ داری ڈالنا کہاں کا انصاف ہے۔

تیسیتے مراد:

شگر میں وادی برالدو کا آخری گاؤں تیسیتے ہے۔ کہا جاتا ہے کہ کسی زمانے میں اس گاؤں میں ایک غریب عورت رہتی تھی جس کی کوئی اولاد نہ تھی۔ اس نے اولاد کے لئے منتیں مانیں اور اللہ تعالیٰ نے اسے بڑا ہی خوبصورت بیٹا عطا کیا۔ ماں نے اکلوتے بیٹے کا نام مراد رکھا۔ خدا نے مراد کو بڑی صلاحیتیں دی تھیں۔ جب وہ جوان ہوا تو اس کے حسن وشباب، بہادری و دلیری اور نیکی وحسن اخلاق کا پورے علاقے میں چرچا ہوا۔ اگرچہ اس کا تعلق ایک غریب گھرانے سے تھا لیکن اس کی قابل رشک صلاحیتوں اور نیکیوں کے باعث علاقے کے لوگ اسے ''چو'' یعنی راجہ کہنے لگے۔ اس زمانے میں (1640/1635) بلتستان پر ایک ظالم وجابر راجہ عبدال خان کی حکمرانی تھی جو اپنے مظالم کی وجہ سے ''می زوس عبدا خان'' یعنی آدم خور کے نام سے مشہور تھا۔ عبدال خان کو جب تیسیتے مراد کی جوانمردی اور حسن و جمال کا پتہ چلا اور یہ بھی معلوم ہوا کہ لوگ اسے ''چو'' یعنی راجہ سے موسوم کرتے ہیں تو اس کے دل میں مراد کی سرکشی کا خدشہ پیدا ہوا۔ اس خدشہ کو دور کرنے عبدال خان نے اسے گرفتار کرنے کے لئے سکردو سے اپنے آدمی بھیجے۔ سپاہیوں نے مراد اور اس کی بیوی کو گرفتار کر کے سکردو لے جانے کی تیاریاں شروع کیں تو مراد کی ماں نے ایک فریاد کی۔ اس کی وہ فریاد اس گیت میں ڈھل گئی۔ اس گیت کی لے حزنیہ ہے۔ اس کے ساتھ ڈیانگ اور ڈامن بجایا جاتا ہے۔

گیت کا ترجمہ:

۱) تیسیتے کا راجہ، تیسیتے کا مراد، جسے حاصل کرنے کے لئے ماں نے سو سو تعویذ گنڈے کیئے۔ آج گرفتار کر کے لے جایا جا رہا ہے۔

۲) تیسیتے کا راجہ تیسیتے کا مراد، جسے حاصل کرنے کے لئے ماں نے مسجدوں اور خانقاہوں کا طواف کیا۔ آج گرفتار کر کے لے جایا جا رہا ہے۔

۳) ماں کے مراد کو گرفتار کر کے جاتے وقت، ماں کے بیٹے کے پیروں میں بیڑیاں ڈال کر لے جایا جا رہا ہے۔ ماں کے مراد کو گرفتار کر کے لے جایا جا رہا ہے۔

۴) ماں کے مراد کو گرفتار کر کے لے جاتے وقت، ماں کے بیٹے کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں ڈال کر لے جایا جا رہا ہے۔

۵) ماں کے مراد کو گرفتار کر کے لے جانا (اس لئے ضروری ہے کہ) سکردو میں اب گائے کی قیمت وصول کرنے کا رواج پا گیا ہے۔ (اس سے پہلے گائے بکری کی قیمت وصول کرنے کا رواج نہ تھا)

۶) ماں کے مراد کو گرفتار کر کے لے جانا (اس لئے ضروری ہے کہ) سکردو میں اب بکری کی قیمت وصول کرنے کا

رواج پا گیا ہے۔

۷)　ماں کے مراد کا گرفتار ہونا (ویسے تو) کوئی بات نہ تھی (لیکن) ماں بچپن میں جو بہو بیاہ کر لائی تھی آج ماں اس بہو سے ہمیشہ کے لئے جدا ہو رہی ہے۔

۸)　ماں کے مراد کو گرفتار کر کے لے جاتے تو میں نہ روتی (لیکن) ماں جو بہو بچپن میں بیاہ کر لائی تھی' آج ماں اس بہو سے ہمیشہ کے لئے جدا ہو رہی ہے۔

منافو:

کسی زمانے میں بلتستان کی وادی خپلو میں دو میاں بیوی رہتے تھے۔ میاں کا نام منافو تھا۔ یہ دونوں ایک دوسرے سے بہت محبت کرتے تھے اور ہر وقت ہنسی مذاق کے ساتھ وقت گزارتے۔ موسم گرما میں دوسرے لوگوں کی طرح وہ بھی پہاڑ کے اوپر واقع زمینوں کی کاشت کے لئے جاتے۔ جہاں منافو کے کھیت ختم ہو جاتے وہاں سے ڈھلان شروع ہو جاتی تھی اور نیچے ہزاروں فٹ گہری کھائی تھی۔ پہاڑ پر ایک خاص قسم کے بید کے درخت تھے جن کی پتلی ٹہنیوں سے وہ بڑے بڑے گول قسم کے ٹوکرے "غوڑوم" بناتے جن میں آلو' شلجم وغیرہ ڈال کر رکھتے۔ ایک دفعہ وہ دونوں پہاڑ پر اپنے کھیت کے کنارے ٹوکرے بنا رہے تھے۔ دوپہر کے کھانے کا وقت ہوا تو بیوی کھانے لانے ڈیرہ میں گئی۔ اس کے واپس آنے کا وقت ہوا تو میاں کو شرارت سوجھی اور وہ ایک بڑے سے ٹوکرے میں چھپ کر بیٹھ گیا۔ بیوی کھانا لے کر واپس آئی تو میاں کو وہاں نہیں پایا۔ ادھر ادھر دیکھا تو اس کی نظر بڑے ٹوکرے پر پڑی۔ وہ سمجھ گئی کہ اس کے خاوند نے اس کے ساتھ مذاق کیا ہے اور وہ ٹوکرے میں چھپ کر بیٹھا ہوا ہے۔ بیوی کی بیوقوفی دیکھئے کہ اس نے ٹوکرے کو لات ماری اور کہا کہ میں جانتی ہوں تم اس میں چھپے بیٹھے ہو۔ لات کے لگتے ہی ٹوکرے نے ڈھلان سے لڑھکنا شروع کیا اور دیکھتے ہی دیکھتے ہزاروں فٹ نیچے کھائی میں جا گرا۔ شوہر کی ہڈی پسلی چور چور ہو گئی۔ یہ منظر دیکھ کر بیوی وہیں بے ہوش پڑ گئی۔ جب ہوش آیا تو ذہنی توازن کھو چکی تھی۔ وہ ہر وقت شوہر کو یاد کرتی اور زیر نظر گیت اس عورت کے احساسات کا عکاس ہے جو "منافو" کے نام سے بلتستان بھر میں مقبول ہے۔ اس گیت کی لے حزینہ ہے۔ اس کے ساتھ ڈیانگ اور ڈامن بجایا جاتا ہے۔

گیت کا ترجمہ:

ہر ایک کا سورج آسمان سے طلوع ہوتا ہے۔
لیکن ہم بدنصیبوں کا سورج پہاڑوں کی اوٹ میں جا رہا ہے۔
میں نے کیا سوچا تھا اور کیا نہیں سوچا تھا
میرے جسم اور جان کے روگ' میری جان منافو!
جب بھی مجھے تمہاری یاد آتی ہے تو
میں خود کو اونچی چٹان سے گرتا ہوا محسوس کرتی ہوں۔
آپ کے گھوڑے کے اصطبل میں
میں ایک کان کٹی گدھی بن کر رہتی ہوں
میں نے کیا سوچا تھا اور کیا نہیں سوچا تھا
میرے جسم اور جان کے روگ' میری جان منافو
جب بھی مجھے تمہاری یاد آتی ہے' تو
میں خود کو اونچی چٹان سے گرتا ہوا محسوس کرتی ہوں۔



ایک بلتی تیرانداز

دو شکاریوں کا واقعہ:

کہا جاتا ہے کہ کسی زمانے میں نرگاؤں (سکردو سے سولہ میل دور مشرق کی جانب) کے دو اشخاص شکار کے لئے پہاڑوں پر گئے۔ کئی دنوں تک پھرتے رہے لیکن کوئی شکار ہاتھ نہ آیا۔ ان کے پاس راشن ختم ہو چکا تھا۔ رات کو کسی غار میں قیام کیا۔ صبح دونوں جاگے تو ایک عورت نے ان دونوں کو الگ الگ مٹھی بھر آٹا

دے دیا۔ اس عورت نے کہا کہ میرے خاوند کے جاگنے سے قبل یہ آٹا لے کر گھر چلے جانا۔ تمہارے گاؤں کے نزدیک موجود چشمہ تک جو آٹا بچ جاتا ہے اسے اسی چشمہ میں پھینک دینا۔ وہ دونوں شخص وہی مٹھی بھر آٹا کھاتے ہوئے آئے اور کئی گیا۔ جس چشمے کی نشاندہی کی تھی وہاں پہنچے تو ایک شکاری نے آٹا ہدایت کے مطابق وہیں پھینک دیا جبکہ دوسرے نے کہا کہ اتنا بابرکت آٹا۔ میں تو اسے اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔ یہ کہہ کر وہ آٹا اپنے ساتھ لے گیا اور اپنے سٹور میں موجود آٹے میں ملا دیا۔ کہا جاتا ہے کہ یہ عورت ہلافو کیسر کی بیوی ہلا موبرو گموتھی۔ روایت کے مطابق نرگاؤں کا وہ خاندان جس کے پڑدادا نے ہلاثو کا دیا ہوا آٹا اپنے گھر کے آٹے میں ملا دیا تھا اب اس کی کوئی اولاد باقی نہیں جبکہ دوسرے شخص جس نے آٹا چشمے میں پھینک دیا تھا' کا خاندان اس وقت اپنے علاقے کا امیر ہے۔

گلیشیئر کی پرورش:

بلتستان میں قدرتی گلیشیئروں کے علاوہ آبپاشی کی خاطر عوامی سطح پر گلیشیئر پالنے کا ایک قدیم اور منفرد رواج صدیوں سے چلا آرہا ہے۔ گلیشیئر پالنے کا یہ طریقہ عجیب وغریب اور انتہائی دلچسپ ہے۔ بتایا جاتا ہے کہ کسی قدیم گلیشیئر سے کئی من یخ کے تودے کلٹوں میں اٹھا کر اس مقام تک پہنچائے جاتے ہیں جہاں گلیشیئر پالنا مقصود ہو۔ اس دوران کہیں رکنا یا ایک دوسرے سے بات چیت کرنا سخت ممنوع ہے۔ اس لئے کلٹوں کے دونوں اطراف میں پٹی باندھ دی جاتی ہے تاکہ ایک بار بردار شخص تھک جائے تو چلتے چلتے دوسرا شخص آسانی سے بوجھ اٹھا سکے۔ کہا جاتا ہے کہ یخ دو مختلف الجنس یعنی نر اور مادہ دونوں گلیشیئروں سے لانا لازمی ہے۔ بیا پھو گھنگ' گھنگ سینگے اور ستق سینگے نر جنس سے تعلق رکھتے ہیں جبکہ خوسور گھنگ اور روندو ڈورو گلیشیئر مادہ بتائے جاتے ہیں۔ علاوہ ازیں یخ بوجھ کی تعداد ہر دو جنس سے طاق عدد میں اور برابر مقدار میں لانا لازمی تصور کیا جاتا ہے مذکورہ لوازمات اور آداب کی پابندی نہ کرنے کی صورت میں گلیشیئر پرورش نہیں پاسکتا۔ جہاں گلیشیئر پالنا مقصود ہو وہاں ضروری ہے کہ دھوپ کم پڑتی ہو۔ اس جگہ ایک گڑھا کھود کر یخ کو اس میں ڈال دیا جاتا ہے۔ سایہ کی خاطر اس کے اوپر جھونپڑی بنای جاتی ہے اور چھپر کی چھت پر یا تو برف ڈال دیتے ہیں یا مشکیزوں میں پانی بھر کر ان میں سوراخ کر کے لٹکا دیا جاتا ہے تاکہ پانی کے قطرے وقتاً فوقتاً برف پر ٹپکتے رہیں اور اس کی نشوونما میں مدد مل سکے۔ سردیوں کے موسم میں ویسے بھی بلتستان کے پہاڑوں پر گزوں برف پڑتی ہے جو گلیشیئر کی پرورش میں اور بھی مدد ومعاون ثابت ہوتی ہے۔ پالتو گلیشیئروں کے لئے کئی سالوں تک اس طرح پرورش کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔

بلتستان کے پالتو گلیشیئروں میں سے سکردو میں گھنگ سینگے' ہرتہ کھنگ پھونگ کھنگ' حسین آباد اور گول نالے کے درمیان موجود نم رفا گھنگ' کھرمنگ غولیس گھنگ' شگر میں خوسور گھنگ اور رونگ یل میں لستیا نگ گھنگ بہت مشہور ہیں۔ ان کے علاوہ کواردو اور پاری گاؤں میں گلیشیئر کی پرورش ناکام رہی ہے۔ بلتستان میں اکثر ان گلیشیئروں کے متعلق دیومالائی اور مافوق الفطرت داستانیں بھی منسوب ہیں جو آج کل کے سائنسی دور میں ناقابل قبول سمجھی جاتی ہیں۔ صرف ایک گلیشیئر کے بارے میں جو لوک روایت زبان زد عام ہے یہاں درج کی جاتی ہے۔

گھنگ سینگے :

یہ گلیشیئر سکردو میں چنداہ پہاڑ کی چوٹی پر موجود ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس گلیشیئر کی پرورش کا منصوبہ مقپون خاندان سکردو کے راجہ بروک سینگے (1280ء تا 1310ء) کے دور میں تیار ہوا تھا۔ اس لئے اس کا نام بھی راجہ بروک سینگے کے نام کی مناسبت سے ''گھنگ سینگے'' پڑ گیا۔ روایت ہے کہ اس گلیشیئر کی دیکھ بھال اور رکھوالی بلے گرونگ گمبہ سکردو میں موجود ''سلم پونگ'' نامی خاندان کی ایک بڑھیا نے کی تھی۔ راوی کا کہنا ہے کہ ایک دن اس بڑھیا کا جوان بیٹا پہاڑ پر شکار کے لئے جارہا تھا۔ اس نے اپنی ماں سے کہا کہ میری بندوق کی فائر کی آواز آنے پر مجھے کھانا وہیں پہنچا دینا۔ ماں بندوق کی آواز کا انتظار کرتی رہی۔ زوال آفتاب کے بعد جب بندوق کی آواز نہ آئی تو ماں بیٹے کی محبت سے نہ رہ سکی اور خود اس کی تلاش میں نکلی۔ ڈھونڈتے ڈھونڈتے پہاڑ کی چوٹی تک جا پہنچی لیکن اسے اپنا بیٹا کہیں نظر نہ آیا۔ بڑھیا نے اس خیال سے کہ بیٹے کو پیاس لگ رہی ہوگی۔ اس پالتو گلیشیئر سے تھوڑا سا یخ اپنی کلہاڑی سے کاٹ کر اٹھالیا۔ بڑھیا اپنے گاؤں کی طرف آنے لگی۔ کچھ راستہ چلنے کے بعد مڑ کے دیکھا تو گلیشیئر آگے بڑھتی ہوئی بڑھیا کے پیچھے آرہا تھا۔ بڑھیا کو غصہ آیا اور اُس نے وہ یخ کا ٹکڑا واپس پھینک دیا۔ راوی کہتا ہے کہ گلیشیئر کی پشت پر یخ کا ابھرا ہوا حصہ بڑھیا کا وہی پھینکا ہوا یخ کا ٹکڑا ہے۔ اگر وہ یخ کا ٹکڑا نہ پھینکتی تو گلیشیئر بڑھ کر نیچے بستی تک پہنچنے کا خطرہ تھا۔ کہا جاتا ہے کہ آج بھی ''سلم پونگ'' نامی خاندان کی خوشی کے موقع پر یہ گلیشیئر بڑھتا ہے اور ان کے غم پر گھٹ جاتا ہے۔

اس گلیشیئر کے ساتھ ہی نیچے کی طرف دو اور گلیشیئرز ''ہرتہ کھنگ''

(اصطبل) اور ''پھونگ کھنگ'' (بھوسہ خانہ) کے نام سے موجود ہیں۔ کہاں جاتا ہے کہ یہ دونوں گلیشیئرز دیومالائی گھوڑے کے اصطبل اور بھوسہ خانہ تھے جو کسی نامعلوم وجہ سے گلیشیئرز کی صورت اختیار کر گئے۔ اس میں ساتھ ہی ایک گھوڑے کی شکل جیسا گلیشیئر بھی پایا جاتا ہے۔ بعض قدامت پرست لوگ یوں توہمات کے شکار ہیں کہ جس سال یہ گلیشیئر پگھل کر گھوڑے کا سرکٹ جائے تو اس سال مقپون خاندان (قدیم بلتستان کا حکمران خاندان) کے کسی اہم فرد کی موت واقع ہو جاتی ہے۔

موجودہ دور کا ایک طلسمی واقعہ:

کہا جاتا ہے کہ کھرمنگ غندوس کا ایک شخص حمزہ المعروف مجاہد کے ساتھ آج سے تیس پینتیس سال قبل ایک عجیب وغریب طلسمی واقعہ پیش آیا اور اس واقعے کے پانچ عینی گواہ آج بھی بقید حیات بتائے جاتے ہیں۔ یہ کہانی اس شخص کی زبانی یوں بیان کی جاتی ہے۔

جولائی 1964ء کی ایک دوپہر کو ہم پانچ آدمی لکڑیاں کاٹنگ چھے کھرمنگ کے ''خلاس'' (گل من) (یعنی پہاڑی چراگاہ پر موجودہ بکڑکوٹھہ) گئے۔ ''خلاس'' کے قریب ایک ''شوکپہ'' سرو کا خشک درخت تھا جسے ہم نے جڑ سے اکھاڑنے کا فیصلہ کیا۔ اس خشک درخت پر کلہاڑی کی پہلی ضرب میں نے لگائی۔ میں نے درخت پر پہلا وار ہی کیا تھا کہ درخت کے بیچ سے دھواں اٹھنا شروع ہوا۔ ہم خوفزدہ ہو کر پیچھے ہٹ گئے اور اس عجیب وغریب منظر کو دیکھتے رہے۔ آن کی آن میں سرو کا سوکھا درخت دھواں بن کر ہوا میں تحلیل ہو گیا۔ ہم پانچوں ساتھی اس غیر فطری واقعے کو سمجھنے سے قاصر تھے اور نہ ہم نے اس پر کوئی تبصرہ کیا۔ جب ہم ''خلاس'' پر پہنچے تو وہاں پر موجود آدمیوں سے اس واقعے کا تذکرہ بھی نہیں کیا۔ ہمیں تو بس لکڑی کی فکر تھی جو ہم نے اکٹھی کر لی تھی۔ ''خلاس'' پر میرے بڑے بھائی بھی موجود تھے۔ سہ پہر پانچ بجے دامن کوہ سے مویشیوں کو واپس ''خلاس'' تک لانے کے لئے مجھے بھیج دیا۔ میں اکیلا چلا گیا۔ ''خلاس'' سے تقریباً دو تین کلو میٹر دور آ گیا تھا کہ مجھے شدت کی پیاس لگی۔ دائیں جانب مجھے ایک چشمہ نظر آیا۔ میں نے ہاتھوں سے پانی پینے کی بجائے جھک کے منہ لگا کر پانی پیا۔ پیاس بجھانے کے بعد جب سر اٹھانا چاہا تو ایسا محسوس ہوا کہ کوئی طاقتور اور بھاری بھرکم آدمی مجھے زور سے نیچے دبا رہا ہے۔ میں نے کافی کوشش کی کہ اٹھوں مگر دباؤ مسلسل بڑھتا رہا۔ میں زور سے چیخ رہا تھا لیکن میری آواز نہیں نکل رہی تھی۔ آخر کار لبوں پر آیت الکرسی کی پاک آیات آ گئیں۔ ان مقدس آیات کے طفیل میں اٹھنے میں کامیاب ہوا۔ چاروں طرف دیکھا تو کچھ نظر نہ آیا۔ میں نے سکھ کا سانس لیا لیکن مجھ پر خوف اور گھبراہٹ طاری تھی۔ میں پسینے میں شرابور تھا۔ جب اٹھ کر چلنے لگا تو میرے قدم منوں بھاری لگ رہے تھے۔ ابھی پانچ دس قدم چلا ہی تھا کہ ایک سفید ہیولہ میرے سامنے آ گیا۔ مجھ پر سکتہ طاری ہو گیا۔ میں قدم بڑھانا چاہتا تھا مگر اس سفید ہیولے نے میرا راستہ روک لیا۔ اس کی شکل وشمائل کیسی تھی، میں الفاظ میں بیان نہیں کر سکتا۔ وہ ایک سفید پوش ہیولا تھا جسے میں صرف محسوس کر سکتا تھا۔ میں حرکت کرنے کی کوشش کرتے ہوئے قرآنی آیات اور دعائیں پڑھتا رہا۔ تب میرے جسم میں حرکت پیدا ہوئی۔ میں بھاگنا چاہتا تھا مگر اس سفید ہیولے نے مجھے دھکا دیکر قریب ہی خاردار جھاڑی میں گرا دیا۔ میری زبان پر بے ساختہ ''یا عباسؑ'' کا لفظ آ گیا۔ اس کے ساتھ ہی ایک آواز میری سماعت سے ٹکرا گئی کہ اس مقدس نام کی بدولت تم بچ گئے ورنہ آج تمہاری زندگی کی آخری شام تھی۔ تم لوگوں نے میرے مسکن کو برباد کر دیا۔ میرے ٹھکانے پر پہلا وار تم نے کیا تھا۔ اس وقت میرے کانوں میں صرف اس کی آواز آ رہی تھی جو نسوانی تھی۔ اس کے لب ہلتے نظر نہیں آ رہے تھے۔ کانٹوں سے اٹھنے کی مجھ میں ہمت نہیں تھی جبکہ وہ سفید ہیولا میرے سامنے تھا۔ اس نے مجھے اٹھنے کا اشارہ کیا اور چلنے لگا۔ میں بھی اٹھ کر اسکے پیچھے چلنے لگا۔ اس کی قدوقامت ہیبت ناک حد تک دراز تھی۔ میری یادداشت کے مطابق دس پندرہ قدم چلنے کے بعد وہ سفید ہیولا اچانک نظروں سے غائب ہو گیا۔ میں حیران وششدر وہیں کھڑا رہ گیا۔ چند لمحوں کے بعد وہ سفید ہیولا ایک پہاڑی سے نمودار ہوا جیسے سفید نور کی لکیر کھینچتی چلی آ رہی ہو۔ اس کے ہاتھوں میں کالے رنگ کا خوبصورت میمنا تھا۔ سفید ہیولا میرے قریب آ گیا یہاں تک کہ میرے اردگرد دودھیا رنگ کا ہالہ سا بن گیا۔ اب مجھے اس کے واضح قدوقامت نظر نہیں آ رہے تھے۔ البتہ اپنے قریب اس کے وجود کو محسوس کر رہا تھا۔ ایک لمحہ کے لئے ڈرا اور خوف سے میری آنکھیں پتھرا گئیں۔ پھر آہستہ آہستہ میری آنکھیں بند ہو گئیں۔ میں نے پھر دعاؤں کا ورد شروع کیا۔ تین چار منٹوں کے بعد میرے اوسان بحال ہونے شروع ہوئے۔ میں نے اپنی بانہوں میں کسی نرم وملائم چیز کی لمس محسوس کی۔ جب مجھے ہوش آیا تو بھیڑ کا ایک بہت ہی پیارا کالا اون والا میمنا میرے ہاتھوں میں جھول رہا تھا۔ میں نے اس بھیڑیئے کے بچے کو اپنی پوستین میں چھپا لیا۔ اردگرد کے ماحول پر نظر دوڑائی تو کچھ بھی نہ تھا۔ اس وقت ڈھلتے سورج کی کرنیں پہاڑوں کی چوٹیوں پر زینہ بہ زینہ چڑھ رہی تھیں۔ میں نے اپنے آپ کو ہلکا پھلکا محسوس کیا۔ یوں سمجھ لیجئے کہ ایک ٹوٹے ہوئے خواب کا سا منظر تھا۔ میں نے اپنے پورے وجود کو ٹٹولا، چہار اطراف کو دیکھا لیکن مجھے کوئی غیر معمولی حرکت یا کوئی ایسی چیز نظر نہ آئی۔

یقین وگمان کی منزل اپنی جگہ لیکن میں محسوس کر رہا تھا کہ کچھ نہ کچھ وقوع پذیر ہوا ہے۔ شام کے سائے آہستہ آہستہ پھیل رہے تھے۔ میں تھکے تھکے قدموں سے ''خلاس'' کی طرف چلنے لگا جہاں باقی افراد میرے اور مویشیوں کا انتظار کر رہے تھے۔ مویشی مجھ سے اپنی عادت کے تحت باڑھ تک پہنچ چکے تھے۔ البتہ سارے ساتھی میرے بارے میں متفکر تھے۔ جب میں ''خلاس'' کے قریب پہنچا تو سارے ساتھی خوف وہراس کے عالم میں باہر نکل آئے۔ مجھے دیکھتے ہی سب نے گھیر لیا اور سوالات کی بوچھاڑ کی۔ سب پریشان تھے اور مجھ سے پوچھ رہے تھے ''بھئی تمہارے ساتھ کون کون لوگ ہیں'' میں نے کہا کوئی بھی نہیں۔ میں اکیلا آپ لوگوں کے سامنے کھڑا ہوں۔ ان میں سے ایک دو آدمیوں نے اس راستے کی طرف دیکھنا شروع کیا جس راستے سے میں آرہا تھا۔ رات کی تاریکی چھا چکی تھی لیکن ''خلاس'' کے لوگ مجھے ابھی تک گھیرے ہوئے تھے اور کہہ رہے تھے تمہارے ساتھ کون لوگ تھے۔ یہ آوازیں اور یہ شور کیا تھا۔ میں نے ان سے کہا کیسا شور' کیسی آوازیں۔ مجھے کچھ سنائی نہیں دیتا۔ میں آپ لوگوں کے سامنے کھڑا ہوں لیکن یہ لوگ میری بات سے مطمئن نہیں تھے۔ وہ کہہ رہے تھے کہ ہم نے تو ایک ایسا شور سنا ہے جیسے ''خلاس'' کی طرف تمہاری قیادت میں ایک بڑا جلوس آرہا ہو۔ اس لئے ہم سب گھبرا کر باڑ سے باہر نکل آئے ہیں۔ ایک دو آدمی تو اس وقت گردنیں تان تان کر رات کی تاریکی میں ادھر ادھر دیکھ رہے تھے۔ بہرحال میں نے ان کو مطمئن کیا کہ میں اکیلا ہوں۔ پس ہم سب باڑ میں گھس گئے۔ چولہے میں سرو کی خشک لکڑی کے شعلے بلند ہو رہے تھے۔ خلاس میں ایک ادھیڑ عمر کا بزرگ تھا اس نے میرے چہرے کی طرف دیکھا اور قریب بلا کر تین دفعہ دعا پڑھ کر مجھ پر دم کیا۔

رات کا کھانا کھانے کے بعد میں نے ''خلاس'' کے آدمیوں سے واقعے کا ذکر کیا۔ میں نے پوری کہانی بیان کی اور پوستین میں سے بھیڑ کا بچہ نکال کر سب کو دکھایا کہ یہ میمنا مجھے دیا گیا ہے۔ سارے لوگ ہنسنے لگے اور میرا تمسخر اڑانے لگے۔ چونکہ میں نوعمر تھا اس لئے میں نے بھی اس واقعے کی یقین دلانے اور منوانے کی کوئی خاص ضرورت محسوس نہیں کی کیونکہ یہ واقعہ میری اپنی ذات تک محدود تھا۔ البتہ ''خلاس'' کے ایک آدمی نے تو یہاں تک دعویٰ کیا کہ یہ بھیڑ کا بچہ ہمارا ہے۔ دوسرے آدمی نے کہا کسی اور کا ہوگا۔ میں نے بھی بے اعتنائی کے ساتھ بھیڑ کے بچے کو ''چورونگ'' (پشت پر اٹھایا جانے والا ٹوکرا) کے نیچے رکھ کر خود سو گیا۔ صبح سویرے میں بھیڑ کے بچے کو دیکھے بغیر گاؤں واپس چلا آیا۔ گاؤں پہنچ کر میں نے اپنے ایک بزرگ سے اس واقعے کا ذکر کیا تو انہوں نے مجھے ڈانٹ پلائی اور مشورہ دیا کہ ابھی اور اسی وقت خلاس جا کر بھیڑ کے بچے کو اٹھا لے آؤ۔ یہ تمہیں نہ ختم ہونے والی دولت دی گئی ہے۔ میں بھیڑ کے بچے کو حاصل کرنے کے لئے دوبارہ ''خلاس'' پر پہنچا تو بقول اس بزرگ کے وہ دولت میرے ہاتھ سے نکل گئی تھی۔ ہوا ایسا کہ دوسرے دن ''خلاس'' کے آدمیوں میں سے ایک نے مذاقاً کہا تھا کہ یار ''چورونگ'' اٹھا کر حمزہ کے لائے ہوئے بھیڑ کے بچے کو تو دیکھیں۔ ایک آدمی نے جونہی بھیڑ کے بچے کو ہاتھ لگایا تو اس نے وہیں دم توڑ دیا۔ جب میں ''خلاس'' پر پہنچا تو بھیڑ کا بچہ مر چکا تھا۔ میں رنجیدہ وافسردہ نہیں ہوا۔ البتہ اس واقعے کے بعد میری زندگی کے معمولات میں عجیب وغریب تغیرات آتے رہے۔ ان تبدیلیوں میں سے اب صرف ایک غیر معمولی اثر میری زندگی پر مرتب ہے۔ یعنی پچھلے تیس سال سے دن رات مسلسل جاگ رہا ہوں۔ میری نیند کی نعمت مجھ سے چھن چکی ہے اور رات دن میرے لئے ایک جیسے ہیں۔ عجیب وغریب بات یہ ہے کہ مجھے اس بے خوابی کا احساس بھی نہیں ہے۔ یہ ایک ایسے شخص کی کہانی ہے جو اس وقت بھی وادی کھرمنگ موضع غندوس میں زندہ ہے۔

سدپارہ جھیل سے منسوب ایک لوک روایت:

سکردو شہر سے کم وبیش چار میل دور سدپارہ جھیل واقع ہے۔ لوک روایت یہ ہے کہ قبل از تاریخ کے زمانے میں اس جھیل کی جگہ ایک گنجان آباد بستی تھی جہاں کے رہنے والے بڑے خودسر اور شرانگیز تھے۔ ایک دن ان کے امتحان کے طور پر ایک مرد فقیر کا وہاں سے گزر ہوا۔ فقیر نے لوگوں کے سامنے دست حاجت دراز کی لیکن ہر کسی نے اس کا ہاتھ خالی لوٹا دیا۔ ایک بڑھیا اور اس کی بیٹی بھی اس بستی میں رہتی تھیں۔ بڑھیا کی بیٹی ریوڑ چرانے کی باری چکانے چراگاہ کی طرف جانے کے لئے تیار تھی۔ بڑھیا نے اپنی بیٹی کے لئے جو کی دو روٹیاں بنا رکھی تھیں جس میں سے ایک اس مرد فقیر کو دے دی۔ فقیر نے دعائیں دیتے ہوئے بڑھیا سے کہا کہ تم اپنی قیمتی اشیاء اٹھا کر پہاڑ کی چوٹی پر نکل جا۔ یہ بستی ابھی تباہ ہونے والی ہے۔ بڑھیا کے گھر کی کل جائیداد میں اون رکھنے کا ایک برتن (بل کھور) اور ایک تغری (بلڑنا) تھیں۔ ماں بیٹی دونوں یہ چیزیں لیکر ''برق کر'' کی چوٹی پر نکلیں۔ فقیر نے انہیں نصیحت کی تھی کہ مڑ کر اپنی بستی کی طرف نہ دیکھنا۔ وہ دونوں جب چوٹی کے عین دھار پر پہنچی تھیں تو ان سے رہا نہ گیا۔ انہوں نے جب مڑ کر اپنی آبائی بستی کی طرف نگاہ کی تو بدقسمتی سے وہ دونوں وہیں پتھر کی صورت اختیار کر گئیں۔ ان کے ہاتھ میں اون کا برتن (بل کھور) گر کر لڑھکتا ہوا موجودہ ڈیانیور گاؤں کے اوپر پتھر بن گیا جو اب بھی ''اپی بل کھور ردوا'' کے نام سے مشہور ہے۔ دوسری طرف

بڑھیا کی بستی غرق ہوکر جھیل بن چکی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ اس وقت جھیل کے وسط میں موجود جزیرہ وہی جگہ ہے جہاں اس بڑھیا کا مکان تعمیر تھا۔

محبّ وطن چڑیل کی کہانی:

علاقہ کھرمنگ کے طولتی گاؤں کے مشرق میں ایک سطح مرتفع ''بروق چن شغرن'' واقع ہے جہاں پر کسی زمانے میں پولو کھیلا جاتا تھا۔ اس سے متصل شمال میں آواتھنگ کے نام سے دوسرا میدان واقع ہے۔ اس کے متعلق مشہور ہے کہ کسی زمانے میں یہاں ایک بدھ راہب ''آوا'' رہا کرتا تھا۔ جس کی مناسبت سے اس کا نام ''آواتھنگ'' پڑ گیا۔ ان دونوں میدانوں کے عین مشرق میں چھوغوتھنگ واقع ہے مقامی لوگ ان میدانوں کو آباد کرنے کے لئے سنگلاخ چٹانوں کے درمیان سے نہر نکالنے کی کوشش کرتے رہے ہیں۔ اس سلسلے میں اتفاقیہ کہیئے یا کسی ماورائی ہستی کا پراسرار کرشمہ کہ جن جن چٹانوں سے نہر گزر سکتی ہے وہاں قدرتی طور پر ایک سفید لکیر نظر آتی ہے۔ لوک روایت کے مطابق اس لکیر کو ایک محبّ وطن چڑیل ''سترین جانو'' نے ایک نہر نکالنے کی نیت سے ابتدائی سروے کے طور رکھینچا تھا تا کہ متذکرہ بالا میدانوں کو سیراب کر کے یہاں کے غریب کسانوں کو خوشحالی سے ہمکنار کر سکے لیکن بدقسمتی سے جب یہ چڑیل اپنے ابتدائی کام سے فارغ ہوکر تھوڑی دیر کے لئے آواتھنگ کے کنارے آ کر بیٹھ گئی تو دریا پار کے شمالی پہاڑوں میں مقیم پاری گاؤں کی چڑیل نے اونچی آواز میں اسے یہ اندوہناک خبر سنادی کہ اے پگلی! تم کن کے لئے یہ سب مشقتیں اٹھا رہی ہو؟ تمہارے وہ بھائی بہنیں جو طولتی گاؤں میں بستے تھے رات کو طوفانی ہواؤں کی زد میں آ کر مر چکے ہیں۔ اگر یقین نہیں آتا ہے تو جاؤ آواتھنگ کے کنارے جا کر خود اپنی آنکھوں سے اس تباہی کا منظر دیکھ لینا۔ اس اندوہناک خبر کو سنتے ہی وہ آوا تھنگ کے مغربی کنارے پر پہنچ کر گاؤں کا حال دیکھا تو واقعاً اسے کوئی انسان نظر نہ آیا۔ یوں لگتا تھا گویا وہ کسی قدیم آبادی کے کھنڈرات کا منظر دیکھ رہی ہے۔ دراصل گاؤں کے بچے، بوڑھے، مرد اور خواتین سبھی صبح سے ہی بودھ خانے میں کسی تہوار کی رسم ادا کرنے میں مصروف تھے۔ اس لئے محبّ وطن چڑیل نے پاری کی طرف سے آنے والی من گھڑت خبر کو سچ سمجھ لیا۔ اس طرح وہ غم سے اس قدر نڈھال ہوگئی کہ بالآخر چھوغوتھنگ کے جنوبی چٹانوں میں جا کر خودکشی کر لی۔



سد پارہ جھیل سکردو

گونگما غور ہرژے کا واقعہ:

کہتے ہیں کہ بلتستان کے علاقہ خپلو کے گاؤں گونگما غور ہرژے میں روایتی طرزِ تعمیر کا ایک دو منزلہ مکان کھنڈر کی صورت میں محض اس لئے ویران پڑا ہے کہ اس کی نچلی منزل میں پراسرار ماورائی مخلوقات یعنی ہلا اور ہلامورات کے وقت رقص وسرور کی محفلیں سجاتی ہیں۔ گاؤں کے اکثر لوگوں نے جب یہ حالت دیکھی تو اس کھنڈر مکان کے آس پاس بسنے والے اپنے گھروں کو ویران چھوڑ کر دوسرے محلوں میں جا کر بس گئے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ رات کے وقت نچلی منزل کے کمروں میں روشنی دکھائی دیتی ہے اور ٹھیک نصف شب کے بعد ڈھول بجانے اور گانا گانے کی آوازیں بھی سنائی دیتی ہیں۔ اس دوران اگر کوئی فرد اندر داخل ہونے کی کوشش کرے تو بوسیدہ دروازے بھی کچھ اس طرح سے بند ہو جاتے ہیں جیسے کسی نے اندر سے مقفل کیا ہو۔ کئی افراد اندر داخل ہونے میں کامیاب بھی ہوئے انہیں آگ کا الاؤ بھی نظر آیا مگر حسی ادراک سے وہاں پر آگ موجود ہونے کی تصدیق نہیں کی جا سکی۔

لوک رومان:

بلتستان میں بہت سے لوک رومان مشہور ہیں اور یہاں کے لوک ادب میں سینکڑوں گیتوں اور نغموں کے ساتھ الگ الگ رومان منسوب ہیں۔ یہ رومان صدیوں سے سینہ بہ سینہ چلے آ رہے ہیں اور یہ رومانوی کردار یہاں کے لوگوں کے دلوں میں اب بھی زندہ ہیں۔ ان رومانوں میں عاشق اور معشوق کے علاوہ رقیب اور پیامبر کے روایتی کردار بھی ضرور ہوتے ہیں۔ عاشق خود کو ''زدیکپہ'' (مظلوم) اور ''درے جوکھ'' (دیوانہ) وغیرہ ناموں سے پکارتا ہے۔ محبوب کو کبھی گلاب کبھی پہاڑی پھولوں جیسے ''چھونڈول'' اور ''مہ خوتینگ'' کبھی چودھویں کا چاند اور چڑھتے سورج کہہ کر آسمان پر چڑھا دیتا ہے اور کبھی ''ہلاٹو'' یعنی دیوی یا پرستان کی شہزادی سے تشبیہہ دیکر اسے زمین پر لے آتا ہے۔ بعض رومان بلتستان، لداخ اور پوریگ کے مشترک ہیں۔ نمونے کے طور پر یہاں چند ایک رومانوں کا ذکر کیا جاتا ہے۔

شِرنگ بغدور:

بلتستان کی وادی رونگ یُل (روندو) کے ایک گاؤں کا نام تریکو ہے۔ کسی زمانے میں اس گاؤں میں ایک خوبصورت لڑکی رہتی تھی جبکہ دریا پار گاؤں میں ایک خوبرو نوجوان شِرنگ بغدور رہتا تھا۔ شرنگ بغدور اس دوشیزہ کا دلدادہ تھا اور لڑکی بھی شرنگ بغدور سے محبت کرتی تھی۔ شرنگ بغدور اپنی محبوبہ کی دیدار کے لئے پہاڑ کی چٹانوں کو پھلانگتا، گہری کھائیوں سے گزرتا اور دریا کے طغیانی موجوں کو عبور کرتا ہوا تریکو آ جایا کرتا تھا۔ جب کبھی شرنگ کسی وجہ سے اس سے ملنے نہ پہنچتا تو محبوبہ اس کے انتظار میں ان اڑتے پرندوں کو حسرت بھری نگاہوں سے دیکھتی جو اڑتے ہوئے دریا پار کرتے تھے۔ وہ ان مارخوروں کو خوش قسمت سمجھتی جو سبک رفتاری سے چٹانوں کو پھلانگتے تھے۔ اس لڑکی نے اپنی بے بسی اور شرنگ بغدور سے ملنے کی اشتیاق کے جذبات میں کہتی ہے کہ میرے شِرنگ بغدور اور مجھ پگلی کے درمیان یہ دریا حائل ہے۔ اے آبی پرندو تم بڑے خوش نصیب ہو جو دریا کو عبور کرتے ہیں۔ میرے شِرنگ بغدور اور مجھ پگلی کے درمیان یہ نوکیلی چٹانیں ہیں۔ ان نوکیلی چٹانوں سے گزرنے والے مارخور! تم بڑے خوش قسمت ہو۔ میرے شِرنگ بغدور اور مجھ پگلی کے درمیان یہ خطرناک کھائی ہے۔ اس کھائی سے گزر کر آنے والے میرے شِرنگ بغدور! تم کتنے خوش نصیب ہو۔

زِھن تھغ ینگ:

یہ ایک شوہر اور اس کی بیوی کا رومان ہے اور اس کا شمار حزنیہ کہانیوں میں ہوتا ہے۔ اس کہانی کے ہیرو کا نام کاظم تھا۔ جو اس زمانے میں مقپون راجہ سکردو کا مقرب تھا۔ ایک دفعہ راجہ سکردو کاظم سے کسی بات پر ناراض ہوا اور اسے روندو کے دور افتادہ گاؤں شوت کے قید خانے میں ڈال دیا۔ کاظم کی خوبصورت بیوی کا نام جہان تھا جسے وہ دل و جان سے چاہتا تھا۔ جہان بھی اپنے میاں سے بے انتہا محبت کرتی تھی۔ کاظم کو جب جیل میں مقید کر دیا گیا تو جہان سے جدائی کا غم برداشت نہ ہو سکی اور سکردو سے اپنے محبوب خاوند سے ملنے ان دشوار گزار راستوں کو عبور کرتے ہوئے روندو کی طرف روانہ ہو گئی جو ان دنوں پیدل پانچ دنوں کی مسافت تھی۔ جہان چلتے چلتے اس معلق پُل پر پہنچی جسے عبور کر کے اسے شوت پہنچنا تھا اور اس پُل کا نام ''چولی فوی زمبہ'' تھا۔ اس زمانے میں بلتستان کے لوگ دریاؤں کو عبور کرنے کے لئے بید کے درخت کی پتلی پتلی ٹہنیوں کے رسے سے بٹ کر معلق پُل بناتے تھے اور مذکورہ پُل بھی ایسا ہی تھا جو بڑا جان لیوا ثابت ہوتا تھا۔ جہان اس پُل پر آ کر کھڑی ہو گئی اور اپنے شوہر کو مدد کے لئے پکارنے لگی۔ مغموم دل سے خون کے آنسو بہانے لگی اور اس کی آہوں کے ساتھ اس کی زبان نغمہ خواں ہو گئی۔ جہان کہتی ہے میں اس طویل رات کو تین حصوں میں تقسیم کرتی ہوں۔ پہلے حصے میں جان دینے والے مالک کی عبادت کرتی ہوں۔ دوسرے حصے میں چہاردہ معصومینؑ کو یاد کرتی ہوں اور تیسرے حصے میں خود کو کاظم کے ساتھ بغلگیر پاتی ہوں لیکن جب صبح

جاگتی ہوں تو دیکھتی ہوں یہ تو میرے گھٹنے تھے جو میرے سینے سے لگے تھے۔ اے میری جان کاظم! میرے اور تمہارے درمیان یہ دریا حائل ہے۔ مجھے اس دریا سے پار جانے کے لئے مشک لے کر آؤ یا ریشمی رسی لے کر آؤ تا کہ میں یہ خطرناک پُل پار کر سکوں۔ جہان کے یہ رومانوی جذبات و احساسات ایک خوبصورت گیت کی شکل میں موجود ہے۔

بروشال پا:

یہ بھی بیوی اور شوہر کا رومان ہے۔ کہا جاتا ہے کہ بلتستان کے اولوالعزم راجہ علی شیر خان انچن نے گلگت و چترال کو فتح کرنے کے بعد واپس وطن آتے ہوئے وہاں سے سینکڑوں جنگی قیدی بھی اپنے ساتھ لائے اور ان کو بلتستان کی مختلف جگہوں پر آباد کیا۔ علاوہ ازیں یہ روایت بھی ہے کہ گلگت و چترال کے بہت سے طالع آزماؤں نے علی شیر خان انچن کی فوج میں ملازمت اختیار کر لی اور اس طرح وہ بھی بلتستان پہنچے۔ ان میں سے ایک شخص بروشال کا باشندہ تھا۔ اس نے یہاں شادی کر لی۔ کئی سال بعد اسے اپنا وطن بروشال یاد آیا اور وہاں جانے کا فیصلہ کر لیا۔ جب اس ارادے کا بیوی کو پتہ چلا تو اس کو یہ جدائی گراں گزری اور اپنے میاں سے کہنے لگی اے میری جان بروشال پا! آپ تو بروشال جا رہے ہیں لیکن میرے پاس کسے چھوڑ کر جا رہے ہیں۔ خاوند نے جواب دیا کہ اے میری جان! میں تمہارے لئے سونے چاندی سے بھرے ہوئے تھیلے چھوڑ کر جا رہا ہوں۔ بیوی کہتی ہے کہ یہ سونے چاندی میری راتوں اور دنوں کی ساتھی نہیں بن سکتے۔ مجھے ان چیزوں کی ضرورت نہیں۔ مجھے تو صرف آپ ہی کی ضرورت ہے۔ ان دونوں میاں بیوی کی یہ گفتگو ایک خوبصورت گیت کی شکل اختیار کر گئی۔

شیلے سوک:

کہتے ہیں کہ کسی زمانے میں سکردو کے کسی دیہات میں شیلے سوک نامی ایک دوشیزہ رہتی تھی۔ شیلے سوک کو ایک نوجوان جان علی سے محبت ہو گئی اور وہ دونوں چوری چھپے ایک دوسرے سے ملاقات کرنے لگے۔ اس واردات عشق و محبت کی خبر شیلے سوک کے رشتہ داروں اور والدین کو ہو گئی۔ انہوں نے شیلے سوک کو اس حرکت سے باز رکھنے کیلئے سخت تادیبی کارروائی کرنے اور جان علی کی مار پٹائی کا منصوبہ بنا لیا۔ اس سازش کی بھنک جب شیلے سوک کے کان میں پڑ گئی تو اس نے اپنے محبوب جان علی کے ساتھ سکردو سے کہیں بھاگ جانے کا تہیہ کر لیا۔ یہ معلوم نہیں کہ جان علی اور سیلے سوک کا انجام کیا ہوا۔ لیکن اس گیت میں شیلے سوک نے اپنے رشتہ داروں کے خفیہ منصوبے کا انکشاف کرتے ہوئے جان علی کے ساتھ بھاگ جانے کا اظہار کیا ہے۔

وہ کہتی ہے کہ میں افواہیں سن رہی ہوں کہ میرے باپ اور بھائی مجھے زدوکوب کرنے والے ہیں۔ اے جان علی! میں اس مار پیٹ سے نہیں ڈرتی بلکہ تیری جدائی سے ڈرتی ہوں۔ میں یہ سن رہی ہوں کہ میرے باپ اور بھائی مجھے باندھ کر رکھنا چاہتے ہیں۔ اے میرے جان علی! یہ لڑکی باندھے جانے سے نہیں ڈرتی بلکہ تیری فرقت سے ڈرتی ہے۔ میں یہ افواہیں بھی سن رہی ہوں کہ مجھ (شیلے سوک) لڑکی کے باپ اور بھائی جان علی کی پٹائی کرنے والے ہیں۔ جان علی کی پٹائی ہونے سے پہلے ہی میں اسے ساتھ لے کر دریہ برگے کو عبور کر کے بھاگ جاؤں گی۔

لوریاں، پہیلیاں اور بدگوئیاں، دعائیہ کلمات اور ضرب الامثال

لوریاں، پہیلیاں، بدگوئیاں، دعائیہ کلمات اور ضرب الامثال بھی کسی معاشرے کے فوک لور کا حصہ ہیں۔ یہ لوریاں، پہیلیاں، بدگوئیاں اور دعائیہ کلمات ماؤں، بہنوں، بڑے بوڑھوں اور بچے بچیوں کے بے ساختہ جذبات و احساسات کی ترجمانی کرتے ہیں۔ ان عوامی ورثوں کا مواد روتے ہوئے بچوں کو بہلانے کے لئے تعریفی، دیومالائی، دھمکی، نفرین اور دعائیہ کلمات کے علاوہ ضمناً اس کے متعلقین کی تعریف و توصیف پر مشتمل ہوتا ہے۔ عام لوک گیتوں کی طرح سادگی، بے ساختگی، معصومانہ جذبات، مقامی رنگ اور گہرے معاشرتی نقوش بلتستان میں پائی جانے والی ان لوریوں، پہیلیوں، بدگوئیوں اور دعائیہ جملوں کی نمایاں خصوصیات ہیں۔ بلتستان کے لوک ورثہ کے ذخیرے میں بڑوں و بچوں اور عورتوں و مردوں سب کا برابر کا حصہ ہے۔ بچوں کو بہلانے کے لئے یہاں بہت سارے ادب پاروں تخلیق کیئے ہوئے ہیں۔ ان میں کچھ تو بامعنی ہیں اور کبھی کبھار بے معنی الفاظ بھی آتے ہیں۔ جس کے بارے میں بلتستان کے مختلف علاقوں میں مختلف روایات زبان زد عام ہیں۔ کوئی بچہ رو رہا ہو تو ایک منظوم لوری کا سہارا لے کر اس کو بہلایا جاتا ہے۔ بہلانے والا شخص اس بچے کے ہاتھوں کو اپنے ہاتھ میں لے کر بچے کو پیٹھ پر چڑھاتا ہے اور سوال و جواب کے انداز میں درج ذیل منظوم لوری کے طور پر عبارات ترنم کے ساتھ سنانے لگتا ہے۔ یوں روتا ہوا بچہ فوراً چپ ہو جاتا ہے۔

بلتی متن	اردو ترجمہ
نی خشول لاچی یود؟	میری پیٹھ پر کون ہے؟

گویکھہ مے ہلتو ینگ نو چھوٗ ستنگ لا داسر پر آگ، پیٹ میں پانی اور دل پر تیر (حقہ)

اپوترم چھونکس، تھولو پلق چھدس　　بوڑھا کود پڑا اور پوستین یک دم پھٹ گئی (اخروٹ کے دانے درخت سے گرنے پر کہا جاتا ہے)

بہ مہ سکیا بو ہندوق　　گائے کا بچھڑا پیدا ہونے سے پہلے چھت پر (دھواں)

اطلاسی کھوڑو کھ سینگ مطلاسی سون چی　　اطلاس کی تھیلی میں مطلاس کے بیج (مرچ)

خیوی طبغینگ موتیگی فیاخب　　فیروزے کے طبق میں موتی کے سوغات (آسمان اور تارے)

کنڈیری ستقجی سکلا بیوسے مہ مگوے مہ　　اردگرد درخت اور درمیان میں لبریز ہو کر نہ گرنے اور نہ کبھی بند ہونے والا (آنکھ) چشمہ

می چھد پی چھومک چی

چھٹ حلیمہ تنگ نائی ننگلہ　　پستہ قد حلیمہ ہر گھر میں (ٹوپہ)

تھونمو یولات چیگی کھہ اذوق ثیس　　سفیدے کے ایک بہت اونچے درخت پر دو آذوق (انسان کے دو کان)

بلتی معاشرہ میں جب کوئی فرد کسی سے ناراض ہو جاتا ہے تو اسے سوقیانہ دشنام سے پکارنے لگتا ہے۔ ان میں غلیظ گالیاں نہیں ہوتیں بلکہ یہ ایک طرح کی بد دعا اور بدگوئی ہوتی ہے۔ ان میں کچھ تو انتہائی حریفانہ انداز میں ہوتے ہیں اور کچھ ہلکے پھلکے ہوتے ہیں جن میں کبھی کبھار غصے کے ساتھ ساتھ پیار و محبت کی ہلکی سے جھلک بھی ملتی ہیں۔ لیکن بعض دفعہ بلتستان کے مرد و خواتین اپنے بچوں، عزیزوں، دوستوں اور سہیلیوں کو بھی مزاحیہ طور پر ڈانٹ ڈپٹ کے لئے انہی الفاظ سے پکارتے ہوئے نہیں کتراتے۔ البتہ یہ بدگوئیاں زیادہ تر عورتوں میں زبان زد عام ہوتی ہیں۔ بلتی زبان کی بے ساختہ نکلنے والی بدخواہی کی یہ عبارتیں بلتستان کی مختلف وادیوں میں قدرے مختلف بھی ہیں جو بلتستان کے لوک ورثہ کا ایک حصہ ہیں۔ بلتی زبان کے چند نفرین آمیز عبارات کے نمونے درج ذیل میں ملاحظہ کریں:

بلتی متن	اردو ترجمہ
(۱) لیس لونگ مہ سونگفہ!	کھلنا نصیب نہ ہو! (۱) اپنی جوانی نہ دیکھ سکے
(۲) ساکھوڑا جو کفہ!	زیر زمین جانا نصیب ہو! (۲) مر جائے
(۳) زالونگ مہ سونگفہ!	کھانا نصیب نہ ہو! (۳) کھانے کی فرصت نہ ملے
(۴) رگانو مکلہ ماتھونگفہ!	آنکھوں کو خوشی نصیب نہ ہو! (۴) غم سے دوچار ہو
(۵) ہلتوا مہ گیسپا!	پیٹ نہ بھرنے والا! (۵) پیٹو
(۶) اتا انوے دونو مہ ژھرفا!	والدین کے سامنے نہ پلنے والا! (۶) سرکش
(۷) زگید پو یکھہ ژونگ ردونگمہ سونگ شیک!	چولہے کے پتھر پر پیاز کوٹنے کی نوبت پہنچے (۷) انتہائی غربت
(۸) رب چھد پھہ!	نسل قطع ہو! (۸) بے اولاد ہو
(۹) سپلبنگ کھی چھدفہ!	پیشانی پر کتے کی تصویر ہونا! (۹) انتہائی بدبخت
(۱۰) ہلچے چھد پھا!	زبان کٹ جائے! (۱۰) زبان سے معذور ہو

دعائیہ کلمات:

بلتستان کے بڑے بوڑھے اپنے بچوں اور کارکنوں کو ان کی کسی بھی اچھی کارکردگی اور اچھے رویئے پر پیار و محبت اور دعائیہ کلمات سے نوازتے ہیں۔ ان دعائیہ کلمات کے چند نمونے درج ذیل ہیں:

بلتی متن	اردو ترجمہ
ژھے رینگمو سونگ	عمر دراز ہو
ندمید دوک	تندرست رہے
رگانو ہلتون	خوشی نصیب ہو
نا سکور	میں تم پر قربان

لوک ساز، لوک ناچ اور گیت:

بلتستان از منہ قدیم سے ایک ترقی یافتہ تہذیب و تمدن کا امین اور بلند پایہ فنون لطیفہ کا گہوارہ رہا ہے۔ بلتستان کی موسیقی جہاں تفریح طبع کا ذریعہ ہے وہاں اس کے پس منظر میں علاقے کی تہذیب اور تاریخ کی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔ موسیقی کی دو قسموں میں سے بلتستان میں درباری موسیقی نے رواج پایا اور خانقاہی موسیقی یہاں کم رائج ہوئی۔ یہاں کا قدیم معاشرہ اور حکومت کے کاروبار میں موسیقی کو مرکزی اہمیت حاصل تھی۔ خوشی کے مواقع پر تفریح طبع کے علاوہ سرکاری احکامات، پیغامات، تعریف و توصیف، ہجو، پند و نصائح، اشارے کنائے، منصوبوں اور سازشوں کا اظہار موسیقی اور لوک گیتوں کے ذریعے کیا جاتا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ موسیقی کے ذریعے علاج و معالجہ بھی کیا جاتا تھا۔ لوگ اپنی درخواست اور شکایات وغیرہ بھی موسیقی اور گیتوں کی وساطت سے کرتے تھے۔ چونکہ سارا معاشرہ موسیقی اور لوک گیتوں کے ماحول میں رچا بسا ہوتا تھا۔ اس لئے حکمران بھی بغیر کسی دقت کے ان

معروضات کو سمجھ لیتے تھے۔ گویا قدیم یونان، ایران اور ہندوستان کی طرح بلتستان میں بھی گزشتہ وقتوں میں موسیقی، رقص اور لوک گیتوں کی بڑی اہمیت رہی جن کا استعمال موقع محل دیکھ کر کیا کرتے تھے۔ نیز یہاں کے رسوم، شاعری، موسیقی اور رقص وغیرہ باہم مربوط بھی ہیں۔ بلتستان کی موسیقی، لوک ساز، گیت اور ناچ کی تین قسمیں کلاسیکی، نیم کلاسیکی اور غیر کلاسیکی بتائی جاتی ہیں اور ان تینوں قسم کی موسیقی کو ہم تاریخی اعتبار سے تین ادوار میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ پہلا دور اشاعت اسلام سے پہلے کی موسیقی، دوسرا دور اشاعت اسلام سے قیام پاکستان تک کی موسیقی اور تیسرا دور قیام پاکستان سے اب تک کی موسیقی۔

موسیقی قبل از اسلام:

بلتستان کی قدیم لوک داستانوں اور کہانیوں سے پتہ چلتا ہے کہ یہاں شروع میں تبتی الاصل مذہب ''بون مت'' کے دور میں رقص و موسیقی کا رواج بہت زیادہ تھا جیسا کہ داستان کیسر میں رسم سوئمبر کے ضمن میں رقص و موسیقی کا تذکرہ ملتا ہے بلکہ اس مذہب کی باقیات میں سے یہ عقیدہ کچھ عرصہ قبل تک لوگوں کے اذہان پر سوار تھا کہ ہمارا علاقہ دیوتاؤں یعنی ''ہلا'' اور ''ہلامو'' کی سرزمین ہے اور ان کو خوش رکھنے کے لئے موسیقی کا رواج ناگزیر سمجھا جاتا۔ شروع میں لوک داستانوں یعنی ہلافو کیسر، رگیالوستراالبو اور رگیالو چولو بزانگ وغیرہ کے منظوم حصوں کی دھنیں رائج ہوگئیں اور رفتہ رفتہ لوک گیتوں کی دھنیں بھی وضع ہوتی گئیں۔ جب بلتستان میں دیگر علاقوں سے مختلف اقوام آ کر آباد ہونے لگیں تو وہ لوگ اپنے ساتھ اپنے اپنے مذہب اور عقائد کی دھنیں بھی لے آئے جو ''چھوس'' کہلاتی ہیں اور عوامی میلوں میں وہ انہی دھنوں پر رقص کیا کرتے تھے۔

بلتی موسیقی (چوس) کی دھنیں:

۱) بلتی چھوس:

یہ بلتستان کے قدیم باشندوں کا ساز اور رقص ہے۔ بلتی دھنوں میں ''غیر سہ غیر چونگ'' نامی دھن منفرد مقام رکھتی ہے جو مشہور ہندی راگ ''ملہار'' کا الٹ ہے۔ بتایا جاتا ہے کہ اس دھن کے بجانے سے بارش تھم جاتی ہے اور موسم صاف ہو جاتا ہے۔

۲) کھچے چھوس:

یہ ان کشمیریوں کی دھن ہے جو صدیوں قبل کشمیر سے ترک وطن کر کے بلتستان آئے اور یہاں آباد ہوئے۔ اب یہ دھن بجانے والے تو ناپید ہیں صرف نام باقی ہے۔

۳) بروق چھوس:

یہ دھن ان درد اقوام سے منسوب ہے جو زمانہ قدیم میں اپنے وطن سے نقل مکانی کر کے بلتستان کی پہاڑی وادیوں میں آباد ہوئے۔ یہ دھن بلتستان کی وادی رونگ یُل میں اب بھی مقبول ہے۔ اس دھن پر جو رقص کیا جاتا ہے اس میں اچھل کود زیادہ ہے۔ اس کی بھی دو قسمیں ہیں۔ (i) ژھونژے بروق چھوس (ii) چھوغو بروق چھوس

۴) مون چھوس:

یہ ان اقوام کا ساز اور رقص ہے جو قدیم دور میں شمالی ہندوستان ''مون یل'' سے بدھ مت کی تبلیغ کے لئے آ کر یہاں آباد ہوئے۔ یہی لوگ بعد میں ''مون'' کہلائے جو اس وقت بلتی زبان میں موسیقار کے لئے مستعمل ہے۔ بتایا جاتا ہے کہ انہی مونوں نے بلتستان کی موسیقی کو ایک فن کی حیثیت سے ترقی دی اور اس کی روایات کو زندہ رکھا۔ البتہ بعد کے زمانوں میں درد موسیقار اور گویئے بھی ''مون'' کے نام سے یاد کیئے جانے لگے جبکہ وہ نسلی طور پر مون نہیں تھے۔

۵) بودھ چھوس:

یہ وہ ساز ہے جو یہاں کے بدھ مت کے پیروکار اپنے مذہبی تہواروں پر عمل میں لاتے تھے۔ روایت کے مطابق آج سے کچھ عرصہ قبل تک بلتستان میں کبھی کبھار تفریح کے لئے کوئی مسخرا اس دھن پر رقص کرتے ہوئے ارواح خبیثہ اور چڑیلوں کی نقل اتارتا تھا۔ اب یہ دھن بھی ناپید ہے۔

۶) بان چھوس:

یہ بھی بروق چھوس سے ملتی جلتی ایک دھن ہے جو ''بان'' کو وجد اور حال میں لانے اور رقص کے لئے بجائی جاتی تھی۔ بلتستان میں ''بان'' صرف انہی علاقوں میں پائے جاتے ہیں جہاں درد اقوام کے لوگ یعنی ''شین'' بستے ہیں اور شنا زبان میں اسے دائیل کہتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ بلتستان کا بان کلچر شینوں کی دین ہی۔ اب اس دھن کا بھی صرف نام باقی رہ گیا ہے۔

موسیقی بعد از اشاعت اسلام:

چودھویں صدی عیسوی کے دوران جب اسلامی تبلیغ کے لئے ایرانی مبلغین کی آمد و رفت کا سلسلہ شروع ہوا تو یہاں کی تہذیب و تمدن اور فنون لطیفہ بھی

ایرانی اثرات سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ کہا جاتا ہے کہ ہندوستان میں مغلیہ دور سے قبل ایرانی فنون لطیفہ اور موسیقی بلتستان میں رائج ہو چکی تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ ایرانی موسیقی کے اصولوں میں موجود مقامات' اوزل یا عزل' گوشہ اور روانی وغیرہ بلتستان میں آج بھی مروج ہیں۔

جب مقپون علی شیر خان انچن بلتستان کا الوالعزم حکمران بنا تو مغل دربار کے ساتھ ان کے روابط پیدا ہوئے۔ ان کی بیٹی کی شادی شہنشاہ جہانگیر سے ہوئی جبکہ ایک مقامی روایت کے مطابق خود علی شیر خان انچن نے بھی ایک مغل شہزادی گل خاتون سے شادی کر لی۔ ان سیاسی اثر ورسوخ کے حوالے سے علی شیر خان انچن نے بلتستان کے نقارچیوں کا ایک ٹولہ دہلی بھیجا تا کہ وہ مغلیہ دربار سے وابستہ موسیقاروں سے حربی وکلاسیکی ساز سیکھ آئے۔ اسی دور میں دربار مغلیہ کے طرز پر بلتستان کے راجاؤں کے محلات میں بھی نوبت خانے بنائے گئے۔ جہاں روزانہ پانچ وقت نوبت بجائے جاتے تھے اور یہ سلسلہ غالباً قیام پاکستان سے کچھ عرصہ قبل تک جاری تھا۔

کہا جاتا ہے کہ مقپون راجہ آدم خان بھی مغلیہ دربار سے وابستہ رہا جنہوں نے قیام دہلی و آگرہ کے دوران مغل درباری موسیقی کی تعلیم حاصل کی اور بلتستان آ کر انہیں رائج کیا۔

یبگو محمد علی خان نے جموں میں اپنی نظر بندی کے دوران ہندی موسیقی اور مغلیہ درباری موسیقی میں مہارت حاصل کی۔ بتایا جاتا ہے کہ آپ شہنائی اور نے بجانے میں بڑے مشاق استاد تھے۔ آپ نے واپس آ کر بلتستان کی وادی خپلو میں بہت سے سازندوں کو موسیقی کی باقاعدہ تربیت دی اور ان سازندوں کو اپنی اپنی ریاست کے مختلف پرگنوں میں زمینیں دے کر آباد کرایا۔ وقتاً فوقتاً ان سازندوں کو جمع کر کے ان کا امتحان لیا جاتا تھا اور کامیاب سازندوں کو انعام واکرام سے بھی نوازا جاتا تھا۔

خپلو کے یبگو راجہ حاتم خان ثانی فارسی شاعری کے علاوہ موسیقی سے خاص شغف رکھتے تھے۔ آپ مولانا محمد عمر سمرقندی المعروف ملا محمد حسین پشاوری کے شاگرد تھے اور موسیقی کا فن ان سے سیکھا تھا۔

دینی مبلغین میں سے جس شخص نے بلتستان میں فن موسیقی کو فروغ دیا ان میں مولانا محمد عمر سمرقندی المعروف ملا محمد حسین پشاوری کا نام قابل ذکر ہے۔ بتایا جاتا ہے کہ آپ سمرقند کے رہنے والے اور جامعہ عرب کے فارغ التحصیل تھے۔ بغرض تبلیغ دین چینی ترکستان سے ہوتے ہوئے لداخ اور آخر براستہ چھوربٹ لا بلتستان وارد ہوئے۔ ملا پشاوری کو علم موسیقی میں کامل دسترس حاصل تھا۔ کہا جاتا ہے کہ انہوں نے بلتستان کے باذوق افراد کو دیگر علوم کے علاوہ موسیقی کا فن بھی سکھایا۔

خپلو کے راجہ اسفندیار خان بھی موسیقی کے ماہر مانے جاتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ انہوں نے ہندی راگ ''سارنگ'' اور ''تلنگ'' میں تحریفات کر کے ''ساز ہندی'' نامی ایک مقام ایجاد کیا جو آج تک رائج ہے۔

خپلو ہلدی کا سنگ سنگ بلتستان کا وہ آخری موسیقار تھا جو ساٹھ حریب بجا سکتا تھا جس کا 1982ء میں انتقال ہوا۔

بلتستان میں کلاسیکی' جنگی' غنائیہ اور دعائیہ سازوں کی کل تعداد ساٹھ بتائی جاتی ہے اور موجودہ موسیقاران میں سے چند دھنیں بجا سکتے ہیں۔

گزشتہ وقتوں میں بلتستان کے مقامی راجے ان فنون کی خوب سرپرستی کیا کرتے تھے' موسیقاروں کی حوصلہ افزائی کی جاتی تھی اور بتایا جاتا ہے کہ راجہ خپلو کے محل میں ایک قدیم بیاض دو تین عشرے قبل تک موجود تھا جس میں بلتستان میں مروجہ تمام راگوں کے بجانے کے طریقے رقم تھے۔ اب معلوم نہیں وہ بیاض ضائع ہوا یا کسی غیر متعلقہ شخص کے پاس موجود ہے۔ بلتستان میں موسیقاروں کا سردار کو ''مون'' کہلاتا ہے اور وہی باقی موسیقاروں کی تربیت و رہنمائی کرتا تھا۔ ماہرین کا کہنا ہے کہ بلتی زبان میں آہنگ صوتی ضربات یعنی ''ردانگ تنگ'' کے ذریعے موسیقاروں کو تعلیم دی جاتی تھی۔

بلتستان میں اشاعت اسلام کے بعد جو موسیقی متعارف و مروج ہوئی یہاں اس کا تفصیلی تذکرہ کیا جاتا ہے۔ جن کی دو بڑی قسمیں (i) حریب (ii) ہرژے کار ہیں۔

حریب:

بلتستان میں مروجہ اصطلاح ''حریب'' سے مراد ''راگ'' ہے۔ جن کے متعدد حصے ہوتے ہیں۔ اگرچہ اصول وقواعد کے مطابق یہ بھی فارسی سے ماخوذ ہیں البتہ ان اصطلاحات میں کچھ بلتی زبان کی تحریف کی ہیں۔ ابتدائی حصے کو ''رق'' کہتے ہیں۔ دوسرا حصہ ''رگو'' تیسرا حصہ ''روانی'' اور چوتھا حصہ ''گوشہ'' کہلاتا ہے۔ بلتستان میں مروجہ حریب کی قسمیں درج ذیل ہیں۔

نوبت:

یہ بہت مشہور راگ ہے جو ۲۱، مارچ کو یعنی نوروز کے دن خصوصی طور پر

بجایا جاتا ہے۔ بعض ماہرین کے مطابق اس حریب کے بارہ اور بعض کے مطابق اٹھارہ گوشے ہیں اور اس کی آخری دھن جنگی بتائی جاتی ہے اسے مکمل کرنے کے لئے کم از کم پونے گھنٹہ لگتا ہے۔ جس دن یہ راگ بجایا جاتا ہے اس دن روایات کے مطابق مقامی راجاؤں کی طرف سے سازندوں کو ضیافت کے جملہ لوازمات عطا ہوتے ہیں۔ بتایا جاتا ہے کہ قدیم زمانے میں نوروز سے ایک دن قبل نوبت کے علاوہ ''فسوس'' حریب یعنی استقبالیہ راگ اور نوروز کے دوسرے دن ''سکیال'' حریب یعنی الوداعی راگ بھی بجائے جاتے ہیں۔

باسن:

یہ حریب نوروز کی صبح صادق کے وقت بجائی جاتی ہے۔

۱۔ برہ ڈم ۲۔ ساز ہندی ۳۔ دبرمالا ۴۔ سیندوری

یہ چاروں راگ ہندی موسیقی سے ماخوذ معلوم ہوتے ہیں۔ البتہ ساز ہندی نامی حریب کے بارے میں بتایا جاتا ہے کہ خپلو کے کاچو اسفندیار خان نے دو ہندی راگ ''سارنگ'' اور ''تلنگ'' میں تحریف کر کے مقامی طور پر ایجاد کیا ہے۔

۱۔ یگاہ ۲۔ دوگاہ ۳۔ سہ گاہ ۴۔ چہارگاہ ۵۔ پنجگاہ

ان پانچوں راگوں کے نام سے فارسی معلوم ہوتے ہیں البتہ چہارگاہ کے بارے میں وثوق سے کہا جاتا ہے کہ یہ امیر خسرو کی ایجاد ہے۔ بلتستان میں یہ پانچوں راگ درباریوں اور لشکریوں کو پہر سے آگاہ کرنے کے لئے بجائے جاتے تھے۔

۱۔ شادیان ۲۔ دلاور ۳۔ حسینی ۴۔ مخالف ۵۔ عجم ۶۔ حجاز ۷۔ چمن بے نظیر ۸۔ دورساقی ۹۔ راست ۱۰۔ اصفہانی ۱۱۔ نوروز صبا ۱۲۔ نوروز عرب ۱۳۔ نیشاپورک ۱۴۔ سورک ۱۵۔ حصار ۱۶۔ سری ۱۷۔ ذلب ۱۸۔ سکنہ سہ گاہ ۱۹۔ کمانچہ ۲۰۔ لوری ۲۱۔ بایت ۲۲۔ بم ۲۳۔ عشاق ۲۴۔ مغلوب ۲۵۔ ہزار داستان ۲۶۔ صبح صادق ۲۷۔ غم ۲۸۔ ذکر ۲۹۔ عراقی ۳۰۔ دیوکندھار ۳۱۔ نوروز عجم ۳۲۔ پہلوی ۳۳۔ کوہی ۳۴۔ نہضت ۳۵۔ اداسی ۳۶۔ بہاکر ۳۷۔ نوا ۳۸۔ روان ۳۹۔ لاچارے ۴۰۔ جنجوق

نقی محمد خان خورجوی کی کتاب حیات خسروی کے مطابق ان میں اکثر راگ ہندوستان میں مروج تھے اور متعدد راگوں کو امیر خسرو کی ایجاد بتایا جاتا ہے۔ امیر خسرو کی ایجاد بتایا جاتا ہے۔

بلتستان میں رائج ان راگوں کے ناموں سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ خالص فارسی موسیقی سے مستعار ہیں۔ اگرچہ ان راگوں کے پس منظر کے بارے میں اس وقت لوگوں کے پاس خاص معلومات نہیں ہیں تاہم فن کاروں کا کہنا ہے کہ ان تمام سازوں کے پس منظر میں مقاصد و معانی ہیں اور انہیں مخصوص موقعوں پر بجایا جاتا ہے۔ شادیان اور بم حریب کی حیثیت جنگی سگنل کی ہے جبکہ ذکر ایک دعائیہ حریب بتائی جاتی ہے۔ بعض راگوں کے بارے میں روایت ہے کہ ان سے بہت سی بیماریوں کا علاج کیا جاتا تھا۔

ان کے علاوہ بعض راگ ایسے بھی ہیں جو مقامی طور پر تخلیق کردہ ہیں جن کے نام درج ذیل ہیں۔

(۱) چھوغو سیگہ (۲) ژھوزنے سیگہ
(۳) بوتی سیگہ (۴) سرقپہ رگوفچوس
(۵) مایون ژھنگ کھرلیس (۶) سحر آگاہ

ہرژے کار (رقص کی دھنیں):

بلتستان میں حریب کے علاوہ رقص کے لئے الگ دھنیں ہیں جو ''ہرژے کار'' کہلاتی ہیں۔ یہ دھنیں درج ذیل کلاسیکی، نیم کلاسیکی اور غیر کلاسیکی قسموں پر مشتمل ہیں۔

چھوغو پراسول:

یہ کلاسیکی دھن ہے جو بارہ مختلف دھنوں کا مجموعہ ہے۔ یہ ساز مقپون حکمرانوں کی فتوحات کی یاد تازہ کرتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ جب علی شیر خان انچن نے چترال فتح کرنے کے بعد جشن منایا اور اس موقع پر انچن کے بیٹوں نے اس دھن پر رقص کیا۔ اس لئے موسیقاروں کو ان شہزادوں کے احترام میں کھڑا ہو کر بجانا پڑا اور یہی رسم آج بھی رائج ہے۔ اس دھن میں کئی افراد تلوار کے ساتھ ناچتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ کچھ عرصہ قبل تک جب کبھی یہ دھن بجائی جاتی تو خانوادۂ مقپون کے شہزادے رقص کیا کرتے تھے۔

گاشوپا:

یہ بھی کلاسیکی دھن ہے جس میں نو مختلف مراحل ہیں۔ اس دھن پر بھی شمشیر رقص کیا جاتا ہے اور ناچ میں کئی افراد شامل ہوتے ہیں۔ یہ رقص پورگ (کرگل) کے گاشوپا خاندان سے منسوب ہے جسے کسی زمانے میں اپنے علاقے کی حکمرانی حاصل تھی۔ اس رقص کا دوسرا نام ''غبوس لاکھورپا'' ہے۔

میندوق بلتمو:

یہ دھن بھی کلاسیکی ہے جو تین مرحلوں پر مشتمل ہے۔ اسے ''میندوق

کار'' یعنی پھولوں کی ساز بھی کہتے ہیں اور یہ دھن بہار کی آمد کی یاد دلاتی ہے۔ بلتستان کی روایات کے مطابق جب بہار میں پہاڑوں پر پھول کھلتے ہیں تو علاقے کے جوان اور اہل ذوق افراد باہمی مشورے سے ایک دن مقرر کر کے تفریح کے لئے پہاڑوں پر جاتے ہیں اور زیر تبصرہ دھن پر ناچتے ہوئے واپس آتے ہیں۔ خپلو میں اسے باقاعدہ ایک تہوار کے طور پر منایا جاتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ رسم لداخ میں بھی مروج ہے اور وہاں پر یہ ''سنولہ'' تہوار کہلاتا ہے۔ پرانے زمانے میں اس رسم میں شریک ہر فرد اپنے عزیزوں کے لئے پہاڑی پھولوں کا گلدستہ لے کر آتا تھا۔

سنیو پا:

یہ رقص خصوصی طور پر راجاؤں کی شادیوں پر بارات لے جاتے وقت کیا جاتا ہے۔ اس دھن کے سات مختلف مراحل ہیں۔ بارات میں شامل لوگ دلہن کے آگے آگے اسی دھن پر ناچتے ہوئے چلتے ہیں۔ بلتستان کے بعض علاقوں میں اسے ''بخمو کار'' بھی کہتے ہیں۔

پھورگون کار:

یہ بھی کلاسیکی ہے اور دو مرحلوں پر مشتمل ہے۔ اس دھن کے ساتھ ناچنے والے ہاتھوں میں چادر لئے کبوتر کی اڑان کے انداز پر رقص کرتے ہیں۔ یہ ''پھوگون کار'' یعنی کبوتر رقص کہلاتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ دھن خپلو کے علاقہ بلاغر میں تخلیق ہوئی ہو۔ جیسا کہ اس دھن سے مربوط بول بھی ہے جس میں بلاغر گاؤں کا ذکر ہے۔ اس نیم کلاسیکی گیت کا متن اور ترجمہ یہ ہیں:

بلاغر یول سکل لانس بزنگ سمنسید خیوفورگون لے
نس بزنگ پوزو سے ناجینگ ہرژیس چی تونگ خیوفورگون لے
جینگ ہرژیس مہ تنکنہ جینگمہ چق توک خیوفورگون لے

بلاغر یول سکل لانس بزنگ سمنسید خیوفورگون لے
نس بزنگ پوزو سے ناکنگ ہرژیس چی تونگ خیوفورگون لے
کنگ ہرژیس مہ تنکنہ کنگمہ چقتوک خیوفورگون لے

بلاغر یول سکل لانس بزنگ سمنسید خیوفورگون لے
نس بزنگ پوزو سے ناشوق ہرژیس چی تونگ خیوفورگون لے
شوق ہرژیس متنکنہ شوقپا چقتوک خیوفورگون لے

ترجمہ:

اے نیلے کبوتر! بلاغر بستی کے مرکز میں جو کی فصل پک گئی ہے
اے نیلے کبوتر! جو کا دانہ کھا کر گردن ناچ شروع کر
اے نیلے کبوتر! گردن نچوانے کی صورت میں گردن توڑ دوں گا

اے نیلے کبوتر! بلاغر بستی کے مرکز میں جو کی فصل پک گئی ہے
اے نیلے کبوتر! جو کا دانہ کھا کر پاؤں ناچ شروع کر
اے نیلے کبوتر! ٹانگوں سے نہ ناچنے کی صورت میں ٹانگیں توڑ دوں گا

اے نیلے کبوتر! بلاغر بستی کے مرکز میں جو کی فصل پک گئی ہے
اے نیلے کبوتر! جو کا دانہ کھا کر پروں سے ناچنا شروع کر
اے نیلے کبوتر! پروں سے نہ ناچنے کی صورت میں پر توڑ دوں گا

تھین کار:

یہ کلاسیکی رقص چھ دھنوں کا مجموعہ ہے اور اس میں صرف دو آدمی تلوار کے ساتھ رقص کرتے ہیں۔

بورا کار:

یہ بھی کلاسیکی ہے اور پانچ ٹکڑوں پر مشتمل ہے۔ اس دھن کے ساتھ سات افراد شمشیر رقص کرتے ہیں۔

پھوتونگ کار:

یہ نیم کلاسیکی ساز ہے۔ عہد رفتہ میں فاتح راجے مفتوحہ راجاؤں کو ذلیل و رسوا کرنے کے لئے اسی دھن پر نچاتے تھے۔ اس وقت مغلوب راجے شرمندگی سے آستینوں سے اپنا منہ چھپاتے تھے۔ اس لئے اس کا نام فوتونگ کار (آستینوں کی ساز) پڑ گیا۔ اس رقص کا مظاہرہ مقپون خاندان کے شہزادوں کی موجودگی میں نہیں کیا جاتا ہے کیونکہ اس کو مقپون حکمرانوں کی 1840ء میں ڈوگروں کے ہاتھوں شکست کی علامت سے منسوب کر کے امیر حیدر نامی لوک گیت کو اس دھن کے ساتھ منسلک کیا گیا ہے۔ آج کل یہ دھن اور رقص ''مقپونی فتونگ کار'' کے نام سے مشہور ہے۔

لم کار:

اسے لمنہ بھی کہتے ہیں اور یہ ساز اس وقت بجائی جاتی ہے جب راجے

اپنی لشکر کے ساتھ راہ چلتے ہیں۔ گویا یہ ایک قسم کی سفری دھن ہے۔ اس کی درج ذیل چھ قسمیں اب بھی مروج بتائی جاتی ہیں۔ (۱) رگیالم چھنمو (۲) چھوغولم کار (۳) مقپون ستن لاشخھ (۴) رلٹا خومبو (۵) بوتی لم کار (۶) نیوکار

ان میں سے ہر دھن کا الگ پس منظر اور معانی ہیں اور راجگی نظام کی برطرفی سے قبل ان کے سفر کی نوعیت کے مطابق یہ دھنیں بجائی جاتی تھیں۔ اول الذکر پانچ دھنیں آج کل پولو ٹیم کے گراونڈ کی طرف چلتے وقت بجائی جاتی ہیں جبکہ موخرالذکر ''نیوکار'' کی دھن اس وقت بجائی جاتی تھی جب شاہی لشکر بذریعہ کشتی دریا عبور کر رہے ہوں۔ بتایا جاتا ہے کہ ملاح اور لشکری اس دھن پر کشتی کے چپو چلاتے تھے۔

لنگ کار:

یہ شکاری دھن ہے۔ پرانے زمانے میں بلتستان کی روایات کے مطابق عوامی سطح پر شکار کھیلا جاتا تھا۔ جب راجہ اپنے لاؤ لشکر کے ساتھ مارخور، اڑیال اور ہرن کے شکار کھیلنے جاتے تو ہانکا اور گھیراؤ کے دوران جو دھن بجائی جاتی تھی وہ ''لنگ کار'' کہلاتی ہے۔

افغانی:

نام سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ساز اور رقص افغانستان سے یہاں منتقل ہوئے ہوں لیکن اب تک ایسا کوئی تاریخی ثبوت نہیں ملا ہے۔ بہر حال یہ یہاں مروج ایک منفرد قسم کا رقص ہے۔ جس میں صرف ایک آدمی دونوں ہاتھوں میں تلوار اٹھائے ناچتا ہے۔ اس ناچ کا ایک ماہر رقاص دونوں ہاتھوں سے تلواروں کو اتنی برق رفتاری سے چلاتا ہے کہ دیکھنے والوں کی آنکھیں خیرہ ہو جاتی ہیں۔ یہ رقص دراصل ایک قسم کا جنگی کرتب ہے جس میں خود حفاظتی کا مظاہرہ کیا جاتا ہے۔

چلا ہو:

یہ الوداعی دھن ہے جو نہایت دلسوز ہوتی ہے۔ عہد رفتہ کے دوران بلتستان میں شاہی محل سے کسی دلہن کی رخصتی کے موقع پر یہ دھن خصوصی طور پر بجائی جاتی تھی۔ رخصتی کے وقت دلہن کو پالکی میں بٹھانے کے لئے زنان خانے میں لے جاتے تو وہاں بڑے غم واندوہ کا سماں ہوتا تھا۔ خاندان کے مرد وخواتین اور دلہن اس جدائی کے موقع پر چیخ چیخ کر روتے تھے۔ چونکہ محل کے باہر لوگوں کا جمغفیر ہوتا تھا اس لئے خواتین کی چیخ وپکار کی آوازیں باہر کے لوگوں تک پہنچنے سے روکنے کے لئے ''چلا ہو'' نامی دھن بجائی جاتی تو اس موقع پر موجود اپنے پرائے سب کی آنکھیں پرنم ہو جاتی تھیں۔ اس دھن کے بول بھی ہیں۔ جو بعض دفعہ خاص لوگوں کی شادیوں پر باراتیوں کی روانگی کے وقت گائے جاتے تھے۔

ستغراء:

پولو کھیل میں گول کرنے کے بعد جب کوئی کھلاڑی گیند کو لے کر مخالف سمت میں گھوڑے کو سرپٹ دوڑاتے ہوئے پولو گراونڈ کے عین درمیان پہنچ کر ''ڈافوق'' یعنی للکارتا ہے تو اس موقع پر سازندے بڑے جوش وخروش سے یہ دھن ''ستغراء'' بجاتے ہیں۔

دھن ''ستغراء'' کی قسمیں:

(الف) تاجور:

یہ دھن صرف راجاؤں اور ولی عہد کے لئے مخصوص ہے اور اس دھن کے ساتھ کئی ''پورغو'' یعنی کرنائی بجائی جاتی تھی۔ اب کرنائی ناپید ہے۔

ب) بختاور:

یہ دھن حکمران خاندانوں کے دیگر افراد کا چو یا ارغون وغیرہ کے لئے بجائی جاتی ہے اس دھن کے ساتھ ایک کرنائی بجائی جاتی ہے۔

ج) بخشاور:

یہ دھن وزیروں اور اعلیٰ عہدیداروں کے لئے بجائی جاتی ہے۔ روایات کے مطابق اس دھن کے ساتھ کرنائی بجانے کا رواج نہیں ہے۔ یعنی بزرگوں کا کہنا ہے کہ راجگی دور میں سلطنت کے بارہ وزیروں یعنی ''پاچونس'' کے ہر خاندان کے لئے الگ الگ دھنیں مخصوص تھیں لیکن اس وقت یہ سب ناپید ہیں اور آج کل کے موسیقاران کے نام سے بھی نابلد ہیں۔

د) گلاور:

یہ دھن عام طبقہ کے کھلاڑیوں کے لئے بجائی جاتی ہے۔

ر) ٹھامہ ننگ:

پولو کے نویں گول ہونے پر ''ڈافوق'' کے ساتھ ہی نقارچی مخصوص اختتامیہ دھن ''ٹھامہ ننگ'' بجا کر کھیل کے اختتام کا اعلان کرتا ہے۔

س) طنزیہ دھنیں:

پولو کھیل کی ہار جیت پر طنز کرنے کے لئے بلتستان کے ہر علاقے میں الگ الگ موسیقی وضع ہے جنہیں پولو کے اختتام کے فوراً بعد بجائی جاتی ہیں۔ سکردو



پولو میچ کے دوران موسیقار ڈرم، نقارہ اور شہنائی بجا رہے ہیں

میں ہارنے والی ٹیم کے لئے ''شاہ بہرام چو'' نامی لوک گیت کی دھن بجائی جاتی ہے جو چلو کے یبگو خاندان کے لئے طنز ہے اور اس دھن پر جیتنے والی ٹیم کے کھلاڑی رقص کرتے ہیں۔ اسی طرح چلو میں ہارنے والوں کے لئے ''مقپونی فوتونگ کار'' نامی دھن بجائی جاتی ہے جس میں مقپون خاندان کی شکست کا طعنہ موجود ہے اور ایک روایت کے مطابق ''شہ ختون'' نامی دھن بھی بجائی جاتی ہے۔ وادی رونگ یل میں ہارنیوالی ٹیم کے لئے رتبہ کے مطابق مختلف لوک دھنیں رائج ہیں۔ اگر ہارنے والی ٹیم میں کوئی صاحب عزت و مرتبت کھلاڑی ہو تو اسے کیسر کی لوک داستان سے اقتباس ''فوروق پون پون'' اور ''می ژھل مورگی'' والے منظوم حصے کی دھنیں بجائی جاتی ہیں جبکہ عام کھلاڑیوں کے لئے کئی دیگر ساز مخصوص ہیں۔

بلتستان میں مذکورہ سازوں کے علاوہ ''جنگ ہرژلیس'' (گردن رقص جس میں رقص ابتدائی مرحلہ میں صرف گردن کو حرکت دیتے ہیں)' خوشال پا (اس میں سات یا دس سے زیادہ لوگ حصہ لیتے ہیں)' چوروکپہ کار' ہلاٹو کار اور شولی نامی قدیم ناچ اور دھنیں قابل ذکر ہیں۔

موسیقی کے آلات اور ان کا استعمال:

بلتستان میں مروج موسیقی کے آلات درج ذیل ہیں۔ جن میں بعض آلات مثلاً بانسری' دف اور ستار وغیرہ بقول کاچو سکندر خان سکندر تبتی تہذیب کی دین ہیں۔ جبکہ دردوں نے ڈھول اور سرنائی وغیرہ کا اضافہ کیا۔

۱۔ ڈانگ (بڑا ڈھول):

(بڑا ڈھول) اس کے دونوں طرف کچا چمڑہ لگا ہوتا ہے جسے ایک چکر دار اور ایک سیدھی چھڑی سے جبکہ چند سازوں پر ہتھیلی سے ماکر اور بائیں ہاتھ کی درمیانی انگلی سے رگڑ کر بجایا جاتا ہے۔

۲۔ ڈامن (طبلہ):

(طبلہ) یہ نقارے کی شکل میں چھوٹے ڈھول کی جوڑی ہوتی ہے مگر جسامت میں یہ نقارے سے بہت چھوٹا ہوتا ہے۔ اس کی باڈی تانبے یا پیتل کی ڈونگہ نما ہوتی ہے اور اس پر کچا چمڑہ لگا ہوتا ہے۔ ان میں سے ایک حصہ آبی اور دوسرا آتشی کہلاتا ہے جن میں سے ایک موٹی آواز اور دوسرا پتلی آواز پیدا کرتا ہے جنہیں مقامی اصطلاح میں ''ٹِنگ ٹِنگ'' اور ''بُونگ بُونگ'' کہتے

ہیں۔ڈامن کو ایک فٹ لمبی چھڑیوں سے بجایا جاتا ہے جسے بلتی زبان میں ''ڈانگ شینگ'' کہتے ہیں۔

۳۔خلنگ بو(بانسری):

(بانسری) اس کی دو قسمیں ہیں۔عام طور پر ''چک خلینگ'' یعنی ایک شاخہ بانسری ہوتی ہے اور کبھی کبھار ''ژھنگ خلینگ'' یعنی دو شاخہ بھی ہوتی ہے۔ اب دو شاخہ بانسری کہیں نظر نہیں آتی۔

۴۔سُرنا(سرنائی):

(شہنائی) اس کی بھی دو قسمیں ہیں۔ایک تو جوڑ والی شہنائی ہوتی ہے جو عام استعمال میں پائی جاتی ہے اور دوسری قسم بغیر جوڑ کے ہوتی ہے جو ''آبری'' کہلاتی ہے۔آبری سُرنا زیادہ تیز اور معیاری سمجھا جاتا ہے۔

۵۔پورغو(کرنا):

(کرنا) یہ ایک بہت بڑا اور لمبا بگل ہوتا ہے جس کی لمبائی پانچ سے آٹھ فٹ تک اور آگے سے تقریباً ایک سے لے کر دو فٹ قطر کا ہوتا ہے۔اس کی آواز بڑی ہیبت ناک ہوتی ہے اور پرانے وقتوں میں یہاں جنگوں میں اس کا استعمال ہوتا تھا۔ پولو کے دوران بھی اسے استعمال میں لایا جاتا تھا لیکن اب یہ متروک ہے۔

۶۔چنگ:

یہ دھات کی دو پلیٹیں ہوتی ہیں جنہیں ''ڈانگ'' کی ساز پر آپس میں ٹکرا کر ایسا بجایا جاتا ہے جیسے تالی۔اس کا استعمال بہت کم ہے۔ویسے بھی یہ یہاں کے قدیم آلات موسیقی میں شامل نہیں۔

۷۔چنگ داؤد:

یہ موسیقی کا چھوٹا سا آلہ ہے جس کا ایک حصہ دانتوں میں دبا کر اور دوسرے حصے کو انگلی سے مار کر بجایا جاتا ہے۔چنگ داؤد چرواہوں کا مقبول آلۂ ساز ہے۔

مقامی حکمرانوں کے زوال اور ان کی برطرفی کے ساتھ ساتھ اس وقت کی مذکورہ لوک ساز اور رقص کو بھی خیر باد کہہ رہے ہیں۔ان میں سے بہت سے سازوں کے صرف نام باقی ہیں۔جدت پسندی کے زد میں آ کر اب موسیقی کے طریقے یکسر بدل گئے ہیں۔ بلتستان میں آج کل کی موسیقی میں ہارمونیم کا استعمال لازمی تصور کیا جاتا ہے جس کی ابتدا غالباً قیام پاکستان سے کچھ عرصہ قبل ہوئی تھی۔اب جدید موسیقی کے آلات میں ہارمونیم اور ڈھول کا استعمال عام ہے۔بلتستان کے جدید رنگ میں گانے والے اور ہارمونیم نواز حضرات میں غلام مہدی مرغوب، غلام محمد بسمل، محمد عبداللہ اور فرمان علی کے نام قابل ذکر ہیں۔

کلاسیکی لوک گیت:

بلتستان کی قدیم شاعری کو ''رگیا خلو'' کہتے ہیں۔یہ دراصل کلاسیکی لوک گیت ہیں۔یہ صنف سخن آج کل کی نظم معریٰ کی طرح ردیف کی قید سے یکسر آزاد ہے اور اسی صنف سخن کو آج تک قبول عام کا درجہ حاصل ہے۔ان گیتوں کے پس منظر میں کوئی نہ کوئی عشقیہ، رزمیہ یا ناصحانہ پس منظر ضرور ہوتا ہے۔ان میں جدائی کی داستان، بے وفائی کے واقعات، محبوب کا انتظار، والدین کی نصیحتیں، اشارہ کنایہ اور تاریخی واقعات موجود ہیں۔ان لوک گیتوں میں ماں بیٹے کی فرقت، ساس بہو کی کشیدگی کے پر درد واقعات اور بہن بھائی کی اسیری کی داستان بھی پائی جاتی ہیں۔ غرض انسانی زندگی کے تمام پہلو انہی گیتوں میں موجود ہیں۔یہ لوک گیت بلتستان کے محنتی، سادہ لوح اور وفادار باسیوں کے دلوں سے نکلی ہوئی بے ساختہ آواز و کلمات ہیں۔عہد رفتہ میں بلتستان کے لوگ ان گیتوں سے پیام رسانی کا کام بھی لیتے تھے اور علاقے کے عمر رسیدہ لوگ اس قسم کی پیام رسانی سے اب بھی واقف ہیں اور اس کے لئے لوک گیت کے پس منظر اور اس سے وابستہ واقعات کی روشنی میں نہایت آسانی سے پیغام بھیجنے والے مافی الضمیر کو سمجھ سکتے ہیں۔اس سلسلے میں اگر بے وفائی کی شکایت مقصود ہو تو ''شینگ کھن کوفہ پی خلو'' بطور تحفہ بھیجا جاتا ہے۔''شینگ کھن کوفہ'' یعنی کوفی بڑھئی کا نام سن کر ہی دوسرے شخص کا ذہن فوراً اس واقعے کی طرف منتقل ہو جاتا ہے جو اس لوک گیت سے وابستہ ہے۔

شینگ کھن کوفہ:

واقعہ یہ ہے کہ ایک ترکھان نے جوانی میں ایک خوبصورت لڑکی کو اپنے دام محبت میں پھنسا کر اس سے شادی کر لی لیکن جب اس کی جوانی ڈھلنے لگی تو اس بے وفا شوہر نے اس سے آنکھیں پھیر لیں اور اس کو طلاق دے دی۔اس پر مطلقہ بیوی نے اپنے خاوند کی ہجو گوئی کرتے ہوئے یہ گیت گایا جس کا ترجمہ و مفہوم یہ ہیں۔

اے میرے بے وفا کوفہ والے ترکھان! جب میں نوخیزی کے عالم میں کلی کی مانند تھی تو تُو نے مجھے ڈالی سے توڑ کر سینے سے لگایا اور اب آدھے بال سفید ہونے پر مجھے چھوڑ دیا۔تیری بے وفائی دیکھ کر کس پر بھروسہ کیا جا سکتا ہے۔جب میرا منہ دانتوں سے بھرا ہوا تھا، جب میرا گھرانہ آباد تھا اور میرے سارے عزیز زندہ تھے تو اس

وقت تم مجھے بیاہ کر لائے۔ اب میرا منہ دانتوں کے گرنے کی وجہ سے خالی ہوگیا' میرے سارے عزیز ختم ہوگئے اور میرا گھر ویران ہوا تو تم نے مجھے دھتکار دیا۔ میرے اس کوفہ والے ترکھان (کی بے وفائی) کو دیکھ کر اب کس پر بھروسہ کیا جاسکتا ہے۔

لنگپا ارزو:

یہ بلتستان کا مقبول عام لوک گیت ہے جس کے ساتھ ارزو نامی ایک سچے عاشق کی جانبازی کی داستان وابستہ ہے۔ ارزو علاقہ رونگ یول کا نامور شکاری تھا۔ ایک دفعہ ارزو کسی مارخور کے تعاقب میں پہاڑ پر چڑھتا چلا گیا اور ایک ایسی تنگ گھاٹی میں پھنس گیا۔ وہ نہ آگے بڑھ سکتا تھا اور نہ پیچھے۔ اس نے وہاں سے نکلنے کی بڑی کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہوا۔ ارزو کو یقین ہوگیا کہ اب وہ کسی صورت سے بھی نیچے نہیں پہنچ سکتا اور اب اس کی موت اسی پہاڑی پر واقع ہوگی۔ یہ خیال آتے ہی اس نے چیخ چیخ کر اپنی آخری خواہش کا اظہار کرنا شروع کیا۔ گاؤں والوں نے آواز سنی اور سب اس جگہ جمع ہوگئے۔ ان میں ارزو کی رفیقۂ حیات بھی تھی جس سے اسے بے پناہ محبت تھی۔ ارزو بھی یہی چاہتا تھا کہ اس کی بیوی کو دامن کوہ میں بلایا جائے تاکہ وہ آخری بار اسے دیکھ کر دلجمعی سے جان دے سکے۔

اس وقت سارے گاؤں والے بھی بے بس تھے کیونکہ پہاڑی کی اس بلندی تک کوئی بھی نہیں پہنچ سکتا تھا جہاں ارزو پھنسا ہوا تھا۔ ارزو کی بیوی نے اسے ہمت دلانے کی بہت کوشش کی۔ اس نے ارزو سے مخاطب ہوکر جو باتیں کیں وہ گیت کی شکل اختیار کر گئیں۔ اس گیت کا مفہوم کچھ اس طرح ہے۔

اے نامور شکاری ارزو! تم فلک بوس چٹانوں کو روندنے والے ہو۔ تم چوٹیوں اور درّوں کو پھلانگنے والے ہو! ہمت کرو اور نیچے اتر آؤ۔ تمہارے دشمن کے علاوہ پہاڑ کے ہرن' مارخور اور رام چکور بھی تمہارا تماشا دیکھ رہے ہیں۔ میرے بے حوصلہ ارزو تم میں حوصلہ نہیں۔ اگر ہم دونوں ایک جان دو قالب ہیں تو تم میری چادر میں چھلانگ لگاؤ۔

ارزو نے بیوی سے چادر پھیلانے کو کہا۔ اس نے پہلے اپنی بندوق پھینک دی۔ بندوق پتھروں پر گر کر اس کے پرخچے اڑ گئے اور کندا آ کر اس کی محبوب بیوی کی گود میں گرا۔ اس کے بعد ارزو نے چھلانگ لگادی۔ سینکڑوں فٹ کی بلندی سے گر کر ارزو کے جسم کے ٹکڑے ٹکڑے ہوگئے اور اسکا دل اس کی بیوی کے گود میں آ گرا۔ عاشق کے دل بے قرار کے لئے دامن محبوب سے بہتر جگہ اور کون سی ہوسکتی ہے۔ یہ گیت دراصل ارزو کا مرثیہ ہے جسے سننے والے اشک بہائے بغیر نہیں رہ سکتے۔

سکنے:

کسی بھی معاشرے میں ساس اور بہو کی رقابتوں کے نتائج بڑے دلخراش نکلتے ہیں۔ بلتی زبان میں سکنے کا گیت ساس اور بہو کے درمیان رقابت کے پس منظر میں تخلیق ہوا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ شگر کے تسر گاؤں میں سکنے نام کی ایک خوبصورت دوشیزہ تھی جس کی شادی اسی گاؤں کے ایک جوان سے ہوگئی۔ شوہر کو سکنے سے بڑی محبت تھی جو ساس پر ناگوار گزرتی تھی۔ ساس نے ان دونوں میاں بیوی کی محبت میں پھوٹ ڈالنے کی بڑی کوشش کی مگر کامیاب نہ ہوئی اور بیٹے کے دل میں بیوی کی محبت روز بروز بڑھتی گئی۔ ماں نے ان دونوں کی محبت کو ختم کرنے کے لئے ایک گھناؤنی سازش کی۔ ایک دن ماں نے بیٹے کو شکار کے لئے بھیجا۔ شام کو جب بیٹے کی واپسی کا وقت آیا تو ساس نے بہو سے کہا کہ تم جا کر کھیتوں میں جاتے ہوئے پانی کو بند کر آؤ۔ بہو کھیتوں کی طرف نکلی۔ تھوڑی دیر بعد بیٹا شکار سے واپس آیا تو ماں نے کہا کہ کھیتوں میں ریچھ گھس گیا ہے اور تمام فصل تباہ کر رہا ہے تم کھیتوں میں جا۔ اور اس ریچھ کو ختم کردو۔ بیٹے نے بندوق اٹھائی اور کھیتوں کی طرف چل دیا۔ جب وہ کھیتوں کے نزدیک پہنچا تو اس نے شام کے ملگجے اندھیرے میں ایک ریچھ جیسی چیز کو کھیتوں میں پھرتے دیکھا۔ اس نے نشانہ لے کر فائر کر دیا اور وہ ریچھ نما چیز ایک چیخ مار کر گر گئی۔ وہ جب دوڑ کر وہاں پہنچا تو دیکھا کہ اس کا نشانہ ریچھ نہیں بلکہ اس کی اپنی چہیتی بیوی تھی۔ اس نے اپنی بیوی کے سر کو گود میں رکھ کر پوچھا کہ تم اس وقت یہاں کیسے آئی تھی۔ سکنے نے جواب دیا کہ ماں نے مجھے پانی بند کرنے کے لئے بھیجا تھا اور یہاں کوئی ریچھ نہیں آیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی سکنے کی روح جسم سے نکل گئی۔ بیٹے کو جب ماں کی اس بھیانک سازش کا علم ہوا تو اسے اپنی ماں سے سخت نفرت ہونے لگی۔ سکنے کی لاش پر بین کرتے ہوئے جو الفاظ اس کے منہ سے بے ساختہ نکلے گیت کی شکل میں آج بھی موجود ہے۔ غمزدہ شوہر اپنی بیوی کی نعش پر فریاد کرتے ہوئے کہتا ہے کہ میں اب گاؤں گاؤں' قریہ قریہ مسجدیں اور خانقاہیں تعمیر کرتا پھروں گا' میں ہر جگہ رفاہ عامہ کے لئے کام کرتا رہوں گا اور میں قرآن کی تلاوت کرتا پھروں گا۔ ان تمام نیک کاموں کا اجر وثواب میری محبوب بیوی سکنے کی روح کو ملے جو مجھ پر عاشق تھی اور اس کی موت میرے لئے روگ بن گئی ہے اور ساتھ ہی میری یہ دعا بھی ہے کہ سکنے کو مجھ سے جدا کرنے کی سزا اللہ تعالیٰ میری ماں کو جلد دے دے۔

ستروغی یتو:

اس گیت میں ''ستروغی یتو'' ایک علامتی نام ہے جو جان کی ساتھی کہلاتا

ہے۔ پہلا ساتھی دوسرے ساتھی سے مخاطب ہوکر زندگی کے بے ثباتی سے آگاہ کرتا ہے۔ روایات گو حضرات اس گیت کا خالق ایک عورت کو قرار دیتے ہیں جو اپنے شوہر کے آوارہ مزاج کی شاکی ہے۔ اس گیت کے بارے میں بلتستان کی ہر وادی کے باشندے دعویدار ہیں کہ اس گیت نے ان کی وادی میں جنم لیا ہے۔ یہ بلتستان بھر میں مقبول ہے۔ اس گیت کے متن کا ترجمہ کچھ اس طرح ہے۔

جب پھول کھلتے ہیں تو نیچے سے اوپر کھلتے چلے جاتے ہیں لیکن جب مرجھانے لگتے ہیں تو اوپر سے نیچے کو مرجھاتے چلے جاتے ہیں۔ مرد کا شباب تین ''لوسکور'' (تبتی کیلنڈر کے تحت بارہ سال کا ایک لوسکور ہوتا ہے) تک' ہر عورت کا شباب تین بچے جننے تک' خوبصورت پھول کی زندگی تین صبح تک' طاقتور گھوڑے بھی پولو کے تین گیم سے زیادہ نہیں کھیل سکے' تندو تیز گھوڑی تین ''ڈفوق'' تک دوڑ سکتی ہے' گھر بار نہ ہونے کا احساس شام ڈھلنے کے بعد ہوتا ہے اور اولاد سے محرومی کا احساس بڑھاپے میں ہوتا ہے۔ اے میرے ساتھی! میرے ساتھی میں تجھے سلام کہتی ہوں۔

لنگ دوکپا:

لنگ دوکپا بلتستان کی وادی رونگ یل بائچہ کے ایک رئیس خاندان سے تعلق رکھنے والا جوان تھا۔ اس کی دو بیویاں تھیں۔ بلتی معاشرے میں یہ بات ہر شخص کی ورد زبان ہے کہ ''بلتھو دی زونگ'' یعنی پہلی بیوی وفادار ہوتی ہے۔ لیکن لنگ دوکپا نے پہلی بیوی کے ہوتے ہوئے اپنی پسند سے ایک اور لڑکی سے شادی کر لی اور اس کو خوش رکھنے کے لئے مصروف رہا۔ اس طرح اس نے اپنی پہلی بیوی سے تعلق تقریباً چھوڑ دیا۔ وہ بے چاری پریشانی میں وقت گزارنے لگی۔ اتفاقاً کسی جرم کی پاداش میں حاکم وقت نے لنگ دوکپا کو قید کر دیا۔ اس وقت پہلی بیوی نے اپنی سوکن سے کہا کہ ہم لنگ دوکپا کی خبر لینے چلتے ہیں۔ پہلی بیوی پیٹھ پر بچے کو اٹھائے اور ہاتھ میں ''رینگ سکور'' میں کھانے لے کر گئی۔ دوسری بیوی بھی اس کے ساتھ گئی۔ شوت گاؤں کے ساتھ واقع موجودہ پل کی جگہ اس وقت قدیم طرز کا جھالہ پل بنا ہوا تھا جسے ''چولی فروی زمبہ'' کہتے تھے۔ اس جھالہ سے دریا کو عبور کرنا جوئے شیر لانے کے مترادف تھا۔ وہاں پہنچنے کے بعد لنگ دوکپا کی دوسری بیوی نے اپنے خاوند کی محبت کو ٹھکرا دیا اور واپس ہوگئی۔ لیکن پہلی بیوی جس کے دل میں اپنے خاوند کی محبت کا شعلۂ مفارقت بھڑک رہا تھا اس خطرناک پل کو عبور کر کے میندی پہنچ گئی۔ اپنے خاوند سے ملنے کے بعد اس عورت نے رونگ یل کے مقپون راجہ کے حضور یہ گیت گایا جو اس کے خاوند کی رہائی کے لئے درخواست کی صورت میں ہے۔ اس گیت میں بیوی نے اپنے خاوند کو اس کی بے وفائی کا احساس دلایا ہے۔ اس کی چہیتی بیوی (سوکن) پر اس کے جیل جانے کا کوئی اثر نہ ہونے اور گاؤں میں خوشی خوشی پھرنے کی شکایت کی ہے۔ نیز اس نے اس گیت کے ذریعے لنگ دوکپا کی شان و رتبہ سے بھی آگاہ کیا ہے۔ اس گیت کا ترجمہ ملاحظہ کیجئے۔

۱۔ اگر میں ستم رسیدہ کہہ دوں کہ میں تمہارے متعلق نہیں سوچتی تو یہ غلط ہوگا کیونکہ آئینے کی طرح میرا شفاف دل باز نہیں رہتا۔

۲۔ اگر میں یہ کہہ دوں کہ میں تمہاری طرف نہیں دیکھتی تو یہ غلط ہوگا کیونکہ میری شاہین صفت آنکھیں تمہیں دیکھنے کے لئے بے قرار رہتی ہیں۔

۳۔ اگر میں یہ کہہ دوں تو غلط نہ ہوگا کہ بائچہ کے چوپال پر سارے جوان جمع ہوکر تیر اندازی کرتے ہوئے خوشی خوشی پھرتے ہیں۔

۴۔ میرے لنگ دوکپا! تمہیں وہاں (چوپال پر) بیٹھنے کی عادت تھی لیکن اب سنا ہے کہ برق مقپون تم سے ناراض ہوکر تمہیں اسیر کیا جا رہا ہے۔

۵۔ اگر میں یہ کہہ دوں تو غلط نہ ہوگا کہ تمہاری وہ بیوی جسے تم بے حد چاہتے تھے وہ تو بناؤ سنگھار کر کے ہنستی کھلکھلاتی گھومتی رہتی ہے۔

۶۔ اگر میں یہ کہہ دوں تو غلط نہ ہوگا کہ تمہاری وہ بیوی جو تمہیں پسند نہ تھی وہ تو پیٹھ پر بچہ اور گود میں ''رینگ سکور'' یعنی کھانے کا برتن اٹھا کر ''چولی فرو'' نامی خطرناک ''ہلچو کزدم'' یعنی جھالہ پل پار کر کے تمہیں کھانا پہنچاتی ہے۔

۷۔ میرے برق مقپون! اگر لنگ دوکپا کے لئے یہ قید خانہ عبادت خانہ بنایا جائے تو میں برق مقپون کے حق میں لافانی زندگی کے لئے اللہ تعالیٰ سے دعا کرتی۔

بیاغہ نقپو:

کہا جاتا ہے کہ علی شیر خان انچن کے دور سلطنت میں سکردو ایک سرسبز و شاداب ملک تھا۔ کھیپ چونگ (حسین آباد) سے کچورہ تک کی پوری آبادی ہموار اور زرخیز تھی جس میں پھلدار درختوں کی بڑی کثرت تھی۔ موضع سندوس سے ہوائی اڈہ کے درمیان موجودہ وسیع و عریض صحرا ایک ایسا بسا بسایا قصبہ تھا جو انچن کی وفات کے بعد عظیم سیلاب کا نتیجہ ہے۔ اس لوک گیت میں سے چند اشعار جو اس وقت دستیاب ہیں کے ترجمے ذیل میں ملاحظہ کریں۔

۱۔ جب بیاغہ نقپو نامی صحرا فیروزہ کی طرح شاداب سبزہ زار تھا اس وقت مقپون علی شیر خان انچن لیہ پورانگ کو اپنی قلمرو میں شامل

کرنے کا قابل بنا۔

۲۔ جب بیانہ نقپو نامی صحرا میں ''دستہ چھومک'' نامی چشمہ ابلتا تھا تو اس وقت مقپون علی شیر خان انچن بروشال (چترال) کو اپنے زیر نگیں لانے میں کامیاب ہوا۔

۳۔ جب میرا آبائی وطن سکردو دودھ کا تالاب بنا ہوا تھا تو اس وقت علی شیر خان انچن نے چہار اطراف میں فتوحات کیئے۔

لوک لباس، زیورات اور دیگر سامان آرائش

دنیا کے ہر معاشرے میں اپنے ماحول اور موسم کے مطابق مخصوص لباس کا رواج ہوتا ہے۔ بلتستان کے لوگوں کا لباس یہاں کے شدید سرد موسمی حالات کے پیش نظر گرم اونی اور نہایت سادہ ہے۔ جس طرح پچھلے چالیس پچاس سالوں کے دوران دیگر شعبہ ہائے زندگی میں معاشرتی ارتقاء کے ساتھ ساتھ تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں اسی طرح یہاں کے لباس اور زیورات پر بھی وقتاً فوقتاً بیرونی اثرت نمایاں طور پر مرتب ہوتے رہے ہیں۔ آج کل تو زمانہ اتنا بدل گیا ہے کہ بلتستان کا کوئی فرد لباس کے حوالے سے پہچاننا اب مشکل ہے کیونکہ مقامی لوک لباس اب متروک ہو چکے ہیں۔ البتہ عہد رفتہ میں بلتستان کے مرد اُونی کُرتے، شلوار، ٹوپی اور لوئی پہنتے تھے جو رنگ میں سفید یا بھورے ہوتے تھے۔ آج بھی یہاں پٹو کے کئی معیار ہیں جو علاقہ خپلو میں بنائی جاتی ہے اور اس سے مقامی ٹوپی اور کوٹ تیار کیئے جاتے ہیں۔ اون کے عام پٹو سے جو کرتہ تیار کیا جاتا ہے وہ تین چار سال سے بھی زیادہ عرصہ تک استعمال میں لایا جاتا ہے اور یہ کرتہ انتہائی ڈھیلا ڈھالا قسم کا ہوتا تھا۔

بلتستان کے قدیم روایتی ملبوسات میں اونی شال (لوئی) جسے بلتی زبان میں ''قار'' کہتے ہیں بہت زیادہ اہمیت کا حامل ہے اور اس کا استعمال بھی بہت زیادہ ہے۔ بالخصوص بزرگ لوگ مجلسوں میں جاتے ہوئے اسے اوڑھ کر جانا آداب مجلس میں شمار کرتے ہیں۔ پرانے وقتوں میں مردوں کے کاندھے پر ایک لوئی لازماً ہوتی تھی۔ زمین پر بیٹھنا ہو تو اسے بچھا لیا جاتا، سودا سلف اس میں باندھ کر لاتے، دھوپ سے بچنے کے لئے اسے بطور صافہ سر سے لپیٹ لیتے۔ گویا یہ ایک کثیر المقاصد پوشاک ہے جو بیک وقت کمبل بھی ہے اور بستر بھی، کوٹ اور چھتری کا کام بھی دیتا ہے۔ بلتستان کے شہری علاقوں میں ''قار'' کا استعمال متروک ہو چکا ہے جبکہ دیہاتوں میں بھی اس کے استعمال کا رجحان بہت کم ہوتا جا رہا ہے۔

بلتستان میں کوٹ پہننے کا رواج غالباً قیام پاکستان کے بعد سے شروع ہوا ہے۔ گزشتہ وقتوں میں سردی سے بچنے کے لئے یہاں کے لوگ بھیڑ کی کھال سے پوستین بنا کر پہن لیتے تھے جو آج کل کے واسکٹ کے مترادف تھا۔ اب اونی پٹو اور کپڑے سے بنے ہوئے واسکٹ پہننے کا رجحان بڑھ گیا ہے۔ بلتستان میں قدیم مردانہ ٹوپی قبہ نما اور منفرد حیثیت کی حامل ہے جو اس وقت متروک ہو چکی ہے۔ البتہ بعض لوگ شوقیہ اور فیشن کے طور پر اسے پہنتے ہیں۔ آج سے تیس چالیس سال قبل عورتوں کے علاوہ مردوں کا بھی ننگے سر رہنا اور بالخصوص محفلوں میں جانا انتہائی معیوب سمجھا جاتا تھا جبکہ بہار کے موسم میں لوگ عام طور پر ننگے پیر چلتے پھرتے تھے۔ آج کل جناح کیپ، لیاقت کیپ اور گلگتی ٹوپی پہننے کا رجحان زیادہ ہوا ہے اور دیہاتوں میں معمر لوگ گرم کنٹوپ پہنتے ہیں۔ سید ہو تو عام طور پر سیاہ دستار اور امتی عالم ہو تو سفید دستار باندھتے ہیں۔ کشمیری خاندانوں سے تعلق رکھنے والے بعض عام لوگ بھی سفید کلاہ باندھتے ہیں۔

قدیم بلتستان میں عورتیں اونی پٹو کو کالا رنگ دیتی اور لمبا کُرتا بنا کر پہن لیتی تھیں جس کی وضع قطع خاصی ڈھیلی ڈھالی ہوتی تھی۔ مرد ہو یا عورت دونوں کے کرتے ایک ہی وضع کے ہوتے تھے البتہ زنانہ کرتوں کی لمبائی قدرے زیادہ ہوتی تھی۔ ان کرتوں میں بٹن کے بدلے دھاگے کے گانٹھ لگائے جاتے۔ اس کے علاوہ مرد و خواتین دونوں اپنے کرتے کے سینے پر آرائش کے طور پر مختلف چیزیں مثلاً ایک چھوٹی سی چھری اور لکڑی کا ایک چمچہ ضرور لٹکائے رکھتے تاکہ ضرورت کے وقت کام آسکیں۔ زنانہ شلوار کی ایک قسم ''سلچق'' کہلاتی ہے جس میں بہت زیادہ کپڑا صرف ہوتا ہے۔ ٹخنوں سے لے کر گھٹنوں تک کپڑے کی بیسیوں تہیں جمائی جاتی ہیں لیکن اب یہ سارے لباس متروک ہیں۔

بلتستان کی زنانہ ٹوپی دو قسم کی ہوتی ہے۔ ایک سیاہ رنگ کی جو مذکورہ بالا مردانہ ٹوپی سے مشابہ ہوتی ہے۔ اس پر چاندی کے منقش زیورات سی دیتی ہیں جسے ''طومار'' کہتے ہیں جو اس وقت بھی دیہاتوں میں رائج ہے۔ اس ٹوپی کے اوپر چادر اوڑھی جاتی ہے۔ عورتوں کی دوسری ٹوپی اس سے بھی قدیم لباس میں سے ایک ہے جس کے اوپر کا حصہ سرخ پٹو کا اور گھیر کالے پٹو کا ہوتا ہے۔ اس کے پیچھے کالے پٹو کا ایک تکون ٹکڑا جوڑ دیا جاتا ہے جو عورت کی کمر اور پیٹھ پر لٹکتا رہتا ہے۔ ٹوپی کے گھیر کے سامنے والی پٹی پر چاندی کے چھوٹے چھوٹے دانے دھاگے میں پرو کر سی دیئے جاتے ہیں جو تقریباً پانچ سے آٹھ لائنوں پر مشتمل ہوتی ہیں۔ اسے ''پھولو'' کہتے ہیں۔ ٹوپی کی سرخ پلیٹ پر چاندی کے چھوٹے چھوٹے قبہ نما زیورات سیئے جاتے ہیں جنہیں ''چھسکور'' کہتے ہیں۔ اب یہ ٹوپی تقریباً نایاب ہے۔

بالوں کو سمیٹ کر رکھنے میں بلتی خواتین منفرد انداز رکھتی ہیں اور بالوں کے ایک ریشے پر بھی نامحرم کی نظر پڑنا اسلامی اقدار کی سخت خلافی ورزی سمجھتی ہیں۔ اس لئے بالوں کے دس بارہ ریشوں کو آپس میں مروڑ کر چابک کی طرح درجنوں چھوٹی چھوٹی گچھیاں بنالیتی ہیں اور اس کے ساتھ پراندہ لٹکا دیتی ہیں جسے بلتستان کے بعض علاقوں میں ''تروم پھرو'' اور بعض علاقوں میں ''سوسکوت'' کہتے ہیں۔ اب بالوں کے سمیٹنے کا یہ طریقہ تقریباً بدل رہا ہے۔

یہاں کی خواتین کپڑے پر بڑے بڑے فیروزے چاندی کے فریم میں جڑا کر سی لیتی ہیں جسے ''پھلا'' کہتے ہیں اور اسے حلقہ بند کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ چاندی کے بڑے بڑے گول دانے فیروزہ اور مونگوں کو دھاگہ میں پرو کر پہنے جاتے ہیں جسے ''سکے پھہ لو'' کہتے ہیں۔ بلتستان میں مرد اور عورتیں فیروزہ، یاقوت اور عقیق جڑی ہوئی چاندی کی انگوٹھی عام پہنتے ہیں۔ بالخصوص فیروزہ کو اس قدر پسند کے ساتھ استعمال کیا جاتا ہے کہ اسے یہاں کا قومی پتھر کہا جائے تو حق بجانب ہوگا۔

تاریخی حقائق سے معلوم ہوتا ہے کہ بلتستان میں زیورات کے ابتدائی اثرات شمال اور شمال مغرب کی طرف سے آئے ہوئے ترک آبادکاروں کے ہیں۔ بعدازاں مشرق میں لداخ اور جنوب میں کشمیر کے اثرات بھی مرتب ہوئے۔ قیام پاکستان اور ملک کے دیگر علاقوں کے ساتھ ہوائی اور زمینی روابط استوار ہونے کے بعد مغربی اثرات میں ہولناک طریقے سے اضافہ ہوتا جارہا ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ ڈوگرہ دور سے قبل بلتستان میں زیورات کا استعمال شاید صرف راجہ خاندانوں تک محدود تھا اور بعد میں رفتہ رفتہ عام خاندانوں کے درمیان بھی رواج پایا۔ چنانچہ دور راجگی میں عام لوگ وہ کپڑے اور زیورات نہیں پہن سکتے جو راجہ خاندانوں میں رائج ہوں۔ جیسا کہ اب بھی یہ قصہ زبان زد عام ہے کہ لٹھا راجہ کا لباس تھا اور کسی شخص کو لٹھا پہننے کی اجازت نہ تھی۔ آج کا بلتستان اس دور سے بالکل مختلف ہے۔ جدت زمانہ کے باعث مذکورہ لباس متروک ہوتے جارہے ہیں۔ اب دیگر اقوام کی دیکھا دیکھی نئے فیشن کے کپڑے، جوتے اور زیورات کا رجحان روز افزوں تیزی سے بڑھ رہا ہے۔ یہاں تک کہ سکردو شہر میں سونے کے زیورات بھی عام ہو رہے ہیں۔ بلتستان میں مروج زیورات کی چند دیگر اقسام درج ذیل ہیں۔

۱۔ پھرانگ (چاندی کے ہار)، ۲۔ کوق چنگ (یہ زیور بھی حلقے میں لگایا جاتا ہے)، ۳۔ برنگ شریک (یہ زیور سینے کی زینت کے لئے استعمال ہوتی ہے)، ۴۔ کھوڑوکھ (پرس)، ۵۔ ڈولان (ہار کی دوسری قسم)، ۶۔ سناتولو (جھمکہ یا بالی)، ۷۔ چہارگل (کوکا یا نتھ)، ۸۔ گوزدام (بال پن)، ۹۔ غدو (چوڑی)، ۱۰۔ پھوقبو (قبہ)

بلتستان میں قدیم جوتے اونی پٹو اور کچے دھاگے سے بنائے جاتے تھے جنہیں ''پپو'' اور ''ہلم'' کہتے ہیں۔ اس کے علاوہ غریب لوگ لکڑی کے کھڑاؤں ''کنگ شنگ'' اور گھاس کی بنی ہوئی چپلی ''پلا'' بھی استعمال کرتے تھے۔



روایتی بلتی زیورات پہنے ایک خاتون

بلتستان میں شیر خوار بچوں کی ٹوپیوں کو رنگ برنگے دھاگوں کے پھول، بٹن اور سوراخ والے سکے (قدیم پاکستانی سکے) سے مزیّن کیا جاتا ہے جسے چشم بد سے محفوظ رکھنے کا ذریعہ سمجھنے کے علاوہ بچے کی تزئین و آرائش کا سامان بھی سمجھتے تھے۔ اب یہ رجحان بھی ختم ہو چکا ہے۔

بلتستان کی خواتین اونی دھاگوں سے بنیان، دستانے، جراب اور مفلر وغیرہ بنتی ہیں جو سردیوں کے موسم میں کام میں لایا جاتا ہے۔ لیکن یہ سلسلہ بھی غالباً قیام پاکستان کے بعد سے شروع ہوا ہے۔ اسی طرح ایک باریک اور قریباً چھ انچ عرض کی اونی پٹی ہوتی ہے جسے یہاں کے روایتی چرواہے، شکاری اور پولو کے کھلاڑی استعمال کرتے ہیں۔ اسے ٹانگوں کے گرد لپیٹ لیا جائے تو ٹانگیں چوٹ وغیرہ سے محفوظ ہو جاتی ہیں۔ یہ ''پتیوال'' کہلاتا ہے۔

بکری کے بالوں سے یہاں چھرا تیار کیا جاتا ہے جو بہترین گرم بچھونا ہوتا ہے اس کے علاوہ اون سے ''پھینگمہ'' یعنی نمدے بنائے جاتے ہیں جو خاص قسم کا بچھونا ہوتا ہے۔ نمدوں پر پھول بوٹے وغیرہ لگا کر اعلیٰ طریقے سے تیار کیا جاتا ہے۔ شروع میں اعلیٰ قسم کے نمدے یارقند سے لائے جاتے تھے اور بڑے خاندان کے گھروں کی زینت بنتے تھے۔ اب پاکستان کے دیگر علاقوں میں موجود کارپیٹ کی صنعت نے تمام مقامی فرش وفروش کے استعمال کو متاثر کر دیا ہے۔

بلتستان میں چونکہ پولو کھیل کا رواج زیادہ ہے جو گھوڑے پر کھیلا جاتا ہے جس کی بابت اگلے ابواب میں ذکر کیا جائے گا۔ پولو کھیل کے دوران گھوڑوں کو اچھی طرح سجا کر گراونڈ میں لایا جاتا ہے۔ چشم بد سے محفوظ رکھنے کے لئے گھوڑوں کے لئے تعویذ بھی پہنائے جاتے ہیں جو شکل میں تکون بنایا جاتا ہے۔ تعویذ کی یہ شکل گھوڑوں کے لئے مخصوص ہوتی ہے۔

اس کے علاوہ کوئی اچھی نسل کا بکرا ہو تو باذوق افراد اس کے گلے میں زنگولہ لٹکاتے ہیں جسے مقامی زبان میں ''تربشل'' کہتے ہیں۔

جسمانی کھیل اور لوک تماشے

بلتستان کے روائتی کھیل اور لوک تماشے انتہائی دلچسپ، منفرد اور مسرت آمیز ہیں۔ ان تمام کھیلوں میں بلتستان کا قومی کھیل ''پولو'' بین الاقوامی شہرت کا حامل ہے۔

پولو کھیل کی تاریخ:

پولو نہ صرف خطہ بلتستان کا بلکہ پورے شمالی علاقہ جات کا مقبول ترین کھیل ہے جسے کھیلوں کا بادشاہ کہا جاتا ہے۔ پولو کھیل سے انسان کی بہادری، جرات اور قدر و قیمت کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے۔ آپس میں پیار و محبت کا رشتہ مضبوط ہو جاتا ہے۔ طاقتور انسان اس کھیل سے مشاق شہسوار بنتے ہیں۔ علاوہ ازیں گھوڑوں میں بھی اطاعت پذیری اور چستی و چالاکی پیدا ہوتی ہے۔ شروع میں اس کھیل کے مقاصد جنگی تھے۔ گیند کا ہدف دشمن کی مثال رکھتا تھا۔ شاید اسی لئے بعض غیر مقامی مورخین اس کو وحشی کھیل سے بھی منسوب کرتے ہیں۔ اس کی ابتداء کے بارے میں وثوق سے کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ اس کھیل نے کہاں جنم لیا اور کب اور کن طریقوں سے شروع ہوا۔ تاہم محققین اس بات پر متفق ہیں کہ یہ کھیل زمانہ قبل از مسیح سے کھیلا جاتا رہا ہے۔

بلتستان کی قدیم کلاسیکی لوک داستان سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں دیو مالائی ہیرو ہلافرو کیسر کے زمانے میں پولو کا کھیل ترقی یافتہ شکل میں رائج تھا یعنی آج سے ہزاروں سال قبل یہ کھیل بلتستان اور آس پاس کے علاقوں مین کھیلا جاتا تھا اور اس لحاظ سے اس کھیل کی تاریخ جتنی پرانی یہاں ہے اتنی دنیا کے کسی بھی گوشہ میں نہیں۔ اس داستان کے مطابق کیسر نے اس کھیل میں کافی دلچسپی لی اور روایات کے مطابق وہ خود بھی پولو کا بہترین کھلاڑی تھا۔ جیسا کہ شگر کے نالہ برالدو اسکولی گاؤں سے جا کر بیافو گلیشیئر کے قریب کیسری شغرن (کیسر کا پولو گراونڈ) اب بھی مشہور ہے۔ لوک روایات کے مطابق جو اسٹک اور گیند کیسر استعمال کرتا تھا وہ چاندی اور موتی کے ہوتے تھے۔ کہتے ہیں کہ کیسر کے بعد رگیالوسترالبو کا دور شروع ہوتا ہے اور اس کے دور میں بھی پولو کے آثار ملتے ہیں جن میں سکردو میں رگیائیل لونگ اور شگر لونگ کے درمیان ایک پولو گراونڈ ''رگیالوسترالبوی شغرن'' کے نام سے اب بھی موجود ہے۔ اس کے بارے میں یہ لوک روایت زبان زد عام ہے کہ رگیالوسترالبو نے بُرگے وادی کی چوٹی سے پولو کو ہٹ کیا تھا جو نیچے اُسی گراونڈ میں آ کر گری تھی لیکن تلاش بسیار کے باوجود پولو دستیاب نہیں ہوا۔ اس پر رگیالوسترالبو برہم ہوا اور بددعا کر کے اس علاقہ کو ویران کر دیا۔

یہ بات بہت وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ ''پولو'' خالص بلتی (تبتی) زبان کا لفظ ہے اور یہ لفظ گیند کیلئے استعمال ہوتا ہے۔ اسی لئے بلتی میں ہر گول چیز کو مشابہ کے طور پر ''پولو کی طرح'' کہا جاتا ہے۔ یہ لفظ بلتی میں گیند کے لئے مستعمل ہے۔ گلگت میں پولو سٹک کو ''یولو'' یا ''بلائی'' کہا جاتا ہے۔ بلتی زبان میں فٹ بال کو ''کنگ پولو'' ہاکی بال کو ''ٹکو پولو'' والی بال کو ''لق پولو'' اور گھوڑے پر کھیلنے والے کھیل کو ''ہرتہ پولو'' کہا جاتا ہے۔ لہذا لفظ ''پولو'' گیند کیلئے مسلمہ ہے۔

تاریخی حوالوں سے معلوم ہوتا ہے کہ بلتستان کا ایک قدیم نام ''پلو'' تھا۔ جیسا کہ گلگت اور آس پاس کے علاقوں میں بلتستان کے باشندوں کو اب بھی ''پلوئی'' یعنی ''ملک پلو کے رہنے والے'' کی اصطلاح سے پکارتے ہیں۔ عثمان علی اپنی کتاب ''شنالوجی'' میں عبدالرشید زائر کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ فارسی کی پرانی زبان میں اس کھیل کا نام ''پلو'' تھا۔ جو بعد میں بگڑ کر پولو بن گیا ہے۔ یہاں اس بات کو واضح کرنا یقیناً ضروری ہوگا کہ بلتی میں یہ تلفظ ہی ''پلو'' ہے جسے بعد میں غیر ملکی قلمکاروں نے لاعلمی کی وجہ سے ''پولو'' لکھا اور یہی رائج ہوا۔ بلتستان کے پولو کے قوانین دنیا کے دیگر علاقوں میں کھیلے جانے والے پولو قوانین سے مختلف ہیں۔ اس کے علاوہ پولو کے بارے میں جتنی اصطلاحات بلتی زبان میں دستیاب ہیں شاید کسی زبان میں موجود ہوں۔

پولو گیند کی ساخت اور حجم:

قدیم زمانے میں بلتستان میں بیر کی گول سخت لکڑی یعنی ''گڑا'' سے پولو بنائی جاتی تھی۔ یہ ہاکی گیند سے قدرے بڑی اور سخت ہوتی ہے۔ اسے گول بنانے کیلئے ہاون میں کوٹا جاتا ہے اور اس کا حجم ناپنے کیلئے آنکھ پر رکھا جاتا ہے۔ پولو گیند کے حجم کا معیار یہ ہے کہ ناک، ابرو اور رخسار کی ہڈی سے ٹکرا کر آنکھ سے نہ چھوئے۔ کہتے ہیں دور راجگان میں سکردو کے موضع کھچے رنا اور کت پناہ کی آسامیاں صرف پولو بنانے کیلئے مقرر تھیں۔ تقریباً نصف صدی سے پولو بنانے کا



پولو کھیل کا منظر

طریقہ کچھ بدل گیا ہے۔ اب لکڑی کے برادہ کو گوند میں ملا کر پولو بنایا جاتا ہے اور اسے سفید روغن کیا جاتا ہے جس کا قطر ۸.۲۵ سینٹی میٹر اور وزن پانچ اونس ہوتا ہے۔

پولو اسٹک:

جس چھڑی سے گھوڑے پر پولو کھیلا جاتا ہے اسے بلتی میں ''ہرتہ بینٹھو'' کہتے ہیں۔ اس کے دو حصے ہوتے ہیں۔ پہلا حصہ ''کھہ'' جسے سرا کہا جاتا ہے جو گیند کو مارنے کے کام آتا ہے۔ یہ حصہ سخت قسم کی لکڑی سے بنایا جاتا ہے جس کی لمبائی آٹھ سے بارہ انچ کے درمیان ہوتی ہے۔ دوسرا حصہ ''یوا'' بمعنی دستہ کہتے ہیں۔ اس کی لمبائی اڑتالیس سے چون انچ تک ہوتی ہے جو لمبی اور باریک لچکدار لکڑی سے بنایا جاتا ہے۔ پہلے زمانے میں ''رنگ گوک'' یعنی درخت کی خودخمیدہ شاخ سے بنایا جاتا تھا جس کا ''کھہ'' صنوبر، اخروٹ یا سرو کی لکڑی اور دستہ ''حسپر'' نامی بوٹی کی شاخ یا بادام کے درخت کی شاخ کا ہوتا تھا۔ اب یہ اسٹک تقریباً مفقود ہے۔

چابک:

بلتستان کے گھڑ سوار شہسواری کے وقت مخصوص روایتی چابک ''تھر'' استعمال کرتے ہیں جو چمڑے کی باریک تار سے بنائی جاتی ہے۔ بلتستان کی روایت میں گھوڑے کو چابک کے علاوہ کوئی دوسری چیز مار کر ہانکنا یا دوڑانا سخت ممنوع ہے۔ بالخصوص پولو کھیل کے دوران گھوڑے پر ''چوگان بلا'' یعنی پولو اسٹک کا مارنا سخت معیوب اور بے ہودہ سمجھا جاتا ہے۔ یہاں یہ بات دلچسپی کا باعث ہوگی کہ چابک ''تھر'' کا دستہ بنانے کیلئے بلتستان میں قدیم الایام سے ایک فارمولا وضع ہے یعنی دو دو انگل کے ناپ کے ساتھ درج ذیل بلتی منظوم فقرے پڑھے جاتے ہیں اور آخری فقرہ پر نشان لگا کر چھڑی کاٹ دی جاتی ہے۔ اس طرح ماہرین کے کہنے کے مطابق چابک کے دستے کی لمبائی تقریباً ایک فٹ بنتی ہے:

پولو گراؤنڈ:

اس علاقے کا قومی کھیل ہونے کی مناسبت سے بلتستان کے تقریباً ہر گاؤں میں سبزہ زار مستطیل نما پولو گراؤنڈ ''شغرن'' موجود ہیں جن کی روایتی انداز میں رکھوالی بھی کی جاتی تھی۔ قدیم تاریخی پولو گراؤنڈ میں سے چند ایک پہاڑ کی چوٹیوں پر بھی موجود ہیں جن میں کے ٹو (K-2) کے قریب واقع کیسری شغرن، رگیا یُل لونگ اور شگر لونگ کے درمیان واقع رگیالو ستر البوی شغرن، سولہ ہزار فٹ کی بلندی پر بلتورو گلیشیئر پر موجود مقپونی شغرن، منٹھو وادی کے چوٹی پر ہلتینگ کھور شغرن، طولتی میں کیسر سے منسوب برقچن شغرن، کواردو میں روندے شغرن اور

بُرگے وادی میں واقع رونگمہ برنگسی شغرن کے آثار اب بھی نمایاں ہیں۔ مستغ ٹاور کے نیچے ''شغرن'' نامی ایک گلیشیئر موجود ہے اس گلیشئر سے ملحق ایک قدیمی شغرن نظر آتا ہے اور اس کے ساتھ ہی اصطبل (کھرلی) اپنے اصل حالت میں اور کئی گرے ہوئے کمرے موجود ہیں۔ اس کی بابت بلتستان کی لوک روایات کے مطابق پانچویں اور چھٹی صدی عیسوی میں بلتستان وگلگت کے حکمران خاندان پلولا شاہی اور ختن کے خاندان اماچہ کے حکمران اس شغرن میں پولو کھیلتے تھے۔ برالدو (شگر) کے لوگ اپنے بزرگوں کے حوالے سے کہتے ہیں کہ کسی زمانہ میں اسی جگہ بلتستان اور ختن کے کھلاڑیوں کے درمیان پولو کا مقابلہ ہوا کرتا تھا۔ ان کے علاوہ رونگ یُل کے ستق پھونگدو میں رونگمہ ردن چوے شغرن بھی موجود ہے جو وہاں کے بزرگوں کے مطابق اس وقت زیر کاشت ہے۔ بلتستان کی لوک داستانوں میں کہا جاتا ہے کہ کیسر اور رونگمہ ردن چو ہمعصر بادشاہ تھے۔

بلتستان میں پولو گراؤنڈ کے اردگرد پتھر کی کچی دیوار بنی ہوئی ہوتی ہیں۔ ہر پولو گراؤنڈ کی مرکزی جگہ کے کنارے پر چنار کے درخت ضرور ہوتے ہیں۔ ان چناروں کی چھاؤں میں بیٹھ کر تماشائی کھیل سے اچھی طرح لطف اندوز ہوتے ہیں۔ چنار کے نیچے کی جگہ خاص طور پر راجاؤں، وزیروں اور اعلیٰ عہدیداروں کیلئے مخصوص ہوتی ہے۔

بلتستان کے جملہ پولو گراؤنڈ کے دونوں کناروں پر گھوڑے کے دوڑتے ہوئے آسانی سے باہر نکلنے کا راستہ ضرور ہوتا ہے جسے ''ہرتہ بیونگ'' کہتے ہیں۔ ماہرین کا کہنا ہے کہ سرپٹ دوڑتے ہوئے گھوڑے کو یکدم سنبھالنا مشکل ہو جاتا ہے اور اگر کہیں سنبھالے تو گھوڑے کے بیمار ہو جانے اور گر جانے کا بھی خطرہ ہوتا ہے۔ اس لئے ''ہرتہ بیونگ'' گراؤنڈ کی ایک ہی جانب ہونا بہت ضروری ہے تاکہ گھوڑے کو دونوں کنارہ سے دائیں اور بائیں دونوں طرف موڑ سکیں۔

لمبائی اور چوڑائی کے لحاظ سے شگر کا پولو گراؤنڈ بلتستان میں سب سے بڑا ہے۔ ماہرین کے مطابق اس گراؤنڈ میں بہ یک وقت چوبیس گھڑ سوار آسانی سے پولو کھیل سکتے ہیں۔ محققین کے مطابق یہ گراؤنڈ ۸۲۷ ہجری سے پہلے کی بنی ہوئی ہے۔

پولو سے متعلقہ موسیقی:

بلتستان میں پولو کا موسیقی کے ساتھ بہت قریبی رشتہ ہے گویا موسیقی کے بغیر پولو کا تصور ناممکن سمجھا جاتا ہے۔ موسیقار کو بلتی میں ''مون'' کہتے ہیں۔ دور راجگی اور بعد ازاں ڈوگروں کے پُر آشوب دور میں بھی یہ پیشہ ور ''مون'' یعنی موسیقار سرکاری ریس اور بیگار کے بوجھ سے مستثنیٰ تھے اور ہر علاقہ میں ان کے نام زمینیں و جائیدادیں وقف تھیں۔ اس طرح انہیں معاشرے کا ایک اہم جزو لاینفک سمجھا جاتا تھا۔ بلتستان میں جوں جوں اسلامی عقائد واقدار پروان چڑھتے گئے اور معاشرے پر دینی علماء کا تسلط مضبوط ہوتا گیا تو ان خطیبوں کی پرزور تقریروں کی وجہ سے اس طبقہ نے رفتہ رفتہ اپنا پیشہ ترک کرنا شروع کیا اور اب خپلو اور رونگ یُل میں چند ایک کے علاوہ ان پیشہ ور سازندوں کا وجود ہی ختم ہو رہا ہے۔

بلتستان میں پولو سے متعلق مروجہ موسیقی

۱۔ لوک دھن: پولو کھیلنے سے ایک دن قبل علی الصبح راجہ کے پیشہ ور سازندے اُن کے محل کے سامنے مخصوص لوک دھنیں بجانا شروع کرتے ہیں۔ موقع کی مناسبت سے موسیقی کا آغاز کرنے کی ذمہ داری سب سے بزرگ سازندہ کی ہوتی ہے۔ پہلے کوئی لوک گیت اور اس کے بعد اسی لوک گیت سے مطابقت رکھنے والی کسی غزل کی دھن چھیڑتے ہیں اس رسم کو بلتی میں ''راتب'' کہتے ہیں۔

۲۔ حریب: دوسرے دن پولو کھیلنے کے مقررہ وقت سے پہلے یہی سازندے پھر راجہ کے محل کے سامنے جمع ہو جاتے ہیں۔ پولو کے تمام کھلاڑی گھوڑوں پر سوار چوگان برداروں اور سائیسوں کو ساتھ لے کر راجہ کے ہاں جاتے ہیں۔ پولو کے مقررہ وقت تک یہ سازندے حریب بجاتے رہتے ہیں۔ بلتستان میں حریب کی تعداد ساٹھ بتائی جاتی ہے جن میں دیسی اور بدیسی دونوں شامل ہیں۔

۳۔ لمسنہ: یہ دھن پولو ٹیم یا لشکر کے چلنے کے دوران یعنی گراؤنڈ میں آتے اور جاتے ہوئے بجائی جاتی ہے اور اسے ''لمسنہ'' یا ''لمکار'' یعنی راستے کی دھن کہتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ اس کی بارہ قسمیں تھیں لیکن اس وقت ان میں سے صرف چند ایک کے نام محفوظ ہیں اور نہ معلوم آج کے موسیقار یہ جانتے بھی ہیں یا نہیں۔ لمسنہ کی قسمیں (۱) چھوغولمسنہ (۲) بودھی لمسنہ (۳) رگیالم چھینو اور (۴) مقپون ستن لاشخھ

۴۔ ذکر: جب کھلاڑی گھوڑوں پر سوار ہو کر گراؤنڈ میں کھیل کیلئے تیار ہو جاتے ہیں۔ اس وقت ایک خاص حریب بجایا جاتا ہے جو ''ذکر'' کہلاتا ہے جس کا مطلب دعا ہوتا ہے کہتے ہیں کہ گراؤنڈ میں کوئی ناخوشگوار واقعہ پیش آنے کی صورت میں بھی یہ دھن بجائی جاتی ہے۔

۵۔ ستغرا: پولو میں جب کوئی ٹیم گول کرتی ہے تو اُس کا کوئی کھلاڑی گیند

کو ہاتھ میں لئے مخالف سمت میں گھوڑا دوڑاتا ہے اور گراؤنڈ کے درمیان میں پہنچ کر گیند کو ہوا میں اچھال کر اسٹک سے مارتا ہے۔ اس موقع پر کھلاڑی کے رتبہ کے مطابق خاص دھن بجائی جاتی ہے۔ جسے ''ستغرا'' کہتے ہیں۔ اس دھن کی درج ذیل چار قسمیں بتائی جاتی ہیں جن کے متعلق مقامی روایت یہ ہے کہ یہ دھن رگیا لفوعلی شیر خان انچن (۱۵۸۰ء تا ۱۶۲۴ء) کے دور میں ہندوستان کے مغلیہ نقارچیوں کے ذریعے بلتستان پہنچی۔

الف۔ تاجور: یہ دھن صرف راجہ اور ولی عہد کیلئے مخصوص ہے اور اس دھن کے ساتھ کئی ''کرنائی'' جسے بلتی میں پورغو کہتے ہیں بھی بجائی جاتی ہیں۔

ب۔ بختاور: یہ دھن حکمران خاندان کے دیگر افراد یعنی کاچو وغیرہ کیلئے بجائی جاتی ہے۔ اس دھن کے ساتھ صرف ایک کرنائی بجائی جاتی ہے۔

ج۔ بخشاور: یہ دھن وزیروں اور اعلیٰ عہدیداروں کیلئے بجائی جاتی ہے۔ بزرگوں کی روایت کے مطابق اس دھن کے ساتھ کرنائی بجانے کا رواج نہیں ہے۔ چند بزرگوں کا کہنا ہے کہ راجگی دور میں سلطنت کے بارہ وزیروں یعنی ''پاچونس'' کے ہر خاندان کیلئے الگ دھن مخصوص تھی لیکن اس وقت یہ سب ناپید ہیں اور آج کل کے موسیقاران کے نام بتانے سے بھی قاصر ہیں۔

د۔ گلاور: یہ دھن عام طبقہ کے کھلاڑیوں کیلئے بجائی جاتی ہے۔

۶۔ ٹھامہ ننگ: پولو کھیل کے نویں ڈافوق کے ساتھ ہی نقارچی مخصوص اختتامیہ دھن ''ٹھامہ ننگ'' بجا کر کھیل کے اختتام کا اعلان کرتا ہے۔

۷۔ طنزیہ دھنیں: کھیل کی ہار جیت پر طنز کرنے کیلئے بلتستان کے ہر علاقہ میں الگ الگ موسیقی وضع ہے جنہیں کھیل کے اختتام کے فوراً بعد بجائی جاتی ہے۔ سکردو میں ہارنے والی ٹیم کیلئے ''شاہ بہرام چو'' کے لوک گیت کی دھن بجائی جاتی ہے جو خپلو کے یبگو خاندان کیلئے طنز ہے۔ اسی طرح خپلو میں ہارنے والوں کیلئے ''مقپونی فوتونگ کار'' نامی دھن بجائی جاتی ہے جس میں مقپون خاندان کی شکست کا طعنہ موجود ہے۔ نیز ایک روایت کے مطابق ''شہ حتون'' نامی دھن بھی بجائی جاتی ہے۔ رونگ یُل میں ہارنے والی ٹیم کیلئے رتبہ کے مطابق مختلف لوک دھن رائج ہیں۔ اگر ہارنے والی ٹیم میں صاحب عزت و مرتبہ کھلاڑی موجود ہو تو اُسے کیسر داستان سے اقتباس ''فوروق پون پون'' اور ''مک ژھیل مورگی'' والی ذدرونگ خلو کی دھن بجاتے ہیں جبکہ عام کھلاڑی کیلئے کئی اور ساز مخصوص ہیں۔

رونگ یُل میں میچ ختم ہونے کے بعد جیتنے والی ٹیم کے کھلاڑی مون کے سامنے ٹیم دائرے میں کھڑے ہو کر یک زبان ہو کر ہاہاہا ہو کی آواز لگا کر اپنے اپنے سٹک کو ایک ساتھ اوپر نیچے کرتے ہیں۔ اس کے بعد ہر کھلاڑی اپنے مدمقابل شکست خوردہ کھلاڑی کا نام لیکر داستان کیسر کے منظوم ''ذدرونگ خلو'' سے کوئی ایسا مصرعہ زور سے پڑھتا ہے کہ مون اسے اچھی طرح سن سکے اور پھر مون اس منظوم حصے کی دھن کو بجاتا ہے اس طرح سارے کھلاڑی باری باری یہی کرتے ہیں۔ شکست خوردہ کھلاڑی ان پر کہے ہوئے ان طنز بھرے مصرعوں اور دھنوں کو سنتا ہے تو وہ جوش انتقام سے بھر جاتا ہے اور دوسرے گیم میں اپنی شکست کا بدلہ لینے کیلئے سر توڑ کوشش کرتا ہے۔ اس طرح یہ طریقہ بہت دلچسپ بھی ہوتا ہے اور کھلاڑیوں میں اپنے مدمقابل سے جان لڑا کر مقابلہ کرنے کا جذبہ تازہ رکھتا ہے اور یہ اس کھیل کو ہمیشہ مقبول اور تازہ رکھنے کا بھی ایک اچھا ذریعہ بنتا ہے۔ شاید اسی وجہ سے رونگ یُل کے کھلاڑی شمالی علاقہ جات میں بہترین کھلاڑی مشہور ہیں۔

بلتستان میں پولو کھیلنے کے خاص دن:

بلتستان میں دیگر شعبہ ہائے زندگی کی طرح آداب کے طور پر پولو کیلئے بھی ایام مخصوص ہیں جن کے تحت ہفتہ بھر میں سنیچر اور منگل کو پولو کھیلا جاتا ہے۔ علم نجوم کی کتابوں کے حوالے سے یہ ہلکے اور موزوں دن تصور کیئے جاتے ہیں۔ اگر سنیچر یا منگل کو عرس کی تاریخ آجائے تو کھیل بدھ کو بھی کھیلا جا سکتا ہے۔ البتہ یہ پابندی نوروز اور دیگر خاص تقریبات کیلئے لاگو نہیں ہے۔ محرم الحرام، صفر المظفر اور رمضان المبارک کے مہینوں میں پولو کھیلا جانا قطعی بند ہے۔ سردیوں کے تین مہینے بھی موسمی شدت کی وجہ سے کھیلا نہیں جا سکتا۔ سال میں دو دفعہ یعنی نوروز اور یوم پاکستان کی مناسبت سے (۲۱ تا ۲۳ مارچ) اور جشن آزادی پاکستان و بلتستان کے سلسلہ میں (۱۴ اگست) کو کھیلوں کے مقابلے منعقد کیئے جاتے ہیں جس میں پولو کھیل کا مظاہرہ لازمی طور پر ہوتا ہے۔

گھوڑے سے متعلق بلتی ضرب الامثال اور محاورے:

پولو بلتستان کا قدیم قومی کھیل ہونے کے ناطے یہاں کے باشندوں کا گھوڑے سے اتنا مضبوط تعلق رہا ہے کہ بلتی زبان میں بے شمار ضرب الامثال اور محاورے گھوڑے سے متعلق ہیں۔ جو شاید دنیا کی کسی اور زبان میں موجود ہوں۔ گھوڑے سے متعلق چند بلتی ضرب الامثال و محاورے درج ذیل ہیں۔

بلتی ضرب الامثال ومحاورہ	ترجمہ
۱۔ ہرتہ لارگا ژے ہرتہ رزی لا۔	جتنی محبت گھوڑے سے اتنی ہی سائیس سے
۲۔ ہرتہ جون کھن ہرتہ قنگید۔	وہی گرتا ہے جو گھوڑے پر سوار ہوتا ہے۔
۳۔ می تھکھ ہش گنگ ہرتہ تھکھ بنگ گنگ	انسان کا اندازہ ایک سانس سے اور گھوڑے کی پہچان ایک ہی دوڑ میں ہو جاتا ہے۔
۴۔ ہرتیکھ مہ رگیالنہ ہرتہ شینگ ردونگما۔	گھوڑے پر نہ جیتے تو ڈنڈے کی اپنی پٹائی
۵۔ گوئے می مے مہ ذدریل دو کپی می ہرتہ ماستود	جانے والا آگ کو محفوظ کیونکر کرے اور بیٹھنے والا گھوڑے پر زین کیونکر چڑھائے۔
۶۔ ہرتہ لا ہرمکپا تنگمنہ بونکبو کنگمہ لیند۔	گھوڑے کی نعلبندی دیکھ کر گدھا بھی پاؤں اٹھاتا ہے۔
۷۔ اتی کھہ بولون میدنا بوجنمی ہرتیکھہ جون	اگر باپ پر قرضہ نہ ہو تو بیٹا بیگانے کے گھوڑے پر سوار ہو جائے۔
۸۔ ایچن خسیری سونگنا سی ردوقپی اوقتو تلے۔	رکاب سونے کا ہی کیوں نہ ہو پھر بھی پاؤں
۹۔ گوتھورلا بودفی ہرتہ ژوخ۔	بے لگام گھوڑے کی طرح (آوارہ)
۱۰۔ ہرتہ لا چھق نیلم تھونگفہ ژوخ۔	گھوڑے کا خواب میں دانہ دیکھنا (اچانک کسی چیز کی خواہش کرنا)
۱۱۔ چھب لا بورفی ہرتہ ژوخ۔	سال بھر بندھے ہوئے گھوڑے کی طرح (اکڑا ہوا)
۱۲۔ ہرتہ غوراخذ فہ ژوخ۔	گھوڑے کا پتھروں کے بیچ میں پھنس جانا (حیران وپریشان)
۱۳۔ حاکی دول مہ سونگ ہرتانانی گیلا مہ سونگ	حاکم کے سامنے اور گھوڑے کے پیچھے نہ جانا
۱۴۔ ہرتہ جورز گامہ جور۔	گھوڑا دستیاب ہوا مگر زین نہیں۔
۱۵۔ ہرتہ سائیکھا یودتھا نکسہ ئیکھہ یود	گھوڑا بھی یہیں ہے اور میدان بھی
۱۶۔ جنمی ہرتیکھا پولو۔	بیگانے کے گھوڑے پر پولو (بے دردی سے کوئی کام کرنا)
۱۷۔ زگار گیالنہ زگوچوق زگور گیانہ زگاچوق	زین جیت کر دروازہ کو توڑ دے یا دروازہ جیت کر زین کو۔
۱۸۔ خور ہرتا شیس ناخوریل گو۔	یار قندی گھوڑے مرتے وقت سر وطن کی جانب کرتا ہے۔
۱۹۔ ہرتہ شی پا بکید پا تھو۔	گھوڑے کی موت سے طعنہ شدید ہوا۔
۲۰۔ زان بوس مہ سونگنہ نقسترن توب نور بوس مہ سونگنہ رگونمہ خسوس	اناج کی کمی ہو تو باقلہ بو اور دولت کی کمی ہو تو گھوڑی پالو۔

پولو کی تمہیدی رسومات:

بلتستان میں پولو کھیل کی تمہیدی رسومات کا ذکر کرتے ہوئے یہ بتانا ضروری سمجھا جاتا ہے کہ یہ رسومات آج سے غالباً تیس چالیس سال قبل تک بھی کلی طور پر رائج تھیں ان میں سے جزوی طور پر چند ایک اب بھی نافذ العمل ہیں۔

بلتستان میں پولو کھیلنے سے ایک دن قبل شام چار بجے راجہ کے محل کے سامنے طبل بجایا جاتا ہے جو کھلاڑیوں کیلئے پولو کھیل کی اطلاع سمجھا جاتا ہے۔ پولو کے دن علی الصبح دھوپ نکلنے تک مختلف حریب اور لوک دھنیں بجائی جاتی ہیں۔ اس کے بعد کھلاڑی اپنی تیاریوں میں مشغول ہو جاتے ہیں۔ تین بجے کھلاڑی معہ گھوڑوں کے راجہ کے محل پہنچ جاتے ہیں۔ کچھ دیر تک دربار میں آرام کرنے کے بعد گراؤنڈ کی طرف جانے کی تیاری شروع ہوتی ہے۔ تمام کھلاڑی اور دیگر تماشائی دالان سے باہر نکل جاتے ہیں اور موسیقار صدر دروازے پر انتظار کرتے ہیں۔ اس کے بعد ایک خوش رو شخص صدقہ لے کر صدر دروازے پر کھڑا رہتا ہے اور راجہ صدقہ پر ہاتھ رکھ کر دہلیز سے باہر قدم رکھتا ہے۔ اب موسیقار ''لم سنہ'' بجانا شروع کرتے ہیں۔ راجہ کے گھوڑے کے دائیں جانب دو آدمی رکاب پکڑنے کیلئے تیار ہوتے ہیں اور سائیس آگے سے گھوڑے کو پکڑے رکھتا ہے۔ راجہ کے سوار ہونے کے بعد باقی کھلاڑی اپنے اپنے گھوڑوں پر سوار ہو جاتے ہیں۔ راجہ کو آگے کر کے پہلی صف میں موسیقاروں کے ساتھ گراؤنڈ کی طرف روانگی شروع ہوتی ہے۔ اسی اثنا میں آگ اٹھانے والے (مے کل) آگ رکھنے والی خصوصی برتن (مین کل) کے ساتھ، ساقی پانی پلانے کے سامان لے کر، فراش قالین اٹھائے ہوئے اور تمبا کو پلانے والا حقہ و دیگر ضروری اشیاء ساتھ لے کر پہلے ہی گراؤنڈ میں پہنچ چکے ہوتے ہیں بلکہ گراؤنڈ کی دیواروں پر اپنی مخصوص نشستیں سنبھال چکے ہوتے ہیں۔

کھلاڑی جب گراؤنڈ کے وسط میں پہنچ جاتے ہیں تو راجہ سمیت سب نیچے اتر جاتے ہیں۔ فراش چنار کی چھاؤں میں قالین بچھاتا ہے۔ اس وقت موسیقار قالین سے تقریباً تیس فٹ کے فاصلے پر آمنے سامنے کھڑے رہ کر بجانا شروع کرتے ہیں۔ کھلاڑی راجہ کی معیت میں جا کر مودبانہ طریقے سے قالین پر

بیٹھ جاتے ہیں۔ (آج کل اسٹیج پر کرسیاں اور صوفے لگے ہوتے ہیں وہاں بیٹھ جاتے ہیں)۔ موسیقار اس اثناء میں مختلف قسم کی دھنیں بجاتے رہتے ہیں جس کے ساتھ رقاص اپنے کلاسیکی فن کا بھی مظاہرہ کرتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ حقہ بردار اپنے فرائض کی انجام دہی کے سلسلے میں راجہ اور دیگر معززین کو حقہ پلانے کیلئے حاضر ہو جاتا ہے۔ ضمناً یہ بھی عرض کر دوں کہ بلتستان میں مروجہ حقے یاک کی سینگ سے بنائے جاتے تھے جس کے اردگرد پیتل کے خوبصورت نقش ونگار جڑے ہوئے ہوتے ہیں۔ اس کی پائپ کی لمبائی کم وبیش ڈھائی گز ہوتی ہے۔

ٹیم کپتان جسے ''پولوے ترنگپہ'' کہتے ہیں تمام کھلاڑیوں سے چابک یا پولو اسٹک کو جمع کر کے جوڑا بناتا ہے اور بارہ چودہ سال کے کسی غیر جانبدار نوجوان کی آنکھوں پر پٹی باندھ کر محفل کے وسط میں کھڑا رکھتا ہے۔ ٹیم کپتان چابک یا پولو اسٹک کا ایک ایک جوڑا اس لڑکے کے ہاتھ میں تھما دیتا ہے۔ وہ اس جوڑے کو ہاتھ میں تین دفعہ گھمانے کے بعد ایک دائیں اور دوسرا بائیں طرف رکھ دیتا ہے۔ جب اس طرح سے چھ جوڑے چابک یکے بعد دیگرے الگ رکھ دیئے جاتے ہیں تو خود بخود دو ٹیمیں تشکیل پاتی ہیں۔ انگریز محقق ڈریو کے مطابق عہد رفتہ میں ایک ٹیم میں زیادہ سے زیادہ کھلاڑی پندرہ تک بھی ہوا کرتے تھے لیکن آج کل ایسا نہیں ہوتا۔ اس وقت ایک معیاری ٹیم میں چھ کھلاڑی سے زیادہ نہیں ہوتے ہیں۔ البتہ گراؤنڈ کی وسعت کے لحاظ سے کھلاڑی کی تعداد بڑھایا یا گھٹایا جا سکتا ہے۔

بلتستان میں جب ٹورنامنٹ ہو بالخصوص نوروز کے موقع پر اس کھیل میں شامل تمام سواروں اور سواریوں کے صدقہ کے طور گول پر ایک بھیڑ کو ذبح کیا جاتا ہے اور وہ شخص جو گراؤنڈ کی رکھوالی کرتا ہے اس ذبیحہ کے سر کو گراؤنڈ کے بیچوں بیچ سے رسی سے باندھکر گھسیٹتے ہوئے دوڑتا ہے جو تماشائیوں کیلئے ایک اور انوکھا منظر پیش کرتا ہے۔ بزرگوں کا کہنا ہے کہ اس کے پس منظر میں کوئی سماجی یا سیاسی راز ضرور ہوگا لیکن وہ اس وقت اسے وضاحت کرنے سے قاصر ہیں۔

عہد رفتہ میں کھیل کے مقررہ وقت پر راجہ دیگر کھلاڑیوں سمیت اپنی نشستوں سے کھڑے ہو جاتے اور دو معزز شخص لٹھے کی چادر یا پٹولا کر راجہ کے کمر بند باندھتے اور اُن کو گھوڑے پر سوار کرتے۔ بلتستان میں پولو گراؤنڈ میں جب تک راجہ گھوڑے پر سوار نہیں ہوتا دوسرے کھلاڑی رکاب میں پاؤں تک نہیں رکھتے ہیں۔ لوگ یہ موروثی آداب بجالانے میں اب بھی پابند ہیں۔

پولو کھیل شروع ہونے سے قبل جب کھلاڑی گھوڑوں پر سوار ہوتے ہیں تو اس وقت ایک خاص حریب بجایا جاتا ہے جو ''ذکر'' کہلاتا ہے جس کا مطلب دعا ہوتا ہے۔ پھر راجہ کی مرضی کے مطابق ایک طرف کی ٹیم کے کسی بزرگ کھلاڑی کو گیند دی جاتی ہے۔ وہ اسے گراؤنڈ کے آخر میں لے جا کر گھوڑا دوڑاتے ہوئے ''ڈافوق'' یعنی آزاد شاٹ مارتا ہے۔ یوں پولو کھیل کا باقاعدہ آغاز ہوتا ہے۔ آج کل آزاد شاٹ کے بجائے پولو گیند کو گراؤنڈ کے مرکز میں پھینک دیا جاتا ہے۔

شرطیہ پولو:

بلتستان میں قدیم زمانوں میں پولو کھیل عام طور پر شرطیہ کھیلا جاتا ہے جسے ''رگین تنگمہ'' کہتے ہیں جن میں سے ''خوجوتاجو'' کی شرط سب سے مقبول تھی۔ ہارنے والی ٹیم جیتنے والی ٹیم کو سلامی دیتی یعنی جیتنے والی ٹیم کے کھلاڑی گراؤنڈ کی ایک طرف بیٹھ جاتے اور ہارنے والی ٹیم کے کھلاڑی گراؤنڈ کے بیچ سے ان کی طرف دور سے جھکتے ہوئے اور ہاتھوں کو پیشانی تک لے جاتے ہوئے کہتے ''خوجو تاجو سلام'' علیکم''۔ اس کے بعد چند قدم آگے بڑھتے اور پھر وہی عمل دہراتے۔ جیتنے والی ٹیم کے کھلاڑی موسیقی کے ساز پر رقص بھی کرتے۔ اس موقع پر شہاتون نامی دُھن بجائی جاتی۔ بسا اوقات بکرا' مینڈھا' مارخور' بیل اور یاک وغیرہ کی بازی لگتی تھی۔ جیتنے والی ٹیم کو ہارنے والی ٹیم مطلوبہ شرط پیش کرتی۔ کبھی کبھار شکست خوردہ ٹیم کے کھلاڑی جیتنے والی ٹیم کے اپنے مدمقابل کھلاڑیوں کو کندھوں پر سوار کرا کر گراؤنڈ میں گھماتے اور یہ شرط پوری ہو جاتی تھی۔ ہارنے والی ٹیم کے کھلاڑیوں کو زنانہ لباس پہنا کر چکی (رینٹھق) میں گندم پسوانے لے جاتے۔ موسم گرما میں ہارنے والی ٹیم توت کے درخت پر چڑھ کر توت کے دانے چن کر لاتے اور جیتنے والی ٹیم کے کھلاڑیوں کو کھلاتے۔ یہ سب دوستانہ شغل کے طور پر کرتے تھے۔ اب یہ روایتی شرطیں ختم ہو چکی ہیں۔

دیگر کھیل تماشے:

ابتدائی طور پر جب بچہ کھیلنے کے قابل ہوتا ہے تو وہ لکڑی کا گھوڑا بناتا ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ لکڑی گھوڑے کی ہیئت کی ہو۔ یہ عام چھڑی بھی ہو سکتی ہے جس پر سوار بچہ یہ خیال کرتا ہے کہ یہ گھوڑے پر سوار ہے۔ ایک ہاتھ میں باگ پکڑتا ہے جو زیر مشق چھڑی کا اگلا سرا ہوتا ہے دوسرے ہاتھ میں چابک اٹھاتا ہے اور پولو کھیلنے لگتا ہے۔

بچے جوں جوں بڑے ہوتے جاتے ہیں تو بلا لے کر پیدل کھیلنے لگتے ہیں جو ''ٹیا کو پولو'' یا ''بٹھو پولو'' کہلاتا ہے جو موجودہ ہاکی کی قدیم شکل ہے۔ لیکن اس کھیل میں گول ہونے کے بعد سائیڈ بدلنا اور ''ڈافوق'' کا طریقہ پولو کھیل جیسا

ہے۔اس میں کھلاڑیوں کی تعداد مخصوص نہیں۔ بلتستان کے بچے فٹ بال کی طرح پہلے ''کنگ پولو'' بھی بہت شوق سے کھیلتے تھے جو فٹ بال ہی کی قدیم صورت تھی۔ البتہ مذکورہ دونوں کھیلوں میں کپڑے سے بنایا ہوا ''گنڈ پولو'' استعمال ہوتا ہے۔ اس قسم کی چمڑے سے بنائی ہوئی گیند کو ''کو پولو'' کہتے ہیں۔ پولو کا کھیل گدھے پر بھی کھیلا جاتا ہے اور اس کی ترقی یافتہ شکل گھوڑا پولو ہے جو بڑے ذوق وشوق اور سنسنی خیز طریقے سے کھیلا جاتا ہے۔

گھوڑے پر سوار ہوکر پولو کے علاوہ نیزہ بازی' تیراندازی' نشانہ بازی' ''پلمہ'' اور سیب تراشی کا مظاہرہ بھی کیا جاتا ہے۔ تیراندازی بلتستان کے جوانوں کا ایک اہم اور قدیم روایتی کھیل رہی ہے۔ اس کھیل کا مشاق کھلاڑی شکار کھیلنے اور جنگ کے موقع پر دشمن کا نشانہ پکڑنے کا ماہر بن جاتا ہے۔ عہد رفتہ میں یہ کھیل بہت مقبول تھا اور وقتاً فوقتاً تیراندازی کے بڑے دلچسپ مقابلے ہوتے تھے۔ یہ مقابلے دراصل جنگی مشق کے طور پر ہی کیئے جاتے تھے۔ یہاں کا ایک اہم روایتی کھیل رسّہ کشی ہے جس کا مقابلہ عام طور پر ایک گاؤں اور دوسرے گاؤں کے درمیان کرایا جاتا ہے۔ سکردو میں تقریباً نصف صدی سے سندوس گاؤں کی ٹیم ناقابل تسخیر رہی ہے۔

بچوں کے کھیل:

بلتستان کے معاشرے میں بچے اور بچیوں کے کھیل بھی خاصے دلچسپ ہیں۔ کسان گھرانوں میں بچے شغل کے لئے لکڑی کا چھوٹا سا ہل بنا کر کھیت میں چلاتے ہیں۔ گویا وہ اپنی طرف سے کاشتکاری کا آغاز کرتے ہیں۔ گرمیوں کے موسم میں دیہات کے بچے نہروں کے کنارے جا کر چھوٹی سی چکی بناتے ہیں جو سچ مچ چکی ہوتی ہے۔ اس کھیل میں دو تین یا اس سے بھی زیادہ ہم خیال بچے شامل ہو جاتے ہیں۔ ایک بچہ گندم پسوانے چکی پر آتا ہے جبکہ دوسرا چکی چلاتا ہے اور آٹا پیس کر اس سے اجناس کی صورت میں آٹا پیسنے کا معاوضہ ''خلہ'' لے لیتا ہے۔ بچے اسے دیکھ کر خوش ہو جاتے ہیں۔ چھوٹی بچیاں اور بچے موسم کے اعتبار سے دھوپ یا چھاؤں میں بیٹھ کر گارے اور کنکر کے چھوٹے چھوٹے مکانات بنا لیتے ہیں اور بچے کھانا پکانے لگ جاتے ہیں۔ اس وقت بچے اور بچیاں آپس میں کام تقسیم کر لیتے ہیں اور فرضی شادی بیاہ بھی رچائی جاتی ہے۔ شیشہ اور چینی کے برتن کے ٹکڑے' بیٹری' ماچس' سگریٹ اور پالش کی ڈبیاں وغیرہ ان گھروں کی سجاوٹ کے لئے جمع کر کے رکھی جاتی ہیں۔ بچیاں گڑیوں کا کھیل بھی کھیلتی ہیں اور ان گڑیوں کو روایتی لباس پہنایا جاتا ہے۔ بلتستان کے بچے ''پھڑ اموش'' کے نام سے ایک شرطیہ کھیل کھیلتے ہیں۔ ان میں دو بچے یا بچیاں ایک دوسرے کی انگشت شہادت ملا کر اس کھیل کا آغاز کرتے ہیں۔ اس کے بعد کوئی بھی فریق جب بھی دوسرے فریق کو کوئی چیز ہاتھ میں دے دے تو لینے والے فریق کو چاہئے کہ اسے لیتے وقت ''ایتو یود'' (یاد ہے) کا جملہ کہہ دے اگر وہ یہ جملہ کہنا بھول جائے تو فریق اول ''فڑ اموش'' کا نعرہ لگا کر شرط جیت لیتی ہے۔ یہ شرط عام طور پر ایک انڈے کے لئے ہوتی ہے جو جشن نوروز کے موقع پر واجب الادا ہوتی ہے۔ چھوٹے بچے یا بچیوں کے آپس میں لڑنے یا روٹھ جانے پر دونوں چھنگلیاں ملا کر ایک دوسرے سے کٹ جاتے ہیں جسے ''کُٹی تنگمہ'' کہتے ہیں۔ اس دوران میں وہ بچے ایک دوسرے سے بات نہیں کرتے اور مل کر کھیل بھی نہیں کھیلتے ہیں۔ کچھ عرصہ بعد ان بچوں کو آپس میں مل بیٹھنے کا احساس پیدا ہوتا ہے تو خود ہی ایک دوسرے کی انگشت شہادت ملا کر صلح کر لیتے ہیں۔ جس گھر میں بھی مرغ ذبح ہو تو گوشت کھانے کے بعد چھوٹے بچے بچیاں اس کی ایک باریک دوشاخہ ہڈی سے اس طرح کھیلتے ہیں کہ اس ہڈی کو پہلے آگ کے قریب رکھ کر سکھا دیا جاتا ہے اور دونوں چھنگلیوں سے اس دوشاخہ ہڈی کو اپنی اپنی طرف کھینچتے ہیں۔ ٹوٹنے کے بعد جس کی طرف زیادہ حصہ رہ جائے تو اسی کی جیت مانی جاتی ہے اور اسے مطلوبہ شرط دینی پڑتی ہے۔ اس شرط کو 'بیاتھین'' کہتے ہیں۔ موسم گرما میں جب خوبانی پک جاتی ہے تو بچے بچیاں خوبانی کھانے کے بعد گھٹلیوں کو اپنے اپنے ہاتھوں میں چھپا کر طاق اور جفت کا کھیل کھیلتی ہیں۔ جو بچہ صحیح عدد بتا سکے گھٹلیاں وہی سمیٹ لیتا ہے۔ غلط بتانے کی صورت میں اس کے برابر کی تعداد میں گھٹلیاں دوسرے کو دینا پڑتی ہیں۔ علاوہ ازیں ان گھٹلیوں کو ایک فٹ کی بلندی سے ہموار زمین پر پھینک دیجاتی ہے اور ہر ایک گھٹلی کو دوسری سے ٹکرا کر دو دو گھٹلیاں اپنی تحویل میں لے لیتے ہیں اور نہ لگنے کی صورت میں دوسرے فریق کو یہی عمل کرنے کا موقع دیا جاتا ہے۔ اس کھیل کو ''یق ٹھس'' یا ''یق گل'' کہتے ہیں۔ چھوٹے بچوں کا ایک کھیل ''بشمالی'' ہے۔ اس میں ایسا ہوتا ہے کہ دو ٹیمیں الگ الگ چھپ کر مختلف ہموار جگہوں پر مٹی سے چھوٹی چھوٹی ''بشمالی'' ڈالتی ہیں۔ اس کے لئے ایک وقت مقرر کیا جاتا ہے اور کچھ دیر کے بعد جب وہ وقت پورا ہو جاتا ہے تو ایک دوسرے کی نظروں سے اوجھل ہو کر جو ''بشمالی'' باقی رہ جاتی ہیں دونوں ٹیمیں مل کر ان کو گننے لگتی ہیں۔ انمنٹ ''بشمالی'' کی تعداد جس ٹیم کی زیادہ ہو وہی ٹیم فاتح تصور کی جاتی ہے۔ اس کھیل کو بعض علاقوں میں ''پتپڑاق'' کہتے ہیں۔ ''ٹیک دونگ'' بچوں کا ایک ایسا کھیل ہے جس میں بٹن استعمال ہوتے ہیں۔ ایک جگہ پر چھوٹا سا گول بنا کر چار پانچ قدم کے فاصلے سے باری باری بٹن پھینک دیئے جاتے ہیں۔ جو بٹن گڑھے میں چلا جائے وہ اس

کھلاڑی کا ہو جاتا ہے۔ نوجوان اس کھیل کو بٹن کے بجائے نقدی پیسے بھی استعمال کرتے ہیں۔ گویا یہ کھیل جوئے کی دوسری شکل ہے۔

بلتستان میں نوجوان بچے ایک طرز کے دو کھیل ''چکہ'' اور ''اپوش'' یعنی گلی ڈنڈا کھیلتے ہیں۔ جو غالباً کرکٹ کی قدیم شکل ہے۔ فرق اتنا ہے کہ اسٹک اور گیند کی جگہ گلی اور ڈنڈا استعمال ہوتے ہیں۔ آدھ فٹ لکڑی کا پیمانہ ''اپوش'' یعنی گلی کو چھڑی کی مدد سے فضا میں اچھال کر ضرب لگاتے ہیں جبکہ مخالف ٹیم اس کو پکڑنے یا کسی چھڑی سے ہوا میں چھونے کی کوشش کرتی ہے۔ اگر وہ اس کوشش میں کامیاب ہوگئی تو مارنے والی ٹیم کو ''جلنا'' تصور کیا جاتا ہے اور کھیلنے والی ٹیم کا وہ کھلاڑی آوٹ ہو جاتا ہے۔ اگر ''اپوش'' کہیں چھوئے بغیر زمین پر گرے تو مخالف ٹیم اسے اٹھاتی ہے اور اس مقام کی طرف پھینک دیتی ہے جہاں اپوش کھیل رہا ہوتا ہے۔ اس مقام پر زمین میں ایک چھوٹا سا گڑھا بنایا ہوا ہوتا ہے جسے ''ہرکونگبو'' کہتے ہیں۔ اس گھڑے میں ''اپوش'' کو رکھ کر چھڑی سے ضرب دیتے ہوئے اچھالا جاتا ہے۔ اپوش کھیلنے والا اپنی چھڑی زمین پر ''ہرکونگبو'' کے اوپر رکھ دیتا ہے ۔ اگر ''اپوش'' پھینکنے والا چھڑی کو مارنے میں کامیاب ہو جائے تب بھی وہ کھلاڑی آوٹ ہو جاتا ہے۔ ''اپوش'' نہ لگنے کی صورت میں کھیل اسی طریقے پر جاری رہتا ہے اور کھلاڑی ڈنڈے کی مدد سے اسے ہوا میں اچھالتے ہوئے گنتا رہتا ہے۔ جتنا ڈنڈے پر لگے وہی نمبر بنتا ہے۔ اس کھیل کی ہار جیت کا معیار ''ہکٹ'' کہلاتا ہے جس کے آخری نمبر کے بارے میں دونوں ٹیموں کے آپس میں پہلے بیس بائیس نمبر طے ہو چکی ہوتی ہیں۔ جب یہ چکر پورا ہو جاتا ہے تو اپنی باری پر مخالف ٹیم کھیلنے کے لئے آتی ہے۔ اس کھیل میں کھلاڑیوں کی تعداد مخصوص نہیں ہوتی ہے۔

نوروز کے موقع پر بلتستان میں ایک کھیل ''چھرگہ تھب یا چھرغہ تھب'' کھیلا جاتا ہے۔ درمیان میں سفیدے کی بلی اٹھائے رکھی جاتی ہے اور دو پارٹیاں آر پار لمبی ڈنڈیاں ایک دوسرے پر مارنے کی کوشش کرتی ہیں۔ یہ کھیل صرف خپلو میں رائج ہے اور اس کھیل کے پس منظر میں ایک تاریخی واقعہ کا ذکر کرتے ہیں۔

بلتستان میں ''ردولین پھنگمہ'' یعنی گول پتھر پھینکنے کا مظاہرہ بھی کیا جاتا ہے۔ جو طاقت آزمائی کا کھیل ہے۔ اس میں پتھر پھینکنے کا مقابلہ ہوتا ہے اور سب سے دور پھینکنے والا بازی جیت لیتا ہے۔ اس کھیل کو جوان اور ادھیڑ عمر کے سب لوگ کھیلتے ہیں۔

بھیڑ بکری یا گائے کی پچھلی ٹانگ کی جوڑ والی ہڈی جسے بلتی میں ''شوٹ'' یا ''اور'' کہتے ہیں سے مختلف قسم کے سات کھیل کھیلے جاتے ہیں۔ اس ہڈی کے چھ پہلو ہوتے ہیں اور ہر پہلو کے لئے الگ نام مخصوص ہے (۱) عاشق (۲) رگیالفو (بادشاہ) (۳) ہرکونمہ (چور) (۴) بونگبو (گدھا)' (۵) شیسپا (مردہ)' (۶) گون۔

آنکھ مچولی ''ایپ ایپ'' چوں کا دلچسپ کھیل ہے جس میں دو ٹیمیں بنا کر ٹیم کے ارکان چھپ جاتے ہیں اور دوسری ٹیم کے ارکان انہیں ڈھونڈ لیتے ہیں۔ بچوں کا ایک کھیل ''شومبو پھنگمہ'' ہے جس میں دو ٹیمیں بنائی جاتی ہیں۔ ایک بڑا لڑکا ریفری کے فرائض انجام دیتا ہے جو تمام بچوں کی آنکھیں بند کرنے کا حکم دیتا ہے۔ بچوں کی آنکھیں بند کرنے کے بعد ریفری لکڑی کا ایک تنکا دور پھینک دیتا ہے۔ بچے اس تنکے سے پہلے ہی آشنا ہوتے ہیں۔ پھر ان کو اسے ڈھونڈ کر لانے کو کہا جاتا ہے۔ سارے لڑکے اس تنکے کو تلاش کرتے ہیں۔ جس کسی کے ہاتھ آجائے اٹھا کر ریفری کی طرف بھاگنے لگتا ہے۔ دوسری ٹیم کو پتہ چل جائے تو چھیننے کے لئے اسے پکڑ لیتی ہے۔ اور ہر دو ٹیم کے بچے آپس میں دست و گریبان ہو جاتے ہیں۔ جس ٹیم کا بچہ اس تنکے کو ریفری تک پہنچانے میں کامیاب ہو جائے اس کو ایک نمبر مل جاتا ہے۔ بچوں کا ایک کھیل ''اپی بجو'' کہلاتا ہے جس میں بچے ایک دوسرے کے پیچھے کمرے سے پکڑ کر قطار میں بیٹھ جاتے ہیں اور کسی ڈھلوان جگہ پر نیچے اترتے ہوئے کچھ عبارت بولتے ہیں۔ یہ کھیل دیہاتوں میں آج بھی رائج ہے۔

نوجوانوں کی تفریح طبع کا ایک ذریعہ بزم موسیقی ہے جو ''ہلتمو'' کہلاتا ہے۔ یہ محفلیں اکثر و بیشتر رات کو منعقد کی جاتی ہیں بالخصوص شادی بیاہ' رسم مے پھنگ اور نوجوانوں کی سیر و تفریحات کے موقعوں پر موسیقی کی محفلیں ضرور جمتی ہیں۔ یہ انتہائی اہم رسم ہے اور دوست و احباب مہینوں اس انتظار میں رہتے ہیں کہ کب یہ رات آئے گی اور پروانے جمع ہو کر محفل موسیقی جمائیں گے۔ سب سے پہلے اس محفل کے آغاز کے لئے لوک گیت الاپنا شروع کرتا ہے۔ حزنیہ گیت گانے کی صورت میں سب کی آنکھیں حزن و ملال کی تصویر بن جاتی ہیں اور اگر گیت رزمیہ ہو تو جوش و ولولے جنم لیتے ہیں۔ گویا ان گیتوں میں زندگی کے بکھرے ہوئے گوناگوں واقعات کی عکاسی ہوتی ہے۔ لوک گیت کے خاتمے پر دیوان کی طرف پلٹتے ہیں جس کی بندش اور ادائیگی لوک گیت (رگیا خلو) سے مختلف ہوتی ہے۔ دیوان کو بلتی میں ''برخلو'' بھی کہتے ہیں اور یہ نیم کلاسیکی گیت کا درجہ رکھتے ہیں۔ آہستہ آہستہ ان سروں میں تیزی آجاتی ہے اور پھر عام غزلیں گائی جاتی ہیں۔

کشتی:

بلتستان میں کشتی بھی لڑی جاتی ہے لیکن اس کا انداز موجودہ دور کے بین الاقوامی سطح پر لڑی جانے والی کشتی سے قدرے مختلف ہے۔ اس میں دونوں کھلاڑی ایک دوسرے سے چھاتی ملاتے اور ایک دوسرے کے ہاتھ میں بغلیں برابر کر کے داؤ پیچ لگاتے ہیں۔ طاقت آزمائی کی جاتی ہے اور ایک دوسرے کو نیچے گرانے کی کوشش ہوتی ہے۔ اس کھیل میں ہر عمر کے کھلاڑی حصہ لیتے ہیں۔

ٹاپو:

چھوٹے بچوں کا ایک کھیل ''ٹاپو'' ہے۔ زمین پر دس خانوں پر مشتمل ایک نقشہ بنا کر (سامنے کی شکل ملاحظہ ہو) اس میں گول پتھر کی نکی پھینک دی جاتی ہے اور کھلاڑی ایک پاؤں پر کھڑا ہو کر پھدکتے ہوئے اسی پاؤں سے اس پتھر کو ایک خاص اصول کے تحت ان خانوں میں سے گزار کر علی الترتیب نکال لیتا ہے۔ یہ بچوں کا انتہائی دلچسپ کھیل ہے۔ بلتستان کے مختلف علاقوں میں یہ شکل مختلف اور اس کے کھیلنے کے طریقے الگ ہیں۔

چھولو:

بچیاں چھوٹی چھوٹی گول کنکریوں سے ایک کھیل کھیلتی ہیں جسے ''چھولو'' کہتے ہیں۔ اس میں کنکریوں کو زمین پر لکیر کے ایک چھوٹے دائرے میں رکھ کر قدرے بڑے کنکر کو ہوا میں پھینک دیا جاتا ہے اور نیچے زمین سے ایک کنکر لیتی ہے اور ساتھ ہی ہوا میں پھینکی ہوئی کنکر کو بھی پکڑ لیتی ہیں۔ اسی طرح یکے بعد دیگرے سارے کنکر چن لیتی ہیں۔ اگر اس کنکر کو نہ پکڑ سکی تو آؤٹ ہو جاتی ہے۔

متفرق کھیل:

جوان لڑکے انڈے لڑانے اور انڈوں کی دوڑ کا کھیل بڑے ذوق وشوق سے کھیلتے ہیں۔ انڈوں کا یہ کھیل ہر سال جشن نوروز کے موقع پر صرف ہفتہ بھر کے لئے مخصوص ہوتا ہے۔

بچے اور بچیاں ''اورا'' اور ''انجالی کو'' یا ''جنجالی کو'' بھی کھیلتے ہیں۔ یہ دونوں کھیل دراصل بچوں کے کھیل ہیں تاہم بسا اوقات چھوٹی عمر کی بچیاں بھی حصہ لیتی ہیں۔ ''اورا'' ایک قسم کا جھولا ہے جس میں ایک رسی کسی درخت کی مضبوط شاخ سے لٹکائی جاتی ہے اور اسی رسی پر پاؤں رکھ کر دونوں کناروں کو ہاتھ میں مضبوط پکڑ لیتے ہیں پھر ایک ساتھ رسی کو زور سے پھینک دیا جاتا ہے اور جھولنے والا اپنی مہارت سے دیر تک جھولتا رہتا ہے۔ ''انجالی کو'' یا ''جنجالی کو'' میں سفیدے کی ایک بلی ایک ایسی جگہ پر رکھ دی جاتی ہے جس کا مرکزی حصہ زمین سے چھوئے اور دونوں سروں کی جگہ نشیبی ہوتا کہ بلی کے دونوں سروں پر ایک ایک بچہ بیٹھ کر اوپر نیچے جھول سکے۔ جوان لڑکے سردیوں کی رات گزارنے کے لئے ایک جگہ جمع ہو جاتے ہیں اور انگوٹھی چھپانے کا ایک کھیل کھیلا جاتا ہے۔ ان کے آپس میں دو ٹیمیں بنا کر کسی چادر کے نیچے ایک ٹیم کو انگوٹھی دی جاتی ہے۔ وہ ٹیم اسے اپنے ارکان کو ان کا چہرہ اور حساسیت دیکھ کر بتانا ہوتا ہے کہ انگوٹھی فلان شخص کے فلان ہاتھ میں موجود ہے۔ نشاندہی برابر آنے کی صورت میں ان کو ایک نمبر مل جاتا ہے بصورت دیگر مخالف ٹیم کا نمبر بن جاتا ہے یہ ''خسوروب بوربا'' Khsurub Borba کہلاتا ہے۔ اس کھیل میں چہرہ پڑھنے اور نفسیات معلوم کرنے کی صلاحیت کا عملی مظاہرہ ہوتا ہے۔

بچے گرمیوں کے موسم میں گاؤں کے تالابوں اور نہروں میں دن بھر کھیلتے رہتے ہیں۔ یہ بچے تالابوں اور ندیوں کے گہرے پانی میں سفید پتھر پھینکتے اور خود چھلانگ لگا کر پانی کی تہہ سے اس پتھر کو نکال لاتے ہیں جس سے بعد میں ان بچوں کو فن تیراکی میں مہارت حاصل ہو جاتی ہے۔

عہد رفتہ میں کتے لڑانا ''کھی کھڑیل''، مرغے لڑانا ''بیا پھوٹھپ'' اور یاک لڑانا ''بیاق ٹھپ'' بلتستان کے جوانوں اور ادھیڑ عمر کے لوگوں کا دلچسپ مشغلہ تھا۔ اس کے علاوہ مسخرے، نقال اور کرتب دکھانے والے بھی ہوتے جو تقریبات کی رونق کو دوبالا کرتے تھے۔ اب کچھ عرصہ سے یہ کھیل تقریباً متروک ہو چکے ہیں۔

آج کل چھوٹے بچے شیشے کی گولیوں سے ایک کھیل ''بنٹا'' کھیلتے ہیں۔ اس کی بابت لوک روایات اور آثار و قرائن کی رو سے کہا جا سکتا ہے کہ یہ کھیل بلتستان میں پرانے زمانے میں رائج چلا آ رہا ہے۔ اس وقت یہ ''پنٹا'' کہلاتا تھا۔ سکردو میں کھرپوچو پہاڑی کے اوپر گمبہ رت کے مقام پر ایک بڑا پتھر آج بھی موجود ہے جس پر چھوٹے چھوٹے گھڑے بنے ہوئے ہیں اور یہ ''پنٹا ہرژے پھونگ'' یعنی ''پنٹا کھیلنے کا پتھر'' کے نام سے موسوم ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس کھیل کو ان دنوں راجاؤں کی سرپرستی حاصل تھی۔ راجے خود بھی یہ کھیل کھیلا کرتے تھے۔ بتایا جاتا ہے کہ اس کھیل کے انعقاد کے لئے باقاعدہ منتظم مقرر تھے اور سکردو کے موضع سندوس میں اس کھیل کا منتظم خاندان اسی مناسبت سے ''پنٹاپا'' مشہور تھا جن کی اولاد اب یہاں ختم ہو چکی ہے۔

لوک علاج، دم درود اور ٹونے ٹوٹکے:

بلتستان کے معاشرے میں جب کوئی شخص بیمار پڑتا ہے تو اس کی عیادت

کے لئے عزیز ورشتہ دار اور سارے محلّہ دار جوق در جوق جمع ہو جاتے ہیں اور مریض کی تشخیص، اس کے علاج اور پرہیز کے بارے میں ہر کوئی اپنی تجاویز پیش کرتا ہے۔ جدید علاج معالجے کی سہولیات کے باوجود یونانی طب اور بدھی طریقہ علاج کے مطابق سینگی کھینچنا، نشتر لگانا، آگ سے داغنا اور جڑی بوٹیوں کے ذریعے علاج ومعالجے کا رواج اب بھی یہاں کے معاشرے میں عام ہے۔ یہ طریقہ علاج اگرچہ جدید سائنسی اعتبار سے مستند نہیں لیکن اس کے عامل مریض کے ذہن میں ایک ایسا سکون پیدا کر دیتا ہے جس سے مریض نفسیاتی طور پر بہتر محسوس کرتا ہے۔ بلتستان کے قدیم طریقہ علاج معالجہ کے بارے میں G.T.Vigne اپنی کتاب میں لکھتے ہیں کہ وہ 1835ء میں جب بلتستان کے دورہ پر تھا تو اس وقت خپلو میں ایک مقامی طبیب سے ان کی ملاقات ہوگئی جن کے پاس تبتی زبان ''اگے'' رسم الخط میں لکھی ہوئی مقامی طب کی ایک قلمی کتاب ''سمن شوق'' تھی۔

لوک طبیب ایک تو خودرو ہیں اور ان کی کہیں تربیت کا ذریعہ موروثی ہوتا ہے اور وہ اپنے اجداد سے سینہ بہ سینہ منتقل ہونے والے نسخے مریضوں کو بتاتے ہیں وہ سب زبانی یادداشت پر مبنی ہوتے ہیں۔ ان کے تجربات کے مطابق خون کی خرابی کو جن امراض کا سبب قرار دیا جائے تو فاسد خون کی نشتر دے کر ایک خاص اندازے کے مطابق خون خارج کر کے اس کا علاج کیا جاتا ہے۔

ہڈی کے ٹوٹنے کی صورت میں اس ہڈی کو کھینچ تان کر اپنی جگہ لایا جاتا اور اسے بیر کے چھلکے میں لپیٹ کر باندھ دیا جاتا ہے۔ اگر کسی جوڑ سے نکل گیا ہو تو اُسے تختے کے ٹکڑے کو سوراخ کر کے ایک خاص طریقے سے باندھا جاتا ہے۔ اس طرح یہ فریکچر مقررہ مدت کے اندر ٹھیک ہو جاتا ہے۔ اس عمل کو ''بیانکبو کلبا'' کہتے ہیں۔ بھڑ کے ڈسنے پر اس کے زہر سے وہ جگہ متورم ہو جاتی ہے جس کے لئے صدیوں پرانا ایک علاج یہاں اب بھی رائج العمل ہے۔ یعنی سفید پتھر کو باریک پیس کر اس کے سفوف میں تھوڑا پانی ڈالا جاتا ہے اور لوشن بنا کر اس جگہ لگایا جاتا ہے جہاں بھڑ نے کاٹا ہو۔ کہیں چھوٹا سا زخم ہو اور خون بہنے لگے تو اس زخم پر مکڑی کا جال رکھ کر خون بند کیا جاتا ہے۔ نیز بڑا زخم ہو تو خون بند کرنے کے لئے سوتی کپڑا جلا کر اس کی راکھ استعمال کی جاتی ہے۔ بلتیوں کا خیال ہے کہ زخموں کے اندمال کے لئے یہ دونوں طریقے بڑے موثر ہیں۔ برف میں کسی کا عضو جل جائے تو اس شخص کو اپنا پیشاب اس کے لئے دوا کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے یعنی اس جگہ پر وہ خود پیشاب کرتا ہے تو ٹھیک ہو جاتا ہے۔ خسرہ اور یرقان کے لئے آگ سے داغا جاتا ہے۔ داغنے کا عمل کبھی سر کے عین وسط میں اور کبھی چھنگلیا کی نوک پر کیا جاتا ہے۔

اس عمل پر لوگوں کو بڑا اعتقاد ہے۔ علاوہ ازیں نجوم کی کتابوں کے ذریعے اکثر بیماری کے ابتدائی ایام میں مریض کو اس طرح زیر علاج رکھا جاتا ہے اور آخری مرحلہ پر اگر کتاب سے نیک فال نکل آئے تو اسے ہسپتال پہنچا دیا جاتا ہے۔ گویا علاج و معالجہ پر یہاں کے معاشرے میں جدید ٹیکنالوجی کے تحت کوئی خاص دھیان نہیں دیا جاتا ہے۔ عام طور پر لوگوں کی عادت یہ بھی ہے کہ جب اپنے کسی عزیز دوست سے ملاقات ہو جاتی ہے تو خیریت دریافت کرنے کے فوراً بعد اس سے پوچھ لیا کرتے ہیں کہ آپ کمزور کیوں ہو گئے ہیں؟ اس کو بار بار اپنی کمزوری کا احساس دلانے سے نفسیاتی طور پر وہ شخص اپنے آپ کو بیمار تصور کرتا ہے۔ بلتستان کے لوگ بیمار کی شفایابی کے لئے صدقہ وخیرات اور نذر و نیاز دینے کے علاوہ دم دعاؤں اور تعویذوں کے بڑے معتقد ہیں۔ تعویذ ایک متبرک درخت کے چھلکے بھوج پتر جسے مقامی زبان میں ''چوا'' کہتے ہیں پر زعفران کی روشنائی سے لکھا جاتا ہے۔ چنانچہ ٹونے ٹوٹکے اور تعویذ والوں کا بڑا دھندا چلتا ہے۔ گاؤں گاؤں قریہ قریہ تعویذ گنڈے اور ٹونے ٹوٹکے کے ماہرین مصروف عمل ہیں۔ چشم بد سے دور رکھنے کیلئے تعویذوں کی بڑی مانگ ہے۔ یہ کام زیادہ تر خواتین کراتی ہیں۔ یہاں تقریباً ہر بیماری کو سایہ کہا جاتا ہے اور ایسے مریضوں سے علاج کیلئے مذہبی ملا یا اخوند کی خدمات حاصل کی جاتی ہیں۔ کتابی نجومیوں کے علاوہ یہاں علاج و معالجہ کرنے والوں کی ایک اور قسم بھی موجود ہے جو ''بان'' یا مِک تھونگ کہلاتا ہے۔ یہ لوگ کچھ دیر عمل کرنے کے بعد نیم بے ہوش ہو جاتے اور غیبی باتیں کرنے لگتے ہیں۔ ان کا دعویٰ ہے کہ اس دوران جنات انہیں غیب کی خبریں دیتے ہیں۔

بلتستان میں اکثر امراض کو آسیب اور چشم بد کے کھاتے میں ڈال کر جنات کے عامل کو علاج کے لئے بلایا جاتا ہے اور جنات کے عامل سے اس کا علاج شروع کرایا جاتا ہے۔ عامل کا طریقہ کار بھی بڑا دلچسپ ہوتا ہے۔ وہ عملیات کے ذریعے جنات کو حاضر کرتا ہے اور اس سے گفتگو مریض یا مریضہ کی زبان سے ہوتی ہے اور عامل بوقت ضرورت بیمار کو مار مار کر بے حال کر دیتا ہے۔ اس کے بعد وہ جن باتوں باتوں میں دوبارہ نہ آنے کا وعدہ کر کے مریض کے جسم سے نکل کر چلا جاتا ہے۔

لوک علاج کی جڑی بوٹیاں:

بلتستان کے لوگ از منہ قدیم سے نباتات اور جڑی بوٹیوں سے اکثر بیماریوں کا علاج خود کرتے ہیں۔ گھر کا بڑے بوڑھے ان جڑی بوٹیوں کے فوائد

بھی زیریں چترال میں ڈمیل اور ارندو کی وادیوں میں پایا جاتا ہے۔

بالائی چترال ''کھو'' ثقافت کی وجہ سے مشہور ہے۔ یہ علاقہ تورکھو، موڑکھو اور مستوج کے نام سے تین الگ خطوں میں منقسم ہے۔ چترال کی ثقافت میں اشور جان اور بیگاں کے گیت زیریں چترال کے سین، اور شخور سے وابستہ ہیں۔ جبکہ یارمن ہمیں، ڈوک پکدیز، نان دوشی اور لوک ژور کا تعلق موڑکھو، تورکھو اور مستوج کے مقابات سٹوگرام، کھوت، لاسپور اور چنار سے ہے۔ ہرن اس علاقے کا خاص جانور ہے۔ جو برفانی پہاڑوں پر رہتا ہے۔ یہاں کے جنگلات میں بید، صنوبر، اور بھورج خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ تیتر اور چکور پورے چترال میں پائے جاتے ہیں۔ مایون یہاں کا موسمی پرندہ ہے جو موسم بہار میں جنوب مغرب کیطرف سے آتا ہے۔ اس پرندے کو لوک روایات میں غیر معمولی اہمیت حاصل ہے۔ اسکی اواز کھوار لہجے میں بولتی ہوئی سنائی دیتی ہے۔ روایتی طور پر مایون دو عام سوالوں کا یوں جواب دیتا ہے۔

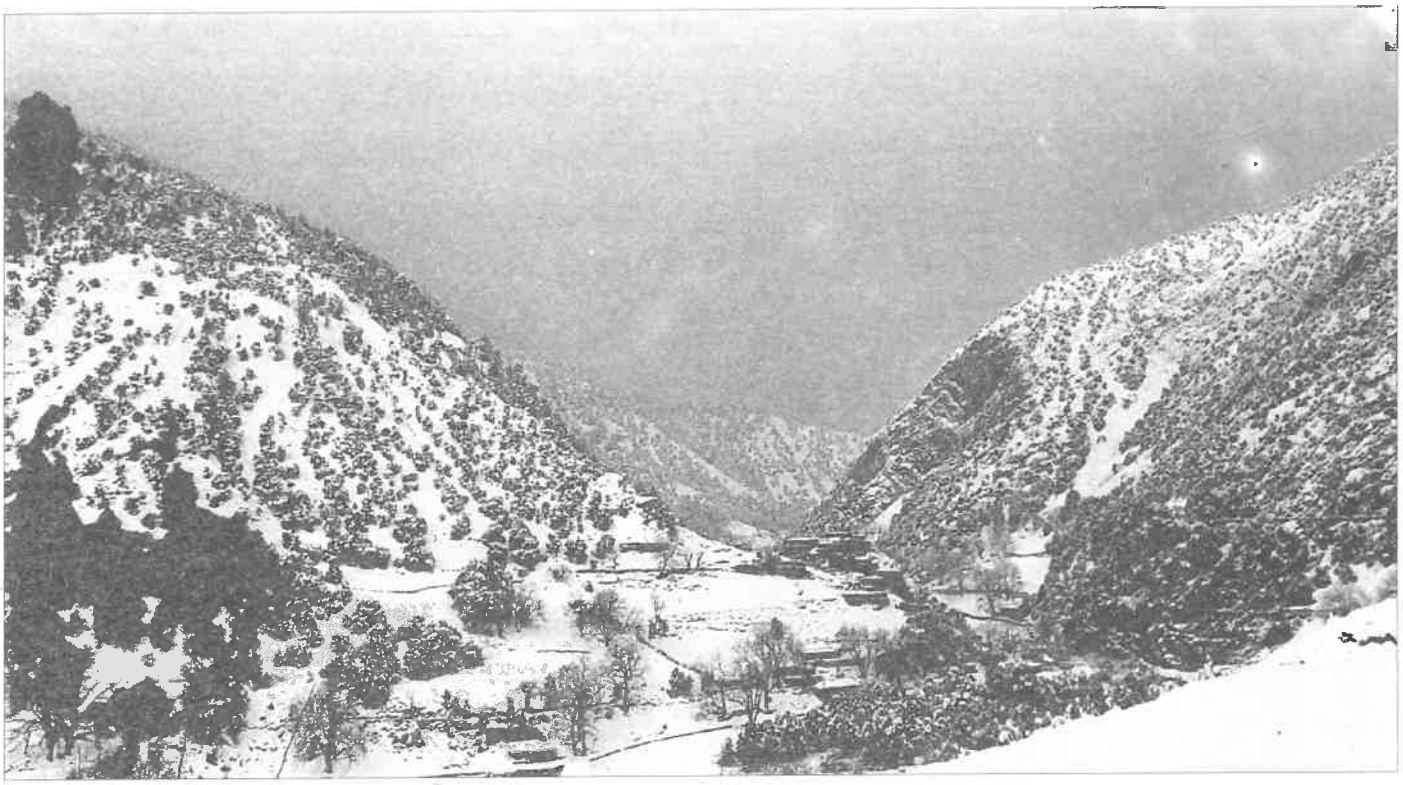
سوال۔	افو کیہ وخت؟	(اُدھر کونسا موسم ہے)
جواب۔	ژوڑی پوچیرو۔	(خوبانی پک گئے)
سوال۔	شوبخو آلاوا؟	(کیا سوئی لائے ہو؟)
جواب۔	بوختو ٹیکہ روخیرو	(پتھر پر بھول آیا)

فصلیں:

گندم، جوار، باجرہ، چاول اور جو چترال کی بڑی فصلیں ہیں۔ کپاس بھی کاشت ہوتی تھی پھر متروک ہوئی۔ مٹر اور دالیں (مونگ وغیرہ) بھی کاشت ہوتی ہیں۔ 600 فٹ کی بلندی تک سال میں دو فصلیں ہوتی ہیں۔ اس کے اوپر صرف ایک فصل ہوتی ہے۔ انگور، اخروٹ، شہتوت، خوبانی، سیب اور ناشپاتی یہاں کے خاص پھل ہیں۔ بھیڑ کے اُون سے چترال میں گرم پٹی تیار ہوتی ہے۔ جو گھریلو دستکاریوں میں بڑی دستکاری ہے۔ بکری کے بالوں سے نمدے، اونی قالین، ریشمی کشیدہ کاری، لکڑی کے کام، اور مٹی کے برتن یہاں کی روایتی مصنوعات ہیں۔

تاریخ

چترال کی تاریخ کا تحریری حصہ ڈھائی ہزار سالوں پر محیط ہے۔ 500 قبل مسیح میں یہاں ایرانیوں کی عملداری تھی۔ اسکے بعد سکندر مقدونی کی فوجوں کا ذکر ملتا ہے۔ قدیم لوک روایات میں آگ کی پرستش اور لقمان حکیم کے طریقہ علاج روم اور یونان، مصر اور چین و ماچین کے ملکوں کا بڑا ذکر آتا ہے۔ پہلی صدی عیسوی سے ساتویں صدی تک یہ علاقہ چینیوں کا باجگزار رہا۔ اس دور میں گندھارا کے راجہ کنشکا نے بھی اسے تاراج کیا۔ آٹھویں صدی کے لگ بھگ کا ذکر آتا ہے کہ چینیوں کی باجگزاری میں چترال کے اندر مقامی سرداری نے سر اُٹھایا۔ بہمن کھوستانی کا نام پہلے مقامی سردار کے طور پر لیا جاتا ہے۔ بہمن نے چینیوں کی طرز میں بالائی چترال کے مقام مژگول میں ایک پہاڑی چوٹی پر اپنا قلعہ بھی تعمیر کیا۔ مارخور اور ہرن کے سینگوں کی مدد سے پائپ لائن بچھا کر اس کیلئے پانی لایا گیا۔ بہمن کے بارے میں لوک روایات میں یہ بھی مشہور ہے کہ ایک مسلمان سردار امیر حمزہ کے ساتھ کئی لڑائیاں لڑیں۔ اس دور میں چترال کا زیریں حصہ کالاش سرداروں کے زیر نگین آیا جہاں بلہ سنگ، راجہ وائے اور دیگر سرداروں نے حکومت کی۔ بالائی حصے پر خاندان سو ملک اور دیگر سرداروں نے اپنا سکہ جمایا۔ لیکن تسلسل اور خود مختاری کیساتھ کسی کو اقتدار نہیں ملا۔ یہاں تک کہ 1320ء میں ترکستان کے رئیسہ خاندان پہلے بالائی چترال کو زیر نگیں لایا پھر زیریں چترال پر یورش کر کے کالاش سرداروں کو شکست دے کر اپنی عملداری چترال کے طول و عرض پر قائم کی۔ سینہ بہ سینہ چلی آنے والی روایات میں لوک تاریخ کے عجیب واقعات ملتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ اناج کے ڈھیر مٹی کے ٹیلوں کے برابر اور گائے، بھیڑ بکریوں کے تھن پورے پیٹ پر محیط ہوتے تھے۔ شندور میں بکریں چرانے والا چرواہا دوپہر کے وقت بکریوں کے ریوڑ کو سلا کر 160 کلومیٹر دور چترال کے پولوگراؤنڈ میں پولو کھیلنے آتا تھا۔ اور واپس شندور جاتا تو نہ سورج غروب ہوا ہوتا اور نہ کوئی بکری جاگی ہوتی۔ کہتے ہیں کہ امیر حمزہ کا گھوڑا ایک پہاڑ سے دوسرے پہاڑ پر چھلانگ لگاتا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ ترچ میر پر پریوں کا بہت بڑا قلعہ تھا۔ اور پورا چترال سرکش دیووں اور پریوں کا قید خانہ تھا۔ امیر حمزہ کی تلوار نے بڑے بڑے دیووں کو تہہ تیغ کیا۔ اس تلوار اور گھوڑے کو سخی شاہ مردان سے بھی منسوب کیا جاتا ہے۔ رئیس خاندان کے بعد 1580ء میں خاندان سنگین علی اور خاندان کٹور کی حکومت قائم ہوئی۔ کچھ علاقے خاندان خوش وقت کے ماتحت رہے۔ ان کا جد اعلیٰ بابا ایوب سرمست ایک فقیر کے بھیس میں چترال آیا تھا۔ ان کے مرشد خواجہ شمس الدینؒ اور ایک فقیر شاہ بورائے والیؒ کی دعا سے انکی اولاد کو حکومت ملی ایک اور فقیر صوفی صاحب سینگور کی بددعا کی وجہ سے اس خاندان کے زوال کا آغاز ہوا۔ اور 1969ء میں چترال کے ضلع بننے کے بعد 1974ء میں ریاستی حکومت کا خاتمہ ہوا اس سے قبل کٹور عہد کے دوران 1895ء میں ایک محاصرے کے بعد انگریزوں نے محاصرین کو شکست دیکر چترال کو اپنی زیر نگین نوآبادیات میں شامل کیا تھا۔ 1947ء میں چترال کی ریاست نے پاکستان



موسم سرما میں چترال کا ایک منظر

کے ساتھ الحاق کا اعلان کیا۔ (مرزا محمد عفران، ایضاً صفحہ 242) چترال زمانہ قدیم میں بدھ مت کا گڑھ رہا مگر یہاں بدھ مت کے آثار بہت کم پائے گئے ہیں۔ کلاش مذہب بھی ایک زمانے میں عروج پر رہا۔ اس کے بہت تھوڑے اثرات موجود ہیں۔ تیرھویں صدی کے بعد یہاں اسلام کی دعوت پھیلی۔ تاج مغل، اخون سلا، اور ناصر خسرو (1004ء) کی دعوت اسلام کا ذکر لوک روایات میں تواتر سے ملتا ہے۔ پیر شاہ ناصر خسرو کی چلہ گاہ کو گرم چشمہ زیریں چترال میں زیارت کا درجہ حاصل ہے۔ بالائی چترال میں تورکھوکھوت کے مقام پر گیسو مبارک کی زیارت ہے۔ جسے گیسوؤ زیارت کہتے ہیں۔ اسے ایک بزرگ نے خواب میں دیکھا۔ اور پیغمبر اسلام محمد ﷺ کے گیسو مبارک سے تعبیر کر کے زیارت بنایا۔ یہاں گیسو مبارک کو سات صندوقوں میں بند کر کے رکھا گیا ہے۔ اسی طرح بالائی چترال کے مقام سنوغر میں شاہ رضائے ولی کا مزار اور زیریں چترال میں بازار کہنہ کے مقام پر شاہ بوریائے دہلی کا مزار بھی مرجع خلائق ہے۔ مگر چترال کی روایات میں عرس اور میلے کا رواج نہیں ہے۔ اس لئے برگر، موری لشٹ جنالکوچ، لون، ارکاری وغیرہ مقامات پر مزارات تو ہیں مگر رونق اور ثقافتی سرگرمی کسی مزار پر نہیں ہے۔ البتہ مختلف مکاتب فکر کے اولیائے کرام کی کرامات کے تذکرے زبان زد عام ہیں اور ان کرامات کو لوک ورثے کا حصہ سمجھا جاتا ہے۔ مثلاً پیر شاہ ناصر خسرو اور شاہ بابا رضائے ولی کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ زمین کے اندر غوطہ لگاتے تھے۔ یہاں غائب ہو کر وہاں زمین سے برآمد ہوتے تھے۔ پہاڑ، دریا، چٹان ان کے سامنے نہیں آتا تھا۔ چنانچہ چترال، یمگان، خراسان، بدخشان انکے زیر زمین غوطہ زنی کی راہ میں محض ایک پڑاؤ کی حیثیت رکھتے تھے۔ اسی طرح بابا شاہ بورائے ولیؒ اور شاہ رضائے ولیؒ کے بارے میں یہ روایت مشہور ہے کہ دفن کے بعد دونوں بزرگ سرحد پار کر کے بدخشاں جاتے ہوئے مسافروں کو ملے۔ مسافروں کے بتانے پر قبریں کھودی گئیں تو خالی کفن پایا گیا یا صندل کی لکڑی پائی گئی۔ کہا جاتا ہے کہ خواجہ شمس الدینؒ بابا ایوبؒ اور پانچ دیگر درویشوں کو ایک جگہ انتظار کا حکم دیکر چلے گئے واپس آئے تو صرف بابا ایوبؒ کو محو انتظار پایا۔ اور دعا دی کہ تیری اولاد حکمرانی کرے گی۔ اسکی اولاد نے خاندان کٹور کے نام سے حکومت کی۔ شاہ بورائے ولیؒ کے بارے مشہور ہے کہ انہوں نے وفات کے بعد بدخشان کی سرحد چترال کے مہتر نادر شا رئیس کو ایک سیب اور سنگین علی کو دوسرا سیب بھیجا۔ نادر شاہ رئیس نے نصف سیب کھایا حکومت سے محروم ہوئے۔ سنگین علی نے پورا سیب کھایا اور حکمران بنے۔ اسی طرح صوفی مرزا محمدؒ سینگور کے بارے میں مشہور ہے کہ انہوں نے اعلیٰ حضرت شجاع الملک کے زمانے میں اپنی ضمانت پر جنگجو سردار دانیال بیگ کو چترال واپس لایا لیکن 1919ء کی تیسری افغان جنگ میں محاذ پر جاتے ہوئے راستے میں انہیں

پختون (پٹھان):

پٹھان یا پختون انیسویں اور بیسویں صدی میں دیر، باجوڑ، اور افغانستان کے مختلف دروں سے چترال آئے۔ اگرچہ مختلف قبیلوں سے تعلق رکھتے ہیں مگر چترال میں پختون کی حیثیت سے اپنی پہچان رکھتے ہیں۔ اگرچہ انکی زیادہ آبادی جنوبی حصوں میں ہے۔ تاہم چترال خاص کے علاوہ شمال اور مغرب کی طرف مختلف دیہات میں پھیلے ہوئے ہیں تاہم کھوا بادی میں مدغم نہیں ہوئے۔ اپنی زبان اور تہذیب وثقافت کو محفوظ رکھا ہوا ہے۔

بشگالی (شیخان):

اس قبیلے کو انکے سابقہ مسکن بشگال (نورستان) کی مناسبت سے چترال میں بشگالی کہا جاتا ہے۔ یہ قبیلہ انیسویں صدی کے نصف آخر کے دوران ترک وطن کر کے چترال آیا۔ ان کا تعلق افغانستان کی اُس مشہور نسل سے ہے جسے تاریخ میں ''سیاہ پوش'' کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ انہی کے وطن کو کافرستان کہا گیا ہے جواب نورستان امتیازی نام سے پہچانا جاتا ہے۔ یہ قبیلہ بیسویں صدی میں مشرف بہ اسلام ہوا۔ چترال میں لٹکوہ کے علاقہ گوبور کے علاوہ رمبور اور بمبوریت میں بھی انکی خاصی آبادی ہے۔ اپنی تہذیب وثقافت کو انہوں نے اپنی زبان اور لباس کے ساتھ محفوظ رکھا ہوا ہے۔ چترال میں انہیں شیخ بھی کہتے ہیں۔ مغربی محققین نے کلاش سے امتیاز کیلئے ان کو اپنی طرف سے سرخ کافر کا نام دیا تھا۔

تاجک (مڈاکلشٹی):

افغانستان سے قریباً دوسو سال پہلے (غالباً اٹھارھویں صدی میں) ترک وطن کر کے آنے والا یہ قبیلہ چترال میں اپنے مسکن کی مناسبت سے مڈاکلشٹی کہلاتا ہے۔ مگر اسکی اصلیت تاجک ہے۔ کہا جاتا ہے کہ مہتر چترال نے اس قبیلے کو خاص دعوت پر چترال بلایا تھا۔ اور اس قبیلے کے بزرگ بندوق، نیزے اور دیگر جنگی ہتھیار بنانے کا کام جانتے تھے۔ جنوبی چترال میں شیشی کوہ کیوادی کے آخر میں ان کی آبادی ہے۔ اپنی بستی میں یہ تاجک قبیلہ اپنی ثقافت کو محفوظ رکھے ہوئے ہے۔ اور انکی اپنی زبان بولی جاتی ہے۔ جودری کی قدیم صورت ہے۔

مُنجی:

زیریں چترال کی وادی لٹکوہ میں پارا بیک کے مقام پر منجان (افغانستان) سے ترک وطن کر کے آنے والے قبیلے کا مسکن ہے۔ لوک روایات کے مطابق ان کا مورث اعلیٰ پیر شاہ ناصر خسرو کے دور میں آیا تھا۔ اس حساب سے انکی آمد کا زمانہ 77-1040 کے لگ بھگ ہوگا۔ اس قبیلے کی آبادی آس پاس دیگر علاقوں میں نہیں پھیلی۔ اپنی تہذیب وثقافت اور یدغہ زبان کو ان لوگوں نے محفوظ رکھا ہے۔



کلاشی بچیاں اپنے مخصوص لباس میں

کلاش:

یہ ہندوکش کی وادیوں میں آباد سیاہ پوش کافروں کا گروہ ہے اور چترال میں آباد قبائل میں سے کلاش سب سے مشہور قبیلہ ہے۔ ان کی نسبت سے وادی بریر بمبوریت اور رمبور کو کلاش گوم کہا جاتا ہے۔ کلاش کی اصلیت کے بارے میں اُنکی اپنی روایات اور لوک گیتوں میں کہا جاتا ہے کہ ملک سیام سے آئے ہیں۔ کچھ لوگ انہیں سکندر اعظم کے دستے کی باقیات خیال کرتے ہیں۔ تاریخی حوالوں سے رابرٹ سن، پروفیسر مارگن سٹرن، پروفیسر سیگر اور پروفیسر اسرار الدین نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ گیارھویں صدی عیسوی میں کلاش افغانستان کے صوبہ کُنٹر میں رہتے تھے۔ محمود غزنوی کے حملوں سے نالان ہو کر ویگال سے چترال میں پناہ گیر ہوئے اور زیریں چترال میں اپنی عملداری قائم کی۔ تاریخ میں یہ قبیلہ ''کالے کافر'' کے نام سے موسوم ہے۔ اس قبیلے نے اپنا قدیم مذہب، اور صدیوں پرانا لباس اب تک نہیں چھوڑا۔

کلاش مذہب میں خدا کا تصور ہے مگر ساتھ ساتھ مختلف دیوتاؤں کی پرستش کی جاتی ہے اور دیوتاؤں کے نام پر قربانیاں دی جاتی ہیں۔ کلاش مذہب میں تہواروں کو خاص اہمیت دی جاتی ہے۔ موت کا سوگ ناچ گانے کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ مذہبی اور معاشرتی اقدار میں پاک اور ناپاک کا ایک منفرد تصور پایا جاتا ہے۔ زچگی اور مخصوص ایام میں عورتوں کو گاؤں سے باہر خاص مقام پر رکھا جاتا ہے۔ مرغی کو بھی ناپاک سمجھا جاتا ہے۔ کلاش کے خاص خاص تہوار چار ہیں (۱) چلیم جوش، موسم بہار کا تہوار ہے یہ تہوار ماہ مئی کے تین دن رہتا ہے۔ خصوصی پکوان پکائے

جاتے ہیں۔ ناچ اور گانے کیساتھ خوشی منائی جاتی ہے۔ یہ تہوار تینوں وادیوں میں منایا جاتا ہے۔ (۲) اوچال۔ موسم خزاں کا تہوار ہے۔ ماہ اکتوبر میں منایا جاتا ہے اس کا دورانیہ ایک دن ہوتا ہے۔ اس میں بھی چلیم جوش کی طرح مذہبی رسومات ادا کی جاتی ہیں۔ اور ایک میدان میں جمع ہو کر مرد و زن ملکر گاتے اور ناچتے ہیں۔ یہ بھی تینوں کلاش وادیوں میں ایک ساتھ ہوتا ہے۔ (۳) چیڑ ماس، موسم سرما کا تہوار ہے۔ اسے چاؤمس یعنی قربانی کا تہوار بھی کہتے ہیں۔ اس موقع پر قربان گاہوں پر بکروں کی قربانیاں دی جاتی ہیں۔ تینوں وادیوں میں سات دن تک خوشی منائی جاتی ہے۔ اسمیں ناچ، گانوں کا مقابلہ ہوتا ہے۔ (۴) پوڑ نام کا ایک روزہ تہوار موسم خزاں میں صرف بریر میں منایا جاتا ہے۔

گُجر:

گجر کی آبادی چترال کے جنوب میں دیار اور بلوط کے جنگلات پر مشتمل وادیوں میں بستی ہے۔ کچھ خانہ بدوش ہیں جو قلنگ دے کر مختلف چراگاہوں میں اپنا اور دوسروں کا ریوڑ پالتے ہیں۔ چترال میں گجر قبیلے کی آمد انیسویں صدی کے اندر عمل میں آئی۔ ابتداء میں ہزارہ اور سوات سے یہاں آکر خانہ بدوش رہے۔ آہستہ آہستہ مختلف سرمائی چراگاہوں میں زمین خرید کر زراعت اور کاروبار کی طرف بھی مائل ہوئے۔ گجر قبیلہ وائٹ ہُن یا افتالی قبائل سے تعلق رکھتا ہے۔ جو پانچویں صدی عیسوی میں شمال کی طرف سے پاک و ہند میں وارد ہوئے۔

واخی:

چترال میں وخان کے باشندوں کو وُخیک اور افغانستان میں واخانی کہا جاتا ہے۔ انگریزی اور اردو میں انکے لئے ''واخی'' کا نام مستعمل ہے۔ چترال میں واخی تارکین وطن برو غیل کے راستے انیسویں صدی میں امیر عبدالرحمان خان کے عہد میں لازمی عسکری بھرتی ''پشک'' سے بھاگ کر وارد ہوئے۔ مگر زیادہ آبادی نے 1936 سے 1942 کے دوران نقل مکانی کی اور وخان کی سرحد سے متصل وادی یارخون کے بالائی مقام بروخیل میں سکونت پذیر ہوئے۔ گلہ بانی کے ساتھ زراعت کا پیشہ بھی انہوں نے اپنایا ہوا ہے۔ اپنی زبان اور تہذیب وثقافت کو کمال چابکدستی سے محفوظ رکھا ہوا ہے۔ واخی قبیلے کی اصلیت کے بارے میں ماہرین کی رائے یہ ہے کہ یہ قدیم ایرانی نسل سے تعلق رکھتے ہیں۔

سریقولی:

سریقولی چینی ترکستان کے مشرقی پہاڑی دروں سے ہجرت کر کے 1938ء میں چترال آئے۔ سریقول ایک ترک قبیلے کا نام ہے۔ اسی نام سے ایک جھیل، ایک بڑا علاقہ اور ایک سلسلہ کوہ بھی چینی ترکستان میں موجود ہے۔ چترال کی سریقولی آبادی



کلاش میں چلم جوش فیسٹول کا ایک منظر

نے سنکیانگ یوغر کے خودمختار علاقے کے مقام تاشقرغان سے ترک وطن کیا۔

کرغیز:

کرغیز روسی ترکستان کے مقام اندجان سے ترک وطن کر کے 1946 میں چترال آئے۔ یہ یورالی منگول نسل کی حامل ترک قوم شمار ہوتی ہے۔ چترال میں بروغیل کا علاقہ انکی آماجگاہ ہے۔ جبکہ انکے بھائی بند وادی فرغانہ ازبکستان میں رہتے ہیں۔

اورسوئی:

چترال کے جنوب میں وادی اورسون ایک ایسے قبیلے کا مسکن ہے جس پر ماہرین بشریات اور ماہرین لسانیات نے اب تک توجہ نہیں دی۔ یہ افغانستان کے علاقہ نورستان سے ترک وطن کرنے والے ایسے لوگ ہیں جو بشگالی تارکین وطن سے الگ شناخت رکھتے ہیں۔ انکی تہذیب وثقافت اور زبان بھی الگ حیثیت کی حامل ہے۔ یہ قبیلہ ''قریش'' کہلاتا ہے۔ اور مسلمان فاتحین کے ہمراہ افغانستان آنے کا مدعی ہے۔

زبانیں

چترال میں آبادی کی اجزائے ترکیبی کی مناسبت سے چودہ زبانوں کو مادری زبان کا درجہ حاصل ہے۔ کھوار ان میں سب سے بڑی زبان ہے۔

کھوار:

چترال میں غالب اکثریتی آبادی کی زبان ہونیکی بناء پر کھوار کو رابطے کی زبان مانا جاتا ہے۔ کھوار، چترال کے علاوہ گلگت کے ضلع غذر، سوات کے کالام، افغانستان کے صوبہ کنٹر، نورستان اور بدخشان کے علاوہ پامیر اور سنکیانگ کے مخصوص علاقوں میں بھی بولی جاتی ہے۔

چترال کی آبادی میں قبائل اور زبانوں کی تقسیم

	زبان	قبیلہ
۱۔	کھوار	کھو
۲۔	شینا (پھلورا)	شین
۳۔	گواربٹی	گواری
۴۔	ڈامیا	ڈمیلی
۵۔	پشتو	پٹھان
۶۔	کلاشہ	کلاش
۷۔	یدغہ	منجی
۸۔	کٹی (بشگالی)	بشگالی
۹۔	دری	تاجک
۱۰۔	گوجری	گجر
۱۱۔	سریقولی	سریقولی
۱۲۔	واخی	واخی
۱۳۔	کرغیز	کرغیز
۱۴۔	ارسونی وار	سونی

ماہرین لسانیات نے کھوار کو ہند آریائی زبانوں میں درد گروپ کی نمایاں خصوصیات والی زبان قرار دیا ہے۔ (جارج مارگن شیٹرنے، چترال، زبانیں، انسائیکلوپیڈیا آف اسلام ای جے ہرل سیڈن 1983، جلد دوم صفحہ 31، گریرسن، لینگوسٹک سروے آف انڈیا حصہ اول جلد 8 کلکتہ 1919، عنایت اللہ فیضی، ڈائلیکشن آف کھوار، مجلّہ کھوار 1989ء) عربی رسم الخط میں مخصوص دردی صوتیات کیلئے چھ حروف کا اضافہ کر کے لکھا جاتا ہے۔ اور 1921ء کے بعد باقاعدہ تحریری زبان بن چکی ہے۔ اس طرح قرآن پاک کے کھوار ترجمے سمیت نظم ونثر میں قابل توجہ مواد شائع ہو چکا ہے۔ رومن سکرپٹ اور انٹرنیشنل الفابیٹ میں بھی کھوار پر کافی مواد شائع ہو رہا ہے۔ کھوار زبان پر سنسکرت کے علاوہ بلتی، بروشسکی، شینا، فارسی، ترکی، اور دیگر ہمسایہ زبانوں کا گہرا اثر پایا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ گزشتہ صدی سے اردو، پشتو اور انگریزی کے الفاظ بھی کھوار کے ذخیرے میں آرہے ہیں۔ کھوار میں لوک کہانیوں، گیتوں، کہاوتوں اور پہیلیوں پر مشتمل بے حساب مواد، روایات کی صورت میں موجود ہے۔ بزرگ شعراء، اور فنکاروں کے علاوہ نوجوان ادیبوں اور محققین کی ایک ٹیم اس مواد کو منظم طریقے سے منظر عام پر لانے کیلئے کام کر رہی ہے۔ اس طرح جامع لغت اور کھوار کی اُن چھ بولیوں پر بھی کام ہو رہا ہے۔ جو مختلف وادیوں میں تھوڑے بہت اختلاف کے ساتھ بولی جاتی ہیں۔ لوک کہانیوں اور سینہ بہ سینہ آنے والی روایتوں کے مطابق پانچ یا سات درویشوں نے پہلی بار ملکھو کے گاؤں وریجون میں ایک بڑے پتھر ''کھو بوخت'' پر آکر پہلی بار کھوار میں بات چیت کی۔

شینا (پھلورا):

شینا زبان کی چلاسی بولی اپنی قدیم صورت میں چترال کے جنوب میں

عشریت، بیوڑی، پُرگاڑ، دروش وغیرہ میں بولی جاتی ہے۔ جارج مارگن سٹیرن اور دیگر محققین نے اسے ''پھلورا'' یا ''پالولہ'' کا نام دیا ہے۔ (مارگن، سٹیرن جارج، لینگوسٹک مشن آف نارتھ ویسٹ انڈیا، اوسلو، 1932) بڈالف نے ''شینا'' لکھا ہے۔ (بڈالف جان، ٹرائبس آف دی ہندوکش، مسٹر بکس اسلام آباد، 1986، صفحہ 64) مقامی طور پر اسے ''اسوریتا نووار'' یعنی عشریت والوں کی زبان کہا جاتا ہے۔ چلاس اور گلگت کے شینا بولنے والے لوگ اسے بخوبی بولتے اور سمجھتے ہیں اس لئے اس کو شینا کا نام دینا زیادہ قرین انصاف ہے۔ جو درد گروپ کی اہم ہند آریائی زبان ہے۔ اور کافر گروپ سے الگ ہے۔ اس کا رسم الخط بھی عربی ہے۔ گیت اور لوک روایات کا ذخیرہ بھی گلگت اور چلاس کے طرز پر محفوظ ہے۔

گوار بٹی:

چترال کے جنوب میں ارندو کے اندر گواری قبیلے کی زبان گوار بٹی کہلاتی ہے۔ جسے ماہرین نے ''انڈس ویلی'' میں بولی جانے والی قدیم ''گورو'' کے قریب تر قرار دیا ہے۔ اسی طرح یہ بھی ہند آریائی زبانوں میں سے ہے۔ اس میں تحریر کی سہولت نہیں ہے اور لوک روایات کا سلسلہ قدیم دور سے سینہ بہ سینہ چلا آرہا ہے

ڈامیا (ڈامیلی):

وادی ڈمیل جنوبی چترال میں قدیم کافر گروپ کی ایک شاخ ڈامیا یا ڈامیلی بولی جاتی ہے۔ پروفیسر مارگن سٹیرن کی رائے میں یہ ہند آریائی زبان ہے۔ اپنی ساخت، ہیئت اور صوتیات کے لحاظ سے درد گروپ سے مطابقت نہیں رکھتی۔ کافر گروپ کے قریب ہے۔ اس لئے اسے قدیم زبانوں میں شمار کیا گیا ہے۔ جسکی ہم عصر زبانیں یا اپنی ہیت بدل چکی ہیں یا معدوم ہو چکی ہیں۔ ڈامیا زبان میں لوک گیتوں کا ذخیرہ بہت وسیع ہے۔ تاہم یہ زبان ابھی تک تحریری صورت میں منظر عام پر نہیں آئی۔

پختو (اڑغانی وار):

چترال کے جنوب میں نوآباد پٹھان اور چترال خاص کے علاوہ دوسرے دیہات میں پھیلے ہوئے پختون آباد کار مادری زبان کے طور پر پشتو بولتے ہیں۔ اسے پختو بھی کہا جاتا ہے، صوبہ سرحد اور بلوچستان کے علاوہ افغانستان کی ایک بڑی زبان ہے جس میں لوک روایات، گیت، اور لسانی ذخائر کے علاوہ شائع شدہ نظم ونثر کا بیش بہا ذخیرہ موجود ہے۔ کھوار میں افغانستان کو ''اڑغان'' اور پشتو کو ''اڑغانی وار'' کہا جاتا ہے۔

کٹی (بشگالی وار):

بشگال کے سیہ پوش قبائل کی ایک شاخ سرخ کافر یا بشگالی کہلاتی ہے۔ انکی زبان کو ''کٹی'' کہا جاتا ہے۔ یہ ہند آریائی زبانوں کے کافر گروپ سے تعلق رکھتی ہے۔ چترال کے علاقہ گوبور، رمبور اور بمبوریت کے علاوہ لنگوریٹ میں بھی کٹی زبان بولی جاتی ہے۔

دری/ فارسی (مڈکلشٹی وار):

چترال کے جنوب مشرق میں مڈکلشٹ کے مقام پر دری یا قدیم فارسی زبان بولنے والے تاجک قبیلے کی آبادی ہے۔ دری ایرانی گروپ کی قدیم زبان ہے جس میں فارسی کے متروک الفاظ کا بڑا ذخیرہ موجود ہے۔ یہ زبان ساختیات ہیت اور صوتی اعتبار سے بھی جدید فارسی سے مختلف ہے۔ اور افغانستان میں بولی جاتی ہے۔

کلاشہ (کلاشوار):

ہند آریائی زبانوں کے زمرے میں کلاشہ کو کافر گروپ کی اہم زبان سمجھا جاتا ہے۔ (ایلینا بشیر، ٹاپکس ان کلاشہ سٹڈیز، یونیورسٹی آف مشی گن 1988) اس کا رسم الخط ابھی تک فروغ نہیں پایا بلکہ وجود میں نہیں آیا ہے۔ محققین نے رومن اور انٹرنیشنل حروف تہجی میں اسے نقل کیا ہے۔ کلاشہ میں کہانیوں اور گیتوں کا بہت بڑا ذخیرہ موجود ہے۔ گیتوں میں زیادہ تر قومی ہیروز کی یادیں اور اجداد کی بہادری کے کارنامے بیان کئے گئے ہیں۔ رومانی گیت بھی گائے جاتے ہیں۔

یدغہ (لٹکوہی وار):

چترال کے جنوب مغرب میں گرم چشمہ سے چند میل کے فاصلے پر پربیک کے علاقے میں یدغہ بولی جاتی ہے۔ یہ منجی تارکین وطن کی زبان ہے۔ محققین نے اسے ''زند'' کی قدیم شاخ اور ''اوستا'' کی زبان قرار دیا ہے۔ یہ ایرانی زبانوں کی قبیل سے ہے۔ اور اس گروہ کی قابل ذکر زبانوں میں شمار ہوتی ہے۔ ابھی تحریر میں نہیں آئی۔ اس کے اندر گیتوں اور کہانیوں کا وسیع ذخیرہ ہے۔ یدغہ گیت ''ماماشیش'' خاصی شہرت رکھتی ہے۔

گوجری (گجروار):

چترال کے جنوب میں آباد اور کچھ خانہ بدوش گجر، مہند آریائی زبانوں

کی شاخ گوجری بولتے ہیں۔ یہ ہزارہ کوہستان، بالاکوٹ وغیرہ میں بولی جانے والی گوجری زبان ہے۔عربی رسم الخط میں لکھی جاتی ہے۔اس زبان میں گیتوں اور کہانیوں کی بہت اہمیت ہے۔

واخی:

وخان سے ترک وطن کرنے والے قبیلے کی زبان واخی ہے۔(نظیف محبّ شہرانی، دی واخی اینڈ کرغیز آف افغانستان، 1979) بروغیل میں بولی جاتی ہے جو شمال میں سرحدی مقام ہے۔واخی کو چترال میں ''وینچیک وار'' اور ہنزہ میں'' گوجالی'' کہتے ہیں۔ یہ ایرانی گروہ سے تعلق رکھتی ہے۔(عنایت اللہ فیضی، وخان ونڈو انٹوسنٹرل ایشیاء، القلم اسلام آباد، 1996) فیلیک اور ''بُلبلیک'' مشہور واخی گیت ہیں۔رزمیہ گیتوں، داستانوں اور کہاوتوں کا وسیع ذخیرہ اس زبان میں محفوظ ہے۔حال ہی میں ہنزہ کی گوجالی آبادی نے واخی زبان کو عربی رسم الخط میں لکھنے کی بنیاد رکھی ہے۔

سریقولی:

یہ ترک منگولیائی زبانوں کی شاخ سے تعلق رکھتی ہے۔سریقولی بروغیل میں تاشقرغن سنکیانگ سے آکر بسنے والے باشندوں کی زبان ہے۔لوک کہانیوں اور گیتوں کا ذخیرہ بہت وسیع ہے۔تحریری مواد دستیاب نہیں ہے۔

کرغیز:

یہ بھی چترال کے شمال میں بروغیل کی وادی کے اندر بولی جاتی ہے۔ازبکستان سے آنے والے کرغیز پناہ گزینوں کی زبان ہے۔ترک زبانوں کے گروہ میں شامل ہے۔ کرغزستان میں اس زبان پر بہت کام ہوا ہے۔روسی رسم الخط میں لکھا جاتا ہے۔

اورسونی وار:

یہ وادی اورسون میں بولی جانے والی زبان ہے۔جو جنوبی چترال میں نورستان کی سرحد پر دروش کے مغرب میں واقع ہے۔یہ ہند آریائی زبانوں میں سے ہے۔اور اس کی علامت مصدر ''ک'' کھوار کے مشابہ ہے۔ذخیرہ الفاظ میں بھی کھوار کے ساتھ کافی مشابہت پائی جاتی ہے۔اس زبان کا ذکر محققین نے چترال کی زبانوں کے تذکرے میں نہیں کیا مجلّہ قراقرم ہندوکش میں لسانیات چترال کے ذیل میں ذخیرہ الفاظ سے جو منتخب نمونے دیئے گئے ہیں۔(عنایت اللہ فیضی، چترال میں علاقائی زبانیں، قراقرم ہندوکش گلگت 1985 صفحہ 49-644) ان سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زبان کا وسیع پیمانے پر مطالعہ کئی اہم حقائق کو منظر عام پر لائیگا۔ارسونی وار میں لوک گیت، کہانیاں، اور کہاوتیں بھی شہرت رکھتی ہیں۔ابھی تک اس زبان کو ضبط تحریر میں نہیں لایا گیا۔

چترال کے روایتی کھانے:

چترال کا روایتی معاشرہ تہذیبی اقدار اور ثقافتی وتمدنی معیار کے رو سے خود کفیل معاشرہ تھا۔جس میں رہن سہن، نشست و برخاست اور کھانے پینے کے طور طریقے اور آداب اسی معاشرے کی پیداوار تھے اور یہیں انکو فروغ ملا۔خوراک انسان کی بنیادی ضرورت ہے مگر خوش خورا کی اہل چترال کا خصوصی وصف ہے۔اس عادت نے چترال میں دودھ، گوشت، گھی اور آٹے سے بیسیوں قسم کے کھانوں کو روج دیا۔چترال میں روایتی طور پر کھانے کے آداب اوقات، اور رسومات یہ ہیں۔



کلاشی عورت روٹیاں پکا رہی ہے

آداب:

اسلامی عہد سے پہلے بھی اور اسلام کے موجودہ دور میں بھی چترال میں کھانے کے اداب تقریباً یکساں سمجھے جاتے ہیں۔ اسلام ی تعلیمات کی روشنی مسنون دعائیں اور ہاتھ دھونے کی مخصوص طریقے متعارف ہوئے۔ چترال میں روایتی طور پر ''کھانا'' اجتماعی عمل ہے۔ بہت سے افراد ایک جگہ، ایک ہی تھالی میں ملکر کھانا کھاتے ہیں مجلس کی مناسبت سے بڑے، چھوٹوں کو مخصوص طریقے سے لقمہ دیتے ہیں۔ جسے ''اسپن'' کہا جاتا ہے۔ یہ طریقہ مہتر کی مجلس سے پیر کی مجلس تک اور پیر کی مجلس سے گھر کے سربراہ کے دسترخواں تک ہر جگہ اسی دستور کے موافق چلتا ہے۔اس طرح مجلس میں چھوٹے اپنے سے بڑوں کو روٹی یا پانی اٹھا اٹھا کر پیش کرتے ہیں۔ بڑوں سے پہلے لقمہ توڑنے کو خلاف ادب سمجھا جاتا ہے۔ میزبان اپنے مہمان کو روٹی، پانی یا چمچہ پہلے پیش کرتا ہے۔ پھر خود اٹھاتا ہے۔اگر روٹی پیش

کرنے کیلئے اٹھا کر آگے بڑھایا جائے تو برائے نام ٹکڑہ کاٹ کر شکریہ ادا کیا جاتا ہے۔ جس سے کھانے کا آغاز ہوتا ہے۔ روایتی طور پر اچھے کھانے کو ''چھمانی'' کہتے ہیں۔ اچھا کھانا مہتر کی مجلس میں رات کا ہوتا تھا۔ مہمان کیلئے کسی بھی وقت تیار کیا جاتا ہے لیکن گھروں میں قدیم روایت کے مطابق ناشتہ سب سیا چھا ہوتا تھا۔ گوشت، انڈے، سبزی اور گھی، پنیر سے بنے ہوئے تمام کھانے ناشتے کیلئے تیار کئے جاتے تھے۔ آٹے کی روٹی کو متبرک سمجھا جاتا ہے۔ بچوں کو سفر پر بھیجتے وقت روٹی کا ٹکڑہ اسکے کپڑوں میں دیو، جنات اور آسیب سے حفاظت کیلئے رکھا جاتا ہے۔ دودھ اور دودھ کے آمیزے کو نیک شگون سمجھا جاتا ہے۔ ''اشپیری'' کے نام سے کسی نئے اور بڑے کام کا آغاز دودھ کا گھونٹ پی کر یا دودھ کے کسی آمیزے سے ایک نوالہ لیکر کیا جاتا ہے۔ خوشی کے موقع پر مہمانوں کو سب سے پہلے دودھ، پنیر وغیرہ پیش کیا جاتا ہے۔ خوشی اور شادی بیاہ کی اطلاع کیلئے ہمسایوں اور رشتہ داروں کے گھروں میں مٹھی بھر یا اس سے کم پنیر کو روٹی میں لپیٹ کر بھیجا جاتا ہے۔ اس کا نام بھی ''اشپیری'' ہے۔ (کسی موسم کے دودھ، گوشت یا آٹے کا پہلا کھانا تیار کر کے تقسیم کرنے سے پہلے دیوتا، دیویوں کے نام پر تھوڑا سا الگ رکھا جاتا ہے۔ جسے بعد میں عورتیں کھاتی ہیں۔ یہ صرف لقمہ ہوتا ہے محض رسم نبھایا جاتا ہے۔ اس رسم سے ''خانگی'' اور ''شری'' نام کے دو گھریلو دیوتا دیوی خوش ہوتے ہیں۔ (خانگی کیلئے رہائشی حصے میں اور شری کیلئے مویشیوں کے حصے میں رہنے کا تصور پایا جاتا ہے)



روایتی چترالی سوپ کی تیاری

مختلف مواقع پر پکائے جانے والے کھانے:

مختلف مواقع پر اور مختلف اوقات میں پکائے جانے والے مخصوص کھانوں کے الگ الگ نام ہیں۔ مثلاً صبح کے کھانے کو ''ہسی'' دوپہر کے کھانے کو ''چشٹ'' عصر یا سہ پہر کے کھانے کو ''مردیج'' شام کے کھانے کو ''بوت'' رات کے کھانے کو ''چھوئے بوتی' اور سحری کے کھانے کو ''زار'' کہا جاتا ہے۔ تقسیم کے وقت ایک شخص کے حصے کو ''برتون'' اور تین بندوں کے حصے کو ''بانو'' کہتے ہیں۔ بیٹی کی رخصتی کے وقت جو پکا ہوا کھانا ساتھ بھیجا جاتا ہے اُسے ''پوندی'' کہتے ہیں۔ بعد میں بیٹی میکے آکر واپس سسرال جارہی ہو یا وہ نہ آئے تو چند دنوں کے بعد کھانا پکا کر اس کے گھر بھیجا جائے۔ اسے ''کولی بار'' کہتے ہیں۔ رخصتی کے بعد مختلف تہواروں پر بیٹی کے گھر جو کھانا بھیجا جاتا ہے۔ اس کا نام ''بش'' ہے۔ استاد کیلئے شاگرد کی طرف سے سبق کے آغاز پر جو کھانا تیار کیا جاتا ہے اس کو ''صُرف'' کہتے ہیں۔ شکار اور پیراکی کے نوآموز اپنے استاد کو یا اپنے ساتھیوں کو دریا کے کنارے یا شکار کے مقام پر گھر کا گوشت کھلائے اُسے ''دیگ جوش'' کہا جاتا ہے۔ بیٹی کی منگنی یا رخصتی کے بعد میکے والے دولہا کے گھر سے ایک سالم جانور کے گوشت کا تقاضا کرتے ہیں۔ اور کسی اہم موقع پر اجتماعی دعوت میں اُسے کھاتے ہیں۔ اس کا نام ''مری'' ہے۔ گھر کی انگیٹھی آگ کی گرمی سے سرخ ہو کر پتھر کا کوئی پرت الگ ہو جائے تو اُسے گرم حالت میں تھالی میں رکھ کر اوپر سے ڈھکنے یا دسترخوان سے چھپا کر، قریبی گھروں میں سے بھابھی یا بھاوج کے گھر لیجا کر بے خبری کے عالم میں وہاں رکھ کر انکو خبردار کر کے کامیابی سے کوئی واپس اپنے گھر آئے تو دوسرے گھر والوں پر ایک وقت کا ''کھانا'' دینا لازم آتا ہے۔ اس کھانے کو ''تختہ بانو'' کہتے ہیں۔ اسی طرح کسی گھر میں میت ہو جائے تین دن بعد گھر والے کھانا پکا کر مذہبی رسومات کے ساتھ سوگ ختم کرتے ہیں۔ اس کھانے کو ''خھار'' کہا جاتا ہے۔ چرواہا، بکریاں چرانے یا مویشی ہانکنے جارہا ہو اُسے پکی ہوئی روٹی دی جاتی ہے جسے ''اونار'' کہتے ہیں۔ شکاری بڑے شکار سے آتے وقت اپنے ساتھ پکا ہوا گوشت لاتے ہیں اور دوست رشتہ داروں کو تحفہ دیتے ہیں۔ اس کا نام ''شوماش'' ہے۔

کھانوں کی اقسام

شہزادہ محمد حسام الملک نے اپنی کتاب ''خوان چترال'' میں ایک سو ستر کھانوں کا ذکر کیا ہے۔ (شہزادہ محمد حسام الملک، خوان چترال، انجمن ترقی کھوار چترال 1988) ان میں سے خاص خاص پکوان یہ ہیں۔

گوشت کے کھانے:

(ا) گوشت کے ساتھ خشک سبزی یا گندم کے ادھ پسے ہوئے دانے ملا کر ہلکی آنچ پر رات بھر پکایا جاتا ہے۔ اسے ''شاوردیکی'' کہتے ہیں۔ لذت، حلاوت اور طاقت میں بے مثال ہوتا ہے۔ اسے عام طور پر

ناشتے میں کھایا جاتا ہے۔

(۲) گندم کے ادھ پسے دانوں کو سری پائے یا گوشت کیساتھ تیز آنچ پر پکایا جائے، اُسے ''لاژیک'' کہتے ہیں۔ یہ کسی بھی وقت کھایا جاتا ہے۔

(۳) چاول کیساتھ گوشت ملا کر پکایا جائے، اور گوشت کے ذائقے میں نرم چاول تیار ہو تو اُسے ''شولہ'' کہتے ہیں۔

(۴) گوشت کو سیخ میں پرونے کے بعد دہکتی ہوئی چنگاریوں پر پکایا جاتا ہے، جسے ''رانڈیژو'' کہتے ہیں۔

(۵) گوشت کا قیمہ بنا کر تڑکے پر پانی کیساتھ پکایا جائے تو ''سنگسیر'' کہلاتا ہے۔

(۶) لکڑیوں کے بڑے آلاؤ پر پتھر کی دو سلوں کو خوب گرم کیا جاتا ہے پھر گوشت کو ایک سل پر ڈالکر دوسرا سل اسکے اوپر رکھنے کے بعد اوپر نیچے سے ہلکی آنچ دی جاتی ہے اس گوشت کو ''سنگ تاب'' کہتے ہیں۔

(۷) گوشت کی بوٹیاں بنا کر گھی میں بھون کر تیار کیا جاتا ہے جسے ''بوڑیان'' کہتے ہیں۔

(۸) گوشت کا باریک قیمہ بنا کر پہلے بھنا ہوا قیمہ تیار کیا جاتا ہے پھر آٹے کو گوندھ کر دو موٹے کیک تیار کئے جاتے ہیں۔ درمیان میں قیمہ ڈالکر اوپر نیچے کیک رکھے جاتے ہیں۔ اسے سانچے میں ڈالکر گرم راکھ اور چنگاریوں پر پکایا جاتا ہے۔ جسے ''پوشورٹیکی'' کہتے ہیں۔

ان کے علاوہ گوشت سے بے شمار پکوان تیار ہوتے ہیں۔ انمیں نمک، مصالحہ وغیرہ حسب موقع اور حسب خواہش استعمال ہوتا ہے۔

گھی کے پکوان:

گھی سے بنے ہوئے کھانے گوشت کے برابر ہوتے ہیں تاہم بعض کے ساتھ الگ سے گوشت بھی شامل کیا جاتا ہے۔ چند خاص کھانے یہ ہیں۔

(۱) گھی کے ساتھ پانی اور آٹا ملا کر نمک کے ذائقے میں پکایا جاتا ہے۔ پہلے تیز آنچ دی جاتی ہے۔ پھر دیر تک ہلکی آنچ پر رکھ کر پکایا جاتا ہے یہ ڈش تیار ہو کر حلوے کی صورت اختیار کرتی ہے۔ اسے ''سناباچی'' کہتے ہیں۔

(۲) پکی ہوئی روٹی کو گرم گھی میں ڈال کر دوبارہ پکایا جاتا ہے اس کیلئے روٹی کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے بنائے جاتے ہیں ساتھ نمک ملایا جاتا ہے۔ یہ ''شینیک'' کہلاتا ہے۔

(۳) دو روٹیوں کے درمیان پنیر بھر کر اوپر گرم گھی ڈالا جاتا ہے ایسے کئی جوڑے ایک دوسرے کے اوپر رکھ کر پیش کیے جاتے ہیں۔ اگر روٹی خمیری ہو تو اُسے خستہ خلمندی کہتے ہیں۔ روٹی خمیری نہ ہو تو خلمندی کہا جاتا ہے۔

(۴) نرم و نازک گرم پھلکے تیار کر کے دودھ میں آٹا ملا کر جوش دیا جاتا ہے۔ جب دودھ پک کر گاڑھا ہو جاتا ہے، تو ایک ایک پھلکا تھالی میں رکھ کر اوپر دودھ ڈالا جاتا ہے۔ دودھ کے اوپر دوسرا پھلکا رکھ کر اوپر سے گھی کا گرم تیل ڈالا جاتا ہے۔ اسی طریقے سے کئی جوڑے اوپر نیچے بنائے جاتے ہیں اس کا نام ''چھیرہ شاپیک'' ہے۔

(۵) ریشیکی بھی گھی اور آٹے سے تیار ہونے والا روایتی کھانا ہے۔ اس کے لئے پتلا سیال آٹا گوندھا جاتا ہے اسے بڑے چمچے کے ذریعے گرم توے پر پتلا کر کے ڈالا جاتا ہے۔ ایکبار الٹ پلٹ دینے پر روٹی پک جاتی ہے۔ پھر گھی کا گرم تیل ایک ایک کر کے ہر روٹی کے اوپر ڈالا جاتا ہے۔ اوپر نیچے کئی روٹیاں رکھ کر پیش کی جاتی ہیں۔ خاص طور پر زچہ کو کھلایا جاتا ہے۔

آٹے اور پانی کے کھانے:

بعض روایتی کھانے ایسے ہیں جو صرف آٹے اور پانی سے تیار کئے جاتے ہیں۔ مخصوص ذائقہ اور حلاوت کے علاوہ اپنی خاصیت اور خوبی کی وجہ سے بھی یہ روایتی پکوان بہت مشہور ہیں۔ چند خاص پکوان یہ ہیں۔

شوشپ:

آٹے کو ٹھنڈے پانی میں اس قدر گوندھا جاتا ہے کہ گوندھ میں چمک



مخصوص کلاشی روٹی تیار کی جا رہی ہے

پیدا ہو جاتی ہے۔ اس گوندھ سے پتلے پتلے پھلکے بنائے جاتے ہیں، ہر پھلکے کو چار تہہ کر کے درمیان میں ہلکا سا آٹا ڈال دیا جاتا ہے۔ اور بڑے چھرے سے باریک کاٹ کر لمبے لمبے تار بنائے جاتے ہیں۔ ان تاروں کو ابلتے ہوئے پانی میں باری باری ڈالا جاتا ہے، اور ہلکی آنچ پر دیر تک پکایا جاتا ہے۔ یہ سیال ڈش ہے جسے چمچے کی مدد سے کھایا جاتا ہے۔ تڑکا، مصالحہ حسب ضرورت ملایا جاتا ہے۔ اس کا نام ''کاڑی'' ہے جسے آش بھی کہا جاتا ہے۔ یہ چترال میں قدیم زمانے سے مقبول ہے۔ چائے کے دور سے پہلے اسے اہتمام کیساتھ ناشتے میں پکاتے تھے۔ آج کلافطاری کیلئے اس ڈش کا خاص اہتمام کیا جاتا ہے۔ گندم سے سوہن آٹا تیار کیا جاتا ہے جو بہت میٹھا ہوتا ہے طریقہ یہ ہے گندم کی مخصوص مقدار کو بیج اُگ آنے تک خاص درجہ حرارت میں بھگو کر رکھا جاتا ہے۔ جب ہر دانہ اگنے لگتا ہے تو اسے سورج کی تمازت اور اوس کی طراوت میں دن رات رکھا جاتا ہے۔ نو، دس دنوں میں پیسنے کے قابل ہوتا ہے۔ پیسنے کے بعد میٹھا آٹا تیار ہو جاتا ہے۔ اس میں سے ایک پاؤ میٹھا آٹا چار سیر عام آٹے کے ساتھ ملا کر پانی میں ہلی آنچ پر دیر تک پکایا جاتا ہے۔ پکنے کے بعد سرخ رنگ کا حلوہ تیار ہو جاتا ہے۔ اسے شوشپ کہتے ہیں۔ اگر پکاتے وقت پانی میں خوبانی، اخروٹ یا بادام کا تیل ملایا جائے تو اسے ژوڑا شوشپ کہتے ہیں۔ پانی کیساتھ چربی کے تیل میں پکایا جائے تو یہ ٹاربٹ کہلاتا ہے۔

شوڑان:

کچا آٹا گوندھ کر چپاتی بنائی جاتی ہے۔ اسے توے پر نیم پختہ کرنے کے بعد ہلکی آنچ پر چربی کے تیل میں پکایا جاتا ہے۔ آہستہ آہستہ کوٹ کوٹ کر پکانے سے اس میں سختی اور شدت آجاتی ہے۔ جب چپاتی کا مادہ پک کر حلوے کی صورت اختیار کرتا ہے تو اُسے گھی کے گرم تیل کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے۔ اسے بہت طاقتور غذا سمجھا جاتا ہے۔ خواتین کی مخصوص بیماریوں کیلئے جڑی بوٹیوں کے سفوف اس میں ڈالے جاتے ہیں۔ نمک اور دیگر مصالحے بھی حسب ضرورت ملائے جاتے ہیں۔ اس ڈش کا نام شوڑان ہے۔

مُول:

گندم کے آٹے کو پانی میں ڈالکر ہلکی آنچ پر دیر تک پکایا جاتا ہے جب خوب پک کر گاڑھا ہو جاتا ہے، تو اس پر تیل یا دودھ ڈالکر چمچے سے کھایا جاتا ہے، اس ڈش کو مُول کہتے ہیں۔

خمیری روٹی:

چترال کی مخصوص روٹی بھی شہرت رکھتی ہے۔ اور اپنی منفرد ساخت کی وجہ سے قابل ذکر ہے۔ عام خمیری روٹی اوپر نیچے ایک جیسی ہوتی ہے لیکن چترال کی خمیری روٹی کا سیدھا رُخ سرخ جبکہ الٹا رخ سفید ہوتا ہے۔ سیدھے رُخ کو سرخ کرنے کیلئے اسے مخصوص دستے کی مدد سے ہوا میں اچھال کر پوری قوت کیساتھ توے پر مارا جاتا ہے۔ اور نرم آنچ پر آہستہ آہستہ پکا کر پھر الٹایا جاتا ہے۔ اور الٹے رخ کو سادہ طریقے پر پکایا جاتا ہے۔ اسکی نرمی پیسٹری کی طرح ملائم ہوتی ہے اور الٹے سیدھے رخوں پر سرخ و سفید رنگوں کا امتزاج اسے حسن و رعنائی بخشتا ہے۔



اجتماعی کھانا کھانے کے بعد لوگ بیٹھے ہیں

لوک پیشے

چترال کے روایتی دیہاتی معاشرے میں بنیادی طور پر دس پیشوں کا رواج رہا ہے۔ عہد بہ عہد مذہبی اقدار اور مذہبی رسومات کے ساتھ وابستہ پیشوں میں ردو بدل یا کمی بیشی ہوتی رہی ہے۔ سوسائٹی کی بنیادی ضروریات سے متعلقہ

پیشے ہر دور میں جوں کے توں چلے آرہے ہیں۔ عام پیشے یہ ہیں۔

پژال (چرواہا):

چترال کی روایتی سوسائٹی میں پژال یعنی چرواہے کا خاص کردار رہا ہے۔ اور چرواہے کے پیشے کو معاشرے میں ناگزیر ضرورت کے طور پر ہر دور میں اہمیت دی گئی ہے چترال میں ریاستی مہتر کے روایتی لباس میں ٹوپی کے اوپر مرغ زریں کے پر اور ہاتھ میں مخصوص لاٹھی چرواہے کے کردار سے لئے گئے استعارے تھے۔ قدیم چرواہا کسی بھی قوم، قبیلے یا گروہ سے ہوتا تھا انیسویں صدی کے بعد گجر قوم نے اکثر مقامات پر اس پیشے کو اپنے ہاتھ میں لیا۔ چرواہا اگر روزمرہ معاوضہ مانگتا ہو تو اُسے پکی پکائی روٹی دی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ شادی، بیاہ، اور تہواروں پر اسکی مناسب قدر کی جاتی ہے۔ یا طے شدہ حصہ مال میں سے یا دودھ کی پیداوار میں سے دیا جاتا ہے۔ چرواہا دور رہتا ہو تو اس کو روزمرہ اخراجات کیلئے طے شدہ مقدار میں اشیائے خوراک مہیا کی جاتی ہیں۔ اور مخصوص معاہدے کے مطابق مال یا دودھ کی پیداوار میں حصہ یا نقد معاوضہ دیا جاتا ہے۔ جسے ''بتائی'' کہتے ہیں۔

خوراوال (چکی والا):

گاؤں میں چکی بنانا اور اسے چلائے رکھنا چترال میں ایک روایتی پیشہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کا تعلق کسی خاص قوم سے نہیں ہوتا۔ البتہ اکثر خاندانوں میں یہ پیشہ کئی پُشتوں سے چلا آتا ہے۔ چکی والا آٹے میں سے ایک معین مقدار معاوضہ لے لیتا ہے جسے ''روشوک'' کہتے ہیں۔

جولاہا:

کھڈی پر اونی کپڑا بُننے والا جولاہا کہلاتا ہے۔ یہ اپنے کام کا معاوضہ کپڑے میں حصہ، یا کسی اور صورت میں طے شدہ مقدار کے مطابق لے لیتا ہے۔ کبھی اپنے گھر پر کھڈی رکھتا ہے اور کبھی کپڑے والے کے گھر پر بھی کھڈی ہوتی ہے۔ کھڈی کو ''شخینی'' کہتے ہیں اور معاوضے کو پھڑا کی کہا جاتا ہے۔

کمہار:

کمہار گاؤں کے لوگوں کیلئے مٹی کے برتن بناتا ہے۔ یہ ہر گاؤں میں الگ الگ نہیں ہوتا کمہار اپنے کام کا معاوضہ روایتی طور پر جتنا بڑا برتن ہو، اس میں بھر کر غلہ لے لیتا ہے۔ چترال میں مداک کمہاروں کی مشہور بستی ہے۔ انکے بنائے ہوئے مٹکے دیگچے اور صراحیاں خوبصورتی اور پائیداری میں بے مثال ہوتی ہیں۔

موچی (لوہار):

چترال میں لوہار گاؤں کی ضروریات پوری کرنے والا اہم کاریگر ہوتا ہے۔ کھوار میں اُسے موچی کہا جاتا ہے اور حضرت داؤد علیہ السلام کے ساتھ نسبت ہونے کی وجہ سے اس پیشے کی بیحد قدر کی جاتی ہے۔ ہر وادی اور علاقے میں الگ موچی کام کرتا ہے تیشہ، درانتی سے لیکر چھری چاقو، کلہاڑی، گھوڑے کے نعل، زراعت، چکی اور باورچی خانے کے اوزار بھی بناتا ہے۔ کاریگر کو نئے کام کا طے شدہ معاوضہ دیا جاتا ہے۔ مرمت اور صفائی کے لئے فصل لیتے وقت مخصوص مقدار میں سالانہ غلہ ہر گھر سے اکھٹا کر کے دیدیا جاتا ہے۔ چترال کے اکثر ہوہار شغنان یا بدخشان سے ترک وطن کر کے آنے والے قبائل میں سے ہیں۔

دارخان (ترکھان):

دار غیر یا دارخان کا پیشہ چترال کی روایتی سوسائٹی میں بنیادی اہمیت کے پیشوں میں سے ایک ہے۔ زمانہ قدیم سے اس پیشے کے ہنرمند ہر گاؤں اور ہر بستی میں موجود رہے ہیں دار غیر یا دارخان لوگوں کیلئے زرعی آلات، لکڑی کے برتن (غان) اور مکانات بناتے ہیں۔ روایتی طور پر کام کا برائے نام معاوضہ لیتے۔ اس پیشے کے ساتھ وابستہ روایتی اقدار رفتہ رفتہ ختم ہو رہی ہیں۔

دشمن (ملا صاحب):

چترال میں اسلام کی آمد کے بعد سُنی آبادی کے اندر دشمن یا مولوی صاحب کا پیشہ رواج پا گیا ہے۔ مولوی کو محلّہ کے لوگ سالانہ غلہ، نذر نیاز، صدقات، زکوٰۃ اور فطرانہ وغیرہ دیدیتے ہیں۔ جس گھر میں کوئی تقریب ہو۔ وہاں سے بھی معاوضہ دیا جاتا ہے۔ وہ محلے کے لئے خوشی اور غمی کے مواقع پر مذہبی رسومات ادا کرتا ہے۔ بیماری میں تعویذ گنڈے لکھتا ہے۔ سفر، یا کسی نئے کام کیلئے نیک ساعت اور تاریخ بتاتا ہے۔ محلے کی مسجد میں نماز پڑھاتا ہے۔ بعض اوقات دشمن جھاڑ پھونک اور عملیات کی بھاری فیس بھی لے لیتا ہے۔

خلفہ (خلیفہ):

دشمن (مولوی) کی طرح اسماعیلی مولوی کو خلفہ کہتے ہیں۔ خلفہ ترجیحاً خاندان سادات سے اور کبھی کبھار کسی اور خاندان سے بھی ہوتا ہے۔ روایتی طور پر خلیفہ محلے میں خوشی اور غمی کے مواقع پر مذہبی خدمات انجام دیتا ہے۔ تعویذ گنڈے کا دھندہ بھی کرتا ہے۔ نئے کام، سفر وغیرہ کیلئے ستاروں کا حال دیکھ کر نیک ساعتیں بتلاتا ہے۔ خلفہ کو نذر پیر کے نام سے سالانہ ہر گھر سے ایک مقررہ مقدار میں غلہ ملتا

ہے۔ نیز جس گھر میں خوشی غمی ہو، اُس گھر سے بھی خلفہ کو کچھ نہ کچھ دیا جاتا ہے۔ نیز عملیات اور جھاڑ پھونک کی مدد سے بھی خلفہ کو معقول آمدنی ہو جاتی ہے۔ اس کی ڈیوٹی مولوی کے مقابلے میں کم ہوتی ہے کیونکہ وہ نماز نہیں پڑھاتا جماعت خانے میں صبح وشام ڈیوٹی کیلئے مکھی کا مڑیا مقرر ہوتے ہیں۔

استادان (موسیقار):

چترال میں استادان کا پیشہ خوشی کے موقع موسیقی کا اہتمام کرنا ہے۔ نیز روایتی طور پر بچوں کا ختنہ بھی ان کے ہاتھ سے کرایا جاتا ہے۔ چترال کی موسیقی ڈھول، سرنا، بانسری اور شہنائی جیسے آلات موسیقی کا ماہرانہ استعمال استادان کا بڑا کمال ہے۔ ریاستی دور میں مہتران وقت اور رؤساء اُستادان کو جاگیریں، انعامات، معاوضہ، مشاہرہ، وغیرہ سے نوازتے تھے۔ خوشی کے موقع پر لوگ بھی انکی سرپرستی کرتے تھے۔ اب مختلف اداروں میں ملازمت کرتے ہیں۔ خوشی کے موقع پر میزبان طے شدہ معاوضہ ادا کرتا ہے اور فن کے شائقین میدان میں بھی انکی مناسب سرپرستی کرتے ہیں۔

طبیب (حکیم):

چترال میں طبابت قدیم لایام سے روایتی پیشہ رہا ہے۔ نبض، زبان، وغیرہ علامات کو دیکھ کر خوراک اور جڑی بوٹیوں کے ذریعے علاج کرنے والے ہر دور میں موجود رہے۔ دور دور سے طبیبوں کو علاج کیلئے بلایا جاتا تھا۔ اور مناسب معاوضہ دیا جاتا تھا۔ مگر اب اس پیشے کے ماہرین اُٹھ گئے۔ ہسپتال اور سربمہر ادویات کی مارکیٹ نے دیسی طریقہ علاج تقریباً ختم کر دیا ہے۔

روایتی دستکاریاں اور گھریلو صنعتیں

چترال کا معاشرہ ایک زمانے میں اپنی اکثر ضروریات خود پوری کرتا تھا۔ مہلک جنگی ہتھیار اور سونے چاندی کے زیوارات چترال کی روایتی دستکاریوں میں شامل نہیں ہیں۔ باقی تمام ضرورتوں کے لئے ہنرمند افراد دستیاب تھے۔ ہر ہنر ایک نسل سے دوسری نسل کو منتقل ہوتا تھا۔ اور دیے سے دیا جلتا تھا۔ سلائی، بنائی اور کندہ کاری کے شعبے میں چترال کے ہنرمندوں کو اتنے روایتی ڈیزائن یاد ہیں کہ ان کا شمار بھی مشکل ہے۔ ایک لوک روایت میں کہا جاتا ہے کہ قدیم زمانے میں چترال پریوں کا جیل خانہ تھا۔ قیدیوں میں خواتین کشیدہ کاری کرتی تھیں اور مرد شاعری کرتے تھے۔ چنانچہ یہ دونوں خوبیاں چترال کی موجودہ آبادی میں میں بدرجہ اتم پائی جاتی ہیں۔ چند اہم گھریلو ہنر یہ ہیں۔

شہد کی مکھی پالنا:

چترال کی روایتی صنعتوں میں شہد کو اہم گھریلو صنعت کی حیثیت حاصل رہی ہے۔ چترال کے جنوب میں ڈمیل اراندو کی وادیاں اور بمبوریت، بریر، رمبور کے علاوہ کئی اور علاقے شہد کیلئے مشہور ہیں۔ چترال میں شہد کی مکھیاں قدیم طریقے سے پالی جاتی ہیں۔ ان کے چھتے کے لئے محفوظ جگہ مہیا کی جاتی ہے۔ شہد کو صاف کرنے سے پہلے دوا کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ اسے اموچھی کہا جاتا ہے۔ صاف کرنے کے بعد اسے خوراک کے طور پر استعمال میں لایا جاتا ہے۔

ریشم کے کیڑے پالنا:

چترال میں خام ریشم کو "کچ" کہا جاتا ہے ریشم کے کیڑے پالنا چترال کی پرانی گھریلو صنعت ہے۔ ریشم کے کیڑے چترال کے طول وعرض میں پالے جاتے ہیں۔ زمانہ قدیم میں یہ صنعت اپنے عروج پر تھی۔ مگر گزشتہ ربع صدی سے اس صنعت کو زوال آیا ہے۔ یہ خواتین کے ساتھ تعلق رکھنے والی صنعت تھی۔ تعلیم اور ملازمت کے رواج پانے کے بعد ریشم کے کیڑے پال کر ریشم بنانے کا محنت طلب کام خواتین کی ترجیحات میں آخری نمبر پر آ گیا ہے۔ نیز بازار میں سستا ریشم دستیاب ہونے کی وجہ سے اس کی افادیت کم ہوگئی ہے۔

بارود تیار کرنا:

بارود بنانے اور بارود کیلئے قلمی شورہ ڈالنے کی صنعت چترال میں ایک اہم گھریلو صنعت ہے۔ قدیم زمانے میں کارتوس والے بندوقوں کی جگہ پرانے طرز کے سیہ کمان، کتہ کمان اور دوسرے بارود پٹاخہ والے بندوق استعمال ہوتے تھے۔ ان بندوقوں کیلئے گھر پر بارود تیار کیا جاتا تھا۔ پہاڑی غاروں سے قدرتی قلمی شورہ بھی اکھٹا کیا جاتا تھا۔ اور شورہ ڈالنے کا رواج بھی تھا۔ بارود کیلئے گندھک باہر سے لایا جاتا تھا۔ مختلف سائز کی چھلنیاں خاص طور پر بنائی جاتی تھیں۔ جو لوگ خود بارود نہیں بناتے تھے وہ دوسروں سے خرید کر استعمال کرتے تھے۔ اس لئے یہ آمدنی کا معقول ذریعہ بھی تھا۔

رسی بنانا:

گلہ بانی اور زراعت کی بنیادی ضروریات میں رسی بھی شامل ہے۔ چترال میں بکری اور خوش گاؤ کے بالوں سے بہت مضبوط رسیاں تیار کی جاتی ہیں۔ رسی کیلئے بالوں کے دھاگے کی تیاری اور پھر رسی کی بنائی کا عمل دقت طلب مگر سادہ کام ہے۔ اس لئے اکثر لوگ رسیاں بنا سکتے ہیں۔ یہ رسیاں پائیداری میں بے

مثال ہوتی ہیں۔ یہ ایسی دستکاری ہے جسے ابھی تک زوال نہیں آیا۔

چمڑے کا کام:

چمڑے کا کام چترال کی گھریلو صنعتوں میں اہم صنعت ہے۔ قدیم زمانے میں جوتے، بوریاں، گھوڑے کے ساز لگام چابک وغیرہ سب گھروں پر بنائے جاتے تھے۔ اس لئے چمڑے کا کام چترال کی روایتی دستکاریوں میں بہت اہمیت رکھتا ہے۔ چمڑے کی تیاری، مختلف مقاصد کیلئے اس کی کٹائی اور چمڑے کے تار بنانا بہت نازک کاموں میں شمار ہوتا ہے۔ اب یہ صنعت روبہ زوال ہے۔

کاغذ بنانا:

کاغذ سازی چترال میں قدیم زمانے کی اہم دستکاری تھی۔ کاغذ کی جگہ بھوج پتر بھی استعمال ہوتا تھا۔ توت کی جڑوں سے بھی کاغذ بنایا جاتا تھا۔ اس مقصد کیلئے توت کی جڑوں کو ہلکی آنچ پر چھ سات دن ابالا جاتا ہے گاڑھا مائع تیار ہونے کے بعد اسے ہموار لکڑی یا پتھر پر پھیلا کر خشک کیا جاتا تھا۔ اور کاٹ کر کاغذ بنایا جاتا۔ یہ موٹا زردی مائل کاغذ ہوتا تھا۔ اس کاغذ پر لکھے ہوئے 1013ھ اور مابعد زمانے کے قلمی نسخے دستیاب ہیں۔

لوہے کے اوزار بنانا:

لوہے کے گھریلو اور زرعی ضروریات کے اوزار بنانا بھی چترال کی گھریلو صنعتوں میں شمار ہوتی ہے۔ اس صنعت کے ہنرمند، تیشہ کلہاڑی، کدال، درانتی، چھریاں، چاقو نعل، اور دیگر زرعی و گھریلو ضروریات کے اوزار بناتے ہیں۔ بازار میں تیار اشیاء دستیاب ہونیکی وجہ سے یہ صنعت بھی زوال پذیر ہے۔

مٹی کے ظروف بنانا:

چترال میں مٹی کے چھوٹے بڑے برتن تیار کرنے کی صنعت بہت پرانی ہے۔ اس صنعت کے ماہرین مٹی کے بڑے بڑے مٹکے، دیگچے اور چھوٹے برتن بناتے ہیں۔ کام بہت مشکل اور معاوضہ کم ہے۔ اس لئے یہ صنعت بے توجہی کا شکار ہے اکثر دستکاروں نے دوسرے پیشے اختیار کئے۔ اور جو ابھی تک دست بردار نہیں ہوئے انکی نئی نسل دوسرے پیشوں کی طرف مائل ہے۔ ملکھو کے گاؤں مداک میں اب بھی یہ صنعت زندہ ہے۔

انگوٹھی بنانا:

خوش گاؤ، ہرن اور مارخور کے سینگ سے خاص ڈیزائنوں میں خوبصورت انگوٹھیاں بنائی جاتی ہیں۔ یہ چترال کے علاقہ تورکھو کی مخصوص صنعت ہے۔ سینگ کی انگوٹھیوں کو چترال کا مخصوص تحفہ سمجھا جاتا ہے۔ اور مارکیٹ میں انکی بڑی مانگ ہے۔ اس لئے یہ دستکاری ترقی کر رہی ہے۔

لکڑی پر نقش ونگاری کا کام:

لکڑی پر کندہ کاری سے نقش ونگار اور بیل بوٹے بنانے کا کام چترال کی روایتی دستکاریوں میں بہت اہمیت رکھتا ہے۔ قدیم زمانے میں مکانات کے ستون، دروازے، صندوق اور الماریاں نقش ونگار اور بیل بوٹے سجا کر بنائے جاتے تھے۔ اور رنگ کے استعمال کے بغیر بیحد خوبصورت جاذب نظر ہوتے تھے۔ یہ فن ابھی تک زندہ ہے اور مکانات کی ارائش وزیبائش کے علاوہ مساجد کی ارائش اور فرنیچر کی صنعت میں بھی اس سے کام لیا جاتا ہے۔ چترال کے ہنرمند کاریگر روایتی ڈیزائن بناتے ہیں جنکی تمام قسمیں انکو زبانی یاد ہوتی ہیں۔ ایک کمرے کی آرائش میں کم از کم آڑتالیس اور زیادہ سے زیادہ ایک سو بارہ ڈیزائن کام آتے ہیں۔

لکڑی کے ظروف بنانا:

چترال کے روایتی ظروف زیادہ تر لکڑی کے ہوتے ہیں۔ ظروف بنانے کیلئے بید کے پرانے درخت کا تنا استعمال ہوتا تھا اور سادہ خراد کی مدد سے مختلف سائز اور مختلف ڈیزائنوں کے برتن بنائے جاتے تھے۔ ان میں، ۲۰ انچ قطر کے بڑے پلیٹ سے لیکر ۳۰ انچ قطر کے بڑے لگن اور ۶ انچ سے ۹ انچ قطر کے چھوٹے چھوٹے ڈونگے بنائے جاتے تھے۔ مختلف سائز کے چھوٹے بڑے چمچے، غربال اور پاراب بھی بنائے جاتے ہیں۔ لکڑی کے برتنوں کا رواج رفتہ رفتہ ختم ہو گیا ہے۔ ساتھ ساتھ یہ دستکاریاں بھی دم توڑ رہی ہیں۔

آلات موسیقی بنانا:

چترال کے روایتی آلات موسیقی، سرنا، ڈھول، دف، بانسری اور ستار چترال کے اندر ہی بنتے ہیں۔ آلات موسیقی بنانا بہت نازک اور پیچیدہ دستکاری ہے۔ ستار کے علاوہ موسیقی کے دیگر آلات کا استعمال بہت کم رہا ہے۔ انکی جگہ نئے آلات، جرمیکن، ہارمونیم، وغیرہ بھی متعارف ہو چکے ہیں۔ اس لئے یہ فن آہستہ آہستہ ختم ہو رہا ہے۔

قالین اور نمدے کی بنائی:

چترل کا روایتی قالین اور نمدہ بنائی کے ذریعے تیار کیا جاتا ہے۔ اس ہنر میں مرد اور خواتین کا برابر حصہ ہے۔ قالین میں موٹا اونی دھاگہ مصنوعی رنگ

دیکر استعمال کیا جاتا ہے۔ صرف کالا اور سفید رنگ قدرتی ہوتا ہے۔ قالین کا دھاگہ خاص طور خواتین تیار کرتی ہیں۔ بنائی میں تانے پر خواتین بھی کام کرتی ہیں اور ہنر مند مرد بھی قالین بناتے ہیں۔ نمدے میں بکرے اور خوش گاؤ کے بالوں کا موٹا دھاگہ قدرتی رنگوں میں استعمال کیا جاتا ہے۔ یہ دھاگہ مرد تیار کرتے ہیں۔ البتہ بنائی میں خواتین بھی مردوں کے برابر حصہ لیتی ہیں۔ قالین اور نمدے کو دلکش بنانے کیلئے بیشمار ڈیزائن کام میں آتے ہیں۔ یہ ڈیزائن کاریگروں کو زبانی یاد ہوتے ہیں۔



کھڈی پر چترالی پٹی کی بنائی

اونی پٹی کی بنائی:

اونی کپڑا چترال کی مخصوص اور بہت مشہور دستکاری ہے، جسے ایک نفع بخش گھریلو صنعت کا درجہ حاصل ہے۔ اسے عرف عام میں چترالی پٹی کہا جاتا ہے۔ اس پٹی کا مخصوص باریک اور نازک دھاگہ خواتین چرخے پر تیار کرتی ہیں۔ کھڈی پر کپڑے کا ابتدائی نمونہ بھی خواتین کاریگروں کو ڈالنا ہوتا ہے۔ جب دھاگہ کھڈی پر چڑھ کر تیار ہوتا ہے تو مرد جولاہا کھڈی پر کپڑے کی بنائی کا کام شروع کرتا ہے۔ یہ کپڑا چار قدرتی رنگوں میں ہوتا ہے سفید کالا اور ہلکا سرخ رنگ قدرتی یک رنگہ اون سے بنتا ہے۔ سلیٹی رنگ کیلئے سفید اور کالے اون کو برابر ملایا جاتا ہے۔ پانچواں رنگ سرخ ہے۔ جس کے لئے اون کو اخروٹ کے تازہ پھل کے اوپر لپٹے ہوئے چھلکے (زالوکی) میں رنگ دیا جاتا ہے۔ یہ بھی قدرتی رنگ کی طرح پختہ رنگ ہے۔ چترالی پٹی کی مانگ بازار میں روز بروز بڑھ رہی ہے۔ اس لئے ہنر مندوں کیلئے اس دستکاری کو نفع بخش خیال کیا جاتا ہے۔

چُغہ کی سلائی اور چرمہ کاری:

چترال کا روایتی چُغہ مقامی زبان میں شوقہ کہلاتا ہے۔ چغے کیلئے کپڑے کی کٹائی، اسکی سلائی، گریبان اور آستینوں پر کشیدہ کاری چترال کی خواتین کا قدیم روایتی ہنر ہے۔ یہ چغہ مختلف سائزوں میں بنایا جاتا ہے۔ اور اسکی سلائی میں کئی ڈیزائنوں میں پھولدار گچھے اویزاں کئے جاتے ہیں۔ بیسویں صدی میں چغے پر چرمہ کاری کا رواج ہوا۔ چرمہ کاری کے رواج کے بعد جوڑنے کا کام مشین اور مرد کاریگروں کے ہاتھوں میں جا پہنچا۔ اب روایتی چغہ قدیم روایات کے مطابق تیار ہوتا ہے۔ جسکا سارا کام خواتین کرتی ہیں۔ اور تمام تر سلائی ہاتھ سے ہوتی ہے جبکہ جدید چغہ مرد درزی کے ہاتھ سے جوڑنے کے بعد گھروں میں لاکر خواتین کاریگروں سے اس پر چرمہ کے ذریعے بیل بوٹے سلائے جاتے ہیں۔ 1978ء میں افغان مہاجرین کی آمد کے بعد چترال کے روائتی چغے کی جگہ افغان درزیوں کا بدخشی چغہ بازار میں مقبول ہوا۔ چترال کی روایتی دستکاری کو اس رجحان سے بھی شدید دھچکا لگا ہے۔

اونی جرسی، جرابوں کی بنائی:

سلائی کی مدد سے اونی جرسیاں، بنیان، دستانے، مفلر، ٹوپیاں اور جرابیں بُننا چترال میں خواتین کی اہم روایتی دستکاری ہے۔ جو زمانہ قدیم کی طرح اب بھی مقبول ہے۔ اور ذرائع آمدن میں شمار ہوتی ہے۔ یہ کام چار پانچ رنگوں میں مختلف ڈیزائن بنا کر بھی کیا جاتا ہے۔ اور ایک ہی رنگ کے دھاگے سے بیل بوٹے سجا کر بھی ہوتا ہے۔ دونوں کا اپنا رنگ اور الگ لطف ہے۔ نزاکت میں دونوں بیمثال ہوتے ہیں۔ گزشتہ ربع صدی سے نٹنگ مشینوں کا استعمال بھی ہو رہا ہے۔

کشیدہ کاری:

کشیدہ کاری کی گھریلو صنعت کو چترال کی قدیم دستکاریوں میں خصوصی اہمیت حاصل ہے۔ چترال میں روایتی طور پر بیٹی کی ہنرمندی، ذہانت اور لیاقت کا سب سے بڑا امتحان کشیدہ کاری میں اس کی مہارت ہے۔ اور گھریلو خواتین کی خوبیوں میں کشیدہ کاری کے ہنر کو بہت بڑی خوبی تصور کیا جاتا ہے۔ کشیدہ کاری کے

ماہرین Stitch کے فنکارانہ استعمال سے ٹوپیاں، سُر بند، چادریں، میز پوش، پن پوش، چائے پوش، ٹی کوزی، رومال، گلے، اور آستینوں کے ٹکڑے، پرس، گھڑی کے چین اور گڑیاں بناتی ہیں۔ کشیدہ کاری کے روایتی ڈیزائن چترال کی خواتین کو زبانی یاد ہوتی ہیں ایک نسل سے دوسری نسل کو منتقل ہوتی ہیں۔ اور ان ڈیزائینوں کے ٹھپے کی کوئی ضرورت نہیں ہوتی۔ دلہن کے روایتی لباس اور جہیز میں کشیدہ کاری سے بنائی ہوئی مصنوعات کو بہت اہمیت ملتی ہے۔ اور یہ مصنوعات اب بھی عام استعمال کیلئے پہلے کی طرح مقبولیت رکھتی ہیں۔ اس لئے کشیدہ کاری کی روایتی دستکاری آجکل مشینی دور میں بھی اپنے جوبن پر ہے۔

ادبی، اور ثقافتی شخصیات

میر محمد شکور غریب:

عرف عام میں انہیں ''مہشکور'' کہا جاتا ہے مشہور شاعر گزرے ہیں۔ ان کا زمانہ خاندان کٹور کی حکومت کا دور اول تھا۔ غالباً سترھویں صدی کا معلوم ہوتا ہے۔ ان کی کھوار شاعری میں پہلی بار غزل کی معروف صنعف میں طبع ازمائی کے نمونے ملتے ہیں۔ کلیات میں فارسی اور کھوار دونوں زبانوں میں انکی تحقیقات موجود ہیں۔ کلام غیر مطبوعہ ہونے کے باوجود زبان زد عام ہے۔ قوم حاتم بیگہ ملکھو سے تعلق رکھتے تھے۔ کھوار غزلیات پہلی بار تحریری صورت میں انکے فارسی دیوان (1685) میں آگئے ہیں۔

بیگال:

بیگال کا تعلق گاؤں شغور لٹکوہ سے تھا پولو کے مشہور کھلاڑی تھے جوانی میں عالم جاودانی کو سدھار گئے۔ پولو کے حوالے سے چترال کے بچے بچے کی زبان پر بیگال کا نام ہے۔ انکی والدہ سے منسوب ایک مرثیہ چترال کی لوک شاعری میں شامل ہے بیگال کا زمانہ معلوم نہیں قرائن سے اندازہ ہوتا ہے کہ عہد کٹور کے ابتدائی دور یا عہد رئیسہ سے تعلق رکھتا ہے۔

مرزا محمد سیئر:

مرزا محمد سیئر کا نام، عاشق، صوفی، شاعر، خطاط اور ستار نواز کے طور پر مشہور ہے، عوامی زبان میں انہیں ''مہسیار'' کہا جاتا ہے کتابی زبان میں ان کا نام ''بابا سیئر'' بھی لیا جاتا ہے۔ ان کا زمانہ 1854-1780 کا درمیانی عرصہ ہے۔ ان کا کھوار کلام ''یارسن ہمیں'' لوک گیتوں میں بے پناہ شہرت رکھتا ہے۔ اسکی دھن بھی مسحور کن اثر رکھتی ہے۔ اس لازوال تخلیق کے کم وبیش 160 اشعار کے علاوہ فارسی میں شاہنامہ اور دیوان پر مشتمل غیر مطبوعہ تخلیقات انکی علمی وادبی یادگار ہیں۔ شوگرام ملکھو میں محمد بیگہ قوم سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کا مزار مرجع خلائق ہے۔ اور شوگرام میں ہے۔

روشن علی خان:

چترال کی لوک روایتوں میں روشن علی خان کا نام فن سپہ گری، پہلوانی اور شمشیر زنی کے حوالے سے مشہور ہے۔ ان کا زمانہ انیسویں صدی پر محیط تھا۔ قوم رضا کے چشم وچراغ تھے۔ ایچ تورکھو سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کا مزار دریجون ملکھو میں ہے۔

محمد رفیع:

عرف عام میں انہیں ''مہمہ رفی'' کے نام سے پہچانا جاتا ہے۔ شمشیر زنی اور فن سپہ گری کیلئے شہرت رکھتے ہیں۔ روشن علی خان کے ہم عصر مگر عمر میں انسے چھوٹے تھے لاسپور میں قوم بوژوکہ سے تعلق رکھتے تھے۔ پرواک میں مدفون ہیں۔

زیارت خان زیرک:

چترال کی لوک شاعری میں زیارت خان زیرک کے گیت بہت مقبول ہوئے انہیں ''سنوغر و ملنگ'' کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ ان کا نام شاعر اور مجذوب کی حیثیت سے مشہور ہے۔ قوم زوندہ سے تعلق رکھتے تھے۔ سنوغر کے رہنے والے تھے، جو علاقہ بیار کا خوبصورت اور رومان پرور گاؤں ہے۔ زیارت خان زیرک کا زمانہ انیسویں صدی کے نصف آخر اور بیسویں صدی کے نصف اول پر محیط ہے۔

گل اعظم خان:

گل اعظم خان ایک قاضی مہاجر پھورولیکر کے بیٹے تھے۔ ملکھو کے مقام زینی میں عمر گزاری۔ زیارت خان زیرک کے ہم عصر تھے۔ ان کا نام گیتوں کی وجہ سے مشہور ہے۔ چترال کی لوک شاعری میں پہلے شاعر ہیں جنہیں انقلابی شاعر کہا جاتا ہے۔ خوبصورت اور برمحل استعاروں کی مدد سے قومی اور معاشرتی مسائل کو اپنی شاعری کے ذریعے اجاگر کیا۔ عرف عام میں انہیں ''پھورولیکوژاؤ'' کہا جاتا ہے۔

شیر مُلک:

شیر مُلک کا نام کھوار میں پرسوز گیتوں کیلئے مشہور ہے۔ ملکھو میں نوگرام / زینی کے باشندے تھے۔ رضا قوم سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کا رومان شریعت کی زد میں آیا اس لئے مجذوب ہوئے۔ زیارت خان اور گل اعظم خان کے ہم عصر تھے۔

امان:

امان کا نام بھی چترال میں لوک رومان اور شاعری کے حوالے سے

مشہور ہے۔ ان کا رومان انکی محبوبہ خوش بیگم کے نام سے مشہور ہے۔ اور گیت بھی اسی نام سے مشہور ہیں، انکی دُھن کو بھی یہی نام دیا گیا ہے۔ امان بھی شیر ملک کا ہم عصر تھا۔ علاقہ غذر گلگت کا رہنے والا تھا۔ ان کی محبوبہ بھی غذر کی رہنے ولای تھی۔ ان کا میکہ گلاغمولی میں تھا اور چٹور کھنڈ (اشکومن) میں بیاہی گئی تھی۔ اس لئے امان کو نہ مل سکی۔ اور امان تمام عمر گیت ہی گاتا رہا۔ لوگ گیتوں پر کام کرنے والوں نے امان کے استعاروں کی غلط اور دوراز کار تاویلیں کر کے زیب داستان کیلئے کہانی کا دائرہ چترال کے شاہی خاندان سے کابل تک بڑھا دیا ہے۔ مگر اس میں حقیقت نہیں ہے۔ (غلام عمر، چترال کی لوک کہانیاں، لوک ورثہ اسلام آباد، 1984ء)

جمسال:

جمسال کا نام چترال میں موسیقی کے حوالے سے زبان زدعام ہے۔ ان کا زمانہ 1930-1850 ہے۔ لوک دھنوں کا ماہر اور سُرنا (Flute) کا بے مثل فنکار تھا۔ انکے خاندان میں یہ فن زمانہ قدیم سے چلا آرہا ہے۔ اور اب تک زندہ ہے۔ ان کا بیٹا اجدابہ خان بھی فن موسیقی کا بے مثل استاد مانا جاتا ہے۔ اور بقید حیات ہے۔

شاہ گلی ذار:

چترال کی لوک ثقافت میں شاہ گلی زار کا نام مشہور ستار نواز کے طور پر نمایا ہے۔ ان کا زمانہ 1978-1890 ہے۔ ان کے فن کی آڈیو ریکارڈز موجود ہیں۔ چترال کے کلاسیکی دھنوں کو بجانے میں ان کا کوئی ثانی نہیں تھا۔ میرا گرام علاقہ بیار کے رہنے والے تھے۔ قوم زوندرہ سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے والد بجانی لال بھی اپنے زمانے میں مشہور ستار نواز تھے۔ بیٹا افسر خان بھی اس فن میں ید طولی رکھتا ہے۔

محمد عیسی:

فن سپہ گری اور شمشیر زنی کے حوالے سے محمد عیسی کا نام چترال میں ضرب المثل اور استعارے کی حیثیت رکھتا ہے۔ عرف عام میں انہیں ''مہمہ تیسہ'' کہا جاتا ہے۔ ان کا زمانہ 1910-1846 ہے۔ اُجنوتورکھو میں بائیکہ قوم سے تعلق رکھتے تھے اور حرمت شاہ پہلوان کے چشم و چراغ تھے۔ جوانی کا زمانہ افغانستان میں جلاوطنی میں گزارا 1880ء میں میمنہ (کابل) کی جنگ میں نمایاں جوہر دکھائے۔ 1892 سے 1895 تک چترال کے اندر مختلف جنگوں میں بہادری کا مظاہرہ کیا۔ انگریزوں کے خلاف جہاد میں نمایاں حصہ لیا۔ اور زندگی کے آخری ایام پھر تانگیر (یاغستان) میں جلاوطنی میں بسر کی اور وہیں شہادت پائی۔ ان کا مزار تانگیر میں ہے۔ ان کی شجاعت کا نمایاں پہلو یہ ہے کہ ایک ہی وار میں مضبوط سے مضبوط پہلوان کے دو ٹکڑے کرتے تھے اور تلوار چلاتے ہوئے انکی آنکھ نہیں جھپکتی تھی۔

دانیار بیگ:

دانیار بیگ کی شہرت بھی فن سپہ گری اور شجاعت کی بناء پر ہے۔ عمر میں محمد عیسی سے بڑا اور فن سپہ گری میں محمد عیسی کا استاد تھا۔ دونوں مہتر شیر افضل کے دربار سے وابستہ تھے۔ جلاوطنی کے ایام بھی دونوں نے ایک ساتھ کاٹے۔ 1895 میں دانیار بیگ کو انگریزوں نے شیر افضل کے ہمراہ گرفتار کیا۔ رہا ہونے کے بعد جلا وطن رہے۔ 1918ء میں صوفی صاحب سینگور کی کوششوں سے چترال آئے۔ 1919ء کی جنگ افغانستان میں بریکوٹ کے محاذ پر جنگ کے لئے جاتے ہوئے راستے ہی میں شہید کئے گئے۔ ان کا تعلق شالی علاقہ لٹکوہ کے ایک کم عزز خاندان سے تھا۔ ان کا مزار گہریت پل کے قریب شیدی کے مقام پر ہے۔ کہتے ہیں کہ انہوں نے مہتر شیر افضل کی بیٹی سے شادی کی تھی۔ یہ بات شاہی خاندان کے دوسرے بزرگوں کو معیوب لگتی تھی۔ اس لئے انکی شہادت کی رات قاتلوں نے گھر کے اندر گھس کر انکی بیوی کو بھی شہید کیا۔ تاریخ کی یہ ستم ظریفی لوک روایات میں المیے کی صورت اختیار کر گئی ہے۔

عمرا خان لال:

چترال نے پولو کے نامور کھلاڑی بہت پیدا کئے۔ ایک نے ایک سے بڑھ کر کمال دکھای۔ مگر فن گھڑ سواری اور پولو کے کھیل میں لوک روایات میں عمرا خان لال کا نام زندہ ہے۔ ان کا تعلق چترال خاص کے محلّہ ژانگ بازار سے تھا۔ رضا قوم کے چشم و چراغ تھے۔ بابائے پولو کے نام سے یاد کئے جاتے ہیں۔ ان کے بیٹے مظفر علی اور پوتے مقبول علی نے بھی پولو میں ایسی ہی شہرت حاصل کی۔ اور یہ فن انکے خاندان میں زندہ رہا۔

شہزادہ محمد حسام الملک:

چترال میں شہزادہ محمد حسام الملک کا نام ''گورنر دروش'' کے خطاب سے مشہور ہے۔ انکی وجہ شہرت چترال کی زبان وادب اور ثقافت کیلئے انکی ادبی اور علمی کارنامے ہیں۔ انہوں نے بڑے بھای ہز ہائی نس محمد ناصر الملک کی صحبت میں زبان وادب اور اپنی ثقافت سے محبت کا اثر قبول کیا۔ دروش کی گوانری کے دوران اس کام میں دن رات محنت کر کے نظم ونثر کا ذخیرہ فراہم کیا۔ مشاعروں کی طرح ڈالی۔ اور زبان وثقافت کے فروغ کیلئے ''جشن چترال'' کینام سے ثقافتی میلے کا اجراء کرایا۔ انجمن ترقی کھوار کی بنیاد رکھی اور اسے پروان چڑھایا اس لئے انکی شہرت عام ادیب اور شاعر سے بڑھ کر ایک ثقافتی علامت اور علاقائی ادب کے سمبل کی سی

ہے۔ان کا زمانہ 77-1903 ہے۔انہیں بجا طور پر بابائے کھوار کہا جاتا ہے۔چار کتابیں اور بیس مضامین شائع ہو چکے ہیں۔آٹھ کتابیں اور بے شمار مضامین غیر مطبوعہ یادگار ہیں۔

علی ظہور:

ستار نوازی کے حوالے سے موجودہ دور کے شائقین فن کو جس فنکار نے سب سے زیادہ متاثر کیا۔ وہ علی ظہور ہے۔ ان کا تعلق مستوج کے گاؤں کارگین سے تھا۔قوم رضا کے ایک کم توسط خاندان سے تھے۔ستار نواز ہونیکے علاوہ شاعر اور گلوکار بھی تھے۔1948ء کو جہاد کشمیر میں حصہ لیا۔انکا رزمیہ گیت اس جنگ کے حوالے سے بہت مقبول ہے۔ستار بجانے میں انہوں نے قدیم موسیقی کے سر تال سے غنائیت کے مسحور کن رنگ پیدا کئے۔اور سروں کو الفاظ و اواز کی سی معنویت سے آشنا کیا۔اور یہ دور حاضر کے شائقین فن کی سب سے بڑی ضرورت تھی۔ 1980ء کے عشرے تک عالم پیری میں بقید حیات تھے۔انکے آڈیو کیسٹ وافر مقار میں دستیاب ہیں۔

امیر گل:

چترال کی ثقافت میں امیر گل ایک ہشت پہلو شخصیت کا نام ہے ملکھو کے گاؤں مور دیر سے تعلق رکھتے تھے۔ زندگی چترال خاص میں گزاری۔ عالم نوجوانی میں بمبئی اور کولمبو کا سفر کیا۔ بیک وقت شاعر، موسیقار، گلوکار اور رقاص تھے۔اور ہر فن میں یکتا تھے۔1910ء میں پیدا ہوئے 1995ء میں وفات پائی بے شمار گیت تخلیق کئے۔1940ء اور 1950 کی دہائی میں آڈیو کیسٹوں کا رواج نہیں تھا۔لیکن انکے گائے ہوئے گانے چترال کے طول و عرض میں سینہ بسینہ منتقل ہو کر شہرت پاتے تھے۔ بعد میں ریکارڈنگ کی سہولتیں میسر آنے اور ریڈیو کا سہارا ملنے سے انکی تخلیقات کو مزید شہرت حاصل ہوئی۔عرف عام میں انہیں ''میر گل'' کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

پستہ گل:

چترال خاص کے جنوب میں اورغوچ کی بے آب مگر مردم خیز سرزمین چترال کے کئی ہیروز کا جنم بھوم ہے۔ پستہ گل کا تعلق اسی گاؤں سے تھا۔فن پہلوانی میں شہرت رکھتا ہے رسہ کشی میں نمایاں بہادری کی وجہ سے ان کا نام عوامی زبان پر چڑھ کر ضرب المثل کی صورت اختیار کر گیا ہے۔

ان کا زمانہ بیسویں صدی کا نصف اول تھا۔لوک ثقافت اور سینہ بسینہ چلی آنے والی روایات کے مشاہیر میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ عام زبان میں چوکھی لڑنے والے کرداروں کو پستہ گل کہا جاتا ہے۔

طرز تعمیر اور رہن سہن

چترال کے روایتی طرز تعمیر اور رہن سہن کے طور طریقے آس پاس کے دیگر علاقوں سے منفرد ہیں۔ چنانچہ ہندوکش قراقرم کی وادیوں میں چترال کو اس طرح ایک الگ تھلگ کالونی کی حیثیت سے پہچانا جاتا ہے۔

چترال میں عام لوگوں کے پاس ملکیتی زمین کی مقدار بہت کم ہے۔ اس کے باوجود ہر گھر کیساتھ چھوٹا صحن اور باغ ضرور ہوتا ہے پھول اگانے اور گھروں کی چاردیواریوں کے اندر پھولوں کے باغیچے بنانے کا رواج عہد قدیم سے چلا آرہا ہے۔

روایتی چترالی گھر کا طرز تعمیر:

عام طور پر روایتی گھر چند کمروں پر مشتمل ہوتا ہے۔ایک بڑا کمرہ بیٹھنے، کھانے پینے اور سونے کیلئے بیک وقت استعمال ہوتا ہے۔کھانا اسی کمرے میں ہ پکتا ہے۔اسے کھوار ختان یا سرائے ختان کہتے ہیں۔اس کمرے کے چار حصے الگ الگ تقسیم ہوتے ہیں۔دروازے کے پاس کم وبیش 4X18 فٹ کا ایک ٹکڑا ''شوم'' کہلاتا ہے۔یہاں جوتے اتارتے ہیں۔لکڑی اور روزمرہ ضرورت کی دیگر چیزیں رکھی جاتی ہیں۔خوشی کے موقع پر ناچ گانے کی محفل بھی یہیں ہوتی ہے۔اسی وجہ سے ضرب المثل مشہور ہے ''پھونیک نو بیتی شوموبہنہ'' جسے ناچنے کا فن نہ آتا ہو وہ شوم کی خرابی کا بہانہ بناتا ہے۔شوم کو گھر کی معاشرتی تقسیم میں مردانہ کاموں کیلئے مخصوص سمجھا جاتا ہے۔شوم سے آگے گھر کم وبیش 4X6,10X6,4X6 فٹ کے تین حصوں میں تقسیم ہوتا ہے اور یہ حصہ شوم کے فرش سے کم بلند ہوتا ہے۔اس کے درمیان میں آخری کونے پر 2X2 فٹ کی انگیٹھی ہوتی ہے جسکی چمنی نہیں ہوتی (دھواں مخروطی شکل کی چھت کے روشن دان سے باہر نکلتا ہے) یہ حصہ بیٹھنے کیلئے ہے اور ''بند'' کہلاتا ہے۔دایاں حصہ مردوں کیلئے اور بایاں حصہ عورتوں کیلئے مخصوص ہوتا ہے۔اس کے دائیں بائیں طرف تین انچ بلند 6X4 فٹ کے دو الگ الگ حصے نخ کہلاتے ہیں۔اور سونے کیلئے مخصوص ہوتے ہیں۔اس سے آگے دس یا بارہ انچ بلند تقریباً حصہ 4X18 فٹ یا کم وبیش ہوتا ہے۔جسے ''ٹیک'' کہتے ہیں۔اور یہ حصہ پانی، برتن، کھانے پینے کی اشیاء رکھنے کے ساتھ ساتھ خواتین کے گھریلو کاموں کیلئے مخصوص ہوتا ہے۔علاقے میں اسلام کی دعوت پھیلنے کے بعد اسمیں ایک اور حصے کا اضافہ ہوا۔یعنی دائیں طرف ٹیک کے کونے کو نماز کیلئے مخصوص

کر کے ''نمشیرینی'' کہا جانے لگا۔ عام گھروں میں مہمان کا کمرہ برآمدے میں ہوتا ہے۔ افراد خانہ کے الگ کمرے بھی شوم کے ملحق برآمدے کے دائیں بائیں ہوتے ہیں۔ سرد مقامات پر برآمدہ اور بڑے کمرے کے درمیان ایک اور کمرہ محض سردی سے بچاؤ کیلئے ہوتا ہے۔ جسے دہلیز کہتے ہیں۔ قدیم زمانے میں مہمان خانہ بھی یہی کمرہ ہوتا تھا۔ اسے گھر کے بڑے کمرے کے برابر اسی ڈیزائن اور نقشے پر بناتے تھے۔ ''کھوار ختان'' یا ''سرائے ختان'' کی چھت مخصوص طرز پر مخروطی شکل میں بنائی جاتی ہے۔ ''شوم'' کے اوپر چھت بھی اسی نقشے پر آتی ہے۔ آگے چھت کو کم وبیش 6X12 فٹ کے تین حصوں پر تقسیم کیا جاتا ہے۔ دیوار سے دیوار تک دو بڑے شہتیر اور چھ مضبوط ستون ان حصوں کو الگ کرتے ہیں۔ دائیں بائیں شوم کی طرح سادہ چھت ڈالی جاتی ہے۔ درمیان میں بینڈ، اور ٹیک کے اوپر مضبوط لکڑیوں کو مرحلہ وار خاص انداز میں ایک دوسرے کے اوپر رکھ کر مخروطی چھت بنائی جاتی ہے۔ پہلے مرحلے کو ''غیاروم'' چھوٹے مرحلے کو ''گٹ'' اور آخری مرحلے کو ''کُماڑ'' کہتے ہیں۔ ہر مرحلے پر چھت سکڑتی ہے اور چھ انچ سے آٹھ انچ تک پہلے سے بلند ہوتی ہے۔ اسی طرح آخر میں 6X12 سے 2X2 فٹ رہ جاتی ہے اور فرش سے اسکی بلندی آٹھ فٹ سے دس یا بارہ فٹ ہو جاتی ہے۔ اوپر روشن دان سے روشنی بھی آتی ہے اور دھواں بھی نکل جاتا ہے۔ امیر گھرانوں کو وہاں کھانا پکانے کیلئے اسی طرز کا الگ کمرہ ہوتا ہے جسے ''راتھینی'' کہتے ہیں۔ بیٹھنے اور سونے کیلئے اسی طرز کا کمرہ الگ قدرے بڑے سائز میں ہوتا ہے جسے بائی بش کہتے ہیں۔ چترال کے خاص طرز تعمیر میں لکڑی کے نقش ونگار اور بیل بوٹے نہایت اہم ہیں۔ بائی پش کمرہ اور عام کھوار کمرے کو لکڑی کے خوبصورت کاموں سے سجایا جاتا ہے۔ اس ہنر کا ذکر پہلے گزر چکا ہے۔ خاص طرز تعمیر کی دوسری بات دو منزلہ کچے مکانات کا تصور ہے۔ لکڑی اور پتھر کی مدد سے دیواریں، اور چھتیں اتنی مضبوط اور پائیدار بنائی جاتی ہیں کہ دو منزلہ اور سہ منزلہ عمارت سو ڈیڑھ سو سال کام دیتی ہے۔ گبور، بمبوریت، رمبور اور جنوبی چترال میں اس طرز کی قدیم عمارتیں بہت ہیں۔ بالائی چترال میں قدیم قلعے اور امراء کے مکانات اس طرز پر بنائے ہیں۔ چپاڑی مستوج میں ڈام کی تاریخی سہ منزلہ عمارت اس طرز تعمیر کی نادر یادگار ہے۔ جدید رجحانات میں سیمنٹ، اور نالیدار چادروں کی چھتوں کے ساتھ مسطح سیلنگ کے رواج نے اس کی جگہ لے لی ہے۔ تاہم مسطح سیلنگ زمانہ قدیم میں روایتی طرز تعمیر میں بھی بعض مقامات میں ملتی ہے۔ ریشن میں مسطح کے نام سے روایتی ''بائی بش'' اس طرز کی یادگار ہے۔ مگر ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہے۔ کیونکہ اسمیں لکڑی کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں کو میخ اور کیل کے بغیر جوڑ دیا جاتا تھا۔ چترال میں پرانے طرز کے مساجد کو بھی منقش محرابوں اور محرابی ستونوں سے مزین کیا گیا ہے۔ مساجد میں خاص طور پر ہشت پہلو ستون استعمال ہوئے ہیں۔ جن پر خراد کا خوبصورت کام ہوتا ہے۔ عام طور پر ''مشاربہ موڑی'' کہلاتے ہیں۔

ادب وآداب:

چترال میں رہن سہن اور نشست و برخاست کے روایتی طور طریقے تہذیب وشائستگی کے وسط ایشیائی اور اسلامی اصولوں پر مبنی ہیں۔ ہر محفل اور ہر نشست میں بڑوں کو آگے جگہ دی جاتی ہے۔ کم عمر کے لوگ درجہ بدرجہ پیچھے اور آخر میں بیٹھتے ہیں۔ باہر سے آنے والے کا خاص طور پر کھڑے ہو کر استقبال کیا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ بڑے بھی کھڑے ہو جاتے ہیں۔ بیٹھے بیٹھے ہاتھ ملانے کو بہت معیوب سمجھا جاتا ہے۔ عام نشست کیلئے بھی تہواروں کے مواقع پر بھی ننگے فرش پر، ننگی چٹائی یا ننگی چارپائی پر بیٹھنے کو بہت معیوب سمجھا جاتا ہے۔ قالین، توشک وغیرہ بچھانیکا خاص دستور ہے گھروں میں کرسیوں کی جگہ لکڑے کے بڑے بڑے تخت بنائے جاتے ہیں۔ ان تختوں پر قالین دری، چاندنی وغیرہ بچھا کر بیٹھتے ہیں۔ خوراک کی اشیاء کا احترام کیا جاتا ہے۔ کھانا رکھتے اور دسترخوان اٹھاتے وقت اس احترام کا خاص خیال رکھا جاتا ہے۔ مہمان کیلئے اہتمام کرنے اور مہمان کا زیادہ سے زیادہ اکرام کرنیکا خیال رکھا جاتا ہے۔ تاہم سادہ خوراک، دال چپاتی، ساگ، لسی، جو بھی دستیاب ہوں، خوشی اور خندہ پیشانی کیساتھ مہمان کے سامنے پیش کیا جاتا ہے۔ تصنع اور تکلیف کیلئے مہمان سے اغماض، پہلوتہی اور پس وپیش کرنیکو معیوب سمجھا جاتا ہے۔ گفتگو میں اونچی آواز اور گالی کو بہت معیوب خیال کیا جاتا ہے۔

رسم ورواج اور تہوار

چترال کے قدیم رسم ورواج میں بعض پر جدید دور میں بھی اُسی طرح عمل ہوتا ہے اور بعض تاریخ کا حصہ بن چکے ہیں جدید رجحانات اور مشینی دور نے انسان کو جس طرح دنیا کے دیگر حصوں میں اپنے ماضی سے کاٹ دیا اسی طرح ان میلانات نے چترال میں بھی سوسائٹی کو ماضی کیا قدار سے بیگانہ کرنیکا عمل شروع کیا ہے۔ چترال کے چند مخصوص رسم ورواج یہ ہیں۔

سفر پر جانے کی رسومات:

سفر پر روانگی کے وقت سب سے پہلے، مذہبی پیشوا، عالم، سید یا خلفہ سے نیک ساعت کے بارے میں رائے لی جاتی ہے۔ وہ ستاروں کا حال، نحس اکبر

کے ایام، اور دیگر لوازمات وتوہمات کو پیش نظر رکھ کر سفر کیلئے تاریخ اور وقت بتاتا ہے۔ اگر کسی وجہ سے اس دن کے بعد سفر کرنا ہو تو مقررہ وقت پر مسافر باقاعدہ سفر کی تیاری میں باہر نکل کر سامان کسی دوسری جگہ رکھدیتا ہے۔ اور واپس آکر اپنی فرصت کے دن وہاں سے سامان لیکر سفر شروع کرتا ہے۔ اگر بتائے ہوئے دن مقررہ وقت پر نکلنا ممکن ہو تو پہلے مسافر کے گھر میں آگ جلائی جاتی ہے وہ تین بار آگ کا طواف کرتا ہے (یہ طواف ہاتھ کے اشارے سے ہوتا ہے) پھر گھر سے ایک برتن میں جو یا گندم کا آٹا لیکر مسافر سے پہلے دروازے پر جا کر ایک بزرگ مسافر کے کندھے پر دو انگلیوں میں آٹا پھینکتا ہے۔ پھر سب لوگ خدا حافظ کہہ کر مسافر کو رخصت کرتے ہیں۔ گھر سے نکلتے وقت قرآن پاک یا پنجسورہ یا ہفت ہیکل دروازے پر لانا بھی باعث برکت سمجھا جاتا ہے۔ گھر سے نکلتے وقت سامنے جو شخص ہو اس کا چہرہ سفر کیلئے نیک فال ہونا بہت ضروری ہوتا ہے۔ لومڑی کو نیک فال سمجھا جاتا ہے۔ بلی کو بدفال خیال کیا جاتا ہے۔ گھر کے افراد اور ہمسایوں میں بھی نیک و بد کے تجربے کئے جاتے ہیں۔ گھر سے کوئی فرد سفر پر گیا ہوا ہو، اس دن کالی چیز، فتیلہ، دیگچہ وغیرہ گھر سے باہر لیجانا بدفال سمجھا جاتا ہے۔

چھیلوئی:

چھیلوئی چترال میں مصنوعی بھائی چارہ اور دستوری رشتہ پیوندی کی ایک رسم ہے۔ اس کا ایک طریقہ سیدھا سادا فطری طریقہ ہے کہ جسے دودھ پلایا اس کیساتھ رضاعت کا رشتہ ہوا۔ مگر ایک رسمی اور رواجی طریقہ ہے۔ جس کی رو سے جس شخص کے ساتھ رشتہ مطلوب ہو، اسکو مقررہ دن اپنے گھر دعوت دیکر گھر کے دروازے پر سوہن حلوہ (شوشپ) کی ڈش ہاتھ میں لیکر اس کا استقبال کیا جاتا ہے۔ اور اپنے ہاتھ سے تین نوالے کھلائے جاتے ہیں اس کے بعد مذکورہ شخص بھائی بن جاتا ہے۔ اسے چھیلوئی کہتے ہیں۔ اس کے ساتھ رضاعت کے رشتے کا سلوک ہوتا ہے۔

دودھ چھڑانے کی رسم:

جب کسی کا بچہ یا بیماری کے علاج کیلئے کوئی بالغ مرد عورت کسی کا دودھ پی رہی ہو، اور دودھ پینے کی مدت پوری ہو جائے تو دودھ چھڑاتے وقت دودھ پینے والے کا خاندان تیار رکھا نا، اور قیمتی تحائف لیکر دودھ پلانے والے کے گھر جاتا ہے۔ وہاں سے جواب میں تحائف دیکر انکو رخصت کیا جاتا ہے۔ حکمران، مہتر اور رؤسا ایسے موقعوں پر دودھ پلانے والے خاندان کو جاگیریں دیتے تھے۔

بی ینسیک:

جب فصلوں کی کاشت کے موسم میں گھر سے پہلے دن کا تخم باہر نکال کر کھیت میں کاشت کیا جاتا ہے، اُس دن خاص اہتمام کیا جاتا ہے کہ باہر سے کوئی عورت گھر میں داخل نہ ہو۔ اس روز گھر پر چھوٹی سی رسم ادا کی جاتی ہے جسے ''بی ینسیک'' کہتے ہیں۔ خاص کھانا یعنی شوشپ (سوہن حلوہ) پکا کر دیسی گھی، دودھ اور بڑی بڑی چپاتیوں کے ساتھ کھیت پر لیجا کر آس پاس کے ہمسایوں کو بلا کر کھانا دیتے ہیں۔ گھر سے کھانے کے ڈش قریبی عزیزوں اور قریب بیاہی گئی بہنوں، بیٹیوں اور دودھ کے رشتے میں قربت رکھنے والے بیٹوں، بیٹیوں کو بھیجا جاتا ہے۔

پھن دک:

یہ ایک روایتی تہوار ہے۔ جو چترال کے بالائی علاقوں میں ہے اس کو ''پھن دک'' کے علاوہ ''اجوان'' بھی کہتے ہیں۔ یہ رسم اُس وقت منائی جاتی ہے جب فصل کے ''خوشے'' نکل آتے ہیں۔ گاؤں یا پوری وادی میں ایک تاریخ مقرر کی جاتی ہے جو ہر سال مختلف ہوتی ہے۔ اس تاریخ کیلئے عید کی طرح نئے کپڑے سلائے جاتے ہیں۔ صبح سویرے روایتی کھانا ''سناباچی'' پکایا جاتا ہے۔ پو پھٹتے ہی پھٹی ہوئی لسی کا پانی بالٹی میں بھر کر فصلوں کو چھینٹا دیا جاتا ہے۔ جسے ''چھراش'' کہتے ہیں۔ کھانا ہمسایوں کو بلا کر کھایا جاتا ہے۔ اور رشتہ داروں، بیٹیوں، بہنوں کے گھر کھانا بھیجا جاتا ہے۔ اس روز کے کھیلوں میں ناچ، گانا، پولو، فٹ بال اور روایتی کھیل ''اوغ جان'' شامل ہیں۔ یہ ''ہولی'' کے طرز کا دیہاتی کھیل ہے۔ جس میں ایک دوسرے پر پانی کے چھینٹے اڑانے کا مقابلہ ہوتا ہے۔ یہ مقابلے نہروں اور چشموں کے کنارے دن بھر جاری رہتے ہیں۔

کھول سوئیک:

یہ ایک رسم ہے جسے موسم خزاں میں فصل جمع کرنے کے بعد کھلیان سے سارا غلہ گھر میں جمع کرنے کے بعد ہر خاندان میں افرادی طور پر اہتمام سے ادا کی جاتی ہے۔ اس موقع پر خاص ڈشیں یعنی سناباچی، وغیرہ پکائی جاتی ہیں۔ جسے ہمسایوں اور بیٹیوں بہنوں کے گھروں میں بھی بھیجا جاتا ہے۔

غاری نیسیک:

موسم گرما کے آغاز میں جب بھیڑ، بکریوں کے ریوڑ اور مویشی پہاڑی چراگاہوں پر بھیجے جاتے ہیں۔ اُس مناسبت پر غازی نیسیک کے نام سے ''غاری'' یعنی چراگاہوں پر ایک تہوار ہوتا ہے جس میں روایتی کھانے پکتے ہیں پولو، رسہ کشی،



کلاشی عورتیں موت کی رسوم ادا کر رہی ہیں

کشتی اور دیگر کھیلوں کے مقابلے ہوتے ہیں۔ رات کو میدان میں زبردست آلاؤ جلایا جاتا ہے۔ اور اس روشنی میں ناچ گانا ہوتا ہے۔ جس میں شرکت کیلئے گاؤں سے ساری آبادی چراگاہ پر چلی جاتی ہے۔

غاری خومیک:

موسم خزاں کے قریب چراگاہ سے بھیڑ بکریوں اور مویشیوں کو چراگاہ سے واپس بستی کی طرف لایا جاتا ہے تو بستی میں ایک تہوار منایا جاتا ہے جسے غاری خومیک کہتے ہیں۔ اس موقع پر بھی پولو اور دیگر کھیلوں کے مقابلے ہوتے ہیں۔ روایتی کھانے پکتے ہیں۔ چراگاہوں سے لایا ہوا گھی، پنیر وغیرہ تقسیم ہوتا ہے۔ اور دن بھر پُر رونق تقریبات کے بعد رات محفل موسیقی منعقد ہوتی ہے۔

لوٹ نمیژ (عیدالاضحیٰ):

عیدالاضحیٰ کو چترال میں بڑی عید یا ''لوٹ نمیژ'' کہا جاتا ہے اس دن مساجد اور جماعت خانوں میں عید کے اجتماعات ہوتے ہیں۔ جانور ذبح کیے جاتے ہیں۔ رشتہ داروں اور پڑوسیوں کے لئے کھانے کی دعوتیں ہوتی ہیں۔ بہنوں بیٹیوں کے ہاں کھانا بھیجا جاتا ہے۔ اگر موسم گرما یا بہار ہو تو کھیلوں کے مقابلے بھی ہوتے ہیں۔ موسم سرما ہو تو اسے صرف ملنے ملانے اور عبادات و ریاضات کا تہوار سمجھا جاتا ہے۔ چترال میں یہ تہوار اسلامی دور کے بعد شروع ہوا۔ اس تہوار پر نئے کپڑے عموماً بنائے جاتے ہیں۔

حیق نمیژ (عیدالفطر):

عیدالفطر کو چترال میں ''حیق نمیژ'' یا ''چھوٹی عید'' کہا جاتا ہے۔ یہ بھی اسلامی عہد میں رائج ہونے والا تہوار ہے۔ اس عید پر قربانی نہیں ہوتی، نئے کپڑے بنائے جاتے ہیں۔ موسم کے مطابق کھیلوں کا اہتمام بھی ہوتا ہے۔ مساجد اور جماعت خانوں میں عید کے اجتماعات ہوتے ہیں۔ خاص ڈشیں پکائی جاتی ہیں۔ دعوتوں کے اہتمام ہوتے ہیں۔ عیدین کے مواقع پر، خاندان کے گزرے بزرگوں کو ایصال ثواب کیلئے مخصوص ڈش پکتے ہیں۔ اور فاتحہ خوانی ہوتی ہے۔ مسلمان آبادی میں رمضان شریف کے روزوں کے اختتام پر یہ تہوار نہایت جوش و خروش کیساتھ منایا جاتا ہے۔

پتھک:

پتھک چترال کی اسماعیلی آبادی کا مخصوص تہوار ہے اس لئے مقامی کیلنڈر کے مطابق یہ تہوار موسم بہار کی ابتدائی تاریخوں میں منایا جاتا ہے۔ عام طور پر ۲۱، مارچ کا دن اس کے لئے مخصوص ہوتا ہے اس تہوار کیلئے گھر سے دھوئیں کے

سیاہ دھبوں کو صاف کیا جاتا ہے۔ آٹے کے میدے سے دیواروں پر گھوڑوں اور ہرنوں کی تصویریں بنائی جاتی ہیں۔ اور دوسرے نقش و نگار سے گھروں کو سجایا جاتا ہے۔ صبح سویرے گھر کا بزرگ یا محلے کا بزرگ دروازے پر یا چھت کے روشن دان پر آ کر گھر والوں کو مخصوص الفاظ میں نئے سال کی مبارکباد دیتا ہے۔ یہ مخصوص الفاظ مختلف علاقوں میں کم وبیش یوں ہوتے ہیں۔

''نیا سال مبارک ہو، بیٹیوں کے ہاتھ پیلے کیے گئے، بیٹیوں کے سروں پر سہرے سجائے گئے، سارے برتنوں کو دودھ گھی اور پنیر سے بھر دیا۔ انباروں میں غلوں کے ڈھیر لگے، تندرستی لیکر نیا سال آیا۔ اور پرانا سال اپنے سارے روگ لیکر رخصت ہوا''۔

جماعت خانوں میں اجتماعات ہوتے ہیں۔ بعد سہ پہر کھیلوں کے مقابلے ہوتے ہیں۔ اس دن کی مناسبت سے پوری اسماعیلی آبادی نئے کپڑے سلواتی ہے۔ بچے پکنک مناتے ہیں۔ خواتین بھی دور دور پکنک پر جاتی ہیں۔

اژیک (بچے کی پیدائش):

بچی یا بچے کی پیدائش کو اژیک یا گوچانی کہتے ہیں۔ (گوچانی Cuchani) اس موقع پر خوشی کی کئی رسومات ہیں۔ بیٹے کی پیدائش پر خوشی زیادہ ہوتی ہے اس لئے ہوائی فائرنگ بھی ہوتی ہے۔ نشانہ بازی کا مقابلہ بھی ہوتا ہے۔ قدیم زمانے میں نشانہ بازوں کیلئے اس موقع پر بطور خاص بکرے یا دنبے کی کھوپڑی بطور نشانہ کے آویزاں کی جاتی تھی یا ''تلوار'' کھڑی کی جاتی تھی۔ اب یہ رواج معدوم ہے۔ اسلامی تعلیمات کے مطابق اہل سنت کے ہاں بچہ یا بچی کے کان میں اذان دی جاتی ہے۔ نام رکھنے کو ''سودک'' کہتے ہیں۔ اس طرح سودک بھی باقاعدہ رسمی طریقے سے ہوتی ہے۔ گاؤں کے بچوں کو جمع کر کے روایتی ڈش ''مول'' تیار کیا جاتا ہے۔ اور بچوں کو کھلایا جاتا ہے۔ اور بچوں سے کہا جاتا ہے کہ خوب رج کے کھاؤ جب بچے سیر ہو کر ہاتھ اٹھاتے ہیں تو بچے کا تجویز شدہ نام بچوں کو بتایا جاتا ہے۔ وہ دعا کرتے ہیں کہ خدا اس نام کے بچے کی عمر دراز کرے پھر یہی دعا زور سے دہراتے ہوئے باہر نکل جاتے ہیں۔ اور اس شور وغوغا میں بچے کا نام ''بچے بچے'' کی زبان پر آ جاتا ہے۔ نام رکھنے میں بچہ یا بچی کی تخصیص نہیں ہوتی۔ پیدائش کے موقع پر سات دن تک خواتین زچہ کے ہاں رات گزارنے آتی ہیں، کلہاڑی، بندوق وغیرہ زچہ کے قریب رکھا جاتا ہے۔

پھورگا نیک (بچے کے بال کاٹنے کی رسم):

بچے کے بال پہلی بار تراشنا ایک باقاعدہ رسم ہے اس رسم میں روایتی کھانا شوشپ پکایا جاتا ہے۔ جانور ذبح کر کے ''لاژیک'' تیار کیا جاتا ہے۔ اور تمام ہمسایہ، قوم قبیلہ رشتہ داروں کو دعوت دی جاتی ہے اس موقع پر مذہبی پیشوا، دشمن یا خلیفہ بھی موجود ہوتا ہے۔ بچے کو نئے کپڑے پہنا کر پلیٹ، قینچی کیساتھ مہمانوں کے سامنے لایا جاتا ہے۔ پہلے مذہبی پیشوا دعا اور چند آیات ربانی یا مثنوی مولانا روم یا کلام پیر پڑھ کر بچے کے بال کاٹتا ہے۔ اس کے بعد باری باری ہر ایک بسم اللہ پڑھ کر بال کاٹنا شروع کرتا ہے۔ بیٹے کو گھوڑا، درخت، بندوق، ہل، بیل وغیرہ دیدیتے ہیں۔ بیٹی کو، بھیڑ، بکری، گائے، زیورات وغیرہ دیئے جاتے ہیں۔ خواتین اپنی باری پر بچے کیلئے مختلف ناموں کے کپڑے دینے یا سوئیٹر جراب وغیرہ لانے کا اعلان کرتی ہیں۔ آج کل ''پیسہ کلچر'' چھا رہا ہے۔ اس میں حسب توفیق جیب سے چند نوٹ نکال کر بچے کو دیئے جاتے ہیں۔ اسی طرح اس قدیم رسم سے وابستہ تجسس، تنوع، اور روایت ختم ہوتی جا رہی ہے۔

دون ینسیک (بچے کے دانت نکلنے کی رسم):

بچے کے دانت نکل آئیں تو اس موقع پر ایک مختصر سی رسم ادا کی جاتی ہے۔ چونکہ دانت نکلنے کے ساتھ ساتھ بچے کے قدم رکھنے کے دن بھی قریب ہوتے ہیں۔ اس وجہ سے کہا جاتا ہے کہ دون ینسیک کی رسم ادا نہ کی گئی تو ہر قدم پر گرے گا۔ اور دانت ٹوٹ جائینگے۔ اس موقع پر مٹر کے چھولے پکائے جاتے ہیں۔ اور ایک تھالی میں چھولوں کو خشک اور ٹھنڈا کر کے بچے کے سر پر ڈالا جاتا ہے۔ پھر اکٹھا کر کے بچوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ باقی چھولے بھی محلہ ہمسایہ کے بچوں کو کھلاتے ہیں۔ بڑوں کو دیئے جاتے ہیں۔ یہ رسم بیٹا اور بیٹی کیلئے یکساں ہوتی ہے۔

لوٹ ژیری (ختنہ کی رسم):

ختنہ کی رسم اسلامی دور کے بعد شروع ہوئی۔ اس سے پہلے ''لوٹ ژیری''، یعنی بڑی خوشی کے نام سے ڈھائی تین سال کے بچے کی خوشی میں ایک رسم منائی جاتی تھی۔ ختنہ یا سنت کے رواج کے بعد اسی کا نام ''لوٹ ژیری'' رکھ کر یہ رسم اسی مناسبت سے انجام دی جاتی ہے۔ یہ گوچانی یعنی پیدائش کے مقابلے میں بڑی خوشی ہوتی ہے۔ اس موقع پر بیل ذبح کیا جاتا ہے۔ گاؤں کے لوگوں کو اکٹھا کر کے کھانا دیا جاتا ہے۔ رات موسیقی کی محفل ہوتی ہے۔ اگلی صبح صرف قبیلہ اور محلہ کے لوگوں کیلئے روایتی سنا باچی'' اور چھوٹے گوشت کا کھانا ہوتا ہے۔ قدیم زمانے میں قبیلہ والے یہ کھانا گھروں پر لیجاتے تھے۔ جسے ''مون'' یا باری کہا جاتا

تھا۔ جس میں ہر گھر کے اندر مردوں کا حساب کر کے ایک مرد کیلئے تقریباً دو سیر سنا باچی تین بڑی روٹیاں اور ایک مکمل عضو کا گوشت ہوتا تھا۔ ایک جانور کے سات عضو حساب ہوتے تھے۔ جس گھر میں سات مرد ہوں اُس گھر میں پورے جانور کا گوشت آجاتا تھا۔ اس رسم میں ایک گھنٹہ پہلے پیدا ہونے والے بچے کا بھی حصہ ہوتا تھا۔ اور یوں قبیلہ بڑا ہو، تو گھر کا صفایا ہو جاتا تھا۔ رفتہ رفتہ یہ رسم ختم ہوئی۔ اب صرف دعوت ہوتی ہے۔ ''مون'' نہیں ہوتا۔

ژورویشیک (بیٹی/ دلہن کی رخصتی):

بیٹی کی رخصتی کو ''ژورویشیک'' کہا جاتا ہے۔ رخصتی سے پہلے منگنی کی رسم ہوتی ہے۔ اس کے بعد ''چادر'' کی رسم ہے۔ جس میں سسرال والے بیٹی کیلئے تحائف بھیجتے ہیں۔ رخصتی سے کم وبیش تین دن پہلے بیٹی کو شادی کا جوڑا پہنایا جاتا ہے۔ جسے ''شابوک کوایک'' کہتے ہیں۔ شادی کے جوڑے میں دلھن اپنی سہیلیوں کے ہمراہ محلّہ والوں اور رشتہ داروں کے ہاں الوداع کیلئے جاتی ہے۔ ہر گھر سے اس کو تحفے تحائف دیئے جاتے ہیں۔ جنہیں ''چی غیچ'' کہا جاتا ہے۔ بارات کی آمد پر محلّہ والے جمع ہو جاتے ہیں۔ بچے خاص طور پر بے تابی کیساتھ بارات کا انتظار کرتے ہیں۔ بارات والے محلے کی حدود میں داخل ہونے پر ڈیڑھ فٹ کی ایک سوٹی بچوں کی طرف پھینکتے ہیں، بچے ایک دوسرے پر سبقت لے جا کر اسے پکڑنے کی کوشش کرتے ہیں۔ سوٹی جس کے ہاتھ آئے اسکو انعام دیا جاتا ہے۔ جسے ''کائی بوٹی'' کہتے ہیں۔

رخصتی سے پہلے دلھن کو تین بار گھر کی انگھیٹی کے گرد چکر لگانے کو کہا جاتا ہے اس موقع پر آگ جلائی جاتی ہے۔ آگ اور انگھیٹی پر ہاتھ کے اشارے سے طواف کر کے دلہن گھر سے رخصت ہوتی ہے۔ اس وقت محلے کے بزرگ رخصتی کا گیت لوک ژور گاتے ہیں۔ آٹا ہفت ہیکل اور قرآن پاک کا نسخہ دروازے پر لا کر دلھن کو باہر لایا جاتا ہے۔ مذہبی پیشوا دعائیں پڑھاتا ہے۔ اور اسکے کندھے پر دو انگلیوں میں آٹا پھینکتا ہے۔ گھر سے باہر ''لوک ژور'' (گیت کا ذکر لوک گیتوں کے باب میں آئیگا) کا گیت پھر گایا جاتا ہے۔ اور محلے کے باہر دُلہا دلہن کو رخصت کیا جاتا ہے۔ دستور یہ ہے کہ دلہن کی ماں بیٹی کے ساتھ گھر سے باہر نہیں آتی۔ دلہن کی روانگی کے بعد دلہا برآمدے سے واپس ہوتا ہے۔ اور گھر کی انگھیٹی کے پاس بیٹھی ہوئی ساس کو ایک تحفہ دیکر رخصت چاہتا ہے۔ جسے برکت کو رالی کہتے ہیں۔ جواب میں داماد کو رخصت کرتے وقت ساس بھی کوئی نہ کوئی تحفہ دے دیتی ہے۔ جسے ''ختم برکت'' کہتے ہیں۔ یہ دراصل دلہن کیلئے ہوتا ہے جسے وہ عمر بھر اپنے پاس رکھتی ہے۔ اور اس کا ذکر کرتی ہے کہ یہ ''ختم برکت'' ہے۔ اور میری ماں کی نشانی ہے۔ بارات کو مقامی روایات میں ''شُشتو'' کہتے ہیں۔ بارات جب دلہا میاں کے محلے کی حدود میں پہنچ جاتا ہے تو باراتی ''شُشتوار'' گانا شروع کرتے ہیں۔ ڈھول سُرنا پر فنکار یا ڈف کی تال پر گلوکار یہ گیت گاتے ہیں۔ آگے تین چار بندے ناچتے ہوئے چلتے ہیں۔ باقی باراتی تالیاں بجاتے ہیں۔ گھر کے قریب دلہن کو گھوڑے سے یا گاڑی سے اتارتے وقت سسر خود موجود ہوتا ہے اور یادگار کے طور پر غیر منقولہ جائیداد میں سے کوئی چیز دلہن کو دینے کا اعلان کرتا ہے۔ جسے سب لوگ سنتے ہیں۔ سواری سے اترنے کے بعد گھر کے دروازے پر ساس پھر آٹا ہفت ہیکل، قران پاک لیکر استقبال کیلئے آتی ہے دونوں کے کندھوں پر آٹا پھینکتی ہے، اور گھر کی انگھیٹی کے پاس دلہا دلہن کو بٹھاتی ہے۔ مذہبی پیشوا اور محلے کے دو چار بزرگ بیٹھ جاتے ہیں۔ باقی مرد، عورتیں اپنی اپنی جگہوں پر کھڑی رہتی ہیں مکھن، پنیر، اور روٹی کا ڈش لا کر سامنے رکھا جاتا ہے جسے اشپیری کہتے ہیں لوک روایات کے مطابق دُلہا، دلہن میں سے جو بھی پہلا نوالہ بنائیگا وہ عمر بھر غالب رہیگا۔ چنانچہ یہ مقابلہ سب دیکھتے ہیں۔ دلہن زیادہ شرمیلی ہو تو دلہا جیت جاتا ہے۔ دُولہا زیادہ شرمیلا ہو تو دلہن جیت جاتی ہے۔ اشپیری کے بعد محفل موسیقی ہوتی ہے۔ اس کے بعد کھانا دیا جاتا ہے۔ رات کے کھانے کے بعد پھر محفل موسیقی ہوتی ہے۔ اگلے دن دلہن کو گرہستی کے امور اور خانہ داری کے کام سپرد کرنیکی رسم ادا ہوتی ہے جسے ''ٹیکہ انلیک'' کہتے ہیں محلے کی بزرگ خواتین جمع ہوتی ہیں دُولہا میاں کو لا کر بٹھایا جاتا ہے۔ اب دُلہن روٹی بنا کر توے پر ڈالتی ہے۔ دولہا اسے اُلٹ پلٹ کر پکاتا ہے۔ اور چترال کی خمیری روٹی کو توے پر ڈالنا بھی ایک فن ہے جسے ایک ہاتھ سے مخصوص طریقے پر لایا جاتا ہے۔ اُسے الٹانا بھی ایک مشکل فن ہے۔ یہاں دُلہا دلہن کے درمیاں دلچسپ مقابلہ ہوتا ہے کچھ خواتین دلہن کی مدد کو پہنچتی ہیں۔ کچھ دُلہا کی مدد کرتی ہیں۔ باقی تماشا کیلئے تیار ہوتی ہیں۔ اور یہاں پہلی بار دُلہا دُلہن کو ایک دوسرے پر جملے کستے ہوئے سنا جاتا ہے۔ اس کے بعد دُلہن کو اس کا کمرہ سونپنے کی رسم ہوتی ہے۔ یہ رسم ساس، پھوپھی یا نند انجام دیتی ہے۔ اس موقع پر دودھ یا دودھ کی بنی ہوئی کوئی ڈش تیار کی جاتی ہے۔ دُلہا پہلے سے وہاں موجود ہوتا ہے۔ ڈش دونوں کے سامنے رکھ کر خاتون رخصت ہوتی ہے۔ ہفتہ عشرہ بعد دُلہا ایک دن کیلئے سسرال جاتا ہے۔ جسے ''اشپریشی پوشیک'' کہتے ہیں۔ یہ ایک رسمی ملاقات اور سلام دعا ہوتی ہے۔ جس سے واقفیت بڑھتی ہے۔ اور دلہا سسرال میں باقاعدہ گھر کا فرد بنتا ہے۔

لباس اور زیورات

چترال کا معاشرہ روایتی طور پر پہاڑی تہذیب اور کوہستانی تمدن کا امین

رہا ہے۔ پہاڑوں میں زندگی گزارنے اور کوہستانی وادیوں میں سرد اور ناموافق موسم میں لباس اور زیورات کے انتخاب میں موسمی حالات کو نمایاں دخل ہے۔ اس لئے یہاں سادگی کیساتھ پائیداری کو لباس میں اہمیت دی جاتی ہے۔ اونی لباس زیادہ مقبول ہے جسے ڈھیلا ڈھالا بنایا جاتا ہے۔ چترال کے روایتی لباس میں سے چترالی ٹوپی اور چغے نے ملکی اور بین الاقوامی سطح پر مقبولیت حاصل کی ہے۔ جدید فیشن اور مارکیٹ کے تقاضوں کے مطابق نئے متعارف ہونے والے لباس کو چھوڑ کر یہاں چترال کے روایتی لباس اور زیورات کا ذکر کیا جاتا ہے۔

راغز:

قمیض کو راغز کہا جاتا ہے۔ یہ اونی کپڑے کی بنی ہوئی ڈھیل ڈھالی قمیض ہوتی ہے۔ سادہ لباس ہے۔ عام طور پر عورتیں پہنتی ہیں۔ یہ لباس گھر پر تیار کیا جاتا ہے عام اون کے ساتھ ہرن کا اون اور تیتر کا اون ملایا جاتا ہے جسے مورغلوم کہتے ہیں۔

شوانک:

شلوار کو شوانک کہا جاتا ہے۔ یہ بھی ڈھیلی ہوتی ہے۔ گھر پر اونی دھاگے سے بنی ہوئی پٹی سے تیار کی جاتی ہے۔ زنانہ شلوار کو چلائے اور مردانہ شلوار کو شوانک کہا جاتا ہے چلائے خلعت کو بھی کہتے ہیں۔ جو عزت کی علامت ہے۔

کھوئی:

زنانہ ٹوپی کو کھوئی کہتے ہیں۔ اونی کپڑے سے ہو، تو بالکل سادہ ہوتی ہے۔ سوتی کپڑے کی ہو تو رنگین ہوتی ہے، اور ریشمی دھاگے سے کاڑھی ہوئی ٹوپیوں کا بھی عام رواج ہے۔ قدیم زمانے میں زنانہ ٹوپی کیلئے کپاس کی کاشت کی جاتی تھی ریشم کیلئے ریشمی کیڑے پالے جاتے تھے۔ غرض سوتی کپڑا اور ریشم بھی گھر پر تیار ہوتا تھا۔ کاڑھی ہوئی ٹوپی کو سوئیر و کھوئی کہا جاتا ہے۔

پھکوڑ:

مردانہ چترالی ٹوپی کو پھکوڑ کہا جاتا ہے۔ یہ اونی ٹوپی خاص وضع پر بنتی ہے۔ گول سطح کو پھڑاک اور سر کے گرد آنے والے حصے کو پھریشو کہتے ہیں۔ قدیم زمانے میں یہ ٹوپی گھر پر خواتین اپنے ہاتھ سے بناتی تھیں۔ بیسویں صدی سے مشین اور درزی کا رواج ہوا۔ چنانچہ اب ی ٹوپی بازار میں بنتی ہے۔ آجکل پھڑاک کے نیچے سوتی کپڑا بھی لگایا جاتا ہے۔ جسے آشٹار کہتے ہیں۔ ٹوپی کیلئے اونی پٹی خاص اہتمام کیساتھ کھڈی پر بنا جاتا ہے۔ جسے پھکوڑ غار کہتے ہیں۔ اس کیلئے بھیڑ کے اُن بچوں کا اون حاصل کیا جاتا ہے جنکی عمریں ۶ ماہ سے ایک سال تک ہوتی ہیں۔

شوقہ:

یہ چترال کا روایتی اونی چغہ ہے۔ ڈھیلا اور کھلا ہوتا ہے۔ عورتیں ہاتھ سے اسکی کٹائی اور سلائی کا کام کرتی ہیں۔ گریبان اور آستینوں پر کڑھائی کی جاتی ہے۔ سینے پر پھولدار گچھے اویزاں کئے جاتے ہیں جنہیں تک کہا جاتا ہے۔ دامن کے کناروں پر بیل بوٹے بنائے جاتے ہیں۔ سفید شوقے کے دامن اور کناروں پر رنگین سوتی کپڑے کا باریک استر بھی لگایا جاتا ہے۔ جسے ''ہراویز'' کہتے ہیں۔ شوقہ ایک کثیر المقاصد لباس ہے۔ قدیم زمانے میں یہ مردوں کیلئے قمیص کا کام دیتا تھا۔ کام کے وقت اب بھی آستینیں چڑھا کر پیٹی کمر سے باندھی جاتی ہے تو قمیض بن جاتا ہے۔ اوڑھا جائے تو چادر ہے۔ سوتے وقت کمبل کا کام دیتا ہے اسکی لمبی لمبی آستینیں تھیلے کا کام دیتی ہیں۔ ضرورت کے وقت پردے کا کام بھی دیتا ہے۔ دو چار روایتی ڈانسوں مین بطور ثقافتی لباس کے استعمال ہوتا ہے۔ دُلہا کے لباس کا ایک نمایاں جزو ہے خاص مردانہ لباس ہے۔

چغہ:

چغہ دراصل چترالی شوقہ کی جدید صورت ہے جو مہتران چترال کے دربار سے شاہی لباس کے طور پر چترال کے اندر اور پورے ملک میں متعارف ہوا۔ اسے زنانہ اور مردانہ لباس کے طور پر الگ الگ تیار کیا جاتا ہے اسکی وضع ڈھیلی ڈھالی نہیں ہوتی بلکہ بدن کے ساتھ فٹ کر کے اسکی کٹائی اور سلائی کی جاتی ہے۔ اس کا کپڑا بھی شوقہ کے کپڑے سے بہتر ہوتا ہے۔ شوقہ کیلئے ۱۴ گز اور چغہ کیلئے ۱۰ گز کپڑا استعمال ہوتا ہے۔ عام سلائی کے بعد اس کے کناروں پر چرمہ کے ذریعے کڑھائی کی جاتی ہے۔ سینہ گلا، اور پیٹھ پر بھ چرمہ کے ڈیزائن بنائے جاتے ہیں۔ شاہی دربار اور تقریبات کے لباس کیطور پر مہمانوں کو پیش کیا جاتا ہے۔ ملک بھر میں مشہور ہے۔

کون:

چترال میں روایتی جوتوں کا نام کون ہے، یہ جوتے چمڑے سے تیار کئے جاتے ہیں۔ اور موزے کی وضع کے ہوتے ہیں۔ زنانہ اور مردانہ کون الگ الگ ہوتے ہیں، اسکی تلی گھسنے کے بعد دوبارہ لگائی جاتی ہے۔ چمڑے کو سرخ رنگ سے رنگا جاتا ہے۔ لکڑی کے مخصوص سانچوں کی مدد سے کون کو سانچے میں کس کر تیار کیا جاتا ہے اور لوہے کے اوزار درزی مول کو گرم کر کے سانچے کے اوپر اسے پریس کیا جاتا ہے۔

جراب:

چترال میں اونی جرابیں خاص طرز پر بنائی جاتی ہیں۔ ایک رنگ کے جراب کو سادہ ژراب کہا جاتا ہے۔ رنگین جراب کو شاہی ژراب کہتے ہیں۔ اور اس پر رنگین اونی دھاگوں سے پسہ رنگ، چہار رنگہ ڈیزائن بنائے جاتے ہیں۔ یہ جرابیں گھٹنوں تک لمبے ہوتے ہیں۔ اور پولو، فٹ بال وغیرہ کھیلوں میں پہنے جاتے ہیں۔ شاہی جراب مردانہ لباس میں شامل ہے۔

پائے تاوہ:

یہ ایک اونی پٹی ہے۔ جو ۶ انچ سے آٹھ انچ تک چوڑی ہوتی ہے۔ لمبائی تین چار گز ہوتی ہے۔ اسے شکاری اور پولو کے کھلاڑی ٹخنوں سے گھٹنوں تک ٹانگوں پر لپیٹے ہیں۔ مردانہ لباس کا حصہ ہے۔

دسموزہ:

دستانے بھی اونی دھاگے سے بُنے جاتے ہیں۔ جنہیں دسموزہ کہتے ہیں، چترال میں کانوں کو سردی سے بچانے کیلئے سر سے ٹھوڑی تک اونی مفلر لپیٹا جاتا ہے اسے سلائی کے ذریعے بنا جات اہے ی بھی مردانہ لباس کا حصہ ہے۔

بنیان:

جرسی کو بنیان کہا جاتا ہے۔ اونی بنیان سادہ اور مختلف رنگوں کے دھاگوں سے مختلف ڈیزائنوں میں تیار کیا جاتا ہے۔ بنیان کی بُنائی بہت مشکل فن ہے۔ یہ مردانہ لباس میں شامل ہے۔

وارانگ:

وارانگ دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک کھلا وارانگ ہوتا ہے جو بکری، یا بھیڑ کے سالم چمڑے سے بنایا جاتا ہے۔ اور اسکی پیٹی گلے پر لا کر چمڑے کو الٹا کر کے (بال اندر کی طرف اور دُم گردن پر لا کر) پیٹھ پر اویزاں کیا جاتا ہے۔ پیٹھ پر بوجھ اٹھانے والے محنت کش اور شکار پر جانے والے لوگ اسے استعمال کرتے ہیں۔ ہرنی کے چمڑے سے بہت پائیدار اور خوبصورت وارانگ بنتا ہے۔ وارانگ کی دوسری قسم وہ ہے جسے اورکوٹ کے طرز پر تین چار بھیڑوں یا ہرنیوں کے سالم چمڑوں کو جوڑ کر تیار کیا جاتا ہے۔ اونی حصہ اندر ہوتا ہے اسکی بہت نازک کٹائی اور سلائی ہوتی ہے۔ واخی آبادی اسے بناتی ہے۔ سب لوگ اسے استعمال کرتے ہیں۔ یہ وسطی ایشیاء کا روایتی فرغل ہے۔

(قدیم روایات میں دہلا کا لباس، شلوار قمیض، کون، شاہی جراب، ٹوپی، بنیان، مفلر اور شوقہ پر مشتمل ہوتا تھا۔ جبکہ دلہن کے لباس میں شلوار قمیض، جراب، کون، سر بند، ٹوپی، دوپٹہ اور چادر شامل تھے)

سر بند:

سُر بند دلہن کی ٹوپی کے اوپر ریشمی رومال ڈالکر اس کے اوپر سر پر پگڑی کی طرح باندھی جاتی ہے۔ یہ رنگین ریشمی تاروں سے کاڑھی ہوئی 18X4 انچ کی خوبصورت پٹی ہوتی ہے۔ اس کا سب سے خوبصورت اور خوشنما حصہ پیشانی کے اوپر آتا ہے۔ دونوں سروں پر لمبے لمبے پھولدار گچھے ہوتے ہیں۔ جنہیں گردن کے پیچھے گرہ لگانے کے بعد کمر پر اویزاں کیا جاتا ہے۔ اس کے اوپر چادر اوڑھی جاتی ہے۔

زیورات کے باب میں چترال کی لوک روایات سادگی اور اختصار کا آئینہ دار ہیں۔ چترال کے مخصوص روایتی زیورات یہ ہیں۔

گرائے: سونے چاندی کا یہ زیور گلے میں اویزاں کیا جاتا ہے۔

گوڑ بیتو: موتیوں کی مالا بنا کر گلے میں باندھی جاتی ہے۔

پشاویز: یہ سونے یا چاندی کا بنا ہوا ہوتا ہے۔ سرے پر موتی اویزاں ہوتے ہیں اسے موتیوں کے وسط میں پرویا جاتا ہے اور سینے پر اویزاں ہوتا ہے۔

جل: گلے پر فٹ کر کے باندھنے کیلئے سرخ رنگ کے موتیوں کی 8X3 انچ مالا تیار کی جاتی ہے۔ جسے جل کہتے ہیں۔

موشٹی: جل کے درمیان میں تین مقامات پر چاندی کے دستے پروئے جاتے ہیں۔ ان کا نام موشٹی ہے۔

پازہ لا کیرو: یہ بھی مالا ہے۔ اس میں عقیق اور سلیمانی پتھر پروئے جاتے ہیں۔

خلتہ: چھوٹے سائز میں ایک خوبصورت پرس ہے۔ جسے ریشمی تاروں سے مختلف رنگوں کے ڈیزائنوں میں کڑھائی کر کے تیار کیا جاتا ہے۔ ایک تار کے ذریعے خواتین سینے پر اویزاں کرتی ہیں۔ اس میں سرمہ، بٹن وغیرہ رکھے جاتے ہیں۔

اخلی ہانو: کنگھی رکھنے کیلئے ایک الگ پرس تیار کیا جاتا ہے۔ جسے اخلی ہانو کہتے

ہیں۔اسے بھی سینے پر اویزاں کیا جاتا ہے۔

شونج ہانو: سوئی رکھنے کیلئے ایک موٹا اونی تار بنایا جاتا ہے اس ے اوپر خوبصورت لکڑی یا خوبصورت چاندی کی ایک نالی پروئی جاتی ہے۔ نیچے ایک پھول بنا کر بند کیا جاتا ہے۔اور اسے تار کی مدد سے سینے پر اویزاں کیا جاتا ہے۔موٹے تار میں سوئیاں لگائی جاتی ہیں۔نالی انکی حفاظت کرتی ہے۔

پولونگوشٹو: انگوٹھی کو پولونگوشٹو کہتے ہیں چترال میں مرد اور خواتین دونوں انگوٹھیاں پہنتے ہیں سونے چاندی کی انگوٹھیوں میں، عقیق، فیروزہ اور زمرد کے نگینے بہت مقبول ہیں۔ ہرن، مارخور اور خوش گاؤ کے سینگوں کی بنی ہوئی انگوٹھیاں بھی مشہور ہیں۔

ہوست گوڑو: چوڑیوں کو ہوست گوڑو کہتے ہیں۔یہ بھی قدیم رواج ہے۔

چل پوش: گھوڑے کو سجانے کیلئے اس کے اوپر ریشمی کپڑے کی خوبصورت پہناواڈالا جاتا ہے جو گھوڑے کے کانوں اور ایالوں سے لے کر دم دک پورے بدن کو ڈھانپتا ہے۔ پیشانی اور اگلے سموں پر ریشمی تاروں سے بنے ہوئے پھول اویزاں کئے جاتے ہیں۔ گلے پر بھی خوبصورت ریشمی پھول اویزاں ہوتا ہے۔ اسے چل پوش کہتے ہیں۔کسی کو تحفہ دیتے وقت گھوڑے کو پہنایا جاتا ہے۔

چاغیز و باند: گھڑسوار کیلئے چابک کے دستے پر ریشمی اور اونی تاروں سے خوبصورت پھولدار چین یا دھاگہ اویزاں کیا جاتا ہے۔جو بازو میں ڈالنے یا لٹکانے کے کام آتا ہے۔اس کی ارائش وزیبائش پر بہت توجہ دی جاتی ہے۔

پازباند: گھوڑے کے لگام اور زین کے درمیان گلے اور سینے پر ریشمی تاروں سے خوبصورت کڑھائی کر کے لگایا جاتا ہے۔ جو چمڑے کے ساز کی جگہ کام دیتا ہے۔ تقریبات اور تہواروں پر گھوڑے کو سجانے اور گھڑسوار کی توقیر بڑھانے کیلئے کام آتا ہے۔

لوک علاج

چترال میں روایتی طور پر علاج معالجے کے کئی لوک طریقے زمانہ قدیم سے مروج چلے آرہے ہیں۔عام بیماریوں کو گرم وسرد، خون اور معدے کی بیماریوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔خاص طریقہ ہائے علاج مندرجہ ذیل ہیں۔

متی کوریک:

زخم کا علاج متی سے کیا جاتا ہے۔اخروٹ، بادام یا خوبانی کا مغز لیکر اسے جلایا جاتا ہے۔پھر گرم پتھر پر گھس کر اس کا کالا تیل نکالا جاتا ہے۔ جسے زخم پر لگایا جاتا ہے۔اس کو متی کوریک کہتے ہیں۔نومولود بچے کے ناف کیلئے یہ بہت مفید ہے۔

کھوشیک:

مختلف جڑی بوٹیوں کے بیج جمع کر کے گرم انگاروں پر ڈال کر بچے کو دھونی دی جاتی ہے۔تاکہ آسیب اور نظر بد سے محفوظ رہے۔اسے کھوشیک کہتے ہیں۔

ڈیپیک:

بچوں اور بڑوں کے جوڑوں کی بیماریوں، دردسر اور درد کمر کیلئے گردن، سر، اور کمر کے مختلف مقامات پر رگوں کے اوپر آگ سے داغ دیا جاتا ہے۔ جسے ڈیپیک کہتے ہیں خوتاین اس کی ماہر ہوتی ہیں۔داغ لگاتے وقت لقمان حکیم کا نام لیا جاتا ہے۔

دم دک:

بعض اوقات بچوں کے رونے کیلئے دم کو بطور علاج استعمال کیا جاتا ہے۔ بچہ جس بیماری سے بھی روتا ہو چند مخصوص کلمے پڑھ کر بچے پر دم کیا جاتا ہے۔اس جھاڑ پھونک سے بچے کے رونے میں کبھی کبھار افاقہ ہو جاتا ہے۔ بڑوں کیلئے بھی اس طریقہ علاج کو ازمایا جاتا ہے۔

لشٹاؤ کوریک:

بچے کے رونے کیلئے اکثر اوقات مختلف ٹونے ٹوٹکے لکھوا کر گھول کر بچے کو پلائے جاتے ہیں۔جنہیں لشٹاؤ کہتے ہیں۔ بڑوں کیلئے بھی مختلف عوارض میں یہ لشٹاؤ کارگر ہوتے ہیں۔

تائیت کوریک:

آسیب، نظر بد اور دیگر بیماریوں کیلئے اکثر تعویذات کا سہارا لیا جاتا ہے۔تعویذ بنا کر گلے میں باندھنے سے اکثر عوارض اور امراض کا علاج ہوتا ہے۔

دیمنیک:

آسیب کا شدید حملہ ہو اور عام طریقے سے اس کا علاج نہ ہوتا ہو تو عامل کو بلایا جاتا ہے۔وہ جنات کو مخصوص عملیات کے ذریعے حاضر کر کے سزا دیتا ہے۔ اور بیمار سے دست کش ہونے کا وعدہ لیکر چھوڑ دیتا ہے۔اس کو دیمنیک کہا جاتا ہے۔

گازک ملہم:

پیاز کو چھیل کر آگ پر سرخ کر کے اس کا تیل نکالا جاتا ہے۔اور چھیلے

ہوئے گرم پیاز کیساتھ اس تیل کو زخم پر رکھا جاتا ہے۔ جسے گازک ملہم کہتے ہیں۔

پھنوُدک:

جسم کا کوئی عضو اپنی جگہ سے ہٹ جائے تو اس قسم کے Dislocation کا علاج ہاتھ کی مہارت سے کیا جاتا ہے۔ اس کام میں لکڑی کے ہموار سطح کے تختے سے بھی کام لیا جاتا ہے۔ اس لئے اسے پھنودک کہتے ہیں۔

شل دک:

زخم میں اگر ہڈی ٹوٹی ہو، تو اُسے لکڑی کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے (SLABS) بنا کر زخم کے اوپر نیچے رکھ کر گیلے چمڑے یا کپڑے سے باندھ دیا جاتا ہے۔ SLABS لگانے سے پہلے ماہرانہ ہاتھ سے زخم کو مہارت کے ساتھ کھینچ کر جوڑ دیا جاتا ہے۔ اس طریقے سے نشہ دیئے بغیر، کوئی بازاری یا ہسپتالی چیز استعمال کئے بغیر زخم کامیابی کیساتھ جُڑ جاتا ہے۔

ناقی دوسیک:

پیٹ کی کئی بیماریوں کو ''ناف'' سے منسوب کیا جاتا ہے۔ اور ناف کو بیرونی طور پر ہاتھ سے دبا کر تندرست کرنے کیلئے ناف کے ماہر مرد یا خواتین ہوتی ہیں۔ ناف ٹل جانے کی صورت میں اس طریقے سے ناف اپنی جگہ پر آجاتا ہے۔ اور تکلیف دور ہو جاتی ہے۔

سی نچ چھنیک:

آنتوں کی متعدد بیماریوں کا علاج تلوار سے کیا جاتا ہے۔ مریض کو پیٹ کے بل لٹا کر حکیم تلوار لیکر پیٹ کے مخصوص مقام پر کند تلوار رکھ کر اس پر زور دیتا ہے اس طریقے سے آنتیں ادھر سے اُدھر ہو جاتی ہیں۔ پیٹ پر زبردست زور پڑتا ہے اور اس طرح آنتوں کی کئی بیماریاں ٹھیک ہو جاتی ہیں۔ خصوصاً Obstruction کا تسلی بخش علاج ہو جاتا ہے۔

لئے دک:

جوڑوں کے درد اور سر درد کے علاج کیلئے ماہر کے ذریعے ایک رگ پر نشتر لگا کر خون جاری کرایا جاتا ہے۔ اور خاص مقدار میں خون بہانے کے بعد اسے بند کیا جاتا ہے۔ یہ کئی دردوں کا شافی علاج ثابت ہوتا ہے۔

سرنگ چاکیک:

بعض بیماریوں کیلئے ایک رگ میں نشتر لگانے کے بعد خون چوس لیا جاتا ہے خون چوسنے کیلئے بکری کی سینگ استعمال ہوتی ہے۔ اس لئے اسے ''سُرنگ چاکیک'' کہتے ہیں۔ سینگ کے ذریعے مخصوص مقدار میں پیشانی یا گردن سے خون نکالنیکے بعد مریض عموماً ان عوارض سے تندرست ہوتا ہے جن کا سبب بلند فشار خون ہو۔

اُوخ پیک:

بعض بیماریاں معدے سے منسوب کی جاتی ہیں۔ ایسی بیماریوں کیلئے چترال کے طول وعرض میں موجود قدرتی کھٹے کڑوے چشموں کا پانی تجویز کیا جاتا ہے۔ ان چشموں پر جا کر پانی پینے کو اوچ پیک کہتے ہیں

اُوخ اوتیک:

جلد کی بیماریوں کا علاج چترال میں جا بجا بہنے والے گندھک کے گرم چشموں سے کیا جاتا ہے۔ مریض کو چشمے کے گرم پانی میں غوطہ دیا جاتا ہے اس گرم پانی سے نہانا بھی مفید ہوتا ہے۔ اسے بعض اوقات جنسی بیماریوں کیئے بھی تجویز کیا جاتا ہے۔ اور اکثر مفید رہتا ہے۔

خیل کورک:

بخار، زکام، کھانسی اور سینے کی بیماریوں کیلئے گرم پسینہ کو علاج سمجھا جاتا ہے۔ چنانچہ گرم خوراک کاڑی یا شوشپ کاڑی پی کر کمبل لپیٹ کے لیٹ اجاتا ہے اور پسینہ آکر دو تین گھنٹے میں خود بخود خشک ہو جاتا ہے تو مریض کمبل سے باہر آجاتا ہے۔

شوغوراوتیک:

یہ بھی پسینہ کے ذریعے علاج کی ایک صورت ہے موسم گرما کی تپتی دھوپ میں بہت ساریت جمع کیا جاتا ہے۔ مریض کو ایک کھائی میں لٹا کر ان کے اوپر گرم ریت ڈال کر پانچ چھ گھنٹے اس میں رکھا جاتا ہے چنانچہ دھیرے دھیرے پسینہ آجاتا ہے اور رفتہ رفتہ خشک ہو جاتا ہے۔ عام طور پر عرق النساء اور دیگر اعصابی دردوں کیلئے اس طرح کا علاج تجویز کیا جاتا ہے۔

پُورُوکوریک:

چہرے کی جلد کو نرم و ملائم اور تر تازہ رکھنے اور موسمی اثرات سے بچانے کیلئے، خواتین اپنے اور نومولود بچوں کے چہروں پر ملنے کیلئے جڑی بوٹیوں سے آمیزہ تیار کرتی ہیں۔ اس آمیزے کو پُورو کہا جاتا ہے۔ اس کی اٹھائیس قسمیں ہیں۔ مختلف



روایتی چترالی ستار اور ستار نواز

جڑی بوٹیوں کے پھل پھول، پتوں اور جڑوں سے بھی ''پورو'' کا آمیزہ تیار کیا جاتا ہے۔ سینگ جلا کر اور انڈہ پھینٹ کر بھی پورو تیار کیا جاتا ہے۔ نومولود بچہ اور زچہ کیلئے عموماً بکرا، بکری، دنبہ، ہرن اور مارخور وغیرہ کی سینگ سے پُورو بنایا جاتا ہے۔

شورغان:

کوئی پہاڑ سے گرے، باہر بھی زخم اور اندر سے بھی زخم کے آثار ہوں تو پانی میں گائے یا بکری کا گھی ابال کر اسے پلایا جاتا ہے۔ یہ بسا اوقات دردوں میں افاقہ کرتا ہے۔

تازہ مسکہ:

قبض کشا کے طور پر تازہ دودھ کو Shake کر کے مکھن نکالا جاتا ہے۔ بڑی مشکل سے بہت تھوڑا مکھن ہاتھ آتا ہے اور قبض کیلئے مفید ہوتا ہے۔ خاص کر بچوں کے قبض کیلئے تیر بہدف نسخہ ہے۔

زوموا شرو:

سلاجیت کو ''زوموا شرو'' کہتے ہیں۔ اس کے معنی ہیں ''پہاڑ کے آنسو'' زخموں کے علاج کیلئے پلایا جاتا ہے۔ جلد اور جنس کی بیماریوں میں بھی مفید ہے۔ روایت یہ ہے سلاجیت کو پانی میں ڈال کر رات بھر تارون کے نیچے رکھا جائے اور صبح سویرے مریض کو پلایا جائے۔ اکثر اس روایت پر عمل کیا جاتا ہے۔

لوک ساز، ناچ دُھن اور گیت

چترال کے لوک ساز بہت سادہ مگر حد درجہ سریلے اور بیحد دلچسپ ہیں ان سازوں میں چمڑا، لوہا لکڑی اور تار کی مدد سے موسیقی پیدا کی جاتی ہے۔ سارے ساز چترال کے اندر بنتے ہیں۔ اس لئے زمانہ قدیم سے اب تک رائج اور مقبول ہیں۔

ستار:

ستار چترال کا مشہور ساز ہے۔ یہ تمام سازوں میں زیادہ دلچسپ ہے عام لوگ اسے بجاتے ہیں۔ اس لئے لوک ساز کی حیثیت سے بھی اہم ہے۔

روایتی چترالی ستار (سیتھار):

''سیتار'' چترال کی مقامی خصوصیات میں سے ہے۔ یہ ہندی سیتار سے مختلف آلہ موسیقی ہے۔ جسے عرف عام میں چترالی سیتار کہا جاتا ہے۔ مقامی زبان میں اسے ''سیتھار'' کہتے ہیں۔ یہ سائز میں ہندی سیتار سے چھوٹا اور نازک ہوتا ہے۔ لکڑی کے تیرہ ٹکڑوں کو جوڑ کر اس کا چوبی ڈھانچہ تیار کیا جاتا ہے۔ جو اندر سے کھوکھلا ہوتا ہے۔ زیر و بم کے سروں کیلئے انتڑیوں کو تار استعمال کیا جاتا ہے۔ ساز و آواز کیلئے فولادی تار استعمال ہوتا ہے۔ چترالی سیتار میں پانچ تار استعمال ہوتے ہیں۔ زیریں حصے میں سروں کی تقسیم کیلئے ''پردہ سوز'' کے نام سے ایک مخصوص پردہ ہوتا ہے۔ جس میں ایک تار پردے کے نیچے آتا ہے مگر اسکی سطح دوسرے تاروں سے پست نہیں ہوتی۔ اس سے سروں میں زیر و بم کا سوز گداز بڑھ جاتا ہے۔ سیتار عام طور پر شہتوت کی لکڑی سے بنایا جاتا ہے۔ سنوغر کا گاؤں چترال میں سیتار بنانے والے کاریگروں کی وجہ سے مشہور ہے۔ سیتار کیلئے لکڑی کی تیاری ایک صبر آزما کام ہے۔ کئی موسموں کی خشک لکڑی کو پانی میں گیلا کر کے وقفے وقفے کے ساتھ کھرچ کھرچ کر اندر سے کھوکھلا کیا جاتا ہے۔ بیرونی سطح پتلی بنائی جاتی ہے۔ اس کے بیضوی سرے اور لمبے باریک حصے میں خاص توازن رکھا جاتا ہے۔ اس کے بیضوی سرے کو ''ڈوری'' اور باریک حصے کو ''غاز'' کہتے ہیں۔ دونوں کے اوپر پتلی لکڑی کے ڈھکنے کمال مہارت کیساتھ لگائے جاتے ہیں۔ تاروں میں خاص فاصلہ رکھنے والی لکڑی جو بیضوی ٹکڑے کے اوپر لگائی جاتی ہے، ''خاریک'' کہلاتی ہے۔ تاروں کو باندھنے اور کھینچنے کیلئے لکڑی کی جو مخصوص کیلیں استعمال ہوتی ہیں انہیں ''گوشیک'' کہا جاتا ہے۔ ''پردہ'' اُس تار کو کہتے ہیں جسے ''غاز'' کے اوپر زیر و بم کیلئے کم و بیش فاصلوں پر چار چار یا پانچ پانچ کر کے لپیٹ دیا جاتا ہے۔ تار ان کے اوپر سے گزرتے ہیں۔ ''پردہ سوز'' کا صرف ایک تار ایک پردے میں بند ہوتا ہے۔

چترال میں روایتی طور پر سیتار بجانا پیشہ نہیں، محض شوق اور فن کا درجہ رکھتا ہے۔ زمانہ قدیم میں ہر دلعزیز، مہتر اور انکے درباری سیتار کے اچھے فنکار ہوتے تھے۔ معاشرتی اقدار کے زوال کے بعد بھی سفید پوش معززین اور پڑھے لکھے نوجوانوں کا طبقہ سیتار بجانے کو اسی طرح باعث فخر سمجھتا ہے۔ یہ معاشرے میں سیتار کی روایتی مقبولیت کی دلیل ہے کہ اس فن میں اب تک پیشہ ور طبقہ پیدا نہیں ہوا۔ اور یہ فن اب تک ایک نسل سے دوسری نسل کو احسن طریقے سے منتقل ہوتا آرہا ہے۔

سُرنائے:

بانسری کی مخصوص قسم ہے جس کا Mouth Piece الگ ہوتا ہے۔ دُھنیں اس پر بجائی جاتی ہیں۔ سرنائے بجانے والا دھنوی کا ماہر فنا کر ہوتا ہے۔ سرنائے کا قطر اوپر سے آدھا انچ اور نیچے ایک انچ ہوتا ہے۔ آٹھ سوراخ ہوتے ہیں۔

دُھل:

دُھل یا ڈھول بڑا آلہ موسیقی ہے۔ چمڑے پر چوٹ پڑتی ہے تو بجتا

ہے۔ فنکار اسے گلے میں ڈالکر بجاتا ہے۔

ڈمامہ:

دو چھوٹے ڈھولک ہوتے ہیں۔ جنہیں سامنے رکھ کر چوٹ کیساتھ بجایا جاتا ہے۔ ڈھول کیساتھ انکی سنگت ہوتی ہے۔ سرنائے پر آنے والے دھن کو تال انہی سے ملتی ہے۔



روایتی کلاشی موسیقار

ڈف:

یہ ڈیڑھ سے دو فٹ قطر کا آلہ ہے۔ پتلی لکڑی کا گول سانچہ بنا کر اس پر چمڑا چڑھایا جاتا ہے۔ اسے آگ پر گرم کر کے دائیں ہاتھ سے بجایا جاتا ہے۔ لکڑی کے سوراخوں میں تانبے کے پتلے پتلے پلیٹ نازک کاٹ کر اویزاں کئے جاتے ہیں۔ جو تال پر سنگت ملاتے ہیں۔ اس کے ساتھ کسی اور آلے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ البتہ تین چار ڈف ایک ساتھ بجائے جاتے ہیں۔ ڈف بجانے والے فنکار کھڑے ہو کر بجاتے ہیں۔ گانے اور ناچنے والوں کی طرح ڈف بجانے والوں کیساتھ پوری مجلس کھڑی رہتی ہیں۔ تالیوں کیساتھ مجلس کو گرمایا جاتا ہے۔

غربہ:

غربہ ستار کے طرز کا ساز ہے۔ یہ ساز وسطی ایشیاء سے اسماعیلی مذہب کے داعیوں نے متعارف کرایا۔ مذہبی گیت فلسفہ تصوف پر مبنی غزلیں، قصیدے منقبت اور مرثیے غربہ پر بجائے اور گائے جاتے ہیں۔ غربہ پر روایتی طور پر ایک ہی طرح کی دھن بجائی جاتی ہے اور ہر آئٹم کو اسی دھن پر گایا جاتا ہے۔ غربہ میں فولادی تاروں کی جگہ بھیڑ کے آنتوں کا تار استعمال ہوتا ہے۔

پیڑو:

یہ بانسری کی طرز کا آلہ موسیقی ہے۔ اس کا Mouth Piece الگ نہیں ہوتا۔ اس لحاظ سے نسبتاً سادہ آلہ ہے۔ عموماً خشک لکڑی سے بنایا جاتا ہے۔ ایران اور وسطی ایشیاء سے آیا ہے۔ موسم بہار میں بھیڑ بکریاں چرانے والی لڑکیاں اور چھوٹی بچیاں بید کی شاخوں کے چھلکوں سے ''پیڑو'' بنا کر خوبصورت سروں میں نغمے بجاتی ہیں۔ دُھن اور ناچ چترال کی روایات میں ایک دسرے کیساتھ لازم و ملزوم ہیں چترال کی روایتی دھنوں کو چار بڑے حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ (۱) دنی (۲) ساؤز (۳) اشور جان (۴) یارمن ہمین۔ ان میں سے دنی اور ساؤز کی قبیل کی 360 دھنوں پر ناچ ہوتا ہے اشور جان اور یارمن ہمین پر رقص نہیں ہوتا۔ اس قبیل میں بھی بے شمار دھنیں آتی ہیں۔ رقص کی چند مشہور دُھنیں اور مقبول رقص یہ ہیں۔ (چترال میں رقص کو پاؤں کا فن سمجھا جاتا ہے)

دنی:

یہ دُھن کلاسیکی دُھن ہے۔ دھیمی رفتار سے یہ دُھن شروع ہوتی ہے۔ زیرو بم میں ''بم'' کا عنصر غالب ہوتا ہے۔ ناچنے والا پہلے ہی لمبی چھلانگیں لگاتا ہے اس کیلئے وسیع میدان کی ضرورت ہوتی ہے۔ آہستہ آہستہ دُھن کی رفتار کیساتھ رقص کی رفتار بھی تیز ہوتی ہے۔

ساؤز:

یہ نیم کلاسیکی دُھن ہے۔ اسے شروع ہی سے تیز لئے میں بجایا جاتا ہے۔ اس دھن میں ناچنے والا بھی بہت تیز ناچتا ہے۔ اس پر دو یا دو سے زیادہ رقاص بھی ناچتے ہیں۔

ششتوار:

یہ بارات کی دھن ہے۔ ساؤز کی طرز میں ہے تیز بجائی جاتی ہے۔ اس دھن پر کئی افراد بیک وقت رقص کرتے ہیں۔ شادی کے موقع پر محفل موسیقی کا آغاز اسی سے ہوتا ہے۔ بارات کی آمد پر بھی اس دھن پر ناچ ہوتا ہے۔

باروازی:

یہ ایک روایتی دُھن ہے جو دنیکی قبیل سے ہے۔ اس دُھن کے پس منظر میں ایک بڑھیا کی کہانی ہے۔ جو گھر سے بھاگ گئی ہے۔ اس دُھن پر رقاص اس

طریقے سے ناچتا ہے کہ اسکی آنکھیں اور حرکتیں نیم غنودگی کی حالت کو ظاہر کرتی ہیں۔ رقاص کے ہاتھ میں شوقہ ہوتا ہے جسے وہ آہستہ آہستہ اٹھاتا اور پہنتا ہے۔ آخر میں اسکی حرکت تیز ہو جاتی ہے۔ اور ناچ ختم ہوتا ہے۔

شب دراز:

یہ بھی دنی قسم کی روایتی دُھن ہے۔ اس پر بھی آہستہ ٹھہرا ہوا، اور نیم غنودہ سا ناچ ہوتا ہے۔

غاڑوار:

یہ پولو کی روایتی دھن ہے۔ ساؤز کی ایک قسم ہے۔ اس دھن کو پولو کی اطلاع کیلئے صبح سویرے، پولو کیلئے روانگی کے وقت اور پولو کے آغاز پر بجایا جاتا ہے۔ یہ کھلاڑیوں اور گھوڑوں کو وجد میں لاتا ہے۔

پونوار:

یہ بھی ساؤز کی ایک قسم ہے۔ مہمان کی آمد یا روانگی کے وقت بجایا جاتا ہے۔ عام طور پر حکمرانوں کیلئے بجایا جاتا تھا۔ اس پر بہت تیز ناچ ہوتا ہے۔ ناچنے والے کے پاؤں کی حرکت اتنی تیز ہوتی ہے کہ نظر نہیں آتی۔ یہ دھن کسی اہم تقریب کے آغاز پر بھی بجایا جاتا ہے۔ جب مہمان آرہے ہوتے ہیں۔

سوچی:

یہ بھی ساؤز کی ایک قسم ہے۔ روایتی دھن ہے۔ اس پر محفل موسیقی کا اختتام ہوتا ہے۔ بہت سے رقاص مل کر رقص کرتے ہیں۔ اور تیز ناچتے ہیں۔

ژانگ دار:

یہ دھن بھی ساؤز کی قبیل میں سے ہے۔ مگر دنی سے ملتی جلتی ہے۔ اعلان جنگ کیلئے بجائی جاتی ہے ریاستی دور میں جب ملک پر دشمن حملہ کرتا یا کسی مہم پر فوج کی روانگی کا موقع ہوتا تو یہ دُھن بجالیا جاتا تھا۔ پولو کے کھیل میں حکمران خاندان کا کوئی کھلاڑی گول کرے تو یہ دھن بجائی جاتی ہے۔ کشتی اور فن سپہ گری کے مقابلے کیلئے بھی کھیل کے میدان میں بجائی جاتی ہے۔

بکارش وار:

دوران جنگ جوانوں کو پُر جوش کرنے کیلئے یہ دھن بجائی جاتی تھی۔ ژنگ وار کے طرز پر ساؤز دھن ہے۔

اشور جان:

یہ کھوار دھنوں کی الگ قسم ہے۔ بہت پُر سوز ہے۔ اور بہت مشکل کلاسیکی دھن ہے۔ اس پر رقص نہیں ہوتا۔ آزاد نظم پر مبنی قدیم گیت اس دھن پر گائے جاتے ہیں۔ اسکی تان بہت لمبی اور اس کی لئے بہت لطیف ہوتی ہے۔ عموماً شاعری اور دھنوں کی یہ قسم خواتین کیساتھ منسوب کی جاتی ہے۔ مرد فنکار بھی گاتے اور بجاتے ہیں۔

موراڑی:

یہ بھی اشور جان کی قبیل سے ہے۔ الگ دھن ہے۔ روایتی طور پر مہمان کے سوتے وقت بجایا جاتا تھا۔ ریاستی حکمران دورے پر ہوتا، تو اس کے سوتے وقت موراڑی بجایا جاتا تھا۔ باہر سے سرکاری مہمان آتا تو اس کیلئے رات کے پہلے پہر اسے بجایا جاتا تھا۔

یارمن ہمیں:

عام طور پر اسے ''یورمن ہمین'' کہتے ہیں۔ کلام سیئر کی دھن ہے صوفی شاعر مرزا محمد سیئر نے اپنا کلام اسی دھن پر گایا یہ عام دھنوں سے الگ ہے۔ اس پر ناچ نہیں ہوتا۔ وجد آفرین دھن ہے۔ مرد، عورت، بچے، بوڑھے، رند و فقیہہ سب اسے سنتے اور گاتے ہیں۔

قُقُنس:

اگرچہ کھوار کی تمام دھنیں ''قققنس'' نام کے پرندے کی چونچ کے مختلف سروں سے منسوب کئے جاتے ہیں مگر ساؤز کی ایک دھن کو خاص پر ''قققنس'' کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس پر رقص بھی ہوتا ہے۔

شودرنگ:

یہ ایک روایتی گانے کی دھن ہے۔ جسے باز پکڑنے کے بعد گایا جاتا ہے۔ اس گیت میں باز کی تعریف ہوتی ہے۔

غوروُ:

یہ بھی روایتی دھن ہے۔ اس دھن پر شکاری ہرن، مارخور، یا شیر، چیتے وغیرہ کا شکار کرنے کے بعد گانا گاتا ہے۔ مہمان یا مہتر (حکمران) شکار کر کے واپس آرہا ہو تو یہ دھن بجائی جاتی ہے۔

سیدو:

یہ دھن ایک تیراک کی محبوبہ سے منسوب ہے گیت میں تیرنے کے داؤ پیچ بیاں ہوتے ہیں۔ بہت پُرسوز ہے۔

لالوزنگ:

یہ مرثیے کی دھن ہے۔ دلہن نے محبوب کے کہنے پر ایک پہاڑی درے پر پہنچ کر دلہا کو زہر دیا۔ جب وقت گزرنے کے باوجود مقصد حاصل نہیں ہوا تو دونوں نے دلہا کی یاد میں مرثیہ کے چند بول کہے اور اس دھن پر گایا۔ بہت پُرسوز دھن ہے۔

ہاشم بیگم:

ی بھی مرثیے کی قدیم دھن ہے ایک دلہن نے دلھا کو پسند نہیں کیا۔ اور ایک بلند گھاٹی میں خود کو گھوڑے سے گرا کر خودکشی کر لی۔ سہیلی نے مرثیہ کہا۔ اسکی دھن بہت مشہور ہے۔ کلاسیکی دھنوں میں شمار ہوتی ہے۔

چند مشہور گیت:

چترال میں لوک گیتوں کی تعداد ہزاروں تک پہنچتی ہے۔ چند مشہور گیتوں کے مختصر بول اردو ترجمے کیساتھ دیئے جاتے ہیں۔ اس سے ان گیتوں کے طرز اور ان کی قدامت کا اندازہ ہوتا ہے۔

اشور جان۔ (ماں اور بیٹی کا مکالمہ)

ہائے مہ ژان ہائے بلبل

تو بو غے مہ ژان کیہ تو بو غے بلبل

تھے تہ موش جم ژانئے ژان تہ موش جم نہ موش جم

اوہ مہ شیرین نانئے نان

ہش کیہ جم نو دایوس ادا جم ادا جم

ادا جمنانئے نان ادا جم ادا جم

چھو یوژین وا غوٹیپ

کہہ انو سو پازوڈوم

مہ پرچم مانئے نان مہ پرچم مہ پرچم

کہہ مہ شیرین نانئے نان

کہہ کوڑ مہ نوش بکوسار

مہ بریک جم نانئے نان مہ بریک جم مہ بریک جم

ترجمہ۔

پیاری بیٹی، دلاری بیٹی

اپنے گھر چلی جا، پیاری بیٹی اپنے گھر کی ہو جا

تیرا خاوند بہت اچھا ہے، پیاری بیٹی وہ بہت اچھا ہے۔

میری پیاری اماں!

کُبڑے کی کوئی خوبی نہیں، میں اچھی ہوں میں اچھی

رات میری گھنی زلفیں پلنگ کے پایوں کو ڈھانپ دیتی ہیں

دن کو زلفیں میرے سینے پر چھا جاتی ہیں

کُبڑا میرا خاوند ہونے سے یہ بہتر ہے

کہ میری موت آئے

پیاری اماں۔

یہ بہتر ہے کہ میری موت آئے

لوک ژور (بیٹی کی رخصتی کا گیت):

ژورے گوژوتے ادا بام ژانئے

مہ ژوردا کیہ خورانان بابت ژانئے

ژورے گوژوتے ادا بام ژنئے

تان موشو ہوستو تانگنے ژنئے

ژورئے گوژوتے ادا بام ژانئے

مہ ژوردو دیر یو پونغو سے

ژورے گوژووتے ادا بام ژانئے

شا بوک سوران جیر تان کورومے

ژورے گوژوتے ادا بام ژنئے

زہگیر وتہ ہوستو وادومئے

ژورے گوژوتے ادا بام ژانئے

گہنان تہ تکہ وانیز یمے

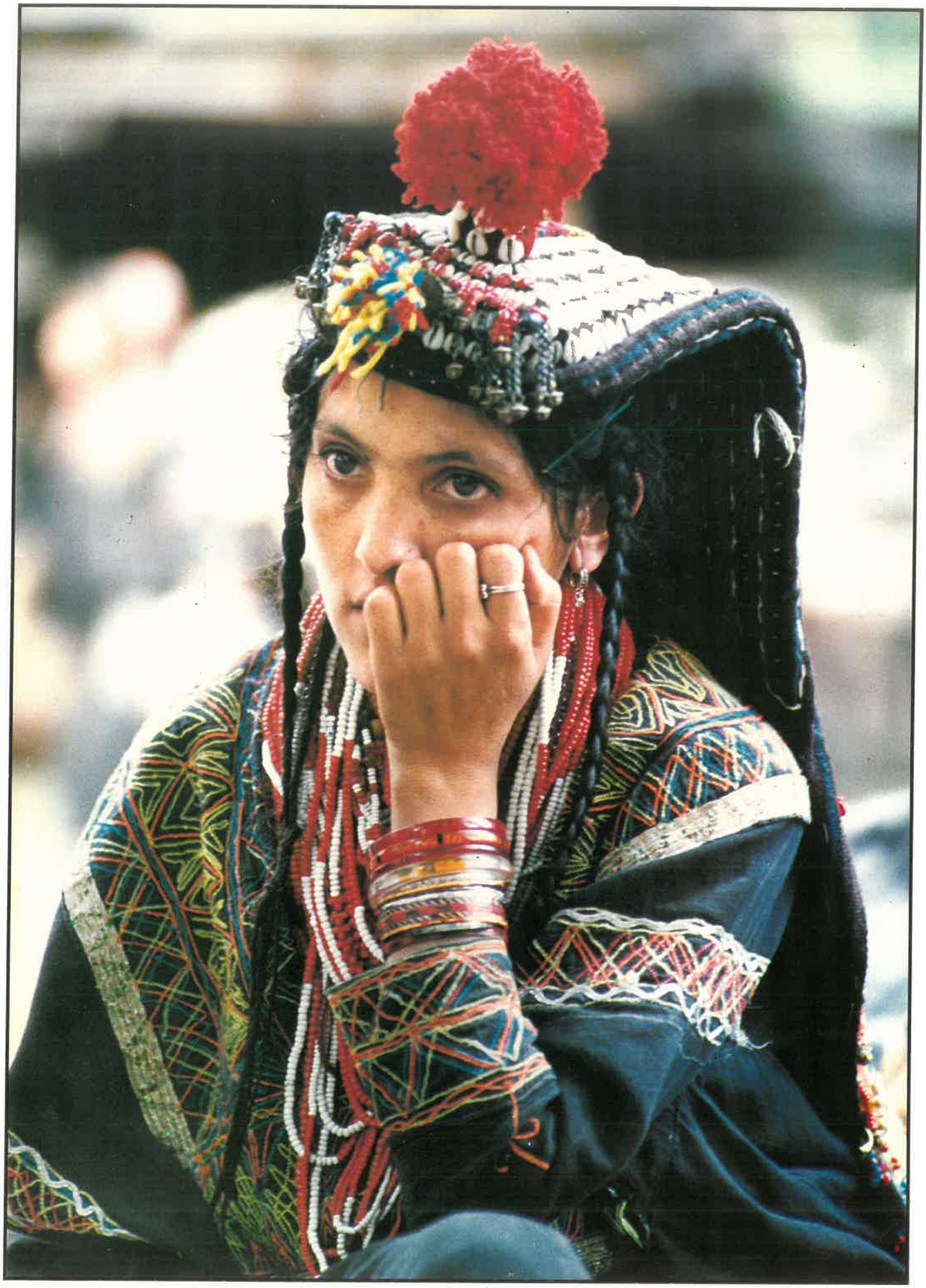
ژورے گوژوتے ادا بام ژانئے

ژورے خدائے واتہ یارے

ژورے گوژوتے ادا بام ژانئے

ترجمہ:

میری بیٹی میری جان میں تیرے صدقے!



کلاش قبائلی لڑکی روایتی لباس میں

میری بیٹی کا ہاتھ غیروں کے ہاتھ ہے بہت بلند ہے
میری بیٹی! میری جان میں تیرے صدقے
اپنے دُلہا کا ہاتھ تھام کے رہیو
میری بیٹی! میری جان میں تیرے صدقے
میری بیٹی بہت دور جانے والی ہے
میری بیٹی! میری جان میں تیرے صدقے
بری جہیز کی لمبی قطار ہوگی
میری بیٹی! میری جان میں تیرے صدقے
میری بیٹی، انگوٹھی تیرے ہاتھوں میں پہناؤنگی
میری بیٹی! میری جان میں تیرے صدقے
میں زیوارات تیرے سینے پر سجاؤنگی
میری بیٹی! میری جان میں تیرے صدقے
میری بیٹی خدا تیرا حامی و ناصر ہو
میری بیٹی! میری جان میں تیرے صدقے

نان درشی (بیٹی کا مرثیہ ماں کی طرف سے):

مہروش نوا، اے نان
دوشیو دیتی کیہ نان دوشیو کرینس نوا، دے نان دوشیو تے لہ ژورے
ہروش نوا وے نان
یوردیتی کیہ لشٹ گرونسائے
ہروش نوا اے نان دوشیو تے لہ ژورے
ہروش نوا اے نان
لشٹ شندور کیہ چوغین گنزول نوا اے نان دوشیو تے ژورے

ترجمہ:

میری اماں، کیا یہ بات درست نہیں کہ تو نے دوشی کے عوض نان دوشی کو خرید لیا (دوشی اور نان دوشی بہنوں کے نام ہیں شادی کی رات نان دوشی مرگئی۔ ماں نے اسکی جگہ دوشی کو دلہن بنایا اور اگلے دن نان دوشی کو دفن کرکے یہ مرثیہ خود اپنے آپ سے مخاطب ہوکر گایا۔)
دھوپ کی کرنیں گھاس کے میدان تک آگئیں، میری بیٹی نان دوشی کیلئے۔ اے میری بیٹی
شندور ہری ٹہنیوں کا تنگ راستہ ہے میری بیٹی کیلئے، ہائے میری بیٹی نان دوشی۔

ڈوک یخدیز: (شوہر کا مرثیہ جسے گاتے ہی شوہر جنگ سے واپس آیا حالانکہ اس کے مرنیکی افواہ مشہور ہوگئی تھی)

لال سامونان بفائے
تتے گوروم کوری
کایو عمر بفائے
تہ یور جودریفان نے دریت
تہ یور جوداغا چھوچو
کیڑیمان چھوئی انوس
تہ ارمانہ چھوچو
اشروغیچہ چھوچو لئے بدانہ چھوچو
ڈنک شوڑ ودیتی
استوروادری
یخدیز ڈوکوتے گوئے ڈوک یخدیز وتے گوئے

ترجمہ:

لال نے رخت سفر باندھا
اور یاسین چلا گیا (قلعے کی دفاع کیلئے)
تجھے یاد کرکے میری عمر گزری
تیرا شہباز تیری یاد میں مرگیا اور اسے درندے کھا گئے
اسکی جدائی میں رو کر میرے آنسو خشک ہوگئے
رات دن تیری یاد میں رو رہی ہوں
میرے آنسو کیساتھ میرا خون بھی خشک ہوگیا اے
میرا محبوب اپنے گھوڑے پر آئیگا
ڈوک شوڑ، کے میدان سے گزریگا
''یخدیز کی طرف آئیگا، اور یخدیز'' پہنچے گا۔

بیگال:

(غلام عمر، چترال کی لوک کہانیاں، لوک ورثہ اسلام آباد، 1984 ص 149,111,97,87)

یہ بھی مرثیہ ہے۔ بیگال پولو کا کھلاڑی تھا اسی رقابت میں سازش سے قتل ہوا۔ ماں نے اگلے دن بیٹے کی لاش چھپا کر اس کے بھیس میں پولو کھیلا اور مہتر کے سامنے یہ گیت گایا۔

چھویو تہ مری بوغدو ہائے تنو بیگال

لئے پزو جاری بروہائے ننو بیگال
تہ استور ژندری بچتائے ہائے ننو بیگال
تہ چاغیز ژینگی بچتائے ہائے ننو بیگال
یار بوژ یکو یار پھتو کی ہائے ننو بیگال
بیگال نو ہائے غاڑ پھتو کی ہائے ننو بیگال
میتار تہ کو مریتائے ہائے ننو بیگال
پڑینجو دکو واوَ دی بیتائے ہائے ننو بیگال

ترجمہ:

ہائے، امی جان کے بیگال، رات کی تاریکی میں تجھے قتل کیا گیا
افسوس امی جان کے بیگال، تیرے سینے پر خون کی دھاریاں بہہ گئیں
ہائے امی جان کے بیگال، تیرا گھوڑا تجھے ڈھونڈھتا رہا اور ہنہنا تا رہا
ہائے امی جان کے بیگال، تیرا چابک تیری یاد میں جھومتا رہا
ہائے امی جان کے بیگال، تیرے ساتھیوں نے ٹیم بنایا تو ٹیم ادھوری رہ گئی
ہائے اپنی امی جان کے بیگال، تیرے بغیر کھیل بھی ادھورا ہے۔
ہائے اپنی اماں کے بیگال ل، گیند کو تو بڑھیا بھی مار سکتی ہے۔
ہائے اپنی اماں کے بیگال، مہتر نے تجھے کیوں قتل کرایا؟

لالوزنگ:

دیگر اکثر گیتوں کی طرح لالوزنگ بھی مرثیہ ہے۔ بہت قدیم ہے۔ رقیب نے محبوبہ (دلہن) کے ذریعے دُلہا کو زہر دیا۔ اور ایسی جگہ پر ہلاک کرایا جو پہاڑی درے کی چوٹی پر تھا۔ جہاں اسکی لاش بیگور و کفن گدھوں اور درندوں کا لقمہ بن گئی۔ پھر محبوبہ کو حاصل کرنیکے لئے رقیب نے یہ گیت گایا اور محبوب نے جواب دیا۔

تہ درو کاڑی مہ راہ کیہ مہ دینارے
تہ حاولیو ژونگ بوم کیہ لالوزنگ
تکان تے تارے کیہ مہ بلبلے
تہ شونگ پزی درونگجوم کہہ لالوزنگ
پوشور پولی بروکیہ مہ دینارے
کوڑ دارانو بروکیہ لالوزنگ
شونھولیا بنشیر کیہ مہ بلبلے
بُر بارکوڑانتے گوئے کیہ لالوزنگ

ترجمہ:

میرے پیارے، میرا راستہ تیرے گھر کے بچھواڑے سے گزرتا ہے۔ اور میں راہ چلتے تیرا دیدار کرلیا کرونگا۔ تجھے تحفے دیدیا کرونگا، اور تیرے قریب ہوتا رہونگا۔ اے لالوزانگ سن لے (لخلر لوزانگ محبوبہ کا نام ہے جسے گیت میں لالوزانگ بولتے ہیں)
میری جان، اُس کا تو گوشت بھی سڑھ گیا، ہڈیاں بھی خشک ہوگئیں، اے لالوزنگ دار اسن لو۔
(اب محبوبہ ان الفاظ میں جواب دیتی ہے)
میرے پیارے، گدھوں کا یہ کام ہے کہ خون کے پیاسے ہوتے ہیں اور مردار پر بیٹھتے ہیں، عقاب تو خشک ہڈی اٹھالیتا ہے۔ اے لالوزانگ ذرا سن لے۔
(اسی طرح کا مکالمہ اخیر تک جاری رہتا ہے)

اژارو بشاوَنو (چرواہوں کا گیت)

مہ پژالو نام نکی بخدو ادلواہ
مہ پژال پھوک اسور بخدو رولواہ
مہ ترانگ گنز ولوترانگکہ توڑیولواہ
مہ مال نیرونہ مہ نست بو یولواہ
مہ باسیر تان ژوتی تان گویولواہ
دونیکہ چھیر کوری انگویولوہ
شابزو کیو گازاتہ راچھیمولواہ
چلیکیو چھاغہ تہ چھاغیکولواہ

ترجمہ:

میرے چرواہے کا اور نام نہیں۔ ہم اسے بہادر کہتے ہیں۔ میرا چرواہا ابھی بچہ ہے۔ عنقریب جوان ہوگا۔ میرے محلے کی گلی بہت تنگ ہے (ریوڑ بہت بڑا ہے) میرا ریوڑ ''نیرون'' سے میرے آگے آگے جارہا ہے۔ میری بکری خود چر کر شام کو آجاتی ہے۔ تو برتن اسکے دودھ سے بھر جاتا ہے۔ میری پیاری بکری، میں تجھے پھولوں کے چمن زار میں چرا کر لاؤنگا، اور بید کے چھاؤں میں لٹاؤنگا۔

یارمن ہمیں:

یہ صوفیانہ گیت ہے۔ لوک گیتوں میں اس کا زمانہ معلوم ہے۔ مرزا محمد سیئر نے اس گیت کو انیسویں صدی کے نصف اول میں گایا۔ اس لحاظ سے اس کا شمار

نئے گیتوں میں ہوتا ہے۔

لورہ کورہ برون شیونیان کورہ زومور ٹیر باریکی یارے
کورہ کوئے درے میہ مارلیس مہ لوانو باک شریکی یارے
چغاڑی جاغ موکورے یار خونو دار بنا اسوم یارے
سور خون استور مہ موڑا پونگ لکھیاڑ غانہ اسوم یاریئے
کورے نین کوری بفائے مرزا مہ سیار ولوڑ وریاریئے
سا گہت دیتی شیر ٹھونہ مہ سیتار ولوڑ وریاریئے
شور دریا ہوغونہ موش مہ عمر کم بچاؤ گویان یارے
شون لفل دوندور دانا مہ ژنو ہر لونما کین یار ہیے
نما کین کھیوغا کین نغو ساری ژور نما کین یاریئے

ترجمہ:

میرے محبوب، کہیں کھیت اور سبزے لہلہاتے ہیں اور کہیں پہاڑ کی تنگ پگڈنڈی پُر خطر ہے۔ مجھے اندیشہ ہے کہ کہیں کسی گھاٹی میں گہری کھائیمیں گرا کر میری جان لے لوگے کیونکہ تیری مثال اُس طوطے کی ہے جو مالک کی بات نہیں مانتا (نفیس امارہ) اے کالے بھجنگ پرندے، مجھ پر آواز مت کسو، میں ایک سرحد پر رُکا ہوا ہوں، سفید گھوڑے پر سوار ہوں اور پا بہ رکاب ہوں۔

میرے محبوب، مرزا محمد سیر کو دیکھو، کہاں سیکہاں جا پہنچا، اس کے سیتار کے اوپر بھی گرد کی تہہ جم گئی۔ اور ستون پر لٹکا رہ گیا۔

میرے محبوب، میری عمر کی مثال خزاں کے دریا کی سی ہے۔ جوانی کا وقت گزر گیا اب بڑھاپے کے غم رہ گئے۔

میرے محبوب، تیرے لب لفل بدخشاں جیسے اور تیرے دانت دُر آبدار کی طرح ہیں تیری باتیں بہت پیاری ہیں۔ تیرے حسن کی کیا تعریف کروں یہاں خالق سے مخلوق زیادہ حسین لگتا ہے۔

مژ لیغو بشاؤنو:

یہ مارخور/ ہرنی وغیرہ سے منسوب گیت ہے۔ ماں اور بچے کے مابین شکاری کے بارے میں مکالمہ ہے۔

نائنے نائنے آف ہیرہ کا گویان　　نانوژنے آنو پژال ٹُوا
نائنے نائنے تھویک ڈاپھیکہ پرائے　　نانوژائنے یوروز ہرٹُوا
نائنے نائنے تہ پزولئے اریہ　　نانوژائنے تنبوسوخیل نوا
نائنے نائنے غوغوان کا ساتیر　　نانوژائنے مجم سا تک نوا

ترجمہ:

میری اماں پیاریا اماں، وہ کون آرہا ہے۔ ماں کے دلارے وہ پہاڑ کا چرواہا آرہا ہے۔ میری اچھی اماں، اسکے ہاتھ میں بندوق چمک رہا ہے۔ ماں کے پیارے، دھوپ میں ذرات کی چمک دمک ہے۔ پیاری اماں، تیرے سینے پر خون بہنے لگا، میری جان، یہ گرمی کا پسینہ ہے، پیاری امی جان یتیموں کی پرورش کون کریگا؟ میری جان جو مالک ہے وہی پالنے والا ہے۔

لوک اسلحہ اور ہتھیار

چترال کا معاشرہ اگرچہ دوسرے ہمسایہ علاقوں مثلاً یاغستان (علاقہ غیر) ترکشان اور افغانستان کے کمقابلے میں زمانہ قدیم سے نسبتاً پُر امن رہا ہے۔ تاہم چترال کے لوک ہتھیار اور روایتی اسلحہ کا مطالعہ اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ جنگی ہتھیاروں کے باب میں بھی چترال کا معاشرہ خود کفیل تھا۔ چترال میں شکار اور جنگ کے ہتھیار پرانے زمانے سے مروج رہے۔ ہتھیاروں میں پتھر سب سے پرانا ہتھیار ہے اس کے بعد لکڑی کے ہتھیار بنائے گئے پھر لوہے، سیسے اور بارود کے استعمال کا رواج ہوا۔

ہوسکی بوہتو:

ہاتھ سے پتھر مار کر پرندوں کا شکار چترال کا قدیم دستور ہے۔ لومڑی، خرگوش اور چھوٹے چرندوں، درندوں پر بھی ہاتھ سے پتھر پھینکنے کا طریقہ ازمایا جاتا ہے۔ دشمن کے خلاف بھی اس ہتھیار کا استعمال ہوتا رہا ہے۔ چرواہے فن کے ماہرین ہوتے ہیں جو سو گز کے فاصلے تک زوردار پتھر مار سکتے ہیں۔

چُونٹی:

یہ ہاتھ کے پتھر سے بڑا ہوتا ہے۔ اسے رسی، چمڑے یا کسی اور لمبے دستے کی مدد سے ہوا میں کئی بار اُچھالنے کے بعد پھینکا جاتا ہے۔ یہ منجنیق کی ابتدائی صورت ہے جو چترال میں زمانہ قدیم سے مروج رہی ہے۔

چوکول لاکیک:

پتھر کو بطور ہتھیار استعمال کرنیکی مہلک ترین قسم ہے۔ اس میں بہت وزنی پتھر استعمال کئے جاتے ہیں۔ جس کیلئے دشمن کے مقابلے میں بلند مقام پر پہلے قبضہ کیا جاتا ہے۔ اس کو ''سرویل'' کہتے ہیں۔ سرویل پر جانے والا یا فوجی دستہ پہاڑی گھاٹی کے اوپر بڑے بڑے پتھروں کے نیچے لمبے لمبے مضبوط کھمبے 60 کے

زاویے پر فٹ کئے جاتے ہیں۔ضرورت کے وقت ان پتھروں کو نیچے لڑھکایا جاتا ہے اور دشمن پر بڑی تباہی آتی ہے۔

چھونچھیرہ:

یہ کمان کے طرز پر بنا ہوا غلیل ہے جسکی کمان لمبی ہوتی ہے۔کمان کے سروں پر گھوڑے کی رگوں سے بنایا ہوا تار لگایا جاتا ہے اور پتھر کو اس غلیل میں بطور تیر کے استعمال کیا جاتا ہے۔

درون:

یہ کمان ہے جس کے ساتھ تیر اور تیر دان بھی ہوتا ہے۔غلیل کے مقابلے میں بہت مضبوط ہوتا ہے اور تیر کو کامیابی کیساتھ نشانے پر پہنچاتا ہے۔کمان اور تیر چترال میں بنائے جاتے ہیں۔

کوتیر:

چترال میں چُھری کو ''کوتیر'' کہا جاتا ہے۔یہ بھی چترال میں بنتا ہے۔مگر آج کل بہت کم بنایا جاتا ہے۔کیونکہ بازار میں سستا مال آسانی سے دستیاب ہے۔

نیرنگ:

نیرنگ بھی چترال میں بنایا جاتا تھا۔چُھری سے بڑا اور وزنی ہتھیار تھا۔اسکی دھار چھری کی طرح ہوتی تھی۔

نیزہ:

نیزہ وسطی ایشیا سے لایا جاتا تھا چھوٹے نیزے کو ''پیان نیزہ'' کہتے تھے۔بہت عام اور مقبول ہتھیار تھا۔چترال میں بھی بنایا جاتا تھا۔

کھونگیر:

تلوار کو چترال میں کھونگیر کہتے ہیں۔سمرقند و بخارا، یا کاشغر سے لایا جاتا تھا۔اس کا استعمال بہت عام تھا۔

کیہچ:

یہ موجودہ دور کے سنگین یا کمانڈو نائف کی قسم کا ہتھیار تھا۔بہت خوبصورت بنایا جاتا تھا۔چترال میں بنتا تھا۔عام طور پر حکمرانوں کے ذاتی محافظین، اور درباری کیہچ اپنے کمر میں رکھتے تھے۔اس کی نوک تیز ہوتی تھی اور دو دھار ہوتے تھے۔ساتھ میان ہوتا تھا۔عام طور پر میان میں رکھا جاتا تھا۔

سیہ کمان:

سترھویں صدی میں جب بارودی ہتھیاروں کی ضرورت ہوئی تو چترال میں وسطی ایشیاء سے ''سیہ کمان'' بندوق لایا گیا۔پھر بدخشاں سے کاریگر بلا کر چترال کے مڈکلشٹ میں سیہ کمان بندوق بنائے گئے۔اسکی نالی لمبی ہوتی ہے باٹ نسبتاً پتلا اور کافی لمبا ہوتا ہے۔نالی کو اوپر سے بارود، چھرے سے لوڈ کیا جاتا ہے۔باٹ کے جوڑ پر ''آتش خانہ'' ہوتا ہے۔اور خشک لکڑی، سکٹ یا اشپین کے چھلکوں سے رسی بنا کر باٹ کے گرد لپیٹ دیا جاتا ہے۔ایک تھیلے میں چقماق کے پتھر اور خشک چھلکوں کا برادہ رکھا جاتا ہے۔پتھروں کو رگڑ کر آگ پیدا کی جاتی ہے جو پہلے برادے کو لگتی ہے پھر رسی کے سرے کو آگ لگائی جاتی ہے۔اور ایک چمٹے کی مدد سے ''آتش خانہ'' پر بارود کو یہ آگ دکھائی جاتی ہے۔رسی کا آتشین ٹکڑا بارود کو چھوتے ہی بندوق چل جاتی ہے۔آج کل چقماق کی جگہ کچاتی یعنی ماچس استعمال ہوتی ہے۔بندوق چونکہ کافی لمبی ہوتی ہے اس لئے اسکے ساتھ لکڑی کا سٹینڈ بھی استعمال ہوتا ہے۔جسے دوکازہ کہتے ہیں

اروسی:

یہ بھی سیہ کمان کی ایک قسم ہے۔سیہ کمان کی یہ قسم پہلے روس سے آتی تھی پھر چترال میں بھی بننے لگی۔اسکی نال بہت باریک ہوتی ہے۔اور اسمیں گولہ استعمال ہوتا ہے۔بڑے شکار اور جنگی مقاصد کیلئے زیادہ کاریگر سمجھا جاتا ہے۔

راپال:

راپال بھی اوپر سے لوڈ ہونے والا سادہ بندوق ہے مگر اسمیں آتش خانہ اور رسی کی جگہ پٹاخے کی نلکی لگی ہوتی ہے اور پٹاخے پر چوٹ لگنے سے بندوق چلتی ہے۔ولایت اور روس سے لائی جاتی تھی۔چترال میں بھی بنتی تھی۔اور اب بھی بنتی ہے۔اس کا رواج موجود ہے۔چھوٹی نالی والے کو شکاری راپال اور بڑی نالی والے کو ژانگی راپال کہتے ہیں۔چھرہ اور گولہ دونوں میں استعمال ہوتے ہیں۔

دنبالہ پُر:

کارتوس والے بندوق پہلے پہل ولایت اور روس سے لائے گئے۔پھر چترال میں بنانے کا رواج ہوا۔چونکہ ان بندوقوں کو باٹ کی طرف سے لوڈ کیا جاتا ہے اس لئے انہیں ''دُنبالہ پُر'' کہتے ہیں۔

مُکائی:

چھرے کو چترال میں مُکہ کہا جاتا ہے۔ اس لئے چھریدار بندوق کو مکائی کہا جاتا ہے۔ چترال میں روس اور ولایت سے آکر متعارف ہوا۔ اب مقامی طور پر بنایا جاتا ہے۔

توپانچہ:

پستول اور ریوالور کو توپانچہ کہتے ہیں۔ انیسویں صدی میں اس کا رواج ہوا۔ چترال میں نہیں بنتا۔ باہر سے لایا جاتا ہے۔ بیسویں صدی میں توپ، رائفل، مشین گن اور بھاری ہتھیاروں کا رواج ہوا۔

روایتی برتن

چترال میں قدیم زمانے کے برتن پتھر کے ہوتے تھے۔ پھر مٹی کے برتنوں کا رواج ہوا۔ اس کے بعد لکڑی کے برتن مقبول ہوئے، پھر پیتل، تانبے وغیرہ کے برتن آئے۔ چند روایتی برتن یہ ہیں۔

کوٹھیک:

یہ پتھر کا بنا ہوا دیگچہ (ہانڈی) ہے۔ اس میں پکا ہوا کھانا بہت لذیز ہوتا ہے۔ اسکو گرم کرنا بڑا مشکل ہے۔ ایک بار گرم ہو جائے تو آگ کے بغیر بھی دیر تک گرم رہتی ہے۔ ایک ضرب المثل ہے ''خدایو کوٹھیک ملالہ ویروم گوئے'' خدا کی ہانڈی میں ابال دیر سے آتا ہے یعنی خدا بہت ڈھیل دیتا ہے۔

داردُو:

یہ بھی پتھر کی ہانڈی ہے۔ کوٹھیک سے چھوٹی ہوتی ہے اسے خوبصورت بنایا جاتا ہے۔ ضرب المثل ہے ''داردو چھیتی واغہ پریر'' ''واردو'' ٹوٹ جائے تو اسکی قیمت بڑھ جاتی ہے یعنی ٹوٹی ہوئی چیز کی بڑی تعریفیں کی جاتی ہیں کیونکہ اس کے جانچنے کا وقت نہیں رہتا۔

ٹونج:

مٹی کا بنتا ہے۔ ہانڈی کے طور پر بھی کام آتا ہے۔ اس کے مختلف سائز ہوتے ہیں۔

غوریر:

''غوریر'' مٹی کا بڑا مٹکا ہے۔ اس میں لسی بناتے ہیں۔ اسے گوڑی بھی کہا جاتا ہے۔

گرینی:

مٹی کا دیگ ہے۔ اس میں دستے لگے ہوتے ہیں۔ کھانا پکانے کے کام آتا ہے۔

غان۔ لکڑی کا بنا ہوا لگن ہے۔ اس کے مختلف سائز ہوتے ہیں۔

لنگری۔ لکڑی کی تھالی ہے۔ مختلف سائزوں میں بنتا ہے۔

تھاوشی۔ لکڑی کا ڈونگہ ہے۔

پتھاخ۔ لکڑی کا نسبتاً چھوٹا ڈونگہ ہے۔

بٹوڑ۔ لکڑی کا پیالہ ہے اسے بہت خوبصورت بنایا جاتا ہے۔

بغیر۔ لکڑی کا بڑا ٹب ہے۔ اس میں دودھ ڈالتے ہیں اور تہواروں کے موقع پر آٹا گوندھتے ہیں۔

پار۔ لکڑی کا چھوٹا برتن، ٹب کی طرح لمبا ہوتا ہے۔ غلہ اور آٹا نکالنے کیلئے استعمال ہوتا ہے۔

ڈُوری۔ لکڑی کا بڑا چمچہ ہے۔ ڈوئی کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔

کیپنی۔ لکڑی کا چھوٹا چمچہ ہے۔ کھانیکے کام آتا ہے۔ اسے بہت خوبصورت بنایا جاتا ہے۔

تھالوَ۔ یہ لکڑی کی بالٹی ہے۔ پانی لانے کے کام آتا ہے۔

دونیک۔ یہ بھی لکڑی کی بالٹی ہے۔ تھالوَ سے چھوٹی ہوتی ہے۔ دودھ دوہنے کیلئے استعمال ہوتی ہے۔

چدین۔ یہ بدخشاں اور ترکستان کا دیگ ہے۔ یہ چونے اور ریت سے بنایا جاتا ہے۔ تین طرف دستے لگے ہوتے ہیں۔ اسکی قیمت گائے کے برابر ہے۔

لوک کھیل اور جسمانی کرتب

چترال کے لوک کھیل بے شمار ہیں۔ بچیوں اور جوانوں کے علاوہ بڑوں کے کھیلوں کو یکجا کیا جائے تو انکی تعداد ایک سو بتیس تک پہنچتی ہے۔ دنیا کے جدید کھیل سکی، کرکٹ، فٹ بال، اور ہاکی چترال میں سامان اور طریقہ کار کے تھوڑے سے اختلاف کے ساتھ۔ زمانہ قدیم میں رائج تھے۔ چترال کے اکثر لوک کھیلوں کا تعلق زور آزمائی، دفاعی حکمت عملی اور ذہانت کی ازمائش سے ہے۔ جسمانی کرتبوں میں جوڈو کراٹے اور کبڈی کی قدیم صورت بھی چترال میں مروج رہا ہے۔ یہاں چند خاص کھیلوں کا تذکرہ ہے۔

گٹ چوکیک:

کشتی لڑنے کو گٹ چوکیک کہتے ہیں۔ یہ کھیل بچے بھی کھیلتے ہیں جوان اور بوڑھے بھی۔ نہایت قدیم اور مقبول کھیل ہے۔ ڈیک نئیک، چاپک وار، اور چاکیک اس کے مشہور داؤ ہیں۔ فن پہلوانی میں اس کھیل کو بہت اہم مقام دیا جاتا ہے۔ اور اس پر شرطیں لگتی ہیں۔

بوخیت پنخھیک:

گولہ پھینکنا ایک پرانا کھیل ہے۔ زور آزمائی کیلئے بوخت پنخھیک کھیلا جاتا ہے۔ یہ کھیل قدیم زمانے میں بہت مقبول تھا۔ ہر میدان، ہر گاؤں اور چراگاہ جا بجا مختلف سائز کے پتھروں کے چھوٹے بڑے گولے رکھے ہوئے ملتے تھے۔ جہاں ہر عمر کے لوگ طاقت ازماتے تھے۔ شرطیں بھی لگائی جاتی تھیں۔

بوخت اُوسنیک:

یہ بھی پتھر کیساتھ کھیلا جاتا تھا۔ اس کھیل میں وزن اٹھانے کا مقابلہ ہوتا تھا۔ پتھر کے بڑے بڑے گولے اسمیں استعمال ہوتے تھے۔ بعض کا وزن ۱۰۰ سیر سے زیادہ ہوتا تھا۔ پہلوانی میں اس کھیل کا خاص معیار ہوتا ہے۔ اور اس میں پہلوان پتھر کو سامنے سے دونوں ہاتھوں سے اٹھا کر کندھے کے اوپر سے پیچھے گرا دیتا ہے۔ اگر یہ نہ ہو تو جس نے پتھر کو زیادہ بلندی تک لایا وہ کامیاب ہوتا ہے۔ اس کھیل کو پہلوان بوخت بھی کہا جاتا ہے۔

سیمینی ژینگیک:

رسہ کشی چترال میں بہت پرانے زمانے سے مروج رہا ہے۔ اس کیلئے موٹی رسی استعمال ہوتی ہے۔ یہ ٹیم کی صورت میں کھیلا جاتا ہے۔ ٹیمیں عموماً گاؤں اور محلے کی سطح پر بنائی جاتی ہیں۔ اس کھیل میں ہر ٹیم کیساتھ ہاتھ میں جھنڈی لیکر ایک استاذ بھی میدان میں آتا ہے۔ اور جھنڈی کے اشارے سے ٹیم کو مختلف داؤ آزمانے کی رہنمائی کرتا ہے۔

موجوستی چھینیک:

ران کی ہڈی کو ایک تنکے کے اوپر رکھ کر ہتھیلی کی چھوٹی انگلی کی طرس ے مخصوص داؤ کیساتھ مارا جاتا ہے۔ تو ہڈی دو برابر ٹکڑوں میں ٹوٹ جاتی ہے۔ یہ جوڈو کراٹے کی قدیم صورت ہے۔ اس مقصد کیلئے جوانوں میں بکرے اور دنبے کی ران کا مقابلہ ہوتا ہے۔ بچے، بکری، بھیڑ اور میمنے وغیرہ کی رانوں سے بھی کھیلتے ہیں۔ یہ کھیل اب معدوم ہوتا جارہا ہے۔

استور غاڑ:

پولو کو استور غاڑ کہا جاتا ہے۔ یہ چترال کا قدیم کھیل ہے۔ لارڈ کرزن نے چترال اور گلگت کو پولو کا گہوارہ قرار دیا ہے۔ اور اسے مشرق کا مقبول کھیل کہا ہے۔ چترال میں اب بھی یہ کھیل زمانہ قدیم کی طرح مقبول ہے اور اپنی پرانی صورت میں کھیلا جاتا ہے۔ اسمیں قواعد وضوابط کا دخل نہیں ہے۔ فری سٹائل میں کھیلا جاتا ہے۔ ''مرو یا مارو'' چترال کے پولو کی خصوصیت ہے۔ دیہات کے اندر کھیلتے ہوئے ایک ٹیم میں کھلاڑیوں کی تعداد کا تعین نہیں ہوتا۔ آٹھ آٹھ کھلاڑی بھی ہوتے ہیں۔ مرکزی مقامات پر ٹورنمنٹ وغیرہ میں ایک ٹیم کے کھلاڑیوں کی تعداد پانچ یا چھ ہوتی ہے۔ کھیل دو وقفوں میں ہوتا ہے۔ اور اس دوران گھوڑا تبدیل نہیں ہو سکتا۔ ریزرو کھلاڑی کی اجازت نہیں ہوتی۔ دیہات میں کھیل کا آغاز کسی بزرگ کے اکیلے گھڑ دوڑ سے ہوتا ہے۔ جسے جنالی تراچیک کہتے ہیں۔ ٹاس کے ذریعے ایک ٹیم پہلے ''تمبوق'' سے کھیل کی ابتداء کرتی ہے۔ جس کے لئے ایک گول سے سارے گھوڑوں کو ایک ساتھ دوڑایا جاتا ہے۔ درمیان میں پہنچ کر ایک کھلاڑی گیند کو ہوا میں اچھال کر دوڑتے ہوئے زور سے مارتا ہے۔ مگر مرکزی مقامات اور بڑے مقابلوں میں میدان کے وسط سے گیند پھینک کر کھیل کا آغاز کیا جاتا ہے۔ ''تمبوق'' گول کرنے والی ٹیم کے ہاتھ آجاتا ہے۔ اور ہر گول کیساتھ سائیٹ تبدیل ہو جا . ہے۔ چترال میں پولو کے دوران ڈھول سُرنا پر پولو کی مخصوص دھن بجائی جاتی ہے۔ اور بہت بڑی تعداد میں تماشائی اس کھیل سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ اپنی ایک نظم میں جے کے اسٹیفن نے اس کھیل کو بادشاہوں کا کھیل اور کھیلوں کا بادشاہ قرار دیا ہے۔ مگر چترال میں اسے عوامی کھیل اور غریبوں کا فن سمجھا جاتا ہے۔ جہاں لوگ گائے بیل کی ضرورت پر گھوڑے کے شوق کو ترجیح دیتے ہیں۔ تنگی ترشی کے باوجود گھوڑے پالتے ہیں اور پولو کھیلتے ہیں۔

بُزکشی:

بُزکشی بھی گھوڑے پر کھیلا جاتا ہے۔ یہ انفرادی کھیل ہے۔ مگم ٹیم کی صورت میں بھی کھیلا جاتا ہے۔ کھلاڑیوں کی تعداد مقرر نہیں ہوتی۔ میدان میں دُنبہ یا بکرا لاکر ذبح کیا جاتا ہے۔ خون میں لت پت جانور کو کھال اور بال یا اون کی ساتھ اٹھانے اور سب سے بچا کر کھیل کے میدان سے باہر لیجانے کیلئے گھڑ سواروں میں مقابلہ ہوتا ہے۔ گھڑ سوار میدان کے ایک سرے سے گھوڑے

دوڑاتے ہوئے آتیہیں۔ جانور کو اٹھانے کیلئے چھینا چھپٹی ہوتی ہے۔ ایک اٹھا کر دوڑتا ہے تو دوسرا راستہ روک کر اُس سے چھین لیتا ہے۔ پولو کی نسبت اس کھیل میں زیادہ شہ سواری کا مقابلہ ہوتا ہے۔ بعض اوقات گھڑ سوار کی ایسی حالت ہوتی ہے کہ ''نہ ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں''۔

نمپوفوتے پخھیک:

یہ ایسا کھیل ہے جو افرادی طور پر کھیلا جاتا ہے۔ اس میں گھڑ سوار بندوق بھرا ہوا ہاتھ میں لیکر گھوڑا دوڑاتا ہے اور میدان کے وسط میں ایک ستون پر لٹکے ہوئے نشانے پر گولی چلاتا ہے۔ اس میں گھڑ سواری کیساتھ نشانہ بازی کا بھی امتحان ہوتا ہے۔ اس کا نشانہ روایتی طور پر ایک کدو ہوتا ہے جس میں ٹھنڈی راکھ پر دی جاتی ہے۔ گولی لگتے ہی کدو ٹوٹ جاتا ہے اور راکھ گرد بن کر دور دور تک پھیل جاتا ہے۔ تماشائی اس سے بہت لطف اندوز ہوتے ہیں۔ گھوڑے سرپٹ دوڑاتے ہوئے بندوق چلانا نشانہ باز کا خاص کمال ہوتا ہے۔

شیٹ لا کھیک:

نشانے کو چترال میں شیت اور نشانہ بازی کو شیٹ لا کھیک کہتے ہیں۔ یہ بہت قدیم کھیل ہے۔ غلیل، تیر کمان اور نیزے کے ذریعے بھی یہ کھیل کھیلا جاتا تھا۔ نشانے کے طور پر عموماً کسی جانور کی کھوپڑی پر کالا نشان بنا کر رکھی جاتی ہے۔ تلوار بھی نشانے کے طور پر زمین میں الٹا کر کے گاڑھ دیا جاتا ہے۔ بیٹے کی پیدائش اور شادی کے موقع پر اس کا خاص اہتمام کیا جاتا ہے۔

ہیم بڑا خودک:

برف کے گولے بنا کر ایک دوسرے پر پھینکنے اور مقابل کو مارنے کا مقابلہ ہوتا ہے۔ یہ سردیوں میں برف باری کے دوران بچوں اور جوانون کا مقبول کھیل ہے۔ بچیاں بھی یہ کھیل کھیلتی ہیں۔

اوغ جان:

گرمیوں میں ہولی کے طرز پر ایک دوسرے پر پانی ڈالنے کا مقابلہ ہوتا ہے تہواروں اور شادی بیاہ کے مواقع پر خاص طور پر یہ کھیل کھیلا جاتا ہے۔

چوڑا:

یہ برف کا کھیل ہے سردیوں کے اختتام کے قریب جب بلندی سے نشیب کی طرف آنے والے پانی کے سُوتے جم جاتے ہیں اور برفباری کے بعد برف بھی جم کر ICE بن جاتی ہے تو گاؤں کے بچے ڈھلوانوں پر جا کر برف پر پھسلنے کا کھیل کھیلتے ہیں یہ کھیل بیٹھ کر بھی کھیلا جاتا ہے۔ کھڑے ہو کر بھی کھیلا جاتا ہے نیچے لکڑی کا کوئی ٹکڑا کبھی کبھار رکھتے ہیں۔ اکثر یہ بھی نہیں ہوتا ہے۔ بسا اوقات یہ کھیل خطرناک ثابت ہوتا ہے۔ یہ شاید Skiing کی قدیم صورت ہے جو چترال میں اب بھی مروج ہے۔ اسے چورغہ بھی کہتے ہیں۔

کھوشت نابلی:

آنکھ مچولی کو چترال میں کھوشت نابلی کہتے ہیں۔ یہ ٹیم کی صورت میں بھی کھیلی جاتی ہے۔ اور انفرادی صورت میں بھی۔ اس کھیل میں جسمانی چابک دستی کے علاوہ ذہانت کا بھی بڑا دخل ہوتا ہے۔ عموماً خزاں کے موسم میں کھلیانوں پر یہ کھیل کھیلا جاتا ہے۔

بل بل موڑی:

یہ کبڈی کے طرز کا قدیم روایتی کھیل ہے۔ عام طور پر خزاں کے موسم میں کھلیانوں پر کھیلا جاتا ہے۔ اس میں ٹیمیں حصہ لیتی ہیں۔ ایک کھلاڑی ہاتھ پاؤں کے بل آجاتا ہے اور بل بل موڑی کہتے ہوئے مخالف ٹیم کو للکارتا ہے۔ مخالف ٹیم اسکے سر پر ہاتھ رکھنے، جسم کو چھونے یا ٹوپی اٹھا کر بھاگنے کی کوشش کرتی ہے۔ پہلی ٹیم کے کھلاڑی بھاگنے والے کو پکڑنے کی کوشش کرتے ہیں مقررہ حدود تک اس کا پیچھا کرتے ہیں۔ بل بل موڑی کہہ کر للکارنے والا دوسروں کو موقع دیئے بغیر بھاگ جائے تو وہ کامیاب ہے۔ دوسری ٹیم کا کھلاڑی اسکو چھو کر بھاگ نکلے تو وہ جیت جاتا ہے۔

غاڑ:

یہ ہاکی کے طرز کا روایتی چترالی کھیل ہے۔ سٹک اور گیند سے کھیلا جاتا ہے۔ ہر گول پر سائیٹ تبدیل ہوتا ہے۔ اس میں قواعد وضوابط نہیں ہوتے۔ صرف گیند لے جانا ہے۔ اور گول کرنا ہے۔ ہر ٹیم گول کرتی ہے تو ایک ساتھی پتھر لا کر اپنے پاس رکھتا ہے۔ جنہیں ''گوغ'' یا کڑا کہا جاتا ہے۔ کھیل کے اختتام پر ہر ٹیم ان پتھروں کو گنتی ہے۔ اور ہار جیت کا فیصلہ کرتی ہے۔ اس کھیل کیلئے کھلاڑی میدان میں آکر دو دو کی جوڑی بناتے ہیں۔ ایک جوڑی کپتانوں کی ہوتی ہے جو کھیل میں دوسروں سے بہتر ہوتے ہیں۔ ہر جوڑی کا ہر کھلاڑی اپنا فرضی نام رکھتا ہے۔ جو جڑی بوٹیوں، پرندوں یا چاند ستاروں کے ناموں سے لئے جاتے ہیں۔ اسی طرح باری باری ہر جوڑی سامنے آتی ہے۔ اور کپتان سے کہتی ہے کہ چاند لوگے یا

ستارا؟ کپتان باری باری ہر جوڑی میں انتخاب کرتے ہیں۔ اور فرضی ناموں کی وجہ سے اچھے یا کمزور کھلاڑی کے انتخاب پر جھگڑا نہیں ہوتا۔ کھلاڑی بھی کپتان سے ناراض نہیں ہوتا۔ کہ اپنی باری پر مجھے ٹھکرا کر فلان کو کیوں پسند کیا۔ ٹیموں کے انتخاب کے بعد قرعہ اندازی ہوتی ہے کہ کون سا گول سائیٹ کس ٹیم کا ہوگا، اور پہلے تمپوق کو مار کر کون کھیل کی ابتدا کرے گا۔ قرعہ کیلئے ایک پتھر اٹھا کر اسکے ایک طرز لعاب لگایا جاتا ہے۔ کپتان سے پوچھا جاتا ہے ''چھو چوازہ؟'' یعنی ''خشک یا گیلا'' پھر پتھر کو اوپر اچھالا جاتا ہے۔ زمین پر گرتے ہی خشک یا گیلا جو بھی اوپر آئے، قرعہ نکل آتا ہے۔ اور کھیل شروع ہوتا ہے۔ ٹیم بنانے کا یہ طریقہ اکثر کھیلوں میں مروج ہے۔ سٹک کی قسموں کے اعتبار سے اور گیند کے اعتبار سے اس کھیل کے کئی نام ہیں اور کئی قسمیں مروج ہیں۔

بامپھو غاڑ:

یہ فٹ بال کے طرز کا قدیم کھیل ہے جس میں اونی کپڑوں کا بنا ہوا گولہ بال کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔ اس گولے کو بامپھو کہتے ہیں۔ اسی مناسبت سے کھیل کا نام بامپھو غاڑ پڑ گیا ہے۔ اس میں بھی ٹیم بنانے کا طریقہ اور گول حساب کرنے کا طریقہ ''غاڑ'' کی طرح ہوتا ہے۔ ہر گول کیساتھ سائٹ بھی تبدیل ہو جاتا ہے۔

شپسر کیٹری:

یہ ایک روایتی کھیل ہے جسمیں دشمن کے مقابلے پر اپنا دفاع کرنیکی تربیت ہے۔ شپر بھیڑیے کو کہتے اور کیڑی بھیڑ کو کہتے ہیں چند کھلاڑی بھیڑ بنتے ہیں اور چند ایک بھیڑیے بنتے ہیں۔ ایک بھیڑیا کسی بھیڑ پر حملہ کرتا ہے سب بھیڑ اپنا دفاع کرتے ہیں۔ اور باقی بھیڑیے بھی حصار سے باہر نکلنے والے بھیڑ پر حملہ کیلئے تیار رہتے ہیں۔ اسی طرح ہار جیت تک نوبت آجاتی ہے۔

ڈانز:

یہ چترال کے پہاڑی سرحدی مقامات پر کھیلا جاتا ہے۔ اس کھیل میں مضبوط لکڑی کے بیٹ کے ذریعے پتھروں کو دور پھینکنے کا مقابلہ ہوتا ہے۔ پتھر کو ہوا میں اچھال کر مارنے کیلئے ایک جگہ بنائی جاتی ہے جسے خانہ کہتے ہیں۔ اس میں کراس قسم کی جھولتی ہوئی لکڑیاں رکھی جاتی ہیں۔ کراس کے ایک سرے پر پتھر رکھ کر دوسرے سرے پر ہلکی چوٹ لگائی جائے تو پتھر اچھلتا ہے۔ اس پتھر کو مرحلہ وار چار طریقوں سے مارا جاتا ہے۔ اور مقررہ حدود سے باہر پھینکا جاتا ہے۔ اور پتھروں کی تعداد ہر مرحلے کیلئے مقرر ہوتی ہے پہلے سادہ طریقے سے مقررہ تعداد سو یا دو سو پوری کرنیکے بعد تین پیچیدہ طریقوں سے ہر کھلاڑی ہر سو کیلئے پانچ پانچ پتھر مارتا ہے۔ اور ہر سو پر کل تعداد ایک پندرہ ہوتی ہے۔ اس کھیل میں انفرادی سکور بھی ہوتا ہے۔ ٹیم کا سکور بھی حساب کیا جاتا ہے۔ اس کیلئے چابکدستی، طاقت اور ذہانت کی ضرورت ہوتی ہے۔ عام طور پر سردیوں میں کھیلا جاتا ہے۔

شیر مُو:

یہ چرواہوں کا مخصوص کھیل ہے۔ اور ایک ہاتھ کی انگلیوں سے کھیلا جاتا ہے۔ دو سے لیکر بیس تک یا اس سے بھی زیادہ کھلاڑی یہ کھیل دو دو کی جوڑیوں میں کھیلتے ہیں۔ بنیادی طور پر انڈور گیم ہے مگر عموماً گھر سے باہر کھیلا جاتا ہے۔ اس میں دائیں ہاتھ کی انگلیوں سے تین نشان بنائے جاتے ہیں۔ تلوار، قینچی اور مٹھی۔

اصول یہ ہے کہ تلوار قینچی کو کاٹتی ہے، قینچی مٹھی کو کاٹتی ہے اور مٹھی تلوار کو کاٹتی ہے۔ مقابل کے دونوں کھلاڑی بجلی کی سی تیزی کیساتھ انگلیوں کو چلاتے ہیں۔ جس نے کاٹا وہ ناک آوٹ ہوتا ہے۔ اور ناکام ہونے والا آگے بڑھتا ہے۔ یہاں کہ آخیر میں جسے شکست ہو جائے وہ ہار جاتا ہے۔ اُسے کام پر بھیجا جائیگا یا شرط وصول کی جائیگی۔ یہی وجہ ہے کہ کامیاب پیچھے ہٹتا ہے اور ناکام آگے بڑھتا ہے۔ یہ قسمت کا کھیل ہے اسمیں داؤ بہت کم چلتا ہے۔

بوڈی دک:

یہ کرکٹ کی طرز کا کھیل ہے جو اپنی قیم روایتی صورت میں چترال میں مروج ہے۔ اسے بچے اور جواں دونوں کھیلتے ہیں۔ اس میں بیٹ کی جگہ لاٹھیاں استعمال ہوتی ہیں۔ جنہیں ڈازبان کہتے ہیں۔ گیند کی جگہ لکڑی کا چھوٹا ٹکڑا استعمال ہوتا ہے جسے ''بوڈی'' کہتے ہیں۔ اس میں بالنگ نہیں ہوتی۔ اس کی جگہ لکڑی کے ایک کراس کو چیر چیلیک بنایا جاتا ہے۔ ڈانز کی طرح بوڈی کو ہوا میں اچھال کر زور سے مارا جاتا ہے۔ گراؤنڈ میں مخصوص فاصلے پر چار حد بندیاں ہوتی ہیں۔ اور بوڈی جتنی حد بندیاں پار کرے اتنے نمبر شمار کئے جاتے ہیں۔ جنہیں گوغ کہا جاتا ہے۔ (گوغ کے معنی ہیں کیڑا) قرعہ جیتنے والی ٹیم کھیل شروع کرتی ہے مخالف ٹیم کے کھلاڑی لاٹھی کے ذریعے بوڈی کو روک کر یا حد بندی پار کرنے سے پہلے ہاتھ سے پکڑ کر کھلاڑی کو آوٹ کرنیکی کوشش کرتے ہیں۔ بوڈی خود کھلاڑی کے ہاتھ سے ''خانہ'' پر گرے تو وہ آوٹ ہوتا ہے۔ یا حدود پار نہ کر سکے۔ تو نمبر نہیں ہوتا۔ ہار جیت کا فیصلہ ہو جائے تو کھیل پہلے ہی راؤنڈ میں ختم ہو جاتا ہے۔ فیصلہ نہ ہو سکے تو تیسرے

راؤنڈ تک جاری رہتا ہے۔ اسی طرز پر تھوڑے سے اختلاف اور فرق کیساتھ پائیک اور ٹوک سوری بھی کھیلے جاتے ہیں۔ یہ بھی کرکٹ کی قدیم صورتیں ہیں۔

پائے دریک:

یہ بچیوں اور نوعمر لڑکیوں کا کھیل ہے۔ اس روایتی کھیل میں چھوٹے چھوٹے خوبصورت گول مٹول پتھر استعمال ہوتے ہیں جنکی تعداد پانچ ہوتی ہے۔ بعض دیہات میں چند صورتوں میں یہ تعداد پانچ سے زیادہ بھی ہوسکتی ہے۔ پتھروں کو مختلف طریقوں سے اوپر اچھال کر ہتھیلی یا ہتھیلی کے الٹے رُخ پر روکا جاتا ہے۔ اس میں ہاتھ کی حرکت حیرت انگیز طور پر تیز ہوتی ہے۔ اسکی دو قسمیں ہیں ایک قسم ای چاڑی ہے (ای تالی والا) جسے گیارہ مرحلوں میں کھیلا جاتا ہے۔ دوسری قسم جو چاڑی ہے (دوتالیوں والا) اسے اُنیس مرحلوں میں کھیلتی ہیں۔ یہ کھیل انفرادی طور پر دو دو کی ٹولیوں میں کھیلا کجاتا ہے۔ گھر کے اندر بھی یہ کھیل ہوتی ہے۔ گلی کوچے یا صحن میں بھی اسے کھیلا جاتا ہے۔

کڑبوکی:

گڑیا کو کڑبوکی کہا جاتا ہے۔ چترال کی بچیوں میں گڑیاں کھیلنے کا رواج زمانہ قدیم سے چلا آرہا ہے۔ بچیاں، لکڑی، دھاگہ اون یا سوت کے کپڑے سے گڑیاں بناتی ہیں۔ ان میں بیٹے بیٹیاں ہوتی ہیں۔ انکی شادیاں ہوتی ہیں۔ اور بچے بھی ہوتے ہیں۔ گڑیوں کی شادیوں میں دستور کے مطابق رخصتی ہوتی ہے۔ پیاز کو بیل گائے، مٹر کے دانوں کو بھیڑ بکڑیاں اور اخروٹ کے دانوں کو صندوق بنا کر گڑیوں کیلئے جہیز تیار کیا جاتا ہے۔

دوردیتی اشٹوک:

''دور'' گھر کو کہا جاتا ہے۔ چھوٹی بچیاں کھیلنے کیلئے گھروندے بناتی ہیں۔ اس میں سامان سجاتی ہیں۔ مٹی سے روٹیاں پکاتی ہیں۔ ایک دوسرے کی دعوتیں ہوتی ہیں۔ روز روز ان گھروندوں کو نئے سرے سے سجاتی ہیں۔ ان میں گھر اور محلے کا ماحول پیدا کیا جاتا ہے۔ گھر کے کام کاج دستکاریاں وغیرہ ہوتی ہیں۔ خوشیاں ہوتی ہیں۔ ناراضگیاں ہوتی ہیں۔ جرگے ہوتے ہیں۔

لوک روایات توہمات، داستانیں، کہانیاں

چترال کا معاشرہ روایتی طور پر ایک قدامت پسند معاشرہ ہے۔ اس کے اقدار میں توہمات اور روایات کی کثرت ہے۔ (شہزادہ محمد حسام الملک، تمدن چترال، جمہور اسلام کھوار پشاور سلسلہ وار 77-1975) مافوق الفطرت مخلوقات اور دیو، جنات وغیرہ کو ان سماجی اقدار میں بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ بعض روایات اور توہمات نے ضابطہء اخلاق کی حیثیت اختیار کر لی ہے۔ لوک، داستانوں، کہانیوں اور گیتوں میں ان اقدار کا نمایاں طور پر ذکر ہوتا ہے۔

روایات اور توہمات:

چترال کے روایتی معاشرے میں یہ قدیم روایت ہے کہ ہر کام کا ایک ''پیر'' ہوتا ہے۔ جسکی روح کو پکارا جائے یا زندہ مخلوق میں سے ہو تو اسکی مدد حاصل کی جائے۔ تاکہ کام میں آسانی ہو۔ اگر کوئی ناواقفیت یا نادانی یا روشن خیالی اور ہٹ دھرمی سے ایسا نہ کرے تو کام میں خلل پڑتا ہے۔ اور بعض اوقات جان کو خطرہ ہوتا ہے۔ گھڑسواری کا پیر بابائے قنبر ولی کو مانا جاتا ہے۔ یہ کہاں گزرے، کب گزرے اس کا علم نہیں ہے۔ گھڑسوار اس کا نام لیتا ہے۔ زراعت کا پیر خواجہ خضر کو مانا جاتا ہے خواجہ خضر تاریخ میں دو گذرے ہیں ایک موسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں اور ایک اسلامی تصوف کے دور میں ترکستان میں گزرا ہے۔ جنہیں فصلوں کے ساتھ نسبت اور سبزہ کیساتھ تعلق کی وجہ سے خاص طور پر خضر کہا گیا ہے۔ چترال کی روایات میں زندہ پیر، اور خواجہ خضر کا امتیاز نہیں ہے۔ دونوں روایات ملتی ہیں۔ کاشت اور برداشت کے وقت ان کا نام لیا جاتا ہے۔ درخت اور لکڑی کے کاموں میں بھی ان کا نام لیا جاتا ہے۔ طب اور حکمت کے کاموں میں لقمان حکیم کو پیر مانا جاتا ہے۔ بوڑھے، بوڑھیاں جب بیمار کا علاج کرنے لگتی ہیں تو لقمان حکیم کا نام لیکر علاج شروع کرتی ہیں۔ شکار اور خاص طور پر جنگلی پہاڑی شکار کا پیر شاوان نان کو مانا جاتا ہے۔ یہ دیوی ہے جو پہاڑوں پر رہتی ہیں۔ سبزہ اور جنگل پر اس کا تصرف ہے اور جنگلی پرند، درند، چرند اس کی ملکیت میں ہیں۔ اس لئے شکاری، شاوان نان کا خاص خیال رکھتے ہیں۔ آٹے کی چھوٹی ٹکیاں بنا کر ساتھ لے جاتے ہیں۔ مختلف گھاٹیوں میں یہ ٹکیاں پتھروں پر رکھی جاتی ہیں۔ گلہ بانی کیلئے دو دیویوں کا تصور موجود ہے چراگاہوں اور پہاڑوں پر شٹاوان نان کا نام لیا جاتا ہے (گاؤ ماتا کی طرز پر شٹاوان کے نام کے ساتھ نان یعنی ماں کا لفظ بولا جاتا ہے) ''شری'' کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ دودھ اور گوشت کے پہلے طعام میں اس کا حصہ دیا جاتا ہے۔ جسے مویشیوں کی دیکھ بھال کرنے والا۔ مویشیوں کے باڑہ میں لے جا کر شری کا نام لیکر کھاتا ہے۔ اور تھوڑا ستون پر لگاتا ہے۔ گھر کے سلیقہ اور برکت کیلئے خانگی نام کے دیوتا کو خوش رکھنے کی کوشش کیجاتی ہے۔ خانگی گھر میں رہتا ہے اور سلیقے کا خیال رکھتا ہے۔ گھر میں کوئی چیز گم ہوجائے تو کہا جاتا ہے کہ خانگی نے چھپایا، اور مل جائے تو کہتے ہیں کہ خانگی نے واپس لایا۔ آگ اور انگیٹھی میں الگ دیوتا رہتا

ہے۔جس کا نام ''پھروٹھس'' ہے۔آگ بجھ جائے۔چنگاریاں خاکستر میں ٹھنڈے پڑ جائیں تو کہا جاتا ہے کہ پھروٹھس ناراض ہوا۔آگ میں پانی گرنے سے پھروٹھس کو بہت تکلیف ہوتی ہے۔چکی پر جشتان نام کی جنات کا کنٹرول ہوتا ہے۔وہ ناراض ہو جائیں تو چکی نہیں چلتی۔جشتان کو ایک مخلوق مانا ہے۔ان میں مرد ،عورتیں ہوتی ہیں۔بچے بوڑھے ہوتے ہیں۔چکی کے علاوہ خالی گھر میں بھی ڈیرہ ڈالتی ہیں۔انکی ٹوپی کسی کے ہاتھ آئے تو انسانی صورت میں غلام بن جاتے ہیں۔شاہ عندلیب (1888-1815) کے بارے میں مشہور ہے کہ اس نے ایک جشتان کو غلام بنا کر اس کا نام مرزا کجت رکھا تھا۔وہ چھوٹے قد کا تھا دس بندوں کا کام اکیلے کرتا تھا۔مہینہ بھر کی مسافت ایک دن میں طے کرتا اور ہفتوں کا کام گھنٹوں میں انجام دیتا تھا۔لوہار اپنے کام کے پہلے حضرت داؤدؑ کا نام لیتے ہیں۔اور اپنے باٹ کو لنگر داؤد کا نام دیتے ہیں۔اسلامی تعلیمات عام ہونے اور جدید تعلیم کا رواج آنے کے بعد یہ روایات اور توہمات آہستہ آہستہ دم توڑ رہی ہیں۔بعض ایسے توہمات ہیں جنکا تعلق کسی دیوتا، دیوی سے نہیں مگر اُن پر یقین کیا جاتا ہے۔مثلاً بہو اپنے میکے سے لایا ہوا خوراک کھائے یا اس میں سے ایک لقمہ بھی لے لے تو اس کے ہاں بیٹیاں پیدا ہونگی۔گوشت میں لبلبہ کوئی کھائے گا تو اس کا باپ مر جائیگا جس کا بھائی زندہ ہو۔وہ ران کا گوشت نہ کھائے۔زمین پر لاٹھی مارنے سے ماں مر جاتی ہے۔دروازے پر پاؤں رکھنے سے باپ مر جاتا ہے۔گھر سے باہر نکلتے وقت بلی سامنے آئے تو بُرا شگون لیا جاتا ہے۔واپس آکر ایک لقمہ منہ میں لے کر واپس ہونے سے بُرا شگون اچھا شگون سمجھا جاتا ہے۔اسی طرح گھر اور پڑوس کے لوگوں کو نیک اور بدشگون کے طور پر آزمایا جاتا ہے۔چاند ستاروں کی گردش اور سیاروں کے بروج کو بھی سعد، نحس اور نیک و بدشگون کے طور پر لیا جاتا ہے۔سورج کے مطلع اور مغرب کے لحاظ سے صبح اور شام کے وقت کرنوں کے ساتھ چلنے والے سایے پر نظر رکھی جاتی ہے۔اس کی گزرگاہ کے مقامات کا تعین کیا گیا ہے۔اور ہر مقام کے ساتھ موسم فصل، گرمی، سردی، بارش وغیرہ کی پیشگوئی کی جاتی ہے۔چاند رات کے ساتھ کئی توہمات وابستہ ہیں۔اس رات گھر میں اچھا کھانا، تندرستی اور خوشی ہو تو سارا مہینہ ایسا ہی ہوگا۔اس رات مہمان آئے تو سارا مہینہ مہمانوں کی نذر ہو جائیگا۔چاند، مہینے کی طاق تاریخوں میں ہر ماہ کسی ایک تاریخ کو آسمان پر چھ ستاروں کے جھرمٹ کے قریب آجاتا ہے۔دونوں کا وقت ایک ہوتا ہے۔جسے بول کہتے ہیں۔(رحمت اکبر خان، این اکاؤنٹ آف دی مومنٹ آف دی سن اینڈ پلے لیڈز ان چترالی ٹریڈیشن، پروسیڈنگز آف دی سیکنڈ ہندوکش کلچرل کانفرنس، آکسفورڈ 1996) بول کی الگ تاریخیں حساب کی جاتی ہیں اور ہر تاریخ کیساتھ کوئی نہ کوئی روایت یا وہم وابستہ ہے۔کوئی تاریخ فصل اور پودوں کیلئے نیک یا بد ہوتی ہے۔کوئی تاریخ انسانوں یا جانوروں کیلئے نیک یا بد ہوتی ہے۔اس طرح چاند کی ہر تاریخ کے ساتھ ایک روایت وابستہ ہے۔جس کا خیال رکھا جاتا ہے۔سیاروں میں سے چترال کی لوک روایات میں مریخ اور مشتری بہت مشہور ہیں۔مریخ کو نحس اور بدشگوں سمجھا جاتا ہے ہفتے میں منگل کا دن مریخ سے منسوب ہے۔اور دن رات کی ساعتوں میں ہر روز دو ایک ساعتیں مریخ سے منسوب ی جاتی ہیں۔مشتری کو سعد اور نیک شگون سمجھا جاتا ہے۔ہفتے کے دنوں میں جمعرات کو مشتری سے منسوب کیا جاتا ہے۔اور دن رات کی ساعتوں میں ہر روز دو ایک ساعتیں مشتری سے منسوب کی جاتی ہیں۔اسی طرح آسمان پر ایک بے نام ستارے کو منحوس خیال کیا جاتا ہے۔اس کا نام محض استاری یعنی تارا ہے۔اسکی گردش کے بارے میں یہ روایت ہے کہ اسے کوئی نہیں دیکھ سکتا۔مہینے کے ہر عشرے میں دو دو دن چار ستوں میں ہوتا ہے۔نویں، انیسویں اور انتیسویں تاریخ کو آسمان پر اور دو، بیس، تیس تاریخوں کو زمین پر ہوتا ہے۔اسکی گردش مشرق سے جنوب، مغرب اور شمال کی طرف ہوتی ہے۔بعض وادیوں اور دیہات میں یہ روایت الٹی ہے یعنی ستارے کی گردش کو مشرق سے شمال، مغرب اور جنوب کے راستے دکھایا جاتا ہے۔ی ستارہ جہاں ہو اسکی طرف رخ کرنا نحس ہوگا۔

لوک داستانیں:

چترال کی لوک داستانوں میں جادو، منتر، اور مافوق الفطرت مخلوق کا زیادہ دخل ہوتا ہے۔(عنایت اللہ فیضی، کھوار ادب میں روایت، ادبی جائزے، اکادمی ادبیات پاکستان اسلام آباد، 1986) داستان، کو ''شلوغ'' کہتے ہیں۔شلوغ میں ایک بڑھیا، طوطا، شہزادہ، گھوڑا، کتا اور لومڑی کے کردار معاشرے سے لئے جاتے ہیں۔داستان ہمیشہ ایک جیسے رٹے رٹائے جملوں سے شروع ہوتا ہے۔اور ایسے ہی دوسرے جملوں پر ختم ہوتا ہے داستان گو داستان شروع کرنے سے پہلے کہتا ہے'' ایک دشت کے بعد دوسرا دشت آیا، ایک پہاڑ کے بعد دوسرا پہاڑ آیا، ایک دریا کے بعد دوسرا دریا آیا، ایکپل کے پار کیا، دوسرے پل سے واپس آیا۔رات نے دن سے جھوٹ بیان کیا، دن نے رات سے جھوٹ بیان کیا۔تو مجھ سے چھوٹ کہے میں تجھ سے جھوٹ کہوں، جس نے پہلے جھوٹ بولا وبال اسی پر ہو، تھا یا نہیں تھا، کہتے ہیں کہ ایک بادشاہ تھا، الخ، اسی طرح داستان کے اختتام پر عموماً بچھڑنے والے پھر سے مل جاتے ہیں یا شہزادے کی شادی ہوتی ہے۔خوشی کا سماں پیدا کرنے کے بعد داستان گو یہ رٹے رٹائے گھسے پٹے جملے دہراتا ہے۔ایک چاند رات سے دوسرے

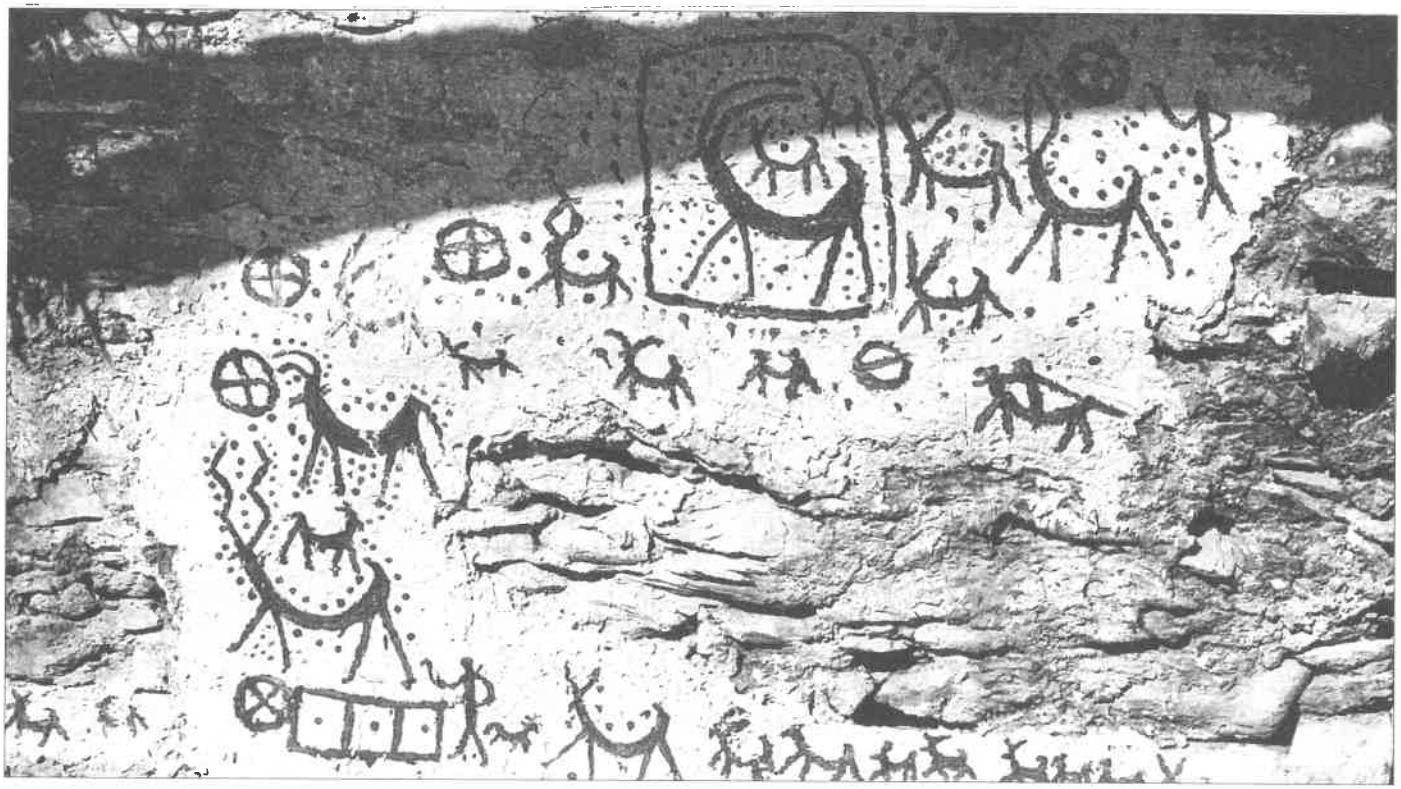
چاند رات تک دعوتیں ہوتی رہیں، کھانے پکتے رہے، خوب کھایا، خوب پیا، دروازے کے کونڈے پر انگور لگے مجھے ایک لنگڑا گھوڑا ملا"۔

کنونا نگ:

یہ ایک روایتی داستان ہے۔اس کا خلاصہ یہ ہے کہ بادشاہ کے ہاں بیٹا نہیں ہوتا۔ایک دن بادشاہ شکار پر جاتا ہے۔وہاں ایک درویش ملتا ہے۔وہ بادشاہ کو سیب دے دیتا ہے اور کہتا ہے کہ آدھا خود کھاؤ آدھا ملکہ کو کھلاؤ۔تمہارا بیٹا ہوگا وقت آنے پر شہزادہ پیدا ہوتا ہے۔نجومی اور جوتشی کہتے ہیں کہ شہزادے کو سولہ سال تک سورج کی روشنی مت دکھاؤ سولہ سال تاریک کوٹھڑی میں رہنے کے بعد شہزادہ ایک دن دیکھتا ہے کہ سورج کی روشنی ایک سوراخ سے کوٹھڑی کے اندر آ گئی ہے۔ شہزادہ اسکو پکڑنے کی کوشش کرتا ہے۔اگلے دن پھر اس کا انتظار کرتا ہے۔اسی طرح جب کوٹھڑی کی مدت پوری کر کے باہر آ جاتا ہے تو اُسے بتایا جاتا ہے کہ وہ روشنی یہی ہے جو باہر نظر آ رہی ہے۔شہزادہ نہیں مانتا ایک بڑھیا شہزادے کو بتاتی ہے کہ اُس روشنی کا راز پرستان کی شہزادی کے پاس ہے۔شہزادہ کہتا ہے وہ کہاں ہے؟ بڑھیا کہتی ہے وہ کنونا نگ کی قید میں ہے۔شہزادہ کہتا ہے کنونا نگ کا قید خانہ کہاں ہے؟ بڑھیا کہتی ہے کوہ قاف کے اوپر ہے۔شہزادہ کہتا ہے کہ میں وہاں جاؤنگا۔بڑھیا کہتی ہے اس پر شیر کا پہرا ہے، شہزادہ ماں، باپ سے چوری چھپے ہتھیار باندھ لیتا ہے۔زنجیر سلیمانی ایک انگوٹھی ہے جو بڑھیا اسکو پہنا لیتی ہے۔ راستے میں درویش ملتا ہے وہ اپنے مونچھوں کا ایک بال شہزادے کو دیکر کہتا ہے کہ ضرورت کے وقت اسکو آگ دکھاؤ میں حاضر ہو جاؤنگا شہزادہ دریا کے کنارے پہنچ جاتا ہے جہاں نہ پل ہے نہ کشتی، حیران و پریشان ہو کر درویش کے مونچھوں کا بال آگ میں ڈال دیتا ہے۔اسی لمحے درویش نمودار ہو کر اپنی پوستین زمین پر بچھا کر شہزادے کو اُس پر بٹھا لیتا ہے۔پوستین شہزادے کو لے کر ہوا میں بلند ہو جاتا ہے اور دریا کو پار کر دیتا ہے۔پہاڑ پر چڑھتا ہے۔سردی، گرمی، برف اور پانی کا مقابلہ کرتا ہے، آندھیوں اور طوفانوں سے کھیلتے ہوئے پہاڑ کی چوٹی پر پہنچ جاتا ہے معلوم ہوتا ہے کہ کنونا نگ نے جادو منتر سے اپنا قلعہ دوسرے پہاڑ پر منتقل کر لیا۔شہزادہ پریشان ہو کر ہاتھ ملتا ہے۔انگوٹھی کو ملتے ہی بڑھیا چرخہ لیکر نمودار ہوتی ہے۔شہزادے کو چرخے پر بٹھا کر پہاڑ کی دوسری چوٹی پر پہنچا دیتی ہے۔یہاں بڑھیا کا چرخہ کنونا نگ کے منتر کو توڑ دیتا ہے قلعہ اپنی جگہ سے نہیں ہلتا۔شیر کے ساتھ مقابلے میں لومڑی شہزادے کی مدد کرتی ہے۔اور فریب دیکر شیر کو شہزادے کے ہاتھ ہلاک کر کے اس کے گوشت پر ٹوٹ پڑتی ہے۔شہزادہ قلعے کے اندر جا کر پرستان کی شہزادی سے ملتا ہے۔شہزادی کہتی ہے کہ کنونا نگ باہر گیا ہوا ہے۔ابھی آئیگا تو تمہیں زندہ کھا جائیگا۔شہزادہ پوچھتا ہے کہ کنونا نغ کی جان کس بات میں پوشیدہ ہے۔شہزادی کہتی ہے کہ طوطے میں ہے۔اتنے میں کنونا نغ کے آنے کی اواز آتی ہے۔زلزلہ ہوتا ہے ہ بادل گرجتے ہیں پتھر گرتے ہیں درخت ٹوٹتے ہیں۔دیواریں کانپتی ہیں شہزادہ چھپ کر دیکھ رہا ہے۔کنونا نگ آجاتا ہے۔ایک سالم گدھے کو تین سالم بیلوں اور سات لڑکوں کیساتھ کھا جاتا ہے۔کہتا ہے کہ بندے کی بو آ رہی ہے۔(شہزادے کی طرف اشارہ ہے) اب شہزادہ اپنے غلیل سے طوطے کو گرا دیتا ہے۔ساتھ ہی کنونا نگ بیہوش ہو جاتا ہے۔اس حالت میں پے در پے وار کر کے شہزادہ کنونا نگ کو ہلاک کرتا ہے۔اور شہزادی کو لیکر گھر آجاتا ہے۔جشن منایا جاتا ہے دونوں کیشادی ہوتی ہے اور داستان ختم ہو جاتی ہے۔

لوک کہانی۔کڈیم کڈاک:

ایک لڑکا تھا کڈیم کڈاک۔اسکی دادی بکریاں لیکر گرمائی چراگاہ (غاری) گئی ہوئی تھی۔لڑکا دادی جان سے ملنے جا رہا تھا راستے میں لومڑی ملی۔ لومڑی نے اس پر حملہ کیا مگر لڑکے نے کہا کہ میں غاری جا رہا ہوں۔گوشت، پنیر اور مکھن، دودھ دہی کھا کر موٹا ہو کر واپس آؤنگا۔اُس وقت مجھے مزے سے کھاؤ۔ آگے ایک بھیڑیا ملا، بھیڑیئے کے حملہ کیا کڈیم کڈاک نے پہلی بات دہرائی تھوڑی دور گیا تھا وہاں ریچھ آیا، اس کے حملے کے جواب میں کڈیم کڈاک نے پہلی بات دہرائی، پھر چیتا آیا، اسکو بھی کڈیم کڈاک نے اس بات پر قائل کیا۔آخیر میں شیر آیا اُسے کڈیم کڈاک اسی بات پر ٹرخا دیا۔گویا آنے کا وعدہ کر گئے جو آئے تھے خواب میں، غاری پہنچ کر کڈیم کڈاک نے کھان اپینا بند کر دیا۔پوچھنے پر سارا ماجرا بیان کیا۔دادی اماں نے کہا۔کھاؤ پیو، جان بناؤ اس بات کا علاج میرے پاس ہے۔اسکی پرواہ مت کرو۔چنانچہ چند ہفتے دادی اماں کے پاس رہ کر کڈیم کڈاک نے خوب جان بنایا۔جب واپسی کا وقت آیا تو دادی اماں نے کڈیم کڈاک کو مٹی کے ایک مٹکے میں بٹھا دیا۔اوپر سے ڈھکنا بند کیا اور اسکے دادا سے کہا کہ اسے اپنی پیٹھ پر گھر لے جاؤ راستے میں درندوں میں سے جو بھی پوچھے اسکو بتاؤ کہ میں کڈیم کڈاک کو نہیں جانتا مٹکے میں کھٹا ہے۔جسے اگر زمین پر ڈالا جائے تو زمین پر شگاف پڑ جائیگا۔پتھر پر ڈالا جائے، پتھر ریزہ ریزہ ہوگا۔ہاتھ پر ڈالا جائے تو ہاتھ پر چھالے پڑ جائینگے۔بوڑھا دادا جان غاری سے روانہ ہوا تو پہلے شیر آیا، شیر نے پوچھا کڈیم کڈاک کدھ گیا؟ بوڑھے نے جواب دیا میں کڈیم کڈاک کو نہیں جانتا شیر نے پوچھا مٹکے میں کیا ہے۔اُس نے کہا اس میں کھٹا ہے شیر نے کہا میری ہتھیلی پر



گھر کی دیوار پر بنائے گئے آرائشی نقش ونگار

ڈالدو، اس نے جواب دیا چھالے پڑ جائیں گے، شیر نے کہا پتھر پر ڈال دو، اس نے کہا ریزہ ریزہ ہو جائیگا۔ شیر نے کہا زمین پر ڈالو، اس نے جواب دیا شگاف پڑ جائیگا۔ آگے چیتا آیا۔ یہی گفتگو ہوئی آگے ریچھ آیا، یہی مکالمہ ہوا آگے بھیڑیا آیا اسی طرح کی بات ہوئی آگے لومڑی آئی ایسا ہی جواب ملا۔ گاؤں کے قریب پہنچ کر بوڑھے نے مٹکے کو زمین پر رکھا اور خود ستانے لگا۔ اتنے میں لومڑی نے پتھر مار کر مٹکے میں سوراخ کیا۔ سوراسے کڈیم کڈاک باہر آیا۔ اور لومڑی نے اُسے ایک خندق میں چھپا کر خرگوش کو خندق کے اوپر پہرہ بٹھادیا۔ دادا جان نے مٹکا اٹھایا تو وہ خالی تھا۔ وہ مایوس اور افسردہ ہو کر گھر چلا گیا۔ کڈیم کڈاک نے خندق سے باہر آ کر خرگوش کو مارا اور بھاگ کر اپنے گھر پہنچ گیا۔ یوں اُسے کوئی گزند نہیں پہنچی۔

یورمس بی بی:

یورمس بی بی چترال کا ایک لازوال رومان ہے۔ یہ سینکڑوں رومانی کہانیوں میں سے ایک ہے۔ اس رومان کا مرکزی کردار شہزادہ مرید دستگیر امان الملک مہتر چترال کا بیٹا تھا۔ 1842 میں پیدا ہوا، 1892 میں خانہ جنگی کے دوران مارا گیا۔ انداہتی لٹکوہ میں انکی جاگیر تھی۔ شغور لٹکوہ کا قلعہ بھی انکی نگرانی میں ہوتا تھا۔ یہ دونوں مقامات گرم چشمہ کے راستے پر ایک دوسرے سے چار کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہیں۔ یورمس بی بی شغور کی ایک حسینہ تھی۔ مرید دستگیر اس پر فریفتہ تھا۔ اور رات دن اس کے تصور میں ڈوبا رہتا تھا۔ یورمس بی بی کا تعلق علاقے کے ایک غریب خاندان سے تھا۔ وہ سرو قد تھی۔ اور لب ورخسار کے ساتھ چشم وگلو کے حُسن عالمتاب سے اسکو وافر حصہ تھا۔ ذہانت میں یکتا اور ہنرمندی میں بے مثال تھای۔ خواتین اس زمانے میں رقص کرتی تھیں۔ وہ جب رقص کرتی تو محفل پر وجد طاری ہوتی تھی۔ مرید دستگیر نے اس کے عشق میں اپنا سب کچھ داؤ پر لگا دیا۔ باپ طاقتور حکمران تھا جس نے ۳۸ سال حکومت کی لیکن مرید نے باپ کی حکومت سے فائدہ نہیں اٹھایا۔ اپنے اثر ورسوخ سے کام نہیں لیا۔ ایک طرف بشگال اور اسمار کی جنگی مہموں میں داد شجاعت دیتا رہا۔ دوسری طرف یورمس بی بی کے دل میں جگہ کرنیکی کوشش کرتا رہا۔ یورمس بی بی کے ماں باپ تک اپنا پیغام پہنچایا مگر اسکی منگنی اسکی پیدائش کے وقت ہوگئی تھی۔ یورمس بی بی کا ہاتھ جس کے ہاتھ میں دیا جانے والا تھا وہ غیر معروف بچہ تھا جبکہ یورمس بی بی بھی مرید دستگیر کو دل دیکر خود کو اس آگ میں جھونکنے کا جُوا کھیل چکی تھی۔ ایک بڑھیا خوشرنگت مرید اور یورمس بی بی کے درمیان نامہ وپیام کا کام کرتی تھی۔ خوشرنگ مرید کے مرنے کے بعد کئی سال زندہ رہی۔ اس کا کہنا تھا کہ مرید بولہوس نہیں تھا اس کا عشق صادق تھا کئی ایسے مواقع آئے کہ یورمس بی بی کے وصل کی گھڑیاں آگئیں لیکن مرید دامن بچاتا رہا۔ وہ اپنی محبوبہ کو دستور کے مطابق اپنا بنا کر اپنی دُنیا میں روشنی لانا چاہتا تھا۔ دستور سے ہٹ کر ایک

قدم بھی اسکو گوارا نہیں تھا۔ خوشرنگ کا کہنا تھا کہ ایک بار مہتر نے اسکی سرزنش کی سخت سُست کہا۔ اور جاگیر واپس لینے کی دھمکی دی۔ مرید دستگیر نے باپ کے سامنے صرف رونے پر اکتفا کیا اور کچھ نہیں کہا۔ خاندان کی بزرگ خواتین نے مہتر سے التجا کی کہ مرید اپنی ذمہ داریوں میں کوتاہی نہیں کرتا بدنامی کا باعث نہیں بنتا، اور اسکے بے لوث عشق کے بارے میں سب کو معلوم ہے۔ بات کو آگے نہ بڑھایا جائے اسی طرح خاندان کی بااثر خواتین کے توسط سے مرید نے خود کو بھی اور اپنی محبوبہ اور انکے ماں باپ کو بھی مہتر کے غیظ وغضب سے بچایا۔ خوش رنگ کا کہنا تھا کہ ایک بار مرید نے اپنے لمبے اور گھنے زلفوں سے ایک بال لیکر لونگ اور چاول کے دانے کے ساتھ یورمس بی بی کو بھیجا۔ یورمس بی بی نے بال کو اٹھا کر اس میں مجبوط گرہ لگائی۔ اسے شہد کی مکھی کے ساتھ ایک پوٹلی میں باندھ کر واپس کیا۔ ایک دفعہ مرید نے لمبے سفر سے آتے ہی کوشرنگ کو بلایا۔ اور پھول کے ساتھ پیاز اور سوئی کو پوٹلی میں باندھ کر محبوبہ کو ارسال کیا۔ یورمس بی بی نے اس کے جواب میں صرف ایک گیلا رومال واپس بھیجدیا جس سے لونگ کی خوشبو آرہی تھی۔ دستور کے مطابق یورمس بی بی کی رخصتی کا وقت آیا۔ اور رخصتی ہوگئی۔ دل سے ایک دوسرے کو چاہنے والے ہمیشہ کیلئے جدا ہو گئے گاؤں کے لوگ اس بات پر حیران تھے کہ مرید اب کیا کرے گا۔ مرید نے کچھ بھی نہیں کیا۔ رخصتی سے تین دن پہلے جب یورمس بی بی دلہن بنی تو اس نے خوشرنگ کے ذریعے کچ (دیسی ریشم) اور اپنی زلفوں کے دو بال لیکر انہیں اُلجھایا اور گڈمڈ کر کے ایک پوٹلی میں باندھ کر مرید کو بھیجدیا۔ رید نے دو دن انتظار کرایا اور تیسرے دن مکھن کیساتھ مکھی اور اخروٹ کا ایک دانہ یورمس بی بی کو بھجوایا۔ اس طرح یہ یورمس بی بی کے نام مرید کا آخری پیغام تھا۔ مرید کا کلام لوک ادب و ثقافت میں اب تک سینہ بہ سینہ چلا آرہا ہے۔ اسے گایا جاتا ہے۔ اسکی دھن بہت پُر سوز ہے۔ اور کہا جاتا ہے کہ دُھن بھی مرید نے خود بنائی ہے گیت کے چند بول اسطرح ہیں،

مشغورو گازومہ بلبل یوو گوئے

ایہ مولوڑے کی بوئیکرہ یوو دوئے

ترجمہ۔ مشغور کے سبزہ زار میں میری محبوبہ قدم رکھیگی۔ میری جان نظر اٹھا کر اوپر مت دیکھو پرندے بیہوش ہوکر گر جائینگے۔

یورمست بی بی اے نصیب ہموش ہوئے

نصیبو کورموکیانی کورین بوئے

ترجمہ۔ اے یورمس بی بی، قسمت کا یہ حال ہے قسمت کے سامنے کسی کا کیا بس چلتا ہے۔؟

رویان بیری مونسورے بیری گانا گانی

یورمس بی بیو کیڑے گئی اوانی

ترجمہ۔ باہر مست نکلو، آندھی چل رہی ہے طوفان آرہا ہے، یورمس بی بی کی رخصتی ہورہی ہے۔ اور وہ روتی ہوئی بابل گھر سے جارہی ہے۔

مہ تت متے ران دورتے بش نوکوم

مہ دوست متے بائی تہ جزیرو کیہ کوم

ترجمہ۔ میرا باپ کہتا ہے تجھے جاگیر نہیں دونگا مجھے میری محبوبہ چاہیے، جاگیر لیکر میں کیا کرونگا۔

شاشارتوری انداہتیاری موڑی

اواوتیتام نہ کتابان موڑی

شغور کی گرد ونواح کے لوگو! میں تمہیں مقدس کتابوں کا واسطہ دیتا ہوں، (مجھے ملامت کی نگاہ سے مت دیکھو)

تکان بچھڑے چھرتہ پازو گوئے

ڈوریناؤ مگس چھیر دسوری گوئے

ترجمہ۔ میرے محبوب، بٹن کھولو گے تو سینے پر دودھ کی نہر بہتی نظر آئیگی۔ رقیب کی مثال دودھ پر بھنبناتی مکھی جیسی ہے۔

محمد حسن حسرت:

7 ستمبر 1955 سکردو کے گاؤں سندوس میں پیدا ہوئے۔

کراچی یونیورسٹی سے علوم اسلامی میں ایم اے کیا۔

مختلف سرکاری محکموں میں خدمات سرانجام دیں۔

آجکل علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی کے علاقائی دفتر سکردو میں بحیثیت اسسٹنٹ ریجنل ڈائریکٹر فرائض انجام دے رہے ہیں۔

شاعری، تحقیق، ادب اور ڈرامہ نگاری آپ کے شعبے ہیں۔ ریڈیو پاکستان سکردو کے ڈرامہ فیسٹول میں ان کا ڈرامہ ''لینگ پُل'' کو بہترین ڈرامہ کا ایوارڈ دیا گیا۔

بلتستان کی ثقافت، زبان وادب ان کی تحقیق کا خاص محور ہے۔ اس حوالے سے بے شمار مضامین لکھ چکے ہیں۔

برن یونیورسٹی سوئٹزرلینڈ میں آپ کے مقالے کو سراہا گیا۔

آپ کی درج ذیل کتابیں شائع ہو چکی ہیں، (۱) تاریخ ادبیات بلتستان (۲) بلتستان تہذیب وثقافت (۳) شملہ سے بلتستان (۴) پولو، بلتستان کا قومی کھیل۔

اس کے علاوہ آپ کے تحقیقی مقالے ''بلتستان زبان وادب'' کو علامہ اقبال یونیورسٹی کے ایم فل کے نصاب پاکستانی زبانیں میں شامل کیا جا چکا ہے۔ مختلف ادبی وثقافتی تنظیموں کے سرگرم رکن ہیں۔

ڈاکٹر عنایت اللہ فیضی:

شمالی علاقہ جات خاص طور پر چترال کے حوالے سے ڈاکٹر عنایت اللہ فیضی کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں۔
درس وتدریس ان کا شعبہ ہے اور طویل عرصے سے گورنمنٹ کالج بونی چترال میں تدریس کے فرائض سرانجام دے رہے ہیں۔
پاکستان کے شمالی علاقوں کی ثقافت، زبان وادب پر گہری نظر رکھتے ہیں۔ خاص طور پر چترال اور ملحقہ علاقوں کی ثقافت کو متعارف کرانے اور کھوار زبان کی ترقی کے حوالے سے آپ کی بے پایاں خدمات ہیں۔
فیضی صاحب آئی یو سی این چترال سے بھی وابستہ رہے اور تحفظ ماحول کے حوالے سے قابل قدر قلمی خدمات سرانجام دیں۔
زبان وادب اور ثقافت کے حوالے سے بے شمار مضامین اور مقالہ جات کے مصنف ہیں جنہیں مختلف ملکی اور غیر ملکی ثقافتی سیمنارز میں پیش کر چکے ہیں۔
چترال کے ثقافتی جائزے کے حوالے سے ان کی ایک کتاب ''چترال'' لوک ورثہ کے تحت شائع ہو چکی ہے۔

جمشید خان دکھی:

5، جون 1956ء کو گلگت میں پیدا ہوئے۔

جامعہ کراچی سے گریجویشن کیا۔

اردو اور شنا زبان میں شاعری کے علاوہ کالم نگاری اور ثقافت کے حوالے سے تحقیقی کام کرتے ہیں۔

حلقہ ارباب ذوق گلگت کے سیکریٹری جنرل اور گلگت سیٹیزن فورم کے چیئرمین ہیں۔

ثقافت، زبان وادب کے حوالے سے بے شمار مضامین اور مقالہ جات لکھ چکے ہیں۔

بہترین کالم نگاری پر ہفت روزہ ''کے ٹو'' شمالی علاقہ جات کی جانب سے 2001ء کا کے ٹو ایوارڈ ملا۔

شیر باز علی خان برچہ:

4، اپریل 1954ء کو موضع حسن آباد ہنزہ میں پیدا ہوئے۔

ابتدائی تعلیم گلگت میں حاصل کی۔ گارڈن کالج راولپنڈی سے گریجویشن کیا۔

ریڈیو پاکستان راولپنڈی میں شناء اناؤنسر اور نیوز ٹرانسلیٹر کے طور پر کام کیا۔

آجکل پبلک لائبریری گلگت میں بطور سینئر لائبریرین خدمات سرانجام دے رہے ہیں۔

تحقیق، زبان وادب اور ثقافت خصوصی دلچسپی کے میدان ہیں۔

بروشسکی زبان وادب کے حوالے سے آپ کا مقالہ علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی کے ایم فل کے نصاب میں شامل کیا گیا ہے۔

درج ذیل کتابیں شائع ہو چکی ہیں (۱) گلگت 1947ء سے پہلے (۲) تذکرہ اہل علم وشعرائے گلگت (۳) خودنوشت سوانح عمری سر محمد نظیم خان جبکہ (۱) دائرہ معارف گلگت بلتستان اور (۲) گلگت 1877 تا 1935 زیر طبع ہیں۔

مآخذات وکتابیات

مآخذات حصہ شنا (صفحہ 1 تا 158)

عثمان علی پروفیسر — خطہ قراقرم، 1996، صفحہ 104 ,101 ,15

غلام رسول — جنگل کے باسی، (جدید ایڈیشن) 1997 صفحہ 5 تا 10۔

محمد اشرف بٹھی — بلورستان، مضمون ''شمالی علاقہ جات ایک جائزہ'' 1982۔

امداد علی خان — Proosed Protected Areas Game Reserves in NAs. جون 2002ء

دانی، پروفیسر احمد حسن — History of NAs, of Pakistan 1989 صفحہ 24، 25، 93، 498

ایم۔ ناموس، ڈاکٹر — (i) ''شنا: بان'' 1961 صفحہ 31-30
Linguistic MAP of Shina (ii)

برچہ شیر باز علی خان — مضمون ''سئی جگلوٹ'' اہفت روزہ اخبار ''شمال'' تاریخ 30/03/03 تا 05/04/03 چیف ایڈیٹر ظفر حیات پال

شاد محمد حسن — غیر مطبوعہ مقالہ بعنوان ''گلگت تاریخ اور ثقافت'' 1972ء صفحہ 2، 3

حشمت اللہ — ''تاریخ جموں'' 1936ء ص، 678، 681 تا 699

شاہ رئیس خان — ''تاریخ گلگت'' 1987ء ص: 2، 4، 13، 18، 27، 29، 44

جون بڈلف — ''ہندوکش کے قبائل'' اردو ترجمہ 1991ء ص 35

سیکریٹری، حفیظ الرحمٰن — مضمون: ''قانون ساز کونسل شمالی علاقہ جات کا تاریخی پس منظر'' شائع شدہ ہفت روزہ ''وادی'' 15/11/2001 تا 9/11/2001

ناموس، ڈاکٹر — ''گلگت اور شنا زبان'' 1961ء ص 41, 62, 65, 88 نقشہ صفحہ 3/2 کے درمیان

حسن دانی — "History of NAs," ص 164 تا 168، 236

عثمان علی، پروفیسر — (۱) '' شنالوجی'' 1991ء ص: 135 (۲) '' گلگت کی روگ کہانی'' 1992 ص 22 تا 44، 223۔ (۳) ''قراقرم کے قبائل'' 2000ء ص 209 تا 225، 507

سکندر خان، کاچو — قدیم لداخ، 1987، لیہ لداخ، ص 63

پنجاب یونیورسٹی — مضمون بعنوان ''شنا زبان وادب'' از محمد اشرف علیگ ''کتاب'' تاریخ ادبیات'' مسلمانان پاکستان وہند (جلد دوئم)'' 1971ء صفحہ 32, 38, 39 تا 41

لٹنر جی۔ ڈبلیو — ''دردستان 1866، 1886 اور 1893 میں'' 1889، ص: 16، 22

سر تاج خان — ''آئینہ دیامر'' 1992ء ص: 136

خان امان اللہ — ''جہد مسلسل'' 1992ء صفحہ 204 تا 208

منظوم علی پروفیسر ''قراقرم ہندوکش'' 1985ء صفحہ 513 تا 525

ناموس ڈاکٹر ''گلگت اور شنا زبان'' 1961ء صفحہ 46 تا 51 صفحہ 79 تا 83، 90

جان بڈلف ''ہندوکش کے قبائل'' اردو ترجمہ 1991ء (جاوید شاہین) صفحہ: 53 تا 60

عثمان علی، پروفیسر ''قراقرم کے قبائل'' 2000ء صفحہ 98، 99، 101، 122، 123، 134، 135، 275، 363، 368، 397، 398، 400، 404، 406، 420، 424، 431، 432، 434، 452، 459، 460، 462، 495، 502، 503، 532، 534، 544، 545، 550، 551، 557، 558،

رازوال کوہستانی ''انڈس کوہستان'' 1998ء صفحہ 20، 21

پنجاب یونیورسٹی ''تاریخ ادبیات'' جلد دوم، چودھویں جلد، 1971ء ص: 137

سرتاج خان ''آئینہ دیامر'' 1992ء مضمون ''خونی پہاڑ'' از پروفیسر میر عبدالخالق

ناموس ڈاکٹر ''گلگت اور شنا زبان'' 1961ء صفحہ 20، 21، 24، 25، 26، 27، 28، 29، 33، 35، 37، 41، 42، 43، 44،

طارق، خوشی محمد بذریعہ انٹرویو 03/04/2004

شمالی، عنایت اللہ بذریعہ انٹرویو 05/04/2004

منظوم علی، پروفیسر (۱)۔ ''بلورستان'' 1982ء مضمون از حمید خاور، صفحہ 23، 24

(۲)۔ ''قراقرم ہندوکش'' 1985ء صفحہ 158، 185

اسعد محمد سعید ''گلگت بلتستان، تاریخی و آئینی حیثیت'' 2004ء صفحہ 31، 152

یحییٰ شاہ سید بذریعہ انٹرویو

سلیم بیگ نمبردار، حراموش انٹرویو اگست 2002ء

خوش گل، گاکوچ غذر انٹرویو اگست 2002ء

زوجۂ حاجی بختاور، کشروٹ انٹرویو اگست 2002ء

زوجۂ حاجی محمد یوسف، کشروٹ انٹرویو اگست 2002ء

شمس الرحمٰن، داریل انٹرویو اگست 2002ء

طارق خوشی محمد، منیمرگ انٹرویو اگست 2002ء

بشیر احمد، (RFO) انٹرویو اگست 2002ء

فقیر شاہ ضدی، چھپروٹ نگر	انٹرویو اگست 2002ء
کریم خان، نومل	انٹرویو 31 دسمبر 2002ء
غلام رسول	''آیئے! درخت اگائیں'' 2003ء صفحہ 58 تا 61
لٹنر، جی، ڈبلیو	''دردستان 1866، 1886 اور 1893ء میں'' صفحہ 38، 39
ناموس ڈاکٹر	''گلگت اور شناز بان'' 1961ء صفحہ 439، 440
انجم شیخ غلام حسین	کتاب ''زندگی کی بارات'' 1995ء صفحہ 39,40,42
غلام محمد	''فیسٹیولز اینڈ فوک لور آف گلگت'' 1980ء صفحہ نمبر 30, 35, 38, 61, 62, 63, 64, 65, 66
لوری مرکرنل	''گلگت، یاسین اینڈ چترال'' صفحہ 17, 18, 55, 56
علاؤالدین صدیقی، پروفیسر	مدیر اعلیٰ ''تاریخ ادبیاتِ مسلمانانِ پاکستان و ہند'' 1971ء مضمون ''شناز بان و ادب'' از وزیر اشرف علیگ صفحہ نمبر 32
سید محمد یحییٰ شاہ، برچہ شیر باز علی، حسرت	''بروشال'' مضمون ''سپیا تھے نہ تھے'' صفحہ نمبر 17
محمد حسن، حسرت	
باہتمام حاجت امان	''گلزارِ ملنگ جان'' دیباچہ و تعارف از فضل الرحمٰن عالمگیر صفحہ 2 تا 8
منظوم علی، پروفیسر	''بلورستان'' مضمون ''شناشاعری - ایک جائزہ'' از فضل الرحمٰن عالمگیر صفحہ نمبر 182
سلیمی، احمد سلیم	بذریعہ انٹرویو 31 دسمبر 2002ء
خطیب، لقمان حکیم	انٹرویو 8 جنوری 2003ء
سخی اکبر گلاپور	انٹرویو 9 جنوری 2003ء
تاج، عبدالخالق	''شناز بان و ادب'' 1999ء صفحہ 98, 97
استوری، سید عالم	''شمالی علاقہ جات میں اردو'' 1991ء صفحہ 67 تا 70
عثمان علی، پروفیسر	''خطہ قراقرم'' 1996ء صفحہ 90, 89, 88
شمالی، عنایت اللہ	انٹرویو 31 دسمبر 2002ء
اخبار	ا۔ ہفت روزہ کشیر، از 14 تا 20 جنوری 2003ء مضمون از ''منظر حسن شگری''
	۲۔ انٹرویو منور خان صدر پربت سوشل ویلفیئر ایسوسی ایشن
ملنگ عبداللہ	بذریعہ انٹرویو 2004-03-30 بعنوان محبت کی کہانی حراموش
شکیل احمد شکیل	''ددی ہَی شلوکے'' 2001 صفحہ 36 تا 47

ایم۔ناموس ڈاکٹر	''گلگت اور شنا زبان'' 1961ء صفحہ 25,26
منظوم علی، پروفیسر	1۔''بلورستان'' 1981ء مضمون از احمد سعید خان طاہر خیلی صفحہ 148 ,147
	2۔مضمون از سلطان ولی ماہر زراعت صفحہ 136
	3۔''قراقرم ہندوکش'' 1985ء مضمون از ڈاکٹر میکی میلن 182
عثمان علی، پروفیسر	''قراقرم کے قبائل'' 2000ء صفحہ 36,42,245,247,248,386,494,495
جان بڈلف، کرنل	1۔ ''ہندوکش کے قبائل'' 1991ء صفحہ 37, 61, 62, 63, 99 (اردو ترجمہ جاوید شاہین)
سید محمد یحیٰ شاہ، برچہ، شیر باز علی، حسرت، محمد حسن،	''بروشال'' مضمون ''یاک'' از ڈاکٹر فرمان علی، وزیر حسن صفحہ 76
غلام محمد	''فیسٹیولز اینڈ فوک لو آف گلگت'' 1980ء صفحہ 4
عثمان علی، پروفیسر	''گلگت کی روگ کہانی'' 1992ء صفحہ 93, 94
حشمت اللہ خان الحاج	''تاریخ جموں'' 1937ء، صفحہ 790
یحیٰی شاہ، سید	''شین برگشپر کی نگر، چے سر گشپر کی نگر، موضع جگلوٹ نومل۔ ایک عمرانی، جغرافیائی اور معاشرتی تجزیہ'' 1989ء صفحہ 85،86

استوری، محمد شفیع	''نگا پربت کی گمنام وادیاں'' 2002ء صفحہ 71, 72
دانی، ڈاکٹر اے ایچ وکو	''ہسٹری آف ناردرن ایریاز'' 1989ء صفحہ 24, 25
غلام رسول، حاجی	بذریعہ انٹرویو 16 مئی 2003ء
شاد، محمد حسن	غیر مطبوعہ مقالہ بعنوان ''گلگت، تاریخ و ثقافت'' 1972ء
ناموس ڈاکٹر	''گلگت اور شنا زبان'' 1961ء، صفحہ 72,73
غلام رسول حاجی	شمالی علاقوں میں جنگلی حیات کی تاریخ 1997ء ''جنگل کے باسی'' جدید ایڈیشن
لٹر جی۔ڈبلیو	''دردستان 1866، 1886 اور 1893 میں'' 1889ء، صفحہ 31
کوہستانی راز ول	''انڈس کوہستان'' 1998ء، صفحہ 69
جعفری سید بشیر حسین	''زندہ باد'' 2003ء، صفحہ 98،99
اوصاف اسلام آباد	روزنامہ اخبار مورخہ 10 ستمبر 2003ء میگزین رپورٹ
سید یحیٰی شاہ	''دنیل تہذیب و تمدن'' 1989ء، صفحہ 2،3
عثمان علی پروفیسر	''شنالوجی'' 1991ء صفحہ 64 تا 68، 87، 91 تا 94
یحیٰی شاہ سید	''شین برگشپر کی نگر، چے سر گشپر کی نگر، موضع جگلوٹ نومل۔ ایک عمرانی، جغرافیائی اور معاشرتی تجزیہ'' 1989ء صفحہ 47 تا 49
استوری محمد شفیع	''نگا پربت کی گمنام وادیاں'' 2002ء صفحہ 156 تا 163

قاسم عباس زیدی علی احمد جان ''آرٹیکچرل ہیریٹیج آف گلگت بلتستان اینڈ دیامر'' 1983ء تھیسس رپورٹ

عبدالحفیظ بذریعہ انٹرویو

عثمان علی، پروفیسر (1) ''شنالوجی'' 1991ء صفحہ: 122، 125، 126

(2) ''خطہ قراقرم'' 1996ء صفحہ: 41 تا 48

پنجاب یونیورسٹی لاہور ''تاریخ ادبیات پاکستان و ہند'' (چودھویں جلد) 1971ء مضمون

''شنا زبان کا لسانی جائزہ'' از وزیر محمد خان اشرف علیگ، ص: 29 تا 50

منظوم علی پروفیسر (ا)۔ ''بلورستان'' 1982ء مضمون از عبدالحمید خاور صفحہ 26

(۲)۔ ''بلورستان'' 1982ء مضمون از فضل الرحمان عالمگیر صفحہ 180

منظوم علی پروفیسر ''قراقرم ہندوکش'' 1985ء مضمون از فضل الرحمان عالمگیر صفحہ 734 تا 742

ملنگ عبداللہ بذریعہ انٹرویو 31-03-2004 بعنوان برانگئے / گریا گائے

قیصر محبت علی ''بیاضِ غم'' 2004ء صفحہ 98

یحییٰ شاہ سید ''سین برگشپور کی نگر، چے سرگشپور کی نگر، موضع جگلوٹ نول ایک عمرانی، جغرافیائی، تاریخی اور معاشرتی تجزیہ'' 1989ء صفحہ 65، 84

منتظر حسن بذریعہ انٹرویو 25 اپریل 2004ء

پنجاب یونیورسٹی ''تاریخ ادبیات'' (چودھویں جلد) 1971ء صفحہ 147 ,31 ,30

جان بڈلف ''ٹرائبز آف ہندوکش'' 1986ء صفحہ 99

ماہنامہ کرگل بابت ماہ اگست/ستمبر 2003ء صفحہ 26 ,25

ضدی، فقیر شاہ چھپروٹ بذریعہ انٹرویو 9 اکتوبر 2003ء

سید قاسم محمود ''اسلامی انسائیکلوپیڈیا'' 2000ء صفحہ 890

عثمان علی پروفیسر ''قراقرم کے قبائل'' 2000ء صفحہ 281، 282، 511، 513، 544

جان بڈلف کرنل (ا)۔ ''ہندوکش کے قبائل'' اردو ترجمہ جاوید شاہین 1991ء صفحہ 135 تا 140

(۲)۔ ''ٹرائبز آف ہندوکش'' (انگریزی) صفحہ 103

شاد محمد حسن ''غیر مطبوعہ مقالہ بعنوان ''گلگت تاریخ اور ثقافت'' 1972ء صفحہ 31، 32، 36، 37، 40، 41

کریم خان، نول بذریعہ انٹرویو دسمبر 2002ء

غلام محمد ''فیسٹیول اینڈ فوک لور آف گلگت'' 1980ء صفحہ 5، 6، 7، 9، 10

استوری محمد شفیع ''نگاپربت کی گمنام وادیاں'' 2002ء صفحہ 59، 60

عثمان علی پروفیسر ''شنالوجی'' 1991ء صفحہ 58، 63

منظوم علی پروفیسر ''قراقرم ہندوکش'' 1985ء صفحہ 243 تا 257 مضمون محمد اکرم خان

جان بڈلف، کرنل ا۔ ''ہندوکش کے قبائل'' (اردو ترجمہ جاوید شاہین) 1991ء
صفحہ 105 تا 156

۲۔ ''ٹرائبز آف ہندوکش'' (انگریزی) صفحہ 87، 103

نوبل، کریم خان انٹرویو 31 دسمبر 2002ء

غلام محمد ''فیسٹیول اینڈ فوک لور آف گلگت'' 1980ء صفحہ 5 تا 7، 11، 12، 14، 19، 34

استوری، محمد شفیع ''نگا پربت کی گمنام وادیاں'' 2002ء صفحہ 57 تا 65

منظوم علی پروفیسر ''قراقرم ہندوکش'' 1985 مضمون بعنوان ''شمالی علاقوں کے چند تہوار اور رسم و رواج'' از
محمد اکرم خان، ص: 247,248، 252,253,254

عثمان علی پروفیسر ''خطہ قراقرم'' 1996ء صفحہ 110

انجم غلام حسین ''زندگی کی بارات'' 1995ء صفحہ 55,56,57

یحییٰ شاہ سید ''شین برگشپر کی نگر، چے سر گشپر کی نگر، موضع جگلوٹ نوبل۔ ایک عمرانی، جغرافیائی اور
معاشرتی تجزیہ'' 1989ء صفحہ: 39، 85، 86، 99

اورینٹل بک سوسائٹی لاہور ''پاپولر آکسفورڈ ڈکشنری اردو ٹو انگلش'' صفحہ 227 برائے چھوپ

خان، سر تاج ''آئینہ دیامر 1992ء صفحہ 139, 140, 205, 206, 207

حشمت اللہ خان الحاج ''تاریخ جموں'' 1937ء صفحہ 791

جیٹ مار، کارل ''بلور اینڈ دردستان'' ری پرنٹ 1980ء صفحہ 62,63

محمد حسن شاد غیر مطبوعہ مقالہ بعنوان ''گلگت، تاریخ و ثقافت'' 1972ء صفحہ 20، 33 تا 41،
47، 48، 75، 80

یحییٰ شاہ سید وغیرہ بروشال'' مضمون ''یاک'' از ڈاکٹر فرمان علی، وزیر حسن صفحہ 76

پنجاب یونیورسٹی ''تاریخ ادبیات مسلمانانِ پاک و ہند'' مضمون ''شنا زبان و ادب'' 1971ء
صفحہ 25، 41، 42

عثمان علی پروفیسر ا۔ ''گلگت کی روگ کہانی'' 1992ء صفحہ 96

۲۔ ''خطۂ قراقرم'' 1996ء صفحہ 109 تا 117

شمالی عنایت اللہ خان انٹرویو 21 دسمبر 2002ء

خان بگورو، محمد عالم انٹرویو 24 دسمبر 2002ء

منظوم علی، پروفیسر ''بلورستان'' 1982ء صفحہ 171

عبدالحفیظ کھر گلگت — انٹرویو 4 جنوری 2003ء

لٹنر، جی، ڈبلیو — ''دردستان 1866، 1886 اور 1893 میں'' 1893ء
صفحہ 14,15,16,38,39,40,45,46,47,48,49

ملنگ، عبداللہ، خاموش (گلگت) — ''شادی کے گانوں کے نمونے'' اور ''شاپ'' بذریعہ انٹرویو 23 جنوری 2003ء

غلام محمد — ''فیسٹیولز اینڈ فوک لور آف گلگت'' 1980ء 36،35،22,23,26,27

استوری محمد شفیع — ''نگاپربت کی گمنام وادیاں'' 2002ء صفحہ 55،56،87 تا 91

غلام رسول — ''میڈیسنل پلانٹس آف ناردرن ایریاز'' 1998ء

لقمان حکیم، مولانا — انٹرویو ''قصہ پری'' جون 2003ء

شمالی، عنایت اللہ — انٹرویو جون 2003ء

بگورو محمد عالم — انٹرویو جون 2003ء

زوجہ بخاور خان — انٹرویو جون 2003ء

رحیم شاہ گاکوچ — انٹرویو جون 2003ء

صلاح الدین بارگو — انٹرویو جون 2003ء

S.D.F.O محمد افضل — انٹرویو 13 جون 2003ء

شاد، محمد حسن — غیر مطبوعہ مضمون ''گلگت تاریخ اور ثقافت'' 1972ء صفحہ 49, 50

جان بڈلف — ''ہندوکش کے قبائل'' اردو ترجمہ جاوید شاہین 1991ء صفحہ نمبر 125

احسان علی ڈاکٹر — بذریعہ انٹرویو 13 جولائی 2003

شاد، غلام مرتضیٰ نگری — مضمون ہفتہ روزہ اخبار ''کشیر'' بعنوان ''نگر برف پوش وادیوں اور جواہرات کا دیس'' از 14/01/03 تا 20/01/03

طارق، خوشی محمد — بذریعہ انٹرویو جون 2003ء

لٹنر، جی، ڈبلیو — ''دردستان 1866ء، 1886ء اور 1893ء میں'' صفحہ 5,6

محمد یحییٰ شاہ، سید — (۱)۔ ''دیئل، تہذیب وتمدن'' حصہ دوم 1989ء، صفحہ 3،6،7،8،9،10،12،13،14، 15،16،17،20،21،22،23 اور 45۔
(۲)۔ ''شین برگشپر کی نگر، چے سر گشپر کی نگر، موضع جگلوٹ نول۔ ایک عمرانی، جغرافیائی اور معاشرتی تجزیہ'' 1989ء صفحہ 79،80،87۔

جیٹ مار، کارل — ''بلور اینڈ دردستان'' ری پرنٹ 1980ء صفحہ 62,63

روزنامہ اخبار — ''اوصاف'' سنڈے میگزین 03-12-07 صفحہ 15,29

عثمان علی، پروفیسر — ''خطہ قراقرم'' 1996ء صفحہ 102,103,105,106,107

منظوم علی، پروفیسر ''بلورستان'' 1982ء مضمون دیئل، مترجم ڈاکٹر ہدایت علی، صفحہ 231

رائینہ عالم انٹرویو بذریعہ مسز جمشید و مسز جمیل گلگت مورخہ 2003-12-14

پنجاب یونیورسٹی لاہور ''تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند'' جلد دوم 1971ء صفحہ 23

انصارالدین مدنی بذریعہ انٹرویو ازکاہنہ مسماۃ ''سیدہ'' ناول جگلوٹ۔

ملنگ عبداللہ بذریعہ انٹرویو 2004-03-30 بابت دیئل گوٹی۔

جان بڈلف۔ ''ہندوکش کے قبائل'' اردو ترجمہ از جاوید شاہین 1991ء صفحہ :115

شاد، محمد حسن غیر مطبوعہ مجموعہ ''گلگت تاریخ اور ثقافت'' 1972ء صفحہ:73

منظوم علی پروفیسر ''قراقرم ہندوکش'' 1985ء صفحہ:735-734

منظوم علی پروفیسر ''بلورستان'' 1982ء صفحہ:25، 26

پنجاب یونیورسٹی ''تاریخ ادبیات'' چودھویں جلد 1971ء صفحہ:25، 26، 32، 116

لٹنر، GW ''دردستان 1866، 1886 اور 1893ء میں'' 1889ء صفحہ:36، 37، 38

شگری محمد یوسف ''پولو'' 2001ء صفحہ:23، 24

جان علی بذریعہ انٹرویو، 26/07/03

علی گوہر نگر شہنائی نواز بذریعہ انٹرویو 14/09/03

تاج عبدالخالق بذریعہ انٹرویو 12/09/03

محمد یحییٰ شاہ سید ''دیئل تہذیب و تمدن'' 1989ء صفحہ:2 و بذریعہ انٹرویو

رینجر امیر حمزہ بذریعہ انٹرویو 17/09/03

مطرب غلام کریم بذریعہ انٹرویو 01/10/03

عبدالرازق بذریعہ انٹرویو 02/10/03

ضیاء محمد امین بذریعہ انٹرویو 31/12/03

انجم شیخ غلام حسین بذریعہ انٹرویو 13/01/04

پنجاب یونیورسٹی لاہور ''تاریخ ادبیات مسلمانانِ پاک و ہند'' جلد:14، 1971ء صفحہ نمبر 26

عثمان علی پروفیسر ۱۔ ''شنالوجی'' 1991ء، صفحہ نمبر 76, 75

۲۔ ''خطہ قراقرم'' 1996ء صفحہ 119 تا 132

یحییٰ شاہ سید، برچہ شیر باز خان، حسرت محمد حسن ''بروشال'' صفحہ 54, 14,15,16

عابد بیگ انٹرویو 29 جنوری 2003ء

ملنگ عبداللہ انٹرویو 23 جنوری 2003ء

غلام رسول	ا۔ ''جنگل کے باسی'' صفحہ 25, 26, 27 ۲۔ ''جنگل کے باسی'' ترمیم شدہ ایڈیشن 1998ء 17 تا 32
یحییٰ شاہ سید، برچہ شیر باز خان، حسرت محمد حسن	ا۔ ''بروشال'' مضمون بعنوان ''شمالی علاقوں میں شکاریات کی قدیم روایات'' از حاجی غلام رسول صفحہ 62 تا 73
یحییٰ شاہ سید، برچہ شیر باز خان، حسرت محمد حسن	''بروشال'' مضمون بعنوان ''گدھ کی سواری'' از یحییٰ شاہ صفحہ 14 تا 16
عثمان علی پروفیسر	''خطۂ قراقرم'' 1996ء، صفحہ 119 تا 132
صدیقی جمال حیدر	مضمون بعنوان ''شندور میں تاریخی پولو ٹورنامنٹ'' شائع شدہ روزنامہ اوصاف میگزین اسلام آباد مورخہ 03-07-06
شاہ رئیس خان	''تاریخ گلگت'' 1987ء صفحہ 259، 260
یحییٰ شاہ سید	''شین برگشپر کی نگر، چے سرگشپر کی نگر، موضع جگلوٹ نومل۔ ایک عمرانی، جغرافیائی اور معاشرتی تجزیہ'' 1989ء صفحہ: 95
اے۔ براؤن ولیئم	''دی گلگت ریبی لیئن 1947ء'' صفحہ 12 تا 16
زائر، محمد ابراہیم	''جلوۂ شمال'' 1999ء صفحہ 261
حسرت، محمد حسن	''پولو، بلتستان کا قومی کھیل'' 2003ء صفحہ 15 تا 19
غلام رسول، حاجی	بذریعۂ انٹرویو یکم جولائی 2004ء
شگری محمد یوسف	''پولو'' 2001ء صفحہ 25، 27، 28، 29
غلام عباس، اے ڈی فشریز	بذریعۂ انٹرویو و رپورٹ
شکاری، عبدالغنی جوٹیال	بذریعۂ انٹرویو 10/07/2004
علی شاہ، سید۔ ڈپٹی ڈائریکٹر فشریز	بذریعۂ انٹرویو 13/07/2004
NACS-IUCN پراجیکٹ فرسٹ ڈرافٹ اکتوبر 2001ء	''بیک گراؤنڈ پیپر آن کلچرل ہیری ٹیج و سسٹین ایبل ٹورزم''
جان بڈلف	''ہندوکش کے قبائل'' اردو ترجمہ از جاوید شاہین 1991ء صفحہ 98,99
شاد محمد حسن	غیر مطبوعہ مواد ''گلگت تاریخ و ثقافت'' 1972ء صفحہ 13
منظوم علی پروفیسر	''بلورستان'' مضمون حمید خاور 1982ء صفحہ 25
جمعہ خان حاجی	صدر جیولرز یونین، بذریعۂ انٹرویو مورخہ 09/01/04
علیم الدین	ممبر شوریٰ جیولرز یونین، بذریعۂ انٹرویو مورخہ 09/01/04
برچہ، شیر باز علی خان	بذریعۂ نظر ثانی 01/02/04

حصہ بروشال ہنزہ، نگر، یاسین (صفحہ 159 تا 210)

سخی، احمد جامی۔ وسط ایشیا میں وخ لوگ اور زبان، ۱۹۷۹ء گوجال اسماعیلیہ اسٹوڈنٹس یونین، کراچی ص ۵۵،

یحییٰ شاہ، سید بروشال۔ جلد 1۔ شمارہ ۲۔ حسرت محمد حسن شیر باز بُر چہ

Oasses of the Karakaram Evolution of Irrigation & Social Organization in Hunza and North Pakistan

۱۔ ایثار، فدا علی۔ ریاست ہنزہ (تاریخ وثقافت کے آئینے ۲۰۰۲ء میں) ہنیسارا پبلشنگ نٹ ورک، گیٹ وے پلازہ ائیر پورٹ چوک گلگت۔ ص ۸۷

۲۔ بیگ، حاجی قدرت اللہ: تاریخ عہد عتیق ریاست ہنزہ، حصہ اول ۱۹۸۰ء حاجی قدرت اللہ بیگ، بلتت ہنزہ۔ ص ۲۳، ۲۴، ۲۵، ۲۸

۳۔ تحسین، محمد اسماعیل۔ بروشال سے نگر تک کا سفر ۲۰۰۲ء زیرک پبلیکیشنز، راولپنڈی۔ ص ۳۴۔۳۵۔۳۶

۱۔ انجمن ترقی کھوار کھوار۔ چترال مارچ ۱۹۷۹ء انجمن ترقی کھوار چترال۔ ص ۱۶۔

۲۔ ایثار، علی جاہ فدا علی ریاست ہنزہ، تاریخ وثقافت کے آئینے میں جولائی ۲۰۰۲ء ہنی سارا پبلشنگ نٹ ورک گلگت ص ۴، ۵، ۶

۳۔ بیگ، غلام رسول (میجر) ر سابقہ ریاست ہنزہ کے میری نظام کا ایک جائزہ۔ (غیر مطبوعہ مواد)

۴۔ تحسین، محمد اسماعیل، بروشال سے نگر تک کا سفر تمبر ۲۰۰۲ء زیرک پبلیکیشنز راولپنڈی، ص ۱۹۶

۵۔ عثمان علی، پروفیسر خطہ قراقرم، زبانیں اور معاشرہ ۱۹۹۶ء مقبول اکیڈمی ۱۹۹، سرکلر روڈ

حصہ بلتستان (صفحہ 211 تا 316)

1- Drew, Frederic,Jammu & Kashmir Territories, 1980 Page 355, 392

2- Afridi, Banat Gul, Baltistan in History, 1988, Page 8, 15

3- A.H,Dani History of Northern Areas of Pakistan,1989, Page 3,14,17,20

4- Elisabeth, B.Booz, A Guide to Tibet, Shangrila Press Hongkong, 1986, Page 14.

5- حشمت اللہ خان، تاریخ جموں، 1968ء، ص 577 تا 580

6- حسین آبادی، محمد یوسف، بلتستان پر ایک نظر، 1987ء (بار دوم) ص 30 تا 44 اور 178 تا 187

7- کاظمی، سید محمد عباس، بلتی لوک گیت، 1985ء، ص 25 تا 26

8- حسرت، محمد حسن، تاریخ ادبیات بلتستان، 1992ء، ص 21 تا 23

9- حسرت، محمد حسن، بلتستان تہذیب وثقافت، 1995ء، ص 228 تا 232

10- نسیم، محمد قاسم، بلتستان تاریخ وسیاست، 1994ء، ص 29 تا 30

11- منظوم علی، قراقرم ہندوکش، (مضمون سیاچن گلیشیئر از نینسی بل لاک ورکرمین ہنٹر ورک مین) اردو ترجمہ 1985ء، ص 59 تا 85

12- منظوم علی، شمالی علاقہ جات کا نقشہ اور اٹلاس (انگریزی) 1995ء
13- لوبسانگ، غلام حسن، می مانگ رگیاستر ید بلتستان (شمارہ کیسر) اگست 1987ء ص2 تا5

1- G.T Vigne,Travel in Kashmir, Ladakh & Skardu. 1987, Page 195, 375
2- A.H. Francke,Baltistan and Ladakh,1986(باردوم)Page 38, 49
3- Karal Jettmar, Bolor and Drdistan,1980, Page 2, 8
4- A.H. Dani, History of Nortern Area of Pakistan,1989, Page 390, 363, 273, 231, 161, 158, 150, 146اور422
5- Banat Gul Afridi, Baltistan in History,1988,Page 16, 155, 222, 235
6- حشمت اللہ خان، تاریخ جموں، 1968ء ص447 -576
7- وزیر قدت اللہ بیگ، تاریخ عہد عتیق ریاست ہنزہ (فارسی)، 1980ء ص43
8- شاہ رئیس خان، تاریخ گلگت (مولف پروفیسر احمد حسن دانی) 1987ء ص112, 117, 186, 192
9- حسین آبادی، محمد یوسف، بلتستان پر ایک نظر، 1987ء (باردوم)، ص46, 142
10- کاظمی، سید محمد عباس، بلتی لوک گیت، 1985ء، ص7,23,103
11- حسرت، محمد حسن، تاریخ ادبیات بلتستان، 1992ء23, 28
12- نسیم، محمد قاسم، بلتستان تاریخ وسیاست، 1994ء، ص30, 77
13- شاکر شمیم، بلتستان کی جنگ آزادی، 1994ء، ص27, 39
14- لوبسانگ، غلام حسن، شمارہ لوبسانگ ص3,7، کیسار ص2, 20، لوسر ص18, 23
15- لوبسانگ، غلام حسن، تاریخ بون فلسفہ (بلتستان، لداخ اور تبت کی فکری تاریخ کا خلاصہ) 1997ء، ص19, 69

1- Johon, Bidluf, Tribes of Hindukush, 1986 Page 54- 46
2- G.T.Vigne, Trevells in Kashmir, Ladakh & Iskardo, 1987, Vol II
3- G.T Vigne, Jamoo and Kashmir, 1980, Page195, 375
4- Frederic,Drew Jamoo and Kashmir Territories 1980,Page 355, 392
5- A.H Francke, Baltistan and Ladakh, IIEd 1907, 1986, Page 15, 31
6- Banat Gul Afridi, 1988, Baltistan in History, Page 16, 20
7- A.H Dani, 1989,History of Northern Area of Pakistan Page 52, 60
8- حشمت اللہ خان، تاریخ جموں، 1968ء (باردوم) ص 447, 448, 519, 537, 540, 558, 561
9- کاچو سکندر خان، قدیم لداخ، 1985ء، ص48, 47
10- حسرت، محمد حسن، بلتستان تہذیب وثقافت، 1995ء، ص18, 28

1- Jean Fairley, the Lion River the Indus, P-1,4
2- Dervla Murphy, Where the Indus is young,

3- نسیم، محمد قاسم، بلتستان تاریخ وسیاست، 1994ء، ص181, 182
4- الہامی، حشمت علی کمال، ادب اور بلتستان (مضمون) شائع دراراض بلتستان مرتبہ الحاج محمد ابراھیم زائر، 1993ء، ص61, 96
5- حسرت، محمد حسن، بلتستان تہذیب وثقافت، 1995ء، ص 29, 38
6- ناشاد، فدا محمد، سیاچن ایک برفانی دلدل (مضمون) شائع دراراض بلتستان مرتبہ الحاج محمد ابراھیم زائر، ص 97, 107 140-144

ا۔ حسرت، محمد حسن، بلتستان تہذیب وثقافت ص 37, 38
۲۔ حسرت، محمد حسن، مقالہ انگریزی غیر مطبوعہ بعنوان Language as a Phenomenon of Social change in Baltistan

1- Vigne G.T Trevells in Kashmir, Ladakh add Iskardu, Voll, Page 195, 375
2- Afridi, Banat Gul, Baltistan in History, 1988, Page 194, 212
3- کاظمی، سید محمد عباس، بلتی لوک گیت، 1985ء، ص31, 32
4- حسرت، محمد حسن، (مضمون۔ بلتستان میں نمکین چائے کی روایت (شائع دراراض بلتستان از محمد ابراہیم زائر، 1992ء، ص 184-192
5- حسرت، محمد حسن، بلتستان تہذیب وثقافت، 1995ء، ص46-50

1- Afridi, BanatGul, Baltistan in History, 1988, p-162-163
2 - حشمت اللہ خان، مولوی، تاریخ جموں، 1968ء، ص452
3- حسرت، محمد حسن، بلتستان تہذیب وثقافت، 1995ء، ص32-33، 128-131، 111-112، 123-124
(1) Vigne, G.T. Travels in Kashmir, Ladakh & Skardu, Page-195-375
(2) Francke, A.H, Baltistan & Ladakh, 1907, 1986, IIEd, Page- 15- 330
(3) Drew, Frederic, Jammu and Kashmir Territories Page- 355- 352
(4) Afridi, Banat Gul, Baltistan in History, 1988, Page- 236- 261
(5) حشمت اللہ خان تاریخ جموں، 1968ء (بار دوم)، ص577-580
(6) کاچو سکندر خان، قدیم لداخ، 1985، ص38-47
(7) حسین آبادی، محمد یوسف، بلتستان پر ایک نظر، ص169-171
(8) حسرت، محمد حسن، بلتستان تہذیب وثقافت 1995، ص107-112
(9) حسو، غلام حسن، بلتستان کی ثقافت (مضمون در کاروان ادب شمارہ نومبر 1995ء) ص102-117

(1) Afridi, Banat Gul, Baltistan in History, 1988, p-166-177
(2) حسین آبادی، محمد یوسف، بلتستان پر ایک نظر دوسرا ایڈیشن 1987ء، ص155-157
(3) کلیم، سید عطا حسین، بلتستان کی شاعری، ص44-74
(4) حسرت، محمد حسن، تاریخ ادبیات بلتستان، 1992ء، 119-283

(1) Afridi, Banad Gul, Baltistan in History, 1988 p-194-212

(2) حشمت اللہ خان، مولوی، تاریخ جموں، 1986ء، ص433-435

(3) حسرت، محمد حسن، بلتستان تہذیب وثقافت، 1995ء ص62-78، 107-121، 132-134

(4) غلام رسول، جنگل کے باسی، تاریخ ندارد، ص 9 -13

(5) کاظمی، سید محمد عباس، بلتی لوک گیت، 1985ء، ص 34 -36

-1 حسرت، محمد حسن، بلتستان تہذیب وثقافت، 1995ء، ص62-78، 107-112، 113-121، 132-134، 154-166، 244-246

-2 حسین آبادی، محمد یوسف، بلتستان پر ایک نظر، 1987ء، ص 161-169

-3 سکندر، کاچو سکندر خان، قدیم لداخ، 1985ء، ص 585-587

-4 زائر، محمد ابراہیم، ارض بلتستان، (مضمون بلتستان میں جشن بہاراں از وزیر حمایت حسین) 1993ء، ص 140-144

۱۔ حسرت، محمد حسن، بلتستان تہذیب وثقافت، ص 135 ,136-120, 121 ص 228-230

۲۔ سکندر، کاچو سکندر خان، قدیم لداخ ص 2216-226

۳۔ غلام حسین، معروف داستان گو، کیسار داستان سے اقتباسات

۴۔ حسرت، محمد حسن، تاریخ ادبیات بلتستان، ص 76-77

۵۔ کاظمی، سید محمد عباس، بلتی لوک گیت ص 114-130-132، 91-93، 52-54، 157-158-159، 45-43، 88-90-112

۷۔ حسنی، غلام حسن، کاروان ادب، چلو شمارہ نمبر 2، ص 121-125

۸۔ لوبسانگ غلام حسن، تاریخ بون فلسفہ (بلتستان، لداخ، تبت کی فکری تاریخ کا خلاصہ) 1997ء، ص 44-77، 127 تا 140

1- Afridi, Banat Gul, Baltistan in Hostory, 1988, Page 160` 164, 176, 179, 181, 182

-2 کلیم، سید عطا حسین، بلتستان (ادبی وثقافتی ورثہ) ص 26 , 39

-3 منظوم علی، قراقرم ہندوکش (مضمون سید محمد عباس کاظمی، بلتستان کی موسیقی) 1985ء، ص 711 ,721

-4 کاظمی، سید محمد عباس، بلتی لوک گیت، 1985ء، ص 47 ,41 ,118 ,120 ,133 ,135 ,109 ,111 ,181 ,183

-5 حسرت، محمد حسن، تاریخ ادبیات بلتستان، 1992ء ص 53 ,60

-6 سکندر، کاچو سکندر خان، قدیم لداخ، 1987ء، ص 422

-7 یحییٰ، الحاج محمد، کاروان ادب، چلو شمارہ نمبر 2 (مضمون موسیٰ قی یا موسیقی) 1995ء، ص 40 ,65

-8 اپو علی حسن بلے واچلو (سُر نہ نواز) انٹرویو بابت موسیقی، شرکائے گفتگو محمد عباس کھرگرونگ، غلام حسن حسنی، عبداللہ کریم۔ بتاریخ 21/5/91

-9 خورجوی، نقی محمد خان، حیات امیر خسرو بمعہ ایجاد موسیقی، 1960ء، ص 144 تا 184

-10 غلام حسین سندوس، داستان گو اور روایات گو

11- وزیر غلام مہدی ایم اے ایل ایل بی، معروف دانشور انٹرویو

1- حسرت، محمد حسن، بلتستان تہذیب وثقافت، ص 42, 45

2- کاظمی، سید محمد عباس، بلتی لوک گیت، ص 31

1- Dani, Prof Dr. A.Hasan, History of Northern Area of Pakistan.1989, Page- 84

2- Afridi, Banat, Gul, Baltistan in History, P- 48, 51

3- Drew, Frederick, Jammu and Kashmir territeries,

4- حسرت، محمد حسن، بلتستان تہذیب وثقافت، 1995ء، ص 143, 152

5- حسرت، محمد حسن، بلتستان میں پولو (غیر مطبوعہ)

6- حسین آبادی، محمد یوسف، بلتستان پر ایک نظر، ص 161, 169

7- کاظمی، سید محمد عباس، بلتی لوک گیت، ص 32

8- عثمان علی، پروفیسر، شنالوجی

9- محمد اکرم خان، بلورستان رسالہ (از منظوم علی)، شعبہ جغرافیہ گورنمنٹ ڈگری کالج گلگت، 1982ء، صفحہ 71 -73

10- وزیر غلام مہدی (بزرگ دانشور) انٹرویو

11- راجہ محمد علی شاہ صبا (بزرگ شاعر اور پولو کے معروف کھلاڑی) انٹرویو

12- وزیر محمد علی ولی پا (معروف پولو کھلاڑی) انٹرویو

13- غلام حسین سندوس (معروف داستان گو) انٹرویو

14- وزیر حمایت حسین، سینئر پروڈ

1- Vigne, G.T, Travals in Kashmir, Ladakh and Skardu,1987,P-317 Vol-II

2- حسرت، محمد حسن، بلتستان تہذیب وثقافت، 1995ء، ص 79، 84

3- زائر، الحاج محمد ابراہیم، ارض بلتستان، 1992ء، (مضمون از محمد ظہیر منڈوق) ص 285-292

4- حسرت، محمد حسن مقالہ (انگریزی) بلتستان میں روایتی طریقہ علاج (پیش کردہ قراقرم کلچرل ایریا کانفرنس منعقدہ اکتوبر 1995ء)

کتابیات اور حوالہ جات: بلتستان

۱۔ حشمت اللہ خان، مولوی، تاریخ جموں، مکتبہ اشاعت ادب عنایت اللہ بلڈنگ انارکلی لاہور، پہلا ایڈیشن 1936ء، دوسرا ایڈیشن 1968ء

۲۔ منظوم علی، قراقرم ہندوکش، ڈگری کالج گلگت، 1985ء

۳۔ حسین آبادی، محمد یوسف، بلتستان پر ایک نظر، پہلا ایڈیشن 1984ء، دوسرا ایڈیشن 1987ء

۴۔ کلیم، سید عطا حسین، بلتستان (ادبی و ثقافتی ورثہ) مکتبہ کاروان، کچہری روڈ لاہور

۵۔ لوبسانگ، غلام حسن، می مانگ رگیاستر ید بلتستان (شمارے لوبسانگ 1987ء، کیسار 1987ء، لوسر 1987ء، یول ان 1988ء، سانگ 1990ء)

۶۔ حسرت، محمد حسن، تاریخ ادبیات بلتستان، سندوس سکردو، 1992ء

۷۔ حسرت، محمد حسن، بلتستان تہذیب و ثقافت، سندوس سکردو، 1995ء

۸۔ نسیم، محمد قاسم، بلتستان تاریخ و سیاست، پروگریسیو پبلشرز ذیلدار پارک اچھرہ لاہور 1994ء

۹۔ زائر، الحاج محمد ابراہیم، ارض بلتستان، بلتستان ادبی بورڈ سکردو، 1993ء

۱۰۔ سکندر، کاچو سکندر خان، قدیم لداخ (تاریخ و تمدن) کاچو پبلشرز لیہہ لداخ، 1985ء

۱۱۔ قدرت اللہ بیگ، وزیر، تاریخ عہد عتیق ریاست ہنزہ، بلتت ہنزہ، 1980ء

۱۲۔ شاہ رئیس خان، تاریخ گلگت، قائداعظمؒ یونیورسٹی اسلام آباد، 1987ء

۱۳۔ شاکر شمیم، بلتستان کی جنگ آزادی، بلتستان اکیڈمی شمیم آباد سکردو، 1994ء

۱۴۔ منظوم علی، شمالی علاقہ جات کا نقشہ، اٹلاس، ڈگری کالج گلگت، 1995ء

۱۵۔ لوبسانگ، غلام حسن، تاریخ بون فلسفہ (بلتستان، لداخ اور تبت کی فکری تاریخ کا خلاصہ) طولتی سکردو، 1997ء

۱۶۔ کاروان، شمارہ دوم، کاروان ادب، چلو، 1995ء

۱۷۔ منظوم علی، بلورستان، گورنمنٹ ڈگری کالج گلگت، 1982ء

۱۸۔ غلام رسول، جنگل کے باسی

۱۹۔ کاظمی، سید محمد عباس، بلتی لوک گیت، لوک ورثہ اسلام آباد، 1985

۲۰۔ کاظمی، سید محمد عباس، غیر مطبوعہ مقالہ بعنوان ''داستان کیسر''

۲۱۔ غلام حسین، سندوس سکردو معروف داستان گو انٹرویو اور کیسار داستان سے اقتباسات

۲۲۔ وزیر غلام مہدی ایم ای ایل ایل بی علیگ سکردو (معروف دانشور) انٹرویو

۲۳۔ راجہ محمد علی شاہ صبا (معروف شاعر، دانشور اور پولو کے کھلاڑی) انٹرویو

۲۴۔ وزیر محمد علی ولی پا (معروف پولو کھلاڑی) انٹرویو

۲۵۔ ابوعلی حسن بلے واچلو، معروف سُر نواز، انٹرویو بابت موسیقی (شرکائے گفتگو محمد عباس کھرگرونگ، غلام حسن حسنی، عبداللہ کریم)

۲۶۔ حسرت، محمد حسن، غیر مطبوعہ کتاب بلتستان میں پولو (اردو۔انگریزی)

۲۷۔ حسرت، محمد حسن، غیر مطبوعہ مقالہ (انگریزی) بلتستان میں روایتی طریقہ علاج پیش کردہ قراقرم کلچرل ایریا کانفرنس، اسلام آباد 1995

۲۸۔ محمد علی المعروف اپو یرو بلغار لوک گیت بذریعہ غلام حسین بلغاری و محمد عباس کھرگرونگ سکردو

29. Dani, Prof Dr. A.H, History of Northern Area of Pakistan, National Institute of Historical and Cultural Research Islamabad, 1989.

30. Frenke, A.H, Western Tibet (Baltistan and Ladakh), Lok Virsa Islamabad, 2nd Edition, 1986

31. Vigne, G.T, Travels in Kashmir, Ladakh and Iskardo, Indus Publications Karachi IInd Edition, 1987.

32. Drew, Frederek, Jammu and Kashmir Territories, Indus Publications, Karachi, 1980.

33. Afridi, Banat Gul, Baltistan in History Emjay Books International, Arbab Road Peshawar Cantt, 1988

34.Encyclopedia Britanica, Vol- 4, 1966

35.Dictionary, Chambers,

36. Bidulph, Jhon. Tribes of Hindukush, Muhammad Book stall Gilgit.

37.Elisabeth. B. Booz, A Guide to Tibet, Shangrila Press Hong Kong, June, 1986

38.The New WEBSTER Encyclopedia Dictionary

39. Encyclopedia International.

40.Jean. Fairley, The Lion River the Indus,

41.Murphy, Dervla, Where the Indus is young.

42.Jettmar, Karl, Bolor and Dardistan, Lok Virsa Islamabad, Reprint, 1980.

انارکلی لاہور ص۔۴۱۔

۱۔منظوم علی، پروفیسر۔ سدپارہ بلورستان

یکم جون ۱۹۸۶ء، شعبہ جغرافیہ گورنمنٹ ڈگری کالج گلگت۔ص ۱۶۷

2.Schomberg, R.C.F Betueen Oxus&Indus 1976,Al.Biruni the malLahore. pp 220

۱۔انٹرویو جمہ بیگ، موضع ڈورکھن ہنزہ زیب النساء، موضع ڈورکھن ہنزہ۔

1-Wilson, Stephe.R. A Look at Hunza Culture 1999 National Instituteof Pakistan Studies,Quaid-e-Azam University Islamabad.pp50,51,52

ہنزائی، عبداللہ جان۔ ہنزہ کے قدیم تہوار اور رسوم ورواج ۲۰۰۲ء سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ص۹۴۔

DATA ENTERED

ا۔سبط حسن پاکستان میں تہذیب کا ارتقاء۔۱۹۸۷، مکتبہ دانیال عبداللہ ہارون روڈ کراچی، ص ۱۳۔

Ethnographic Study of Village Gulmit ,Gojal, 2.Ghulam Rasool Upper Hunza ,Distt Gelgit an MSc thesis submitted to department of anthrropology University of Peshawar

3. Wilson Stephen .R A Look at Hunza Culture 1999 National Institute of Pakistan Studies ,Quaid-e-Azam Univerristy pp 101,102

ا۔ ہنزائی عبداللہ جان۔ ۲۰۰۰ء ہنزہ کے قدیم تہوار اور رسوم ورواج سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ص ۹۷، ۹۸، ۹۹، ۱۲۳۔

1. Felmy ,Sabine: 1996, the voice of the nightingale oxford university press, new york oxford Delhi. pp 28,29

2. Lorimer,D.L.r: 1979, Hunza A Rademische Drucr.u.werlagsamstait Graz austria pp,100,101

ا۔ برچہ، شیر باز علی خان، مارچ ۱۹۸۹ء، تذکرہ اہل قلم وشعرائے گلگت۔ گلگت۔ ص۔ ۴۱۔ ۱۴۰

۲۔ ریاض احمد خان، راجہ، جولائی ۲۰۰۳ء، وادی ہنزہ شمالی علاقہ جات جنت نظیر۔ گلگت۔ ص۔ ۱۱۔ ۳۱۰

۳۔ ہنزائی، عبداللہ جان، ۲۰۰۰ء، ہنزہ کے قدیم تہوار اور رسوم ورواج لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ص۔ ۶۳، ۶۲، ۱۶۱

Lorimer, It col D.L.R. the Brushaski language oslo 1935,pp,356, 7,8,9

ماخوذ:

ا۔ احمد حسن دانی شاہ رئیس خان کی تاریخ گلگت ۲۰۰۰ء، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ص، ۲۰

۲۔ تحسین، محمد اسماعیل۔ بروشال سے نگر تک کا سفر (تاریخ نگر) ستمبر ۲۰۰۲ء، زیرک پبلی کیشنز، راولپنڈی ص، ۴۹، ۵۰

3- Felmy, Sabine, thevoice of the nightingle 1996, Oxford University press,Pakistan ,PP 66,67,68,69 &70

4- Wilson, Stephon R, A Look ot Hunza culture 1999, NIPS, Linguistics ,PP,168,169 & 170 Quaid-e-Azam University & summer Institute of

کتابیات (حصہ چترال صفحہ 317 تا 361)

۱۔ اسرارالدین پروفیسر 1971 کھوارادب، سید قاسم محمود ادبیات مغربی پاکستان، حصہ دوم جلد چہارم، پنجاب یونیورسٹی، لاہور۔

۲۔ اسرارالدین پروفیسر 1985، چترال ایک تعارف، انجمن ترقی کھوار، چترال

۳۔ اسرارالدین پروفیسر 1985، کھوارادب، منظوم علی، قراقرم ہندوکش گلگت۔

۴۔ شرولی خان اسیر 1987 چترال کے آلات موسیقی، (قلمی نسخہ) لائبریری لوک ورثہ اسلام آباد۔

۵۔ عنایت اللہ فیضی، ڈاکٹر 1980 کھوارادب کا ارتقاء جرنل پاکستان سٹڈی سنٹر، پشاور یونیورسٹی۔

۶۔ عنایت اللہ فیضی، ڈاکٹر 1985 کھوارادب، چترال ایک تعارف، انجمن ترقی کھوار چترال۔

۷۔ عنایت اللہ فیضی، ڈاکٹر 1986 کھوارادب میں روایت، ادبی جائزے، اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد۔

۸۔ عنایت اللہ فیضی، ڈاکٹر 1989 چترال کے لوک فنون اور دستکاریوں کا زوال، مجلّہ کھوار، انجمن ترقی کھوار، چترال۔

۹۔ عنایت اللہ فیضی، ڈاکٹر 1989 چترال، لوک ورثہ اسلام آباد۔

۱۰۔ عنایت اللہ فیضی، ڈاکٹر 1985 چترال کی علاقائی زبانیں، منظور علی ایڈیٹر، قراقرم ہندوکش، گلگت۔

۱۱۔ غلام عمر 1983 باباسیئر، لوک ورثہ اسلام آباد۔

۱۲۔ غلام عمر 1984 چترال کی لوک کہانیاں، لوک ورثہ اسلام آباد۔

۱۳۔ گل نواز خاکی 1985 مایون چترال کا سیاح پرندہ۔ منظور علی قراقرم ہندوکش، گلگت۔

۱۴۔ محمد حسام الملک شہزادہ 1976 تمدن چترال، جمہور اسلام کھوار، پشاور (قسط وار)

۱۵۔ محمد حسام الملک شہزادہ 1988 خوان چترال، انجمن ترقی کھوار، چترال۔

۱۶۔ محمد غفران مرزا 1963 نئی تاریخ چترال، پبلک آٹ پریس، پشاور۔

۱۷۔ مورگن سٹیرن جارج 1983 کھوار، دائرہ المعارف اسلامیہ پنجاب یونیورسٹی، لاہور۔

۱۸۔ وزیر علی شاہ، 1985 تاریخ چترال، چترال ایک تعارف انجمن ترقی کھوار، چترال۔

۱۹۔ ولی زار خان ولی، 1988 کھوار کی ترقی میں ریڈیو کا کردار، گل مراد حسرت، مرتب، کھوارادب، انجمن ترقی کھوار چترال۔

۲۰۔ وقار احمد، 1980 کھوار زبان کی تاریخ، اسرارالدین ایڈیٹر، مجلّہ ترتیمر، پشاور یونیورسٹی۔

DATA ENTRED



لوک ورثہ، اسلام آباد اور الفیصل ناشران، لاہور کے مشترکہ اشاعتی پروگرام کے تحت ''پاکستان کے ثقافتی انسائیکلو پیڈیا'' کے آئندہ درج ذیل والیمز شائع کیے جائیں گے:

-- پنجاب

-- سرحد

-- سندھ

-- بلوچستان

-- پاکستان کی موسیقی اور موسیقاروں کا انسائیکلوپیڈیا

پاکستانی ثقافت، فنون اور صوفیاء کے حوالے سے کتابیں شائع کرنے کا منفرد مشترکہ اشاعتی پروگرام

ISBN 969-503-379-2

CAD LIBRARY P.U. LHR